
asia
دونوں ایک سے ہیں؟
شاید دیکھنے کی حد تک
پھر اس کے بعد یکسانیت ختم
ایشیا فین
ہلکی رفتار، زیادہ ہوا
بے آواز، خوبصورت اور دیرپا
فیکٹری میں ہر پنکھے کی انفرادی جانچ پڑتال
مد مقابل پنکھوں کی نسبت کم سے کم بجلی کا خرچ
۲۵۰ وولٹ تک بجلی کا بوجھ برداشت کرنے کی اہلیت
تین سالہ گارنٹی اور بعد از فروخت سروس کی ضمانت
انور انڈسٹریز لمیٹڈ گوجرانوالہ

SCAN

مُبین پیرزادہ

ادبی دستاویز "معاصر" کی دوسری

جلد کی اشاعت پر

پیرزادہ پائپ کراچی

کی طرف سے

مبارکباد

پیش کرتے ہیں

غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل مجموعہ نظم و نثر

معاصر (۲)

مدیر مسئول :- حبیب اللہ خان

مدیر اعزازی :- عطاء الحق قاسمی

— ملنے کا پتہ —

مکتبہ معاصر ۴۰۳ الفیصل پلازہ شاہراہ قائداعظم لاہور

قیمت: پچھتر روپے

حبیب اللہ خاں نے پاکستان پرنٹنگ ورکس ریٹیگن روڈ لاہور سے طبع کراکے مکتبہ معاصر ۴۰۳ الفیصل پلازہ شاہراہ قائداعظم لاہور سے شائع کیا

حرفِ سپاس

"معاصر" کا دوسرا شمارہ قریباً ۴ سال بعد منصۂ شہود پر آ رہا ہے۔ ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور ملکی اخبارات و رسائل کی طرف سے ہماری اس کاوش کو جس طرح سراہا گیا اور پوری دنیا میں جہاں جہاں اردو پڑھی جاتی ہے، اس کی جس طرح پذیرائی ہوئی، وہ ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے کافی تھی۔ ہم دوسرا شمارہ چند ماہ کے بعد شائع کرنا چاہتے تھے مگر بہت سی دشواریاں آڑے آئیں، بہر حال ہم ان سطور میں ملک کے ان تمام ادیبوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جنہوں نے "معاصر" کے لیے اپنی غیر مطبوعہ تحریریں عنایت کیں اور ان کی اشاعت کے لیے اتنا طویل عرصہ انتظار کیا اور ان کا بھی جن کی کتابیں اس عرصہ میں شائع ہو گئیں اور یوں ہم بادلِ نخواستہ ان کی گرانقدر نگارشات سے محروم ہو گئے اس کے باوجود "معاصر" میں چند ایسی تحریریں موجود ہیں جو پہلے چھپ چکی ہیں یہ تحریریں اس وقت کتابی صورت میں سامنے آئیں جب "معاصر" پریس میں جانے کے لیے تیار تھا یا ان کی اشاعت کے بارے میں ہمیں تاخیر سے علم ہوا۔ چند چیزیں بھارت میں شائع ہو چکی ہیں تاہم پاکستانی قارئین کے لیے یہ نئی ہیں۔ بہر حال ہم ان تمام دوستوں کے ممنون ہیں جنہوں نے "معاصر" کی اشاعت کے ضمن میں ہمارے ساتھ تعاون کیا!

ہمیں اپنے خوشنویس دوستوں سعید احمد اور ان کے ساتھیوں کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے اور ان کے علاوہ خصوصی طور پر نعمت اللہ خان بابر کا کہ انہوں نے "مشکل" وقت میں ہمارا ساتھ دیا۔ کتاب کے سرورق کے لیے ہم ملک کے معروف آرٹسٹ محترمہ بالہ فاروقی کے ممنون ہیں اور ہاں "معاصر" پنجابی بھی تیار ہے، اگر اس کی راہ میں مزید دشواریاں پیش نہ آئیں، تو ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی پنجابی نگارشات پر مشتمل یہ مجموعہ عنقریب آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائیگا

حبیب اللہ خاں

(مدیرِ مسئول) یکم اگست ۸۲ء

سلیم احمد اور فتح محمد ملک کے نام



بزم آرائیاں



جناب شفیق الرحمٰن ایک طویل عرصے کے بعد لاہور آئے تو "معاصر" نے ہوٹل ہلٹن میں ان کے
اعزاز میں عصرانہ دیا۔ تصویر میں منیر نیازی، اشفاق احمد، شفیق الرحمٰن، محمد خالد اختر اور
انتظار حسین نظر آ رہے ہیں۔



راولپنڈی سے ممتاز ادیبوں کی لاہور آمد پر "معاصر" کی طرف سے کیتھے ریستوران میں دیئے
گئے عشائیے کے چند شرکاء۔ گلزار وفا چوہدری، کرنل محمد خاں، سید ضمیر جعفری، محمد خالد اختر
مظہر الاسلام، عطاء الحق قاسمی، صدیق سالک، امجد اسلام امجد، عبدالعزیز خالد اور احمد ندیم قاسمی

تقریب صحت

جناب احمد ندیم قاسمی ایک طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوئے تو ملک کے مختلف شہروں میں ادیبوں نے انکی صحت کا جشن منایا لاہور میں منعقد ہونیوالی چند بڑی تقریبات میں سے مدیر نقوش محمد طفیل، سیف اللہ خالد، محترمہ شبنم شکیل اور شکور حسین یاد کی طرف سے منعقدہ تقریبات خصوصی اہمیت کی حامل تھیں۔ ایک تقریب ایڈیٹر "معاصر" نے بھی اپنے گھر پر منعقد کی جس کے صدر ڈاکٹر وحید قریشی تھے تقریب میں بیسیوں مہمانوں نے شرکت کی چند تصویری جھلکیاں



محمد طفیل، احمد ندیم قاسمی (مہمان خصوصی) مظہر بخاری



امجد اسلام امجد، ڈاکٹر سلیم اختر اور سراج منیر



نجیب احمد ایوب خاور اور خالد احمد



محمد علی صدیقی، سلیم درانی، صابر ظفر، جمیل اختر خان، غلام عباس مرحوم اور ہاجرہ مسرور

کراچی

کراچی میں سجاد میر نے ادیبوں اور دانشوروں کی طرف سے "معاصر" کا استقبال کیا سجاد میر کی طرف سے دیئے گئے استقبالیے میں شہر کے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی اس تقریب کی صدارت برصغیر کے ممتاز افسانہ نگار جناب غلام عباس (مرحوم) نے کی۔ جناب غلام عباس نے "معاصر" کو ایک مستقل اہمیت کی ادبی دستاویز قرار دیا۔ ان کے علاوہ جناب سلیم احمد۔ جناب مشفق خواجہ اور جناب محمد علی صدیقی نے "معاصر" کے بارے اظہار خیال کیا اور کہا کہ اس پرچے کو معاصر پاکستانی ادب کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے



جناب جمیل الدین عالی اور بیگم عالی



احمد علی خاں (ایڈیٹر "ڈان") سلیم احمد، محسن بھوپالی، مختار زمن اور شبنم رومانی



ادیب نفیس (مرحوم) اور امجد اسلام امجد



زاہد ملک، ایڈیٹر معاصر عطاء الحق قاسمی، شفیق الرحمٰن، نور الحسن جعفری، ضیاء جالندھری، صادق نسیم، منظر الاسلام:

"معاصر" کی رونمائی

راولپنڈی: "معاصر" کے پہلے شمارے کی اشاعت پر پنڈی کلب میں ڈاکٹر صفدر محمود کی طرف سے منعقدہ تقریب رونمائی میں ممتاز ادیبوں نے شرکت کی چند تصویری جھلکیاں



امجد اسلام امجد "معاصر" کا اولین شمارہ فریدہ حفیظ کو پیش کر رہے ہیں، ان کے ساتھ شمیم سہگل اور منظر الاسلام ہیں۔



محمد منشا یاد "معاصر" کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں تصویر میں ان کے علاوہ خالدہ اقبال یاسر، جمیلہ ایدیٹ، بلقیس فاروقی اور بیگم لعل جعفری نظر آ رہے ہیں۔



لاہور

لاہور میں ایڈیٹر "معاصر" عطاالحق قاسمی کی طرف سے اپنے گھر پر دیئے گئے ایک عشایئے میں نئی اور پرانی نسل کے ممتاز ادیب اور دانشور شریک ہوئے۔ یہ ایک بھرپور تقریب تھی جس میں ایک سو کے لگ بھگ ادیب، شاعر اور دانشور شریک ہوئے

ابوالاثر حفیظ جالندھری (مرحوم) اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ تصویر میں رحمٰن شیخ، طاہر لاہوری اور ڈاکٹر ملک حسن اختر نظر آ رہے ہیں۔



انجم رومانی، امجد اسلام امجد، رحیم گل، ڈاکٹر سلیم اختر، محمد اقبال دگلوکار، حمید چوہدری، سید سرفراز احمد، پروفیسر محمد عثمان، شیخ حفیظ الرحمٰن، جلیل نقوی، مسعود رکیلی، شعیب بن عزیز اور جلیل صدیقی



محمد کاظم، احمد حسن حامد، حسنین جاوید، حفیظ صدیقی، رفیق ڈوگر، خالد احمد، یحییٰ امجد،
ذوالفقار احمد تابش، حبیب کیفوی، اور محمد ادریس۔



ابوالاثر حفیظ جالندھری، اعجاز حسین بٹالوی، صلاح الدین محمود، مجیب الرحمان شامی، دلدار پرویز بھٹی، انجم رومانی، محمد ادریس
مسعود حیبلی، عطاء الحق قاسمی (میزبان) اور دوسرے بہت سے احباب۔

فہرست

ناول

نظمیں

افسانے

آئینۂ خیال

غزلیں

نقطۂ نظر

خاکے

حلقہ اربابِ ذوق (لندن)

طنز و مزاح

انشائیہ

سفر نامے

نظمیں

بستی ــــ خصوصی مطالعہ

سرورق: ہالہ فاروقی

حرفِ آغاز

پاکستانی ادب کے مسئلے پر چونکہ بہت کچھ کہا جا چکا ہے لہٰذا اس پر ابھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش باقی ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں جس موضوع پر جتنا زیادہ لکھا جاتا ہے اتنی ہی اس کی تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دُور جانے کی کیا ضرورت ہے اقبالؒ ہی کو لے لیجئے قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک اور خصوصاً سالِ اقبال کے دوران ہمارے محققین اور نقادوں نے انتہائی ناساعد حالات کے باوجود اقبال کے فن اور شخصیت پر جتنا کچھ لکھا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے ناساعد حالات کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ ان محققوں اور نقادوں کے پاس سوائے ایک قینچی اور ایک پبلشر کے کچھ نہیں تھا اور یوں یہ لوگ اپنی اپنی ذات میں ایک ادارہ بلکہ سرکاری ادارہ ثابت ہوئے۔ مگر دیکھ لیجئے اس کے باوجود اقبالؒ پر کوئی نئی بات کہنے کی ابھی کتنی گنجائش موجود ہے۔ اسی طرح پاکستانی ثقافت پر کیا کچھ نہیں لکھا گیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے کیسے کیسے جغادری دانشوروں کے لیکچر نشر کئے گئے اور کتنے عظیم الشان پیمانے پر سیمینار منعقد ہوئے بلکہ حلقہ اربابِ ذوق لاہور کے چھوٹے سے پلیٹ فارم سے آج سے سات آٹھ برس پیشتر ڈیڑھ دو لاکھ روپے کی لاگت سے ثقافت پر جو سیمینار منعقد کیا گیا۔ وہ تو بین الاقوامی حیثیت کا حامل تھا کیونکہ اس کی تفصیلی کارروائی ریڈیو ماسکو سے نشر کی گئی تھی۔ مگر نتیجہ آپ کے سامنے ہے، یعنی پنچوں کے فیصلے کے باوجود پرنالہ وہیں کا وہیں ہے۔ ایک پجاری روزانہ دفتر جانے سے پہلے اپنے کمرے میں بنی مورتی کی پوجا کرتا۔ اس کے گلے میں ہار ڈالتا اور اس کے پاس لوبان جلاتا۔ مگر جب وہ دفتر چلا جاتا تو اس پجاری کا چھوٹا بھائی ایک پرانا سوکھا ہوا جوتا نکالتا اور گن کر سات جوتے اس مورتی کے سر پر مارتا۔ ایک روز پجاری کو خواب میں وہ مورتی دکھائی دی اس نے اسے بتایا کہ تمہارا بھائی میرے ساتھ روزانہ یہ سلوک کرتا ہے، اسے منع کر لو نہیں تو میں تمہاری ٹانگ توڑ دوں گی۔ پجاری یہ سن کر حیران ہوا۔ اور اس نے کہا "میں تو تمہارا ماننے والا، تم میری ٹانگ کیوں توڑو گی۔ ٹانگ توڑنی ہے تو میرے بھائی کی توڑو" اس پر مورتی نے کہا "میں اس کی ٹانگ کیسے توڑ سکتی ہوں، وہ تو مجھے مانتا ہی نہیں ہے!" سو ثقافت کے ضمن میں بھی ہمارے بھائی بندوں نے یہی رویہ اپنایا ہوا ہے، ایک اس کی پوجا کرتا ہے اور دوسرا اسے جوتے مارتا ہے ثقافت کو بت بنا کر اس کی پوجا کرنیوالا کو ہم کیا کہیں اور اسی طرح وہ جو صبح شام اٹھتے بیٹھتے ثقافت کو جوتے مارتے ہیں، ان کا ہم کیسے کچھ بگاڑیں کہ وہ تو اسے مانتے ہی نہیں!

ایسے یہ سطور لکھتے ہوئے اندازہ ہوا ہے کہ پاکستانی ادب کی بات تو بیچ ہی میں رہ گئی ہے علامہ اقبال کا موضوع ہو، ثقافت کی بات ہو یا پاکستانی ادب کا مسئلہ ہو۔ اصل بات بیچ ہی میں رہ جاتی ہے کیونکہ ان موضوعات پر گفتگو کرتے وقت ہمارے پاس کہنے کی اور بہت سی باتیں ہوتی ہیں، جن میں بیشتر کا ان موضوعات سے جائز تعلق نہیں ہوتا۔ بہرحال پاکستانی ادب پر گفتگو کرتے ہوئے خلط مبحث کے لیے بہت سے سوال اٹھا سکتا ہوں مثلاً یہ کہ ادب تو ادب ہوتا ہے اسے پاکستانی، ہندوستانی امریکی اور روسی خانوں میں بانٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ ضرورت تو واقعی کوئی نہیں مگر کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو ہماری ضرورتوں کا خیال رکھے بغیر اپنے آپ ہو جاتے ہیں اور پاکستانی ادب بھی کچھ اسی قسم کی چیز ہے، چنانچہ امریکہ اور روس کا ذکر تو چھوڑیئے، پاکستان اور بھارت ہی کی مثال کو لیجئے ظاہری طور پر کئی مشترک چیزوں کے باوجود، دونوں ملکوں میں ایک ہی زبان میں لکھے جانے والے ادب کے درمیان واضح طور پر ایک حد کھینچی جا سکتی ہے اور یہ پہچان اتنی نمایاں ہے کہ کسی بھی شخص کو مصنفوں کے نام بتائے بغیر اگر پوچھا جائے کہ ان دو تحریروں میں سے پاکستانی ادیب کی تحریر کون سی ہے اور بھارتی ادیب کی کون سی؟ تو یقین جانئے وہ بالکل مشکل میں نہیں پڑے گا، بلکہ زبان اور ڈکشن کے علاوہ مشترک موضوعات بھی اس پہچان کو دھندلا نہیں سکیں گے! مثال کے طور پر انتظار حسین کا مرکزی موضوع ہجرت ہے، جب کہ بھارت میں ادھر سے جانے والے کچھ افسانہ نگار ایسے ہیں جن کا محبوب موضوع بھی ہجرت ہے مگر انتظار حسین کی ہجرت اپنے گمشدہ گلی کوچوں سے گھوم پھر کر بالآخر اسلامی تاریخ کی رہگذر میں کھڑی نظر آتی ہے اور یہی رہگذر پاکستانی ادب کی رہگذر بھی ہے۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پاکستانی ادب کی رہگذر یہی ہے تو پھر گلزار وفا چوہدری اور دوسرے غیر مسلم ادیب جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ تو میرے نزدیک وہ بھی پاکستانی ادب ہے۔ کیونکہ پاکستانی ادب کی ایک کھڑکی اگر مکے مدینے کی طرف کھلتی ہے تو اس کی ایک کھڑکی ان گلی کوچوں کی طرف بھی کھلتی ہے جن میں ہم رہتے ہیں، کیونکہ پاکستانی ادب صرف آسمانی رشتوں نہیں، زمینی رشتوں کا بھی نام ہے۔ چنانچہ اس زمین پر بسنے والوں کے دکھ، ان کی خوشیاں، ان کا رہن سہن سبھی کچھ پاکستانی ادیب کا ورثہ ہے اور یوں یہاں کا ادیب اپنے ایمان اور اپنے ضمیر کی روشنی میں جو کچھ لکھتا ہے وہ پاکستانی ادب ہے کیونکہ یہ وطن حاصل کرتے ہوئے ہم نے کسی کے ایمان اور کسی کے ضمیر کی نفی نہیں کی تھی۔ یہاں ایک وضاحت میں ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ پاکستانی ادب اور محکمہ اطلاعات کے "ادب" میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ پاکستانی ادیب پر یہ ذمہ داری بہرحال عائد ہوتی ہے کہ وہ قوم کو اماوگی میں مبتلا نہ کرے بلکہ انہیں مثبت قدروں کی طرف راغب کرنے والا ادب تخلیق کرے کیونکہ میں ادب کو کوکا کولا کی طرح محض فرحت بخش نہیں سمجھتا اور نہ ہی ادیب اور ملیشئے

کر ایک ہی قبیلے کا فرد سمجھتا ہوں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ادیب کی ذمہ داری کچھ اس کے سوا بھی ہے تاہم محکمہ اطلاعات کے پروپیگنڈا ادب کا پاکستانی ادب سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا ایک "ثبوت" یہ بھی ہے کہ جو ادیب پاکستانی ادب تخلیق کرتے ہیں ان کا نام تاریخ ادب میں بلکہ ڈاکٹر سلیم اختر کی مختصر ترین تاریخ ادب میں بھی آ سکتا ہے اور جو محکمہ اطلاعات کے لیے "ادب" تخلیق کرتے ہیں۔ ان کا نام بالاخر وائٹ پیپر میں آتا ہے!

اور اب آخر میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ پاکستانی ادب کوئی پیٹنٹ پروڈکٹ نہیں ہے جس کی ہول سیل ڈیلری کچھ مخصوص لوگوں کے پاس ہو بلکہ یہ ہمارے ادب کی رگوں میں خون کی طرح رواں ہے چنانچہ مجھے اگر ایک فقرے میں پاکستانی ادب کی تعریف کرنے کو کہا جائے تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ پاکستانی ادب وہ ہے، جو غیر پاکستانی نہیں ہے۔

عطاء الحق قاسمی
۱۵ راگست ۸۳ء

کر
استا

حمد

صلاح الدین محمود

اے نور کے آقا
سیاہ ہوا سورج شب سے
اور چاند بنا
اِک مہکا دریا
تنہائی کے لب سے
اے نور کے آقا
سیاہ شجر نے جذب کیے
طائر اُجلے اُجلائے
اور نئے نئے تارے کے تن میں
ساگر پھوٹا جائے
اے نور کے آقا
لانبے لانبے تن اور شبنم
دریا پار چمکتے
نابینا جسموں کے اندر
بینائی کے سکتے

•

اے نور کے آقا
کیا تم نور ہو آنکھوں کا
یا آنکھیں نور کا نور ہو
کیا ایک صدا
ساکت اجیالا
اجیالا خوش بو

کیا نور تمھارا، صبر شجر کا
دریا کی لاچاری
کیا اسپِ سیاہ، تہمتی بینائی
یا اِک لمحہ جاری

•

پر نور کے آقا
میں نے ہر
شب کی سیرت میں
دیکھے دوہرے چاند
ایک کو میں نے روشن دیکھا
اور دوجے کو ماند،
کیوں میرا اِک بازو ساکت
اور کیوں دوجا ماند
میں نے ہر
شب کی سیرت میں
دیکھے دوہرے چاند
نور کے آقا ـــــ

حمد

سید رضی ترمذی

ترا نام تیرا ہی نام ہے
تری ذات ، اک تری ذات ہے
کہ تری صفات کی حد نہیں
تو بلند لفظ و بیاں سے ، وہم و گماں سے ہے
تو قریب تر رگِ جاں سے ہے
مری زندگی ، مرے روز و شب ترے
سامنے
مرے روز و شب کا یہ اِک تسلسلِ بے سبب
ترے سامنے
مری نارسائی کے درد سے تو ہی آشنا
مری آرزو ، مری جستجو کا مآل سب ترے
سامنے
مرے خشک لب ترے سامنے
مری عرضِ غم ، مری چشمِ نم
مرا بیش و کم
ترے سامنے

○

ترے سامنے یہاں زندگی مجھے کن طویل
مسافتوں سے
گھسیٹتی ہوئی ، کھینچتی ہوئی لائی ہے ،
میں عدم کے دشت کا ایک ذرۂ بے نشاں
کبھی سیلِ وقت میں مثلِ یک خسِ ناتواں
کبھی لامکاں کے سفر میں گُم
کبھی آگہی کی خبر میں گُم
کبھی خود تعاقبِ مرگ میں
کبھی رنجِ زیست سے سرگراں !!

○

مرا اے سمیع و بصیر —
اب ترے سامنے
یہاں جیسے صد ہزار سے ایک لمحۂ جاں گسل
یہ کھڑا ہوں میں
وہی ایک لمحۂ منتقل
جہاں منزلیں ہیں نہ راستے
جہاں کوئی وقت نہ فاصلے
فقط اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے دیکھنا ،
جہاں سوچتے ہوئے سوچنا
کہ یہ خواب میں کوئی خواب ہے
کہ حقیقتوں کا سراب ہے !!
مجھے اس سراب سے
دیکھنے کے عذاب سے
یہاں کون ہے جو نجات دے
وہ ندائے درد جو آج تک کبھی میرے
لب پہ نہ آ سکی
وہ فغاں کہ جیسے سُلگ رہی ہے درونِ جاں

وہ کسی کو کیسے سناؤں میں
وہ جو تیر سا رگِ جاں میں ہے
وہ کسی کو کیسے دکھاؤں میں

○

مرے چار سو ـــــ
یہ تمام شور، یہ انتشار،
گذرتے، لُوٹتے، گرتے وقت کا تار و پو

جہاں دل کو کچھ نہ سجھائی دے
جہاں دیکھتی ہوئی آنکھ کو نہ دکھائی دے
مجھے کون تیرے سوا یہاں
مرے چار سو سے رہائی دے
تو ہی بے نواؤں کا آسرا
تجھے میری چُپ بھی سنائی دے!!

اے ربِّ کائنات

حفیظ الرحمٰن احسن

معمور تیرے نور سے ایوانِ شش جہات
دل پر اُتر رہی ہیں تری آیاتِ بیّنات
اصلِ وجود و مُوجد و خلّاق تیری ذات
اے ربِّ کائنات!

اعماقِ بحر و بر میں بھی تیری تجلّیات
تو مُوجدِ حیات ہے تو خالقِ ممات
شاہد ہیں تیری ذات پہ تیری سبھی صفات
اے ربِّ کائنات

ہر لب پہ تیرے لطف و کرم کی حکایتیں
رحمت ہے تیری اصل میں گلگونہ حیات
بے مدعے رباب ہیں تیری عنایتیں
اے ربِّ کائنات

مفہوم جبر کیا ہے، تو کیا شے ہے اختیار
یہ کائنات کیا ہے، ترا پرتوِ صفات
کس پر ترے رموزِ مشیّت ہیں آشکار
اے ربِّ کائنات

ماضی سے حال، حال سے مستقبل آشکار
توفیقِ خیر تیری عطا، تیرا التفات
سعی و عمل پہ عزت و عظمت کا ہے مدار
اے ربِّ کائنات

غیب و شہود تیرے لیے ایک ہیں سبھی — اپنے کرم سے بھر دے مرا دامن تہی
کیوں کر بیاں ہوں اس دلِ مضطر کے واردات — اے ربِّ کائنات

ہیں بحر و بر فساد کے مسکن بنے ہوئے — ہر سُو ہیں مکر و زُور نے جالے تنے ہوئے
ٹوٹیں گے کب تمدّنِ حاضر کے سومنات — اے ربِّ کائنات

جور و ستم کی گرد سے راہیں اَٹی ہوئی — بارود کے دھوئیں سے فضائیں پٹی ہوئی
کیوں چھا رہی ہے زیست پہ غم کی سیاہ رات — اے ربِّ کائنات

حُسنِ عمل کے نُور سے خالی ہے زندگی — لائی ہے کس مقام پہ انساں کو "آگہی"
کیا دُور ہے کہ اَوج پہ ہے ذوقِ سیّئات — اے ربِّ کائنات

کھِلتے نہیں دلوں میں وہ مہر و دفا کے پھول — دامن کشِ حیات ہیں تزویر کے ببول
دہنِ ظلام پاس ہے جذبوں کی چاند رات — اے ربِّ کائنات

عرفان و آگہی کے اُجالوں کی خیر ہو — توفیقِ خیر چاہنے والوں کی خیر ہو
راسخ رہے دلوں میں ترے شوق کا ثبات — اے ربِّ کائنات

○

بجنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

حفیظ تائب

آمادۂ شر پھر ہیں ستم گر مرے آقا
اُمت کی خبر لے مرے سرور مرے آقا

افغانیوں پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا ہے
خوں ریز ہیں کہسار کے منظر مرے آقا

مسموم و شرر بار ہیں کابل کی فضائیں
مغموم ہیں سب سرو و صنوبر مرے آقا

ہے سطوتِ محمود مسلماں سے گلہ مند
غزنی کا ہر اک ذرہ ہے مضطر مرے آقا

پھر بھیک ہمیں قوتِ حیدرؓ کی عطا ہو
اک حشر بپا ہے پسِ خیبر مرے آقا

فریاد کناں ہیں در و دیوارِ فلسطین!
ہیں نوحہ بلب مسجد و منبر مرے آقا

نبیوں کی زمیں منتظرِ حرفِ اذاں ہے
پہنچے کوئی اسلام کا لشکر مرے آقا

سازش سے یہود و نصاریٰ کی جہاں میں
توحید کے فرزند ہیں بے گھر مرے آقا

صیہونیت افرنگ کے بل پر ہے تنومند
مسلم ترے دم سے ہے تونگر مرے آقا

ہر دورِ پُر آشوب میں اک تیری دُعا ہے
وہ جس سے بدلتا ہے مقدّر مرے آقا

توفیقِ جہاد اُمتِ آخر کو بھی مل جائے
طاغوت صف آرا ہے جو کھل کر مرے آقا

پھر غلبۂ اسلام ہو آفاق میں ہر سُو
تائب کو یہ حسرت ہے برابر مرے آقا

نعتِ رسولِ پاکؐ

صلاح الدین محمود

لوہو کی انجان نگر
کے پرے سمندر خو کا
ان کی مہک سپیدہ جیسی
طائر اِک خوش بو کا

ان کا بدن شجر کی سیرت
جو خود ہی اُگتا ہو
خود اُگتے اس بن میں بولے
مور میرے لوہو کا

تم سجدہ، تم پیشانی
تم چٹیل میداں کا خم
جس کے پرے نرا اِک جنگل
بارش کے قابو کا

بے قابو، ہم بے قابو
کیا اُس حیراں کا لمحہ
جس نے سُنا شجر میں جلتے
شعلہ میٹھی خو کا

تم دوہرے تاروں کے باسی
مجھ میں دوہرا دریا
ایک اکہری رنگت لب کی
اور لہجہ آہو کا

کیا مجھ میں اِک آئینہ گم
جس کے پرے سمندر
کیا پانی کی شنوائی میں
عکس میرے پہلو کا

کیا تم کو میں ان آنکھوں سے
اس باڑ میں پاؤں
کیا تم خود زینے آؤ
یا میں آئینے جاؤں

تم میری آنکھوں کے بانی
میرے لب کا بچپن
میری راتوں کے طائر میں
لمحہ تم خوش بو کا

لوہو کی انجان نگر
کے پرے سمندر خو کا

صلاح الدین پرویز

رسول اللہؐ کے نام ایک خط

ادھر ایک شب سے
عجیب شک ہے!
کہ میری آنکھوں کی جلوتوں میں بنام خلوت
کوئی ایک مکتوب لکھ رہا ہے
گرامی!
تو چیزے دیگری
راز داں عجب ہے
کہ میں،
کوئی عالی نسب نہیں ہوں
مگر تیرے شجرے میں جڑ گیا ہوں
دکھوں کی چادر، بدن پہ اوڑھے
کہیں کہیں تجھ میں سو گیا ہوں
گرامی!
تو صاحب راز کیا ہے۔
تیرا چہرہ تو کندن ہے، اک نگینہ ہے
اور آسماں پہ قمر کا پرندہ چھپا پھر رہا ہے۔
ادھر ایک شب سے
عجیب شک ہے!
کہ میں شمس ہوں
اور تجھ میں طلوع ہو رہا ہوں.......!!!

سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم

غلام رسول ازہر

اشکِ خونناب سے گلرنگ ہے چشمِ عالم
زمزمۂ تارِ رگِ جاں سے کروں نعت رقم

سیّدِ کون و مکاں، نازشِ جاں، فخرِ امم
غایتِ لوح و قلم، عظمتِ نوعِ آدم

شش جہت جس کے کھُلے رحمت و رافت کے علم
نام نامی ہی فقط جس کا ہے اسمِ اعظم

جس کے فرمان جلی، حصنِ حصین محکم
جس کی تحدیث ہے آئینۂ اسلوبِ حِکم

جس کے دروازے پہ سر سارے سلاطین کے خم
فقر سے جس کے خجل قیصر و کسریٰ و جم

وہ عزیزوں کا بُلانا چاہنے والا ہر دم
مضطرب رکھتا تھا ہر آن جسے غیر کا غم

غمزدوں اور یتیموں کا وُہ مولائے نعم
بےکسوں اور غلاموں کا وہ سلطانِ شیم

جس کے یارانِ صفا، بتشۂ دیں کے ضیغم
جن کی ہیبت سے مسخر ہوئے عالم عالم

وہ ادب گاہ جہاں شہپرِ جبریل ہیں خم
ہر طرف صَلِّ عَلیٰ، صَلِّ عَلیٰ کی سرگم

لامکاں جلوہ نما ذاتِ خدا، شانِ کرم
چشمِ انجم نے بھی دیکھا ہے یہ عالم کم کم

وہ تراشہ کرم، چشمِ تمنا کا حرم
جس پہ رحمت کی گھٹا جھوم کے برسے چھم چھم

خُلقِ قرآن ہے جس کا وہ نبیِ مُلہَم
جس کے اُسوہ میں نہاں رازِ نجاتِ آدم

راہِ حق ہی میں اُٹھے جتنے اُٹھے اس کے قدم
دمبدم جس نے لیں آزار اُٹھائے پیہم

لاالٰہ جس کی صدا، کان میں آئے ہر دم
چار اکناف میں پھر جس سے گریں سارے صنم

وہی محسن، وُہی منقاد و مُطاع و مُنعم
جس کا منشور ہے منشورِ فرازِ آدم

حُسنِ تقویٰ سے بشر نزدِ خدا ہے اکرم
کوئی تخصیص نہیں، اہلِ عرب ہو کہ عجم

کوئی احمر ہو کہ ابیض ہو کہ اسود، ہمدم
حُسنِ اعمال پہ قائم ہے مقامِ آدم

[illegible] توریت [illegible] کی تنزیل سے جو ہے پیہم
ذاتِ اقدس ہے فقط ذاتِ خدا کی محرم

جس کا قرآں مصدق ہو وہ سرخیلِ امم
آپ انجیل بھی دے جس کی خبر وہ ملہم

سارے نبیوں کا وہ سرتاج وہ فخرِ آدم
جس کا رحمت ہے لقب، سرورِ ہر دو عالم

نبضِ ہستی کی عجب چال ہے مدّھم مدّھم
زندگی موت کے دریا میں ہو جیسے مدغم
چُور زخموں سے بدن، تارِ رگِ جاں برہم
کوئی رکھے تو کہاں زخموں پہ اپنے مرہم
ایک آشوبِ جہاں جس میں گرفتار ہیں ہم
اب تو مایوس نظر آتے ہیں ابنِ مریم
ڈھونڈتے پھرتے ہیں سب آج ترا نقشِ قدم
سب ہیں دیوانے بنے پھرتے، رسولِ اکرمؐ
رابعہؒ کوئی، تو ہے کوئی فضیلؒ و ادھمؒ
نام تیرا ہی چلے دہر میں یہ بہ تجسیم
ہم فقیروں کا تری ذات سے قائم ہے بھرم
دل کے قلزم میں ہے صد نیل و فرات و جہلم
چوبِ نے نغمۂ داؤد کو دیتی ہے جنم
شعلۂ تارِ نفس ہی سے ہیں دیپک پنچم

یک نظر ہم پہ بھی اے سیدِ ساداتِ اُمم
جس نے بخشے ہیں غلاموں کو سلاطیں کے عَلَم
ہم پہ احسان ہو، احسان، رسولِ اکرمؐ
ایک مدّت سے ہیں ہم، منتظرِ چشمِ کرم
شب گزیدہ ہیں، ہوئی ہم پہ بہت یورشِ غم
زندگی دَم سے ہے بیزار، رمق اس میں نہ رم
خشک ہے کِشت، نہ مٹی میں ہے اگلا سا وہ نم
ہم کڑی دھوپ میں ہیں ہم پہ برس، ابرِ کرم
یک نگہ خاصۂ خاصانِ رسل، بہرِ کرم
آج پھر ہم پہ کڑا وقت ہے اے شاہِ اُمم
ہم ہیں رنجور، پریشان، شکستہ، بے دَم
ہم پہ ہو لطف و کرم، لطف و کرم، لطف و کرم
تا بہ کے ڈوبے ستاروں کا کریں ہم ماتم
تا بہ کے نوش کریں تلخیِ ایام کا سم

تیرا اعجاز ہے اے میرِ عربؐ، میرِ عجمؐ
جس سے کنجشک کے سینے میں ہے شہباز کا دم
سر بکف وقتِ وغا جوششِ عمل سے پیہم
وہ بڑھے سارے شہیدانِ وفا برق قدم
ہیں ستاروں سے پرے جن کے مقاماتِ اہم
جس پہ ہے آیۂ "والنجم" دلیلِ محکم
نٓ و حٰمٓ ہے یٰسٓ ہے تو قٓ و قلم
جز خدا نام ترے کیسے کرے کوئی رقم
پھیر دے قافلۂ وقت کو پھر سوئے حرم
پھر دکھا اَبلقِ ایام کا اگلا سا وہ رم

رشتۂ عمرِ ترا بر بدنم بافتہ ام
ہر بُنِ موئے تنم شعلہ بجاں یافتہ ام

علی اکبر عبّاس

نعت

آٹھ آئینوں کی پرتوں میں اِک تیری تصویر
سارے حرف ہیں اسم اُسی کا لفظ اُس کی تفسیر

سارے عہد زمانے تیرے اِک پل کے مظروف
ساری شان گمان ہے تیرے جلوے کی جاگیر

ہر ہر جسم ہے بردہ تیرا رُوح کنیز تیری
تیری دید کی آس میں ہر اِک آنکھ بصیر

تیرے بخشندہ احساسوں پتھر بھی انسان؛
تیری ایک حکیمی نظر دوں خاک ہوئی اکسیر

تیرے عِلم کی رُوح سے یہ سارے عِلم علوم
تیرے روشن سینے صدقے ہے ان کی تنویر

جعفر بلوچ

نعت

ادب شرط ہے یہ سخن عامیانہ نہیں ہے
یہ ہے نعت کوئی غزل یا فسانہ نہیں ہے

قلم سر جھکاتا ہے اپنا درِ مصطفےٰؐ پر
یہاں بات کوئی سخن گسترانہ نہیں ہے

مَیں کیوں معجزاتِ نبوّت کے موتی نہ رولوں
بَلا سے اگر خوش نظر یہ زمانہ نہیں ہے

وہ اپنے تئیں اب ہیں شرعِ پیمبر کے وارث
ادا جن میں کوئی بھی پیغمبرانہ نہیں ہے

بھلا عام کیسے ہو خُلقِ عظیمِ پیمبر
کہ واعظ کی تبلیغ ہی دلبرانہ نہیں ہے

غلاماں غلامِ شہنشاہِ کونینؐ ، جعفر
رہینِ نشیب و فرازِ زمانہ نہیں ہے

ڈاکٹر ظفر علی راجا

کچھ آبلہ پا لوگ ہیں ہجرت کے سفر پر

اے گنبدِ خضرا کے حدی خوان کبوتر
تجھ پر تو مہرباں ہیں بہت شافعِ محشر
نغمے ہیں ترے مسجدِ نبویؐ کی فضا میں
خوشبو ہے تری خانۂ کعبہ کی ہوا میں
حاصل ہے تجھے سرورِ کونینؐ کی صحبت
ہمدوشِ ثریا ہے ترا رتبہ و عزت
مقبول تری عرشِ معلیٰ پہ دعا ہے
تو نعت بہ لب ارضِ مقدس میں رہا ہے

اے گنبدِ خضرا کے حدی خوان کبوتر!
کہیو مرے مولا کی حضوری میں یہ جب کر
افغان کیمپوں پہ برستے ہیں اندھیرے
پامال ہیں ہنستے ہوئے غنچوں کے بسیرے
پلکوں کی گھنی چھاؤں تلے اشک رواں ہیں
آنکھوں کے دریچوں میں مگر عزم جواں ہیں
کچھ آبلہ پا لوگ ہیں ہجرت کے سفر پر
سینوں سے لگائے ہوئے پیغامِ پیمبرؐ

ہر وقت رہیں شوقِ شہادت میں وضو سے
جلتی ہوئی گولی کو کریں سرد لہو سے
خیموں کی خبر ہے نہ کوئی سر پہ ردا ہے
افغان زمیں ہے کہ نئی کرب و بلا ہے

تجھ پر تو مہرباں ہیں بہت شافعِ محشر
کہیو مرے مولاؐ کی حضوری میں یہ جا کر
ریچھوں کے لشکر یہ چمن لوٹ رہے ہیں
لادین گڈریئے یہ وطن لوٹ رہے ہیں
ملت کے جو ہونٹوں پہ ہے فریاد وہ کہیو
اس خطۂ بیداد کی امداد کو کہیو
اے گنبدِ خضرا کے حدی خوان کبوتر
اے گنبدِ خضرا کے حدی خوان کبوتر

افسانے

بَین

احمد ندیم قاسمی

بس کچھ ایسا ہی موسم تھا میری بچی، جب تم سولہ سترہ سال پہلے میری گود میں آئی تھیں۔ بکائن کے اودے اودے پھول اسی طرح مہک رہے تھے اور بیریوں پر گلہریاں، تنے سے چوٹی تک اسی طرح جاگی پھرتی تھیں، اور ایسی ہوا چل رہی تھی جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی۔ جب تم میری گود میں آئی تھیں تو دیے کی کالی پیلی روشنی میں اونگھتا ہوا کوٹھا چمکنے سا لگا تھا اور دایہ نے کہا تھا کہ ہائے ری، اس چھوکری کے تو انگ انگ میں جگنو ٹکے ہوئے ہیں! اس وقت میں نے بھی درد کے خمار میں اپنے جسم کے اس ٹکڑے کو دیکھا تھا اور مجھے تو یاد نہیں پر دایہ نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں مسکرا کر، تمہارے چہرے کی دمک میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کوئی خط پڑھتا ہے۔

اگلی رات جب تمہارے بابا نے موقع پا کر تمہیں دیکھا تھا تو اداس ہو گیا تھا۔ اور میں نے کہا تھا، "تم تو کتنے نھے بیٹا ہو یا بیٹی سب خدا کی دین ہے۔ پھر اب کیوں منہ لٹکا لیا ہے" اور اس نے کہا تھا، "تو نہیں جانتی نا بھولی عورت۔ تو ماں ہے نا۔ تو کیسے جانے کہ خدا اتنی خوبصورت لڑکیاں صرف ایسے بندوں کو دیتا ہے جن سے وہ بہت خفا ہوتا ہے" اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ میں تمہارے بابا کی آنکھیں اس کی کھوپڑی میں سے نکال کر باداموں کی طرح توڑ دوں کیونکہ میری جان، وہ تو تمہیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے چڑیا سانپ کو دیکھتی ہے۔ وہ تمہاری خوبصورتی دیکھ کر ڈر گیا تھا اور پھر اس نے اپنی عمر کے سولہ سترہ سال تم سے ڈرتے ڈرتے گزار دیئے۔ وہ اب بھی ڈرا اور سہما ہوا، باہر گلی میں بچھی ہوئی چٹائیوں پر، لوگوں میں گھرا بیٹھا ہے اور آسمانوں کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے کوئی اس کی طرف آ رہا ہے۔

تم مجھ پر تو نہیں گئی تھیں میری بچی۔ میں تو گاؤں کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ میرا ناک نقشہ بالکل سیدھا سادا تھا۔ ہاں تم اپنے بابا پر گئی تھیں جو بہت خوبصورت تھا۔ وہ تو اب بھی خوبصورت ہے پر اب اس کی خوبصورتی سولہ سترہ سال کی گرد سے اٹ گئی ہے۔ اب بھی اس کی بڑی بڑی چیروں میں،

بادامی آنکھیں ہیں اور اب بھی اس کے چہرے اور مونچھوں کے رنگ میں سونا ہے پر جب تم پیدا ہوئی تھیں نا تو وہ بالکل مورت تھا۔ تم آئیں تو وہ ڈر گیا تھا مگر اس ڈر نے اس کی شکل نہیں بدلی۔ بس ذرا سی بجھا دی۔ تمہارے آنے کے بعد میں نے اس کے موتیوں کے سے دانت بہت کم دیکھے اس کے پنکھڑی ہونٹ ہمیشہ یوں بھینچے رہے جیسے کھلے تو کچھ ہو جائے گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ آیا اور اس نے نہیں دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی بہت بڑے محل کی بنیادیں بیٹھ رہی ہیں وہ یہاں کھڑے کھڑے ہی ایک دم اندر سے بوڑھا ہو گیا جب وہ پلٹا تو میں ڈری کہ وہ گلی تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو جائے گا۔ مگر ابھی ابھی میں نے دیوار پر سے جھانکا ہے تو وہ گلی میں بیٹھا ہے اور جمع ہوتے ہوئے لوگوں کو یوں ڈر ڈر کر، چونک چونک کر دیکھ رہا ہے جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔

تم جب تین چار سال کی ہو کر بھاگنے دوڑنے لگیں تو دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ مٹی کا بنا ہوا انسان اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے۔ ایک بار تم گر پڑیں اور تمہارے ماتھے پر چوٹ آئی تو میں تو روتے روتے نڈھال ہو گئی پر تمہارے بابا نے جھک کر کہا تھا: "خدا جو بھی کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ ہماری رانو بیٹی کے ماتھے پر چوٹ کے نشان نے اس کی خوبصورتی کو داغدار کر دیا ہے۔" پر خدا کو تو کچھ اور منظور تھا۔ چوٹ کا نشان تو باقی رہ گیا مگر یہ نشان بالکل ننھے منے چاند کا سا تھا۔ لال لال سا بھی اور سنہرا سنہرا سا بھی، جواب میری جان، پیلا پیلا سا لگ رہا ہے۔

پھر جب تم پانچ سال کی ہوئیں تو میں نے قرآن شریف پڑھانے کے لئے تمہیں بی بی جی کے پاس بٹھا دیا۔ تب پتہ چلا کہ تمہاری آواز بھی تمہاری طرح خوبصورت ہے۔ بی بی جی کے گھر کی دیواروں کے اندر سے قرآن شریف پڑھنے والی بچیوں کی آوازیں آتی تھیں تو ان میں سے میری رانو بیٹی کی آواز صاف پہچانی جاتی تھی۔ تمہاری آواز میں چاندی کی کٹوریاں بجتی تھیں۔ ایسی کھنک کہ تم چپ بھی ہو جاتی تھیں تو جب بھی چار طرف سے جھنکار سی اٹھتی رہتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ پہلے تم آیت پڑھتی تھیں اور تمہارے بعد تمہاری ہم سبقوں کی آوازیں آتی تھیں۔ یوں جب تم اکیلی پڑھ رہی ہوتی تھیں تو گلی میں سے گزرنے والوں کے قدم رک جاتے تھے اور چڑیوں کے غول منڈیروں پر اتر آتے تھے۔ ایک بار مزار سائیں دولے شاہ جی کے مجاور سائیں حضرت شاہ ادھر سے گزرے تھے اور تمہاری آواز سن کر انہوں نے کہا تھا — یہ کون لڑکی ہے جس کی آواز میں ہم فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن رہے ہیں! — اور جب تمہیں معلوم ہوا تھا کہ سائیں حضرت شاہ نے تمہارے بارے میں یہ کہا ہے تو تم اتنی خوش ہوئی تھیں کہ رونے لگی تھیں۔

تب یوں ہوا کہ عورتیں پانی سے بھرے ہوئے برتن لائیں اور تمہاری تلاوت ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتیں۔ تم قرآن پاک بند کر کے اٹھتیں اور "طفیل سائیں دولے شاہ جی" کہتی ہوئی، ان برتنوں پر

دھوو۔ کرنیں اور عورتیں یہ پانی اپنے عزیزوں کو پلاتیں تو بیمار اچھے ہو جاتے۔ بڑے نیک ہو جاتے۔ بے نماز نمازی ہو جاتے!

ان دنوں مجھے یوں لگنے لگا جیسے تم نور کی بنی ہوئی تو خیر ہمیشہ سے تھیں پر اب تم بی بی جی کے ہاں سے واپس گھر میں آئیں تو تمہارے چہرے پر میری نظریں نہ جم پاتیں۔ جیسے سورج پر نظر نہیں جمتی۔

خدا اور رسولؐ کے بعد تم سائیں دولھے شاہ جی کا نام جپتی رہتی تھیں۔ اسی لئے تو تمہارا بابا ایک بار تمہیں سائیں دولھے شاہ جی کے مزار پر سلام بھی کرا لایا تھا۔

قرآن شریف تم نے اتنا پڑھا میرے جگر کی ٹکڑی! کہ اب بھی جب چار طرف سناٹا ہے اور صرف ادھر اُدھر سے سسکی کی آواز آ جاتی ہے، میں تمہارے آس پاس، تمہاری ہی آواز میں قرآن شریف کی تلاوت سن رہی ہوں۔ تمہارے ہونٹ تو نہیں ہل رہے، پر میں اپنے دودھ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ آواز تمہاری ہے۔ زمین پر ایسی نورانی آواز میری رانو کے سوا اور کس کی ہو سکتی ہے۔

ایک دن جب تمہارے چاچا دین محمد کی بیوی اپنے بیٹے کے لئے تمہارا رشتہ پوچھنے آئی تو تب مجھے معلوم ہوا کہ تم شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔ مائیں تو بیٹی کے سر پر چنی لیتے ہی سمجھ جاتی ہیں کہ وقت آ رہا ہے پر تمہارے بارے میں تو میں سوچ ہی نہ سکی۔ تم نے سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔ میں نے تمہارے بابا سے اپنی اس بے خبری کی بات کی تو وہ بولا "تو تو سدا کی بے خبری ہے پر میں ایسا بے خبر نہیں ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے لڑکی سے ڈر لگتا ہے اس سے بھی تو بات کرو۔ اس نے تو جیسے اپنا سب کچھ مولا کی راہ میں تج دیا ہے"

تب پہلی بار مجھے بھی تم سے خوف آیا۔ میں نے سوچا اگر میں نے تم سے رشتے کی بات کی تو کہیں تم جلال میں نہ آ جاؤ۔ مگر پھر اسی شام کو سائیں حضرت شاہ کا ایک خادم آیا اور اس نے بتایا کہ کل سے سائیں دولھے شاہ جی کا عرس ہے جو تین دن تک چلے گا اور سائیں حضرت شاہ نے خواب میں سائیں دولھے شاہ جی کو دیکھا ہے اور یہ فرماتے سنا ہے کہ میری چیلی رانو کو بلا کر تین دن تک اس سے میرے مزار پر قرآن شریف کی تلاوت کراؤ ورنہ سب کو بھسم کر دوں گا۔ تم جانتی تھیں بیٹی کہ سائیں دولھے شاہ جی بڑے جلال والے سائیں تھے۔ زندگی میں جس نے بھی ان کے خلاف کوئی بات کی، اسے بس ایک نظر بھر کر دیکھا اور راکھ کر ڈالا۔ مرنے کے بعد بھی ان کی درگاہ میں یا اس کے آس پاس کوئی برا کام یا بری بات ہو جائے تو ان کا مزار شریف سرہانے کی طرف سے کھل جاتا ہے اور اس میں سے ان کا دست مبارک بلند ہوتا ہے۔ برا کام یا بری بات کرنے والا جہاں بھی ہو کھنچا چلا آتا ہے۔ اپنی گردن سائیں جی کے دست مبارک میں دے دیتا ہے اور پھر وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ سائیں جی کا دست مبارک واپس مزار شریف میں چلا جاتا ہے اور مزار شریف کی دراڑیں یوں مل جاتی ہیں جیسے کبھی کھلی ہی نہیں تھیں

کس کی مجال تھی کہ سائیں دولھے شاہ جی کا حکم ٹالتا۔ دوسرے دن صبح کو ہم تینوں ایک اونٹ پر کجاوے

میں بیٹھے تھے اور درگاہ سائیں دولے شاہ جی کی طرف جا رہے تھے میں کجاوے کے ایک طرف تھی اور تم میری جان، دوسری طرف تھیں اور درمیان میں اونٹ کے پالان پر تمہارا بابا بیٹھا تھا۔ اونٹ جونہی اٹھا تھا اور چلنے لگا تھا تو تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی، اور میری پاک اور نیک بچی، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ہمارا اونٹ جہاں سے بھی گزرتا تھا، لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور رو رہے تھے اور سبحان اللہ کہہ رہے تھے اور کجاوے کے اوپر چڑیوں اور ابابیلوں اور کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے تھے اور غوطہ لگا کر جیسے میری بچی کی آواز کا شربت پی کر ناچتے تیرتے ہوئے دور نکل جاتے تھے اور میں سوچتی تھی کہ یہ ہم گنہگاروں کی کس نیکی کا بدلہ ہے کہ خدا نے ہمیں ایسی بیٹی بخشی ہے جو زمین پر قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہے تو اسکی آواز آسمان تک جاتی ہے۔ آسمان کا خیال مجھے یوں آیا تھا کہ ایک بار تمہارے بابا نے پالان پر سے جھک کر میرے کان میں ہولے سے کہا ـــــ اوپر دیکھو۔ یہ کیسے نورانی پرندے ہیں جو ہمارے ساتھ ساتھ اڑ رہے ہیں۔ میں نے ان علاقوں میں ایسا پرندہ کبھی نہیں دیکھا کہ ان کے پروں میں ستارے چمکتے ہوں۔ یہ تو آسمانوں سے اتر کر آنے والے فرشتے معلوم ہوتے ہیں! ـــــ اور میری آنکھوں کا نور بچی، میں تمہاری جاہل ماں بھی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ وہ فرشتے ہی تھے ـــــ کچھ ایسے جیسے ننھے منے بچوں کے پر لگ گئے ہوں اور وہ ہوا میں ہمکتے پھرتے ہوں ـــــ وہ میری پہنچی ہوئی بیٹی سے تلاوت سننے آتے تھے۔

پھر جب درگاہ سائیں دولے شاہ جی کے پاس ہمارا اونٹ بیٹھا تھا تو جیسے تم بھول گئی تھیں کہ تمہارے ساتھ تمہارے ماں باپ بھی ہیں۔ تم مزار شریف کی طرف یوں کھنچی چلی گئی تھیں جیسے سائیں دولے شاہ جی تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں اپنے گھر لئے جا رہے ہوں۔ مزار شریف کو بوسہ دے کر اور اس کے ایک طرف بیٹھ کر تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی اور تمہاری آواز کی مٹھاس چکھنے کے لئے عرس پر آنے والے لوگ مزار شریف پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ہم دونوں نے مزار شریف کو اپنی پوروں سے چھوا اور پھر اپنی پوریں چوم لیں۔ پھر ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں ان کے زانوؤں کو چھوتے اور دست مبارک کو چومنے پہنچے تھے اور انہوں نے فرمایا تھا: "اپنی بیٹی کو سائیں جی کے قدموں میں بٹھا کر تم نے اپنے اگلے پچھلے گناہ معاف کرائے ہیں۔ تم انشاء اللہ جنتی ہو۔" یہ سن کر خوشی سے ہماری سانسیں پھول گئی تھیں۔ پھر میں نے اندر جا کر بی بیوں کو سلام کیا تھا اور تمہیں ـــــ میری جان ـــــ سائیں دولے شاہ جی اور سائیں حضرت شاہ اور ان کے گھرانے کی بی بیوں کی امانت میں دے کر ہم دونوں یہ کہہ کر واپس گاؤں آ گئے تھے کہ عرس کے تین دن گزرنے کے بعد اگلے روز ہم اپنی اس نعمت کو لینے حاضر ہو جائیں گے جو خدا نے اور اس کے حبیب پاک نے ہم غریبوں گنہگاروں کو ہماری کسی سیدھی سادی نیکی سے خوش ہو کر بخشی ہے۔

اے میری بچی، اے میرے جگر کی ٹکڑی، اے میری صاف ستھری رانو بیٹی! پھر جب تین دنوں کے بعد ہم دونوں سائیں دولے شاہ جی کے مزار شریف پر گئے تھے تو تم وہیں بیٹھی تھیں جہاں ہم تمہیں بٹھا گئے تھے، مگر کیا یہ تمہی تھیں؟ تمہاری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں پر جمے ہوئے خون کی پپڑیاں تھیں، تمہارے بال الجھ رہے تھے۔ چادر تمہارے سر سے اتر گئی تھی مگر اپنے بابا کو دیکھ کر بھی تمہیں اپنا سر ڈھانپنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ تمہارا رنگ مٹی مٹی ہو رہا تھا اور ہمیں دیکھتے ہی تم چلا پڑی تھیں ــــــ "مجھ سے دور رہو بابا۔ میرے پاس نہ آنا اماں۔ میں اب یہیں رہوں گی۔ میں اس وقت تک یہیں رہوں گی جب تک سائیں دولہا شاہ جی کا مزار شریف نہیں کھلتا اور اس میں سے ان کا دست مبارک نہیں نکلتا۔ جب تک فیصلہ نہیں ہوتا میں یہیں رہوں گی۔ جب تک انصاف نہیں ہوگا میں یہیں رہوں گی اور مزار شریف کھلے گا۔ آج نہیں تو کل کھلے گا۔ ایک مہینہ بعد، ایک سال بعد، دو سال بعد سہی، پر مزار شریف ضرور کھلے گا اور دست مبارک ضرور نکلے گا۔ تب میں خود بھی اپنے بابا اور اپنی اماں کے قدموں میں چلی آؤں گی اور ساری عمر ان کی جوتیاں سیدھی کروں گی اور ان کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ پر اب میں نہیں آؤں گی۔ اب میں نہیں آ سکتی۔ میں بندھ گئی ہوں۔ میں مر گئی ہوں۔" پھر تمہیں ایک دم بہت سا رونا آ گیا تھا مگر تم نے ایک دم اپنے آنسو روک لئے تھے اور تم بھیگی ہوئی آواز میں تلاوت کرنے لگی تھیں۔ آس پاس کھڑے ہوئے بیسیوں لوگ ہمارے ساتھ زار زار رونے لگے تھے اور کہنے لگے تھے۔ "اثر ہو گیا ہے۔ دن رات مزار شریف پر رہنے سے اس پر اثر ہو گیا ہے۔"

تمہارے بابا نے فریاد کی تھی۔ "اثر ہو گیا ہے؟ دن رات قرآن شریف کی تلاوت کرنے والی لڑکی پر کوئی اثر کیسے ہو سکتا ہے اور اگر تم کہتے ہو کہ اثر ہو گیا ہے تو سائیں حضرت شاہ کہاں ہیں؟" وہ روتا ہوا سائیں حضرت شاہ کی طرف چل پڑا تھا اور میں بلکتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ مگر ہمیں خادموں نے بتایا تھا کہ سائیں جی تو عرس کے فوراً بعد ایک حجرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور کئی دنوں تک وظیفہ فرماتے ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ پھر میں نے اندر بی بیوں کے پاس جانا چاہا تھا مگر بڑے دروازے پر خادماؤں نے بتایا تھا کہ رانو کی حالت سے بی بیاں پہلے ہی بہت پریشان ہیں اور انہیں اور زیادہ پریشان کرنا گناہ ہے۔

ہم پھر لپک کر مزار شریف کی طرف گئے تھے مگر اب کے میری بچی، تم نے ہمیں دیکھا تو تمہیں جلال آ گیا تھا اور تم نے اتنے زور سے چیخ کر کہا تھا کہ "تم چلے کیوں نہیں گئے" کہ مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ چیخ اس حلق سے نکلی ہے جس نے تلاوت کے سوا کبھی کچھ کیا ہی نہیں۔

ہم اجڑے پجڑے ماں باپ، مزار شریف سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے تھے اور رو رہے تھے اور لوگ ہمیں روتا دیکھ کر رو رہے تھے کہ سائیں حضرت شاہ کا خاص خادم آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ سائیں جی کو بھی رانو کی اس حالت کا بڑا دکھ تھا اور انہوں نے فرمایا تھا کہ یہ لڑکی اچانک جن

بھوت کے قبضے میں چلی گئی ہے اور سائیں حضرت شاہ ایک خاص وظیفہ فرما رہے ہیں کہ یہ جن اترے تو اس امانت کر اس کے ماں باپ تک پہنچایا جائے۔ پھر حکم ہوا تھا کہ تم جاؤ اور راتو کو درگاہ شریف کی نگرانی میں رہنے دو۔

"اب تم جاؤ" ہمارے سروں پر تمہاری آواز آئی تھی اور ہم نے سر اٹھا کر دیکھا تھا کہ تمہاری آنکھیں تالابوں کی طرح بھری ہوئی تھیں "اب تم جاؤ میرے بابا۔ جاؤ میری اماں۔ اب تم جاؤ۔ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دست مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہوگا۔ فیصلہ ہو جائے تو میں سیدھی تمہارے پاس پہنچوں گی۔ سائیں دولھے شاہ جی خود مجھے تمہارے پاس چھوڑ جائیں گے۔ اب تم جاؤ"۔۔۔ یہ کہہ کر تم مزار شریف کی طرف پلٹ گئی تھیں اور تم چلتے ہوئے یوں ڈول رہی تھیں جیسے کٹی ہوئی پتنگ ڈولتی ہے۔

میں تم پر سے صدقے جاؤں میری بیٹی۔ ہم تمہارے ماں باپ اس کے بعد بھی بار بار تمہارے پاس پہنچے مگر اب تو تم ہمیں پہچانتی بھی نہیں تھیں۔ ہم تمہیں پکارتے تھے تو تم ہماری طرف یوں خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی تھیں جیسے حیران ہو رہی ہو کہ یہ آواز کدھر سے آتی ہے۔ تمہارا رنگ خاکستری ہو گیا تھا۔ تمہارے ہونٹ اکثر کر پھٹ گئے تھے۔ تمہارے بالوں میں گرد تھی اور تنکے تھے اور ٹوٹے ہوئے خشک پتے تھے۔ ایک بار جب ہم تمہارے لیے کپڑوں کا نیا جوڑا لے کر گئے اور ہم نے یہ کپڑے تمہارے سامنے رکھ دیئے تو تم یہ کپڑے ہاتھ میں لے کر اٹھیں اور ایک طرف چل پڑیں۔ تمہارا ایک بھی قدم سیدھا نہیں اٹھتا تھا۔ پھر تم غائب ہو گئی تھیں اور ہم خوش ہوئے تھے کہ تم کہیں کپڑے بدلنے گئی ہو۔ مگر پھر ایک دم ایک طرف سے شور اٹھا تھا تم اسی رفتار سے واپس آ رہی تھیں اور تمہارے پیچھے درگاہ شریف کے چند خادم تھے جنہوں نے بتایا تھا کہ تم نے نئے کپڑوں کا جوڑا درگاہ شریف کے لنگر کی دیگ کے نیچے بھڑکتی آگ میں جھونک دیا تھا۔

"تلاوت تو تم اب بھی کر رہی تھیں مگر آواز میں چاندی کی کٹوریاں نہیں بجتی تھیں۔ پھر تم پڑھتے پڑھتے مزار شریف کے سرہانے کی طرف جھک جاتی تھیں جیسے کوئی جھری، کوئی دراڑ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہو۔ پھر تم ٹوٹ کر رو دیتی تھیں اور تلاوت کو روک کر ہولے ہولے جیسے خود کو سمجھاتی تھیں ۔۔۔ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دست مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہوگا۔ انصاف ضرور ہوگا ۔۔۔ پھر تم آنکھیں بند کر لیتی تھیں اور تلاوت میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

ایک بار ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے اور عرض کیا تھا کہ جن بھوت کلام پاک پڑھنے والوں کے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ دور سے بیٹھے ہنستے رہتے ہیں اور جھومتے رہتے ہیں اور اگر ہماری ہیرا بیٹی پر ایسے کافر جن آ گئے ہیں جو قرآن شریف کی تلاوت کا بھی لحاظ نہیں کرتے، تو یہ آپ کی درگاہ شریف ہی کے جن ہیں۔ آپ کے حکم سے اتر جائیں گے۔ خدا کے نام پر، رسول پاکؐ کے نام پر، پیر دستگیر کے نام پر، سائیں دولھے شاہ جی کے نام پر ہمارے ساتھ مزار شریف پر چلیے اور یہ

جن اتار دیتے۔ اور سائیں حضرت شاہ نے فرمایا تھا کہ ہم جن تو اتار دیتے مگر تم نے ٹھیک کہا یہ کوئی بڑا کافر جن ہے اور کافر جن ہمارے قبضے میں نہیں ہیں۔ ہم یہاں دعا کر رہے ہیں، تم گھر جا کر دعا کرو۔ ہمارا وظیفہ جاری رہے گا۔

جب ہم ٹوٹے پھوٹے واپس آ رہے تھے تو بی بیوں کی ایک بوڑھی خادمہ نے مجھے ایک طرف لے جا کر بتایا تھا کہ عرس کے تیسرے دن سائیں حضرت شاہ مزار کی طرف آئے تھے تو تمہاری بدنصیب بیٹی نے مزار شریف پر سے گول گول لہریئے پتھر اٹھا کر جھولی میں بھر لئے تھے اور چیخ چیخ کر کہا تھا کہ سائیں! مزار شریف سے دست مبارک تو جب نکلے گا، نکلے گا۔ اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں سائیں دولہے شاہ جی کے دیئے ہوئے ان پتھروں سے تمہارا ناس کر دوں گی! خادم تمہاری بیٹی کو پکڑ کر مارنے پیٹنے کے لئے آگے بڑھے تھے تو سائیں جی نے انہیں روک کر کہا تھا کہ نادانو، یہ لڑکی نہیں بول رہی ہے اس کے اندر کا کافر جن بول رہا ہے۔ جب تک یہ مزار شریف پر قابض ہے، ہمیں اور ہمارے خاندان کے کسی مرد عورت کو ادھر نہیں آنا چاہیئے ورنہ کیا خبر یہ جن کیا کر بیٹھے۔

پھر رات درگاہ شریف کا ایک خادم آیا کہ تمہاری بیٹی تمہیں بلا رہی ہے۔ پر راتوں رات گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو تم مزار شریف کی پائنتی لیٹی ہوئی تھیں۔ چراغ کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ تمہاری نظر ٹک گئی تھیں اور تمہارے ہونٹ ذرا ذرا سے ہل رہے تھے۔ ظاہر ہے تم اس وقت بھی تلاوت ہی کر رہی تھیں۔ پھر جب ہم نے تمہارا سر اپنی گود میں رکھا اور تمہارے بابا نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر رونا شروع کر دیا تو تم نے ایک دم ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا تھا: میری اماں۔ میرے بابا۔ کون جانے مزار شریف کیوں نہیں کھلا۔ انصاف تو نہیں ہوا پر چلو فیصلہ تو ہو گیا۔ چلو میں ہی گنہگار سہی۔ سائیں دولہے شاہ جی، آپ نے تو بڑا انتظار کرایا۔ اب قیامت کے دن جب ہم سب خدا کے سامنے پیش ہوں گے ——— جب ہم خدا کے سامنے پیش ہوں گے ——— خدا کے سامنے ——— خدا ———! اس کے بعد تم چپ ہو گئی تھیں اور تب سے چپ ہو۔

پھر ہم تمہیں یہاں گھر میں اٹھا لاتے۔ اور جب ابھی ابھی صبح سویرے سائیں حضرت شاہ کا خاص خادم سائیں جی کی طرف سے تمہارے لئے کفن لایا تو تم پر سے اترا ہوا جن جیسے تمہارے بابا پر آ گیا۔ اس نے کفن ہاتھ میں لیا اور اسے اس چولہے میں جھونک دیا جس پر تمہیں غسل دینے کے لئے پانی گرم کیا جا رہا تھا۔

اب میرے جگر کی ٹکڑی، میری نیک اور پاک، میری صاف اور ستھری رانو بیٹی! آؤ میں تمہارے ماتھے کے بجھے ہوئے چاند کو چوم لوں۔ دیکھو کہ بکائن کے اودے اودے پھول مہک رہے ہیں اور بیریوں پر گلہریاں تنے سے چوٹی تک بھاگی پھر رہی ہیں اور ایسی ہوا چل رہی ہے جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی، اور چاروں طرف تمہاری تلاوت کی گونج ہے اور سائیں حضرت شاہ کے بھیجے ہوئے کفن کے جلنے کی بو اب تک سارے میں پھیل رہی ہے اور میرے اندر سناٹا بہت سا درد جمع ہو گیا ہے جیسے تمہیں جنم دیتے وقت جمع ہوا تھا۔ ○○

اگنی دا

جمیلہ ہاشمی

کرنل مرزا کا ہیلی کاپٹر گوپے کے سامنے پہلی اور تپش سے سیاہ پڑی گھاس پر سے ابھی اڑا تھا ٹھاکر تیج سنگھ کی تلاش میں صحرا کے اوپر لمبی اور نیچی پرواز کے لیے انھوں نے پروگرام کے مطابق اپنی دوربینیں، وزھری ہوئی بندوقیں گولیوں کے راؤنڈ بھی ساتھ لیے تھے ہم کئی دنوں سے اس ٹوبے کو اپنا ٹھکانا بنائے ہوئے تھے کیوں کہ یہ ٹوبہ رہنال پوسٹ اور جے پور کی سرحد کے قریب تھا۔ دونوں حکومتوں کو ٹھاکر تیج سنگھ کی ضرورت تھی اس کے سر پر ایک بہت بڑا انعام مقرر تھا جس کا اعلان کئی بار ہو چکا تھا مگر سردار صحرا کے ہونے کے غرور طبیعت کی بے باکی اور جرأت مندی نے اسے اپنی جان سے بھی بے پروا بنا دیا تھا وہ کڑے پہرے اور تنگ گھیرے کے باوجود جو چاہتا کر گزرتا۔

گرم ہواؤں کے ابلتے ہوئے چکر کھاتے اور آگ اگلتے اس موسم میں جب سورج تمھارے سر پر چمک رہا ہو اور ریت کے لہریوں میں سے آگ کے شعلے لپکتے ہوں وہ اپنے تیز رفتار اونٹوں کے جھنڈ لے کر جس پوسٹ پر موقع ملتا حملہ کر دیتا۔ ہم تقریباً پچاس آدمی اس جنگ میں لگا چکے تھے اور کرنل مرزا کے لیے یہ اب زندگی اور عزت کا سوال بن گیا تھا۔ مردہ یا زندہ تیج سنگھ

جھکڑوں اور خونی آندھیوں کے گھیرے میں۔ تیز رو لہروں میں ہونکتا ہوا سناٹا ہمارے چاروں طرف ہے بدطینت دشمن کی سی چالاکی سے وہ آدمی کو گرفتار کرتا اور فنا کرتا ہے۔ صحرا کی بے چین روحیں پل پل لمحہ لمحہ زندگی کی کھوج میں گھومتی ہیں۔ خانہ بدوشوں کی طرح ٹیلے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوا غصہ و دیوانی اپنا سر جھٹکتی شور مچاتی ہے، ریت کے ابلتے ہوئے فواروں میں سورج اپنا زور اور توانائی لگاتا ہے مگر شام اپنی مہندی لگی پوروں سے رات کی اوڑھنی پر ٹھنڈے ستارے ٹانکتی ہیں اُسے سجاتی ہیں پھر خاموشی کی ڈھولک پر لمبی تانوں والے راگوں کی پھوار ریت کے ذروں کو رجھاتی ہے کمال کر بھی بولتی ہے۔

سارے ٹوبے سیاہ کیچڑ بن جاتے ہیں جو اندر کی تپش سے پھٹ جاتی ہے اور کالے چرمراتے ہوئے پرتوں کی طرح کھڑکھڑاتی ہے تو ریت اس ساز پر اپنے وحشی گیت اور موت کے ترانے گاتی ہے مگر یہ ٹوبہ۔

جس کا پانی یا نالہ ... ہے کبھی نہیں سوکھتا کیونکہ اس اونچے ٹیلے کی خطرناک ڈھلوان سے نیچے کی طرف جنڈ اور کریر، رائی اور پھوگ کے پودے بڑے بڑے پستا رجال کے درخت ہیں الجھے ہوئے اس پر گرے پڑتے ہیں اور پانی پر سایہ کیے ہوتے ہیں۔ جیسے پیاس بجھانے کو جھکے ہوں ٹھنڈا اور میٹھا پانی آسمان کی نگاہوں سے چھپا سخت موسم میں بھی اس میں ہلکورے لیتا ہے۔ صحرا میں گم ہوئی گائیں، راہ بھٹکے ہوئے اونٹ، بھٹکے ہوئے ہرن سب اس پانی پر کبھی نہ کبھی جمع ہوتے ہیں۔ دوست اور دشمن اس چشمے پر اکٹھا ہوتے ہیں۔ خدا کی اس فیاضی پر خوش ہوتے ہیں۔

اور اس اونچے ٹیلے پر بنے گوپے پر پیچ راہوں سے ایک دوسرے سے ملے ہیں یوں لگتا ہے ایک شہر آباد تھا۔ اناج اور اسلحہ اور کپڑے اور تصویریں بنانے کا سامان۔ پنسلیں اور برش کاغذ اور کینوس۔ ستار کا پٹارہ گھنگرو اور ستار، ڈھولک شہنائی اور انگریزی کتابیں بے شمار لوٹ کے ڈھیر، نایاب چیزیں پھیلی ہوئی زندگی کا سمٹا سا لمحہ تھی۔

شام قریب تھی۔ دھوپ کے زور میں ذرا کمی تھی۔ جب بیلی کا پر بلند ہوا ہے تو ڈھلی ہوئی فضا میں تیر کی طرح سنسناتا ہوا دور تک دکھائی دیتا رہا پھر افق نے اُسے اچک لیا اور نظر کی حد سے پرے اس کی پھر پھر بھی بند ہو گئی۔ میں نے باہر گوپے میں آ کر ادھر ادھر دیکھا بندوق کو چٹائی پر رکھ دیا۔ اپنے اکڑے ہوئے اعضاء کو سیدھا کرنے کی خاطر سر سے اُوپر ہاتھ اُٹھا کر انگلیوں کو کھینچا۔ دائیں بائیں گھوما۔ ہوا کے آنے والے سوراخوں سے آنکھ لگا کر دیکھا سپاہی بندوقیں لیے مستعد کھڑے تھے۔ میں نے ٹھنڈی ریت پر اوندھے لیٹ کر اپنا جلتا ہوا چہرہ چٹائی پر رگڑا۔ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور پھر جانے کب مجھے نیند نے آ لیا۔

جناب ! یہ عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ سپاہی کی آواز توپ کے گولے کی طرح میرے کان میں داغی گئی۔ گھبرا کر میں نے بندوق پر ہاتھ مارا۔ اکڑی ہوئی ٹانگوں نے ہلنے سے جواب دے دیا۔ سوئی ہوئی انگلیاں بے جان سی بندوق کے گرد مردہ گھاس کی طرح بکھر گئیں۔

تنگ راستے پرے مجھے ایک گھاگرے کی گوٹ دکھائی دی اور گھیر پڑتے ہوئے ململ کے کُرتے کے دامن پر لٹکے ہوئے ہاتھ تڑے مڑے کاغذ کی طرح زاویوں اور مثلثوں اور ٹکڑوں اور شکلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ لمبی انگلیاں پتلی تھیں جیسے کسی زمانے میں یہ ہاتھ ساز بجاتے رہے ہوں۔ ان انگلیوں نے برش اور قلم سے تصویریں بنائی ہوں۔ پتھر کو تراش کر اس میں سے مورتیاں نکالی ہوں۔ یہ ہاتھ کمزور نہ تھے مگر مضبوط اور جوان ہوں گے تو جانے کیا ہوں گے۔ اب بھی ان سے گھبراہٹ نہیں جھلکتی تھی۔ چہرہ مجھے اس وقت تک دکھائی نہیں دے سکتا تھا جب تک میں باہر نہ جاؤں یا آنے والی کو اندر نہ بلاؤں۔ بڑی ... کو اپنے سامنے تانے ہیں۔ میں نکل کر باہر آیا تو میرے سامنے ایک دھندلے بھولے ہوئے خواب کی سی صورت تھی۔ پرچھائیں۔ مورتی جو پتھروں تلے دبی دبی ریزہ ریزہ ہو چکی ہو۔ گو ... نہ ہو۔ سفید

بالوں میں کہیں کہیں سیاہی تھی اور گوندے جاتے ہوئے چمکیلے بالوں میں مانگ گم ہوتی پگڈنڈی کی طرح تھی سفید بھویں پپوٹوں پہ چھائی ہوئی تھیں اور پپوٹے بے پلکوں کی آنکھوں پر گرے گرے تھے نگاہ لٹ سے جھانکتی کرن تھی اور دھیرے دھیرے دیکھے جانے والی شکا کو اجالتی تھی گردن سیدھے کندھوں پر ٹکی ہوئی ذرا آگے کو جھکی ہوئی تھی جیسے کوئی وجود صدیوں پرانے پردوں کو ہٹا کر آج کی دنیا کو دیکھ رہا ہو۔

میں "اگنی دا" ہوں تیج   کی دائی ماں، ٹھاکر تیج سنگھ کی دائی ماں۔

میں اُسے دیکھتا ہی رہا۔

"کیا تم نے اسے کھوج لیا ہے کیا وہ تمھارے پاس ہے"؟ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ لفظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"اچے بیر سے آئی ہوں۔ کیا تم بیٹھنے کا نہ کہو گے"؟

مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔

"تم اپنی بندوق کو پرے کر لو۔ یہ نہیں کہ مجھے اس کھلونے سے ڈر آتا ہے میں بہت تھک گئی ہوں پھر وہ اپنا بھاری گھاگرا سمیٹ کر اس کے گھیرے پہ بیٹھ گئی جوتیاں اتار کر اپنے سامنے رکھ لیں اور پاؤں کو دبانے لگی۔

"تمھیں اپنے سے کسی بڑے افسر کا انتظار ہوگا کہ تم خود مجھ سے بات کر سکو گے"۔

مجھے چپ دیکھ کر اس نے کہا"۔ میرا بچہ سیدھا اور بھولا ہے، ہٹیلا بالک۔ ہوائیں اُسے چکر پھیریاں دیتی ہیں۔ اپنے ساتھ اڑائے اڑائے پھرتی ہیں"۔

"ہوائیں بھی کسی کو قید کر سکتی ہیں"۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں سچ کہتی ہوں یہ ہوائیں اپنی لہروں اور آوازوں سے ایسا جادو جگاتی ہیں، ایسی ہانک لگاتی ہیں یہ کبھی نہ ختم ہوتے۔ صحرا پر دن رات   ناچتی ہیں تم نے کبھی ریت پر ناچ کے چکر نہیں دیکھے نا ورنہ تمھیں پتہ ہوتا کہ ان پہ اگر کوئی ایک بار پاؤں دھر دے تو پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ پھر کسی کی نہیں سنتا۔ اپنی دائی ماں کی بھی نہیں"۔

عجیب بات ہے"۔ میں نے جواب دینے کے لیے کہا۔

"تمھیں پتہ ہے نا دکن سے ہوا گھلے تو بارش ہوتی ہے گھیرے کالے بادل امنڈ گھمنڈ کر آتے ہیں۔ بجلی کے لہریے زمین کو چمکا دیتے ہیں ایسے ہی چکروں کی بھی کہانی ہے۔ مگر تم شہروں کے رہنے والے یہ سب کیا جان سکتے ہیں"۔

"اچھا" : اب میں دلچسپی اور توجہ سے بات سن رہا تھا۔

ہوا آدمی کو اپنے اندر لپیٹ لیتی ہے اپنی بلاؤں کو اس پر بٹھا دیتی ہے اس کے سر میں گھومنے پھرنے اور آزادی کے خیال بھر دیتی ہے۔ وہ جوانوں کے دل کو آبادیوں سے پھیر دیتی ہے وہ دیوانے ہو کر بستیوں سے نکل آتے ہیں۔" وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھی رہی۔

کرنل خشک لمبی لیٹی ہوئی سوکھی چرمراتی گھاس پر سے چلتا ہوا روشنی ملی نیلاہٹ کے گلابی پڑتے اجالے سے ہماری طرف آیا۔ گوپے کی طرف چبوترے پر قدم دھر کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

"یہ تیج سنگھ آف اچے سر کی داتی ماں ہے اگنی دا۔" میں نے فراغت کا سانس لیا اور بندوق کو اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بدلا۔

کرنل نے گہری سوچتی ہوئی نگاہ سے اگنی دا کی طرف دیکھا جو اپنی ادھ مندی آنکھیں کھول کر بےخوفی سے کرنل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کرنل کے ماتھے پر ایک رگ زور سے پھڑک رہی تھی شاید اسے غصہ آ رہا تھا۔

"کیا کہنے کی ضرورت ہے تیج سنگھ کے لیے وہ اگر کسی بڑی ریاست کا راجہ ہو تو بھی سزا سے نہیں بچ سکتا" وہ پورا اپنی ایڑی پر گھوم گیا اور ٹیلے کی بلندی سے اس نے نیچے پاتال سے ملے ڈوبے پر نگاہ دوڑائی جہاں جال میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں اور شام کی ہوا سے پانی گیت کی لے پر مست مانجھی کی طرح تال کے بیچ ٹھہرا ہوا تھا۔

"میرا سوال سن لو جواب دینا نہ دینا تمھارے اختیار میں ہے۔" اگنی دا کی آواز میٹھی تان کی طرح کرنل کے پیچھے سے اٹھی۔

"مگر یہ سب ناممکن ہے۔ تم یہ چاہو گی کہ میں اس کا پیچھا نہ کروں۔" کرنل نے جھنجھلا کر اپنا پاؤں زمین پر مارا۔ میں مہینے سے اس جلانے والی گرمی اور پیڑوں کو کملا دینے والے صحرا میں ڈیرے ڈال کر یونہی نہیں پڑا ہوں۔"

اگنی دا نے ڈھلک جانے والے دوپٹے کو سر پر برابر کیا۔ "کھکشا ناتے بات کرنے کا ادھیکار تو دو۔ تم بہت غصے میں ہو تمہیں ہونا ہی چاہیے۔ تم بہت دنوں سے اس صحرا میں گھوم رہے ہو۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے۔ تم تیج سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی کھوج میں ہو۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ ہیں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر آگے کو جھک گئی۔" میں نے تین نسلوں سے اس کی چاکری کی ہے۔ تین نسلوں کی رگوں میں میرا دودھ ہے۔ کیا مجھے کچھ کہنے نہ دو گے؟"

"مگر تمہاری بات ایسی ہوگی جو میں کبھی نہیں مان سکتا۔ پھر ایسی باتیں سننے سے کیا ملے گا" کرنل نے

بہت آہستگی سے کہا جیسے اگنی دا سے زیادہ اپنے آپ سے بحث کرکے اپنے آپ کو منوا رہا ہو۔
"دیکھو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں کہوں گی جس سے تمہاری راہ میں مشکلیں پیدا ہوں۔ سوچ کر جواب دو مجھے واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ اجے سر میں اب میرا کون بیٹھا ہے"
"کیوں اجے سر میں تمہارا خاندان ہوگا، بہوئیں، بیٹیاں، بیٹے، پوتے، گھر" کرنل نے کہا۔
میرا سب کچھ اس صحرا میں ہے۔ صرف تیج میرا ہے میرا ٹھاکر۔"
کرنل نے کہا۔ "گوپے میں چٹائیاں سیدھی کردو دیے جلاؤ" ہم اگنی دا کی بات سن ہی لیں" اور میری طرف دیکھ کر کہا ٹوبے کے چاروں طرف پہرہ دوگنا کردو۔ میں سارے ٹوبوں اور پانی کے ٹھکانوں پر دیکھ آیا ہوں ایک بوند کہیں نہیں ہے سوائے اس ٹوبے کے رکس پور کے پانی کے ذخیروں کا کا بھی یہی حال ہے۔"
میں نے سر جھکا دیا۔ ریت ٹھنڈی ہو رہی تھی سیاہ آسمان دوج کے چاند کی روشنی میں خالی خالی سا تھا ڈھلوان پر درختوں میں ہوا سرسرا رہی تھی اور کم سر سے ابھرتی تو بال بکھرائے کنجنی کی طرح ہمارے چاروں طرف چک پھیریاں لیتی۔ مدھم زردی میں ستارے ایک دم نہیں جیسے اندھیری راتوں میں ہوتا ہے ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں ہمارے سروں پر جمع ہو رہے تھے۔
"ناتواں اگنی دا کسم سر تک کا لمبا راستہ تم نے کیونکر طے کیا گرمی اتنی بے پناہ تھی اور تم تو ہوا کے ایک جھونکے سے اڑ جاؤ۔"
دیے کی لو سیدھی اس کی زمانوں سے بھی پرانی آنکھوں میں پڑ رہی تھی اور وہاں ہیرے کی چمک اور پھر الگ الگ ٹکڑے میں الگ جیسے ہیروں کے ریزوں سے بنی مورتی پھر دیوں کی لو کانپے اور دکھائی دے۔ اگنی دا نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔
"کسم سر میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں ہے۔ پھر سانس لینے کے لیے رک کر اس نے کہا۔" پہلے یہ سارے ٹوبے آباد تھے جیتے جاگتے لوگ یہاں رہتے تھے۔ اجے سر سے اکثر کسم سر آیا کرتی تھی میرے ٹھاکر کے دادا کے وقتوں میں یہ آبادیاں تھیں۔ راج محلوں کی سی رونقیں تھیں۔ پھر اور لوگ، خراب موسم، وقت سب نے مل اجے سر کو ایک گڑھی بنا دیا۔"
سیٹی کی آواز کرنل کے منہ سے نکل گئی۔
"تمہیں وشواس نہیں ہے نا۔ میں بھگوان کی سوگند اٹھا کر کہتی ہوں۔ یہ سب سچ ہے۔"
"ان ویرانوں کو دیکھ کر کبھی یہ گمان نہیں ہوتا" میں نے کہا۔
اس دھرتی پر تماشے ہوتے ہیں اور آکاش یہ تماشے دیکھتا ہے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتا

ہے۔ راجے ڈاکو بن جاتے ہیں عزت دار بڑے لوگ لیس مٹی میں مل جاتے ہیں" اگنی دا کی مدھم مگر مضبوط اور صاف باتیں سب کو سنائی دے رہی تھیں۔

"یہ تو ہے، یہ تو ہے" کرنل نے اپنے گھٹنے پر ہاتھ مار کر کہا۔

" بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔ جب تم یہ سمجھ گئے ہو تو آگے کی بات بھی تمہیں سمجھ آجائے گی۔"

" اگنی دا میں تمہاری بات سمجھتا ہوں اور پھر بھی مجھے پتہ ہے تیج سنگھ کو دنیا کی کوئی حکومت معاف نہیں کریگی"

کرنل کی آواز الجھی ہوئی، جھگڑالو، تیز اور قطعی تھی۔

" میں نے کہا ہے تم ٹھاکر کو چھوڑ دو ؟" اس نے ہم سب کے منہ کی طرف دیکھا۔

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اصل میں سارا قصور میرا ہے۔ اس ساری کہانی کی مصیبت میرے لاتے لائی ہوئی ہے۔ بڑے ٹھاکر کو میں نے بچوں کی طرح پالا تھا۔ امر سنگھ کو تیج سنگھ کے باپ کو میں نے اپنا دودھ پلایا ہے اور اس سینے میں آگ جلتی ہے الاؤ لپکتے ہیں۔ جب میں وہ سب یاد کرتی ہوں جو ہُوا۔" وہ سر جھکا کر چٹائی پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

" امر سنگھ سیدھا تھا۔ بھولا اور وشواس کرنے والا اور اس لیے جب اس کے گھر میں وشواس گھات ہوئی تو اسے پتہ ہی نہ چلا۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ وہ بہو جس کو سہاگ رات سے میں نے اپنے ہاتھوں کا سایہ کیا جس کے قدموں میں آنکھیں بچھائیں جسے اپنی کوکھ سے جنم لینے والی بیٹیوں سے زیادہ پیار کیا۔ وہ مجھے ہار دے گی میرے دل کو اپنے پیروں میں مسل کر آگے نکلے گی وہ اس کی پروا نہیں کرے گی جو اس کا سہاگ تھا پہلے پہل میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہوں۔ میرے کان کم اور غلط سنتے ہوں۔ یہ صرف دیور اور بھابی کی چھیڑ چھاڑ ہو۔ ذرا سی دل لگی، تھوڑا سا دلار یونہی مان اور کھیل۔ پتہ نہیں امر سنگھ کو کیوں شبہ نہیں ہوا۔ میں اُسے بتا سکتی تھی، ہوشیار کر سکتی تھی مگر اس گھرانے میں خون کی ہولی دیکھنی نہیں چاہی۔ جب سمے بیت جاتا ہے تو بس بیت ہی جاتا ہے اور میرا دل یونہی اندر باہر ہوتا رہتا تھا۔ خوف کے مارے یونہی دھڑکتا تھا۔ جب سب ختم ہو گیا۔ بہو کے سولہ سنگھار اور پُور پور سوگندھ اس کے پاؤں کے پائل، اس کے ماتھے کی بندیا۔ اسکی مانگ کا سیندور۔ اس کی آنکھوں کا کاجل اس کی ستی ساوتری ہونے کی چالیں اس کی ہنسی کی موہنی اس کے ہونٹوں کے میٹھے بول سب مل کر وہ زہر بنے جو ٹھاکر امر سنگھ کی جان لے گئے۔

رام سنگھ اور بہو نے مل کر ایک جال پھیلایا تھا جس میں امر سنگھ پھنسا اور اس سے پہلے کہ وہ پھڑکتا وہ نہ رہا۔ آج اس گھڑی سوچتی ہوں جب اس نے ان دونوں کو اپنے پاس دیکھا ہوگا ان کی ظالم آنکھوں میں اپنے انت کا لکھا پڑھا ہوگا۔ اس ایک لمحے اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اسکا دل تو خود ہی پھٹ گیا ہوگا۔

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے میں نے رام سنگھ سے کہا تھا چھوٹے بھیا یہ تم نے کیا کر دیا ہے۔
اپنی فتح کی خوشی میں اپنے مکمل اور طاقت ور ہونے کی اس گھڑی میں اس نے مجھے دھکیل کر پرے کر دیا زور سے ہنسا اور کہا۔

تو تم اگنی جانتی ہو ناکہ سب کیا ہوا ہے۔ اپنی زبان بند رکھو۔ جو دیکھا ہے بھول جاؤ۔ اجے سر کا ٹھاکر میں ہوں، میں ہوں اور اس نے زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا تھا۔ اور پھر وہ لوٹ گیا تھا۔

اجے سر رام سنگھ کا تھا۔ اجے سر کی راج گدی سوگ کے بعد اسے مل گئی۔ سال بیتنے پر پھر بھی اس کی ہو گئی۔ اپنے بھائی کے خون میں ڈوبا ہنستا اور خوش اجے سر کا ٹھاکر بن گیا۔"

"ہو سکتا ہے یہ تمہارا وہم ہو۔ رام سنگھ کو زہر نہ دیا گیا ہو۔ تمہاری سوچ ہو" کرنل نے کہا۔

"پہلے پہل میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ میں جلن کے مارے دیوانی ہوں ایسی کوئی بات نہیں مگر وہ رات وہ گھڑی بھلائے نہیں بھول سکتی۔ رام سنگھ کا سہاگ، گھر کی سیڑھیوں سے اترنا، مجھ سے ملنا۔ اس کی خوشی۔ یہ سب بُرا خواب سمجھنے پر بھی سمجھے نہیں جا سکتے۔ بھلائے نہیں جا سکتے۔"

"مجھے پینے کو پانی کا ایک گھونٹ دو بھگوان کے لیے۔ میرا گلہ سوکھ رہا ہے۔" اگنی دا نے ہاتھ پھیلایا میں نے اٹھ کر صراحی سے مٹی کا پیالہ اس میں بھر کر اسے تھما دیا۔ "ہاں یہ کسم سر کا پانی ہے۔ امرت جیسا پاتال کے سارے سوتے اکٹھے ہوتے ہیں۔"

"سارے ٹوبوں میں کڑوا اور بدبودار پانی ہوتا ہے صرف کسم سر کا پانی پینے کے قابل ہے کبھی سیاہ نہیں پڑتا۔ کبھی سورج کی گرمی سے سوکھتا نہیں اور کبھی کسی پر بند نہیں کیا گیا۔ صرف اب ہم اس پانی کو گھاٹ بنا کر تیج سنگھ کے منتظر تھے۔"

"اجے سر کی گڑھی کا مالک تو میرا ٹھاکر ہے۔ میں نے اُسے بھُوک کے سائے سے بھی جدا رکھا اب سوچتی ہوں ہو سکتا ہے اگر یہ ماں کی گود میں رہتا تو حالات دوسرے ہوتے۔ مگر نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا رام سنگھ تو اس کی جان کا لاگو تھا۔ اگر اس کے رونے کی آواز اسے کو لیکوں اور آنگنوں کے پار سے کبھی سنائی دے جاتی تو ہو یہ بگڑتا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا وہ بھلا اسے کہاں برداشت کر سکتا تھا۔

میں اسے چھپا کر رکھتی۔ جب یہ کھلکھلا کر ہنستا، تو مجھے ڈر لگا رہتا۔ یہ میرے دل کے وہم تھے۔ میری بھول تھی میں سمجھتی تھی رام سنگھ اب تیج کو بھول گیا ہے۔ مہتاب اور شمشاب پیدا ہوئے تو اس نے مجھے بلایا تھا۔ پالنے پر جھکے ہوئے اور دونوں ایک سی صورتوں کو پیار کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

اگنی دا۔ دیکھو یہ میری وجے ہے۔

"ٹھاکر بھگوان سدا سکھی رکھیں" میں نے دور کھڑے ہو کر کہا تھا۔

"قریب آؤ اور دیکھو یہ تیج سے زیادہ خوب صورت نہیں ہیں کیا۔؟"

دل اچھل کر میرے حلق کے قریب خون خون ہونے لگا۔ میں نے ہاتھ منہ پر بھینچ لیا اور جھک کر ان دونوں کو دیکھا پھر سیدھے ہو کر کہا "یہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ اور میرا ٹھاکر بڑا ہے۔ بڑا اور بہت سُندر"

"اگنی! رام سنگھ نے مڑ کر کہا "تمہاری یہ جرأت۔ تم ہمارے ہی منہ پر ہمارے بچوں کو برا کہہ رہی ہو۔"

"چھوٹے بھیا میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ یہ ابھی چھوٹے ہیں ابھی کیا پتہ چل سکتا ہے۔"

"ہم چھوٹے بھیا نہیں ٹھاکر رام سنگھ ہیں اس گڑھی کے مالک اور یہ شیر کے بچے ہیں۔ ان کا پتہ تمہیں پالنے میں بھی چل سکتا ہے۔" اس نے گرج کر کہا۔

بہو لیٹے سے اٹھ گئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ باندیاں منہ ڈھانپ کر کونوں میں چھپ گئیں۔ صرف میں کھڑی تھی اور میں نے کہا تھا۔

"جب تیج بڑا ہوگا تو وہ ٹھاکر ہوگا۔ چھوٹے بھیا یہ اس کے باپ ٹھاکر امر سنگھ کی گڑھی ہے۔" میرے سارے شریر میں سے جان نکل گئی تھی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ہاتھ پسینے سے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ مگر میں نے بڑے ٹھاکر کو گود میں کھلایا تھا، رام سنگھ اور امر سنگھ دونوں کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ مجھے اپنے حق اور اپنی شکتی پر بڑا مان تھا۔

اس تھپڑ کے نشانوں میں آج بھی آگ سلگ اٹھتی ہے۔ جب میں یہ سب یاد کر رہی ہوں۔ چھوٹے بھیا کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں جل اٹھتی ہیں" اگنی دائی اپنا تڑا مڑا زمانوں پرانے کاغذ کا سا گال سہلایا۔

"اگنی دا۔ اگنی دا" وہ چیخنے لگا۔ "یہاں سے چلی جاؤ۔ اگنی دا" مگر میرا سارا جسم یوں ڈھے گیا تھا جیسے بارش میں کچی دیوار بیٹھ جائے۔

اس کے بعد ہر دن ایک نئی مصیبت لے کر آتا۔ رام سنگھ تیج کو بلاتا ڈانٹ پیٹتا اسے ڈانٹتا پھٹکارتا کبھی حکم دیا جاتا کہ تیج کو گڑھی سے باہر نکلنے نہ دیا جائے اس پر نت نئے عذابوں اور نت نئی پابندیوں کی آزمائش ہوتی۔

ہو سکتا ہے اگر میں اپنی زبان بند رکھتی تو ہم پر یہ عذاب نہ ٹوٹا کرتا ان سارے زمانوں، لمبے سالوں میں یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا اصل دشمن میں تھی۔ جب دوسرے آپ کا حق چھینتے ہیں تو وہ ساری راہیں بند کر دیتے ہیں۔ ان کے اپنے دل تک جانے والے راستوں پر بھی پہرے ہوتے ہیں وہ نرمی، محبت، رشتہ حق ہر رشتے کو بھول جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ کہانیوں کی باتیں ہوتی ہیں جو کسی اور دیس میں، کسی اور جنم میں زندہ ہوتی ہیں۔

میں جب تیج کو مہابھارت کی کتھائیں سناتی تو وہ ہنس دیتا۔ اگنی دا، جو آدمی چھٹپنے میں کچھ نہ کر کے جوانی میں بھی کچھ نہیں کر پاتا۔ اگنی دا میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ تم ایسے ہی اپنی جان کھپاتی ہو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے یہی تمہارے سپنوں کا سُورو بیر بن کر گڑھی کا مالک بن جائے گا۔ میں کونتڑ ہوں۔ پانڈوؤں کی ماں کا بیٹا۔"

جب میں منہ لپیٹ کر لیٹ جاتی اور اس سے نہ بولتی تو وہ کہتا" اگنی دا اگر تم کہتی ہو تو میں بہت بڑا اونچا سور بیر بن جاؤں گا۔ میرا سر چھت سے بھی اونچا ہوگا۔ بازو پھیلا کر یہ ساری جگہ گھیر لوں گا۔"

اگر تم ایسکو تو مجھے پھانسی پر لٹکا دو۔ میں نے اُسے جھوٹے سپنوں میں الجھائے رکھا۔ میں چوری چوری اسے گھوڑوں پر سواری کے لیے بھیجتی۔ اسے تیر چلانا اور وہ سارے کرتب جو گڑھی کے ٹھاکر کو آنا چاہئیں سکھاتی رہی۔ میں نے اسے اندر سے نہیں باہر سے ٹھاکر بنا دیا۔ ایک دراشا اور گھٹن اور بنا محبت کے پلا ہوا بچہ، سہما ہوا ڈرا ہوا۔ ڈرایا دھمکایا بچہ وہ آزادی اور دل کہاں سے لاتا جو ٹھاکر بننے کے لیے ضروری ہے" وہ چپ ہو گئی جیسے کھو گئی ہو۔ ایک دوپہر جب رام سنگھ کے باز گڑھی کا چکر لگا رہے تھے اڑ رہے تھے تو تیج نے ان میں سے ایک کو اپنے تیر سے زخمی کر دیا۔ میں منع کرتی رہی اور اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے اپنے تیر کا صحیح نشانہ آزمانے کے لیے اس اڑتے باز کو نشانہ بنایا۔

دیواریں بھی کانپ رہی تھیں اور خوف سے سہمے ہوئے نوکران میں گھسے جاتے تھے جب رام سنگھ نے میرے آنگن کا دروازہ توڑ ڈالا۔ اس نے تیج کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا وہ چیختا رہا اور وہ اسے ٹھوکریں لگاتا رہا۔ ایسی گھڑیوں میں بھگوان سو جاتا ہے کیا؟"

بہت دیر تک اگنی دا خاموش رہی۔ تھکی ہوئی چڑیا کی طرح زور زور سے سانس کھینچتی ہوئی یادوں کے دیلوں میں خون بیلاتی ہوئی۔

جب ہوا اسے دیکھنے آئی تو جانے رات کا کون سا پہر ہو گیا۔ تیج رہ رہ کر چیختا تھا اور ڈر کر سسکنے لگتا تھا۔ ذرا سا بچہ ستار کے تنے ہوتے تار کی طرح ہوا سے بھی بج اٹھتا ہو۔ کوفت اور شرمندگی اور بے عزتی کے احساس سے روندے جانے ٹھکرائے جانے کی اذیت سے سوجے ہوئے چوٹ کھائے ہوئے جگہ جگہ سے ابھرے ہوئے زخموں کی وجہ سے سو نہ سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ صرف خشک سسکیاں تھیں جن کو روکے ہوئے بیٹھی میں سنکائی کر رہی تھی۔ روشنی کی چبھن سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں پہ پردہ ڈالنے کے لیے میں نے دیا بجھا دیا تھا۔ عجیب سنسناتی ہوئی بے تاب رات تھی۔ آگن کی طرح پلٹ پلٹ کر جس کی تنہائی پلٹ پلٹ کر مجھے ڈستی تھی۔ تیج کا کوئی بھی نہ تھا۔ میرا کوئی نہ تھا۔ ہم بھگوان کی اتنی بڑی دنیا میں اکیلے تھے اکیلے اور بھلائے ہوئے میں امر سنگھ کو اور بڑے ٹھاکر کو اور سارے گزرے ہوؤں کو یاد کر رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا

کوئی نہیں ہے کچھ نہیں ہے۔ میں اور تیج پاتال میں گھر گئے ہیں۔ بھگوان میں یہاں سے کیسے نکلوں۔ کسے پکاروں کسے آواز دوں۔ بہو نے دیا تپائی کے نیچے رکھ دیا۔ میں کھڑی ہو گئی۔

"اگنی دا تیج کا کیا حال ہے۔"

"اچھا ہے رانی ماں۔ ٹھیک ہے" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"اگنی، میں تمہاری بہو ہوں۔ تیج کی ماں ہوں۔ رانی ماں نہیں ہوں" بہو میرے پاؤں کے قریب بیٹھ گئی "جو آ گیا رانی ماں" میں نے اپنے پاؤں گھاگرے کی گوٹ کے اندر کر لیے۔ "تیج کی ذرا دیر ہوئی آنکھ لگی ہے اگر برا نہ مانیں تو آنگن میں چلیں وہ روشنی دیکھ کر جاگ جائیگا۔" ہم دونوں باہر آ گئیں۔

اگنی، اس میں میرا کوئی دوش نہیں تم نے تیج کو روکا ہوتا۔ ٹھاکر کے باز پر تیر کیوں چلایا۔"

"دیکھو بہو میں تمہیں دوش نہیں دیتی مگر تم شتاب اور مہتاب کی ماں ہو اس بنا ماتا پتا کے بچہ پر کچھ تو دیا کیا کرو۔ اسے جینے کا حق تو دو تمہاری کرپا ہو گی۔ اگر تم اپنے پتی سے کہہ کر اسے کسی سکول میں بھجوا دو دہیں جہاں پر امر سنگھ کو بھجوایا گیا تھا۔"

"میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نہیں چھڑایا ٹپ ٹپ آنسو میری ان انگلیوں کے بیچ سے گرتے رہے۔ دونوں ہاتھوں کو بھگوتے رہے میں بنا ہلے کھڑی رہی ساپی ہی رات تھی کالی اور دکھ بھری گرجنوں سے کراہتی ہوئی۔

اگنی دا۔ تم کچھ بھول نہیں سکتیں مجھے۔ تیج سے ملنے دو، اس کے زخموں پر مرہم لگانے دو۔ یہ دیکھو میں یہ لائی ہوں اس نے ایک ڈبیہ میرے ہاتھ میں دے دی۔

"جانے اس میں کیا ملا ہو۔ تمہارے پتی دلو کو پتہ چل گیا تو تیج کو جیتا نہ رہنے دیگا اسلیے تم یہ واپس لے جاؤ اور خود بھی جاؤ۔" میں نے اُسے اپنے آنگن سے تقریباً دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

تیج اچھا ہوا تو مجھے اُسے گڑھی سے باہر بھجوانے کی جلدی لگ گئی۔ میں نے آپ ہی آپ پرانے دنوں کی یادوں کے سمے۔ اسکے کپڑے اور دوسرا ساماں ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔ سامان جو کبھی میں نے ٹھاکر امر سنگھ کے لیے تیار کیا تھا۔ ایسا ہی سامان جو میں نے بڑے ٹھاکر کے لیے بنایا تھا۔ پہلے زمانے میں میرا دل ہلکا ہوتا مگر اب بھاری اور ڈوبتا ہوا تھا۔

اگلی صبح اسے روانہ ہونا تھا۔ سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں میں تیج کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی، جانے اب کب ملنا ہو اور ہو بھی سکے کہ نہیں۔ جینا اور مرنا تو بھگوان کے بس میں ہے پر میں پل پل مر رہی تھی۔ آج تک مر رہی ہوں۔ تیج کو اپنے سینے سے لگائے میں نے پرارتھنا کی تھی۔ بھگوان تو اس کی رکشا کرے گا۔ میں اسے تجھے سونپتی ہوں۔ چاروں دشاؤں میں طوفان اور ہوائیں اور بلوان دشمن ہیں۔ میرا اکیلا بچہ تیرے حوالے ہے بھگوان میرا یہ آنگن سونا نہ ہونے دینا۔ یہ دیا جلتا رہے۔ امر سنگھ کا یہ نام مٹ نہ جائے۔ بھگوان تو نے موت

بنائی ہے اور زندگی بھی۔ تو نے آشائیں دی ہیں اور ان کو پورا کرنے کا بھی زور تیرے پاس ہے۔" جسبیر میں نے اور تیج نے مل کر موتی کو پرنام کیا۔ میں نے آسن سے اٹھا کر سیندور کا ٹیکا اسے لگایا جیسا گڑھی کے ٹھاکر اپنی پیچدار پگڑی پہننے سمے لگاتے ہیں۔ امر سنگھ کی پگڑی اس کے سر پر رکھی تو اس نے کہا۔

"اگنی دا میں کسی شے پر وشواس نہیں رکھتا۔ نہ بدلہ لینے میں نہ گڑھی کا سردار بننے میں اتنی لمبی چوڑی دنیا ہے اس میں مجھے بھیج رہی ہو تو وعدوں میں قید نہ کرو۔ اب ہم یہاں سے باہر کہیں ملیں گے تمہیں پتہ ہے میں اب واپس نہیں آؤں گا۔ میں کس لیے واپس آؤں۔ اگنی دا، دیکھو رو کر نہیں اب ہنس کر مجھے وداع کرو اجے سر کی گڑھی ہی تو ساری دنیا نہیں ہے؟ جانے کیا کیا تمہاری اور میری آنکھوں نے نہیں دیکھا جو ہے"

میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ یہ ذرا سا بچہ جو میرے سینے کے ساتھ لگ کر سوتا تھا اور جب بھوک لگتی تھی تو منہ بسور کر کھانا مانگتا تھا۔ یہ ایک دم اتنا بڑا اتنا سمجھدار کیسے ہو گیا۔ یہ بڑی بڑی باتیں جو مجھے بھی سمجھ میں نہیں آتیں اس نے کب کہاں سے سیکھی ہیں، میں نے تو اسے کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

تمہیں پتہ ہے اگنی دا جب میں گھوڑوں کو بھگانے کے لیے باہر جاتا ہوں تو میں ہوا کے چکر میں اپنا پاؤں ضرور دھرتا ہوں۔ مہاراج کہتا ہے کہ اس چکر میں پاؤں دھرنے والا ہوا کے جادو کے زور سے باقی بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے خوب گھومتا ہے مسافر بنا رہتا ہے"۔

"بھگوان میں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا"۔ تو یہ مہاراج تھا جس نے میرے تیج کو ہوا کے چکر میں پاؤں دھرنے کا بتایا تھا۔"

"یہ چکر کیا ہوتا ہے" کرنل نے پوچھا۔

"صحرا میں رہنے والوں کے اپنے وہم ہیں"۔ میں نے اگنی دا کی جگہ جواب دیا "ہر جگہ کے چھوٹے چھوٹے وہم ہوتے ہیں شگون اور اشارے"۔

تیج اسکول سے کبھی واپس نہیں آیا۔ چھٹیاں ہوتیں تو وہ اپنے کسی استاد کے ساتھ پہاڑ پر بھجوا دیا جاتا سردیاں ہوتیں تو وہیں پڑھائی کی کمی پوری کرنے کے خیال سے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹکا رہتا۔ میں بولائی ہوئی دیوانوں کی طرح اپنے آنگن کے اندر دالانوں میں اور دالانوں سے باہر چھت پر نیچے پھرتی رہتی۔ آس لگائے لگائے راہ دیکھتے دیکھتے سولی پر لٹکے لٹکے مجھے نیند بھی نہ آتی لمبی دوپہروں کو جب سوچیں میرا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ ہے بھگوان اب کیا ہوگا؟ کبھی تو، کبھی تو سکھ اور تیج مجھے آن ملیں گے۔

جب اجے سر کی گڑھی کے باہر ایک سنسان رات میں تیج مجھے ملا ہے۔ تو اسے دیکھتی رہ گئی "تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔ گھر چلو۔ میرے سُونے آنگن میں بہار آ جائے۔ میں تمہاری راہ دیکھتی رہی ہوں "اگنی دا"۔ اس نے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر مجھے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اب میں بڑا ہو گیا ہوں اور تمہارے آنگن میں سما نہیں سکتا۔ تم نے ہی تو مجھے کہا تھا کہ تم سئودیسر ہو۔ اب تم مجھے کس آنگن میں لیے جاتی ہو۔"

وہ اتنا بڑا، ایک دم عقلمند ہو گیا تھا کہ مجھے کوئی جواب سجھائی نہ دیا۔ میں اس کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی، کھڑی رہی، اس کے پسینے کی سوگندھ اس کا بھرا ہوا جسم یہ سب میرے تھے۔ ہاں میں اب اس پر مان کر سکتی تھی۔ شتاب اور مہتاب کی ماں نہیں ہو نہیں۔ میں تیج کی ماں تھی۔ وہ مجھے کمزور بچہ سمجھ کر میرے سفید بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میرے ماتھے اور گالوں کو چوم رہا تھا مجھے گھڑی گھڑی اپنے سے لگا رہا تھا۔ تیج میرا بچہ تھا۔ میرا اپنا تھا۔

"تیج! میرے بچے آخر تم کہاں جا رہے ہو" جب اس نے مجھے اپنے سے الگ کیا تو میں نے پوچھا۔

"یہ گمبھیر، بڑی اور گہری رات ہے اس میں کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اس میں کیا ہے۔ نہیں معلوم نہیں بس میں یہی کھوجنے نکلتا ہوں۔ دآ، انجانے کا جادو، ہوا کا جادو، زور سے ٹکر لینے کا جادو مجھ کو گھیرے ہوتے ہے"۔ اس نے مجھے پھر اپنے ساتھ لگا لیا۔

مجھے بہلاؤ نہیں تیج۔ مجھے بتاؤ تم کہاں رہتے ہوں۔ راتوں کو کہاں گھومتے ہو۔ کچھ مجھے جاننے کا ادھیکار ہے۔ ہے کہ نہیں"۔ میں نے پوچھا تھا۔

اس نے ہنس کر کہا تھا۔ سارے ادھیکار تمہارے ہیں مگر ان سوالوں کے جواب کسی اور وقت دوں گا۔ جب کبھی پھر ملیں گے۔ صرف یہ کہتا ہوں کہ جب میرے زخموں کے نشان ابھرتے اور دکھتے ہیں۔ جب ان میں پھر سے ٹیسیں اُٹھتی ہیں تو میں ان لوگوں کے لیے دوا کھوجتا ہوں جو دُکھی ہیں اور جن کی مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ میرے لیے کسی گڑھی کی ضرورت نہیں، کسی نیلے ہیرے کی ضرورت نہیں۔"

"بے کار کی باتیں ہیں"۔ کرنل نے چٹائی پر اپنا پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"مجھے تیج نے یہی کہا تھا۔ تب سے اب تک۔ اس گھڑی تک جانے کتنا سمے بیت گیا ہے۔ میری اور اس کی بھینٹ کہیں نہیں ہوئی۔"

"میں تمہارے تیج کو ڈھونڈتا تو پھر رہا ہوں"۔ کرنل نے بات ختم کی ہی تھی کہ گولی چلنے کی آواز آئی ہم نے پھونک مار کر دیا بجھا دیا۔ بندوقیں اٹھائیں اور باہر کی طرف بھاگے۔ ستاروں کا غبار روشن اور زیادہ چمکنے والے تاروں کے درمیان آبشار کی طرح ہمارے سروں پر گر رہا تھا۔ جال میں سوتی ہوئی

چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں۔ بے چین ہو کر جاگ اٹھی تھیں، کہیں جنڈ اور کریں کی خشک ٹہنیوں پر پانی کے کنارے مینڈکوں نے اپنی چر چر پھر شروع کر دی تھی۔

بھاگتے قدموں، اونٹوں کے بلبلانے اور گولیوں کی ہر طرف سے آوازیں گھوم پھر کر سناٹے کو توڑ رہی تھیں۔ ہوا جس رخ چلتی آواز اُدھر ہی پلٹتی تھی۔

ہمارے پیچھے سے اگنی وا کی آواز گونجی۔ "تیج ٹھاکر میں یہاں ہوں۔ تمہاری اگنی وا۔"

ہمارے ہاتھ بندوقوں پر جم گئے۔ سانس رک گئی۔ جس طرف سے آواز ابھرے گی ہم اُدھر ہی نشانہ باندھیں گے۔

اور ہم ٹھیک ہی منتظر تھے۔ ٹوبے کے کنارے سے کسی نے زور سے کہا۔

"اگنی وا۔ سورگ میں۔" اس سے پہلے کہ ہم شست باندھتے بات ختم ہو گئی۔

رنہال پوسٹ پر جس اگنی وا کو ہم نے دشمن کے سپاہیوں کے حوالے کیا اس کا وزن چڑیا سے بھی ہلکا تھا۔ بند آنکھوں کے گرد عجیب مسکان تھی۔ بے دانتوں کا چہرہ بھرا بھرا تھا اور گلابی جیسے بھور کا لمحہ ہو۔ اجالے کے اور ہوا کے چکروں میں جانے کون قید تھا اور کون آزاد تھا۔ سورگ کہیں ہے بھی کہ نہیں۔

OO

روس سے — محبت کے ساتھ

بانو قدسیہ

کسی ملک، شہر، کسی موسم کو جاننے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر کسی واقعے یا انسان کی مہر لگ جائے ورنہ جگہوں کو دیکھ لینے سے کبھی وہاں کا کچھ یاد نہیں رہتا۔ شہر ملک اور موسم ہسٹری یا جغرافیہ میں محبوس نہیں رہ سکتے۔ لمحوں میں زندہ رہ جاتے ہیں جب میں نیا نیا روس گیا تو میرا خیال تھا کہ موسکاؤ کو جاننے کے لئے مجھے وہاں کی تاریخی عمارتیں، اُن کا لٹریچر، اُن کے اخبار، رہن سہن کا طریقہ اچھی طرح نوٹ کرنا چاہیئے —— یہ وہ وقت تھا جب میں موسکاؤ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈگری کے حصول کے لئے داخل ہوا تھا اسی لئے میں نے نہ صرف تیزی سے زبان سیکھنی شروع کی بلکہ وہاں کی عمارتیں اور میوزیم بھی کھنگالنے شروع کر دیئے۔

میرا سارا دن گردن اٹھائے گزرتا۔ خوبصورت بولشویک تھیٹر جیسی عمارتیں دیکھ دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ روس میں بھی آرکیٹیٹ کے مختلف اثرات کہیں نہ کہیں سے آتے رہے ہیں جب بہتے پانیوں میں خس و خاشاک اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ سولہویں سے اٹھارہویں صدی تک بائی زنطائین اثرات غالب تھے کیف، موسکاؤ، لینن گراڈ ان ہی تین شہروں کو عرصے سے کلچرل برتری حاصل رہی ہے کیونکہ عرصے سے روسی زندگی پر جنگلات حاوی رہے ہیں اس لیئے ان کی عمارتوں پر بھی عمارتی لکڑی کا چوکھٹا سجا ہے۔ یوں سمجھیئے روسی آرکیٹیٹ میں عمودی تسلسل ہے وہ دوسرے [illegible] کر بھی مستعار [illegible] کہ وہ [illegible] مائل ساخت روس [illegible] ہے کریملن کے دو اہم گرجے لاطینی شامل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پیٹرزبرگ کا تمام عمارتی سرمایہ جرمن، فرانسیسی، اطالوی اثرات سے پرکشش بنا ہے۔ نیو ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی جس کا میں طالب علم رہا ہوں سکائی سکریپرز کے انداز پر بنی ہے اور اس میں بتیس منزلیں ہیں۔ کریملن کے خوبصورت مؤلف انگریزوں کی احیا کی خوشبو میں لپے ہیں لیکن روسی لوگ باگ ان اثرات کو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ روس کا سب کچھ ان کا اپنا خود ساختہ ہے —— اور وہ آرٹ سے لے کر سائنس تک کسی کے مرہون منت نہیں رہے حالانکہ ان کی سائنسی ترقی میں بھی دوسروں کا ہاتھ رہا ہے۔

جس روز پہلی بار میں ایئر پورٹ سے اتر کر موسکاؤ کی طرف روانہ ہوا تو راستے کی ہمواری کبھی کبھار خوبصورت

دیہاتی بنگلے جنہیں روسی داچو کہتے ہیں نظر آنے لگے۔ میں نے اپنے ساتھی سے انگریزی میں کہا

"یہ علاقہ اسلام آباد کی طرح خوبصورت ہے۔ کیا آپ کبھی اسلام آباد گئے ہیں؟"

میرے روسی ساتھی کا رنگ گلابی ہو گیا۔

اسلام آباد؟ لیکن یہ تمام برچ کے درخت ہیں اور ماسکاؤ کی آب و ہوا اسلام آباد سے بہت مختلف ہے۔ یہ تمہیں کیسے خیال آ گیا کہ یہ جگہ اسلام آباد لگتی ہے۔ ——"

ایسی ہی ایک غلطی ایک بار ماں نے بھی کی تھی۔ میں تب تین سال کا تھا ہر ماں کی طرح میری ماں کا یہ خیال تھا کہ میں بہت خوبصورت ہوں اسی غلط فہمی کی بنا پر ایک مرتبہ اس نے اپنی جیٹھانی سے کہہ دیا "دیکھو تو قیوم تمہارے بیٹے سے کتنا ملتا ہے —— " میری تائی اماں کو ماں کی یہ بات اس قدر بری لگی تھی کہ اس دن کے بعد انہوں نے ہمارے گھر نہ آنے کی قسم کھالی۔

میں نے بھی اسی روز یہ فیصلہ کر لیا کہ روس کی کوئی بات پاکستان سے نہیں ملتی —— ہاں پاکستان کی تمام باتیں امریکہ اور روس سے ملتی جلتی ہیں۔

ہر نئے سیاح کی طرح ماسکاؤ میں ساتیا پہنچ کر میں بھی وہاں کی تاریخی عمارتوں کو ہی روس سمجھتا رہا۔ کریملن پولشکو تھیٹر، گرجے گھر، گمنام سپاہی کی قبر پر جانا میرا معمول تھا۔ اس کے سوا مجھے وطن کی ہسٹری کا خبط ہو گیا تھا اپنے ہم وطنوں کو روس کے متعلق معلومات بہم پہنچانا، خطوں میں روس اور پاکستان کا مقابلہ کرنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ جس طرح شاہی مسجد لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ پاکستان میں ایسے ہی یہ پتھریلی عمارتیں روس میں ہیں۔ یہاں کے لوگ بھی ان عمارتوں کو اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی مچھلی پانی کو دیتی ہے۔

عمارتوں کے چکر سے نکل کر میں نے میوزیم کھنگالنے شروع کر دیئے۔ آرٹ کا جس قدر خزانہ موسکاؤ اور لینن گراڈ میں ہے اسے ہی دیکھنے کے لیے ایک عمر کافی نہیں۔ پشکن اور کے عجائبات آرٹ تھرڈ ورلڈ کے مسافر کو ہمیشہ کے لیے تھکا دینے کو کافی ہیں۔ روس کا آرٹ دراصل ارتھوڈاکس عیسائیت سے بہت شدید طور پر وابستہ ہے۔ اس کا آرٹ ICON PAINTAING سے نکلا ہے۔ پہلے پہل وہاں کے آرٹسٹ حضرت مریم، حضرت عیسیٰ اور مذہبی روایات کو محفوظ اور قابل احترام بنانے کے لئے تصویریں اور بت بنایا کرتے تھے پھر جب منگول حملے شروع ہوئے اور ایشیائی لوگ یہاں رہنے بسنے لگے تو اس کے ساتھ ہی یونانی آرٹسٹ بھی آ پہنچا ملکہ الزبتھ کے دور حکومت میں بہت سے اطالوی اور فرانسیسی آرٹسٹ یہاں کام کرتے تھے۔ لیکن اٹھارویں اور بیسویں صدی میں یورپ کا اثر بعید نمایاں رہا۔

رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا سوشلسٹ ڈائنیمکز کے تحت ایک خاص قسم کا ادب اور بتوں کا رواج عام ہوا۔ میکسم گورکی کے ساتھ جو حقیقت پسندی شروع ہوئی تھی وہ لینن کے عہد میں MONUMENTS کی شکل اختیار کر گئی۔ اس نے فرداً فرداً بھی اور گروپس کی شکل میں بھی یادگاریں تعمیر کروائیں۔

لیکن کچھ عرصہ بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی ملک کا آرٹ، مصوری، بُت تراشی یہ سنگ میل ضرور ہیں۔ لیکن یہ بھی تمام تر اس ملک کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ ہر آرٹ اپنے عہد میں محبوس ہوتا ہے اور جس طرح ایک عہد ختم ہونے کے بعد لڑی تو بن جاتا ہے لیکن زندہ نہیں رہتا۔ ایسے ہی کسی ملک کا آرٹ نشان دہی تو کرتا ہے پر ملک نہیں ہوتا ——— ہمارے دیوں کی MINIATURE مصوری ہمیشہ زندہ رہنے والی تو ضرور تھی لیکن پاکستان نہیں تھی۔

جب تک میں سونیا سے نہیں ملا ——— تب تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ ہر ملک اس کے لوگوں سے عبارت ہوتا ہے .... اگر وہاں کے لوگ من بھائیں تو دیس اچھا لگتا ہے۔ ہوائیں، موسم، جغرافیہ آرٹ سب من بھاتا ہے ——— لوگوں سے مناسبت پیدا نہ ہو تو پھر واقفیت اخبار بن جاتی ہے ——— پچھلے دن کا اخبار کسی کام نہیں آتا ———

سونیا نے مجھے روس سے محبت کرنا سکھائی .... ناکافی محبت ناتسلی بخش محبت

افسوس تو اس بات کا ہے کہ میں سونیا سے بھی محبت نہ کر سکا کیونکہ ہم دونوں کے درمیان ایک دیوار حائل تھی .... تعلیم یافتہ لوگوں کے نظریات کی دیوار! .... یہ دیوار ہر سماج سے مضبوط تھی .... میں پورے تین سال روس میں رہا۔ میں کئی بار سونیا سے ملا ——— لیکن ان ہی نظریات کی وجہ سے ہر بار ہمیں نئے تعارف کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اس دن ہم یونیورسٹی کے سامنے مین سڑک پر کھڑے تھے۔ سامنے نشیب میں موسکاؤ دریا سست روی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ مہران، گنگا، مسس ازسپی یہ بڑے بڑے دریا ایسے ہی بہا کرتے ہیں جیسے انہیں اپنے کنارے بسنے والے شہروں کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ اگست کے مہینے میں موسکاؤ ویران ہو جاتا ہے۔ نوجوان لوگ چھٹیاں منانے شہر سے باہر چلے جاتے ہیں۔ بیلے اور تھیٹر والے ٹور پر چلے جاتے ہیں سکولوں کے بچے کیمپوں کو سدھارتے ہیں۔ سکول ٹیچر، متوسط طبقے کے افسر اور دکاندار لوگ شہر سے باہر دیہاتی گھروں میں جنہیں داچا کہتے ہیں کمر توڑ سردیوں کا اثر زائل کرنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔

یونیورسٹی میں اس قدر چہل پہل نہ تھی۔ موسکاؤ کی شام تھی جس میں حیدر آباد کا دھندلکا۔ لاہور کی اداسی، پشاور کے رنگ اور کوئٹے کی خوشبو شامل تھی ——— میرا دل اچانک رونے کو چاہتا تھا۔

سونیا کے جسم پر ہلکا ہلکا بلاؤز اور گہرا نیلا سکرٹ کمر پر کسا ہوا تھا۔ اس کا اجمالی اور تفصیلی تعارف بہت مرتبہ ہو چکا تھا لیکن روس جیسے بڑے ملک کی طرح جسے دیکھا تو جا سکتا ہے لیکن سمجھا نہیں جا سکتا وہ بھی کئی تعارفوں کے باوجود جانی پہچانی لیکن اجنبی لگتی تھی۔ اس کا جغرافیہ میں اچھی طرح سے جانتا تھا لیکن اس کے موسموں سے میں ناآشنا تھا۔

"ہم شاید رائٹرز یونین میں بھی مل چکے ہیں" سونیا نے بلی سی ناک سکوڑ کر پوچھا۔

"ہاں ہم لیکمکہ سنگ کے اس ریستوران میں سے تھے جہاں ٹالسٹائی نے اپنی ہیروئن کا ہیولا بنایا تھا۔ جہاں تم اپنی ایک سہیلی کے ساتھ سارا وقت پاسٹرناک اور سولزی نٹسن پر آگ برساتی رہی تھیں ——"

"میرے سامنے ان کا نام نہ لو ——— انہوں نے گریٹ اشیا کا استحصال کیا ہے۔ فرد کی عزت بنانے کا یہ بڑا عجیب طریقہ ہے"۔

میں چپ رہنا چاہتا تھا لیکن پھر رہ نہ سکا۔

ان کے ناول ساری دنیا میں مشہور ہیں اور حقیقت کے قریب ہیں ——"

"یہ دونوں مردہ پرست ہیں۔ ماضی کے پجاری ہیں۔ یہ تم مشرق کے لوگوں کو ماضی سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس طرح حال تباہ ہو جاتا ہے ——— بہتر مستقبل کی کوئی گارنٹی باقی نہیں رہتی"۔

"کیا تمہیں اپنے بچپن سے اپنے سکول سے اپنے آبائی گھر سے پیار نہیں ——؟"

"ہے —— پیار ہے لیکن بیماری کی حد تک ہم NOSTALGIA میں مبتلا نہیں ہوتے ——"

میں نے سڑک کو آہستہ آہستہ پار کیا اور سڑک کے کنارے بنی ہوئی ریلنگ تک جا پہنچا۔ وہ مجھ سے چند منٹ بعد یہاں پہنچی۔ موسکا ؤ دریا میں سورج کے تمام رنگ دفن ہو رہے تھے۔ دور دور تک موسکاؤ کا شہر ایک سوئی ہوئی پتنگ کی طرح آویزاں تھا۔

"بھلا خوبصورت لمحات کے جادو سے آزاد ہونے کا کیا طریقہ ہے سونیا؟ —— —— میں تو ماسکو یونیورسٹی کے سامنے گزارے ہوئے اس آدھ گھنٹے کو اپنے دیس لے جاکر ایسے ——، کرتا رہوں گا کہ بالآخر یہ وقت سوئی بن جائیگا ہم لوگ —— تو رامچھلی ہوتے ہیں سونیا سیپی کے اندر ایک خوبصورت لمحے کے آرزو مند ——— ایک قطرے پر زندگی گزارنے والے۔

وہ ہنس دی۔

"تم مشرقی لوگوں کو اپنے جذبات پر بڑا اعتماد ہوتا ہے۔ حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہیئے وقت سب کچھ بدل دیتا ہے"۔ وہ دیر تک ہنستی رہی۔ اس کی ہنسی میں کچھ ندامت کچھ زہر خند اور تھوڑا سا تصنع شامل تھا۔

روسی لڑکی سولہ سے اکیس سال تک پدمنی، کامنی، شائستہ رو، جمال، جلال سب ہوتی ہے۔ اس وقفے میں اسے کوہ قاف کی پری سمجھنا آسان ہے۔ اس کے بعد چاول کی سفید دہی میں خمیر لگنے لگتا ہے۔ یہ خمیر کی طرح پختہ ہو کر پھیلنے لگتی ہے۔ اس میں روڑی کوٹنے والے انجن کی طرح مضبوطی آجاتی ہے —— وہ پھیلتی جاتی ہے مضبوطی کے لئے....... جگہ کے لئے۔ کپڑوں کے اندر۔ صوفوں کے اوپر، ادھر ادھر ہر جگہ۔

لیکن جوانی کے شروع میں یہ کسم کے پھولوں کی طرح زردی مائل سفید ہوتی ہے ——— زرد خوشبودار اور بےحد نازک ——— شاید اسی لئے اس عمر میں ہر روسی لڑکی گھر بسانے کی آرزو مند ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد وقت تیزی سے ڈھلنے لگتا ہے ——— روسی لڑکی پر دوپہر کے بعد سہ پہر شام، پہلی رات نہیں آتی

بلکہ دوپہر کے بعد رات کا آخری پہرہ آجاتا ہے۔

میں نے غور سے سونیا کی طرف دیکھا ——— روس میں شاید مرد اور عورت کے حقوق برابر ہوں ——— ہوسکتا ہے وہاں ڈاکٹر انجینئر استادوں کا جب شمار کیا جائے تو عورتیں مردوں سے زیادہ ہوں ——— لیکن مجھے نکیتا خروشیف کا قول کبھی نہیں بھولتا ——— اس نے کبھی کہا تھا ——— " روس میں مردوں کے ذمہ انتظام ہے لیکن سارا کام قریباً عورتیں کرتی ہیں" صبح سویرے جب میں ایروفلوٹ سے اتر کر پہلی مرتبہ روس کی دھرتی پر اترا تھا، تو ہر طرف بیرل نما سفید موٹی روسی عورتیں بڑے بڑے جھاڑو، بالٹیوں میں گھلا ہوا صابن و ٹاکیاں برش لئے پھر رہی تھیں۔ ان کی عمریں میری دادی کی عمر کے قریب تھیں ان کے جسم تھری ٹنر ٹرک کی طرح بھاری تھے ——— یہ وقت ہمارے دیس میں چارپائی توڑنے، عبادت کرنے، پوتے نواسے کھلانے اور بہو بیٹیوں پر رعب جمانے میں گزرتا ہے موٹی دادی دیگ کی دیگ سارے گھر کی لاڈلی ہوتی ہے لیکن یہاں سڑکوں پر بھاری معمر عورتیں سروں پر سفید رومال باندھے ٹرک چلا رہی تھیں، سڑکیں دھو رہی تھیں، سارا سارا دن میوزیم کے سامان کی نگرانی میں ایک کھڑی کرسی پر بیٹھ کر اکڑ جاتی ہیں میری ماں بھی صبح سے شام تک کام کرتی ہے لیکن صرف بچوں کے لئے .... شوہر کے لئے گھر کے لئے، وہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہیں کرتی، روزی اس کی اماں کا مسئلہ نہیں ہے۔

میں نے پھر سونیا کی طرف دیکھا۔ شاید آج سے تیس برس بعد جب میں واپس ماسکو آؤں تو سونیا تین من کی ہو چکی ہو۔ اس نے سمور کی ٹوپی پہن رکھی ہو اور وہ بیلچے کے ساتھ بڑی سڑک سے برف اٹھانے میں مصروف ہو۔ پتہ نہیں وقت آگے کی طرف بھاگ رہا تھا کہ پیچھے کی طرف ——— پتہ نہیں ہر لمحے کے سنگ لوح پہ اپنی موت کی عبارت لکھ کر نئے لمحے کا استقبال

"یہ مت سمجھو سمرد کہ صرف تم مشرقی ہو ——— مجھ میں بھی مشرقی لہو ہے میری نانی کا خاندان ازبکستان سے آیا تھا آدھا روس ایشیا میں ہے ——— "

لیکن طاقت ور اور امیر وہی روس ہے جو سفید ہے اور یورپ سے ملتا ہے۔ جس کا رہن سہن رسم و رواج سب مغربی ہیں ——— "

سونیا دل برداشتہ ہوگئی وہ روس پر کوئی بات برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

"ہر ملک کا جنوب ہمیشہ گرم بھی ہوتا ہے اور غریب بھی۔ بھلا اس میں طعنے کی کیا بات ہے ؟" سونیا نے زچ ہو کر کہا۔

"ہمارے کراچی میں آکر دیکھو تو حیران رہ جاؤ ——— سارے پاکستان کی دولت وہاں جمع ہے ———"

"تمہاری کیا بات ہے۔ تمہاری نظریاتی ریاست جو ہوئی ——— وہاں تو ہر بات الٹی ہوگی ہی"

سونیا مجھ پر جیسے ایک گول کر گئی ——— ہم دونوں جب بھی ملتے تھے اس بات کے درپے رہتے تھے کہ ایک دوسرے کو زچ کریں۔ ہم ایک دوسرے کو نظریاتی شکست دینے کے اس قدر درپے رہتے تھے کہ ہمیں بھول

نا تھا کہ ہم دونوں کو قدرت نے آپس میں محبت کرنے کے لئے بنایا ہے ـــــ ـــــ !

مرد اور عورت کی محبت میں ازل سے رکاوٹیں آتی رہی ہیں۔ یہ رکاوٹیں دراصل وہ پتھر ہوتی ہیں جو پہاڑی دں کی رفتار بڑھا دیتی ہیں۔ کبھی ماں باپ کبھی سماج، کبھی مذہب کبھی رسم و رواج و قبیلے کی روک تھام ان کے ستے میں چیک پوسٹ بن جاتا ہے۔ لیکن جب مرد عورت ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو اصل میں ان مذہب سماج قبیلہ رسم و رواج ایک ہو جاتے ہیں جیسے سیٹ تھیوری کے مطابق ایک شامیانے تلے لگا ہوا سارا سامان یک ہی بریکٹوں میں بند ہو جائے ـــــ لیکن بیسویں صدی میں ایک ایسی چیز ایجاد ہو چکی ہے جو مرد اور عورت کی ہمی کشش کے باوجود ایک نہیں ہوتی ـــ یہ نظریات ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے میں مکمل طور پر ضم ہونے کے وجود اپنے اپنے نظریات سے محبت کئے جاتے ہیں اور ان نظریات کی وجہ سے ایک دوسرے کو مکمل طور پر قبول نہیں کرتے۔

جب بھی میں سونیا سے ملا وارفتگی سے ملا لیکن جیسے اچانک بریکیں لگ گئیں خودبخود۔

اگر ہم دونوں کو اپنے اپنے ملک سے ذرا کم محبت ہوتی اگر وہ روس کی کمیونسٹ پارٹی کے آدرش کی پجارن نہ ہوتی اور میں دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی ایک نئی ریاست کا عاشق نہ ہوتا تو شاید ہم ایک دوسرے کو جھٹ جھپا ڈال لیتے اور اظہار محبت کو اس قدر گھورے میں نہ ڈالتے لیکن بدقسمتی سے جب بھی کسی سے محبت کرنی ہو باقی تمام محبتیں دل سے نکالنا پڑتی ہیں اور فی الحال ہم دونوں وطن پرست تھے۔

اس شام پتہ نہیں کیوں ہم موسکاؤ یونیورسٹی کے سامنے ایک بار پھر اجنبی بن گئے۔

" مجھے تمہارا نام بھول گیا ہے ـــــ " سونیا نے مجھ سے قصاص لینے کے انداز میں کہا۔

" عثمان سمرد ـــــ پاکستان میں ایک صوبہ سندھ ہے۔ اس میں مہران دریا بہتا ہے جیسے تمہارے دیس میں والگا نیوا ماسکاؤ میں بہتا ہے۔ یہیں حیدر آباد شہر آباد ہے اور اس میں ہمارا خاندان رہتا ہے۔ بہت پرانا کئی صدیوں تک .... ہمارے خاندان کے ہاتھ میں سندھ کا اقتدار رہا ہے ـــــ "

" سمرد آسان ہے " سونیا نے آہستہ سے کہا

" پچھلی مرتبہ جب تم مجھے ملی تھیں تب تم نے کہا تھا کہ عثمان یاد رکھنا آسان ہے "

" پتہ نہیں فارن نام مجھے یاد نہیں رہتے۔ ـــ "

" میرا خیال ہے انہیں یاد رکھنے کی کوئی ایسی خاص وجہ بھی نہیں ہے ـــــ "

ہم دونوں غالباً دنیا کی خوبصورت ترین یونیورسٹی کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ میں اسے بغل میں چھپا کر راون کی طرح کسی جزیرے کی طرف روانہ ہو سکتا تھا۔ میں اعتراف کرنا چاہتا تھا کہ سورج کی ترچھی کرنیں اس کی براؤن آنکھوں میں آگ سی لگا رہی تھیں۔ میرا قد سونیا سے فٹ بھر اونچا تھا لیکن پتہ نہیں اس محبت کے اعتراف میں مجھے اپنے ملک کی ذلت نظر آئی۔ مجھے لگا جیسے وہ دل میں کہے گی دیکھا یہ ہوتی ہیں سوپر پاورز .... یہ ہوتے ہیں سفید فام لوگ ـــــ تم تیسری دنیا کے لوگ ایڈ کے بغیر زندہ

رہ جو نہیں رہتے جب یہ دانہ دکھ معاشی ہو یا جذباتی تم لوگ ہمارے بغیر لمحہ بھر کو کھڑے ہو ہی نہیں سکتے تمہیں جتنی ملن لگتی ہے ہمارے وجود سے لگتی ہے۔

موسکاؤ دریا کا رنگ اب مٹیالا ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کی عمارت کی بتیاں جلنے لگی تھیں اور اچانک سیں سیں کرتی ٹھنڈی ہوا دریا کی طرف سے اوپر کو آنے لگی تھی

"پچھلی چھٹیوں میں تم کہاں گئے تھے؟" ۔

"یورپ ——— "

"اور اس سے پچھلی چھٹیوں میں؟ ——"

"حیدرآباد میری ماں بیمار تھی ——— "

"اور واپس کب چلے جاؤ گے؟ ——— "

"اِس ماہ کے بعد ——— "

"اور روس کب دیکھو گے؟ ——— "

"شاید ہم طالب علم کبھی بھی روس نہیں دیکھ سکتے ——— ہمیں صرف پراپیگنڈا پڑھنے کو ملتا ہے ——— تمہاری سوویت زندگی پر IDEOLOGY چھائی ہوئی ہے تم لوگ GLORY TO LABOUR ——— کمیونسٹ پارٹی زندہ باد کے نعرے لگانے کے بعد بھی نارمل زندگیاں بسر کرتے ہو لیکن ہم اس فلٹر کے پیچھے نہیں دیکھ سکتے۔ ہم ریڈیو، ٹیلی ویژن سرکس میں بھی اگر روس کو دیکھنا چاہیں تو بھی ہم خبر سے زیادہ کچھ نہیں جان سکتے اور روس خبر دں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ——— "

"میں تمہیں روس دکھا دوں گی ——— میں ٹورسٹ گائیڈ رہی ہوں کافی دیر"

روس دیکھ کر کیا کریں گے سونا جیسا ایک دیس ویسا دوسرا دیس .... اب تمہارے اتنے بڑے ملک میں تین سال رہنے کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا ہوں"

"یعنی؟ —"

"ابھی انسان نے انسان کے ساتھ رہنا نہیں سیکھا .... ابھی انسان کو وہ چابی نہیں ملی جو خوشی کے تالے میں اپنی مرضی سے فٹ ہوتی ہے ——— اور ابھی .... انسان کا کسی ایسی طاقت کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا جو اس کی تمام مشکلات کے وقت اس کے دل پر پھاہا رکھ سکے ——— دولت بانٹ لو تمام ذرائع سانجھے کر لو کچھ فرق نہیں پڑتا ——— "

"نہیں ہمرو روس اور باقی ملک ایک سے نہیں ہیں ——— یہ ملک عام آدمی کا ملک ہے نادار مفلس آدمی کا ملک .... باقی ملک امیر آدمیوں کے ملک ہوتے ہیں ——— "

"پھر بتاؤ سونیا کیا یہاں عام آدمی خوش ہے؟ ——— کیا کمیونزم انسانی دکھوں کا علاج ہے ——— واحد علاج؟

اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبایا اور پھر آہستہ سے بولی —— "ہاں ——"
"کیسے کیسے کیسے ——" میں نے گرج کر کہا —— "ابھی پرسوں میں سینٹ نکولس کے گرجا گھر
گیا تھا —— شام کا وقت تھا۔ گرجے کے اندر ایک جنازہ پڑا تھا اور ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں موم بتی لئے
اپنے کفناتے ہوئے بیٹے کے لئے رو رہی تھی —— وہ اسی طرح غم کے آگے ہنستی تھی جیسے ہم تھرڈ ورلڈ کے
آدمی ہوتے ہیں۔ اس کے آنسوؤں میں وہی دکھ تھا جو کسی سرمایہ دار ملک کی عورت کے آنسوؤں میں ہوتا ہے۔
بتاؤ یہ خوشی ہے —— یہ علاج ہے انسانی دکھوں کا؟ ——"
سونیا نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا —— "تم ایشیا کے لوگ روس محض یہ دیکھنے آتے ہو —— کہ
ہم لوگ اس حد تک ناکام ہوتے ہیں تم لوگ مسجدوں میں گرجوں میں ...... صرف یہ دیکھنے جاتے ہو کہ روس ابھی تک
کتنا مجبور ہے اور مجبوری کے وقت کسے پکارتا ہے ...... تم لوگ یہ دیکھنے نہیں آتے کہ روس نے کس قدر
فاصلہ طے کر لیا ہے انسانی حرماں نصیبی کا ...... بیوقوف آدمی ...... جنگلی شخص ہم انسان کے ظلم انسان کی
درندگی کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ خدا کے دیتے ہوئے غموں کے خلاف بغاوت نہیں کر رہے ...... ہماری
کوشش ہے کہ انسان انسان کو دکھ نہ دے —— سب برابر ٹھہریں"

"مساوات ہمارے مذہب کی بھی اساس ہے ——"
"ہاں ہے —— لیکن اعتراف تک ...... ہم لوگ اسے پریکٹس کرتے ہیں تم لوگ اسے نعرے کے
طور پر استعمال کرتے ہو —— بس اتنا فرق ہے"۔
میں پسپائی کے عمل میں تھا اور میری مردانگی اس پسپائی کو قبول نہ کر رہی تھی اس لئے میں نے جو بھی اعتراضات
مجھے کمیونزم پر معلوم تھے ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔ سونیا پہلے مجھے تعجب سے دیکھتی رہی پھر یکدم ہنس دی
"تم —— تم سرد رودگوزن ہو —— رودگوزن"
اس وقت تک میں نے دوستوفسکی کی ایڈیٹ نہیں پڑھی تھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ رودگوزن کیسا طوفانی کردار
تھا جو اپنی شکست کو آسانی سے قبول نہیں کرتا —— اس وقت وہ مجھے رودگوزن پکار کر جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔
میں قزاق لیٹرا، پاگل ...... جانے کیا کچھ تھا۔
"تم تھرڈ ورلڈ کے آدمیوں کو تو بہت ہمدردی ہونی چاہیئے۔ تم لوگ الٹا ہم ہی سے لڑتے ہو —— باباہم
ان مصیبتوں سے نہیں لڑتے جو خدا ہم پر نازل کرتا ہے —— موت حادثات ...... بدصورتی ...... پیدائشی
جسمانی محرومی —— بلکہ کمیونزم ان لعنتوں سے چھٹکارا دلاتا ہے جو انسان انسان پر ٹھونستا ہے مثلاً غریبی ......
بے روزگاری ...... مواقع کی کمیابی ...... کمیونزم نے خوشی کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا رودگوزن ...... بلکہ انسان
کو یہ احساس دلایا ہے کہ سب گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں جب کسی کو کھانے کو نہ ملے تو وہ بلبلاتا ہے،
منہ پر تھوکو تو اسے ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے"۔

"اخوت کا سبق چودہ سو سال پرانا ہے ــــ کچھ نیا نہیں ہے ــــ احمق لڑکی"
وہ اب بالکل چڑ گئی ــــ "بتاؤ بتاؤ تمہارا چودہ سو سال پرانا سبق کہاں لاگو ہوتا ہے ــــ کس ملک میں؟
ایران ــــ افغانستان ــــ سعودی عرب پاکستان ــــ؟ ــــ بتاؤ ــــ"

اب ہم دونوں ایک دوسرے کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے دو ننگی تلواریں آپس میں آڑھی تنی ہوں میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اگر مجھے اپنے وطن اپنے مذہب سے کچھ کم محبت ہوتی یا سونیا تمام تر اپنے دیس اپنے ملک کی دیوانی نہ ہوتی تو ہمیں ایک دوسرے کا وجود ضرور نظر آجاتا۔ کبھی کبھی کوئی مشن کوئی آدرش کوئی تخلیق بھی انسان کو انسان کے قریب آنے سے معذور رکھتی ہے۔ مذہبی حد بندی، نسلی حدود، زبان کا اختلاف، دیس کی سرحدیں کئی ناگزیر حالات محبت کے راستے کا اندھا شیشہ ہیں۔ یہ حالات، فرق اونچ نیچ ہمیشہ سے مختلف روپ دھارتی رہی ہے لیکن پہلے انسان جس حد تک دوسروں کی محبت کا محتاج تھا اب نہیں رہا۔ اب وہ انسان کی جگہ اشیاء اور نظریوں کا زیادہ محتاج ہوگیا ہے پہلے رکاوٹیں بیرونی ہوا کرتی تھیں۔ اب خندقیں، فصیلیں حصار خود ساختہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے زیادہ ناقابلِ فہم اور دقیق ہوتے ہیں! اور آدمی کتے کی طرح اپنی ہی دم کے تعاقب میں چکر کاٹتا رہتا ہے اور کبھی سرے تک نہیں پہنچتا۔ میں اور سونیا بھی ایک دوسرے کی ہمدردی، محبت دوستی کے حاجتی تھے لیکن ہم دونوں اپنے اپنے گرد لگی ہوئی سرکنڈوں کی باڑ ٹھیک کرتے رہے اور ایک لمحے کے لئے بھی ہمیں خیال نہ آیا کہ اس باڑھ کے باوجود ہم اوپر سے ہاتھ تو ملا سکتے ہیں۔ یہ مصنوعی فاصلے اس طرح تو پاٹ سکتے ہیں۔

"میں چلتی ہوں سمرد ــــ"

"تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ ــــ"

"نہیں سمرد آج مجھے نتاشا کو فلم دکھانے لے جانا ہے ــــ"

"کونسی فلم؟ ــــ"

"محبت کے غلام ــــ میخالکوف نے اسے بنایا ہے ــــ"

"روس میں ایسے نام کی فلم پر تعجب ہوتا ہے ــــ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے دیس میں یہ دیوانگی نہیں ہوتی ــــ"

"کیوں ہم انسان نہیں؟ ہماری جبلتیں نہیں ــــ ہم محبتیں نہیں کر سکتے"! اس نے غصے سے کہا ــــ
"ہیں بابا ہیں جبلتیں ــــ تم سب سوپر مین ہو دنیا بھی چلا لیتے ہو اور خوش بھی رہ لیتے ہو۔ اس کی کہانی کیا ہے محبت کے غلام کی ــــ"

"ایک چھوٹا سا معصوم گروپ کوشش کرتا ہے کہ وہ انقلاب میں نہ پھنس جائے ــــ"

"بس بس میں تو سمجھا تھا کہ کوئی واقعی محبت کی کہانی ہوگی ــــ"

"ہمارے لٹریچر کو تم مات نہیں کر سکتے سمرد...... تم کو ایسا ہی محبت کی کہانیوں کا شوق ہے تو اپنا کرمینا

پڑھو — وار اینڈ پیس پڑھو۔"

ہم دونوں شہر کی جانب جانے والی سڑک پر چلنے لگے پتہ نہیں کیوں میں نے آہستہ سے کہا
"میرے وطن چلو سونیا .... وہاں عورتیں سڑکیں نہیں دھوتیں .... حیدر آباد میں ہماری کوٹھی میں ان گنت ملازم ہیں ایک خانساماں، دو نوکرانیاں .... مالی جمعدار .... تمہیں آرام ہی آرام ملے گا ——"
وہ رک گئی اور چہرہ پھیر کر بولی —— "میں سبزی نہیں ہوں جو میری نلائی کے لئے، پانی دینے کے لئے دوسرے مقرر ہوں تم ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے لوگوں کو آرام سے اتنی محبت کیوں ہے —— کیا تمہیں یہ انسان کی ذلت نہیں لگتی کہ ایک آدمی کے آرام کے لئے دوسرے آدمی اس کے خدمت گزار بن جائیں۔ میں تو ایسے آرام میں ایک گھنٹہ بھی خوش نہیں رہ سکتی ——"
میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "اگر تمہیں سڑکیں دھونی پڑیں —— ہوٹلوں کے فرش چمکانے پڑیں۔ ٹرک چلانے پڑے تو —— تو سونیا ——؟"
"تو کیا میں روس کی سڑکیں صاف کروں گی اپنے روس کی —— یہ کچھ کم اعزاز نہیں میرے لئے ——"
"تم جیسی شکل و صورت کی لڑکی تو مہارانی بن کر رہ سکتی ہے اپنے سندھ میں ——" پھر میں نے مذاق کے ساتھ کہا —— "میرے ساتھ چلو جب تک میں کام کروں گا تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ تمہاری جگہ کھانا بھی میں کھا لیا کروں گا ——"
وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی —— "کیوں؟ کیا میں لولی لنگڑی ہوں۔ اپاہج ہوں —— میں کسی کی دی ہوئی روٹی کیوں کھاؤں؟ —— میں عورت ہوں ہاتھ پاؤں والی ......؟"
"تمہاری مرضی —— آفر اچھی تھی ——"
"شکریہ ٹرمز اچھی نہیں تھیں ——"
ہم دونوں ہنس دیئے کر ے کا وقت آیا اور چلا گیا وہ بس پر سوار ہو گئی اور میں یونیورسٹی کی طرف لوٹ گیا۔

سونیا سے میری کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں کئی بار باہمی دوستوں نے ہمارا تعارف کرایا تھا لیکن سب سے پہلی بار وہ مجھے یوریا ہاسٹل میں ملی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے مجھے روس آئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا میں کسی دوست کی شدید آرزو رکھتا تھا زبان کی اڑچنیں گونگے بن کا احساس دلاتی تھیں اس وقت میں ریڈ سکوئیر، لینن کی قبر پشکن، میوزیم، ٹیلی ویژن ٹاور، بولشویک تھیٹر اور دوسری تاریخی عمارتیں دیکھنے میں مشغول تھا۔ روس کا فوٹو سٹیٹ ذہن میں تیار کرنا میرے لئے بڑا مشکل کام تھا روسی مزاج، رسم و رواج، بدحواسیاں، تضادات رہن سہن کی اڑچنیں آپس کی مشکلات کا مجھے علم نہ تھا۔ ابھی تو میں ایک گریٹ ملک، گریٹ قوم ایک گریٹ آدرش کے سامنے یوں کھڑا تھا جیسے کوئی بوناٹیلی ویژن کے ٹاور کو دیکھ رہا ہو۔

اس روز میں اپنی پاکٹ بک میں لکھی ہوئی روسی اور ماسکو کے نقشے کے سہارے پینوراما پہنچا جو ٹرمف گیٹ کے قریب ہے اور اس تاریخی واقعے کی خوشی میں تعمیر کیا گیا ہے کہ روس نے نپولین کو لپسا کر کے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

شاید یہ میرا وہم ہو یا اندازے کی کمی ہو لیکن روسی خاصکر سفید روسی اپنے لئے نپولین کی شکست کو اپنی تاریخ کا ایک بہت بڑا سنگ میل سمجھتے ہیں۔ وہ نپولین کی شکست کو اپنی قومی ٹوپی میں سرخ پر کی طرح سجائے رکھتے ہیں لیکن پتہ نہیں وہ کونسا عمل ہے ——— وہ کونسا طریق کار ہے جس کے زیر اثر ہمیشہ سے فاتح مفتوح کو پیروں تلے روندنے کے بعد اسی مفتوح کا اسیر ہو جاتا ہے ——— اکبر اعظم کے محل میں جودھا بائی . . . . . محمود غزنوی کے دربار میں ہندی کاریگر . . . . . سکندر کے ہمراہ ہندوستان کے ستارہ شناس طبیب . . . . مسلمانوں میں ذات پات کی تمیز اسی عمل سے وجود میں آئی۔

مجھے محسوس ہوا جیسے روسی فرانس سے بیک وقت نفرت اور محبت کے رشتے میں مبتلا ہیں۔ ان کی آرٹ گیلریوں میں عموماً وہی تصویریں قابل ذکر ہیں جو فرانس سے آئی ہیں یا ان کے سکولز آف تھاٹ کے مطابق بنی ہیں۔ ان کے ہاں آرٹ جمال، فیشن، لباس کا اندر ہی اندر کہیں وہ پیمانہ چھپا ہے جو فرانس کا ہے جیسے حضرت یوسف نے اپنا پیمانہ بھائیوں کے غلے میں چھپا دیا تھا ایسے ہی نپولین برفوں میں دھنستا شکست خوردہ اور تہی داماں جاتے ہوئے اپنے فرانس کی میٹر روڈ کہیں کہیں برف میں چھپا گیا تھا۔ اب کلچر کی دنیا میں جو کچھ بھی روسی کرتے ہیں بظاہر روسی انکے اعتبار سے اس میں خود رائی ہوتی ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے اندر ہی اندر وہ نپولین کے میٹر سے ناپتے ہیں اور اسی کے پیمانے سے تولتے ہیں ——— کسی کو شکست دینے کی اتنی قیمت تو ہمیشہ ادا کرنی پڑتی ہی ہے ——— بالآخر فاتح کو مفتوح کا رنگ ہی اختیار کرنا ہوتا ہے۔

ان دنوں سونیا پینوراما میں گائیڈ تھی۔ جس وقت میں اوپر پہنچا وہ ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی لئے روسی لب ولہجے میں ساری تصویر کے متعلق انگریزی میں معلومات امریکی سیاحوں کو سنا رہی تھی۔ پینوراما دراصل ایک تصویر ہے جو گول بڑی دیوار پر چسپاں ہے اس پر کچھ ایسی چابکدستی سے روشنی کی گئی ہے کہ سرکلارا ما کی طرح اس میں تین سمتی پن موجود ہو گیا ہے۔ ہر چیز اپنے پیک گراؤنڈ میں جیتی جاگتی اور اصل محسوس ہوتی ہے۔ تمام سیاح اس تصویر کو اتنی توجہ اور تحیر سے دیکھتے ہیں جیسے روبکاری کے لئے آئے ہوں

سونیا نیلے سکرٹ اور سفید بلاؤز میں ملبوس سر پر سفید رومال باندھے ذرا سی گنگناتی آواز میں کہہ رہی تھی "یہ تصویر جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں ۱۸۱۲ء میں نپولین کی شکست کا منظر پیش کرتی ہے۔ تصویر بونو جیف گاؤں کی ہے۔ اس مقدس سرزمین سے جب نپولین کو بھگایا گیا تو اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ گھوڑے پر بھی چڑھ نہ سکتا تھا اور اپنی ٹوپی چہرے پر یوں کھینچ کر موسکاؤ سے روانہ ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں کے آنسو کوئی دیکھ نہ سکے ——— "

میں باری باری تصویر اور سونیا کو دیکھتا رہا ——— پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

تصویر [illegible] واقعی غیر معمولی جان تھی۔ جہاں الاؤ روشن تھا وہاں سے سینک آتا محسوس ہوتا تھا۔ گھوڑے کے پسینے [illegible] گمان تھا۔ گھروں سے جو دھواں اٹھ رہا تھا اس کے ختم ہو جانے کا امکان تھا تصویر زندگی کی طرح ایک لمحے کی گرفت میں آئی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ کھڑی ہوئی ایک بڑھیا سے سوال کیا ——— "یہ تصویر کس نے بنائی ہے؟" میرا خیال تھا وہ روسی عورت ہے لیکن اس امریکی عورت نے آنکھ مار کر جواب دیا؛

ایک فرانسیسی نے اور کس نے۔

"بھلا ایسی پینٹنگ کوئی روسی بنا سکتا ہے؟ ——"

مجھے جواب دیتے ہی وہ پیٹھ موڑ کر چلی گئی

تصویر سے میں نے سونیا کی طرف نگاہ کی۔

لمحہ بھر کے لئے مجھے شبہ ہوا کہ چھتری کے ساتھ تصویر دکھانے والی بھی کہیں دھوکا ہی نہ ہو —— کہیں وہ بھی تصویر ہی کا حصہ نہ ہو اور روسی سائنس دانوں کا کرشمہ نہ ہو ——— وہ بھی تصویر کی طرح بے عیب تھی۔ وہ بھی تصویر کی طرح ایک چھپے ہوئے حزن کا سراغ دیتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگا جیسے سونیا اور تصویر دونوں فرانس کی امپورٹ کی ہوئی ہیں۔ وہ بہت نازک خوبصورت اور خوشبودار نظر آتی تھی ——— بغیر فل شاپ کا نام ڈالے وہ رٹا ہوا لکھان دہرائے جا رہی تھی سامنے قطار میں کھڑے سیاح تمام اس کی طرف تصویر کی جانب ٹکٹکی باندھے یوں کھڑے تھے جیسے دار و عہ گھاٹ کے روبرو کھڑے ہوں۔

پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ بھی میری طرح گائیڈ کے فرائض ہی ادا نہیں کر رہی بلکہ اندر ہی اندر اور پڑتے لگا رہی ہے وہ سوچ رہی ہے ابھی میٹھا چیز بھی خریدنا ہے ——— داڑکا کی بوتل کے لئے پتہ نہیں پیسے بچ بھی سکیں گے کہ نہیں ——— شاید میں کچھ حصہ مل کر جاؤں تو کچھ پیسے بچ جائیں یہ روبل اتنی جلدی کیوں ختم ہو جاتے ہیں؟ وہ بھی میری طرح اندر ہی اندر اپنی اکونومکس درست کر رہی تھی

یہ سونیا سے میری پہلی ملاقات تھی ......

وہ پینورامیں پرانی گائیڈ تھی اور میں یونیورسٹی میں نیا طالب علم ——— لیکن اس دن کی ملاقات کچھ مسلسل نہ ہو سکی۔ ہم کچھ دیر کے لئے ملے ...... بس شاپ تک پہنچے ٹرام میں بیٹھے اور اپنی اپنی منزل کو روانہ ہو گئے میرے لئے پینوراما کی تصویر کے سامنے کھڑی ہوئی سونیا اس تصویر کا حصہ بن گئی ......

ملاقاتوں کا بھی عجیب گراف ہے کچھ لوگوں سے روز روز ملاقات ہوتی ہے اور ان کا کچھ اثر طبیعت پر مرتب نہیں ہوتا ——— کچھ لوگ اتفاقاً ملتے ہیں۔ بجلی کی سی تیزی سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ چند نظریں کچھ جملے، ایک آدھ لمس کے کاربن پیپر مل جاتے ہیں جن پر آپ بھی لکھ کر کئی عبارتیں کئی تصویریں کئی شکلیں بنتے رہتے ہیں مجھے روس سے متعارف کرانے والی ——— روس کے قریب لانے والی سونیا تھی اس سے پہلے میں حیدرآباد لوٹ جانے کی سوچ رہا تھا۔ سونیا کو دیکھنے کے بعد مجھے روس اپنی ہی خالہ کا گھر نظر آنے لگا۔

دراصل ہر شخص اپنے ملک کا فسٹ سیکرٹری ہوتا ہے اس کے وجود کے ساتھ ایک ساری ایمبسی کام کر رہی ہوتی ہے۔ دوسرے ممالک کے لوگ جس تناسب سے اس سے متاثر ہوتے ہیں اسی لحاظ سے وہ اس کے ملک سے رعایت برتنے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امریکہ وہی ہے جو امریکیوں نے اسے دکھایا...... انگلستان وہی کچھ ہے جو انگریزوں نے اسے ظاہر کیا .... میری بھی شدید آرزو تھی کہ سونیا میری وجہ سے پاکستان کو دنیا کا سب سے خوبصورت ملک سمجھنے لگے ....

کچھ دنوں بعد وہ مجھے مائی کوسکی چوک کے قریب کارڈ خریدتے ہوئے مل گئی ——— میرے ہاتھ میں گمنام سپاہی کی قبر کا کارڈ تھا جسے میں اپنے صوبیدار چاچا کے لئے منتخب کر رہا تھا ——— ہم دونوں نے اپنے اپنے کارڈ خریدے سونیا نے میرا حساب لگا کر مجھے روبلز بتائے اور ہم دونوں قریبی کھوکھے سے آئس کریم کھانے چلے گئے آئس کریم کھانے کے بعد اس نے اپنے ساٹھ کوپک ادا کئے اور میں نے اپنی آئس کریم کی قیمت ادا کی ——— ہم دونوں سڑک کنارے بینچ پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے اس سے اس کا پتہ پوچھا وہ مسکرا دی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے لیکن اچانک سورج نکل آیا ———

"کیا کرو گے میرا پتہ پوچھ کر ——— "

"کبھی کسی روز تمہارے گھر آؤں گا ——— "

"ایسے ہی ٹھیک ہے سرو .... یہاں وہاں کسی وقت بغیر تعین کے"

"کیوں؟ ——— "

"تم یہاں اجنبی ہو ...... تم یہاں کے رسم و رواج نہیں جانتے ..... بس ایسے ہی ٹھیک ہے ——— اتنا ہی کافی ہے"

وہ مسکراتی ہوئی روانہ ہو گئی۔ ——— ایسی لڑکی کا کوئی کیا کرتا جس کا ٹھکانہ ہی معلوم نہ ہو۔

یونیورسٹی میں مجھے بہت لڑکیاں ملیں۔ بہت سے روسی لڑکے دوست بن گئے ——— یہ لوگ سادہ دل اور مخلص تھے انہیں اپنے ملک سے بڑا شدید پیار تھا جیسے کسی نومسلم کو اپنے مذہب سے ہوتا ہے ——— لیکن روسی کی محبت اپنے ملک اور آدرش سے اس لئے بھی کچھ زیادہ نظر آتی ہے کہ وہ ہر وقت امریکیوں کے ساتھ مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر کام اس لئے بھی اچھا کرتے ہیں کہ انہیں روسی ہونے پر فخر ہے اور انہیں ہر کام میں اس لئے بھی سر دھڑ کی بازی لگانا ہوتی ہے کہ انہیں امریکیوں پر ثابت کرنا ہے کہ وہ امریکیوں سے بہتر جانتے ہیں۔ اس دوہری کشاکش میں وہ ہر لحظہ پروپیگنڈہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر غیر ملکی کے سامنے اپنا اور امریکہ کا معاملہ رکھ کر یہ چاہتے ہیں کہ ووٹ ان کے حق میں دیا جائے ——— وہاں کے سادہ لوح شہریوں سے مل کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ امریکہ اور روس نے سپر پاور بن کر اپنے عام شہریوں پر بہت بڑا ظلم کر رکھا ہے اب ملائشیا، کمبوڈیا، روڈیشیا پاکستان ...... چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ انجانی ائیرپورٹوں پر روسی اور امریکن یہ معلوم کرتے پھرتے

ہیں کہ یہ پاکستانی ——— یہ سوئی یہ جاپانی ...... یہ فرانسیسی کس کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ امریکہ کو کہ روس کو ...... گویا حب جاہ کی آرزو میں یہ بڑے ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں چھوٹے چھوٹے ملکوں کے سامنے کاسہ بردار ہیں۔ اتنے بڑے اتنے سوپر سوپر ہونے کے باوجود ان کو راتے چھوٹے ملکوں سے لینا پڑتی ہے کیونکہ آپس میں تو وہ طے نہیں کر پاتے کہ ان دونوں میں سے کون بڑا ہے؟ نہ ہی وہ یکبارگی اپنے حریف کو ختم کر کے کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔

یونیورسٹی میں، بازاروں میں، سرکس گھر اور تھیٹروں میں جیسے میں کاسٹنگ ووٹ تھا ——— تمام تر معمولی اور چھوٹے پن کے باوجود وہاں کے شہری یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ میں روس سے کس حد تک اور کتنا کچھ متعارف ہو چکا ہوں ——— کیا یہ تعارف مثبت ہے کہ منفی؟

لیکن کسی شخص، شہر یا ملک کا اصلی تعارف ہمیشہ اچانک ہوتا ہے۔

مجھے روس میں رہتے ہوئے پورا سال ہو چکا تھا لیکن ابھی میں اصلی روس سے متعارف نہ ہوا تھا۔ انسانوں کی طرح ملکوں کی بھی ایک روح، سائیکی ہوتی ہے۔ اس کا تعارف مشکل سے اور ہمیشہ اچانک ہوتا ہے۔ میں چند دن کے لئے لینن گراڈ کی سیر کے لئے گیا تھا۔

لینن گراڈ بادلوں کا شہر ہے سمندر کنارے کا شہر ہے دریا نیویدا کا شہر ہے۔ اس میں گھر، باغ، سڑکیں، محل، ریستوران، سمندر کا ساحل، کشتیاں، لاؤنج، کاریں، جہاز، میوزیم اتنا سارا کچھ ساتھ ساتھ ہے اور الگ الگ نظر آتا ہے۔ دریا نیویدا کنارے وہ محل ہے جس میں راسپوٹین کو گولیوں سے داغا گیا تھا۔ پیٹر دی گریٹ کا خوبصورت موسم سرما کا محل ہے اور لینن گراڈ سے نکل کر ایک بہت بڑا موسم گرما کا محل ہے جس کے ان گنت کمرے اب بھی بند ہیں اور جس کے سامنے خوبصورت قد آدم گھوڑے، فرشتے شہزادے پتھروں کی شکل میں ایستادہ ہیں۔ ان بتوں پر جیسے سونے کا پانی چڑھا ہے اور فوارے ان سے پھوٹتے ہیں۔ یہ پیٹر دی گریٹ کا شہر ہے جسے اب لینن گراڈ کہتے ہیں۔

یہ بہت خوبصورت ہے اور چونکہ بہت شمال میں واقع ہے اس لئے یہاں رات کو گیارہ بجے ابھی دن ہوتا ہے یہاں بھی رات کو اپنے کمرے کے دبیز پردے بند کر کے رات کر لیتے ہیں اور اپنی رات بنا کر سو جاتے ہیں حالانکہ باہر دن پڑھا ہوتا ہے۔

لینن گراڈ پر عموماً بادل گھرے رہتے ہیں جیسے کوئی خوبصورت لڑکی کسی ایسے مرد کے متعلق سوچتی رہتی ہو جو اس کا ہونے سے پہلے ہی مر گیا ...... غالباً سارے روس میں یہ اکلوتا شہر ایک نیک دل ترقی پسند بادشاہ کا بسایا ہوا ہے جیسے پیٹر دی گریٹ رات کو لباس تبدیل کر کے ہارون الرشید کی طرح روند کو نکلتا ہو ...... جیسے اسے خبر ہو وہاں گلی میں ایک بڑھیا رہتی ہے۔ سمندر کنارے وہ ملاح جال بنتا ہے جس کے پاس سمندر میں جانے کے لئے کشتی نہیں ...... سارا شہر ماڈرن ہے ساحل کنارے بکنی پہنے زرد کمروں والی روسی لڑکیاں گھومتی ہیں۔ موٹر سائیکل پر جینز میں ملبوس بھوری مونچھوں والے نوجوان لگے پھرتے ہیں جن کے پاس

کھڑے ہوں تو آپ کو واڈکا اور پنیر کی خوشبو آتی ہے ـــــ سارا شہر کمیونسٹ ہے. عموماً سیاحوں کو وہ جیل خانہ دکھایا جاتا ہے جہاں لینن کے ساتھیوں کو گرفتار کرکے نظر بند کیا جاتا تھا...... لیکن اس شہر میں پیٹر دی گریٹ کی روح گھومتی ہے اب بھی یہ اس کا شہر ہے جس خوبصورت گرجا گھر میں اس کی خوبصورت قبر ہے وہاں قبر پر ہمیشہ پھول ہوتے ہیں. میں نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ ـــــ "اب جب کہ ملک میں شاہ پرستی نہیں ہے اس کی قبر پر کون پھول رکھتا ہے" ـــــ ایک بڑھی عورت نے کہا ـــــ "پتہ نہیں بیٹے ـــــ کسی کو پھول رکھتے کبھی دیکھا تو نہیں پر پھول یہاں ہوتے ہیں بلکہ ہمیشہ یہاں ہوتے ہیں ـــــ سردیوں میں بھی ...... یہ بادشاہ کہاں تھا مزدور تھا کئی سال تو سمندری جہازوں کے کارخانوں میں مزدور بن کر کام سیکھتا رہا."

ہم برصغیر ہندو پاکستان کے مغلیہ بادشاہوں (پر فخر کرتے ہیں) ہم نے ان کے انتظام حکومت کی کبھی جانچ پڑتال نہیں کی بلکہ ان کی تاریخی عمارتوں کو دیکھ کر ان کی عظمت کے ساتھ ایک رومان وابستہ کر دیا ہے ـــــ ان کی شاہی عمارتوں نے ہی ہمیں ہمیشہ کے لئے ان کا گرویدہ کر دیا ہے.

یہ شہر بھی محلوں کا شہر ہے ـــــ

پیٹر کے محلوں کا شہر ـــــ

میں ایک چھوٹے سے محل میں جہاں پیٹر دی گریٹ نے خود ایک مشین ایجاد کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کا باورچی خانہ بالکل سادہ اور غریبانہ تھا باہر نکلا ـــــ باہر درخت ہی درخت تھے بادلوں اور سمندری ہواؤں کی نمی سے بوجھل درخت ـــــ جیسا سبزہ اور درخت لینن گراڈ میں نظر آیا پھر کبھی نہ دیکھا کیونکہ یہاں کی روئیدگی میں ہونٹوں کی سی ملائمت تھی. باغ خاموش تھا. اتفاق سے نہ مقامی لوگ نظر آتے تھے نہ سیاح ـــــ صرف فاصلے سے کچھ دبی دبی آوازیں آرہی تھیں. ـــــ باتوں کی ہنسی کی آوازیں.

پرندوں کی سیٹیاں نہیں تھیں لیکن لگتا تھا درخت بے آباد نہیں ہیں. بارش نہیں ہو رہی تھی لیکن پتوں سے بوندوں کے پھسلنے کا شبہ ہوتا تھا. زیادہ درختوں کی لکڑی سیاہ تھی اور ڈالیاں کونپلوں کی طرح سبز...... اِدھر اُدھر پرانے بت پڑے تھے...... روشیں ٹھنڈی تھیں......

پھر اچانک میری نگاہ ایک بت پر پڑی. یہ ایک قد آدم عورت کا مرمریں بت تھا. بھرے بھرے جسم کی ملائم شکل سی فرشتہ رو عورت ...... اس کے کندھے پر مرمر کا ایک چھوٹا سا کبوتر بیٹھا تھا اور کبوتر کی چونچ میں عورت کے پتھریلے پستان کا سرا تھا.

میرا جی چاہا کہ اس کبوتر کو اڑا دوں. جس گستاخی کا وہ مرتکب تھا اس کا میں متحمل نہ ہو سکتا تھا...... لیکن جس آرٹسٹ نے عورت اور کبوتر کو یوں ساحری رنگ میں دکھایا تھا وہ دوستوفسکی کے کرداروں سے، ٹالسٹائی کی بے چینی، چیخوف کی برداشت، مزدوروں کی جفاکشی، شمالی روس کی برفباری سے واقف تھا وہ اس کرب سے بھی آشنا تھا جو انسانی پستان کے حیوانی چونچ میں آجانے سے ہوتا ہے اور اس آرٹ کی ساحری کو بھی جانتا تھا جو اس کرب سے

پیدا ہوتی ہے۔

کاسنی پھولوں میں چبوترے پر سجایا یہ بت بیک وقت مضحکہ خیز بھی تھا اور خیال آرا بھی۔ اس میں لذت کوشی بھی تھی اور بیزاری بھی۔

اس میں غایت درجے کا دبدبہ انبساط تھا اور سارے لینن گراڈ کا دکھ بھی۔۔۔۔

مجھے اچانک لگا جیسے اس سادھنی اور کبوتر کی وجہ سے میں روس سے متعارف ہوا۔۔۔۔۔ روس جو سدا اپنے مسلک کے کبوتر کو اپنے کندھے پر بٹھائے رکھتا ہے۔ یہ کبوتر مسلسل اس کے لپتانوں سے اس کا لہو پیتا ہے اور کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اس درد کی سادھنا میں ان دونوں کی بقا ہے۔ IDEOLOGY کا کبوتر لہو پیتا رہے گا۔۔۔۔۔ اور مرمریں لپتان کبھی خالی نہ ہوگا۔ وہ درد کی لذت کو سہتا رہے گا اور کبوتر کو پالتا رہے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس باغ میں گھومنے پھرنے والے شہریوں کو مقامیوں کو علم نہ ہوگا کہ سیاہ درختوں تلے سبز پتوں میں چھپی ہوئی ہری گھاس پر روس کی روح بیٹھی ہے۔۔۔۔ مجھے لگتا ہے کبھی کبھی آدھی رات کو خندق کی طرف سے دبے قدم پیٹر دی گریٹ تاقم اور سمور کا بڑا کوٹ پہنے جس پر کاٹھ کے تکلے لگے ہوں گے ادھر آتا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔ اس بت کے خالی کندھے پر ہاتھ رکھ کر سوچتا ہوگا ——— کیا میں یہ کبوتر اڑا دوں کہ رہنے دوں؟ ——— کیا ہر بادشاہ کی روح مرنے کے بعد اپنے ملک کو واقعی وارثین کی ملکیت سمجھنے لگتی ہے ؟ ——— کیا مغلیہ بادشاہ اب بھی راتوں کو شاہی قلعے کے طواف نہیں لگاتے؟ کیا وہ واقعی اپنی سلطنت کو بھول جاتے ہیں ؟

ایسے ہی جب پہلی بار میں سونیا کو پنورا ما میں ملا تھا تو بڑی دیر تک سوچتا رہا تھا کہ میں اس روسی لڑکی کو یاد رکھوں کہ بھلا دوں ——— جب اسے بھلانے لگتا تو وہ یاد آئے جاتی اور جب یاد کرتا تو اس کا کچھ بھی واضح طور پر یاد نہ آتا۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے اور پھر اچانک ایک شام وہ مجھے ٹیلی ویژن ٹاور کی لفٹ میں مل گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح شفاف آنکھوں سے نہ جانے کدھر دیکھ رہی تھی؟ جب میں لفٹ میں داخل ہوا تو اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اس کے اور میرے علاوہ ایک بوڑھا روسی دیوار سے کندھا لگائے ناک سے چوہے نکال رہا تھا۔ ایک منٹ میں ہم ۵۰۴ میٹر اوپر چلے گئے اور لفٹ رک گئی۔ میں نے لفٹ سے باہر نکلنے کے لئے سونیا کو اشارہ کیا تو اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "سی پاسی با" کہا اور آگے بڑھ گئی۔

ٹیلی ویژن ٹاور روسی فخر میں شامل ہے۔ وہ ہر سیاح کو اس کے متعلق بتاتے ہیں اور اس کی پیمائش پر حیران کرتے ہیں۔ ٹیلی ویژن ٹاور کے اوپر ایک چھوٹا سا گول روشن ریستوران ہے جس کے چاروں طرف شیشہ ہی شیشہ لگا ہے۔ ان کھڑکیوں سے سارا ماسکو نظر آتا ہے۔ دور تک آسمان دکھائی دیتا ہے یوں لگتا ہے جیسے ہم کسی منجمد طیارے میں ایک ہی مقام پر ایک ہی جگہ پر ٹک گئے ہیں۔ ہم دونوں ایک کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ باہر غالباً تیز دھوپ اور گرمی تھی لیکن اندر بہت خوشگوار تھا۔ اگست میں ماسکو پر بہار کا احساس ہوتا ہے۔

"بڑے دنوں بعد دکھائی دی ہو ———"

"ہاں —— میں یہاں نہیں تھی —— کیف گئی ہوئی تھی"
"میں کئی مرتبہ پنڈورا بھی گیا۔ کتنے عرصے کیف رہیں ؟"
اس نے میری اس بے تکلفی کا جواب نہ دینا چاہا
"کیوں ماسکو پسند آیا ؟" ——

"بہت —— یہاں کے لوگ سادہ ہیں۔ زندگی عام فہم ہے .... شام کو جب سڑکوں پہ نیون کے اشتہار نظر نہیں آتے تو بڑی راحت کا احساس ہوتا ہے سارا شہر ستھرا ستھرا لگتا ہے —— "
وہ خوش ہو گئی جیسے میں نے اس کے محبوب کی تعریف کی ہو۔
"تمہارے شہروں میں اشتہار ہوتے ہیں ؟ —— خاص کر نیون کے ؟" —— اس نے سوال کیا
"تم کراچی آؤ تو پتہ چلے آدھی کراچی اشتہاروں سے روشن رہتی ہے —— "
اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا پھر چپ ہو گئی
"کیا بات ہے سونیا —— "
"کچھ نہیں تم برا مان جاؤ گے —— "
"نہیں —— اب میں پہلے سے زیادہ روس آشنا ہو گیا ہوں —— "
"تمہارا غریب ملک ہے —— اور —— تم لوگ اشتہاروں پہ اتنا پیسہ ضائع کرتے ہو ...... اگر یہ اشتہار نہ چھپیں تو اشیا اتنی مہنگی نہ ہوں جتنی ہو رہی ہیں بھلا ایک غریب ملک کی
CONSUMERS
اس آسائش کی کہاں متحمل ہو سکتی ہے ؟ —— "

اس کی بات درست تھی۔ دراصل میں نے یہی کیا تھا کہ میں بُرا نہیں مانوں گا لیکن دشمن کی آمد پہ جانوروں کے جھبرے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی میں بھی اسے کوچنے کے لئے تیار ہو گیا ہم پاکستانیوں کا بھی عجیب مزاج ہے ہم اپنے گھر بیٹھ کر اپنے ہم وطنوں پہ، اپنے ملک، لیڈر شپ، نظام کو چاہے جو کچھ بھی کہیں، پاکستان سے باہر نکلتے ہی ہمارا تعصب بڑھنے لگتا ہے۔ ہم پاکستان پہ سچی جھوٹی کوئی تہمت برداشت نہیں کر سکتے۔ یہی جذبے اور جوش نے سفید دنیا میں ہمارے خلاف ایک محاذ سا بنا رکھا ہے لندن میں اس نفرت نے پاکی بیشی کی شکل اختیار کر لی ہے کینیڈا میں ویسے ہی "پاکی پاکی" کہہ کر ذلت کا احساس دلاتے ہیں اور تو اور سعودی عرب میں بھی پاکستانیوں سے کچھ ایسی تواضع کا برتاؤ نہیں —— باقی فیکٹر اپنی جگہ درست ہوں گے لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بیرون پاکستان جو کچھ نفرت پاکستانیوں کو پیش آتی ہے اس کی ایک وجہ وہ محبت بھی ہے جس کے اظہار سے ہم لوگ باز نہیں آتے —— پاکستان کو ذرا کسی نے کچھ کہا اور ہم نے میان سے تلوار نکالی ——
"تم ماسکو پہ بہت فخر کرتی ہو" میں نے لگواڑے کہا
"کیوں نہیں —— روس دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے —— ماسکو دنیا کا خوبصورت ترین شہر

ہے۔ ہم دنیا کی عظیم ترین قوم ہیں اور ماسکو روس کا دل ہے دل —— روسیوں کی جان ہے جان —— "

مجھے یوں لگا کہ میں نے اسے دیوار سے لگا کر دونوں بازو اس کے کندھے کے دائیں بائیں رکھ کر اسے چنگل میں پھنسا لیا —— میں نے آہستہ آہستہ کہا —— "یوں لگتا ہے سونیا تم کمیونزم کی اصل سپرٹ نہیں سمجھتیں — کمیونزم نے معاشی اونچ نیچ اس لئے مٹائی کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو دولت کی وجہ سے شرمندہ نہ کر سکے اپنے آپ کو دوسرے آدمی سے بہتر نہ سمجھ سکے۔ اگر فخر کرنے کے لیے متکبر ہونے کے لئے کچھ اور بھی وجوہات ایجاد ہوتی رہتی ہیں تو پھر دولت پر اعتراض کیوں۔ یہ اچھی خاصی معقول وجہ ہے انسانی فخر کے لئے —— پہلے لوگ اپنی ملکیت پر فخر کرتے تھے اب قومی ملکیت متکبر ہیں —— تکبر چاہے ذات کا ہو چاہے قومی سطح کا تکبر ہی رہے گا —— "

"کمال ہے کہاں ذاتی ملکیت کہاں قومی ملکیت ؟ —— فخر کرنے کے لیے ہر روسی کے پاس ایک سا روس ہے۔ کسی کے پاس بڑا یا چھوٹا سرمایہ نہیں ہے —— "

"ہو سکتا ہے کسی چھوٹے ملک کے باشندے کے پاس اتنا بڑا فخر نہ ہو —— اور اسے احساس کمتری کا شکار ہونا پڑے پھر —— کیا بنی نوع انسان پہ یہ زیادتی نہیں —— یہ قومی فخر —— یہ قومی ملکیت — پہلے ایک روسی دوسرے روسی سے بہتر تھا —— اب ایک روسی دوسری قوموں سے دوسرے لوگوں سے بہتر ہے۔ بات تو وہیں رہی —— "

وہ چپ ہو گئی —— چھوٹا سا گنگناتا پرندہ برف میں دب گیا ——

بڑی دیر تک ہم دونوں اپنا اپنا سینڈوچ کھاتے رہے اور ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے دوستی کے لمحات، محبت کے لمحات میں نظریاتی زہر گھولتے رہے۔ پھر کہیں سے ایک بادل کا ٹکڑا سورج کے سامنے آ گیا۔ سارے ماسکو پر یکدم سورج کی روشنی بند ہو گئی اندر کی روشنی کم ہو گئی۔

میں نے اس سے کہنا چاہا سونیا آئی ایم سوری .... میں تو دوستوفسکی کا عاشق ہوں — میں اسے سارے کلاسیکی ادب کا گرو مانتا ہوں بھلا میں روس کے خلاف زبان کھول سکتا ہوں لیکن میرے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

"سنا ہے تمہارا ملک نظریاتی ہے —— اس کی کوئی جغرافیائی وجہ نہیں ہے نہ ہی یہ کسی جنگ کے بعد بنا ہے —— "

میں معافی مانگنے کے موڈ میں تھا لیکن اب مجھے پتہ چلا وہ بھی چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

"نہ صرف نظریاتی بلکہ مطالباتی —— "

"اس کے پانچ صوبے ہیں اور ہر صوبے کی زبان مختلف ہے —— ہے ناں ؟"

"لیکن ہم سب کا مذہب ایک ہے —— "

"عجیب سی بات ہے تم پاکستانیوں کی شکلیں، زبان ..... کلچر سب ہندوستانیوں جیسا ہے۔ میں ہندوستانیوں

سے ملتی رہتی ہوں ـــــ پھر تم لوگوں نے ان سے علیحدہ ہو کر اپنا علیحدہ ملک کیوں بنایا........ ہمارے ملک میں بہتر زبانیں بولی جاتی ہیں پھر بھی ہم اکٹھے ہیں ؟

" ہمارے ہاں بھی پانچ زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہم اکٹھے ہیں "

" لیکن علیحدہ ملک بنانے کی ضرورت کیا تھی آخر تمہارا اور ان کا اتنا کچھ سانجھا ہے ـــــ "

میں واقعی اسے حلیف دینا نہیں چاہتا تھا لیکن میں خاموش بھی کیسے رہتا میری پہلی محبت پاکستان تھی۔

" تمہارا کلچر رہن سہن، شکلیں رسم و رواج، مذہب عقیدہ تعلیم سب کچھ فرانس سے ملتا ہے۔ پھر تم ان کے ساتھ ایک ملک کیوں نہیں بنا لیتے ـــــ "

وہ نرم پڑتے ہوئے بولی ـــــ " چلو ملک بنا لیا ـ ـ اب اتنے چھوٹے رقبے میں دو جنگوں کی کیا ضرورت تھی ـــ خوامخواہ ـــــ اتنی نفرت کی وجہ کیا ہے ؟ ـــــ اب بھول بھی جاؤ ـــــ اتنا چھوٹا سا ملک ہے اور اتنے بڑے ملک کے ساتھ دشمنی پال رہا ہے ـــــ "

" وہی وجہ سونیا جو تم لوگوں کے دلوں میں فرانس کے خلاف نفرت بن کر بیٹھی ہے ـــــ روس اتنا بڑا ملک ہے جب وہ فرانس جیسے چھوٹے ملک سے نفرت کئے جا رہا ہے تو ہم کس گنتی میں ہیں ہمارے لئے تو وہ جنگیں بھولنا اور بھی ناممکن ہے۔ نپولین کی جنگ ۱۸۱۲ء میں ختم ہو گئی سونیا۔ پھر اب تم ٹرائمف گیٹ ڈھا کیوں نہیں دیتے۔ پینوراما کی نمائش بند کیوں نہیں کر دیتے "

" ہم اپنے بچوں کو ہسٹری پڑھانا چاہتے ہیں کہ وہ دوست دشمن میں پہچان کر سکیں "۔

" کیا میں دست بستہ پوچھ سکتا ہوں کہ ہسٹری سے سبق سیکھنا روس کا خصوصی حق ہے کیا ؟ اگر آپ لوگ اپنی عبرتوں کو آئندہ نسلوں کے لئے تازہ رکھنا چاہتے ہیں تو کیا یہ خصوصی حق صرف روس کا ہے .... کہ کیا ہسٹری سے سبق سیکھنے کا بھی کوئی خاص ویزا ملتا ہے کوئی سیکورسٹی جمع کرانی پڑتی ہے گارنٹی سے پہلے "

اب سونیا کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی دوستی کا لمحہ آیا لیکن دلوں کو بند پا کر واپس چلا گیا۔

وہ اٹھی آہستہ سے اس نے تسوے دانیا کہا اور چلی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے پھر کبھی نہیں ملنا چاہتی ......

اس ملاقات کے بعد میں نے اسے تلاش بھی نہ کیا ٹی وی ٹاور پر ہماری ملاقات کا سرکٹ اچانک فیوز ہو گیا تھا۔ میں اپنی بدزبانی کی تلافی کرنا چاہتا تھا معافی مانگنے کے موڈ میں تھا۔ میں نے ایک کمزور سی لڑکی کو وطن پرستی کی بہت زیادہ سزا دی تھی لیکن مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا پینوراما میں پہنچ کر پتہ چلا کہ سونیا نوکری چھوڑ کر جا چکی ہے۔

اس روز گورکی سٹریٹ کے بیلے گھر میں ISONE RALDA نامی بیلے کی نمائش تھی۔ سڑک سے بالکل احساس نہ ہوتا تھا کہ اندر اس قدر بڑا ہال ہوگا چھوٹے سے پھاٹک سے داخل ہو کر میں اندر چلا گیا۔ دو ہزار سیٹوں کا ہال کھچا کھچ بھرا تھا لیکن سارے ہال میں اندھیرا اور خاموشی اس درجہ تھی کہ محسوس بھی نہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی موجود ہے۔ میں چپ چاپ مسحور بیلے کو دیکھنے لگا۔ انٹرول کے وقت جب میں تازگی حاصل کرنے کے لئے بغلی ریسٹوران میں گیا تو سونیا مجھے ایک

کاؤنٹر کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ اس تک پہنچنے کی کوشش محال تھی کیونکہ لوگ درمیان میں دیوار کی طرح کھڑے، آئوسکار سے کا رس، اورنج، پانی، بیئر اور بیف کھانے میں مشغول تھے۔ معافیاں مانگتے اور ایکسکیوزمی کہتے جب میں اس کاؤنٹر تک پہنچا تو وہ جا چکی تھی اور لوگ ادھر ادھر ہالوں میں لوٹ رہے تھے۔ اس امید میں کہ وہ ہال سے نکلنے کی راہ میں اس سے مل لوں گا۔ بیلے ختم ہونے سے پہلے بڑے پھاٹک پر آکر رک گیا —— لیکن پتہ نہیں وہ کہاں سے رخصت ہوگئی یا کیسے پاس سے گزر گئی کہ میں اسے دیکھ نہ سکا۔ کاش اس روز وہ مجھے مل جاتی تو میں اسے بتاتا کہ روسی بیلے نے مجھے کس درجہ متاثر کیا ہے۔ ایک ہی ٹانگ پر لٹو کی طرح گھومنے والے ڈانسر، تتلیوں کی طرح آنے جانے، بھونروں کی مانند لرزاں، ان لوگوں نے تو انسانی تہذیب کا ہر حسن اپنے میں جذب کر لیا تھا۔ اس سے پہلے روسی سرکس اور کوسک گھڑسواروں نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ میں سونیا کو بتانا چاہتا تھا کہ مجھے روس کی تخلیقی قوت نے بے حد متاثر کیا ہے۔ اگر روسی لوگ اسی ترنگ سے کندھے سے کندھا ورزی پی سرحدوں پر ناچنے لگیں تو کوئی ٹینک ان کا کالم توڑ نہیں سکتا۔ اگر وہ اپنے گھڑسواروں کو ہمالہ کی چوٹیاں سر کرنے کے لئے بھیج دیں تو سموں سے چنگاریاں اڑاتے یہ گھوڑے حیاں سے بھی پہلے وہاں پہنچ جائیں گے لیکن سونیا تو پتہ نہیں کس دروازے سے رخصت ہوگئی؟ اسے کہتا کہ روس کا ملکی جینئس میں ناچ ہے — زندگی کا رقص موت کا رقص ...... میں سونیا کے پاس بیٹھ کر لمبے چوڑے اعتراف کرنا چاہتا تھا لیکن میرے سامنے گورکی سٹریٹ تھی ...... رات کا وقت تھا اور بیلے تھیٹر سے نکلنے والوں کا شور تھا۔ میں سوچتا ہوا چلنے لگا۔

ایک تو ہر ملک کا فرداً فرداً جینئس ہوتا ہے اور ایک اس ملک کا مجموعی خصوصی جینئس ہوتا ہے۔ اسی مجموعی جینئس سے اس ملک کے آرٹ کا پتہ چلتا ہے کیونکہ آرٹ ہی تو وہ ناکہ ہے جس سے قوم کا بارک آل کیر بڑے تواتر سے گزرتا رہتا ہے۔ انگلستان کا جینئس اس کے ڈرامے کی شکل میں سامنے آیا۔ ہم شیکسپیئر کو انگلستان کی سائیکی کا مجموعی سرمایہ کہتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ کا جینئس سیاسی ہے۔ چھوٹی چھوٹی سیاسی بصیرتیں مل کر ابراہم لنکن جیسی دولت میں اکٹھی ہوئی ہیں۔ جاپان کا قومی جینئس ان کی الیکٹرانکس میں بند ہے۔ وہ سڑکوں پر آنے جانے کو، ٹاک جیک، روش آمد و رفت، اسا فقرے کہتے روزمرہ کی پابندی میں چھوٹے سے الیکٹران لگتے ہیں۔ انہوں نے الیکٹرانکس کو چھٹی حس کی طرح ایک ناقابلِ فہم حیثیت دے رکھی ہے —— جرمنی سرمنڈل ہے —— اس کے ولس دماغوں اور دلوں کو بجز دیتی ہیں۔ اس کا مجموعی شعور موسیقی میں ڈوبا ہے۔ بیتھوون، باخ، موزارٹ، شوبرٹ سب ایسے بادلوں تلے پروان چڑھے ہیں جن سے موسیقی مترشح ہوتی ہے۔

ہر ملک میں ہر قوم میں وقتاً فوقتاً مہان پرش پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ جینئس لوگ اپنے ملک کی سمتیں، کلچر، آدرش، رسم و رواج، سوچ کو بدلنے کے لئے آتے ہیں لیکن یہ مہان پرش فرد کی حیثیت میں بڑے ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق قومی جینئس، مجموعی ملکی جینئس سے نہیں ہوتا —— لیکن لوگ فرداً فرداً اور مجموعی طور پر فطرتاً ایک خصوصی ملکہ رکھتے ہیں۔ قومی جینئس سے میری مراد وہ خاص لگاؤ ہے جو کسی قوم میں اس وقت بھی ملتا ہے جب اس میں مہان پرش پیدا نہیں ہو رہے ہوتے۔ وہ اپنی خصوصی مجموعی سائیکی کے زیرِ اثر اپنی فیلڈ میں معرکے مارتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا دھارا اس میدان میں کبھی ختم نہیں ہوتا۔ روس میں بیلے، امریکہ میں پالیٹکس ...... سعودیہ میں مہمان نوازی، فرانس میں نئی سوچ ...... علیٰ ہٰذا القیاس

ہر ملک اپنی قومی سطح کے جنس سے دوسرے ممالک کے سامنے اپنا شرف قائم رکھتا ہے ...... برصغیر کا قومی جنس سفید آدمی سے مرعوب ہوتا ہے اس میں ہندوستان پاکستان دونوں ایک سے خوفزدہ ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ پاکستانی مرعوب ہو کر سفید فام آدمی کی نقل اتارتا ہے اور اس کے ہم پلہ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ہندوستانی بظاہر اپنے لباس، زبان، کلچر پر ڈٹا رہے گا لیکن خوفزدہ وہ بھی ہوگا۔ اندر سے اس کا بھی لہو سوکھتا ہے ——— وہ بھی تمام تر سادھی اہنسا اور تیاگ کے باوجود مغرب کے کارناموں پر انگشت بدنداں رہتا ہے۔

ہوتے ہوتے میں تسوے دانیا، سی پاسی با، بنت کا استعمال خوب موقع پر کرنے لگا تھا غالباً نیت ایک ایسا لفظ ہے جو روس میں سب سے زیادہ اٹل اور بامعنی ہے۔ ہماری دکانوں پر اگر سامان موجود نہ ہو تو بھی "باجی جی" "آپا جی" کے لیے دکاندار ساتھ والی دکانوں سے سامان منگوا کر دکھا دیتا ہے خرید وا دیتا ہے۔ لیکن روسی دکاندار، ہوٹل کا بیرا، ٹیکسی ڈرائیور کی زبان سے جب ایک بار نیت کا لفظ نکل جائے تو پھر اس پر پسیجنے کا شبہ کرنا زیادتی ہے جو چیز نہیں ہے۔ نہیں ہے۔ ویسے بھی ابھی روس CONSUMERS GOODS کی طرف توجہ نہیں ہوا وہ قومی سطح پر ایسے بڑے بڑے حیرت انگیز پروجیکٹ بنا رہے ہیں کہ ضرورت کے سامان کی طرف ابھی ان کی دلچسپی توجہ نہیں جیسی امریکہ اور جاپان کی ہوتی ہے۔ وہاں سڑکیں، ڈیم ...... ہوائی جہاز، ہسپتال، ہیوی انڈسٹری، بجلی گھروں پر حکومت کا سارا زور لگتا ہے لیکن عام آدمی کے لئے خوبصورت سینٹ، گھڑیاں، پن، لپ سٹک، ریشمی جرابیں، خوبصورت پرس، نکٹائیاں ایسی چیزیں جو کبھی ہیں تو بی گریڈ ہوتی ہیں۔ ہر حکومت کی طرح روسی حکومت کا بھی خیال ہے کہ ہمارے عوام اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں وہ ملکی ضرورت کے سامنے ذاتی ضرورت کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔ ہر حکومت یہاں دھوکا کھاتی ہے۔ اسے یاد معلوم نہیں ہوتا کہ عام شہری اپنی غرض وغایت سے بندھا ہوتا ہے۔ ——— یہی معمولی لوگ جب ان کی ضرورتیں پوری نہ ہوں چاہے یہ ضرورتیں آسائش کا غیر ضروری سامان ہی کیوں نہ ہو تو پوری ملکی IDEOLOGY کو SABOTAGE کر دیتے ہیں ——— پاکستان میں مال سمگل ہونے لگتا ہے۔ فارن سامان کے خفیہ بازار اڈے کھلنے لگتے ہیں اور روس میں امریکی سگریٹ، لپ سٹک، ریشمی جرابیں، فنک دیک کرنے والے سینٹ دیکھ کر ایک نوجوان روسی لڑکی کو کمیونزم کے سارے اونچے آدرش بھول جاتے ہیں اور وہ سیدھی سادی لڑکی رہ جاتی ہے جسے خوبصورت لگنے اور محبوب کی نگاہوں میں جچنے کے سوائے اور کچھ نہیں سوجھتا جس طرح قومی سطح پر اس ملک اور قوم کا بہت ڈراوا ہوتا ہوتا ہے جس کے پاس مہلک ہتھیار ہوتے ہیں ایسے ہی فردی سطح پر اس آدمی کا بہت دبدبہ ہوتا ہے جس کے پاس دوسرے آدمی کو مرعوب کرنے کا سامان ہوتا ہے۔

میرے ساتھ یونیورسٹی کے دور سے پڑھے راریا اور منیل بھی تھے ہمیں داریا نے اپنی منگنی کی خوشی میں "روس" ہوٹل میں مدعو کر رکھا تھا ہم تینوں بہت خوش تھے کیونکہ ہم میں سے داریا سب سے زیادہ جنس مخالف سے بے پروا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے شادی کو مضحکہ خیز ثابت کرتا۔ پھر اچانک وہ نتاشیا کے ساتھ کبھی کبھی دیکھا جانے لگا اور پھر اس سے بھی اچانک پتہ چلا کہ وہ نتاشیا سے شادی کرنے والا ہے۔

جس وقت ہم "روس" میں بیٹھے انارکلی پی رہے تھے اس وقت ایرو فلوٹ کی بس سامنے رکی روس ہوٹل کی بیرونی دیوار تقریباً شیشے کی ہے جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے سڑک کا منظر صاف نظر آ رہا تھا بڑے بڑے بھدے جسموں والی امریکی عورتیں جینز اور بغیر آستینوں کے بلاؤز پہنے سروں پہ پیلے اور ٹیکنے والے سرخ رومال باندھے بس سے اتر رہی تھیں ان کے بازو چہرے دھوپ میں کندنی ہو رہے تھے چہرے پر گہری براؤن چتی پڑی تھی۔ امریکی مرد جسموں پہ کافی سامان لادے نون غنے کی بھرمار سے انگریزی بول رہے تھے ان سب کا لباس سادہ تھا جیسا کہ امیر آدمیوں کا عموماً ہوا کرتا ہے لیکن انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ وہ ایک بڑے سوپر پاور ملک کے باشندے ہیں۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی امریکی میزوں کے گرد بے تکلفی سے بیٹھ گئے اور ان کی آمد و رفت ٹائیلٹس کی طرف ہونے لگی ان کی میزوں پہ ایک بڑی خوبصورت روسی لڑکی ویٹرس مقرر تھی۔ وہ روسی چھپکی چائے تلے ہوئے انڈے ٹوسٹ کا آرڈر لے کر چلی گئی لیکن امریکی عورتوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ روسی ویٹرس پلٹ پلٹ کر انہیں دیکھتی جاتی تھی

جب روسی ویٹرس ٹرائے لے کر واپس آئی تو امریکی عورتیں اپنے آپ کو تازہ دم کرنے کے مرحلوں میں تھیں۔ وینٹی بکس کھلے تھے۔ لمبی لمبی چمکدار لپ سٹکیں چوڑے دہانوں پہ پھیری جا رہی تھیں۔ کوہوں کی بوتلوں سے چتی دار بازوؤں پر سپرے ہو رہا تھا۔ فلیٹ بوٹ اتار کر لمبی ریشمی جرابیں پہنی جا رہی تھیں۔ آنکھوں پہ ماسکارا لگ رہا تھا امریکی عورتیں سیاحوں کی بے تکلفی کے ساتھ بالوں کو برش کر رہی تھیں اور ان کے ساتھ آنے والے ان کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ انہیں پڑا نہ تھی کہ ان کا پرائیویٹ کمرہ نہیں وہ امیروں کی آزادی کے ساتھ میک اپ کرنے میں مشغول تھیں۔

ویٹرس بہت خوبصورت تھی وہ کسی ایکٹرس کی مانند تھی لیکن اتنا سامان آرائش دیکھ کر جیسے وہ بوکھلا گئی اور دودھ کا جگ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ پھر وہ ایکسکیوزمی کہہ کر پیچھے کی طرف کپڑا لینے بھاگی ——

پتہ نہیں کیوں لگتا تھا جیسے وہ اچانک احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی ہے۔

اگر ساری امریکی عورتیں مل کر ایک عورت بنائی جاتی تو اس روسی ویٹرس جتنی خوبصورت نہ ہوتی —— لیکن ایک معمولی لپ سٹک ایک واہیات سینٹ سپرے .... لمبی ریشمی جرابیں اس لڑکی کو شکست دے گئیں۔ ہو سکتا ہے دنیا کے تمام ملک مل کر بھی روس کی بڑی صنعتوں کو اس کی ہتھیار کاری کو ، فلک بوس پہ وجیکٹوں کو نہ ہرا سکیں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ڈن ہل کا سگریٹ .... ساری آئیڈیالوجی میں آگ لگا دے کیونکہ ہر فرد سب سے پہلے اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور پھر کسی اور سے .... حالانکہ ملک سے بھی نہیں مذہب سے بھی نہیں۔

یونیورسٹی میں منخل سے میں بہت بے تکلف تھا وہ مجھ سے اپنے تمام گھریلو حالات اپنے سابقہ معاشقے، اپنے سفرنامے بیان کر چکا تھا۔ منخل سے بات کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ لگتا جیسے وہ بھی سندھی ہے اور سکھر کا رہنے والا ہے۔ روس ہوٹل میں باتیں کرتے ہوئے اس نے اچانک مجھ سے پوچھا "سمرو! کیا تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟ —— "

"کس سے ——؟"

"ایک لڑکی سے اور کس سے ؟ ــــ"

"تمہارے ملک کی ہے ـــــ؟" داریا نے سوال کیا

"نہیں میرے ملک کی نہیں ہے ــــ"

"پھر کہاں کی ہے ؟ ــ"

"بس ہے کہیں کی ــــ" پتہ نہیں کیوں میں داریا کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی ہم وطن سونیا سے محبت کرتا ہوں۔

"کہاں رہتی ہے ؟ ــــ"

"بس یہیں کہیں ــــ"

"یار مت پوچھو یہ بتانا نہیں چاہتا ــــ" میخل نے کہا۔

میں ان دونوں کو کیا بتاتا کہ مجھے واقعی سونیا کا گھر معلوم نہیں۔ وہ ماسکاؤ کی کس سڑک پر کس گلی میں رہتی ہے۔ اس کے گھر کے کتنے افراد ہیں۔ یہ تمام باتیں میں نہیں جانتا تھا۔ میں تو صرف چاند کے طلوع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ اور میں نظریاتی بُعد کی وجہ سے کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ــــ چاند اور میں!

اس روز میں اکیلا نمائش گاہ گیا یہ نمائش گاہ اس لئے خوبصورت نہیں تھی کہ اس کی بڑی بڑی عمارتوں میں روس کی مصنوعات ہر وقت عام نمائش کے لئے رہتی ہیں بلکہ ساری نمائش گاہ ایک پارک تھی اونچے اونچے صنوبروں کے درخت، برچ کے درخت ...... قدآور چیڑھ اور بلوط کے درخت ہیں نمائش گاہ میں چھوٹی سی ٹرین نما بس سواری چلتی تھی اور سیاح جیسے اس پر سوار ہو کر ایلس ان ونڈرلینڈ پہنچ جاتے تھے۔ نمائش گاہ بہت بڑے رقبے پر پھیلی تھی اس میں بڑی قدآور عمارتیں تھیں جن میں روس میں بننے والی، اگنے والی، ساخت کی جانے والی مصنوعات ہر وقت نمائش کے لئے رہتی ہیں۔ جب کوئی سیاح اس نمائش گاہ میں داخل ہوتا ہے اسے اونچے گیٹ کے اوپر ایک دہقانی جوڑے کا بت نظر آتا ہے۔ بتوں پر سونے کا پانی پھرا نظر آتا ہے اور ان کے ہاتھوں میں گندم کا گٹھا سورج کی روشنی میں جگر جگر چمکتا ہے۔

جس وقت میں نمائش گاہ کے اندر گیا اور ایروفلوٹ کے فل سائز ماڈل کے پاس سے گذرا سونیا میرے دل و دماغ میں کہیں نہیں تھی لیکن جب وقت میں گاڑی میں سوار ہو گیا تو یکدم کہیں سے سونیا کی خوشبو آئی۔ وہ میرے پاس سیٹ پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ ــــ اب ساری نمائش غائب ہو گئی۔ میرے اردگرد صرف جنگل پھیل گیا اور مجھ میں کسی مور کی طرح آلسی جو بارش کے بعد یکدم جنگل والوں کے لئے ناچنے پر مجبور ہو جاتا ہے ــــ۔ سونیا پاس تھی روس اپنا تھا۔ ہر ایک شخص اسی داخلیت کا شکار ہو کر ایسی GENERALITIES میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ پھر کبھی اسے OBJECTIVE مطالعے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ انسان اپنے تجربے کے ہاتھوں اس درجہ مجبور ہے اپنے ماحول کا یہاں تک پابند ہے کہ اس کا سارا تجزیہ اس کی فلاسفی شاذ ہی ان دونوں چیزوں سے نکل سکتی ہے میں سونیا کو دیکھ کر یہاں تک خوش تھا کہ میں نے دل میں عہد کیا کہ اب میں روس کے خلاف ایک لفظ نہیں بولوں گا اور پاکستان تو بھاڑ میں جائے مجھے اس سے کیا لینا ہے،

یہاں کون دیکھ رہا ہے کہ میں پاکستان کے بارے میں کیا کہتا ہوں کم از کم سونیا تو زمین بوس ہو جائے گی ——— سورج اس کے بالوں میں سونے کے پاؤڈر بن رہا تھا اس کی آنکھوں میں کیمپین سی کی نیلاہٹ تھی اس کے کندھے کسی نوبیاہتا کی طرح جھکے ہوئے تھے اور اس کی جلد پہ شرم کی ہلکی سی لالی تھی ...... اس وقت میرا کمیونزم سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ میرے چڑھنے سے پہلے ہی سونیا نے میری ٹکٹ کے پیسے ادا کر دیئے۔ میں نے اسے ڈیڑھ روبل دینا چاہا تو وہ ہنس کر بولی

"یہ مت سمجھ لینا کہ تم ہی ایک مہمان نواز ملک سے آئے ہو۔ اپنے پاس رکھو آرام سے ——— اپنے روبل"

ہمارے اردگرد نمائشی عمارتیں بھاگی جا رہی تھیں جنگل پہلے سے زیادہ گھنا ہو گیا تھا اور سونیا بلاوجہ ہلکے ہلکے ہنس رہی تھی

"میں یہ نمائش کتنی بار دیکھ چکی ہوں تمہیں جہاں بھی اترنا ہو بتا دینا ہم اتر جائیں گے لیکن میں اندر نہیں جاؤں گی"

"جب تم کسی عمارت کے اندر جانا نہیں چاہتیں تو پھر آئی کیوں ہو ———"

"مجھے یہ باغ اچھا لگتا ہے درخت اچھے لگتے ہیں یہ رائیڈ اچھی لگتی ہے ———"

وہ پھر ہولے ہولے ہنسنے لگی

"کیوں ہنس رہی ہو سونیا ———!"

"آج میں ہنستی رہنا چاہتی ہوں کیونکہ آج میری سالگرہ ہے ——— آج میں تم سے بھی جھگڑا کرنا نہیں چاہتی"

"لیکن کیوں؟ آخر جھگڑا کیوں ہوگا؟"

"بس ہوگا ناں ...... اگر میں اندر صنعت گاہوں میں تمہارے ساتھ گئی تو تم بھڑک اٹھو گے ——— میں جانتی ہوں تم برداشت نہیں کر سکتے"

"کیا برداشت نہیں کر سکتا میں؟ ———"

"بس یہی ——— روس کی صنعتی، معاشرتی، زرعی، خلائی ترقی ——— تم جلتے ہو روس سے اسی لئے بھید نکالتے ہو ———"

جیسے یکدم سورج بادلوں میں چھپ گیا۔ اس روز میں بہت اداس تھا۔ روس میں طالب علم کی زندگی کو مکین کی زندگی ہے اسے محنت کی چکی میں پسنا پڑتا ہے دو سال کی مسلسل محنت نے مجھے پرانی جراب کی طرح بودا کر دیا تھا۔ میں چپ ہو گیا۔ تین مرتبہ ہم نے روسی مصنوعات کی مختلف بلڈنگوں کے ٹکٹ خریدے اور بغیر اندر داخل ہوئے پھر گاڑی میں آ بیٹھے اونچے اونچے درختوں میں سفر بہتر تھا ——— پاس پاس گھٹنے ...... پاس پاس ہاتھ کندھے، بات کرتے وقت سانسوں کی ملی جلی خوشبو۔ اس سفر میں بہت آنند تھا ——— اور باہر سردی تھی۔

جب تیسری بار ہم نے جنگل کا پورا چکر کاٹ لیا اور اس جگہ پہنچے جہاں ایروفلوٹ کا پورا جہاز بطور ماڈل کے کھڑا تھا تو سونیا اتر گئی

"اتر آؤ سمرو ...... یہاں پر اس سپتنک کی نمائش ہے جو خلائی سفر کو گیا تھا جب اپنے دیس جاؤ گے تو لوگوں

کو بنا نا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے سپتنک دیکھا تھا ـــــــ "

اس کے اترتے ہی گاڑی میں گرمی نہ رہی۔ میں بھی بادل نخواستہ اترا اور اس عمارت پہ نگاہ کی جس میں خلائی سفر کے متعلق تمام انفرمیشن، مشینری، ہوا بازوں کے سوٹ، راکٹ سب کچھ عوام کے لئے لگا تھا۔ یہ ایک ہوائی جہازوں کے ہینگر جیسی جگہ تھی جس میں جا بجا گھڑیاں، کمپیوٹر مشینیں لگی تھیں جیسی امریکی فلموں میں مشینوں سے چکا چوند کا سماں ہوتا ہے یہ جگہ بھی عام آدمی کو چھوٹا کرنے کے لئے کافی تھی۔ سونیا عمارت کے اندر میرے ساتھ نہ آئی بلکہ باہر کھڑی ہو کر آئس کریم کھانے لگی۔ شاید وہ ساتھ آتی تو میں زیادہ دلچسپی سے انسان کے اس معرکے کو دیکھتا۔ لوگ باگ ٹکٹ خرید کر راکٹ کے اوپر تک جا رہے تھے لیکن میں ان مانے جی سے تمام مشینری میں چکر لگا کر واپس لوٹ آیا یہ سارا ساز و سامان خلا کی طرح ٹھنڈا اور بے جان تھا۔

جب میں باہر پہنچا تو سونیا کی آنکھوں میں فتح مندی تھی ـــــ " دیکھا دیکھا ـــــ اب تو قائل ہو جاؤ، اب تو مان جاؤ کہ روس دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے ـــــ "

"کیسے مان جاؤں ـــــ جب اپالو گیارہ میں سب سے پہلے تین امریکن چاند پر پہنچے نیل آرمسٹرانگ، مائیکل کولنز ایل ڈرن اصل بات تو انسان کا چاند پر پہنچنا تھا ـــــ " پتہ نہیں مجھے کسی امریکن سے کیا ملتا تھا پر سونیا کو جلانے کے لئے میں نے کہا۔ مجھے انسان کے چاند پر پہنچنے سے کوئی غرض نہ تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ جملہ سن کر بھڑک اٹھے گی۔ وہ یہ تو برداشت کر سکتی تھی کہ روس اور امریکہ سالٹ کی کانفرنسوں میں آپس میں بندر بانٹ پر ایک دوسرے سے لڑیں لیکن وہ یہ فعل عمداً نہیں دیکھ سکتی تھی کہ ایک چھوٹے ملک کا آدمی روس کے مقابلے میں امریکہ کو ترجیح دے۔ وہ کسی زندانی کی طرح بھڑک اٹھی ـــــ " تمہارا امریکہ...... تمہارا امریکہ .... انسانوں کو کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ انسانوں کے ساتھ کھیل سکتا ہے انہیں چاند پر بھیج سکتا ہے ان پر تجربہ کر سکتا ہے۔ ہم انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ جب تک فضائی سفر ہر قسم کے خطرے سے پاک نہیں ہو جاتا ہم خلائی سفر پر انسان کو کیسے بھیج دیتے پتہ نہیں جہاں کہیں جمہوریت ہوتی ہے وہاں انسان کیوں اتنا بے وقعت ہو جاتا ہے"۔

یکدم مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا میں پھر سرحد عبور کر کے اس کی حدود میں ہتھیار بند پہنچ گیا تھا۔

آخر جب کبھی کوئی اپنی تخلیق پیش کرتا ہے تو اس کا مقصد تنقیص حاصل کرنا تو نہیں ہوتا۔ سونیا نے مجھے اس لئے تو اندر نہیں بھیجا تھا کہ میں چھوٹتے ہی روسی ٹیکنالوجی کی ٹانگ گھسیٹنے لگوں لیکن دوستی کا لمحہ نکل چکا تھا اب خارپشتوں کی طرح ہم دونوں کے تیر نما پر کھڑے تھے اور ہم ایک دوسرے پر حملہ کرنے کو تیار کھڑے تھے۔

میں چونکہ تھرڈ ورلڈ کا آدمی تھا اور میں نے جمہوریت کو بلا سوچے سمجھے اپنے مذہب سے بھی زیادہ اہمیت دے رکھی تھی اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ جمہوریت سرد ملکوں کا شگوفہ ہے وہیں کھلتا ہے اور وہیں خوشبو دیتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ جمہوریت انسانی سوچ کا کرشمہ نہیں بلکہ کوئی آسمانی صحیفہ ہے جو سیاسی حل نہیں الہامی حل ہے اس لئے سونیا کے حملے کو برداشت کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ تھرڈ ورلڈ کے تمام کالے، براؤن، پیلے، گندمی

سفید لوگوں کو پاؤڈر ملک کے ساتھ ساتھ جمہوریت بھی راس آگئی ہے۔

میں نے جل کر کہا ——— "سونیا جمہوریت اور کمیونزم میں کوئی فرق نہیں ——— یہ تم چھوڑ دو رہنے ہی دو نہ انسان کی قدر یہاں ہے نہ وہاں ——— "

"تمہاری جمہوریت میں ایسے ہوگا ——— وہاں انسان صرف ووٹ ہے ایک ووٹ ——— اجتماعی طور پر ایک طاقت اور فرداً فرداً کچھ نہیں بے مایہ ——— بے حیثیت"

میں اب بھر رہنے کی حد تک ناراض ہو چکا تھا ——— پھر بھی میں نے مٹھاکر کہا" سونیا رانی! انسان دنیا کے کسی خطے میں ابھی اہم نہیں ہوا۔ نہ پہلے ہی کبھی اہم تھا اور نہ اب ہے ——— پہلے فرد بادشاہ ہوتے تھے اب حکومتیں بادشاہ ہیں پہلے تاج شاہی پہننے والے کو کوئی پوچھ نہیں سکتا تھا اب اکثریتی پارٹی کی حکومت کو کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے پہلے بادشاہ متلون مزاج تھے اب حکومتیں، قانون، آئین تلون کا شکار ہیں ان کا مزاج شاہانہ ہے .... پرانے زمانے میں جب بادشاہ جنگوں سے لوٹتے تھے تو واپسی پر ان کے ساتھ بہت سا مال غنیمت ہوتا تھا سکندر.... محمود غزنوی، نادر شاہ .... کے ساتھ عورتیں غلام، کاریگر ...... خزانے تو ہوتے ہی تھے لیکن وہ آرٹ کے خوبصورت نمونے بھی ساتھ لے جاتے تھے .... تخت طاؤس ایسے ہی ایران پہنچا تھا، بادشاہوں کو وقت پر اپنا نام ثبت کرنے کی فکر رہتی تھی وہ خوبصورت عمارتیں چھوڑ کر مرتے تھے تاکہ آئندہ نسلیں انہیں یاد رکھیں۔ تمہارے لینن کا میوزیم اس لئے آباد ہے کہ کچھ روسی بادشاہوں نے ظلم و تشدد سے آرٹ اور کلچر کے یہ نمونے اکٹھے کئے ہیں ...... اب بھی حکومتوں کا یہی شاہانہ مزاج ہے ——— وہ بھی اپنے دور حکومت کا نام ابد کی لسٹ میں لکھوانا چاہتی ہیں آئندہ نسلوں کے ذہنوں پر ——— اور یہ چکا چوندہ سائنسی شعبدے اکٹھے کر کے پیدا کر رہی ہیں تمام دولت بادشاہ بھی فوجوں پر لگاتے تھے ——— اب بھی حکومتیں ملک کی کمائی ہتھیار کی فیکٹریوں پر ضائع کر رہی ہیں ...... نہ بادشاہوں کو انسان کی پروا تھی نہ حکومتوں کو۔ بادشاہ دولت سے علیش کرتے تھے۔ بڑی حکومتیں ہتھیاروں کی فیکٹریاں بناتی ہیں۔ خلائی سفروں کے انتظام کرتی ہیں ——— عام آدمی کی کسی کو پروا نہیں ——— فرق صرف یہ ہے کہ بادشاہ اپنی انا کی خاطر عام آدمی کے حقوق تلف کرتا تھا حکومتیں عام آدمی کو احمق بنا کر یہ احساس دلا کر وہ اس کے حقوق کا تحفظ کر رہی ہے اپنی شان بناتی ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے جو کچھ بادشاہوں نے تعمیر کیا جمع کیا خوبصورت تھا جو کچھ آج کل کی حکومتیں ذخیرہ کر رہی ہیں نہ خوبصورت ہے نہ دیرپا ——— "

"یہ تم حکومتیں حکومتیں کیوں کہہ رہے ہو تمہارا مطلب ہے روس نے عام آدمی کے لئے کچھ نہیں کیا ......"

"کیا ہے کیا ہے بہت کیا ہے"

مجھے یاد آگیا کہ میں اس کی سالگرہ کے روز اس سے جھگڑ رہا تھا ——— "لیکن"

"لیکن کیا بولو ——— بولو اب کیوں چپ ہو بولو ——— "

"تم ناراض ہو جاؤگی ——— اور آج میں تمہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا ——— "

نہیں لوبو ــــ میں ناراض نہیں ہوں گی ــــ اس نے مکمل ناراضگی سے کہا

"تمہاری حکومت نے عام انسان کے لئے بہت کچھ دیا ہے - بہت زیادہ لیکن وہ اس سے بھی زیادہ کر سکتی تھی اگر اس کے اتنے بڑے بڑے پلان نہ ہوتے تاج محل قسم کے۔ سونیا ذرا سوچو تو جو اپنی شان کے لیے چاند کو تسخیر کرنے کی سوچ رہے ہوں۔ انسان کو یک جنبش صفحۂ ہستی سے نیست کرنے کے لیے بم بنا رہے ہوں وہ زمین پر چلنے والے انسان کے متعلق کیا سوچ سکتے ہیں۔ بڑے پلانز والا چھوٹی باتیں کیسے سوچ سکتا ہے ــ ؟"

"تم دقیانوسی تو ہو ہی ہمرو ــــ آج مجھے پتہ چلا تمہاری انفرمیشن بھی درست نہیں ــــ"

"میں تو تمہارے ملک میں آکر، یورپ میں ہر جگہ گھوم پھر کر، امریکہ کے متعلق پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ طاقتور ملکوں کی حکومتیں امیر ہوتی ہیں اور عوام غریب ہوتے ہیں اور چھوٹے ملک جو ایڈ پر چلتے ہیں قرض پر زندہ رہتے ہیں، ان کی حکومتیں غریب ہوتی ہیں وہاں افراد کافی امیر ہوتے ہیں آسائش اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میرے دیس میں چل کر دیکھو ایک غریب گھر میں بھی تمہیں کافی افراط نظر آئے گی۔"

"تم دراصل یہ چاہتے ہو کہ افراد میں اونچ نیچ امیری غریبی ہو ــــ"

"میں تو ایسے نہیں جانتا ــــ پر ایسے ہوتا ہے ــــ ہو رہا ہے ہر جگہ ــــ"

"پھر تمہارا پلان بھی تو کچھ ہوگا ــــ آخر تم دوسروں پر اس قدر تنقید کرتے ہو تو تم نے بھی تو ضرور کچھ سوچا ہوگا کہ بہتر راستہ کون سا ہے ــــ" سونیا نے چڑ کر کہا

"ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام ملک، قریباً برابر برابر ہوں، جہاں زبان بدلے ملک بدل جائے جہاں نیچرل سرحد آئے نئی سلطنت قائم ہو جائے چھوٹے چھوٹے ملک ہوں۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں، ایسی حکومتیں کہیں نہ ہوں جہاں سورج ملک کے کسی نہ کسی حصے میں طلوع رہتا ہو ــــ دادا ابا کے زمل سے جب تک بڑے ملک دست بردار نہیں ہو جاتے دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا ــــ"

"تمہارا مطلب ہے بٹے ہوئے پیچ ورڈ ــ دس چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جائے پیچ ورڈ ــــ"

"تمہارے کمیونزم کا دار و مدار اس مفروضے پر ہے کہ جب دولت کچھ لوگوں کے پاس اکٹھی ہو جاتی ہے تو وہ باقی لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں میرا مفروضہ یہ ہے سونیا کہ جب دولت، مواقع طاقت کچھ ملکوں کی جاگیر بن جاتی ہے تو تمام چھوٹے چھوٹے ملکوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ــــ پھر جس طرح غریب آدمی پستا ہے ایسے ہی غریب ملک کا استحصال ہوتا ہے وہ اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتا چھوٹے ملک میں اپنی زبان بے وقعت ہو جاتی ہے ان کا کلچر، مذہب سب بیکار ہو جاتا ہے۔ تمہارے کمیونزم نے چھوٹے غریب آدمی کو آزادی دلائی ہے اسے احساس کمتری سے چھڑانے کی کوشش کی ہے ــــ لیکن ابھی ایسا مسیحا کوئی نہیں آیا جو چھوٹے ملکوں کو من حیث القوم احساس کمتری کے گرداب سے نکالے ــــ چھوٹے ملک کو بھی جینے کا حق ہے سونیا...... ساری تھرڈ ورلڈ اس کرب میں مبتلا ہے، تڑپ رہی ہے اور بڑے ملک......"

"بس چپ کرو سمرو- آج میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر سمرو مجھے مل بھی گیا تو میں اس کی کسی بات کا جواب نہیں دونگی ——— تم پاکستانی اگر اس قدر امریکی پٹھو نہ ہوتے تو تمہیں نظر آجاتا کہ روس کیا ہے اور اس نے عام آدمی کے لئے کیا کیا ہے ——— تسوے دانیا ———"

وہ گیٹ کی طرف چلنے لگی

"سونیا آج تمہاری سالگرہ ہے آج میں تمہیں اس طرح جانے نہیں دونگا ———"

"میرا بھی خیال تھا کہ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی —— لیکن ——"

"میں تمہارے لئے کیک خریدوں گا ———"

"نہیں اب نہیں ——— تسوے دانیا ———"

"میں وعدہ کرتا ہوں ———"

"میں بھی وعدہ کرتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ میں اپنے وعدے کی پابند نہیں رہ سکتی ..... کیونکہ میں روس سے محبت کرتی ہوں ———"

"پھر کب ملوگی؟ ———"

"نہیں نہیں ——— کسی روز اچانک ——— ریڈ سکوائر میں بولشویک چوک میں ——— کارل مارکس کے بت کے سامنے ——— شاید لینن کی قبر کے پاس ——— کسی دن ——— شاید تب تک میں نارمل ہو جاؤں! ہو سکتا ہے تب تک ہم ایک دوسرے سے بات کرنا سیکھ جائیں ———"

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایسے آنسو جن کا میری پشیمانی سے گہرا تعلق تھا!

دراصل میں تین سال روس میں محض پڑھنے کی غرض سے نہیں رہا بلکہ اس وجہ سے بھی ٹکا رہا کہ کسی طرح سونیا سے میرا سمجھوتہ ہو جائے کسی طرح میں روس کو سونیا کی نظر سے دیکھنے اور سمجھنے لگوں۔ ہم دونوں کے درمیان جو ڈراپ سین ہو جاتا ہے وہ پردہ اٹھا رہے ——— میں نہیں جانتا تھا کہ سونیا کہاں رہتی ہے میں یہ بھی اچھی طرح سے معلوم نہ کر سکا تھا کہ دراصل روس کیا ہے؟ ——— میں نے ہمیشہ سونیا کو تلاش کیا ہمیشہ روس کو سمجھنے کی کوشش سچی نیت سے کی خاص کر جتنی بار بھی میں لینن گراڈ گیا میں نے اس شہر میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے سونیا کو ضرور ڈھونڈ نکالنا چاہا۔ دریاؤں، ہواؤں اور آدھی رات کے سورج کا یہ شہر عجیب طور پر مجھ پر اثر انداز ہوتا تھا ہر بار یہاں پہنچتے ہی مجھے زکام ہو جاتا اور ساتھ ہی ساتھ میں مرضِ عشق میں مبتلا نظر آتا ہر بار جب میں لاؤنج میں سوار ہو کر پیٹرو گریٹ کا محل دیکھنے جاتا اور لاؤنج گلف آف فن لینڈ کے سمندری پانیوں میں چل نکلتی تو نارنجی شیشوں پہ سے سورج کی روشنی اندر مسافروں کے چہروں پر منعکس ہوتی ہر روسی لیونارڈو ڈاونچی کی تصویر بن جاتا میں کسی اور زمانے میں کسی اور عہد میں کھسک جاتا جہاں میں دوستوفسکی کا احمق تھا اس کا POSSESSED تھا میں شہزادہ بھی تھا اور دیوانہ تھا۔ مجھ میں کسی پرانے پادری کی روح بھی تھی اور کسی رند مست کی آنکھیں بھی میرے جسم پر لگی تھیں لیکن لینن گراڈ میں سونیا مجھے کبھی نہ ملی ——— شاید اس شہر میں کبھی وہ مجھے مل جاتی

تو میں اس کا مرید ہو جاتا۔

ماسکو میں تعلیم حاصل کرنا ایک مسلسل عمل ہے۔ یہاں پڑھائی کلاسوں تک محدود نہیں بلکہ اپنے مضمون میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لئے ہر وقت پڑھنا پڑتا ہے۔ اتنی کڑی محنت کے بعد جو باقی وقت بچتا ہے وہ داریا اور میخل کی صحبت میں کٹتا۔ میخل طبعاً عادتاً، فطرتاً شاعر تھا۔ پتہ نہیں وہ کس لئے فزکس میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا تھا جب کہ اس کے ہونٹ پنکھڑیوں کی طرح شاعرانہ اور سبز آنکھوں میں واڈکا بکھری ہوئی تھی۔ داریا بہت مختلف تھا اس کے نظریات میں میری طرح بڑی قطعیت تھی۔ اس نے میرے ساتھ اپنے ملک اور کمیونزم کو کبھی زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی لیکن وہ ہر مسئلہ کا علاج یا تو واڈکا یا لینن کی زندگی میں تلاش کر لیتا تھا۔ داریا کہا کرتا تھا کہ ان دونوں نے مجھے آج تک کبھی مایوس نہیں کیا۔

ہم تینوں کبھی کبھی اکٹھے کریملن جایا کرتے تھے۔ میخل ہمیں لینن کی قبر کے پاس اپنی نظمیں سنایا کرتا تھا داریا باپ کے سے فخر سے یہ نظمیں سنا کرتا تھا اس کی حضرت مسیح جیسی صورت پر ایسے وقتوں میں بڑی حیا ہوتی۔

اس روز جب روس میں میرے قیام کو صرف دو مہینے رہ گئے تھے ہم تینوں سرخ چوک گئے۔ یہاں ہر وقت، ہر موسم میں زائرین آتے رہتے ہیں۔ کیمروں کی کلک کلک سنائی دیتی ہے پکچر پوسٹ جیسی یہ خوبصورت جگہ کبھی لوگوں سے خالی نہیں ہوتی۔ داریا جس کی عادت تھی کہ ہر بات پر مسکرا کر چپ ہو جاتا اور لمبی سوچ بچار کے بعد منہ کھولتا، اس روز خوب بول رہا تھا۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ ایک دن تمہیں واڈکا میں ڈبو دوں —— " داریا نے کہا

"کیوں ؟ —— "

"جب تمہارے ہر مسام سے واڈکا نکلے گی تو تم خود بخود سچ بولنے لگو گے"۔

"کیا اب میں جھوٹ بولتا ہوں —— یعنی"

"نہیں تم جھوٹ نہیں بولتے لیکن جو سچ تم بولتے ہو وہ ہمارے لئے قابل قبول نہیں" داریا نے مندی مندی آنکھوں سے کہا

"دیکھو لینن کی قبر کا سنگ مرمر کس قدر ٹھنڈا ہے —— جس روز پہلی بار رقیب تمہاری محبوبہ کا بوسہ لیتا ہے اس روز کے بعد تمہاری محبوبہ کے ہونٹ اتنے سرد ہو جاتے ہیں تمہارے لئے ——"، میخل قبر کے جنگلے کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا وہ ہم دونوں کی گفتگو میں بالکل شامل نہیں تھا۔

داریا فزکس میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا لیکن مجھے اس کی شکل دیکھ کر ہمیشہ لگا جیسے دراصل وہ پیرا سائیکولوجی کا طالب علم ہے وہ کہیں اندر ہی اندر ٹیلی پیتھی، سائیکو کائی نیس، کلیروائنس، ہپ ناسس پہ کام کر رہا ہے اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا خورد بینی تجسس تھا حالانکہ اس کے ہونٹ شاذ ہی کھلتے تھے۔

"سچ بتانا ممرد تمہیں ہمارا روس کیسا لگا ؟ —— تمہارا ہر جواب میرے لئے قابل قبول ہوگا، فقط دل رکھنے کے

لئے جھوٹ نہ بولنا۔"

"ابھی میں وطن سے بہت دور ہوں ـــــ تین سال کی جدائی نے وہاں کا رنگ نکھار دیا ہے جب بھی میں روس کی تعریف کرتا ہوں مجھے لگتا ہے جیسے میں اپنے وطن کی حق تلفی کر رہا ہوں جیسے محبوبہ کے زانو پہ سر رکھ کر اچانک بیوی یاد آنے لگتی ہے اور محبوبہ کی تمام خوبیاں ختم ہو جاتی ہیں...... بالکل ایسے ہی..... مجھے چند سال واپس جا کر اپنے وطن رہ لینے دو داریا ـــــ پھر میں تمہیں روس کے بارے میں لکھوں گا"

"جھوٹ ـــــ جھوٹ سراسر جھوٹ ـــــ تمہیں روس پسند نہیں آیا ـــــ"

"آیا ہے ـــــ آیا ہے ـــــ میں اگر چاہوں تو بھی باقی ماندہ ساری زندگی اس کے اثرات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔" داریا نے اپنی دور مار آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ہولے ہولے بولا ـــــ "تمہیں معلوم نہیں سرو...... روس دنیا کا مستقبل ہے۔ کوئی شخص بھی اپنے مستقبل سے نفرت نہیں کرتا لیکن کبھی کبھی...... سرو تم جیسے احمق مستقبل سے خوفزدہ ہو کر حال کو تباہ کر دیتے ہیں"

میخل نے آہستہ آہستہ گنگنانا شروع کر دیا۔ اپنی جادو بھری ساحری آواز میں اس نے اپنی نظم سنائی۔

"میرے دل کی گھاس پہ ایک زرد ٹکڑا ہے
میں نے اسے آنسوؤں سے بہت سینچا
لیکن یہ گھاس کبھی ہری نہ ہوئی
یہ وہی جگہ ہے جہاں تم ایک شام کہنی ٹیک کر لیٹی تھیں
دل کا سارا لان سرسبز ہے
لیکن یہ زرد ٹکڑا سرسبز نہیں ہوتا
آنسو اس پر گرتے رہتے ہیں پھر بھی یہ زرد رہتا ہے

ہر رت میں ......"

سونیا...... سونیا...... یہ لڑکیاں بھی کیا بلا ہیں ایک پل ـــــ کسی شام دل کے لان پر زرد رنگ کا ٹکڑا چھوڑ جاتی ہیں جو کبھی ترو تازہ نہیں ہوتا......

لینن کی قبر کے پچھواڑے قلعے کی سمت پہرے پر مقرر دو سپاہی بڑے تواتر سے ایک دوسرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ "رنگین پیڑ پیڑ جیسے گنبدوں والا آٹھ ون تھا TERRIBLE اگر جا گھر لعدادسے گاچی کر کے یہاں نصب کیا لگتا تھا" جب تم پاکستان چلے جاؤ گے تو پھر ہم کس سے پوچھیں گے بتاؤ نا تمہیں روسی کیسے لگے؟ روس کو چھوڑو ـــــ"

میں ان کو کیسے بتاتا میرے لئے تمام روسی سونیا کے باعث پیارے تھے۔ دیگ کا ایک ہی چاول کافی ہوتا ہے

"روسی بہت پیارے ہیں سب کے سب ـــــ"

"یہ سب جھوٹ ہے سرو ـــــ سچ سچ بتاؤ تجزیہ کر کے ـــــ ان کی ایک خصوصی بات ـــــ" داریا نے

ی نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

روسی فرد پرست ہیں۔ ان کا سب کچھ لینن ہے حالانکہ ان کا سب کچھ کارل مارکس ہونا چاہیئے تھا ــــ"

"پہلی بات یہ ہے سمرو کہ کارل مارکس تھیوری تھا لینن نے اس کو عملی جامہ پہنایا ـــــ عمل بہرکیف قول سے بڑا نا ہے۔ دوسری بات یہ الزام ہے۔ اتہام ہے کہ روسی فرد پرست ہوتے ہیں ـــــ یہ غلط چارج ہے ہم لینن کی بہت زت کرتے ہیں لیکن ہم لینن پرست نہیں ......"

ہم بھی فرد پرست ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم مانتے ہیں کہ فرد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا کوئی ECOLOGY، فرد ، مثال کے بغیر نہیں چل سکتی۔ تم لوگ مانتے نہیں ـــــ"

"باتیں مت کرو سمرو داریا .... دیکھو اس طرف سپاہیوں کا پہرہ بدلنے والا ہے پتہ نہیں اس منظر سے مجھے کیوں لگتا ہے جیسے یک دم موسم بدلنے والے ہوں۔" میخل نے فاصلے پر دیکھتے ہوئے کہا

آدرش موجود ہو تو اس پر ہر وقت عمل کیا جا سکتا ہے ـــ"

"ہم مشرق والے ـــــ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ماننے والے اس بات کو جان گئے ہیں داریا کہ جب آدرش کو اپنے وجود سے مثال بنانے والا ختم ہو جاتا ہے تو آدرش فقط قول میں تبدیل ہو جاتا ہے ہمارے پاس بھی خدا کا بھیجا ہوا قرآنی آدرش موجود ہے لیکن ہر رت میں ہر عہد میں ہر ملک میں قطب، ولی، ابدال آتے رہتے ہیں۔ وہی آدرش کو عملی جامہ پہنا کر مجھاتے رہتے ہیں ـــ جب کمیونزم کے لینن آنے بند ہو جائیں گے تو کمیونزم بھی کتابوں کی زینت رہ جائیگا پھر لوگ مانا تو اسے بھی کریں گے لیکن اس پر عمل نہیں کریں گے ـ"

روس کا ہر فرد لینن ہے ہم سب اپنے مسلک پر رہبر کے بغیر بھی چلنے کی قوت رکھتے ہیں۔"

مجھے لڑکیوں کا وہ سکول یاد آگیا جس میں لینن نے پناہ لی تھی اور جس کے باہر اب بھی لینن کا اتنا بڑا بت نصب ہے میں نے داریا سے کہنا چاہا اگر تم فرد پرست نہیں ہو ـــــ تو لینن کی یادوں میں ہل کیوں نہیں چلا دیتے؟ اس کے گھر کو میوزیم کیوں بنا رکھا ہے اس گھر میں جانے والے سیاح کو وہ پاسپورٹ کیوں دکھاتے ہو جس پر لینن یورپ گیا تھا اور جس میں وہ معمولی مزدور کے لباس میں نظر آتا ہے وہ کیاری جو لینن کے بت کے اردگرد پھیلی ہے اور جس میں اہتمام سے سرخ جرنیم کے پھول اگتے ہیں۔ اس میں پھولوں کی اتنی نگرانی کیوں؟

یہی تمام نشانیاں تو اس بات کی دلیل ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فرد زندہ رہے مثال زندہ ہوگی تو آدرش کے بے جان وجود میں گرم لہو دوڑتا رہے گا۔ کبوتر کے لئے مرمریں جسم کا لہو ضروری ہے ورنہ آدرش صرف ایسے لفظوں میں ڈھل جائیگا جن کو سمجھنا بہت مشکل ہوگا۔

چلو گم میں چلیں ـــــ یہ سرخ چوک اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہمیشہ ہوائیں چلتی ہیں۔" اور مجھے ہواؤں سے ڈر لگتا ہے۔ میخل یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ سرخ چوک کے تینوں طرف بڑی اونچی عمارتیں ہیں ایک طرف قلعہ ہے دوسری جانب رنگ برنگی گنبدیوں والا گرجا ہے اور تیسری جانب گم محل ہے جس میں آج کل بادشاہ شہزادے نہیں رہتے بلکہ ایک بڑا

شاپنگ سنٹر آباد ہے ——

"سمرو ...... پہلی مٹی کو ضرور اس جگہ کو یاد کرنا —— اتنے زائرین ..... اتنے عقیدت مند یا تو مکہ معظمہ میں آتے ہیں یا یہاں —— یہ دونوں جگہ عام آدمیوں کے قدموں سے آباد ہیں —— تمہارا مکہ —— اور ہمارا مکہ !"

ہم تینوں خاموشی سے گم کی طرف چلنے لگے کچھ نائیجیریا کے سیاحوں نے ہمارے سمیت اس پتھریلے چوک کی تصویریں لیں اور مسکرا کر ہمیں اپنی خوش دلی کا احساس دلایا

"سمرو مجھے سندھ کے طاس سے تھوڑی سی مٹی بھیجنا —— "میخل نے کہا۔

"کیوں مٹی کا کیا کرو گے ؟

"چاند کی مٹی کیوں لائے تھے زمین پر —— دیکھنا پڑتا ہے کہ روس کی مٹی اور پاکستان کی مٹی کے کیمیائی اجزا کیا ہیں

"اچھا تو کیمیکل فرق نکال کر کیا کرو گے —— ؟" میں نے سوال کیا

"پھر سمجھ جاؤ گا کہ سندھ میں کیوں سمرو پیدا ہوتے ہیں اور موسکاؤ میں کیوں میخل پیدا ہوتے ہیں"۔

گم کے بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ موٹی روسی عورتیں بھاری بھاری سفری تھیلے، چیز اور سستا کپڑا خرید رہی تھیں ہم تماکو کی تلاش میں دوسری منزل پر گئے اور وہاں سے ہم نے نچلی منزل کی طرف دیکھا۔ ایک سیلاب تھا جو دوکانوں میں آ جا رہا تھا —— ضرورت کی چیزیں —— ہر ملک میں ہر جگہ عام آدمی نے ساری معیشت کو CONSUMERS GOODS کے تابع کر رکھا تھا ...... حکومتیں خالفت کر رہی تھیں

"تم نے سمرقند نہیں دیکھا ؟ —— میخل نے پوچھا

"نہیں ؟"

"دوشنبے، سمرقند، تاشقند بخارا ..... یہ روس کی الف لیلوی ریاستیں ہیں۔ ان شہروں میں اب بھی شہزادیاں پھرتی ہیں۔ یہاں اب بھی بہار رنگوں کے گاؤن پہنے لمبی چوٹیاں لٹکائے ترچھی آنکھوں والی لڑکیاں انگور خوبانی اور آڑو بیچتی ہیں۔ سمرو اپنے دیس لوٹنے سے پہلے وہاں ضرور جانا۔ سفید روس کا اور مزاج ہے اور موسم ہے جنوب کی آب و ہوا اور ہے جیسے اب بھی ریگستانی چوک سے اونٹوں پر قافلے اٹھتے ہوں ..... جب تمہیں ماسکاؤ لینن گراڈ بالکل بھول جائیں گے پھر بھی تمہیں سمرقند یاد رہے گا ...... جیسے بچپن کا دیکھا ہوا خواب —— "میخل شاعر تھا اور خوابوں سے محبت کرتا تھا۔

"میں تب چھوٹا تھا جب تمارا خانم پاکستان آئی تھی۔ میں نے اسے بھی نہیں دیکھا —— "

"تم ضرور جاؤ —— وہ حصہ تمہارے قریب ہے —— تمہیں اسے سمجھنے میں آسانی ہوگی اور اسی رعایت سے روس کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ پتہ نہیں یہ میخل کا اصرار تھا کہ میری اندرونی آنند لیکن کچھ دیر کے بعد میں جنوبی روس کے لئے روانہ ہو گیا۔

میں بڑی امید کے ساتھ تاشقند کے لئے روانہ ہوا تھا۔ بچپن سے تاجکستان ازبکستان کو دیکھنے کی آرزو دل

سے پال رکھی تھی جیسے کنگارو مادہ اپنے مادہ اسپر برابر بچے کو اپنی تھیلی میں پالتی ہے لیکن ایئرپورٹ پر زرد ہواؤں میں یت تھی۔ گرمی غریبی افلاس دونوں سے پیدا ہونے والا احساس کمتری ہر آنکھ سے ٹپک رہا تھا۔ یہ لوگ زردی مائل سفید مول تھے ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا حجاب تھا جو میں سمجھ نہیں سکا کبھی یہ لوگ سفید روس پر حملہ آور ہوا کرتے ہے .... مارے مارتے تھے ..... سمرقند، تاشقند..... بخارا

بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا

جب بادشاہ عنایات کرتے تھے تو پھر خزانوں کا منہ کھول دیتے تھے جس وقت جب ہند و محبوبہ کے تل پر تاشقند و بخارا ربان سے ہوگئی یہ ستم ایجاد شہر خانقاہ کی شکل کے نہ ہوں گے بلکہ یہاں کی چہل پہل دولت و ثروت سے دھرتی کا کلیجہ دہل جاتا ہوگا۔ اب سمرقند اور تاشقند نور جہاں کے مقبرے کی شکل کے آثار السنادید تھے۔ الغ بیگ کی رصدگاہ [illegible] تھی جس میں زمین کھود کھود کر نیچے تک زاویوں اور ڈگریوں کا حساب لگا کر ستاروں کو دیکھنے کا انتظام تھا۔ بی بی جان کی مسجد ریگستانی چوک ...... تینوں مسجدیں جن کے سامنے سے کبھی ہندوستان ترکی ایران کے لئے قافلے جاتے ہوں گے .... یہاں تیمور لنگ کا مقبرہ تھا ——

سب کچھ ماضی تھا —— حال میں صرف کھنڈر تھے۔ یہاں وہ خوبصورت میوزیم نہیں تھے جو لینن گراڈ اور موسکاؤ کی زینت تھے —— وہ آرٹ کے نمونے بھی ماضی کے آئینہ دار تھے لیکن وہ زندہ تھے جی رہے تھے۔ وہ میوزیم ماضی کا حصہ نہیں لگتے تھے۔ یہاں علی شیر نوائے میوزیم سے لے کر تمام تاریخی عمارتوں تک ایک اداسی محیط تھی ایک کس مپرسی ایک دکھ —— پتہ نہیں سمرقند اور تاشقند میں مجھے کیوں سڑکوں پر مسلمانوں کا زوال نظر آیا؟ جیسے وہ اٹھنا چاہتے تھے لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ کیسے اٹھا جاتا ہے؟ جیسے وہ اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش میں اور الجھتے جا رہے تھے۔ خاک مذلت سے اٹھنے کے لئے انہیں کسی ایسے دستگیر کی ضرورت تھی جو ان کی طرح افتادہ تر نہ ہو۔

روس کے جنوب میں پہنچ کر مجھے مایوسی ہوئی —— یہاں ماضی کی شان و شوکت نہیں تھی اس کا نوحہ موجود تھا ہر جگہ پر ہر چہرے پر .... میں نے گھبرا کر یہاں کے تاریخی مقامات دیکھنے بند کر دیئے۔ کتب خانوں میں جانے لگا۔ ان کی مسجدوں کو دیکھنے لگا۔ میں ان کے قلمی اثاثے میں اپنی وراثت کے آثار تلاش کرنا چاہتا تھا۔ یہیں انسٹیٹیوشن آف اورینٹیل سٹڈیز میں مجھے خانم شمع رو ملی۔

خانم شمع رو نے لہریئے رنگوں کا گھٹنوں سے نیچے تک ڈھیلا سکرٹ نما میڑنٹی توب پہن رکھا تھا اس کے لمبے بال لمبی چوٹی میں لٹک رہے تھے اور سر پہ سبز رومال بندھا تھا۔ خانم شمع رو سفید گاچنی کے رنگ کی گڑیا تھی اس کے رخسار کی ہڈیاں اونچی اور آنکھیں ابروؤں کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میں ایک الماری کھولے انہماک سے فصوص الحکم کا نسخہ دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے پاس آئی۔ اس کے پیروں میں ایسے جوتے تھے جن کا کوئی شور نہیں ہوتا۔ مسلمان عورت کے جوتے!

"فرمائیے کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟" اس نے رواں کتابی فارسی میں کہا
ازبکستان کے لوگ اب بھی شاعر طبیع ہیں۔ یہ ایرانی لب ولہجے میں فارسی نہیں بولتے بلکہ ایسی فارسی استعمال کرتے ہیں جو ہمارے ہاں نصابوں میں ملتی ہے عام باشندوں کو بھی کئی کئی فارسی شعر زبانی یاد ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ بر وقت استعمال کرتے رہتے ہیں۔

"میں کسی ایسی کتاب کی تلاش میں ہوں جو کسی روسی سیاح نے لکھی ہو اور جس میں برصغیر کے واقعات بیان کئے ہوں" وہ کچھ دیر اپنے موٹے رجسٹر دیکھتی رہی پھر ایک نازک سی سیڑھی پر چڑھ کر اس نے سکرٹ کے کیسے سے عینک نکالی لگائی اور ایک کتاب کو جھاڑتی ہوئی اتر آئی۔

"یہ دیکھئے عبدالرزاق سمرقندی کی کتاب —— سفر ہندوستان و شرح غرائب ——"
میں شمع رو کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ میں مسلمان ہونے کے ناطے سے فارسی خوب سمجھتا ہوں۔ میں اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ اب برصغیر کے مسلمان فارسی کی جگہ انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اس روسی لڑکی کے سامنے جواب بھی فارسی بولتی تھی یہ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا ——

شمع رو سے کتابوں کی باتیں کرنے کے بعد میں کتب خانے سے باہر نکل آیا۔ شمع رو نے مجھے دوسرے دن ہوٹل ستارا میں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ میں وقت سے کچھ پہلے ہوٹل کی کھلی ٹیرس پر پہنچ گیا۔ ہوائیں سستی اور تواتر کے ساتھ چل رہی تھیں۔ ہوٹل کی میزوں پر کپڑے اڑ رہے تھے۔ یہاں کے تاریخی مقامات کو یہ ہوائیں ہولے ہولے چاٹ رہی تھیں۔ سب کچھ کھنڈر میں بدل رہا تھا...... یہاں کی نئی عمارتیں تمام کنکریٹ کے ڈھانچے تھے جن کا اسلامی عمارت گری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہاں کے میوزیم شمالی میوزیموں کے مقابلے میں فقیرانہ تھے۔ اپنے ماضی کی یاد میں گم گشتہ و حیران!

یہاں کے بچے حیدرآباد کے بچوں کی طرح غریب اور متجسس تھے غریب آدمی ہمیشہ ان چیزوں کو غور اور تجسس سے دیکھتا ہے جن سے ایک آدمی دوسرے آدمی سے ممتاز ٹھہرتا ہے کار...... کپڑے، جوتے...... ریڈیو...... سگریٹ...... وینٹی بکس...... یہاں بھی گرم ملک کے باشندوں کی طرح لوگ متجسس تھے اور دیکھتے تھے...... غور سے۔ اس طرح شمالی روس میں کوئی بچہ نہیں دیکھتا......

خانم شمع رو کچھ دیر سے آئی لیکن اس کے آتے ہی لذیذ تکے، نفیس نان اور سمرقندی پلاؤ آ گیا کھانا دیکھ کر روح کے تمام دکھ دور ہو گئے میں نے رغبت کے ساتھ ندیدے بچوں کی طرح کھانا شروع کر دیا۔

ٹیرس سے نیچے دف بجاتی لڑکیوں کے گھیرے میں ایک مسلمان لڑکی عیسائی دلہنوں کے لباس میں ہوٹل کی جانب آ رہی تھی شادی کے مہمانوں میں کچھ مرد ناچ رہے تھے اور نفیری کی آوازیں مشرقی سُر تھے۔

"آپ کی شادی ہو چکی ہے عثمان سمرو؟ ——"
"جی نہیں —— لیکن لڑکی ماں پسند کر چکی ہے۔ جب میں واپس لوٹوں گا تو شادی ہو گی۔"

خانم شمع رو نے فارسی میں شعر پڑھا جو میں سمجھ نہ سکا

"اور آپ کی؟ ——"

"میں ابھی سوچ رہی ہوں عثمان سمرو کہ کس سے شادی کروں؟"

"اتنی لمبی سوچ کیوں؟" میں نے پوچھا ——

"میں اپنی بوڑھی نانی کے ساتھ رہتی ہوں وہ پرانے خیال کی عورت ہے اس کا خیال ہے مجھے کسی ازبک مسلمان سے شادی کرنی چاہیئے اور میں کسی سفید روسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں جو ماسکاؤ میں رہتا ہو جینز پہنتا ہو اور جس کی ھی مکئی کے بالوں جیسی سنہری ہو ——"

"نانی ٹھیک کہتی ہے ——"

"وہ ابھی پچھلے سال حج کرکے آئی ہے میرے لئے بھی آبِ زمزم لائی تھی میں نے تو وہ پانی نہیں پیا لیکن نانی نے سنبھال کر رکھتی ہے وہ چاہتی ہے میں بھی حج کروں اور کسی ازبک سے شادی کروں"

"تمہارا آئیڈیل کون ہے شمع رو —— ازبک کہ سفید روسی؟ ——"

شمع رو بہت خوبصورت تھی اس کا رنگ بال آنکھیں تمام تباہ کن تھے پھر بھی وہ جیسے ریتلی مٹی پہاڑی کی آس میں ٹھی تھی —— "دیکھو ناں سفید روسی ہم سے خوبصورت ہوتے ہیں پھر ان کی زبان روسی ہے ہماری قومی زبان۔ ہم لوگ تو فارسی بولتے ہیں پھر وہ شمال میں رہتا ہوگا۔ شادی کے بعد میں موسکاؤ جا بسوں گی یا شاید لینن گراڈ چلی جاؤں —— سچ بتانا سفید روسی ہم سے زیادہ مہذب ہیں ناں — تمہیں وہاں کے روسی زیادہ اچھے لگے ہوں گے؟ —"

"شمالی روس —— اور جنوبی روسی ——"

"کیسے ہو سکتا ہے — کیسے ممکن ہے بھلا سفید روسی کے مقابلے میں کوئی کیسے ہمیں پسند کر سکتا ہے خوامخواہ ——!"

"ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے — کیونکہ ہم لوگ — متعصب ہوتے ہیں ہمیشہ اپنوں کو غیروں پر ترجیح دیتے ہیں"

"تمہارا رشتہ اسلام سے کٹ گیا ہوگا لیکن تم کعبے کے بتوں کی طرح وہیں کے ہو جہاں کے ہم ہیں ——"

وہ چپ چاپ نیچے دیکھنے لگی جہاں براتیوں کے گھیرے میں دولہن پھولوں کا گلدستہ لئے مسکرا رہی تھی۔ ازبک مسلمان کی ازبک دولہن ——

میں خانم شمع رو کو ایک واقعہ سنانا چاہتا تھا لیکن چپ رہا کیونکہ وہ روسی زبان کو فارسی سے بہتر سمجھتی تھی شمالی سفید روسی کو اپنے سے شرف میں اعلیٰ جانتی تھی اور موسکاؤ اور لینن گراڈ کے شہر اس کی نظر میں بہشت سے کم نہ تھے۔ ہن کا حال اس غریب بستی میں رہنے والی لڑکی کا تھا جو اسلام آباد کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتی ہو۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ وطن کی سرحدوں سے آگے، رحمی رشتوں سے علاوہ، بھی ایک رشتہ ہوتا ہے جس میں چودہ سو سالوں سے خود بخود جان پڑتی رہتی ہے جب انسان اپنوں میں گھرا ہوتا ہے اس کے اردگرد رشتے ہی رشتے ہوتے ہیں تو اس چودہ سو سال پرانے پیوند کا احساس نہیں ہوتا لیکن جس وقت انسان کسی اجنبی فضا میں کسی مسلمان سے ملتا ہے تو دونوں قلب عجیب گرمی سے تازہ ہو جاتے

ہیں اور آپس میں ایسے قرب کا احساس ہوتا ہے جو کسی اور کے ہمراہ محسوس نہیں ہوتا۔

دوشنبے سے قریباً ستر کلومیٹر شمالی پہاڑوں میں اس علاقے کا بجلی گھر تعمیر کیا گیا ہے اس کو دیکھنے کے لئے میں وہاں گیا تھا۔ دریا کافرنیاں کے ساتھ ساتھ سڑک بل کھاتی اوپر پہاڑوں کی طرف جاتی ہے۔ راستہ میں کھلے آراستہ کھیت، خوبانیوں سے لدے درخت اور زمین پر پھیلے ہوئے تاکستان نظر آتے ہیں۔ کافرنیاں کا نیلگوں پانی پتھروں سے ٹکراتا سر پھوڑتا نشیب کی جانب جاتا نظر آتا ہے جس وقت میں ہائیڈرو الیکٹرک سٹیشن دیکھ کر لوٹ رہا تھا تو ہمارے ڈرائیور نے کار میں پانی بدلنے کے لئے گاڑی روکی۔ ہمارے پیچھے ہی ایک کھلی چھت والا ٹرک آ کر رک گیا۔ ڈرائیور اس چشمے پر پانی بھرنے کے لئے چلا گیا جو سڑک کے کنارے ہی بہہ رہا تھا۔

کھلے ٹرک میں دیہاتی لوگ گہرے رنگوں کے سواتی قسم کے کھلے کرتے ٹخنوں پر تنگ پائنچے والی شلوار پہنے ہوئے تھے لڑکیوں کی شکلیں افغانی سواتی قسم کی تھیں اور ان کے سروں پر چادریں تھیں۔ ہم بھی ٹیکسی سے اتر کر چشمے میں منہ ہاتھ دھونے لگے۔ غالباً تمام دیہاتی لڑکیاں کسی شادی پر جا رہی تھیں کیونکہ ان کا لباس خوبصورت اور نیا تھا اور وہ دف بجاتی ہوئی گا رہی تھیں جس وقت میں چشمے کے برفیلے پانی میں انگور کے کاسنی خوشے دھو رہا تھا ایک بوڑھا آدمی شادی کے گروہ سے کٹ کر میری طرف آیا۔

"یہ کہاں سے آئے ہیں؟" باباجی نے ہمارے ڈرائیور سے سوال کیا

تھوڑی سی فارسی کے سہارے میں اس کی بات سمجھ گیا ——

"پاکستان —— آغا از پاکستان آمدم ——"

"بلے بلے...... ہندی نیست؟ ——" باباجی نے پوچھا

"ناں ہندی نیست —— مسلمانم ——"

"الحمدللہ —— الحمدللہ ——"

بوڑھے کے چہرے پر مدنی قسم کی ڈاڑھی تھی۔ اس کا چہرہ میرے دادا ابا کی طرح جھریوں سے بھرا تھا اس کی آواز دھیمی تھی لیکن اب یکدم وہ مجھے جوان نظر آنے لگا۔ اس کی چھاتی تن گئی۔ آنکھوں میں خوشی چمکنے لگی۔

"واللہ مسلمان میہمان ——"

اس نے کتنے سارے ترکی نام لئے اور سڑک کے پار کھڑی لڑکیوں کو پکارا

"مسلمان میہمان ——"

لڑکیوں نے جھولیاں پھیلا کر مجھے پھل پیش کئے۔ وہ ہمارے پہاڑی علاقوں میں بسنے والی لڑکیوں کی طرح شرمیلی اور رکھی رکھی کر کے ہنسنے والیاں تھیں۔

بوڑھے بابا نے میرے خالی بائیں ہاتھ کو اٹھایا اپنے ہونٹوں سے لگایا اور آہستہ آہستہ کوئی سورۃ پڑھی پھر اس کی آنکھ سے ایک آنسو لڑھک کر میرے ہاتھ پر گرا —— "مسلمان میہمان..... مسلمان میہمان"

...ر نہیں کیوں اس آنسو نے میری ساری روح بھگو دی۔ ایک مرتبہ میری بڑی بہن سخت بیمار ہوگئی تھیں۔ میں جمعرات
...رات شاہ عبداللطیف بھٹائی کے دربار میں بڑے دروازے کا کنڈا پکڑ کر گڑگڑا رہا تھا —— اس رات میرے
...ایسی گریہ طاری تھا جو اس آنسو سے موجزن ہوا۔

...بابا جی نے اپنی پوتیوں نواسیوں بیٹیوں کو حکم دیا کہ وہ میرے گرد دائرہ بنا کر ناچیں اور دف بجائیں۔ پہلے تو لڑکیاں
...ں شرمائیں لیکن جب بابا جی نے خود دف پکڑ کر بجانا شروع کر دیا تو تمام عورتوں لڑکیوں نے میرے گرد دائرہ بنا کر ناچنا
...ردیا۔ میں دم بخود تھا۔ بابا سورتیں پڑھ پڑھ کر میرے سر پر پھونک رہا تھا۔ مرد گا رہے تھے۔ ڈرائیور لڈی ڈال رہا تھا۔
...ہم سب مسلمان ہونے کے ناطے سے یکدم ایک گھرانہ ایک برادری بن گئے تھے۔ کافرستان کے اس واقعے نے تمام
...ت، تمام ازم، تمام سیاسی سوجھ بوجھ کو خاک میں ملا دیا اور میں دوشنبے کی اس سڑک سے مشرف بہ اسلام ہو کر ایسے
...ے پہلی مرتبہ میں نے روشنی دیکھی ہو۔

آخری بار مجھے سونیا پشکن کے گھر کے سامنے ملی —— اچانک

"جنوبی روس دیکھ آئے؟ ——"

"ہاں لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ ——"

"مجھے میخل ملا تھا —— وہ بتا رہا تھا تمہارے متعلق ——"

"اچھا —— " مجھے میخل پر اچانک غصہ سا آگیا۔

"وہاں کا کیا پسند آیا؟ تیمور لنگ کا مزار —— بی بی جان کی مسجد کہ علی شیر نوائی کی میوزیم؟ ——"

"مجھے ایک بوڑھا ترک پسند آیا جس کی ڈاڑھی بالکل سفید اور جس کا سینہ ڈاڑھی سے بھی زیادہ منور تھا ——"

"اور کیا پسند آیا؟ ——"

"وہاں کے خربوز پسند آئے —— بے حد لذیذ تھے ——"

سونیا اہم تاریخی مقامات کے متعلق پوچھ رہی تھی وہ انسان کے بنائے ہوئے مظہروں کے بارے میں جاننا
...ہتی تھی۔

"خربوزہ انگور انار تو تم یہاں بیٹھ کر بھی کھا سکتے ہو ——" سونیا نے چڑ کر کہا۔

"اس طرح نہیں سونیا —— کئی سو سال پرانے ظروف میں سجے ہوئے پھل ...... تازہ تل لگے نان ......
...سمندوری قہوہ ...... ساتھ تاشقندی ہوائیں —— سمرقندی فضائیں ...... مجھے لگتا تھا ہر لحظہ جیسے میں کسی
...اروان کے ساتھ جنوب کو جانے والا ہوں —— فضا میں گھنٹیوں کی صدائیں تھیں ...... ریت پر اونٹوں کے پیروں
...کے نشان تھے ......"

"تم دراصل انحطاط پسند ہو ...... تم ہمیشہ ماضی کے رومان میں رہنا چاہتے ہو لینن گراد ہو یا بخارا —— سمرقند ہو یا دوشنبے
...تم میں اس جذبے کی کمی ہے جس سے انسان میں کچھ کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے جس کے طفیل وہ خود بھی بڑا ہوتا ہے ملک
...کو بھی قدآور کرتا ہے —— تم میں بڑائی کا احساس نہیں ——"

میں نے کسی نومسلم کے جوش سے نعرہ لگایا —— اللہ اکبر —"

"کیا کہا کیا —؟"

"میں نے کہا صرف اللہ بڑا ہے باقی سب بڑائیاں بڑائی کی کوششیں ہیں —— انفرادی اور مجموعی —"

کچھ دیر وہ چپ رہی پھر اٹک اٹک کر بولی —"اور یہاں —— ؟ یہاں کا کیا اچھا لگا —"

یہ ایسا ہی سوال تھا جیسے کوئی گاؤں کا چوہدری اپنے کتی سے پوچھے بتا بھئی تجھے ہمارے ڈیرے پر کونسی چیز اچھی لگی ہے۔ بس صرف ایک چیز بتا صرف ایک —"

شاید وہ مجھ سے اپنا نام سننے کی آرزو مند تھی لیکن میرے ہاتھوں پر ابھی باباجی کا آنسو تر تھا۔

مجھے دوستوفسکی کا سادہ اور خوبصورت گھر پسند آیا —— جانتی ہو اگر وہ صرف جہنم کی اتنی جامع تعریف ہی چھوڑ جاتا جو اس نے چھوڑی ہے تو ہمیشہ زندہ رہتا —"

"کیا تعریف کی ہے اس نے جہنم کی" سونیا نے سوال کیا

"تمہارا دوستوفسکی کہتا ہے جس شخص میں محبت کرنے کی صلاحیت نہیں وہ دوزخ کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔"

"اس کے علاوہ؟ —— اور —— ؟" اس نے پُرامید نظروں سے میری جانب دیکھ کر کہا

"پاکستان جانے سے پہلے ضرور بتاؤں گا سونیا ——"

"نہیں ابھی بتاؤ ——"

"ابھی نہیں بتا سکتا ناں ورنہ پاکستان نہیں جا سکوں گا۔"

ہم دونوں اکٹھے پشکن کے گھر میں داخل ہوگئے جس کے پہلے کمرے میں ایک کھڑوس کرسی پر ایک چھیاسی برس کی بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر بس سکارف تھا وہ ہمیں سب سے پہلے پشکن کی لائبریری میں لے گئی —— وہ ٹھہر ٹھہر کر انگریزی میں بولی —"یہ پشکن کی لائبریری ہے پشکن روس کا وہ شاعر ہے جس نے روسی زبان کو ادبی بنایا۔ وہ ایک ایسا شعلہ نوا شاعر تھا جو حقیقت سے کبھی دور نہیں ہوا۔ یہ اس کی لائبریری ہے۔ یہ اس کا میز ہے —— یہ اس کا وہ قلم ہے جس کے ساتھ اس نے جلاوطنی کے دور میں نظمیں لکھیں یہاں اس صوفے پر اسے لٹایا گیا جب وہ اپنی بیوی نتالیا کی خاطر ڈوئیل میں زخمی ہوا —— کیا آپ جانتے ہیں کہ پشکن کی موت کیسے واقع ہوئی؟ —"

"نہیں ——" میں نے نفی میں سر ہلایا

وہ ہمیں پشکن کے بیڈ روم میں لے گئی پھر اس نے وہ چھوٹا سا کمرہ دکھایا جس میں پشکن اس کی بیوی نتالیا، بیوی کی دو بہنیں اور ایک بہن کیتھرین کا فرانسیسی شوہر رہتا تھا۔ گھر اتنا بڑا نہ تھا جس میں اتنے سارے لوگ سما سکتے شاید اس طرح بہت قریب رہنے کے باعث ہی کیتھرین کا شوہر پشکن کی بیوی پر عاشق ہو گیا پشکن کو دربار سے منسلک رہنے کا شوق نہ تھا وہ اپنی زندگی کسی دیہات میں ادبی سرگرمیوں میں گزارنا چاہتا تھا لیکن نتالیا دربار کی محفلوں کی جان تھی —— اسی چھوٹے سے گھر سے یہ خوبصورت بہنیں خوبصورت گاؤن پہن کر دربار روانہ ہوتی ہوں گی اور پشکن اپنی لائبریری میں

بیٹھا سکاٹ بائرن کا مطالعہ کرنے میں مصروف رہتا ہوگا۔

پھر دربار کے لوگوں نے پشکن کو ان باتوں سے آگاہ کیا ہوگا جو نتالیا اور جارجیس کے مابین لذت کا باعث تھیں جارجیس کو پشکن نے غیرت کے باعث ڈوئل میں للکارا اور جارجیس جو فوج میں تھا پشکن پر غالب آیا۔ پشکن کو زخموں سمیت اس صوفے پر لا کر ڈال دیا گیا جس کے اردگرد کتابیں تھیں، ایسی کتابیں جن کو پڑھنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا ——

ایسی کتابیں جو پڑھی جا چکی تھیں لیکن ذہن سے اتر گئی تھیں۔ ایسی کتابوں کے درمیان جو اس کے ادبی تسلسل کا ایک حصہ تھیں پشکن نے جان دیدی۔

پشکن جس میں ایسے سینا کے بسنے والوں کا لہو تھا کیونکہ اس کی ماں ہنی بال کی بیٹی تھی اور ہنی بال پیٹر دی گریٹ کا غلام تھا —— پشکن نے مرنے سے پہلے ضرور سوچا ہوگا کہ کبھی کبھی انسان کو ایسی باتوں کے لئے بھی مرنا پڑتا ہے جو اس کے لئے بالکل اہم نہیں ہوتیں۔

ہم تینوں بہت اداس بیرونی دروازے تک پہنچے۔ فضا میں پشکن کی آخری سانسیں تھیں۔ چھیاسی سالہ روسی عورت کی انگریزی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ سونیا کے ساتھ روسی میں باتیں کر رہی تھی اور کبھی کبھی مجھے مسکرا کر دیکھ لیتی تھی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے سونیا سے روسی میں پوچھا —— "اس سے پوچھو سونیا کیا وہاں سردی پڑتی ہے جہاں یہ رہتا ہے؟ —— "

میں نے اس کی بات سمجھ کر کہا —— "نہیں ماں ہمارے ملک میں تو ہمیشہ سورج چمکتا ہے قریباً سارا سال گرمی پڑتی ہے —— "

"تو پھر تمہاری ماں کے جوڑوں میں تو درد نہیں ہوتا ہوگا —— "

"نہیں ماں —— اللہ سائیں کی مہربانی سے اس کے جوڑوں میں بھی درد ہوتا ہے کیونکہ یہی بڑھاپے کا عمل ہے"

بوڑھی عورت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "بیٹے تو نے میرا بڑا دکھ دور کر دیا۔ میں سمجھتی تھی جو گرم ملکوں میں رہتے ہیں ان کے جسم میں درد نہیں ہوتا —— میں انہیں خوش قسمت سمجھتی تھی۔ اب پتہ چلا کہ میرے حضرت عیسیٰ کا نظام ہر جگہ ایک سا چلتا ہے۔ ٹھنڈے گرم ملکوں میں ایک سا ...."

"تسورے دانیاں ماں —— "

"تسورے دانیا —— دیکھو ہر وقت خدا کو یاد رکھا کرو ...... دیکھتے نہیں خدا نے پشکن کو کیسی شہرت دی لازوال اور پھر اسے کیسی دکھ بھری موت کے حوالے کر دیا —— وہ سب کچھ کر سکتا ہے کرتا ہے —— ٹھنڈے ملکوں میں بھی اور گرم ملکوں میں بھی —— "

جب ہم مڑنے لگے تو وہ اپنی لکڑی کی کرسی پر جا بیٹھی اور کسی اور سیاح کے انتظار میں گھٹنوں پر تھپکیاں مارنے لگی۔

"اب تو میں گھر جانے والا ہوں سونیا —— کیا اب بھی تم مجھے نہیں بتاؤ گی تم کہاں رہتی ہو؟ —— "

"اب کیا فائدہ سمرو —— اب تو تم گھر ہی چلے جاؤ گے ......"

وہ میرے پاس سے اچانک ہاتھ ہلاتی روانہ ہوگئی۔ ایک دوسرے کو ہونٹ پر چومنے لپٹنے کا موقع قریب آکر آگے چلا گیا جیسے رات کے وقت کار کی بتیاں مجھے کو روشن کرکے آگے نکل جاتی ہیں۔

شاید اسے میخل سے میری فلائیٹ کا پتہ چلا کیونکہ وہ مجھ سے پہلے ائیرپورٹ پر موجود تھی میرے ساتھ داریا اور میخل ٹیکسی سے اترے لیکن سونیا کو منتظر پاکر جلد ہی رخصت ہوگئے ان دونوں نے جس وقت مجھ سے ہاتھ ملائے تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ میرا ہاتھ اپنے ساتھ ہی لے جا رہے ہیں۔ میخل کی آنکھوں میں نمی تھی اور داریا اپنی مونچھوں کے بال منہ کے اندر کئے انہیں چبا رہا تھا ہم نے کوئی الوداعی جملے استعمال نہ کئے خط لکھنے لکھانے کی فرمائش نہ کی اور چپ چاپ رخصت ہوگئے۔

سونیا کے پاس میں سامان بک کرنے پاسپورٹ جمع کرانے اور فلائیٹ کا ٹائم پوچھنے کے بعد پہنچا۔ شام کے وقت عمارتوں میں جلی بتیاں بہت اداسی پیدا کرتی ہیں جسب معمول ائیرپورٹ پر بہت رش تھا کوئی فلائیٹ نئی نئی آئی تھی اس پر سے افریقہ کے حبشی کندھوں پر گٹار لٹکائے جینز پہنے پیروں میں فلیٹ پھنسائے کلارنٹ کے سروں میں ہنستے اور لال سیڑھیوں سے اتر رہے تھے۔ سونیا دونوں مٹھیاں بھینچے منہ پکا کئے صوفے پر آگے ہو کر بیٹھی تھی۔

"کبھی پاکستان آؤ تو میرے پاس ٹھہرنا سونیا یہ میرا ایڈریس ہے" —— میں نے اسے اپنا پاکستانی کارڈ دیتے ہوئے کہا۔

"پھر روس آؤ گے —— تو..... تمہیں اس سے محبت ہو جائے گی۔ ایسے ہی ہوتا ہے ہمیشہ۔ میں نے دیکھا ہے"۔

"مجھے روس سے بڑی محبت ہے سونیا —— روس نے دنیا کو بہت کچھ دیا ہے کم از کم اس نے ڈیموکریسی کو وہ ظلم عام نہیں کرنے دیا جو جمہوریت کے خمیر میں موجود تھا —— "

"لیکن ابھی تم یہ نہیں مانتے ناں کہ اب ساری دنیا کا مستقبل سوائے کمیونزم کے اور کچھ نہیں۔"

اگر کافریان کے کنارے باباجی کا آنسو میرے ہاتھ پر نہ گرا ہوتا تو شاید اس لمحے اور کچھ نہیں تو اس کا دل رکھنے کے لئے میں اس سے اتفاق کرتا —— لیکن پتہ نہیں کیوں اب میں اس آنسو سے غداری نہیں کر سکتا تھا ہمیشہ کے لئے اس نے میرے کئی اندیشے ختم کر دیئے تھے۔

"کچھ دیر کے لئے ہاں —— ہو سکتا ہے چند صدیوں کے لئے کمیونزم ہی ساری دنیا کا واحد رواج ہو۔ پر کوئی انسان ساختہ ازم ہمیشہ کے لئے انسان کے دکھوں کا علاج نہیں ہو سکتا سونیا —— آدمی جو کچھ اپنے لئے سوچتا ہے اس میں ستم ہوتا ہے نقص ہوتا ہے —— ناپائیدار کوئی پائیدار حل نہیں سوچ سکتا..... جب تک آدمی اپنی رضا سے خوشی سے بانٹنے کا فن نہیں سیکھتا —— خدا کی راہ میں دینے پر راضی نہیں ہوتا تب تک برابری کا اس سے بہتر طریقہ کوئی نہیں ہے —— "

"کمیونزم ہمیشہ کے لئے آیا ہے اور ہمیشہ ٹھہرے گا دنیا کے ایک ایک کرنے میں —— "

"بھولی لڑکی! —— معصوم روح..... پہلے فرش دھلائے جاتے ہیں۔ قالین بچھتے ہیں جھنڈیاں لٹکائی جاتی

ہیں۔ اصلی دولہا آخر میں آتا ہے ——— حالانکہ بہت پہلے سے اس کے لئے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں — یہ تمام لوازم تیاریاں ہیں"

"اور اصلی دولہا کون ہے؟"

"اسلام! ——" سفید چینی داڑھی والے خاموش بابا جی نے مجھ سے کہلوایا ———

"جیسا اسلام پاکستان میں آیا ہوا ہے۔ افغانستان ایران میں رائج ہے ——— سعودی عرب میں جیسے اسلام کی خبریں گرم ہیں ——— وہ؟ ———"

میں نے پہلی مرتبہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا وہ ایسے بدکی جیسے میں چڑی مار تھا اور چڑیا پکڑ کر جال میں ڈالنے والا تھا۔ "سونیا..... یہ بھی کوششیں ہیں ادھوری ادھوری ——— نقائص سے بھری...... لیکن جس نظام کی میں بات کر رہا ہوں اس میں انسان کسی انسان کے خوف سے سزا کے ڈر سے کسی خفیہ ایجنسی سے مغلوب ہو کر اپنے حقوق نہیں چھوڑے گا بلکہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے سر قربانی دیگا اسے علم ہوگا کہ تخلیق کے لئے اوّل و آخر خالق کا حکم ہی درست ہے۔ اس نظام میں عام آدمی کو معلوم ہوگا کہ سب کچھ تج کر ہی اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے چھوٹے آدمی جنت کے لالچ میں سب کچھ چھوڑیں گے۔ بڑے آدمی رضائے الہٰی کو مدنظر رکھ کر سب کچھ قربان کریں گے ——— انسان کے بنائے ہوئے کسی نظام میں یہ امید نہیں ——— بغیر امید کے نیکی کا عمل مشکل ہو جاتا ہے کیپٹلزم میں مالی منفعت جاتی رہے۔ اس کے عوض غریبی ضرور ملتی ہے لیکن کسی قسم کی جزا کی امید نہیں ہوتی — ایسے نظاموں میں جب آدرشی آدمی موجود ہوتا ہے تو نظام چلتا ہے پھر ایک جنریشن اپنی ملکیت کی قربانی دیتی ہے — دوسری جنریشن ڈھیلی پڑ جاتی ہے اس کو دبا کر زبردستی منا کر آدرش پر چلانا پڑتا ہے لیکن تیسری پود تک۔ زنجیر کی کڑیاں ٹوٹنے لگتی ہیں جگہ جگہ اختلاف رائے سر اٹھانے لگتا ہے۔ چوری چوری...... جگہ جگہ سوال پوچھے جاتے ہیں لیکن جواب دینے والا کوئی نہیں ہوتا ——— تباؤ سونیا...... عام آدمی...... معمولی آئی کیو کا آدمی لالچی حریص...... اس دنیا کی آرزوؤں کا پتلا ——— وہ بھلا وعدے کے بغیر کیسے نیک ہو سکتا ہے کتنی دیر تک نیک رہ سکتا ہے ——— چاہے وہ وعدہ دعدۂ فردا ہی کیوں نہ ہو ———"

وہ گڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات کی بتیوں میں اس کا چہرہ بہت ہی زرد نظر آنے لگا۔

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو ——— لیکن اب اتنا ضرور ہوگا دنیا کو اپنے وسائل برابر کرنے پڑیں گے۔ غریب انسان ہمیشہ مظلوم نہیں رہ سکتا ———"

"انشاء اللہ ———"

"کیپٹلزم ہی واحد علاج ہے ساری دنیا اس کی لپیٹ میں آئے گی۔"

"ہاں آئے گی ———"

"جب تم مانتے ہو تو پھر جھگڑے کیوں ہو ———" اس نے بلی سی ناک سکوڑ کر کہا ———

"اس کی پیٹ میں آئے گی ضرور لیکن ہمیشہ نہیں رہے گی جب لینن جیسے آدمی آنے بند ہو جائیں گے جب مثال باقی نہ رہے گی۔ پیغام بے اثر ہو جائیگا...... ۔"

"ہم تمہاری طرح فرد پرست نہیں ہیں۔"

"تم بھی فرد پرست ہو سونیا ورنہ لینن لینن نہ ہو رہی ہوتی سارے روس میں —— "

"اچھا تمہارے پیغمبر کو گذرے تو چودہ سو سال ہوئے —— تمہارے پاس تو اب مثال موجود نہیں ہے۔"
میں نے محسوس کیا کہ بابا جی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور نظروں میں مجھے اکسایا۔

"اوّل تو یہ انسان کا ساختہ لازم نہیں کہ یہ مثالوں کا محتاج ہو —— اور پھر ہمارے لئے تو قطب ابدال ولی...... ایسے نیک بندے ہر وقت آتے رہتے ہیں۔ پھر احیائے اسلام کے لئے مہدی آئیں گے۔ ہم سب حرص کے بندے مادہ پرستی چھوڑ دیں گے کیونکہ ہمیں معلوم ہوگا —— وہاں اوپر ہمارے لئے جنت میں کوٹھیاں بن رہی ہیں۔ یہاں دنیا میں ہمیں تقویٰ کے شناختی کارڈ ملنے والے ہیں —— "

اس نے لمبی آہ بھری اور بولی —— "مجھے معلوم تھا کہ مسلمان ہمیشہ متعصب ہوتا ہے —— "

"جہاں کہیں یقین کامل ہو وہاں تعصب نہیں ہوتا فقط نظر آتا ہے —— "

وہ چپ ہو گئی اور اس وقت تک چپ رہی جب تک میری روانگی کی اناؤنسمنٹ نہیں ہو گئی۔

ہم دونوں بنچ سے ایک ساتھ اٹھے۔

"میرا خیال تھا —— " سونیا نے آہستہ سے کہا

"میرا بھی خیال تھا —— " میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا

"میرا خیال تھا تم مجھے پاکستان چلنے کو کہو گے ؟" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی گلابی نمی تھی۔

"میرا خیال تھا تم مجھے ہمیشہ کے لئے روس میں رہنے کو کہو گی۔"

"آدمی کی زندگی بڑی سہولت سے گذر رہی ہوتی ہے ہر طرح کا آرام میسر ہوتا ہے مثل ٹھیک کہتا ہے کہ جب بہار باغ میں پورے جوبن پر ہوتی ہے تو کہیں سے ایک کالا ناگ نکل کر آتا ہے اور سب سے اونچی شاخ پہ بنے ہوئے گھونسلے تک پہنچ جاتا ہے پھر پھولوں کی خوشبوؤں میں پھولوں کے بوجھ سے لدی ڈالیوں پہ رنگ ہی رنگ کے درمیان وہ گھونسلے کے تمام انڈے پی جاتا ہے —— "

"کالا ناگ میں ہوں سونیا —— ؟"

"تم نہیں...... نہیں، تم نہیں..... وقت"

ہم دونوں کے ہاتھ ایسے پیوستہ تھے جیسے ڈالی کے ساتھ پتے۔ پھر میں نے اسے ہلکا سا جھٹکا دیکر اپنی طرف گھسیٹا۔ وہ میرے سینے سے آ لگی جیسے وہ الاسٹک کی بنی ہوئی تھی چند ثانیے وہ میرے ساتھ لگی رہی۔ یہ وقفہ ہر قسم کے اختلافات سے پاک تھا۔ ہم دونوں اتنے قریب تھے جتنا فطرت نے ہمیں پیدا کیا تھا۔ پھر اس نے اپنا توازن درست

کیا میں نے اس کے روسی بالوں کو بوسہ دیا اس نے اپنی گھڑی کو درست کرتے ہوئے کہا — "جاؤ سمر — بہت دیر ہوگئی ہے"

ہوائی جہاز کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر میں نے ایئرپورٹ کی جانب دیکھا — میں روس سے پی ایچ ڈی کی ڈگری اور ایک گہری الجھن لے کر اپنے وطن لوٹ رہا تھا۔ سارے طرف روس نہ تھا ایک اداسی تھی آمد رفت ... اداسی۔

میں نے لمبی سانس کے ساتھ اپنی سیٹ پر بوجھ ڈالا

حجابات کی بھی کوئی انتہا نہیں — یہ پردے ہمیشہ دلوں کے درمیان حائل رہے۔ رسم و رواج .... مذاہب .... ماں باپ اور بیسویں صدی کے نیم پختہ مرد و عورت کے لئے نظریات — شاید وہ ایسی کمیونسٹ نہ تھی جس کا عمل پختہ ہو۔ میں ایسا مسلمان نہ تھا جو مثالی کہلائے — ہم دونوں کے مسلک فقط نظریے تھے.....

لیکن بیسویں صدی میں نظریئے کی شکست میں سارے انسان کی شکست تھی

ہم دونوں اپنے اپنے نظریئے کی وجہ سے لہروں کی طرح ٹکرائے اور پھر لوٹ گئے — لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ ترکی بڈھا کافرنیاں کے کنارے خم ٹھونک رہا ہو .... داد دے رہا ہو کہ بچھڑے خوب لڑے تم!

طیارہ رات کے اندھیرے میں روس کو بہت دور چھوڑ چکا تھا نیچے کہیں اکا دکا روشنیاں شہر کی سرحدوں پر روشن رہ گئی تھیں — سونیا کہیں اس اندھیرے میں کسی بس یا ٹرک میں بیٹھی گھر لوٹ رہی تھی۔ اس کا چھوٹا سا گیلا رومال مٹھی میں بند تھا اور وہ سوچ رہی تھی شکر ہے آج میں نے تھرڈ ورلڈ کے اس آدمی سے اتفاق نہیں کیا جو میرے نظریئے سے محبت نہیں کرتا تھا.......

اس شکر کے باوجود جو میرے دل سے اٹھ رہا تھا اور اس اعتراف کے باوصف جو سونیا کے دل سے نکل رہا تھا، مجھے میخل کی ایک نظم آہستہ آہستہ یاد آ رہی تھی۔ داریا، میخل اور میں "اجنبی شہید" کی قبر دیکھنے گئے تھے۔ قریب ہی ایک نوبیاہتا جوڑا کھڑا قبر سے نکلنے والی چھوٹی سی جوالا مکھی کو دیکھ رہا تھا۔ یہ خوبصورت شعلہ قبر کے اوپر چھوٹے سے ستارے میں جل رہا تھا۔ داریا نے مجھے بتایا تھا کہ نوبیاہتا عموماً اس قبر پر خراج تحسین ادا کرنے آیا کرتے ہیں۔ پھر دولہن نے اپنی شادی کا گلدستہ قبر کی پائنتی رکھا اور وہ دونوں بڑی عقیدت سے رخصت ہو گئے۔

میخل نے اس گلدستے سے ایک پھول توڑ کر مجھے دیا اور اپنی نظم سنانے لگا — "سمر — سنو یہ نظم میں نے کسی کو نہیں سنائی۔ اس کا مسودہ بھی میں پھاڑ چکا ہوں — لیکن یہ نظم نذرانہ ہے....... تو — سنو۔

میں تمہاری یاد کو اس طرح پیار کرتی ہوں
جیسے ایک چھوٹی سی لڑکی اپنی مردہ بلی کو گود سے نہیں اتارتی......

بلی جو مر چکی
یادیں جو ختم ہو چکیں

لیکن ابھی دفن نہیں ہو سکیں
انسان کی بدقسمتی ہے کہ اسے
ٹوٹے ہوئے گلاسوں سے
ایئرپورٹ کے مسافروں سے
اور لینن گراڈ کے ان پھولوں سے محبت ہو
جو کسی سپاہی کی قبر پر مرجھائے پڑے ہوں ——"

میں نے سونیا کو کبھی کوئی تحفہ نہ دیا تھا —— اس کی سالگرہ پر بھی نہیں لیکن اب مجھے لگا جیسے وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہو۔ میں دیر تک اُسے یہ نظم بار بار سناتا رہا حتیٰ کہ سارا روس گہرے اندھیرے میں ایسے ڈوب گیا جیسے رات میں سمندر کا وجود اور اس میں سونیا کا وجود یوں تیرتا رہا جیسے برچ کی لکڑی کا چھوٹا سا سفید بجرا...... ہولے ہولے ڈولتا...... ہچکولے کھاتا...... بے پتوار......

میں نظم سناتا رہا —— اور جیسے وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر سو گئی........

OO

دُوسرا پہیہ

یُونس جاوید

حادثہ زیہی تھا کہ غیر ارادی نگاہ اس پر پڑی اور جم گئی اور پھر اوپر سے سراپے پر پھیل گئی پھیلتی گئی۔ اتنی دبلی کمر کے اوپر سیماب صفت چھاتیاں اور قائم بالذات بھی۔ سر سے پاؤں تک کتنے خم تھے۔ یقین نہ آتا تھا اُسے۔ چلتے ہوئے لمبی چوٹی کبھی دائیں کولہے کو چومتی کبھی بائیں کو۔ ہر قدم کے ساتھ چوٹی کا جھلاؤ دیکھنے والے کو پلک نہ جھپکنے دیتا تھا جسم کیا تھا۔ ایک دعوت تھی سائرکیشن کشش اور کھیاؤ تھا جو دل کو ایک پجاری کی طرح گداز کئے دے رہا تھا۔

یہ سب کچھ لمحہ بھر میں ہو گیا۔ فریم میں جیسے تصویر جڑ دی گئی ہو۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ گاڑی کہاں رُکی ہے۔ ٹیں ٹیں ٹوں ٹوں ٹاں ٹاں کی آوازیں سنائی دیں تو احساس ہوا کہ گاڑی بیچ سڑک میں کھڑی ہے اور وہ عالم سکرات میں دور کہیں دیکھ رہا ہے۔

تیزی سے گھما کر اس نے مرسیڈیز کو پارک کیا۔ بریک چرچرائے اور وہ اچھل کر باہر کود آیا اور اپنی سرکتی، پھیلتی نگاہوں کے پیچھے چلنے لگا۔ یہ کمرشل بلڈنگ تھی۔ اور وہ اس سے سو گز آگے ڈولفن چوک کی طرف جا رہی تھی۔

جب وہ انارکلی کی طرف کراس کرنے کے لئے چوک میں رکی تو اس نے سوچا کہ اسے سامنے سے آنا چاہیئے۔ وہ تیزی سے بھاگا اور نقی روڈ کا موڑ مڑ گیا۔ لیکن نقی روڈ طے کرنے کے عرصے میں وہ کافی آگے نکل چکی تھی اور وہ پھر پیچھے تھا۔

اس جگہ پرانے کپڑوں کی ریڑھیاں اور شور اسے چلنے نہیں دے رہا تھا کہیں کہیں لحظہ بھر کے لئے وہ لڑکی بھی رکتی تو یہ اپنی جگہ رک جاتا۔ کوئی دوسرا اس لڑکی کی طرف دیکھتا تو اس کا جی چاہتا اس کا منہ نوچ لے اس خوبصورت لڑکی کے جسم کے بعض حصے سنسر کر دے۔ مگر دوسروں کے لئے وہ پاگل تو نہیں تھا مگر اس وقت کیفیت یہی تھی۔ اس بازار سے اُسے معلوم تھا کہ پرانی پتلونیں اور پرانی عورتیں عام مل جاتی ہیں مگر یہ نئی لڑکی محسوس کرتی تھی۔ [illegible] جاتی تھی۔

وہ لڑکی ایک دن کے باہر کھڑی کچھ خرید رہی تھی۔ بے صبر ہو کر وہ آگے بڑھا لحظہ بھر کو اس نے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ تانبا کانچ میں ملا تھا۔ نگاہیں پھر اس کی چھاتیوں پر چلی گئیں ـــ "میرے خدا" وہ آگے بڑھ گیا نگاہ ملانے کی کوشش میں وہ دو دفعہ راہ گیروں سے ٹکرا چکا تھا۔ وہ کافی آگے نکل آیا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی رفتار کو نارمل نہیں کر سکا تھا۔ چوک میں رک کر اس نے انتظار شروع کیا۔ وہ آ رہی تھی۔ چال میں بڑی لٹک اور لچک تھی توازن اور تناسب تھا اور کیا چیز تھی کہ اس کی پنڈلیوں میں رس اتر رہا تھا۔

چال بھی کیا شے ہوتی ہے وہ سوچنے لگا "بغیر کسی تعارف کے سب سے پہلے متاثر کرتی ہے"

چوک کراس کرنے کے بعد دونوں انارکلی میں گھس گئے مگر ہجوم میں رلے ملے نہیں۔ وہ سو پچاس گز آگے تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اسے ہمت تھی نہ جرأت۔ پھر بھی رفتہ رفتہ اس نے اپنے آپ کو جمع کیا اپنی ذات کو ایک اکائی کی شکل دے کر وہ رکا اور مڑ کر پیچھے دیکھ ہی لیا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

بے قراری میں اس نے کافی دھکے کھائے۔ پھر انتظار کرنے کی خاطر چھوٹی سی گھڑیوں کی دکان پہ آ گیا۔ گھڑی اتاری اور شوکیس پہ گھڑی رکھ دی۔

"سٹریپ بدل دیں"

"کیا چاہیئے" دکاندار نے پوچھا۔

"کوئی بھی ـــ اچھا سا لگا دیں"

بغل کی دکان سے وہ لڑکی دھم سے باہر آئی اور سیدھی بخشی مارکیٹ چلی گئی بے چینی اس کی نس نس میں جل تھل ہو گئی۔ "آپ لگائیں میں ابھی آتا ہوں" گھڑی اس نے چھوڑ دی مگر بخشی مارکیٹ کے راستے پیچھا کرنے کے بجائے وہ بانو بازار کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

اچھا بھلا وجیہہ نوجوان، قیمتی لباس، خوشبو۔ بہت سی لڑکیوں نے پلکیں اٹھا کر پہلے غیر ارادی اور پھر دانستہ اسے دیکھا بھی۔ مگر اس پہ ایک ہی دھن سوار تھی اور آج ہی پہ کیا منحصر اس سے پہلے بھی وہ کتنی دوست لڑکیوں سے مل چکا تھا۔ مگر اس لڑکی کو دیکھ کر تو سب اسے مصنوعی اور خود غرض معلوم ہو رہی تھیں شاید اس لئے کہ ان تک رسائی ہو چکی تھی۔ ہاں شاید اس لئے۔

دوستی بہرحال سب سے رہی اور تھی بھی ـــــ مگر ایسا جسم تھا نہ تمکنت نہ چال نہ بے پروائی نہ ہی کسی میں اس طرح کی کشش محسوس ہوئی وہ تو سب بزنس تھا۔ سب ضرورت مند تھے ایک دوسرے کے۔ وہ بھی وہ بھی ـــ وہ بھی ـــ اس نے ہر پرانی یاد کو ذہن سے کرچ دیا اور کینوس اس طرح صاف کر دیا کہ کوئی سی بھی نئی تصویر پینٹ کی جا سکے۔

"اوہ" اس کا دل اچھل سا گیا تھا۔ سامنے دکان میں وہ کھڑی تھی۔ یوں لگا جان پاؤں سے

ہوتی ہوئی نکل گئی ہے۔ پور پور میں رس دوڑنے لگا تھا۔

اپنی مردانہ وجاہت، گرم جیب اور جمع کی ہوئی جرأت کے سہارے اس نے دکان میں قدم رکھا۔

"یہ دکھائیں ——— وہ دکھائیں" کئی قیمتی چیزیں اس نے شوکیس سے نکلوالیں۔

"یہ دے دیں۔ وہ بھی دے دیں ——— یہ بھی ——— پیک کر دیں"

وہ بے قراری سے دو گز کی دکان میں بھی ٹہل رہا تھا۔

"آٹھ سو بیس" سیلز مین نے بل بنا کر کہا۔

بل چیک کیے بغیر اس نے نو سو روپے دیئے، "باقی پیسوں کی کوئی خوشبو دے دیں ——— مگر ٹھہریں ——— اتنے پیسوں میں کون سی خوشبو آئے گی ——— رہنے دیں" اس نے بقایا لے لیا لڑکی نے ذرا برابر اثر نہ لیا۔ آواز سن کر اس نے گردن موڑی نہ پلک اٹھائی نہ کچھ بولی۔ بلکہ بغیر کچھ خریدے بڑے اعتماد سے وہ دکان سے اتر گئی" اور کوئی خدمت؟" سیلز مین مسکرایا۔

"تھینک یو۔ آپ پیک کر کے رکھ لیں ——— میں واپسی پہ لے لوں گا" وہ دکان سے اتر آیا سامنے چاٹ کی دکان تھی۔ وہ لڑکی پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ وہ باہر رک گیا۔ چاٹ ذرا دیر میں بنی۔ دوسرا چمچہ اٹھاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ وہ پھر باہر نکل آئی ہے اور اب کے تو اس نے دیکھ بھی لیا اُسے۔ نگاہوں میں سمندر کی گہرائی تھی جس پر دھوپ پھیلی تھی۔ اسے لگا کہ لڑکی نے اس کی طرف دیکھا نہیں ہے بلکہ دھوپ کی گرم چادر سے اسے لپیٹ لیا ہے ایک رعب تھا۔ تقدس کا تھا یا حُسن کا ——— یا اس وقار کا جو اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ چمچہ واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے اس نے سوچا میں اس لڑکی کے لئے کیا کر سکتا ہوں ہزار دو ہزار نہیں ——— کم ہے۔ پانچ ہزار دس ہزار نہیں ——— نہیں۔ اس کی چال، النظروں نگاہوں، وقار، تقدس اور جسم کے ساتھ تو زندگی گزاری جا سکتی ہے۔

جن لڑکیوں کے ساتھ زندگی گزاری جا سکتی ہے وہ سب کھمبوں کے ساتھ بیاہ دی جاتی ہیں دونوں عمر بھر روتے ہیں۔ دونوں صحبت ناجنس کا شکار ہوتے ہیں۔ آئیڈیل کے لیے تقدیر اور تدبیر دونوں کو یکجا ہونا ضروری ہے اور شاید وہ لمحہ آ پہنچا ہے کہ مجھے میرا دوسرا پہیہ ——— میری زندگی کا دوسرا پہیہ ملنے والا ہے۔

وہ آگے بڑھا ——— تجربہ کار ہوتے ہوئے بھی اس پر جھجک غالب تھی۔ بڑے خاندان کی کچھ لڑکیاں ان اوچھے ہتھکنڈوں کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ اس پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ کیا اس کا پیچھا کرنا ایک اوچھی حرکت نہیں ہے اور یہ اوچھی حرکت اس لڑکی کے لئے کی جا رہی ہے جس کے ساتھ وہ زندگی گزارنے پر تلا بیٹھا ہے مجھے کوئی سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

میرے پاس کیا نہیں ہے ـــــ میری مرسیڈیز ہی میرا اشتہار ہے مگر ـــ وہ لڑکی آگے بڑھ گئی اور وہ سب کچھ بھول گیا۔

بن کھائے چاٹ اس نے واپس رکھ دی تھی۔ افسوس کہ وہ بقایا چھوڑ نہ سکتا تھا۔ بہت سے لوگ اس کی بے قراری کو بھانپ چکے تھے۔ رش بہت تھا اور بقایا۔ لیتے لیتے دو منٹ نکل گئے تھے وہ بھاگنا چاہتا تھا مگر اس بازار میں بھاگنا رسوائی کو دعوت دینا تھی۔ پریشانی یہ تھی کہ ہر دکان کے اندر تک جھانکنا پڑتا تھا۔ جواب میں ہر دکاندار کی تیز نگاہیں اسی کے بدن کو پسینے میں گوندھ دیتی تھیں۔

کارنر کی ایک جگر جگر کرتے شیشوں والی دکان سے نکلتے ہوئے بالآخر آمنا سامنا ہو گیا۔ لڑکی نے نگاہیں ملا کر پلکیں جھکائیں تو اسے لگا دیوار پر سے دھوپ اتر رہی ہے۔

اسے یقین آ گیا کہ وہ عورت ہے جس کی اسے تلاش تھی اسی تلاش میں وہ کہاں کہاں نہیں بھٹکا کیا کیا ٹھوکریں نہیں کھائیں کتنا لہو جلایا ہے کسی ان دیکھی صورت کے انتظار میں۔ کوئی مکمل شخصیت۔ جسے آئیڈیل کہا جا سکے۔ جس کے لئے تڑپا جا سکے، رویا جا سکے۔ اور اپنی منہ زور جوانی کی لگام جس کے ہاتھ میں تھما کر دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔

دل نے آواز دی یہی ہے وہ جس کی تلاش میں تم نے بیسیوں لڑکیوں، عورتوں سے تعلقات قائم کئے تھے مگر وہ سکون، وہ ٹھنڈک، وہ بے چینی، وہ حرارت اور حُسن کاری کا وہ مکمل نقش کسی میں نہ تھا۔ جو یوں اسے چلتے پھرتے مل گیا تھا۔ اس نے سوچا ـــــ بال بال اپنی جگہ پہ ہے اور جوانی تو اداؤں کا نام ہے کس ادا سے اس لڑکی نے دکان دار سے کپڑے کا پیکٹ اور بقایا لیا تھا اور کس تمکنت سے اس نے گردن کی صراحی اٹھائی تھی۔ بے نیازی اور اعتماد نے اسے بلے حد خوبصورت بنا دیا تھا۔ اس لڑکی کے رنگ میں تبدیلی آ رہی تھی یا اُس کی نگاہوں میں ـــ بہرحال کچھ تھا ضرور۔ دودھیا کالنسی، سیندور اور کارنج کو گوندھ دیا جائے تو کیسا لگتا ہے! شاید ایسا ہی لگتا ہو اس نے سوچا۔ خدا نے اسے جتنا حسن دیا ہے اس سے کہیں زیادہ جسم بھی دیا ہے۔ اس جسم میں تو بدصورت عورت بھی لہو کھولا دیتی ہے جب کہ یہاں معاملہ دو چند نہیں۔ دو چند ہے۔ دل پے پارہ پچکاری کی طرح گداز ہو گیا دماغ نے تائید کی تو وہ پھڑک گیا" میرا فیصلہ درست ہے ـــ مجھے اس سے شادی کر لینی چاہیئے" عمر بھر کی دوستی یا دشمنی کی آخری صورت کو سامنے رکھ کر اس نے مستقبل کے لئے پروگرام بنانا شروع کر دیا ـــ" یہ لڑکی ایسی نہیں ہے کہ اسے کسی بے نور کھمبے کے ساتھ بیاہ دیا جائے۔ اسے تحفظ ملنا چاہیئے۔ محبت ملنی چاہیئے" ـــ حکم دینے کی مجبوری کے سوا وہ مجبور نہ ہو ـــ ہر طرف ـــ اس کے چاروں طرف تعمیل ہاتھ باندھے کھڑی ہو" اس نے ٹھنڈا اطمینان بخش سانس لے کر دل سے کہا" میرے پاس وسائل ہیں، محبت کرنے والا دل۔ تعمیل

کرنے والی روح ـــــ تحفظ دینے کے لئے میرا سٹیٹس میری شخصیت اور میرا بنک بیلنس ـــــ سب کچھ تو ہے ـــــ پھر اس نے تجزیہ شروع کر دیا کہ ایک نظر یا ایک جھلک سے محبت کیسے ہو سکتی ہے؟ ـــــ اس کے لاشعور میں کوئی ادنیٰ جذبہ ہی نہ ہو ـــــ کہیں وہ بھٹک تو نہیں رہا اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دے رہا۔

"نہیں ـــــ نہیں ـــــ نہیں" اس نے سارا تجزیہ سب خیالات جھٹک دیئے۔ پہلی نظر کی محبت بہت دیر پا اور سچی ہوتی ہے ـــــ میرا جذبہ صادق ہے۔ ورنہ دل سمندر کی طرح نہ پھیل جاتا ـــــ کبھی اتنا لذ از نہ ہوتا نہ ہی اس میں اس روشنی اترتی کہ شریانیں سمیٹ نہ سکتیں ـــــ یہ میرا نصیب ہے ـــــ فطرت کا اشارہ ہے۔ میں اس کے لئے سب کچھ کرنے کو کیوں تیار ہوں؟ ذات پات اور سٹیٹس جانے بغیر کیوں دل بچھا جا رہا ہے؟ ـــــ میں اس کے بغیر ادھورا سا لگ رہا ہوں ـــــ وہ میرے لئے ہے، میری تکمیل کے لئے ـــــ اس کے بغیر میں مر جاؤں گا ـــــ اسے بڑے زور کی ٹھوکر لگی تھی۔ وہ اس بری طرح گرا تھا کہ پاؤں نالی کے کیچڑ میں لت پت ہو گیا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے تو اسے لگا کہ جسم سے سارا خون نچڑ گیا ہے لوگ مدد کو آئے۔ اٹھایا ـــــ پانی پلایا بھی اور جوتے پر بہایا بھی ـــــ سب نے ہمدردی کی تسلی دی۔ مگر اس لڑکی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

وہ اب پاؤں دبا کر چل رہا تھا ـــــ دونوں تقریباً آگے پیچھے انارکلی سے نکلے اور نیلا گنبد کی طرف آ گئے۔ اس کے جی میں کئی دفعہ یہ خیال بھی آیا کہ وہ بے دھڑک اپنی آفر دے دے مگر نہیں ـــــ ہر دفعہ اس کے دماغ نے اسے روک دیا تھا یوں وہ اپنا سب کچھ بیٹھے کے لئے کھو دے گا ـــــ وہ کوئی رسک بھی نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لئے برابر آ کر چلنے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔ یوں بھی وہ اس وقت آگے آگے چل رہی تھی اور اسے آتی ہوئی عورت سے زیادہ جاتی ہوئی عورت پسند تھی ـــــ اور اس وقت تو وہ عالم تحیر میں تھا کہ وہ اس وقت پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ پیاز کا چھلکا بدن سے چپکا تھا قمیض نہ تھی۔ پل بھر کو نگاہ نہ ہٹتی تھی اس کی۔ نہ اس نے خریدے ہوئے سامان کو اٹھایا نہ گٹھڑی واپس لی۔ اسے کچھ یاد ہی نہ تھا ـــــ ایک مقناطیسی کشش تھی جو اسے اِدھر اُدھر مڑنے سے بے بس کئے دے رہی تھی۔

خدایا مجھے ہمت دے ـــــ میں گنہگار ہوں ـــــ مگر نیک نیت ہوں ـــــ میں سیدھے راستے کی تلاش میں بھٹکتا ہوا یہاں تک آ رہا ہوں ـــــ پرانی زندگی کو خیر باد کہہ رہا ہوں۔ جو زندگی کو ـــــ بہترین ترتیب سے گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہمت دے ـــــ مجھے ہمت د۔

—— الفاظ نہ تھے احساس تھا —— احساس کا جہنم تھا اور وہ جل رہا تھا —— بس اس کا پیچھا کرے اس کا گھر دیکھا جائے۔ فوراً ہی اسے خیال آگیا —— سامنے اس کی مرسڈیز کھڑی تھی۔ تبھی اس نے سوچا کہ سڑک کراس کر کے وہ گاڑی میں بیٹھ جائے گا اور پھر بہر طور اس لڑکی کا گھر دیکھنے جائے گا۔

لڑکی چوک میں پہنچی —— اس کی ملازمہ —— ہاں شاید ملازمہ ہی تھی —— پارک میں اس کی منتظر تھی۔ سارا سامان لڑکی نے اس عورت کے حوالے کر دیا۔

وہ سڑک کراس کرنے کے لئے لپکنا ہی چاہتا تھا —— کہ یک لخت وہ لڑکی مڑی —— مسکرائی —— اور بولی —— "کہاں چلنا ہے —— کوئی سواری لے لیجئے نا —— میں تھک گئی ہوں —— وہ سُن ہو گیا۔

"پانچ سو روپیہ اسے دے دیجئے —"

"اسے جانا ہے: ملازمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

OO

اقرار

مرزا ریاض

کبھی مجھے اس کی محبت کا یقین نہ آیا، کبھی اس نے مجھے اپنی محبت کا یقین نہ دلایا۔ سوچتی ہوں تو پتہ لگتا ہے کہ اس کا رویہ میرے ساتھ محبت بھرا تھا، مگر اس نے کبھی اقرار نہ کیا اس کا، اور میں اقرار چاہتی تھی، عورت ہونے کے رشتے سے ــــ عورت مغرب کی ہو یا مشرق کی، جانے کیا کمی پاتی ہے اپنے وجود کے اندر کہ وہ اقرار چاہتی ہے، ہر دم ایک آرزو رہتی ہے اس کے قلب کی ادگھٹ کھائیوں میں، مرد اپنی محبت کا ــ اسکے لئے ــــ اقرار کرے گواہی دے سچی ذات کی تمام تر جستجوؤں کے ساتھ مرد کی زبان سے نکلا ہوا اقرار کا نغمہ، جسے وہ بار بار سننا چاہتی ہے کیسٹ میں محفوظ کر لینا چاہتی ہے، جسے ہر بار سن کر ــ ہر بار اسے ایک نئی خوشی پراسرار مسرت، ایک سکون، اور عجب طرح کے قرار کا احساس ہوتا ہے، جیسے منزل کے قریب پہنچتے ہوئے چند قدموں کے فاصلے سے ہوتا ہے۔ اقرار عورت کی نفسیاتی خلا کو پُر کر دیتا ہے جس کی شکار ہر عورت ہوتی ہے مغرب کی ہو یا مشرق کی۔

مگر جانے کیوں اسے چڑ تھی اس بات سے، کہتا تھا، یہ سب کچھ بہت چیپ (cheap) ہے میں تم پہ مرتا ہوں I love you میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی قسم کے دوسرے فلمی اور افسانوی فقرے عورت جانے کیوں ان فقروں کی بھوکی ہوتی ہے، مسکراہٹیں بکھیرتی ہے، خفا ہوتی ہے دامن پھیلا کر بھیک مانگتی ہے کہ اس کی ہستی کے کشکول میں کوئی مرد خیرات ڈال دے۔ ان فقروں کی اصل گواہی تو برتاؤ سے ملتی ہے رویہ۔ حسن سلوک۔ اور عمل۔ قربانی ایثار۔ فقروں سے دل بہلانا ان مردوں کا کام ہے جو سازش کرتے ہیں، دھوکہ دیتے ہیں۔

فراز کا رویہ قابل رشک تھا، خوبصورت تھا، اسی کی طرح، اتنا ہی خوبصورت جتنا وہ خود تھا، جس محفل میں وہ موجود ہوتا نظریں نہیں ہٹتی تھیں اس پر سے، اس کے علاوہ وہاں کی ہر شے معدوم ہو جاتی تھی ــ وہ تجریدی آرٹ کا شاہکار لگتا تھا اسی لئے مجھے وہ قریب سا لگتا تھا، جیسے اس کا حسن و جمال ایک طلسم تھا ویسے ہی اس کا برتاؤ میرے ساتھ، پر مجھے اس میں بھی شک ہونے لگتا تھا، کیونکہ ہونا ؟ میں ایک معمولی خط و خال کی لڑکی تھی۔ درمیانہ قد، سانولی رنگت کوئی بھی تو جاذب نظر بات نہ

تھی مجھ میں میرے جیسی، مجھ سے بہتر کئی لڑکیاں ہوں گی اس روشنیوں کے شہر میں تعلق بھی ایک اوسط گھرانے سے تھا میرا، ایسی لڑکی کو ایک دم سے۔ کوئی شخص پسند کرنے لگے، ایسا کوئی شخص جو ایک ہی ہو، لاکھوں میں ــــ پھر یہ سب جو کچھ کہ ہوا، ناقابل یقین سا نہیں لگتا؟ کچھ داستانی الف لیلوی سا ــــ

اس دن میں ــ حسب معمول ــ کالج جانے کے لئے سپیشل بس کے انتظار میں بس سٹاپ پہ کھڑی تھی کہ کچھ فاصلے پہ ایک بہت بڑی موٹر اچانک رکی، کوئی توجہ کے قابل بات نہ تھی ہر روز کا معمول تھا، دائیں کبھی بائیں، آگے یا پیچھے یوں ہی موٹر سائیکل، سکوٹر، موٹر کاریں، لڑکیوں کے لئے رکتی رہتی ہیں اور مسکین صورت بنائے شریفانہ انداز اپنائے ہوئے نوجوان لفٹ دینے کی پیشکشیں کرتے رہتے ہیں۔ میری بس آج معمول کے خلاف کچھ لیٹ دکھائی دے رہی تھی۔ بڑی کار ابھی تک رکی ہوئی تھی۔ معاً مجھے لگا جیسے اس کے اندر کا شخص مجھے مسلسل گھور رہا ہے۔ پلک بھی نہیں جھپک رہا تھا۔ شاید، کچھ مبہوت سا دم بخود سا۔ لفنگا، بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ اس سے پہلے ایسی سچویشن میں کبھی اتنی نروس نہ ہوئی تھی تھوڑی دیر بعد گاڑی سٹارٹ ہوئی اور چل دی، بات اسی دن ختم ہو جاتی تو مجھے چین ملتا، مگر میری بے چینی بڑھتی گئی اس لئے کہ یہ ناگوار حرکت کچھ دن تک جاری رہی۔ پورے طمطراق کے ساتھ، بڑے احترام کے ساتھ۔ اور پھر میری حیرت اور تعجب کی انتہا نہ رہی جب ایک دن وہی بڑی موٹر کار ہماری تنگ سی گلی میں زبردستی گھس آئی۔ اور ہمارے ہی مکان کے بالکل سامنے آکر اپنے مخصوص سٹائل میں رک گئی۔ میں اوپر والی کھڑکی میں تھی، یا اللہ خیر، میری زبان سے نکلا، مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں!

فراز گاڑی سے اترا۔ بڑی آن بان سے، اور پورے اعتماد سے قدم اٹھاتا ہوا، دروازے کی دہلیز تک آن پہنچا، ہاتھ بڑھا کر اس نے بلانے کی گھنٹی کا بٹن دبایا، اور انتظار کرنے لگا، اس روز جمعہ تھا، اور ابا جان گھر پہ ہی تھے۔

فراز امیر زادہ تھا، اس کے انداز میں ایک بانکپن تھا، عادات و مشاغل میں بھی ایک انفرادیت تھی وہ بگڑا ہوا امیر زادہ نہ تھا، اسے شراب اور کتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، البتہ لباس کے معاملے میں ٹھاٹھ باٹھ رکھتا تھا، ادب و سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی، البتہ موٹریں رکھنے اور انہیں بدلتے رہنے کا شوق شاید برزنیف سے کم نہ تھا، اچھی موٹر اس کی کمزوری تھی، میں نے ایک دفعہ اسے بڑی طنز سے کہا" امیر لوگ تو موٹروں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی بدلتے رہتے ہیں۔" اس نے حسب عادت ایک مسکرانہ اعتماد سے جواب دیا" عورت سے تمہاری مراد اگر بیوی ہے تو ـــــ وہ عیاشی نہیں ہوتی، ضرورت ہوتی ہے گھر کی، شوہر کی۔ ایسی ضرورت جو کبھی کم نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ تعلق خواہش کا ہوتا ہے ــ ہوس کا نہیں ـــ پرنس کریم آغا خان کو جانتی ہو؟ ـــــ اس کی دولت اور امارت کو بھی؟"

میں شرمندہ ہو گئی اس کی دلیل سن کر ـــــ لاجواب کر دیتا وہ ہمیشہ مجھے اپنے ملے سے، اپنی منطق

ــــت، اپنی سوچ کی سچائی سے۔

وہ چلا جاتا تو میں سوچتی: میں کس سے یوں ہی مرعوب ہو جاتی ہوں ہر بار — اس کی باتوں اور عمل میں کتنا تضاد ہے؟ کیوں ہے ایسا؟ اب گھر سے نکلا ہے تو کب لوٹے گا؟ شام کو یا پھر رات کو؟ میں اس کی ضرورت کیوں کر رہی ہوں؟ کیا کرتا رہتا ہے وہ باہر؟ ایک دفتر بنا رکھا ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا، مگر وہاں وہ جاتا ہی کب ہے؟ ایک دو کلرک ہیں جو وہاں کام کرتے ہیں۔ کام کیا خاک کرتے ہیں۔ تنخواہ لیتے ہیں فقط اور وہ خود سارا دن سڑکیں ناپتا پھرتا ہے۔ کئی باتیں میں نے سنی ہیں، افواہیں، سکینڈل — خود میرا باپ اور میرے بھائی قصے بتلاتے ہیں۔ بناتے رہتے ہیں!

پہلے پہل میں ضرورت نہیں سمجھتی تھی اپنے مجازی خدا کی وضاحت طلبی کی — مگر میں تنگ آ گئی۔ ایک دن میں پوچھنے لگی اس سے، دبی زبان میں، وہ اپنے انداز میں بات کہتا اور مجھے لاجواب کر دیتا، میں لاجواب ہو جاتی، مگر مطمئن نہ ہوتی

اس روز جمعہ تھا اور ابا جان گھر پر تھے، انہوں نے ہی دروازہ کھولا۔ فراز نے اندر آنے کی اجازت چاہی اور وہ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ فراز نے بھرپور اعتماد کے ساتھ اپنا مختصر سا تعارف کرایا۔ دروازے کی اوٹ میں سے میں سب کچھ دیکھ رہی تھی، میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ میری شکایت کرنے تو نہیں آیا تھا..؟ میں اندیشوں میں گرفتار تھی، کہیں کوئی سکینڈل تو تیار نہیں کیا! بلیک میل کرنے تو نہیں آیا مجھے؟

ابا جان نے — تھوڑی دیر کے بعد — امی کو بھی وہیں بلا لیا، لگتا تھا جیسے ابا اس کی شخصیت اس کی باتوں سے متاثر ہوئے ہیں، اسی لئے انہوں نے امی کو مشورہ کے لئے بلا لیا تھا یا شاید وہ اکیلے فراز کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ فراز نے بغیر کسی تمہید کے میرا رشتہ طلب کیا تو ابا اور امی دونوں چونک گئے اور میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

[illegible] ابا جان ہوئے تو انہوں نے کہا "آپ اکیلے آئے ہیں؟ ہمارے معاشرے میں یہ کام بزرگ کرتے ہیں"

"نہ کوئی بزرگ اور نہ کوئی دوسرا رشتہ دار"

اس نے بات ہی ختم کر دی۔

ابا اور امی کے خاموش استفسار کو وہ سمجھ گیا اور کہنے لگا "میری امی اور ابو حج پہ گئے تھے، تین برس قبل — وہیں وہ بس کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے — مکے سے مدینے جاتے ہوئے — وہیں انہیں دفن کر دیا گیا"

ابا جان اور امی کو بہت افسوس ہوا سن کر۔ "وہ تو شہید ہوئے بیٹا، ہلاک نہ کہو —" میں نے محسوس

کیا۔ دونوں کو فراز سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ میرے ابا نے اس سے کہا : "بیٹا، ہمیں سوچنے کی مہلت دو، عزیز رشتہ داروں سے بات کرنے دو۔

اس نے اچھا کہا اور اٹھ کر چل دیا ۔۔۔ دروازے تک اسے چھوڑ کر دونوں واپس آئے۔ مجھے آواز دی اور پوچھا۔ میں نے سب کچھ بتا دیا، امی نے کہا "مجھے تو یہ سب دھوکہ نظر آتا ہے۔ ابا نے امی کی رائے سے اتفاق کیا۔

فریب ہی تو لگتا تھا، یہ سب، ایک Delusion فراز ایک حقیقت تھا مگر اس کی آرزو ۔۔۔ کیا یہ بھی حقیقت تھی؟ کیا وہ اپنی طلب میں سچا تھا؟ نیک نیت تھا، اس کا یقین نہیں ہو رہا تھا، ہمیں. ہوتا بھی کیسے ۔۔ وہ ہم سے ہر لحاظ، ہر پہلو سے بڑا تھا ہر ڈائی مینشن Dimension سے ارفع دولت، حیثیت کہ دولت ہی حیثیت مرتب کرتی ہے علم گھر بار ۔۔ کسی بھی اعتبار سے ہم اس کے برابر نہ تھے پھر یقین کیسے آتا؟ ہمارے گھر میں تشکیک اور تذبذب کی فضا طاری تھی۔ اگر یہ خواب ہوتا تو ہم اس کی تعبیر نکال لیتے کہ خواب کبھی کبھار سچے بھی ہو جاتے ہیں، مگر یہ تو سراسر ایک سراب Illusion تھا ہم گھر والوں نے اپنی عقل اپنے شعور اور تجربے کے مطابق سوچا اور اس تجویز کو ایک حماقت سمجھ کر رد کر دیا۔

مگر وہ پھر آیا۔ اور روز روشن کی طرح اپنی ہستی، اپنی آرزو کی سچائی، اپنی نیت کی صفائی ۔۔ منوانے کے لئے ۔۔ کوئی بھی دلیل نہ دے سکا اس کے سامنے ۔۔۔ ہکلانے لگے اس سے بات کرتے ہوئے وہ کیا ہے؟ اس کے چلے جانے کے بعد ۔۔ سب سوچوں میں ڈوب گئے!

جو ہو سو ہو ۔۔۔ اس سے تو انکار نہیں کہ وہ ایک شخص ہے اور تنہا ہے۔ اور [illegible] چاہتا ہے، زندہ رہنے کے لئے قوت چاہتا ہے ۔ قوت زیست کی ضرورت ہے اسے ماں باپ کے مر جانے کے بعد عدم تحفظ کا شکار ہو گیا ہے، اعتماد نہیں رہا، موٹریں بدلتا رہتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں ۔ حادثے کا شکار ہو جائے ۔۔۔ ایک مخصوص موٹر پہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ۔۔ مگر یہ ساری باتیں وہ کہتا کیوں نہیں؟ ہماری تسلی کے لئے ۔۔ کیوں ہمیں ہر بار ایک نئے شک میں الجھا دیتا ہے؟

شادی کے بعد اس نے کہا، "اگر یہ شادی نہ ہوتی تو میں جان دے دیتا" پھر وہ اپنی اس چیپ سی بات پہ خود ہی شرمندہ ہو گیا، مگر پھر کہنے لگا، میں ایک دم بہت ہی Involve ہو گیا تھا تم میں ۔۔ لگتا تھا جیسے تم ہی ہو صرف جو میری ہستی کا وہ خلا پر کر سکو گی جو بہت بڑا ہے۔ میری انا کو بہت بڑی تسکین ملی اس کی بات سے۔ مگر ۔۔ کیا وہ سچ کہہ رہا تھا؟

فراز کی بیوی بننا ایک اعزاز خوش بختی اور فخر کی بات تھی، تھوڑی ہی مدت میں ۔۔ میں اس میں کھو گئی، بڑا ہی چارمنگ تھا وہ ۔۔ بلاشبہ میں اسے ہر دم دیکھنا چاہتی تھی اپنے سامنے، اس

کے قریب رہنا چاہتی تھی ہمہ وقت ! میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا ایسے شخص کے بارے میں ایسے رنگین زندگی کے بارے میں — کالج کے زمانے میں میری سہیلیاں مجھ سے پوچھا کرتی تھیں۔ خوابوں کے بارے میں۔ وہ اپنے خواب سنایا کرتی تھیں، مسرت کے عالم میں — ہک ہک کر — میں انہیں بتاتی کہ میں خواب بہت کم دیکھتی ہوں اور پھر بڑے فلسفیانہ انداز میں ان سے کہتی " زندگی میرے نزدیک خواب نہیں ہے اور نہ ہی جوانی کوئی رومانوی قصہ Romantic episode۔ وہ مایوس ہوکر کہتیں " جوانی میں اگر خواب بھی نہ دیکھے تو تُف ہے ایسی جوانی پر خواب تو جوانی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔" وہ خواب دیکھنے والیاں جانے اب کہاں ہوں گی ؟۔ اپنی اپنی جنت میں — یا اپنے اپنے جہنم میں — مگر وہ مجھ سے اب بہت دور ہو گئی نہیں — یا پھر میں ان سے بہت دور ہو گئی تھی — جہاں میں رہتی تھی۔ یہ تو خواب سے زیادہ حسین اور دلفریب جگہ تھی — زندگی کی کونسی کمفرٹ ہوگی جو یہاں پر موجود نہ تھی — کوئی بھی چیز جس کا تصور کیا جا سکے۔ نام گنوانے بیٹھوں تو فہرست ختم ہونے میں نہ آئے آسائشوں کا ذکر کرنے لگوں تو صبح سے شام ہو جائے۔

اور وہ شخص — فراز کہ رعنائیوں کا پیکر تھا۔ میری خوشیوں کا وسیلہ — میری راحتوں کا حوالہ — میری آرزوؤں کی تکمیل — میرے خوابوں کی تعبیر — فراز جس نے مجھے اپنا آپ بھلا دیا تھا — گھر والوں کو فراموش کر دیا تھا میں نے اس کے لئے — وہ جس کے قریب رہنا چاہتی تھی — ہمہ وقت — مگر وہ کہاں تھا ؟ گھر سے وہ سارا سارا دن غائب رہتا اس کے دفتر فون کرتی پتہ چلتا وہاں پر نہیں ہے میں استفسار کرتی۔ وہ بتاتے۔ کچھ کہہ نہیں سکتے بیگم صاحبہ۔ ان کا کوئی ٹھکانہ تو نہیں ہے۔

اتنا بھرا گھر اور اتنا خالی۔ ایک ڈھانچہ سا لگنے لگا تھا، روح سے خالی بدن، جو محل تھا پہلے پہل ایک ویرانہ سا بن گیا تھا — فراز، شام کے دھندلکوں میں اور گاہ رات کی تاریکیوں میں آسیب کی طرح نمودار ہوتا، میں اس کے لئے ترس گئی تھی، آنکھیں اس کی دید کو، کان کی شنید کو ہونٹ اس کے لمس کو، اور جسم اس کی قربت کو، کس لئے لایا تھا مجھے ؟ محض دو سراہٹ کے لئے مگر دو سراہٹ بھی تو نہ تھی اپنے گھر کے قیمتی سازوسامان کی حفاظت کے لئے۔ کہ نوکروں پہ بھروسہ نہ تھا۔ دن کے چوکیدار کی حیثیت سے — کچھ پتہ نہ چل رہا تھا کیا مرتبہ ہے میرا اس گھر میں۔ شیبا کا فراز سے کیا تعلق ہے آخر ؟

پہلے میں دبی زبان سے پوچھتی رہی، وہ میرے استفسار کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھتا، وہ میری پریشانی کو بھی نہ سمجھتا تھا، عورت کی پریشانی، ایک بیوی کی پریشانی، ایسا بھی کم گو اور بیوقوف نہ تھا، مگر ایسے سوالات پر جس میں براہ راست اس کی ذات کو شک کا نشانہ بنایا جاتا — وہ خاموش

رہتا اور ٹال مٹول کر جاتا ـــ وہ اپنا دفاع کبھی نہ کرتا، یہ اس کی عادت تھی، اب جب کہ میری باتوں میں تلخی آ گئی تھی ـــ اور میں نے اس پہ الزامات عائد کرنے اور تہمتیں لگانے کی باقاعدہ مہم شروع کر دی تھی وہ ان کا جواب دینے کے لیے تیار نہ تھا، چڑ کر کبھی کبھار کہتا Foolish اور بس! تہمتوں کا جواب دینا دراصل اس کے خیال میں جرم کا اعتراف کرنے کے مترادف تھا، بیگناہی اور معصومیت کا سب سے بڑا ثبوت خاموشی ہے وہ کہا کرتا، سکول میں جب کبھی اس سے کوئی خطا ہو جاتی، اور ماسٹر صاحب پوچھتے تو وہ چپ رہتا، وہ کچھ بتا ہی نہیں سکتا تھا، اس کی زبان، ایسے موقعوں پر لڑکھڑا جاتی۔ وہ خاموشی سے مار کھاتا، اف تک نہ کرتا۔ بعد میں جب ماسٹر صاحب کو پتہ چلتا دوسرے لڑکوں سے کہ شرارت اس نے نہ کی تھی، ماسٹر صاحب شرمندہ ہو جاتے تو اسے عجیب کی طرح خوشی ملتی۔ خوشی جس میں فخر بھی شامل ہوتا۔

مجھے اس کی اس بے ڈھنگی خاموشی میں مکاری نظر آتی وہ کہتا " شک نہ کیا کرو مجھ پر شیبا۔ میرے کردار پر، میرے اعمال پر! پارسائی کا دعویٰ نہیں کرتا، مگر میں برا شخص نہیں"۔ میں جل کر کہتی "کیوں نہ کروں، کبھی میرے شکوک کو رفع کرنے کے لئے کچھ کہا ہے تم نے" "مگر میری تذلیل ہوتی ہے اس سے، کیا تمہیں مجھ پہ بھروسہ نہیں ہے، اعتماد نہیں کرتی مجھ پر، اعتماد ہی وہ بنیاد ہے جس پہ شادی شدہ زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے ورنہ" ـــ "کیسے کروں اعتماد؟ کبھی تم نے اپنی زبان سے کہے ہیں دو جھوٹے بول محبت کے؟" "میں تمہارا شوہر ہوں، فلمی ہیرو نہیں ہوں کہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کہوں۔ محبت کرتا ہوں تم سے! اور شیبا، شک ایسی آگ ہے جس میں انسان خود جلتا ہے، ایندھن بن کر" "مجھے آپ کے فلسفے کی ضرورت نہیں ہے، میں آپ کی بیوی ہوں، اور اس ناطے سے میرے اور آپ کے درمیان قربت کا سب سے بڑا رشتہ ہے۔

"خوب کہا، بہت ہی خوب کہا، لطف آ گیا۔ اتنی خوبصورت، اتنی آفاقی بات"! "تو پھر اگر یہ سچ ہے، میرے اور اپنے درمیان حجابات اور جھوٹ کی مکروہ دیواریں کیوں کھڑی کرتے ہیں؟"

"میں جھوٹ نہیں بولتا شیبا، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، مصلحتاً بھی نہیں بولا، جھوٹ بولنے کو میں انسان کی توقیر کے خلاف سمجھتا ہوں۔

"تو پھر آپ بتاتے کیوں نہیں کہاں رہتے ہیں آپ دن دن بھر؟"

"بتاؤں گا تو تم ہنسو گی، مذاق اڑاؤ گی میرا، یقین نہیں کرو گی ـــ مزید شبہات میں الجھ جاؤ گی۔ سمجھ نہ سکو گی، سمجھا بھی نہ سکوں گا میں ـــ جھوٹ لگے گا تمہیں سب کچھ"! میں چپ چاپ سنتی رہی، وہ بتلانے جا رہا تھا، پردہ اٹھانے والا تھا، اپنی مخفی زندگی پر سے ـــ بے نقاب کرنے والا تھا اپنی منافقت کو! میں دخل دینا نہ چاہتی تھی۔ کہیں انکشاف کا یہ لمحہ ملتوی نہ ہو جائے اور میں دوسرے

لمحے کے انتظار میں ہیگ اور جلتی رہوں۔ شیبا —— مجھے تم بے حد عزیز ہو —— دوسرا کوئی بھی —— اس حد تک —— عزیز نہیں مجھے، مگر انسانیت کے ساتھ بھی میرا ایک رشتہ ہے۔ کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں مجھ پر —— فرائض ہیں جنہیں ادا کرنا ہے —— میرے پاس کرنے کے لیئے اور ہے بھی کیا! فکر معاش اور رزعم روزگار —— کیسی بیکار اور گھٹیا زندگی ہے میری، تمہیں اس گھر میں کسی بات کی کمی نہیں ہے۔ میں اگر ہر وقت گھر میں بیٹھا رہوں تو بیزار ہو جاؤ گے ایک دوسرے سے —— اور میں لولا لنگڑا تو ہوں نہیں —— اور باہر کارزار حیات میں ایک بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مسئلے میں لوگ مبتلا ہیں۔ دکھوں میں گھری ہوئی ہے مخلوق خدا۔ ہر طرف! کیا میں کسی معذور انسان کو اپنی گاڑی میں لفٹ —— کسی جواز سے کو کندھا نہیں دے سکتا؟ میں کیسے اپنے آپ کو معاف کر سکتا ہوں گھر میں بیٹھ کے۔ مجھے بتایا گیا کہ میرے ماں باپ حادثے کے بعد بڑی دیر تک جانکنی کے عالم میں سانس لیتے رہے اگر وقت پر انہیں ہسپتال پہنچا دیا جاتا تو شاید وہ بچ جاتے۔"

"مجھے بھی تو ہمدردی کی ضرورت تھی" میں نے اس کے چلے جانے کے بعد سوچا "مردوں کی ساری ہمدردیاں گھر سے باہر کی مخلوق سے کیوں ہوتی ہیں آخر! مجھے اس کی ساری باتیں ایک مختصر افسانہ سی لگیں، جس بات کی پردہ پوشی وہ کرنا چاہتا تھا وہ یہی تھی، کسی خاتون کو لفٹ دی، تعلق بڑھ گیا تو مزہ، نہ بڑھا تو نیکی۔ امیرزادوں کے اور کیا مشاغل ہوتے ہیں؟ اوروں سے زیادہ مجھے اس کی ضرورت تھی، دو برس سے قید تنہائی کاٹ رہی تھی؟ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اتنا آرام وہ گھر چھوڑ کر میں نہیں جا سکتی تو یہ اس کی سخت بھول ہے، عورت اپنی انا، اپنے حقوق کے حصول کے لیئے بڑے سے بڑا قدم بھی اٹھا سکتی ہے!

ناقدری کا گھاؤ۔ لحظہ بہ لحظہ گہرا اترتا چلا گیا۔ اندمال کی صورت نہ بنی اور نہ اس کی ضرورت سمجھی فراز نے —— ایک دن میں نے اسے اپنے گھر جانے کے لیئے کہا۔ اس کا چہرہ —— ہمیشہ کی طرح —— اتر گیا، اور وہی بحث وتکرار شروع کر دی، جو ہمیشہ کیا کرتا، کیا ضرورت ہے جانے کی وہ لوگ تمہیں ملنے تو آ جاتے ہیں اکثر! میں چپ رہی، جاتے وقت میں اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔

"ہر دفعہ رکاوٹ بنتے ہو"

وہ حسب معمول سنگین صورت بنائے مجھے تکتا رہا، اس دفعہ وہ غیر معمولی طور پہ کسی خوف کا شکار تھا، شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ میرے شکوک کو دور نہیں کر سکا۔

"روٹھ کے جا رہی ہو؟" اسی احساس کے تحت اس نے پوچھا۔

"شاید!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

دیکھو شیبا، میں بہت چھوٹے دل کا ہوں۔ کسی کی ناراضگی ـــــــ نہیں کر سکتا اور پھر تم تو کتنے دن رہو گی؟ ـ

"کچھ نہیں سکتی، شاید یہ مدت طویل ہو جائے۔"

"شیبا تم خوفناک باتیں کر رہی ہو آج۔ تم جانتی ہو یہ میری کمزوری ہے، اکیلا نہیں رہ سکتا میں — تنہائی اور جدائی ہمیشہ خوفزدہ اور غمزدہ کر دیتی ہے مجھے۔ تنہائی بے آسرگی اور جدائی موت ہی کا دوسرا نام ہے — پل بھر کی ہو یا عمر بھر کی، بہرحال تمہیں ایک رات وہاں رہنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ جدائی کی ایک رات تو کسی نہ کسی طرح گزار سکتا ہوں۔ مگر دوسری نہیں!

واپس آؤ گی نا پھر اپنے گاؤں چلیں گے۔ مانسہرہ تم اسے پسند کرو گی، حسین اور پر سکون جگہ ہے اور پھر وہاں سے کاغان چلیں گے۔ پھر سے ہنی مون منانے لگے۔"

پہلی دفعہ — خوشامد کر رہا تھا۔ فراز!

مائیں ہمراز بھی ہوتی ہیں اور رہبر بھی۔ میں اپنی ماں کو دو برسوں کا حساب دیتی رہی، وہ میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ میں نے ماں کو بتایا کہ فراز کو رفاقت کی تمنا ہے اور نہ اطاعت کی ضرورت۔ اطاعت کرنے کو گھر میں بہت نوکر ہیں اور رفاقت کے لئے وہ عورتیں جو اس کے ساتھ اس کی کاروں میں دیکھی گئی ہیں اور جس کی تصدیق میرے بہنوئی نے بھی کر دی تھی، میرے ابا نے بھی اسے ہسپتالوں میں آتے جاتے دیکھا تھا اجنبی چہروں کے ساتھ اور کچہریوں میں گواہیاں دیتے ہوئے۔ اب کس ثبوت کی ضرورت ہے۔ میں اس کے گھر میں بیوی بن کے گئی تھی، گھر چلانے کے لئے منتظم بن کے نہیں۔

"وہ شخص مخلص نہیں ہے امی اس کی باتیں شاعرانہ ہوتی ہیں، مگر مکر و فریب سے پر، ڈھکوسلہ — اس کی محبت میں کھوٹ ہے، وہ ایسا بنا ہے کہ اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے کو عزیز نہیں رکھ سکتا، بلکہ اپنے ارد گرد ایک دائرہ بنا کر رکھتا ہے، محبت کا۔ شاعرانہ تصور ہے — مگر — وہ ایسا نہیں ہے جیسا دکھائی دیتا ہے۔" میری ماں نے میری سوچ کی آبرو رکھ لی۔ آخرکار کہنے لگی "اس نے تو ہم پر بس کچھ جادو ہی کر دیا تھا کسی کی نیت کا کیا پتہ چلتا ہے — مگر بیٹی شیبا — ایک بات بتاؤ؟ کیا تم نے اس سے کچھ زیادہ ہی مانگا تھا۔ تمہاری توقعات کہیں زیادہ تو نہیں تھیں — اس کی استطاعت اور اختیار سے زیادہ — ہر شخص کی کچھ حدود بھی تو ہوتی ہیں؟"

"نہیں — میں نے اس سے بہت کچھ نہیں مانگا تھا، صرف ایک ہی چیز چاہی تھی — فقط ایک سی چیز خلوص۔ جسے وہ گھر سے باہر بانٹتا پھرتا تھا۔ ظاہر تو ایسے ہی کرتا تھا کم سے کم — خیرات کے طور پہ — مگر مجھے یہ خیرات نہیں چاہئے تھی، میرا تو یہ قانونی حق بنتا تھا"

دو برس میں بیتی ہوئی ان گنت گھڑیوں کی تفصیلات میں نے کھول کے سنائی چلی گئی تھی، اذیت ناک کیفیات کا ذکر سنتے سنتے میری ماں رو دی — "مرد لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، بے وفا، ہرجائی، فنکار" وہ کہنے لگی "ہمارا فیصلہ غلط تھا۔ اس کی بے پناہ دولت نے ہمارے فہم کو ماؤف کر دیا تھا۔ بہرحال اب ہمیں اس سے طلاق کا مطالبہ کرنا ہوگا، جلد یا بدیر۔"

صبح بہت سویرے بلانے کی گھنٹی بجی، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں اور امی سوئے تھے، امی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھیں "یہ کون آگیا اتنی صبح" دروازے پہ فراز کا ڈرائیور کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پہ سختی تھی پتھر جیسی! امی گھبرا گئیں اور مجسم سوال بن گئیں۔

صاحب نے بلایا ہے بیگم صاحبہ کو!

میں دروازے کی اوٹ میں امی کے پیچھے کھڑی تھی "خیر تو ہے؟" امی نے پوچھا۔

"رات ــــ پچھلے پہر صاحب کو دل کا دورہ پڑا۔

بہانہ ہے" ــــ میں نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا "مجھے بلانے کی ترکیب" مگر ڈرائیور کا چہرہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ ــ معاً مجھے خبر کی سنگینی کا احساس ہوا اور میں نے بڑھ کر ڈرائیور سے پوچھا ــ

"کہاں ہیں تمہارے صاحب؟"

"ہسپتال میں ــــ" اس نے مختصر سا جواب دیا، اور میری طرف اسی سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوش آیا تو کہنے لگے آپ کو بلاؤ"

فراز کے الفاظ یکبارگی میرے دماغ میں گونجنے لگے۔

جدائی کی ایک شام تو برداشت کر لوں گا شاید ــــ مگر دوسری نہیں! اور وہ تو ایک شام بھی تو برداشت نہ کر سکا ــــ فراق کی!

کار بڑی تیز رفتاری سے شہر کی سنسان سڑکوں پہ بھاگ جا رہی تھی۔ میں نے اپنا سر امی کے کندھوں پہ رکھا ہوا تھا اور امی دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

ڈاکٹر نے ہمیں دروازے ــ پر ہی روک لیا تھا ــ "مریض ابھی ہوش میں نہیں ہے ــــ"

ڈاکٹر صاحب میں نے پوچھنا چاہا۔ ڈاکٹر نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرا جی چاہا۔ خدا کرے یہ سب جھوٹ ہو "صرف ایک نظر دیکھ لینے دیجئے مجھے، میں ان کی بیوی ہوں، ان کی سب کچھ ہوں ــ میں ــــ شیبا فراز! مجھے دیکھ کر واپس پاکر جی اٹھے شاید وہ!" ڈاکٹر نے دروازہ کھول دیا۔ فراز مسلسل توجہ کے وارڈ Intensive care ward میں تھا۔ اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی ــــ اور اسے آکسیجن دی جا رہی تھی!

میں نے لپک کر اندر جانا چاہا تو ڈاکٹر نے سختی سے روک دیا۔ پھر وہ خود اندر چلا گیا ــ میں دروازہ تھام کر کھڑی رہی۔

"مجھے تم بے حد عزیز ہو ــــ دوسرا کوئی بھی ــــ اس حد تک عزیز نہیں مجھے" مسلسل میرے کانوں میں فراز کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے امی! یہ سب ——— یہ سب!" میرے حواس معطل ہو رہے تھے۔
ڈاکٹر نے باہر نکلتے ہوئے اور اپنے پیچھے دروازے کے کواڑ بند کرتے ہوئے کہا "ہم کچھ نہیں کر سکے
مسز فراز۔ دورہ بہت شدید تھا ——— آپ میت گھر لے جا سکتی ہیں ———"
"میت! کس کی میت؟" میں نے سوچا۔ جیسے کسی نے میرے سینے میں برچھی گاڑ دی ہو۔
امی نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا، مگر ایک قدم بھی اٹھانے کے قابل نہ تھی میں ——— ایسے لگ
رہا تھا جیسے دہلیز کھسکتی جا رہی ہو میرے قدموں کے نیچے سے گرتے گرتے میں نے دروازے کو مضبوطی سے
تھامنا چاہا ——— مگر جیسے سب کچھ میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا ——— سب کچھ!
خوشیاں۔ قرار۔ محبت ——— ازل ——— ابد!

OO

آخری سبق

ڈاکٹر سلیم اختر

ماں نے صحن میں دو قدم چل کر پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو اسے دہلیز پر رکے پایا۔

"ارے آ جاؤ رک کیوں گئے"

حامد نے صحن میں بیٹھے لڑکے، لڑکیوں کو نظر بھر کر دیکھا جو اب تک کتابوں پر سے گردنیں اٹھا کر اسے گھور رہے تھے، اس کے دل کی دھڑکن میں تیزی پیدا ہو گئی۔ پاؤں جیسے دہلیز نے جکڑ لئے۔

حامد نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا پھر ان بچوں کو جو اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور پھر استانی جی کو۔ چوڑے کندھوں اور بھرے بھرے ہاتھ پاؤں والی لمبی تڑنگی استانی کو دیکھ کر ویسے ہی اس کے چھکے چھوٹ گئے۔

وہ سب اُسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"بڑا شرمیلا ہے میرا حامد"

ماں نے اب لاڈ میں آ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے لا کر استانی جی کے سامنے پیش کر دیا، وہ مجرم بنا سر جھکائے کھڑا تھا۔ تپتے گال اور سرخ چہرہ لیے۔ اسے بچوں کی ہنسی اپنی پشت پہ کانٹوں کی طرح چبھتی محسوس ہو رہی تھی اپنے لمبے قد کے باوجود وہ خود کو ایک بونا محسوس کر رہا تھا۔ ایسا بونا جسے ابھی قلابازی لگانے کو کہا جائے گا اور وہ اس معمولی سے کام میں بھی ناکام رہے گا۔ دھڑام سے گر پڑے گا اور پھر سب اس پہ دل کھول کر ہنسیں گے۔

شاید وہ ہنس ہی رہے تھے مگر نہیں اب کوئی بھی نہیں ہنس رہا تھا۔ استانی جی کی ایک ہی نگاہ نے ان سب کی چیں چیں بند کرا دی تھی۔ مگر وہ ابھی تک مجرم بنا کھڑا تھا۔ جس کا سر اور آنکھیں استانی جی کے سانولے پاؤں پہ ٹکی تھیں، کھلی چپل میں سانولے پاؤں اس وقت کشش ثقل کا کام کر رہے تھے۔

"ارے واقعی" استانی جی بولیں "یہ تو بہت ہی شرمیلا ہے" یہ سن کر وہ شرم سے اور بھی سکڑ گیا اور ماں فخر سے بولی "یہ میرا حامد سات بیٹیوں جیسا ہے" اس پر سب کی چیں چیں پھر اس کی پشت پر سوئیوں کی طرح چبھی مگر استانی جی کی ایک ہی نگاہ نے سب کو سُن کر دیا۔

باقی بچے سن ہوئے یا نہ ہوئے مگر حامد خود یقیناً سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ دراصل سن ہونا حامد کی خصلت تھی غالباً اس کے خون میں سرخ خلیوں کے علاوہ کچھ ایسے خلیے بھی تھے جو اسے خواہ مخواہ سُن رکھتے تھے۔ ڈرنے کی بات

جو یا نہ ہو وہ خود بخود ہی ڈرا رہتا تھا خاص طور پر لڑکیوں سے تو اس کی جان جاتی تھی، اسے یہ لڑکیاں عجیب و غریب اور پُراسرار قسم کی مخلوق نظر آتیں، ایسی مخلوق جس سے بچنے ہی میں عافیت ہو اور اب جو استانی جی کی صورت میں وہ ایک بہت بڑی لڑکی کے حضور پیش ہوا تو خود کو مجرم سمجھنا لازم تھا سو نظریں ابھی تک سانولے پاؤں پر ہی تھیں۔

اس کی ماں جھنجھلا کر بولی "او کھوتیا"

اس پر پھر اس کی پشت پر زور سے سوٹیاں جھڑیں۔

استانی جی بولیں "رہنے دیں، مت ڈانٹیں اسے، ابھی نیا نیا ہے اس لیے گھبرا رہا ہے۔" اس نے سکڑ سمٹ کر استانی جی کو دیکھا تو انہیں اپنی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے پایا۔ اس مسکراہٹ سے اس کی جان میں جان تو آئی مگر مکمل طور پہ نہیں! ماں کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے چنانچہ وہ جھنجھلا کر بولی "بڑا شرمیلا ہے میرا حامد۔"

قصور حامد میاں کا بھی نہ تھا۔ ماں دنیا سے خوفزدہ تھی اس لیے مرغی کی طرح حامد کو اپنے پروں میں لیے رہتی وہ وقت جو بچوں کے ساتھ باہر گلی میں کھیلنے میں گذارنا چاہیے تھا۔ وہ صرف گھر میں ماں اور خالاؤں اور پھپھیوں کے ساتھ گذارتا، وہ گھر میں ماں کے ساتھ کام کراتا۔ بلکہ بعض کام تو اسے بے حد پسند تھے مثلاً سل بٹے سے مصالحہ پیسنا، ماں کی سہیلیاں آتیں تو یہ ان کے دائرہ کے قریب ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے ان کی باتیں سنتا رہتا، ساسوں کی باتیں، خاوندوں کی باتیں، پڑوسیوں کی باتیں۔ کچھ سمجھ پاتا، بہت کچھ سمجھ میں نہ آتا مگر باتوں میں مزا ضرور آتا۔ ان باتوں کے سننے میں اس کے لیے سب سے زیادہ مزا تھا اور یہی اس کی سب سے بڑی تفریح تھی۔ پھر یہ ہونے لگا کہ کوئی ایک کہتی "دیکھو تو کیسے چسکارے رہا ہے۔"

"چلو حامد بیٹے!" اس کی ماں چمکار کر کہتی۔

اور وہ عورتوں کی جنت سے جلاوطن کر دیا جاتا۔

پھر اس نے چھپ کر باتیں سننی شروع کر دیں گو اب بھی بہت سی باتیں پلے نہ پڑتیں۔ مگر یوں چھپ کر سننے میں مزا اور بھی زیادہ تھا چنانچہ وہ اور بھی زیادہ رگڑ کر مصالحہ پیسنے لگ گیا۔

پھر اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا قد بے حد طویل ہو چکا ہے اور اپنی ماں کے منہ سے نکلی باتیں اسے مکمل طور پر سمجھ میں آ گئیں۔ اس رات وہ خواب میں بلاوجہ ہی روتا رہا اگلی صبح اس نے مصالحہ پیسنے سے انکار کر دیا اور تب ماں کو احساس ہوا کہ بیٹا خاصا بڑا ہو چکا ہے۔

اب اسے پڑھانا چاہیے اور تعلیم کے لیے استانی کے گھر سے بہتر بھلا اور کونسا سکول ہونا تھا۔

استانی جی جو محلہ بھر میں آپا جی اشرف کے نام سے مشہور تھی غریب کی جورو تھی آٹھویں پاس تھی اور پرائمری تک کے بچے پڑھاتی تھی کیونکہ باقی عورتیں آٹھویں پاس تو کجا آٹھویں فیل بھی نہ تھیں اس لیے استانی جی

پھر لفافہ پھٹ گیا۔ آنکھ کھلتے ہی اسے خود پر گھن آ رہی تھی۔

اور پھر اچانک ہی جیسے جھنجھوڑ کر اسے سہانے خواب سے بیدار کر دیا گیا اس کی ماں کو اچانک یاد آ گیا کہ وہ اب بہت ہی بڑا ہو گیا ہے استانی جی نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ اسے جو سکھا سکتی تھی سکھا چکی ہے اور۔ یوں وہ سکول پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس نے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو ڈرنا مزید سیکھ لیا ! ماسٹروں سے ان طاقتور لڑکوں سے جو چھوٹے بچوں پر حکومت کرتے تھے، کتابوں سے اور سب سے بڑھ کر خود اپنے جسم سے۔

آپا جی کے ہاں جانا موقوف نہ ہوا تھا معاملہ چھینے یا بالوں میں تیل لگانے کے لیے نہیں بلکہ ویسے ہی انہیں سلام کرنے کا اسے یہاں آکر عجیب سے سکون کا احساس ہوتا تھا۔ سکول اور کلاس روم میں وہ سکڑا سہما رہتا مگر یہاں آکر اسے محسوس ہوتا گویا اب دنیا بھر کی پریشانیوں سے محفوظ ہو گیا ہو یہاں بیٹھ کر سکول کا کام کرتا اور سب سے بڑھ کر سکول کے لڑکوں کی اور ماسٹروں کی باتیں کرتا اور یوں دونوں کی شعوری کاوش کے بغیر استانی اور شاگرد میں دوستی کے ایک نئے رشتہ نے جنم لیا وہ دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی، اسے مشورہ دیتی، اونچ نیچ سمجھاتی اور وہ سن کر سر ہلاتا رہتا۔ محلہ کی عورتوں کی بک بک سننے کے بعد اور بچوں سے مغز ماری کے بعد حامد سے گفتگو اسے بھی بہت اچھی لگتی چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی۔ میاں کی بیماری کی باتیں، کپڑوں کی باتیں، زندگی کے دکھ سکھ کی باتیں۔

حامد کے لیے دن میں دوست بنانا ناممکن ہو چکا تھا اور رات کے خوابوں سے پیچھا چھڑانا بھی ناممکن ہو چکا تھا۔

اور پھر اچانک ہی جیسے جھنجھوڑ کر اسے سہانے خواب سے بیدار کر دیا گیا اس کی ماں کو اچانک یاد آ گیا کہ وہ اب بہت ہی بڑا ہو گیا ہے کیونکہ تعلیم ختم کر کے ملازمت کر رہا ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کی شادی سے نہیں روک سکتی، روکا کس نے تھا؟ بلکہ استانی جی نے تو ایک رشتہ بھی بتا دیا، حامد نے بہت شور مچایا کہ اس نے صرف میٹرک پاس کیا ہے اور وہ معمولی سا کلرک ہے اور ابھی محض انیس سال ہی کا ہے مگر اس کی کسی نے بھی نہ سنی۔ یہ سب خواب محسوس ہو رہا تھا۔ مہندی کی رسمیں، تیل کی رسمیں سہرا، بارات، مولوی صاحب کے منہ سے ادا ہوتے ہوئے مقدس کلمات، کھانا، واپسی اور پھر کمرہ میں ایک اجنبی عورت، سرخ جوڑا، مہندی والے ہاتھ، ٹیکے والا ماتھا اور۔ اور۔ اور وہ مرد نہیں تھا۔ وہ رونے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔

شادی کے سہانے سپنے کی تعبیر یہ نکلی کہ دلہن نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ عورتوں کی زبانیں سرگرم عمل ہو گئیں۔

استانی جی اس کی ماں سے ملیں، دلہن کی ماں سے ملیں پھر دلہن سے ملیں وہ سب سے زیادہ پریشان تھیں۔ لڑکی انہوں نے پسند کی تھی اور حامد نے ان کے کہنے پر ہاں کی تھی سب ان کی عزت کرتے تھے مگر ابھی ڈر۔۔۔

سرا کہاں سے ملے؟

شادی کے بعد سے حامد صبح سویرے کام پر چلا جاتا اور رات گئے تک گھر آتا اس دوران اس پر کیا بیتی؟ کسی کو نہ معلوم تھا کہ اس کا کوئی دوست بھی نہ تھا، استانی جی کے گھر کا اس نے رخ نہ کیا تھا۔

دفتر میں اس کی طبیعت بہت پریشان ہوئی تو چھٹی لے کر نکل آیا مگر جائے کہاں؟ بس سٹاپ پر بیٹھا سواریوں کی بھیڑ دیکھتا رہا، دیواروں پر لگے پوسٹر اور لکھے اشتہارات پڑھتا پھرا، سینما میں تصویریں دیکھتا رہا اور آخر تھک تھکا کر سر جھکائے سوچ میں ڈوبا ہو چلا تو یہ احساس ہی نہ ہوا کہ کب اور کیسے وہ استانی جی کے گھر آ پہنچا وہ دہلیز میں مجرم سا بنا کھڑا تھا وہ صحن کے کونے میں چولھے پر بیٹھی تھی، بچے جا چکے تھے مگر وہ پھٹی دری ابھی تک لپیٹی نہ گئی تھی وہ کچھ دیر تک خاموشی سے نظریں دوڑاتا رہا۔ تب اچانک وہ آگے بڑھا اور اس نے دری لپیٹنی شروع کر دی۔ استانی جی خاموشی سے دیکھتی رہی مگر اُسے منع نہ کیا اس نے دری لپیٹ کر وہیں کونے میں رکھی جہاں وہ ہمیشہ رکھا کرتا تھا اس کے بعد اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اس کے چہرے پر ایسی کیفیت تھی کہ خاموش رہی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا حامد نے بولنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر کھلے ہونٹوں سے الفاظ نہ نکلے صرف ٹھوڑی کپکپا کر رہ گئی اور اگلے لمحے وہ استانی جی کے گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا۔ سسکیوں سے سارا جسم کانپ رہا تھا وہ خاموشی سے اس کی پیٹھ سہلاتی رہی۔ دھیرے دھیرے وہ سکون پذیر ہو گیا مگر آنسو رک گئے مگر وہ اب بھی سوکھی سسکیاں لے رہا تھا اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ مگر ابھی تک اسی طرح اس کے گھٹنے سے لگا بیٹھا تھا آنسوؤں نے اس کی شلوار گیلی کر دی تھی۔

وہ خاموش تھی اور خاصی دیر تک خاموش رہی پھر اس نے ایک لمبی سانس لی۔ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اندر کمرے میں لے گئی۔

OO

داغِ ناتمامی

سائرہ ہاشمی

ایک روز ناہید مرزا نے مجھے فون کر کے کہا تھا "یوسف جمال کیا بات ہے تم نہ کبھی فون کرتے ہو اور نہ ہی کبھی ملنے آتے ہو۔"

میں ایسا جواب دینا چاہتا تھا جو اسے خوش کر سکے۔ مجھے لڑکیوں سے دوستی کرنے میں کبھی مشکل نہیں پیش آئی۔ میں ان کے اندر چھپی خودپسند عورت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لیے میں جہاں کہیں بھی گیا ہمیشہ کامیاب رہا اور ناہید مرزا سے میری دوستی بھی اسی نوعیت کی تھی۔

میں نے بڑے رومانی انداز کی آہ بھری اور کہا "ناہید مرزا تم سے مجھے ابھی بھی محبت ہے۔"

وہ ہنس دی۔ اس کی ہنسی کا جلترنگ تاروں میں ارتعاش پیدا کرتا میرے ہاتھوں سے ہوتا ہوا میرے دل میں اتر گیا تھا۔ اس کی ہنسی جو اس کے وجود کا سب سے قیمتی سرمایہ تھی اور وہ جانتی تھی کہ وہ دوسروں پر کیسے اثر انداز ہو سکتی ہے۔

میں نے کہا "ناہید مرزا ذرا اور ہنسو... بہت عرصے بعد تمہارا جادو میرے دل میں جاگ رہا ہے۔" اس نے کہا "یوسف جمال تم بہت بڑے ایکٹر ہو... لیکن میں بتاؤں میں تمہاری ایکٹنگ کو عرصہ ہوا جان چکی ہوں۔"

"ناہید مرزا یہ تو بہت برا ہوا۔" میں زور سے ہنس کر بولا "مسز فیروزہ ہارون کا خط آیا ہے۔ اگر اسکو تو مل کر پڑھیں۔ تم بھی تو ابھی تک اُسے نہیں بھولے اور پھر اُس کی یاد تازہ کریں۔ مجھے آج وہ بری طرح یاد آ رہی ہے۔"

ناہید کی آواز میں یادوں کا دکھ تھا "فیروزہ ہارون... فیروزہ ہارون..." میرا دل ہولے ہولے دھڑک رہا تھا۔

"بہت اچھا میں آج شام آ رہا ہوں۔" اور میں نے فون بند کر دیا۔

فیروزہ ہارون جو میری دوست تھی۔ جو ناہید مرزا کی دوست تھی۔ جس کے پرانے کٹ طرز کے بالوں کی خوبصورتی کے ہم دونوں ہی مداح تھے۔ جس کے خوبصورت وجود میں مجھے ساری دنیا کی حسین عورتوں کا عکس نظر آتا تھا۔ لیکن اب تو وہ میرے ماضی کی دل آویز رنگین یادوں کا حصہ بن چکی تھی۔ ایسا راز جو یادوں کی دبیز تہوں کے نیچے چھپا کر رکھنے کو دل چاہتا ہے اور میں نے اُسے انہی یادوں میں کہیں بہت دور دفن کر کے چھپا رکھا ہے۔ لیکن ناہید نے اپنے دل میں دبی اس چنگاری کو روشن ہونے [illegible] کا نام [illegible] ہے۔

[illegible] رہا تھا۔ تم جواب تمہارے [illegible]

لیکن کیا یہ تمہاری شکست تھی۔ نہیں فیروزہ بیگم میں جانتا ہوں یہ تمہاری ہار نہیں تھی بلکہ یہ میری ہار تھی۔ میری ہار جو جس من چاہی عورت کو چاہتا تھا اپنے جال میں الجھا لیتا اور پھر اپنی جیت پر اکیلے میں خوب ہنستا۔ لیکن تمہارے نام کے ساتھ میرے لبوں پر کوئی ہنسی نہیں۔ میں ہنسوں بھی تو کس فتح پہ پتا نہیں تمہارے دل کے درد میں میرا کتنا حصہ ہے۔ تمہارے چلے جانے میں میں نے کہاں تک مدد کی ہے۔ فیروزہ ہارون میں تو تمہیں جانے کا جواز کبھی نہیں۔ شاید کوئی بھی نہ جان سکا۔ میں اپنی یادوں کے بہاؤ میں بہہ رہا ہوں۔ ناہید مرزا، سیمی خواجہ، افتخار ملک۔ ستار زماں اور میں خود۔ ان دنوں ایک ادبی مذاکرہ تھا۔ سٹیج بنواتے۔ باہر سے آتے مندوبین کے رہنے کا بندوبست کرتے۔ ان کو سٹیشن سے لاتے۔ میں بہت تھک گیا تھا جو پورا کے ہال میں سٹیج کے پاس کرسی ڈالے میں ذرا ستانے کے لیے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ سٹیج پہ روشنیاں گل کر دی گئی تھیں اور اس وسیع ہال کا اندھیرا بڑا ہی گمبھیر تھا اور ڈراؤنا بھی۔ خالی کرسیوں کے سائے ایسا لگ رہا تھا جیسے آوازوں کا ایک ہجوم ہے جو اس سنسان ہال میں سے اٹھ کر میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں اپنی بزدلی پہ ہنس دیا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔ سامنے سرو کے درختوں کے پار شام کے چاند کا چھوٹا سا بے رنگ وجود رکا ہوا تھا۔ ناہید مرزا نے میرے پاس آ کر کہا تھا

"یوسف جمال میری گاڑی ابھی تک نہیں آئی اور مجھے اپنی دوست کو بھی چھوڑنے جانا ہے کیا تم میرے لیے اتنی تکلیف کرو گے کہ مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑ آؤ۔ آج مجھے دیر ہو گئی ہے۔"

میں نے سرمئی شام میں ناہید مرزا کے پاس کھڑی اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ لاپرواہی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر دل میں فوراً کوئی خاص خیال نہیں آتا تھا۔ بس وہ خوبصورت تھی "یہ فیروزہ ہارون ہیں۔ کراچی سے آئی ہیں۔ میں انہیں ذرا لاہور کی سیر کروانے لے آئی تھی۔ بس دیر ہو گئی۔" ناہید مرزا معذرت بھرے انداز میں کہنے لگی اور یہ ہیں یوسف جمال ناہید مرزا نے کہا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ اس کے انداز میں کوئی تجسس نہیں تھا وہ خاموش کھڑی تھی۔ آئیے میں آگے چل پڑا۔ ناہید مرزا اس سے باتیں کر رہی تھی اور میں اس کے سراپے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بہت اعتماد تھا۔ اپنے آپ پر بھروسہ۔

"آپ کیا کرتی ہیں" میں نے پوچھا۔

"یونیورسٹی میں پڑھاتی ہوں" وہ بولی اور پھر ناہید سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔

اگلے روز اس نے سٹیج پر انگلش میں زوردار تقریر کی تھی۔ اور میں اس کی آواز کی خوبصورتی میں الجھا کچھ سمجھنے سے زیادہ صرف اس کی آواز [illegible] وہ پورے اعتماد سے بول رہی تھی۔ بہت پڑھی لکھی خاتون لگتی ہیں۔ میں نے پاس بیٹھی ناہید مرزا سے آہستہ سے کہا۔

ناہید مرزا نے سوچ بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ "تم عورتوں پہ بڑی جلدی ریشہ خطمی ہو جاتے ہو۔" اس کی آواز میں طنز تھا۔ "لیکن فیروزہ ہارون تمہارے ہاتھ نہیں آئے گی۔"

"ناہید بیگم اس میں ریشہ خطمی ہونے والی کونسی بات ہے۔ میں۔ کوئی غلط [illegible] تو نہیں [illegible] میں اعتج [illegible] کرتے [illegible] بولا۔

اس لیے کہ تمہیں ہر صورت میں نہ جانے کیا کیا نظر آنے لگتا ہے" ناہید مرزا نے غصے سے کہا اور چپ ہوگئی
۔ ناہید کی بات پر غور کرنے لگا۔ آخر ناہید کو کیوں برا لگا تھا۔ ہو سکتا ہے میں کوئی واضح بات نہیں کہہ سکتا تھا۔
ہید کی اور میری دوستی صرف چند مہینے پہلے ہی تو ہوئی تھی۔ فیروزہ ہارون سٹیج سے اتر کر میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ
گئی تھی۔

" آپ تو بہت خوب بولتی ہیں" میں نے اس سے کہا۔ اچھا وہ رسان سے مسکرائی۔ شکریہ اور اپنے پرس میں
سے ننھا سا آئینہ نکال کر چہرے پر پف سے پوڈر لگانے لگی۔

" ہوں۔ یہ صرف خوب بولتی ہی نہیں خوب سنورتی بھی ہیں" میں نے دل ہی دل میں حیران ہو کر سوچا۔ "بہت
ماڈرن خاتون ہیں یہ تو" میں ناہید کی طرف جھک کر مسکراتے ہوئے بولا " ذرا زیادہ ہی ایڈوانس لگتی ہیں۔ تمہاری دوست
کیسے بن گئیں" " تم تو بہت سادی ہو۔ "

" چپ کرو یوسف جمال مسخرا بننے کی کوشش مت کرو" ناہید نے غصے سے سرگوشی کی۔ وہ نہ جانے اتنی تنی ہوئی
کیوں بیٹھی تھی۔

پہلے دن کا اجلاس ختم ہوا تو لوگ آپس میں باتوں میں مصروف ہوگئے۔ گروہوں میں بیٹھے ہوئے لوگ تیز تیز
باتیں کر رہے تھے آپس میں گلے مل رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ مبارکباد، تنقید، شور اور ہنگامہ، جیسے زندگی
اپنے پورے رنگوں سے کائنات پر چھائی ہوئی ہو۔

سمیع خواجہ بھی آیا ہوا تھا۔ اس نے فیروزہ ہارون کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس لا کر کہا۔

" فیروزہ سے ملو۔ پچھلے سال ہی تو پاکستان آئی ہیں۔ یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتی ہیں۔ بہت ہی ذہین ہیں۔ ان کی
ذہانت کے بارے میں تو مزید کہنے کی ضرورت نہیں نا۔" سمیع خواجہ کی آنکھوں میں احترام اور محبت کی جوت سی روشن تھی۔
فیروزہ مسکرا کر بولی " سمیع خواجہ میری ذہانت کا ڈھنڈورا پیٹتے تم کچھ اچھے نہیں لگتے۔ کیونکہ میں اتنی ذہین تو
نہیں ہوں۔"

" یہ جھوٹ نہیں بول رہا محترمہ" میں جلدی سے بولا۔

" آئیے آپ کو چائے پلواؤں" اور پھر میں سمیع خواجہ فیروزہ ہارون یونیورسٹی سے باہر آگئے تھے۔
مال روڈ پر زندگی رواں دواں تھی۔ ہم تینوں چلتے چلتے وارڈز ریسٹورنٹ میں آگئے اور میں نے دیکھا کہ اس کی
آنکھوں میں عجیب انداز کی ملامت تھی۔ جیسے غیر مرئی روشنی نکل کر اس کے چہرے کا ہالہ کر رہی ہو۔ اس نے ایکبار
پھر اپنے چہرے کو چھوٹا سا آئینہ نکال کر سنوارا تھا۔ بالکل انتہائی فیشن ایبل غیر ملکی انداز میں۔

جانتے ہو یہ پانچ سال آکسفورڈ میں رہی ہیں۔ سمیع خواجہ اس کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔
آکسفورڈ۔ زندگی کا تیز بہاؤ۔ آئینہ فیروزہ کے حسین گھنگھریالے بال۔ میں نہ جانے کیا کیا سوچ
رہا تھا۔

سمیع خواجہ نے کہا۔ "دیکھو چائے ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے۔ جاگو یوسف جمال" میں مسکرا دیا اور بولا۔
"میں آکسفورڈ کے بارے میں سوچ رہا ہوں"

اور پھر میں اور فیروزہ ہارون بیتے دنوں کی یادوں میں گم ہو گئے۔ جانی پہچانی سڑکیں۔ پھول۔ خوبصورت لڑکیاں، پرانے استاد۔ میں اور فیروزہ ہارون ان یادوں کو آپس میں بانٹ رہے تھے۔ جیسے ہم دونوں دوست ہوں۔ مشترک یادوں نے ہمیں دوست بنا دیا تھا۔

اگلے چند دن ہم تینوں نے زیادہ وقت ساتھ گذارا تھا اور میں جو سوچتا تھا کہ چند ملاقاتوں میں میں فیروزہ ہارون کی کمر میں بازو ڈال کر کسی بہت ہی ماڈرن ہوٹل میں ڈانس کروں گا۔ اس کے ہاتھ کو ایک انگلی سے چھو بھی نہیں سکا تھا۔ اس نے کبھی بے باکی سے میری آنکھوں میں بھی نہیں جھانکا تھا۔ اس کے قہقہوں میں ایک رکاوٹ تھی جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب عورت کے اندر ایک اللہ عورت بیٹھی ہر وقت اس کا محاسبہ کرتی رہے۔ کیا یہ لڑکی جو بظاہر اتنی آزادی سے دوست بناتی تھی۔ جو آدھی رات تک میرے ساتھ پھر سکتی تھی۔ جو پانچ سال تک آکسفورڈ میں پڑھ کر آئی تھی۔ اتنی مشرقی کیوں لگتی ہے۔ میں اکثر اس کو اس کے خالہ کے گھر چھوڑ کر آتے ہوئے راستے میں سوچتا اور میرا دل انوکھی طمانیت اور مسرت سے بھر جاتا۔ فیروزہ ہارون میری دوست تھی اور اس نے اپنے اندر کی مشرقی عورت کو مٹا نہیں دیا تھا۔ فیروزہ ہارون کے ساتھ گذارے ہوئے لمحے ایسے لمحے جو میں نے اپنی آواز میں نہیں بلکہ اس کی آواز کے جادو میں گذارے تھے میرے دل کو سب لمحوں سے زیادہ انوکھے اور پیارے لگتے تھے۔ میرا اپنا جادو مجھ پر کم ہو رہا تھا اور میں سوچتا آخر کو میں ہی جیتوں گا۔ ہمیشہ کی طرح۔ اور پھر فیروزہ ہارون واپس چلی گئی سٹیشن پر بہت سے لوگ اسے الوداع کہنے آئے تھے اس کے دوست اس کے رشتہ دار۔

ناہید مرزا کچھ بجھی بجھی لگتی تھی۔ میں نے جاتی ہوئی ٹرین پر الوداعی نظر ڈالی میں اداس سا تھا اگرچہ اس اداسی میں غم نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "ناہید بیگم تم اتنے دنوں سے نظر نہیں آئی ہو۔ کیا بہت زیادہ مصروف رہی ہو" میں واپس جاتے ہوئے ہجوم میں سے اس کے لیے جگہ بناتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش تھی جیسے ناراض ہو۔

"کیوں ناہید بیگم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا" میں نے رک کر پوچھا۔ "فیروزہ ہارون تو تمہاری دوست تھی"
"کیا تمہیں اتنی فرصت ہے کہ میری ناراضگی کے بارے میں سوچ سکو" وہ ہمیشہ کی طرح طنز سے بولی۔

"کیوں نہیں ناہید بیگم میں تو زندگی میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ میں بیک وقت بہت ساری خوبصورت لڑکیوں کا خیال رکھ سکتا ہوں۔ جیسے فیروزہ ہارون۔ عفت جمیل اور تم۔ اور بھی اگر کوئی ہو تو" میں مذاق کرتے ہوئے بولا۔

ہم دونوں سٹیشن سے باہر کھڑے تھے۔ ناہید مرزا کو اس کے گھر جانا تھا اور میں جو فیروزہ کے جانے کے بعد ایکدم اداس ہو گیا تھا۔ اس کو باتوں میں الجھائے اپنی اداسی سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"کیا فیروزہ تمہیں پسند آئی" ناہید نے پوچھا۔

میں ایکدم رک گیا تھا۔ میں اس بات کا کیا جواب دوں ، میں نے سوچا۔ اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ میرے دل کی سچائی تو وقتی جذبے تلے دبی ہوئی تھی اور یہ جذبہ کتنا سچا تھا؟ میں نہیں کہہ سکتا تھا۔

ناہید بیگم اس سے مل کر انسان اتنا خوش نہیں ہوتا۔ جتنا تم سے مل کر میں نے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ جاتے جاتے رک گئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

" کیا تم سچ کہہ رہے ہو یوسف جمال " اس کے چہرے پہ ایک رونق سی آگئی تھی۔

" وہ لڑکی بہت ہی مغرور۔ اور خود پسند ہے اور ایسی لڑکیاں مردوں کو پسند نہیں آتیں " میں نے اپنے الجھے خیالات کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ فیروزہ ہارون کے ساتھ رہ کر مجھے یہی احساس ہوا تھا۔ دوپہر کا سورج آسمان کے بیچوں بیچ چمک رہا تھا اور فٹ پاتھ سنسان تھا۔ مجھے لگ رہا تھا۔ جیسے یہ ویرانی میرے اندر سے امڈ رہی ہو۔ گاڑی کو ناہید کے گھر کے پاس روکتے ہوئے میں نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ شاید ناہید کے بارے میں یا فیروزہ ہارون کے بارے میں۔

ناہید نے ہنستے ہوئے کہا " یوسف جمال فیروزہ ہارون ایک قدیم مشہور خاندان کی بیٹی ہے کوشش کر دیکھو — اور تیزی سے چلتی گیٹ میں داخل ہو گئی "

" فیروزہ ہارون عورت تو صرف عورت ہوتی ہے جس کا دل چاہت کے دیوتا کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ کیا خبر میں ہی وہ دیوتا بن جاؤں " میں نے سوچا اور تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

زندگی کے موڑ جو انجانے میں ہماری راہوں میں آ جاتے ہیں اور انسان بڑھتے بڑھتے ایک لمحے کو ٹھٹھک کر کھڑا رہ جاتا ہے۔ کونسی راہ۔ اسے اپنے پر یقین نہیں رہتا چاہے وہ ایک لمحہ ہی ہو۔

ناہید مرزا بھی میری زندگی میں ایسا ہی موڑ بن گئی تھی۔ ناہید مرزا کو ملتے ہوئے میں اکثر حیران ہوتا۔ وہ جو ایک عام گھریلو سی لڑکی لگتی تھی۔ کبھی کبھار میرے دل میں آ بیٹھتی اور میں کچھ گہری سوچوں میں گھر جاتا۔ ہاں ان سوچوں میں اپنی ذات کا اعتماد اور بڑھ جاتا۔ میں جو یوسف جمال تھا۔ لڑکیوں کے لیے باعث کشش تھا اور ناہید مرزا بھی اس کشش کا شکار رہتی۔

لیکن جب بھی مجھے فیروزہ ہارون کی یاد آتی دل ایک محرومی۔ ایک کسک سے دھڑکنے لگتا اور ناہید مرزا کا سارا جادو جو اس کی ہنسی کے جلترنگ میں چھپا ہوا تھا۔ ختم جاتا۔ کیا میں فیروزہ ہارون کے خاندان سے مرعوب ہوں۔ میں اپنے آپ سے سوال کرتا۔ شاید۔ اس شاید میں بہت کچھ تھا۔

فیروزہ ہارون کا سراپا۔ اس کا اعتماد، اس کا ذہن اور پھر اس کا خاندان۔ یہ ساری باتیں مل کر فیروزہ ہارون کی تکمیل کرتی تھیں اور میں ان سے کیونکر انکار کر سکتا تھا۔ ناہید مرزا کا فون سنتے، اس کی خوبصورت باتوں میں الجھتے اس سے بے معنی باتیں کرتے میں نہ جانے اپنے دل کو ان باتوں سے الگ کیوں محسوس کرتا تھا اور میں جانتا تھا ناہید

کیا سوچ رہی تھی۔

ایک روز میں نے ناہید مرزا سے کہا تھا۔

ناہید مرزا: مجھے تمہارا اعتماد اچھا لگتا ہے لیکن تمہاری منزل شادی ہے۔ تم میرے ساتھ وقت گزار رہی ہو کسی سے شادی کیوں نہیں کر لیتی۔

وہ میرے آفس میں کرسی پر بیٹھی تھی اس نے ایک لمحے کو میری طرف دیکھا اور بڑے وثوق سے کہا۔

" یوسف جمال اگلے ماہ میری شادی ہونے والی ہے اور میں جو اس بات کو کہتے بہت سے آنسوؤں اور بہت سے شکوؤں کا منتظر تھا حیران رہ گیا۔ اس نے اپنے چہرے کے زرد ہوتے رنگ کو ہنسی میں چھپا لیا تھا یہ ایک عام گھریلو سی لڑکی ایک ماہ بعد شادی کرنے والی ہے اور پھر بھی میرے ساتھ ملتی ہے۔ میں دل میں سوچ رہا تھا۔ "یہ بھی زندگی کے حادثوں میں ایک موڑ تھا اور مجھے آگے ہی تو بڑھنا ہے"

تم نے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا ناہید بیگم۔ میں نے پوچھا۔ میں اس کی بات پر یقین نہیں کر رہا تھا وہ مزور اپنا بھرم رکھ رہی تھی۔

" یوسف جمال ہر لڑکی کی شادی ہوتی ہے۔ میری بھی ہو رہی ہے اور تم نے اس سے پہلے کبھی یہ سوال بھی تو نہیں کیا تھا"

" کون ہے وہ؟" میں نے پھر پوچھا۔

" بہت امیر آدمی ہے" وہ مسکرا کر بولی۔

" کیا تمہاری اپنی پسند ہے" ہو سکتا ہے اور وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے سوچا یہ لڑکیاں جو مردوں کے جذبات سے کھیل کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ میں نے اسے خدا حافظ کہا۔ میں حیران تھا۔

اور پھر جب وہ دو مہینوں کے بعد مجھے میرے دفتر ملنے آئی تو اس کے بازو سونے کی چوڑیوں سے بھرے ہوئے تھے اور اس نے سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ اپنے میاں کی باتیں۔ شاید وہ مجھے یہ دکھانے آئی تھی کہ میں جس غلط فہمی میں مبتلا تھا وہ درست نہیں تھی۔ یا جس تلاش میں وہ تھی پوری ہو گئی ہے۔

اس نے کہا۔ میں تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ فرزندہ بارون کی ٹرانسفر یہاں ہو گئی ہے اور وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں نے اسے تمہارا فون نمبر دے دیا ہے کسی روز ملنے جانا۔

" ناہید بیگم۔ میں تمہارا دوست تھا اور تم نے مجھے شادی پہ بلایا نہیں" میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

" بات ٹالو نہیں۔ اگر اس کا فون نہ آئے تو خود کر لینا۔ تم اس کے دوستوں میں ایک کا اضافہ ہو جائے گا۔ اور تمہیں ایک خاندانی لڑکی سے شادی کے لیے موقع مل جائے گا" اس کی آواز میں ہلکا سا طنز تھا اور میں دل ہی دل میں اس کی مایوسی پر مسکرا رہا تھا۔

" کیا وہ میاں کی تلاش میں ہے" میں مذاق کرتے ہوئے بولا۔

"ہر عورت کو ایک شوہر کی تلاش ہوتی ہے یوسف جمال۔"

"اسے بھی ضرور ہوگی" اور وہ پرس جھلاتی باہر چل پڑی۔ میں اس کے پیچھے باہر نکل گیا وہ ایک بڑی سی کار میں بیٹھ رہی تھی اور ڈرائیور بڑے ادب سے دروازہ بند کر رہا تھا۔ جب اس نے ہاتھ ہلایا تو میں نے دیکھا کہ اس کی گردن فخر سے تنی ہوئی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔

"بھلا تم مجھے اتنی بڑی گاڑی دے سکتے تھے اور اتنا سونا۔" میں اسے جاتا دیکھتا رہا۔ ناہید بیگم نے کہیں نہ کہیں تو گھاٹے کا سودا کیا ہوگا۔ میں نے اپنی انا کو مجروح ہوتے دیکھ کر سوچا۔ اسے سب کچھ کس طرح مل سکتا ہے وہ تو عام صورت کی سام سی لڑکی تھی۔ میں ناہید مرزا کے سونا بھرے بازوؤں اور سرخ ساڑھی دیکھ کر نہ جانے کیوں اداس ہو گیا تھا حالانکہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لڑکی وہ نہیں تھی جو ایک مرد کے دل میں اتر جاتی ہے اور پھر وہاں بیٹھے ہمیشہ مسکرائے جاتی ہے اپنی جیت پر۔ دوسرے کی بے بسی پر۔ میں جانتا تھا کہ ناہید جیسی لڑکیاں تو شوہر کی تلاش میں ہوتی ہیں۔ شاید فیروزہ ہارون بھی ہو۔ میں نے اسی وقت فیروزہ ہارون کو فون کیا میں بہت اداس تھا۔ فیروزہ ہارون کے یہاں آکر مجھے نہ ملنے پر یا ناہید کے شادی کرنے پر۔ شاید اس وقت یہ دونوں دکھ گڈمڈ ہو رہے تھے۔

فیروزہ نے فون اٹھایا تھا۔ میں نے کہا۔ فیروزہ بیگم آپ نے یہاں آکر مجھے خبر بھی نہ کی۔ وہ زور سے ہنسی اور بولی

"جمال صاحب میرا آنا کوئی اتنی بڑی خبر تو نہیں تھی جو آپ کو ضرور دی جاتی۔ اب میں آگئی ہوں تو آپ ضرور مجھ سے ملنے آئیں اور آج ہی آئیں۔ شام کو میرے چند دوست آ رہے ہیں۔

"تو آپ نے مجھے اپنے دوستوں میں شامل کر لیا نا" میں خوش ہو کر بولا۔

"ارے وہ تو آپ کب سے ہیں" وہ پھر ہولے سے ہنسی۔

شام کو میں جب اس کی خالہ کے خوبصورت گھر میں داخل ہوا تو وہ سب لوگ باہر لان میں بیٹھے تھے۔ رنگین پھولوں کی بھینی بھینی باس تتلیوں کے سنگ اڑ رہی تھی۔ اس نے مجھے سب سے ملوایا اور پھر رات گئے تک ہم لوگ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ موجودہ دور کا ادب، سیاست۔ فیشن۔ باتیں۔ ایسی باتیں جو انسان کے دل کے سارے بوجھ کو کہیں دور پھینک دیتی ہیں۔ باوردی نوکر دبے قدموں آجا رہے تھے۔ خوبصورت برتن۔ خوشبودار قہوہ اور پھر ایسی کتنی ہی شامیں میں نے ان کے ہاں فیروزہ ہارون سے باتوں میں بتا دی تھیں۔ اس کے دوست رات گئے تک بیٹھے رہتے۔ قہقہے۔ مسکراہٹیں۔ وہ کبھی اکیلی ہی میری ساتھ چل پڑتی۔ کہتی "آؤ یوسف جمال میں صرف آج تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ سارے لوگوں میں بیٹھے انسان نہ ڈھنگ کی بات کر سکتا ہے اور نہ سوچ سکتا ہے" تب ہم دونوں کسی ہوٹل کے نسبتاً اندھیرے سے کونے میں بیٹھ جاتے وہ ہوتے ہوئے ان کتابوں کی باتیں کرنے لگتی جو اس نے پچھلے دنوں میں پڑھی ہوتیں۔ کرداروں پہ اپنی رائے دیتے ہوئے وہ ہمیشہ صحیح انداز سے دیکھتی اور میں جو اپنے علم کو اپنے لیے فخر بنائے ہوئے تھا صرف اس کی باتیں سننے لگتا۔ مجھے لگتا۔ میں اس سے زیادہ صحیح نہیں دے سکتا۔ میں اس کے لہجے کی خوبصورتی اور نگینہ لفظوں کے خوبصورت بہاؤ میں بہنے لگتا اور پھر میں انجانے میں خوفزدہ ہو جاتا وہ ذہنی طور پہ مجھ سے کہیں بہتر تھی۔

لیکن میں اس کی پڑائی کو مان کر بھی نہیں مان رہا تھا ۔ وہ تو محض ایک لڑکی تھی جس کو شرما کر میری طرف دیکھنا چاہیے تھا جیسے ان ملگجے اندھیروں میں بیٹھ کر محبت کی سرگوشیاں کرنی چاہئیں تھیں ۔ لیکن وہ بڑے اعتماد سے میرے ساتھ بیٹھی
۱ رہتی اور میں جو اپنی ذات سے گناہ کی حد تک آگاہ تھا ۔ آگے بڑھ کر اس کو چھونا چاہتا ۔ لیکن نہ جانے میری ہمت کو کیا ہوتا ۔ تب میں جھنجھلا جاتا اور کہتا ۔

فیروزہ بیگم تم صرف کتابوں میں کیوں الجھی رہتی ہو ۔ زندگی بھی تو مشاہدے کے لیے تمہارے سامنے بکھری پڑی ہے ۔ اسے دیکھو ۔ اسے برتو ۔ مردہ کردار ہی تو کردار نہیں ہوتے تم زندہ انسانوں کو اتنا غیر دلچسپ کیوں سمجھتی ہو مجھے دیکھو میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں کوئی میری بات کرو ۔ " میں مذاق کے انداز میں اپنا چھپا غصہ نکالتا ۔

وہ کہتی ۔ " یوسف جمال تم کوئی فارمولا تو نہیں ہو جسے حل کرنا پڑے گا ۔ تم میرے دوست ہو اور دوست ہونے کے ناطے میں اپنے اندر کی ساری باتیں تم سے کرتی ہوں ۔ کیا یہ ہم دونوں کے لیے بہت نہیں ۔ کافی نہیں ۔ تم مجھے بہت ہی عزیز اور اپنے سے لگتے ہو ۔

اور نہ جانے میں اسے کبھی نہ کہہ سکا کہ فیروزہ بیگم میں ایک مرد ہوں تم ایک عورت ۔ اور میں اس طرح نہیں سوچتا جس طرح تم سوچتی ہو ۔ کیونکہ میں اس کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا میں تو اس کے اندر چھپی ہوئی عورت کی کھوج میں تھا اور مجھے کامیاب ہونا تھا ۔

نہ جانے میری تلاش کب ختم ہوگی ۔ میں دل میں کہتا اس سے مل کر میں خوش رہتا تھا ۔ حالانکہ ایک محرومی کا احساس ہر وقت میرے لاشعور میں رینگتا رہتا جو ہوتے ہوتے دل میں ابھر آتا میں اداس ہو کر کسی پکچر ہاؤس میں گھس جاتا سگار میں سبٹ بڑھاتا ، بھرتا اور پھر یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھا بے معنی بحثوں میں الجھ پڑتا ۔

اور پھر میں نے لوگوں کو کہتے سنا کہ فیروزہ ہارون سمیع خواجہ سے شادی کر رہی ہے اور یہ کہ فیروزہ ہارون مردوں کے دل شکار کرتی ہے ۔

فیروزہ ہارون سمیع خواجہ سے شادی کر ہی نہیں سکتی ۔ اس کا بہترین ذہن طرزِ زندگی ۔ اس کا بہترین خاندان ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ میں نے اپنے مخاطب سے غصے ہو کر کہا تھا ۔

اس نے کہا ۔

" تم شاید عورت کو نہیں جانتے ۔ یہ سب اونچے خاندانوں کی لڑکیاں ایسے ہی ہوتی ہیں ۔ ان کو تلاش ہوتی ہے ایک بے وقوف مرد کی جو احساس کمتری میں لپٹا ہوا ان کی آزادی کو مان لے اور وہ من مانی کرتی پھریں سمیع خواجہ سے بہتر کون ملے گا اسے وہ مسکرایا ۔

میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک سا گیا تھا ۔ میں نے کیفے ٹیریا کے دھوئیں سے بھرے ماحول کو دیکھا ۔ دبا دبا شور ۔ سگریٹوں کا دھواں ۔ بے معنی باتیں ۔ میرے دوست نے بند آنکھ سے میری طرف ہنس کر دیکھا اور کہا ۔ ۔ ۔

میں نے تو سنا ہے تم بھی اُس کے عاشقوں میں سے ہو۔ لیکن شادی تو وہ سمیع خواجہ سے ہی کرے گی تم اس کی طرح بے وقوف نہیں ہوتا۔ اور وہ زوردار قہقہے لگانے لگا۔

میں اس کے ذلیل منہ پر زوردار تھپیڑ مارنا چاہتا تھا لیکن میں خاموش رہا اور بولا میں اُسے جانتا ہوں۔ افتخار ملک ستار زمان اور سمیع خواجہ وہ سب کی دوست ہے۔ بس دوست اس سے آگے وہ جا ہی نہیں سکتی۔ وہ عام عورت نہیں ہے۔ دیوی ہے لیکن پتھر کی۔

"تم دوسروں کے بارے میں یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔ وہ تیزی سے بولا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کیا تم سارا وقت اس کے ساتھ رہتے ہو؟"

"اس لیے کہ میں اُس کو سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔"

"بھلا عورت بھی کبھی کسی کی سمجھ میں آئی ہے۔ وہ قطعیت سے بولا اور وہ بھی فیروزہ ہارون جیسی جو صرف مردوں سے دوستی کرتی ہو۔ جو محفلوں میں بیٹھ کر چہرے پہ پوڈر لگاتی ہو اور انگریزی کے سوائے اور کسی زبان میں بات ہی نہ کر سکتی ہو۔ چھوڑو یار چھوڑو وہ بازاری انداز میں ہنسا اور اس سے پہلے کہ میں اُس کے منہ پر سچ مچ تھپڑ مار دیتا میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے نکل آیا۔

اگر ایسی باتیں کرنے کا حق کسی کو ہے تو وہ مجھے ہے۔ میں جو اس کا سب سے گہرا دوست ہوں میں نے جاتے جاتے اونچی آواز میں اپنے آپ سے کہا۔

کیا میں نے اس کے جسم تک کبھی رسائی پائی ہے۔ کیا وہ سارا وقت جو ہم نے اکٹھا گذارہ بہت کچھ بیت جانے کے لیے کافی نہیں تھا۔ لیکن فیروزہ ہارون کیا تھی۔ صرف ایک ہیولا جس کو پانے کی شدید خواہش میرے اندر بھی پیدا ہوئی لیکن وہ ہیولا میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اور سمیع خواجہ جو میرا دوست ہے۔ اگر میں فیروزہ ہارون تک نہیں پہنچ سکا ہوں تو وہ کیونکر اس تک پہنچ سکتا ہے۔ میں سمیع خواجہ کو جانتا ہوں میں فیروزہ کو جانتا ہوں۔ لیکن فیروزہ کیا چاہتی ہے وہ کیوں اپنے آپ [illegible] غافل ہے۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

فیروزہ ہارون جو اپنی بوڑھی ماں کی تندرستی کا انتظار کر [illegible] تھی جو اپنے بھائی کی امریکہ سے واپسی کی منتظر تھی۔ جو اپنی ساری جائیداد ہندوستان میں چھوڑ کر آ گئی تھی کہ اسے یہ [illegible] نا چاہیے تھا۔ اسی ملک سے اس کا مستقبل وابستہ تھا۔

ایک روز میں نے اس سے کہا تھا "فیروز بیگم اپنے گرد بڑھتے [illegible] ے اندھیرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے تم کو نسے خوابوں میں الجھی رہتی ہو" یہ بات کہ [illegible] ہوئے میں نے سوچا تھا وہ شرما کر میری طرف دیکھے گی اور پھر میں اس کی آنکھوں میں وہ سب کچھ دیکھ لوں گا [illegible] جو میں نے کہنا چاہتا تھا وہ سب باتیں سن لوں گا جو اُسے مجھ سے کہہ دینی چاہیے تھیں جن سننے کے لیے میں نہ جانے کب سے منتظر تھا۔

اس وقت میں اُس کے پاس اس کی چھوٹی سی لائبریری میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں اکیلے تھے۔

اس نے میری طرف دیکھا تو تھا لیکن اس کی آنکھیں میرے لیے کوئی پیغام نہیں دے رہی تھیں اور چاند اُس کی کھڑکی سے اندر جھانک کر اس کے خوبصورت چہرے کو اور بھی روشن کر رہا تھا۔ چاندنی میرے اندر جذبات کے دھارے کی مانند بہہ رہی تھی۔ میرے سارے جسم میں لہریں اُٹھ رہی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا جیسے فیروزہ ہارون موجودہ زمانے کی عورت نہ ہو بلکہ قرنوں پہلے کسی معبد میں رکھی ہوئی دیوی کی مورتی ہو جس کے جاگنے کے انتظار میں، میں صدیوں ہی۔ اُس کے آگے جھکا رہا ہوں۔ اگر وہ اپنی آنکھوں میں دوستی کی چمک کی بجائے ایک محبت کرنے والی عورت کی چمک لے آتی تو شاید آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیتا اور شاید آج وہ میرے گھر میں میرے ساتھ بیٹھی ہوتی۔ لیکن اس نے کہا تھا۔

دوست میرے پاس ان اندھیروں سے ڈرنے کا وقت ہی نہیں ہے دیکھتے تو ہو ماں ابھی تک بیمار ہے اور مشعل کی پڑھائی ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ نہ جانے ابھی اُسے کتنا وقت امریکہ میں لگے۔ مجھے اس کا انتظار کرنا ہی پڑے گا اور اس کے آنے کے بعد۔ لیکن یوسف جمال میں کیوں گھبراؤں۔ تم ہو۔ ستار ہے۔ افتخار ہے اور سمیع خواجہ تم سب کی موجودگی میرے اندر بھروسہ بن کر ابھرتی ہے" وہ دیوار میں لگے چھوٹے سے آئینے میں کھڑی اپنے بالوں کو برش کرنے لگی۔

آج میں یہاں بیٹھا سوچتا ہوں کہ اس نے شاید اپنی آنکھوں میں آئے آنسو روکے تھے اگر وہ اس وقت باقی لوگوں کے نام نہ لیتی تو میں آگے بڑھ کر اُس سچائی سے اُس کو آگاہ کر دیتا جو اس وقت میرے دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ لیکن میری انا ان سارے ناموں سے مجروح ہو گئی تھی اور میں نے سوچا تھا۔ فیروزہ ہارون کو خوش کرنے کی ذمہ داری صرف مجھ پر ہی تو عائد نہیں ہوتی۔ وہ مجھے دوسروں سے الگ اہمیت نہیں دیتی وہ جھکنا ہی نہیں جانتی یا وہ سوئی ہوئی ہے میں اُسے کیسے جگاؤں میں اُسے کہنا چاہتا تھا۔ فیروزہ بیگم جاگو۔ فیروزہ بیگم جاگو ایسا نہ ہو کہ میرے جذبات اور محبت کی باگ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔ لیکن میں نے اس سے اجازت لی اور بڑے بڑے لانوں کی خاموشی کو محسوس کرتا واپس چلا آیا تھا۔ غصے اور مایوسی سے بھرا۔ میں اس پر دوسروں کے جذبات سے کھیلنے کا الزام بھی تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ محبت کے کھیل کا اس کی دوستی میں کوئی مقام نہیں تھا وہ تو ہم سے ایسے ملتی تھی جیسے وہ بھی ایک مرد ہو۔ اس کا عورت ہونا تو ہم ہی نہیں بھولے تھے اور پھر میں نے اس کے ہاں جانا کم کر دیا۔ اصل میں، میں محبت کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔ میں اس کو اپنے سامنے جھکا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ پورے پانچ سال آکسفورڈ میں پڑھ کر آئی تھی اور پھر بھی محبت کے مادی رخ سے آگاہ نہیں لگتی تھی۔ اس کے اندر کا مشرقی پن خالص یہاں کا تحفہ تھا۔ اسے تو شراب پینی چاہیے تھی اور سگریٹ کے دھوئیں میں لپٹی وہ زور زور سے قہقہے لگاتی میرے بازوؤں میں جھول جاتی تو میں اپنی فتح پر سرشار ہو کر اس کو خوبصورت باتوں کے جال میں اُلجھا کر خوش ہوتا۔ لیکن وہ جو بظاہر اتنی بے ضرر لگتی تھی۔ مضبوطی سے اپنے اندر کی مشرقی عورت کی حفاظت کرتی تھی اور آج بھی میرے منہ میں اپنی شکست کا کڑوا مزا ابھرا ہوا ہے۔

ایک روز میں سیمی خواجہ کو زبردستی ایک ہوٹل میں لے گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا سیمی خواجہ لوگ کہتے ہیں فیروزہ بارون تم سے شادی کرنے والی ہے۔ لیکن تم تو کچھ کہتے ہی نہیں ہو۔ کچھ بولتے ہی نہیں ہو۔ سچ کیا ہے۔

اس نے اضطراری طور پر اپنی سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا اور لیمپ کے جالی دار شیڈ سے آتی روشنی کو دیکھتے ہوئے ہولے سے مسکرا دیا اور بولا۔

یوسف جمال زندگی کبھی اپنے اندر کی ساری خوشیاں کسی کے دامن میں نہیں ڈالتی اور میں تو سمجھتا ہوں میں اس خوشی کا حقدار نہیں جو فیروزہ بارون کی ذات سے وابستہ ہے۔ وہ دکھ سے بولا۔

سوچ کا یہ منفی انداز ہے سیمی خواجہ یا تم اپنے آپ کو ایسی اخلاقی ذمہ داری سے بچانا چاہتے ہو۔ میں اس کے اندر کے راز کی کھوج میں بولا۔

" میں سچ بولنا چاہتا ہوں۔ ایسا سچ جو صرف انسان اپنے اللہ کے سامنے ہی بول سکتا ہے یوسف جمال، کیونکہ دوسروں کے سامنے ایسا سچ مرد کے پندار کی تذلیل ہے۔ مرد ہمیشہ فاتح ہی رہنا چاہتا ہے وہ چاہے وقتی کھیل تاش کی بازی ہی کیوں نہ ہو" وہ میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے اور اس کی آنکھیں بوجھل سی تھیں۔

سیمی خواجہ میں تمہاری بات کو سمجھ نہیں سکا" میں نے ہولے ہولے اپنی انگلی سے میز پہ تال دیتے ہوئے پوچھا۔

" تم کیا سمجھنا چاہتے ہو۔ تم کونسا اعتراف سننا چاہتے ہو۔ یہی کہ میں اس عورت تک پہنچ نہیں سکا جس کی تلاش میں میرے جیسا مرد ہوتا ہے تمہارے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کر کے میں اس شرمندگی سے بچ جاؤں" جو اس اعتراف سے وابستہ ہے۔" وہ تیز تیز سگریٹ کے کش لینے لگا یوسف جمال تم بھی تو اسے جانتے ہو سمجھتے ہو۔

میں اور وہ دونوں اس ہوٹل میں خاموش بیٹھے رہے تھے۔ یادوں کا ریلا تھا۔ میرا دل میرے پہلو میں بڑے بڑے ڈوب رہا تھا جیسے کوئی بوند بوند خون میری رگوں سے نچوڑ رہا ہو۔ جیسے حیات کی ساری لذتیں میرے ہاتھ سے چھٹ گئی ہوں میں نے میاں سی مائل روشنی کو ٹھنڈی لہروں میں تبدیل ہوتے محسوس کیا تھا۔ میں فیروزہ بارون کو کب سے جانتا تھا۔

سیمی خواجہ دھوئیں کے مرغولے بناتا ہوا اس قدر تھکا ہوا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بڑی مسافت طے کر کے آیا ہو لیکن میرے پاس تو ایسی شکست کی یاد بھی نہیں تھی جس میں انسان ٹوٹ پھوٹ جائے میں نے تو ہمیشہ اپنے آپ کو بہت سنبھال کر رکھا ہے میں نے سیمی خواجہ سے کہا۔

" ہمارے لیے عورت کا وجود دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے اس کے بغیر ہمارے لیے عورت کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔"

" ہاں۔ کیونکہ ہر کسی اور سچائی کے قائل ہی نہیں ہوتے کیونکہ اور سچ بیوقوف۔ ہمارا پہنچ ہی نہیں ہوتی یوسف"

پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ یوسف جمال میری بات مانو، تم فیروزہ سے شادی کر لو۔ اُس کے لہجے میں شکست تھی۔

اور میں جانتا تھا کہ مجھ میں سمیع خواجہ کی سچائی نہیں ہے میں زیادہ خود پرست ہوں۔ میں عورت کے جھکے ہوئے وجود کو اٹھا تو سکتا ہوں لیکن اس کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ میں نے تو فیروزہ کو بھی ایک عورت ہی سمجھا تھا۔ ایسی عورت جو محبت میں اپنا آپ بھی نچھاور کر دیتی ہے میں نے سمیع خواجہ کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف نہیں کیا تھا میں نے کہا تھا۔

"فیروزہ ہارون کے اندر کی خود پرست عورت مجھے پسند نہیں آئی۔ شاید اس کے اندر کوئی عورت ہی نہیں"

یوسف جمال میں جانتا ہوں تم جھوٹ بول رہے ہو میں نے تمہارے چہرے پر کامیابی کی وہ روشنی کبھی نہیں دیکھی جو ایک مرد کے چہرے پر اس وقت ہوتی ہے جب وہ ایک عورت کا دل فتح کرتا ہے۔ اسے اپنے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے۔ وہ تیزی سے بولا۔ اس کے لہجے میں غصہ اور نفرت تھی۔

"تم دوسروں کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہو۔ تم دوسروں کو کیونکر جان سکتے ہو" میں احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

"یوسف جمال میں تم کو نہیں جانتا۔ میں فیروزہ ہارون کو جانتا ہوں اور مجھے اس بات کو کہتے ذرا بھی جھجک نہیں کہ میں نے اس کو اپنے سے بہت بلند پایا۔ ذہنی طور پر۔ اخلاقی طور پر یوسف جمال میں اس کی صلاحیتوں سے خوفزدہ ہوں میں اس کی برتری تک پہنچنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ میں اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ پھر آگے بڑھنے سے فائدہ" وہ بہت رنجیدہ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ ویرانی سی تھی۔

میں جانتا تھا سمیع خواجہ سچ بول رہا تھا۔ میں نے اکثر فیروزہ کو اپنی گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر سوچا تھا۔ یہ کمزور سی خوبصورت لڑکی بھی اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دے گی اور وہ سارے آنسو بہا دے گی جو زندگی کی ناہمواریوں نے اس کے اندر بھر رکھے ہیں۔ لیکن اس کا وجود کبھی بھی میرے ساتھ آ کر نہ لگا۔ اس کے سر کے بوجھ کے انتظار میں میرا کندھا بے چین سا ہوا تھا۔ درد کرنے لگتا۔ اور میں جانتا تھا یہ بوجھ کبھی کم نہ ہو گا۔

"یوسف جمال میں اپنی برتری کی شیخی نہیں مار سکتا۔ ابھی تو مجھے اپنے تنگ دل میں اور وسعت پیدا کرنی ہے تاکہ اس میں وہ سما سکے۔ مجھے صرف اسی بات پر فخر ہے کہ وہ میری دوست ہے۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے وہ۔ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور میں اپنے دل کے سامنے شرمندہ کھڑا تھا۔ یہی تو سب سے بڑا حادثہ ہے کہ میں اس سے بے غرض محبت نہیں کر سکا تھا۔ میں اپنی ذات کی نفی نہیں کر سکا تھا۔ میں سمیع نہیں تھا میں تو یوسف جمال تھا۔ خود پرست یوسف جمال۔ میں نے کہا تھا۔ فیروزہ ہارون اپنے خول سے باہر نہیں آتی۔ وہ چاہتی ہے کہ ہم اس کے آگے جھکیں۔

اور تم چاہتے ہو کہ وہ تم سے محبت کی بھیک مانگے تاکہ تمہارے پندار کی عمارت کچھ اور اونچی اٹھ جائے۔ وہ طنز بھرے لہجے میں بولا۔

"مرد ہونے کے ناطے اس میں ہی میری برتری ہے" میں نے جواب دیا۔

مرد ہونے کے ناطے تم یہ بھی تو کر سکتے ہو کہ آگے بڑھ کر اس کے اکیلے وجود کو سہارا دو" وہ بولا۔

"سمیع خواجہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ اسے میری ضرورت ہے اور پھر میں ہی تو اس کا دوست نہیں ہوں۔ دوسرے بھی تو ہیں کیا حرج وہ ان میں سے کسی سے شادی کرے۔" میں نہ جانے کیوں تلخ ہو رہا تھا اور کمینگی سے اس کے عظمت کے بت کو پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ میری شکست کی تلخی میرے اندر اکٹھی ہو رہی تھی۔

"یوسف جمال اس وقت تمہاری باتیں سن کر میں جان گیا ہوں کہ تم ہم سب سے زیادہ اس کے قابل نہیں ہو۔ کیونکہ تمہارے اندر کا مرد زیادہ کمینہ اور خود غرض ہے۔ تم صرف عورت کو شکستہ دیکھ کر مسکرانا چاہتے ہو لیکن یاد رکھو فیروزہ تمہیں اس ہنسی کا موقعہ کبھی نہیں دے گی۔ میں بھی یہ بات جانتا ہوں اور تم بھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نیچے اتر گیا۔

اور میں یادوں میں گھرا وہاں اکیلا بیٹھا رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے ٹوٹے پندار کی کرچیاں میرے سارے وجود میں چبھ رہی ہوں۔ میں نے فیروزہ ہارون کو جو ایک خوبصورت جذبے کی مانند روشن اور اجلی تھی اپنی انا کی بھینٹ چڑھانا چاہا تھا۔

میں نے صرف اپنے اندر جھانکا تھا۔ میں نے اس کے اندر جھانکنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی دیر بعد جب میں ہوٹل سے باہر نکلا تو خزاں کے آخری دنوں کا زرد سورج سامنے کی بڑی عمارت کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ نیون سائن کی روشنیاں اداس مٹے دن میں بجھی بجھی اور غمگین لگ رہی تھیں۔ میرے دل کی طرح۔

اس روز میں بہت دنوں بعد اس کے ہاں گیا تھا۔ اس کی اماں بی بیمار تھیں۔ میں ہمیشہ کی طرح رات گئے تک وہاں بیٹھا رہا وہ اپنی خالہ کے گھر میں ہی رہ رہی تھی ہم دونوں بڑے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

اس نے کہا تھا۔

یوسف جمال یہ خیال ہی کر کتنا سکھ دیتا ہے کہ تم میرے دوست ہو۔ میں زندگی کی ہر بات میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں میرے چہرے پر جما دی تھیں۔

اور میں سوچ رہا تھا۔ شاید اس کے پہلو میں ایسا دل ہے جو بات کو جذبات کو سمجھتا ہی نہیں یا وہ کچھ سمجھتی کیوں نہیں۔

"میں بھی اس کو جھکا کر رہوں گا۔" میں نے اس کے اطمینان بھرے انداز کو دیکھ کر دل میں عہد کر لیا تھا۔

میں نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے جھک کر ہیٹر کو اور تیز کرتے ہوئے اپنے ہاتھ ان شعلوں کی تپش کے پاس بڑھا دیئے۔ پہلے دنوں کا چاند ایک سفید بادل کے پیچھے سے آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا اور باہر سفیدی مائل سبز گھاس پر اوس کے موتی آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ جیسے میرے دل میں فیروزہ کی چاہت۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔ "فیروزہ بیگم میں کوئی اتنا نیک آدمی نہیں ہوں کہ تم مجھ پر مکمل بھروسہ کر سکو۔ میں تمہارے سامنے اپنے آپ کو نہ جانے کیوں اتنا بے بس پاتا ہوں اور مجھے لگتا ہے اگر میں نے تمہیں چھوا تو میلی ہو جاؤ گے۔" اور میں اس کمرے سے نکل آیا۔ اس گھر سے نکل آیا۔ اکیلی اور سنسان سڑکوں پر روشنیوں کے نیچے گہری دھند تھی اور جہاں سے ہوتے چلتی ہوا میں سڑک کے کناروں کی مٹی بگولوں کی صورت میں اٹھتی اور تھوڑی دور جا کر تھم جاتی کوئی آوارہ کتا بھونکتا اور چپ

ہوجاتا۔ کس قدر ویرانی ہے۔ کتنی ویرانی ہے دل میں اس ویرانی کو محسوس کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ہو سکتا ہے وہ اس ویرانی میں اس وقت بڑے سے ڈرائنگ روم میں تنہا سگرٹ پیتی ہو یا سوچ رہی ہو اور ہو سکتا ہے آنے والے برس بھی اس کو یاد دلاتے رہیں۔ ایسی جو دل کو غم سے بھر دیتی ہیں۔ ایسی یادیں جو صرف غمزدہ کرنا ہی جانتی ہیں رفضول سوچیں ہوا کے ساتھ اڑ رہی تھیں۔ میرے دل میں گھس رہی تھیں۔ میرے ذہن میں گھس رہی تھیں اور میں ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ ان یادوں سے چھٹکارا پانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ میں شادی کر لوں اور پھر میں نے سچ مچ شادی کر لی۔ ایسی لڑکی کے ساتھ جو فیروزہ کی مانند ذہین نہیں تھی جو ادب سے شغف تک نہیں رکھتی جو شاعری کے بارے میں فلمی گیتوں تک جانتی تھی جو برسوں کانونٹ میں نہیں رہی تھی لیکن پھر بھی وہ آزادی پسند تھی مرد کو لبھانا جانتی تھی اسے اپنی کشش کا احساس تھا۔

شادی کے بعد وقتی طور پر میں فیروزہ بارون کو بھول گیا تھا۔ اس کا ذہن، اس کا وجود۔ اس کی پاکیزگی سب گزری باتیں لگ رہی تھیں جن کو میں خواب میں ہی جانتا تھا۔ ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ میری بیوی ایسی لڑکی تھی جو ظاہر کے حسن میں ہزاروں سے بڑھ کر تھی لیکن ذہن۔ اس روز میں لائبریری میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس نے میری لائبریری کو دیکھ کر کہا تھا "یوسف جی اتنی بڑی بڑی کتابیں بھلا آپ کیونکر پڑھتے ہوں گے۔ ان کو دیکھ کر ہی میرا دل گھبرا رہا ہے۔ اللہ۔ کوئی انسان تو ان کو اٹھا بھی مشکل سے سکتا ہے اور وہ معصومیت سے ان کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

میں روکنگ چیئر پر بیٹھا ایک مشہور ناول پڑھ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف حیران ہو کر دیکھا تھا اور پھر فیروزہ میرے لاشعور سے نکل کر میرے شعور پر پوری شدت سے قابض ہو گئی تھی اور مجھے اپنی بیوی اجنبی اور دور رہتی ہوئی لگی تھی۔

ذہن اور جسم۔ کیا ایک خوبصورت جسم کو خوبصورت ذہن کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اگر نہیں تو فیروزہ بارون اس بات سے مستثنیٰ کیوں تھی۔ اس کا خوبصورت بالوں والا سر۔ اس کی ذہین چمکتی آنکھیں۔ میں جانتا تھا میں نے کتنے قیمتی جذبے کو اپنے دل سے دھکیل کر باہر نکالنا چاہا تھا لیکن وہ پھر بھی میرے خیالوں میں در آئی تھی اور میں بے بس تھا۔

میں نے اپنی بیوی کو پاس بیٹھا کر کہا تھا۔ جہاں آرا ایک بہت خوبصورت لڑکی میری دوست تھی لیکن وہ صرف خوبصورت ہی نہیں تھی بلکہ ذہین بھی تھی۔ وہ ان کتابوں سے بھی بڑی بڑی کتابیں پڑھ چکی تھی۔ وہ تمہاری طرح کتابوں سے خوفزدہ نہیں تھی۔ جہاں آرا نے اس کا ذکر سن کر ایک لمحہ کو سوچا اور کہا تھا کون تھی وہ، کہاں رہتی ہے میں اس سے ضرور ملوں گی۔ یوسف جی آپ کی ہر چیز ہی مجھے عزیز اور پیاری لگتی ہے۔ آپ کی دوستیں بھی اور اس کے چہرے پر ملکوتی سی ہنسی چھا گئی تھی اور میں نے دل میں کہا تھا۔

فیروزہ بارون کے بدلے جہاں آرا کو ساتھی بنا کر میں نے کچھ زیادہ نقصان تو نہیں اٹھایا۔ یہ خوبصورت عورت حقیقتوں اور سچائیوں کا مقابلہ کھلے دل سے کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور فیروزہ بارون جو زندگی کی تلخیوں پر ایک غیر نظری پردہ ڈال کر خوش رہنا چاہتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد کا اتنا واضح اجالا تو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا

ایسا اُجالا جو پاتو معصومیت کے بطن سے پیدا ہوتا ہے بالکل استغنا سے۔ تو کیا فیروزہ ہارون نے اپنی ذات کے گرد ایک ایسا ان دیکھا حصار بنا رکھا ہے ایسا حصار جو ہوتا ہوتے پر بھی کبھی نظر نہیں آتا۔ اس رات میں نے مہینوں بعد فیروزہ ہارون کو فون کیا تھا اس نے میرا نام سن کر کہا تھا۔

کتنا اچھا ہو جو تم کل شام اپنی مسز کے ساتھ چائے پیئو۔ ضرور آنا۔ اماں بی کبھی کبھار تمہارا ذکر کرتی ہیں تو مجھے لگتا ہے جیسے انہیں تمہارے نہ آنے کا ملال ہے۔ اور پھر اس نے فون رکھ دیا تھا۔

میرا دل کیوں رنجیدہ تھا۔ کیوں میں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ شاید اس سے دوستی بھی میری انا کا سوال بن گیا تھا۔

دوسری شام میں اور جہاں آرا اس کے گھر گئے تھے۔ بام کے بڑے بڑے پودوں سے اداسی جھلک رہی تھی اور ڈرائنگ روم کے ہلکے اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے مجھے نہ جانے کیوں فیروزہ پر ایکدم رحم آ گیا تھا۔ فیروزہ ہارون اور جہاں آرا باتیں کر رہی تھیں اور میں اماں بی کے پاس خالی ذہن بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کی شفقت اور محبت میں ڈوبی باتیں۔ جن میں فیروزہ کے مستقبل کا فکر بھی شامل تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔

"یوسف میاں تمہاری دلہن تو حور کی طرح پاکیزہ اور خوبصورت لگتی ہے۔ اور میں جانتی ہوں جب ایک لڑکی جی سے اپنے میاں کو قبول کرے تو اس کے چہرے پر ایسا ہی اُجالا چھا جاتا ہے اور پھر وہ فیروزہ کو دیکھنے لگی تھیں اور ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ انہوں نے اپنا منہ آہستہ سے دوسری طرف پھیر لیا تھا اور پان لگانے لگی تھیں میں نے ان کی طرف نہیں دیکھا تھا فیروزہ کے لیے میرے دل میں اور بھی دکھ بھر گیا تھا۔ جہاں آرا نے آواز دے کر مجھے بلایا۔

"یوسف جی دیکھیں تو کیسے خوبصورت لوگ ہیں۔ جہاں اس نے بڑے سے البم کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ فیروزہ کے خاندان کی تصویریں۔ انگریز لارڈز۔ خوبصورت طرحدار، رایوں کی شان والی فیروزہ کے خاندان کی عورتیں، خاندانی گروپ فوٹو۔ فیروزہ کے بچپن کی تصویریں وہ یادوں کا ایک میلہ تھا اور فیروزہ ہارون ان یادوں کے مزار پر آخری دیا جلائے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا کیا وہ اپنے دوستوں میں سے کسی کے ساتھ خوش رہ سکتی تھی۔ ہم تو اس کے بڑے پن سے اندر سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے جہاں آرا نے اُس کی ایک تصویر دیکھ کر کہا تھا۔ "فیروزہ جی آپ تو شہزادیوں کی طرح باوقار اور خوبصورت ہیں اور میں خوش ہوں کہ آپ یوسف جی کی دوست ہیں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ ہیں نا یہ خوبصورت یوسف جی۔ جہاں آرا نے ایکدفعہ پھر البم میری گود میں رکھ دیا۔ میں صرف مسکرا دیا تھا اور فیروزہ ہارون اپنے چہرے پر چھائے غمگین تاثر کو اپنی مسکراہٹ میں دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے کہا تھا۔

جہاں آرا ہم کو ان پر فخر ہے۔ ایسے ذہن بہت کم پیدا ہوتے ہیں اور پھر میں چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ فیروزہ اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑی ہمیں جاتا دیکھتی رہی۔ اداس اور اکیلی۔ اور مجھے لگا تھا جیسے وہ کوئی زندہ ہستی نہ ہو بلکہ البم میں لگی ایک تصویر ہو۔ جو صرف گزری یاد تو بن سکتی ہے لیکن زندگی کا ایک حصہ نہیں بن سکتی۔ جہاں اس کے

بالوں کو بکھیر رہی تھی اور جہاں آرا بیگم نے گھر آکر کہا تھا۔ یوسف جی ایسی لڑکی کے لیے تو کوئی بہت ہی اعلیٰ خاندانی لڑکا ہی مناسب رہے گا۔ اس کے چہرے پہ اتنی اداسی تھی۔ اتنا اکیلا پن تھا کہ میرا من بھی اداس ہو رہا تھا۔ اسے شادی کر لینی چاہیے۔" اور جہاں آرا ڈریسنگ روم میں چلی گئی تھی۔

کمرے کے درمیان کھڑا میں ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو خالی ذہن پا رہا تھا۔ محرومی کا احساس کچھ کھو دینے کا احساس۔ جہاں آرا کی چاہت کے باوجود بھی۔ اس کے حسن کے باوجود بھی۔

سگریٹ کا دھواں میری آنکھوں کے سامنے چھا گیا تھا۔ ٹھنڈ کا عجیب سا احساس میرے اندر داخل ہو رہا تھا اور میں سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

اس کھونے کے احساس کو اجاگر کرنے کے لیے ایک دن سمیع خواجہ میرے پاس آیا تھا اس نے کہا تھا۔

یوسف جمال تم اس کے سب سے زیادہ دوست تھے اور تم نے بھی اس کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ جانتے ہو فرزانہ نے ہندوستان واپس جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہ کوئی خاص وجہ تو نہیں بتاتی لیکن کہتی ہے۔

"مجھے اپنی جائیداد کا خیال رکھنے کے لیے واپس چلے جانا چاہیے۔ یوسف جمال وہ واپس کیوں جانا چاہتی ہے وہ سب چیزیں چھوڑ کر یہاں آئی تھی۔ لیکن اب ایسی کونسی بات ہے جو اسے جانے کے لیے مجبور کر رہی ہے۔ سمیع خواجہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

" اس کی اپنی مجبوریاں ہوں گی۔" میں نے غیر جذباتی انداز میں جواب دیا۔ حالانکہ میرا دل اب بھی پرانی چاہت سے دھڑک رہا تھا۔

کوئی مجبوری نہیں یوسف جمال۔ کوئی مجبوری نہیں۔ میں جانتا ہوں وہ یہاں زیادہ دکھی اور اکیلا محسوس کرتی ہے کیونکہ اس کا کوئی مستقبل نہیں وہ اپنے ماضی سے تعلق تو رکھتی ہے لیکن اتنا شدید نہیں۔ وہ باشعور ہے وہ بدلتے حالات کا احساس رکھتی ہے۔ لیکن ہم اس کو ایک بہتر مستقبل کی ضمانت نہیں دے سکے۔ وہ ایک لڑکی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جو دوسری لڑکیوں کی مانند خواب دیکھتی ہے۔ ایک گھر کا ایک شوہر کا اور تم جانتا ہے ہم سب دھوکا باز ہیں۔ فراڈ ہیں کمینے ہیں۔ احساس کمتری کا شکار ہیں۔ ہم سب اپنے احساس کمتری کو چھپانے کے لیے اس سے دوستی رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اٹھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

" اور یوسف جمال تم ہم سب سے زیادہ کمینے ہو"

" سمیع خواجہ میں حقیقتوں سے آنکھیں نہیں چرا سکتا"۔ میں بولا۔

کونسی حقیقتیں یوسف جمال۔ تم اس کی اونچائی کو مان نہ سکے۔ تم اس کے اندر چھپی عورت کو مان نہ سکے صرف تم جسم کو مانتے ہو۔ گندگی کو مانتے ہو۔ وہ اور بھی تیزی سے بولا۔

" سمیع خواجہ تم ناحق جذباتی ہو رہے ہو" میں طنزیہ ہنسی ہنس کر بولا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ صرف گذری یادیں ہیں۔ جن پر وہ دربار لگا کر بیٹھی ہوئی ہے۔ ایسا غرور ہے جس کو ماننے والا اب کوئی نہیں ہے

واپس جانا ہی تھا۔

"کیا تم اور بھی کچھ کہنا چاہتے ہو۔" وہ ہونٹوں سے ہنس کر دکھ سے بولا۔

"اس کے بارے میں کوئی اور بات کیا ہو سکتی ہے۔" سمیع خواجہ"

ہاں کیوں کہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح کہانیاں بنانے میں یقین نہیں رکھتی۔ وہ دوسروں کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں نہیں پھانستی اس کے اندر کی شریف عورت جو اتنا عرصہ باہر رہ کر بھی نہیں بدلی یہاں آکر کیسے بدل جاتی اور یہی اس کی شکست ہے۔ یہی تمہاری شکست ہے۔"

"تم خود کیوں نہیں روکتے اُسے۔" میں نے اس سے پوچھا۔

یوسف جمال میرے پاس اُسے دینے کے لیے کچھ بھی تو نہیں۔ میں اسے کس بھروسے پہ روکوں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ وہ کنگ کی مانند بے بس لگ رہا تھا۔

"ہم میں سے کوئی بھی تو اس کے قابل نہیں تھا۔ میں اعتراف نہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی اپنے آپ کو کہتے پایا۔

سمیع خواجہ میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا تھا۔ ہم دونوں نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میرے پاس کہنے کو تھا بھی کیا۔ پھر میں اور سمیع خواجہ اس کے گھر گئے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا تھا "فیروزہ بیگم کیا پاکستان میں تمہارے لیے کچھ باقی نہیں رہا جو تم واپس جا رہی ہو۔"

اس نے بے چینی سے اپنے بالوں کو کھینچتے ہوئے ہوئے سے کہا تھا۔

"میری زندگی کے خوبصورت دن یہیں تو گذرے ہیں۔ لیکن اب مجھے جانا ہے۔ ان یادوں کے سہارے پیر کبھی تہی دامن نہیں ہو سکتی۔"

میں نے کہنا چاہا تھا۔ زندگی بھر کے لیے یادیں ہی کافی نہیں ہوتیں فیروزہ بیگم لیکن میں خاموش بیٹھا رہا تھا۔ سمیع خواجہ اس کی طرف دیکھتا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیتا۔ وہ پریشان تھا۔ اور میں اس وقت بھی فیروزہ ہارون کو معاف نہیں کر سکا تھا۔ کیونکہ وہ میری فتح کا باب نہیں بن سکی تھی اور اس کے سامنے بیٹھ کر میں اپنے آپ کو شکست خ محسوس کر رہا تھا۔ حقیر اور چھوٹا۔ جو میں کسی طور محسوس کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

فیروزہ بیگم اگر تم اپنے وجود کے خزانے کی اتنی حفاظت نہ کرتیں تو شاید اتنی مایوس نہ ہوتیں۔ میں نے اپنی محرومی کا سوچتے ہوئے دل میں کہا۔ تم صرف ایک عورت ہوتیں اور صرف مرد کی تلاش کرتیں۔ سمیع خواجہ بالکل ایک لفظ بولے بغیر وہاں بیٹھا رہا اور فیروزہ ہارون کے چہرے پر ایک سایہ لہرا رہا تھا۔ لیکن وہ دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھی۔ ایسی باتیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ جن کو کوئی مطلب نہیں دیا جا سکتا اور شام بیتی جا رہی تھی

جہاں آرا اور میں اکثر فیروزہ کے ہاں چلے جاتے فیروزہ کے ساتھ پیکنگ کرواتے ہوئے جہاں آرا اکثر

اداس ہو جاتی اور میں اکثر خیالوں میں کھو جاتا۔

ایک روز جہاں آرا نے کہا تھا۔ یوسف جی کیا آپ کو اپنی دوست کے چلے جانے کا دکھ ہے اور میں جو اسے ایک عام عقل کی لڑکی سمجھ رہا تھا حیران ہو گیا تھا۔

"جہاں آرا میں اس کے جانے سے اداس نہیں ہوں۔ میں تو سوچتا ہوں۔ کتنا اچھا ہوتا جو کوئی اچھا سا لڑکا اس کا سہارا بن سکتا۔

ہاں یوسف جی میں جانتی ہوں وہ اتنی ناکام کیوں رہی ہے۔ اگر کوئی اور زمانہ ہوتا تو وہ اپنے گھر کی چاردیواری میں اپنے بچوں اور شوہر کے درمیان ہی گذار دیتی اور خوش رہتی۔ لیکن یہ اس کا قصور نہیں۔ وہ شاید غلط وقت میں یا غلط خاندان میں پیدا ہوئی ہے۔ یوسف جی آپ بھی تو اس سے شادی کر سکتے تھے۔" وہ میرے پاس آکر اچانک ہی بولی۔

"میں۔ میں۔" میں بوکھلا کر بولا "میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا جہاں آرا کیونکہ وہ ایک اچھی بیوی ثابت نہ ہوتی کوئی شوہر اتنی آزادی پسند نہیں کرتا۔"

"نہیں یوسف جی آپ ضرور اس کے ذہن سے ڈر گئے ہوں گے۔ یوسف جی اگر میں آج سے پہلے آپ دونوں کو جانتی تو میں آپ دونوں کی ضرور شادی کروا دیتی۔" وہ کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولی۔

ائیرپورٹ پر اُسے خدا حافظ کہنے اس کے دوست، رشتہ دار اور اس کے کالج کی پروفیسر آئی ہوئی تھیں وہ اداسی سے سب کے درمیان کھڑی تھی اور میں جو پچھلے چند دنوں سے اس کا ہاتھ بٹانے کے بہانے اس کے نزدیک رہا تھا، چاہتا تھا کہ وہ جب بھی یادوں میں کھوئے تو میری ذات کی چکا چوند اُسے سب کچھ بھلا دے اور جب اس کا جہاز نیلے آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گیا تو میں اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ وہ رعب جو اپنے میں مس فیروزہ ہارون کو سمیٹے گم ہو گیا تھا۔

"اور اب فیروزہ بیگم مجھے نظر نہیں آئے گی" میں نے واپس مڑتے ہوئے جہاں آرا بیگم کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا تھا۔ میں اچانک ہی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میں اپنی سوچوں سے ڈر رہا تھا۔ میرا دل نہ جانے خالی خالی کیوں ہو گیا تھا اور اس خالی پن کا احساس آج تک میرا تعاقب کرتا ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ برسوں ہی تو گذر گئے۔

میں اس احساس سے تب بھی چھٹکارا نہیں پا سکا تھا جب اچانک ہی مجھے اپنے ماموں کو ملنے ہندوستان جانا پڑا تھا۔ تب میں فیروزہ ہارون کو بھی ملنے گیا تھا۔

اجنبی گلیوں اور غیر مانوس راستوں سے ہوتا ہوا جب میں اس کے گھر گیا تھا تو میرا دل اسی جذبے سے دھڑکا تھا جو میں نے برسوں پہلے اس کے لیے محسوس کیا تھا۔ بڑے سے لان میں آملں کے بوڑھے درخت پھل سے جھکے ہوئے کھڑے تھے کوئل کی کوک اس خاموش فضا کو ایک سنگیت سے بھر رہی تھی۔ دکھ کا گیت۔ انتظار کا نوحہ۔ میں نے بوجھل دل کے ساتھ فیروزہ ہارون کی طرف دیکھا جو اپنی نیم روشن لائبریری میں میرے سامنے کھڑی تھی۔

میرا وجود کانپنے لگا تھا۔ اس نے نظر کی عینک کو درست کرتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے سر کے بال آدھے سفید ہو گئے تھے۔

ہم دونوں خاموش بیٹھے گذرے وقت کی چاپ سن رہے تھے۔

میں نے پوچھا تھا۔

"فیروزہ بیگم زندگی کیسے گذر رہی ہے۔ تو وہ ہمیشہ کی طرح ہوئے سے ہنس دی تھی۔

"یوسف جمال وقت کس کا انتظار نہیں کرتا۔ گذرتا ہی جا رہا ہے۔" اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیں سی تھی۔

"کیا کرتی رہتی ہو فیروزہ بیگم" میں وہاں کمرے میں چھائی خاموشی سے گھبرا کر پھر بولا۔ مجھے لگ رہا تھا۔ جیسے میرا دل میرے پہلو سے باہر نکل آئے گا۔ میں اٹھ کر کتابوں کی ایک بڑی سی الماری کے پاس کھڑا ہو گیا۔ پڑھاتی ہوں اور کیا کروں گی۔ چند دن ہوئے سمیع خواجہ کا خط لندن سے آیا تھا۔ میں خوش ہوں کہ میرے سارے دوست ترقی کر رہے ہیں" وہ ہولے سے بولی۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اور کیا بات کروں۔ یادوں سے بوجھل دل زبان کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ میں نے اماں بیگم کے بارے میں پوچھا تو وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔

یوسف جمال اماں بی تو اب نہیں ہیں۔ چار سال ہو گئے ہیں" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے چہرے پر ویرانی چھا گئی تھی۔

"تو فیروزہ بیگم اب تم اکیلی ہو؟" میں رنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"نہیں میں اکیلی کب ہوں۔ یادوں کا میلہ میرے ساتھ ہے یوسف جمال اور پھر یہ تو میرا اپنا وطن ہے۔ وطن میں بھی بھلا کوئی اجنبی ہوا ہے۔ اس کی ہنسی بڑی مضمحل سی تھی۔

میں نے جہاں آرا کا بھیجا ہوا چھوٹا سا پیکیٹ اُسے دیا تو اس نے کھولے بغیر اسے اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور کہا تھا۔

"یوسف جمال کیا جہاں آرا بیگم ویسی ہی من موہنی ہے؟"

"فیروزہ بیگم وقت کسی کو نہیں بخشتا" میں اُٹھتے ہوئے بولا۔

اور جب میں اس کو خدا حافظ کہہ کر آیا تھا تو وہ اپنے بڑے سے گیٹ کے پاس روشنی کی زد میں کھڑی تھی اور جاتے جاتے جب میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ابھی تک وہیں کھڑی ایک سایہ لگ رہی تھی جو واضح نہ ہو۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہ دیتا تھا۔ دور کسی مندر کی گھنٹیاں ہوئے ہوئے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

فیروزہ بیگم صرف یادوں کے مقبرے تعمیر کرنے سے زندگی کی خوشیاں نہیں ملتیں۔ صرف دیئے جلا کر روشنیاں

روح میں نہیں اتر سکیں۔

تم نہ جانے کس بات کا انتظار کرتی رہ گئیں"۔ میں دکھی ہو رہا تھا۔ ان لمحوں کے لیے جو بیت گئے۔ اس محبت کے لیے جو میرے اندر جاگ اٹھی تھی۔ شاید میں اب بھی صرف اس سے ہی محبت کرتا تھا۔ صرف اُسی سے۔

OO

صلہ

انور خواجہ

چوٹی پر چڑھ کر فضلو نے پلٹ کر دیکھا بٹ واسی کا چیڑ کا جنگل تینوں طرف پھیلا ہوا تھا۔ درخت ایسے گھنے اور ان کی شاخیں ایک دوسرے میں ایسی پیوست تھیں کہ دور سے یوں لگتا تھا کہ جیسے ترائیوں اور چوٹیوں کو کسی نے سبز رنگ سے رنگ دیا ہو۔ اس نے چوٹی کی دوسری طرف دیکھا، نیچے نیچے لمبی لمبی سبز گھاس میں جابیاں فارم کی ولایتی بڑے بڑے بالوں والی بھیڑیں چر رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اگر آئندہ سال اس کی مالی حالت درست ہوئی تو وہ ضرور ولایتی بھیڑوں کے دو جوڑے خریدے گا اور ان کی نسل کشی کرے گا۔ ان سے اُون زیادہ اترتی ہے۔ اور اس کا معیار بھی اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس نے اپنے کندھے پر رکھی گٹھڑی کو نیچے رکھا، جس میں خودرو ٹینگ تھے جو ایک ترائی میں چھپے ہوئے درخت سے توڑ کر لایا تھا۔ وہ وہاں پر کھنگلے جمع کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اس درخت پر پڑ گئی۔ گول گول سرخ ٹینگوں سے درخت کی ٹہنیاں لدی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی بوری میں تھوڑے سے کھنگلے ڈالے اور باقی بوری ٹینگوں سے بھری۔ اُسے معلوم تھا کہ سکینہ ٹینگ دیکھ کر بے حد خوش ہوگی۔ اُسے مختلف پھلوں کا مربہ ڈالنے کا بے حد شوق تھا۔ گڑھی میں اس کے چچا کی پنساری کی دکان تھی جس سے اکثر وہ مربہ کے مرتبان بھر کر لایا کرتی۔ اچار تو وہ خود بہت اچھا بناتی تھی اور جب زیادہ تیار ہو جاتا تو اپنے چچا کے پاس اچھے داموں بیچ کر آتی۔ پھر آج کل اُن کے گھر میں چینی بھی موجود تھی جو وہ چند دن پہلے جنگلی شہد مانسہرہ میں بیچ کر لایا تھا۔

ٹینگوں والی بوری اٹھا کر وہ پتلی سی پگڈنڈی سے آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔ جب وہ ایک بڑی چٹان کے پاس آیا تو اچانک ایک کالی سی چیز اس کے ساتھ زور سے ٹکرائی۔ بدبو کا ایک بھبکا اُٹھا اور وہ لڑھک کر نیچے ایک خاردار جھاڑی میں پھنس گیا۔ اس کے سارے بدن میں کانٹے چبھ گئے۔ جب اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مارے خوف کے اس کا دم نکل گیا۔ ایک سات فٹ اونچا عظیم الجثہ کالا بھجنگ ریچھ اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑا اس کی بے بسی پر کھڑا اس کی ہئیت کذائی کو دیکھ کر گویا قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ شاید دوسرے راستے سے آیا یا چٹان کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اس لیے فضلو کو نظر نہیں آیا۔ ورنہ فضلو اوپر سے آتے ہوئے اسے ضرور دیکھ لیتا۔

ریچھ نے جھک کر بوری سے دو ٹینگ نکالے اور اپنے بڑے لمبے دانتوں والے منہ میں ڈال کر کچر کچر کھانے لگا۔ فضلو کو بے حد غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس گوشت کی چٹان کو اٹھا کر پہاڑ سے لڑھکا دے۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ وہ کمینہ ریچھ اُس کی دن بھر کی محنت کو کس طرح ضائع کر رہا تھا۔ جو ٹینگ اسے مزا نہ دیتے، انہیں فوراً تھوک دیتا اور بوری

سے دوسرا بھٹہ نکال لیتا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے فضلو کی طرف دیکھ لیتا اور اپنا منہ کھول کر آوازیں نکالتا، جیسے قہقہے لگا رہا ہو۔ اس نے اپنے کپڑوں کو کانٹے دار جھاڑیوں سے چھڑایا اور جب دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تو اس نے دیکھا کہ ریچھ اب آدمیوں کی طرح چٹان کے ساتھ اپنی پیٹھ ٹیک کر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے بوری کو کھینچ کر اپنی رانوں پر رکھ لیا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ بھٹہ نکالتا ذرا سا ان کو دانتوں سے کترتا اور پھر انہیں نیچے کی طرف پھینک دیتا۔ وہ کھانے سے زیادہ ضائع کر رہا تھا۔ فضلو کو جانوروں کی یہ عادت بے حد ناپسند تھی۔ وہ کھاتے کم ہیں اور چیزیں تباہ زیادہ کرتے ہیں۔

جب اس نے غور سے دیکھا تو اسے ریچھ کی چھاتی پر سفید نشان نظر آیا، اسے یاد آیا کہ یہ ریچھ تو اس کا دشمن ہے۔ پچھلے سال اس نے فضلو کا مکئی کا کھیت تباہ کر دیا تھا۔ لیکن وہ حیران تھا کہ اس سال وہ سردی کا موسم شروع ہونے سے پہلے کیوں پہاڑوں سے اتر آیا تھا۔

فضلو کے باپ کرم داد نے اس علاقے کے خان سے پہاڑ کا ایک حصہ اجارے پر لیا تھا۔ جس کے بعد دونوں باپ بیٹے نے پہاڑوں کے سینے کھود کر کھیت بنائے، وہ کھیت اوپر تلے واقع تھے اور دور سے دیکھو تو پہاڑ بھی زینوں کی طرح نظر آتے تھے، ان میں مکئی کی فصل بے حد اچھی ہوتی تھی۔ پچھلے سال فضلو گدھوں پر لاد کر مانسہرہ سے مصنوعی کھاد لایا تھا تو فصل اور بھی اچھی ہوئی۔ مکئی کے پودے آٹھ آٹھ فٹ اونچے ہو گئے اور ایک پودے کے ساتھ کئی کئی بھٹے لگے۔ جب فصل کے پکنے میں تھوڑے دن رہ گئے تو ایک صبح فضلو نے عجیب بھیانک کا منظر دیکھا۔ مکئی کی فصل کا سب سے بڑا کھیت نہایت بے دردی سے اجاڑ دیا گیا تھا۔ سارے پودے توڑ دیئے گئے۔ لمبے لمبے بڑے بڑے سفید دانوں والے بھٹے ٹوٹے پڑے تھے اور اکثر بھٹے ادھ کھائے ہوئے تھے۔ یہ کسی چور کی نہیں کسی پاگل کی کارستانی تھی یا کسی ایسے جانور کا کام تھا جو فطرتاً بے حد حاسد اور کمینہ تھا۔

فضلو اور سکینہ نے بھاری دل کے ساتھ بھٹے اکٹھے کئے۔ سکینہ کی تو آنکھوں میں آنسو تھے فضلو بے حد اداس اور دکھی تھا اس نے کھیت کے ذرے ذرے کو اپنے خون سے سینچا تھا اور اس کی ساری محنت رائیگاں چلی گئی تھی۔

جو پودے بالکل ٹوٹ چکے تھے انہیں اس نے درانتی سے کاٹ کر الگ کر لیا اور ان پودوں کے ساتھ باندھ کر زمین میں گاڑ دیا جو صرف ٹیڑھے ہوئے تھے۔ اس طرح اس نے کئی پودوں کو بچا لیا۔

فضلو نے برآمدے میں بنی کلوٹی کے پاس سارے کچے بھٹے ڈھیر کر دیئے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کلوٹی کو اس دفعہ بھر دے گا۔ لیکن اب اس کھیت کے تباہ ہو جانے کے بعد اسے امید نہیں تھی کہ کلوٹی آدھی بھرے گی۔ کلوٹی اناج رکھنے کے لیے ایک طرح کا ٹینک ہوتا ہے جو عام طور پر برآمدے میں بنائی جاتی ہے۔ اس کی دیواریں آٹھ فٹ لمبی اور چھ فٹ اونچی ہوتی ہیں۔ اوپر سے بند ہو جاتی ہے۔ صرف ایک گول سوراخ ہوتا ہے جس پر لکڑی کے دستے والا ڈھکنا رکھا ہوتا ہے۔ کسان اناج وغیرہ صاف کر کے اس میں ڈال دیتے ہیں۔ اس کا پیندا ڈھلوان ہوتا ہے

اور نیچے ایک سوراخ ہوتا ہے جس کے آگے لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈھکنا لگا ہوتا ہے۔ ضرورت کے مطابق عورتیں مکئی یا گندم نکال کر پھر اُس ڈھکن کو بند کر دیتی ہیں۔ اس میں اناج خراب نہیں ہوتا۔

فضلو بھابھا آکر صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دور مغرب میں کالے کالے پہاڑوں کے پیچھے سورج غروب ہو چکا تھا لیکن آسمان پر لالی چھائی ہوئی تھی۔ سناٹا چھا رہا تھا۔ چڑیوں کے چہچہانے کی آواز بھی بند ہو چکی تھی۔ سارا ماحول اداس اداس لگتا تھا۔

سکینہ نے چائے کا گرم گرم پیالہ لا کر فضلو کے ہاتھ میں تھما دیا پھر لکڑی کی چوکی گھسیٹ کر چارپائی کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے پیالے سے ایک گھونٹ پیا اور پیالہ نیچے رکھ دیا۔

"اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اللہ اور دے گا۔"

"مجھے تو یہ فکر لگی ہے کہ آج رات وہ جانور پھر سے آ جائے اور ہمارے کھیت کو تباہ کر دے تو پھر کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ کیا بندوبست کروں مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

"کسی سے کوئی مشورہ کریں۔"

"ہاں کچھ کرنا پڑے گا۔ ورنہ ہم تباہ ہو جائیں گے بارشوں اور برفوں کے زمانے میں اناج کہاں سے آئے گا۔"

"وہ کونسا جانور ہے جو پھل، سبزیاں کھاتا ہے۔"

"بندر وغیرہ"

"ممکن ہے بندروں نے یہ کام کیا ہو۔ لیکن بندر تو بٹ راسی کے جنگلوں میں نہیں ہوتے شاید اوپر سے آتے ہوں۔"

"بندر عام طور پر دن کو آتے ہیں اور پھر اتنا غل مچاتے ہیں کہ ان کی آمد کا فوراً پتہ چل جاتا ہے۔"

"تو پھر کسی موصوچور کی کارستانی ہوگی۔"

"نہیں چور نہیں ہو سکتا شاید ریچھ ہو۔ وہ بھٹے بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ پھر وہ کسی حاسد چور سے کم نہیں۔"

"ہاں ریچھ ہی ہوگا۔ ریچھ کا مقابلہ کرنا بڑا مشکل اور خطرناک ہے۔"

"ہاں نہایت مکار اور کینہ پرور جانور ہے۔"

"اس نے دو تین بڑے بڑے گھونٹ لے کر پیالہ خالی کر دیا۔" سکینہ پیالہ اٹھا کر اندر لے گئی۔

"زمان کے گھر جاتا ہوں۔ اس سے مشورہ کرتا ہوں۔

میرا تو خیال ہے اس سے بندوق مانگ کر لے آؤں۔"

"جلدی واپس آنا۔"

"بندوق تو شاید زمان کے پاس بھی نہیں۔ پھر مجھے بندوق چلانی بھی نہیں آتی۔ تم گھبراؤ مت میں جلد واپس

آتا ہوں ۔"

فضلو نے اندر کمرے میں جا کر ایک ہلکی سی کلہاڑی دیوار پر ٹنگی ہوئی اتاری۔ اس کلہاڑی کا دستہ کا ہو کی لکڑی کا تھا اور اس کے اُوپر لوہے کی تار لپٹی ہوئی تھی۔ کلہاڑی لاٹھی کا کام بھی دے سکتی ہے۔

زمان کا گھر ترائی میں واقع ہے۔ فضلو لمبے لمبے ڈگ بھرتا کوئی پندرہ بیس منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔

" زمان دروازے کے سامنے صحن میں چارپائی پر بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ اسے دیکھ کر فوراً باہر نکل آیا۔ اس نے فضلو کے ہاتھ اپنے بڑے بڑے مضبوط ہاتھوں میں لے کر خوب گرمجوشی اور زور سے دبائے۔

" کیا حال ہے یار کیسے ہو "

" بس اچھا ہوں "

" بہت دنوں بعد آئے "

" مصروف تھا "

" آؤ اندر آؤ "

وہ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ صحن میں بان کی بڑے بڑے اونچے پایوں والی چارپائی بچھی تھی دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ زمان نے چلم اس کے آگے کر دی اور خود تمباکو کو دیا سلائی جلا کر آگ لگانے لگا فضلو نے دو تین لمبے لمبے کش لگائے پھر چلم زمان کی طرف بڑھا دی۔ زمان چلم کی نے منہ میں پکڑ کر کش لگانے لگا اس دوران زمان کی بیوی برآمدے میں چولھے کے پاس سے اُٹھ کر دوپٹہ اپنے سینے اور سر پر درست کرتی ہوئی آئی ۔

" خیر سے آئے ہو لالے "

" تمہارا کیا حال ہے رحمت بھابی "

" اچھی ہوں ۔ سکینہ کا کیا حال ہے ۔ بہت دنوں سے آئی نہیں "

" تم لوگ بھی تو نہیں آئے "

" اصل میں پہاڑ پر چڑھنے کے خیال سے ذرا سستی ہو جاتی ہے ورنہ تو میں سکینہ کے پاس جاؤں "

زمان نے جب چلم دور کر دی تو رحمت چولھے کی طرف چلی گئی ۔

" زمان ہم ایک مشکل میں پھنس گئے ہیں "

" کیا مشکل ہے "

" ہمارا ایک بڑا مکئی کا کھیت کسی درندے نے روند ڈالا ہے ۔ سارے پودے توڑ دیئے ہیں ۔ بھٹے توڑ کر پھینک دیئے ہیں ۔ میرا خیال ہے یہ ریچھ کا کام ہے "

" تمہارا خیال بالکل درست ہے ۔ ایسا ریچھ کا کام ہی ریچھ ہی کرتا ہے ۔ لیکن ریچھ اس موسم میں اس علاقے میں نہیں آتا ۔ تمہارا کوئی دشمن تو نہیں ۔؟

"نہیں بھائی ہمارا کوئی دشمن نہیں۔"

"تو پھر یہ ریچھ کی حرام زدگی ہے بندروں کا غول تو کہیں سے نہیں آگیا۔"

"بندروں کا غول ہوتا تو سارے جنگل میں شور ہوتا۔"

"ہاں انہوں نے تو سارا جنگل چیخ چیخ کر سر پہ اٹھایا ہوتا۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"میرے پاس بندوق نہیں۔ ہاں بارود کے کچھ گولے ہیں جو میں ایک دوست کی شادی کے لیے لایا تھا۔ شاید چھ گولے بچے ہوئے ہیں۔ ان سے ریچھ کو ڈرا کر بھگایا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیسے۔"

"میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ پھر کوئی ترکیب کرتے ہیں تمہارے پاس دل کی لکڑی اور گندہ بیروزہ تو ہے۔"

"بہت۔ بیروزہ کا تو کنستر بھرا ہوا ہے۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔ تم ٹھیرو میں ابھی بارود کے گولے لاتا ہوں۔" زمان اندر گیا اور لفافے کر آیا۔ اس کا منہ کھول کر فضلو کو دکھانے لگا۔

"چھ دانے ہیں۔ کام چل جائے گا۔ ان کا بہت زور کا دھماکہ ہوگا اور جب گندہ بیروزہ لگا تو خوب روشنی بھی نکلے گی۔"

"فضلو نے ایک گولہ لفافے سے نکال کر دیکھا۔ گولے کا حجم گیند کے برابر تھا۔ اس کے اوپر پٹ سن کی پتلی پتلی سوتلی لپٹی ہوئی تھی جس کے اندر سے چار لکڑیاں نکلی ہوئی تھیں۔ یہ ایک صلیب کے نشان والا گولہ نظر آتا تھا گولے میں ایک ڈوری سی بنی تھی جہاں سے اسے آگ لگا کر پھینکتے ہیں۔

"ریچھ ان گولوں کے دھماکے سے ایسا بھاگے گا کہ پھر لوٹ کر اس علاقے میں کبھی نہیں آئے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ چلو چلیں فضلو نے کہا

"کھانا تو تیار ہے۔ کھانا کھا کر جائیں۔" رحمت نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"کھانا تو ہمارے گھر بھی تیار ہوگا۔ وہاں چل کر کھاتے ہیں۔" فضلو نے کہا۔

"ارے یہاں تو بالکل تیار ہے۔" زمان نے کہا۔ "رحمت جو کچھ پکا ہے لے آؤ۔"

دونوں صحن کے ایک کونے میں پتھروں پر رکھے گھڑوں کی طرف گئے۔ زمان نے ایک آب خورے میں پانی نکال کر پہلے فضلو کے ہاتھوں پر ڈالا۔ پھر خود اپنے ہاتھ دھوئے اور واپس آ کر دونوں بان کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ رحمت نے ایک سرخ دسترخوان بچھا دیا ایک دھات کی رکابی میں چار بڑی بڑی مکئی کی روٹیاں۔ دوسری رکابی میں گندلوں کا ساگ، ایک مٹی کے پیالے میں اچار، دوسرے پیالے میں اخروٹ، پودینہ اور انار دانے کی چٹنی اور ایک مٹی کی رکابی میں مکھن کی بڑی بڑی گولیاں لا کر رکھیں۔ مکئی کی گرم گرم روٹیوں کی اشتہا انگیز خوشبو فضا میں پھیلی اور دونوں جوانوں کی بھوک تیز ہو گئی۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران رحمت ایک بڑے سے مٹی کے کوزے میں لسی لے آئی۔ دونوں نے بھر بھر کر گلاس پیئے

اور پھر ڈکاریں لیتے ہوئے چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"بڑے مزے کا کھانا تھا۔ فضلو نے کہا۔ رحمت کے ہاتھ کا کھانا ہمیشہ مزے کا ہوتا ہے۔" زمان نے کہا۔

رحمت کے چہرے پر خوشی سے سرخی دوڑ گئی۔

"تمہارا بیٹا کہاں ہے" فضلو نے پوچھا۔

"آج وہ جلدی سو گیا ہے"۔ رحمت نے کہا۔

زمان اندر سے جا کر ایک بڑی سی ٹارچ اور ہلکی سی کلہاڑی لے آیا۔

"چلو چلیں" زمان نے کہا۔ پھر رحمت سے مخاطب ہوا۔ رحمت اگر مجھے دیر ہو گئی تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ لالہ ابھی آتے ہوں گے۔"

"گھبرانے کی کیا بات ہے آپ غم نہ کریں۔ ویسے بھی میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ وہ تو مجھے معلوم ہے"

اب اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ دونوں ٹارچ کی روشنی میں پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ چاروں طرف سکوت تھا اور کالے کالے پہاڑوں کے سائے یوں لگتا تھا جیسے کوئی عظیم الجثہ بھوت ہوں۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ فضلو کے کھیتوں کے پاس پہنچے۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں اپنا تباہ شدہ کھیت زمان کو دکھایا۔

"کھیتوں کو اس طرح تباہ صرف ریچھ کرتا ہے"۔ زمان نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے"۔ فضلو نے جواب دیا۔

دونوں کھیتوں کے کنارے چلتے ہوئے فضلو کے مکان میں داخل ہو گئے۔

برآمدے میں ایک لکڑی کے ستون کے ساتھ ایک لالٹین جل رہی تھی اور اس کی دھیمی دھیمی روشنی سارے گھر پر پھیلی تھی۔ سکینہ چولہے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"سکینہ دیکھو کون آیا ہے؟"

"ارے زمان لالے۔ السلام علیکم۔ آپ ہمارے گھر کا راستہ کیسے بھول گئے"

"آپ لوگ ہماری طرف نہیں آئے، اس لیے میں نے سوچا خود چلا چلوں"

"ارے جھوٹ بولتا ہے، اسے میں پکڑ کر لایا ہوں۔ ہاں کھانا تو ہم نے کھا لیا۔ تم ذرا جلدی سے چائے بنا لاؤ"

"کھانا تم نے کہاں کھایا ہے"۔ سکینہ نے پوچھا۔

"زمان کے گھر۔ بڑا مزا آیا"

"اچھا تو یہ بات ہے"

سکینہ نے واپس جا کر چولہے سے روٹی اتاری۔ پھر کپڑے سے پکڑ کر توا اتارا اور پانی کی دیگچی رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد چائے تیار ہو گئی۔ دونوں چائے پینے لگے۔ رفتہ رفتہ رات بھیگنے لگی اور سناٹے کا فسوں چاروں طرف پھیلنے لگا۔ پھر

بالکل سکوت چھا گیا۔ ذرا سی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھی۔

" فضلو کسی ڈبے میں گندہ بیروزہ ڈال کر لے آؤ۔ بھابی کوئی پھٹے پرانے کپڑے ہوں تو ذرا لا دو" اس نے ستون سے لالٹین اتار کر نیچے رکھ دی۔ فضلو نے ایک کھلے منہ کے ڈبے میں گندا بیروزہ ڈال کر لالٹین کے پاس لا رکھا۔ زمان نے ایک چوڑی لکڑی کے ٹکڑے کے ذریعے لفافے سے ایک گولہ نکالا کر اُس کی سوتلی والے حصے پر گندا بیروزہ لگانا شروع کیا اس دوران سکینہ نے پرانے کپڑے کے ٹکڑے پھاڑ کر ان کی پٹیاں بنا کر رکھ دیں۔ زمان نے بیروزہ کے اوپر پٹیاں لپیٹ دیں۔ صرف وہ جگہ خالی چھوڑ دی جہاں سے اُسے آگ لگانی تھی۔ اس طرح اُس نے سارے گولے بیروزہ میں بھگو کر تیار کر لیے پھر ان کو لفافے میں ڈالا۔ ٹارچ دائیں ہاتھ میں لی اور کلہاڑی بائیں ہاتھ میں۔ گولوں کا لفافہ فضلو نے سنبھالا اور دونوں گھر سے نکل کر مکئی کے بڑے کھیت پر پہنچ گئے۔

زمان نے فضلو کو بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

" تم اس کنارے پر جاؤ۔ میں اس کنارے پر رہتا ہوں۔ یہ پکڑو تین گولے۔ جونہی مکئی کے پودے توڑنے کی آواز سنو تو تینوں گولوں کو آگ لگا کر ہوا میں پھینک دینا۔ بہت اونچا بھی نہ پھینکنا اور بہت نیچا بھی نہ پھینکنا۔ بس ایسا اندازہ رکھنا کہ گولے اس کھیت میں واپس آئیں اور زمین پر لگنے سے پہلے پھٹ جائیں۔"

" اچھا۔ انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا" فضلو نے جواب دیا۔

اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے مخالف سمت چل پڑے فضلو نہایت اعتماد اور احتیاط سے منڈیر چلتا جا رہا تھا۔ جہاں کہیں اسے کوئی شبہ ہوتا یا کوئی کالا سایہ نظر آتا وہ دیا سلائی جلا کر دیکھ لیتا۔ اس نے تمام قوتیں، قوت سماع پر مرکوز کی ہوئی تھیں۔ اگر کوئی بھی حرکت ہو تو اُسے سنائی دے جائے۔ اگر کوئی جانور اپنے پاؤں کے گدیلے پر بھی چل رہا ہو تو اس کے قدموں کی چاپ اسے سنائی دے۔ اُسے معلوم تھا کہ جانوروں کو یہ کمال حاصل ہے کہ اگر ان کے پاؤں کے نیچے خشک پتے یا ٹہنیاں بھی آجائیں تو ان کے چرمرانے کی آواز نہیں آتی۔ اسی لیے وہ اپنے شکار کے قریب اچانک پہنچ جاتے ہیں اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔ ایک خونخوار پنجہ ایک ہی مہلک وار سے اپنے شکار کی جان نکال دیتا ہے۔ ریچھ کے پاؤں کی چاپ بھی سنائی نہیں دیتی اگرچہ نہایت بھدے اور بھونڈے انداز سے اپنے موٹے موٹے مجرب کولھوں کو ہلا کر چلتا ہے لیکن اس کے چلنے سے آہٹ سنائی نہیں دیتی۔

دونوں نے ماچس اور گولے اپنے پاس ایک پتھر پر رکھ لیے اور سانس روکے جانور کے آنے کا انتظار کرنے لگے سناٹے اور گھپ اندھیرے نے مل جل کر ایک نامعلوم خوف کی شکل اختیار کر لی تھی اور ان کے دل دھک دھک کرنے لگے دور نیچے جنگل میں چیڑ کے اونچے اونچے درخت بھوتوں کی طرح دکھائی دیتے تھے ان کو یوں محسوس ہوا جیسے تاریکی اور خاموشی کی نہ جانے کتنی صدیاں گذر گئی ہیں۔ پھر مکئی کے ایک پودے کے ٹوٹنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ جیسے کوئی دبی ہوئی کراہ پھر خاموشی کی برف جم گئی انہوں نے اپنے کانوں پر زور دیا۔ پھر پودا ٹوٹنے کی ایک واضح چیخ بلند ہوئی۔ جس نے خاموشی کی تنی ہوئی چادر کو گویا کاٹ کر رکھ دیا۔ پھر سکوت چھا گیا۔ پھر مکئی کے پودوں کے ساتھ لگے ہوئے پتوں کی دوسرے پودوں کے ساتھ رگڑ کھانے کی آواز آئی۔ کش کش۔

دونوں نے جلدی سے گولوں کو دیا سلائی دکھائی اور ان کو ہوا میں اچھال دیا۔ اندھیری رات میں چنگاریاں اڑتی بڑی بھلی معلوم ہوئیں۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے سارا پہاڑ ہل گیا۔ کسی جانور کے بھاگنے کی آواز آئی وہ غصے اور خوف سے بے اختیار چیخا اور دوڑنے لگا۔ اس کے بھاری قدموں کے زمین کے ساتھ ٹکرانے سے دھم دھم کی آواز پیدا ہوئی۔ پھر ٹارچ کی شعاعوں کا ایک سیلاب بہہ نکلا۔ فضلو نے دیکھا کہ کالا سیاہ خوفناک وحشی دیو ہیکل ریچھ اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑا مسلسل اچھل رہا تھا۔ ان دھماکوں سے اس پر ایک ہیبت اور دہشت طاری کر رکھی تھی، جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ چکر کھا کر گرنے لگا۔ جب اسے پگڈنڈی کا راستہ ملا تو چاروں پاؤں پر چلنے لگا۔ اس کے چربی والے فربہ کولہے عجیب مضحکہ خیز انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کھا کر حرکت کرنے لگے۔ فضلو کو بے حد ہنسی آئی۔ اس نے دیکھا کہ ریچھ کے سینے پر ایک چھوٹی سا سفید نشان تھا۔ فضلو زمان کے قریب آیا۔

"اب یہ حرامی اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔" زمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ وہ تو دھماکوں سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ اسے بھاگنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔"

"لیکن ایک بات ہے وہ واپس اپنے پہاڑ پر جا کر سوچے گا کہ ان دھماکوں سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ صرف اسے ڈرانے کے لیے چھوڑے گئے تھے۔" زمان نے کہا۔

"ایک جانور ایسی باتیں کیسے سوچ سکتا ہے۔" فضلو نے جواب دیا۔

"نہیں ریچھ کو تم ایسا جانور نہ سمجھو۔ وہ بڑا سیانا اور چالاک ہوتا ہے۔ اس کی بہت سی باتیں انسانوں سے ملتی ہیں۔ ہو سکتا ہے لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ جانور کیا اور انسان کیا سب سے پہلے اپنی جان بچانے کی فکر کرتے ہیں۔ اتنے خوفناک دھماکوں کے بعد وہ ادھر واپس نہیں آئے گا۔ ممکن ہے اس سال ادھر کا رخ نہ کرے لیکن اگلے سال پھر آ جائے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ جانوروں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔" فضلو نے کہا۔

"اچھا۔ اب میں چلتا ہوں" زمان نے کہا۔ "تم اپنا مونگرا چلا لو۔"

"آج ادھر رک جاؤ۔"

"نہیں مہربانی۔ رحمت پریشان ہو گی۔"

"اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

فضلو نے ماچس سے دیا سلائی نکال کر اس سے دلی کی مشعل جلائی۔ دلی کی لکڑی چیڑ کے تنے کے درمیان ہوتی ہے اور جب درخت ہرا ہوتا ہے تو اس حصے سے گندہ بیروزہ بنتا ہے جو رس رس کر باہر آتا ہے۔ محکمہ جنگلات کے کارندے اس کو مٹی کے پیالوں میں جمع کرتے ہیں۔ پھر درخت کے تنے کو ایک جگہ سے چھال ہٹا دی جاتی ہے وہاں ایک کیل گاڑ کر اس کے ساتھ پیالہ لٹکا دیا جاتا ہے اور بیروزہ اسی پیالے میں ٹپکتا رہتا ہے۔ گندہ بیروزہ پہاڑی لوگ زخموں پر لگاتے ہیں اور زخم اچھے ہو جاتے ہیں۔ روایت مشہور ہے کہ ریچھ جب زخمی ہو جاتا ہے تو گندہ بیروزہ اپنے زخموں پہ لگاتا ہے۔ ریچھ

کو دوسری جڑی بوٹیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ وہ پہاڑ سے نکلنے والی سلاجیت بھی کھاتا ہے جس سے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔

فضلو مشعل کی روشنی میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے روپے پیسے کا انتظام کر کے بندوق ضرور خرید لینی چاہیے۔ اس سال ریچھ آیا تو اگلے سال جانے کوئی چیتا یا شیر ادھر آ نکلے۔ اوپر پہاڑی جنگلوں میں ہر طرح کے جانور موجود ہیں۔ جب پہاڑوں پر برف پڑ جاتی ہے تو خوراک کی تلاش میں جانور ترائیوں کا رخ کرتے ہیں لیکن اب چند سالوں سے زیادہ برف پڑنے لگی تھی اس لیے اب اتنا نیچے قریباً میدانی علاقوں تک بھی جانور آنے لگے تھے۔ لیکن وہ بندوق خریدنے کے لیے روپے کہاں سے لائے گا۔ ان کھیتوں میں سے بڑی مشکل سے ان کی خوراک پوری ہوتی تھی۔ بالن کے لیے وہ گرے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں، چلو مغز اور کھنگے اکٹھے کر کے لاتا تھا۔ ورنہ سردی کا لمبا عرصہ بڑی مشکل سے گزرتا۔ اس نے کئی دفعہ سوچا کہ ان پہاڑوں کو چھوڑ کر میدانوں کی طرف اتر جائے۔ ان پہاڑوں کی میں کیا رکھا ہے سوائے بھوک اور افلاس کے لیکن سکینہ کی محبت نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں اور وہ گھر سے نکلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

جب وہ مشعل ہاتھ میں لیے گھر کے اندر داخل ہوا تو سکینہ دروازے میں کھڑی تھی اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ "تم دھماکے کی آواز سن کر ڈر تو نہیں گئیں۔"

"ڈری تو نہیں لیکن فکر لگی ہوئی تھی۔ ریچھ کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔"

فضلو نے اسے سارا واقعہ سنایا وہ سن کر زور زور سے ہنسنے لگی۔ سردی کا موسم اس کے بعد خیر و عافیت سے گزر گیا۔ اس کی فصل بھی اچھی ہوئی۔

اس سال ابھی گرمی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ریچھ پہاڑوں سے اتر آیا۔ جب اس نے سارے ٹینگ دانتوں سے کتر کتر کر خراب کر دیئے تو خوشی سے ناچنے لگا۔ فضلو نہایت آہستہ آہستہ وہاں سے کھسک کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ ریچھ پچھلے سال کا بدلہ لینے کے لیے اس دفعہ گرمی کے موسم میں پہاڑوں سے اتر آیا ہے۔ اس کے بدن کی سڑاند اور بدبو دیر تک فضلو کا پیچھا کرتی رہی اور غصے کے مارے اس کا خون کھولتا رہا۔ اس نے گھر آ کر سکینہ کو سارا واقعہ سنایا۔ "اب تو ہر حالت میں بندوق لینی پڑے گی۔ اور بندوق خریدنے کے لیے سینکڑوں روپے کی ضرورت ہے پھر سرکاری لائسنس بھی چاہیے اور لائسنس حاصل کرنے کے لیے بھی تو روپوں کی اور سفارش و رسوخ کی ضرورت ہو گی۔"

"دیسی بندوق تو سستی آ جائے گی؟"

"وہ بھی چار پانچ سو روپے سے کم نہیں ہو گی۔ لیکن اس کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہے کب نالی پھٹ جائے اور بندوق والا بھی شہید ہو جائے۔"

"گڑھی میں ایک آدمی بندوقیں بناتا ہے ذرا اسی سے بات کرو۔"

"اچھا۔ اب کے گڑھی گیا تو اس سے معلوم کروں گا۔ یہ جو ہمارے کھیتوں کے حلقے پر چیڑ کا بہت بڑے تنے والا اونچا درخت ہے اور بہت پرانا ہے۔ اگر اس کے کاٹنے کی اجازت محکمہ جنگلات سے مل جائے تو ہماری بہت سی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔"

" تو کوشش کر کے اجازت لے لو۔"

" کوشش نہیں۔ ہزار دو ہزار روپیہ رشوت چاہیے۔"

" فرض کرو اگر میں اپنی ماں یا لالہ سے ہزار دو ہزار روپے کا بندوبست کر لوں تو کتنے روپے کی لکڑی نکلے گی۔"

" کم از کم دس بارہ ہزار روپے کی عمارتی لکڑی نکلے گی اور سال بھر کا بالن۔"

" تو پھر میں امی سے روپوں کی بات کروں گی۔"

" مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

" اس میں برائی کی کونسی بات ہے جب ہمیں روپے ملیں گے تو ان کو واپس کر دیں گے۔"

" ہم ایک بندوق خرید لیں گے۔ جابیا سے ولایتی بھیڑیں لے کر آئیں گے۔ ایک گائے اور خرید لیں گے اور گھر کا دوسرا کچھ سامان آجائے گا۔"

" اچھا دیکھو کچھ کرتے ہیں۔"

چند دنوں کے بعد وہ گڑھی سے بندوق کے بارے میں معلوم کر کے آیا تو اس نے پٹ واسی کے جنگل کے حاتے پر ایک کھائی میں شہتوت کا ایک بہت بڑا درخت دیکھا۔ اس کے گرد شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس نے جب قریب جا کر دیکھا تو اس پر شہد کے دو بڑے چھتے تھے۔ لیکن بہت اونچے۔ وہ گھر سے جا کر ایک بوری اور کپڑے کی پٹیاں اور دلی کی لکڑی لایا۔ اس نے اوپر سے بوری پہنی ہاتھوں میں کپڑے کی پٹیاں باندھیں اور دلی کی لکڑی جلا کر درخت پر چڑھ گیا۔ دھوئیں سے مکھیاں بھاگ گئیں اور اس نے دونوں چھتے اتار کر بوری میں بند کر لیے۔ وہ بہت خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دھوئیں کے باوجود کئی مکھیوں نے اُسے کاٹا تھا لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ چھتوں میں خاصا شہد تھا اور اتنا شہد حاصل کرنے کی یہ بہت تھوڑی سزا تھی۔ جب وہ ترائی سے اتر کر ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چڑھنے لگا تو اچانک ریچھ سامنے آ گیا۔ وہ شاید کسی جھاڑی کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں فضلو پر مرکوز کیں۔ اس کے بعد وہ اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور خوشی سے قہقہے لگانے لگا۔ شاید اس نے فضلو کو پہچان لیا تھا۔ اس کی چھاتی پر سفید بالوں کا دھبہ اس کے سیاہ کالے بالوں میں بہت نمایاں نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے نتھنوں سے لمبے لمبے سانس کھینچنے لگا۔ جیسے کوئی چیز سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ فضلو نے بوری کندھے پر رکھی تھی اور ساکت کھڑا تھا اس نے سوچا کہ اگر ذرا سی بھی حرکت کی تو ریچھ اس پر حملہ کر دے گا۔ اور جانے اس کا کیا حشر کرے گا۔ پھر اچانک اسے شہد کے چھتوں کا خیال آیا۔ شہد ریچھ کو بے حد پسند ہے اور وہ شاید شہد کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں بھی اس کی قوتِ شامہ بہت تیز ہوتی ہے۔ شہد کے چھتے اس کی جان بچا سکتے ہیں اس نے فوراً بوری کندھے سے اتاری اور ریچھ کے آگے پھینک دی۔ ریچھ نے جھک کر بوری کو سونگھا اور پھر اس کے گرد منہ مارنے لگا۔ فضلو نے اس موقع کو غنیمت جانا اور پیچھے ہٹنے لگا پھر اس نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ اچانک چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے تیتروں کی بارش ہونے لگی۔ سارے تیتر آ کر ریچھ کے جبڑوں اور نتھنوں کے گرد اگرد پھنس گئے۔ ریچھ نے خوفناک چیخیں ماریں اور اپنے چاروں پاؤں پر اچھلنے لگا۔

اس وقت جھاڑی سے سہہ نکلی۔ وہ پھول کر کپا ہو گئی تھی۔

ریچھ کی چیخوں نے اسے اور زیادہ غصہ دلا دیا تھا۔ اس نے اپنے بدن کو ایک خوفناک جنبش دی۔ تیروں کا ایک ریلا نکلا اور ریچھ کے جبڑوں پیشانی اور گردن پر مزید تیر لگے۔ سہہ کو اس نے پہلی دفعہ اتنے قریب سے دیکھا تھا وہ کتے سے ذرا چھوٹی تھی اس کا منہ خرگوش کی طرح تھا۔ اس کے بدن پر کالے اور پیلے رنگ کے نہایت کھردرے اور لمبے بال تھے۔ جن کے نیچے اس نے تیر چھپائے ہوئے تھے۔ تیر چلانے کے بعد وہ ایک جھاڑی میں غائب ہو گئی۔ ریچھ چیختا چلاتا بھاگنے لگا۔ فضلو ریچھ کی حالت دیکھ کر بہت زور سے ہنسا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنی چھتوں والی بوری اٹھائی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر اس نے سارا واقعہ سکینہ کو سنایا وہ بہت ہنسی اور کہنے لگی۔

" یہ ریچھ تو تمہارے پیچھے ہی پڑ گیا ہے اب تو تمہیں بندوق خریدنی ہی پڑے گی "

" ہاں لگتا کچھ ایسا ہی ہے۔ میں کل ہی درخت کٹوانے کے بارے میں بات کرتا ہوں "

دوسرے دن اس نے جٹ داس کے جنگل میں محکمہ جنگلات کے چوکیدار سے پوچھا اگر اس درخت پر نمبر لگا ہوا ہے تو پھر تم بغیر اجازت کے نہیں کاٹ سکتے۔ اگر نمبر نہیں لگا ہوا تو چپکے سے کاٹ لو۔ وہ علاقہ بھی میرے ماتحت ہے لیکن کسی کو بھی پتہ نہ چلے " چوکیدار نے کہا۔

فضلو نے چوکیدار کو دو سو روپے دیئے اور چپکے چپکے درخت کی شاخیں کاٹنے لگا۔ جب درخت ٹنڈ منڈ ہو گیا تو زمان کی مدد سے ایک رات انہوں نے درخت کاٹ کر گرا لیا۔

درخت بہت لمبا تھا اور اس سے شہتیر بنانے کے لیے اسے آراکشوں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں پہلے انہوں نے درخت کو مختلف ٹکڑوں میں کاٹا۔ اس کے بعد بڑے تنے کو ایک سرے سے اونچا کر کے اس کے نیچے لکڑی پھنسا کر اسے کھڑا کر دیا گیا یہ ایک تکون سی بن گئی تھی۔ اس کے بعد ایک آراکش تنے پر چڑھ گیا اور اس نے اپنی جیب سے ایک چرخی پر لپٹا ہوا کالا دھاگہ نکالا اور اسے کھول کر ایک سرا نیچے کھڑے آدمی کو پکڑا دیا اس نے تنے کے سرے پر رکھ کر اسے انگوٹھے سے دبایا اوپر والے آدمی نے تنے کے درمیان دھاگے کو اپنے پاؤں سے دبایا۔ اس کے بعد دھاگے کو پکڑ کر اور کھینچ کر تین چار مرتبہ چھوڑا تو لکڑی پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک کالی لکیر لگ گئی۔ اب اوپر والے آدمی نے دھاگے کو لپیٹ کر چرخی بغلی جیب میں ڈال لی۔ اب نیچے والے آدمی نے ایک بڑا سا فولاد کی پتلی چادر سے بنا ہوا تیز دندانوں والا آرا ایک جانب سے اسے تھما دیا۔ آرے کو دونوں آدمیوں نے سروں سے پکڑ کر درمیان سے وہاں رکھا جہاں سے کالی لکیر شروع ہوتی ہے اس کے بعد آہستہ آہستہ آرا حرکت میں آیا۔ لکڑی کٹنے لگی اور پیلے رنگ کا برادہ گرنے لگا۔ تقریباً تین چار فٹ چر گیا تو نیچے کھڑے آدمی نے اس چری ہوئی لکڑی کے درمیان ایک گٹکا لگا دیا اس طرح لکڑی کے دو حصے ہو گئے الگ الگ پھر آری چلنے لگی اور لکڑی کٹتی گئی۔ فضلو ایک منڈیر پر بیٹھا سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نیچے والے آدمی نے چرے ہوئے تنے کے درمیان ایک اور گٹکا لگایا۔ فولاد کی پتلی چادر لکڑی کو کاٹنے لگی۔ اچانک ان کے ہاتھ رک گئے جیسے شل ہو گئے ہوں۔ ان کی نظریں سامنے پگڈنڈی پر جم گئیں۔ فضلو نے ان کی نظروں کا تعاقب کیا۔ سامنے

کی پگڈنڈی سے وہی خبیث ریچھ جھومتا چلا آرہا تھا۔ اس نے شاید ابھی ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔ آرا کشوں نے فوراً دستہ کھول کر لکڑی کے درمیان سے اپنا آرا نکال لیا۔ ہتھیاروں کی پوری اٹھائی اور افراتفری میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب ریچھ خاصا قریب آگیا تھا۔ اس نے فضلو کو دیکھا اور رک گیا۔ پھر اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہو کر قہقہے لگانے لگا۔ فضلو نے اُسے زیادہ قریب آنے کا موقع نہ دیا اور تیزی سے پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ریچھ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جب ریچھ وہاں پہنچا تو میدان خالی تھا۔ اس نے خوشی سے ناچنا شروع کر دیا۔ اچانک اس کی نظر لکڑی کے پیلے برادے کے ڈھیر پر پڑی تو اس نے جھک کر زبان سے اس کا ذائقہ چکھا۔ لیکن برادہ بدمزہ ثابت ہوا۔ اس نے فوراً تھوک دیا۔ اور اپنے سر کو ادھر اُدھر جھٹکتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ اس کے بعد اس کی نظر لکڑی کی طرح کھڑے تنے پر پڑی وہ کافی دیر اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اچھل کر اس پر چڑھ گیا اور حیران ہو کر دیکھنے لگا کہ یہ کیا چیز ہے اُسے دو حصوں کے درمیان فاصلہ نظر آیا۔ اس نے اپنی ایک پچھلی ٹانگ ان دو لکڑیوں کے درمیان ڈالی اس کی ٹانگ نچلے کھٹکے کے ساتھ ٹکرائی اس نے اگلے پنجے سے زور دے کر وہ کھٹکا نکال دیا۔ پھر اُسے دوسرا کھٹکا نظر آیا۔ اس نے بڑی دیر تک جدوجہد کرنے کے بعد اُسے بھی کھینچ کر نکال لیا۔ اب لکڑی کے دونوں حصے جو ان کھٹکوں کے ذریعے الگ الگ تھے اپنی جگہ پر آگئے۔ ریچھ کی ٹانگ پھنس گئی وہ لکڑی ایک شکنجہ بن گئی۔ اب ریچھ نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ پہلے تو وہ آہستہ آہستہ روتا رہا جب کوئی آواز نہ آئی تو اس نے زور زور سے شور مچایا لیکن کوئی بھی اُسے شکنجے سے نکالنے نہ آیا تو وہ خاموش ہو گیا بعد درد کو برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اندھیرا ہونے لگا اور گہری رات ہو گئی۔ پھر رات گذری اور صبح ہوئی اور جب سورج ذرا اونچا ہوا تو فضلو اور دونوں آرا کش ریچھ کو یوں پھنسے دیکھ کر بے حد حیران ہوئے۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگے۔ ریچھ نے نہایت رحم طلب نگاہوں سے فضلو کو دیکھا اور پھر سر جھکا دیا۔ فضلو سے اُسے امید نہیں تھی کہ وہ اُسے شکنجے سے نکالے۔ فضلو نے اس کے قریب جا کر کہا۔

"کیوں جوان کیا حال ہے؟"

ریچھ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"بڑے مسکین بن گئے۔" فضلو نے کہا۔ "پھر آرا کشوں سے مخاطب ہوا "یار۔ اس جانور کو کسی طریقے سے اس شکنجے سے نکالو۔"

"نہ بابا نہ۔ کہیں یہ آزاد ہو کر ہم پر ہی نہ حملہ کر دے۔" اب حملہ نہیں کرے گا اسے کافی سزا مل چکی ہے اور اس کی ٹانگ بیکار ہو چکی ہو گی۔"

"چھوڑو یار۔ تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔ لاؤ یہ کھٹکا مجھے دو۔ میں ٹھونکتا ہوں۔" اور اس نے کھٹکا اٹھا کر چیری ہوئی لکڑی کے درمیان ٹھونکنا شروع کر دیا۔ ایک آرا کش نے اُٹھ کر دوسرا کھٹکا ٹھونکا۔ اب دونوں لکڑیوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہو گیا۔ ریچھ اب آسانی سے ٹانگ نکال سکتا تھا۔ لیکن اس نے ٹانگ کو ذرا بھی جنبش نہ دی۔ فضلو نے ایک سی شاخ سے کر اس کے پھنسے ہوئے پاؤں کے تلوے کے نیچے ماری۔ ریچھ نے فوراً اپنی ٹانگ کھینچ لی اور پھر

اسے اُوپر نیچے کرنے لگا۔ اس کی ٹانگ میں خون دوڑنے لگا۔ وہ شہتیر پر چاروں پاؤں کے بل کھڑا ہوا اور پھر کود کر زمین پر آ گیا۔ اس نے دور کھڑے تین انسانوں کو دیکھا پھر پاس پڑی ایک چادر اٹھا کر لنگڑاتا ہوا پہاڑ کی جانب چل دیا۔

"کمبخت کو رہائی دلانے کا اچھا فائدہ ہوا۔ میری ہی چادر اٹھا کر لے گیا" فضلو نے کہا۔ دونوں آرہ کش ہنسنے لگے

"چلو بھئی اب کام ختم کرو" دونوں پھر آرے سے شہتیر چیرنے لگے۔ کھانے کے لیے انہوں نے آدھ گھنٹہ کام روکا۔ اس کے بعد پھر آرا چلنے لگا۔ اچانک پھر آرا رک گیا۔ وہ دونوں پہاڑ کی طرف دیکھنے لگے۔ فضلو نے بھی اُدھر دیکھا۔ ریچھ ایک بڑی سی گٹھڑی کو گھسیٹتا ہوا آہستہ آہستہ ایک پتلی سی پگڈنڈی سے اتر رہا تھا۔ وہ سارے اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ اور اوپر ٹیان پر چڑھ گئے۔ ریچھ نے وہ گٹھڑی لکڑیوں کے پاس لا کر رکھ دی۔ پھر ان تینوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پہاڑ کی جانب روانہ ہو گیا۔

فضلو نے نیچے اُتر کر چادر کھولی۔ یہ اس کی اپنی چادر تھی جو ریچھ چند گھنٹے قبل اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس چادر میں شہد کے چھتے، تازہ اخروٹ، سنبلو کی ٹہنیاں اور بیروں سے لدی پھندی شاخیں تھیں اس نے حیرت سے آرا کشوں کی طرف دیکھا وہ مسکرائے پھر اُس نے پلٹ کر ریچھ کی طرف دیکھا جو سامنے والی چوٹی پر کھڑا تھا۔ ریچھ اپنے پچھلے پنجوں پر کھڑا تھا۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر چوٹی کی دوسری طرف اُتر گیا۔

اس واقعے کے بعد ریچھ پھر فضلو کے کھیتوں کی طرف نہیں آیا۔

○○

ناول

سانجھ بھئی چوندیس

(باب نہم۔۳)

سلمیٰ یاسمین نجمی

"دھیئے ردتی لب ملے گی بڑے زور کی بھک لگی ہوئی ہے۔ ڈھڈ چوہ دکنا ردلا پا رہا ہے" ریشماں کے ماموں فضل داد نے ہانک لگائی۔

"وئی ماما تیرا ڈھڈ ہے کہ ا ندھا کھوہ جو ڈالو جتنا ڈالو جانے اللہ کہاں غائب ہو جاتا ہے" ریشماں ہنس کر بولی

"سنا یار امنی کیا کہہ رہی ہے۔ ہمیں ہشرے[1] سد کے اب ردٹی دار دن دل تنگ کر رہی ہے۔ خداوندی بات یہ ہے کہ ڈھڈ نہ پیٹیاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں"

"حوصلہ کر ماما حوصلہ میرا دل بہت بڑا ہے یہو بندہ بھی ہو تو منتھے پرورٹ نہ پڑے۔ ردٹی اللہ جی کے کرم سے اتنی کھلی ہے کہ رج رجا کے بھی جہاں بچ جائے گی۔ بس یہ تھوڑی پٹی ہو رہ گئی ہے اس کا دھندہ بھی مکا چھوڑ دو زری تر کھتے ہتھ چلاؤ۔ میں گھر کا ڈلا کیا ہوا گھر دی گھؤ اور شکر دوں گی"

"شالا جیاتی ہو دے۔ یہ تو نے میرے دل کی بات کی ہے۔ اب تو نماشاں تک بھی لگا رہوں تو اف نہ کروں پر یک گل پہلے مو ہرے صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔ گھیؤ پر کوئی پابندی نہ ہو گی۔ جتنا میرا دوح منے گا پیوں گا"

ریشماں مسکرائی۔ "کچا گھیؤ کون پی سکتا ہے"

کتنے ہی جی میری نکاں تلے ہیں جو پانی کی طرح کچا گھیؤ پی چھوڑتے ہیں" فضل داد بڑے یقین سے بولا۔ اسی کے ساتھ سنگی ہوں گے۔ انھوں نے تو یہ کسب بنایا ہوا ہے۔ جہاں کہیں ہشرے[2] بن کر جاتے ہیں دب کے گھی پیتے ہیں اور پھر گھر آ کر تپلے[3] میں پرت چھوڑتے ہیں اور نلوں کے ذریعے اپنے داندوں اور لیاریوں کو پلا دیتے ہیں"

مہر افضل نے بتایا۔

ریشماں نے جھرجھری سی لی" توبہ توبہ۔ یہ بات تو میں نے بھی سنی تھی پر میں سمجھی کہ لوگ کوڑ پیچ کرنے رہتے ہیں

---

[1] اپنے گاؤں والے جو بغیر اجرت کے کام کراتے ہیں [2] لوہے کی پرات [3] دودھ دینے والی گائیں بھینس

" اس کی بات نہ سن منی۔ یہ ہمیشہ الٹی ہی بات کرتا ہے۔ تو زری نہ گھبرا تو میری دھی ہے۔ کدی کسی نے اپنی دھی دھیانی کا زیان کیا ہے؟"

" اگلیرا گھیٹو پی کر تو کتنی ہی واری بخوڑ ہوا ہے اس کی شہادت تو میں بھی دوں گا" خوشدل پہلی بار بولا۔

" واہ سنگیا تو بھی ان کے ساتھ رل گیا؟" فضل داد نے شکوہ کیا۔

" سچی بات کہہ رہا ہے خوشدل چاچا۔ تم لوگ جہاں بھی جاتے ہو ہم سب کو بے عزت، خوار کرتے ہو۔ ساری خلقت خدا کی کھا پی کر بخاری[١] ہو جاتی ہے اور تم لوگ لگے رہتے ہو۔ اتنی لازمی[٢] آتی ہے نا" ریشماں کا چچا زاد بھائی وارث بولا۔

" تو چپ کر خبردار جو دوجی گل کی۔ تیرا کیا حق بنتا کہ تو بڑوں کو ایسی بات بولے۔" وارث کے باپ شیردل نے ڈانٹا۔

" پروں داندوں کی ریس[٣] سے پہلے یہ ہرجائی ہشرہ بن کر رہ گیا۔ ہر واری خوب گھیٹو پیا اور پورت کر اپنے داند کو پلاتا رہا" مظفر نے قصہ شروع کیا۔

" توبہ استغفار ہے" ریشماں نے ابکائی لی "کتنا گندہ ہے ماما تو بھی"

" اور پھر اس کا داند خوب تگڑا تازہ اور بھلا ہو گیا۔ نہاتا"

وارث نے بات کاٹی "داندوں کی ریس جت گیا"

" جت کہاں سے گیا یارا۔ داند دوڑا ہی نہیں۔ بھتی مار اس نے دی۔ پونچھل مروڑی، مندیاں چنگیاں کیں۔ پر وہ پھڑکی جو گا اپنی جائی وٹا بن کر کھلو گیا۔ سارے داند دوڑ گئے اور یہ نیک بخت اپنے داند کے ساتھ ہکلا کھڑا رہ گیا" سب بے تحاشا ہنسنے لگے۔

" کھڑا رہ گیا۔ یہ کھڑا رہنے والا بندہ کہاں یارا۔ غضب کے مارے لگتا تھا اس کا مغز پھر گیا ہے۔ یوں اچھل رہا تھا جیسے زمین میں ٹوٹے ڈال دے گا"

" داند کو سرون[٤] مارنے لگا تھا۔ وڈ وڈیروں نے سمجھایا تو قابو آیا۔ مگر اسی وقت داند کی رسی پکڑی اور قصائی کے پاس لے گیا۔ اپنا اتنا کاری کا داند مٹی کے بھاؤ بکری کر آیا"

" داند ہو کہ زنانی۔ جو بندے کی نظر چار دوں کے سامنے نیوی کر دے وہ گھر رکھنے جوگی چیز نہیں" فضل داد ٹھنڈا سانس بھر کے بولا۔

" چھڑی باتیں ہی کرو گے یا کچھ جنگلوں باہراں بھی ہلاؤ گے" ریشماں چلائی

اور مردوں نے تیزی سے درانتی چلانی شروع کر دی۔ سب اپنی لاٹوں میں پھرتی سے گیہوں کاٹ

---

١ فارغ ٢ شرم ٣ بیلوں کی دوڑ ٤ جان سے مارنا۔

کو ڈالتے جا رہے تھے۔ خوشدل اور میرا فضل کٹی ہوئی گیہوں کے گٹھے باندھ رہے تھے۔ کھیتوں میں جگہ جگہ گیہوں کے سنہری گٹھے پڑے تھے۔

ریشماں اور اس کی دیگر رشتہ دار عورتیں گھی شکر اور روٹیوں کی چنگیریں لے کر نیچے آ گئیں جبکہ مرد ہاتھ منہ دھو کر وہیں بیٹھ گئے۔ مٹی کے پیالوں میں شکر ڈال کر سامنے رکھ دی۔ ایک عورت مٹی کے برتن سے گھی ڈالتی جا رہی تھی۔ گرم گرم تندوری روٹیاں تھیں۔ فضل داد ایک طرف روٹھا روٹھا سا بیٹھا تھا۔

"لے ماما تو بھی بسم اللہ کر۔"

"بس دھیئے بھک ہی مر گئی ہے۔"

"اللہ جی خیر جزا کرے تو ہی روٹی کے لیے سب سے زیادہ رولا ڈال رہا تھا۔"

لوگوں کی مخولوں[1] نے دل مندا کر دیا۔

"ماما لوکی تو کھچاں کرتے ہی ہیں۔ مگر پھر بندہ ٹکڑا کھانا تو نہیں چھوڑ دیتا۔ پرے دفع کر سب کو روٹی بھی میری گھی بھی میرا کسی کو کیا لگے۔ تو سکھاں نال کھا۔ جتنا تیرا روح منے گھیوڑ پی۔ جو سڑتا ہے پڑا سڑتا رہے زری پرواہ نہ رکھ۔ تو سب سے پاس وانڈ[2] ہو کر ادھر بیٹھ جا۔ یہ گھیوڑ کا کٹورا اپنے ہی پاس رکھ لے۔"

کھانے سے فارغ ہو کر سب حقہ پینے بیٹھ گئے۔

عورتیں الگ ہٹ کر بیٹھ گئیں۔ سرور پھر امید سے تھی اس لیے نہ آ سکی وہ زیارت علی جیماں اور شیر زمان کو گھر سنبھالے بیٹھی تھی۔

"حسنی تو سنا تیری دوجی نوہ کا کیا حال احوال ہے وہ آئی نہیں تیرے ساتھ" نشیداں نے ماچس کی تیلی جلا کر چھوٹی سی چلم پر رکھی اور گہرے گہرے کش لیے۔

"وہ میری نوہ ہے؟ اللہ جی کسی دشمن سجن کو بھی ایسی نوہ نہ دے۔ جانے اللہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب سکندر خاں نے یہ ڈائن میرے متھے لگائی تھی۔ بڑی آکڑی دیکڑی تریمت ہے ویرو، کسی کی نہیں سنتی نہ کسی پاسے جاتی ہے۔ کوئی سگی بہن یا شادی ہو کہتی ہے میری کونسی سکداری ہے جو میں جاؤں۔ اور تیرے منہ پچھے کیوں جاؤں نہ تو مجھے نوہ سمجھے نہ مصری خاں تریمت۔"

"روز ہی تیرے گھر میں رولا گولا بنا رہتا ہے" گلاب جان نے کہا۔

"تے ہور۔ ہر ویلے کھپ پڑی رہتی ہے۔ بڑی بد زبان زنانی ہے۔ ہر ویلے منہ سے ایسے ہی نکلتے رہتے ہیں۔ پر ایک بات ضرور ہے۔ جتنی اسے لہر چڑھتی ہے اتنا ہی کام اگیرا کرتی ہے۔"

---

[1] مذاق۔ [2] علیحدہ

" مرضی کی مالک ہے۔ دل نہ کرے تو جھانڈا یہاں سے وہاں نہیں رکھتی۔ ساری دیہاڑ کھائے پیئے بغیر منجی پر لمی پڑی رہتی ہے" نور نشاں پہلی بار بولی۔

" یتر سے بھی جھڑتی ہے متی" شہنیداں نے پوچھا

" وہ تو ہواؤں سے بھی جھڑتی ہے۔ نور نشاں شوہری تو اس کے آگے زبان نہیں کھولتی۔ ڈراکل سی تو ہے۔ البتہ وہ اس کو اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے دیتی ہے اور جب سے اُسے یہ پتہ چلا ہے کہ نور نشاں کو خیری ڈھڈ ہو گیا ہے تب سے تو اکا اس کی جانی کی ویری ہو گئی ہے۔ اسکا کھاڑا ہی نہیں چھوڑتی۔ میں تو ماں اس ہر ویلے کے دگا فساد سے بیزار ہو گئی ہوں"

" مصری خان سے کوئی گل بات نہیں کرتی" نانی ماں نے پوچھا۔

" وہ آپ ہی اس سے پاس وان رہتا ہے۔ تبھی تو ہر ویلے اندر سے جلتی بلتی رہتی ہے۔ اُسے دیکھتے ہی ہلکائی کتیا کی طرح پھرنے لگتی ہے۔

نہ راتی اکھ لگاتی ہے نہ دنے دما کرتی ہے۔ دھاڑا یہ کل توڑی[1] میرے ہی مقدروں میں لکھی تھی"

" بڑی جبٹ ترمیت ہے۔ اس کا قصہ تو وانڈے گراواں میں مشہور ہے۔ اس نے یک واری جھلی گدڑی کے منہ سے جاکٹ کھس لیا تھا۔ رحمت جان نے بتلایا۔

" یہ کیا قصہ ہے چاچی زدی نہیں بھی تو سنا" ریشماں نے پوچھا۔

حسن جان نے نسوار دانتوں میں دبائی " زری مردوں سے بھی پوچھ لو۔ کسی شے کی لوڑ تو نہیں۔ روٹی پوری ہو گئی ہے"

" لکھاں تے مناں کے حساب سے پڑی ہیں۔ شامی ہور پکانے کی لوڑ ہی نہیں۔ چھولوں کی دال کا کٹوا چاڑھ آئی تھی۔ بے بے پکا رہی ہے" ریشماں نے جواب دیا۔

رحمت جان نے قصہ شروع کیا " شگندری اور اس کی گوانڈن پتن پر چیسڑے دھونے گئیں۔ اس کی گوانڈن نے اپنا نکا سارا جاکٹ آک کے بوٹے تلے سلا دیا۔ تقدیر یوں اس پاسے یک گدڑی آ گئی۔ اس نے دبا انٹے جاکٹ منہ میں دبایا اور دوڑ پڑی۔ مگر شوہدی کا ادیکا ساہ اوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور پھر اُسے کسی چیز کی سرت نہ رہی

شگندری ڈمنی اٹھا کر گدڑی کے پیچھے نس پڑی۔ گدڑی کی کھوہ تک جا پہنچی۔ ڈمنی مار مار کر اس کی سری بھن چھوڑی اور بچہ کھو لیا۔ پر اس ویلے تک اس کا ساہ ختم ہو چکا تھا۔ تھا بھی کتنا چوڑی کے نبجے جتنا تو تھا۔

---

[1] کالی بھنگ۔

"گدڑی کو مار کر بچہ کھسکا لانا کوئی مخول نہیں۔" نانی ماں بولی۔

"توبہ کرو دیرو۔ زنانیوں کا اتنا جگرا کہاں۔ میرا ویلا یاد رکھو۔ اس پر یقینی کسی جن کا سایہ ہے۔ اور ہو سکتا ہے یہ آپ ہی جنی ہو۔ مصری پر عاشق ہوگئی ہو اور اب زنانی کے بھیس میں اس کے پیچھے ٹور ٹور کر رہی ہے۔ کسی سیانے کے پاس جا کر تاب شتاب کڈوا۔" شفیداں نے مشورہ دیا۔

"ہے تو کچھ اوپری سی زنانی۔ قدبت منہ مہاندرا سب سے وکھرا ہی ہے۔" گلاب جان فکرمندی سے بولی۔

"زنانی کہاں پوری ڈراپی کی ڈراپی ہے۔" حسن جان بولی۔

"اللہ جی نے رنگو رنگ دنیا بنائی ہے۔ وکھو وکھ لوکی پیدا کیے ہیں۔ ایسی کیا بات ہے چنگی بھلی زنانی ہے۔ بال بچے دار۔ آخر پیچھے چار جاکت کڑیاں چھوڑ کر آئی ہے۔" رحمت جان بولی۔

"سچ تو ہے بوبو کو تو ہر پاسے بھوت جن پریاں ڈائنیں ہی نظری آتی ہیں۔ شکندری کو جنی بنا دیا۔ کیا قصور ہے شوہدی مسکین کا۔ سوائے اس کے کہ جی لالہ پر بھول بیٹھی اور ہو کچھ چھوڑ چھاڑ اس کے پیچھے نکل آئی۔" ریشماں بولی۔

نور نشاں نے شکایت بھرے لہجے میں ریشماں کی طرف دیکھا۔ "اکھیاں نوٹ۔ لونو ادھوڑا، میں سے بندہ بھیڈ بھی نہیں پہچان سکتا۔ میری بات مہردہ ننو۔ آپ پچھتاؤ گے۔ حسن جان تیرا کوہک پیتر ہے۔ اس کی بھلائی منظور ہے تو سیتھ پیر پلا۔ سخی زندہ پیر کی زیارت پر جا کر منت مان۔ فتح جنگ والے بابا فضل احمد سے دعا کرا۔ حسن میں اک سیانا رہتا ہے کسی معصوم کے انگوٹھے پر شیا ہی لگا دیتا ہے بس جی بچے کو ساری حقیقت نظری آنے لگتی ہے۔ اور وہ سارا کوڑھ سچ بتا دیتا ہے۔" شفیداں نے بتایا۔

"بڑی سوہنی گل کی ہے ماسی نے۔ آخر یہ پیر فقیر کس دیہاڑے کے لیے ہوتے ہیں۔ ویلے پر کام نہ آئیں تو ان کا کیا فیدہ۔ احتیاط چنگی شے ہے۔ چھپکڑ سے ہاتھ ملنے سے کیا حاصل۔" گلاب جان بولی۔

"تو آپ سیانی ہے حسنی۔ مصری جلیبا جرکا۔ ہمیش نماشاں ہی گھر مڑتا ہے۔ سورج چھپنے کے بعد تو رنگا رنگ مخلوقات باہر نکل آتی ہیں اور انسان کی گھات میں چار چوفیری پھرنے لگتی ہیں۔ ویکھے بندے کو تو چھوڑتی ہی نہیں۔ پچھے کا علاقہ تو آج بھی ڈھاڈا خراب ہے۔ ہر شے وہاں ہوتی ہے۔ بڈاوے، پیریاں، ڈنیں، مبار واح اور جانے اللہ کیا کیا بلا بتر۔ یہ چیزیں ٹنگی جائیاں، ویران کوٹھے، لستان،

۱۔ عاشق ہوگئی ہو۔ ۲۔ آخیر ہیں۔ ۳۔ تنہا۔

نیتے نکتے اور پنڈ پسند کرتی ہیں رہنے کے لیے۔" شفیداں اپنے مخصوص، پُراسرار انداز میں بول رہی تھی۔

"جُل اب مکا بو بو۔ کیوں ساروں کا تراہ نکال رہی ہے۔ اللہ جی خیر کرے گا۔ وہ اُدھر دیکھ ماما دھکی پر چڑھ رہا ہے۔" ریشماں نے ہاتھ کا چھجا بنا کر اوپر دیکھا۔

شفیداں مسکرائی "پرتتے جا رہا ہوگا۔"

"ڈھاڈی مندی عادت ہے۔ میری نظر تو ہر کسے کے سامنے نیوی کر دیتا ہے۔ آکھ آکھ کے تھک گئی ہوں کہ اب وہ اگتے والی بات نہیں۔ اب تیرا ساہ ہلتا ہے۔ پرتنے کے بعد گھنٹہ دو گھنٹہ ساہ ہی نہیں ٹھیک ہوتا۔ آندراں باہر آنے لگتی ہیں کھنگ کھنگ کے۔ مگر بڑا ضدّل ہے کسی کے آکھے نہیں لگتا۔" گلاب جان بولی۔

"خیر ہے ماسی۔ دُھد شروع کی پڑی وعید ہمیں نہیں جاتیں تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ وہ جانے اس کا کام جانے۔" ریشماں نے تسلی دی۔

"سارے ہی مندا کہتے ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔" گلاب جان پھر بولی۔

"چھوڑے پرے یہ قضیہ۔ اُٹھ یہ سارے جھوٹے بھانڈے اور چیزاں وستاں سانبھ سمیٹ۔ کل تک تو مساں میری پٹی مکے گی۔ ابھی تو سارے ول باقی ہیں۔" ریشماں اُٹھتے ہوئے بولی۔

"جتنا ترکھا کام ختم ہو جائے اچھا ہے۔ بہار کا کوئی پتہ نہیں کب بدل جائے۔ حال کی گھڑی دھوپ ہے۔ کل جھڑ ہو جائے۔ برسات ہو گئی تو کنک کالی پڑ جائے گی۔" رحمت جان بولی۔

سب چیزیں سمیٹنے لگیں۔

⁂

گیہوں گاہنے کے لیے میدان تیار کیا جا رہا تھا۔ کھلیزں کے درمیان ایک بڑے ٹکڑے کو بالکل صاف کر دیا گیا تھا اور اب عورتیں، مرد اور بچے اسے کوٹ کوٹ کر ہموار اور سپاٹ کر رہے تھے۔ ریشماں بھی پہنچ گئی۔

"کھلاڑا تو تیار رہی ہے کیوں لالہ"

"ہاں رنتی زیادہ دیری نہیں۔ اللہ جی کا حکم ہوا تو پہلے موہرے تیری کنک گاہیں گے۔ صابر اور وارث ادھر پھلا تیار کر رہے ہیں۔" پھر مظفر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یار یہ رمبلے اور

لے عادت، ے دھرہے، ے موسم، ے گیہوں گاہنے کا میدان۔
ے جس سے گیہوں گاہا جاتا ہے۔ ے جس سے کنک گاہی جاتی ہے۔

ریشماں اپنے چچازاد بھائیوں کے پاس چلی گئی جو درخت کے تین موٹے موٹے بھاری مضبوط تنے باہم باندھ رہے تھے۔

"یہ ڈنگریاں پھلاہی کی ہیں وارث ویر۔"

"ہاں بہن پھلاہی کی ہیں اور بھلی بھاری ہیں۔ کنک اچھی گاہی جائے گی۔ صابر زری دا کر یارا میں پہنچتا ہوں۔ ایسی کیا بھیڑ پڑ گئی ہے۔ اگر کام پیدا[۱] نہ ہوا تو اور کوئی وادا گھاٹا بن جائے گا۔ یہ رسّی ادھر مجھے دے۔ بہن ریشماں تو بھی زری ستھ اگیرے کرا۔ یہ کنڈے چمکیں گے تیرے پھٹے پر ڈال۔"

ریشماں بندھے ہوئے تنوں پر جھاڑیاں شاخیں بچھانے لگی۔ جب ایک چبوترہ سا بن گیا تو اس پر گھاس بچھادی تاکہ کانٹے وغیرہ نہ چبھیں۔

"چل یارا وا نرول کے ٹکروں پر پچالی ڈال۔"

"پھٹے کو واہے گا کون" ریشماں نے پوچھا۔

"وار و وار سارے دل او پر بیٹھیں گے۔ ہک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ دھوپ بڑی تیز ہے۔ مغزے کا تیل نکل آئے گا۔"

سب نے میدان میں گیہوں کے گٹھے کھول کر دائرے کی شکل میں بچھا دیئے۔ بیل اپنا بھاری بوجھ گھسیٹتے گیہوں پر گول گول گھومنے لگے۔ پودے چور چور ہو کر بھوسے میں تبدیل ہونے لگے۔ اور بوجھ کی رگڑ سے گیہوں کا چھلکا اترنے لگا۔ شام تک گاہنے کا عمل جاری رہا۔ شام کو بیل کھول دیئے گئے۔ اور آدھی گاہی ہوئی گیہوں پر مچھلی پکڑنے کے بڑے بڑے جال ڈال دیئے گئے تاکہ بھوسہ ہوا سے اڑ نہ جائے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک گیہوں مکمل طور پر چھلکوں سے آزاد نہ ہو جائے۔ کئی دن لگ گئے۔

"تیری تقدیر اچھی ہے ریشماں۔ آج تو ہوا بھی کھل پڑی۔ کنک اڑانے کا کام ہو جائے گا۔ ورنہ جانے اللہ کتنی ڈھل لگ جاتی اور تو درماندہ بیٹھی رہتی۔" شفیداں ریشماں سے بات کرکے خوشدل سے مخاطب ہوئی۔

"اوو ڈکیا[۲] کونسی ڈونگی سوچوں میں مست ہے۔ سانگیاں[۳] انوا اوپر سے۔"

---

۱ مضبوط۔ ۲ بڑوں کو بلانے کا طریقہ یعنی بڑے میاں۔ ۳ گیہوں اڑانے کے کانٹے۔

"ہلا بہن۔ بس ابھی سیتی وچوں دھڑ لگاتے ہیں۔ سارے نڈے بھڈے مل کر کنک اُڑا دیں گے۔"

ریشماں کے بھائی بند کانٹوں سے گیہوں اُڑانے لگے۔ ہوا کے رُخ پر بھوسے کے ڈھیر لگتے جا رہے تھے اور نیچے دانے رہ جاتے تھے۔ عورتیں دانے صاف کرکے بوریوں میں بھرتی جا رہی تھیں اور ریشماں بوریوں کے منہ سی رہی تھی۔

"نورنشاں یہ سیبا لے اور تو بھی زری بوریوں کو ڈنگا مار دے۔ کیوں ماسی شلیتے تھڑ تو نہیں جائیں گے۔"

"تو کیا ہوا مردوں سے کہہ کہ وہ شلیتے وہیڑے میں اُلٹ کر دوڑ لائیں۔ انہیں پرت کے بھر لیں گے۔ لوڑ پڑ ہی گئی تو صفدر خان کے گھر سے اُدھار منگوا لینا" شفیداں نے مشورہ دیا۔

"سارے دانے وچ ڈبانہ چھوڑیں۔ زری ماشہ اپنے خرچے ماروں بھی رکھ لینا۔" نانی ماں نے مشورہ دیا۔

"رکھوں گی۔ ہر ویلے چھٹری مکئی کھا کھا کر دل تنگ پڑ جاتا ہے۔ میں ہتے اپنے دانے وکری کروں گی بھی نہیں۔ کچھ مدّا الگ کرا آٹا پی کر وچوں گی۔"

"وئی اللہ کل اتروں کی جمی کتنی ہوشیار ہو گئی ہے۔ جد بھا اوچّا ہو گا تد وکری کر دے گی" رحمت جان بولی۔

"ہر کوئی اپنا فیدہ نقصان دیکھتا ہے چاچی۔"

"یہ تیرا نک منہ کیوں سُجا پڑا ہے گلاب جان۔" شفیداں نے پوچھا۔

"پھر وہی سختی ہے ماسی۔"

"تو یوں کرو بیرو۔ دھمیاں گھوٹ کر پی۔ اللہ جی کرے گا وَل ہو جائے گی۔"

"میں تو کبھی ان ڈاکٹروں کے نزدیک نہ جاؤں۔ رُپے بھر کے پیسے لے لیتے ہیں اور ایسی مندی مشک والی دارو پکڑا دیتے ہیں کہ کھادا پیتا باہر آ جائے۔ اپنی جالوں دارو سب سے اچھی۔ اللہ جی نے کوئی بوٹی کوئی شے بغیر وجہ کے پیدا نہیں کی۔ ہر شے میں کوئی نہ کوئی تو تاثیر رکھی ہے۔" شفیداں حلیم کے ساتھ ساتھ مشورے بھی عنایت کر رہی تھی۔

"ریشماں دھیئے یہ کنڈیاں تم لوگ اُٹھا لو۔ یہ زنانیوں کا حق ہے۔ میں سب کے حصے ونڈ کے

---

۱ بوریاں سینے کی باریک رسّی ۲ ادھی قسم کی چیز ۳ ترنگڑ باریک رسّی کے سوراخ دار تھیلے برائے بھوسہ
۴ وہ گیہوں جو کاٹنے سے رہ جاتے ہیں۔

دوں گی پھر تم لوگ مونگلیوں میں کوٹ کر چھل اُتار دینا۔" شفیہاں بولی۔

" چلو جی میرا گرمیوں کے لیے ماڑا موٹا سا چولا سکھن ہو جائے گا۔"

" میں بھی دانے ویچ کر دھیئو کے واج ماروں حصّے سے کوئی شے الوالوں گی۔" رحمت جان بولی —

" کتنی زنانیوں کو میں جانتی ہوں جنھوں نے خالی اِن کنڈیوں سے دھیئوں کے امن امان داج جوڑ لیے۔" نانی ماں بولی۔

کافی دن یہ سلسلہ چلتا رہا۔ لوگ باگ اپنا اپنا گیہوں اُٹھا کر لاتے رہے اور گاہتے رہے۔ گیہوں کی فصل سے فارغ ہو کر انہیں مکئی اور باجرے کی فصل کے لیے زمین تیار کرنی تھی۔ ریشماں کا کام ختم ہو گیا تھا۔ اب صرف بھوسہ سمیٹنا باقی تھا۔

" صابرو یر کتنا کھ بھوسہ ہو گا۔ تیرے خیال میں کتنے پوہاڑے بن جائیں گے۔" ریشماں نے پوچھا—

" تین پوہاڑے پنج منجیوں والے یقینی بن جائیں گے۔ بس ابھی بنا لیتے ہیں۔ زنانیوں سے کہہ دو تھوڑی مٹی گن لیں۔"

مردوں نے پانچ چارپائیاں گول دائرے میں کھڑی کیں اور درمیان میں بھوسہ ڈالنا شروع کیا۔ آج بچوں کا راج تھا۔ وہ کود کود کر بھوسہ دبا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ بھی ایک شغل آ گیا تھا۔ ہنسی قہقہے اور شرارتیں جاری تھیں۔ تنکے اُن کے بالوں چہرے اور کپڑوں سے چمٹ گئے تھے۔ سنہری دھوپ میں تنکے سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ بھوسہ ایک اونچے مینارے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔

" شاواوے جاتکو۔ سستی نہ کرنا۔ سوہنا کام کرو گے تو کچّی[1] بنا کر دوں گی اور ساتھ دوں گی سیٹھی گڑ گیا اور تو نکیا تو ادھر کیوں پلپ رہا ہے۔ اوپر چڑھ۔ لا میں چاڑھ دوں۔" ریشماں نے ایک چھوٹے بچے کو اوپر چڑھا دیا۔

" لے بھئی ریشماں معاملا تیار ہو گیا۔ اب نری تو اُوپر چڑھ۔ ناڑیں[2] اوپر رکھ کر مٹی سے لیم دے۔" بچے شور مچاتے اوپر سے نیچے کودنے لگے۔ وہ اپنے سر اور کپڑے جھاڑ رہے تھے۔ سارے بدن میں کھجلی چھڑ گئی تھی۔ سب کھُجا رہے تھے اور بسُور رہے تھے۔ شیر بہادر نے ریشماں کو اوپر چڑھا دیا اور سار

---

[1] دودھ کی لسّی [2] گیہوں کے سوکھے پودے۔

نے اور گمیوں کے پودے بچھا کر بڑی نفاست سے لپائی کر دی۔

"کوندر لاؤ تاکہ پوہاڑے کے آس دیری پھرا کر اسے پیڈا کر کے باندھ دیں۔" خوشدل نے میر افضل سے کہا۔ سب نے کوندر کی موٹی سی رسی سے بھوسے کے منارے کو باندھ کر چار پائیاں کھینچ لیں۔ نورنشاں اور ریشماں مل کر چاروں طرف لپائی کرنے لگیں۔

"جی لالہ نے کوئی کام نہیں کرایا۔ آیا تو گلہ دوں گی۔ بندہ دو یک دن چھٹی کر لے تو کیا فرق لگ جاتا"

"آج شامی آئے گا۔" نورنشاں نے مٹی لگاتے ہوئے کہا۔

"چنگا تو پھر دیہاں اللہ کیتا بھلی لڑائی ہوگی۔ میں اسے اپنے سگے بھرا سے بھی ودھ سمجھتی ہوں پر وہ تو جس دن کا ویاہیا گیا ہے وسار ہی بیٹھا کہ کوئی شودھی مسکین اس کی بھی بہن ہے۔ ملنا گلنا ہی چھوڑ بیٹھا۔"

"جس دن کا اس موتو جوگی نے گھر میں پیر رکھا ہے شو ہے کا مغز ہی بھورا ہو گیا ہے۔ ہر ویلے فکر کرتا رہتا ہے۔ خداوندی گل یہ ہے کہ میں آپ اپنی اس جند سے تنگ آگئی ہوں۔ شکندری کا وس چلے تو مجھے کوہ کے پھینک دے۔"

"میں تو اپنے کم کار میں ایسی ڈبی کہ کٹیر خبر لینا ہی بھول گئی۔ کل آؤں گی تب دیکھوں گی۔ رحم ایسی کیا بات ہے۔ انسان کی بچی ہے تو سدھی ہو جائے گی ورنہ اپنا ہی کج زیان کرے گی۔ ایسی اڑونگی اور بدزبان تربیت کو کون گھر رکھ سکتا ہے۔"

۴

ریشماں جیسے ہی دروازہ سے اندر داخل ہوئی ٹھٹھک کر رہ گئی۔ شکندری آستین چڑھائے بغیر دوپٹے کے بیچ آنگن کے تنی کھڑی تھی۔ اس کی بھری بھری مضبوط کلائیوں میں سبز چوڑیاں پھنسی ہوئی تھیں۔ سرخ پھولدار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سیدھے سیاہ بال کھلے ہوئے تھے۔ چوڑے نتھنے اور بھی چوڑے لگ رہے تھے۔ غلافی آنکھوں میں آگ دہک رہی تھی۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ نورنشاں کمرے کی دہلیز پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ مصری خان تندور کی مینڈھ پر بیٹھا آسمان کی طرف تک رہا تھا۔ گہرے نیلے آسمان پر پرندے قطار اندر قطار آزاد سرخوشی کے عالم میں یوں ہولے ہولے اڑ رہے تھے جیسے خود اپنی پرواز سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ چاندی کی طرح چمکتے سفید بادلوں کی کشتیاں آسمان کے نیلے پانیوں میں رواں دواں تھیں۔ ہر چیز پر کاہلی اور سکوت سا چھایا ہوا تھا۔ شکندری کی غصہ

---

۱ ایک مقامی پودے کو بٹ کر رسی بناتے ہیں۔ ۲ مستری۔

بھری آواز نے سکون درہم برہم کر دیا۔

" اوپر کیا بٹ بٹ تک رہا ہے۔ او پر تیری مٹو کا جنا تو نہیں بیٹھا۔ کون سا ویلا ہو گیا مجھے مغز ماری کرتے۔"

مصری خان نے ایک طویل سانس لیا اور بیزاری سے شکندری کی طرف دیکھا۔

" تجھے جو بکنا ہے بے شک بکتی رہ۔ لیکن اگر میری مٹو کا نام لیا تو چھتر مار مار کر تیری بوتھی لال کر دوں گا۔"

" آیا بڑا وہاں سے چھتر مارنے والا۔ تیرے میں اتنا دم ہی نہیں۔ تو میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ مَیں چھڑا یہ پوچھ رہی ہوں کہ مَیں تیری کچھ لگتی ہوں کہ نہیں۔ یا تونے مجھے بھی مال ہال سمجھا ہُوا ہے جسے بھورے میں باندھ کر تو بے غم ہو گیا ہے۔"

" مَیں نے تیرے پیر پکڑے تھے کہ میرے پیچھے نکل آ۔ بندہ کنک را ہوے تے کنک ہی کپنا ہے۔ بکواس کر کر کے کلیجہ کھا گئی خنزیر کی بچی۔"

" ہاں جی۔ مَیں خنزیر کی بچی ہوں۔ اور یہ ماچس کی تیلی کس کی بچی ہے جو ساری دیہاڑ رنگین بادوں والی انوار[1] کی منجی پر پڑی بلاتی رہتی ہے۔ یہ ہے تیرا انصاف کہ مَیں تو راتی دیہاڑی کام میں جتی رہوں۔ مال ہال سنبھالوں لیاریوں کا دودھ نکال کر رڑکوں۔ مکھن گھی بناؤں کھائی پکائی کروں چیڑے دھوکل پانی بھر کر لاؤں اور کو ندر کی بھیڑی منجی پر پڑی کلپتی رہوں۔ تیرے دو میٹھے بولوں کے لیے ترسوں۔ اور یہ شاہ بہرام کی دھی ساری راتی تیری چھاتی پر سر رکھ کر سوئے۔"

نوزنشاں کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ مصری خان کے نتھنے غصّے سے پھڑکنے لگے۔

" بے حیا کہیں کی۔ جو تجھے میٹھے بول سناتا تھا اُسے کیوں چھوڑ آئی۔ جا چلی جا واپس اُس کے پاس۔ میری جان سوکھی کر۔"

" وہ حرامی اگر میٹھے بول سنانے والا ہوتا تو مَیں تیرے پیچھے ہی کیوں آتی دل پر وٹا[2] رکھ لیتی۔ اوکھی سوکھی گذران کر ہی لیتی۔ وہ بدبخت کم از کم گالی گفتار تو کرتا تھا۔ روز بیٹہ مار مار کر نیل ڈال دیتا تھا۔ جینا جاگنا بندہ تو دکھتا تھا۔ تیری طرح وٹے کا وٹا تو نہیں بنا رہتا تھا۔"

مصری خان چپ رہا۔

" مصری خان آخر میں تیری ٹبری ہوں۔ میری تیری دعا بندھی ہے۔ اللہ رسول اور سارا جگ گواہ ہے۔ مَیں تیرے سے زیادہ کی سوالی تو نہیں ہوں۔ اپنا پورا حق بھی نہیں مانگتی۔ خود کو نوزنشاں کا ساڈیں سٹ بھی نہیں سمجھتی۔ اجوں کہ وہ بھی تیرے پیچھے ہی نکلی تھی اور اس کی دعا میں تو

---

1. نواڑ 2. برابر

والا کا اک بندہ بھی شاملات نہیں مجھا تھا۔ تیری زری سی نظر مانگتی ہوں۔ میرے سے بھی کدی کدار کوئی گل گت کر لیا کر۔ آخر میں مٹی کی مورت تو نہیں ہوں۔ جیتی جاگتی جوان تریمت ہوں۔ تو نے کیا سمجھا ہے مجھے کیا میں چھڑی تیری صورت تکتے تکتے جند گزار دوں گی۔"

"یہ بات میں نے پہلے موہرے صاف کر دی تھی۔ مجھے تیرے ساتھ کوئی لگوت نہیں ہے۔ تو نے خود کہا تھا کہ بس دعا بند ھوا دو میرا ہور کوئی سوال نہیں۔"

"ویاہ سے پہلے کس کو کس سے لگوت ہوتی ہے۔ یونہی انھے مودے ویاہ شادیاں ہو جاتی ہیں۔ مرد زنانی بن کر ہی اک دوسرے سے ہلتے ملتے ہیں۔ زنانی زنانی تو ایک سی ہوتی ہے۔ مجھ میں اور نور نشاں میں کیا فرق ہے۔ اس کے پاس میرے سے ودھ کون سی شے ہے۔ ماڑی مڑنگ بہاری کی تیلی۔ چھڑی ہڈی اور چمڑا۔ دو وقت دم ہلتی ہے تو کھڑکنے لگتی ہے۔ ہک ویلے آٹا گوندھتی ہے تو انکھیوں کے آگے مکھی تھپرنے لگتی ہے۔ یہ بھی کوئی زنانی ہے۔ جس میں نہ جان نہ طاقت۔ میں نو سمجھی تھی کہ ہولی ہولی تو راہ پر آ جائے گا۔ پر تجھ پر تو اس گنڈوئی کا جادو چڑھا ہوا ہے۔"

نور نشاں تلملا اُٹھی " میں گنڈوئی ہوں۔

ہور تو کیا ہے۔ سپنی۔ ہر ویلے شوکتی رہتی ہے۔ ہر بندے کو ڈسنے کو تیار۔ چھپنی کی نک نہیں پر کن ڈھاڈے تیز ہیں۔ دوسرے نڑے میں ہونے والے گوشے بھی سُن لیتے ہیں۔ بے شرم اتنی کہ ساری راتی میرے بوئے کے ساتھ کن جوڑ کر بیٹھی رہتی ہے۔ مرتی بھی نہیں سڈی کی سڈی۔"

شکندری نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "مرے مری پیزار۔ تُو اپنی فکر کر جس کے بُتے میں ابھی سے کوئی ساہ نہیں ہے۔ مرمُندی دکھتی ہے۔ میں تو سب کو مار کے بھی نہ مروں۔ میں مصری خان کے متھے لگوں گی۔"

"زبان کھینچ لوں گا دونوں کی۔ چُپ نہیں کرتیں۔" مصری خان چیخا۔ "ایک دن کے لیے گھر آتا ہوں۔ شیپا گھڑی دنا کر دں گا۔ کسی سے ملوں گلوں گا۔ بریہ دل سڑی تو میرے گل منگ ہی ہو جاتی ہے۔ کیا کروں۔ کیا آنا چھوڑ دوں۔ دُور دفعان ہو شکندری۔ تیری صورت دیکھ کر مجھ کو کراہت آتی ہے۔"

"دھاڑا دھاڑا۔ اس کو میری صورت سے کراہت آتی ہے۔ اس مڑدے کا مغز خراب ہو گیا ہے۔ تو سمجھتا ہے تجھ پر خالی نور نشاں کا حق ہے مگر اتنا یاد رکھنا اگر تُو میرا نہ بن سکا تو نور نشاں کا بھی نہیں بن سکے گا۔ ونڈ کے کھانا اچھا ہوتا ہے۔ ہم دونوں سادیں سٹ ہیں۔ کوئی کسی سے گھٹ ودھ نہیں ——

۱۔ جکہ آنا ۲۔ مٹھے ۳۔ کانا پھوسی ۴۔ سانڈنی ۵۔ مصری خان کے ہاتھوں مروں گی
۶۔ جھاڑ کا کانٹا۔

نوز نشاں بھی منبرے میں سے یہ بات نکال دے کہ وہ سوتاں تجھے قابو کرے گی۔"

" کیا کرے گی تو مجھے پھاہی لگا دے گی۔ میرے گھر وسنا چاہتی ہے تو اسی طرح وسنا ہو گا۔ ورنہ وہ سامنے بُوا کھلا ہے۔ جدھر تیرا دل کہتے بے شک دفع " مصری نفرت اور بیزاری سے بولا۔" وخت ڈال لیا اس کو گھر ڈال کر۔"

شکندری کی آنکھوں میں پاگل پن لہریں لینے لگا۔ اس نے سختی سے دانتوں پر دانت جما دیے مگر غصّے سے اس کا اوپر کا ہونٹ کھچ گیا اور سفید چمکیلے دانت نمایاں ہو گئے۔ اس نے ایک پھنکار سی ماری اور بغیر ایک لفظ کہے مڑ گئی۔ چارپائی پر پڑا دوپٹہ اُٹھا کر سر پر ڈالا اور تیزی سے دودھ بلونے لگی۔ ریشماں کانپ اُٹھی " واقعی عورت کہاں پوری گھیاڑی لگتی ہے۔ سچ ہی کہتی ہے شفیداں بوبو یہ انسان نہیں کوئی بلا ہے۔" ریشماں نے سوچا اور مصری خان کے پاس چلی گئی۔

" کیا بات ہے جی لالہ۔ آج شکندری بڑی تپی ہوئی ہے۔"

" یہ تو روز کا تماشا ہے بہن۔ زنانی نہیں جلتا ہوا انگار ہے۔ جہاں گرتا ہے ساڑ چھوڑتا ہے۔"

" اگر ایسی بات ہے جی لالہ تو پھر ہوش سے کام لے۔ کدی کدار اس شودہری سے بھی گل بات کر لیا کر۔ تا کہ اگ ٹھنڈی رہے دھیان ایسا نہ ہو کہ گھر ہی ساڑ کر چھائی کر دے۔"

" میں کیا کروں اس والی دل ہی نہیں ہوتا۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ خان لالہ کے پاس جرگہ لے کر جاؤں۔ انہوں نے ہی یہ کرائی ہے۔ وہاں جا کر گیٹیاں[۲] پھینک دوں گا کہ اگر آگے اس نے لڑائی کی تو معاملہ ہلیش[۱] واسطے ختم۔"

" کیسی باتیں کرتا ہے تو جی لالہ۔ گیٹیاں سُٹنے سے کیا شکندری گھُنّا چھوڑ دے گی۔ بندے کی فطرت کدی نہیں بدلی۔ خان لالہ تجھے کدی اس کا اجازہ نہ دیں گے۔ آخر تو بھی عقلے والی گل کر۔ تو اس کے سر کا سائیں ہے۔ تیرے پیچھے گھر بار بال بچّہ سب فنا کر کے نکل آئی ہے۔ تو نے بھی اس کو دھکّا دے دیا تو یہ کہاں چخیں مارے گی۔"

" تو میری سہیلی ہو کر اس کا دھڑا کر رہی ہے۔" نوز نشاں تلخی سے بولی۔

" اس میں دھڑے والی بات کیا ہے۔ خداوندی بات کر رہی ہوں۔ دعا تو بندھی ہے نا بھاویں خوشی سے بھاویں زوروں۔ اب تو شکندری بھی جی لالہ کی تریمت ہے۔ اگر زری ماشہ اس کا بھی خیال کرے تو ایسا کیا غناہ ہے۔ تو آپ سیانا بندہ ہے۔ ایسی خطرے ناک اور منہ زور زنانی کو سختی سے قابو

---

۱ کمل ۲ زمین پر کنکریاں پھینک کر کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہُوا تو خود بخود طلاق۔

کیا جا سکتا۔ روٹیں نال ہی کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر کہیں کل کلموتر تیرا لوز نشاں یا بچّوں کا کوئی نقصان زیان کر دے۔ پھر؟۔ سچی بات یہ ہے کہ اس زنانی پر میرا سوٹھا[۱] نہیں ہوتا۔"

"تو پھر مَیں کیا کروں؟" معری خان جھنجلا گیا۔

"کرنا کیا ہے تیری تریتی ہے۔ جو بھی لڑ نا کر اس کو قابو کر۔ ڈھلا[۲] یار چھوڑ دے۔ چنگی بھلی زنانی ہے بد شکل بھی نہیں۔ لوگوں نے فضول اور نکمّی باتیں کر کر کے تیرا دل اس دُمیں مندا کر دیا ہے۔ لوگوں کا کیا ہے ان کی تو وہی بات ہے کچھ بنائی چھوڑے لوکاں شیشے بھن تروڑ۔"

"شادانی سہیلیئے آج تو نے مجھے حیران پشیمان کر دیا ہے۔" لوز نشاں تیز ہو کر بولی۔

ریشماں سنی اَن سنی کر کے بولی "جی لالہ چنگے نال سب چنگے مندے نال کوئی چنگا ورتے تب بات ہوتی ہے۔ ہوش کر ابھی کچھ نہیں بگڑا۔"

"دھاڑا لوٹی۔ کیسے معری خان کو ولا نکلار ہی ہے۔ میرا سائیں کس کے شکندری کے حوالے کر رہی ہے۔ وہ بڑی سکی ہے نا تیری۔"

"مَیں کیوں کھسوں تیرا سائیں تجھ سے۔ اللہ تجھے نصیب کرے۔ یہ سائیں تیرے پلّے باندھا کس نے ہے۔ بڑی جلدی پچھلی باتیں وسر گئیں۔" ریشماں کا لہجہ زہرناک ہو گیا "تو تبھی سِدھی تیر رہتی جب بانی ترکھان اور اس کے پُتروں کی جتیاں سِدھی کرتی اور وہ تیری ہڈیاں تروڑتے۔ زیادہ بڑھ بڑھ کر بولی تو جیب کپ کے تلی پر دھر دوں گی۔ یہ میری ماسی کا گھر ہے۔ جی لالہ دین دنیا اوّل آخر میرا ویر ہے۔ مَیں اس گھر کی تباہی بربادی نہیں جھل سکتی۔ تو ٹھہری پرائی دھی تجھے وہ درد کہاں ہو سکتا ہے جو مجھے ہے تیری خفگی کی مجھے زری پرواہ نہیں۔ آخر مرد دو دو زنانیاں کرتے ہیں انھیں خوش بھی رکھتے ہیں۔ کوئی نویں گل تو نہیں ہو رہی۔ میری وار اس طرح کھوری ہو کر نہ تک۔ تو میری سہیلی ہے بر یہ میرا ویر ہے۔ لکھی ولنی نہیں۔ تیرے مقدروں میں سوکنی لکھی تھی۔ لکھتی پرشاکر ہو جا۔"

لوز نشاں نے کمرے میں گھس کر زور سے دروازہ بند کر لیا۔ "بلا پوے۔ کل تک مٹّی میں رُل رہی تھی۔ آج خصم جُڑ گیا تو پیر ہی زمین پر نہیں لگا رہی۔"

ریشماں خفا ہو کر فوراً ہی باہر نکل گئی۔ معری خان اُسے بُلاتا ہی رہ گیا۔

OO

۱۔ نرمی، ۲۔ بھروسہ ۳۔ سختی ۴۔ بھلا پھسلا

نظمیں

احمد ندیم قاسمی - پشتو نظم ایوب صابر
اردو ترجمہ جمیل حشمی

سب کے شاعر
اے انسان کے نغمہ گر
تجھے سلام
اے انسان کے نغمہ گر
رنگ اور نسل کے عالم سے تو بالا ہے
تو لاہور اور سرگودھا کا نہیں ندیم
تو ساری دنیا کا رہنے والا ہے
پاک وطن سے پھیلی ہیں تیری خوشبوئیں ترے رنگ
تو انسان کے ساتھ ہے اور ساری انسانیت تیرے سنگ
رچنا میں، مہران میں تو
خیبر اور بولان میں تو
تورخم اور بدین میں تو
اے انسانیت کے گلشن کی خوشبو کے اور رنگ کے شاعر
اپنے پاک وطن کے نام و ننگ کے شاعر
اے انسان کے شاعر
اے لاہور کے کوی
باگرام (پشاور کا قدیم نام)
مرے باگرام کے شاعر
اے انسان کے نغمہ گر اے سب کے شاعر
میری جان!
عظیم انسان
اے صابر ایسے اس دور کے دوزخ میں جلنے والوں کے نغمہ گر
ہے تجھے خبر
اس دوزخ میں تو بھی جلا ہے
جیسے ہم سرحد والے اپنے مہمان کی خاطر
دنبے کو اس کی چربی میں بھونتے ہیں!

جمیل الدین عالی

امّا بعد

○

نرم لمحوں کی رنگینیوں
لذّتوں شدّتوں
کا بیاں
اب بھی ممکن نہیں
سخت لمحوں جاں کاہیوں
درد انگیزیوں۔ اضطرابوں عذابوں
کی وہ داستاں
اب بھی ممکن نہیں
اے خدا
تُو نے اتنا دیا
اب مجھے تابِ اظہار دے
سچ کا آزار دے
حُسنِ گفتار دے

غلام جیلانی اصغر

سردیوں کی ایک رات

○

ہوا رات بھر گیت گاتی رہی ہے
کبھی سرسراتے لباسوں میں خوشبو کی ہلکی سی جُنبش کی لَے میں
کبھی کوہساروں کے ہیکل میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کی طرح
گنگناتی رہی ہے
کبھی اِس طرح جیسے شوریدہ ندی
چٹانوں کے سینے سے نیچے اترتے ہوئے
اپنے پاؤں کی پازیب سے پتھروں سے کوئی گفتگو کر رہی ہو۔
کبھی اس طرح،
جیسے مندر کی چوکھٹ پہ اِک دیو داسی،
سمٹتی۔ لجاتی
بڑی نرمگی سے قدم دھر رہی ہو۔
کبھی اِس طرح جیسے ماندوں کے پردے سے زخموں کا سارا
لہو رِس رہا ہو۔
کبھی اس طرح جیسے بیمار کوئی
تنفّس کے اُس آخری مرحلہ پہ ذرا رُک گیا ہو

منیر نیازی

اس کے باہر صرف ڈر ہے رات کے ہنگام کا

اک دھندلکا صبح کا ہے اک دھندلکا شام کا
اور ان کے درمیاں دن کارِ بے آرام کا

سانس لینے ہی نہیں دیتا یہ وقفہ کام کا
کچھ ذرا فرصت ملے تو یاد آئے یار بھی

اس کی صحبت میں جو تھی وہ ساعتِ سیار بھی
دو حدوں پہ ہے جو قائم وہ درِ دلدار بھی

میری ہستی میں بھی آئے ایک دن آرام کا
اک دھندلی صبح کا اور اک دھندلی شام کا

منیر نیازی

لاہور ٹاؤن شپ پر ایک نظم

○

جس شہر میں رہا میں برسوں کی زندگی میں
کاٹی حیات جس میں شرمندہ خامشی میں

اس شہر کی حدود پر میں گھر بنا رہا ہوں
ماہِ منیر جس پر شب گیر ہو رہا ہے

اک شہر ساتھ میرے تعمیر ہو رہا ہے،
میرے مکاں سے آگے میداں کہیں کہیں پر

آبادیاں کہیں پر خالی زمیں کہیں پر
اک بڑھ کا پیڑ جو اب کچھ پیر ہو رہا ہے

جگمگ دکاں سے ملتے سنسان راستے پر
اک لالٹین والے تنور کے سرے پر

اک مرد اور عورت اک سوچ میں کھڑے ہیں
وحشی غزالی جیسے زنجیر ہو رہا ہے۔

اے دل — اے دل

سید رضی ترمذی

(۱)

یہ کیسا رستہ ہے ؟
جس میں آنے اور جانے کی کوئی سمت نہیں ہے ؟
مَیں کب اور کیسے آیا تھا ؟
اِس ویران خلا میں دیکھتے دیکھتے
سب کچھ بھول چکا ہوں

○

سورج اِک دن میرے سامنے
دُور — اُفق کے پار کہیں اندھے غاروں میں جا اُترا تھا
تب سے چار طرف رستوں میں
سائیں سائیں کرتی رات
سِسکتی پھرتی ہے
اور سَرد ہوا میں
پچھلی رُتوں کے نوحے
اور یاروں کے دُکھ ہیں
اور مَیں بیٹھا دیکھ رہا ہوں

○

لیکن ایک زمانہ گذرا
یاد ہے ؟

جب ہم دونوں، — میں اور تم
خوابوں کی پاگل پاگل چاندنی راتوں میں
اپنے جذبوں کے رنگین پرندوں کے پیچھے بھاگا کرتے تھے
خاموشی کی گہری، ساکن جھیلوں پر
نغموں کے شگوفے کھلنے کی آواز سنائی دیتی تھی
اور ہم دونوں
اُن دیکھی، اَن جانی راہوں میں کھو جاتے تھے
جب چاند درختوں کی شاخوں سے پھسل کر
ساکن جھیل پہ آ کر تیرنے لگتا تھا

○

وہ دن یاد ہیں؟
اور اب دیکھو
اس ویران خلا میں دیکھو
کچھ بھی نہیں ہے
اس بے پایاں وسعت اور تاریکی میں
اُن پچھلی رُتوں کا
ایک بھی خواب نہیں ہے، لیکن
ہم دونوں
محرومی کے درد سے بوجھل سناٹوں کے اس جنگل میں
بیٹھے ہیں
بیٹھے دیکھ رہے ہیں
اِس رستے میں آنے اور جانے کی کوئی سمت نہیں
اور پھر بھی کتنا سفر باقی ہے !!!

(۲)

دیکھو رات کا یہ سنّاٹا
سنّاٹے میں بوجھل، سرد اندھیرا برس رہا ہے
ہوا کے جھونکے دروازوں کے پیچھے کیسے سسک رہے ہیں
شہر کے قبرستان کے باہر
شاید وقت کہیں سستانے بیٹھ گیا ہے
یہ موسم، — یہ یادوں کے دُکھ کا موسم
اور مَیں، — اور تم
اور کوئی نہیں ہے،
آؤ ہم آپس میں بیٹھ کے خود سے اپنی باتیں کرلیں
مَیں جو کچھ ہوں
اور جو کچھ تم میرے لیے ہو
کوئی اور نہیں ہو سکتا!
دیکھو، — رات کی یہ آواز سُنو
اور سانس نہ لو
اور آنکھیں اپنے اندر کھولو،

○

یاد ہے، جب
ایسے ہی پچھلے موسم میں
ہم تم بیٹھے تھے
رات کا گہرا، سرد، سیہ سنّاٹا تھا
اور اُس میں اِک بے پایاں، بے ساحل وسعت کی ویرانی تھی
(وقت نہیں تھا)

ایسے میں وہ تیز ہواؤں کا طوفان
اور صدیوں کے سوکھے، مردہ پتّوں کی بارش
جس میں سارے شہر کی دیواریں تک ڈوب چلی تھیں
یاد ہے کس نے
گھر کے دروازے پر آکر دستک دی تھی
مَیں تو خوف سے کانپ رہا تھا
دروازہ تم نے کھولا تھا
باہر خاک اور خون میں لت پت
میرے اور تمہارے خواب کھڑے کہتے تھے
"ہم یہ دیکھنے آئے ہیں
کیا تم اپنے خالی جسموں کو ساتھ لیے
اب تک زندہ ہو!!"

(۳)

یہ صدیوں کے جُھلسے پیڑ
یہ بِکھرے، کالے، جُھلسے پتھر
حدِّ نظر تک پھیلا ریت کا تانبے جیسا سُرخ سمندر۔
دیکھ رہے ہو؟
اور اس ریت کے سُرخ سمندر پر یہ اُڑتے، چکر کاٹتے
پیاس سے چُور پرندے،
کیسے چیخ رہے ہیں،
پانی کی اِک بُوند نہیں
اور ہواہیں دُھوپ کی آگ بھری ہے،
یہ ویران کھنڈر
جس کی دیواروں کے پتھر اس ریت پہ چارطرف بِکھرے ہیں،
شاید اِک بستی تھی،

دیکھو، —— اس کی ویرانی، بربادی دیکھو!!
—— یہ سب میں ہوں،
یہ منظر، یہ سارا منظر
میرے اندر کا منظر ہے
میرے اندر سوکھے، جھلسے پیڑ اُگے ہیں،
ریت کا سُرخ سمندر میری پیاس ہے
میرے جسم کی دیواروں میں بند پرندے چیخ رہے ہیں
—— کوئی دن میں
میری جگہ پر کوئی اور بکھرا دیکھے گا
میرے ٹوٹے، جھلسے پتھر
اس مٹی میں بکھرے ہوں گے

۱۹۸۰ء میں ایک سالگرہ

اختر حسین جعفری

صبحِ خیرات تھی
شامِ صدقات تھی
اور اُس شام بھی میں نے مسلے ہوئے پھول کی دوستی
زندگی کی دعا مانگی چوبِ تاریک پر
شاخِ نامعتبر پر نچھاور نہ کی

دوستوں کی مُدارات کا سلسلہ
آنسوؤں سے چلا

ٹہنیوں پہ سجے مہر و انجم کی ضو
شمعداں کی لَو
پتّیاں ، بتیاں
سالگرہ ہواؤں سے بجھتی نہ تھیں

کانپتی انگلیاں
دم بخود کلک ، نم خوردہ مہتابیاں
کانپتی انگلیوں کے فتیلے، قلم میرے اثبات کا حرف لکھتے نہ تھے

وصل کی شام بھی
قتل کی شام تھی
اور اُس شام بھی میں نے مسلے ہوئے پھول کی دوستی
زندگی کی دعا مانگی چوبِ تاریک پہ
شاخِ نامعتبر پہ نچھاور نہ کی

صلاح الدین محمود

نظم

نہیں نہیں
میں نہیں جلوں گا
تارے کی سوگند
نہیں نہیں
میں نہیں رہوں گا
بارش کا پابند

بند ہوا
لمحوں کے اندر
جیسے دریا بہہ کر
ہو جاتا
ساگر کے اندر
ساگر کا پیوند

ایک سیاہ
لمحے کے تن میں
دو سورج آن جانے
اِک اُجلے
پل کی جنبش میں
چاندر دو
بیگانے

نہیں نہیں
میں نہیں مروں گا
پانی کی سوگند
نہیں نہیں
میں نہیں رہوں گا
بارش کا پابند

نہیں نہیں
میں نہیں بھٹوں گا
دریا کی سوگند
نہیں نہیں
میں نہیں رہوں گا
بارش کا پابند

صلاح الدین محمود

دوہری رات کا ہم زاد

شجر تمھیں معلوم کہ پانی
کس صورت کا ہوتا
رات کی دوہری
آوازوں میں
کون سمندر ہوتا

شجر تمھیں معلوم کہ دریا
کیوں پتھر میں سوتا
سیاہ ستارہ
چاند کو چھو کر
کیوں اندھیارا ہوتا

شجر تمھیں معلوم کہ تم کیوں
سدا شجر کے بانی
کبھی تمھارے غیب میں چمکی
بارش کی عریانی

شجر تمھیں معلوم کہ پانی
بارش کا ہم زاد
بارش تھم جاتی تو پانی
بن کر آتا باد

شجر تمھیں معلوم کہ میں بھی
کبھی کبھی بہہ جاتا
شجر کی سیرت میں ہر طائر
دریا کا ہو جاتا

شجر تمھیں معلوم کہ پانی
کس صورت کا ہوتا
رات کی دوہری
آوازوں میں
کون سمندر ہوتا

شجر تمھیں معلوم

شب اور لب کی نیند کے اندر

صلاح الدین محمود

شب اور لب کی نیند کے باہر
تم بھی کچھ تو بولو
سبک بنو جتنے تم شب بھر
اتنا لب تو کھولو

شجر کی پسلی سے باہر کو
جھانکیں سیاہ پرندے
لہو کے آنگن میں تم لب بھر
بینائی کو بولو

تنہائی، سورج کی پتے
پھول، قمر کا بچپن

چاند اور سورج کی خوشبو کو
شجر کے بھیتر تولو

نہیں، ہواؤں کی نسبت میں
نہیں سیاہی بننا
بہتے پانی کی قربت میں
لمحہ بھر تو سو لو

شب اور لب کی نیند سے باہر
کبھی کبھی تنہائی
شب اور لب کی نیند کے اندر
موت شجر تک آئی

معراج

صلاح الدین محمود

کل ہم نے اِک اونچے تن سے
شجر کی جانب دیکھا
کل ہم نے اِک طائر بن کر
دور شجر کو
اگتے تھمتے، بہتے پھلتے،
تھمتے چلتے دیکھا

کل ہم نے اِک تارا بن کر
اِک سورج، دو چاند پرے
اِک ساگر چلتے دیکھا
پھر ہم نے اِک خلا کے خم سے
اِک تارا، اندھا بے چارا
ایک اجالا دیکھا

دو آئینے وا دیکھے
اور دو کو تنہا دیکھا
پھر ہم نے دوہرے تاروں میں

اپنا چہرہ دیکھا
کل ہم نے

جلاوطن رات

صلاح الدین محمود

رات ایسی تھی
جیسے ایک وطن ہو،
جس میں
سورج جیسے، جلتے بن ہوں
شبنم کا آنگن ہو

رات ایسی تھی
جس میں تارے
اونچے اونچے شجر سہانے

لانبے لانبے تن ہوں
دوہری ایک کرن ہو

رات ایسی تھی
جیسے مجھ میں
تنہا ایک بدن ہو
ساکت سا چاندن ہو

رات ایسی تھی

شبنم رومانی

خیریت نامہ

○

مَیں ایک لمبے سفر سے
زندہ،
صحیح و سالم،
جو واپس آیا
تو کوئی پہچان ہی نہ پایا

ہر ایک یوں مجھ کو دیکھتا تھا
کہ جیسے میری جبیں پہ آنکھیں اُگ آئی ہوں
اور میرے شانوں سے چار بازُو لٹک رہے ہوں
کہ جیسے سب شیشہ تاب آنکھوں میں
بال میرے کھٹک رہے ہوں

ہر ایک یوں مجھ کو دیکھتا تھا
کہ جیسے میرا وجود مشکوک ہو
خدایا!
کہ جیسے مَیں ہوں
کسی کھنڈر کی اکیلی بیری کا کوئی سایہ
جو میری صورت پہن کے
اور میرا نام اپنا کے
اس خرابے میں آگیا ہو

ظفر عزنوی

تتلیاں اُڑ گئیں

○

پیلی مرجھائی ہوئی کرنوں کے دھاگے یوں بکھر کر جھیتی دھرتی پہ پھیلے
زندگی گہنا گئی
خندہ رو، روشن فضائیں تیرگی کا وار سہہ کر سو گئیں
صبحدم کلیاں جو کھل کر خوشبوؤں، رنگوں میں گھل کر جھومتی تھیں
الجھنوں میں کھو گئیں
اب بھی ان دھندلائی اور تشنہ فضاؤں میں پرندے اڑ رہے ہیں
شوخیوں سے سب مگر بے بہرہ ہیں
یوں
جیسے سب کوئی حسیں شے کھو چکے ہوں
سب کے سب ڈاروں میں یکجا، سرنگوں
دن کے سارے چہچہے، چونچیں بھلا کر جا رہے ہوں
سرنگوں لیکن کھلی آنکھوں سے دھرتی میں ٹھکانے ڈھونڈتے ہیں
آسماں نے جانے کتنے رنگ بدلے ہیں
چمن کی ہر کلی نے پھول بن کر پتی پتی ہو کے گرنے تک ذرا جھپکی نہیں ہے
حیراں سوچتی ہے،
سب کے سب دریوزہ گر تھے؟
اپنی اپنی منزلوں سے بے خبر تھے!

○

انیس ناگی

ایک نظم

○

میں سرد مہر زندگی سے کیا طلب کروں؟
طلب تو اک بحر ہے
زندگی تو سانس کی لپکتی ایک لہر ہے
جو آ کے پھر گذر گئی
چند سال اس کے نقش پا
یہیں کہیں کسی کے ذہن میں رہے

میں دیکھتا ہوں
شاخِ عمر زرد موسموں کی دھوپ میں
اسی خیالِ خام میں
کہ وقت گھڑی کی قید میں ہے
برگ برگ جھک گئی ہے

زندگی نے کیا دیا مجھے؟
طرح طرح کے عارضے دماغ کا بخار
اختلال اور حواس کے شعور کا ملال
رات کو میں جاگتا رہا ہوں
تمام دن بقا کی آرزو میں افسروں کے خوف سے
سست گاہ انتظار میں بہت ہی پھیکی مسکراہٹوں کے ساتھ
فیصلے کے انتظار میں لہو کی گردشوں کے ساتھ
ذات کی عظیم سلطنت کو آگ میں لپٹتا دیکھتا ہوں

یہ سگرٹوں کا ہلکوں دھواں، غبار ہی غبار،
بھاگتا سوار اسپ کا سنہری نا نعل راستے میں چھوڑ کر کدھر گیا؟
یہ شور اب کدھر سے آ رہا ہے؟
غور سے سنو،
نہیں یہ کچھ نہیں،
میں انتظار کی طویل ساعتوں میں ناخنوں سے میز کو بجا رہا ہوں
پرده کاغذوں میں غرق ہے
میں فیصلے کو اک غلیظ زیرِ پیرہن کی طرح اس نشست گاہِ انتظار میں کبھی کا چھوڑ کر
بہت قدیم رات، ابتدا سے انتہا کے لازوال بحر میں اُتر گیا ہوں۔
سارے دن کے غم کو میں
نشے کی اک رِدا میں ڈھانپ دوں؟
مگر نشہ حرام جرم ہے
تو پھر پلٹ کے میں خیال میں مقیم عشرتوں کو آئینوں میں دیکھ لوں
لذیذ تھرتھراتے جسم
ڈھول کی دھمک پہ لہر لہر کھِل رہے ہیں
الاماں، محرمات —
میں سرد مہر زندگی سے کیا طلب کروں
کہ وہ بھی خود اسیر ہے۔

موت قبول کرنے کے بعد

کشور ناہید

گیس بھرے غباروں کی طرح
ہماری گاڑی کے شیشوں سے، قہقہے نکلتے ہیں
کبھی کبھی چادر منہ پہ ڈال کے
میں قہقہوں کو قید کرنے کی کوشش کرتی ہوں
گھڑا میں گرتے پتھر کی آواز کی طرح

○

برسات میں چمکتے جگنوؤں کی طرح
ہماری آنکھوں کے باغوں میں رات کی رانی مہکتی ہے
میں دوپٹے پہ پلو میں جگنوؤں کو پکڑتی ہوں
بہت سی قید چڑیاں
پنجرے میں یہ پھڑپھڑاتی ہیں۔
رات کی رانی کی خوشبو،
آئینے کی طرح مجھے دیکھتی ہے۔
دائرے میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر
ناچتی لڑکیوں کی طرح، ہمارے سر چکراتے ہیں۔
میں آنکھیں بند کرتی ہوں
آدھی رات کو شعر لکھنے
اور بھری دوپہر میں سوچنے کی عادت
آنکھوں میں زنجیریں لیے آن دھمکتی ہے۔
آنکھوں میں لومڑیوں جیسی مکاری
مگر اوپر سے نیچے گرنے کا خوف
سارے خوابوں میں ایک ہی کمرہ
اور ایک ہی جالا تھا
مگر انسان بدل رہے تھے
پھر مجھے گاڑی، برسات، رات اور خواب۔

گنڈیں گرتے اور آیئنے میں کھڑی دیواروں کی طرح نظر آئے

O

گونگے انسانوں کی ہلتی انگلیوں کی طرح
ہمارے پیکر، گاڑی کی سیٹوں پر موج بن جاتے تھے۔
وہ موجِ پایاب، میری آنکھوں میں زعفران گھول رہی ہے۔
آؤ میرے ہاتھ میں ٹھہرے پانی کے دریا کو دیکھو
میری آنکھوں کے ڈوبتے چاند کی آخری لکیر
دو دھاری تلوار، پل صراط
ہوا کو لگا کے میں کس سمت جاؤں
کہ میرے پلو میں
جگنوؤں کی جگہ، یہ دعا بندھی ہوئی ہے۔

سانول موڑ مہاراں

خلا پہن کے ہوا میں پر مارنا
زندگی ہوتی
تو میرا ہی آشیانہ، سب سے اونچا ہوتا
بل کھاتی سڑکوں، گھنے جنگلوں
بہتے دریاؤں اور اترتی آبشاروں میں سے
کوئی بھی تو تم سے رشتہ نہیں بتاتا ہے۔
تمہاری دھار، چاقو کی سی تھی۔
مگر صرف چاقو کا دستہ بن کر
تم نے خود ہی پناہوں کے پردے چاک کئے۔
تمہاری زندگی کی ہر صبح
سورج کی منڈی میں بے بھاؤ اٹھالی گئی۔
تمہیں پرمٹ پہ جتنی آزادی ملتی ہے۔
اس کا راشن تو ایک صبح کے لیے بھی ناکافی ہوتا ہے۔

میں اب سمندر کی سب سے اونچی لہریں
خود کو تحلیل کر کے
ریت بن کے بکھر چکی ہوں
ساحل سمندر، میری وسعت
اور آنسوؤں کی طرح نمکین پانی، میری حیات ہے
آگ لگے پیروں کے ساتھ تڑپتی چڑیا
میرے سینے پہ آ گرتی ہے۔
ہوا اور تیز چلتی ہے۔
رات اور گہری ہوتی ہے
محبت مرنے کی قیمت دے کے حاصل ہوتی ہے۔
سمندر کی سب سے اونچی لہر اور میں
ساحل پہ بکھری ریت اور میں

مینڈا عشق وی توں

میں ہوا کی طرح آزاد ہوتی
تو کتنی بار تمہیں چھوا ہوتا
تم روشنی کی طرح ناقابلِ گرفت نہ ہوتے
تو میں تم میں بنانے کے علاوہ
تمہارے پیکر میں جذب تو ہو سکتی
شام کے لمبے سائے کی طرح
تمہارا سایہ مجھ سے لمبا نہ ہوتا۔
تو زندگی کی دوپہر ہی میں سہی
ہمارے سائے یکجان تو ہو سکتے تھے
میری آنکھیں آئینہ بنی دیکھ رہی ہیں
کبھی کبھی کوئی رات، پوری رات نہیں لگتی ہے۔
کبھی کبھی کوئی دن، پورا دن نہیں لگتا ہے۔

میں ایسا ہی دن
اور ایسی ہی رات پہنے
اندھیرے ڈھلوان پہ چڑھتی چلی جا رہی ہوں
میلے میں اکیلے رہ جانے والے بچے کی طرح
خیالوں کی کلیاں، جو تم نے میرے پلو میں، باندھی تھیں
کھلنے کے لیے منہ کھول رہی ہیں
زندگی کی لہریں بھنور میں بدل چکیں
تو ساحلِ مراد کیسے ملے
قبروں جیسا گہرا درد مجھ سے پوچھتا ہے
سورج ڈوبنے سے پہلے میں نے دن کا چراغ کیوں بجھا دیا۔

امجد اسلام امجد

○

اِس وقت جو دریا ہے!

ہم تم بھی یہیں ہوں گے یہ پُل بھی یہیں ہوگا
اس وقت جو دریا ہے کل صبح نہیں ہوگا
آنسو کی طرح لمحے پلکوں پہ لرزتے ہیں
پھر وقت کے دریا میں اس طرح اترتے ہیں
پہنائی صحرا میں
جس طرح کوئی ذرّہ
بے نام و نشاں ہو جائے
ہونے کا گماں ہو جائے!
یہ چمکتا ہوا آنسو — یہ ٹھہرا ہوا لمحہ
اِک جھیل سی ہے جس میں
اِک وصلِ رمیدہ کے کچھ پھول مہکتے ہیں! کچھ عکس لرزتے ہیں
یہ پھول مہکنے دے۔ یہ عکس لرزنے دے!
اِس جھیل کے ساحل پر اس چاند کو چلنے دے!
آنکھوں سے گرا آنسو ٹوٹا ہُوا پرچم ہے
ساحل کے اُدھر ہر سُو اِک ہجر کا موسم ہے!
اُس ہجر کے موسم میں
یہ جھیل کہیں ہوگی یہ چاند کہیں ہوگا
اِس وقت جو دریا ہے، کل صبح نہیں ہوگا

امجد اسلام امجد

کیا کبھی تم نے سوچا ہے

جب یونہی بے ارادہ
کبھی باتیں کرتے،
مرا ہاتھ اُس کے بدن پر کہیں چھو سا جائے
تو لگتا ہے جیسے مری انگلیوں میں
یکایک بہت سے دیئے جل اُٹھے ہیں
ستارے اُگے ہیں

(۲)

کبھی یونہی جب
باتیں کرتے ہوئے ایک دم رُک سے جائیں
اور اک دوسرے سے کہیں،
"ہاں تو کیا بات تھی وہ......"
چند لمحے اُسے
یاد کرنے کی ناکام کوشش کریں

اور پھر
اس طرح ہنس پڑیں
جیسے باتوں کا مقصد فقط ایک دُوجے کی قُربت میں رہنا
اور آوازیں سننا
اور اُس اجنبی بے تعارف سے لمحے کی آہٹ سے بچنا ہو
جس کے سبب دِل کی دھڑکن کبھی ایڑیوں اور کبھی
سر سے اس طرح آتی ہے
جیسے یہیں اس کا مسکن ہو، گھر ہو!

یہیں اِس کی منزل یہیں رہگزر ہو !

(۱۳)

جانِ جاں، میں نے سوچا بہت ہے !
تمھاری قسم،
میں نے اُن سارے لمحوں کو، ژولیدہ لمحوں کو
عمرِ گذشتہ کے صحرا سے چُن کر
دھندلکوں میں بُن کر
شب و روز کے بے ٹھکانہ تسلسل کی تسبیح میں
دانا دانا پرِدیا بہت ہے — (خود کو کھویا بہت ہے)
مگر جب بھی میں اُس نشاطِ الم آفریں سے گزرتا ... (گذرنے کی کوشش
یا تدبیر کرتا ہوں تو) کہیں سے کوئی
بے تعارف سا لمحہ
کوئی اجنبی سا خیال آکے دامن پکڑتا ہے،
میں یاد کرتا ہوں .....
میں یاد کرنے کی بھرپور کوشش میں ٹوٹے ہوئے
ریزہ ریزہ بدن آئینے کی طرح
سارے عکسوں کو ترتیب دیتا ہوں پر — شکل بنتی نہیں
"شکل بنتی نہیں اور ژولیدہ لمحوں کے آشوب میں یاد آتا نہیں
مجھ کو کچھ ٹھیک سے یاد آتا نہیں.
" وہ سب کچھ محبت کا جادو تھا
میری تمھاری رفاقت کا بے انت نشہ تھا
یا جسم کی بے ٹھکانہ صدا تھی"
تمھاری قسم! وہ جو کچھ بھی تھا
اس کے عنوان اور اس کے معنے کی قسم
مجھ کو کچھ ٹھیک سے یاد آتا نہیں..

(۳)

دن بہت جا چکے ہیں اور اب جانِ جاں
تم بھی میری طرح
زندگی کے سب اُس نوع کے تجربوں سے یقیناً گذر آئی ہو
جنہیں لوگ حسّی، حقیقی، جبلّی
اور گم گشتہ جنت میں گیہوں کے دانے سے نکلی ہوئی
داستاں کے حوالے سے تفسیر کرتے ہیں
تمہیں بھی — (اور اس تم سے میں خود کو منفی نہیں کر رہا)
ان حقائق پہ اور اِن کی تفسیر پر پختہ ایمان ہوگا
مگر جانِ جاں
کیا کبھی تم نے سوچا ہے
وہ لمس کیا تھا
جو پوروں میں تارے جگاتا ہوا، مسکراتا ہوا
از ازل تا ابد پھیلتا تھا
(پھیلتا تھا مگر کچھ بتاتا نہ تھا
ہاتھ آتا نہ تھا)
اور چُپ کے وہ سب بے کنارہ جزیرے
جو باتوں کے بے نام گہرے سمندر میں یُوں ڈولتے تھے
کہ پورے بدن میں بدن بولتے تھے
وہ کیا تھے !!

ستاروں کی نظمیں

ناہید قاسمی

چودھویں کا چاند

آؤ ستارو!
اپنی کٹوریاں بھر کر لاؤ
چندا خالی تھال اٹھائے
کرنیں چننے نکلا ہے

احتجاج

جب بھی فلک پر
کوئی ستارا ٹوٹا ہے
دور تلک روشن کرنوں کی آہ کھنچی ہے!

آپے رانجھا ہوئی

چاند سے چہرے والی ہیر
کی نیلی نیلی اوڑھنی پر
جتنے جگمگ تارے ہیں
اک اک میں رانجھے کا نام
جھلمل جھلمل کرتا ہے
ان کی دھیمی دھیمی لو میں
جب آئینہ دیکھتی ہے۔ تو
چاند بھی رانجھا لگتا ہے

ستارۂ صبح

ایک ستارہ
افق کی دلہن کی اک جھلک دیکھنے
جاتی رات سے اپنا ہاتھ چھڑا کر
آسمان پر ٹھہر گیا ہے۔

ناہید قاسمی

ترغیب

○

پیارے سورج!
تم تو اپنا چہرہ
آسمان پر تیرتے تاروں کے آئینوں ہی میں ڈھونڈتے رہتے ہو
پر میری بھی اِک بات سنو:
یہ جو آنکھ میں روشن تارے ہیں
اور یہ جو گالوں پر بہتے ہوئے تارے ہیں
اور یہ جو پھول پھول کی پتی پتی پر ٹھہرے ہوئے تارے ہیں
اور یہ جو ریت سے جھانکتے تارے ہیں
اور یہ جو ندیا کی لہروں پر ناچتے اور نہاتے تارے ہیں
یہ تارے بھی آئینے ہیں
اور میری زمین کے یہ آئینے
پیارے، صرف تمھارے ہیں

○

ثروت حسین

باب نیم رُخ

○

پھولوں
اور پھلوں کی بہتات میں
کسی کو نیند نہیں آئی
چبوتروں
اناج گھروں کو سراہتے ہوئے
غلہ گاہنے کے سمے
کتابوں، ہتھیاروں کو قید
گیتوں کو رہائی
دشمنی کو زمہریر ــــــ
کرئی بول
ہواؤں کی حدوں کو
چُومتا ہُوا
کہ آدھے ستارے پر
اب بھی
سُورج کا چراغ جھُومتا ہے

ثروت حسین

باب غرناطہ

○

غرناطہ ترے آئینوں پر پھُول اُتریں
غرناطہ ترے باغیچوں میں رسُول اُتریں
غرناطہ تری آوازیں پر و بال رہیں
غرناطہ ترے تاکستان بحال رہیں
غرناطہ ترے مینار و محراب سدا
غرناطہ ترے فوّارے جہاں تاب سدا
غرناطہ ترے بازاروں میں رنگ رہیں
غرناطہ ترے شاعر خوش آہنگ رہیں
غرناطہ ترے خوش اندام ہجُوم کریں
غرناطہ مرے حرف تجھے منظوم کریں
غرناطہ ترے تیرا انداز زوال نہ ہوں
غرناطہ ترے خواب کبھی پامال نہ ہوں

○

باب پُرہول

اِک تواتر سے کوئی آواز رندے کی طرح موجودگی کو چھیلتی،
ہموار کرتی، بے بضاعت ساعتوں، بے وزن بے اجناس پلڑوں کی
گراں خوابی کو سرکش اونٹنی کی طرح کوڑوں سے ہنکاتی
چھوڑ جاتی ہے کھجوروں سے تہی ویرانیوں میں، ساتویں دن
اک کنواں خاشاک سے لبریز، کس کی ایڑھیاں چشمے جگائیں
بھول جائیں شہد اور زیتون سی آبادیوں کو بھول جائیں

ذوالفقار احمد

گیت

پچھلے پہر نہیں دل بہلے گا
دن تو بیت گیا
شام ڈھلے پھر لوٹ آئے گا
دھیان جو پلٹ گیا
کیسے خواب تھے آنکھوں میں
ان خوابوں میں
خوشبو سے مہکتے باغوں میں
کیا کیا پھول کھلا

پھول چراغ سا روشنی ساتھی
رستا ان دیکھا
کون کہے وہ کب گھر آیا
پھر کب لوٹ گیا
کب آنکھوں میں چھائی گھٹائیں
کب بادل برسا
کیسے کہوں وہ اب نہیں ملتا
جو کبھی اپنا تھا۔

ذوالفقار احمد

آسمان پر رنگ انوکھے

(برادرم صلاح الدین محمود کے لیے)

کیسے خوشبو آنکھ میں اترے
کیسے ذکر زباں پہ آتے
کھلتا نہیں فلک پر کیا ہے
گلوں میں ہے یہ رنگ گلابی
یا اس بحر میں ڈوبے ہوتے ہیں
ندی کے پار سے آئے بادل
شام ڈھلے آنکھوں نے دیکھے

کیسے صبح سے سے شام ملے
لبوں کو اذنِ عام ملے
کیا ہے زمیں کے چہرے پر
یا بادل کے لہرے پر
آج ، فلک کے سنہرے پر
جل موتی ہر بادل سنگ
کھلے فلک پہ انوکھے رنگ

علی اکبر عبّاس

کلمۂ د (دال)

ہاتھ کے ناخن بنے بیساکھیاں، آنکھ پر مکڑی کے جالوں میں
نہ جانے کتنے ہی معصوم بے ضرر رس پتنگے سُوکھ کر بھی
پھڑ پھڑاتے ہیں نِکل جانے کی خواہش میں ہَوا کے گیت گاتے ہیں۔
دہن میں چیونٹیوں کے رزق کا کِتنا ذخیرہ ہے۔ کوئی خوشبُو
کبھی بھُولے سے بھی جھانکے تو شاید ناک کے تاریک گوشے جگمگا اٹھیں
صدا کانوں سے ٹکرائے تو شاید زلزلہ آئے۔

مگر سینے میں اِک جنّت ہے، جس میں دُودھ کی نہریں، شہد، شیریں رسیلے سائے ہیں۔ سب کچھ ہے موعودہ۔ ذہن اِک برزخِ بے رنگ کی صورت یہ سب مانے مگر کچھ جاننے کی ضد میں اپنے سارے کاندوں کو کچھ کرنے کی مہلت دے کے اب اُن کے اپاہج پن سے خائف ہے۔ بدن دوزخ ہے جس میں پیپ کے جوہڑ، اُبلتا خون سلگتی ہڈیوں کے بے تکان کتنے الاؤ ہیں زمیں کے واسطے دیمک ہزیمت ہے۔ مگر جامد تنوں میں زندگی کی کوئی حرکت ہو۔ یہ دیمک زندگی ہے۔ جو بھی جامد تنوں کو چاٹتی ہے جس طرح نوزائیدہ بچّوں کو مائیں چاٹتی ہیں، تاکہ اُن کا خوں بدن کے ایک حصّے میں فرطِ زندگی سے پھڑ پھڑا اُٹھے، ہَوا کے گیت گا اُٹھے۔

ستار سید

ساعتِ ہجر میں وصل کا ایک پل

دُوریوں سے جھلکتے ہُوئے رنگ کی تہ بہ تہ جھلملاہٹ میں تیری
شباہت ترے عکس کی

پھڑ پھڑانے لگے "طاہرہ" جذبوں والے پرندے
مرے سوچ آنگن کے موسم بدلنے لگے

موتیے جیسے پھُولوں سی دوشیزہ خوشبو سے
مہکے ہُوئے ہاتھ اِک اِک کیاری میں اُگنے لگے

پھر ہُوا اسیرِ یاد، آباد
گم گشتہ محبوب لمحوں کی جھنکار سے —
پھر کسی نے بلایا مجھے پیار سے

دُور مہکی فضاؤں کے باطن سے تکنے لگیں.
دوریوں سے بھی گہری تری مسکراتی ہوئی جھیل آنکھیں —

تھرکنے لگیں ساعتِ ہجر میں وصل کی خواہشیں
پھر سماعت میں جاگا، ترے حرف و آواز کا ذائقہ

پھڑپھڑانے لگے "طاہرو" جذبوں والے پرندے، کہ شاید
طلوع ہونے والی ہیں پھر رتجگوں کی رُتیں

اے دلِ غمزدہ!
اس بشارت نما ایک لمحے کی دہلیز سے کس کو آواز دیں
کب تک پاس سے دُور جاتی ہوئی،
دُور سے پاس آتی ہوئی آہٹوں کو سُنیں،
آؤ گھر کو چلیں
پھر دیارِ دل و جاں میں، رُوٹھے ہوئے ہجر کے موسموں سے ملیں
آؤ گھر کو چلیں
کہ — طلوع ہونے والی ہیں پھر رتجگوں کی رُتیں

○

آذر تمنّا

یہ ڈرامے کا آخری ایکٹ تھا

یہ ڈرامے کا آخری ایکٹ تھا
ناکام عاشق دل پر ہاتھ رکھ کر گرا
اور مر گیا
"نہیں —" وہ چلّائی
"یہ کھیل نہیں تھا"
لیکن اس کی آواز
تالیوں کے شور میں دب گئی
پردہ کھینچنے والا
لمحہ بھر کو ٹھٹکا
پھر حسبِ معمول اپنا فرض انجام دیا
"شاید —
موت کے بعد تم مجھے جان لوگی
لیکن شاید"
بھیگا ہُوا کاغذ مٹھی میں دبائے
تماشائیوں سے خالی پنڈال میں
وہ دیر تک لرزا کی
کھیل ختم ہونے کی گھنٹی
اپنی گونج ختم کر چکی تھی
اور باہری دروازے پر دربان
اس کے رخصت ہونے کا منتظر تھا۔

آذر تمنا

اندھی لڑکی کا خواب

اندھی لڑکی خواب دیکھتی ہے
اچھا سا ذائقہ، بھلی سی آواز
محبت بھرا لمس
ایک کے بعد ایک
یہ اندھی لڑکی کے خواب میں آتے ہیں
اندھی لڑکی مسکراتی ہے
افسوس! وہ اپنی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکتی
اچھا سا ذائقہ، بھلی سی آواز
محبت بھرا لمس —
اور کچھ نہیں
اندھی لڑکی اور کچھ نہیں دیکھ سکتی
وہ خواب دیکھتی ہے
اور خواب میں مسکراتی ہے
اس کا دل سکھ اور خوشی سے بھر جاتا ہے
سکھ اور خوشی سے بھرا ہوا
ایک اندھی لڑکی کا دل —
وہ نہیں جانتی
کہ خواب میں اس سے زیادہ
چیزیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں
ندی کا ڈگمگاتا پل، پھول چنتے ہوئے ہاتھ
اور انتظار کرتا ہوا چراغ

اندھی لڑکی نے
ندی کا ڈگمگاتا ہوا پل نہیں دیکھا
لیکن اس نے پانی کی آواز سنی ہے
اس نے کبھی پھول نہیں چنے
لیکن وہ مہرباں ہاتھ کا محبت بھرا لمس
پہچانتی ہے
اس نے چراغ نہیں دیکھا
لیکن وہ محبت کرنے والے کے دل میں
روشن آگ کے بارے میں بتا سکتی ہے
اندھی لڑکی!
تمہاری تقدیر جس خواب سے بنائی گئی تھی
اس خواب کو دیکھنے والی آنکھ
کہیں کھو گئی ہے
ایک دن یہ خواب
اس آنکھ کو ڈھونڈ نکالے گا
اور تم خود کو مسکراتے ہوئے
دیکھ لوگی
اور جان لوگی
کہ جن قدموں پر تم چل رہی تھیں
وہ میرے تھے
اور جو خواب تم نے دیکھا
وہ میں نے تھا

سید جاوید

○

تجدید

رُت بدلی ہے
موسم رنگ بدل جانے کے خوف میں ہے
لمحہ لمحہ اندھیروں کے برزخ میں دَم توڑ رہا ہے
اندر باہر سناٹا سا گھات لگائے بیٹھا ہے
ایسا ہے کہ
ہر منظر دُھندلایا ہے
سارے رنگ ہی
اُس کے ہونٹوں
اُس کی آنکھوں
اس کے ہنستے چہرے جیسے واضح واضح روشن روشن
گڈمڈ ہوتے جاتے ہیں
ایسا ہے کہ
ساری مدھر سی آوازیں
بے ہنگم سے شور میں ڈھلتی جاتی ہیں
اس سے پوچھوں
اس نے کیوں آنکھوں کے شیشے
سانجھ کے نشوں سے چھلکائے
خود سے پوچھوں

مَیں نے کیوں اسے ٹوٹ کے چاہا
مَیں نے کیوں ساری تصویریں اس کے رنگوں سے ہی بھر لیں
مَیں نے کیوں ہر خواب کا پیکر
اس کے پیکر میں ہی دیکھا
مَیں نے کیوں ہر سوچ کا محور
اس کی آنکھوں کو ہی جانا
میں نے کیوں جو لفظ تراشے
اس کو ہی بس نذر کیے
مَیں نے کیوں . . . .
کس سے پوچھوں ؟
پر یہ سب لاحاصل ہے
ان لمحوں کی تحریریں جو ہم دونوں پر
یکسانی کی رحمت لے کر اُتری تھیں
اندیشوں کی بانجھ فضا میں بے رنگی ہو جائیں گی
آؤ ان کو پھر سے لکھ لیں

○

ڈاکٹر ظفر علی راجا

○

گونگے پینگوئین گونگے درد

دُور تلک نیلے ساحل پر
لہروں کے پُرجوش سمندر کا اِک تحفہ
ٹھنڈی بھیگی ریت بِچھی ہے
ٹھنڈی بھیگی ریت کے اوپر
غم آلودہ شام کی چادر
سر پر اوڑھے
لاکھوں کی تعداد میں پینگوئین
گہری گونگی سوچ میں ڈوبے
اِک دُوجے کو تکتے ہیں

دُور تلک دِل کے ساحل پر
اشکوں کے پُرسوز سمندر کا اِک تحفہ
غم کی بھیگی ریت بِچھی ہے
غم کی بھیگی ریت کے اوپر
لاکھوں کے ہندسوں پر پھیلے
جیون بھر کے درد ہمارے
کھُلی ہوئی آنکھوں میں بھر کر گونگے لہجے
یوں بیٹھے ہیں
جیسے وہ بھی درد نہیں ہیں
پینگوئین ہیں

شمیم سہگل

○

لے چلے، لے چلے، بابلا وے

تجھے تو چُننا تھا ہیر جَٹی
تیرے ہونٹوں پہ کس نے مہر ڈالی
نہ قاضی سے مباحث میں تُو اُلجھی
نہ بابل سے کوئی حرفِ شکایت ؟
بساؤگی پرائے غیر آنگن ؟
دِلوں میں نفرتوں کے دُکھ سمیٹے
اَدا ہوں گے فرائض زوجیت کے
نئی نسلوں کی بنیادیں ہی نفرت سے اُٹھیں گی
تجھے معلوم ہے اے ہیر جٹی۔ ؟
تیری اس بے بسی کے مجرم کو صدیاں سہیں گی

سیفو

ساجن پیارے

○

تم نے یہ کیا ظلم کیا ہے
میری کانچ سی ہستی کو اب
اتنا بوجھل کام دیا ہے
اور میں تو پنگھٹ پہ کھڑی تھیں
اور کسی کے سر پہ رکھتے
پریم کی بھاری گاگر۔ تم نے
میری پتہ سی ہستی پر
میرے ڈولتے تن من پر
میری کچی مٹی کی سی
کچی کچی خوشبو پر بھی
پریتم! تم کو رحم نہ آیا
میں ڈولوں تو قطرہ قطرہ چھلکا جانے پانی
چولی دامن سب کچھ بھیگا
راہ چلوں تو ساری نظریں مجھ پر اٹھیں
پریتم میری خاطر اب تم اتنا کام تو کر دو۔ مجھ کو
اپنی اوٹ میں رکھ لو
مجھ پر اپنا سایہ کر دو!

میری چولی میں اک بچھو ہے!

ساجن!
میری چولی میں اک بچھو ہے
میرے سینے میں وہ زہریلے ڈنگ کو گاڑے
میرے خون پر پلتا ہے۔

سارے وید حکیم اپنا ہر چارہ کر کر ہارے
جتنے بھی وہ منتر پھونکیں
یہ اتنا ہی گہرا ہوتا جائے۔
اف ساجن میں مر جاؤں گی
تم نے میرے گرد جو اپنے جادو والے نینوں سے
تین لکیریں کھینچی تھیں
میں ان میں یوں سمٹی ہوں
جوں خوشبو ہر پھول میں یا پھر
ناگن سرخ پٹاری میں!
ساجن!
جادو توڑ دو۔ میں بچھو کاٹے کا مرہم
تم سے لینے آؤں (جو بس تم ہی دے سکتے ہو تنہا)
یا پھر تم خود
اپنے شیش محل سے باہر نکلو!

○

سیفو

عفریت

ایک عفریت ہے
جس کی دائیں پسلیاں وسیع صحراؤں کی ریت پر
ثبت ہیں
اور اُس کی بائیں پسلیاں آسمان پر پھیلے
ہلکے سفید بادلوں پر منقش
وہ کسی ازلی تشنہ لب کی طرح
سمندروں پہ اپنی تھوتھنی رکھے لیٹا ہے
اُس کے پیٹ میں ساری کی ساری
مخلوق بستی ہے
یہ خوفناک عظیم الجثہ
عفریت جب ہلتا ہے تو
بے چاری مخلوق
زلزلوں کا شکار ہو جاتی ہے
اُس کی زہریلی سانسیں
ساری مخلوق میں
نفرت، غصہ، بغض اور دشمنی اگا رہی ہیں
اُس کے پیٹ سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ خدایا!
اِس عذابِ مسلسل سے کوئی رہائی، پروردگارا
کوئی وحی، کوئی الہام کوئی تدبیر
مجھ پر بھی اُترے
کہ میں نے بھی ساری بدقسمت مخلوق سے الگ سوچا ہے
میں آنکھیں میچے انگلیوں پر تیرا نام گنتی ہوں
اور بھول جاتی ہوں

نگار سجاد

پھر سے مجھے زندہ کر دو

○

آؤ میرے سارے غم تم اپنی آنکھوں میں بھر لو
مجھ کو پھر سے زندہ کر دو
تنہائی کی لذت نے اب الٹا روگ لگایا ہے
کچھ سانسیں ہوں کچھ باتیں ہوں
کچھ باتیں ہوں
کوئی دھڑکن ہو
کوئی آہٹ ہو
میرے دروازے پر دلبر ہاتھوں سے دستک تو دو
پھر سے مجھے زندہ کر دو!
اس تنہا تنہا، اجڑی اجڑی
بے کل، بے حس دنیا میں
تم جگ مگ کرتے نینوں سے
میرا آپا روشن کر دو
آؤ میرے سارے غم تم اپنی آنکھوں میں بھر لو
مجھ کو پھر سے زندہ کر دو۔

سلیم الحق

جس کے نقطے کے آغاز میں موت ہے

سبھی دائروں کی بناوٹ کا آغاز مجھ سے ہوا ہے
یہ اِک "میں"
کہ جس "میں" کے اندر کئی "میں"
حصاروں کی بستی میں آباد ہیں
سبھی دائرے وقت کے مساموں سے تجسیم ہوتے ہوئے
سلسلے، فاصلے، ڈوریاں، دائروں کی طرح
اور اِن سلسلوں، دائروں، فاصلوں سے پرے
اِک عجب دائرہ
جس کے نقطے کے آغاز میں موت ہے،
تیرگی، روشنی، بے بسی، زندگی،
سارے پرکار کی دوسری نوک ہیں
تو کہ خوشبو ترنم اگاتی ہوئی آبشاروں
اترتی ہوئی ٹھنڈکوں کا صحیفہ
جس کے الفاظ سطروں کی ڈوری سے آزاد ہیں
جس کے اوراق اڑتے ہوئے پنچھیوں کی طرح
مجھ میں لمحوں کا ہر دائرہ ہے سمٹتا ہوا
میں کہ نقطے کے آغاز کی سمت بہتا ہوا
موج در موج ساحل سے دوری کا زہراب چکھتا ہوا
اور پرکار کی دوسری نوک
اس دائرے میں ہے ٹھہری ہوئی
جس کے نقطے کے آغاز میں موت ہے۔

ارشاد صدیقی

بے شک میں خسارے میں ہوں

○

میں اِک سرسبز وادی میں کھڑا تھا
مرے چاروں طرف تھے :
رنگ، خوشبو، چہچہے، جھرنے ،
پھلوں کی لذتیں
مدہوش جھونکے
میں اپنے آپ میں گم
شرابِ ناب میں گم
اچانک اِک کڑک نے آلیا میری سماعت کو
چمک نے آن میں خیرہ کیا میری بصارت کو
عجب پُرہول تاریکی ! عجب سناٹے کا عالم !!
لگا، جیسے غضب میں گھر گئے ہیں :
سہمتی کانپتی دھرتی ،
لرزتے ہانپتے پربت
— عجب ہیبت !
لگا، جیسے میرے پاؤں تلے مٹی نہیں، پاتال کی گہرائیاں ہیں
اور میں اُن میں اترتا جا رہا ہوں

— عجب وحشت!

لگا، جیسے مرے چاروں طرف پربت نہیں، پتھر کی دیواریں کھڑی ہیں
کہ جن کا درمیانی فاصلہ،
گھٹتا ہوا،
معدوم کی سرحد پہ مجھ کو پیس ڈالے گا
— عجب دہشت!
کہ اتنے میں ندائے غیب آئی:
"تجھے مژدہ:
ترے رب نے تجھے اک اور موقع دے دیا ہے"

فضا مانندِ نور وحور لپکی
مجھے ریشم کے گالے میں لپیٹے،
ہوا سنکی، تو سوئے طور لپکی

فرازِ طور پہ جاکر:
وہی میں تھا،
وہی رب تھا،
وہی میثاقِ روزِ اولیں — میراثِ گم گشتہ
خزانہ پھر سے میرے ہاتھ آیا

فرازِ طور سے پھر وادیٔ سینا میں جب اترا،
تو آب و رنگ، خوشبو، چہچہے، جھرنے،
پھلوں کی لذتیں

○

"او میری گو" رفعت ظفر

میں ایک میری ہوں
اُس نے جسے
آنے والے سبھی برف و باراں کے طوفاں سے
آگاہ ہو کر
سوچی سمجھی ہوئی چال سے
کھیت میں چرنے والے سبھی جانور
لے کے آنے کو بھیجا تھا
میں برف میں،
سخت سردی کے طوفان میں گم گئی ہوں
مری ہڈیاں جالبازی کی یخ بستہ تہہ میں
چٹخ سی گئی ہیں
نہ جانے وہ کب —
میری ٹھٹھری ہوئی لاش کو ڈھونڈنے
زرد رُو لالٹین لیے
اپنے گرم اور محفوظ کمرے سے نکلے
نکلے نہ نکلے
مجھے کیا پتہ — کہ اگلی صبح
ہری جھیل کے نرم پانی پہ میرے سنہری چمکتے ہوئے بال
سورج کی کرنوں میں
دمکیں، نہ دمکیں
یا شاید کہ وہ
کسی اور میری سے بیزار ہو کر
اسے کھیت میں چرنے والے سبھی جانور
لے آنے کو بھیجے۔

(ورڈز ورتھ کی سینیٹز آف لوسی سے ماخوذ)

رفعت ظفر

اُس کے آنے کا موسم

نرم ہونے لگی دھوپ پچھلے پہر
رات بارش سے مل کر مہکنے لگی
گرم بانہوں سے وحشت امڈنے لگی
سرد آنکھوں سے جنگل کی خوشبو اُٹھی
یاد لوبان بن کر سُلگنے لگی

تیرے آنے کی ساری رُتیں آگئیں
مٹیلی گھاس بھی سبز ہونے لگی
خشک پیڑوں پہ بھی کونپلیں آگئیں

سورج

صفدر صدیق رضی

میں سخت سردی میں
اپنے دفتر سے
بھیگتی رات کو بہت دیر سے
گھر آیا ہوں
اور مری بیوی حسب معمول اب تک
جاگتے ہوئے میری منتظر ہے
مگر
مرا بچہ میرے بستر میں
میری آمد میں اتنی تاخیر کے سبب
کب کا سو چکا ہے
اور اتنی سردی کے باوجود
اس کے جسم کی پرسکوں حرارت سے
میرے بستر کی گرم آغوش اب تک
میری سرد باہوں کی منتظر ہے
میری پناہوں کی منتظر ہے۔
اور اپنے بستر میں لیٹتے ہی
مرا بدن
اس کے لمس کی آگہی کے موسم کی زد میں ہے۔
سرد رت کا کوئی گماں نہیں
میری روح کے ہر افق پہ
اس سے بڑا کوئی آسماں نہیں
میری عمر کی سرحدوں میں
کوئی بھی سورج اس سے سوا
مرے برف جسم پر مہرباں نہیں۔

وحید قیصر

نیند

○

وہ پانی کی تاریک چادر سے اٹھ کر
طلسمی جزیروں کی جانب بڑھے
سارسوں کے پَرے
نیند آگے بڑھی لے کے سپنوں کے گجرے
تہِ آب مخلوق کے کارِ رواں
اجنبی ساحلوں کا ارادہ کیے
آگے بڑھنے لگے
نیند آگے بڑھی لے کے سپنوں کے گجرے
کنول پھول نے پتیوں کو سمیٹا
سیلِ خزانے نہک اور لو کے
بڑے پیار سے
نیند آگے بڑھی لے کے سپنوں کے گجرے
ہوائیں بھی تھک ہار کر سو گئیں
اپنے محبوب کی جستجو چھوڑ کے
کوئی دم کے لیے
نیند آگے بڑھی لے کے سپنوں کے گجرے
نگارِ جواں کی حسیں فکر میں
اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے ہوئے
خود کو بھولے ہوئے
کوئی یوں کھو گیا
جیسے ہو سو گیا
نیند آگے بڑھی لے کے سپنوں کے گجرے

دعا

اے دل دعا یہ مانگ

حاصل رہیں سدا ہمیں سچی مسرتیں
اللہ کی نعمتیں ۔
روٹھے نہ اپنے صحن سے چندا کی چاندنی
سورج کی روشنی
اس گھر کے پھول گرم ہوا سے بچے رہیں
مہکار میں بسیں
وہ شام جس میں یاس کی کوئی بھی ہو گھڑی
آئے نہ یاں کبھی
ہر صبح مہر کاب بہاراں ہوا کرے
ایسا خدا کرے
یہ سرزمین پھولوں سے ہر دم سجی رہے
یہ پھولے اور پھلے
اپنی دعائے نیم شبی کا ثمر ہے یہ
خونِ جگر ہے یہ

انتظار

وادیوں میں گلاب کھلتے ہیں
رنگ اور نور کے تصادم میں
مستی و سرخوشی کے عالم میں
کتنے سورج یہاں پر ڈھلتے ہیں

—

آسماں سے مرے گلستاں پر
شبنمی چاندنی برستی ہے

صبح کی خنکگی برستی ہے
دل کی دنیا میں دیکھ لے کے آ
ابر پاروں کے سائے میں اکثر
چاہنے والے آ کے ملتے ہیں
اپنا ہر غم بھلا کے ملتے ہیں
سلسلہ ہائے لالہ و گل پر

آ ترا منتظر ہوں میں کب سے
حاصلِ زیست ہیں یہی لمحے
کل انہی کو ترس گئے ہوں گے!

سوچ

یہ سوچتا ہوں کہ کاش میں بھی گلاب کا ایک پھول ہوتا
صبا سے بڑھ کر تیرے تنفس میں اپنی خوشبو کا رنگ بھرتا

تو چاندنی شب میں، سایۂ گل میں، محوِ خواب و خیال ہوتی
میں تیرے ہونٹوں پہ آ کے گرتا، میں تیرے سینے پہ پھیل جاتا

مجھے تو زلفوں میں جب سجاتی، تو ان کی حیرت نہ دیکھ پاتی
جو تیری گردن کا لمس ملتا تو میں اپنی قسمت پہ ناز کرتا

اگرچہ تجھ میں کمی نہیں کچھ، یہ اپنی حسرت بھی گفتنی ہے
میں تیرے عارض کا رنگ بنتا، میں تیری رگ رگ میں دوڑ جاتا

صبا سے کہتا وہ تیرے رستے میں میری ہستی بکھیر ڈالے
یہ آرزو ہے فنا سے پہلے میں تیرے قدموں کو چوم لیتا!

افسانے

انتظار

انتظار حسین

وہ گلی کے اس نکڑ پر سکوٹر لیے کتنی دیر کھڑا رہا۔ کتنے انتظار کے بعد وہ آئی اور کتنی گھبرائی ہوئی تھی

"بہت دیر لگا دی۔"

"بہت مشکل سے نکل کے آئی ہوں۔ اصل میں آج ہمارے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے بہت بہانے کرنے پڑے" پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر گھبرائے لہجہ میں بولی "کوئی دیکھ نہ لے"۔

"تم آج گھر سے نئی تو نہیں نکلی ہو۔"

"وہ نکلنا اور ہوتا تھا۔ اس طرح تو کبھی نہیں نکلی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس ملاقات کو نارمل طریقے سے نہیں لے رہی ہو۔ سمجھ رہی ہو کہ یہ چاہنے والوں کی ملاقات ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسی باتیں کریں گے تو میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔"

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ تم اس ملاقات کو دوسرے رنگ میں مت لو۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اس ملاقات کو کوئی رومانٹک ملاقات سمجھ رہی ہوں۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں ورنہ خواہ مخواہ مجھے اپنے آپ کو ایک رومانٹک ہیرو تصور کرنا پڑے گا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی "کہیں واقعی آپ اپنے کو ہیرو تو نہیں سمجھ رہے۔"

"ہیرو اگلے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ سکوٹر کے ساتھ کون اپنے آپ کو ہیرو تصور کر سکتا ہے!"

"اچھا یہاں سے تو سرکو۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔"

"دیکھنے کی فرصت بھی اگلے زمانے ہی میں تھی جب ہی تو عشق کا اتنا چرچا ہو جایا کرتا تھا آج کی مصروف زندگی میں کسی کو دیکھنے کی فرصت کہاں ہے۔"

"اچھا جلدی کریں۔ اور چلنا کہاں ہے؟"

"اچھا بیٹھو۔ ایسا کرتے ہیں کہ شہر سے نکل کر کسی خاموش سے چائے خانے میں بیٹھتے ہیں۔"

وہ گھبرائی "میں بہت دُور نہیں جاؤں گی۔"

"پھر یہیں قریب ہی کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"مگر کوئی دیکھ نہ لے۔"

"جب ہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ دُور چل کر کسی خاموش جگہ بیٹھتے ہیں۔"

"مگر سکوٹر پہ آپ کیوں آئے ہیں"۔

"اس لیے کہ میرے پاس کار نہیں ہے۔"

سکوٹر کے پیچھے بیٹھتے ہوئے وہ جھجک رہی تھی "سکوٹر پہ میں اس طرح بیٹھی ہوئی کیسی لگوں گی۔"

"اس طرح جھجکو گی تو کسی دوسرے کو تو بعد میں شک ہوگا پہلے خود مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگا کہ میں شاید تمہیں۔۔۔"

اس نے فوراً بات کاٹی "بس بس جلدی کرو۔"

"تو پھر جلدی بیٹھو۔"

وہ سکوٹر کی عقبی نشست پر بیٹھی۔ اس نے آگے بیٹھ کر سکوٹر سٹارٹ کیا۔ مختلف بازاروں سے وہ کس تیزی سے گذرا۔ بازاروں سے گذر کر جب خاموش کشادہ سڑک پر آیا تو اس نے رفتار اور تیز کر دی۔

"آہستہ چلائیے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" ڈرنے کی بات بھی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ کسی کے ساتھ سکوٹر پر اس طرح بیٹھی تھی اور سکوٹر اتنا تیز جا رہا تھا کہ وہ جیسے اُڑی جا رہی تھی، جیسے کسی صبا رفتار گھوڑے پر شہسوار کی کمر میں بازو حمائل کیے بیٹھی ہے۔ گھوڑا سنسان راہوں پر سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اس کی لمبی زلفیں ہوا میں اُڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں بازوؤں میں اس تندرست کمر کو اور زیادہ شدت سے جکڑ لیا۔

چلتے چلتے وہ ایک سنسان مقام پر پہنچے سامنے ایک عمارت کھڑی نظر آئی۔ گھوڑے سے اُتر کر اس نے اس دروازے پر دستک دی "کوئی ہے؟"

ایک سفید ریش نے اندر سے جھانکا "اِس غیر وقت میں یہاں کون آیا ہے۔"

"اے شخص ہم مسافر ہیں کہ ہزع مرح کھینچتے یہاں ایسے وقت میں پہنچے ہیں جب شام پڑ رہی ہے اور رات سر پہ کھڑی ہے۔ اس سنسان بیابان میں یہ دروازہ نظر آیا۔ گویا امید کی کرن نظر آئی۔ سوچا کہ کوئی سرائے ہے یا کسی مہربان کا دولت کدہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ در ہماری دستک پہ وا ہو۔

اور جینے سر چھپانے کے لیے جگہ ملے۔"

وہ دریشک ان پروا ہُوا۔ اور جب انہوں نے اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ شمعیں روشن ہیں، فانوس جھلملاتے ہیں، مسندیں بچھی ہیں، گاؤ تکیے لگے ہیں۔ سامانِ ناؤ نوش ہے۔ خدام دست بستہ کھڑے ہیں۔ خادمائیں آجا رہی ہیں۔ سفر کی ساری تکان دم بھر میں اُتر گئی۔ جی باغ باغ ہُوا۔ وصل کا شوق تیز ہُوا۔ لب سے لب ملے۔ سینے سے سینہ ملا۔ یک جان دو قالب۔

جب مرغ نے بانگ دی تب وہ ہڑبڑا کر اُٹھی۔ اب اس کی آنکھیں کھُلیں۔ گھر کی یاد آئی۔ خوف سے لرزنے لگی۔ تب اس نے دلاسا دیا کہ جانِ من! تشویش مت کرو۔ میرا راہوار صبا رفتار ہے۔ یہ کہہ کر اس نے لپک جھپک گھوڑے پہ زین کسی، لپک کر خود بیٹھا۔ آغوش میں لے کر اسے بٹھایا۔ گھوڑے کو ایڑ دی۔ اس برق رفتار نے اشارے کو فیصلہ سمجھا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

جدائی کے مقام پر پہنچ کر وہ گلے ملے۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھے۔ وعدے وعید ہوئے۔

وہ آبدیدہ ہو کر بولا "کیا یہ ہماری آخری ملاقات تھی؟"۔

"نہیں۔"

"پھر طے ہو جانا چاہیئے کہ کب اور کیسے ملاقات ہوگی۔"

وہ چُپ رہی۔ تب اس نے تجویز پیش کی "کل شام پڑے یہیں، اسی مقام پر، ٹھیک وقت پر آؤگی نا؟"

"اگر میں ٹھیک وقت پر نہ آئی تو تم چلے جاؤگے؟"

"نہیں۔ انتظار کروں گا۔"

"کب تک انتظار کروگے؟"

"جب تک تم نہیں آؤگی۔"

"فرض کرو کہ میں عمر بھر نہ آؤں۔"

"میں عمر بھر انتظار کروں گا۔"

دونوں کھِلکھلا کر ہنسے۔

"اچھا فرض کرو کہ میں نہ آؤں۔"

"نہیں، تم آؤگے۔"

"فرض کرو۔"

"انہونی کو کیسے فرض کر لوں۔ آؤگے اور مقررہ وقت سے پہلے آؤگے اور میرے آنے تک انتظار کروگے۔" "ہماری وفا پر اتنا اعتماد ہے؟"

دونوں پھر کھلکھلا کر ہنسے۔ کتنا ہنسے اور کتنی ہنسی خوشی ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

مگر ادھر اور ہی گل کھلا تھا۔ آئے مہمانوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا تھا۔ خالہ بی کہہ رہی تھیں کہ "فرخندہ کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ وہ مگر خالہ بی، میں تو . . . . "

" میں تو کیا۔" خالہ بی نے فوراً بات کاٹی" تمہارے امتحان ابھی بہت دُور ہیں۔ بہت وقت پڑا ہے پڑھنے کے لیے۔ میں جلدی واپس بھیج دوں گی۔"

اس نے بہت حیلے بہانے کیے۔ کوئی حیلہ بہانہ نہ چلا۔ جانا اس کا ٹھہر گیا تھا۔

وہ مقررہ وقت پر اس مقام پر پہنچا اور انتظار کی گھڑیاں گننے لگا۔ گھڑیاں گذرتی گئیں۔ اس کا اضطراب بڑھتا گیا۔ کھڑا رہا، کھڑا رہا۔

ایک نظر شناس نے کہ زمانے کا گرم و سرد دیکھے ہوئے تھا اُسے تاڑا۔ اس کے پاس آیا اور بولا کہ " اے جوان، میں دیکھتا ہوں کہ روز تُو یہاں کوئی امید لے کر آتا ہے، کھڑا رہتا ہے، راہ تکتا رہتا ہے جانے کس کی اور پھر افسردہ و رنجور واپس چلا جاتا ہے۔ کچھ کہہ کہ تُو نے اپنا یہ حال کیوں بنایا ہے اور وہ کون ہے جس کا تُو یہاں آکر انتظار کرتا ہے۔"

اس نے ایک آہِ سرد بھری اور کہا" اس کا جسے ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی آرزو ہے۔"

اس نظر شناس نے غور سے نوجوان کو دیکھا اور ہمدردانہ بولا "اب میں سمجھا۔ کسی نازنین کے تیرِ نظر نے تجھے گھائل کیا ہے۔ اے جوان اپنی جوانی پہ رحم کھا اور اس خیالِ خام سے باز آ۔ ایک دفعہ دیکھے کو غنیمت جان۔ دوسری دفعہ دیکھنے کے خیال سے درگذر ورنہ جان لے کہ دربدری خاک بسری تیرے مقدر میں لکھی گئی ہے۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بولا" اے مرے مشفق، یہ تو کیا کہتا ہے۔ میں اس کے وعدے کو کیونکر فراموش کر سکتا ہوں۔ صبحِ رخصت ہنوز میری آنکھوں میں رم رہی ہے۔ کس دُکھے دل کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے جُدا ہوئے تھے۔ کس خلوص سے اس نے شام پڑے اسی مقام پر مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔"

وہ شخص تلخ ہنسی ہنسا" نادان نازنینوں کے وعدوں پہ مت جا۔ عورت اور وقت جا کر واپس نہیں آیا کرتے۔"

انتظار کی گھڑیاں اس شام اس پہ بہت سخت گذریں۔ جوں توں کر کے اس نے وہ گھڑیاں گذاریں اور جب پلٹا تو اسے لگا کہ وہ ڈھے چکا ہے۔

عورت اور وقت، وہ بڑبڑایا۔ دن بھر وہ ایک کرب کے عالم میں رہا۔ انتظار اسے اب لاحاصل نظر آرہا تھا۔ اے میرے دل، اس راہ جانا اور اس کی راہ تکنا اب بے سود ہے۔

پر دن ڈھلے اس نے اپنے آپ کو پھر اسی مقام پر پایا، اسی شہرِ سنگ دل کے کنارے۔ اس شام بھی اس نے بہت انتظار کھینچا۔ تھک کر سکوٹر پر بیٹھا، بڑبڑایا، عجب لڑکی ہے آج بھی نہیں آئی۔ سکوٹر سٹارٹ کیا اور واپس چلا گیا۔

OO

سفرِ منزلِ شب

انتظار حسین

"اچھا؟ ... تو؟ ... تو وہ تو تھا؟"

ہاشم، حیدر، عبید، حمید چاروں کی نظریں حبیب پر جم گئیں۔ ان پر یہ انکشاف بجلی بن کر گرا تھا۔ وہ تو سکتہ میں آ گئے۔ کتنی دیر تک پتھر بنے بیٹھے رہے۔

"مگر ... " حیدر نے زبان کھولی۔ کچھ کہنے لگا تھا۔ کیا کہنے لگا تھا۔ کہتے کہتے جیسے الجھ گیا ہو۔ چپ ہو گیا۔

پھر حمید نے جھرجھری لی "مجھے یقین نہیں آرہا" ۔ اور اس نے حبیب کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ بولے۔ شاید یہ کھلے کہ وہ کوئی اور تھا۔ وہ نہیں تھا مگر حبیب نے تو جیسے ہونٹ سی لیے تھے۔

حمید نے پھر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ لہجہ میں تھوڑا سا تحمل پیدا کرتے ہوتے بولا "تو اس سے انکار نہیں کرے گا۔؟"

پھر سب کی متجسس نظریں اس پر جم گئیں۔ شاید اب وہ کچھ بولے گا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہے گا۔ مگر ہونٹ سل گئے تھے۔ سلے رہے۔

"تو ہم یہ سمجھیں کہ" آخر عبید نے قطعی لہجہ میں زبان کھولی "وہ تو ہی تھا۔"

ذرا جو اس نے جنبش کی ہو۔

رفتہ رفتہ حیرت اور بے یقینی کے لمحے گزر گئے۔ رفتہ رفتہ انھیں یقین آگیا کہ وہ شخص وہی ہے اور ان کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

چاروں نے اُسے خونخوار نظروں سے دیکھا جیسے وہ ان میں سے نہیں ہے۔ وہ جو انھیں میں سے تھا۔ اچانک ان میں سے نہیں رہا تھا۔ کتنی سرعت سے وہ ان کے لیے بیگانہ ہوا۔ کتنی عجلت کے ساتھ وہ ان سے جدا ہوتے۔

پہلے ہی وہ گھٹ چھنٹ کر پانچ رہ گئے تھے۔ اب چار رہ گئے۔ حبیب ان سے کٹ چکا تھا۔ حبیب سے وہ کٹ چکے تھے۔ اب وہ ان کے لیے ایک اجنبی تھا۔ پہلے بھی تو یہی ہوتا رہا تھا۔ ساتھی ان سے کٹتے گئے۔ اور اجنبی بنتے گئے۔ بس اچانک کوئی ایک کٹتا اور اچانک اجنبی بن جاتا۔ مگر جب پانچ رہ گئے تو یوں نظر آرہا تھا کہ یہ یک جان پانچ قالب ہیں۔ کتنے کتنے مشکل مرحلوں میں وہ قدم سے قدم ملا کر چلے تھے۔ کتنی دیر، کتنی دور ساتھ چل کر ایک پھر ٹوٹ گیا اور وہ جو سب سے پختہ دکھائی دیتا تھا۔

"عجیب بات ہے" حمید بولا۔ "ہم یہ سمجھتے رہے کہ سب کچھ باہر سے ہو رہا ہے۔ یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ہمیں میں سے ایک ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہمیں سے ایک" عبید نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ "اور وہ جس پر ہمیں سب سے زیادہ اعتبار تھا۔"

"مگر ۔ ۔ ۔" حمید پھر کچھ کہنے لگا تھا۔ کتنی دیر بعد اس نے زبان کھولی تھی۔ مگر کہتے کہتے پھر رک گیا۔ شاید پھر الجھ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس واقعہ کا سب سے زیادہ اثر اس نے قبول کیا ہے۔

"ہاں واقعی۔" حمید بولا۔ "سب سے زیادہ تو ہم نے اسی پر اعتبار کیا تھا۔"

"یہ تم لوگوں کی خوش فہمی تھی۔" اب ہاشم نے زبان کھولی۔ "مجھے تو اس پر پہلے ہی شک تھا۔"

عبید نے اسے غور سے دیکھا۔ "یہ تو تم اب کہہ رہے ہو۔"

"میں نے کئی موقعوں پر اشارہ کیا تھا۔ مگر کسی نے میری بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔"

"ہم تو اس کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہم میں سب سے زیادہ جوشیلا تو وہی تھا۔ کتنا بے جگرا تھا۔ سر دھڑ کی بازی لگانے پر تیار رہتا تھا۔" حمید نے یہ بات اس طرح کہی کہ ان کے تصور میں اگلے پچھلے مختلف واقعات گھوم گئے کہ کب کب اس نے جان جوکھوں میں ڈالی تھی۔ کب کب ایسے کام اپنے ذمے لیے تھے جن میں ذرا سی چوک اسے موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

مگر ہاشم اس بیان سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ بولا "ایسے لوگ ایسے ہی جانباز نظر آیا کرتے ہیں۔" رک کر بولا "وہ جو اتنا جانباز بنتا تھا اسی سے تو مجھے اور شک ہوا تھا۔"

عبید کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔ "انھوں نے ہم پر کتنا اعتبار کیا تھا۔ کتنا بھروسہ تھا انھیں ہم پر۔ اب جب یہ خبر ان تک پہنچے گی تو کیا سوچیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سمجھیں گے کہ ہم بھی ایسے ہی ہوں گے۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا" ہاشم نے اعتماد بھرے لہجہ میں کہا۔
"وہ کیسے ؟"
"ایسے کہ ہم میں جو ایک مشتبہ شخص تھا وہ دفعہ ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک دوسرے پر پورا اعتبار کر سکتے ہیں۔"
"اچھا ؟ اس کے بعد بھی ؟" حیدر کے منہ سے لبس بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا۔ وہ کب سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر زبان کھولتے کھولتے رک جاتا کہ بات آتے آتے اس کے لبوں پر الجھ جاتی۔ اب بلا ارادہ اس کے منہ سے ایک جملہ نکل گیا۔ ایسا کہ سب چونک پڑے۔
ہاشم نے غصے سے اسے دیکھا۔ "تو کیا کہنا چاہتا ہے ؟"
میں کہتا ہوں" اب اس کی زبان کھلنے لگی تھی۔ "اس میں اور ہم میں کیا فرق تھا۔ آخر ہم اکٹھے ایک ہی طرح سوچ رہے تھے۔ ایک ہی نہج پر کام کر رہے تھے۔ اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی ہے تو ہم اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ کیسے قرار دے سکتے ہیں۔"
عبید اور حمید اس دلیل سے قائل ہوتے نظر آ رہے تھے۔ مگر ہاشم نے تاؤ کھایا۔ "تو ہم پر شک کر رہا ہے۔"
"کم از کم میں اپنے آپ کو شک سے بالاتر قرار نہیں دے سکتا۔"
"بالکل ٹھیک ہے" ہاشم غصے سے بولا۔ "تو تو اس کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا تو اس سے بے خبر تو نہیں ہو سکتا" ۔
عبید اور حمید نے چونک کر غور سے حیدر کو دیکھا۔
"چپ کیوں ہو گیا ؟" ۔ ہاشم نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔
حیدر نے عبید، حمید، ہاشم تینوں کو دیکھا جو اسے شک بھری نظروں سے تک رہے تھے پھر دھیرے سے بولا۔ "ہو سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید میں بھی۔"
"تو ؟ ۔ ۔ ۔ تو بھی ؟ ۔ ۔ ۔ ۔" عبید اور حمید دونوں کے منہ سے ایک ہی وقت میں ایک ہی جملہ بلیساختہ نکلا۔
"ہاں شاید میں بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس نے گڑبڑ کی ہے تو میں کیسے یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں اس میں ملوث نہیں تھا۔" یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑا ہوا تینوں نے اسے غور سے دیکھا جب وہ چلنے لگا تو عبید اور حمید پریشان نظر آئے۔
"تو جا رہا ہے ؟"

"ہاں میرا خیال ہے کہ میرا چلا جانا ہی بہتر ہو گا کہ اس کے نکل جانے کے بعد میری حیثیت بھی مشتبہ ہو گئی ہے۔"

وہ چلا گیا۔

ایک دفعہ پھر وہ گم سُم ہو گئے۔ مگر ہاشم نے جلدی ہی خاموشی کی مہر توڑ دی۔ "تم تو اپنی وضعداری میں چپ رہتے۔ میں نے اسے EXPOSE کر دیا۔"

عبید اور حمید دونوں تذبذب میں تھے۔ عبید چپ رہا۔ حمید سے رہا نہ گیا۔ "یقین نہیں آتا کہ وہ بھی . . . . . "

"اب بھی یقین نہیں آیا۔" ہاشم تڑخ کر بولا۔ "اس نے تو خود اعتراف کر لیا۔ اصل میں میں بہت دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بہت اکھڑا اکھڑا تھا اور تم نے یہ غور نہیں کیا کہ اس سارے عرصے میں وہ بولا ہی نہیں تھا۔ ہر بات پیتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اسے تاڑ لیا تھا کیسا CORNER کیا۔ آخر کو پھٹ پڑا۔"

"اور ہم سے ٹوٹ گیا۔" عبید نے افسوس بھرے لہجہ میں آہستہ سے کہا۔

"اچھا ہی ہوا۔ ٹکا رہتا تو ہمارے حق میں یہ اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے اس طرح گھیر کر اسے اعتراف کرنا پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ ٹک کیسے سکتا تھا۔ اچھا ہوا اب ہم محفوظ ہیں۔"

ہاشم رواں تھا۔ عبید اور حمید اس کا منہ تک رہے تھے جیسے اس کی مت ماری گئی ہو ایک کے بعد دوسرا اتنی جلدی۔ وہ کچھ بوکھلا سے گئے تھے۔ ہاشم فاتحانہ شان سے بولے چلا جا رہا تھا ثابت کر رہا تھا کہ وہ دونوں ملے ہوئے تھے۔ "حیدر مصلحت کے تحت ٹکا رہنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اسے EXPOSE کر دیا۔ اسے اعتراف کرنا پڑ گیا۔ پھر وہ کیسے ٹک سکتا تھا۔ چلا گیا۔ اچھا ہوا۔ اس کا ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا چلا جانا بہت ہی اچھا ہوا۔"

عبید اور حمید سنے جا رہے تھے۔ قائل ہونے لگتے کہ بے یقینی کی ایک لہر آتی اور وہ اکھڑ جاتے ہاشم پھر اسی جوش و خروش سے اپنے استدلال کی تعمیر کھڑی کرتا۔ پھر وہ قائل ہونے لگتے۔ مگر قائل ہوتے ہوتے پھر اکھڑ جاتے۔ وہ بس یقین اور بے یقینی کے بیچ ڈول رہے تھے۔ اسی میں رات ہو گئی۔

"اب سونا چاہیے۔"

"ہاں مٹی ڈالو اس پر۔ سوتے ہیں۔"

اس رات وہ جلدی لیٹے کہ اس واقعہ پر سوچ سوچ کر تھک گئے تھے جلدی لیٹے مگر دیر میں سوئے کہ جانے کتنی رات تک ان کے ذہن اسی ادھیڑبن میں رہے۔

دیر سے سوئے، جلدی جاگے۔ جاگنے کے ساتھ ایک نئی حیرانی۔ جب وہ سوتے تھے تو تین تھے اور جب صبح جاگے تو دو رہ گئے تھے۔

"وہ کہاں گیا؟" حمید نے خالی چارپائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون؟"

"ہاشم؟"

"ہاشم؟" عبید کہ آدھا جاگ رہا تھا، آدھا سو رہا تھا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس چارپائی کو دیکھا جس پر ہاشم سویا تھا۔ تھوڑا چکرایا مگر وہ اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سادگی سے بولا۔ "یہیں کہیں ہوگا۔"

حمید نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ واپس آیا۔ بولا "یہاں کہیں نہیں ہے۔"

عبید نے تامل کیا پھر کہا۔ "شاید سیر کو نکل گیا ہو۔"

"ہو سکتا ہے، مگر جب کبھی وہ صبح کی سیر کے لیے اٹھتا تھا تو ہمیں بھی ضرور جھنجھوڑتا تھا۔"

"ممکن ہے یہ سوچ کر کہ پریشانی میں دیر سے سوئے ہیں جگانا مناسب نہ جانا ہو۔ کوئی بات نہیں آجائے گا۔"

اس استدلال سے بظاہر وہ دونوں ہی مطمئن ہو گئے تھے۔ مگر اندر سے دونوں ہی بے چین تھے کتنی بے کلی کے ساتھ انھوں نے اس کا انتظار کیا۔ وقت گزرتا گیا۔ بے کلی بڑھتی گئی اور وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ صبح کا دھندلکا کبھی کا چھٹ چکا تھا۔ دن چڑھ رہا تھا اور گرم ہوتا جا رہا تھا۔ عبید اور حمید پر وقت جتنا گزرتا جاتا تھا بھاری ہوتا جاتا تھا۔ آخر کو حمید سے نہ رہا گیا۔ "اب تو بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں! آنا ہوتا تو اب تک آجاتا۔"

حمید، عبید کا منہ تکنے لگا۔ خیال اس کا بھی یہی تھا۔ مگر عبید سے وہ اتنے قطعی لہجے میں جواب کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

"تو کیا ......"

"ہاں! شاید اب وہ نہیں آئے گا۔"

"تو گویا وہ بھی ...۔"

"ہاں وہ بھی۔"

پھر دونوں ہی چپ ہو گئے۔ چپ بیٹھے رہے۔ تذبذب اب تمام ہو چکا تھا اور عبید کو تو بالکل صبر آگیا تھا۔ "خیر اس کے ٹوٹ جانے پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"وہ بول بہت رہا تھا۔" رکا، پھر بولا۔ "ایسے وقت میں جو شخص بہت بولتا نظر آتے اسے شک کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔"

"اور جو چپ چاپ نظر آتے۔"

عبید نے تامل کیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "اسے بھی۔"

"عجیب بات ہے۔" حمید بڑبڑایا۔

ہاں عجیب بات ہے۔ مگر شاید اتنی عجیب بات بھی نہیں ہے۔ ایسے میں تو ہر بات ہی سے شک پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ کہتے کہتے کیسی کیسی گھڑی عبید کے دھیان میں آئی کہ جب ایک دم سے وہ سب ایک دوسرے کے لیے مشکوک ہو گئے تھے۔ کوئی چپ ہو جانے پر مشکوک ٹھہرا، کوئی بول پڑنے پر۔ کسی پر شک کہ خبر سن کر اتنا بوکھلا کیوں گیا۔ کسی پر شک کہ خبر سن کر اسے سانپ کیوں سونگھ گیا۔ کسی کے باخبر ہونے سے شک پیدا ہوا کہ اسے کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ کسی کی بے خبری نے شک میں ڈالا کہ کہیں وہ جان کر تو بے خبر نہیں بن رہا۔ شکوک و شبہات کی دھند کتنی پھیلی کہ دوست دوست کو نہ پہچان پاتا۔ دماغ کے کسی گوشے میں چپکے سے ایک سوال سر اٹھاتا۔ بات زبان پر آتی اور سرگوشی بن کر کانوں کان پھیلتی چلی جاتی۔

بیٹھے بیٹھے ایک لہر آئی اور عبید اٹھ کھڑا ہوا۔ حمید نے سوال بھری نظروں سے اسے دیکھا

"کیوں؟ .... کہاں؟"

"یہاں سے نکل چلنا چاہیئے ورنہ ممکن ہے کہ ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں۔"

حمید چونک پڑا۔ اس پہلو پر تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بس فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

دن بھر چلتے رہے یہ سوچے بغیر کہ کہاں جانا ہے۔ کوئی منزل نظر میں نہیں تھی پھر بھی ایک عجلت میں چلے جا رہے تھے۔ جیسے واقعی کہیں پہنچنا ہے۔ چلے جا رہے تھے یہ دھیان دیئے بغیر کہ کتنا چل لیے ہیں۔ کتنا اور چلنا ہے۔ کتنے سنسان، کتنے آباد رستے قدموں نے ناپے۔ قدموں میں بجلی بھری تھی کہ اسی ایک سی تیزی سے اٹھ رہے تھے اور رستے گرد ہوتے چلے جا رہے تھے۔

"بس اب یہاں ٹھہر جائیں" اچانک عبید نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"لیکن ...."

عبید نے حمید کی بات کاٹی ۔"رات تو نہیں گزارتے ہیں۔ صبح کیا کرنا ہے۔ کدھر جانا ہے۔ یہ سوچیں گے ۔"

تو وہ وہاں پسر گئے اور اب انھیں احساس ہوا کہ وہ کتنا تھک گئے ہیں۔ ٹانگیں کتنی اکڑ گئی ہیں جیسے یہاں سے اب وہ ایک قدم آگے نہیں اٹھا سکتے۔ حمید نے کمر پیچھے لگائی، ٹانگوں کو سیدھا کیا، پھیلایا۔ بولا "آج بہت چلے ہیں تھک کر چور ہو گئے۔"

"اس سے پہلے تو ہم بہت آرام کرتے تھے۔" عبید نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

اس فقرے نے عجب اثر کیا۔ دونوں ہی ملول ہو گئے بیتے دنوں کی کلفتیں اور صعوبتیں نظروں میں پھر گئیں۔ کتنے دنوں سے وہ یہ رنج کھینچ رہے تھے۔

"مگر اس سے پہلے ہم اکٹھے چلا کرتے تھے۔" حمید نے عجب طرح سے کہا کہ بچھڑنے والے دونوں ہی کو ایک دم سے یاد آ گئے۔ وہ بھی جو پہلے بچھڑے تھے، وہ بھی جو اب آکر بچھڑے، کب کب کا ملنا اور بچھڑنا یاد آیا۔ کون کون کس کس موڑ پر بچھڑا۔ اور کس کس طور بچھڑا۔ کوئی تو چلتے چلتے بس پچک گیا اور رہ گیا کسی نے کسی موڑ پر پہنچ کر اپنا اصلی چہرہ دکھایا اور خندق کے اس پار نظر آیا۔ کوئی بیچ منجدھار میں چھوڑ کر گیا کوئی پانی میں اترنے سے پہلے ہی دوسری طرف بہہ گیا۔ یار حیران کہ کہاں گیا، کدھر نکل گیا، وسوسے، تجسس، چہ میگوئیاں، سرگوشیاں، پھر خبر ملنا کہ وہ عزیز خندق کے اس پار پہنچ گیا۔ اچھا؟ واقعی؟ اول حیران ہونا۔ پھر ایک دوسرے کو قائل کرنا کہ وہ تو تھا ہی اس قماش کا۔ بس اسی طرح کتنے ہمسفر بچھڑ چکے تھے آگے کتنے قریب تھے۔ اب کتنے دور ہو چکے تھے۔

حمید نے ٹھنڈا سانس بھرا "اب تو ہم دو ۔ ہی رہ گئے ہیں۔"

"ہاں یار" عبید افسردگی سے بولا۔ پھر کہنے لگا۔ "ایسے حالات میں دو کا بچارہ جانا بھی بہت غنیمت نظر آتا ہے۔"

"مگر کب تک۔"

عبید، حمید کو تکنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ آخر کب تک۔"

پھر آپس میں وہ کوئی بات نہ کر سکے۔ بس جیسے ذہن میں ایک پھانس اٹکی ہو۔ کب تک، آخر کب تک۔ دیر تک دونوں نہ سو سکے، نہ بات کر سکے۔ پھانس بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔ ہاں آخر کب تک؟ دیر تک جاگا کیے اور کروٹیں بدلا کیے۔ مگر نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ مگر وہ نیند کہاں تھی؟ عبید کو تو بس ایک جھپکی سی آئی تھی۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ یوں ہی اس نے حمید پر نظر ڈالی جو اس کی طرف کروٹ لیے پڑا تھا اور یوں ہی اسے خیال آیا کہ اسے نیند تو آ نہیں رہی مگر حمید کس اطمینان سے سو رہا ہے

اتنے میں حمید نے کروٹ بدلی۔ اس نے پھر حمید پر نظر ڈالی۔ شاید وہ جاگ رہا ہے یا شاید سو رہا ہو اور سوتے سوتے کروٹ بدلی ہو۔ اس نے ایک تھوڑی دیر حمید پر نظر ڈالی۔ تھوڑی دیر اسے دیکھا۔ یہ جاننے کے لیے وہ واقعی سو گیا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اگر وہ جاگ رہا ہے تو یہ کیوں ظاہر کر رہا ہے کہ وہ سو رہا ہے کیوں؟ اور ایک شک کے ساتھ اس نے پھر حمید کا جائزہ لیا۔ شاید سو ہی رہا ہو۔ میرا یہ محض وہم ہے کہ وہ جاگ رہا ہے۔ لیکن اگر وہ جاگ رہا ہے اور ظاہر کر رہا ہے کہ وہ سو رہا ہے تو۔ یہ تو شک میں ڈالنے والی بات ہے اور اس کے اندر شک تقویت پکڑتا چلا گیا۔ دماغ میں ایک اندیشہ جاگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ جب صبح میں اٹھوں تو اپنے آپ کو اکیلا پاؤں۔ اس خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ اکیلا رہ جانے کا خیال بھی کتنا خوف بھرا ہوتا ہے۔ اچانک اسے کتنا ڈر لگنے لگا تھا۔ اگر میں اکیلا رہ گیا تو۔ ۔ ۔ ۔

نہیں اس نے فوراً ہی اپنے اس خیال کی تردید کی۔ حمید ہاشم نہیں بن سکتا۔ ہاشم کے تو شروع ہی سے تیور اور قسم کے تھے۔ آدمی ہی وہ اور طرح کا تھا۔ حمید ویسا آدمی نہیں ہے۔ اس نے اپنے آپ پر نفرین کی کہ لے دے کے ایک رفیق رہ گیا ہے اس پر بھی وہ شک کرتا ہے۔ میں بہت کمینہ آدمی ہوں۔ مگر پھر اس نے اپنی کمینگی کے لیے ایک عذر بھی تراش لیا۔ رفیقوں کی دغا نے مجھے شکی مزاج بنا دیا ہے۔

عبید پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی کہ حمید نے پھر کروٹ لی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں حمید کی طرف دیکھا جس نے کروٹ بدل کر پھر اس کی طرف پیٹھ کر لی تھی۔ گمان تو اسے پہلے ہی ہوا تھا اب یقین آچلا تھا کہ حمید سویا نہیں ہے، ظاہر کر رہا ہے کہ سو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے حمید کا فقرہ یاد آیا۔ "مگر کب تک"؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حمید بھی اب ڈانوا ڈول ہے۔ اچھا حمید بھی۔ اس خیال کے ساتھ وہ کتنا افسردہ ہو گیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اپنی اس بدگمانی پر قابو پائے۔ حمید اور طرح کا آدمی ہے۔ ہاشم نہیں ہے۔ سچا اور کھرا آدمی ہے۔ یہ تو گویا اپنے وسوسوں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اپنے وسوسوں کے ساتھ وہ بہت لڑا۔ بہت کشتم کشتا ہوئی مگر بے خوابی سے اس کے وسوسے طاقت پکڑتے چلے گئے اور وہ کمزور پڑتا چلا گیا۔

وہ اپنے وسوسوں کے نرغے میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔ مجھے آج کی رات سونا نہیں چاہیے۔ سویا مویا برابر۔ بے خبری میں تو نہیں مارا جانا چاہیے۔ ہاشم نے آخر ہماری نیند ہی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ نہیں مجھے جاگتے رہنا چاہیے۔

رات بھر جاگتے رہنے کے ساتھ وہ دور دور کی باتیں دھیان میں لایا۔ کوئی نیا سا خیال، کوئی عجب سی تجویز، جو بھی اس کے ذہن میں آتا اسے وہ دیر تک پکاتا۔ اس میں تفصیلات کا رنگ بھرتا چلا جاتا۔

اسی عالم میں ایک خیال اسے اور آیا۔ حمید کو کیوں موقع دیا جائے کہ وہ میرے ساتھ وہ کرے جو ہمارے ساتھ ہاشم نے کیا تھا۔ کیوں ... ہم ہی خود ہی ... ہاں بالکل۔ جب سب ہی نے یہ کیا ہے تو میں بھی... اور حبیب تو ہم سب میں سب سے بڑھ کر صاحب کردار سمجھا جاتا تھا۔ اگر حبیب یہ کرسکتا ہے تو میں کیوں نہیں کرسکتا۔ اس خیال کی رو میں وہ بہنے لگا تھا کہ اچانک اس نے اپنے آپ کو تھاما۔ نہیں یار کسی کو قائم بھی رہنا چاہیے۔ جیسے اچانک اس کے ایک کے دو ہو گئے۔ ایک دوسرے سے شرمندہ سا تھا۔ غور کرنے لگا کہ بس یونہی مجھے خیال سا آیا تھا اور پھر اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ایسا خیال مجھے مغلوب نہ کرلے۔

حمید نے ایک مرتبہ پھر کروٹ لی اور پھر اس کے کان کھڑے ہوئے وہ سوتا سا بن گیا۔ دیکھوں تو سہی وہ کرتا کیا ہے۔ دیر تک ایسے پڑا رہا جیسے بے سدھ سو رہا ہے۔ مگر جب حمید نے کوئی کروٹ نہ لی تو اس کی طرف سے بے تعلق ہو کر سوچنے لگا کہ تھوڑا سو لینا چاہیے۔ پتہ نہیں کل دن کس طرح گزرے اور رات کہاں آئے۔ کم از کم تھوڑی سی نیند تو لے ہی لینی چاہیے اور اس نے اپنے آپ سے پوچھا کہ آخر وہ جاگ کیوں رہا ہے۔ حمید کی نگرانی کرنے کے لیے؟ اور اپنی نگرانی؟ اسے خیال آیا کہ ابھی وہ بھی تو ڈانوا ڈول ہو گیا تھا۔ ایسے عالم میں آدمی کو دوسروں سے زیادہ اپنی نگرانی کرنی چاہیے۔

حمید واقعی جاگ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اس کی آنکھ ضرور لگی۔ مگر صرف آنکھ۔ دماغ نہیں سو رہا تھا دماغ نہ سوئے تو آنکھ کتنی دیر تک لگی رہ سکتی ہے۔ آنکھ لگی اور کھل گئی۔ بس پھر بار بار کوشش کرتا تھا کہ دماغ سے سارے خیال نکل جائیں اور وہ سو جائے۔ کتنی مرتبہ اسے گمان ہوا کہ اس نے اچھے برے خیالوں کو نکال باہر کیا ہے اب نیند آجائے گی۔ دیر تک ایسے پڑا رہا جیسے بس نیند آنے لگی ہے۔ آرہی ہے، آگئی ہے۔ مگر پھر پتہ چلتا کہ جنھیں نکال باہر کیا تھا وہ سب پھر اندر گھس آئے ہیں اور دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ پھر کروٹ لیتا۔ جیسے کروٹ لینے سے دماغ سے اچھے برے خیال رخصت ہو جائیں گے اور نیند کے لیے رستہ صاف ہو جائے گا۔

کروٹیں لیتے لیتے اسے احساس ہوا کہ علید بھی سویا نہیں ہے۔ اچھا میں سمجھ رہا تھا کہ سو گیا ہے۔ جاگ رہا ہے تو ظاہر کیوں نہیں کرتا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مگر پھر اس نے اپنے اس خیال کو زیادہ طول نہیں دیا۔ وہ اس وقت اپنے کسی بھی خیال کو طول دینا نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس وقت سونے کی فکر تھی۔ مگر خیال خود بخود طول پکڑتے چلے جا رہے تھے اور پھر اسے گمان گزرا کہ علید نہ صرف جاگ رہا ہے بلکہ اس نے کئی بار اس کی طرف غور سے دیکھا ہے۔ پہلے گمان ہوا پھر

کروٹ لیتے ہوتے اس نے عبید کی طرف اڑتی سی نظر ڈالی اور پایا کہ واقعی وہ تو اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ کیا میں بھی مشکوک ہو چکا ہوں۔ اس نے اس خیال کو بہت رفع دفع کرنا چاہا۔ مگر اپنی ہر کروٹ کے ساتھ اس نے محسوس کیا کہ عبید چوکنا ہو گیا ہے۔

حمید نے ایک بار پھر کروٹ لی اور ایک بار پھر اس نے محسوس کیا کہ عبید اس کی کروٹ پر چوکنا ہو گیا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "عبید"

عبید بہ ظاہر تو نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے مگر پھر بول ہی پڑا "ہوں" اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یار نیند نہیں آ رہی ہے" پھر تھم کر بولا۔ "تم تو سو لیے ہو۔"

"نہیں" حمید نے روکھا سا جواب دیا۔

"یار رات بہت لمبی ہو گئی" عبید نے جماہی لی۔

حمید نے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔ "عبید"

"ہاں۔ کیا بات ہے" عبید نے غور سے حمید کو دیکھا۔

"تمھیں میرے بارے میں کوئی شک ہے؟"

عبید جیسے چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔ سٹپٹایا۔ پھر سنبھلا۔ آہستہ سے بولا۔ "ہاں تمھارے بارے میں بھی اور اپنے بارے میں بھی"

حمید اس کی صورت تکنے لگا۔ چپ رہا۔ پھر دبے لفظوں میں بولا "شاید میرا بھی یہی قصہ ہے۔"

OO

آج : ۱۰

انور سجاد

پھیلی پتلیوں میں رات

مشتری چہرہ، دودھ اُبلتی چھاتیاں، زہرہ کا اُبھار جیسے اپنی ہی کائناتی توانائی کی شعاعوں سے دمکتا ہے۔ باقی بدن گھُپ اندھیرا جس میں ہڈیوں پر منڈھی کھال نظر نہیں آتی۔

بادامی آنکھوں کی پتلیوں میں پھیلی سیاہ رات۔

سرتا ہُوا، نظریں آسمان میں اُتریں، پاتال سے تارے کھینچ کر تیرا دینے کی خواہش۔

آنسو، جو کبھی نہیں ٹپکتے۔

وہ اپنا بایاں پاؤں گھسیٹ کر چلتی ہے جیسے پاؤں میں پڑی زنجیر کے ساتھ وزن بندھا ہو۔ وہ لنگڑی بھی نہیں ہے۔

بائیں پاؤں میں پڑی زنجیر کے ساتھ وزن بندھا ہے، چہرے، چھاتیوں اور اُبھار سے پھیلتی اپنی ہی کائناتی توانائی کی شعاعوں کی دمک میں اُس کی ٹانگوں، بازوؤں اور دھڑ کے گرد زنجیریں آکاس بیل کی طرح لپٹی نظر آتی ہیں، کہیں ڈھیلی کہیں کسی ہوئی۔ گردن میں طوق۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ فریبِ نظر ہو اور محض پسینے میں گندھے گرد و غبار سے بدن پر کھنچی موٹی موٹی، خم کھاتی، گولائی میں مڑتی لکیروں نے ایک دوسرے کے ساتھ مڑ کر حلقوں کی شکل اختیار کر لی ہو یا جسم کے ساتھ لپٹے، لٹکتے تار تار لباس کی سکڑتی گھنگھریالی لیریں زنجیروں کے حلقے بن کر نظر آتی ہوں۔

تو پھر زنجیروں کی جھنکار؟ فریبِ سماعت؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا، حسّیات کے تیکھے پن یا ادراک پر منحصر ہے۔

وہ اپنا بایاں پاؤں گھسیٹ کر چلتی ہے۔ آہستہ آہستہ

فضا میں زنجیروں کی جھنکار اُبھرتی ہے، چلنے کی رفتار سے ہم آہنگ، مدھم مدھم، ہوا کے لہر لہر جھونکوں کے ساتھ بھولی بسری یادوں کی گونج۔

مرے ہوؤں کے پچھتاوے؟ زندوں کی خواہشیں؟

گھٹی گھٹی سسکیاں، سرگوشیاں، مدھم آوازیں ایک دوسرے میں گھلتی ملتی، مبہم، شہر پہ

جگمگی کائنات کی ازلی سیاہی میں، شہر کے اندر پھیلی ابدی تاریکی میں، گلیوں بازاروں شکستہ گھروں میں شاہراہوں عالیشان بنگلوں شاپنگ سنٹروں میں، غلام گردشوں برآمدوں کھڑکیوں دروازوں کمروں بستروں میں سرسراتی، کانوں میں رینگتی، بھنبھناتی، نیند کو جاٹتی ہیں۔

بستروں میں بے چینی سے کروٹیں بدلتے خواب حقیقت میں ڈھلنے کی آرزو لیے جسموں کو جگاتے ہیں، ذہنوں کو سلاتے ہیں۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ لہرا لہرا آتی جھنکار کی گونج کا کوئی نقش نہیں سرسراتی، رینگتی، بھنبھناتی آوازیں اس نقش کو بھی چٹ کر جاتی ہیں ورنہ جسموں کے ساتھ ذہن بھی جاگ رہے ہوتے۔ لیکن یہ محض قیاس ہے۔

فضا میں رچی کنواریوں کی خوشبو، رات کی باس۔ کھٹ میٹھی

سیلن میں رچے کوڑے کرکٹ سے پھیلتا تعفن، رات کی باس۔ بوجھل، تلخ۔

رات کے کسی بھی پہر میں وہ ایک مرتبہ یا بار بار یوں ہوتا ہے کہ اس کے چمڑہ منڈھے بدن پر دمکتی چھاتیاں، مشتری چہرہ اور زہرہ کا ابھار رفتہ رفتہ تمتماتے اتنے روشن ہوجاتے ہیں جیسے لاکھوں سورج، زنجیروں میں زلزلہ آجاتا ہے۔ ایک دوسرے سے الجھتی، کھنکتی، بائیں پیر میں پڑے وزن سے ٹکراتی زنجیروں کی جھنکار دنیا کی سب سے بڑی آبشار کی صدا بن جاتی ہے۔

لاکھوں سورج آوازوں کے آبشار میں سفر کرتے دھنک رنگ

لیکن بستروں تک کسی رنگ کسی آواز کی رسائی نہیں۔ رات کا اندھیرا ہے، رات کی سرگوشیاں ہیں یا حقیقت میں ڈھلنے کی آرزو لیے بے چینی سے کروٹیں بدلتے خواب

وہ چلتی ہے آہستہ آہستہ، منوں بوجھ اٹھائے۔ سرتنا ہوا۔

شہر تاریک ہے۔ بجلی کے کھمبوں کے ساتھ یا کمروں میں جلتے بلبوں کی روشنی جامد، پھیلتی نہیں، جیسے کسی پینٹنگ میں جلتے بلب، پینٹنگ سے باہر کچھ بھی نہیں روشن کرتے، اپنی روشنی کو خود ہی نگل لیتے ہیں۔

سناٹا۔ دور دراز جاتی بسوں، رات کی پروازوں، گھر کی جانب بھاگتے تیز رفتار رکشا، اور سینما کے آخری شو کے بعد سواریوں کو پکارنے والوں کے شور، ڈھیلی چولوں والی ہلتی چارپائی کی ہیجان انگیز بے شرم چرچراہٹ کے باوجود سناٹا جیسے آوازوں کا منبع ہی آوازوں کا قبرستان ہے۔

جب وہ لاکھوں سورجوں کے دھنک رنگ اپنے بدن میں نہیں سنبھال سکتی اور آبشار اس کے کانوں میں گرنے لگتی ہے تو وہ لمحہ بھر کے لیے رک جاتی ہے۔

اس کے دل سے ایک کوک رفتہ رفتہ اٹھتی ہے، اٹھتی ہے، دھیرے دھیرے، دھیرے دھیرے بڑھتی ہے،

زمین میں پڑے بیج سے پھوٹ کر زمین کو چیر کے نکلتی پہلی پتی، نوکیلی، دو دھاری، تیز، رفتہ رفتہ چیرتی ہے، دل سے نکل کر حلق کے زہریلے لعاب میں بجھ کے زبان پہ آ کر روشن ہوتی دھیرے دھیرے اُبھرتی، پھیلتی ساری کائنات پر محیط ہو جاتی ہے

— میاآآآآآن پوترووووووو ڈ

صرف دو لفظ، دو میز اُملیں شہر کی گلیوں بازاروں میں گھومتی، بھول بھلیاں میں چکر کھاتی، تزتاتی ہوئی نکلتی ہیں، لمبی تاریک، مزاحم، کھردری رات کو اس رفتار سے کاٹتی چلی جاتی ہیں کہ میز انکھوں کی رگڑ سے ساری کائنات، مشتری چہرہ، دُودھ اُبلتی چھاتیاں، زہرہ کا اُبھار بن جاتی ہے، لاکھوں سورج۔

— میاں پوترو

دھنک رنگ، آبشار—

شہر تاریک ہے۔ تاریکی کی اپنی بھی کوئی روشنی نہیں۔

سناٹا— سناٹے کی اپنی بھی کوئی آواز نہیں۔

کچھ سونگھنے کی تشویش میں تھوتھنی اُٹھائے کُتے کی بھونکار سناٹے ہی میں جذب ہو جاتی ہے۔

دہن میں، زبان پر، رحم میں جمتی پھپھوندی، جسموں سے خاموشی اُگتی ہے۔

وہ سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر آگے بڑھتی ہے۔ اپنی بادامی آنکھوں کی پتلیوں میں تارے بجھی تاریک رات کو ملتی ہے۔

آنکھوں میں پھلجھڑیاں

وہ راتیں جب چاند معدوم ہوا

— میاں پوترو

اور جسموں پر خنجروں نے پھول کاڑھے

چاروں اور جلتی آگ نے آنکھوں کا نور چھینا۔ لپکتی آگ کی لپٹوں کے ساتھ ہمبستری

نہ ختم ہونے والی، لاشوں قبروں سے بنی سڑک پر چلتی

— میاں پوترو

جسم سے چمٹے دن کے حشرات الارض کو نوچ نوچ کر پھینکنے کی کوشش میں تھک جانے

کے بعد بستروں میں بے چینی سے کروٹیں بدلتے نیم مُردہ خواب اپنے جسموں کی مٹی چاٹ چاٹ کر خود اپنی ہڈیوں کو برہنہ کرتے ہیں۔

صرف اُدا اس چادر کے پیچھے کھڑی ماں نے بیٹے کے کھو جانے کا مطلب جانا اور خوف زدہ لرزتے ہونٹوں سے اس کی سلامتی کے لیے دعا کی۔

رات کا گھیراؤ، خروج۔ یادداشتیں۔ پیاسے بھوکے، یعقوبؑ کے گوشت پر پلتے۔

یادیں اندھوں کے لیے روشنی۔ بہروں کے لیے مسلسل سیٹی

میاں پوترو۔ میاں پوترو

وہ بھاگتی پھرتی ہے اِدھر سے اُدھر

الامان، الامان، دارالامان

اُدھر سے اِدھر، وہ بھاگتی پھرتی ہے

بھول بھلیاں

راستوں میں عفریت، سائے، سوال۔ وہ تھک ٹوٹ کر ہار جاتی ہے۔ آنسو اس کی آنکھوں میں اٹک جاتے ہیں۔ ساری دنیا میں کوئی نہیں جانتا کہ آنسو، کھوئے ہوؤں کی آس میں بہتے نہیں۔ کوئی بھی درد کے ساتھ اکائی بن کر نہیں روتا

اس کا بدن زمین کی مٹی، ذرہ ذرہ لطن

—— میا آ آ آن پوترو و و و

لیکن کانوں میں سب کچھ فلٹر ہو کر صرف رات کی بھنبھناہٹ رہ جاتی ہے۔ آنکھوں میں دن کی کرچیاں اور کوئی نقش نہیں

کال کوٹھڑیوں کی دیواروں پر بڑھے ہوئے ناخنوں سے کندہ کیے گئے اقوالِ زریں۔ آیات

آندھی حافظے کو مٹا دیتی ہے؟

وہ سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر پھر آگے بڑھتی ہے۔ آنکھوں کی پتلیوں میں تاروں سے بجھی رات کو ملتی ہے۔

جنگلوں میں اُگے خاردار تاروں سے بنے تاج۔

اس کی استخوانی اُنگلیاں آنکھوں کو ملتی ماتھے پر پھسل جاتی ہیں۔ وہ ٹھٹک کر انگلیوں کی پوروں کو آہستہ آہستہ ماتھے پر پھیرتی ہے۔ بار بار۔ اُبھری ہوئی لکیروں کو، سلوٹوں کو پوروں سے پڑھنے

کے بعد ماتھے کو ہتھیلیوں سے خوب رگڑتی ہے، مٹانے کی کوشش کرتی ہے

لیکن سنگینوں کی نوکوں سے موت کے فارمولے کندہ کیے جا چکے ہیں

وہ ماتھے کو ہتھیلیوں سے رگڑتی، مشتری چہرہ آسمان کی طرف اُٹھا کر آسمان کو کھوجتی ہے۔

بڑھے ہوئے میل خوردہ ناخنوں سے ماتھے پر کندہ تحریر جیتے جاگتے لہو میں بہہ نکلتی ہے۔

وہ بائیں پیر کو گھسیٹتی آگے بڑھتی ہے۔ زنجیروں کی آوازیں رُک رُک کر فضا میں اُبھرتی ہے، مدھم مدھم، جیسے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتی بھولی بسری یادوں کی گونج، لہر لہر۔

اُس کی ناک کی پھننگیں دائیں طرف سے آتی تیز بدبو سے پھڑکنے لگتی ہیں۔ وہ اُس اور مُڑ جاتی ہے

رُوڑی میں گندھے روٹی کے ٹکڑے، باسی سالن، ہڈیاں، گوشت کے ریشے، گلی سڑی سبزیاں، پھل، چھلکے، خالی ڈبے، ٹوٹی بوتلیں، بال، گلے کاغذوں پر پیپ اُگلتے لفظ، استعمال شدہ فریج لیلا، گھورے کے کیڑے مُردہ نطفے، سیلن میں جذب بھوک، اشتہا

فضا میں رچی کنواریوں کی خوشبو، خواب کی باس

روڑی کی چوٹی پر خون آلود گٹھڑی سی۔

دُور دراز جنگلوں میں، باغوں میں، پارکوں میں، گھروں میں سجے گملوں میں مرتے پھولوں کے لیے آہ وزاری، شہوت کی چار دیواری میں رقص، کنوارے ہونٹوں سے گائے گئے سُہانے خواب، اخباروں میں قتل، اغوا اور زنا کی خبروں کی لذت، بسوں میں ریل گاڑیوں میں جہازوں میں، ہوٹلوں میں عدالتوں میں عبادت گاہوں میں یونیورسٹیوں میں وجود عدم وجود کی بحثیں جوئے کی سائنس میں اور سائنس کی جوئے میں قلبِ ماہیت، حکیمانہ تشخیص اور عامیانہ نسخے، کتابوں میں صحیفوں میں خوف، جبر، قہر اور موت عظیم لفظ

پیکیج ڈیل، زندگی کی خون آلود گٹھڑی، روڑی کی چوٹی پر۔ آنول سمیت۔

اس کی نظریں تازہ سُرخ دھبوں سے منقش گٹھڑی پر جم جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سُکڑتی پھیلتی ہیں۔ اس کا مشتری چہرہ، دُودھ اُبلتی چھاتیاں منوّر، اندر کو پچکا پیٹ پھولتا ہے پھولتا ہے، دمکتا ہے، دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ، وینس کے اُبھار میں مدّوجزر، درد، ٹیسیں، جنم کی آلائشوں کی خوشبو بے بی پاؤڈر میں بھیگی، جنم لینے کی جنم دینے کی خواہش حرامی، خوشبوں کے باغ میں زنا بالجبر کا ثمر،

جب اس کا سارا وجود پھوٹتے ستارے کی طرح پھٹنے لگتا ہے تو اس کے دل سے، رفتہ رفتہ دھڑکتی آواز اُٹھتی ہے، بڑھتی ہے دھیرے دھیرے جیسے زمین میں پڑے بیج سے پھوٹتی، زمین

کو چیر کے باہر نکلتی پہلی پتی- نوکیلی، دو دھاری، تیز، رفتہ رفتہ چیرتی حلق کے زہریلے لعاب میں
بھیگتی زبان پر آ کے روشن ہو جاتی ہے اور دھیرے دھیرے ساری کائنات پر محیط ہو جاتی ہے:
— میاآآآآن پوترو ووودو

لیکن بستروں تک کسی صدا کسی رنگ کی رسائی نہیں۔ رات کا اندھیرا، رات کی سازشی سرگوشیاں
اور بے چینی سے کروٹیں بدلتے اور ہوس میں مبتلا خواب سب کچھ فلٹر کر دیتے ہیں۔

وہ چلتی ہے۔ آہستہ آہستہ، منوں بوجھ اٹھائے، سر تنا ہوا
تلاش، نفی کرنے والوں کا خاردار چنچہ
تلاش شہر کی رگوں میں دوڑتی سورج مچھلی

ہو سکتا ہے، بظاہر، تاریکی اور سناٹے کے تانے بانے سے بُنے شہر کا یہ منظر نامہ محض پھسلتے لمحے کے اپنے ادراک کا اعجاز ہو، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

OO

کنواں

خالدہ حسین

اُس لمحے مجھے فوراً ماں کا خیال آیا۔ وہ اپنے کسی بزرگ کے متعلق بتایا کرتی تھی کہ انہیں راہ چلتے بے شمار چیزیں ملتی تھیں۔ تب میں بہت چھوٹا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ اکثر خواب میں سڑکوں کی دھول میں دور دور تک چمکتے سکے رُلتے مجھے نظر آیا کرتے تھے اور میں مٹھیاں بھر بھر اٹھا کر جھولی میں ڈالا کرتا تھا۔ اور اسی کوشش میں میری آنکھ کھل جاتی اور تب میں دیکھتا کہ میری جھولی خالی ہے۔ مٹھیاں بھنچی ہیں اور ان میں پسینہ ہی پسینہ بھرا ہے۔ تب میرے دل پہ ایک تاریک بوجھ اتر آتا۔ ایک بھولی بسری خوفناک سرگوشی، تاریک رات میں سانس لینے والے نامعلوم حادثے سرسراتے میری کمر میں اوپر کی طرف چڑھنے لگتے۔ میری گردن میرے منہ کی طرف۔ کوئی میری آنکھوں میں سوئیاں بھر دیتا۔ میں چیخنا چاہتا اور نہ چیخ سکتا اور یہ جادو بھری بے بسی مجھے مسلسل۔ ہمیشہ ہمیشہ۔ میرے اپنے وجود کے ساتھ زندہ رہنے والی حقیقت محسوس ہوتی۔ میں ماں کے بستر کی طرف بمشکل ہاتھ بڑھاتا۔ ٹٹولتا۔ اس کی بھری بھری بانہہ اور اس کی چوڑیاں میری انگلیوں سے مَس ہوتیں۔ تب میں ذرا کشادگی سے سانس لیتا اور پھر ان گم ہو جانے والے بے شمار خوبصورت چمکتے دمکتے سکوں کے متعلق سوچنے لگتا جو یوں میرے راستوں کی دھول بنے پڑے تھے اور جنہیں سمیٹ کر میں نے کھو دیا — گم کر دیا۔

تو اس لمحے بھی مجھے ماں اور اس کے بزرگ اور اپنے خواب تینوں ایک ساتھ یاد آئے۔ ماں بتاتی تھی کہ جب بھی ماما گھر میں داخل ہوتے ان کی جیب چھوٹی چھوٹی عجیب و غریب چیزوں سے بھری ہوتی۔ کبھی کوئی ایک آدھ سکہ۔ کوئی خوبصورت چمکتا دمکتا موتی۔ بالوں کا کلپ، قمیضوں کے رنگین بٹن۔ اور بعض بالکل ہی بے معنی چیزیں۔ مگر ایسی کہ خواہ مخواہ ان کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کو جی چاہے۔ یہ عجیب و غریب خزانہ لا کر وہ بچوں کے سامنے زمین پہ ڈال دیتے اور بچے اس پر جھپٹ پڑتے۔ حالانکہ چند ہی لمحوں کے بعد وہ سب چیزیں ان کے لئے بے معنی بن چکی ہوتیں اور وہ انہیں ادھر ادھر پھینک پھانک دیتے۔ مگر سب ماما کی اس چھٹی حِس پر حیران تھے کہ آخر انہیں راہ چلتے اتنی ڈھیر سی چیزیں کیونکر ملتی ہیں۔ حالانکہ باقی سب لوگ بھی تو انہیں راستوں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ تب ایک دن بڑے ابا نے بنیان چڑھا کر ماں سے کہا تھا کہ بھئی یہ سمجھنا کونسا ایسا مشکل ہے۔ ایک تو ایسی چیزیں بے کار لوگوں کو ملتی ہیں جنہیں اور کچھ کرنے کو نہ ہو۔

دوسرے جن کی نظریں ہر دم زمین ہی سے لگی رہیں۔ بات تو یہ ٹھیک ہی تھی کیونکہ ماما ہمیشہ زمین کی طرف دیکھتے چلتے تھے۔ وہ زمین کا گز بنے شہر میں گھومتے۔ مگر نظریں اپنے پاؤں سے ذرا آگے زمین پر ہی جمی رہتیں۔ تو ظاہر ہے کہ جو زمین کو ہر دم دیکھے گا اس پر زمین اپنا آپ ظاہر کرے گی۔

آج برسوں بعد مجھے ایک دم یہ سب باتیں یوں یاد آئیں جیسے سب کل ہی کی بات ہو۔ جیسے دھول بھری راہوں سے چمکیلے سکے سمیٹتے ہوئے اور ان کو جاگ کر کھوتے ہوئے میں ابھی اٹھا ہوں۔ وہی تاریک ہول اور سینے سے پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سی اٹھ کر کنپٹیوں تک جاتی ہوئی۔ وہی سب کچھ اب بھی میرے اندر تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا۔ پاؤں ذرا سا آگے کر کے اس پر رکھ دیا۔ کچھ لمحے توقف کیا اور پھر بالآخر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ کر میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔

مگر میرا وہ جھکنا بھی عجب جھکنا تھا۔ یوں جیسے ایک دم ساری زمین کا بوجھ جھک کر میری کمر پہ آ گیا ہو اٹلس کی طرح جو دنیا کو کاندھوں پر اٹھائے کھڑا ہو۔ مگر پھر مجھے یاد آیا کہ یہ بوجھ تو کوئی انوکھا بوجھ نہیں، یہ تو میری ہڈیوں اور میرے جسم کا وہ زوال ہے جو عرصہ سے میرے جسم میں نمو پا رہا ہے۔ یہ میرا کائنات کی جڑی بوٹیوں کے ساتھ رشتہ ہے۔ جس طرح وہ نمو پاتی ہیں، سرسبز ہوتی ہیں، پھر خشکی ان کی رگوں میں سرایت کر جاتی ہے اور ان کی ہریاول کو چاٹ جاتی ہے ان کا رنگ مرنے لگتا ہے اور ان میں ایک ٹوٹتی کیفیت ایک ترٹخ پیدا ہو جاتی ہے تو میں بھی ان بہت سے پودوں میں سے ایک پودا تھا کہ میری ہریاول کو وقت کی امربیل لپٹ چکی تھی۔ ایک ترٹخ جو بچپن میں جادو بھری بے بسی کا احساس تھی، مسلسل میرے وجود کی حقیقت بن چکی تھی۔ یہ نمی اور رنگ کھوتے ہوئے پیڑ پتے میرے ہم جنس تھے۔ تو پھر جھکنے میں یہ بوجھ کا احساس میری کمر کے لئے کچھ نیا نہ ہونا چاہیے تھا۔

مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں نے نہایت واضح طور پہ یہ محسوس کیا کہ یہ بوجھ میرے اندر سے، ہڈیوں اور لہو اور جسم کے رگ پٹھوں میں سے نہیں نکلا۔ یہ تو ایک دم سے اوپر سے وارد ہوا ہے۔ اترا ہے۔ منزل بہ منزل ایک اتران جو آہستہ آہستہ میری کمر کے ساتھ چپک گئی ہے۔ یہ وہ بوجھ ہے جو گہری سیاہ نیند میں کبھی ہم انسانوں پر یوں وارد ہوتا ہے کہ ہم نیچے ہی نیچے دھنستے چلے جاتے ہیں اور بالآخر گھبرا کر بیدار ہو جاتے ہیں اور شکر کرتے ہیں کہ وہ خواب تھا اور وہ بوجھ بھی خواب کا بوجھ تھا۔ مگر اب جبکہ میں نے جھک کر دھول مٹی میں سے اپنے قدموں سے کچھ آگے سے اسے اٹھا لیا اور سیدھا بھی ہو گیا، تب بھی میں نے یوں محسوس کیا گویا میں ایک کمان کی مانند جھکا ہوں۔ یا پھر دنیا کا گولا۔ نیلے سمندروں اور خاکی خشکیوں بھرا گولا میرے کاندھوں پہ دھرا ہے۔ یہ اس خواب کا بوجھ نہ تھا جو بیدار ہونے پر مر جاتا ہے۔ یا یہ وہ خواب نہ تھا جو جاگنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ خواب اور اس کا بوجھ دونوں مسلسل تھے۔ حقیقت تھے۔ اس لئے خواب نہ تھے۔

میں نے جھاڑ پونچھ کر اسے اپنی بائیں جیب میں رکھا ۔ مگر چند قدم چل کر ہی مجھے یوں لگا، جیسے ہر دھڑکن کے ساتھ وہ میرے دل کی دیواروں کے ساتھ ٹکراتا ہے ۔ تب میں نے (اپنا دیکھتے ہی اسے اپنی داہنی جیب میں منتقل کر دیا۔

عجیب بات تھی کہ میرے پاؤں من من بوجھل ہو گئے تھے ۔ سانس یوں دھونکنی کی طرح چلتی تھی کہ گویا کہیں سے بڑی بھاری مزدوری کر کے چلا آ رہا ہوں ۔ میں کچھ دیر دم لینے کو رک گیا۔ سامنے دفتر کی بے شمار سیڑھیاں تھیں ۔ ایک ہفتہ سے لفٹ خراب تھی۔ یوں بھی اس لفٹ میں مجھے ایک عجیب و غریب تجربہ ہوا تھا اور وہ بھی ایک بوجھل خواب کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، مسلسل میرے ساتھ سانس لیتا تھا۔ اسی لئے میں لفٹ کا استعمال کم سے کم کرتا تھا ۔ اب بہتر ہے کہ میں آپ کو اس تجربہ سے آگاہ کر دوں ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو بھی ایسا کوئی تجربہ ہو چکا ہو ۔ یا شاید یہ بھی میرا وہم ہو۔ دراصل یہ آپ ہی کا تجربہ ہوا اور میرے ساتھ ہوا ہو یا پھر یہ ان میرے ہم جنس رنگ اڑے پھول پتوں، درخت اور پودوں کا تجربہ ہو اور میرے ساتھ ہوا ہو جو مسلسل زمین کی جانب جھکتے چلے جا رہے ہیں ۔ اسی لئے زمین ان پر اپنا آپ کھولتی ہے ۔

تو کچھ عرصہ ہوا میں اپنے کمرے میں نویں منزل پر پہنچنے کے لئے اس لفٹ میں سوار ہوا ۔ اس روز لفٹ مین نہیں تھا ۔ شاید چھٹی پر تھا۔ میں برسوں سے اس لفٹ پر چڑھتا اترتا آ رہا ہوں ۔ لفٹ مین تو محض ایک اضافی چیز تھا۔ اگر وہ ساتھ ہوتا بھی تو کیا تھا؟ تو میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ سوئچ بورڈ پر سے نمبر ۹ کا بٹن دبایا ۔ آج میرے ساتھ کوئی بھی نہ تھا ۔ شاید گھڑی خراب ہونے کی وجہ سے میں وقت سے بہت پہلے ہی آ گیا تھا ۔ بہرحال بٹن دباتے ہی لفٹ روانہ ہوئی اور سوئچ بورڈ پر منزلوں کے نشان جلنے بجھنے لگے۔ مگر پانچویں منزل کے بعد اچانک گھپ اندھیرا ہو گیا ۔ میں نے محسوس کیا لفٹ رک چکی ہے ۔ میں کہیں پانچویں اور چھٹی منزل کے درمیان معلق تھا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا محسوس دیواروں کی طرح تنا کھڑا تھا ۔ اور اس اندھیرے میں میں نے دیکھا کہ اس دیو قامت عمارت کے کہیں بیچوں بیچ ایک اندھے ــــ نہ ختم ہونے والے اندھے کنوئیں کے درمیان ــــ ایک تاریک غیر وجود کے گہرے اونچے تنگ راستے ــــ نیچے سے اوپر جانے والے ایک غیر وجود کے اس راستے کے درمیان میں اکیلا معلق ہوں اور چاروں طرف اندھیرے کی محسوس دیواریں ہیں، لمحہ لمحہ آگے بڑھتی ہیں ۔ باہم ملنے کو بے قرار چلی آتی ہیں ۔ چنانچہ میں نے پکارنا چاہا۔

پہلے میرے ذہن میں کچھ نہ آیا کہ آخر میں کس کو پکاروں؟ کیا اس نویں منزل پر اپنے کمرے میں، لکڑی کی میزوں کرسیوں میں اپنے ساتھ بیٹھے، فائلوں پر جمائیاں لینے والے ساتھیوں میں سے کسی ایک کو؟ جن کی سب کی صورتیں ایک سی تھیں۔ نہیں ان لوگوں تک میری پکار اس اندھے گہرے کنوئیں میں سے کس طرح پہنچ سکتی تھی۔ اور بالفرض پہنچ بھی گئی تو وہ ضرور سنی ان سنی کر دیں گے اور میز کے نیچے ہیٹر چھپائے اپنے پاؤں سینکتے رہیں گے ۔ پھر میں نے سکینہ کو پکارنا چاہا ۔ وہ یقیناً میری آواز سن کر دوڑی چلی آتی مگر ابھی میری

سمجھ کچھ تھوڑا بہت کام کرتی تھی۔ سکینہ اور اس اندھے کنوئیں میں؟ وہ کہیں گھر میں بیٹھی ہے۔ بچے سکول کالج جا چکے ہیں اور وہ گھر کے کاموں میں جتی ہے اور یہاں سے وہاں تک کا فاصلہ معلوم کتنے میلوں کا ہے۔ یہ میں نے کبھی آج تک ماپا ہی نہ تھا۔ غور ہی نہ کیا تھا کہ اگر اچانک مجھے اس کو پکارنے کی ضرورت آن پڑے تو یہ کتنے میلوں کا فاصلہ ہے کہ میری آواز کو طے کرنا پڑے گا۔ مگر اس کی ضرورت تو اس ہر وقت کھڑکھڑاتے فون کی وجہ سے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ کوئی ضروری کام ہوتا تو میں فون ہی پر سکینہ کو ہمسایوں کے گھر بلا لیتا اور اس کی ٹھنڈی میٹھی آواز سن کر تازہ دم ہو جاتا اور حیران ہوتا کہ آخر گھر میں اس عورت کی اور اس کی آواز کی تمام دلکشی کہاں گم ہو جاتی ہے۔ ہاں تو اس وقت میں نے سکینہ کو پکارنا چاہا۔ مگر آواز میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ تب میں نے جانا کہ میں سکینہ سے میلوں نہیں صدیوں کے فاصلے پر ہوں اور یہ کس قدر ظلم کی بات ہے کہ میں نے کبھی اس تک اپنی آواز براہِ راست پہنچانے کا نہ سوچا تھا۔ یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ کبھی مجھے اندھے کنوئیں میں سے پکار کر اس کو بلانا ہوگا۔

مگر پھر میری غیرت جاگ اٹھی۔ مجھے یاد آیا کہ میں مرد ذات ہوں اور مرد خدا کے شیر ہوتے ہیں۔ اور میں اس وقت خوف زدہ ہو کر اپنے وجود کی نفی کر رہا ہوں —— خصوصاً ایک عورت کو پکار کے۔ میں نے سکینہ کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میں نے بند دروازے کو کھولنا چاہا۔ اس کی لوہے کی جالی دار سلاخوں کو جھنجھوڑا۔ مگر اس کے باہر تو کچھ بھی نہ تھا۔ محض اندھیرا اور خلا۔ دروازہ کھول کر آخر مجھے جانا بھی کہاں تھا۔ قدم رکھنے کو زمین کہاں تھی؟ چنانچہ میں خاموش کھڑا رہا۔ اور اندھیرے کی محسوس دیواریں آپس میں ملنے کو بےقرار قریب قریب آتی چلی گئیں۔

پھر میرے سر کی جانب اچانک ایک گرم گرم لاوا لپکا اور میں نے یوں جانا گویا میں خود بخود انتہائی تیزی سے اوپر اٹھا جا رہا ہوں —— اوپر ہی اوپر —— اوپر —— پھر اچانک ایک جھٹکے سے سب کچھ روشن ہو گیا۔ لفٹ کا دروازہ کسی نے کھول دیا۔ باہر نویں منزل تھی اور میرا ایک ساتھی حیران کھڑا تھا۔ "یار حد کرتے ہو۔ معلوم نہیں یہ لفٹ انتہائی خطرناک ہے۔ وہ تو میں نے کہیں نیچے سے سوئچ بورڈ پر دیکھ لیا کہ کوئی مارا گیا عین بیچ میں —— یہ تمہیں کیا سوجھی؟ ذرا باہر پڑھ تو لیا ہوتا۔"

میں خاموشی سے باہر نویں منزل پر اتر گیا۔ اس روز کے بعد سے کبھی لفٹ پر نہیں چڑھا۔ مگر وہ تاریک اندھا۔ نہ ختم ہونے والا کنواں میرے وجود کا حصہ بن گیا ہے۔ میرے ساتھ سانس لیتا ہے۔

تو اسی لئے اس وقت بھی مجھے آٹھ منزل کی سیڑھیاں طے کرنا تھیں۔ اور اب تو یہ میری عادت بن چکی تھی۔ میرے ساتھی سب ہنستے تھے کہ ان کی صحت کا راز یہ آٹھ منزلہ سیڑھیاں ہیں اور اکثر کہتے تھے کہ تم ٹی وی میں اپنا ایک اشتہار دلوا دو۔ "میری صحت کا سنگھار۔" حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے سینے میں کتنے گرم گرم جاں بلب پرندے پھڑپھڑاتے میرے حلق میں آن اٹکتے ہیں۔

یہ آٹھ منزلہ سیڑھیاں طے کرنا میرا مقدر بن چکا ہے۔ مگر آج میرا ایک ایک پاؤں منوں بھاری تھا۔ ساری دنیا کا گولا اپنے تمام سمندروں اور خشکیوں کے ساتھ میرے کاندھے پر دھرا تھا اور میں اسے سنبھالے سنبھالے زمین کی جانب جھکا جاتا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اپنے وجود کو کبھی اتنا بوجھل محسوس نہ کیا تھا۔

بمشکل زینہ طے کر کے میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ سامنے فائلوں کا ڈھیر لگا تھا اور اس پر مٹی کی ایک باریک تہہ جم چکی تھی۔ میز کے نیچے کونوں میں مہین جالے لٹک رہے تھے۔ میں نے رومال سے پیشانی کا پسینہ خشک کیا۔ "بھئی آج تو اس ہاشمی نے کمال ہی کر دیا۔ میں نہ دیکھ لیتا تو بس زمین آسمان کے درمیان لٹکا ہی رہتا۔ تا قیامت۔" میرے اس ساتھی نے پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے وہی بات چھیڑ دی۔ میں نے سنی ان سنی کر دی۔ کیونکہ اب تو دائیں طرف بھی وہ میرے سینے کی دھڑکن کے ساتھ لپٹا دھڑک رہا تھا اور غیر شعوری طور پر میرا ہاتھ بار بار اپنی جیب سہلاتا تھا۔ اتنے میں چپراسی کنارے جھڑی پیالیوں میں ہاف سیٹ چائے لئے آ گیا۔

"لو بھئی۔ آج تم بار بار سینہ سہلا رہے ہو۔ ایک کپ چائے پیو۔" میرے ساتھی نے ٹپکتی ٹپکاتی پیالی میری طرف بڑھائی۔ جس پر ایک مکھی بار بار منڈلا رہی تھی۔

"نہیں یار رہنے دو۔" میں نے پیالی دوبارہ اس کی طرف کھسکا دی کیونکہ ایک ابکائی میرے حلق میں آن کے پھنس گئی تھی۔

"کیوں بھئی آج بھابھی سے جھگڑ کر آ رہے ہو؟" میرے اس دوسرے ساتھی نے ایک سسکی لے کر کہا۔

"ارے اس میں جھگڑنے کی ہمت کہاں؟ وہ اسی وجہ سے لڑی ہو گی۔ آدمی کا دم خم گیا اور وہ بیکار۔ باقی تو وہ مہینے کے مہینے آنے والا منی آرڈر ہی ہے نا۔" اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔

"ارے یار۔ آج تو بہت سنجیدہ ہو رہے ہو۔" اتنے میں سیکرٹری صاحب کے کمرے کی گھنٹی آ گئی۔ مجھے فائلوں سمیت بلایا گیا تھا۔ میں وہ ڈھیر اٹھائے اندر چلا گیا اور اس ڈھیر کے ساتھ کاندھوں پر وہ ناقابلِ بیان بوجھ بھی۔

دفتر سے واپسی پر جب میں اپنی گلی کی نکڑ پر پہنچا تو میں نے چپکے سے اپنی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اسے نکالا۔ دیکھا۔ پرکھا اور پھر جیب میں ڈال دیا۔ اگر کہیں سے گری گرائی چیز پائی جائے تو اس کے بارے میں کیا حکم آیا ہے؟ میں نے یاد کرنا چاہا۔ شاید یہ کہ تین بار لوگوں سے پوچھا جائے کہ کیا ان کا کچھ گم ہوا ہے؟ اگر کوئی جواب نہ دے تو پھر؟ اور اگر کوئی آس پاس ہی نہ ہو تو تب؟ پھر میں سب کچھ بھول گیا۔ اس صورت میں بھی تو کچھ حکم آیا ہے۔ میں نے سوچا سکینہ سے پوچھوں گا۔

آج سکینہ نے کریلے گوشت پکایا تھا جو مجھے بے حد مرغوب تھا۔ اس نے نہایت نفاست کے ساتھ سینی میرے سامنے لگا دی۔ میں ہاتھ دھو کے بیٹھ گیا اور سکینہ میرے سامنے آن بیٹھی۔ بچے ابھی سکول سے

نہیں آئے تھے۔ پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہی نجانے کیوں مجھے ایک دم وہ پرانی سکینہ — برسوں پہلے والی سکینہ یاد آ گئی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اپنی اور اس کی جان پر بہت ظلم کیا ہو اور یقیناً میں بہت ہی ظلم کرنے والوں میں سے ہوں۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں آج بھی ویسی ہی تھیں۔ شربتی۔ چمکتی۔ ہاں جسم پہلے سے کمزور ہو چکا تھا اور پھر میں نے نہایت خوفزدہ ہو کر دیکھا کہ وہ ایک اونچی لمبی، زمین سے نکلنے والی جڑی بوٹی ہے کہ اب اس کی ہر یاول کو کوئی چاٹ رہا ہے اور چپکے چپکے زمین کی طرف جھک رہی ہے اور شاید اس کو چاٹنے والی امر بیل میں تھا۔ میں لمبی لمبی باریک کنڈلیاں مار کر لپٹ جانے والی ننگی سانپ ایسی شاخوں والا جال — میں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ آج وہ میری اس حرکت پر یوں چونکی جیسے برسوں بعد میں نے کوئی بھولا بسرا اقدام کیا ہو۔

"سکینہ!"

"کیا بات ہے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ اور میں سخت شرمندہ ہو گیا۔ میں مرد ذات۔ خدا کا شیر — اپنا تمام دم خم کھو کر زمین کی طرف جھک رہا تھا اور میں نے کبھی آج تک اس زمین کی کشش سے ٹکر لینے کی کوشش نہ کی تھی۔

"آج غزالہ کی سسرال والے پھر شادی کا اصرار کر رہے تھے۔ میں نے کہا تھا چند ایک دنوں میں تاریخ کا فیصلہ کر دیں گے۔ ذرا غزالہ کی دادی کو آ لینے دو۔"

"ٹھیک کیا۔ اور یہ — یہ تم نے بہت اچھا پکایا ہے۔ اور تم پر یہ گلابی دوپٹہ بہت اچھا لگتا ہے سکینہ۔" میں نے ٹوٹتے پھوٹتے لفظوں میں کہا۔ اس کے چہرے پر سرخی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔

"مگر تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ میں نے کہا تھا زکام کی دوا لے لینا۔"

میں نے سوچا وہ نجانے کب سے مجھے تھکا ہوا پا رہی ہے۔ شاید اسے میرے کاندھوں پر دھرا یہ زمین کا گولا نظر نہیں آتا۔ وہ گلوب۔ چمکتا، خوبصورت فیروزی سمندروں اور رنگ برنگے خطوں والا، رواں دواں دریاؤں اور لاوا اگلتے پہاڑوں والا گلوب۔ بے شک اس کو نہایت درستی سے بنایا گیا اور پہاڑوں کی میخیں اس میں وزن برابر رکھنے کو گاڑی گئیں اور آسمانوں کو بنا ستونوں کے تانا گیا اور تم بار بار نگہ کرو۔ تمہیں کہیں کوئی نقص نظر نہ آئے گا۔ بالآخر تمہاری آنکھیں تھک کر لوٹ آئیں گی۔ ہاں اسے وہ گلوب میرے کاندھوں پر عین گردن کی ہڈی پر رکھا نظر نہیں آتا۔ سکینہ اے سکینہ۔ کیا تم نہیں دیکھ سکتیں؟

مگر میں خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اس کے پاس پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ میری پیشانی سہلائی۔

"سکینہ — اگر کوئی گری گرائی چیز راہ چلتے مل جائے تو اس کا کیا کرنا چاہیے؟"

"چیز — چیز کیسی؟ یہ تو چیز پر منحصر ہے۔ کوئی سونا چاندی ہو تو۔"

"سونا چاندی؟ نہیں شاید سونا چاندی نہیں۔ معلوم نہیں مجھے تو پہچان بھی نہیں۔"

"کہاں پھدکاؤ ــــ سونا چاندی نہیں تو پھینکو پرے۔ کسی نے فضول جان کر اپنی جان چھڑائی ہوگی۔ ایسی چیزیں اٹھانی ہی نہیں چاہئیں۔" وہ میرے برابر لیٹ گئی۔ دن بھر کی تھکی تھکائی اس کی آنکھیں نیند سے بھاری ہو رہی تھیں۔

"سکینہ۔ تمہیں وہ ماما یاد ہیں جنہیں راستے میں پڑی بہت سی چیزیں ملا کرتی تھیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہوں۔ ہوں ــــ" وہ نیند میں بولی۔

"مگر وہ تو لا کر بچوں کے درمیان زمین پر ڈال دیتے تھے۔ اور وہ سب کی سب کام آ جاتی تھیں۔ ختم ہو جاتی تھیں۔ شاید زمین کا رزق بن جاتی تھیں۔ زمین بھی تو اپنا رزق مانگتی ہے۔"

مگر سکینہ میری بانہہ پر سر رکھ کے سو چکی تھی۔ میری گردن میں شدید درد تھا اور باوجود کوشش کے میں اسے ہلا نہیں سکتا تھا۔ میں اس وقت تک ساکت لیٹا رہا جب تک سکینہ کی نیند پوری نہ ہو گئی اور اس نے مسکرا کر میری جانب کروٹ لی۔

"بچے آ رہے ہوں گے۔" اس نے اٹھ کر اپنی لمبی چوٹی کا جوڑا باندھا۔

اس وقت اچانک مجھے اپنا دوست۔ بہت پرانا دوست حسن یاد آیا۔ جسے میں نے ایک عرصہ سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ جن دنوں میں سکینہ کو حاصل کرنے کے چکر میں تھا اس نے خود ہی مجھ سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ پھر میں گھر کے معاملوں میں ایسا کھویا کہ ایک عرصہ تک اس کا خیال ہی نہ آیا۔ کبھی کوئی ملنے والا بتا دیتا کہ وہ فلاں جگہ ہے۔ پروفیسری کر رہا ہے اور تمہیں اکثر یاد کرتا ہے۔ مجرّد ہے۔ اب مجھے اس کے تجرّد پر سخت حیرانی ہوتی۔ جی چاہتا اس سے پوچھوں تم اس طرح کیونکر زندہ ہو۔ مگر پھر گھر کے چھوٹے چھوٹے چکر مجھے الجھائے رہتے۔

اب میں اٹھ کر چل دیا۔

"اس وقت کہاں جا رہے ہو؟ سکینہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ حسن تھا نا ــــ حسن میرا دوست۔ اس سے ملے ایک عرصہ ہو گیا۔ آج اچانک یاد آ گیا۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟ اسی کالج میں؟"

"ہاں سنا تو یہی ہے ــــ دیکھتے ہیں۔" میں اپنی دائیں جیب ٹٹولتا باہر آن نکلا۔ ابھی تک مجھے اس کے گھر کا پتہ یاد تھا۔ بس ایک آدھ گلی کا چکر پڑا۔ اور اب اس کا دروازہ سرخ نہیں سفید ہو چکا تھا۔ مکان پر بھی سلیٹی سا پینٹ کروا لیا تھا۔ میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر میں سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔

"حسن!" میں اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ ہم سب کے گرد وہ امربیل لپٹ چکی تھی۔ حسن تک اس

سے نہیں بچا تھا۔

"ارے ہاشمی —" وہ مجھ سے لپٹ گیا۔" دیکھ میں نے تجھے کتنی مہلت دی ہے۔ مجھے معلوم تھا ایک روز تو خود ہی میرے پاس آئے گا۔ میں خود آکر تجھے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بھائی تو ٹھہرا گھر بار والا۔"

"ہاں آخر میں ہی آیا۔" اس کے چھوٹے سے صاف ستھرے کمرے میں ہر چیز قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر رکھی تھی۔ سامنے میز پر چمکتے فریموں میں بہت سی تصویریں جڑی تھیں۔ آج سے برسوں پہلے کی۔

"ہاں بھئی۔ یہ کالج کے زمانے کی تصویریں ہیں۔ یاد ہیں؟" اس نے ہنس کر کہا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میں ابھی ابھی اس کے ساتھ ادب اور فلسفے کی بحثوں میں سر کھپا کر دھوپ بھرے کافی ہاؤس اور کھلے سرسبز باغوں اور شاداب سڑکوں پر سے سائیکل چلاتا چلا آرہا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ اچانک ایک بجلی کا کوندا سا لپکا اور مجھے یاد آگیا۔ یہ تو اس نے کہا تھا۔ اس حسن نے —" یار ہاشمی تو اپنے ہر فعل کو ذاتی سمجھتا ہے۔ اس کو ذات کے حوالے سے صحیح غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرے کاندھوں پر تو دنیا کا گلوب رکھا ہے کہ میری گردن کی ہڈی چٹخ رہی ہے۔ کبھی اٹلس کو دیکھا ہے؟"

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ کھچڑی بالوں کے نیچے اس کی تنگ پیشانی میں گہری ذہین آنکھیں اسی طرح چمکتی تھیں۔ مگر وہ بہت ہشاش بشاش تھا۔ شاید اس لئے کہ اس نے اپنے کاندھوں سے وہ زمین کا گولا اٹھا کر میرے کاندھوں پر ڈال دیا تھا۔

"پھر کیا حال ہے یار گھر بار کا۔" وہ تھوڑی دیر میں چائے کی دو پیالیاں نہایت نفاست کے ساتھ چھوٹی سی سینی میں لگائے چلا آیا۔

"ٹھیک ہے یار۔" میں نے اسے بتانا چاہا کہ میری گردن کی ہڈی چٹخ رہی ہے اور قسم ہے مجھے اپنے پیدا کرنے والے کی کہ میں نباتات کے ساتھ مل کر نباتات ہو گیا اور ایک امر بیل میرے گرد لپٹی ہے۔ میرے۔ سب کے۔ سکینہ کے بھی۔

مگر میں خاموش رہا۔

"یار۔ ایک بات ہے۔ یہ دیکھو—" بالآخر میں نے اپنی داہنی جیب میں سے اسے نکالا۔ ہتھیلیوں کے درمیان ذرا ملا اور پھونک مار کر اسے دیا۔

"یہ کیا ہے — سکہ ہے کوئی — کوئی پونڈ یا گنی وغیرہ۔ نہیں یار۔ کہاں سے لیا؟"

"راہ چلتے ملا ہے۔ مٹی دھول ہیں۔ میرے قدموں میں پڑا تھا۔"

"اچھا تو اب تم بھی زمین کو دیکھ کر چلنے لگے۔ ایک وہ تمہارے ماما تھے نا۔ ان کو بھی بہت چیزیں ملتی تھیں۔ مگر وہ اچھا کرتے تھے کہ زمین کا مال زمین ہی پہ لا ڈالتے تھے۔"

"یہ ہی تو میں تم سے پوچھنے آیا ہوں۔ یہ کیا ہے اور اس کا میں کیا کروں۔ اس کے بارے میں کیا حکم آیا ہے؟"

"حکم ــــ تو اب تم بھی احکام کی تلاش میں ہو! میں جانتا تھا کہ کبھی تم کو بھی ان کی تلاش ہوگی۔ لاؤ دکھاؤ یہ ہے کیا۔" اس نے آنکھوں پر چشمہ رکھا۔

"آہاں۔ جو کچھ بھی ہے۔ یار ہاشمی یہ تمہارے کام کی چیز نہیں۔ یہ کھوٹا سکہ ہے۔ سمجھتے ہو؟"

"کھوٹا ــــ؟ وہ کیسے؟" میں حیران رہ گیا۔

"بس بے کار ہے۔ مجھے تو خوب پہچان ہے۔ اور کھوٹے سکے کے بارے میں میرے پیر و مرشد کا ایک فرمان ہے۔"

اس وقت حسن کی آواز میں ایک عجیب ارتعاش آ گیا۔ اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں اس کی اس کیفیت پر سخت متعجب ہوا۔ شاید جس کے وجود میں اسقدر رنم ہو وہ تڑخ کی زد میں نہیں آتا۔

"انہوں نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی کھوٹا سکہ پائے تو اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسں کو ہر ممکن طریق سے ضائع کر دے تاکہ وہ ایک ہاتھ سے چل کر دوسرے کے پاس نہ پہنچے اور اس طرح مخلوقِ خدا میں رواج پا کر رزقِ حلال کو حرام نہ کرے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کو کسی کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔"

"کنوئیں میں؟" میں یک دم چونکتا ہو گیا۔

"ہاں کنوئیں میں۔ آباد یا غیر آباد۔ کچھ بھی۔ مگر کنوئیں میں۔ اور اب یہ تمہارا فرض ہے کہ یہ زمین کا رزق بنے۔"

"اچھا یار۔ عجیب باتیں کرتے ہو۔ معمولی سی بات تھی۔ بچے بھی کھیلتے رہتے تو کیا حرج تھا۔" میں نے کہنا چاہا مگر پھر خاموش رہا۔ اسے لے کر میں نے پھر جیب میں ڈال لیا۔

"اچھا یار چلتے ہیں۔ کبھی آؤ۔"

"ہاں۔ اب سلسلہ چل نکلا ہے تو۔ مگر تم فوراً اس سے نجات حاصل کرو۔" اس نے میری جیب کی طرف اشارہ کیا۔

میں وہاں سے چل دیا۔ کنواں ــــ اب میں کنواں کہاں سے ڈھونڈوں گا۔ میں نے بہت سوچا ایک مدّت سے میں نے کہیں کنواں نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ میں نے تو کبھی بچپن میں بھی ایک آدھ بار ہی کنواں دیکھا ہوگا۔ ہاں مجھے یاد ہے میری دادی پہاڑی والی "کھوئی" پر جایا کرتی تھی۔ وہ ہمارے لئے بڑی پُراسرار جگہ تھی۔ مگر وہ کبھی ہمیں اپنے ساتھ نہ لے جاتی۔ پھر میں نے ایک کنواں تب دیکھا جب شادی کے بعد میں سکینہ کو لے کر دور دراز کی سیر کو نکلا۔ وہاں شمالی سرحد کے قریب ایک سایہ دار محراب کے نیچے ایک

تاریکی کنواں تھا۔ اس جگہ کے چوکیدار نے بتایا کہ یہ شیر شاہ کا بنایا ہوا کنواں ہے۔ اس کے پاس میں نے سکینہ کی ایک تصویر بھی اتاری تھی۔ پھر ہم نے جھانک کر وہ پکا کنواں دیکھا۔ چھوٹی چھوٹی صاف ستھری اینٹوں سے بنا، اتنا گہرا۔ اتنا نیچا کر آخر تک پہنچتے اس کی گولائی تنگ ہوتے ہوتے ایک سیاہ نکتہ میں غائب ہو جاتی تھی اور اس کو دیکھ کر مجھے بالکل یونہی خوف آیا کہ گویا میں نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا ہو۔ سکینہ بھی ایک دم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اور اب مجھے یاد آیا کہ دراصل وہ کنواں اور لفٹ میں سوار ہو کر اس دیو قامت عمارت کا کنواں جو انسان کو تا قیامت ہوا میں ٹھوس اندھیروں میں معلق رکھ سکتا ہے، ایک ہی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک کس نے اور کہاں بنایا دوسرا کس نے اور کہاں بنایا۔ پھر مجھے ہاروت ماروت کا وہ کنواں بھی یاد آیا جس میں وہ آج تک معلق ہیں۔ اور وہ بھی ایک ویران کنواں تھا کہ جس میں سے ایک غلام دوانٹی سوت کے عوض بکا اور نبی بادشاہ بنا۔ مگر آج میرے پاس کوئی کنواں نہیں تھا۔

اب میرے سامنے محض ایک مسئلہ تھا — کنوئیں کی تلاش — میں نے سکینہ سے پوچھا یہاں کہیں قریب ہی کوئی کنواں ہے؟ وہ یہ سن کر ہنس دی۔ کنواں اور آج کل؟ حد کر دی — میں نے اور بہتوں سے پوچھا۔ مجھے کسی کنوئیں کا پتہ بتاؤ۔ اس بجلی کے ڈھکے ڈھکائے ٹیوب ویلوں کے شہر میں کسی اصل کنوئیں کا پتہ بتاؤ۔ مگر کیوں؟ وہ سب پوچھتے رہے اور میں ان کو کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ یہ میں کیسے شہر میں رہتا تھا کہ اس میں کہیں کوئی آباد، غیر آباد کنواں نہ تھا۔ نہ ہی کہیں اس کے مضافات میں۔

آخر میرے بچے میرے اس ایک ہی سوال پر ہراساں ہونے لگے۔ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے۔ وہ طرح طرح کی باتوں سے مجھے بہلانے لگے۔ اور پھر سکینہ مجھے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئی جس نے چند ماہ کی چھٹی تجویز کی اور کام کی زیادتی کا کچھ تذکرہ کیا۔ مگر ان سب سے میں نے کہا کہ دیکھو میرا مسئلہ صرف ایک ہے: میرے پاس ایک زہر ہے۔ ایک افعی ایک کالے کا من ہے کہ رات کے اندھیروں میں شب چراغ کی مانند دمکتا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ زہر ہے اور اس کے بارے میں حکم آیا ہے کہ اس کو زمین کا رزق بنا دیا جائے۔ دیکھو ہم سب کے گرد یہ امر بیل لپٹی جا رہی ہے بل کھاتی — اس سے پیشتر کہ یہ ہماری ساری ہریاول چوس جائے مجھے ایک کنوئیں کا پتہ بتاؤ کہ میں جا کر اسے وہاں پھینک آؤں جس نے میرے سینے، میری ہڈیوں میں ایک تڑخ پیدا کر دی ہے۔ مگر کوئی نہیں سنتا۔ اور ہر وقت ایک پہرے دار میرے ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے کہ کہیں میں کسی گہرائی میں نہ اتر جاؤں، کوئی کنواں نہ دیکھ پاؤں۔ مجھے طرح طرح کی مقوی قلب اور ذہنی سکون کی دوائیں دی جاتی ہیں تاکہ میں اس سینے سے ٹکرانے بوجھ کو بھول جاؤں۔ مگر نہیں۔ یہ ایک پتھر کی سل ہے جو مجھ پر باہر سے، اوپر سے وارد کی گئی ہے۔ مجھے اس سے نجات حاصل کرنا ہے۔ مجھے ایک کنواں چاہیے۔

مگر آج ایک عرصہ کے بعد میں نیند کی بے شمار گولیوں کے باوجود رات کو اچانک بیدار ہو گیا۔ برامرا میری سوچ بالکل آئینہ کی طرح صاف تھی۔ میرے سینے کا بوجھ کوئی اوپر اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ سامنے اندھیرے میں ایک شب چراغ دمکتا تھا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو ایک کنواں تھا۔ گہرا۔ بہت گہرا۔ پاتال تک جا پہنچنے والا۔ پانی سے خالی۔ نیچے بہت نیچے اس کی گولائی ایک نکتہ میں جا کر ڈوب جاتی تھی۔ کنواں! مل گیا۔ میں مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ میں نے اس شب چراغ کو بجھا کر کالے کا من تھا۔ میں نے اسے ہاتھ میں اٹھایا تو وہ وہی سکہ تھا۔ دمدماتا۔ شعاعیں پھینکتا۔ آنکھیں خیرہ کرتا۔ میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آوازیں سنیں۔ اس سے پیشتر کہ وہ لوگ مجھے پکڑتے میں نے اسے اس گہرے گہرے اندھے کنوئیں میں پھینک دیا۔ اور دیکھو اس کے ساتھ ہی وہ امربیل بھی مر گئی۔ وہ دنیا کا گولا میرے کاندھوں پر سے ہٹا لیا گیا۔ اس بوجھ کو اوپر واپس طلب کر لیا گیا۔ اور یہ دیوانے چلا رہے ہیں۔

"نگل لیا۔ نگل لیا۔"

اور اب مجھے معلوم ہے کہ یہ سب لوگ مجھے کن کن طریقوں سے قے دلوائیں گے۔ اچھا ہے۔ انہیں یہی سمجھنے دو۔ حسن جانتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تو اس اندھے کنوئیں میں زمین کا رزق بن گیا۔ زمین نے اس پہ اپنا آپ کھول دیا۔

○○

بھٹی

خالدہ حسین

اس نے وہ اونچا دروازہ کھولا اور باہر کچی سڑک پر نکل آئی۔ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس اس کے دائیں ہاتھ میں جھولتا تھا۔ اس میں راستے کا پورا نقشہ موجود تھا۔ نقشہ جو اب بے کار ہو چکا تھا۔ اس نے طے کیا تھا کہ وہ اس نقشہ پر نگاہ نہ ڈالے گی۔ بس ایک سمت کا احساس صحیح ہونا چاہیئے۔ راستوں کا کیا ہے، وہ خود چلنے والوں کے قدم بنا لیا کرتے ہیں۔ اصل چیز تو سمت ہے۔ چنانچہ اس نے وہ بہت سی سمتوں والا نقشہ اٹیچی کیس میں ڈال دیا تھا۔

اس کچی سڑک کی باریک، نفیس مٹی اس کے پاؤں میں گھستی چلی گئی۔ ایک وہ وقت تھا جب اس کو مٹی سے سخت وحشت ہوتی تھی۔ کبھی مجبوراً بھی ننگا پاؤں فرش پر رکھنا پڑتا تو اسے سخت کوفت ہوتی۔ مگر آج یہ نفیس سوندھی سنہری مٹی پاؤں کی انگلیوں میں سرسراتی اسے بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے اپنے کسی بہت پیارے کا لمس۔

اس نے نظر اٹھا کے سامنے دور دور دیکھا۔ اونچے گھنے درختوں کا حاشیہ آسمان سے جا ملا تھا اور آسمان کا شفاف نیلا گنبد ایک حد سے دوسری تک تنا تھا۔ اس نے آج سے پہلے کبھی اتنا صاف آسمان نہ دیکھا تھا۔ یا شاید اس نے کبھی آج تک یوں نگاہ اٹھا کے سامنے حدِ نظر تک نہ دیکھا تھا۔ ایک نرم سی شادابی آنکھوں کے راستے داخل ہو کر اس کے اندر پھیل رہی تھی، بڑھ رہی تھی۔ اسے اپنے آپ سے بھر رہی تھی۔ جیسے وہ ابھی پرندوں کی طرح بازو پھڑپھڑا کے اس نیلے گنبد کے کنارے کنارے اڑتی پھرے گی۔ آج اسے معلوم ہوا کہ پرندے کس طرح اپنی اڑان سے بھرے ہوتے ہوں گے۔ لبالب بھرے ہوتے ہوں گے اور خود بخود پرواز کرتے ہوں گے بغیر کسی ارادے کے۔ بغیر کسی ارادے اور حوالے کے۔ اور بغیر کسی ارادے اور حوالے کے کچھ کرنا کتنی بڑی آزادی تھی۔ وہ جو خود بخود ہو جاتے اصل ہونا وہی ہے۔

اٹیچی کیس دائیں سے بائیں ہاتھ میں کرتے ہوئے اسے اس صد چہرہ کا خیال آیا جو اس دروازے کے پیچھے رہ گیا تھا۔ جس نے اسکو بتایا تھا کہ ہر احساس حوالے کا اسیر ہے۔ اور حیرت تھی کہ آج ابھی ان چند ہی قدموں میں وہ اس سے کتنی صدیوں کے فاصلے پر نکل آئی تھی۔ اور اب وہ اسے یوں نگاہ اٹھا کے حدِ نظر تک دیکھ سکتی تھی۔ اس کے پورے کے پورے وجود کو۔ شروع سے آخر تک۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ جیسا کہ وہ آج سے پہلے کبھی نہ کر سکی تھی۔

وہ بے چارہ، صد چہرہ!

وہ دل ہی دل میں خوش ہوئی اور بہت سی کچی سڑک پار کر کے اب کھیتوں کھیت ایک پگڈنڈی پر ہو چلی۔ کیونکہ ان

کھیتوں کے پار بجلی کے کھمبوں کی قطار چلی جاتی نظر آتی تھی اور یقیناً یہ راستہ شہر کو جاتا تھا۔ شہر جس میں ریلوے اسٹیشن تھا، بسوں کے اڈے تھے اور ہر سمت کو گاڑیاں سواریاں آتی جاتی تھیں۔

اگر ان سب صد چہرہ مخلوق نے بند کمرے میں بیٹھ کر اس کے ساتھ ہفتوں مغزماری کی تھی کہ اس سڑک سے اس طرف کو اور ادھر سے اِدھر کو اور فلاں مقام سے فلاں تک جانا تو اب اس لیے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ قطعاً کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ ان کا دیا ہوا نقشہ ایک بے جان کاغذ اس نے اٹیچی کیس میں پھینک رکھا تھا۔ اور اسی خیال ہی سے اس کو بڑی طمانیت ہو رہی تھی کہ اب وہاں اس اُدھیڑ دروازے کے پیچھے اس کمرے میں بیٹھے وہ سوچ رہے ہوں گے کہ اب وہ اس سڑک کے فلاں موڑ پر اور وہاں سے بس سٹاپ تک پہنچ چکی ہو گی جبکہ وہ بالکل مخالف سمت میں چلی جا رہی تھی اور ان کی نظروں کے حصار سے باہر تھی۔ جبکہ وہ پورا گروہ اپنی دھیمی، گہری آواز میں سرگوشیاں، گونجتی، پھیلتی، دھوئیں کی طرح آسمان کو لپیٹتی سرگوشیاں کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہے۔ ہم جانتے ہیں تمہیں کیا چاہیئے — تمہیں کیا کرنا چاہیئے — تم نہیں جانتیں نا؟

ان سب کی آنکھوں میں ایک سیاہ ریشمیں جال کی لہلہاہٹ سمندر کی لہروں کی طرح پھیلتی، بڑھتی، امنڈتی اُمڈتی، یلغار کرتی چلی آتی ہے اور تمہیں یقین آجاتا ہے کہ بے معنی شور اور بے ہنر سناٹوں میں کروٹیں بدلتی اس وسیع وسیع بے کراں دُنیا میں صرف یہ ایک سرگوشی سچ ہے۔ لہٰذا تم پوچھنے پر مجبور ہو جاتی ہو۔ تو مجھے بتاؤ۔ وہ کیا ہے۔ بتاؤ؟

اس پر وہ تمام چہرے ایک ہی بدن پر کے ان گنت چہرے اپنی طلسمی بھید بھری مسکراہٹ سے تمہاری طرف دیکھتے ہیں۔" وقت آنے پر — وقت آنے پر۔ ابھی وقت نہیں آیا۔"

ہاں ابھی وقت نہیں آیا۔ وہ دل ہی دل میں ہنس دی۔ اور اب پکی سڑک پر نکل آئی۔ ہاں، ابھی جاننے، جانچنے اور دیکھنے جھیلنے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی تو محض یہ وقت ہے کہ تم ان سب صد ہزار چہرہ مخلوق کی آنکھوں سے دیکھو، ان کی سماعت سے سنو۔ مگر یہ احساس کتنا نیا، کتنا کورا تھا کہ وہ صد چہرہ جھوٹ بھی بولتا ہے۔ ہماری زندگی فریب دینے اور فریب کھانے، شکست دینے اور شکست کھانے کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ ایک حلقہ در حلقہ زنجیر۔ اور اُس نے کہا تھا۔ یہی اس کی رونق اس کی دل بستگی ہے۔ اور میں تم کو خبردار کرتا ہوں — میں کہ ہزار آنکھ رکھتا ہوں — قطعی طور پر خبردار کرتا ہوں کہ اس سلسلے کو توڑ کر کچھ دیکھنے — دیکھ کر جاننے — جان کر سمجھنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا، کیونکہ وقت آنے پر سب کچھ خود ہی تم پر کھل جائے گا۔

چنانچہ وہ وقت آنے کا انتظار کرتی رہی۔ مگر وقت کو آنا کہاں سے تھا۔ وقت تو ہر دم موجود تھا، موجود ہے۔ ہماری مٹھیوں میں سے پانی کی طرح قطرہ قطرہ گر کر ریت میں جذب ہو رہا ہے۔ پھر ہم کس وقت کے انتظار میں رہیں؟ کس لمحے کے منتظر؟ جبکہ ہر لمحہ ازل سے شروع ہو چکا ہے کبھی ختم نہ ہو گا۔ کبھی ختم نہیں ہوا۔ –

اس نے اٹیچی کیس دم بھر کے لیے سڑک کے کنارے رکھا اور پھر اپنے سامنے دُور دور حدِ نظر تک دیکھا، سورج ڈوبنے کو تھا۔ گھنے درختوں کے اونچے نیچے کٹاؤ دار حاشیے کے اوپر اور پر نارنجی روشنی پھیلی تھی۔ اب آسمان کا نیلا

شغاف کا پنچ دُھندلانے کو تھا۔

اس نے دیکھا سامنے ریلوے کراسنگ تھی اور اس پر پھاٹک بند۔ کچھ سائیکل سوار، ایک ٹوٹا پھوٹا تانگہ جس کے پائیدان تک پر زرد رو بچے لدے تھے، ایک مسافر بس، پھاٹک کھلنے کے منتظر کھڑے تھے۔ اب وہ اٹیچی کیس پر بیٹھ گئی۔ اس کے پاؤں سے خون رِس رہا تھا۔ اسے لگا اس نے پہلی بار اپنے جسم میں رواں دواں، اس موت اور زندگی کے مابین حدِ فاصل کھینچنے والے مادے کو دیکھا ہو۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہی اس کی سوچ، اس کی سماعت اور بصارت ہے!

اسکے زخم پر دھول پڑ رہی تھی۔ ٹیٹنیس۔ معلوم نہیں بچپن میں اسکے ٹیٹنیس کا ٹیکہ لگوایا گیا تھا یا نہیں۔ اس نے جان بُوجھ کر سڑک کی مٹی میں اپنے پاؤں رَول لے۔ مٹی کا زہر جب لہو میں داخل ہو جاتے تو دل مرجاتا ہے۔ مگر ایک مٹی وہ ہے کہ خاکِ اکسیر کہلاتی ہے —— اور وہ صرف آنکھ رکھنے والے دیکھ پہچان سکتے ہیں۔

اُس نے دیکھا دُور سے ٹرین کی روشنی نظر آ رہی تھی اور گڑگڑاہٹ ہوتے ہوئے زمین کی رگوں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ کبھی ٹرین دیکھنے کا کتنا چسکا تھا اُس کو۔ ان سب کو —— جب وہاں شہر کے مضافات میں اُن کا گھر تھا۔ صبح سویرے اسکول کے وقت پر ایک ٹرین گذرتی تھی، وہ بستے گلوں میں لٹکاتے باغ کی منڈیر پر جا بیٹھتے اور اس لمبی حلقہ در حلقہ زنجیر سی ٹرین کو رینگتے دیکھتے۔ دیکھتے کہ اس کے اندر مسافر کھچا کھچ بھرے ہیں۔ کچھ ڈبے احساسِ برتری سے سر اُٹھاتے ایک آدھ مسافر لئے ہوتے، باقیوں سے بہت سے مُسافر کھڑکیوں سے باہر جھانکتے ہوتے اور وہ سوچتے کیا انہوں نے دیکھا، ان مُسافروں نے کہ ہم یہاں اس منڈیر پر بیٹھے ان کو دیکھتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم ٹرین میں ہوتے اور وہ ہم کو اس منڈیر پر سے دیکھ رہے ہوتے۔ اور کیا معلوم اس وقت بھی ایسا ہی ہو۔ پس وہ بھُول جاتی کہ دراصل ٹرین میں کون سوار ہے —— وہ یا دُوسرے —— کون کِس کو دیکھ رہا ہے۔ اور حیران رہ جاتی کہ ایک ہی دیکھنا کتنے قسم کا ہو سکتا ہے اور یہ دیکھنا ایسا ہے کہ شروع شروع سے —— ازل سے چلا آ رہا ہے اور آخر آخر تک ہمارے بعد۔ اور اس کے بعد تک رہے گا۔ تو پھر ہم کس لمحے کے منتظر ہیں؟

اب اس ٹرین کا طلسم بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ جیسے ماچس کی خالی ڈبیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ باہم مربوط، حلقہ در حلقہ۔ تیرتا۔ رینگتا۔ سراسر ایک خواب —— جو شروع سے تھا آخر تک رہے گا۔ اسی لئے ہر شے شروع سے تھی آخر تک رہے گی۔ تھکن کے مارے اس کا سر دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔ بے شک یہاں کچھ بھی عبث نہیں۔ کچھ بھی عبث نہیں۔ اور پھر ہم نہیں جانتے کہ وہ کیوں ہے۔ کیا ہے؟

معلوم نہیں اسٹیشن یہاں سے کتنی دُور ہے۔ اور اس راستے پر کوئی اسٹیشن ہے بھی یا نہیں۔ اگر یہ سمت صحیح ہے تو کوئی بات نہیں۔ پھر تو کچھ پرواہ نہیں۔ اب اسے وہ تمام پند و نصائح یاد آئے جو بند کمرے میں اسے برسوں دیئے گئے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے، دِن چڑھتے دِن اُترتے، ہر وقت، ہر لمحے، ہر آن۔ لفظوں سے، آنکھوں سے، سرگوشیوں میں۔ بلند آہنگیوں سے۔ وہ صد چہرہ اسکو ازل سے کہتا چلا آیا تھا۔

"اب تم پھر غلطی نہ کرنا —— اچھا دیکھو یہ نقشہ ہے۔ اس کے مطابق تمہیں چلنا ہے۔ اِدھر پانچ فرلانگ پر

سنگِ میل کے ساتھ ساتھ ایک موڑ ہے۔ وہاں سائیکل مرمت کی ایک دوکان ہے۔ وہاں سے گھوم کر پھر سیدھے تقریباً ایک کلو میٹر کے بعد ــــ بہتر ہے کوئی آتی جاتی بس پکڑ لینا ــ مگر نہیں۔ وہ راستے میں کہاں رُکے گی۔ صرف اپنے بس سٹاپ پر رُکے گی۔ ہاں رُک سکتی ہے اگر کوئی ڈرائیور اُسے آتا دیکھ لے اور بروقت اشارا کر دے مگر تم تو پہلے ہی بالو کیا ہو۔ سُنو، غور سے سُنو، ـــ باقی سب آوازیں فراموش کر دو۔ صرف یہ یاد رکھو کہ تمہیں اسطرح ــــ اس لکیر کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ یہاں سے یہاں تک ـــ "

اس نے وہ لفظ سُنے تھے اور اِس طرح ــــ اس حد تک کہ پھر وہی لفظ تمام فضا میں۔ ہر طرف، ہر سمت رہ گئے۔ اور پھر ہر چیز سیّال بن کر اِن لفظوں کے سانچوں میں ڈھلنے لگی۔

مگر ایک روز اُس نے ایک بھٹی پر دیکھا کہ میلے کچیلے ہاتھوں سے ایک آدمی روئی اور کیک کا سیّال مادہ تیار کرتا ہے۔ اس کو ہاتھوں، اُنگلیوں سے، طرح طرح سے یک جان کر کے خمیر کرتا ہے۔ پھینٹتا ہے، دھنکتا ہے۔ اور پھر اس کو اس سیّال مادہ کو جس کی اپنی کوئی صورت نہیں خود اپنی مرضی سے، رضا سے، جس طرح جی چاہے، چھوٹے بڑے چوکور، تکون، لمبوترے سانچوں میں ڈالتا ہے۔ چنانچہ وہ سیّال جو اپنی کوئی صورت نہ رکھتا تھا، ان سانچوں میں آ کر انہی کی صورت مُنجمد ہونے کو ہے بھٹی میں گِر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پتھر کی صورت، جامد ہونے کو ہے۔

اس سیّال کو منجمد ہوتے دیکھ کر خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں تھرتھرائی۔ اس نے اپنی جانب نظر دوڑائی۔ ایک سیّال مادہ جس کو صد چہرہ جاندار کسی ایک ان دیکھے سانچے میں ڈھالنے کو بے قرار ہیں۔ اور اس سانچے کا نقشہ اس کے ہاتھ میں جھوٹا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ ان سب کو خبر کئے بنا۔ وہ اٹیچی کیس اُٹھائے چلی آئی۔ وہ ان دیکھا سانچہ اُس کے ہاتھوں میں تھا جس میں اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منجمد ہونا تھا، شاید پتھر بننا تھا، معلوم کس ڈھب، کس رنگ کا۔ شاید اسکو بھی وہ صد چہرہ بنانا تھا۔ سرگوشیاں کرتا مسلسل بھنبھناتا، رضامتیں اُگلنے والا صد چہرہ دوسروں کی رُوحوں کو ہپنوٹائیز کرنے والا صد ہاتھوں، آنکھوں والا چہرہ ــــ اور اس سے پیشتر کہ یہ سب کچھ ہوتا، وہ وہاں سے بھاگ نکلی۔ بھاگ نکلی جبکہ وہ سب کے سب وہاں اندر بند کمرے میں بیٹھے رہے۔ سگرٹوں کے دھوئیں میں ایک دوسرے کو ہپنوٹائز اور برین واشنگ کرتے رہے۔ بند کمرہ ان کے لفظوں اور خیالوں کے دھوئیں سے بھرا تھا۔ ان کے سامنے کائنات کا محض ایک ہی مسئلہ تھا۔ انسانوں کا باہمی ایک ہی رشتہ ـ کون کس کا عامل یا معمول بنتا ہے۔ بس یہاں ایک سے دوسرے تک کی پکار محض اسی قدر ــــ میں کون؟ تو عامل ــ اور تو؟ میں معمول ــــ جو پوچھو نگا بتلائے گا ــ بتلاؤں گا۔

کبھی اس طرح اور کبھی اس سے اُلٹ ـ اور کبھی کوئی ہٹ دھرم مرتد معمول جواب ہی نہ دے۔ چُپ سادھ لے۔ وہ حلقہ در حلقہ زنجیر کھٹ سے ٹوٹ گرتی ہے۔

اب آس پاس کے بچے مکانوں میں دیئے جل اُٹھے تھے۔ ذرا فاصلے پہ کچھ گھروں میں بتیاں روشن تھیں۔ پھاٹک کھل چکا تھا اور سب ریلوے لائن پار کر رہے تھے۔ اس نے کشادگی سے سانس لیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی ـــ وہ

اٹیچی کیس اُس نے ریلوے کراسنگ پر رکھ دیا اور آگے بڑھ گئی۔

آسمان پر نرم اندھیرا اُتر رہا تھا۔ ایسا شفاف اندھیرا اِس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا — اور ایسے روشن صاف باتیں کرتے ستارے بھی کبھی نظر نہ آتے تھے۔ شاید آج بہروپ کی پرت جل گئی تھی۔ ہر شے آسمانوں اور زمینوں کے کناروں سے نیچے اُتر آئی تھی۔ اس کے قریب — بالکل قریب۔ آج ہم نے تمہاری آنکھوں کی تاریکی کھول دی۔ اور بے شک تمہاری نگاہ خوب تیز ہے۔ مگر اُسے یکدم یاد آیا — میں تو مائیوپک ہوں۔ میری دید کی شہادت کون دے گا —؟

○○

دُوسرا آدمی

خالدہ حسین

یہ سیٹ بھی مجھے چانس پر ملی تھی۔

۲۳-A میں نے بورڈنگ کارڈ پر نمبر دیکھا۔ سیٹ شیشے سے ہٹ کر تھی۔ بیٹھتے ہوئے میں نے سوچا اگر آج نہ بھی ملتی تو ایسی کوئی بات نہ تھی۔ یوں بھی ذکر میں سفر کرنا اچھا خاصا بیزارکن تھا۔ اس سے تو اچھا ہے انسان کسی بس میں بیٹھ جائے۔ میں نے عادتاً بیٹھتے ہی پیٹی باندھنا شروع کر دی۔ ابھی سب لوگ اندر داخل ہو رہے تھے پیٹی باندھ کر میں نے اپنے ہم سفروں کا جائزہ لیا۔ فلائٹ میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ سب سیٹیں ہولے ہولے بھر رہی تھیں۔ مجھے نہ معلوم کس کی سیٹ ملی ہے۔ ایک دم مجھے خیال آیا۔ یہ میرے ساتھ والی سیٹ بھی ابھی تک خالی تھی۔ کیا معلوم اس پر کون آ بیٹھے گا۔ اور یہ سب کے سب اتنے بہت سے لوگ کون کون سے کونوں سے نکل کر آج یہاں بیٹھے تھے۔ باہم۔ ایک ساتھ۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا۔ انسانوں کی ایک گنتی ایک جگہ باہم تھی جن کا آپس میں کوئی میل کوئی رشتہ نہ تھا۔ گر پھر بھی وہ باہم تھے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اب آہستہ آہستہ سب کے چہرے مانوس نظر آنے لگے تھے۔ جیسے وہ سب کے سب اتفاق سے نہیں بلکہ کسی ارادے سے آئے ہوں۔

میری برابر کی قطار میں ایک عورت گول مٹول سے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی سرخ ربن پہنے اس کے برابر کی سیٹ میں تھی۔ بچہ عورت کی باہوں سے اچھل اچھل کر باہر نکل رہا تھا اور وہ بادلِ ناخواستہ غصے سے اس کو سنبھالے جا رہی تھی۔ چھوٹی لڑکی شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ عورت نے آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والے نیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کے دائیں رخسار پر آنکھ کے قریب ایک بڑا سا سیاہ تل تھا۔

سب لوگ ایئر ہوسٹس سے اپنی اپنی پسند کا اخبار لے رہے تھے۔ اکثر لوگ پیٹیاں باندھ چکے تھے۔ میرے برابر بیٹھی عورت اب اپنی پیٹی کے ساتھ الجھ رہی تھی۔ تب یک دم وہ تیز تیز قدم اٹھاتا دھڑام سے آ کر میرے ساتھ کی سیٹ میں بیٹھ گیا۔

"۲۴-A یہی ہے۔ تھینک گاڈ۔" اس نے ہانپتے ہوئے پیشانی کا پسینہ پونچھا۔

"السلام علیکم خواتین و حضرات... آپ سے درخواست ہے اپنے حفاظتی بند..." میرے برابر والے نے اپنے نیچے آ جانے والی پیٹی کے ساتھ الجھنا شروع کر دیا۔ بہت دیر تک اس کے ہاتھ پیٹی کا سرا ٹٹولنے کی کوشش کرتے رہے

"ادھر۔ یہ دیکھیے" میں نے غیرارادی طور پر چیپی کھینچ کر اس کے آگے کر دی۔ اور تب پہلی بار میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ عجب مانوس صورت تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہاں دیکھا ہے اسے۔ میں نے یاد کرنا چاہا۔ اب ہوائی جہاز کے انجن سٹارٹ ہو چکے تھے۔ میرے برابر والی عورت خاموش ساکت بیٹھی تھی۔ بچہ گود میں بیٹھا ٹافیاں چبا رہا تھا اور اس کی ٹھوڑی شیرے سے لتھڑی تھی۔ سرخ ربنوں والی چھوٹی لڑکی شیشے سے باہر جھانک رہی تھی۔ حدِ نظر تک ——— تمام سیٹوں پر اخبار ہی اخبار کھلے تھے۔ انجنوں کے شور کے باوجود جہاز کے اندر عجب طرح کی خاموشی تھی۔

"السلام علیکم خواتین و حضرات۔ آپ کا کپتان۔ . . آپ سے مخاطب ہے۔ ہم۔ . . ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے انشاء اللہ۔ . . منٹ میں۔ . ."

شور میں ڈوبتی ابھرتی آواز آ رہی تھی۔ میں نے آواز سے کپتان کی شکل و صورت کا اندازہ لگانا چاہا۔ یہ کتنی عجیب بات تھی۔ سب سے زیادہ اہم شخص کو ہم میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ کوئی بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ اور اس کے باوجود اس کے بغیر اس جہاز کا، ہم سب کا کوئی مفہوم نہ بنتا تھا۔

"کتنے منٹ بتائے ہیں؟ آواز صاف نہیں آ رہی" میرے برابر بیٹھے نے کہا۔

"غالباً پچاس منٹ" میں نے پھر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ہاں۔ ناک۔ ہماری مخصوص چپٹی ناک۔ میں دل میں ہنسا۔ اسی لیے اتنی مانوس صورت ہے۔ مگر اس ناک کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ جو بالکل اپنا۔ خود اپنا حصہ لگتا تھا۔

"یہ بھاگ دوڑ بہت پریشان کرتی ہے صاحب۔ اتنی مشکل سے پہنچا ہوں حالانکہ آج نہ بھی جاتا تو ایسی کوئی بات نہ تھی"

"اچھا تو آپ بھی" میں نے دل میں سوچا۔ تو کیا اتنے بہت سے لوگ یونہی غیر ضروری طور پر سفر کر رہے ہیں۔ اگر یہ آج نہ بھی آتے تو کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود یہ سب کے سب آ چکے ہیں۔ ان کے آنے کا واقعہ ہو چکا ہے، ہمیشہ کے لیے۔ معلوم نہیں کہاں کہاں سے۔ سب کے سب ایک جگہ۔ ایک نکتہ پر آن رُکے ہیں۔ اگر میں نہ آتا۔ نہیں ——— اگر وہ آ جاتا جس کی سیٹ پر میں آیا ہوں تو سب کچھ بدل جاتا۔ میں ان بہت سوں کو نہ دیکھتا اور یہ بھی مجھے نہ دیکھتے۔ شاید ہم سب ایک دوسرے کو دیکھنے کی خاطر یہاں جمع ہیں۔ ہمارا باہمی رشتہ محض اسی قدر ہے۔ اور ایک وہ شخص جس کو سب سے زیادہ دکھائی دینا چاہیے۔ وہ غائب ہے۔ صرف اس کی آواز حاضر ہے۔

اب جہاز رن وے پر چل رہا تھا۔

"صاحب یہ نوکر کی خلاشٹ بہت رف ہوتی ہے۔ اور ایسی کوئی مجبوری بھی نہ تھی۔ پھر بھی معلوم نہیں کیوں۔ اچھی بھلی سیٹ کینسل کراتے کراتے رہ گیا۔ خیر" میرے ساتھ والے نے ماتھے کا پسینہ پھر پونچھا۔

"ٹیک آف پر اچھا خاصا حبس سا ہو جاتا ہے۔ یہ ہوا کا رخ ٹھیک کرنا پڑے گا" اس نے ہاتھ بڑھا کر اوپر لگے بٹن کو اِدھر اُدھر گھمانا شروع کیا۔ اس کا بازو دیکھ کر میں ایک دم ٹھٹھک گیا۔ اتنا مانوس بازو۔ میں پھر سوچ میں پڑ گیا۔ سیاہ بالوں بھری کلائی۔ نیچے نیچے جاتی وہ ہلکی نیلی رگیں۔ یہاں تک کہ ناخنوں کی ساخت بھی۔ میں نے کنکھیوں سے

اس کی طرف دیکھا۔ پسینے کے قطرے ابھی تک پیشانی پر چمک رہے تھے۔ سانس کا اتار چڑھاؤ اس کی سیٹ سے ہوتا میری سیٹ میں داخل ہو رہا تھا۔

"شاید ہم پہلے کہیں مل چکے ہیں۔" اب کے اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں غالباً۔" اب ہم دونوں سوچ میں پڑ گئے۔

"اُڑنے لگا ہے۔ اُڑ رہا ہے ناامی۔" برابر کی قطار میں سرخ ربنوں والی چھوٹی لڑکی نے شیشے سے باہر جھانک کر کہا۔

"چپ رہو۔" عورت نے ڈانٹ کر کہا اور بچے کو زور سے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

مَیں نے شیشے میں دُور ہوتی زمین کو جھانکا۔

"ہمارے پائلٹ بہت قابل ہیں۔ اے ون۔"

"جی یقیناً" مَیں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر سرخ ہو رہا تھا۔ حالانکہ جہاز میں خاصی خنکی تھی۔ مَیں نے دیکھا اس نے اپنی بیلٹ خاصی سخت باندھ رکھی تھی۔ سامنے نو سموکنگ کا نشان بجھ گیا۔ میں بیلٹ کھول کر اطمینان سے بیٹھ گیا مگر وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

اب بہت شوخ میک اپ کیے ایئر ہوسٹس کھانے کی طشتریاں لیے گھوم رہی تھی۔ سرخ عنابی رخساروں کے ساتھ اس نے بے حد سیاہ آنکھیں اور گہرے نیلے پپوٹے بنا رکھے تھے۔ اس کے ساتھ جامنی اور ہرے رنگوں کے کپڑے۔ مجھے عجیب اکتاہٹ کا احساس ہونے لگا۔

"باہر چلو۔ باہر چلو۔" عورت کی گود سے بچے نے ہمک ہمک کر باہر نکلنا شروع کر دیا۔

"چپ کرو۔ چپ کرو۔" وہ ہماری طرف دیکھ کر شرمندہ سی ہو گئی۔

"باہر چلو۔" میرے برابر والے نے کہا۔ "باہر عجیب بات ہے کہ ایک بار اندر آ جاؤ تو باہر نہیں جا سکتے۔ جانا بھی چاہیں تو نہیں جا سکتے۔" پسینہ اس کی کنپٹیوں سے قطرہ قطرہ گر کر گردن پر بہہ رہا تھا۔

ائیر ہوسٹس نے ہمارے سامنے کھانے کی طشتریاں رکھ دیں۔ عورت کی گود میں بیٹھے ہوئے بچے نے ہاتھ مار کر سامنے رکھی طشتری اُلٹا دی۔

"اُف وہ۔ بدتمیز۔" عورت نے گھبرا کر پھر ہماری طرف دیکھا۔ مَیں نے فوراً کھانے پر نظریں جھکا دیں اور کھانے کی تیاری کرنے لگا۔ اب جہاز خاصا رَف چل رہا تھا۔ کبھی کبھی یوں گڑگڑاہٹ ہوتی گویا کوئی بس نہایت ٹوٹی پھوٹی سڑک پر بھاگتی چلی جاتی ہو۔ ایئر ہوسٹسز چلنے میں اپنا توازن برقرار رکھنے میں معروف تھیں۔

"یہ تو عام سی، معمولی بات ہے۔ یہ گڑگڑاہٹ — موسم بھی کچھ ایسا ہی ہے۔" میرے ساتھ والے نے شیشے سے باہر بادل بھرے آسمان کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ آج شام بارش کی فورکاسٹ ہے۔" مجھے یاد آیا۔ پھر میں ایک ناخوشگوار مصروفیت سمجھ کر کھانے پر

جھک گیا۔ سب لوگ کھانے میں معروف تھے۔

یک دم میرے برابر کی قطار میں بیٹھی عورت نے خوفزدہ ہو کر چیخ ماری۔ وہ ایک عجیب اذیت ناک چیخ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں مدت سے اس چیخ کے انتظار میں تھا۔ یہ چیخ کہیں ازل سے میرا پیچھا کر رہی تھی اور آج میرے روبرو تھی۔ وہ جسے ہونا تھا اور نہ ہو چکا تھا آج میرے سامنے موجود تھا۔ اور اس کے ہو چکنے کے بعد ایک پتھریلی خاموشی تھی۔

میرے ہاتھ پلیٹ ہی میں منجمد ہو کے رہ گئے۔ اس واردات کو دیکھنے کے لیے میں نے عورت کی طرف آنکھیں اٹھائیں۔ وہ واردات جو خود میرے اندر سے نکل کر باہر آگئی تھی یا شاید وہ ایک ساعت تھی جو منظر میں ڈھل گئی تھی۔ تب میں نے دیکھا۔

میں نے دیکھا کہ عورت کے چہرے پر عجب دہشت برس رہی تھی۔ وہ لرزتی انگلی کے ساتھ ہماری جانب اشارہ کر رہی تھی۔

" وہ۔ وہ۔ وہ۔"

اب کچھ لوگوں نے کھانے پر سے نظریں اٹھا کے، پیچھے مڑ کے ہماری طرف دیکھا۔ میں نے خود بھی اپنی طرف دیکھا مگر میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔

" وہ۔ خدا کے لیے دیکھو۔ وہ۔" عورت کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ اس کا انگلی اٹھاتا ہاتھ تیز ہوا میں پتے کی طرح لرزتا تھا۔ اب ایئر ہوسٹس اور اسٹورڈ ہماری طرف لپکے۔

" وہ" اب عورت نے چلا چلا کر رونا شروع کر دیا۔

ایئر ہوسٹس لپک کے میرے ساتھ والے کے اوپر جھک گئی۔ تب میں نے اس کی طرف گھوم کر دیکھا۔ اس کا سر کرسی کی پشت سے ٹکا تھا اور پسینے میں ڈوبا زرد۔ بالکل زرد چہرہ۔ سامنے بالکل سامنے دیکھتا تھا، جبکہ آنکھیں کھلی بالکل ساکت تھیں۔ اس کا مانوس بالکل مانوس بازو میرے بازو کو چھو رہا تھا۔

" اوہ۔ مائی گاڈ" ایئر ہوسٹس اب ڈاکٹر کے سٹیتھو سکوپ کو گھور رہی تھی جو میرے ساتھ والے کے سینے میں گاڑے چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ سٹیتھو سکوپ ڈاکٹر کے گلے میں جھولتا رہا۔ اور اس نے وہ مانوس۔ بالکل مانوس کلائی۔ ہلکی نیلی رگوں اور کالے بالوں سے ڈھکی کلائی ہاتھ میں لے کر انگلیاں نبض پر رکھیں اور پھر ہاتھ چھوڑ دیا۔

" یہ آپ کے ساتھ تھے۔ کیا آپ ان کے ساتھ تھے؟" ڈاکٹر نے کانوں سے سٹیتھو سکوپ اتار کر مجھ سے کہا اور جواب سنے بغیر ایئر ہوسٹس کو ساتھ لے کر چل دیا۔ جانے سے پہلے اس نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرے اور جیب میں سے بورڈنگ کارڈ نکالا۔

اب عورت خاموش ہو چکی تھی۔ نہیں، بلکہ سب مسافر بھی خاموش ہو چکے تھے سرخ ربنوں والی لڑکی نے بھی اپنی ماں کی گود میں منہ چھپا لیا تھا۔

"خواتین و حضرات۔ آپ کا کپتان آپ سے مخاطب ہے۔ آپ کے دائیں ہاتھ مرغلہ ہلز نظر آ رہی ہیں۔ جن کی چوٹیاں برف سے۔۔۔"

مگر اب سامنے سے دو اسٹورڈ اسٹریچر اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ سب سر گھمائے پیچھے ہماری طرف۔ نہیں۔ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ان سب کو یوں اس طرح میری طرف دیکھنا تھا اسی لیے وہ نہ جانے کہاں کہاں سے چل کر یہاں آن بیٹھے تھے۔

اسٹریچر رکھ کے اسٹورڈ آگے بڑھے۔ ان کے لوہے جیسے ہاتھ میرے بازوؤں میں گڑ گئے۔ پھر انہوں نے مجھے اٹھا کے اسٹریچر پہ ڈالنے کی تیاری کی۔ میری زبان بے جان برف کی ڈلی میرے منہ میں بند تھی۔ میں چلایا۔ مگر۔ مگر۔ میں تو زندہ ہوں۔ مرا تو وہ ہے۔ وہ۔"

"سب یہی کہتے ہیں!" انہوں نے مجھے اٹھا کر اسٹریچر پہ ڈال دیا۔

○○

گاچنی

منظہر الاسلام

میں آج پھر افسانہ لکھنے بیٹھ گیا ہوں جس کا کلائمکس اس نے پھاڑ دیا تھا۔

سارے دن کی چلچلاتی دھوپ کے سائے پچھلے پہر کے بعد لمبے ہو رہے تھے اس لیے گرمی کی شدت میں کمی آ گئی تھی میں اپنے گھر کے چھوٹے سے لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا چڑیاں جو گرمی سے گھبرا کر اپنے گھر کے چھوڑ کر چلی گئی تھیں بیل کے اندر اپنے گھونسلوں میں لوٹ آئی تھیں اور ان کی چہچاہٹ گھنی بیل کے اندر پھدک رہی تھی مرجھاتے پھول آہستہ آہستہ اپنی پتیاں یوں پھیلا رہے تھے جیسے کوئی مریض ہوش آنے کے بعد اپنی مٹھیاں کھول رہا ہو ایسے میں عجیب اتفاق ہوا حیرت کے مارے میری کیفیت پتھر کے مجسمے جیسی ہو گئی ہوا یوں کہ گھونٹ لینے کے بعد چائے کی پیالی میز پر رکھی ہی تھی کہ کسی نے پیالی اٹھالی اور گھونٹ لینے کے بعد پھر میز پر رکھ دی میں نے بےچینی اور گھبراہٹ کے عالم میں ایک اور گھونٹ لیا اور حیرانی سے تنی ہوئی آنکھیں ادھر ادھر گھمائیں لیکن وہاں میرے سوا اور کوئی نہ تھا میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی غرض سے کہ محض میرا وہم ہے میری پیالی سے کسی نے چائے نہیں پی لیکن جب پیالی میں آخری گھونٹ رہ گیا تو کسی نے پھر سے پیالی اٹھالی اور خالی کرنے کے بعد واپس میز پر پڑی خالی پرچ میں رکھ دی تب مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی میری پیالی سے کوئی اور بھی چائے پی رہا تھا۔ میں نے سوچا آخر وہ کون ہے جو میری جھوٹی چائے پی رہا تھا اور مجھے بھی اپنی جھوٹی چائے پینے پر مجبور کر رہا تھا لیکن کوشش کے باوجود میں اس کا سراغ نہ لگا سکا اور پھر یہ معمول بن گیا اور میں جب بھی چائے پینے لگتا تو کوئی دوسرا بھی چائے پینا شروع کر دیتا لیکن یہ عجیب بات تھی کہ میرے ساتھ چائے پینے والا مجھے دکھائی نہ دیتا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا کہ شاید وہ نظر آجائے لیکن میری ساری کوششیں ضائع چلی جاتی تھیں۔ بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھا ابھی کل ہی کی بات ہے جب میں کھانا کھانے بیٹھا اور روٹی کا ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا ہی تھا تو اس نے دوسرا نوالہ توڑ لیا میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا کہ دیکھوں کوئی نوالہ توڑتا ہے کہ نہیں۔ روٹی میرے سامنے پڑی تھی اور اس میں سے دو نوالے ٹوٹے ہوئے تھے کافی دیر کے بعد بھی جب کسی نے نوالہ نہ توڑا تو میں

نے کھانا کھانا شروع کیا وہ بھی شروع ہوگیا اور مجھے محسوس ہوا کہ نوالہ توڑنے کے بعد وہ بھی نوالہ توڑلیتا ہے اور اب میں اس صورت حال سے اس قدر خوفزدہ ہوگیا ہوں کہ کسی کو بتانے سے بھی ڈرتا ہوں۔

عالم یہ ہے کہ جب میں اکیلا کہیں گاڑی میں جارہا ہوتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے ساتھ والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہوا ہے مجھے اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے جب میں سگریٹ سلگاتا ہوں اور اس کا دھواں پھیلنے لگتا ہے تو کوئی دوسری سیٹ کے ساتھ والے دروازے کا شیشہ آہستہ آہستہ نیچے سرکا دیتا۔

کئی دنوں سے میں اس سوچ میں ہوں کہ وہ کون ہے سایہ مجھے کیوں نہیں آتا وہ کوئی عورت ہے یا مرد۔ انسان ہے یا جن۔ اور وہ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے پھر جب اسے دیکھنے کی حسرت میں میرے نتھنے بری طرح کھل گئے اور میں نے اُسے سونگھنے کی کوشش کی کہ شاید میں اس کی خوشبو سے اسے پہچان سکوں لیکن اس کی خوشبو نے میری حیرت میں اور اضافہ کر دیا اس کے جسم سے اردو میڈیم سکول کی دوسری جماعت کے کلاس روم جیسی مہک آرہی تھی جس میں سیاہی گاچنی اور ٹاٹوں کی مہک ملی ہوئی تھی۔ پھر اچانک بچوں کے پہاڑا یاد کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

اک دونی دونی
دو دونی چار

میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ پہاڑا یاد کرنے والے بچوں کی آوازیں شاید اس کے جسم کے اندر سے آرہی تھیں۔ میں نے سامنے پڑی ہوئی پیالی اٹھائی اور چائے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد میز پر رکھ دی۔ میں نے پیالی کی طرف دیکھا تو مجھے ایسے لگا جیسے بہت بڑے راز کا انکشاف ہوگیا ہو اس کی لپ سٹک کا رنگ اس کے ہونٹ پیالی پر ہی چھوڑ گئے تھے پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ نشان مٹا رہی ہے میرا جی چاہا کہ میں تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے نشان نہ مٹانے دوں لیکن ہمت نہ ہوئی اور جب سے مجھے پتہ چلا ہے کہ کوئی لڑکی ہے تو میری حیرت میں اضافہ ہوگیا ہے حالانکہ وہ مجھے نظر نہیں آتی لیکن جونہی وہ آتی ہے میرے اردگرد کسی اردو میڈیم سکول کے دوسری جماعت کے کلاس روم کی مہک پھیل جاتی ہے اور پہاڑا یاد کرنے والے بچوں کی آوازیں میرے کانوں کے گرد گھیرا ڈال لیتی ہیں۔

اک دونی دونی
دو دونی چار

میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ کسی بات کا جواب نہیں دیتی اس دن

میں نے افسانہ لکھ کر رکھا اور اس نے افسانے کا کلائمکس پھاڑ دیا پھر میں نے اپنی ڈائری پر لکھا کہ آج کل ایک لڑکی میرا پیچھا کر رہی ہے وہ میرے ساتھ بیٹھ کر جاتی ہے پلتی ہے مگر مجھے نظر نہیں آتی اس کے جسم سے بچوں کے پہاڑا یاد کرنے کی آوازیں اور دوسری جماعت کے کلاس روم جیسی مہک آتی ہے اس نے میری ڈائری کا وہ ورق بھی پھاڑ کر پھینک دیا میں نے اس طرف منہ کرکے جس طرف مجھے احساس تھا کہ وہ بیٹھی ہے قدرے غصے سے کہا آخر تم چاہتی کیا ہو۔ تم نے میرے افسانے کا کلائمکس اور ڈائری کا ورق کیوں پھاڑا ہے لیکن اس نے کوئی جواب دیا مجھے اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور پھر دوسری جماعت کے کلاس روم کی مہک اور پہاڑا یاد کرنے والے بچوں کی آوازیں دور ہٹنے لگیں۔ میں نے سمجھا وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔

کچھ [illegible] میں گھر سے باہر آیا اور گاڑی سٹارٹ کی تو ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھلا اور اردو میڈیم سکول کے دوسری جماعت کے کلاس روم کی مہک میرے چاروں طرف پھیل گئی اور بچوں کے پہاڑا یاد کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

اک دونی دونی

دو دونی چار

میں سمجھ گیا کہ وہ آ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی ہے میں نے اس سے پوچھا۔ بتاؤ تو سہی تم کون ہو؟ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی مہک اور پہاڑا یاد کرنے والے بچوں کی آوازوں سے لبالب بھری ہوئی تھی اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ٹریفک کا شور ہزارہا میل سے آ رہا ہے۔ اچانک مجھے ایک جگہ بریک لگانی پڑی۔ بریکوں کی چیخ گونجی تو ساتھ والی سیٹ سے ہلکی سی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مارکیٹ سے میں نے کچھ چیزیں خریدیں تو کسی نے سگریٹ کا ایک کارٹن شاپنگ باسکٹ میں رکھ دیا میں سمجھ گیا کہ یہ اسی نے رکھا ہے اور پھر جب میں بل ادا کرنے کے لیے کاؤنٹر پر پہنچا تو منیجر نے بتایا کہ بل محترمہ نے ادا کر دیا ہے۔ میں نے منیجر سے تفصیل اس لیے نہیں پوچھی کہ بات کہیں لمبی نہ ہو جائے۔ جب میں نے گاڑی سٹارٹ کی تو ساتھ والی سیٹ پر اسے محسوس کرکے کہا تم نے بل ادا کرکے اچھا نہیں کیا لیکن اس نے میری اس بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا اور اب تو مجھے اس پراسرار لڑکی پر غصہ آنے لگا ہے اور میں نے اس سے کہہ دیا ہے یا تو کھل کر سامنے آؤ یا میرا پیچھا چھوڑ دو اور اگر تم بولنا نہیں چاہتی تو لکھ کر بتا دو کہ تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو۔ تم نے میرا بل کیوں ادا کیا ہے لیکن جیسے اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ اب بھی وہ میری پیالی سے چائے پیتی ہے میرے ساتھ کھانا کھاتی ہے اور جب آتی ہے تو اس کے جسم سے اردو میڈیم سکول کے دوسری جماعت کے کلاس روم

جیسی مہک اور بچوں کے پہاڑا یاد کرنے کی آوازیں آتی ہیں۔ ۲۸۶

اک دونی دونی

دو دونی چار

کل سے میری حالت عجیب ہو گئی ہے مجھے رات بھر نیند نہیں آتی اور جب میں نیند کی گولی کھانے کے لیے الماری کی طرف بڑھتا ہوں تو وہ نیند کی گولیوں کی شیشی اٹھا لیتی ہے اور پھر مجھے اس کے پرس کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں۔ تم بتاتی کیوں نہیں کہ تم کون ہو۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ لکھ کر ہی بتا دو کہ تم کون ہو۔ اور پھر میں نے اسے دھمکی دے دی کہ اگر تم نے مجھے نہ بتایا کہ تم کون ہو تو میں خودکشی کر لوں گا۔

میری اس بات کا اس پر بے حد اثر ہوا اور اب وہ کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھ کر چھوڑ گئی ہے کاغذ کا یہ پرزہ اب بھی میرے سامنے کھلا پڑا ہے مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ اس پر کیا لکھا ہے میں اس کاغذ پر لکھے لفظوں کے رنگ اور خوشبو کو تو محسوس کرتا ہوں لیکن انھیں پڑھ نہیں سکتا۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہزاروں بچے میرے اردگرد بیٹھے اپنی تختیوں پر گاچنی مل مل کر پہاڑا یاد کر رہے ہیں۔

اک دونی دونی

دو دونی چار

اور چاروں طرف اردو میڈیم سکول کے دوسری جماعت کے کلاس روم کی مہک پھیلی ہوئی ہے پھر مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے گاچنی کا ڈھیلا میرے منہ میں رکھ دیا ہے اور گاچنی میری زبان پر گھلتی جا رہی ہے۔

OO

نیند کے ماتے

مرزا حامد بیگ

بات ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ اُلجھتا چلا گیا۔

ریستوران کے اندر، اس کے سامنے بچھے ہوئے میز پر سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے رکھی تھی۔ باہر تیز دھوپ تھی اور سڑک کا شور — اور ایک طرف کونے میں ویٹر اونگھ رہے تھے۔

وہ نہایت آہستگی کے ساتھ اُٹھا اور سامنے پھیلی ہوئی میز پر گھٹنوں میں سر دے کے بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے، دائیں بائیں اور پیچھے چمک دار سطح پر آسمان جھک آیا۔ اس شفاف نیلے آسمان سے نیچے آتے، اُونگھتے ہوئے ریستوران کے دو نیم روشن فانوس تھے — اور سامنے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے۔

میز پر اس کے دائیں بائیں، دو عمارتوں کی بنیادیں بھری گئیں اور پھر لمحہ لمحہ اُوپر اُٹھتی سیسہ پلائی دیواریں — اور فارمیکا کی چکنی چمکدار سطح، بجری کی کھُردری پٹی میں بدل گئی جس کے بیچوں بیچ وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ وہ بیٹھا رہا، یہاں تک کہ دونوں جانب کی عمارتیں تکمیل پاکر گرتے ہوئے شدید موسموں کے پیچھے دُھندلانے لگیں۔

اب بجری کی تنی ہوئی پٹی میں وہ صرف ایک گانٹھ تھا۔ اور وہ جب چاہتا یہ گانٹھ کھُل سکتی تھی لیکن وہ بیٹھا رہا تھا اور اس کی پیشانی سے نیچے گرتی ہوئی سر کے بالوں کی بٹی ہوئی سُرمئی رسیاں جھول رہی تھیں۔ اس کے پیروں میں پہنے ہوئے بُوٹ گل گئے اور کپڑے پسینے کے ساتھ بہہ گئے۔ ا

اس نے بازو پھیلا کر اوپر جھکی ہوئی، آسمان کی نیلی چادر کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اس کے گلے ہوئے بُوٹوں کی لَو سے انگوٹھوں نے کونوں میں اونگھتے ہوئے ویٹروں کو جھانکا۔ وہ پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں بوٹوں کے تسموں کے ساتھ بندھے تھے، اور اونگھ رہے تھے۔

اس نے بیٹھے بیٹھے آنکھیں کھولیں اور سر کے بالوں سے بٹی ہوئی سُرمئی رسیوں کی اوٹ سے میز کی چکنی چمکدار سطح پر اُگ بھرے سرکنڈوں کے مٹیالے منہ میں جھانکا۔ وہ ان سوتے جاگتے چہروں میں اپنا کھویا ہوا چہرہ تلاش کرتا بہت دُور نکل گیا، اور گرتے ہوئے شدید موسم —

اس نے عورتوں اور مردوں کو بنیادیں کھودتے اور سیسہ ابھارتے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ ان سیسہ ابھارنے والوں میں وہ خود بھی شامل ہے۔ وہ جو یوں ہی بیکار سا کھپریل کی چھت تلے سوتا جاگتا تھا اور وہ ماہتاب چہرہ کھپریل سے چھنتی دھوپ میں اس کے سامنے کھلا رہتا۔

یہی اُس کے جینے کا طریقہ تھا۔

وہ بیکار تھا، دوسروں کے کہنے میں آگیا۔

یہیں سے اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

ہاں تو، وہ بیکار تھا اور دوسروں کے کہنے سُننے میں آگیا۔ آخر کب تک ہاتھ پیر توڑ کر سوتا جاگتا ــ اور وہ یادگار دن تھے جب کام پر بھی ماہتاب سامنے کھلا رہتا۔

وہ دن جب صرف بنیادیں بھری گئی تھیں۔ لیکن جب سے دونوں جانب سیسہ پلائی دیواریں اُٹھی ہیں اور آپس میں اُلجھتی ہوئی راہداریاں ــ تب سے درمیان میں بچھی ہوئی بجری کی پٹی دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرتی گئی ہے۔ تقسیم بھی کچھ ایسی تھی اور کچھ کہنے سُننے والے ــ

دونوں کو علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

سیسہ پلائی دیواروں اور آپس میں اُلجھتی راہداریوں میں ماہتاب کھو گیا۔ گرم لُو چلنے لگی اور درمیان میں گرتے ہوئے موسموں نے جگہ لے لی۔

وہ صاحب سے بات کرے گا۔

اُس نے سوچا اور سارا دن صاحب دوسری طرف کام کی نگرانی کرتا رہا، یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اگلے روز پھر یہی ہُوا اور یہی معمول بن گیا۔

ایسا کیوں ہُوا؟ وہ صاحب سے بات کرے گا۔

اس نے سوچا، لیکن صاحب کا اس طرف چکر ہی نہیں لگتا تھا ــ اور اس کے جینے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا، ماہتاب سامنے کھلا رہے۔

یہ اس طرف رہا اور دوسری طرف اس کے جینے کا طریقہ ــ اور درمیان میں یہ بجری کی سات فرلانگ لمبی پٹی ــ دونوں جانب اُوپر اُٹھتی عمارتوں کے اُوپر تلے متعدد کمرے اور اُلجھی ہوئی راہداریاں جن میں مزدوروں کی قطاریں آپس میں سر جوڑے ہوئے تھیں۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب کام پر نہیں جائے گا۔ تب ایک مدت تک اس کے سامنے کھپریل کی چھت سے چھنتی زرد ماہتاب ٹھہرا رہا اور اس کا سونا جاگنا۔

وہ صبر شکر کر کے بیٹھ رہا تھا لیکن آخر کب تک؟

وہی لوگ جو آپس میں سر جوڑتے تھے، ایک بار پھر ساتھ لے گئے، تقسیم پھر اُسی طرح ہوئی — اور درمیان میں بجری کی نامکمل کھُردری پٹی۔

زمانے بیت گئے

ایک دن موقع پا کر وہ قطار میں چکر کھاتے ہوئے تیر کی طرح نکلا۔ اب وہ دوسری جانب جا رہا تھا۔ وہ بے پروا تھا۔ دوسری جانب، جہاں اُس کے جینے کا طریقہ تھا۔

ہانپتا ہوا دوسرے سرے تک پہنچا، کمروں میں، راہداریوں میں، اوپر تلے ڈھونڈتا پھرا۔ اور پھر ایک بند دروازے سے ٹکرایا۔

اس نے دیکھا کہ دروازوں کی درزوں میں زرد چھلنی ماہتاب اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ اور کمرے میں صاحب، اکھڑی چارپائی پر بے ترتیب، سگار پی رہا ہے۔

وہ دروازے پر کھڑا ہانپتا رہا، اور راہداریوں میں چکر کھاتے ہوئے مزدوروں کے جھلسے ہوئے سر، وہ اپنے ٹھیے کو لوٹ آیا — اور شام کو پھر دوسروں نے کہا سنا۔

وہ ہانپتا ہوا وہاں تک پہنچا، کمروں میں، راہداریوں میں اُوپر تلے اُلجھتا پھرتا۔

— اور صاحب ایک کمرے میں کھڑی چارپائی پر بے ترتیب۔

وہ دروازوں پر ہانپتا رہا، اور شام کو دوسروں کا کہنا سننا معمول بن گیا۔

وہ دوڑتا رہا اور ہانپ کر بیٹھ گیا۔

اس نے موسلا دھار بارشوں کی ترچھی باڑ سے بنی ہوئی تہہ در تہہ موٹی چادریں اوڑھ لیں۔ اب وہ بیٹھا تھا اور اس کی پیشانی سے نیچے گرتی ہوئی سر کے بالوں کی بٹی ہوئی رسیاں جھول رہی تھیں

وہ بیٹھا رہا تھا اور دونوں جانب کی عمارتیں اور بکھرے ہوئے سرکنڈوں کے ٹھیے گرتے ہوئے شدید موسموں کے پیچھے دھندلا گئے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بجری کی پٹی میں ایک گانٹھ ہے اور وہ جب چاہے اُٹھ کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے پیروں پر نگاہ کی پھر اس نے دیکھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں بھی سلامت ہیں۔ فضا میں وصال اور جُدائی کی ملی جُلی مدھم سُر تھی — اور وہ پیٹر کونے میں اونگھ رہے تھے۔

چہار جانب حیرت تھی اور وہ فراق میں نڈھال، دُکھی ہر طرف اُداسیاں بانٹتا پھر رہا تھا۔

اس نے یہ سب دیکھا اور امن، امن پکارتا باہر نکل گیا۔

وہ جہاں سے اُٹھا تھا، میز پر ایش ٹرے اُلٹی ہوئی تھی اور آدھ جلی سگریٹوں کے ٹکڑے مخصوص ترتیب کے ساتھ اوپر تلے چُنے ہوئے تھے۔

کانٹوں پہ اُگے پھول

فریدہ حفیظ

میں نے اسے کئی برس پہلے جتنا دیکھا تھا وہ اب بھی اتنی ہی ہے۔ ہم دونوں تب ملے تھے جب میں بھی اتنا ہی تھا، بس اتنا یاد ہے ایک صحرا نما میدان میں پہلے خیمے تنے تھے شام ہوتی اور سورج ٹیلوں کے پیچھے ڈوبنے کو ہوتا تو سارا اُفق گلابی مائل زردی میں نہا جاتا۔ بالکل ویسی ہی جیسی میں چھابڑی والے کی خوبانیوں میں دیکھا کرتا۔ جب میں شام کے وقت افق کو دیکھتا تو مجھے وہی خوبانیاں یاد آتی تھیں۔ جن کا ذائقہ معلوم نہیں کیسا تھا۔ مجھے تو صرف ان باداموں کا ذائقہ یاد تھا جو چھابڑی والے کے گرد پڑی خوبانی کی گٹھلیوں میں سے توڑ کر نکالتا۔ میں بیٹھا افق پر خوبانیوں کے رنگ ڈھونڈتا مگر جلد ہی اس ٹرک نما گاڑی کی آواز مجھے چونکا دیتی جس کا سب دن بھر بڑی شدت سے انتظار کرتے تھے گاڑی کے آتے ہی لوگ خیموں میں سے نکل آتے بچے بوڑھے جوان سب ادھر ہی لپکتے۔ کوئی برتن لے کر آتا کوئی دامن پھیلاتا۔ میرے پاس برتن نہیں تھا دامن تار تار تھا ایک جراب کہیں پڑی مل گئی تھی۔ میں اسی کا منہ کھول دیتا اور سفید سفید چاول جراب میں گرنے لگتے۔

خیموں کی جگہ لمبی لمبی قطاروں میں چھوٹے چھوٹے گھر بن گئے۔ خیمے گھروں میں اُٹھ آئے ٹرک نے آنا بند کر دیا مگر افق کا رنگ نہیں بدلا۔ اس کا رنگ خوبانیوں جیسا تھا ــــــ اور وہ اتنی ہی تھی۔ بالوں میں ربن باندھے ہوئے گالوں پر شفق رنگ لئے ہوئے ــــــ اور میں اس کی انگلی تھامے یا شاید وہ میرا ہاتھ تھامے گھر گھر پھرتی رہی۔ وہ جانتی تھی مجھے کس کی تلاش تھی۔ انہی چھوٹے چھوٹے گھروں میں کوئی گھر میرا تھا ــــــ مجھے یہی بتایا گیا تھا۔ یونہی گھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلا نہیں ہوں اور وہ اتنی ہی ہے۔ بالوں میں ربن باندھے گالوں میں شفق رنگ لئے میری خواہشوں اور آرزوؤں کی طرح شگفتہ اور تازہ دم، معصوم اور پھر یہ احساس شدت اختیار کرنے لگا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں ہمارے ساتھ کچھ اور دم بھی ہیں وہ میری انگلیاں تھامے میرے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش میں گھسٹتے چلے آ رہے ہیں ــــــ اور میں نے اس کا ہاتھ تھام رکھا ہے اس نے اچانک پلٹ کر دیکھا اور بولی اب ان گھروں میں تمہارا کوئی نہیں۔ یہ گھر تمہارے لئے چھوٹا ہوگا۔ آؤ بڑے گھر والی لائن میں چلتے ہیں۔ میں اس کے

پیچھے پیچھے چل پڑا ـــــ مگر حیران بھی ہوا کہ آخر یہ بڑے گھر کب بن گئے۔

لیکن ـــــ میرے حصے کا چھوٹا گھر کیا ہوا ـــــ تم عجیب سی باتیں کیوں سوچنے لگے ہو۔ وہ دل کا حال بھی جان گئی تھی۔ بولی۔

تم لوگ زیادہ ہو اس لئے تمہیں زیادہ کمروں والا گھر چاہئیے زیادہ لوگ زیادہ جگہ گھیرتے ہیں۔

اور پہلی بار میں نے اسے شک کی نظروں سے دیکھا جب میں خیمے میں تھا تو بڑی مشکل سے پاؤں پسار کر سوتا تھا۔ جگہ ہی اتنی کم تھی۔ تب مجھ پر ایک روز کھلا کہ وہاں بڑے خیمے بھی ہیں جو ایک ایک کے قبضے میں ہیں اور وہ پاؤں پسار کر سوتے بھی ہیں تو ارد گرد گزوں جگہ بچ جاتی ہے۔ اور وہی خوبانی والے سے خوبانیاں لے کر کھاتا ہے اور گٹھلیاں پھینک دیتا ہے جو میں چنتا اور توڑ کر بادام نکالتا۔ لیکن اس کے چہرے پر سچائی کی دمک تھی جس کی روشنی میرے وسوسوں کو دھندلا دیتی تھی ـــــ شاید امید کی روشنی بھی تھی۔ مجھے سچائی اور امید میں فرق نہیں معلوم۔ وہ سچائی بھی تھی اور امید بھی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

چھوٹے گھروں کی لائن بہت دور رہ گئی تھی۔ اب ہم خاردار جھاڑیوں کے قریب پہنچ گئے تھے۔ جو چھوٹے اور بڑے گھروں کے درمیان تھیں اور دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی تھیں اور ابھی جتنا فاصلہ ہم ادھر سے طے کر کے آئے تھے اتنا ہی ادھر کو اور تھا اور کانٹوں کو پار کرنا بے حد دشوار معلوم ہوتا تھا۔ دراصل یہ کانٹے بڑے عجیب تھے ـــــ ان کانٹوں پر کھلے پھول ان سے بھی عجیب تر۔ ان پھولوں کے چہرے سیاہی مائل سرخ تھے مگر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ یہ تو خون تھا جو ان کے گالوں پر سوکھ کر جم گیا تھا۔ اور ان کے چہرے سیاہ پڑ گئے تھے۔ حیرت کی بات ہے، اتنے سفید کانٹوں پر اتنے سیاہ پھول۔ پھول بے شمار تھے، کانٹے اتنے زیادہ نہ تھے۔ مگر بے حد نوکیلے تھے اور پھولوں کو اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ تکلیف کے مارے انکی جلدوں میں سے لہو رستا تھا اور سوکھ سوکھ کر سیاہ ہو جاتا تھا۔ مجھے یہ منظر بہت عجیب و غریب لگا۔ میں گھر کو بھول گیا اور سہم سہم کر ان کانٹوں کے بیچ چلنے لگا۔ میرا جی چاہنے لگا ان پھولوں سے باتیں کروں اور ان سے پوچھوں کہ وہ کس طرح ان کانٹوں میں پھنس گئے لیکن کوئی پھول میری بات کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جب بھی وہ کچھ کہنے کے لئے لب کھولتا اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہو جاتے اور نیا تازہ خون رسنے لگتا۔ اس کی چند پنکھڑیاں اس سے جدا ہو کر ہوا میں بکھر جاتیں۔ جگہ جگہ ایسی پنکھڑیوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بن گئی تھیں اور ان میں نئے پھول کھلنے لگے تھے مگر جیسے ہی یہ پھول خاردار تاروں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے کانٹے انہیں جکڑ لیتے ـــــ اور تب ہی اس نے تالیوں اور معصوم قہقہوں کی آواز سنی۔ وہ میرا ہاتھ چھوڑ 4
کر سیاہی مائل پھولوں کے درمیان خوشی سے ناچتی پھر رہی تھی۔ مجھے اسکے بارے میں پھر شبہ ہونے لگا۔ وہ کون تھی ـــــ شاید وہ تتلی جسے بچپن میں پکڑنے کی خواہش ہمیشہ دل میں رہی اور میں اس کے پیچھے بھاگتا رہا شاید وہ ناآسودہ

خواہشوں کا مرکب تھی۔ چھوٹی بڑی بے شمار خواہشیں ان کی تکمیل کے لئے سرگرداں سا میں پھولوں اور کانٹوں کے اس دیس میں آنکلا تھا۔ کئی بار مایوسیوں نے گھیرا تھا مگر اس نے میرے دل میں امید کی شمعیں روشن کی تھیں۔ شاید وہ امید تھی، جبھی تو اس نے کانٹوں میں جکڑے پھولوں میں جاکر ہنسنا شروع کیا اور جانے کیا کہا کہ وہ پنکھڑی پنکھڑی ہوکر بکھرنے لگے۔ خون رِس رِس کر زمین پر بہنے لگا۔ کانٹوں کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ وہ پھولوں کو چھید چھید کر اپنے انتقام کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر اس نے وہ حیرت ناک منظر دیکھا۔ پھول اپنے آپ کو کانٹوں سے چھڑانے میں کامیاب ہوگئے۔ پھولوں نے اپنا آپ چھڑایا تو وہ قدآدم میں بدل گئے۔ یوں جیسے شہزادی نے پرندے کے سر سے جادو کی سوئی نکال دی ہو۔ ان کی جلدیں آبنوس کی طرح چمک رہی تھیں گھنگھریالے بال اور خوبصورت بڑی بڑی آنکھوں کے گرد گھنیری پلکوں کی جھالروں میں چھپا سرم ——— اس کی نظریں ان کے لہولہان پاؤں کی طرف گئیں۔ کانٹے پھر اب زمین پر پڑے تھے اور ان کی پہنچ قدآدم میں بدلے پھولوں کے پاؤں تک ہی تھی۔ اس نے تالیاں بجانی بند کردیں اور میرے پاس چلی آئی۔ آؤ اب چلیں۔ یہ لوگ خود ہی خاردار تاریں پار کرلیں گے۔ آؤ ہم اپنے گھر کی تلاش کریں۔ وہ زیادہ دور نہیں۔ ہم سیاہ لوگوں کے ہجوم میں سے گزرتا خاردار تاروں کو پھلانگ کر اس سبز خطے پر آگیا جسے گرین بیلٹ کہتے ہیں۔ نرم نرم مخملیں گھاس پر چلتے ہوئے میں نے دور ان بڑے بڑے خوشنما گھروں کی قطاریں دیکھیں جو اونچے درختوں کے درمیان تھیں۔ انہیں دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا اور دل ایک انجانے جذبے سے ناچنے لگتا تھا۔

وہ انگلی تھامے مجھے ان گھروں کی طرف لے چلی۔ اور میرے ساتھ ساتھ وہ سب بھی تھے جن کی وجہ سے مجھے بڑے گھر کی ضرورت تھی۔

پہلی قطار کے پہلے گھر کے سامنے ہم سب رک گئے۔

میں گیٹ کھولنے کے لئے گیٹ پر ہاتھ رکھا تو ایک چیخ کے ساتھ واپس کھینچ لیا۔ میرا ہاتھ لہولہان تھا اور ایک بڑا سا کانٹا اس میں چبھا ہوا تھا۔ گیٹ کے اندر ایک اور کانٹے نے میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھا اور بولا۔

یہاں بھکاریوں کے لئے جگہ نہیں۔ چلے جاؤ یہاں سے۔

میں بھکاری نہیں میں تو اپنے گھر آیا ہوں۔ یہ بڑے گھر ہمارے ہیں نا۔

کانٹا یہ سن کر آگے بڑھا کہ مجھے پھر لہولہان کر دے میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ تم یہاں کیا کرنے آئے ہو۔ تمہارے لئے وہ دور قطاروں میں چھوٹے گھر ہیں تم لوگوں کے لئے وہی گھر بنائے گئے ہیں جاؤ اور اپنا گھر لے لو۔

میں نے مایوسی سے پھر اس شفق رنگ بالوں میں ربن والی اس امید کی کرن کو طنزیہ نظروں سے

دیکھا۔ جس کے پیچھے پیچھے چل چل کر میں نے اپنے پاؤں لہولہان کر لئے تھے، اور نہ چھوٹا گھر ملا تھا اور نہ ہی بڑا۔ میرا جی چاہا اس کا رِبن نوچ لوں۔ شفق کو ناخنوں سے کھرچ دوں تاکہ وہاں کا لیاں پپڑیاں جم جائیں۔ میں اسی نیت سے اس کی طرف بڑھا مگر وہ بولی۔

وہ دیکھو۔ وہ آ رہے ہیں بڑے گھروں کے حقدار، جو بہت زیادہ ہیں اور جن کا حق بہت تھوڑوں نے مار رکھا ہے تم بھی ان کے ساتھ مل جاؤ کہ جب تک پنکھڑیاں اکٹھی نہ ہوں پھول نہیں بنتا۔ اور تم بہت نہ ہارو کہ اتفاق کی اس لڑی کا ایک موتی بن سکو۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ میں اب اس تتلی کی کوئی بات مانوں مگر اس طرف بڑھتے سیاہ ہجوم کی شان نے مجھے مسحور سا کر دیا۔ یہ کیسا نشہ تھا۔ میرے پاؤں جیسے ریت میں گڑ گئے۔ وہ اس ہجوم کے آگے آگے تھی۔ میں اس لمحے کا منتظر تھا کہ وہ آبنوسی ہجوم میرے قریب آئے اور مجھے بھی اپنا ایک حصہ بنا لے۔

○○

مُستاجر خان

عبدُالوحید

اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے اور رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی ہیں۔ اس کا چہرہ چوڑا ہے جس پر چھدری داڑھی بھورے رنگ کی ہے۔ سامنے کے دانتوں کے درمیان خلا ہے۔ جس کے راستے بے بس زخم خوردہ مسکراہٹ سارے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے — اور وہ مستاجر خان ہے جس کا مطلب ہے "سردار"

مَیں دریا کے عین وسط میں ایک پتّھر پر کھڑا ہوں۔ جس کے پار دُھند کی چادر میں لپٹا مستاجر خان ہے۔

کنہار کا پانی زور و شور سے جب کوٹ شوہال کا موڑ کاٹتا ہے تو ایسی دھاریں اُٹھتی ہیں جو سرکش بھی ہیں اور رنتریر بھی۔ مَیں دریا کے بیچ رنگین سنگریزوں کی جگمگاہٹ دیکھ رہا تھا جب وہ میری تلاش میں ادھر آ گیا۔

ہم گذشتہ کئی ماہ سے ہزارہ میں کنہار وادی کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ جہاں جنگلوں کی حفاظت اور معاشی ترقی کے لیے حکومت ایک سروے کروا رہی تھی۔

میرا قیام کوٹ شوہال میں ہے جہاں فارسٹ کوارٹر کا چوکیدار مستاجر خان ہے اور کوٹ شوہال کا نمبردار بھی وہی ہے۔

مجھے معلوم نہیں تھا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ مَیں لاعلم رہوں۔

ہم نے کوٹ شوہال کا سروے شروع کیا تو سوالنامے کے پہلے خانے میں مستاجر خان کا نام تھا۔

پیشہ، چوکیدار فارسٹ رینج کوارٹر

رات کو لالٹین کی روشنی میں وہ دال بنا کر لایا تو مَیں نے یونہی دریافت کیا۔

"فضل الرحمٰن!"

تو تم مستاجر خان ہو! "

کیا مطلب ہے اس کا؟"

"جی اس کا مطلب ہے سردار، ہم اپنے سرداروں کو یہی کہتے ہیں۔"

وہ ہنستا بڑے عجیب طریقے سے ہے۔ شاید آپ پہلی بار اُس ہنسی کو زہر خند سمجھیں یا پھر کھنکار تصور کر لیں گے اور آخر کار وہ جب زہر خند ہو گا، تو بھی آپ کو مسکراتا ہوا دکھائی دے گا۔

بعض لوگ بڑے جفاکار ہوتے ہیں جیسے مستاجر خان ہے۔

ایک روز اُس نے مجھے کہا۔

"صاحب آپ مجھے مستاجر خان کیوں کہتے ہیں۔ میں تو چوکیدار ہوں اور آپ غیر علاقے کے ہیں۔ بھلا آپ کے لیے میں کیسے مستاجر ہو سکتا ہوں؟"

"اِس دنیا میں جو بھی تم سے ملے گا تم اُس کے لیے مستاجر ہو۔ یہی تمہارا نام ہے اور یہی تمہاری پہچان۔"

اُس نے زہر خند بھرا اور میں اُسے ہنسی سمجھا۔

صبح سویرے مستاجر میرے سرہانے کھڑا ہو کر آہستہ سے مجھے اُٹھاتا ہے۔

"صاحب چائے پی لو۔"

میں چائے کے کپ کے ساتھ سگریٹ سلگا لیتا ہوں۔ مستاجر کھڑا رہتا ہے۔ اُس کے سر پر ہمیشہ نیلی پگڑی ہوتی ہے خوب بھاری اور قمیض کے بازو بہت لمبے ہوتے ہیں جو کلائیوں پہ سلوٹوں میں لپٹے ہوتے ہیں۔

"مستاجر خان بیٹھو۔"

"نہیں جی، ناشتہ تیار کروں گا۔"

ناشتے پر میرے سامنے کی چارپائی پر مستاجر ہوتا ہے اور ہم ایک پراٹھا اکٹھے شروع کرتے ہیں۔ مستاجر بہت آہستہ کھاتا ہے۔ میری رفتار خاصی تیز ہے۔ وہ چائے پیتے ہوئے خاموش رہتا ہے۔ وہ شروع شروع میں قطعاً رضامند نہیں تھا کہ میرے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرے لیکن پھر آخر کار مان گیا۔ کیوں؟ خدا جانے۔

دریائے کُنہار کے سامنے ریسٹ ہاؤس کے اور جھولتے پل کے پار کورٹ خوشحال ہے جس کے سب

مکان کچے ہیں۔ رات کو میں جھولتے پل کے پار کورٹ شوہال کو دیکھتا ہوں جو لرزتا رہتا ہے۔ وہاں مستاجر خان کا گھر ہے۔

کچا۔ لیکن صاف ستھرا۔

جب میں اُس کے گھر گیا تو بہت سے لوگ آگئے۔ اُس کے ہاں ریڈیو بھی ہے اور رنگین پلنگ پر چادر اور تکیہ رکھا ہے۔

دو کرسیاں ہیں۔ دیوار پر چند زندہ اور مُردہ سیاسی رہنماؤں کی تصویریں ہیں۔ اُسے ان سے کوئی عقیدت نہیں ہے۔ "بس اگر لگی ہیں تو لگی رہنے دو۔"

لوگ ملنے آئے تو مستاجر نے کہا "یہ میرے صاحب ہیں۔ کوارٹر میں ٹھہرے ہیں۔"

بلاشبہ وہ مستاجر ہے۔ ساری مخلوق اُسے بڑے احترام اور انکسار سے مل رہی تھی۔ وہ میرے قریب بیٹھ کر چلم کے کش لگا رہا تھا۔

"میرا گھر سب سے بڑا ہے اور سب سے زیادہ سجا ہُوا۔ ہمارے لوگ بڑے سُست ہیں محنت نہیں کرتے۔ جُوتے میں کیل بھی لگوانا ہو تو مانسہرہ جاتے ہیں۔"

وہ سیاسی انقلاب اور افغانستان کے پاوندوں کی باتیں کرتا رہا ہے۔

جناب یہ بڑے معصوم اور سادہ لوگ ہیں۔

صاحب بھلا ان کو کیا پتہ۔ سوشلزم کیا ہوتا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں وہ کوئی جادو ہے جو حکومت پڑھ کر پھونک مارتی ہے تو کلمہ بھول جاتا ہے۔

قسم خدا کی۔ محمدؐ کی اُمت میں یہ کافر لوگ کامیاب ہو گئے تو یہ پگڑی آتار کر پل سے نیچے پھینک دوں گا

سچا آدمی جب تک عقل استعمال نہیں کرتا۔ صداقت خود دانش بنی رہتی ہے۔

مستاجر خان کی زندگی کنہار پر لٹکے پل کی طرح ہے جو ہر قدم پر جھول جاتا ہے لیکن وہ مضبوطی سے جما ہُوا ہے۔

صبح وہ پراٹھے پکاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے "تاریخ کی ساری بادشاہتیں وہ پراٹھوں میں بھر کر توے پر سینک دے گا اور پھر مسکرا کے کہے گا۔

"صاحب شروع کرو۔"

اور میں پیازی پراٹھے کا لقمہ کاٹ کر تاریخ کی پوری ایک صدی چبا جاؤں گا۔

ہمارے ساتھ دو لڑکیاں بھی اُس سروے میں شامل ہیں۔

پچھلے ہفتے میں انہیں مستاجر کے گھر لے گیا۔

شگفتہ کو مستاجر کی بیوی بہت پسند آئی۔ وہ کہتی ہے کہ اُس عورت نے مستاجر کی باتیں بہت کم کیں اور اسے خان کہہ کر پکارتی رہی۔" خان صبح صاحب کو ناشتہ کروا کے گاؤں آجاتا ہے اور بڑا معروف رہتا ہے۔"

مجھے اُن لڑکیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ مستاجر اگلے انتخاب میں حصّہ لینے کی تیاری کر رہا ہے۔

صبح ناشتے پر میں نے پوچھ لیا۔

"مستاجر الیکشن لڑ رہے ہو۔"

وہ ہنس پڑا!

وہی ہنسی جس سے میں گڑبڑا جاتا ہوں۔

"جی ہاں لڑنا ہی پڑے گا۔"

"جیت لوگے؟"

"اللہ مالک ہے۔ برادری ساتھ ہو تو یہ بھی مشکل نہیں ہے۔"

"مگر تم تو سرکاری ملازم ہو"!

وہ کھنکارا

"استعفیٰ دینے کے لیے صرف مانسہرہ تک جانا پڑتا ہے۔"

پھر وہ زور و شور سے الیکشن کی تیاری میں لگ گیا۔ صبح و شام گاؤں گاؤں دورے۔ اپنے حامیوں کی کھیپ لے کر پیدل پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر گھر گھر جانا شروع کر دیا۔

مجھے دلچسپی تھی تو صرف اس قدر کہ میں اُس سے کچھ لگاؤ سا محسوس کرنے لگ گیا تھا۔ انجانا!۔ جیسا کہ اکثر کسی سڑک پر چلتے ہوئے اُس کے موڑوں سے ہو جاتا ہے یا جیسا گھر کی کرسیوں سے، میزوں سے ہو جاتا ہے۔

مانسہرہ میں پرسوں اس کے مخالف گروہ کے کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی تو رحیم الدین ہنس پڑا۔ "ارے صاحب جانے دیں۔ چوکیدار کا دماغ چل گیا ہے۔ آرام سے آپ کے پراٹھے تلے۔ کون اُسے ووٹ دے گا۔"

"قوم میں اب بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔"

سیاسی رقابتوں میں ایسے جملے عام سننے میں آیا کرتے ہیں۔ میں نے سنی اَن سنی کر دی بلکہ بھول گیا۔

کل صبح مجھے وہ جگانے نہیں آیا۔ اُس کا بھانجا آیا۔

کہنے لگا۔

"صاحب! خان آج مانسہرہ گیا ہے۔ کل خاندان کا جلسہ ہوا تھا۔ اُسے سب نے کہہ دیا کہ وہ الیکشن

ووٹ دے۔ ہمارے ہاں خان خیلوں میں لوگ بھلا کیسے اُسے ووٹ دے سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے میں برادری کا نمبردار ہوں۔ جناب اب تبدیلی آ چکی ہے۔"

سب لوگ حاکم خان کو متفقہ طور پر کھڑا کر چکے ہیں۔ خان اگر نہ بھی بیٹھا تو بات وہی ہو گی یعنی شکست ۔ "

"تم کس کے ساتھ ہو"

"جناب اُس کی تو بیوی نے بھی صبح کہہ دیا کہ اب تم مستاجر نہیں۔ چوکیدار خان ہو۔ وہ بھی حاکم خان کے ساتھ ہے۔ میرا کیا پوچھتے ہیں۔"

٭ ٭ ٭

میں گذشتہ رات پل بھر کو نہیں سو سکا۔ مستاجر کا انتظار کرتا رہا۔ آدھی شب کو کُمہار کے پل سے اس کے گھر کی تھرتھراتی لو نظر آتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ مستاجر خان چاہے دنیا بھر کے لیے چوکیدار ہو، اُس ایک گھر میں تو وہ بدستور مستاجر خان ہے۔ اگر وہاں زوال آ گیا تو پھر،

میں بقا کے سارے فلسفے پر لعنت بھیج دوں گا۔

اگر غرور اتنا ہی ارزاں ہے تو پھر تُف ہے اس پر۔

میں رات کوارٹر میں نہیں گیا۔

اب پو پھٹ چکی ہے۔ میں جس پتھر پر کھڑا ہوں، وہ مستاجر خان کی طرح بے بس ہے لیکن مضبوطی سے بھاگتے ہوئے کُمہار میں گڑا ہوا ہے۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ میرے چہرے کو نہیں دیکھ رہا۔ میں اُس سے نظریں چُرائے کھڑا ہوں۔

ہمارے درمیان دُھند ہے اور ایک جذبہ ہے جو مشترک ہے۔

وہ اپنی قوتِ گویائی سامنے کچے گھر میں بھول آیا ہے۔

جہاں وہ مستاجر خان تھا۔

دُھند چھٹ رہی تھی۔

وہ شاید بول رہا ہے۔

"صاحب ناشتہ تیار ہے۔ چلو"

"مستاجر میرا سامان باندھ دو۔ میں یہاں سے منتقل ہو رہا ہوں کسی دوسری جگہ۔"

وہ ہنس رہا ہے۔ سامنے کے دانتوں کی دراڑ میں سے جھلکتی تھی دست ہنسی۔

"صاحب! چائے کا پانی اُبل رہا ہوگا۔ کیا آپ بھی بے گھر ہونا چاہتے ہیں چلیے مَیں جیت گیا ہوں، مَیں سامنے ریخ کوارٹر میں آپ کا انتظار کروں گا۔ جہاں مَیں چوکیدار خان ہوں۔"

مَیں نے دریا کے اُس پار صرف ایک زقند بھری ہے۔ سارا فاصلہ ختم ہو گیا ہے۔

وہ مُڑ رہا ہے۔

میرے قدموں تلے سرکش لہروں سے جگمگاتے سنگریزے دست و گریباں ہیں۔

○○

حیّ علی الفلاح

محمد اجمل خان

گڑیا اتنی بڑی بات بھی تو نہیں تھی۔

میرے بھائی کی بچیاں اپنے کھلونے نکال گڑیا گڈے کا بیاہ رچانے بیٹھتیں تو میری بچی دور سے دیکھتی ترستی رہتی۔ ایسے ہی ایک دن اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ میرے پاس آئی اور بولی "ابو کیا میرے لئے گڑیا نہیں لاؤ گے؟" اب بھلا میں کیسے انکار کرتا جب کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ گڑیا بچی کی کمزوری ہے اور بچی میری اپنی کمزوری۔ اگر سوچا جائے تو یہ تو میرے بھائی کا اخلاقی فرض تھا کہ جب وہ اپنے بچوں کے لئے کھلونے لا رہا تھا تو کوئی سستی سی گڑیا میری بچی کے لئے بھی لے آتا۔ حالانکہ وہ جب بھی مجھ سے ملتا یہی کہتا کہ تم میرے بھائی ہو۔ اس بات کی میں نے اس سے ایک دو مرتبہ شکایت بھی کی لیکن اس کا مسلک یہ تھا کہ بچی اگر ضد کرتی ہے تو اسے ڈانٹ کر چپ کرا دو۔ لیکن یہ بات کم از کم میرے لئے ممکن نہ تھی کیونکہ بچپن میں ایک بار جب میں نے بھی اپنے باپ سے کسی چیز کی فرمائش کی تھی تو جواب میں اس نے ایسی قہر بھری نظروں سے مجھے گھورا تھا کہ میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا اور ایسا بکھرا کہ آج تک اپنے آپ کو یکجا نہیں کر پایا۔ میرے باپ کی مجبوریاں اپنی جگہ بجا سہی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس دن مجھے اس سے سخت نفرت ہو گئی تھی کیونکہ اس کی اس ایک بات نے میرے اندر اتنے وسیع خلا پھیلا دیئے کہ تمام عمر بھی بھٹکتا رہوں تو تکمیل نہ پا سکوں۔ میں خود جو اتنے بڑے حادثے کا شکار ہو کر اپاہج ہو چکا ہوں اب بھلا اپنے بھائی کی بات کیسے مان لیتا جب کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ گڑیا بچی کی کمزوری ہے اور بچی میری اپنی کمزوری۔ "نہ رو میرے چاند نہ رو۔ میں آج ہی تجھے اچھی سی گڑیا لا دوں گا۔" بچی کے پھول جیسے چہرے سے آنسوؤں کی لڑیاں پونچھتے ہوئے میں اسے دلاسہ دینے لگا۔ میری بیوی جو دیر سے کھڑی یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھی بولی "وہ جو کچھ کہتے ہیں کیا سب ہی سچ ہے؟" ایسی باتیں میری بیوی کا روز کا معمول تھیں اور میں جب بھی گھر سے باہر جانے لگتا۔ اس کے الفاظ کا پگھلا سیسہ کانوں کے راستے گھس کر میرے کھوکھلے جسم میں سوچوں کے لاتعداد الاؤ بھڑکا دیتا۔ اور آج بھی جب میں نے دہلیز پار کی تو اس کی آواز نے ایک مرتبہ پھر مجھے دہکتے انگاروں کے ڈھیر میں

دھکیل دیا۔ اس کی باتوں سے کبھی کبھار یہ سارے رشتے مجھے مشکوک نظر آنے لگتے لیکن پھر اچانک میرے باپ کا چہرہ میری نظروں کے سامنے ابھر آتا جس نے مرتے وقت ہمیں بلا کر کہا تھا۔

"تم سب آپس میں بھائی ہو۔ لیکن اس رشتے کے تقاضے بڑے کٹھن ہیں" باپ کی آواز میرے کان میں گونجتی تو ان رشتوں پہ میرا یقین اور بھی پختہ ہو جاتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب میں اپنے بھائیوں کی طرف دیکھتا تو میرے اندر ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ نئے سرے سے پھر شروع ہو جاتا۔

مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ گاؤں کے بوڑھے لاٹھیاں ٹیکے اکا دکا مسجد کی طرف جانے لگے تھے۔ میں دوڑ رہا تھا کیونکہ ایک تلخ حقیقت میرے تعاقب میں تھی۔ بچی کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم جاتا اور اس کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو بجلی بن کر مجھے بھسم کر جاتے۔ اذان کی آواز چاروں طرف گونجنے لگی تھی دھندلکوں سے نکلنے والے راستے جب مدھم پڑ جائیں تو انسان سمتوں کا ادراک کھو بیٹھتا ہے۔ میرے سامنے بھی ایک وسیع صحرا تھا جہاں راستوں کے سب نقوش مٹ چکے تھے۔ مؤذن نے اللہ اکبر پکارا تو جیسے کسی نے میرے ہاتھ میں اعتماد کا زینہ تھما دیا ہو۔ میں سب سے بے نیاز ہو کر اس زینے کو تھامے ان گہرائیوں میں اترنے لگا جہاں روشنی دم توڑ دیتی ہے اور تاریکیاں جنم لے لیتی ہیں لیکن ابھی میں نے پہلی ہی سیڑھی پہ قدم رکھا تھا کہ وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح مجھ پر لپکے اور میرے اعضا الگ کر ڈالے۔ میرا اعتماد کانچ کی طرح کرچی کرچی ہو کر دور تک بکھر گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں ان کا سوتیلا بھائی ہوں یا پھر ان کا اور میرا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔

میں اپنا آدھا جسم ان کو دے چکا تو میرے اردگرد سوچ کی ایسی لا متناہی وسعتیں پھیل گئیں جہاں کسی کو پکاریں بھی تو آواز کھو جاتی ہے میں اس اندھیرے میں اپنے آپ سے ٹھوکریں کھاتا جب گھر پہنچا تو میری بچی وحشت زدہ ہو کر اپنی ماں کی گود میں گھس گئی اور پھر جب میں نے رحم طلب نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو اجنبیت کی ان گنت تہوں نے اس کے چہرے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

تم تو کہتے تھے وہ تمہارے بھائی ہیں" بچی کے سہمے جسم کے گرد اپنے بازوؤں کا دائرہ مزید تنگ کرتے ہوئے وہ طنز بھرے لہجے میں بولی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں خاموش رہا کیونکہ اس کی بات کا جواب دینے کے لئے میرے الفاظ اپنا مطلب کھو چکے تھے۔

"امی ابو سے کہو یہاں سے ہٹ جائیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے" میری بچی جو سہم کر اپنی ماں کی گود میں پناہ لے چکی تھی، کانپتے ہوئے بولی۔

شکست و ریخت کا عمل جو سالوں سے میرے وجود کے اندر جاری تھا، بچی کے مطالبے پہ ایک آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا اور میں تیزی سے انتشار کی چکی میں پسنے لگا عشاء کا وقت ہو چکا تھا

حی علی الفلاح۔ حی علی الفلاح" مؤذن زور زور سے پکارا۔ میرے اندر اٹھتے دھماکے اور بھی تیز ہو گئے۔
تب اچانک میرے الفاظ نے اپنا مطلب کہیں سے دوبارہ پا لیا اور مجھے اپنی بیوی کی بات کا جواب مل گیا۔ یہ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ میں پاگلوں کی طرح زور زور سے چیخنے لگا اور اسی طرح چلاتے چلاتے گھر کی دیوار پھلانگ کے باہر نکل آیا

یہ جھوٹ ہے یہ جھوٹ ہے، گاؤں کی گلیوں میں چیختا میں سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ لوگ میری آواز سنتے تو اپنے کواڑ بند کر کے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے۔ میں رات بھر اسی طرح دوڑتا رہا یہاں تک کہ گاؤں بہت پیچھے رہ گیا اور کھیتوں میں سے گزرتی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ساری رات اونچی نیچی اور پتھریلی راہوں پہ ٹھوکریں کھاتے کھاتے میرا جسم لہو لہان ہو چکا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ ایک قدم بھی آگے اٹھا سکوں۔ نڈھال ہو کر میں نے ایک چٹان سے ٹیک لگا لی۔ تب میرے باپ کا چہرہ سوالیہ نشان بن کر ایک بار پھر میری نظروں کے سامنے ابھرا اور میرا احتساب کرنے لگا۔

"تم مجھے کوئی الزام نہیں دے سکتے" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں اس سے مخاطب ہوا "تم نے ہمیں ان رشتوں کی جو پہچان دی تھی میں مانتا ہوں اس کی سچائی میں کوئی کھوٹ نہیں لیکن اس سے پہلے کہ تم مجھ سے کوئی سوال کرو یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے بیٹوں نے وہ تقاضے پورے کئے ہیں جو اس بندھن کی بنیادی اکائی تھے" میرے باپ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور اس کا چہرہ آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو گیا۔ تب اچانک مجھے پہاڑ کی دوسری طرف روشنی دکھائی دی۔ شاید وہاں سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے حیران ہو کر اس روشنی کی طرف دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی پکار رہا ہو۔

"حَیَّ عَلَی الفلاح۔ حَیَّ عَلَی الفلاح"۔ میں جو اندھیرے کا اتنا بڑا عذاب سہہ کر تقریباً مر چکا تھا، اپنے جسم میں نئی روح کی تازگی محسوس کرنے لگا اور پھر اٹھ کر آواز کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔

OO

کمرہ نمبر تیرہ کی لڑکی

نگار سجاد

وہ لڑکی کمرہ نمبر تیرہ میں تھی۔

وہ ایک ماہ قبل اپنے پہلوٹھی کے بچے کی پیدائش کے لیے شہر کے اس بڑے اور سستے ہسپتال میں آئی تھی۔ ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ کی دوسری منزل کی نیم تاریک گیلری میں بنے ہوئے کمروں میں، اس کا کمرہ سب سے آخر میں تھا اس کے بعد لابی تھی جہاں لفٹ اور سیڑھیوں سے آنے جانے والوں کا ہر وقت تانتا بندھا رہتا تھا، حالانکہ یہاں ملاقات کے گھنٹے مقرر تھے۔ لیکن ان کا اطلاق صرف جنرل وارڈ کی حد تک محدود تھا، پرائیویٹ وارڈ والوں کے لیے پرائیویٹ قانون تھا۔

کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی بہت بزدل، کم گو اور الگ تھلگ سی تھی۔ وہ یہاں ایک ماہ سے تھی لیکن ڈاکٹرز، نرسز اور ہسپتال کے دوسرے عملے سے اس کی کوئی دوستی نہیں تھی۔ وہ ان سے صرف کام کی باتیں کر لیا کرتی تھی بلکہ بعض اوقات تو وہ بھی نہیں کرتی تھی۔ سوائے اس کے کہ اپنے نحیف و کمزور بچے کو تک آفٹر کرتی رہے اور یا پھر ہاتھ کا کوئی کام کرتی رہے اور یا پھر کرسی پر بیٹھے بیٹھے، یا بستر پر اوندھے لیٹے لیٹے ہاف ڈور سے، باہر گیلری میں سے گزرنے والوں کے قدموں کو دیکھتی رہے۔ ہاف ڈور کی وجہ سے وہ گزرنے والوں کی شکلیں تو نہیں دیکھ پاتی تھی لیکن پہچاننے لگی تھی کہ کون سے قدم بالآخر کس نمبر کے کمرے کے آگے جا کر رکیں گے۔

سفید شلواروں بھرے بھرے پاؤں ہمیشہ کمرہ نمبر آٹھ کے سامنے جا کر رکتے تھے اور یہ جو نازک نازک سینڈلوں میں کسے، خوبصورت خوبصورت پیر تھے۔ وہ جان گئی تھی کہ یہ ضرور کمرہ نمبر سات کے آگے جا کر رکیں گے، جہاں ایک مریض قیدی داخل تھا۔ اور وہ سانولے نسوانی پاؤں، جنکی انگلیوں میں چاندی کے چھلے ہوتے تھے اور گھیر کے فراک ٹخنوں تک آتی تھی، یہ پاؤں کمرہ نمبر ۱۰ تک جائیں گے۔

وہ منتظر تھی کہ ان گذرتے ہوئے قدموں میں سے کوئی دو مردانہ پاؤں، جنہوں نے سرمئی پتلون پہن رکھی ہو۔ اور سیاہ جوتوں پر مسافتوں کا پتہ دینے والی ہلکی ہلکی گرد ہو۔ اس کے دروازے پر آ کر رکیں۔ ایسا اب تک نہیں ہوا تھا، لیکن اس کی نظریں ہاف ڈور سے اُدھر، زمین پر گڑی رہتی تھیں۔ یہ مشغلہ اس کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔

جب وہ لڑکی ہسپتال آئی تھی تو اس کے ساتھ اس کی ایک موٹی سہیلی تھی جو بچے کی پیدائش کے بعد بھی ہفتے بھر تک اس کو دیکھنے روزانہ آتی تھی، لیکن اس کے بعد وہ بھی اچانک غائب ہو گئی تھی اور اب کمرہ نمبر ۱۳ میں کوئی ملاقاتی نہیں آتا تھا۔ تین ہفتوں سے اس سے ملنے کوئی نہیں آیا تھا۔ پھر بھی وہ تین بجتے ہی، ملاقات کا وقت شروع ہوتے ہی بڑی پھرتی سے دروازہ کھول دیتی تھی اور اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ کر گزرنے والوں کے قدموں میں دو ایسے مردانہ پیروں کی تلاش کرتی تھی جنہوں نے سرمئی پتلون پہن رکھی ہو اور جو اس کے کمرے کے آگے آکر رک جائیں اور پھر اسے مانوس دستک سنائی دے۔ کئی دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ سرمئی پتلون، سیاہ جوتے ان پر پڑی ہلکی ہلکی گرد، یہ سب دیکھ کر وہ مضبوطی سے کرسی کا ہتھا تھام لیتی کہ کہیں وہ اٹھ کر بے تحاشا دروازے کی طرف نہ دوڑ پڑے۔ لیکن اٹھتے ہوئے قدموں کی تیزی بتاتی کہ ان کی منزل، کمرہ نمبر ۱۳ سے کہیں آگے ہے۔ ایسے میں وہ نڈھال ہو کر کرسی کی پشت سے ٹک جاتی۔

کمرہ نمبر ۱۳ کے مقابل کمرہ نمبر ۱۴ تھا۔ جہاں اب دو ہفتوں سے ایک یرقان زدہ بوڑھی عورت داخل تھی۔ جس سے ملنے یوں تو بہت لوگ آتے تھے لیکن اس کی نواسی۔ ثمر دن رات اس کے پاس رہتی تھی۔ ثمر بے حد باتونی اور کھوجی لڑکی تھی، وہ ایک چلتا پھرتا اخبار تھی جس سے کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی کو سارے ہسپتال کی خبریں روز کی روز ملا کرتی تھیں آج کس کمرے میں کیا ہوا؟ کونسا کمرہ خالی ہوا؟ کس کمرے میں کون سے نئے لوگ آئے؟ کس سے ملنے کون آتا ہے اسے کوئی نہ بتائے تب بھی وہ لوگوں کے درمیان باہمی رشتوں کا پتہ فوراً چلا لیتی تھی اور اسے سب کے حالات ایسے معلوم تھے جیسے ان سے اس کا باقاعدہ تعلق ہو۔

کمرہ نمبر ۱۱ میں وہ جو ایک سٹوڈنٹ ایڈمٹ ہے۔" ثمر کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی کو بتاتی "وہ بیمار ویمار بالکل نہیں ہے۔ اس کی گرل فرینڈ کا گھر یہاں سے بہت نزدیک ہے نا۔ اس لیے وہ یہ کمرہ لے کر یہیں پڑ گیا ہے تم ہی بتاؤ ملاقات کا یہ کتنا ترقی یافتہ طریقہ ہے۔ تم نے دیکھی اس کی گرل فرینڈ، اتنی خوبصورت ہے کہ کیا بتاؤں روزانہ آتی ہے۔ صبح ہی صبح۔ کالج تھوڑے ہی جاتی ہے آج تم بھی اس کو دیکھنا۔ اتنا چالاک ہے وہ سٹوڈنٹ ڈاکٹرز سے خوب یارانہ گانٹھ رکھا ہے۔"

ایک ہفتے بعد وہ سٹوڈنٹ چلا گیا تھا۔ لیکن کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی کو اس سے دلچسپی تھی نہ اس کی گرل فرینڈ سے ثمر کو بڑی حیرت تھی کہ یہ کیسی عجیب لڑکی ہے، اس نے تو آنے جانے کے اوقات بھی بتا دیئے تھے پھر بھی کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی نے ایک دن بھی جھانک کر اس لڑکی کو دیکھنے کی کوشش کی۔

لیکن اس کا جوش و خروش کم نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی تفتیش جاری رکھتی تھی کمرہ نمبر ۵ کے سلسلے میں اس کا تجسس انتہا کا تھا لیکن اسے زیادہ پتہ ہی نہیں چلا وہ سخت بے چینی سے کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی سے کہتی کمرہ نمبر ۵ کی عورت سے جو شخص روزانہ ٹھیک ڈھائی بجے ملنے آتا ہے، وہ اس کا شوہر نہیں ہے وہ اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ اس کو دیکھتے ہی عورت سخت خوفزدہ ہو جاتی ہے جب تک وہ بیٹھا رہتا ہے عورت کی جان پر بنی رہتی ہے

مجھے اس بے چاری پر بہت ترس آتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ اسے بلیک میل کر رہا ہے میں نے اس عورت سے دوستی کر لی ہے۔ لیکن وہ تو ایسی گھنی ہے کہ منہ سے کچھ بولتی ہی نہیں۔"

کمرہ نمبر تیرہ کی لڑکی یہ سب کچھ سنا کرتی اور کسی روبوٹ کی طرح اپنے کاموں میں مصروف رہتی کمرہ نمبر ۱۳ میں جب تک کمر رکتی یہاں انسانی آوازیں سنائی دیتیں ورنہ تو اس کمرے پر مرگھٹ کا گمان ہوتا۔ گھنی تو کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی بھی تھی۔ جس سے نمر اب تک کچھ بھی اگلوا نہیں سکی تھی۔ اب مثلاً وہ یہی جاننے کے لیے بیقرار تھی کہ جہاز کی آواز سنتے ہی وہ دوڑ کر کھڑکی تک کیوں جاتی ہے اور آدھے دھڑ سے لٹک کر اس وقت تک جہاز کیوں دیکھتی رہتی ہے جب تک کہ جہاز کی جلتی بجھتی بتیاں نظروں سے اوجھل اور اس کی آواز معدوم نہیں ہو جاتی جب بھی کوئی نیا مریض ایڈمٹ ہوتا۔ نمر کی مصروفیات بڑھ جاتیں۔ ان دنوں کمرہ نمبر ۱۲ میں ہسٹیریا کی ایک مریضہ تھی، راتوں کو اس کی چیخیں سن کر کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی دہل جایا کرتی تھی۔ نمر کو اس کے بارے میں اب تک صرف یہی پتہ چل سکا تھا کہ جہاں اس کے والدین اس کی شادی کر رہے ہیں یہ لڑکی وہاں نہیں چاہتی اور اس سے بچنے کا یہ حربہ ہے۔

"مجھے تو اس کی چیخیں مصنوعی لگتی ہیں" نمر آخر میں تبصرہ ضرور کرتی "ایسے تو میں بھی چیخ سکتی ہوں۔ ہاتھ پاؤں بھی اکڑا سکتی ہوں۔ آنکھیں بھی چڑھا سکتی ہوں۔ بنتا ہے یہ اور اس کی ماں کو دیکھو روتی ہے دھاروں دھار اس کے پاس بیٹھ کر۔"

کمرہ نمبر سات میں جو مریض قیدی تھا، نمر اس کے لیے بڑی بے تاب تھی اسے کہیں سے نہیں پتہ چل رہا تھا کہ چھتیس سینتیس سالہ یہ وجیہہ شخص، جو ہلکے رنگوں کی شلوار قمیص پر عموماً گہرے رنگ کی واسکٹ پہنتا تھا اور اچھا بہت ڈیلینٹ دکھتا تھا، کس جرم میں قید تھا؟ اس کے کمرے کے دروازے کے آگے ہمیشہ ایک موٹا تازہ سپاہی، بغل میں ڈنڈا دبائے بیٹھا رہتا تھا۔ اس قیدی کے سپاہی سے بڑے ہی اچھے تعلقات تھے، نمر اکثر ان کے درمیان "پر امن بقائے باہمی" کے نظارے دیکھتی تو اس کا جوش و خروش بڑھ جاتا لیکن وہ مجرم کے جرم کی نوعیت سے آخر وقت تک آگاہ نہیں ہو سکی۔

اس خاموش نیم تاریک پرائیویٹ وارڈ سے ایک منزل نیچے۔ بائیں جانب گیلری کے اختتام پر گائنی کا جنرل وارڈ تھا۔ اس وسیع وارڈ میں بہت سے بیڈ اور ہر بیڈ کے ساتھ ایک ایک پالنا تھا۔ عموماً جتنے بیڈ بھرے تھے اس کے ساتھ کے پالنے بھی بھرے تھے۔ یہاں ہر عمر جسامت اور شکل کی عورتیں تھیں۔ کچھ عورتیں اپنے پہلے، کچھ تیسرے، چوتھے اور کچھ آٹھویں، نویں بچے کی پیدائش کے لیے آئی تھیں، اسی حساب سے ان عورتوں کے چہرے پر کچا پکا پن بھی تھا۔ عموماً بڑی عمر کی عورتیں کم عمر ماؤں کو اپنے بیش بہا تجربات سے موقع بے موقع آگاہ کرتی رہتیں۔

اسی وارڈ میں بستر نمبر تیرہ پر زیب النساء تھی۔ جس کی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس تیئیس برس رہی ہو گی لیکن ڈبل

ڈول اور جسامت میں اپنی عمر سے کہیں بڑی دکھتی تھی۔ وہ بھی اپنے پہلوٹھی کے بچے کی وجہ سے آئی تھی۔ بچہ بہت خوبصورت اور صحت مند تھا۔ پہلے ہی بچے کی پیدائش پر وہ اچھی خاصی بے ڈھنگی ہو گئی تھی۔ اس کا پیٹ قابلِ اعتراض حد تک بڑھا کا بڑھا رہ گیا تھا۔ گالوں پر چھائیاں سی پڑ گئی تھیں۔ سارا جسم خمیر اٹھے آٹے کی پوری سا ہو گیا تھا۔ بال بھی بہت گرنے لگے تھے وہ روز صبح کنگھی کرتی اور اپنے ساتھ والی عورت کو جو اپنے ساتویں بچے کی پیدائش پر آئی تھی، اپنے گرنے والے بالوں کا گچھا دکھاتی، اس پر وہ عورت بے دردی سے ہنس کر کہتی۔

" پہلے بیٹے کی پیدائش پر تو میرے بال نہیں گرے تھے، دوسرے کی پیدائش پر آدھے رہ گئے تھے اور اب تو۔۔۔۔۔"

وہ ہنس کر اپنی چوہیا کی دم ایسی پتلی لمبی مردہ چوٹی زیب النساء کی آنکھوں کے آگے نچا کر بولتی "بس یہ رہ گئے ہیں۔"

زیب النسا بیچاری کا دل دھک سے رہ جاتا۔ وہ یونہی جسم کے "نانا" بے ہنگم ہو جانے پر شرمندہ تھی اوپر سے یہ اُفتاد وہ جلدی جلدی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر، ساتھ والی عورت کی نظر بچا کر اپنی چوٹی پر تھو تھو کر کے سر سے دوپٹہ اوڑھ لیتی کہ اس کے بال کسی کو نظر نہ آئیں۔

یہ زیب النساء پورے وارڈ میں اپنے شوہر کی وجہ سے مشہور ہو گئی تھی جب سے وہ یہاں ایڈمٹ ہوئی تھی، اس کا شوہر ایک پل کو وہاں سے نہیں ہلا تھا۔ ملاقات کا وقت شروع ہونے سے قبل ہی وہ اندر جانے کے لیے زور آزمائی شروع کر دیتا اور ملاقات کا وقت ختم ہونے کے بعد بھی وہ اس وقت تک نہیں جاتا تھا جب تک کہ کوئی سسٹر یا وارڈ بوائے آکر اس کے سر پہ نہ کھڑے ہو جاتے اور اسے اٹھا کر دم لیتے۔ ایسے میں بھی وہ گھر نہیں جاتا تھا بلکہ لمبا چکر کاٹ کر گیلری میں کھڑکی کے پاس آ جاتا جہاں کمرہ کی سے ملا ہوا زیب النسا کا بیڈ تھا۔ وہ گاہے گاہے سر اٹھا کر بیوی کو دیکھ لیتا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں اور کبھی کبھی کھڑکی کی گرل میں سے بدقت تمام ہاتھ ڈال کر بچے کے پنگھوڑے کو جھولا بھی دے دیتا۔ سارے دن میں وہ صرف ایک وقت کھانے پینے کی چیزیں لانے کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ہسپتال سے باہر جاتا تھا۔ ورنہ وہیں اکڑوں بیٹھا رہتا، خالی، بے مصرف اور رات وہیں گیلری میں پڑ کر سو جاتا۔ آتے جاتے مختلف ڈاکٹرز اور سسٹرز اس کو جھڑکتے۔ وہ سر جھکا کر سن لیا کرتا تھا۔ البتہ سسٹر ناز کو دیکھ کر وہ ہر بار تدرے پریشان ہو جاتا تھا۔ سسٹر تھی بھی تو تنتیہ۔ پہلے پہل تو وہ اسے صرف لڑکتی تھی۔ کہ اگر وہ وہاں سے نہیں ہٹا تو ایڈمنسٹریٹو آفیسر سے شکایت کر دے گی۔ لیکن نہ ہی ناز نے شکایت کی، نہ ہی وہ وہاں سے ہٹا۔ رفتہ رفتہ ناز کو اس سے باقاعدہ چڑ ہو گئی۔ آتے جاتے گالیاں دیتی۔ جان بوجھ کر اس کے مختصر سے سامان کو اور خود اس کو ٹھوکر مارتی ہوئی گزرتی۔ کبھی جان کر اس کا کمبل پاؤں کے ساتھ گھسیٹتی

لے جاتی۔ کوئی بھی مرد، کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، کبھی کسی عورت کے ہاتھوں اتنی ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر زیب النساء کا شوہر خدا جانے کیسا مسکین تھا کہ مسز ناز کی ہر کارستانی پر قدرے پریشان ہو کر اپنے وجود کو اور اندر سمیٹ لیتا اور بس۔ لیکن وہ جگہ جہاں سے اس کی بیوی اور بچے اس کے بہت نزدیک تھے۔ ایک پل کو نہیں چھوڑی۔

اس دن کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی مسز ڈیلیوری روم سے کسی کو فون کر رہی تھی جب مسز ناز لڑنے لیے اندر آئی غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"مر جائے اللہ کرے۔ ایسا بے غیرت مرد میں نے تو نہیں دیکھا۔"

اس نے نام نہیں لیا تھا پھر بھی کمرہ میں موجود سب لوگ سمجھ گئے کہ کس کا ذکر خیر ہو رہا ہے

"تجھے بھی تو ضد ہو گئی ہے" مسز فرزانہ بولی" بھئی اپنی ہی بیوی بچے کی خاطر یہاں پڑا ہے۔ تو پڑا رہنے دو۔"

"کیوں پڑا رہنے دوں، راستہ رکتا ہے۔ میں آج ہی ڈاکٹر شمس سے اس کی شکایت کروں گی۔ اسے اٹھوا کر باہر نہیں پھنکوایا تو میرا بھی نام ناز نہیں۔" ناز نے اتنی زور سے بڑے میز پر پٹخی کہ اس میں پڑی چیزیں جھنجھنا گئیں۔

"کیوں اس قدر جل رہی ہو، تمہیں تو کوئی محبت کرنے والا جوڑا اچھا نہیں لگتا۔ ارے اللہ سے دعا کرو کہ تمہیں بھی کوئی ایسا ہی چاہنے والا۔ جورو کا غلام۔۔"

فرزانہ کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ ناز نے اسے دانت پیستے ہوئے دھکا دیا تھا اور لڑھکتی ہوئی کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی سے ٹکرائی تھی۔ وہ بے چاری اپنی جگہ ہل کر رہ گئی

"نہیں چاہیئے مجھے ایسا بے غیرت شوہر" ناز چیخی

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے" فرزانہ دھمکی آمیز انداز میں بولی" میں ابھی دعا کرتی ہوں کہ تجھے ایسا فلرٹ شوہر ملے جو تیرے سوا دنیا کی ہر لڑکی پر عاشق ہوتا پھرے۔"

"تو بھی مر جائے اللہ کرے" ناز کو ہنسی آ گئی۔ وہ دوسروں کو مرنے کی دعائیں بڑی فراخدلی سے دیا کرتی تھی۔ اچانک اس کی نظر کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی پر پڑی تو اس نے بڑے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"کیوں ابھی تک نہیں آئے تمہارے میاں؟"

کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی جو اس اچانک سوال پر گھبرا گئی تھی کوئی جواب دیئے بغیر کمرے سے نکل گئی اور ناز "چہ...... چہ ...... بے چاری" کہہ کر تبصرہ کرنے لگی۔ فرزانہ اس کے اظہار افسوس پر طنزیہ مسکرائی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر آج کمرہ نمبر تیرہ کی لڑکی کا شوہر باہر سے واپس آ جائے اور اپنی بیوی کی طرف صرف ایک ہی محبت بھری نظر ڈال لے تو اس وقت کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی کی تنہائی اور بے چارگی پر افسوس کرنے والی مسز ناز دونوں

"بے غیرتوں" کی شکایت ضرور ایڈمنسٹریٹر سے کرے گی بے چاری ناز اتنی بدصورت ہرگز نہیں تھی کہ ایک کے بعد دوسری نظر ڈالنے کو جی نہ چاہے مگر ہر وقت جلنے، کڑھنے اور نفرت کرنے کے مشاغل نے اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ انسانی عادتوں اور فطرتوں کا کتنا گہرا اثر ہوتا ہے صورتوں پر۔ فرزانہ سوچتی۔ محبت کرنے والوں کے چہرے کتنے دلآویز ہوتے ہیں اور نفرت کرنے والوں کے کس درجہ کریہہ النظر!

"توبہ توبہ......" ناز بڑبڑا رہی تھی، کیسا لاپرواہ شوہر ہے اس کا، ذرا دیکھو پہلے بچے کی پیدائش پر وعدہ کرنے کے باوجود نہیں آیا۔ کتنی پریشان ہے بیچاری، اللہ ایسا کمینہ شوہر کسی کو نہ دے، ایسی پریشانیوں میں بے چاری کو تنہا چھوڑ رکھا ہے۔ چہ..... چہ ...... بے چاری ...."

کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی کا بچہ سوا ماہ کا ہو چکا تھا لیکن وہ بہت کمزور تھا، اس کی گروتھ بہت حوصلہ شکن تھی اور کبھی کبھی اس کو فٹس پڑنے لگتے تھے ان باتوں کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹرز اس کو چھٹی نہیں دے رہے تھے کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی کو کمرے کے در و دیوار سے وحشت ہونے لگی تھی۔ تنہا پریشانیاں اٹھاتے اٹھاتے، بچے کو غیر یقینی زندگی کے دکھ میں دیکھتے دیکھتے اور منتظر آنکھوں سے دروازے کو تکتے تکتے وہ شل ہو چکی تھی۔

گزشتہ دنوں کمرہ نمبر ۱۴ کی وہ یرقان زدہ بڑھیا بھی تندرست ہو کر جا چکی تھی اور یوں ثمر کی رفاقت ختم ہو گئی تھی۔ جاتے جاتے ثمر اس کو اپنا فون نمبر دے گئی تھی کہ کبھی بھی ضرورت ہو تو فون کر دے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی اتنی الگ تھلگ اور خاموش سی ہے کہ اتنا عرصہ یہاں رہنے کے باوجود یہاں کی نرسوں سے اتنی بھی دوستی نہیں تھی کہ ضرورت کے وقت کوئی اس کے کام آسکتا۔

کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی کبھی کبھی بہت بے بسی محسوس کرتی جب وہ دوائیوں کے لیے یا اپنی ضرورت کی کسی چیز کے لیے مارکیٹ تک جانا چاہتی، اور نہ جا سکتی۔ نہ وہ ڈاکٹرز کی ہدایت کے خلاف بچے کو ساتھ لے جا سکتی تھی نہ تنہا اس کو کمرے میں بند کر کے جا سکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ان مجبوریوں اور پریشانیوں کے پاٹ میں پس کر کسی اعصابی مریضہ کی طرح خود بخود بڑبڑانے لگتی۔ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتی۔ اس کا جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لے اور ساری دنیا اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ ساری دنیا۔

اس رات اس کے بچے کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے ننھے اور کمزور بچے کے ہونٹ نیلے پڑنے لگے ہیں اور فٹس کی وجہ سے بچے کے جسم کو جھٹکے لگ رہے ہیں اور اس کی ڈرتی آنکھوں سے سب... پلٹنے لگی ہے تو کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی کا دل جیسے کسی نے کچل دیا ہو۔ کبھی وہ دوڑ کر دروازے تک جاتی اور پھر بھاگ کر بچے کے پاس واپس آجاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ڈوبتے بچے کے پاس رکے یا بچے جا کر ڈاکٹر کو بلا لائے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو جائے تاکہ یہ دونوں کام ہو جائیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور وہ بڑی بے بسی سے اپنے بچے کو ایک نظر دیکھ کر نیچے بھاگی۔ رات کے تین بجے، وہ دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی جب ڈاکٹرز ڈیوٹی روم میں جانے کے لیے گیلری سے بھاگتی ہوئی گزری تو اس کا

پاؤں کسی چیز سے رپٹ گیا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ زیب النساء کا شوہر جو گنٹھڑی بنا پڑا سو رہا تھا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مسز ناز کی جگہ کوئی اور لڑکی کو دیکھ کر اس نے گہرا سانس لیا اور معاف کرنا بہن جی" کہہ کر اپنا پھیلا ہوا کمبل اور وجود سمیٹنے لگا۔ اور جب کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی ڈاکٹر نادرہ کے ساتھ واپس اوپر جا رہی تھی تو وہ دوبارہ جلیبی بنا سو رہا تھا کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر اس کی نظریں آسمانوں کی طرف اٹھ گئیں۔ جہاں کچھ نہیں تھا، نہ کوئی جہاز تھا نہ جہاز کی جلتی بجھتی بتیاں، اس نے حسرت سے اندر سوئی ہوئی زیب النساء کو دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنے آپ کو سمیٹ لیا!

دوسرے دن اس کے بچے کی حالت قدرے بہتر تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔ اسی پریشانی کے عالم میں کبھی وہ کھڑکی تک جاتی۔ کبھی دروازے تک۔ کبھی کمرے میں ادھر سے اُدھر بے مقصد چکر لگاتی شاید اسے کسی ضرورت سے باہر جانا تھا لیکن وہ بچے کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے پرس میں سے ڈائری نکالی۔ ثمر کا فون نمبر اپنی ہتھیلی پر لکھا سوتے ہوئے بچے پر ایک نظر ڈال کر، دروازہ باہر سے لاک کر کے نیچے مسز ز ڈیلوٹی روم میں گئی۔ اس کو دیکھتے ہی مسز ناز نے اسے اطلاع دی کہ "وہ جو زیب النساء کا بے غیرت شوہر تھا نا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج اپنی بیوی کو لے کر جا رہا ہے مت ماری گئی تھی کم بخت کی۔ ارے ساری ہی عورتوں نے ایک سا دکھ اٹھایا تھا۔ کون سا اس کی بیوی نے اکیلی یہ تیر مارا تھا مگر وہ تھا ایسا بے غیرت کہ بڑے جوتے اور گالیاں کھاتا تھا۔ آنے جانے والوں کے پیروں میں رلتا تھا مگر ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا!"

کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی کو مسز ناز کی باتوں میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اضطراری طور پر بار بار نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ لیکن دوسری طرف سے کوئی بھی فون ریسیو نہیں کر رہا تھا بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ابھی تک نہیں آئے تمہارے میاں؟" مسز ناز قدرے رازداری سے اس سے پوچھ رہی تھی وہ کچھ جواب دیئے بغیر مردہ قدموں سے اوپر جانے لگی۔

کمرہ نمبر ۱۳ کا لاک کھولنے کے لیے ابھی اس نے چابی سنبھالی ہی تھی کہ اندر سے اسے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی اور اس کا ہاتھ بہک گیا اور پھر جوں جوں اندر سے بچے کی آواز بلند ہوتی گئی۔ ویسے ہی ویسے اس کے ہاتھ کسی اعصابی مریضہ کی طرح کانپنے لگے۔ اس سے تالا نہیں کھل رہا تھا۔ اندر سے بچے کے رونے کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک وہ کسی ہسٹریائی مریضہ کی طرح چیخی اور چیختی چلی گئی۔ گیلری میں سے گزرتے ہوئے کسی شخص نے اس کے ہاتھ سے چابی لے کر تالا کھولا۔ اور جب اس نے اندر جا کر اپنے بچے کو اٹھایا تو بچے کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔

کچھ دیر وہ بچے کو لے کر ٹہلاتی رہی۔ اس کو سلانے کے بعد جب وہ کھڑکی بند کرنے آئی تو اس کی نظر نیچے گئی۔ زیب النساء بڑا سا سفید برقعہ اوڑھے گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی گود میں اس کا صحت مند بچہ تھا اس کے ساتھ اس کا شوہر تھا جس نے بائیں ہاتھ میں کچھ سامان اٹھا رکھا تھا اور دائیں ہاتھ سے بار بار

زیب النساء کو سہارا دیتا تھا۔ حالانکہ اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں تھی، وہ بڑی مضبوطی سے جمے ہوئے قدم رکھ رہی تھی اور اس کا چہرہ دمک رہا تھا

اور پھر جہاز کی آواز سن کر کمرہ نمبر ۱۳ کی لڑکی کی نظریں بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئیں، جہاں ایک جہاز، بادلوں کو چیرتا ہوا نکلا چلا آرہا تھا وہ اس وقت تک آدھے دھڑ سے نکلی اس جہاز کو دیکھتی رہی جب تک اس کی آواز معدوم اور اس کی جلتی بجھتی روشنیاں نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئیں جب وہ پلٹی تو اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور اس کا بدن کسی اعصابی مریضہ کی طرح کانپ رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی جنونی کیفیت میں اپنا سر کمرہ نمبر ۱۳ کی بدرنگ دیواروں سے ٹکرانے لگے گی اور اس پر چلانے کا دورہ پڑ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ چند لمحے وہ بیچ کمرے میں تنہا کھڑی کانپتی رہی جیسے اسے سردی لگ رہی ہو۔ پھر اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اور بستر پر اوندھے منہ گر کر ہاف ڈور سے پرے، گیلری کی زمین تکنے لگی!

○○

کھنڈر

طاہر نقوی

اِدھر اُدھر سے میری طرف رینگتے ہوئے لمحوں کے سرسراتے کیڑے میری آنکھوں میں گھس گئے اور میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں نے ٹٹولتے ہوئے سوئچ پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا وہ آن تھا۔ بلب بھی روشن تھا یہ اندھیرا میرے اردگرد خود میرے تانے ہوئے حصار کو توڑ کر میری آنکھوں کے راستے میرے دل میں اتر گیا، پھر یہی دھواں غیر محسوس طریقے پر میرے دل سے دستک کی آواز بن کر ابھرنا شروع ہو گیا یہ دستک میرے وجود کے کونے کونے سے ہوتی ہوئی میرے ذہن میں آ کر ٹھہر گئی۔ میں نے ذہن کو ادھر سے ہٹانے کی کوشش میں جھنجھلا کر سر کو جھٹکا دیا تو یہ دستک میرے ذہن کی سطح سے گیند کی مانند اچھل کر دروازے پر جا گری۔ میں اخبار پھینک کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک ان دیکھا مفہوم میرے اوپر، ہر چیز پر، اس کمرے میں تن گیا۔ دروازے پر دستک کی آواز رفتہ رفتہ بلند ہوتی رہی۔ ایسے لمحوں میں کسی ذہن میں بیٹھے بے چین پرندے کی پرواز نہیں ٹھہرتی۔ لمحے مسلح تھے اور میں تنہا و تنہا دنیا کی بھیڑ میں گم دوسروں کی نفرتوں کے انگارے اپنی جھولی میں بھر رہا تھا۔ جن کی تپش اب میرے اعصاب سے ہوتی ہوئی جسم میں سرایت کر رہی تھی اور بھاپ سارے کمرے میں پھیلنے لگی۔ دستک کی یہ آواز میرے بدن میں تھکن کی طرح اترتی جا رہی تھی خیالات کے پرندے ذہن سے اڑ کر گزرے لمحوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کونے کھنڈروں میں پڑی خاک میں اٹی یادیں آنے لگیں۔ میں نے آنکھوں کے غار بند کر کے ذہن کا دریچہ کھول دیا۔ مختلف کردار سرگوشیوں کی ٹکڑیاں بن کر میرے ذہن کے جالے سے ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔ اپنے عمل کو یادوں میں سمونے کا مجرم میں خود ہی ہوں ضمیر بھی بجھے ہوئے ٹوٹے بھر سنگ پڑے سے میں نے اپنے آپ کو اپنے وجود میں محصور کر لیا اور اپنے وجود کے گہرے اندھیرے غار سے ہانپتا گزرتا اپنے بے کفن ضمیر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

یہ دستک انور کی سی تھی اس کے ساتھ ہی مجھے شاہدہ کے خیال نے آ گھیرا شاہدہ کو میں نے ورغلا کر انور سے بدظن کر دیا تھا اس کے بعد انور مجھے کہیں نہیں ملا تھا۔ شاہدہ مجھ پر اعتماد کرنے لگی

اور میں اس کی دولت لٹاتا رہا۔ جب وہ اس سے اپنا ہاتھ کھینچنے لگی تو میں نے اسے اس طرح چھوڑ دیا
جیسے اس سے کبھی واقفیت ہی نہ تھی وہ روتی رہی مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس وقت دستک یہ دونوں ہی
دینے لگے تھے۔ گھڑی کی آواز ذہن سے ٹکرانے کے بعد اچھل اچھل کر چاروں طرف فضا میں بہنے لگی اور
اسی ٹک ٹک سے سیما کا چہرہ ابھر کر نمودار ہونے لگا۔ اس کی بے قرار طبیعت اسی طرح کی بے ترتیب
اور تیز دستک دیا کرتی تھی۔ سیما ایک ماڈرن اور اونچے گھرانے کی لڑکی تھی اس کے چہرے اور جسم پہ
ہمیشہ ایک جنسی کشش ناچتی رہتی تھی جس کی وجہ سے میں بے خودی میں اس کی طرف کھنچا چلا گیا اس
کو راغب کرنے کے لئے میں نے ہر جا، بے جا طریقہ اختیار کیا۔ اچانک میرے وجود میں تیز ہوا چلی اور
میرے اندر سے انسانیت کو لے اڑی اس کے بعد ادھر ادھر اڑتی ہوئی تتلی محسوس ہو کر رہ گئی۔
اس کی ساری تیزی جاتی رہی وہ میرے سامنے روتی منتیں کرتی مگر میں اسے دلاسے دیتا۔ ہاں ہر روز
اپنے دل تک پہنچنے کے لئے ایک چور دروازہ رکھتی ہے جس میں سے کوئی بھی ایک مرد گزر سکتا ہے
شاہدہ اور سیما نے میرے واسطے وہی چور دروازہ کھول دیا تھا میں اچھلتا کودتا اس سے گزر کر ان
کے دل تک پہنچا مگر دبے پاؤں خاموشی سے ایک روز انہیں تنہا سسکنے کے لئے چھوڑ آیا۔ پھر
کئی لوگ ایک ساتھ دستک دینے لگے۔ یہ میرے دفتر کے ماتحت معلوم ہوتے تھے جن کو میں
نے ہمیشہ ناجائز دبایا جن پر سختیاں کیں اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کیا۔ اپنے ہی ایک ساتھی
جو مجھ سے زیادہ مستحق تھا، کے خلاف اپنے افسر کو ورغلا کر اور خوشامد درآمد کے بعد ترقی حاصل کر لی
تھی مجھے ان تمام دفتر والوں کے چہرے ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔ دن کے اجالے میں اپنے آپ
کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے وقت۔ یہی احساس رہتا ہے کہ یہ لمحے پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ پھر
یکایک میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے وہ دن یاد آنے لگا جب میرے کرتوت اور نافرمانیوں کی وجہ سے
میرے ماں باپ مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ میں اپنی ماں کے آنسو دیکھتا رہا۔ مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میرے
وجود کے اندر سے وقت کا پرندہ اڑ گیا تھا۔ جو محبت اور ممتا ایسے جذبوں کے لئے بھی نہیں ٹھہرتا۔ ماں
باپ کے پرسکون اور ٹھنڈے سائے کو چھوڑ کر میں خود ہی زندگی کی تپتی دھوپ میں نکل آیا تھا ان کے
حق کو کبھی نہ سمجھا نہ چھوٹے بہن بھائیوں کو ان کا حق دیا۔ ان کے خیال کے ساتھ ہی مجھے دروازے
پر ہلکی نرم دستک سنائی دینے لگی۔ ہر بار دستک پر میں اٹھتا مگر کچھ سوچ کر بیٹھ رہتا کیونکہ ہمت نہیں
تھی کہ دروازہ کھول کر اپنا چہرہ ان سب کو دکھاتا۔ یہ سارے کردار میرے جسم کے تاریک غاروں سے نکلے
ہوئے بھیڑیوں کی طرح میرا پیچھا کر رہے تھے۔ اگر مجھے ایسی نظروں سے دیکھے گا کہ میں سنبھل نہ پاؤں
گا۔ شاہدہ مجھے پتہ نہیں کیا کیا کہے گی۔ سیما کے سامنے نظریں نہ اٹھا سکوں گا ممکن ہے اس جیسی لڑکی
مجھ پر جھپٹ پڑے۔ دفتر والے سب مل کر مجھ پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں

خیال آتے ہی میں دروازے کی طرف لپک کر گیا اور کھولنے ہی والا تھا کہ جھجک کر رہ گیا۔ ابا کی غصیلی نظروں سے خوفزدہ ہو گیا۔ اماں اور بہن بھائیوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ میرے اعمال کے ثمرات میرے وجود کے درخت سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگے کیونکہ ان میں میرے اندر کا سڑا ہوا مادّہ جمع ہو گیا تھا وقت ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اس کے لمحے یوں گزر رہے تھے جیسے سانپ سوکھی گھاس میں سرسرا رہے ہوں۔

دستک ہوتی رہی۔ یہ دستک میرے اعصاب پر بری طرح چھا گئی تھی۔ ہاتھ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھتا اور رک جاتا مجھے یہی خدشہ تھا کہ باہر ایک ہجوم کھڑا ہوگا جو مجھے جھنجھوڑ ڈالے گا، میری زیادتیوں کا بدلہ لے گا، سب مجھ سے اپنا اپنا حق مانگیں گے، فریاد کریں گے کفارہ طلب کریں گے۔ زندگی کا ہر ہنگامہ وقت کے سمندر میں کھو جاتا ہے مگر اب یہ سارے ہنگامے وقت کے سمندر سے دوبارہ اُبھر اُبھر کر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتے تھے ان کی نفرتوں کی سیاہ لہریں میرے چہرے پر ابھر رہی تھیں میرے پیچھے لپکتی ہوئی ساعتوں نے آپس میں تحلیل ہو کر میرے وجود کے گرد عجیب سا موہوم حلقہ بنا لیا تھا۔ میں اسی کیفیت میں مبتلا تھا کہ بیوی نے اندر سے آکر حیرانی سے پوچھا۔

"یہ دروازے پر کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟"

"دستک!"

"دستک؟"

"ہاں بہت دیر سے" میں بوجھل لہجے میں بولا۔

"تو پھر کھولتے کیوں نہیں؟"

"نہ۔ نہیں ـــ" میرے حلق سے آوازیں نکل کر آپس میں الجھ گئیں۔

"ایں!" اس نے پریشانی سے کہا، بھئی باہر ہے کون؟ نہیں بے چارہ کون ہوگا" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے چپ رہنے کو کہا تو وہ چمک اٹھی۔

"آخر کیوں؟"

میں اسے پکڑ کر اندر لے آیا کہ کہیں اس تکرار سے میری آواز باہر نہ چلی جائے۔ دستک کی آواز مجھے برابر آتی ہوئی محسوس ہوتی رہی۔ میں زندگی میں اب تک اپنے سر پر ظاہر داری کا چراغ جلائے سرپٹ بھاگتا رہا تھا۔

"میں دیکھتی ہوں" بیوی نے مشکوک نظریں مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میں اُسے روکتا رہا۔ دبی دبی اور گھٹی گھٹی آواز میں منع کرتا رہا لیکن اس نے دیکھتے ہی دیکھتے جاکر دروازہ کھول دیا۔ باہر کھڑے ہجوم کے تصور سے میں کانپ گیا اس لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا اور اب حلق سے دل کے

دھڑکنے کی آواز آنے لگی تھی۔ باہر دیکھ کر بیوی بولی۔

"ارے یہاں تو کوئی بھی نہیں ـــــ"

"کوئی نہیں ـــــ؟" میں یقین کرنے کے لئے مشکوک لیکن بھاری قدموں پر اپنے آپ کو لادے آگے بڑھا۔ یہ سامنیں ایک دوسرے میں گھلی ملی میری آنکھوں کے راستے میرے وجود کے اندر چاروں طرف بہہ نکلی تھیں۔

"تمہیں وہم ہوا ہوگا"

یہ کہہ کر بیوی پھر کسی کام میں مصروف ہوگئی۔ میں آگے بڑھا اور آدھ کھلے دروازے سے گردن نکال کر لرزتے جسم اور دھڑکتے دل کے ساتھ باہر جھانکنے لگا اور اندر واپس آنے کی بجائے میں باہر ہی نکلتا چلا گیا۔

رات گئے جب میں واپس آیا تو گھر میں داخل ہونے وقت میں جو ریزہ ریزہ ہوگیا تھا اب مجتمع ہوگیا۔ بیوی نے دیکھتے ہی فکر مندی سے پوچھا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟ اتنی دیر لگادی"

اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سب سے پہلے میں نے گھر کی ساری کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے۔ بیوی تعجب سے کھڑی دیکھتی رہی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا، باہر کوئی بھی نہیں ـــــ!!!"

OO

جہنمی

ارشاد صدیقی

"یار! میرا باس بڑا ذلیل آدمی ہے۔ وہ جلتا ہے میری قابلیت سے، میری صلاحیت سے، میری انگریزی سے۔ تمہیں پتہ ہے؟ مجھ سے بہتر انگریزی کوئی نہیں لکھ سکتا۔ میرا باس بھی نہیں، کوئی نہیں! مگر میرا باس بڑا چالاک آدمی ہے۔ حرام الدہر ہے۔ مجھ سے کہتا ہے، میرے لیے ریسرچ پیپر تیار کر دو۔ خوب اچھا سا۔ اتنا اچھا کہ میں تمہاری پروموشن کی سفارش کر دوں۔ اور تمہارے تیار کیے ہوئے ریسرچ پیپر کی بنیاد پر میں یو۔ این۔ او میں ایڈوائزر لگ جاؤں۔ تم کو پتہ ہے؟ یہ ریسرچ پیپر صرف میں تیار کر سکتا ہوں! میرے باس کو بھی پتہ ہے کہ میرے علاوہ کوئی اور یہ ریسرچ پیپر تیار نہیں کر سکتا۔ مگر میرا باس بہت ذلیل آدمی ہے۔ میں اس کے لیے یہ پیپر تیار نہیں کروں گا۔

تمہیں پتہ ہے میں نے اپنے باس کو کیا جواب دیا؟ میں نے کہا: ہم نے ایسٹ پاکستان میں بہت مار کھائی ہے۔ ادھر دولت خاں نے بھی ہمیں بہت مارا ہے۔

میں چپ ہو گیا۔ مگر ارشاد! میں اس کے لیے پیپر تیار نہیں کروں گا۔ تمہیں پتہ ہے؟ کوئی میرا بہت اچھا دوست تھا۔ بالکل جگری یار۔ وہ اُدھر E-P-R میں کمانڈر تھا۔ بندوق چلاتا تھا اور شاعری کرتا تھا۔ تمہیں پتہ ہے نذر الاسلام بھی تو پہلی جنگ عظیم میں محاذ جنگ پر تھا۔ توپ کے گولے برستے رہے اور وہ مورچوں میں بیٹھا انقلاب کے نغمے گنگناتا رہا۔ باغی شاعر! کہ جس نے جنگ سے واپس آکر کلکتہ میں "اگنی بنیا" پر آتشیں نغمے الاپے تو سارے بنگال میں آگ لگ گئی اور ہر طرف آزادی اور انقلاب کے ترانے گونجنے لگے۔ مگر وہ جو میرا دوست، کومی تھا۔ کومی یعنی شاعر۔ وہ واقعی شاعر تھا۔ راجشاہی میں E-P-R کا کمانڈر تھا جسے محاذ جنگ سے واپس آکر وطن کے گیت الاپنے تھے۔ ذہنی آزادی، سیاسی آزادی اور معاشی کے ترانے کتنے ہی ترانے تخلیق کرنے تھے، وہ محاذ جنگ سے واپس نہ آسکا۔ یار! کومی مجھے نہیں بھولتا۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتا ہے۔ کیا مسلمان کے ہاتھوں مسلمان قتل ہو جائے تو وہ شہید ہوتا ہے۔

تم ہی بتاؤ! میں اُسے کیا جواب دوں۔ ارشاد! مجھے لگتا ہے کہ اُس کی روح بڑی بے چینی میں ہے۔ نہ وہ زندوں میں ہے اور نہ مردوں میں۔ یار تم ہی بتاؤ میں اُس کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟

ارشاد! تم نے تاج محل دیکھا ہے؟ نہیں تم نے نہیں دیکھا۔ تاج محل تو انڈیا میں ہے اور تم تو انڈیا کبھی گئے ہی نہیں۔ تمہیں پتہ ہے؟ میں انڈیا میں ہی پیدا ہوا تھا مگر آنکھ کھولی ایسٹ پاکستان میں۔ یار! میں ایسٹ پاکستان کو بنگلہ دیش نہیں کہہ سکتا۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ بنگلہ دیش میرے حلق میں اٹک جاتا ہے میری سانسوں میں الجھ جاتا ہے۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔

ہاں تو تم نے تاج محل نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے۔ تم نے تاج محل کے بارے میں پڑھا ہوگا میں نے دیکھا ہے پڑھنے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق میں نے دیکھا ہے۔ اپنی ان کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تمہیں پتہ ہے، تاج محل میری محبوبہ کا نام ہے۔

ارشاد! تم ادھر کراچی کیا کرنے آئے ہو؟ اشتہار بک کرنے۔ اپنے پرچے کے لیے؟ یار ارشاد! تم بہت ڈفر آدمی ہو۔ بالکل ڈفر۔ یہ بتاؤ کتنا پیسہ ہے تمہارے پاس؟ دو ہزار؟ چار ہزار؟ دس ہزار؟ اور تم پرچہ نکالنے چلے ہو؟ بیوقوف آدمی! کوئی سرمایہ دار ہے تمہاری بیک پہ؟ کوئی وڈیرا ہے جس کے مفاد کے لیے کام کر سکو؟ کوئی صنعت کار یا سیاستدان۔ جس کے اشارے پر تم ناچ سکو؟ مجھے پتہ ہے کہ تم اس کام کے لیے نہیں بنائے گئے۔ تم کسی کے لیے کام نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم اپنے لیے بھی کام نہیں کر سکتے۔ مجھے پتہ ہے تم پاگل آدمی ہو۔ میرے سمجھانے سے باز نہیں آؤ گے۔ تم پرچہ ضرور نکالو گے۔ مگر۔ جو خون پسینہ ایک کر کے دو چار روپے تم نے پس انداز کئے ہیں، جب اڑ جائیں گے تو پتہ چلے گا کہ رسالے کا دوسرا شمارہ پریس میں نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ نہ بیوی کے پاس زیور ہے جسے بیچ کر کام چلاؤ اور نہ ہی کوئی آبائی یا ذاتی جائداد جو اس پاگل پن کے کام میں تمہاری مدد کر سکے۔

تم ادھر کراچی اشتہارات بک کرنے آئے ہو۔ یار کتنی ذلت کی بات ہے۔ تم خود سوچو، دو ٹکے کے لوگ جنھیں نہ علم سے سروکار نہ ادب سے، نہ سیاست سے نہ معاشرے سے نہ قوم سے نہ انسانیت سے مگر سیٹھ ہیں۔ سمگلنگ سے، چوری سے، منافع خوری سے، ذخیرہ اندوزی سے اور دنیا کے تمام ناجائز ذرائع سے اور تم ان کی خوشامدیں کرو گے، ایک اشتہار کی خاطر تم ان کی جھوٹی تعریفیں کرو گے، مکھن لگاؤ گے، زمین و آسمان کے قلابے ملاؤ گے۔ تف ہے۔ لعنت ہے تم پر!!!

مگر مجھے پتہ ہے تم یہ سب کچھ نہیں کر سکو گے۔ مجھے پتہ ہے کہ دو چار دس دن سڑکیں ناپنے کے بعد دل برداشتہ ہو کر لاہور واپس چلے جاؤ گے۔ مگر کل تم میرے پاس آنا۔ میرے دفتر۔ دو ہزار کا ایک اشتہار میں تمہیں دے دوں گا۔

ارشاد! تم سمجھتے ہو گے کہ میں نشہ کرنے کا عادی ہوں اور جو کچھ یہ بکواس کر رہا ہوں، اسی نشے کے عالم میں کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں، میں نشے کا عادی نہیں ہوں۔ بس کبھی کبھی نشہ کرتا ہوں، جب میری محبوبہ تاج محل مجھے بہت یاد آتی ہے۔ اور پھر اس کے ماموں، دولت خاں کا وہ سلوک یاد آجاتا ہے جس

نے مجھے کہیں کا رکھا۔ میں تباہ ہو گیا۔ ارشاد میں تمہیں زندہ دکھائی دیتا ہوں۔ بھلا میں کہاں سے زندہ ہوں۔ میں تو بس ایک چلتی پھرتی لاش ہوں۔ ہاں کبھی کبھی میں اپنے آپ کو زندہ محسوس کرتا ہوں صرف اپنی بوڑھی ماں کے لیے۔ میری ماں بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔ بہت بیمار رہتی ہے۔

تو یار! میں کبھی کبھی نشہ کرتا ہوں۔ مگر تم یہ نہ سمجھو کہ میں یہ ساری باتیں نشے میں بک رہا ہوں۔ بالکل ہوش میں ہوں، سو فی صد ہوش میں۔ میں نشہ کر دوں بھی تو مجھے نشہ نہیں ہوتا۔ میرے سارے نشے ٹوٹ چکے ہیں، اب کسی چیز سے مجھے نشہ نہیں ہوتا۔ تم ایل۔ ایس۔ ڈی والا پان مجھے کھلا دو۔ مجھے نشہ نہیں ہوگا۔ ہرگز نہیں یار! یہ تم میری بکواس کیوں لکھتے جا رہے ہو۔ تاج محل کا ماموں دولت خاں تمہیں بہت مارے گا۔ خبردار یہ ساری بکواس کہیں لکھ کر چھاپ نہ دینا۔ ورنہ میری طرح تم بھی کہیں کے نہ رہو گے۔ مارے جاؤ گے۔ دولت خاں اور اس کے گرگے تمہیں ذہنی طور پر اپاہج کر دیں گے۔ تمہارا قلم تم سے چھین لیں گے۔

یار! تاج محل بہت خوبصورت ہے بالکل تاج محل کی طرح اور جانتے ہو

I like her inner self not the outer self

تم نے وہ بنگالی راسٹر مجیب احسین نام سنا ہے۔ اس نے ایک افغان لڑکی سے عشق کیا تھا۔ ادھر میں نے ایک آگرے والی سے عشق کیا۔ دونوں مارے گئے۔

دونوں کا حشر نشر ہو گیا

پتہ ہے؟ قریشی صاحب کہتے ہیں، تم میرے لیے ریسرچ پیپر تیار کر دو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ یو۔ این او۔ لے جاؤں گا۔ وہاں سے لاگوس میں یو۔ این۔ او کا نمائندہ لگوا دوں گا۔ پھر تم مزے کرنا۔ عیش ہو جائے گی لاگوس بڑی اچھی جگہ ہے۔ ہر لحاظ سے اور مجھے آنکھ ماری۔ قریشی صاحب کہتے ہیں ترقی کا چانس زندگی میں بار بار نہیں آتا یہ موقع تم نے کھو دیا تو پھر زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ میں نے سوچا زندگی بھر پچھتانا منظور مگر قریشی صاحب بہت ذلیل آدمی ہیں۔ میں ان کے لیے پیپر تیار نہیں کروں گا۔ ہرگز نہیں کروں گا۔

یار! تمہیں نور جہاں اچھی لگتی ہے مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ کہیں سے اس کی ایک فوٹو تو لا دو۔ میں اسے اپنے دل میں رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ کیا بکواس ہے ہ فوٹو بھی کہیں دل میں رکھی جاتی ہے؟ دل میں تو نیا سا ہوتا ہے۔ احساس ہوتا ہے۔ درد ہوتا ہے اور مستقل کسک۔ مگر یہ سب بکواس ہے۔ سب شاعری ہے اور ارشاد! تمہیں پتہ ہے۔ ایسٹ پاکستان سے آنے کے بعد میں نے شاعری چھوڑ دی ہے۔ دل میں ریت ہی ریت ہے۔ دھواں ہی دھواں ہے۔ شاعری کہاں سے ہو گی؟

دولت خاں مجھ سے پوچھتا ہے۔ تمہارا بنک بیلنس کیا ہے؟

میں نے کہا یہی کوئی بیس پچیس ہزار ہوگا۔ وہ بہت زور سے ہنسا اور کہا بس! اسے چھوٹے آدمی! میرا چھ پیٹی کنڈیکٹر ہے۔ بلکہ کئی ہیں۔ وہ بھی کوئی کروڑ پتی سے کم نہیں۔ اس نے مجھے ذلیل کیا مجھ

مارا۔ ارشاد! اس نے مجھے بہت مارا اور مار پیٹ کر مجھے میرے گھر پھینکوا دیا۔

میں اُسے کیا بتاتا کہ میرا تو تمام (ASSET) ایسٹ پاکستان میں رہ گیا۔ میرا ASSET تو میرا دوست چھیکو تھا جو میرا دکھ سکھ کا ساتھی تھا۔ دکھ تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ سکھ ہی سکھ تھا۔ چھیکو مجھے ہندوؤں کے گھروں میں لے جاتا تھا اور کہتا تھا کہ ہندوؤں نے تم پر بڑا ظلم کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اتنا ظلم کیا کہ تم اسے کبھی بھول نہیں سکتے۔ اب تم ان ہندوؤں پر ظلم کرو۔ خوب جی بھر کر ظلم کرو لیکن میں نے پیسے دیئے بغیر کبھی ظلم نہیں کیا تھا۔ چھیکو اس میں سے اپنا کمیشن رکھ لیتا تھا اور کبھی کبھی پوری رقم ہی ہضم کر لیتا تھا اور جب وہ ایسا کرتا تھا تو میں اسے بہت ڈانٹتا تھا۔ مگر وہ شیطان ہنس ہنس کر کہتا تم DUFFER ہے۔

یار! یہ میری ماں بہت ڈفر ہے۔ وہ میری تین ہزار روپے تنخواہ پر بہت خوش ہے۔ بہت نمازیں پڑھتی ہے۔ بہت اللہ کا شکر ادا کرتی ہے۔ نمازیں تو میں بھی پڑھتا ہوں۔ اللہ کا شکر تو میں بھی ادا کرتا ہوں۔ مگر میں اسے کہتا ہوں۔ یہ تین ہزار روپے تو کچھ بھی نہیں۔ دولت خاں کے دفتر کا ایک معمولی انجینئر بھی اس سے زیادہ تنخواہ لیتا ہے۔ دولت خاں ارب پتی ہے۔

"یار! یہ ڈاکٹر مقبول بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ بہت ہینڈسم۔ بڑا سمارٹ۔ کیا پرسنلٹی ہے۔ تاج محل کے پیچھے بالکل شہ تاج کی طرح۔ بہت اچھی، جوڑی رہے گی۔ لیکن پھر میرا سانس اکھڑنے لگتا ہے دم گھٹنے لگتا ہے اور پھر تھوڑا سا نشہ کر لیتا ہوں۔ مگر تمہیں پتہ ہے؟ مجھے بالکل نشہ نہیں ہوتا۔ میں just normal بالکل نارمل رہتا ہوں۔

تمہیں پتہ ہے، میں بنگال میں رہا۔ بنگلہ سیکھی، بنگلہ پڑھی، بنگلہ بول چال کو اپنایا۔ ان کا رہن سہن ان کا لباس، ان کی تہذیب، غرض سب کچھ۔ تمہیں پتہ ہے میں راجشاہی یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس یونین کا صدر رہا۔ میں راجشاہی یونیورسٹی کا ہیرو تھا جس میں قوم کا ہیرو بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ مگر کیا ہوا؟ آہ۔ بنگالیوں نے مارا۔ اور ادھر دولت خاں نے۔ لٹ پٹ کر یہاں پہنچا، کچھ دیر پیر جمانے کی کوشش میں لگا اور جب تھوڑا سا سر اٹھانے کے قابل ہوا تو دولت خاں نے سر کچل دیا۔ اتنا مارا، اتنا مارا کہ میں ذہنی طور پر اپاہج ہو گیا۔

" یار میری ماں بہت پریشان ہوگی۔ بڑی دیر ہو گئی ہے۔ تم نے مجھے بہت پلا دی۔ لیکن نہیں، تم نے کہاں پلائی۔ پی تو میں نے خود ہے تم نے تو میرا ساتھ بھی نہیں دیا۔ تم تو اس سارے عرصے میں ایک کوک کی بوتل بھی ختم نہ کر سکے۔

یار! تم بڑے ڈفر ہو۔ اب تم ایک کام کرو۔ مجھے ۴ - x میں بٹھا دو۔ مجھے بڑی سستی سی ہو رہی ہے۔ میں شاید ویگن میں سوار نہ ہو سکوں۔ تمہیں ذرا میری مدد کرنی پڑے گی۔ مجھے بس ۴ - x میں بٹھا دو

میں اپنے شاپ تک پہنچتے پہنچتے ٹھیک ہو جاؤں گا۔

ادھر کراچی میں تم خواہ مخواہ اشتہار بک کرنے آئے ہو۔ مجھے معلوم ہے تمہیں کوئی اشتہار نہیں ملے گا اور اگر فرض کرو مل بھی جائے تو کتنے کا ملے گا؟ دس ہزار۔ بیس ہزار۔ میں کہتا ہوں کہ اگر لاکھ دو لاکھ بھی تمہارا بینک بیلنس ہو جائے تو تمہارا دکھ دور نہیں ہو سکتا۔ پیسہ تمہارا دکھ نہیں ہے۔ تمہارا دکھ کچھ اور ہے اور اس کا علاج بینک بیلنس سے نہیں ہو سکتا MENTAL AILMENT سمجھتے ہو۔ نہیں سمجھے تم ڈفر ہو۔ تم نے اردو میں ایم اے کیا ہے نا؟ اسی لیے تم ذہنی مریض ہو۔

میں اپنی ماں سے کہوں گا۔ وہ لاہور والا ارشاد ملک ہی تھا۔ وہی میری اس ہستی کا ذمہ دار ہے۔ میں نے کچھ نہیں پیا۔ کوئی غلط کام نہیں کیا۔ چلو اب گھر چلتے ہیں۔ میں ماں کو سمجھاؤں گا۔ مگر گھر تو مجھے اکیلے ہی جانا ہے۔ تم ایک کام کرو مجھے ۳ - X میں بٹھا دو۔ میں خود گھر چلا جاؤں گا۔

یار وہ دولت خاں کی بھانجی ہے۔ اس کا باپ بھی بہت امیر آدمی تھا۔ دولت خاں اب اس کا سرپرست ہے۔ تم ہی بتاؤ وہ میرے جیسے WRETCHED آدمی کے ساتھ کیسے گزارا کر سکتی ہے۔ وہ میرے لیے دولت خاں سے کیسے لڑائی لڑ سکتی ہے۔ تمہیں پتہ ہے؟ میری اس کی شادی ہو گئی تھی۔ نہیں تمہیں نہیں پتہ۔ کسی کو بھی نہیں پتہ۔ دولت خاں کو بھی پتہ نہیں تھا۔ عین اسلامی قانون کے مطابق شادی ہوئی تھی۔ مگر جب دولت خاں کو پتہ چلا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ مجھے گھر میں بند کر کے بہت مارا۔ اپنے نوکروں سے بھی پٹوایا اور پھر مجھ سے NO پر دستخط لے لیے۔ مجھے کچھ نہیں پتہ کہ میں نے NO پر کیسے دستخط کئے۔ مگر اتنا پتہ ہے کہ اس کے بعد دولت خاں نے مجھے میرے گھر بھجوا دیا تھا اور پھر میں کئی مہینے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میری ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔

" پتہ ہے! جب میری ماں مر جائے گی تو میں ایک اسٹین گن خرید دوں گا اور دولت خاں کو مار ڈالوں گا۔ لیکن مجھے پتہ ہے وہ مرے گا نہیں اور میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ پھر مجھے پھانسی ہو جائے گی۔

جاوید بخش سنجرانی میرا دوست ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ میرے لیے گاؤں سے اصلی گھی لائے گا۔ پورے پانچ کلو۔ میں یہ گھی کھا کر اپنی جان بناؤں گا اور جب مجھ میں بہت طاقت آ جائے گی تو میں دولت خاں کو ایک مکہ لگاؤں گا اور وہ مر جائے گا۔ قصہ پاک ہو جائے گا۔

یار! یہ بیرا بل کتنے کا لایا ہے؟ ستاون روپے پچاس پیسے۔ یار۔ یہ پچاس پیسے زیادہ لگا رہا ہے۔ یہ سراسر دھاندلی ہے۔ یہ کھلا ڈاکہ ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں مینیجر کی ناک توڑ دوں گا۔ اس کی بتیسی ہلا دوں گا۔ لیکن یار اس مینیجر کا کیا قصور ہے۔ یہ تو بیرا اس طرح ... اور یہ بیرا بھی بہت غریب آدمی ہے۔ یہ ساٹھ روپے ٹھیک ہی ہو گئے۔ یہ ڈھائی روپے بیرے کی ٹپ۔ چلو

چلو یار چلتے ہیں۔ لیکن یار میں بالکل کنگال ہو گیا ہوں۔ بیرے کو کم از کم ایک اٹھنی تو واپس کرنی چاہیے تھی۔ یار اس نے بڑا ظلم کیا ہے۔ میں تو بالکل فقیر ہو گیا ہوں۔

چلو مجھے ایک اٹھنی دے دو اور مجھے ۲ – x پر بٹھا دو۔ تاکہ میں اس پر بیٹھ کر جہنم میں چلا جاؤں . . .
"یار! اگر آج وہ خواب میں آ گئی تو کیا کہے گی؟ کہے گی! تم تو ایڈیٹ ہو۔ ڈفر۔ یہ کچھن ہیں تمہارے دولت خاں سے مقابلہ کرنے کے؟ لعنت ہے تم پر۔ لیکن وہ تو خواب میں بھی نہیں آتی۔ خواب میں بھی دولت خاں ہی آتا ہے۔ ارے یار! خواب میں بھی وہ مجھے مارتا ہے۔ کیا تم مجھے اس کے ظلم سے بچا نہیں سکتے۔ یار وہ کروڑ پتی ہے۔ چار ہزار گز کے محل میں رہتا ہے۔ اس کے پاس بیوک ہے۔ اس کی بھانجی کے طلبگار و خریدار بھی بہت ہیں۔ چاہت کا دعویٰ کرنے والے بھی بہت ہیں۔ ممکن ہے اس کی شادی بھی ہو گئی ہو۔ مگر مجھے معلوم نہیں ہے۔ اگر کبھی ہوا تو میں سائنائڈ کھا لوں گا۔

" اُس نے مجھ سے کئی بار ملنے کی کوشش کی۔ کئی بار پیغام بھجوائے۔ مگر میں کیسے مل سکتا تھا۔ کومٹمنٹ اور کومٹمنٹ۔ جینٹل مین پرومس۔ میں نے اُسے کہلوا دیا یہ ناممکن ہے۔

پتہ ہے، میں اپنی ماں سے کیا کہوں گا؟ کہ میں کہوں گا کہ وہ لاہور والا ارشاد مل گیا تھا۔ وہ مجھے نو سے بارہ کے شو میں لے گیا تھا۔ اور میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ کہیں بھی نہیں گیا . . . یار دیکھو کتنی گھٹیا بات ہے؟ میں اپنی ماں سے جھوٹ بولوں گا۔ حالانکہ میری ماں کو میرے جھوٹ کا پتہ لگ جائے گا اور وہ مجھے بستر پر سلا کر خود رونے بیٹھ جائے گی . . . تم بہت حرامی ہو۔ اور آج پھر میری ماں کو تمہاری وجہ سے رونا پڑے گا۔

ویسے ارشاد! تم بہت نکمے آدمی ہو! واقعی بہت نکمے ہو! نہیں ہو؟ نہیں تو ذرا کسٹم کا محکمہ توڑ کر دکھا دو۔ ذرا انکم ٹیکس کا محکمہ توڑ دو۔ ذرا پورٹ ٹرسٹ اور پولیس کا محکمہ ختم کرا دو۔ نہیں کر سکتے۔ کچھ نہیں کرا سکتے۔ اگر سلسلے میں تم نے کچھ کرنے کی کبھی جرأت بھی کی تو دولت خاں تمہیں بہت مارے گا۔ مار مار کے ادھ موا کر دے گا۔ بلکہ شاید تمہیں مروا ہی دے۔ لہٰذا کبھی ایسا کرنے کی کوشش مت کرنا۔

تم مجھے ۲ – x میں بٹھا دو۔ لیکن ذرا پہلے ایک پان کھلا دو۔ خوشبو والا نہیں۔ تمباکو والا۔ نہیں خیر۔ تم پان والے سے کہو کہ ایسا پان دے کہ میرے منہ سے بو جاتی رہے اور میں اپنی ماں سے آسانی سے جھوٹ بول سکوں۔ بس کہہ سکوں کہ وہ میرا پرانا دوست ارشاد مل گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے پیسے سے سینما لے گیا تھا میں نے کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا۔

یار! غالب بڑا Faithful شاعر ہے بڑا ساتھ دیتا ہے ہر حال میں ساتھ دیتا ہے۔ پتہ ہے! ساجد کو غالب کے بہت سے اشعار یاد ہیں تم ساجد کو نہیں جانتے۔ وہ سالا کمال ظفر کا ماموں ہے۔ کمیشن ایجنٹ ہے۔ وہ جیسے ایسٹ پاکستان میں میرا دوست، چھبکو تھا۔ تم چھبکر سے نفرت کرتے تھے اس کے دشمن تھے۔ تم ساجد سے بھی نفرت کرو گے۔ تم اس سے ملو گے تو تم اس کے دشمن بن جاؤ گے۔ لیکن چھبکر کا بھی کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ وہ اب بھی وہیں ایسٹ پاکستان میں ہے اور تم ساجد کا بھی کچھ نہ بگاڑ سکو گے، خواہ مخواہ اس سے دشمنی کر کے اپنا ہی خون جلاؤ گے۔

" لگتا ہے میرا نشہ اتر رہا ہے۔ لیکن مجھے نشہ ہوا ہی کب تھا۔ میں بھی ڈفر ہوں۔ بالکل ڈفر۔ تم ذرا مجھے ایک پان اور کھلا دو۔ الائچی اور خوشبو والا۔ ذرا کھلی ہوا میں تھوڑی دیر اور گھوم پھر لیتے ہیں۔ پھر تم مجھے ۲ - × میں بٹھا رہنا اور میں جہنم میں چلا جاؤنگا۔

OO

آئینۂ خیال

جاپانیوں کے سامنے "سیف الملوک"

سید ضمیر جعفری

کئی برس ہوئے — جاڑے کی ایک شب کا ذکر ہے۔ چند احباب جو دوسری جنگ عظیم کے فارغ سپاہی تھے ایک جگہ الاؤ کے گرد بیٹھے اپنی اپنی یادداشتوں کی دبی چنگاریاں سلگا رہے تھے۔ اس وقت لانس نائیک علی بہادر خان اپنی کہانی سنا رہے تھے۔

دوسری جنگ عالمگیر بڑی وسیع جنگ تھی۔ کئی کئی ہزار میل لمبے چوڑے محاذ دنیا بھر میں کھلے پڑے تھے ہم جیسے نوآموزوں کو یہی سمجھ نہ آتا کہ اتنی وسیع جنگ لڑی کیسے جا رہی ہے۔

صف کے عام سپاہی کا محاذ جنگ اس کے بالکل سامنے ہوتا ہے۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے کیا ہو رہا ہے؟ کل کیا ہوگا؟ سامنے کی کھاڑی عبور کرنے، دائیں بازو کی ٹیکری سر کرنے کے بعد، ہمیں کدھر جانا ہے اور ان کے سر ہو جانے سے جنگ کی عاقبت کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ ہم کس کی کمک پر ہیں؟ ہماری کمک پر کون ہے، کوئی ہے تو کہاں ہے؟ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا علم درجہ بدرجہ اوپر کے افسروں کو ہوتا ہے۔ مقام و محل کے مطابق جس کو جتنا جاننا چاہیے اس کو بس اتنا ہی معلوم ہوتا۔ جتنا کوئی اوپر ہوتا اتنا ہی وہ پیچھے ہوتا اور اتنا ہی زیادہ باخبر ہوتا۔

سنگاپور کی لڑائی عجیب لڑائی تھی۔ ہماری پلٹن جزیرے میں زیر تعمیر ایک ہوائی اڈے کی حفاظت پر متعین تھی۔ لڑائی جب کوئی پانچسو میل دور ملایا کے دوسرے کونے میں شروع ہوئی تو قیاس تھا کہ کچھ عرصہ بعد ہمیں بھی محاذ پر جانا ہوگا مگر خبروں سے معلوم ہوا کہ محاذ خود ہماری طرف آ رہا تھا۔ دو تین ہفتوں میں محاذ ہمارے سر پہ آ پہنچا اور ایک دن علی الصبح صوبیدار میجر صاحب نے حکم بھیجا کہ جوان مورچے چھوڑ کر بارکوں میں آ جائیں۔ سپہ سالار جنرل پرسیول نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

ہم حیران تھے کہ ہم نے تو اپنے ہوائی اڈے سے ایک جاپانی کو بھی نہیں گذرنے دیا اور ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ بھی ہو گیا۔ مگر ہمارے ہتھیار تو جنرل پرسیول کے حکم کے پابند تھے۔

لڑائی بند ہوتے ہوتے میں خواہ مخواہ زخمی ہو گیا۔ قریب ہی ربڑ کا گنجان باغ تھا۔ بلکہ سارا ملایا ہی ربڑ کا ایک گنجان باغ ہے۔ نہ جانے کہاں سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور میرے دائیں پاؤں میں شگاف کرتی ہوئی یہ جا اور وہ جا۔ مجھے باقاعدہ زخمیوں کی طرح مورچے سے بارک میں پہنچایا گیا۔

اب ہم اس انتظار میں تھے کہ جاپانی آئیں اور ہمیں قید کریں۔ یہ بڑا کرب انگیز احساس تھا۔ جنگ میں حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں آس پاس برستی ہوئی موت میں بھی امید کی روشنی برابر جھلملاتی رہتی ہے جب تک بندوق ہاتھ میں ہے سپاہی اپنے آپ کو دنیا کی بلند ترین چوٹی پر محسوس کرتا ہے۔ دشمن کی قید، سخت اور بے معیاد، نامعلوم تاریکی کا ایک بیکراں سمندر تھی۔ اب ہم وطن اور عزیزوں سے دور ہی نہ تھے، ان سے کٹ بھی گئے تھے۔

جنگ میں لاکھ صعوبت سہی مگر زندگی اور ہماہمی کا احساس موجود تھا۔ سوالی جوابی حملوں کے سوا، جو بے شک سنگین ہوتے، زندگی کا دھارا روانی اور بانکپن سے بہتا رہتا دھاوا روز روز ہوتا بھی نہ تھا۔ زیادہ وقت اقدام اور دفاع کی منصوبہ بندی میں گذرتا۔ دونوں طرف فوجوں کے ٹڈی دل اس طرح بیٹھے رہتے کہ بعض راویوں کے بقول فوج زیادہ ہوتی تھی اور لڑائی کم۔ پھر سپاہیوں کی نازبرداریاں، اللہ اکبر، ملک ملک کی نعمتیں ہمیں با افراط میسر تھیں۔ جو چیزیں باہر دیکھنے کو نہ ملتیں ہمارے ہاں ان کے انبار لگے رہتے۔ "نافی" (NAFI) اسٹور سے صاحب لوگوں کو وہسکی کی بوتل تین روپے میں مل جاتی۔ گوالیار کی ریاستی یونٹ کے ایک سردار صاحب فرنٹ لائن کا راشن کھا کھا کر اتنے موٹے ہو گئے تھے کہ اب فرنٹ لائن تک ان کا چل کر پہنچنا دشوار تھا۔

میرا پاؤں زخمی تھا۔ عام حالات میں مجھے انڈین ملٹری ہسپتال میں داخل ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر اس افراتفری میں ہسپتال کون جاتا۔ اپنی چوکی کے ہنس مکھ مدراسی نرسنگ آرڈرلی منگلم سے پٹی بندھوا کر بارک ہی میں پڑ رہا۔ بہ ہاراں درزش۔ منگلم بذات خود ایک دلچسپ تماشہ تھا۔ ہر وقت بشاش، ہنستا، مسکراتا ہوا۔ خود جتنا سیاہ تھا، دانت اتنے ہی سفید تھے۔ جوان شفا خانے میں آتے تو ان کو اپنے معاشقوں کی رنگین کہانیاں بڑے دلچسپ انداز میں سناتا۔ اس کی اصلی محبوبہ تو کہیں مالابار میں تھی۔ مگر پچھلے دو تین برس وہ جہاں جہاں رہا ایک آدھ محبوبہ اپنے پیچھے چھوڑ آیا اور اب ان سب کے فوٹو سینے سے لگائے رکھتا۔ میں جس وقت زخم کھا کر چوکی میں پہنچا تو شدت درد سے کراہ رہا تھا۔

منگلم حسب معمول قہقہہ لگا کر بولا۔ "ارے اتنا سی چوٹ پر چیختا ہے ادھر دیکھو۔ ایک ران پر تم کو سیکڑوں زخم دکھاؤں۔" اور اس نے بنیان اتار کر جراحی کے میز پر رکھ دی۔ وہاں زخم تو کہاں تھا۔ البتہ میری طبیعت اس کی زندہ دلی سے بحال ہو گئی۔

جاپانیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ آندھی کی طرح آتے اور بگولے کی طرح جاتے ہیں۔ قیاس تھا آناً فاناً آکر ہتھیار رکھوائیں گے اور ریوڑوں کی طرح ہانک کر بندی خانے میں بند کر دیں گے۔ مگر کئی روز تک کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ ہراس کا ابتدائی سناٹا ذرا ٹوٹا تو لنگر گپ کے بادشاہوں نے پھلجھڑیاں چھوڑنا شروع کر دیں منگلم کا خیال تھا کہ جاپانی ہماری یونٹ کو بھول گئے ہیں۔

حوالدار کلرک منش خان جنگ چھڑنے سے پہلے کچھ روز کسی پرائمری مدرسے کے مدرس رہ چکے تھے اخبار کا ایک ایک لفظ چاٹ جاتے۔ ریڈیو پاخانے میں بھی ساتھ رکھتے۔ ہماری چوکڑی میں سب سے زیادہ باخبر آدمی وہی تھے اور وہ کہتے "میں تو سمجھتا ہوں کہ جاپانی ہمیں قید کرنے سے انکار کر دیں گے۔ قید ہونے والی فوج، گنتی میں فاتح

ریتوں سے پھر ٹھک ٹھک کرنے کی آواز آئی۔ کرنل صاحب پھر چلے آرہے تھے۔ اب ان کے ہاتھ میں عمدہ جاپانی سگریٹوں کے دو پیکٹ تھے جو انہوں نے مجھے تھما دیئے۔

بارہ بجے کرنل نہایت سج دھج کی وردی پہن کر باقاعدہ کرنل بنا ہوا اترا۔ موٹر خانے سے موٹر نکالی اور مجھے پچھلی سیٹ پر بٹھا کر سیدھا ہسپتال پہنچا جہاں ایک چھوکرے سے جاپانی ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے میری مرہم پٹی کی پھر وہ سرانگون روڈ کے ایک دفتر میں بیٹھا رہا اور واپسی پر مجھے میری بارک کے سامنے چھوڑ گیا۔ سرانگون روڈ پر جنگی قیدیوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ کرنل وہاں کا اعلیٰ اسٹاف افسر تھا جب تک وہ دفتر کے اندر رہا میں باہر سٹاف کار میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ ایک مرتبہ اندر سے میرے لیے چائے بھی آئی۔

شام کو باروں کی منڈلی جمع ہوئی تو ساتھیوں میں سگریٹ کا پیکٹ تقسیم کیا گیا۔ دن کی روداد سنائی جس پر دوستوں نے مبارک باد دی۔ ابھی خوش گپیاں ہو رہی تھیں کہ حوالدار بخشش خاں آگئے۔

" باوا تم نے جاپانی کرنل پر کیا طلسم مارا ہے۔ ٹیلی فون آیا ہے۔ کل آٹھ بجے ادھر وہ خود تم کو لینے آئے گا۔ ایک دم تیار رہنا۔"

اب یہ روزانہ کا معمول ہوگیا کہ کرنل صبح آکر مجھے ہسپتال لے جاتا مرہم پٹی کراتا اور ہیڈ کوارٹر سے واپسی پر مجھے میری بارک میں چھوڑ جاتا۔ دو وقت چائے اور سگریٹوں کے پیکٹ کا روزینہ الگ۔ قید کی حالت میں یہ کیفیت گویا دن عید اور رات شب برات سے کم نہ تھی۔ مصروف سرانگون روڈ پر دن بھر قیدیوں کی ناملوں کو جس حال میں دیکھتا اس کے بعد خود کو دیکھتا تو اللہ کا ہزار ہزار شکر بجا لاتا۔ کام نہ دھام، دن بھر موٹر میں بیٹھا رنگا رنگ انسانوں کے سیلاب کو دیکھتا رہتا۔ انڈین قیدیوں کے نمائندوں کو حکم و ہدایت کے لیے روزانہ اس ہیڈ کوارٹر میں آنا پڑتا تھا۔ ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ بچھڑے ساتھیوں کی خیر خبر مل جاتی۔

سرانگون روڈ سنگاپور کی ہندوستانی سڑک تھی۔ آس پاس جنوبی ہند کے تامل ہندو یا چولیا مسلمان آباد تھے۔ بازار بھی انہیں لوگوں کے تھے دو اسے کے ساتھ جا لگے "ریتو کیدار" اور مسلمان گوالے، گویا کسی اپنے شہر کا کوئی بازار یا محلہ۔

ہمارے ہیڈ کوارٹر سے ہٹ کر سیالکوٹ کے ایک حاجی صاحب نے چھوٹا سا درزی خانہ کھول رکھا تھا جہاں گجراتی وضع کا چھوٹا حقہ ہر وقت گڑ گڑ آتا رہتا۔ مجھے جب بھی موقع ملتا میں وہاں جا بیٹھتا حقے کا دور چلتا، گپ شپ رہتی دیس کی کچھ خبریں مل جاتیں۔

پاؤں کا زخم مندمل ہوا تو میں سٹاف کار چلانے لگا۔ کرنل نے مجھے ایک بائیسکل بھی دے رکھی تھی۔ میں گاڑی بند کرکے عموماً شام کو بائیسکل پر اپنی یونٹ میں چلا جاتا۔ ایک دن اتا دیمی اکرنل کے اردلی نے حکم دیا کہ بوریا بستر یہیں اٹھا لاؤں۔ میرے واسطے یہ بڑا گراں حکم تھا۔

رات کو باروں کی منڈلی میں ہنس بول کر قید اور مسافرت اور تنہائی کا غم غلط کرنے کی چند ساعتیں مل

فوج سے کہیں زیادہ ہے۔ اتنی بڑی فوج کے ساتھ لڑا تو جا سکتا ہے، اس کو قید نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

نائیک پائندہ خان ان پرجوش جان فروشوں میں سے تھے جو میدان کارزار میں اس بات کی تمنا کرتے ہیں کہ اے کاش کمانڈر انچیف کی جگہ پورے آرمی گروپ کی کمان انکے ہاتھ میں ہوتی اور وہ دنیا پہ ایک مرتبہ روشن کر سکتے کہ لڑائی کا بانکپن کیا ہوتا ہے۔ رن بولا کیسے کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی رائے میں یہ قید کا نہیں یلغار کا محل تھا۔ ہتھیار تو جاپان میں جا کر بھی ڈالے جا سکتے ہیں۔"

کوارٹر ماسٹر حوالدار تراب علی ایک اور مزے کے آدمی تھے۔ وہ کوارٹر ماسٹر اسٹور میں مربے کی خوشبو سونگھتے سونگھتے کچھ شاعر سے ہو گئے تھے۔ کوئی سی بات ہو رہی ہو وہ بیچ میں یکبارگی ہاتھ کانوں پر رکھ کر بہ آواز بلند سیف الملوک کا یہ بیت الاپ دیتے :

الف اج دی رات وصال والی جھلکے کی جاناں کیہڑا رنگ ہوسی
میلے فیر محمدا قسمتاں دے کتھے شمع تے کتھے پتنگ ہوسی

آج کی رات وصل کی رات ہے۔ کیا معلوم کل کیا ہو۔ دوبارہ اسی طرح کی یکجائی مقدر کی بات ہے۔ کون جانے شمع کہاں ہو گی اور پروانہ کہاں؟ (میاں محمد صاحب)

صوبیدار میجر صاحب حسب معمول مصروف ترین آدمی تھے، بلکہ جب سے لڑائی بند ہوئی تھی ان کی مصروفیت اور فکرمندی کے درجوں نئے دروازے کھل گئے تھے ڈسپلن اور "ٹرن آؤٹ" پر پہلے سے زیادہ زور تھا۔ جوانوں کے حوصلے، نظم و ضبط، آسائش سے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات پر گہری نظر۔ صبح و شام ہدایات کا دریا بہتا رہتا۔ وردی کا پیتل پہلے سے زیادہ چمک رہا تھا۔ ملایا کی عظیم اتحادی فوج ہتھیار ڈال چکی تھی۔ دنیا کا سیاسی نقشہ کچھ سے کچھ ہو رہا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں سلطنت برطانیہ کا نہ غروب ہونے والا آفتاب ڈوب گیا تھا۔ جاپان کا چڑھتا سورج نصف النہار پہ آ گیا تھا۔ مگر صوبیدار میجر صاحب کو ان حالات میں بھی اگر کوئی فکر تھی تو صرف یہ کہ قید میں بھی یونٹ کی روایات کا پرچم کیونکر بلند رکھا جائے۔

قصہ کوتاہ، یونٹ میں سرکاری، نیم سرکاری، کچی پکی خبروں، افواہوں، تبصروں، قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔

آج بریگیڈ کمانڈر صاحب یونٹ ہیڈکوارٹر میں آئے تھے دو جاپانی افسر ساتھ تھے۔ تین گھنٹے کانفرنس ہوئی۔ جب وہ آئے تو ہمارے کرنل صاحب نے ان کو سلوٹ کیا۔ جب وہ گئے تو ہمارے کرنل صاحب نے اسٹاف کار کا دروازہ کھولا۔ اسٹاف کار ہمارے بریگیڈ کی تھی مگر جھنڈا کوئی نیا سا تھا۔ جاتے وقت بریگیڈ کمانڈر نے کرنل صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے گڈ سائی کہا تھا۔ جاپانی افسروں نے تھوڑا سا سر ہلایا۔ شاید مسکرائے بھی۔"

" آج کرنل صاحب ایڈجوٹنٹ اور کوارٹر ماسٹر سارا دن کسی ہیڈکوارٹر میں گئے رہے۔"

آج دو جاپانی سارجنٹ کوارٹر ماسٹر کے رجسٹر اور کوت "کی پڑتال کرتے رہے۔ دونوں نے تلوار لٹکا رکھی تھی۔ ایک سارجنٹ کو ڈیوٹی اردلی کی اسٹک پسند آ گئی۔ جاتے ہوئے وہ اسٹک لے گیا اور کلائی سے اپنی گھڑی کھول کر

ڈیوٹی اردلی کو دے گیا۔"

اب واقعات رونما ہونے لگے۔

ایک روز کرنل صاحب نے پریڈ بلائی جو ہتھیاروں کے بغیر جنازے کا جلوس معلوم ہوتی تھی۔ کرنل صاحب نے حالات پر جو روشنی تھی مزید روشنی ڈالی یعنی ملایا کی لڑائی ختم ہو چکی! اب ہم جاپانیوں کے تسلط میں ہیں۔ یہ آزمائش کا دور ہے جس کا سامنا حوصلے اور نظم و ضبط کے ساتھ کرنا ہے۔ اب ہم جاپانی افسروں کے حکم پر کام کریں گے۔ صوبیدار میجر صاحب نے جنگی قیدیوں کے طرز عمل سے متعلق ایک طویل ہدایات نامہ سنایا ایک شق اس مضمون کی تھی کہ جو قیدی فرار ہونے کی کوشش کرے گا اس کو گولی مار دی جائے گی۔ لیکن سرکاری حکم سنانے کے بعد صوبیدار میجر صاحب نے جو غیر رسمی مشورہ دیا وہ یہ تھا کہ قانون خواہ کچھ کہتا ہے، ہم قید سے بھاگنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ صوبیدار میجر صاحب نے یہ الفاظ کچھ اس جوش و جذبے سے کہے تھے کہ اگر مصلحت کا خوف غالب نہ ہوتا تو ہم با آواز بلند زندہ باد کا نعرہ لگاتے۔

دوسرے روز یونٹ کا تمام اسلحہ و بارود ٹرکوں میں لاد کر ایک جاپانی ڈمپ (DUMP) میں پہنچا دیا گیا۔ ہماری قید پر گویا آخری مہر ثبت ہو گئی۔ جاپانیوں کی نگرانی میں یہ سارا کام خود ہم نے کیا۔ آج ہمارے ہاتھ، ہمارے ہتھیار، ہماری گاڑیاں ان کے حکم پر چل رہی تھیں۔

میری مولنس و دمساز بندوق بھی جس کو میں نے ہمیشہ ہی ان کی طرح عزیز رکھا، جاپانیوں کے گودام میں ڈوب گئی اس کے چھن جانے پر میرا دکھ کسی بھائی بند کی موت کے صدمے سے کم نہ تھا۔ خاتمہ جنگ پر میں نے اسلحہ کے مختلف قبرستانوں میں اپنی بچھڑی ہوئی رائفل کو بہت ڈھونڈا مگر نا معلوم وہ جاپانیوں کے ساتھ کسی محاذ پر جا پہنچی تھی اور عام سپر اندازی میں انہوں نے کس محاذ پر کس فوج کے سامنے کہاں رکھ دی تھی؟

کچھ روز بعد سنگاپور بلدیہ کی عظیم الشان سیلیٹی عمارت کے سامنے کھلے باڈان (چمن) میں ایک بڑی پریڈ ہوئی جس میں سپراندازی کی رسم ادا کرتے ہوئے انگریز سپہ سالار نے جاپانی سپہ سالار کے سامنے رکھ دی معلوم اکا موقع پر انگریز جرنیل تلوار کہاں سے لایا کیونکہ مدت ہوئی تلوار کی حیثیت سے تلوار برٹش آرمی سے نکل چکی تھی۔ ہاں جاپانی فوج میں تلوار باندھنے کا رواج اب بھی موجود تھا۔

ہماری یونٹ اب بھی اسی زیر تعمیر ائیرپورٹ پر متعین تھی۔ پہلے ہم اس کی حفاظت کرتے تھے اب مشقت کرتے تھے۔ قیدی یونٹیں ضرورت و حالات کے مطابق ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔ ایک یونٹ جو قید کے وقت سنگاپور میں سڑک بنا رہی تھی آزاد ہونے پر بورنیو میں سڑک بنا رہی تھی۔ ہم لوگ اس معاملے میں خوش قسمت نکلے۔ راشن کے اسکیل کی طرح گو کام کی نوعیت اور مشقت کا اسکیل بدلتا رہا مگر شروع سے آخر تک ہم اسی ٹاپو میں پڑے رہے۔

جنگی قیدی عموماً قیدی کیمپوں میں رہتے تھے۔ ہاں جو لوگ انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے وہ باقاعدہ فوجوں کی طرح بارکوں میں رکھے گئے ان کی اپنی الگ تنظیم اور جدا ہیڈکوارٹر تھا۔ ہماری طبیعت ادھر آتی نہ تھی۔ ہمارا کرنل قید، افسر قید، سردار قید، ہم بھی قید۔ پاؤں کے زخم کی وجہ سے میں ابھی کسی ڈیوٹی کے لائق نہ تھا مگر ایک دن تڑکے

تڑکے حوالدار بنگش خاں دوڑا دوڑا آیا "علی بہادر خاں وردی پہن کر تیار ہو جاؤ ۔" اس نے حکم دیا ۔ گمگا استاد میرا پاؤں ۔ میں نے جواب دیا "پاؤں واؤں کچھ نہیں یارا" حوالدار بنگش خاں بولا " ڈیوٹی ایسا ہے کہ پاؤں سر پر رکھ کر بھاگنا پڑے گا ۔ ایکدم جانا پڑے گا ۔ ایم کرے "

" ایسی کیا ڈیوٹی آن پڑی ہے استاد " کوئی جاپانی کرنل ڈرائیور مانگتا ہے ۔ اپنا سب ڈرائیور ہمیشہ ڈسور رہا ہے وہ اسی وقت ایک دم ڈرائیور مانگتا ہے ۔ تم پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤ ۔ اللہ مالک ہے یارا ۔ جاپانی کرنل کا جیپ باہر کھڑا ہے ایک جاپانی اس میں بیٹھا ہے ۔ پانچ منٹ ۔ ۔ ۔ ۔ " اور حوالدار بنگش خاں عجلت کی سیٹی بجاتا ما جب کے پاس جا ٹھہرا ۔ میں نے فوراً جنگل گرین وردی پہنی ، شناختی کارڈ جیب میں رکھا ۔ تیاری کے طور پہ پاؤں کی پٹی کھول دی تاکہ زخم کا شگاف واشگاف نظر آئے ۔ پھر درو دیوار پر حسرت کی ایک نظر ڈالتے ہوئے جیپ میں جا بیٹھا جاپانی سپاہی مجھے دیکھ کر مسکرایا پھر کچھ بڑ بڑایا میری سمجھ میں خاک نہ آیا ۔ راستے میں کوئی بات چیت نہ ہوئی ۔ وہ کبھی کبھی میری طرف دیکھ کر مسکراتا ۔ میں بھی احتیاطاً تھوڑا تھوڑا مسکراتا ، ذرا ذرا سر ہلاتا رہا ۔ ہم اس کے اشارے پر چلتے گئے ۔

جاپانی کرنل ایئرپورٹ کے قریب ہی ایک چھوٹے سے دو منزلہ بنگلے میں رہتا تھا جیپ کی آواز سن کر نیکر پہنے ہوئے ایک ننگ دھڑنگ جاپانی برامدے سے برآمد ہوا ۔ میں سمجھا کرنل ہوگا ۔ لنگڑا کر جیپ سے اترا ۔ پاؤں جوڑ کر ٹھک سلوٹ کیا وہ مسکرایا تو میری جان میں جان آئی ۔ اشارے پر اس کے پیچھے پیچھے اندر ایک کمرے میں پہنچا جو بھائیں بھائیں کر رہا تھا جس سے شبہ ہوا کہ یہ کرنل کا کمرہ نہ تھا ۔ کرنل واقعی اوپر دوسری منزل میں رہتا تھا ۔ یہ ننگ دھڑنگ جاپانی میری طرح کا سپاہی تھا ۔

اب جاپانی سپاہی اپنے تھیلے سے گھڑی نکال لایا ۔ مجھ سے اشارہ کر کے پوچھنے لگا تمہارے پاس گھڑی ہے ۔ میں نے گردن اور ہاتھ نفی میں ہلا دیئے اس پر وہ تھیلے سے ایک پنسل نکال لایا گھڑی میرے سامنے رکھ کر بارہ کے ہندسے پر پنسل کی نوک رکھ دی پھر منہ سے موٹر اسٹارٹ کا ہارن بجایا ۔ پھٹ ۔ پھٹ ۔ پھٹ پٹ ۔ ٹیں ۔ ٹیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں سمجھ گیا کہ کرنل صاحب کو بارہ بجے موٹر کی ضرورت ہوگی ۔

پھر اس نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر مجھے دکھائی وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا ۔ اشاروں میں مجھ سے کچھ پوچھتا رہا ۔ غالباً میرے بیوی بچوں کی بابت پوچھتا ہوگا ۔ یہاں شادی تک نہ ہوئی تھی ۔ مگر اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کی خاطر ہم نے اسی فوٹو کی مدد سے ہاتھ کی انگلیوں کو اٹھا بیٹھا کر یہ بتانے کی کوشش کی کہ ہماری ایک بیوی اور تین بچے ہیں ۔

خدا معلوم وہ کچھ سمجھا بھی یا نہیں ، اتنے میں اوپر سے کرنل صاحب اتر آئے ۔ انہوں نے بھی صرف نیکر پہن رکھی تھی ۔ قد کاٹھ ، ڈیل ڈول بھی ویسا ہی ۔ پہلے اپنے سپاہی سے کچھ پوچھا ۔ پھر میرے قریب آئے ۔ ہاتھ ملایا ۔ زخم دیکھا تو پاؤں پہ جھک گئے ۔ اور میچ میچ کرتے رہے پھر گھڑی پر بارہ کا ہندسہ دکھا کر منہ سے موٹر کا ہارن بجاتے اوپر چلے گئے ۔ کرنل کے جانے پر میری طرح جاپانی سپاہی نے بھی اطمینان کا سانس لیا ۔ مگر چند سانس ہی لیے تھے کہ چوبی

جاتی تھیں۔ اب ان سے بھی محروم ہونا پڑے گا حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ دوسرے دن ہم اپنا مختصر سا بستر مچھر دانی کٹ بیگ اور حرالدار بگش خان کا مشہور و معروف حقہ مانگ کر بنگلے پر آ ڈٹ آئے اناد بی نے حقے کو نیچے سے اوپر تک بڑے غور سے دیکھا۔ میں نے حسبِ توفیق اس کی تکنیک سمجھائی۔ مشین چالو کر کے دکھائی۔ کرنل نے حقہ دیکھا تو ارشاد ہوا کہ یہ چیز یہاں نہیں چلے گی۔ چنانچہ اسی شام حقہ واپس اپنے تھان پر پہنچ گیا۔

اب میں رہتا تو بنگلے پر تھا مگر دونوں وقت کا کھانا بدستور لنگر پہ جا کر کھاتا۔ یہ دراصل بھائی بندوں سے ملنے اور حقہ پینے کا بہانہ تھا ورنہ بنگلے پر کھانے کی کوئی کمی نہ تھی۔ چاول، چائے، چینی، کافی، مکھن میوہ ہر چیز بہ افراط آٹھویں، دسویں کرنل کی ماں (وہ ابھی گزارہ تھا) جاپان سے تحائف کی ٹوکری بھیج دیتی۔ اناد بی با اختیار مختار کار تھا اور طبعاً نیک دل آدمی خود بھی کھاتا ہمیں بھی کھلاتا۔ مگر ہم نے اپنے لنگر کا دامن نہ چھوڑا بلکہ وقتاً فوقتاً یہاں سے چینی چائے لنگر کو سپلائی کرتے رہے۔

ابتدا میں کچھ عرصہ زبان کی دقت ضرور حائل رہی۔ مگر مرورِ وقت کے میل جول سے افراد لی لمیعتیں سمجھ میں آگئیں تھیں اس لیے اشاروں اشاروں ہی میں بول چال کی ایک زبان آپ ہی آپ تخلیق ہو گئی تھی۔ کئی جاپانی الفاظ خود بخود زبان پر چڑھ گئے تھے۔ لیکن کرنل اس صورت حال سے مطمئن نہ تھا۔ چنانچہ ایک دن وہ کہیں سے ایک جاپانی سارجنٹ کو پکڑ لایا جو رومن اردو جانتا تھا۔ وہ روزانہ ڈیڑھ دو گھنٹے رومن حروف میں مجھے جاپانی پڑھانے لگا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر کہ نہ معلوم یہ قید کب تک چلے، جی جان لگا کر جاپانی سیکھنی شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں فرفر جاپانی بولنے لگا۔ اس دوران میں ایک دلچسپ لطیفہ ہوا۔ میں اپنی یونٹ سے رومن اردو کی ایک کتاب اٹھا لایا تاکہ مانوس اسباق کا ترجمہ جاپانی میں پڑھ سکوں۔ کتاب کے جملہ اسباق سرکار انگلشیہ کی برکات سے بھرپور تھے۔ سارجنٹ نے مطالب کو سونگھا تو کتاب یہ کہہ کر باہر کھیت میں پھینک دی کہ یہ بکواس تو میں کبھی نہ پڑھاؤں گا۔

میں قید کی پوری مدت اسی بنگلے پر رہا۔ نچلی منزل میں پہلے اناد بی پھر منشی سے رفاقت رہی۔ کرنل مجھ پر ہزار مہربان سہی لیکن میرے اصل معاصرین یہی دونوں تھے۔ اناد بی تیز طرار، طرحدار، حالاتِ حاضرہ سے باخبر نوجوان تھا۔ سیر سپاٹے کا شوقین۔ وطن میں کسی لڑکی سے معاشقہ بھی چل رہا تھا۔ جس کو وہ تقریباً روزانہ ایک کافی طویل خط لکھتا۔ محبوبہ کا خط آتا تو کئی کئی روز ایک عجیب خمارِ مسرت میں اٹھا اٹھا پھرتا۔ باجا بجاتا۔ گھومتا گاتا، ناچنا کودتا۔ رات کو عموماً اپنی محبوبہ کی تصویریں پھیلا کر بیٹھ جاتا۔ ایک ایک کو دس دس زاویوں سے دیکھتا۔ مجھے دکھاتا۔ داد کا طالب ہوتا میں واہ وا کے دو نگڑے برساتا۔

ہماری گفتگو زیادہ تر جاپان اور انڈیا کے بارے میں ہوتی۔ مجھ سے انڈیا کی باتیں پوچھتا۔ عقیدہ، رسم و رواج، کھانا پینا، عشق و محبت ہر موضوع پر بحث رہتی۔ اس کو ان باتوں کا چسکا تھا۔ ادھر مجھے اس طرح کی گفتگو کی قطعاً کوئی ٹریننگ نہ تھی۔ بہرحال اس کے شوق کا ساتھ دے رہا تھا جو کچھ جیسا سمجھ میں آتا کہہ دیتا۔

بعد میں تو میں حوالدار منشی خان سے حالات حاضرہ اور کوائف ملکی کا باقاعدہ درس لینے لگا تاکہ انادیمی سے کچھ تو برابر کی چوٹ رہے باتوں کا ماحصل عموماً ایک مشترکہ حیرت ہوتی۔ اسے انڈیا پہ مجھے جاپان پہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے ناواقف تھے۔ لیکن یہ سب رات کی بات ہوتی تھی۔ دن کو اس کے تیور بدل جاتے۔ کیا مجال کہ ڈیوٹی میں ایک آنچ کی کسر رہنے دے جاپان کی جنگ کو اپنی ذاتی جنگ سمجھتا۔ شہنشاہ کے لیے تن من دھن ہر چیز قربان کر دینے پہ ہر وقت آمادہ ڈیڑھ دو برس کی یکجائی کے بعد انادیمی کو برما کے محاذ پہ جانا پڑا اور پھر اس کی کوئی خبر نہ آئی۔

منشی، جس کو ہم منشی کہتے، نسبتاً خاموش طبع آدمی تھا۔ دن بھر کام میں جٹا رہتا۔ انادیمی کے مقابلے میں اس کا جسم زیادہ گھٹا ہوا تھا۔ لہجے میں ویسی ملائمت بھی نہ تھی۔ ورزش کا شوقین۔ مگر ساتھ ساتھ مصوری بھی کرتا۔ ایک دفعہ قومی کھیلوں کے تذکرے میں میں نے اپنے ہاں کی کبڈی کا نقشہ کھینچا تو اس کھیل پہ ایسا فریفتہ ہوا کہ ہفتے میں ایک دو بار مجھ سے کبڈی ہونے لگی۔

میرے لیے یہ بڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا۔ اگر میں اس کو پچھاڑ دیتا تو اس طرح غضبناک ہو جاتا جیسے ایک ملک نے دوسرے ملک کی توہین کر دی ہو۔ زخمی شیر کی طرح جھپٹتا اور جب تک مجھے پچھاڑ کر زمین پہ خوب رگڑ نہ لیتا اسے چین نہ آتا۔ اگر میں دو تین پالیاں لگا تار ہار جاتا تو الگ خفا ہوتا کہ میں اس کو اسپورٹس مین نہیں سمجھتا ناراض ہو کر کہتا —

"میں اس جیت کو شکست سے بدتر سمجھتا ہوں جو رعایت سے حاصل ہو۔ اگر تم نرمی سے کام لوگے تو میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش آؤں گا۔" چنانچہ جب تک میں اس کو پچھاڑ کر زمین پہ اچھی طرح سے رگڑ نہ لیتا اس کی خفگی دور نہ ہوتی۔ جسم سے دھول جھاڑتا، اٹھتا، اٹھ کر شاباش دیتا کہ میاں جیتے رہو۔ کیا پکڑ ہے، کیا چھل بل ہے۔ واہ وا، کیوں نہ ہو، آخر انڈیا کے چیمپئن ہو۔ گویا وہ کبڈی میں انڈیا کے چیمپئن کے مقابلے میں ہارا تھا اور میں بھی چیمپئن بنا ہوا تھا۔

اپنی خاموشی کے باوجود، راتوں کو قدرے چہک بھی اٹھتا۔ بال بچے دار آدمی تھا۔ اکثر اپنے بال بچوں کی یاد میں گانے لگتا۔ میں یونٹ سے ایک دوتارا اٹھا لایا تھا۔ مجھ سے دوتارے پہ سیف الملوک کے بیت سنتا۔ سیف الملوک کے بیت سنا دینا تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ مشکل بات یہ تھی کہ شعروں کا جاپانی میں ترجمہ کرنا پڑتا، جو جیسا کیسا میری سمجھ میں آتا میں کر دیتا۔ ترجمہ سن کر بڑا حیران ہوتا۔ کہتا تمہارے شاعر تو بالکل ہمارے شاعروں کی طرح باتیں کرتے ہیں اور سناؤ ..... اور سناؤ"

رفتہ رفتہ سیف الملوک کے ابیات سے اس کی یہ دلچسپی میرے لیے اچھا خاصا وبال بن گئی۔ ہر روز میں نئے نئے شعر کہاں سے لاتا۔ سخت گھبرایا۔ حوالدار منشی خان سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو وہ ہنس کر بولے

"علی بہادر تم جیسا احمق بھی شاید ہی کوئی ہو۔ پچھلے شعر پرانے سناؤ۔ ترجمہ نیا بتاؤ" یہ نسخہ دانش کارگر ثابت ہوا۔ بلکہ بعد میں ایک آسانی یہ نکل آئی کہ منشی شعر سنتا ہی نہ تھا۔ صرف ترجمہ سنتا تھا۔ اس کو دو۔ اصل

میرا گانا پسند ہی نہ تھا اس کو صرف دو تارے کی موسیقی سے رغبت تھی یا شعر کے معنی سے۔ چنانچہ اب میں دو تارے پر اس کو اشعار کا ترجمہ سناتا۔ "پچھیئے کنوار گندلے سے لے کر" چھٹی رَن گئی لبھرے فولا گئی" تک کی پنجابی لوک گیتوں، سی حرفیوں کا ترجمہ میں نے دو تارے پر سنا ڈالا۔

کرنل کا سلوک شروع ہی سے مشفقانہ تھا۔ زبان کی دشواری دور ہوئی تو میں اس کے زیادہ قریب ہو گیا میں روانی سے جاپانی بولتا تو وہ بڑا خوش ہوتا۔ افسروں کے سامنے مجھے فخریہ پیش کرتا۔ میں جاپانی بولتا وہ تالیاں بجاتے نہ جانے کتنے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ میں جاپانی بول گیا۔

طبعاً کرنل کم گو، تنہائی پسند شخص تھا۔ ڈیوٹی کے بعد کم ہی گھر سے نکلتا۔ باغبانی اور مطالعہ بس یہ دو ہی مشاغل تھے۔ دفتر سے آتا تو گھنٹوں باغبانی کرتا۔ کتاب ہر وقت ہاتھ میں رہتی۔ راتوں کو دیر تک باہر گھومنے کا عادی بھی نہ تھا۔ کوئی دعوت پارٹی ہوتی تو عموماً خود ہی گاڑی لے جاتا۔ میں ساتھ ہوتا تو میرے کھانے پینے کا بڑا خیال رکھتا۔

باغبانی سے اس کا شغف دیکھ کر میں اکثر اس کا ہاتھ بٹانے لگ جاتا۔ اس پر بڑا خوش ہوتا۔ گھل مل کر چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا ایک روز پوچھا۔

"تم لوگ پھول اگاتے ہو؟" میں نے جواب دیا۔ "ہاں ہمارے ہاں تو پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ اور تو پھولوں سے عشق ہے۔ میں نے خود اپنے گھر کے آگے پیچھے طرح طرح کے پھول لگا رکھے تھے۔ نا معلوم اب وہ کھلتے ہیں یا مرجھا چکے ہیں" اور پھولوں سے اپنے عشق کے ثبوت میں مجھے پہروں سنگاپور کے اس گرم مرطوب بنگلے کے لان میں پھاوڑا چلانا پڑتا۔

ایک روز کرنل اور میں پھلواری میں ٹماٹروں کی پنیری سیٹ رہے تھے کہ کرنل بولا۔

"تمہارا نام تو ہم نے پوچھا ہی نہیں"

"میرا نام علی بہادر خاں ہے"

"یہ تو بڑا مشکل نام ہے۔ یہ تو انڈیا جتنا لمبا نام ہے۔ یہ نام نہیں چلے گا۔ آج سے تمہارا نام جروسان ہے۔ آج سے تم نپن ہو"

اور پھر کرنل نے مجھے پکارا "جروسان"

"جناب عالی" میں جروسان بن گیا اور پھر دوسرے دن جاپانی ٹوپی ڈانٹ کر باقاعدہ "نپن" بن گیا جو میرے لیے بڑا فائدہ مند ثابت ہوا۔ میں ایک بالکل ہی عام قیدی تھا۔ مگر کرنل نے مجھے جنگی قیدیوں کے جاپانی ہیڈکوارٹر کا امتیازی بلا دے دیا جس کو بازو پہ باندھ کر میں ہر جگہ بلا روک ٹوک گھوم سکتا۔ دوسرے قیدی مجھے رشک کے علاوہ کبھی کبھی خوف کی نظروں سے بھی دیکھتے۔

یہ سب "نپن" ہونے کی برکتیں تھیں۔

آئی این اے میں بھرتی کا بڑا زور تھا ایک دن کرنل کہنے لگا جردسان تمہارا کیا خیال ہے؟ میں اس سوال پر سخت گھبرایا مگر یہ کہیئے کہ یہ بات بروقت سوجھ گئی۔ فوراً جواب دیا "مجھے آئی۔ این۔ اے میں شامل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو نپن۔ ہوں" یہ سن کر کرنل اس زور سے ہنسا کہ اس بے ساختہ پن کے ساتھ اس کو میں نے کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ بولا "ہاں ٹھیک ہے۔ جردسان نپن ہے"

ایک دن دفتر میں بلا لیا۔ طبیعت کچھ مکدر نظر آئی۔ پیشانی پر بل تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ سوچا شاید رنگون کی طرف سے شکست کی خبر آئی ہے۔ ایسی خبر آتی تو ملایا کے تمام جاپانیوں کا موڈ سخت برہم ہو جاتا تھا۔ کہنے لگا "جردسان ہم پوچھتے ہیں تم محمد ہو یا گاندھی؟" (مطلب یہ تھا کہ مسلمان ہو یا ہندو) اس پر میں نے تمام حقیقت کھول کر بیان کی۔ سن کر بولا۔ ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔ ایک قیدی کیمپ میں چند محمڈن ایک آوارہ گائے کاٹ کر کھا گئے ہیں۔ اس پر گاندھی لوگ شور مچا رہے ہیں" اس واقعہ کے بعد جب ضرورت پڑتی وہ ہندو، مسلمانوں کے مذہبی عقیدوں کے بارے میں پوچھتا رہتا۔ ظاہر ہے کہ میں عالمانہ باتیں تو نہ کر سکتا تھا۔ غلط بیانی کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا۔ جہاں تک ممکن تھا میں دونوں فرقوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دلوانے کی کوشش کرتا۔ یہ بات بھی بتا دیتا کہ انڈیا میں گاندھی والوں کا سلوک ہم محمڈن والوں سے اچھا نہیں ہے۔

کرنل میرے گھر بار، بال بچوں کے بارے میں بھی اکثر پوچھتا۔ میں چونکہ ایک بیوی اور تین بچے شروع میں بتا چکا تھا۔ لہٰذا دل سے جوڑ جوڑ کر بیوی بچوں کی شکلوں اور عادتوں پر روشنی ڈالتا رہتا۔ بیوی بچوں کا ذکر کرتے ہوئے بعض اوقات میری آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے۔ کیونکہ دراصل جب میں بیوی بچوں کا ذکر کرتا تو میری آنکھوں کے سامنے اپنے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کی شکلیں آ جاتی تھیں۔ میرے آنسو دیکھ کر کرنل مجھے بہت سی تسلیاں دیتا اور کہتا "دیکھو ہماری بیوہ ماں بھی پیچھے بیٹھی ہے" یہ دل میں کہتا میں بھی اپنی ماں کو ہی یاد کر رہا ہوں۔ کچھ عرصے سے یہ افواہیں تو سن رہے تھے کہ اتحادیوں کا پانسہ پلٹ رہا ہے۔ جرمنی دم توڑ چکا تھا۔ برما میں جاپانیوں کے قدم اکھڑ رہے تھے۔ مگر ہم قیدیوں کا اوڑھنا بچھونا صرف افواہیں تھیں۔ گرد و پیش کو دیکھے تو ملایا میں بیشمار جاپانی فوج کیل کانٹے سے لیس پڑی تھی۔ جس کا بقول شخصے، ہنوز بال تک بیکا نہ ہوا تھا ان کے حوصلے بھی ابھی تک بلند تھے۔ کم از کم ہمیں تو کسی بے چینی کے آثار نظر نہ آتے۔ ان حالات میں اگرچہ ہم دل میں جاپانیوں کی شکست کی آرزو تو ضرور کرتے تاکہ دوبارہ وطن کے ساحلوں اور کھیتوں کی رونق دیکھ سکیں۔ مگر صورت حال کا کوئی قطعی علم نہ تھا۔ کیونکہ جو ریڈیو ہمارے ارد گرد گو بجتے تھے ان کی رو سے "نپن" کا ہر قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ مایوسی کے لمحات میں کبھی کبھی سوچتا شاید بقیہ عمر عزیز اسی بنگلے کے لان میں گوبھی ٹماٹر بونے میں گذر جائے گی۔

ایک دن اسی حزینہ کیفیت میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اچانک کرنل میرے کمرے میں آ گیا جناب نے تمغوں سمیت پوری وردی پہن رکھی تھی۔ نقش و نگار کی تلوار ہاتھ میں تھی۔ میں سمجھا کسی تقریب یا پریڈ میں جا رہے

ب ۔ دیکھا تو کرنل کا چہرہ متغیر نظر آیا میرے قریب آکر باقاعدہ فوجی انداز میں مجھے سلام کیا اور تلوار کھینچ کر
رے سامنے بڑھاتے ہوئے بولا ۔

وجے دوسان ہم لڑائی نہیں ہارا مگر جنگ ہار گیا ۔ شہنشاہ نے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا ہے جے دوسان آج
تمہارے قیدی ہیں "

اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو آنسو نکل کر تلوار کے چمکتے ہوئے پھل پر پھیل گئے ۔ یہ اپنی
چانک آزادی پر بے پایاں مسرت کے آنسو تھے یا کرنل کی مروت پر احسان مندی کا نذرانہ میں کچھ
یں کہہ سکتا !

OO

دائرے

رُوحی بانو

ہر دفعہ جب بھی میں اپنے آپ کو ٹی۔ وی کی چھوٹی سی سکرین پر دیکھتی ہوں تو... کھو سی جاتی ہوں۔ اُن خوابوں کی دنیا میں کہ جہاں مجھے ہونا چاہیئے تھا لیکن میں یہاں ہوں حقیقتوں کی چھوٹی حقیقتوں کی اس چھوٹی سی دنیا میں۔ گنے چُنے لوگوں کے چھوٹے سے مجمع میں۔ ہم سب نے ایک دوسرے کو اپنی محدود سوچوں کے ساتھ گھیر رکھا ہے۔ ہم سب کتنے قریب ہیں کہ کوئی بھی محفوظ نہیں ظاہر ہے یہ تو انسانی فطرت ہے۔ خود سے زیادہ حسین بُت کو توڑ دینا۔

○●○

میری وقعت میری حقیقت کا ڈُوبتا سورج، الٹو رسی امیدوں اور خوابوں کا سُرخ تھال دریا کنارے مُرجھائے سے سر جھکائے سے درختوں کی شاخوں کو جلانے لگا ہے۔

دھول اُڑاتی سڑکوں پر دھول میں غرق کچھ لوگ، پُل پر کھڑے دریا کے ساکن پانی پر ڈُوبتے اُبھرتے آگ کے دائرے، سوچ سے خالی لیکن پُر نظارہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں — انتظار کر رہے ہیں..... اتنے میں ایک چھوٹا سا بچہ بھاگتا ہُوا آیا جو اس کٹہرے سے پُل کے جنگلے کی سلاخوں کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا پھر جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اُس نے ایک سنگریزہ ان ساکت پانیوں میں پھینکا اور پھر پانی کی لہروں جیسی ہنسی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

○●○

میں پچھلے چند سالوں سے کچھ زیادہ ہی مشہور ہو رہی ہوں یہاں پر بہت سے دشمن یا پیدا ہو گئے ہیں یا جو پہلے سے تھے ظاہر ہو گئے۔ لیکن میں حیران ہوں۔ میں پہلے کی طرح

رف زدہ نہیں ہوں۔ میرا دل دماغ بکھرنے نہیں لگتا اب۔ ایک ہوا سے ہلکی زہریلی سی خلش
نے سمیٹ رکھا ہے مجھے۔

مجھے چہروں کی پہچان آگئی ہے اب۔ لیکن اب بھی میں اُن کی مسکراہٹوں کو جھوٹ
نہیں سمجھتی۔ اِن پلاسٹک کے چہروں کے اندر "زندہ" آنکھیں اب بھی مجھے کھینچ لیتی ہیں
پنی طرف۔ میں بُرائی سے نہیں ڈری کبھی۔ کبھی اس کی اسیر نہیں ہوئی۔ میں نے ہمیشہ اچھا پہلو
ی تلاش کیا ہے دُوسرے میں۔ کسی کی بُرائی کو 'اپنی' بُرائی سے اُکسا کر دو آتشہ کیوں
رتے ہیں لوگ۔

میں صرف ایک چہرہ دیکھتی ہوں اور وہ بہت حسین اور پیارا ہے۔ انسان کا صرف
ایک ہی چہرہ ہے جو ماں کی کوکھ میں شکل پاتا ہے۔ اس شکل کو ماں دیکھتی ہے یا میں دیکھتی
ہوں۔

○●○

آج کل کے ماحول میں بلیک میلرز کی کمی نہیں۔ دوسروں کی سچائیوں کو جھٹلانے کی دبی دبی
دھمکیاں یا اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتی ہیں ایک دوسرے کو۔

سچائیوں اور صداقتوں کی یہ حرص بھری دوڑ ہمیں بالآخر جھوٹ کی طرف لے جاتی
ہے بلکہ اس سے بھی آگے اخلاقی انحطاط کی طرف۔ ایسا کیوں کرتے ہیں یہ سچ کی کھوج لگانے
والے؟ دوسروں کی صداقتوں کو پرکھنے والے؟ یہ کون ہیں؟

یہ 'سچ' اور سچائیوں کا کھوج لگانے والے، شکاری کُتّے نہیں۔ جن کو ہر وقت
کہیں نہ کہیں سے، کسی نہ کسی میں بُرائیوں کی بُو آتی رہتی ہے۔

خدا کے لیے، کبھی تو یہ دوڑ، یہ "آنکھ مچولی" چھوڑ دیں۔ یہ "پکڑ" یہ احتساب
چھوڑ دیں اور موقعہ دیں اُن مجرموں کو خود احتسابی کا۔

یہ کیا کہ آج تک "سزا" دوسرے نے ہی دی۔ یہ بانٹ جُرم اور سزا کی، ایک نے
جُرم کیا تو سزا دوسرے نے ہی دی۔ دراصل یہ بانٹ، قوموں میں، انسانوں میں محبت کی بجائے
نفرت اور تعصب پھیلاتی ہے۔

○●○

مجھے عادت نہیں مجھ پہ عائد الزاموں کی تردید کرنے کی۔ یہ عادت ہمیشہ سے ہے

اور رہے گی۔ حالانکہ یہ بہت غلط عادت ہے۔ لوگ تو ہمہ وقت ہمہ تن محاذ آرائی پہ ڈٹے رہتے ہیں۔ محاذ آرائی بھی اپنے دفاع کے لیے۔

لیکن مَیں ایک ایسی شخص ہوں کہ جسے اپنا دفاع کرنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ کتنی مضبوط اور کتنی غیر محفوظ ہوں مَیں۔ مَیں ایک جارحانہ ماحول میں ہنستے ہاتھوں بڑی فراخدلی سے ہر ایک سے ملتی ہوں ہر جگہ ہر کہیں گھومتی پھرتی ہوں۔ مجھے کیا اپنے دفاع کی ضرورت نہیں ؟ یا دفاع کے تصور سے ہی ذہن عاری ہے میرا۔

مَیں تو پیدا ہوئی جیسے صرف محبت کے لیے۔ میرے سینے کے تاریک اندھیروں میں ایک قندیل روشن ہے۔ اس نحیف سے جسم میں ایک قوی ہیکل رُوح مقید ہے۔

○●○

مَیں آخر کب تک 'ظلم'، 'مظلومیت'، اور 'انصاف'، 'سچ جھوٹ' اور 'حقیقت' کے مروّجہ لفظوں پر یقین کرتی رہوں گی۔ یہ سب مروّجہ اور بڑے بڑے 'لفظ' میرے ذہن کو گھن کی طرح کھا گئے ہیں اور دل اُن کی جہنمی آگ میں سُلگتا رہتا ہے۔

کسی کو یہ زعم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر ظلم کر کے اپنا حق اُن سے 'چھین' سکتے ہیں۔ کوئی ظلم سہہ رہا ہے اور سہتا چلا جاتا ہے اور کسی کو یہ وہم ہے کہ وہ 'انصاف' کر رہے ہیں اور وہ انصاف کرتے چلے جاتے ہیں۔

یہ تینوں فعل کتنے غیر فطری ہیں انسان اِن سے بالا ہے۔

یہ تینوں منفی ردِّ عمل ہیں غیر فطری عمل کے۔

یہ معاشرے کی غیر محفوظ اور بھیڑ کی زندگی کے ردِّ عمل ہیں۔

لیکن ہم میں سے کسی میں اتنا ظرف نہیں کہ وہ ایک دن اکیلا بیٹھ کر خالی ذہن سے یہ سوچے کہ ہم صرف ان تین رویّوں کے جال میں جکڑ کر کیوں رہ گئے ہیں؟ نفرتوں سے پاک خالی دل سے اس انسانوں سے بھری دنیا میں پھیلی محبتوں کو محسوس کر کے۔ خوابوں اور خیالوں سے پاک خالی ذہن سے انسانی زندگی کے نئے نئے رویّوں کو تشکیل دے سکے۔ اور پھر جھوٹی اَنا سے پاک ضمیر جاگ اُٹھے تو دوسروں کے دُکھ ہمیں بہت دُکھ دیتے ہیں۔

○●○

"زندگی" سے جتنا مَیں ڈرتی رہی ہوں اور جس قدر اسے چاہتی رہی ہوں۔ وہ ڈر، خوف

سچ نکلا۔ جو میں نے چاہا وہ سراب نکلا، یہ اب پتہ چلا۔ BASICALLY زندگی کتنی ادھوری چیز ہے، جسے موت آکر مکمل کرتی ہے۔

لیکن ساری زندگی ہم "زندگی کو سمیٹتے رہتے ہیں۔ ہر دفعہ نئے سرے سے۔ ہر بار اقرار ہوتا ہے۔ وہی صدیوں پرانا قول مانگتے ہیں زندگی سے "زندگی" کا۔ اور ہر بار پرانے ٹوٹے ہوئے عہد و پیمان یاد آجاتے ہیں۔ یاد آجاتے ہیں تو اور پاگل دیوانوں کی طرح دوڑتے ہیں زندگی کی طرف۔

شاید! زندگی تو وہی چند گھڑیاں تھیں جو تم نے گزار لیں۔ جو تم جی چکے۔ زندگی نے تو اپنا "قول" پورا کیا اور عہد و پیمان کے بندھنوں سے آزاد بھی ہو چکی۔ اب تم کسے ڈھونڈتے پھر رہے ہو پاگلوں کی طرح؟

نہ اتنے حریص مت بنو۔ "سمیٹ" لو اُسے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اور لوٹ جاؤ اُدھر جدھر سے آئے تھے۔ تمہاری عمر بڑھ جائے گی۔

○●○

"محبت" کرنے والا، آدمی جب بھی بھاگتا ہے، تو زندگی کی طرف بھاگتا ہے۔ وہ موت کو کبھی بھی کسی صورت میں بھی نہیں قبول لتا۔ اُسے کسی رنگ، کسی شکل، کسی حالت میں "زندگی" سے عشق ہے۔

جب انسان موت سے "بھاگتا" ہے تو کتنا DESPERATE اور دیوانہ بن جاتا ہے۔ اس میں کس قدر تندہی اور تیزی آجاتی ہے۔ طوفان کی طرح بے صبر اور بے چین۔ کنارہ نظر آجائے تو اس کی بے چینی، بے صبری اور بڑھ جاتی ہے۔ لیکن موت سے بھاگتے بھاگتے ایک دن وہ تنِ تنہا رہ جاتا ہے۔ لیکن وہ مطمئن ہے کہ اُس نے موت کو قریب نہ آنے دیا۔ موت اُسے تاابد ڈھونڈتی رہے گی اور وہ تاابد "زندگی" رہے گا۔

یہ ویران ٹوٹے کنارے، جگہ جگہ دراڑیں، چٹانوں میں شگاف، یہ تباہی طوفان کی بے صبری اور تندہی نے کی۔

وہ طوفان کو ڈھونڈنے نکلتے ہیں۔ اور طوفان تو اُن کے پیچھے دبے پاؤں آرہا ہے۔ خاموش! لیکن بھرپور۔

وائے قسمت! وہ دیکھو، تھکا ہارا طوفان ٹوٹے کناروں کو گلے لگا رہا ہے۔

وہ دیکھو، دراڑوں سے پانی واپس جا رہا ہے۔

○●○

جس طرح انسان "ہونے" "نہ ہونے" کی دو دنیاؤں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی اس زندگی میں اچھائیوں اور بُرائیوں کے اندھیرے اور روشنیوں میں کبھی "ادھورا" کبھی "سر تا پا" تصویر بنتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک بات ہے۔ ہر حال میں ہر حالت میں زندہ رہتے ہیں۔ "زندگی" شرط ہے ہر عظمت اور تکمیل کے لیے۔ اُسی طرح جینا پڑتا ہے ہر ظلم، ہر گناہ ہر بُرائی کے لیے۔

○●○

زندگی مقتل کدوں سے نکل کر ہسپتالوں میں داخل ہو چکی۔ آج کل تو "لاعلاج" امراض کا دَور ہے۔ ہر دوسرا آدمی لاعلاج مرض میں مبتلا اور ہر تیسرا آدمی بسترِ مرگ پر۔ بسترِ مرگ ہم اپنے اپنے کندھوں پر اُٹھائے، ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ بڑے بڑے سرکاری دفاتر ہوں یا کاروباری ادارے یا کارپوریشنز، کھیل کے میدان ہوں یا گھر۔

مجھے خوشی ہے کہ مجھے کم از کم اتنا شعور ہے کہ اس پھیلی ہوئی گنجان زندگی پر پھیلتا ہُوا موت کا "سایہ" مجھے نظر آتا ہے اور مَیں نہیں ڈرتی۔ افسوس ہے تو صرف اِس بات کا کہ یہ پھیلتا ہُوا موت کا "سایہ" لاعلاج ہے۔

○○

ایک لڑکی کا خط

سیفو

تم نے ٹھیک کہا تھا کہ ہماری محبتیں اور تمہاری محبتیں ایک دوسرے کو سنگسار کر دیں گی اور یہ بھی کہ سنگساری کا عمل شروع ہو چکا ہے میرے بدن پر پتھروں کے نشان نہیں ہیں، نہ لہو کا کوئی قطرہ۔ یہ عجیب سنگساری ہے کہ جہاں پتھر پڑتا ہے، جسم کے ساتھ پیوست ہو جاتا ہے، یوں میں اپنی جگہ پر ایک پتھریلی چٹان بنتی جا رہی ہوں اور میرے بدن کا گلستان ایک صنم کدہ ہو رہا ہے ایک طرح سے تو یہ بھی بہتر ہی ہوا، ورنہ اس طوفان بلاخیز میں میں تنکے کی مانند بہہ جاتی۔ ان پتھروں نے مجھے زمین کے ساتھ باندھ رکھا ہے لیکن اب میں مجموعۂ اضداد ہو گئی ہوں۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو، اور کاش تم بھول ہی جاؤ، تم مجھے مجموعۂ اضداد کہا بھی تو کرتے تھے باہر سے سنگِ خارا لیکن اندر سے نرم جھرنوں کا شفاف پانی۔ ہر نئے پتھر پر مسکراتی ہوں۔ ہنس کے ٹالتی ہوں لیکن کون جانے اس سنگساری سے میں ہر لمحہ ٹوٹ رہی ہوں۔ بدقسمتی تو یہی ہے کہ ٹوٹ نہیں چکتی۔

شادی کو ایک ڈیڑھ مہینہ تو ہونے کو آیا ہے۔ میرا شوہر بڑا سادہ دل ہے، بڑا سادہ مزاج مجھے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ میرے ہونٹوں کی جنبش پر اس کا سرِ تسلیم خم ہو جاتا ہے۔ لیکن میں اس سے چاہتی بھی ہوں تو کیا محض تنہائی! میری آنکھوں سے خاموش پکار ہر وقت پھوٹا کرتی ہے یہ پکار میرے پورے وجود میں گونجتی ہے جیسے گہرے کنویں میں پتھر گرا دو تو کنواں بولے۔ لیکن کنویں کی زبان کون سمجھے یہ تو وہی سمجھے جو باہر سے تشنہ کامی کا مداوا کرے اور اندر سے خزاں رسیدہ پتوں کا مقبرہ بنا ہو۔ ہاں تم سمجھو گے! آخر تم کیوں نہ سمجھو گے؟

قدرت مجھ پر مہربان ہے، لیکن خدائے محبت مجھ پر خفا۔ لوگ میری خوش قسمتی پر مجھے مبارکباد دیتے ہیں۔ میں ہنس کے چپ ہو جاتی ہوں۔ بڑا خوبصورت گھر ہے میرے سسرال کا میں اس گھر میں دلہن بنی مورنی کی طرح اٹھلاتی پھرتی ہوں۔ میری ساس ہر قدم پر میرا صدقہ اتارتی ہیں لیکن اچانک مجھ پر گمان کی وحی نازل ہوتی ہے اور مجھے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ یہ سب فریب ہے، دھوکا ہے۔ یہ میرا گھر

نہیں ہے۔ کہیں اور، کوئی اور گھر ۔ میرا اپنا گھر ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے بلاتا ہے۔ بے در و دیوار سا گھر مجھے آوازیں دیتا ہے۔ وہ گھر جس کی بنیادوں میں ہم نے پر شوق نگاہوں سے کئے ہوئے عہد و پیمان بھر دیئے لیکن جس کی دیواریں اٹھنے سے پہلے ہی، ایک کالی تیز منحوس آندھی کا شکار ہوکے ہم بچھڑ گئے۔ وہ سب زمرّدیں سبزہ زار جو ہمارے قدموں کو چومتے تھے، جل کر خاکستر ہو گئے۔ وہ سارے گھنے سایہ دار مہربان درخت جن کے تلے ہم نے محبت کو خود میں سرائیت کرتے ہوئے محسوس کیا، خزاں رسیدہ ہو گئے۔ اب ان کے پتّے نغمے نہیں گاتے، نوحے سناتے ہیں اور ابر کے وہ ٹکڑے جو ہم دونوں پر سایہ فگن رہتے تھے پھٹے ہوئے دوپٹے کی دھجیاں بن گئے ہیں۔ اے خدا! پوری کائنات پر کیا بیتی؟

جب ایسی سوچ آتی ہے تو میری پور پور میں زہر اترنے لگتا ہے۔ میں خود سے خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ میں ڈرتی ہوں کوئی خطرناک قدم نہ اٹھالوں۔ ایسا نہ ہو کہ میں گھر سے نکلوں اور دیوانہ وار بھاگتی ہوئی تمہاری دہلیز تک آن پہنچوں۔ لیکن میں اپنی عقل و شعور کے ہاتھوں سخت عاجز ہوں۔ کاش کبھی مجھ سے یہ دیوانگی ہو سکتی۔

میرے شوہر کو یہ شکایت ہے کہ میں ہمیشہ کھوئی رہتی ہوں۔ کبھی وہاں موجود نہیں ہوتی جہاں ہونا چاہیئے وہ جب مجھے گلے سے لگاتا ہے تو اس کی پشت پر میری دونوں باہیں کھلی رہتی ہیں۔ میرے ہاتھ تمہارے ہاتھوں کو تلاش کرتے ہیں، میری باہیں تمہاری گردن کو، اور پھر ان بھٹکتے ہوئے ہاتھوں کو میں مایوسی سے گرادیتی ہوں، اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں سے دو آنسو لوٹ کے میری آستین میں جذب ہو جاتے ہیں۔ میں کبھی بھی تو اس کے پاس نہیں ہوتی۔ میں بڑی کھرّی اور سچی لڑکی رہی ہوں۔ دوغلا پن مجھ سے کبھی نہیں ہوا۔

وہ اچھی شکل و صورت والا مرد ہے، لیکن میری بدنصیب آنکھیں۔ کن آنکھوں میں کون آنکھیں تلاش کرتی ہیں۔؟ مجھے ہر سُو چھائی ہوئی تمہاری سحر کار آنکھیں نظر آتی ہیں۔ اور جب نظر نہیں آتیں تو میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی ہوں۔

کبھی تو تم بھی مجھے زہر لگتے ہو۔ کیونکہ زہر بن کے میری رگ و پے میں سرایت کر گئے ہو۔ میرے اندر زندگی کے جتنے سرچشمے تھے، ان کے سوتوں میں تمہارے نام کا زہر گھل چکا ہے۔ زندگی کا کوئی رُخ تمہارے بغیر جی کو نہیں بھاتا۔ میرا شوہر اچھی شکل و صورت کا ہے، لیکن کبھی اس کی صورت سے ایسی دہشت ہونے لگتی ہے کہ میں لرز جاتی ہوں اس کے ساتھ یہ عجیب شعبدہ بازی ہے وہ لباس میں ڈھک چھپ کر دیدہ زیب نظر آتا ہے لیکن جب بے لباس ہو جاتا ہے تو پلپلا ہراریجھ معلوم دیتا ہے، کبھی بہت قوی الجثّہ گھوا۔ اس کے جسم کی جلد پر سفید موہوم لکیریں ایسی ابھر گئی ہیں جیسے دھوپ میں کھال تڑخ گئی ہو اور یوں وہ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوڑیالے سانپ کی کینچلی اوڑھے ہو۔

مجھے معلوم ہے وہ ایک پارسا انسان ہے جو غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھے تو غسل واجب ہو جائے،

تب ہی وہ میرے بدن کی سرسبز کھیتی پر ٹڈی کے دَل کی طرح ٹوٹ کر چھایا ہے ۔ اس کے ان تمام سیلابی جذبوں کے مقابلے میں خود میں سخت پرسکون ہوتی ہوں ۔ وہ اس بات سے سخت چڑتا ہے ۔ وہ جب بدن کی ریاضتوں میں گم ہوتا ہے ، اس کے ماتھے کا پسینہ میرے عریاں سینے پر گرتا ہے تو میں اس وقت قطب شمالی کی برفباری تلے آخری سانسیں لے رہی ہوتی ہوں ۔

کہیں رک جانا منزل نہیں کہلاتا ۔ منزل کی طرف بڑھتے رہنا منزل کی شان ہے اور منزل پر قدم رکھ دینا اس کی کسرِ شان ۔ میں تم تک پہنچ نہیں پائی ، لیکن مسلسل تم تک آنے کی راہوں پر گامزن ہوں ۔ صبح سفر شروع کرتی ہوں ، رات کو سب طے شدہ مسافتوں سمیت کسی اتھاہ کنوئیں میں گر جاتی ہوں ۔ اس کاوش میں میں خود ٹوٹ رہی ہوں ، لیکن میری شکستگی کون دیکھے ؟

یہ بہاروں کا فریب بڑا جان لیوا فریب ہے ۔ اس کی مہکار کے دھوکے میں پھنس کے عمر صلیب پر گزارنا پڑتی ہے ۔ یہ سزا کب تک سہوں گی ؟

جو محبت کر نہیں سکتا وہ محبت کئے جانے کے قابل بھی نہیں ہوتا ۔ میرا شوہر ہزار مجھ سے محبت جتلائے ، لیکن میں بخوبی جانتی ہوں کہ یہ وقتی آگ ہے جو چند لمحوں کے بعد سرد ہو جاتی ہے ۔ اس کے بعد وہ پھر نہایت خضوع و خشوع سے اپنے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے ، وہ خود پسندی ، بلکہ خود پرستی کا بیمار شخص ہے ۔ وہ اپنے سے الگ کچھ قبولتا نہیں ۔ مجھے بھی وہ اپنی جائیداد سمجھتا ہے تو اسی طرح سے محبت کرتا ہے جیسے کسی زر خرید ملکیت سے کی جائے ۔ مجھے اس کا بڑا دکھ ہے وہ میری ذات کی نفی ہے ۔ میں اس کی ذات کا حوالہ بن کے سانس لے سکتی ہوں ورنہ وہ میرا گلا گھونٹ دے گا ۔ تب میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ وہ چشم بند بیل ہے جسے کنوئیں سے پانی نکالنے کو جوت دیا گیا ہے ۔ وہ اپنے مخصوص دائرے میں سفر کرتا رہتا ہے اور قریب بکھرے ہوئے سرسبز کھیت اور لہلہاتی فصل تک کو دیکھنے سے عاری ہے ۔ اس کی کل بساط وہ محدود دائرہ ہے ، کل کائنات وہ رہٹ ، ذوقِ موسیقی اس کی آواز ہے فقط اور اس کائناتِ تاریک میں اس کا وجود اول و آخر ہے ۔ جب یہ سوچ آتی ہے تو میں پھر اسے معاف کر دیتی ہوں ۔ وہ بخدا قابلِ رحم ہے ۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی بولی سمجھنے سے قاصر ہیں ۔ بہتری اسی میں تھی کہ ہم میں سے کوئی ایک گونگا ہو جائے ۔ وہ خود کو نہایت خوش بیان و خوش الحان سمجھتا ہے لہٰذا میں نے خود کو گونگا ظاہر کر لینے میں عافیت جانی ۔ میں اس کی ہر بات پر سر جھکا دیتی ہوں اور خاموش رہتی ہوں ۔ اگر میں بھی بولنے لگ جاتی تو چیخ چیخ کر ہمارے گلے رندھ جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں مگر ایک دوسرے کو ہرگز ہرگز سمجھ نہ پاتے ۔ تم جانتے ہو آنکھیں بڑی کم بخت ہیں ، ایک دفعہ بھیگ جائیں تو پھر تیرے کناروں تک ان کا خشک ہونا مشکل ہو جاتا ہے ۔ اب ہر سو چین ہی چین ہے وہ گونگی عورت کی خوبیاں پہچانتا ہے ۔ میری خوبیاں ہرگز ہرگز نہ پہچان پاتا ۔ تم نے کہا تھا : جانِ عزیز ! ہر طریقے سے اپنے گھر کو بچانا ۔ ایک دفعہ آنگن کی زمین پیر تلے سے کھسکی تو عمر بھر قدم جم نہ پائیں گے ۔ میں نے

آنگن کی مٹی میں اپنے پیروں کی مٹی سمو دی ہے۔ میں بادِ باراں کی تندی اور سورج کی تپش اپنی جان پر سہہ جاتی ہوں، مگر اپنے قدم زمین سے نکلنے نہیں دیتی۔

اور کیا لکھوں، صرف اتنا کہتی ہوں کہ اپنی جانِ عزیز کے نام کر دی اور حکم ہو، تمہارا شاد۔

○○

غزلیں

○

احمد ندیم قاسمی

کیسے طلسم عشق کی نادانیوں میں تھے
گل سے لبوں میں، چاند سی پیشانیوں میں تھے

ڈرتے تھے چاند سے بھی، ہراساں تھے گل سے بھی
جو لوگ اپنی ذات کے زندانیوں میں تھے

ساحل پہ، شب، زمیں کا فلک سے وصال تھا
اترے ہوئے نجوم رداں، پانیوں میں تھے

ہر فکر کا مآل جوازِ گناہ تھا
جتنے ثواب تھے، میری حیرانیوں میں تھے

دیمک تنے کو چاٹتی جاتی تھی — اور ہم
کتنے مگن شجر کی نگہبانیوں میں تھے

چہرے تو اہل شہر کے تھے پُر سکوں، مگر
ڈوبے ہوئے ضمیر پشیمانیوں میں تھے

یوسف کا اک نقیبِ مہِ کنعاں تو تھا۔ مگر
یوسف کے بھائی بھی انھی کنعانیوں میں تھے

پھولوں میں پتھروں کو لپیٹے ہوئے ندیم
مصروف میرے یار گل افشانیوں میں تھے

○

احمد ندیم قاسمی

کچھ گھبرایا گھبرایا سا لگتا ہوں
ابھی ابھی زندانِ ذات سے نکلا ہوں

روزِ قیامت ہے میرا ہر روزِ حیات
حشر ہوں اور خود اپنے اندر برپا ہوں

زندگی کرنے کا فن خود سیکھا ہی نہیں
اور سارے الزام خدا پر دھرتا ہوں

مَیں نے پیاس بجھانی چاہی پیاسوں کی
اب صحرا میں غائب ہوتا دریا ہوں

ایک دیا ہوں، جس نے جل کے سحر کر دی
اب سورج کے حوالے، اب میں چلتا ہوں

تیرے ساتھ چلوں، گر تیری اجازت ہو
قافلۂ گل! میں جو خزاں کا تنہا ہوں

دھرتی پر کچھ دیر تو مجھ کو رکنے دو
کڑے سفر کے بعد یہاں تک پہنچا ہوں

مَیں جگراں ہوں زر کے ہزار انباروں سے
پھول کی پتّی سامنے ہو تو سستا ہوں

میرا کمالِ فن ہے امکانات کی سیر
ریت پہ بیٹھا پھول بناتا رہتا ہوں

کوئی شجر ہی نہیں ہے جس سے کلام کروں
حبس کے ویرانوں میں بھٹکا جھونکا ہوں

سنّتِ آدمؑ ہے میرا معیارِ عمل
ہوں آلودۂ عصیاں، پھر بھی اُجلا ہوں

مَیں — میرے نقاد! بہت ہی بُرا سہی
اِتنا بُرا نہیں ہوں جتنا اچھا ہوں

رات کو روشن رکھنا میرا کام ندیم
شام کا پہلا — صبح کا آخری تارا ہوں

احمد ندیم قاسمی

اپنے لہو سے آپ چراغاں کرتا ہوں
مجھ کو بھی دیکھو، میں بھی تو ایک تماشا ہوں

میرے عدوئے تیرہ ضمیر کو کیا معلوم
نورِ سحر ہوں اور افق پر ملتا ہوں

دشتِ خیال کا ایک بگولا ہوں، لیکن
عرش کو چھوتا ہوں جب فرش سے اٹھتا ہوں

میری حیات، تلاشِ جنتِ گم گشتہ
اول دن سے اپنے وطن سے بچھڑا ہوں

باندھ رکھا ہے میں نے ازل سے رختِ سفر
کھول کے شہپرِ فکر، ابد تک اڑتا ہوں

ایک آواز مسلسل پیچھا کرتی ہے
انسانو! میں باغِ بہشت میں تنہا ہوں

میں انسان ہوں، میرا غروب قیامت ہے
میں سورج ہوں، اور بظاہر ڈوبا ہوں

گزرے دنوں کی گونج بھی میرے کان میں ہے
آنے والے دور کی چاپ بھی سنتا ہوں

ہمدمو! اپنے اندر جھانکو اور بتاؤ
کانٹا بن کر کس کے دل میں کھٹکتا ہوں

پاس رہے جس کو آدابِ عداوت کا
میں دیوانہ، اس دشمن پر مرتا ہوں

شاید مستقبل کا مؤرخ ہی سن لے
پتھر کی دیوار پہ دستک دیتا ہوں

شعر کہے تو کبھی کبھی محسوس ہوا
جیسے ابر ہوں اور خلا میں برستا ہوں

اپنی فنا سے مجھ کو بلا کی ضد ہے ندیم
سبزہ بن کر اپنی لحد سے نکلا ہوں

○

احمد ندیم قاسمی

ان زمینوں میں شجرکاریِ نو ہے درکار
سبز ہوتے نہیں اُکھڑے ہوئے پودے زنہار

فصلِ گل آئے تو بٹ جائے توجہ شاید
مجھ سے ہوتا نہیں سوکھے ہوئے پتّوں کا شمار

کوئی منزل نہ کوئی سمت معیّن اپنی
ہم ہیں بے ربط کہانی کے ادھورے کردار

اب زبردست کو یلغار کی حاجت ہی نہیں
اب تو نیلام پہ چڑھ جاتا ہے قوموں کا وقار

رُخ پہ برنائی بھی ہو، چال میں رعنائی بھی ہو
صرف مخلوقِ خدا سے نہیں سجتے بازار

اب تو واجب ہوا خورشیدِ قیامت کا طلوع
چار جانب سے گھٹا ٹوپ اندھیرے کا حصار

اب تو مہرِ لبِ اظہار خدارا توڑو
مجھ کو اس وقت فقط اذنِ فغاں ہے درکار

قدغنوں پر سے اچھل جاتا ہے سیلِ تاریخ
اور فلک تک تو کبھی اٹھ نہیں سکتی دیوار

تیر زن آج تو وہ شخص بھی کہلائے ندیمؔ
شیر کی جگہ جو کرتا رہے چڑیوں کا شکار

○

منیر نیازی

ہے میرے گرد کثرتِ شہرِ جفا پرست
تنہا ہوں اس لیے ہوں میں اتنا انا پرست

صحن بہارِ گل میں کفِ گل فروش ہے
شام وصالِ یار میں دستِ حنا پرست

تھا ابتدائے شوق میں آرام جاں بہت
پر ہم تھے اپنی دھن میں بہت انتہا پرست

بام بلندِ یار پہ خاموشیاں سی ہیں
اس وقت وہ کہاں ہے وہ یارِ ہوا پرست

گمراہیوں کا شکوہ نہ کر اب تو اے منیرؔ
تو ہی تھا سب سے بڑھ کے یہاں رہنما پرست

○

صلاح الدین محمود

بنت رات سمندر شبنم کا　　تن جیسے اِک ساکت یم کا
گل بینائی کے سر سے شجر　　لب جیسے اِک تشنہ خم کا
دو جانب پھول سیاہ سیرت　　دو جانب سورج سا چم کا

میں اس میداں کی سالم شب　　دل میرے پہلو کا دم کا
اِک میداں پھولوں کا جیسے　　اِک ساگر لمحوں میں سم کا
دریا کی اور دیکھنے دسس　　اک غنچہ لوہو میں غم کا
ہم ہاتھ سے چھوتے ہونٹوں کو　　تو لوہو خوشبو سے رم کا
قدموں کی صوت سیاہ جیسی
ہونٹوں میں حرف ہوا دم کا

○

صلاح الدین محمود

خوش بو کا در، صدا کی ہوا، روپ کا خلا
راتوں کی اوٹ ایک سیاہ چاند سا کھلا
لانبے شجر ہوا کی جبیں کو نہ چھو سکے
شبنم کے ذائقے میں مزا رات کا ملا
تھمتا گیا زمیں کا بدن، خاک کا چلن
تاروں کی ذات میں نہ کوئی آئنہ جلا
شنوائیوں کے جسم بدن میں اتر گئے
لمحوں کی وسعتوں میں کوئی نم قدم چلا
چلنے لگے شجر تو زمیں آپ تھم گئی
جیسے صدا شجر کی نفی آپ تھی ہوا
ہونٹوں کے پار ایک شجر ماہ تاب کا
بہتا مرے لہو میں سمندر سفید پا
[illegible] ساعت میں ایک رنگ
کہتا تھا اپنے آپ سے، میں نے یہ کیا سُنا
لانبے شجر کی اوٹ میں لانبے شجر جلے
بو ہو کے سبز باغ میں طائر نہ [illegible]

شہزاد احمد

کسی صورت مسافت میں کمی ہونے نہیں دیتے
شجر بے درد ہیں چھاؤں گھنی ہونے نہیں دیتے

سحر ہوتے ہی ہر جانب دھواں سا پھیل جاتا ہے
یہ بادل اس نگر میں روشنی ہونے نہیں دیتے

وہ روز و شب ہمیں اعزاز پر اعزاز دیتے ہیں
مگر احساسِ ذلت میں کمی ہونے نہیں دیتے

تعلق کچھ بھی ہو قائم حدِ فاصل تو رکھتے ہیں
وہ مجھ سے دوستی یا دشمنی ہونے نہیں دیتے

بجھا دیتے ہیں جو جلتا چمکتا جاگتا سورج
کسی کو رات کا احساس بھی ہونے نہیں دیتے

وہ سیل تند خو ہیں برق کی صورت گزرتے ہیں
کوئی دیوار رستے میں کھڑی ہونے نہیں دیتے

جلا کر خاک کر دیتے ہیں جو تازہ شگوفوں کو
وہ سورج ہیں جہاں میں تیرگی ہونے نہیں دیتے

وہ ہم کو نت نئے خوابوں کے آئینے دکھاتے ہیں
مگر امید کی صورت گری ہونے نہیں دیتے

اسے جانے نہیں شہزاد دیتے ہم تصور سے
کبھی ویران ہم دل کی گلی ہونے نہیں دیتے

شہزاد احمد

ہر اک لحظہ خود اپنی آرزو کرتی ہوئی آنکھیں
بلند آواز میں وہ گفتگو کرتی ہوئی آنکھیں

ہے کام ان کا بکھرتے منظروں کو جوڑتے رہنا
مگر تقسیم خود کو کو بہ کو کرتی ہوئی آنکھیں

چھلکتی بولتی رت میں اداسی ان کی عادت ہے
لہو کو پھول پھولوں کو لہو کرتی ہوئی آنکھیں

وہ آئینہ تو کب سے آنکھ کی پتلی میں رکھا ہے
تلاش اس آئینے کی چار سو کرتی ہوئی آنکھیں

میری پلکوں کے آگے روشنی ہے یا اندھیرا ہے
جو دل میں ہے اسی کی جستجو کرتی ہوئی آنکھیں

چراغِ آب آلودہ نہ بجھتا ہے نہ جلتا ہے
وہ خود کو روز و شب بے آبرو کرتی ہوئی آنکھیں

ابھی تو کاروانِ گل کی آہٹ تک نہیں آئی
ابھی سے امتیازِ رنگ و بو کرتی ہوئی آنکھیں

وہ آ پہنچا مگر پلکوں کے آگے دیکھتا کب ہے
سکوتِ شامِ غم میں ہاؤ ہو کرتی ہوئی آنکھیں

یہ دل شہزاد وہ بگڑا ہوا آئینہ خانہ ہے
لرز جاتی ہیں خود کو رو برو کرتی ہوئی آنکھیں

سید مظفر احمد ضیاء

شہر گھٹتے جائیں گے ویرانیاں رہ جائیں گی
زندہ جسموں کی جگہ پرچھائیاں رہ جائیں گی

آشیانے خاک ہو جائیں گے جل کر دفعتاً
آسمانوں پر کڑکتی بجلیاں رہ جائیں گی

خشک ہو جائیں گے اک دن یہ سمندر دیکھنا
ریگزاروں میں بھی سوکھی ندیاں رہ جائیں گی

اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
وقت گر بدلا تو تن پہ دھجیاں رہ جائیں گی

گرمیٔ جذبات بھی ہے موسموں کے ساتھ ساتھ
آخری رت میں ٹھٹھرتی سردیاں رہ جائیں گی

ایک اک پروانہ جل کر خاک ہوتا جائے گا۔
رو چکے گی شمع اور خاموشیاں رہ جائیں گی

کرب کے آثار ہر چہرے پہ ہو جائیں گے نقش
کل کے پس منظر میں سب رعنائیاں رہ جائیں گی

ریت کی مانند بہہ جائیں گے باطل کے پہاڑ
لوحِ گیتی پر اٹل سچائیاں رہ جائیں گی،

جاوید شاہین

وہ جس کے ہاتھوں سلامت کوئی قبا نہ رہی
اُسی کے واسطے اس شہر میں سزا نہ رہی

تمام کمروں میں اِک ساتھ بجھ گئیں شمعیں
کروں میں کیا کہ مکاں میں کہیں ہوا نہ رہی

گیا تھا دیر سے ، بازار میں فقط چُپ تھی
بچی کھچی بھی مرے واسطے صدا نہ رہی

جو میرے دل میں تھا کوڑا سمجھ کے پھینک آیا
جو میں سمجھتا تھا وہ خلقتِ خدا نہ رہی

میں ساتھ لے کے پھروں کیسے فصلِ گُل شاہیں
کہ اُس کے سر پہ تو عرصہ ہُوا ردا نہ رہی

جاوید شاہین

گھروں کی لاش تھی اور سب کھڑے تھے ڈر سے پرے
رہِ بہار کے نزدیک میرے گھر سے پرے

نکل سکی نہ تھکی شام گھر کے سناٹوں میں
غریب سایہ پڑا رہ گیا شجر سے پرے

مسافروں کے اگر حوصلے بھی ہیں تو میں
سفر نکال کے رکھ دوں گا رہگذر سے پرے

میں دن کو پھیرتا ہوں گھڑی لیے اندھیروں کی
کہ ہاتھ مجھ سے ہو گیا سحر سے پرے

میں واردات میں مصروف تھا پتا نہ چلا
پڑی ہوئی تھی وہیں آنکھ بھی نظر سے پرے

بتاؤں کیا کہ مزا کیا تھا میری محنت کا
کسی نے کاٹ کے رکھ دی زباں ثمر سے پرے

گذر بسر کے لیے بس وہی غنیمت ہیں
بچا کے رکھے ہیں کچھ خواب میں نے سر سے پرے

جاوید شاہین

ڈرا ہُوا ہوں ترے شہر میں اماں لے کر   میں سوچتا ہوں نِکل جاؤں نقدِ جاں لے کر
جگا دیا ہے اُسے یہ قصور ہے میرا   گلوں پہ سویا ہُوا تھا بھری خزاں لے کر
مرے لیے یہ تسلّی کہ میری جاں چھوٹی   اُسے گماں کہ وہ خوش ہے مری زباں لے کر
وہ لاکھ کہتا پھرے سب سے، پر سمجھتا ہے   کہ چیز میری ہے جائے گا وہ کہاں لے کر
وہ لین دین میں شاہیں کھرا نہیں نِکلا
نفع میں کس طرح دے دوں اُسے زیاں لے کر

جاوید شاہین

فقط تجھے نہیں، یہ تشنگی کہاں نہ ملی!   ملے تھے لفظ مجھے پر مجھے زباں نہ ملی:
خفا کیا تھا کبھی موسمِ وفا میں نے   پھر اُس کے بعد کوئی رُت مجھے یہاں نہ ملی
شجر میں سایہ نہیں چھت نہیں مکانوں پر   سروں پہ رکھنے کو تھوڑی سی بھی اماں نہ ملی
میں رکھ کے بھول گیا در کہیں، کہیں دیوار   جہاں دھری تھی وہاں شاخِ آشیاں نہ ملی
مرا تو رنگ ہی اُس آن اُڑ گیا شاہیں
بدن میں جھانک کے دیکھا تو اُس میں جاں نہ ملی

○

امجد اسلام امجد

جو آنسو دل میں گرتے ہیں وہ آنکھوں میں نہیں رہتے
بہت سے حرف ایسے ہیں جو لفظوں میں نہیں رہتے
کتابوں میں لکھے جاتے ہیں دنیا بھر کے افسانے
مگر جن میں حقیقت ہو کتابوں میں نہیں رہتے
بہار آئے تو ہر اِک پھول پر اک ساتھ آتی ہے
ہوا جن کا مقدر ہو وہ شاخوں میں نہیں رہتے
لیے پھرتے ہیں کچھ احباب ایسے مضطرب سجدے
جہاں دربار مل جائے جبینوں میں نہیں رہتے
مہک اور تتلیوں کے نام سبزے سے جدا کیوں ہیں
کہ یہ بھی تو خزاں آنے پہ پھولوں میں نہیں رہتے

○

امجد اسلام امجد

دشتِ دل میں سراب تازہ ہیں — بجھ چکی آنکھ خواب تازہ ہیں
داستانِ شکستِ دل ہے وہی — ایک دو چار باب تازہ ہیں
کوئی موسم ہو، دل گلستاں میں — آرزو کے گلاب تازہ ہیں
دوستی کی زباں ہوئی متروک — نفرتوں کے نصاب تازہ ہیں
آگہی کے، ہماری آنکھوں پر — جس قدر ہیں عذاب تازہ ہیں
زخم در زخم دل کے کھاتے ہیں — دوستوں کے حساب تازہ ہیں
سر پہ بوڑھی زمیں کے امجد
اب کے یہ آفتاب تازہ ہیں

○

دوحی کتھا ہی

تم دوست ہو میرے تو یہ احسان کرو گے — جو کچھ بھی کہو گے وہ مرے منہ پہ کہو گے
لہجے سے تمہارے یہی ہوتا ہے اشارہ — تم میری کسی بات کی پروا نہ کرو گے
اچھا ہے اگر وقت مؤرخ بنے ورنہ — تم سارے گنہ اپنے مرے نام لکھو گے
لمحے کو حیاتِ ابدی دینا ہنر ہے — یہ کام کرو گے تو بڑا کام کرو گے
مجموعۂ الفاظ ہوں اور منہ میں زباں ہے — کب تک مجھے مفہوم سے محروم رکھو گے

تم تو مجھے جیتے جی بھلا بیٹھے ہو دوحی
مر جاؤں گا تو حشر تک مجھے یاد کرو گے

○

دوحی کتھا ہی

تو گھڑی بھر کا تماشا دیکھتا رہ جائے گا — کیا ہوا رنگوں کا میلہ، سوچتا رہ جائے گا
وقت تیزی سے گزر جائے گا تیرے پاس سے — اور اس گاڑی کو بس تو روکتا رہ جائے گا
موج کی صورت نکل جا، جس طرف اٹھیں قدم — ورنہ جانا ہے کہاں، تو پوچھتا رہ جائے گا
بند ہو جائے گی خوابوں کے مکاں میں زندگی — عمر بھر تو روزنوں سے جھانکتا رہ جائے گا
شہروں کے جاگتے اپنے بال و پر پھیلائیں گے — اور تو مقراضِ غم سے کاٹتا رہ جائے گا
موسمی لوگوں سے تو نے کیا امیدیں باندھ لیں — جب ذرا بدلے گی رُت، تو سوچتا رہ جائے گا

دوسرا رُخ جب دکھاؤں گا تجھے تصویر کا
تو بھی دوحی دیکھنا پھر دیکھتا رہ جائے گا

پروین شاکر

خوف رہبر کا رہا جو کسی رہزن سے نہ تھا
سچ تو یہ ہوگا کہ خطرہ مجھے دشمن سے نہ تھا

مَیں بھی تتلی کی طرح رقص کیا کرتی تھی
ایسا پتھرایا ہُوا پاؤں تو بچپن سے نہ تھا

تیری منزل تو نہ تھی مَیں بھی، مگر دُکھ یہ ہے
تیرے گھر کا کوئی رستہ مرے آنگن سے نہ تھا

کچھ بھروسہ تو ہواؤں کا بھی ہو جاتا ہے
یہ تعلق بھی دیے کو ترے دامن سے نہ تھا

اِس طرح آئے کہ بس پھول کھلاتا جائے!
یہ وہ جھونکا تھا جو شاید ترے گلشن سے نہ تھا

پروین شاکر

چاند چہروں کے فروزاں تھے کہ ناموں کے گلاب
شاخِ مژگاں پہ مہکتے رہے یادوں کے گلاب

تیری زیبائی سلامت رہے، اے قامتِ دوست!
زیبِ پوشاک رہیں گے ابھی زخموں کے گلاب

جی اُٹھی خاک، نمی پا کے مرے اشکوں کی
کھل رہے ہیں مری گِل میں نئے خوابوں کے گلاب

اُس سے جُو، مری آنکھوں کو دمِ صبح اور
رکھ گیا میرے سرہانے مرے خوابوں کے گلاب

کون چھُو کر انہیں گزرا کہ کھِلے جاتے ہیں
اِتنے سرشار تو پہلے نہ تھے ہونٹوں کے گلاب

سرحدِ نُور پہ اِس طرح سے خوشبو پہنچی
چاند پھُولوں کے ہُوئے اور ہوئے تاروں کے گلاب

دوپہر شام ہوئی، شام شبِ تار ہوئی،
اور کھِلتے رہے، کھِلتے رہے باتوں کے گلاب

پروین شاکر

دیکھا تھا اُس نے اور ہنسا تھا جواب میں
اِک خواب مجھ کو اور نظر آیا خواب میں

شائستۂ سرور نہ ہو دل تو سب قیب
کیا تیری بزم، کیا ترے جامِ شراب میں

یادوں کا چاند اپنے سفر میں تھا اور اُدھر
تصویر بنتی ساقی تھی چشمِ پُرآب میں

مجھ کو تو اپنی رُوح میں کھِلتا ہُوا ملا
تُو نے تو ایک شکل ہی دیکھی گلاب میں

اے کس کو ملکیت کی تمنا ہے اور کبھی
دو نام سب تھے ساتھ لکھے تھے کتاب میں

چہرہ تو خیر اب بھی اسی بے وفا کا تھا،
پہلے سے بڑھ گیا تھا مگر آب و تاب میں

پروین شاکر

نظر بھی آیا، اُسے اپنے پاس بھی دیکھا
مری نگاہ نے یہ التباس بھی دیکھا

یہی نہیں کہ وہ پہچان کر بڑھا — اُس میں
وہی تپاک، وہی طرزِ خاص بھی دیکھا

اُسی طرح کی چمک بھی تھی اور اُن آنکھوں میں
بچھڑتے وقت پرانا ہراس بھی دیکھا

بہت دنوں پہ ملے اور گھر سے چلتے وقت
کسی کی آنکھ سے اپنا لباس بھی دیکھا

بس ایک بار گلے اُس کے لگ کے روئے تھے
پھر اُس کے بعد کسی نے اداس بھی دیکھا!

سب اچھا، سننے پہ دل کا ہراس بھی دیکھا
امیرِ شہر کبھی آس پاس بھی دیکھا!

جو پیڑ اہلِ گلستاں کا ستر ڈھکتا رہا
اُنہی کے ہاتھوں اُسے بے لباس بھی دیکھا

جو صبح سرمد و منصور تھے، اُنہیں سرِ شام
حضورِ شاہ سراپا سپاس بھی دیکھا

تمام رات جو خندق میں ریت بھرتا رہا
اُسی کو شہر کی خاطر اداس بھی دیکھا

کھلا کسی پہ نہ بس کا کبھی سیاق و سباق
زمیں کے نام سے وہ اقتباس بھی دیکھا

پروین شاکر

وقتِ رخصت کی خموشی میں کوئی گویا بھی تھا
سر ہی شانوں پر نہیں رکھا تھا، وہ رویا بھی تھا

کچھ تو وہ طبعاً ہوا کا ہم سفر تھا، اور کچھ
مَیں نے گھر کے شوق میں از خود اُسے کھویا بھی تھا

ناخنِ گل کی طرح چبھنے پہ وہ مجبور تھا
آنسوؤں سے لیکن اُس نے زخم کو دھویا بھی تھا

خوش ہے قتلِ مہر پر لیکن امیرِ شہر کو
یہ بھی ہو معلوم، کیا اُس شب کوئی سویا بھی تھا!

میری بربادی کے سب اسباب خود مجھ سے چلے
مَیں نے اب تک بس وہی کاٹا ہے جو بویا بھی تھا

رنگ کچھ میرے بھی تو امکان سے باہر رہے
چاہتا وہ تھا مجھے، پر حسن کا جویا بھی تھا

پروین شاکر

خوف رہبر کا رہا جو کسی رہزن سے نہ تھا
سچ تو یہ ہو گا کہ خطرہ مجھے دشمن سے نہ تھا

مَیں بھی تتلی کی طرح رقص کیا کرتی تھی
ایسا بکھرایا ہُوا پاؤں تو بچپن سے نہ تھا

تیری منزل تو نہ تھی مَیں بھی، مگر دُکھ یہ ہے
تیرے گھر کا کوئی رستہ مرے آنگن سے نہ تھا

کچھ بھروسہ تو ہواؤں کا بھی ہو جاتا ہے
یہ تعلق بھی دیے کو ترے دامن سے نہ تھا

اِس طرح آئے کہ بس پھول کھلاتا جائے!
یہ وہ جھونکا تھا جو شاید ترے گلشن سے نہ تھا

پروین شاکر

چاند چہروں سے فروزاں تھے کہ ناموں کے گلاب
شاخِ مژگاں پہ مہکتے رہے یادوں کے گلاب

تیری زیبائی سلامت رہے، اے قامتِ دوست
زیبِ پوشاک رہیں گے ابھی زخموں کے گلاب

جی اُٹھی خاک، نمی پا کے مرے اشکوں کی
کھل رہے ہیں مری گل میں نئے خوابوں کے گلاب

اُس نے چُوما مری آنکھوں کو دمِ صبح اور
رکھ گیا میرے سرہانے مرے خوابوں کے گلاب

کون چھُو کر انہیں گزرا کہ کھلے جاتے ہیں
اتنے سرشار تو پہلے نہ تھے ہونٹوں کے گلاب

سرحدِ نُور پہ اِس طرح سے خوشبُو پہنچی
چاند پھُولوں کے ہُوئے اور ہوئے تاروں کے گلاب

دوپہر شام ہوئی، شام شبِ تار ہوئی،
اور کھِلتے رہے، کھِلتے رہے باتوں کے گلاب

پروین شاکر

دیکھا تھا اُس نے اور ہنسا تھا جواب میں
اِک خواب مجھ کو اور نظر آیا خواب میں

شائستۂ سرور نہ ہو دل تو سب قیب
کیا تیری بزم، کیا ترے جامِ شراب میں

یادوں کا چاند اپنے سفر میں تھا اور اُدھر
تصویر تھی ساقی تھی چشمِ پُرآب میں

مجھ کو تو اپنی رُوح میں کھلتا ہوا ملا
تُو نے تو ایک شکل ہی دیکھی گلاب میں

اے کس کو ملکیت کی تمنا ہے اور کبھی
دو نام سب تھے ساتھ لکھے تھے کتاب میں

چہرہ تو خیر اب بھی اسی بے وفا کا تھا،
پہلے سے بڑھ گیا تھا مگر آب و تاب میں

○

پروین شاکر

نظر بھی آیا، اُسے اپنے پاس بھی دیکھا — مری نگاہ نے یہ التباس بھی دیکھا
یہی نہیں کہ وہ پہچان کر بڑھا — اُس میں — وہی تپاک، وہی طرزِ خاص بھی دیکھا
اُسی طرح کی چمک بھی تھی اور اُن آنکھوں میں — بچھڑتے وقت پرانا ہراس بھی دیکھا
بہت دنوں پہ ملے اور گھر سے چلتے وقت — کسی کی آنکھ سے اپنا لباس بھی دیکھا
بس ایک بار گلے اُس کے لگ کے روئے تھے — پھر اُس کے بعد کسی نے اداس بھی دیکھا!

○

سب اچھا، سننے پہ دل کا ہراس بھی دیکھا — امیرِ شہر کبھی آس پاس بھی دیکھا!
جو پیڑ اہلِ گلستاں کا ستر ڈھکتا رہا — اُنھی کے ہاتھوں اُسے بے لباس بھی دیکھا
جو صبح سرمد و منصور تھے، انہیں سرِ شام — حضورِ شاہ سراپا سپاس بھی دیکھا
تمام رات جو خندق میں ریت بھرتا رہا — اُسی کو شہر کی خاطر اداس بھی دیکھا

کھلا کسی پہ نہ بس کا کبھی سیاق و سباق
زمیں کے نام سے وہ اقتباس بھی دیکھا

○

پروین شاکر

وقتِ رخصت کی خموشی میں کوئی گویا بھی تھا — سر ہی شانوں پر نہیں رکھا تھا، وہ رویا بھی تھا
کچھ تو وہ طبعاً ہوا کا ہم سفر تھا، اور کچھ — میں نے گھر کے شوق میں از خود اُسے کھویا بھی تھا
ناخنِ گُل کی طرح چھبنے پہ وہ مجبور تھا — آنسوؤں سے لیکن اُس نے زخم کو دھویا بھی تھا
خوش ہے قتلِ مہر پر لیکن امیرِ شہر کو — یہ بھی ہو معلوم، کیا اُس شب کوئی سویا بھی تھا!
میری بربادی کے سب اسباب خود مجھ سے چلے — میں نے اب تک بس وہی کاٹا ہے جو بویا بھی تھا

رنگ کچھ میرے بھی تو امکان سے باہر رہے
چاہتا وہ تھا مجھے، پر حسن کا جویا بھی تھا

ثروت حسین

کتابِ سبز و درِ داستاں بند کیے
وہ آنکھ سو گئی خوابوں کو ارجمند کیے
گزر گیا ہے وہ سیلابِ آتشِ امروز
بغیر خیمہ و خاشاک کو گزند کیے
بہت مُصر تھے خدایانِ ثابت و سیار
سو میں نے آئینہ و آسماں پسند کیے
اسی جزیرۂ جائے نماز پر ثروتؔ
زمانہ ہو گیا دستِ دعا بلند کیے

ثروت حسین

آنکھوں میں سوغات سمیٹے اپنے گھر آتے ہیں
بجرے لاگے بندرگاہ پہ سوداگر آتے ہیں
زرد زبور تلاوت کرتی ہے تصویرِ خزاں کی
عین بہاریں کیسے کیسے خواب نظر آتے ہیں
گندم اور گلابوں جیسے خواب شکستہ کرتے
دُور دراز زمینوں والے شہر میں در آتے ہیں
شہزادی تجھے کون بتائے تیرے چراغ کدے تک
کتنی محرابیں پڑتی ہیں کتنے در آتے ہیں
بندِ قبائے سُرخ کی منزل اُن پر سہل ہوئی ہے
جن ہاتھوں کو آگ چُرا لینے کے ہُنر آتے ہیں

ثروت حسین

اے شجرِ غنودگی نیند مجھے بھی آ نہ جائے
میرے غیاب میں کہیں دھوپ وہ جگمگا نہ جائے
مزرعِ ماہ کے اسیر دیکھ یہ سُرمئی لکیر
صُورتوں کو مٹا نہ دے آنکھوں کو بجھا نہ جائے
سب یہ ستارہ و سبُو سلسلہ ہائے کاخ و کو
بارِ تجلیات سے خاک میں ہی سما نہ جائے
اے نگہِ نشانہ جُو آج ہوں اپنے رو برو
وار کوئی غلط نہ ہو، تیر کوئی خطا نہ جائے
خلوتیانِ ذی شرف، شور بہت ہے ہر طرف
لفظ کوئی نہ کہہ سکیں، حرف کوئی سُنا نہ جائے

○

خالد احمد

رُوپ کو دھن جانا تو من میں دُبدھا گھنیرا پھیل گیا
دریا دریا، صحرا صحرا، دامن میرا پھیل گیا

اے تاروں کے بکھراوے، اے نور بھری بے ترتیبی
کس کا ہاتھ پکڑلوں جاکر، دن بہتیرا پھیل گیا

شام کے طاق میں بولتی چڑیا، کنج چراغ میں لرزاں لَو
کس کے عزم کی تکبیریں ہیں، کیسا سویرا پھیل گیا

حرفِ فتح کا سطرِ شکست میں نکتہ نکتہ پڑاؤ رہا
صبحِ مُبیں تک حرفِ مُبیں کا رین بسیرا پھیل گیا

تیز ہوا کے پیچھے پیچھے خوشبوؤں کے لشکر تھے
خون وہ پھول تھا جس کو جہاں بھی جس نے بکھیرا پھیل گیا

آدھا گھر اِک سورج گھر تھا، آدھا گھر اِک کاجل گھر
بھادوں کے بادل کا سایہ بن کے اندھیرا پھیل گیا

بُوندوں کا بستر تھیں پلکیں، آنکھوں آنکھوں جل تھل تھا
میری باتوں سے سانسوں تک ساون تیرا پھیل گیا

گھر سے دَرد کمانے نکلے، دِن کے ساتھ طلوع ہوئے
شام تری تیزی سے اُتری اور اندھیرا پھیل گیا

پل کے پل وہ رات آئی، جس رات کی بات بھی یاد نہیں
سانجھ تری چھَب کے ڈھب گندی اور سویرا پھیل گیا

دَم لینے کو جہاں ٹھہرے تھے، وہ منزل کیا منزل تھی
آدم قد درختوں کی بانہوں کا گھیرا پھیل گیا

خالد احمد

اے احتیاط یہ نمِ غم تاب اور ہے — سلکِ مژہ میں ایک دُرِ ناب اور ہے
پھوٹیں ہوا کی شاخ سے لہروں کی پتیاں — کھلنے کو پھر کوئی گلِ گرداب اور ہے
وہ پانیوں کی سطح تھی، پانی کا شور تھا — منظر سرِ نگاہ، تہِ آب اور ہے
یہ پانیوں کے بن ہیں کہ دشت کے دشت ہیں — یہ شہر اور ہے کہ یہ سیلاب اور ہے
کجلا رہے ہیں نیند کے کھڑے سے بام و در — شاید کفِ چراغ میں اک خواب اور ہے
یہ دھڑکنوں سے ہاتھ پہ جگنوں سی دستکیں — اک گردشِ کم آمیزش پسِ باب اور ہے
تجھ پر دکھوں کی دھوپ چڑھے عمر ہو چکی — اے حزنِ یار آج تب و تاب اور ہے

جبیں کھنگال لینا تو آنکھیں کھنگال لے
سلکِ مژہ میں ایک دُرِ ناب اور ہے

محمد اجمل نیازی

اضطرابِ خاکِ ابجد میں کہیں رہتا ہے وہ
کائناتِ رُوحِ احمدؐ میں کہیں رہتا ہے وہ

دائرہ در دائرہ صدیاں بُلاتی ہیں اُسے
سچی آوازوں کے گنبد میں کہیں رہتا ہے وہ

ڈھونڈنے نکلے ہیں اُس کو علم کے صحرا میں ہم
درد و غم کی راہِ ابجد میں کہیں رہتا ہے وہ

یاد آتا ہے مصیبت میں دعاؤں کی طرح
شہر کے ویران معبد میں کہیں رہتا ہے وہ

خاک میں گھُلتا لہو ہے منتظر اُس کے لیے
سرخرُو ہونے کی سرحد میں کہیں رہتا ہے وہ

اُس کے رازوں کی محافظ ہے مری موت و حیات
ذات کے پُرنور مرقد میں کہیں رہتا ہے وہ

منکشف ہوتی ہوئی حیرت میں اُس کو دیکھئے
اِک نگاہِ خواب کی زد میں کہیں رہتا ہے وہ

اِک ارادے کی طرح اجملؔ دِلوں کے درمیاں
ارضِ جاں کی آخری حد میں کہیں رہتا ہے وہ

تحسین فراقی

ماضی کے اوراق میں یارو انہی کے سبز حوالے تھے
جن کے ہاتھوں میں تو قلم تھے، دل میں درد کے بھالے تھے

ان کی یاد سے اب بھی دل میں دیپک جلتے بجھتے ہیں
وہ لمحے جو بیت گئے ہیں کتنے کرماں والے تھے

ماہ رخوں کو چھونا تو آفاق حدوں کو چھونا تھا
لیکن ان کو کیسے چھوتے، بیچ میں جبر کے ہالے تھے

سرد رتوں کی دھوپ تو اب بھی بام بام پر پھیلتی ہے
لیکن کیا وہ لوگ ہوئے جو دھوپ نہانے والے تھے

وہ میرا دل دریا تھا جسے دید کی مدرا بھر نہ سکی
وہ جو یکسر ہو گئے خالی اس کے نین پیالے تھے

اب تو خواب رتوں کا عرصہ صدیاں صدیاں پھیل گیا
اے صدیوں کے سچے مالک ہم تو لڑکے بالے تھے

ان کی اب پہچان کہاں ہے ان کا اب عرفان کہاں
وہ جو من کے اجلے اجلے تن کے کالے کالے تھے

تحسین فراقی

گو عشق میں راحتیں بہت ہیں   پر اس میں قباحتیں بہت ہیں
ابلاغ کی مشکلیں بہت ہیں   ہر چند وضاحتیں بہت ہیں
مصحف سے مکالمہ نہیں ہے   ظاہر میں تلاوتیں بہت ہیں
جو ادنیٰ غلام وقت کے ہیں   ان کے لیے گردشیں بہت ہیں
کیا عدل کیا معدلت شعاری   کہنے کو عدالتیں بہت ہیں
جس سے تھے کبھی دلوں کے رشتے   اب اس سے عداوتیں بہت ہیں

اُس بن جی لوں کہ جان دے دوں
اس طرح کی الجھنیں بہت ہیں

تحسین فراقی

جو میرا نام بچھڑتے سمے پکار گیا ہے
غموں کے بوجھ کو فی الحال تو اتار گیا ہے

گیا میں چھت پہ تو دیوار پر گلاب دھرا تھا
کھلا کہ بام سے وہ کر کے انتظار گیا ہے

تم اپنے کام نبیڑو نہ میرے زخم کو چھیڑو
جو تیر دل میں لگا تھا، جگر کے پار گیا ہے

تمام شہر کے کوزہ گروں کے چاک رکے ہیں
تمام شہر کو مٹی کا قحط مار گیا ہے!

وہ شخص جس نے وقارِ بشر کو خاک میں رلا
وہ شخص خود بھی جہاں بھر سے بے وقار گیا ہے

نہ اس نے مجھ کو بلایا نہ میرے فن میں سمایا
میں اس سے ہارا تو میرا قلم بھی ہار گیا ہے

تحسین فراقی

صلیب سر پہ اٹھائی تو سر زمیں پہ دھرا تھا
زمیں سے سر کو اٹھایا تو دوش خود سے جدا تھا

انہی دنوں میں مسافر لٹا تھا غمزہ زنوں سے
انہی رتوں میں مرا اس کا میل جول ہوا تھا

یہی رتیں تھیں کہ دو جسم ہمقران ہوئے تھے
انہی رتوں میں بچھڑنے کا سانحہ بھی ہوا تھا!

وہ جس سے عام دنوں میں درشتیاں ہی ملی ہیں
وہ شخص قریۂ قربت میں تو صبا ہی صبا تھا

میں اس کو اوڑھتا خود پہ تو کیسا رنگ دکھاتا
جو دیکھنے میں بظاہر برنگِ برگِ حنا تھا

مسافروں کے ٹھکانے تھے یا کہ ریت کے ٹیلے
مسافروں کا نگر تھا کہ نقشِ موجِ ہوا تھا

○

حسن رضوی

نہ وہ اقرار کرتا ہے نہ وہ انکار کرتا ہے
وہ میرا دوست جو چھپ چھپ کے اکثر وار کرتا ہے

میں اُس کے کس ستم کی سرخیاں اخبار میں دیکھوں
وہ ظالم ہے مگر ہر ظلم سے انکار کرتا ہے

منڈیروں سے کوئی مانوس سی آواز آتی ہے
کوئی تو یاد ہم کو بھی پسِ دیوار کرتا ہے

ہمیں یہ دکھ کہ وہ اکثر کبھی موسم نہیں ملتا
مگر ملنے کا وعدہ ہم سے وہ ہر بار کرتا ہے

یہ اُس کے پیار کی باتیں فقط قصے پرانے ہیں
بھلا کچے گھڑے پر کون دریا پار کرتا ہے

حسن راتوں کو جب سب لوگ میٹھی نیند سوتے ہیں
تو اک خواب آشنا چہرہ ہمیں بیدار کرتا ہے

○

حسن رضوی

کبھی کتابوں میں پھول رکھنا، کبھی درختوں پہ نام لکھنا
ہمیں بھی ہے یاد آج تک وہ نظر سے حرفِ سلام لکھنا

وہ چاند چہرے، وہ بہکی باتیں، سلگتے دن تھے مہکتی راتیں
وہ چھوٹے چھوٹے سے کاغذوں پر محبتوں کے پیام لکھنا

گلاب چہروں سے دل لگانا، وہ چپکے چپکے نظر ملانا
وہ آرزوؤں کے خواب بُننا، وہ قصۂ ناتمام لکھنا

مرے نگر کی حسیں فضاؤ، کہیں جو اُن کا نشان پاؤ
تو دیکھنا یہ کہاں بسے وہ کہاں ہے اُن کا قیام لکھنا

کھلی فضاؤں میں سانس لینا عبث ہے اب تو گھٹن ہے ایسی
کہ چاروں جانب شجر کھڑے ہیں صورتِ تمام لکھنا

گئی رُتوں میں حسن ہمارا بس ایک ہی تو یہ مشغلہ تھا
کسی کے چہرے کو صبح کہنا کسی کی زُلفوں کو شام لکھنا

ماجد صدّیقی

نقش بنے صحراؤں کے — سپنے سُکھ کی چھاؤں کے
ہنر کاروں کے ہاتھ لگے — لعل بلکتی ماؤں کے
ابریشم سے جسموں پر — برسیں سنگ جفاؤں کے
جی ہاں آپ کو زیبا ہیں — سارے زعم خداؤں کے
حسرت حسرت روز بڑھیں — دل میں سینک چتاؤں کے
برسوں سے ناپید ہوئے — کھلتے رنگ فضاؤں کے
ماجد نطق ڈھلے کیسے
اس کی شوخ اداؤں کے

محمودہ غازیہ

جو میرے ہونٹوں پہ اِک نام تھا دعا کی طرح — وہ نیکیوں کی علامت تھا ابینا کی طرح
وہ بے حجاب نگاہوں کو روک لیتا تھا — وہ مجھ پر سایہ فگن تھا میری ردا کی طرح
وہ بے وفا تو نہ تھا پھر یہ کیا ہُوا لوگو — وہ مجھ کو بھول گیا اپنے نقشِ پا کی طرح
مجھے گلہ بھی نہیں اس کی بے وفائی کا — کہ اپنے آپ میں تنہا ہوں مَیں خدا کی طرح
مشامِ جاں میں مہکتے گلاب کھل اُٹھے — میرے قریب سے گزرا کوئی صبا کی طرح
مَیں آج کس سے بتاؤں کہ کس کے نام کا غم — سبوئے جان میں چھلکتا ہے کیمیا کی طرح
جلا کے اپنا بدن رنجشوں کی بھٹی میں
کوئی غزل تو کہے آج غازیہ کی طرح

اختر امان

زندگی میں ابھی کتنے ہی سفر باقی ہیں
ہم نے جو دیکھے نہیں ہیں وہ نگر باقی ہیں

اور پتھر ابھی آئیں گے مری سمت ضرور
جب تلک شاخ پہ کچھ اور ثمر باقی ہیں

دل کی سب بستیاں آباد ہیں اُن کے دم سے
گرچہ وہ لوگ نہیں ہم میں، مگر باقی ہیں

کب مسافر نے اک چھاؤں کو منزل جانا
ورنہ راہوں میں تو کتنے ہی شجر باقی ہیں

آگ تو بجھ گئی ہے پھر بھی مگر یاد رہے
خشک پتوں میں دبے ہیں جو شرر باقی ہیں

کشتیاں لگ گئی ہیں اُن کی کناروں پہ امان
پھر بھی دریاؤں میں کتنے ہی بھنور باقی ہیں

اختر امان

ہم سے جو شخص ملے گا ترے جیسا ہوگا
دل سے جو پہلے ہوا اب کے بھی ویسا ہوگا

ایک تم ہی تو نہ تھے جس کو مری چاہت تھی
اور کوئی بھی مری آگ میں جلتا ہوگا

مطمئن ہم تھے اُسے کھو کے، اگر سوچ کے یہ
اب کے جو ہم کو ملا، پہلے سے اچھا ہوگا

بعد مدت کے اُسے دیکھ کے یاد آیا ہے
ہم نے شاید کبھی اس شخص کو چاہا ہوگا

ہاتھ ممکن ہے کسی اور کے ہاتھوں میں رہیں
میری آنکھوں میں مگر تیرا ہی چہرہ ہوگا

زندگی تم بھی گزاروگے کسی اور کے ساتھ
دل کے اندر تو کوئی اور ہی بستا ہوگا

زخم کھائے ہیں بہت ہم نے محبت میں امان
اب تو ہم اُس کے ہی ہوں گے جو ہمارا ہوگا

اختر امان

تجھ سے پہلے بھی کسی اور کو چاہا ہم نے
ایک ہی شخص کو ہر شکل میں ڈھونڈا ہم نے

جستجو اور کی تھی جو لیے پھرتی تھی ہمیں
ورنہ سب وقت ترے ساتھ گزارا ہم نے

کیا کوئی چاند خلاؤں میں کہیں ڈوب گیا
تیری آنکھوں میں بھی دیکھا ہے ستارا ہم نے

سیر ہو کر بھی پئیں پھر بھی نہیں بجھتی پیاس
دشتِ دنیا میں عجب دیکھا تماشا ہم نے

گرچہ پہلے سا تعلق تو نہیں اُس سے مگر
جو محبت کا تقاضا تھا نبھایا ہم نے

یہ کرشمہ تو فقط حسنِ نظر کا ہے امان
سب نے اُس گل کو ہے چاہا جسے چاہا ہم نے

○

ایوب خاور

ہوا نے رت کو تماشا بنا دیا آخر
چراغ شیشہ و دل کو بجھا دیا آخر

فصیلِ کوچہ پندارِ جاں کی لرزش دیکھ
کسی نے آج اسے بھی گرا دیا آخر

گزر گئے مرے موسم، بکھر گئے میرے خواب
نظر کے سامنے صحرا بچھا دیا آخر

بس ایک خواب سا بھیجا تھا میرے نام
ہوائے زرد نے وہ بھی گنوا دیا آخر

وہ کچھ نہ تھا مگر اک خامشی کا قصہ تھا
کہیں کہیں سے اُسے بھی سنا دیا آخر

اور اب کی بار تو میری اَنا تھی اُس کا ہدف
سو مَیں نے صلح کا پرچم جلا دیا آخر

○

ایوب خاور

رات اُتری شام آثاروں کے بیچ
دشت کے اور دشت کے ماروں کے بیچ

اِک زمانہ گوش بر آواز ہے
ایک چپ اور کتنی دیواروں کے بیچ

ایک خیمہ خیمہ ہوا کی زد میں ہے
اِک دیا روشن ہے بنجاروں کے بیچ

اِک فراق آثار لمحے کا نزول
ڈوبتی آنکھوں کے نظاروں کے بیچ

پھر وہ موسم لوٹ کر آیا نہیں
ایک خوشبو ہے سفر زاروں کے بیچ

اُس قبیلے میں سبھی سردار تھے
اور مَیں تنہا تھا دستاروں کے بیچ

بادباں دشمن ہوا کے ہاتھ میں
اور سفر تقسیم، منجدھاروں کے بیچ

حکمِ حاکم ہے کہ سچ بولے کوئی
آئینہ رکھا ہے بازاروں کے بیچ

ایوب خاور

ثواب ہوں کہ عذاب اپنے سر لیے رکھنا
ہوائے تند کی زد پر مگر دیے رکھنا

عجب نہیں کہ ہوا اپنا رُخ بدل ڈالے
جو ہوسکے تو ابھی بادباں کھُلے رکھنا

حصارِ آئینہ و ذات سے نکلنے تک
شکستِ ذات کا منظر سنبھال کے رکھنا

یہ بارگاہِ محبت ہے اس کی خلوت میں
مرے حریف قدم احتیاط سے رکھنا

گرا دیا جسے اِک بار اپنی نظروں سے
پھر اس کو خواب کی حد سے بھی کچھ پرے رکھنا

فرازِ کوہِ شبِ غم سے دیکھنا ہے اُسے
مرے خدا مرے حصّے کے رتجگے رکھنا

ایوب خاور

جب گئے ہیں ثواب سے زیادہ
نیندوں کے حساب سے زیادہ

اندر سے سُلگ رہی ہے مٹی
دریا کے عتاب سے زیادہ

موسم کا زوال جھیلنا ہے
خوشبو کو گلاب سے زیادہ

دیکھیں گی ہمیشہ میری آنکھیں
تجھ کو تیرے خواب سے زیادہ

وہ لمحۂ وصل ہو کہ جس میں
پڑھنا ہو نصاب سے زیادہ

جینے کو ترس رہی ہے دنیا
جینا ہے عذاب سے زیادہ

بادل بھی ہے، مَیں بھی اور دونوں
پیاسے ہیں سراب سے زیادہ

○

انعام الحق جاوید

سورج مری امید کا ڈھل جائے گا اِک دن
یہ آخری کانٹا بھی نکل جائے گا اِک دن

پل بھر میں سبھی رابطے ہو جائیں گے بے بس
یہ چال وہ چُپ چاپ ہی چل جائے گا اِک دن

پتّوں کی طرح خاک میں مل جاؤں گا مَیں بھی
وہ پھول بھی خوشبو میں بدل جائے گا اِک دن

اِک روز بڑی دیر سے نکلے گا یہ سورج!
دن وقت سے کچھ پہلے ہی ڈھل جائے گا اِک دن

اِک روز فلک ٹوٹ کے برسے گا زمیں پر
پاؤں مری دنیا کا پھسل جائے گا اِک دن

مَیں دھوپ سے ٹکراؤں گا جس شخص کی خاطر
وہ برف کی محفل میں پگھل جائے گا اِک دن

جلیل عالی

تھے نگاہوں میں جن راستوں کے شجر، اور تھے
دل مسافر کو درپیش تھے جو سفر اور تھے

بس رہا تھا مری سوچ کے آسمانوں پہ جو
اور ہی شہر تھا اس کے سب بام ودر اور تھے

وہ جو چہروں پہ لکھا ہوا خوف تھا اور تھا
وہ جو سینوں کے اندر پنپتے تھے ڈر اور تھے

سب جبینیں وہاں تھیں زمیں بوسیوں میں مگن
کٹ کے کچھ اور اوپر اٹھے تھے جو سر اور تھے

شوق طغیانیوں میں بھی سنبھلی رہیں دھڑکنیں
ڈوب کر جن میں ابھرا نہ دل وہ بھنور اور تھے

اُن زمانوں میں بھی اپنے قلم کی زباں تھی یہی
لفظ جب شہرِ تحریر میں معتبر اور تھے

○

جلیل عالی

وہ جو صدیوں مرے احساس کا محور ٹھہرا — کیوں مرے لمس کی دہلیز سے باہر ٹھہرا
صبح جلتا ہُوا سورج بھی لگا برف مجھے — مَیں کہ سوچوں کی کڑی دھوپ میں شب بھر ٹھہرا
آنکھ وادی میں بدلتے رہے موسم کتنے — دل دریچے میں سدا ایک ہی منظر ٹھہرا
منزلِ عشرتِ جاں ہم سے گریزاں کب تھی — اپنا ہی عہدِ وفا راہ کا پتھر ٹھہرا
جشنِ تکمیلِ مساوات مناؤ عالی
غمِ دنیا بھی غمِ دل کے برابر ٹھہرا

○

جلیل عالی

دریا میں تو روکی نہ کہیں راہ بھنور نے — ساحل کی ہَوا نے نہ دیا پار اُترنے
پتھر سی لگی دل کے دھڑکنے کی صدا بھی — دیکھے ہیں کئی ایسے مناظر بھی نظر نے
مَیں جب بھی کہیں دل کا سکوں ہار کے آیا — سینے سے سدا مجھ کو لگایا مرے گھر نے
کس تیغِ ستم گار کی منت نہ اُٹھائی — کیا کیا نہ خجل مجھ کو کیا کاسۂ سر نے
یہ کیسا سفر تھا کہ ہر اِک گام پہ عالی
دیوار اُٹھا دی کسی بے نام سے ڈر نے

○

دُرِ شہوار فیروز

بہا کے لے گیا سیلاب کشتیاں اور پھول — ہمیشہ ساتھ رہیں گی یہ آندھیاں اور پھول
مجھے خبر ہے یہی ہے تجھے دلوں کی خوشی — رکھوں گی مَیں بھی کتابوں میں پتیاں اور پھول
سمندروں کے کنارے اگر لگیں پودے — مَیں چُن لوں اپنے دوپٹے میں سیپیاں اور پھول
جہاں ہیں رنگ، وہیں خوشبوؤں کی بارش ہے — یہ سب ملاؤ تو بنتی ہیں لڑکیاں اور پھول
نئی رُتوں میں دلوں پر نکھار آتا ہے
چمن میں جب بھی نظر آئیں تتلیاں اور پھول

○

خالد اقبال یاسر

کسی نے ہم سفری کا ارادہ کب بدلا
قدم قدم سفرِ غم کا لمحہ بدلا

کہیں سکوں نہیں نا مطمئن طبیعت کو
ہزار بار پرندے نے گھونسلہ بدلا

فقط مجھی سے نہ تھی پہچان جس کے پیڑوں کی
بڑھی جو بھیڑ تو میں نے وہ راستہ بدلا

نہیں یہ اور نہیں ہے مجھے تو لگتا ہے
اسی گلاب نے چپ چاپ شاخچہ بدلا

ابھی تو پہلے سہارے میں جان تھی یاسر
ابھی سے کس لیے اس نے وہ آسرا بدلا

○

زاہد فخری

اکھڑے ہوئے سانسوں کا سفر یاد رہے گا　　مرجانے پہ بھی جاں کا نگر یاد رہے گا
بھولے گا نہ ذہنوں سے کبھی یوسف دوراں　　اس شہر کو وہ شہر بدر یاد رہے گا
جو حبس کے موسم میں ہوا بانٹ رہا تھا۔
اس شخص کے ہاتھوں کا ہنر یاد رہے گا
شاہوں کے بڑے نام کسے یاد رہیں گے　　نیزے پہ اٹھایا ہوا سر یاد رہے گا
ہجرت کا سفر ہی تو وراثت کا سفر ہے　　جانا ہے کسی اور نگر یاد رہے گا
فخری یہ نیا شہر بڑا خوب ہے لیکن
تجھ کو تیرا چھوڑا ہوا گھر یاد رہے گا۔

○

زاہد فخری

لوگ تھے سہمے ہوئے وہ شہر کم آباد تھا
موسم خوشبو میں ان کو پچھلا موسم یاد تھا
ٹہنیاں اور پھول شرمندہ تھے اپنے حسن پر
اپنے گرد و پیش سے بیزار آدم زاد تھا
اپنے کانوں سے سنیں ہیں اپنی آوازیں وہاں
جس نے شہر سنگ میں جو کچھ کہا بے داد تھا
روشنی مانگی تھی لیکن سرخ انگارے ملے
ہر گلی کے موڑ پر برجستہ فریاد تھا
پیار کا صحرا انہیں گھیرے ہوئے تھا چار سمت
ویسے ہر کاندھے پہ فخری تیشۂ فرہاد تھا

اصغر علی شاہ

ہم جی رہے کہ زیست کے آثار ہی نہیں
گویا کہ جسم و جاں سے سروکار ہی نہیں

سینے میں کسمساتا ہے سانسوں کا سلسلہ
پر وہ چھری کہ جس کی کوئی دھار ہی نہیں

زیر و بم نفس کے سبب سے صراطِ عمر
زندانہ وار بھی ہے۔ لگاتار ہی نہیں

مہنگائیوں سے اس قدر ارزاں ہوئی حیات
عموں دھری ہوئی ہیں، خریدار ہی نہیں

آخر پڑے گا صورِ اسرافیل پھونکنا
صدیاں گذر گئیں، کوئی بیدار ہی نہیں

رہرو فریب خوار ہے رہبر فریب داد
دونوں جواریوں کو کبھی ہار ہی نہیں

مُنیب افغانی

سرِ آبِ رواں گھر مت بناؤ
ہواؤ! ایسا منظر، مت بناؤ

یہاں ہیں آئینے پتھر پہ حاکم
ہمارے شہر میں گھر مت بناؤ

ڈرو تعبیر سے اے کشتی بھنو
گھروندوں کا سمندر مت بناؤ

نئی رستیں بنانے والے لوگو،
پرانا بُت ہو پر سر مت بناؤ

فہیم اصغر

ہم لوگ کب سے اپنے خوابوں میں بند ہیں
سب کے دل و دماغ سرابوں میں بند ہیں

کہتے ہیں ہم کہ ایک جہاں ہے حباب میں
اور سر چھپائے کب سے حبابوں میں بند ہیں

یارب سزائیں ختم بھی ہوں ایک مجرم کی
نظرِ کرم کہ لوگ عذابوں میں بند ہیں

بس زندگی کے اور ہی کچھ ضابطے رہے
یوں تو اصول سارے کتابوں میں بند ہیں

اب دیکھئے فہیم کہ تعبیر کب ملے
اب تک خیال و فکر تو خوابوں میں بند ہیں

○

سراج منیر

سراسیمہ ہمیشہ پرتو مہتاب میں رہنا
بہت مشکل ہے ساری عمر اس کے خواب میں رہنا

ہماری آنکھ کا بے اشک ہونا موسم گل میں
تمہارے عکس کا اس قریۂ بے آب میں رہنا

خدا جانے در و دیوار کو کیا دن دکھائے گا
مکانِ خاک کا ہر دم کفِ سیلاب میں رہنا

اجل کی سرزمیں تک بھی مجھے لے جائے گا اک دن
مسلسل جستجوئے صورتِ نایاب میں رہنا

عجب کچھ ربط رکھتا ہے غمِ ہجراں کے منظر سے
چراغ دل کا اس کے نام کی محراب میں رہنا

○

سراج منیر

یہ زمینِ گل ہے کیسی، سرِ آسمان کیا ہے
جو کھلا ہے اب نظر پر وہ نیا جہان کیا ہے

تجھے کیوں پسند آیا مری دسترس میں رہنا
کوئی رمز اس کرم کی مرے میہمان کیا ہے

تو چراغ و آئینہ ہے، سبھی دیکھتے ہیں لیکن
مری آنکھ جانتی ہے، ترے درمیان کیا ہے

کوئی چاند وصل کا ہے، کوئی ہجر کا ستارا
یہ چراغِ شام جیسا، سرِ بادبان کیا ہے

سرِ باد و خاک میری یہ عجیب الجھنیں ہیں
کہ نشانِ مہر و مہ میں کوئی بے نشان کیا ہے

ہے ازل سے میری منزل نئی ہجرتوں میں جینا
مرے ہمسفر ستارے، تری داستان کیا ہے

○

سراج منیر

دل ادھر گم نشۂ زورِ جوانی میں رہا
اور ادھر دریائے عمر اپنی روانی میں رہا

یہ سپہرِ نیلمیں اور پارۂ ابرِ سفید
میں بہت حیران تیری اس نشانی میں رہا

آنکھ لگنے دی نہ دردِ ہجر نے پل بھر کبھی
یہ خزانہ تھا میں اس کی پاسبانی میں رہا

لوگ سارے اپنے اپنے خواب میں کھوئے رہے
میرا دل بھی مست یادِ یارِ جانی میں رہا

کیمیا اس خاک کو یہ آنچ آخر کر گئی
پرتوِ عشقِ ازل جو قلبِ فانی میں رہا

خوفِ دنیا مار دیتا پر سراج اس نام سے
ایک احساسِ تحفظ ناتوانی میں رہا

سراج منیر

چراغ چشم اور تمہارا چہرہ کسی نے ہم خواب کر دیا ہے
یہ ایسا منظر ہے جس نے خلقِ خدا کو بے تاب کر دیا ہے
وہ رنج کیا ہے کہ جس سے سرسوں ہمارے چہروں پہ پھولتی ہے
یہ کیسا جادو ہے جس نے تیرے بدن کو شاداب کر دیا ہے
میں جوڑتا ہوں تمام آنکھوں سے بہنے والے لہو کے قطرے
انہیں کو پھیلا کے عمر بھر میں یہ دشت سیراب کر دیا ہے
یہ کن عذابوں کے جھٹپٹے میں نگاہیں پتھرا رہی ہیں آخر
کشیدہ قد، سرو قامتوں کو یہ کس نے محراب کر دیا ہے
یہ رات کچھ دور ہے ابھی تک مہ و ستارہ کی دسترس سے
سو ہم نے فی الحال اک دیئے کو بجائے مہتاب کر دیا ہے
چراغ تھا ایک جل رہا تھا، ہمارے سینے کے طاقچے میں
وصال کے موسموں نے آکر اسی کو نایاب کر دیا ہے

سراج منیر

کوئی لو سی شمع سحر کی تھی، کہیں اک گلاب کے روبرو
مری ساری عمر گذر گئی، اسی ایک خواب کے روبرو
کوئی صبح ہو، کوئی شام ہو، میں وہ پھول تیرے چمن کا ہوں
جسے شوق رکھتا ہے سو بہ سو اسی آفتاب کے روبرو
میں پلٹ گیا تری سمت سے، کئی سال مجھ پہ گذر گئے
نہ ترے کرم کے ہوں سامنے نہ ترے عتاب کے روبرو
کبھی رنج عمرِ فضول کا رہا مجھ کو سایۂ تاک میں
کہیں ایک حیرت دائمی شجر و سحاب کے روبرو
مجھے آج آکے پتہ چلا کہ تمام عمر دھرا رہا
کسی اور خواب کا آئینہ، کسی اور خواب کے روبرو

سراج منیر

مرے چراغوں کی لو سے آگے ابھی ستاروں کا سائباں ہے
یہ رات خالی نہیں ہے اس میں ہزار خوابوں کی کہکشاں ہے

وہ چشم و لب جل رہے ہیں مجھ سے نئی محبت کے آئینے میں
نگاہِ نم کو مگر یقیں ہے کہ خواب تو یہ بھی رائیگاں ہے

میں اس کے ہونٹوں کو کیسے چھو لوں، کہ خلوتِ شمع و آئینہ میں
قدیم یادوں کے فاصلے تک ابھی کوئی آنکھ درمیاں ہے

نگاہِ حیرت یہ پوچھتی ہے جہانِ تازہ کی سرحدوں پر
یہ کیسے پھولوں کی سرزمیں ہے، یہ کن ستاروں کا آسماں ہے

مجھے خبر ہے کہ اس سے آگے کسی ستارے کی لو نہ ہوگی
یقیں کی منزل گذر چکی ہے، یہاں سے اب سرحدِ گماں ہے

زاہد مسعود

نقاط ہم خط جو ہو نہ پائے وہ مستقل انتشار میں ہیں
ہم ایک ہی مستوی میں رہ کر بھی اپنے اپنے مدار میں ہیں

ہمارے سب خواب روشنی کے ٹھٹھرتی راتوں کی چاندنی ہیں
کرن کرن شبنمی مسافر سحر سحر انتظار میں ہیں

وہ لوگ جو شب کی سلطنت میں ہتھیلیوں پر چراغ لائے
صلیب بر دوش سرکشیدہ صعوبتوں کے حصار میں ہیں

ہمیں تھے شاید کہ آئینوں کو فریب دینے کے زعم میں تھے
اب عکس اپنے اُبھر چکے ہیں تو آئینے بھی وقار میں ہیں

چلو کہ پھر سے بصارتوں میں گریز کی ساعتیں سجا لیں
یہ ہجرتوں کے اسیر لمحے مفارقت کی قطار میں ہیں

زاہد مسعود

سماعت کے صحیفوں میں لبوں کی جنبش تحریر کر لینا
صدا کے لمس سے محروم لفظوں کی کوئی تفسیر کر لینا

کہیں ایسا نہ ہو ردِّ دعا کی آیتیں منسوخ ہو جائیں
شبِ تنسیخ سے پہلے ندامت کی ذرا تشہیر کر لینا

جو سمتیں مختلف ٹھہریں خطوں کو جوڑنا ممکن نہیں ہوتا
مثلث کھینچنا چاہو اگر تو زاویے زنجیر کر لینا

نئے موسم پرانے زائچوں سے عین ممکن ہے گریزاں ہوں
پرندو درمیانی مرحلے میں گھونسلے تعمیر کر لینا

سسکتی خواب گاہوں میں کبھی جاگے وصالِ کرب کی خواہش
تو آنکھوں میں اُبھرتی ڈوبتی سی شام کو تسخیر کر لینا

زاھد مسعود

اُفق کی تیرگی نے آئینوں میں عکس پھیلائے گھنیرے سائبانوں کے
شبِ اسرار کی گرد میں کھیلیں تو روزنوں میں خواب جاگیں آسمانوں کے
ذرا ٹھہرو پسِ دیوار بھی سرگوشیوں میں اسم کی ترتیب ہو جائے
مقفل در چٹخنے کی صدا کا زہر پی لیں گے مکیں سوئے مکانوں کے
بھری چوپال میں قصہ فروشانِ سحر کے آخری کلمات باقی تھے
الاؤ کی لرزتی روشنی میں بجھ گئے منظر ہماری داستانوں کے
جزا کی ساعتوں کا کوئی آوازہ گلی کے آخری گھر تک نہیں پہنچا
چھتوں پر گھونسلوں میں پر تراشیدہ رہے امکان نئے دن کی اڑانوں کے
جلیں گی برف کی آنکھیں تو پھر نیلے پرندے ساحلوں کی ریت چومیں گے
ہَوا ٹھہرے ہوئے پانی پہ لکھے گی دعا نامے شکستہ بادبانوں کے

سید جاوید

کل سپنا تھا کل کے وعدے جھوٹے تھے — رنگ برنگے سارے جذبے جھوٹے تھے
ڈھلتا سورج کتنا بے بس لگتا تھا — شام کے منظر دھول کی گھر میں بیٹھے تھے
لمحے تھے کہ پروائی سی چلتی تھی — ہر اک پل کچھ زخم سے کھلنے لگتے تھے
جینے کا سرمایہ بس کچھ خواب سراب — اصلی سکوں پر کچھ سانپ سے بیٹھے تھے
جن جن رستوں سے وہ مجھ میں اترا تھا — آنکھوں میں وہ سارے نقش سلگتے تھے
ان ہونٹوں نے جو کچھ بھی فرمایا تھا — دل پر وہ الفاظ وہ لہجے لکھے تھے
اب اُن کے جاوید اشارے کیا سوچیں
آنکھوں نے بھی شاید جھوٹ ہی بولے تھے

سید جاوید

نہ جانے کیسی انوکھی گھڑی میں اُترا تھا — جو ساری عمر نہ گزرا عجیب لمحہ تھا
میں لفظ لفظ تراشوں اسی کے خدوخال — یہ میری سوچ پہ کیسا جمال اُترا تھا
عجیب باتیں تھیں اُس کی عجیب افسانے — وہ جس کے پاس بھی ہوتا اُسی کا لگتا تھا
ملا تھا مجھ سے بچھڑنے کے واسطے شاید
وہ چاند میرا نہیں تھا جو مجھ پہ اُترا تھا

سید جاوید

سروں تک پانیوں میں چل رہا ہوں — میں اپنے سے بھی ہلکا ہو گیا ہوں
ہوا چلتی تو جل بجھتا کبھی کا — گھٹن میں ہوں سلگتا جا رہا ہوں
لبوں پر ہوں تو میرا نام بولو — میں اپنا نام سننا چاہتا ہوں
نہ کچھ جاوید سوجھے اس کے آگے
چلا جائے تو کیا کچھ سوچتا ہوں

سید جاوید

ٹھنڈے ٹھار وجود کے اندر آگ سُلگتی لگتی تھی
یاد کے سُوکھے جنگل میں اِک چنگاری سی بھڑکی تھی
جِسے کو محصُور کیا تھا جانے کیسے جذبوں نے
رنگ برنگے خوابوں کی اِک دھنک سی رُخ پہ بِکھری تھی

ایسے لُطف لیا کرتی تھی کبھی تو مجھ سے باتوں میں
جیسے اندر ساجھ ستار پہ میٹھی دُھن چھڑ جاتی تھی
ہر ایک شے میں بول رہا تھا جادُو اس کے ہونے کا
ہر اِک شے میں اُس نے جیسے اپنی شوخی بھردی تھی

اب سب اس بھرپور جوانی کا سکہ مانیں تو کیا
مجھ کو ہی یہ فخر کہ سب سے پہلی گواہی میری تھی
چاروں سمت اندھیرا تھا پر آئینے کی آنکھوں میں
روشنی کی اِک آدھ کرن جاوید کہاں سے اُتری تھی

عتیق جیلانی

سبز بناتا ہوں پُل ، دریا پار نہیں کرتا
مَیں رستے اپنی خاطر ہموار نہیں کرتا

ویسے تیر کمان لیے پھرتا ہوں گلیوں میں
وقت پڑے تو چھپ جاتا ہوں وار نہیں کرتا

دُکھ مجھ کو اپناتے ہیں مَیں دُکھ اپناتا ہوں
لیکن اپنے روز و شب دُشوار نہیں کرتا

سرسبزی اور سائے کی خواہش تو ہے لیکن
موسم کی تبدیلی سے انکار نہیں کرتا

دنیا کے میلے سے مَیں چُپ چاپ گزرتا ہوں
جاں پر بے اندازہ دُکھ لکھ بار نہیں کرتا

عتیق جیلانی

بھروسہ ساعتِ درکار پر تھا
سو مدّت سے دیا دیوار پر تھا

مرے اطراف بھی منظر بہت تھے
مگر دل دُور کے اسرار پر تھا

زمین و آسماں ہاتھوں میں تھے اور
قدم اِک ساعتِ دُشوار پر تھا

بصارت اِک مسلسل دُکھ ہے اور مَیں
بہت دن سے اسی بیگار پر تھا

عتیق اپنے لیے کُل آب و دانہ
اسی معمورۂ آزار پر تھا

عتیق جیلانی

بادل مجھ سے آگے آگے اُڑتا جاتا تھا
مَیں روزانہ پیاسا آتا پیاسا جاتا تھا

بڑھتے قدموں میں زنجیریں ڈالی جاتی تھیں
مجھ کو میرے گھر سے روز پکارا جاتا تھا

مَیں اپنی اِک اِک ساعت کا سب حاصلِ تفریق
خاموشی سے لوحِ جاں پر لکھتا جاتا تھا

لوگ گھروں میں بیٹھے مجھ پر ہنستے رہتے تھے
مَیں جنگل سے خوشبو لینے تنہا جاتا تھا

عتیق جیلانی

فسونِ خوش نظر سے واپسی پر — اندھیرا ہے سفر سے واپسی پر
وہی لاحاصلی کا روگ ہے پھر — خمارِ بے ثمر سے واپسی پر
نیا اِک سلسلہ حیرانیوں کا — سکوتِ بام و در سے واپسی پر
سپاہی مورچوں میں سو رہے ہیں — صفِ تیغ و تبر سے واپسی پر
پرندے خاک صورت گر رہے ہیں — حصارِ بال و پر سے واپسی پر
وہی خوابِ سفر ساعت لہو میں — فروزاں ہے سفر سے واپسی پر
عتیق احمد کئی جگنو ملے تھے
مجھے دشتِ خبر سے واپسی پر

عتیق جیلانی

سفر کے دن تھے اور بے ثمر گیا تھا ایک دن — عتیق زیرِ سایۂ شجر گیا تھا ایک دن
سفید چاند ہاتھ میں لیے طلوع ہوئی تھی شب — فصیلِ دشتِ شام سے گزر گیا تھا ایک دن
میں جمع کر رہا ہوں روز و شب کی ساری ساعتیں — بہت دنوں کی بات ہے بکھر گیا تھا ایک دن
بجھا ہوا چراغ تھا اور آس پاس کچھ نہیں
میں مدتوں کے بعد اپنے گھر گیا تھا ایک دن

عتیق جیلانی

اندھیرا تھا، دریچہ سامنے تھا — وہ چہرہ تھا، اُجالا سامنے تھا
نئے موسم مرتب ہو رہے تھے — نئی دنیا کا نقشہ سامنے تھا
اُسی انجان رستے کی رفاقت — وہی تنہا ستارہ سامنے تھا
حدیثِ ہجر از بر ہو رہی تھی — کتابِ جاں کا صفحہ سامنے تھا
مری اپنی انا کا مسئلہ تھا — مرا اپنا حوالہ سامنے تھا
عتیق احمد وہی پیاسی طلب تھی
وہی بے انت صحرا سامنے تھا

کیف جاوید

تیرگی نے روشنی کا راستہ رکھا نہیں اب ہَوا کے رُخ پہ کوئی بھی دیا رکھا نہیں
کشتیاں اپنی سرِ ساحل جلا کر آئے ہیں ہم نے واپس لوٹنے کا راستہ رکھا نہیں
کر دیا ہے کیوں مجھے بیباک اتنا آپ نے اپنے میرے درمیاں کیوں فاصلہ رکھا نہیں
زلزلوں پر رکھ دیا ہے سنگِ بنیادِ خیال کاوشِ فن کو زمانے سے چھُپا رکھا نہیں
وہ سمجھ پائے گا کیونکر جیت کے مفہوم کو
کیفؔ جس نے ہارنے کا حوصلہ رکھا نہیں

کیف جاوید

کبھی اِس بات کے بارے میں بھی سوچا ہے اے دریا
ترے پانی کو اِک دن خشک بھی ہونا ہے اے دریا
کناروں نے ہمیشہ دوستی تجھ سے نبھائی ہے
سدا تُو نے ہی اپنا راستہ بدلا ہے اے دریا
تری موجوں کی طغیانی کو یہ بھی سوچنا ہوگا!
کنارے پر ترے اِک گاؤں بھی بستا ہے اے دریا
میری بے چینیوں پر اس قدر حیرت زدہ کیوں ہے
کبھی تُو نے کسی کا راستہ دیکھا ہے اے دریا
تجھے حق کی پیاسی کھیتیاں سیراب کرنی ہیں
تجھے باطل کنارے توڑ کر بہنا ہے اے دریا
بجھانی ہے تجھے بارش کی صورت پیاس صحرا کی
سمندر سے تجھے پھر لوٹ کر آنا ہے اے دریا
مَیں سطحِ آب پہ تُو ریت پہ چہرے بناتا ہے
مری طرح سے شاید تُو بھی دیوانہ ہے اے دریا
قسم کھائی ہے تُو نے بھی ڈبونے کی مگر سُن لے
سفینہ کیفؔ کو بھی پار پہنچانا ہے اے دریا

ستّار سیّد

بنتے مٹتے زاویے دستِ شفق پر دیکھنا
ایک اِک کر کے کھُلیں گے سارے منظر دیکھنا

شاید اس خوشبو کی آہٹ شہر نے محسوس کی
بے سبب کھُلتے نہیں ہیں روزن و دَر دیکھنا

بولتی آنکھوں میں تھا شامِ جُدائی کا ملال
بھُولتا کیسے مجھے اُس کا وہ مُڑ کر دیکھنا

ضبط اتنا بھی کرو نا قدر نہ اپنے آپ پر
اب نہ بولو گے تو ہو جاؤ گے پتھّر دیکھنا

بن گئے ریگِ رواں پر تشنگی کے خدوخال
پیاس کے صحرا کی اُس جانب سمندر دیکھنا

وہ ترا آنگن میں میٹھی نیند سونا رات کو
وہ ستاروں کا تجھے سوتے میں چھُپ کر دیکھنا

ستّار سیّد

کبھی شامِ غم کی پناہ میں اُسے دیکھنا
کبھی اُجلی صُبحوں کی راہ میں اُسے دیکھنا

کبھی ڈھونڈنا اُسے راستوں کے غبار میں
کبھی دھڑکنوں کے نواح میں اُسے دیکھنا

کبھی دیکھنا اُسے دوستوں میں انیسِ جاں
کبھی دشمنوں کی سپاہ میں اُسے دیکھنا

کوئی رات اُس کی اُمید میں ہمیں جاگنا
کسی خوابِ عکس پناہ میں اُسے دیکھنا

کبھی ساحلوں کی ہواؤں میں اُسے سوچنا
کبھی پانیوں کی اتھاہ میں اُسے دیکھنا

نورین طلعت

ہم سے ناراض، کہ کم ظرف کو کمتر لکھّا!
اُس سے خوش ہے کہ اُسے جس نے بلند تر لکھّا

کچھ بھی معنی اِسے پہناؤ، تمہاری مرضی
ہم نے جو کچھ بھی لکھا، سوچ سمجھ کر لکھّا

تُو نے لکھّا تھا مرا نام درختوں پہ فقط
مَیں نے لکھّا تو ترے نام کو دل پر لکھّا

ہم سمندر کو چھُپاتے پھرے دل میں لیکن
لکھنے والوں نے تو قطرے کو سمندر لکھّا

لوگ بھی کو مقدّر کا لکھّا مانتے ہیں
اور وہ شخص کہ خود جس نے مقدّر لکھّا

جب بھی تنہائی میں سوچا کبھی، تجھ کو سوچا
اور کوئی شعر جو لکھّا ہے تو تجھ پر لکھّا

سوچ پر تو کوئی قدغن بھی نہیں لگ سکتی
سامنے کہہ نہ سکے جو، وہی چھُپ کر لکھّا

علی اکبر عبّاس

قطرے سے بھی پوچھو تو کہے ذاتِ سمندر
جیبوں میں لیے پھرتی ہے برسات سمندر

یوں دامنِ مقصد کا نہ بھیگے کوئی کونہ
ڈھونڈنے کو تو ملتے ہیں یہاں سات سمندر

یہ عرصۂ تشنہ لبری سر ہو تو کیسے
اِک ہات جو صحرا ہے تو اِک ہاتھ سمندر

ہیں صبح و مسا سبز و تر و تازہ جزیرے
اِس شہرِ جواں گرد کے دن رات سمندر

آزردہ و سر آمدہ، ہر عہد بلا باش
ہر حال میں ہے صورتِ حالات سمندر

ناصر بلوچ

پیڑوں کی گلیوں میں وہ برسات لگی
ساون دیس کی مہندی رُت کے ہاتھ لگی

جلیٹھ اساڑھ کی دھوپ ننگی شاخوں لے
تب پیڑوں پر آموں کی سوغات لگی

پھر سبزوں کا سونا ڈھل کر کھرا ابھرا
نئی نویلی ہم کو اپنی ذات لگی

وصل کی کلیاں چٹکیں، پر اک آدھ روش
ہجر کی رُت تو ہر ٹہنی ہر پات لگی

کون ہیں میرے دشمن کوئی پہچانو
کیسا جال بچھا ہے کیسی گھات لگی

ناصر بلوچ

اوٹ میں پربت کی جب سورج ڈھلتا ہے
بہتی آگ سے پانی آگے چلتا ہے

بیت گئی ہے میٹھے سپنوں جیسی رات
زہر بھرا دن اپنی آنکھیں ملتا ہے

وقت کی تیز روانی میں بھی یاد ہے تو
کس آندھی میں کیسا دیپک جلتا ہے

ظرفِ زمیں کا کم پڑ جاتا ہے جب بھی
تب پتھر سے چشمہ پھوٹ نکلتا ہے

مر جاتے ہیں کھینچ کے رنج و غم ناصر
دل ہے اِک جو دردکے رزق پہ پلتا ہے

○

وضاحت نسیم

مری تنہائیوں کا رازداں ہے
تصور تیرا کتنا مہرباں ہے

تکلف آپ مت کیجے ستم کا
ابھی سر پر ہمارے آسماں ہے

کہاں سے لائیے گا یہ حرارت
کہ جیسی زندگی شعلہ بجاں ہے

دعا کرتی ہے خاموشی صدائیں
مگر میری کوئی سنتا کہاں ہے

تمہیں اپنا کہیں یا غیر سمجھیں
یہ کیسا ربط اپنے درمیاں ہے

رہے ممنون جس کے زندگی بھر
وہ چاہتا اب نصیبِ دشمناں ہے

خیال افروز ہے ہر بات لیکن
ہم ایسوں کو نصیحت رائیگاں ہے

○

وضاحت نسیم

اس طرح ملیے کہ پچھلا زخم بھی تازہ نہ ہو
اور ہم کو اگلی رنجش کا بھی اندازہ نہ ہو

خواہشیں بن کر فصیلیں اتنی اونچی ہو گئیں
لگ رہا ہے شہر دل میں جیسے دروازہ نہ ہو

دھوپ نے کملا دیئے ہیں کیسے کیسے برگ و گل
اب ہوا آئے تو شاید اس قدر تازہ نہ ہو

شہر والے پر تکلف، پر تصنع، پر فریب
زندگی ان کے لیے بالکل ہی بے غازہ نہ ہو

سچ کی باتیں یقیناً رنج دیتی ہیں مگر
اعتماد اتنا ہے چہرے سے اندازہ نہ ہو

○

وضاحت نسیم

تھا وہی لہجہ مگر بارِ دگر کیسا لگا
دوسرے لمحے میں وہ نامعتبر کیسا لگا

ملنے والوں سے ملائی جب نظر کیسا لگا
منتظر پائے جب اپنے بام و در کیسا لگا

خواہشوں کا اور جذبوں کا اثر کیسا لگا
یہ بتاؤ خود کو تنہا جان کر کیسا لگا

دن گزرنا تو بہت آساں ہوا ہوگا مگر
جاگتی راتوں میں خوابوں کا نگر کیسا لگا

شوق تھا جس سے بچھڑ جانے کا بہت شاید تمہیں
جب نہ آیا اتنے دن کوئی نظر کیسا لگا

ایک تو زخمی پرندہ اور پھر پنجرے میں قید
اس پہ جب دیکھا اسے بے بال و پر کیسا لگا

محمد اظہار الحق

نمک ان آنسوؤں میں کم نہ تھا، پر، نم بہت تھا
گھروں میں دانۂ گندم نہ تھا، ماتم بہت تھا

مری آنکھوں پہ بھی زرتار پردے جھولتے تھے
ترے بالوں میں بھی کچھ ان دنوں ریشم بہت تھا

مزے سارے تماشا گاہِ دنیا میں اٹھائے
مگر اک بات! جو دل میں تھی جس کا غم بہت تھا

سیاہی رات کی پیچھے، سمندر دن کا آگے
ستارہ صبح کا میری طرح مدھم بہت تھا

بدلتے جا رہے تھے جسم اپنی ہیئتیں بھی!
کہ رستہ تنگ تھا اور یوں کہ اس میں خم بہت تھا

محمد اظہار الحق

ابھر اس جھاگ پر اے غیب کے ہاتھ
تھمے اب یہ سفر اے غیب کے ہاتھ

کوئی عزت نہیں ان چیتھڑوں میں
مجھے دے کرّ و فر اے غیب کے ہاتھ

کسی تیری ہی دنیا کا نگینہ
مری انگشت پر اے غیب کے ہاتھ

بنیں یہ انگلیاں رنگت ابر کی
کوئی ایسا ہنر اے غیب کے ہاتھ

مقید ہوں میں کالی کوٹھڑی میں
مہیا کر ثمر اے غیب کے ہاتھ

محمد اظہار الحق

بریدہ گیسوؤں میں آنکھ کا رستہ نہیں تھا
وہ چہرہ خوبصورت تھا مگر دیکھا نہیں تھا

میں جب ساحل پہ اترا خلق میری منتظر تھی
کئی دن ہو گئے تھے، بادشہ ملتا نہیں تھا

بلاتے تھے ہمیں انجیر اور زیتون کے پھل
مگر وادی میں جانے کا کوئی رستہ نہیں تھا

تنا یاقوت کا، شاخیں زمرد کی بنی تھیں
ثمر لعل و گہر تھے، نخل کا سایہ نہیں تھا

پروں میں آبگینے، منقار میں تاجِ شہی تھا
پرندہ قاف سے آیا مگر اڑتا نہیں تھا

نقطۂ نظر

سلیم احمد ۔ فتح محمد ملک

اقبالؒ اور سرزمینِ پاکستان

(دو دوستوں میں مکالمہ)

برادرم فتح محمد ملک صاحب!

سلام مسنون!

"معاصر" کے پہلے شمارے میں آپ کا ایک وقیع مضمون "اقبال اور سرزمینِ پاکستان" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں آپ نے میرے حوالے سے کچھ باتیں کہی تھیں اور فکرِ اقبال کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالی تھی۔ میں نے معاصر کی تقریبِ رونمائی میں اس مضمون کی تعریف کی اور کہا کہ ہر چند کہ میں حق لفاد اور معترضانہ کا جواب نہیں دیتا لیکن یہ مضمون اتنے خلوص سے لکھا گیا ہے کہ اس کا جواب دینے کو جی چاہتا ہے۔ اب کچھ احباب، جن میں ارباب "معاصر" بھی شامل ہیں، تقاضا کر رہے ہیں کہ میں اس مضمون کے جواب میں کچھ لکھوں۔ میں نے آپ کے مضمون کو دیکھا تو اس میں کچھ باتیں ایسی پائیں جو وضاحت طلب ہیں۔ اس غرض سے آج درجِ ذیل اقتباسات کے بارے میں میرے سوالات کا جواب عنایت فرمائیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ ... اس طرح باہمی مکالمے کی ایک صورت نکلے گی اور مکالمہ آپ جیسے آدمی سے نہ ہو تو پھر کس سے ہو؟

آپ نے لکھا ہے:

"اگر ہم فکرِ اقبال سے روشنی لیں تو یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا اس لیے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کے ہاں وطن سے وابستگی اور اسلام سے محبت میں جو تضاد اور تصادم تھا وہ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اب سرزمینِ پاکستان سے محبت اور اسلام سے وفا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور ہماری جغرافیائی سرحدیں اور نظریاتی سرحدیں ایک ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔"

اس اقتباس میں "اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں" کا حوالہ اہم ترین ہے۔ براہِ کرم کیا آپ بتائیں گے کہ اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کے ہاں وطن سے وابستگی اور اسلام سے محبت میں جو تصادم و تضاد ہے وہ قیامِ پاکستان کے ساتھ کیسے ختم ہو جاتا ہے؟ کیونکہ اقلیتی علاقوں کے مسلمان تو اب بھی اسی تضاد و تصادم سے دوچار ہیں جس سے وہ قیامِ پاکستان سے پہلے دوچار تھے۔ اکثریتی علاقوں کے مسلمانوں کے لیے جغرافیائی سرحدیں اور نظریاتی سرحدیں ضرور ایک ہو گئی ہیں لیکن کیا یہی بات ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے؟ فکرِ اقبال سے

روشنی لینا صرف پاکستان کے مسلمانوں ہی کا تو حق نہیں ہے ہندوستان کے مسلمان بھی اس روشنی میں یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے مسئلہ کا اقبال کے پاس کیا حل ہے؟ اور فکرِ اقبال میں وہ کون سا نکتہ ہے جسے وہ اپنے لیے راہنما بنالیں یہ سوال میں اس لیے کر رہا ہوں کہ قوم اور ملت کی کوئی بحث میرے نزدیک اس وقت وقیع نہیں ثابت ہو سکتی جب تک وہ ہندی مسلمانوں کی حیثیت کا تعین نہ کرے۔

آپ کا دوسرا قابلِ توجہ اقتباس یہ ہے:

"اس کے جواب میں اقبال نے مسلمان قوم پرستی کا نظریہ پیش کیا جس کی رو سے برصغیر کے مسلمانوں پر لازم آتا ہے کہ جہاں جہاں وہ اقلیت میں تھے وہاں سے ہجرت کر کے اس سرزمین سے وابستہ ہو جائیں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور جہاں ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست کا قیام دائرۂ امکان میں تھا"

کیا اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کی مجوزہ ہجرت یعنی مسلمانوں کے نقلِ مکانی کا تصور تحریکِ پاکستان کے زعما کو قابلِ قبول تھا اور کیا آپ اس بات کے حق میں ہیں کہ اقلیتی علاقوں کے مسلمان پاکستان میں آجائیں یا کم از کم ان پر ویزے کی پابندیاں ختم کر دی جائیں اور پاکستان کی سرحدیں اُن کے لیے کھول دی جائیں۔

آپ کے دونوں اقتباسات کے بارے میں میرے سوالات کا خلاصہ اتنا ہے کہ آپ ہندی مسلمانوں کے لیے اسلام اور فکرِ اقبال کی روشنی میں کیا حل پیش کرتے ہیں؟ ہندوستانی قومیت کو تسلیم کر لینا؟ ہندو قوم میں ضم ہو جانا؟ پاکستان کو ہجرت کر آنا؟

مکرمی! براہ کرم یہ بھی ارشاد فرمایئے کہ شعری اسرار و رموز میں اقبال نے قومیت پر جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے نزدیک ہندوستانی قومیت کے حوالے سے ہے یا مجرد طور پر قومیت کی نفی کرتا ہے؟ اس کے علاوہ ان خیالات کی پیدائش کا سبب کوئی وقتی مصلحت ہے یا اسلام کی اساسی تعلیمات؟

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے!

نیاز مند

سلیم احمد

عزیز اور محترم بھائی سلیم احمد صاحب!

السلام علیکم۔

گرامی نامہ ملا۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے میری ایک ناچیز تحریر کو پذیرائی بخشی اور یوں باہمی مکالمے کی صورت نکلی۔ آپ نے پہلا اقتباس میرے مضمون کے جس پیراگراف سے لیا ہے اس کی ابتدائی سطریں درج ذیل ہیں:

"پاکستان کا تصور دراصل زمین سے وابستگی کا تصور ہے یہ ہندی مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطۂ زمین

کے حصول کا تصور ہے اس تصور کو اپنا کر اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں نے بے شک اس سرزمین سے رشتہ توڑا جہاں ان کا منفرد قومی و تہذیبی وجود فنا کے خطرات سے دوچار تھا مگر ہجرت کا یہ عمل ایک ایسی سرزمین سے وابستگی کا عمل تھا جسے تمام ہندی مسلمانوں کے لیے ایک مرکزِ محسوس کی مقدس حیثیت حاصل تھی۔'

ان سطروں میں نہ صرف پہلے اقتباس کے حوالے سے اٹھائے گئے سوالات کا بلکہ دوسرے پیراگراف کے حوالے سے اٹھائے گئے سوال کا جواب بھی موجود ہے۔ پاکستان تمام ہندی مسلمانوں کے لیے قائم کیا گیا تھا، اس لیے جب بھی کوئی مسلمان پاکستان کو ہجرت کرے ہمیں چاہیئے کہ ہم اسے سر آنکھوں پر جگہ دیں ہم اس کے راستے میں رکاوٹ بننے والے کون ہیں؟ وہ تو اپنے خوابوں کی سرزمین اور اپنے مرکزِ محسوس کا رخ کر رہا ہے

جی ہاں! میں اس بات کے حق میں ہوں کہ بھارت کے مسلمان پاکستان ہجرت کر آئیں یا پھر بھارت کے کسی مسلمان اکثریتی علاقے میں ایک اور پاکستان قائم کر لیں۔ فکرِ اقبال کی روشنی میں بھارتی مسلمانوں کو کسی صورت میں بھی بھارتی قومیت کا نظریہ قبول نہ کرنا چاہیئے۔ آج بھی بھارتی مسلمانوں کے لیے اسلامی لائحہ عمل یہی ہے کہ وہ متحدہ بھارتی قومیت کا نظریہ اپنانے کے بجائے جداگانہ مسلمان قومیت پر اصرار کریں۔ اقبال کے تصورِ اسلام کی رو سے اسلام کے اخلاقی مسلک کو اسلام کے سیاسی مسلک سے الگ کرنا اور متحدہ بھارتی قومیت کی تعمیر کی خاطر اسلام کے سیاسی مسلک کو ترک کر دینا ناممکن ہے۔ یہ بات ۱۹۳۰ء میں بھی سچ تھی اور آج ۱۹۸۱ء میں بھی سچ ہے بلاشبہ آج کے بھارت میں جداگانہ مسلمان قومیت پر اصرار کی راہ نہایت کٹھن اور پرخطر راہ ہے مگر بھارتی مسلمانوں کے دینی اور تہذیبی وجود کی بقا کی طرف یہی ایک راہ ہے باقی تمام راہیں مقامِ فنا کو جاتی ہیں۔ ممکن ہے یہ بات مجذوب کی بڑ نظر آتی ہو مگر ۱۹۳۰ء میں اقبال کا تصورِ پاکستان بھی تو مجذوب کی بڑ ہی نظر آتا تھا۔ نئے مصائب اور تازہ تر مشکلات کو دعوت دیئے بغیر قریہ محبت تک پہنچنا محال ہے۔ آج بھارتی مسلمانوں کو مولانا ابوالکلام آزاد کی نہیں مولانا حسرت موہانی کی ضرورت ہے۔

جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں "مثنوی اسرار و رموز" میں قومیت کے موضوع پر اقبال کے خیالات کا سرچشمہ اسلام کی اساسی تعلیمات ہیں مگر اقبال نے اسلام کو اپنے عہد کی دنیائے اسلام کی عمومی اور ہندی مسلمانوں کی مخصوص صورتِ حال کے پیشِ نظر از سرِ نو تفسیر کیا ہے اقبال عمر بھر مجرد تصورات سے کھیلنے کے بجائے اسلام کے زندہ و متحرک تصورات کو عملی زندگی کے ٹھوس قالب میں ڈھالنے میں کوشاں رہے اس لیے انہیں ہمیشہ تصورات کے عملی مؤثرات سے شغف رہا۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے اور میری معروضات کے جواب میں مزید سوالات اٹھائیں گے باقی آپ کا خط آنے پر۔

والسلام۔ مخلص

فتح محمد

برادرم ملک صاحب!

سلام مسنون!

آپ نے میرے سوالات کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے وہ میری توقع کے عین مطابق ہے۔ میں اپنی آسانی کے لیے ان کی تلخیص کر رہا ہوں تاکہ آپ یہ دیکھ لیں کہ میں نے انہیں ٹھیک سمجھا ہے یا نہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ پاکستان تمام مسلمانانِ ہند کے لیے بنا ہے اور اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل یہی تھا کہ وہ اپنے کلچر کو برقرار رکھنے اور اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے پاکستان چلے آئیں یعنی بھارت سے اجتماعی ہجرت یا نقل مکانی کریں۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر وہ ایسا کرنا چاہیں تو ہم انہیں روکنے والے کون ہیں کیونکہ پاکستان تو ان کے خوابوں کی سرزمین ہے اور اس پر ان کا حق ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ یہ نقطۂ نظر خود پاکستان کے لیے کس حد تک قابل قبول ہے میں نے آپ سے ایک سوال اور کیا تھا وہ یہ کہ تحریک پاکستان کے رہنماؤں میں سے وہ کون لوگ ہیں جو اجتماعی ہجرت کے تصور کو قبول کرتے ہیں آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے اجتماعی نقل مکانی کا تصور تحریک پاکستان کے زعماء کو قابل قبول نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ قیام پاکستان کے اعلان پر جب قائد اعظمؒ سے پوچھا گیا کہ اب اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کا کیا ہو گا تو انہوں نے یہ جواب نہیں دیا کہ ان کا وطن بن گیا ہے وہ اپنے وطن آجائیں بلکہ صاف طور پر یہ کہا کہ انہیں بھارت کا وفادار ہو کر رہنا چاہیے کیونکہ کوئی ریاست اپنے غداروں کو برداشت نہیں کرتی۔ آپ ارشاد فرمائیں گے تو مسئلہ زیر بحث سے متعلق ضروری حوالے آپ کی خدمت میں پیش کروں گا آپ نے ہجرت کے تصور کو علامہ اقبالؒ سے منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ مسلمان ہجرت کر کے " اس سرزمین سے وابستہ ہو جائیں جہاں وہ اکثریت میں تھے اور جہاں ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست کا قیام دائرۂ امکان میں تھا " کیا براہ کرم آپ بتائیں گے کہ علامہ مرحوم نے یہ کہاں کہا ہے اور آپ نے کس حوالے سے بات کی ہے؟

اب رہ گیا شعری "اسرار و رموز" کا معاملہ۔ آپ کا ارشاد ہے کہ علامہ نے اسلام کے اساسی تصورات کی نئی تعبیر پیش کی ہے اور "مجرد تصورات سے کھیلنے کے بجائے اسلام کے زندہ و متحرک تصورات کو عملی زندگی کے حوالے سے" دیکھا ہے" میرے نزدیک اس پورے نقطۂ نظر میں کچھ قباحتیں ہیں لیکن کسی اور وقت پیش کروں گا۔ فی الحال تو مجھے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ علامہ نے مثنوی میں جو کچھ لکھا ہے آپ اسے ان کے بنیادی تصورات کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ آپ انہیں قبول کرتے ہیں بس میرے لیے یہی کافی ہے۔

آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "پاکستان کا تصور دراصل زمین سے وابستگی کا تصور ہے" لیکن اقبال مثنوی میں صاف لکھتے ہیں کہ "ملت محمدیہ موسس بر توحید و رسالت است۔ پس نہایت مکانی ندارد   اس عنوان کے تحت جو کہا گیا ہے اس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

جوہر ما با مقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفال جام ماست — رومی و شامی گل اندام ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست — مرز و بوم او بجز اسلام نیست

ان اشعار میں زمین سے وابستگی کی نفی کی گئی ہے اور ان کا خلاصہ یہ ہے "مسلم استی دل باقلیمے مبند گم مشو اندر جہان چون و چند" زمین سے وابستگی کا تصور سیاسی اصطلاح میں وطنی قومیت کا تصور ہے۔ اقبال صاحب کہتے ہیں کہ "وطن اساس ملت نیست" وہ وطن پرستی کے اتنے بڑے مخالف ہیں کہ اسے مسلمانوں میں تو کیا دوسری قوموں میں بھی پسند نہیں کرتے اور ان کا کہنا ہے کہ وطن پرستی ایسی لعنت ہے جس نے عالم مسیحیت کو پارہ پارہ کر دیا اور نوع انسان کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ؎

تا وطن را شمع محفل ساختند — نوع انسان را قبائل ساختند

نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد

اقبال وطن پرستی کو دہریت کا ایک شاخسانہ قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وطن پرستی " مرسل از شیطان " کی ایجاد ہے " مملکت را دین او معبود ساخت فکر او مذموم را محمود ساخت " زمین وطن اور مملکت اقبال مثنوی میں ان تینوں تصورات کی تنقید کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ پر اسلامی تصور کو پیش کرتے ہیں یہ تصور یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی اساس کلمۂ توحید پر ہے۔

عقدۂ قومیت مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد — بر اساس کلمۂ توحید کرد

چنانچہ مسلمانوں کے لیے ان کا پیغام یہ ہے "صورت ماہی بہ بحر آباد شو۔ یعنی از قید مقام آزاد شو"

از راہ کرم ارشاد فرمایئے کہ علامہ صاحب کے ان اشعار کی روشنی میں " زمین سے وابستگی " کا تصور کس طرح پیدا ہوتا ہے۔

آپ کا

سلیم احمد

برادرم ملک صاحب یا

سلام مسنون !

آپ کو خط لکھے ہوئے عرصہ ہو گیا مگر جواب سے ہنوز محروم ہوں۔ آخر صدیقی صاحب کے خط

سے معلوم ہوا تھا کہ آپ میرے سوالوں کا جواب بھیج رہے ہیں مگر اس اطلاع کو بھی ڈیڑھ ماہ سے زائد ہو گیا۔ محترم آپ کو معلوم ہے کہ ہم جس مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں وہ پاکستان کی تہذیبی اور فکری زندگی میں کیا اہمیت رکھتا ہے اور خصوصاً فکرِ اقبال کی تشریح و تعبیر میں اس سے کیا مدد ملے گی؟ اس لیے براہِ کرم جلد جواب عنائت فرمایئے تاکہ سلسلۂ کلام آگے بڑھ سکے۔ میں بہت بے چینی سے آپ کے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا

سلیم احمد

برادر عزیز و مکرم!

السلام علیکم!

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں نے آپ کے سوالات کے جواب میں جو کچھ عرض کیا ہے وہ آپ کی توقع کے عین مطابق ہے۔ تازہ گرامی نامہ میں آپ نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان کے جواب میں میری گزارشات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ہجرت کا تصور۔ ۱۹۳۰ کے خطبۂ الہ آباد میں موجود ہے۔ اقبال ہندی مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ

'The life of Islam, as a cultural force, in This country very largely depends on its centralization in a specified Territory.'

ظاہر ہے کہ ایک مخصوص علاقے میں اسلام کی مرکزیت ہجرت کے بغیر ناممکن ہے۔ اقبال نے سرزمینِ پاکستان میں ہندی مسلمانوں کے لیے ایک مرکزِ محسوس کے قیام کا تصور پیش کر کے ہندوستان کے طول عرض میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ہجرت کی دعوت دی ہے ہندوستان میں اسلام کی بقا اور اسلام کے فروغ کے اس سیاسی پروگرام میں روحانی کشش پیدا کرنے کی خاطر اقبال اپنی شاعری اور سیاسی مناظرہ بازی میں رسولِ کریم صلعم کی مکّہ سے مدینہ ہجرت کے تجربے سے بصیرت اندوز ہونے کی بار بار تلقین کرتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اقبال نے ہجرت کا ذکر صراحت سے نہیں بلکہ اشارات میں کیا ہے۔ بلیغ شاعر اشارہ ہی وقت کا تقاضا تھا۔ مدلّل وضاحت قبل از وقت تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ اقبال نے اِسی خطبے

سکے شروع میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھا تھا کہ :

'I lead no party; I follow no leader.'

۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک خود مسلم لیگ کو تصورِ پاکستان قبول نہیں تھا اور جو لوگ اقبال کے تصورِ پاکستان کو مجذوب کی بڑ نہیں سمجھتے تھے وہ اسے شاعر کا خواب قرار دیتے تھے ایسے میں سیاسی زعماء کے بجائے عامۃ المسلمین سے ہمکلام رہے اور یہ عامۃ المسلمین ہی تھے جو اپنی چھٹی حس سے اقبال کے شاعرانہ اشاروں پر عمل پیرا رہے اور بالآخر یہ مسلمان عوام کا دباؤ ہی تھا جس کے زیر اثر زعماء نے مارے باندھے تصورِ پاکستان قبول کیا اور پھر رفتہ رفتہ ان میں سے چند ایک زعماء نے صدقِ دل سے تصورِ پاکستان کو اپنا لیا۔

یہاں میں آپ کے دوسرے سوال کی جانب آتا ہوں آپ نے پوچھا ہے کہ "تحریکِ پاکستان۔ رہنماؤں میں وہ کون لوگ ہیں جو اجتماعی ہجرت کے تصور کو قبول کرتے ہیں ؟"

اس بات پر میں نے گزشتہ عریضے میں جان بوجھ کر اظہارِ خیال نہیں کیا تھا۔ یہ خطرناک سوال ہے اس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ اقبال، قائداعظم اور حسرت موہانی سے آگے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ ان کے علاوہ سب مجھے سیاسی راہنما نہیں بلکہ سیاسی ابن الوقت نظر آتے ہیں پنجاب ہی کو دیکھئے اقبال ساری عمر لوڈھی جاگیرداروں کے خلاف جہاد کرتے رہے، جب پاکستان کا قیام ناگزیر نظر آنے لگا تو یہی یونینسٹ جاگیردار تحریکِ پاکستان کے راہنما بن بیٹھے اور قائداعظم کی آنکھیں بند ہوتے ہی پاکستان کے نام پر تصورِ پاکستان کی بیخ کنی میں سرگرم عمل ہو گئے جنہیں عرفِ عام میں رہ نما کہا جاتا ہے یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے باوجود پاکستان بن گیا۔ تائیدِ ایزدی نے عامۃ المسلمین کے سیاسی اور دینی عمل کی وساطت سے ہمیں یہ خطۂ پاک عطا کیا ہے۔ پاکستان کی بقا بھی رہنماؤں کی بجائے عوام کے عزم و عمل میں پوشیدہ ہے۔

(۲) آپ نے اقلیتوں کی وفاداری کے سلسلے میں قائداعظم کے جس بیان کا ذکر کیا ہے وہ سراسر رسمی ہے ایسے رسمی بیانات سیاسی قائدین کو دینا پڑتے ہیں اور سننے والے بھی انہیں رسمی ہی سمجھتے ہیں۔ اس باب میں قائداعظم کا طرزِ فکر و عمل سمجھنے کے لیے چوہدری خلیق الزماں کی کتاب Pathway to Pakistan. کے آخری صفحات کا مطالعہ ضروری ہے ۳۹۰ سے لیکر ۴۰۰ صفحات تک حسین شہید سہروردی اور چوہدری خلیق الزماں پر گاندھی کے زیر اثر دو قومی نظریے کی تباہ کاریاں آشکار کی گئی ہیں۔ ہر دو زعماء دو قومی نظریے کے قیامِ پاکستان کے بعد متروک ہو جانے کی دستاویز پر گاندھی سے دستخط کرا کے قائداعظم کے پاس آتے ہیں اور پاکستان اور بھارت میں فرقہ وارانہ فسادات ختم کرنے کے لیے گاندھی اور قائداعظم کے مشترکہ دستخطوں سے یہ دستاویز شائع کرنے کی درخواست کرتے ہیں مگر قائداعظم ایسا کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک دو قومی نظریہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی زندہ ہے اور

اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اب میں آپ کی خدمت میں مولانا حسرت موہانی کے ۲۷ دسمبر ۴۷ ۱۹ء کے روزنامچے سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:۔

" مولانا ابوالکلام آزاد نے صاف صاف اقرار کیا کہ آج کی کانفرنس کا صرف ایک مقصد ہے وہ یہ کہ تمام مسلم ادارے سیاسی حیثیت سے ختم ہوں۔ کل فرقہ وارانہ جماعتیں کانگرس میں مدغم ہو جائیں۔ اس پر ہم لوگ یہ کہہ کر چلے آئے کہ " ہم لوگوں کی شرکت بالکل بے کار ثابت ہو گی "۔ دورانِ گفتگو میں چلتے چلتے میں نے ایک فقرہ ابوالکلام کے متعلق چست کر دیا جس سے ان کی ساری کارستانیوں پر پانی پھر گیا اور جس سے وہ انتہا درجہ جھنجلائے ۔میں نے کہا کہ " ۱۸۵۷ء میں برٹش گورنمنٹ کی بدگمانیاں رفع کرنے کی غرض سے جس طرح سرسید نے مسلمانوں کو صرف تعلیمی اور سماجی امور پر زور دینے کی تلقین کی تھی بالکل اسی طرح ۴۷ ۱۹ء میں آپ کانگرس کے ساتھ مسلمانوں کو بلاشرط وفاداری سکھاتے ہیں اور اسلامی اداروں کو سماجی امور کیلئے محدود کر دینے کے درپے ہیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ "

میرا خیال ہے کہ قائداعظم کا دوقومی نظریے پر اصرار اور حسرت موہانی کا مسلمانوں کی سیاسی ہستی کی بقا و فروغ اور استحکام پر اصرار، اجتماعی ہجرت سمیت تمام مصائب و مشکلات کے سامنے سینہ سپر ہونے کا پیغام ہے سرفروشی اور جاںنثاری کے اس پیغام پر سیاسی زعماء تو بے شک کان نہیں دھرتے مگر عامۃ المسلمین اس کے لیے تب بھی تیار تھے اور اب بھی ہیں۔

۳۔ اب رہ گیا زمین سے وابستگی کا تصور، تو گزارش ہے کہ وابستگی کے تصور کے سیکولر معنی نہ لیجئے اسے اسلامی رنگ میں لیجئے۔ یہ وابستگی ویسی ہی عارضی وابستگی ہے جیسی مسلمان کو اس دنیائے آب و گل سے ہونی چاہیئے۔ یہ مطلب فقط اس حقیقت کی جانب اشارہ کرنا تھا کہ پاکستان کا تصور جغرافیائی حقیقت کی سراسر نفی کا تصور نہ تھا۔ بے شک پاکستان کے تصور میں جغرافیے کی بجائے روحانی یگانگت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے مگر تصورِ پاکستان میں جغرافیے کی بھی ایک حیثیت ہے اور وہ حیثیت یہ ہے کہ ہندی مسلمانوں نے اپنی اور اسلام کی بقاء کی خاطر ایک مخصوص خطۂ زمین میں اپنی مرکزیت قائم کی۔ ظاہر ہے کہ اولین اہمیت تو اسلام کی بقاء کو حاصل ہے مگر اسلام کی بقاء کی خاطر جس خطۂ زمین کو دارالاسلام بنایا گیا وہ بھی کچھ کم اہم نہیں وہ خطہ بھی مقدس ہو جاتا ہے اور اس حد تک مقدس ہو جاتا ہے کہ اس کی حفاظت اور اسلام کی حفاظت میں فرق باقی نہیں رہتا۔

۴ امید ہے کہ آپ کی صحت اب پہلے سے بہتر ہو گی۔ دو ماہ پہلے ایک خط آپ کے نام لکھا مگر پوسٹ نہ کر سکا۔ وہ خط بھی ارسالِ خدمت ہے

والسلام مخلص

فتح محمد

○○

یہ قدسیوں کی زمیں
جہاں فلسفی نے دیکھا تھا، اپنے خوابِ سحر گہی میں
ہوائے تازہ و کشتِ شاداب و چشمۂ جانفروز کی آرزو
کا پرتو!

یہیں مسافر پہنچ کے اب سوچنے لگا ہے
"وہ خواب کابوس تو نہیں تھا؟
وہ خواب کابوس تو نہیں تھا؟"
اے فلسفہ گو!
کہاں وہ رویائے آسمانی؟
کہاں یہ نمرود کی خدائی؟
تو جال بنتا رہا ہے جن کے شکستہ تاروں سے اپنے موہوم
فلسفے کے ہم اس یقین سے، ہم اس عمل سے ہم اس
محبت سے آج مایوس ہو چکے ہیں

(خوابِ سحر گہی)

تصور اور حقیقت ۔ حرف و معنی کے آہنگ کی شکست کا نوحہ لکھنے کے بعد راشد
صاحب تو سرزمین پاکستان سے ہجرت کر کے دنیائے مغرب میں جا آسودہ ہوتے مگر وہ شاعر
اور ادیب جو پاکستان سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں انھوں نے بھی تصورِ پاکستان کی حقیقی نوعیت
کی تلاش و جستجو سیاست دانوں کا کام جانا اور خود کو خالص فنی سرگرمی میں مصروف رکھا اس یکسوئی
کا یہ کرشمہ تو قابلِ رشک ہے کہ آج پاکستان کی فنی اور تخلیقی شخصیت کا حسن دیدنی ہے مگر اس کا ایک
نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ تصورِ پاکستان مسلسل دھندلاتے دھندلاتے کچھ کا کچھ ہو گیا ہے اور نوبت
یہاں آ پہنچی ہے کہ تصورِ پاکستان میں سے اقبال کی انقلابی آرزومندی کو منہا کرنے کے جتن
ہونے لگے ہیں اور تحریکِ پاکستان سے اس کا عوامی جمہوری کردار چھیننے کی سازش پنپنے لگی۔
تصورِ پاکستان کے خالق کو یہ گلا تھا کہ عجم کے لالہ زاروں سے پھر کوئی رومی نہ اٹھا اور ہمیں پاکستان
کے ادب زاروں سے یہ گلہ ہے کہ ان سے پھر کوئی اقبال نہ اٹھا جو یہ سمجھ اور سمجھا سکے کہ تصورِ پاکستان
سے انحراف کی راہ اکھنڈ بھارت پر جا ختم ہو گی اور یہ وہ مقام ہو گا کہ جہاں ہماری فنی اور تخلیقی شخصیت
اپنے تمام تر حسن سمیت فنا ہو کر رہ جائے گی۔ اس سیلِ فنا سے بچنے کی صرف ایک ہی راہ ہے

اور وہ ہے پاکستان کے حقیقی تصور کی جانب مراجعت اگر ہم ان لوگوں سے پاکستان کا مطلب پوچھیں گے سن سینتالیس سے پہلے جن کے تصورِ اشتراکیت، تصورِ جدیدیت اور تصورِ اسلام سے تصورِ پاکستان متصادم تھا تو لازماً وہ ہمیں انحراف کی راہ پر ہی ڈالیں گے اس گمراہی سے بچ کر پاکستان کے حقیقی تصور تک ہم صرف اقبال کی رہنمائی میں ہی بچ سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں قیام پاکستان کے محرکات سے بحث کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

"برصغیر میں ایک جداگانہ اسلامی ریاست ہندوستان کے ساتھ ساتھ اسلام کے لیے بھی انتہائی فائدہ بخش ہے ہندوستان کے لیے یوں کہ اندرونی توازنِ اقتدار کے باعث تحفظ اور امن پیدا ہو گا اور اسلام کے لیے یوں کہ اسے موقع ملے گا کہ عرب ملوکیت کی چھاپ سے نجات پائے اور اپنے قانون، تعلیم اور کلچر کو تحریک دے کر انھیں اپنی اصل روح اور روحِ عصر سے ہم آہنگ کر دے۔"

پاکستان تو قائم ہو گیا مگر اسلام کو یہ موقع نہ ملا کہ وہ عرب ملوکیت کی چھاپ سے نجات پائے عرب ملوکیت کی چھاپ سے اسلام کو آزاد کرنے کا فریضہ اور اسلام کو اپنی اصل روح اور روحِ عصر سے ہم آہنگ کرنے کا عمل کسی اقبال ہی کا منتظر ہے اور ظاہر ہے کہ اقبال سیاستدانوں، ملاؤں اور اقتدار پسندوں کی منڈلی نہیں بلکہ تخلیقی فن کاروں کی صف سے ہی اٹھے گا۔

بے شک ادیب کا کام ادب پیدا کرنا ہے مگر پاکستان کے ادیب کی ذمہ داری اس سے بھی زیادہ کٹھن ہے۔ مملکت پاکستان کی یکتائی کا تقاضا ہے کہ پاکستانی ادیب پاکستان کے جغرافیائی وجود سے محبت کا حق بھی ادا کرے اور پاکستان کے مثالی تصور کی نگہداشت کا بارِ امانت بھی سنبھالے۔

○○

جدید شعری تنقید کا مورث — میراجی

ڈاکٹر سلیم اختر

"میراجی کو بجا طور پر اردو کی جدید شعری کا تنقید کا مورث کہہ سکتے ہیں :

مولانا صلاح الدین احمد

جہاں تک باقاعدہ نفسیاتی تنقید کا تعلق ہے تو بلا شبہ اس میں میراجی کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ خود میراجی وہ شاعر ہے جس کی زندگی تخلیقی شخصیت اور شاعری اردو نفسیاتی تنقید کے اہم ترین میں سے قرار دی جا سکتی ہے اس کی انبار ملیطی اور جنسی کجروی کو ناقدین نے بطور خاص محدب شیشے میں رکھ کر میراجی کی تنقید کو دیکھیں تو اس کی شاعری میں جو ایک چکا چوند کر دینے والی کیفیت ملتی ہے اس نے ناقدین کو یوں مسحور کئے رکھا کہ اس کی تنقید کی طرف بطور خاص توجہ نہ دی گئی۔ میراجی کی تنقیدی تحریروں سے لا علمی کا یہ عالم تھا کہ بقول فیض احمد فیض "شاید میراجی کی ادبی تخلیقات کے سلسلہ میں ایک آدھ ناقد نے ضمنی طور پر ان کی نثر نگاری کا بھی تذکرہ کیا ہو لیکن اس سے ان مضامین کی نوعیت اور قدر و قیمت کا قطعی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جدید اردو ادب کے طلباء غالباً یہ نہیں جانتے کہ میراجی نثر بھی لکھا کرتے تھے لیکن اس نثر کی صحیح پہچان اب تک کسی کو بھی نہ تھی۔ اسی سبب سے میراجی مرحوم نقاد اور نثر نگار کی حیثیت سے اہل نظر حلقوں میں بھی زیادہ متعارف نہیں۔"

گو فیض احمد فیض نے اپنے مختصر مضمون (میراجی کا فن)[1] میں میراجی کی نثر کی بعض خصوصیات کی نشاندہی تو کی لیکن میراجی کی تنقید کے مزاج اور اس میں نفسیات سے اخذ روشنی کی نشاندہی کی کوشش نہ کی۔ حالانکہ میراجی کا اصل کارنامہ ہے کہ انہوں نے تنقید یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اچھی تنقید) لکھی بلکہ یہ کہ سب سے پہلے اور شعوری طور پر نفسیاتی اصولوں کا ملکی اور غیر ملکی ادبیات و شخصیات پر اطلاق کر کے اردو تنقید میں طرح نو ڈالی۔

میراجی نے ابھی لکھنے کا آغاز ہی کیا تھا کہ مولانا صلاح الدین احمد اور ان کے حوالے سے ادبی دنیا سے اس کے روابط کا آغاز ہو گیا۔ یہ میراجی کے شباب کا زمانہ تھا اور ابھی وہ ان ذہنی الجھنوں سے دور تھا۔ جنہوں نے بعد میں اسے ہیجنڈ بنا دیا۔ اس زمانے میں وہ ادبی دنیا کا مدیر معاون تھا۔ اس زمانے میں اس نے ملکی اور غیر ملکی شاعروں پر مفصل تنقیدی مضامین اور ان کی تخلیقات کے منظوم تراجم کا سلسلہ شروع کیا۔ بقول مولانا صلاح الدین "یہ مضامین ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک ادبی دنیا کے اوراق کی زینت مسلسل بنتے رہے۔"[2] لیکن کتابی صورت میں طبع ہونے کے لیے

---

[1] میراجی، مشرق و مغرب کے نغمے لاہور اکادمی پنجاب ۱۹۵۸ء ص ۸

[2] مشرق و مغرب کے نغمے " ص ۵

انہیں تقریباً "دو دہائیوں" کا انتظار کرنا پڑا اور مولانا نے جب ۱۹۵۸ء میں انہیں "مشرق و مغرب کے نغمے"[1] کے نام سے طبع کرایا اور ادیبوں اور ادب و فن کے ناقدین کو پہلی بار میراجی کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ چنانچہ اب تنقید میں جدید رجحانات کی بحث ہو، یا نفسیاتی تنقید کے اثرات کا مطالعہ۔ ہر دو کا تذکرہ میراجی کی تنقید کے بغیر نامکمل سمجھا جائے گا۔ مولانا صلاح الدین کا ایک مضمون بعنوان "میراجی کی نثر" بھی شامل کتاب ہے جس میں مولانا نے اپنے مخصوص شاعرانہ تگ و پر جوش اسلوب میں میراجی کی نثر نگاری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے بقول:۔

"میراجی نے کوئی بائیس تیئیس برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ میری مراد نثر سے ہے۔ اس کی نظم نگاری کی عمر میں نہیں جانتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اپنے اولین مضامین نثر لکھنے سے پہلے وہ عشق و ناکامی کے پر آشوب دور میں سے گذر چکا تھا۔ مدرسے کی تعلیم چھوڑ چکا تھا اور کنارِ نہر کی تنہائیوں اور کتب خانہ عام کی ویرانیوں کا مکین ہو چکا تھا۔ شراب ابھی تک اسے نہیں لگی تھی۔ بیئر وہ کبھی کبھی ضرور پیتا تھا لیکن چھپ چھپ کر اور نگارشِ مضمون کے اسباب میں اس ضرورت کو اچھا خاصا دخل تھا۔ اس تشریح کی ضرورت اس کی نثر نگاری کا پس منظر تیار کرنے کے لیے پیش آئی۔ اگر اسے عشق میں ناکامی نہ ہوتی تو وہ اپنی شاعرانہ اور لاابالی طبیعت کے باوجود معمولات زندگی سے زیادہ دور نہ جاتا۔ اور غالباً کلرک ہو کر شادی کر لیتا اور ناکامیٔ عشق کا مداوا دنیا بھر کی عشقیہ شاعری کے مطالعہ میں تلاش نہ کرتا۔"[1]

اس اقتباس کی آخری سطور معنی خیز ہیں۔ مولانا صلاح الدین نفسیاتی نقاد نہ تھے۔ لیکن آخری سطروں میں وہ فرائڈ کا نام اور اصطلاح استعمال کئے بغیر "ارتفاع" کے عمل کی طرف اشارہ کر گئے ہیں۔ (اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لیے جمیل جالبی کا مقالہ "میراجی کو سمجھنے کے لیے" ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کا نام: "تنقید اور تجربہ")

میراجی کی تنقید کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوتا ہے اور یہ وہی سال ہے جب ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی اور پہلی مرتبہ اردو ادب کو نیا چلن اور اردو کی تنقید کو نئی سوچ ملی۔ میراجی اس تحریک سے نہ تو وابستہ تھا اور نہ ہی متاثر۔ وہ تو اپنی ذات میں خود ایک انجمن اور اپنی تحریروں میں خود ایک منفرد رجحان تھا اور اسی لیے عالم آثار گاں ہے اک جہان سب سے الگ کے مترادف اس نے اپنے شعر و نقد کی دنیا سب سے الگ بسالی۔ یہ انفرادیت شاعری اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی نثر میں بالعموم اور تنقید میں بالخصوص ملتی ہے۔ چنانچہ مولانا صلاح الدین رقمطراز ہیں:

"میراجی کی تخلیقات نثر کا ایک حیرت انگیز امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے سامنے اس مزاج کی نثر کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ جس میں زمانے میں اس نے یہ تنقیدیں لکھی ہیں۔ ہمارے جدید نقاد ابھی پروان چڑھ رہے تھے اور انہوں نے نقادانہ غل بھی کرنا سیکھا تھا۔ اس اعتبار سے ہم میراجی کو بجا طور پر اردو کی جدید شعری تنقید کا مورث کہہ سکتے ہیں اور جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اس نے یہ تنقیدیں اس زمانے میں لکھی ہیں جب اس کی عمر صرف بائیس تیئیس برس کی تھی اور اکثر اس وقت لکھی ہیں۔ جب اُسے بہت پیاس لگ رہی ہوتی تو ہم ایک مسرت افروز حیرت میں گم ہو جاتے ہیں اور پھر گم ہی ہوتے چلے جاتے ہیں۔"[2]

---

[1] مشرق و مغرب کے نغمے، ص ۱۲

میراجی کی تنقیدی صلاحیتوں کو سراہنے والوں میں محمد حسن عسکری بھی پیش پیش ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک مقالے ”تنقید کا فریضہ“ میں میراجی کی تنقید اور اس کے پھیلے اثرات کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

”میراجی نے مغربی ادب براہِ راست پڑھا تھا اور اس سے زیادہ سے زیادہ اثر قبول کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ان کی توضیحی تنقیدوں کا نئے ادب کی تحریک پر بہت بڑا احسان ہے اگر میراجی نہ ہوتے تو غالباً بہت سے نئے ادیب اور شاعر پیدا ہی نہ ہوتے، یا کم از کم اتنا نہ لکھتے جتنا انہوں نے لکھا۔ ادیبوں کے لیے خصوصاً شاعروں کے لیے وہ بہت بڑا سہارا تھے۔“ [1]

عسکری صاحب نے میراجی کی تنقید کو محض توضیحی تنقید قرار دے کر میراجی کی تنقید کے اہم ترین رجحان یعنی نفسیاتی طرزِ استقلال کی اہمیت کو نگاہوں سے اوجھل کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ عسکری خود بھی نفسیاتی تنقید کا اچھا شعور رکھتے ہیں۔ تعجب ہے انہوں نے ”مشرق و مغرب کے نغمے“ کے اس پہلو کو کیوں پس پشت ڈال دیا۔ ”مشرق و مغرب کے نغمے“ اردو تنقید میں بلاشبہ ایک عہد آفرین تصنیف ہے۔

گو مولانا صلاح الدین نے محولہ بالا مضمون میں میراجی کی نثر کے بارے میں بہت کارآمد باتیں کی ہیں لیکن فیض اور عسکری کی مانند مولانا نے بھی اس کی تنقید میں نفسیاتی نقطہ طرازیاں اجاگر کرنے کی کوشش نہ کی۔ حالانکہ آج میراجی کی اہمیت اس لیے ہے کہ اسے جدید نفسیاتی تنقید کے اہم ترین رجحان کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر وحید قریشی نے راقم کی کتاب ”نگاہ اور نقطے“ کے دیباچے میں اسی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔

”میراجی غالباً پہلے آدمی ہیں کہ آزاد تلازمہ خیال کی مدد سے شاعری کی۔ انہوں نے تنقید میں بھی نفسیات کے مطالعے سے بہت کام لیا۔ اس نظم میں ”چارلز مورال کی پیروی کرتے ہوئے مختلف شعراء کی نظموں کا تجزیہ پیش کیا۔ اسی طرح ”ادبی دنیا“ کے لیے ایک سلسلہ مضامین (جو بعد میں ”مشرق و مغرب کے نغمے“ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا) فرائڈ کے مطالعات کی روشنی میں اردو کے نفسیاتی دبستان کی داغ بیل ڈالی۔“ [2]

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ [3]
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

یہ غالب کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر انتخاب کرنے والے کے لیے درست ہے کہ انتخاب پسند و ناپسند کا آئینہ ہوتا ہے اس نقطۂ نظر سے ”مشرق و مغرب کے نغمے“ میں شامل شعراء کو دیکھیں تو یہ میراجی کی مخصوص ذہنی دلچسپیوں کی غمازی کے ساتھ ساتھ ان نفسی رجحانات کے بھی مظہر ہے۔ جنہوں نے ثناء اللہ کو میراجی بنایا۔ میراجی نے مضامین کے عنوانات میں ہر شاعر کی اساسی خصوصیت کو یوں عنوان بنایا کہ وہ اس کی شخصیت کی تفہیم کے لیے بھی ایک اہم اشارہ بن جاتا ہے۔ چند شاعروں

---

[1] محمد حسن عسکری، ”ستارہ یا بادبان“ کراچی مکتبہ سات رنگ ۱۹۶۳ء ص ۱۱۴

[2] سلیم اختر، ”نگاہ اور نقطے“ لاہور جدید ناشرین ۱۹۶۸ء ص ۱۶

[3] ”نظم جدید کی کروٹیں“ میں ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی عنوانات کے اس انداز کی نقالی کی ہے۔

سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

فرانس کا آوارہ شاعر :۔ فرانساں ولاں

مغرب کا ایک مشرقی شاعر :۔ طامس مور

فرانس کا ایک آوارہ شاعر :۔ چارلس بادلیر

امریکہ کا تخیل پرست شاعر : ایڈگر ایلن پو

خود اس انتخاب میں شامل بیشتر شعراء ایسے ہیں۔ جن کی زندگی کے مخصوص نفسی میلانات ہیں۔ خود میراجی کی نفسی سرگذشت کی بعض کڑیاں بھی تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اس ضمن میں ولاں ، باد لیر ، ایڈگر ایلن پو ، میلارمے ، اور ڈی ایچ لارنس وغیرہ کا بطور خاص نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ نفسیاتی مریض تھے اور کچھ جنسی الجھنوں کا شکار۔ ایک انتہا پر جاپانی طوائفوں (گیشاؤں) کے گیت اور ہم جنس پرست شاعرہ سیفو نظر آتی ہے تو دوسری طرف پوتر پریم کہانی سنانے والا چنڈی داس (کا مطالعہ نفسیاتی دلچسپی کا حامل ہے) الغرض ان میں بیشتر شعراء اور ان کی شاعری کے مخصوص انداز کی روشنی میں میراجی کی ذہنی دلچسپیوں اور اس کی مخصوص افتاد طبع کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک ان مضامین کے تنقیدی تجزیئے کا تعلق ہے تو آغاز ہی میں واضح کر دینا ضروری ہے کہ میراجی نے نفسیاتی تنقید کے اصولوں کی وضاحت کے لیے خود کوئی باضابطہ مقالہ قلم بند نہ کیا۔ البتہ " رس کے نظریئے " پر ایک مفصل مضمون سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جدید نظریات کے ساتھ ساتھ قدیم سنسکرتی انتقادی مباحث سے بھی واقفیت رکھتا تھا گو اس نے اپنے تنقیدی مطالعات میں " رس " کے نظریئے سے استفادہ کی بطور خاص کوشش نہ کی۔ جہاں تک " مشرق و مغرب کے نغمے " ، کے مضامین کی روشنی میں میراجی کی اپنی شخصیت کی عکاسی کا تعلق ہے تو اس ضمن میں دو امور بطور خاص پیش نظر رکھنے ہوں گے۔ اول یہ کہ یہ اُسکی ادبی زندگی کے آغاز اور ابتدائی دور کی نشانی ہے اور دوسرے ان مضامین کی نثر اس اشکال سے پاک ہے جو میراجی کی بعض نظموں کی اساس نہ بنا۔ اس کی نزاعی حیثیت متعین ہوئی۔ اس میں آج کے بعض ان اہل قلم کیلئے بھی یہ نقطہ ، دانش پوشیدہ ہے جو شعوری طور پر نثر کو الجھا کر بے معنویت اور بے دلیلی کا پرچار کرتے ہیں۔ چنانچہ فیض احمد فیض کے بقول :

" . . . . ان کی نثر کی ماہیت اور فضا ان کی نظم سے قطعی مختلف ہے میراجی کے ذہن کا جو عکس ان کی نثر میں ملتا ہے بعض اعتبار سے ان کی شاعرانہ شخصیت کی قریب قریب مکمل نفی ہے۔ ان مضامین کی نکھری ہوئی شفاف سطح پہ ان ابہام سایوں اور غیر مجسم پرچھائیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ جو اس کے شعر کی امتیازی کیفیات ہیں۔ ان کی تخلیق کا یہ حصہ تمام تر اس پاسبانِ عقل کی راہنمائی میں لکھا گیا ہے جسے وہ بظاہر عمل شعر کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے [1]

تو یہ ہے وہ پس منظر جس میں میراجی کی نفسیاتی تنقید کے ان مخصوص رجحانات کا جائزہ لینا ہوگا۔

میراجی کی تنقید کے مطالعے سے جو امور بطور خاص واضح ہوتے ہیں ان میں سے ایک تو فرائڈ اور اس کے نظریہ تحلیل نفسی

---

[1] مشرق و مغرب کے نغمے ص ۱۴

سے ان کی واقفیت ہے۔ چنانچہ باؤلیر اور ملارمے وغیرہ کے ضمن میں میراجی نے تخلیق اور اعصابی کے باہمی رابطے کے تصور سے اچھی خاصی واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ کہیں کہیں وہ احساس کمتری کی اصطلاح بھی استعمال کرتا ہے لیکن یہ اصطلاح اور اس سے وابستہ تصورات تنا عام فہم ہے کہ ہر شخص ایڈلر کی انفرادی نفسیات سے خصوصی واقفیت کے بغیر بھی اُسے استعمال کر سکتا ہے۔ البتہ ژونگ کے نظریات سے کسی طرح کی واقفیت ان تحریروں سے عیاں نہیں ہوتی حالانکہ مذکورہ بالا علامات اور آزاد تلازمہ کی بنا پر میراجی کے لیے ژونگ کی تحلیلی نفسیات سب سے زیادہ پرکشش ثابت ہوتی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ میراجی کے وقت تک ادب و نقد کے ضمن میں ژونگ کے افکار و تصورات کا ابھی یورپ میں بھی چرچا زیادہ نہ ہوا تھا۔ اس لیے میراجی سے ژونگ کی نفسیات سے واقفیت کی توقع بے جا ہے۔ میراجی کی ایک اور خصوصیت بھی قابل ذکر ہے اور وہ ہے مغربی شعراء سے اردو شعراء کا نفسیاتی تقابل۔ گو اس ضمن میں اس نے زیادہ ژرف بینی کا ثبوت نہ دیا۔ تاہم مختصر الفاظ میں اور ضمناً وہ تقابلی مقابلے کرتا جاتا ہے۔ مثلاً بادلیر کا تجزیہ یا تبصرہ کرتے وقت وہ اس رائے کا اظہار کرتا ہے ۔

" اردو میں ہم اس کا تطابق پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن اشارتاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر تقی میر کی شخصی و عشقیہ شاعری اور جان صاحب اور چرکین کا تخریبی کلام کچھ اسی قسم کا ہے " [1]

بادلیر کو اس نے ایک موقع پر غالب سے مشابہ قرار دیا :۔

" ادبی تخلیق کے لحاظ سے وہ ایک بہت محتاط انسان تھا۔ اردو زبان میں ایسی احتیاط کی مثال مرزا غالب کی زندگی سے دی جا سکتی ہے۔ مرزا نے اپنی ساری عمر میں اردو کا صرف ایک مختصر دیوان شائع کیا۔ بادلیر نے بھی اپنی ساری عمر میں صرف ایک کتاب شعروں کی لکھی اور اسی ایک ہی کے اثرات کی پیداوار آج کل کی جدید فرانسیسی شاعری ہے۔ اپنے اس اثر کے لحاظ سے بھی بادلیر کا دیوان مرزا غالب کے دیوان سے بہت ملتا جلتا ہے جس طرح اگر مرزا غالب کا دیوان نہ لکھا جاتا تو آج اردو شاعری کا رنگ اس کے موجودہ رنگ سے مختلف ہوتا " [2]

فرائڈ کے نظریہ ادب کی پیروی میں میراجی بھی تخلیق اور اعصابی خلل میں گہرا تعلق دیکھتا تھا (ویسے تو اسے اس نقطے کو سمجھنے کے لیے دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ خود اس کی اپنی ذات فرائڈ کے نظریہ کی توثیق میں ٹیکسٹ بک کی سی حیثیت رکھتی ہے) چنانچہ اس کی تحریروں سے مختلف اقتباسات باہم پیوست کرنے سے اس کا فرائڈین تصور تخلیق اجاگر کیا جا سکتا ہے [3]

الف : تجزیۂ نفس نے ہمیں بتایا ہے کہ علامات و اشارات خیال کی سب سے بڑھ کر بے ساختہ اور آپ ہی آپ ہونے والی صورت ہے۔ دن اور رات کے (نیند اور بیداری کے) خوابوں میں علامات، اشارات اور استعارے کی زبان ایسا بے ساختہ ذریعہ اظہار ہے جو احساسات پر کسی قسم کے بندھن نہیں ڈالتا۔ اس لحاظ سے گویا اشاراتی شاعری اظہار کا ایک ایسا فطری طریقہ ہے

---

[1] " مشرق و مغرب کے نغمے " ص ۱۶۴ [2] ایضاً ص ۱۶۵ - ۱۶۶

[3] فرائڈ سے میراجی کی عقیدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے مشرق و مغرب کے نغمے ص ۲۰ میں اسے جدید نفسیات کا پیغمبر لکھا ہے ۔

جو ہماری ہستی کی گہرائیوں سے اُبھر کر نمودار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نظریہ نے نفسیاتی اور طبی علوم پر ایک انقلابی اثر کیا ہے وہ ادب اور آرٹ پر اثر کئے بغیر کیونکر رہ سکتا تھا[1]

ب۔ بادلیر کا کلام مشاہدہ نفس تھا۔ احساسات (نئے احساسات) اس کا خام مواد تھے۔ وہ اپنے اعصاب اور اپنے ذہنی امراض سے تخلیق فن کا کام لیتا تھا[2]

رپو) کی ذات میں صرف یہی بات پُراسرار اور السی ۔ یہی قابل غور ہے کہ وہ ایک اعصابی مریض تھا اور اس کی تخلیقات ادبی میں صرف ایک الجھن ہے ادب اور آرٹ کی ازلی (اور ابدی) الجھن۔

ادبی میں صرف ایک الجھن ہے ادب اور آرٹ کی ازلی اور ابدی) الجھن۔ اس کی شخصیت میں متضاد، غیر معمولی اور تخریب آلود باتیں ہیں[4]

ج:۔ نفسیات کے ماہر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ اعصابی مریض کی بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ ایک افسانے کے بل پر زندگی گذارتا ہے اور اس کا یہ عمل اس افسانے کو حقیقت بنانے کے لیے ایک براہ راست یا بالواسطہ کوشش ہوتی ہے۔ اس کی تمام حرکات و افعال کا یہی مقصد ہوتا ہے۔ کہ وہ اس افسانے کو حقیقت کی صورت دیدے[5]

د۔ "پو کے ذہن نے جو الگ تھلگ دنیا بنا رکھی تھی۔ اگر ہم اس کی نوعیت اور علت تخلیق کو سمجھ لیں تو ہم اس کی زندگی، اس کی شخصیت اور اس کی تخلیقات ادبی کو صاف اور واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں اور ہمدردانہ زاویہ نگاہ سے غور کر سکتے ہیں اس کے بغیر ہمارا راستہ دشوار منزلوں سے پٹ جاتا ہے۔ بلکہ ہم صحیح معنوں میں کسی راستے پر گامزن ہی نہیں ہو سکتے۔[6]

" ان کی زندگی کے نجی حالات واضح طور پر حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان کی ذہنی تخریب کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا[7] جب تک ہم کسی مصنف یا شاعر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق معلومات حاصل نہ کر لیں ہم اس کی ادبی تخلیقات یا کلام کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہر مصنف یا شاعر کی تخلیقات خواہ اس کا فنی اصول داخلی ہو یا خارجی، اس کی اپنی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔"[8]

س :۔ "اگر انسان اعصابی مریض ہو اور اس کی جنسی آرزوئیں معمول کے مطابق پوری نہ ہو سکیں تو اُسکے بعض احساسات

---

[1] میراجی نام یہ بغیر لاشعور کے تخلیقی عمل کی وضاحت کر رہا ہے۔

[2] "مشرق و مغرب کے نغمے" ص ۲۶۳

[3] ایضاً ص ۱۶۳

[4] ایضاً ص ۲۳۰

[5] ایضاً ص ۲۵۹

[6] ایضاً ص ۲۶۱

[7] ایضاً ص ۱۹۳

[8] ایضاً ص ۱۹۰

دب کر اس قسم کے غیر معمولی راستے اختیار کر لیتے۔"

"محبت کا نفسی دور ایک ذہین اور طباع انسان پر کسی قسم کا اثر کرتا ہے۔ اس دور سے فرد کو فائدہ ہو اس کی اندرونی قوتیں بیدار ہو کر سطح پر آجاتی ہیں اور اس نفسی دور کے ساتھ ضروری نہیں ہے کہ جسمانی لذت کا دور بھی ہو، اس کے بغیر بھی یہ اپنی اثر اندازی کے قابل ہے۔"

"شعر و ادب میں یہ رنگ اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جب کہ فنکار کی نظر میں جنسیت اور محبت ایک ہی بات کے دو نام ہوں۔

ل ۔ جدید مغربی علوم کی روشنی میں جب ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ذہن انسانی میں ہر فعل کی تحریک کا باعث جنسی جذبہ ہے اور مذہبی احساس اور تجربہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم روایات سے غیر جانبدار ہو کر صحیح بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ محض خوش عقیدت انسان ہو کر ہی نہ رہ جائیں اصل میں یہ سارا مسئلہ مذہب اور جنس کے گہرے تعلق کا مسئلہ ہے[۳]۔"

مندرجہ بالا اقتباسات گو مختلف مضامین سے لیے گئے ہیں لیکن انہیں کسی مضمون کی مانند مسلسل پڑھنے سے میراجی کے تصورِ ادب کے اہم پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ انکے تمام تصورات فرائڈ کی تحلیل نفسی سے ماخوذ ہیں۔ دراصل اسے یہ احساس بھی تھا کہ تخلیقات اور تخلیق کاروں کی تحلیل و تفہیم میں نفسیات سے امداد لینے میں وہ ایک نیا کام کر رہا تھا۔ چنانچہ اس کے بقول :۔

"تشخیص نفسی ابھی ہمارے لیے ایک نئی چیز ہے اور نئے موضوعات کی کھپت بھی اردو شاعری میں ابھی بہت کم ہے۔"[۴]

جہاں تک میراجی کی عملی نفسیات کا تعلق ہے تو اس کا طریق کار فرائڈین ہے مغرب میں فرائڈین ناقدین کی مانند وہ بھی تخلیق کار کی شخصیت کی نفسی تشکیل اور اس سے وابستہ جنسی اور جذباتی محرکات کا تجزیاتی مطالعہ کر کے تخلیقات سے ان کے رابطے کو اجاگر کرتا ہے اس ضمن میں بادلیر، ایڈگر ایلن پو، واک ویٹمن، ڈی ایچ لارنس پر مقالات خصوصی مثالوں کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ شاعر کے کام کو اس کے نجی حالات اور نفسی کوائف کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ اس وقت اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ جب وہ شاعر عام ڈگر سے ہٹ کر نئی سوچ نئے اسلوب اور میراجی ہی کے الفاظ میں، موضوعات کے تخریب آلود انتخاب[۵] پر مبنی ہو۔ چنانچہ جان صاحب کی ریختی اور چرکین کی ہزل کے مطالعہ میں وہ یہی رکاوٹ دیکھتا ہے کہ "ان کی زندگی کے بعض حالات واضح طور پر حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان کی ذہنی تخریب کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکا۔[۶] مگر ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے نامور ادبی جیالوں کی ذہنی تخریب کے متعلق تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

ایڈگر ایلن پو اور بادلیر کے نفسیاتی مطالعے میراجی ہی کے نہیں بلکہ اردو میں نفسیاتی تنقید کے بہترین مقالات میں شمار کئے جا سکتے

۱۔ "مشرق و مغرب کے نغمے" ص ۵۶۸ ۲۔ "مشرق و مغرب کے نغمے" ص ۱۶۳

۳۔ ایضاً (ص ۱۴۷) ۴۔ ایضاً ص ۱۶۳

میں گو ان سب کا تفصیلی تجزیہ ممکن نہیں تاہم میراجی کے طریق کار کی اساس کی تفہیم کے لیے ایڈگر ایلن پو سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ وہ ایڈگر ایلن پو کے کرداروں کا اس کی شخصیت کے مخصوص نفسی رجحانات کی روشنی میں مطالعہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"پو کے کلیات اور سوانح حیات کو دیکھنے کے بعد سب سے پہلا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنی کہانیوں (اور نظموں میں بھی) وہ متواتر حسین دوشیزہ عورتوں کا ذکر کرتا ہے ان کی تہ میں کون عورت چھپی بیٹھی ہے۔ وہ اکثر ان نازنینوں کو مردہ تصور کرتا ہے اس لیے بہت سے لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ ان میں اپنی بیوی ورجینیا کا عکس دیکھتا ہے لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ورجینیا ابھی زندہ تھی تب ہی سے اس کے تخیل نے ان عورتوں کی تخلیق شروع کر رکھی تھی۔ ابھی وہ چودہ پندرہ سال کا تھا کہ اسے اپنے ایک دوست کی ماں مسز ایس ہیلنا سٹینارڈ سے محبت ہو گئی اور جب یہ عورت مر گئی تو اس کا غم کسی کروٹ چین ہی نہ لیتا تھا۔ اس کے بعد ایک اور عورت سے اُسے رغبت ہوئی۔ جس کا نام میری ڈیورو تھا اس عورت نے پو سے وفا نہ کی۔ ہمارے خیال میں یہی عورت تھی جس کی جدائی کو پو موت کی جدائی تصور کرتا ہے بچپن کی پہلی محبت کا خاتمہ موت نے کیا اور دوسرا تعلق بے وفائی سے ٹوٹا۔ ان دونوں حقائق نے مل کر اس کے دماغ میں مری ہوئی دوشیزہ کا تصور پیدا کر دیا۔ اور یوں اس کی نظموں اور کہانیوں میں اس کے ان تشنہ افسانہ ہائے محبت کا غیر شعوری اثر ظاہر ہوا خواہ وہ تعلق ماں کا تھا، یا محبوبہ کا اس میں اسے مکمل تسکین حاصل نہ ہو سکی۔"[1]

پو نے اس نظریہ کا بھی اظہار کیا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ شعریت سے لبریز موضوع ایک حسین دوشیزہ کی موت ہے اور ہمارے خیال میں اس نظریہ کی تحریک اس کو ان عورتوں سے ہوئی تھی جو اسے مل نہ سکیں یا اس سے الگ ہو گئیں یا اس کے جذبہ محبت کو تشنہ چھوڑ کر مر گئیں۔ تینتیس سال کی عمر سے پہلے چھ ایسی عورتوں کا حال ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ جس کا سلسلہ طفلی میں اس کی اپنی والدہ سے شروع ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ذہن میں حسن اور موت ہم آہنگ ہو کر رہ گئے۔[2] ایک فرد کی جنسی آرزوئیں جب پیاسی رہتی ہیں تو ان میں ایک ناگوار جھلک ایک خوف کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس خوف میں اگر پیدائش سے پہلے کا خوف بھی شامل ہو جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ پو کس لیے دوشیزاؤں کے مرنے اور مر کر پھر جی اٹھنے سے دلچسپی لیتا تھا۔"[3]

میراجی کے ان اقتباسات سے عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ یہاں فرائڈ کے طفلانہ جنسیت اور مادرانہ وابستگی کے حوالے سے بات کر رہا ہے۔ میراجی نے نہایت محنت سے ایڈگر ایلن پو کی جنسی زندگی کے تشنہ پہلو اجاگر کرنے کیلئے واقعات و شواہد بہم پہنچائے اور پھر ان کی روشنی میں پو کی تخلیقات کے بعض انوکھے پہلوؤں اور کہانیوں کے کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔ تحلیل نفسی کے آغاز اور نفسیاتی تنقید کے ابتدا ہی سے یہ اہم مگر نزاعی بحث ملتی ہے کہ تخلیق اور اعصابی خلل کا کیا تعلق ہے اور کیا تخلیق اعصابی

---

[1] "مشرق و مغرب کے نغمے" ص ۲۷۰

[2] ایضاً ص ۲۷۱

[3] ایضاً ص ۲۷۱، ۲۷۲

وسیع مطالعے کی روشنی میں منفرد ادبیت پسند ذوق اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیتے ہوئے نظموں کے فنی مسائل اور معنوی محاسن اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ شاعر کے ذہن اور بعض صورتوں میں تخلیق کے نفسی پس منظر اور اس سے وابستہ لاشعوری محرکات سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے نظم تک رسائی کے لیے یہ طریقہ اپنایا کہ خود کو شاعر کی ذہنی فضا کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس کے تخلیقی عمل کے ساتھ چلتے ہوئے نظم کی تفہیم کی سعی کی جائے۔ چنانچہ جوش کی نظم "بیدل ہے آج" کے تجزیہ کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

"نظموں سے لطف اٹھانے اور انہیں صحیح طور پر سمجھنے کے سلسلہ میں نے آج تک یہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک بار پڑھ لینے کے بعد میں اس جگہ جا کھڑا ہوتا ہوں جہاں استادہ ہو کر شاعر نے اپنا کلام ظاہر کیا ہے اور پھر آغاز سے لے کر نظم کو دوبارہ پڑھنا شروع کرتا ہوں اور میرا ذہن شاعر کے ذہن کی اس کیفیت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے جس میں اس نے شعر کہا لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس شاعر کی انفرادی خصوصیات کو بھی مد نظر رکھتا ہوں تاکہ بعض باتیں جو میرے لیے غیر مانوس ہوں نظم میں ان کی آمد سے میرا ذہن لغزش نہ کھا جائے اور کہیں میں شاعر کی کیفیت ذہنی کو سمجھنے میں چوک نہ جاؤں۔" (۱)

یہ انداز نقد بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ احساسات کی آمیزش سے اگر غلو ہو جائے تو یہ تاثراتی تنقید کا روپ دھار سکتی ہے جس کے نتیجے میں نقاد اپنے خام احساسات مجمل تاثرات اور جذبات کے رنگ میں رنگی تنقید کرتا ہے۔ لیکن میراجی اس معاملے میں اپنے تجزیاتی ذہن کی راہنمائی میں تاثرات کے فوری حملے سے بچ کر تخلیق کے شعری محرک تک معانی حاصل کرنے میں بالعموم کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال احمد ندیم قاسمی کے ایک قطعے کی تشریح ہے (یہ اس نظم میں شامل نہیں ہے) اس سے جہاں اس طریقے کی کامیابی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ عملی تنقید میں نفسیات کے استعمال کی بھی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ بلکہ تعجب اس بات پر ہے کہ ایسی اچھی تنقید کتاب میں شامل کیوں نہ کی؟ قطعہ یہ ہے:

چھت پہ یوں آنچل ہلا دینا بھی کوئی بات ہے
آ مری باہوں پہ بکھرا دے اندھیری کاکلیں
سارا عالم دم بخود ہے رات ہے برسات ہے
آ اکٹھے طے کریں کون و مکاں کی منزلیں

قطعہ مشرق و مغرب کے ملاپ کا نمونہ ہے۔ پہلے مصرعہ کی روز مرہ حقیقت اس آنچل کی طرح لہرا رہی ہے اور جاذب توجہ ہے جو اس تحریک شعری کا باعث ہوئی۔ شہری زندگی میں ایسے واقعات نواب مرزا شوق کے زمانے سے ہوتے آ رہے ہیں۔

---

(۱) "اس نظم میں"۔ ص ۱۶۰، ۱۶۱

دل میرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا   سیر کرنے کو بام پہ آیا

اور رہتا ہوا آنچل دیکھا لیکن شاعر موجودہ زمانے کا مادی انسان ہے۔ ایسی اضطراری اور رومانی حرکات سے اس کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ اس کا دل زلف دیا ہوئے یہ پریشاں کئے ہوئے عرف لب بام پر نہیں مانگتا۔ اس کے نفس غیر شعوری (لاشعور سے مراد ہے) میں غالب ہی کا ایک شعر ہے۔ نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں۔ اس لیے وہ بھی کہتا ہے کہ آمیری باہوں پہ بکھرا دے اندھیری کا کلیں۔ زلفوں کو باہوں پر بکھرانے کے لیے چوری کی ملاقات ہوگی۔ چوری کی ملاقات کے لیے رات کی ضرورت ہے وہ بھی ہے۔ سارا عالم دم بخود ہے۔ اور یہ برسات کا موسم ہے۔ یہاں تک شاعر کامیابی سے شعری منزلیں طے کرتا ہے لیکن اس نے بعد اس کے نفس غیر شعوری سے پھر وہی مشرقیت جاگ اٹھتی ہے اور وہ اس دعوت کی تکمیل کے صحیح مقصد کو کون و مکان کی منزلوں کے استعارے سے پھیکا کر دیتا ہے۔" (۱)

اس ایک مثال سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میراجی شاعر کے ذہن اور تخلیق عمل کے ساتھ نفسیات کی امداد سے تنقیدی عمل کو کامیابی سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ اس تنقید میں نہ تو احساسات کا جوش ہے اور نہ تاثرات کا خروش۔ انداز تشریح کا ہے لیکن یہ الفاظ کی تشریح نہیں بلکہ تخلیق کی نفسی تشریح ہے۔ تخلیقات کا مطالعہ کرتے وقت میراجی تنقید کے بام بلند سے تخلیق کو نہیں دیکھتا بلکہ ایک حساس قاری بن کر خود فضائے تخلیق میں گم ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

وقار عظیم کے خیال میں۔

"وہ کسی نظم کے متعلق کچھ لکھیں یا شاعر کے متعلق ان کا انداز مبصرانہ یا نقیدی ہونے کے بجائے تجزیاتی ہوتا ہے۔ میراجی نظم کی اچھائی یا برائی کو پرکھنے یا نظم نگاری کے اصول کو کسوٹی بنانے کے بجائے اپنی جدت پسند طبیعت اور اس طبیعت کی بدلتی ہوئی لہروں کا سہارا لے کر نظم کی کہانی (اگر کہانی کی بجائے اس کا پسندیدہ لفظ استعمال کیا جائے تو) قصہ بیا کرنے کے سارے لوازم کر لیتے ہیں۔ کہنے والے نے جو کچھ کہنا چاہا ہے۔ اس سے پہلے اس کے ذہن نے کون کون سی راہیں طے کی ہیں۔ کونسا لفظ اور کونسا مصرعہ اس کے تحت الشعور کے کس بھید کی غمازی کرتا ہے۔ یا کر سکتا ہے۔ شاعر نے ذہن سامع کے لیے کون کون سی کڑیاں چھوڑ دی ہیں اور ان چھٹی ہوئی کڑیوں کا رشتہ کیوں اور کس طرح جڑتا ہے۔" (۲)

جہاں تک نفسیاتی تنقید کا تعلق ہے تو میراجی نے ہر نظم کو تحلیل نفس کی رو سے نہیں پرکھا لیکن جن نظموں میں شاعر کے نفسی میلانات کی عکاسی نظر آئی وہاں اس نے تحلیل نفسی سے نظم کا میاب نفسیاتی مطالعہ کیا ہے اس ضمن میں ان نظموں کے نام بطور خاص لیے جا سکتے ہیں۔"اجنبی عورت" "زنجیر" (ن۔م۔راشد)۔

---

(۱) "ادبی دنیا" اپریل ۱۹۴۰ء،

"ایسا کیوں ہوتا ہے"، "محاکات" (سلام مچھلی شہری) جھیل کے کنارے" (خواجہ محمود علی ذوق) "صدائے آوارہ" (یوسف ظفر) "موہن بابو" (مقبول حسین احمد پوری) اور "تنہا قاصد" (اختر شیروانی) طوالت کے خوف سے کی بنا پر ان تمام نظموں پر تفصیلی بحث نہیں کی جا رہی ہے۔ لیکن تحلیل نفسی کے ذریعے میراجی نے شاعر کے ذہن کے ان گوشوں تک کامیابی سے رسائی حاصل کی ہے۔ جہاں شعور کی حد ختم ہوتی ہے اور میراجی کے اپنے الفاظ میں نفس غیر شعوری کی قلمرو کا آغاز ہو جاتا ہے۔ میراجی نے ن۔م۔ راشد، سلام مچھلی شہری اور مقبول حسین کی تخلیقات کے حوالے سے ان کی جنسی واردات کو جس انداز سے اجاگر کیا اس کی اہمیت آج بھی برقرار ہے میراجی کے ذہن رسا کی داد یوں بھی دینے کو جی چاہتا ہے کہ اردو میں اس کے سامنے اس انداز کی تنقیدی مثالیں نہ تھیں۔ نفسیات اور اس کے ساتھ ساتھ فرانسیسی شاعروں کی تخلیقات اور ان پر تنقیدوں کے مطالعہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ شاعر کی شخصیت اور اس کی تخلیقات کو ہوا بند ڈبوں میں مقید کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ "مشرق و مغرب کے نغمے" میں تفصیلاً اور "اس نظم میں" مجملاً اس نے یہی انداز نقد روا رکھا۔ یہی نہیں بلکہ مختلف مواقع پر بھی اس نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ چنانچہ اختر ہوشیار پوری کے مجموعہ کلام کے دیباچہ میں اس نے لکھا۔

"شاعر کی شخصیت جسے اکثر و بیشتر اب تک (تجزیہ نفسی کے باوجود) شعر سے الگ ایک اکائی سمجھا جاتا ہے۔ میری نظر میں کلام کا جزو ہے۔ ایک ایسا جزو جس کو ذہن کی فضائے بعید میں رکھے بغیر قاری صحیح معنوں میں کلام تک نہیں پہنچ سکتا۔" (۱)

یہ مجموعہ (اور اس کے ساتھ ساتھ یہ دیباچہ بھی) غیر مطبوعہ ہے۔ موت سے کچھ عرصہ قبل لکھا گیا دیباچہ اکرم ضمیر کے بموجب "میراجی کا آخری تنقیدی مضمون ہے"۔ (۲)

میراجی کا یہ بیان اس کی تنقید کی نفسیاتی اساس مہیا کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب وہ یہ کہتا ہے:

"اس نظم کو پڑھنے کے بعد میرا ذہن اس کے الفاظ کو بھول جاتا ہے۔ سب سے پہلے میں دل سے شاعر کے براہ راست مفہوم کو نکال دیتا ہوں۔" (۳)

تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ وہ الفاظ کے جمالیاتی حظ اور نظم کے واضح مفہوم میں گم ہو جانے کے بجائے شاعر کی اس نفسی واردات کا سراغ لگاتا ہے جس نے تخلیق کے لیے تحریک مہیا کی۔

اس کے نتیجے میں نظم کا ابہام یا اشکال تحسین کی راہ میں رکاوٹ بننے کے بجائے تخلیق سے

---

(۱) و (۲) میراجی کی آخری مطبوعہ تحریریں ادبی دنیا نمبر ۳ ۱۹۵۰ء دور جدید

(۳) اس نظم میں ص ۱۸

وابستہ نفسی پیچیدگیوں اور محرکات کی نفسیاتی اساس کو سمجھنے کے لیے ایک طرح سے اشاریہ بن جاتا ہے۔

اور اس انداز نقد میں میرا جی نے وہ کامیابی حاصل کی کہ جدید نفسیاتی تنقید کا امام قرار پایا اور ڈھنڈورچیوں کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے باوجود ڈاکٹر وزیر آغا ایسے نقاد وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔

OO



نیلا پتھر

ڈاکٹر سلیم اختر

"کسی بھی تخلیقی فن کار کے لیے موضوعات کبھی کمیاب نہیں ہوتے اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے آس پاس موضوعات کم ہو رہے ہیں تو یہ کمی دراصل خود اس کے اندر ہوتی ہے میرے ساتھ المیہ یہ ہے کہ میں نے موضوعات کی کمی کبھی محسوس نہیں کی۔ مگر میرے حالات نے مجھے اتنا مصروف کر لیا ہے کہ میری افسانہ نگاری کی رفتار بہت سست پڑ گئی ہے اس سست رفتاری کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے میری عمر بڑھ رہی ہے لفظ گراں بہا ہو رہا ہے چنانچہ قارئین میرے اس دور کے افسانے پڑھ کر محسوس کریں گے کہ میں الفاظ کی فضول خرچی سے ممکن حد تک اجتناب کرتا ہوں اور میرے ان افسانوں میں شاید کوئی ایک بھی زاید یا نالتو لفظ نہیں ہے یوں ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کر کے لکھنا بہت دقت طلب کام ہے۔"

(احمد ندیم قاسمی : گزارش ـ "نیلا پتھر")

احمد ندیم قاسمی کی تخلیقی شخصیت متنوع جہات کی حامل ہے، یہی نہیں بلکہ انھوں نے جس صنفِ ادب پر قلم اٹھایا اسی میں تخلیق کی جوت سے اپنی انفرادیت کا سکہ منوایا، شاعری کی جملہ اصناف پر طبع آزمائی کے ساتھ نثر میں ان کے قلم نے افسانے سے لے کر کالم تک ہر نوع کے موضوعات پر اہم ترین تحریریں پیش کی ہیں۔ ایسی تحریریں جن میں اپنے عصر کا آئینہ بننے کی صلاحیت بھی ہے اسی لیے احمد ندیم قاسمی آج محض برصغیر کے اہم ترین ادیبوں کی سطح سے بلند ہو کر بین الاقوامی شہرت کے حامل تخلیق کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ان کی تخلیقات کے تراجم ہو چکے ہیں۔

بحیثیت ایک تخلیق کار احمد ندیم قاسمی کے تخلیقی مقاصد کو ان ہی کے اس معروف مصرع کی صورت میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

انسان عظیم ہے خدایا!

احمد ندیم قاسمی وہ حساس تخلیق کار ہے جس نے اپنا قلم عظمت انسان اجاگر کرنے کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ انسان دوستی اس کا فنی آدرش ہی نہیں مقصدِ حیات بھی ہے چنانچہ احمد ندیم قاسمی نے بدل بدل کر یہی نغمہ بار بار گایا ہے اس لیے جب وہ انسان کو غیر انسانی حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کے اندر کا حساس فن کار تخلیقی سطح پر احتجاج کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"میں گاؤں کی ننھی سی ایک بچی ہوں۔ میرا نام نورخاتون ہے میں نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی ہے کہ اگر خدا نے میری پیدائش کے فوراً بعد مجھے عقل و شعور سے بہرہ ور کر دیا ہوتا تو میں ایک ہولناک چیخ مار کر مر جاتی، میں اشرف المخلوق کے ایک فرد کی حیثیت سے دنیا میں آئی تھی مگر میں نے جس کوٹھے میں جنم لیا وہ موت کی طرح تاریک تھا۔ اس کے ایک کونے میں میرے بابا کی اکلوتی بکری بندھی تھی جو بیٹھے بیٹھے تھک جاتی تھی اور اٹھ کر ایک جھرجھری سے اپنا جسم جھاڑتی تھی تو اس کی غلاظت اڑ کر میری چیختی ہوئی ماں کے بالوں میں اٹک جاتی تھی۔ میرے پیدا ہوتے ہی دنیا کی جس چیز نے میرا استقبال کیا وہ اس غلاظت کا ایک چھینٹا تھا جو بعد میں میرے ماتھے پر آگرا اور میری تقدیر لکھ گیا یہ الگ بات ہے کہ اس کے بعد میرے کان میں اذان بھی دی گئی اور مجھے چیتھڑوں میں لپیٹ بھی لیا گیا۔ مگر غلاظت کا چھینٹا اس سے پہلے ہی اپنا کام کرا چکا تھا۔"

افسانہ: "ایک عورت تین کہانیاں"

غلاظت کا یہ چھینٹا صرف نام نہند برعکس نورخاتون ہی کے ماتھے کی تحریر نہیں بنتا بلکہ اس معاشرہ میں ایسی نورخاتونوں اور ان کے نورخانوں کی کمی نہیں ہے جن کے مقدر میں غلاظت ہی غلاظت ہے سو وہ اس سے فرار حاصل کر کے کھلے آسمانوں کی طرف پرواز کی لاکھ خواہش رکھتے ہوں وہ تازہ ہوا میں سانس لینے کی لاکھ تمنا رکھتے ہوں مگر دو لتوں کی دلدل میں ایسے پھنستے ہیں کہ اشرف المخلوق کے درجہ سے گر کر جانور کی سطح پر آجاتے ہیں۔ اقتصادی مسئلہ انسان کا اہم ترین مسئلہ ہے اور بھوک زندگی کی تلخ ترین حقیقت۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ حقیقت نگاری کی روایت سے خود کو وابستہ سمجھنے والا فن کار زندگی کی اس اہم ترین اور تلخ حقیقت سے آنکھیں بند کر کے دھرتی پوجا کا جاپ شروع کر دے۔ زندگی کی اس تلخ حقیقت نگاری پر بالتو نقاد خواہ کتنا ہی بلبلائے مگر یہ حقیقت

ل۔ ندیم دیہات کو محبت کی نظر سے دیکھنے کی بجائے دیہات کے ہر موضوع کو اقتصادی زاویے سے ہی پرکھتا ہے (فکر و خیال، ص ۵۴)

اپنی جگہ اٹل رہتی ہے کہ ندیم کو ان ہی کرداروں سے پیار ہے جن کے نہ مٹکے میں اناج ہے نہ صندوق میں کپڑا ہے نہ جیب میں پیسہ ہے اگر کچھ ہے تو آنکھوں میں آنسوؤں کی چنگاریاں ہیں اور دل میں جیسے کسی نے کپڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے اور ہونٹوں کی اکڑی ہوئی پیپڑی بولوں پر یہ دعا اٹکی ہوتی ہے کہ "الٰہی تو جو ایک کو لاکھوں دے ڈالتا ہے۔ لاکھوں کو ایک تو عطا کر دیا کر ہم بڑے شاکر اور صابر لوگ ہیں ہم خون کے گھونٹ پی کر بھی جی سکتے ہیں مگر رگوں میں خون بھی تو ہو۔ ہم مٹی چاٹ کر بھی زندہ رہ سکتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہم سانپ نہیں ہیں ہم تو اشرف المخلوق ہیں ہم تو زمین پر تیبر سے خلیفے ہیں"۔ (ایک عورت تین کہانیاں)

احمد ندیم قاسمی کا مشن دھرتی کے ان بیٹوں، بیٹیوں کے لیے وقف رہا ہے جو انسان ہیں مگر زمین پر رینگتے ہیں۔ دھرتی کا یہ بیٹا مزارع ہے، کاشت کار ہے، کھیت مزدور ہے بعض اوقات بیگار میں پکڑا جاتا ہے خدمت کرتا ہے مگر صلہ میں جاگیردار کی جوتیاں کھاتا ہے اور کمی کمین کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات منفعل حیثیت رکھتا ہے اور مجبوری کی علامت ہے۔ ادبی جاگیردار کے نقاد[1] مزارع نے اپنی دانست میں ندیم کے افسانوں پر جو بہت بڑا اعتراض کیا ہے "دراصل اس حقیقت کا مظہر قرار پاتا ہے کہ جاگیردار کا ظلم اور جبر دیہات کی روح پر کس طرح عفریت بن کر چھا جاتا ہے۔ شہر میں جو جاگیردار ادب، کلچر اور تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھا جاتا ہے کسانوں کے لیے وہ زرد رنگ کی مرد نما دیہاتی سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔ اس لیے ندیم نے اگر پامال دیہاتی کی سسکیوں اور آہوں کو جذباتی سطح پر محسوس کر کے تخلیقی سطح پر اس کا اظہار کیا تو یہ اس کے فنی مقاصد کے عین مطابق ہے کہ اس نے ابتداء سے ہی دھرتی کے مجبور اور بے کس بیٹوں کے لیے اپنا قلم وقف کیے رکھا ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں بھی وہ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

> "حقیقت یہ ہے کہ شمال مغربی پنجاب سے زیادہ میں نے دنیا کے اور کسی حصے کا اتنا گہرا مطالعہ نہیں کیا اور جہاں تک مجھے پنجاب کے دیگر اضلاع کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے دیہاتی زندگی کے بنیادی اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں پایا۔ گاؤں میرے افسانوں کے لیے صرف پس منظر کا کام

---

[1] ایضاً ص: ۴۴۴

دیہات ہے اور اس میں رہنے بسنے والے انسان میرے افسانوں کا کردار ہیں۔
انسانی دل کی دھڑکن دنیا کے ہر حصے میں یکساں ہے۔ دکھ سکھ کا قانون
ہندوستان کے دیگر حصوں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی وہی ہے
جو ان دیہات میں رائج ہے۔ میں نے دیہات کے موضوع پر صرف اسلئے
قلم اٹھایا تھا کہ پنجاب کے دیہات کو صحیح رنگوں میں پیش کرنے والا
مجھے کوئی نظر نہ آیا۔"

(دیباچہ : "طلوع و غروب"[1])

اس اقتباس میں یہ اہم تنقیدی نکتہ قابلِ غور ہے کہ دکھ سکھ کا قانون عالمگیر ہے، جغرافیائی خطہ سے قطع نظر انسانوں کے بنیادی مسائل میں یکسانیت ملتی ہے۔ یہ مسائل اقتصادی بھی ہیں جذباتی بھی اور معاشرتی بھی۔ ندیم کے فن میں اسی اندازِ نظر نے آفاقیت پیدا کی ہے کہ انھوں نے انسان کو محض شمال مغربی پنجاب کے دیہات تک محدود نہ رکھا بلکہ اس کے دُکھ سکھ کی ترجمانی میں ایسی بصیرت کا ثبوت دیا کہ وہ انفرادی حیثیت سے بڑھ کر اجتماعی روپ اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ "الحمد للہ" کا مولوی اُبل نہ صرف یہ کہ ہمارے کسی بھی پس ماندہ گاؤں کی مسجد کا مولوی ہو سکتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ یورپ کی کسی بھی (POOR PARISH) کا غریب پادری بھی ہو سکتا ہے کہ اصل مسئلہ غربت کی پیدا کردہ ایک خاص صورت حال میں انسانی سائکی کی کشمکش کی تصویر کشی ہے۔ ظاہر ہے اس میں اندازِ نظر کی جو نزاکت ہے اس تک مستعار منہ نقاد کی نگاہ نہیں جا سکتی تھی[2] کہ مانگے کی عینکوں سے دیکھنے والوں کے پاس بصیرت تو خیر کیا ہو گی ان کی تو بصارت بھی مشکوک ہوتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے دیہات کو اس تواتر سے موضوع بنایا کہ اب ایک طرح سے وہ ان کا ٹریڈ مارک بن گیا ہے۔ پریم چند سے ہمارے ہاں دیہات کی تصویر کشی کا آغاز ہوتا ہے اور مختلف ادوار میں مختلف افسانہ نگاروں نے دیہات کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا کچھ کے ہاں تو دیہات کی پاک فضا اور دیہاتیوں کی سادہ لوحی نے ایک کلیشے کی صورت اختیار کر لی ہے جیسے وہ بلینڈ و افسانہ نگر

---

[1] اس دیباچہ کے ساتھ "آجکل" (۱۹۴۴ء) کا ابتدائیہ "میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں" ملا کر پڑھنے سے قاسمی صاحب کا تصورِ فن بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

[2] ایضاً ص : ۴۳

جیسے ندیم کے مخالفین بلیسا کھیوں پر کھڑا کر کے اس کے قد میں اضافہ کی سعی ناکام میں مصروف چلے آرہے ہیں چنانچہ (GIANT VS. PYGMY) سے جو مضحکہ خیز صورت حال جنم لے سکتی ہے اس سے احمد ندیم قاسمی کا کچھ نہ بگڑا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے اور جس پر غالباً ابھی تک کسی نقاد نے بطور خاص توجہ نہیں دی کہ ندیم نے دیہات کی پیش کش میں جہاں اقتصادی عوامل اور ان کا باعث بننے والے جاگیر دار کے سلبی کردار کو اجاگر کیا وہاں بے بس دیہاتی کو ردعمل کا اظہار کرتے بھی دکھایا اور میں سمجھتا ہوں یہی انداز نظر ندیم کو دیگر دیہاتی افسانہ نگاروں سے ممیز کرتا ہے ندیم کے دیہات کا غریب یقیناً غربت اور جاگیردار کی چکی کے دو پاٹوں بیچ پستا ہے اور بہت دیر تک پستا جاتا ہے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کی خودی بیدار ہو جاتی ہے اور وہ بے بس دانہ نہیں رہتا بلکہ روڑا بن جاتا ہے اور پاٹوں میں پسنے سے انکار کر دیتا ہے اور یوں وہ ایک توانا ہاتھ میں تبدیل ہو کر چکی چلانے والے کی کلائی تھام لیتا ہے۔ چنانچہ "نیلا پتھر" کا افسانہ "جوتا" اس انداز کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ انداز ندیم کے بعض اور شاہکار افسانوں جیسے بادل اُمڈ آئے "ووٹ" اور کہانی لکھی جا رہی ہے کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ان افسانوں کا بے زبان آہستہ آہستہ زبان میں گویائی اور گویائی میں توانائی پیدا کرتا جاتا ہے۔ یوں کہ "جوتا" میں چودھری سے یہ تک کہنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔

"کرموں بگڑ گیا نہیں صاحب جی! میں گداگر نہیں ہوں۔ گدا کا ایک پیسہ بھی مجھ پر حرام ہے میں تو عمر بھر اپنی محنت کی کمائی کھاتا رہا۔ میرے بچے پڑھ لکھ گئے تو یہ بھی میری محنت کی کمائی ہے اب وہ محنت کرتے ہیں اور میری محنت کا بدلہ چکاتے ہیں میں تو اب زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں پھر میں گداگر کیسے ہو گیا گداگری اتنی سستی ہے تو چودھری کو گداگر کہو کہ کسان محنت کرتا ہے اور چودھری کھاتا ہے۔"

چودھری کو خبر ملی کہ کرموں نے ووٹ درج کرنے والوں کے سامنے اسے گداگر کہا ہے اسے فوراً دارے پر بلایا گیا اور سب گاؤں والوں کے سامنے چودھری نے اپنے منشی سے اسے جوتے لگوائے۔ جوتے لگ رہے تھے جب کرموں اچانک اٹھ بیٹھا اور منشی کی کلائی پکڑ کر بولا بس باسٹھ پورے میرا کرنٹ مجھے مل گیا زیادہ لگاؤ گے تو قیامت کے دن چودھری جی کو تکلیف ہو گی۔

"مجھے تکلیف ہوگی؟" چودھری یوں حیران رہ گیا جیسے اس کے سر پر سورج گر پڑا ہے۔ "مجھے کیسے تکلیف ہوگی بکنے؟"

کرموں کے تیور بدلے ہوتے تھے۔ بولا "چلئے آپ کو تکلیف نہیں ہوگی تو آپ کا حساب پورا کرنے والے فرشتوں کو تکلیف ہوگی۔"

"میرا حساب؟" چودھری نے اس طرح پہلو بدلا جیسے پلنگ پر کھڑا ہو جائیگا "کیا بکتے ہو میرا حساب کیسا؟"

"جی یہی! غریبوں کو جوتے لگوانے کا حساب ایک کے ستر۔" کرموں مزید جوتوں کا انتظار کیے بغیر کھڑا ہوا تھا اور زمین پر سے اپنی پگڑی اٹھا کر اسے جھاڑ رہا تھا۔ "اب آپ خود حساب لگا لیجئے۔ اقبال قائم کہ باسٹھ یہ جوتے اور باسٹھ وہ پچھلے کل ہوتے خدا آپ کا بھلا کرے ایک سو بیس قیامت کے دن اگر ایک کے ستر لگیں گے تو ایک سو بیس کے کتنے لگیں گے منشی، حساب لگا کر بتا دو چودھری جی کو۔"

چودھری نے غصے میں اپنے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر جب دیکھا کہ دارے پر موجود بیشتر لوگ کرموں کی باتوں پر دانت نکالے کھڑے ہیں تو ہاتھ واپس لانے کی بجائے اس نے زمین پر سے ایک تنکا اٹھایا اور اسے اپنی پوروں میں یوں مسلا کہ وہ سفوف سا بن کر رہ گیا۔ گالیاں اس کے ہونٹوں پر کپکپاتی رہ گئیں۔"

یہ فنی ریاضت، ندرت نگاری اور غریب دیہاتی کے ضمیر کی پہچان صرف احمد ندیم قاسمی سے ہی مخصوص ہے۔ کسی پلینڈو افسانہ نگار کے بس کی بات نہیں۔ اور ایک خاص جاگیردار نے قاسمی صاحب کو اپنی دشنامی مہم کا مرکز بنا رکھا ہے تو وہ بھی اس لیے ہے کہ اسے قاسمی صاحب کے فن میں اپنے لیے باسٹھ کا حساب نظر آتا ہے۔

جہاں تک عورت کا تعلق ہے تو احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں وہ ایک توانا اور بالعموم پہل قدمی کرنے والی ثابت ہوتی ہے۔ قاسمی صاحب کے افسانوں کا مرد اپنی تمام مردانگی کے باوجود عورت کے حضور قدرے گھبرایا گھبرایا اور اکھڑا اکھڑا سا محسوس ہوتا ہے سو وہ خود کو عورت کے سامنے سخت زمین پر کھڑا محسوس نہیں کرتا۔ جب کہ ہر لمحے اسے یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں وہ عورت کی دلدل میں دھنس کر نہ رہ جائے سو یہ اس کی اپنی تمنا بھی یہی ہوتی ہے لیکن خواہش

کے باوجود وہ عورت کے سامنے جھینپو سا بن کر رہ جاتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے دیکھیں تو یہ خود افسانہ نگار کی سائیکی کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ قاسمی صاحب نے تمام عمر شرافت اور نیک نامی میں بسر کی ہے۔ آج تک ان سے کوئی سکینڈل منسوب نہ ہوا اور میرا خیال ہے کہ غیر عورت کا ہاتھ پکڑنے میں جو ایک خاص قسم کا تھرل ہے وہ اس سے آشنا نہیں (اب غیر عورتوں نے اگر ان کا ہاتھ چھو جانے پر کسی طرح کا تھرل محسوس کیا ہو تو یہ اور بات ہے) اس لیے ان کے افسانوں میں اب تک عورت کے بارے میں وہ جھجک پائی جاتی ہے جو ٹین ایجرز لڑکے پختہ عمر کی عورت کے سامنے محسوس کرتے ہیں وہ جنسی کشش سے اس کی طرف کھنچ بھی جاتے ہیں مگر ناکردہ کاری کا خوف زنجیر بھی بن جاتا ہے چنانچہ "چاگل" "نامرد" "نمنگاتی الاؤنس" اور "حد فاصل" وغیرہ ان کے پرانے افسانوں میں یہی شرمیلا مرد روپ بدل بدل کر آتا ہے۔ ان سب افسانوں کے مرد میں آخری قدم اٹھانے کی جرات نہیں۔ جبکہ ان سب افسانوں کی عورت مرد کے مقابلہ میں زیادہ برجستہ ہے اور اسی لیے زیادہ شدید اور AGRESSIVE بھی۔ "نیلا پتھر" کا افسانہ "عالاں" بھی اسی جنسی رویہ کا غماز ہے۔

"میں نے کہا تم کیا کچھ کر لیتی ہو عالاں، تم چکی پیس لیتی ہو، چھتیں تم لیپ لیتی ہو مرچیں تم کوٹ لیتی ہو۔ کنویں سے وہ دو تین تین گھڑے پانی بھر لاتی ہو پورے گھر کا کام تم سنبھال لیتی ہو کرتے تم کاڑھ لیتی ہو۔ بوجھ تم اٹھا لیتی ہو۔ تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو عالاں۔"

وہ خاموش کھڑی رہی پھر دو قدم اٹھا کر میرے اتنے قریب آ گئی کہ مجھے اپنی گردن پر اس کی سانسیں محسوس ہونے لگیں۔ "میں تو اور بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں عارف میاں" اس کی آواز میں اسی جھنکار تھی۔ "آپ کو کیا معلوم میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں۔"

مردانہ جبلت کا تقاضا ہے کہ مرد پوچھے کہ وہ اور کیا کیا کر سکتی ہے۔ کیونکہ گردن پر پڑتی گرم سانسیں بہت کچھ کہہ رہی ہیں مگر وہ خوفزدہ بچہ کی طرح خاموش رہتا ہے چنانچہ۔

"ذرا سے وقفے کے بعد بولی۔ مجھ سے پوچھیے نا میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں۔"
پہلی جماعت کے بچے کی طرح میں نے اس سے پوچھا۔ "اور کیا کچھ کر سکتی ہو"
"میں پیار بھی کر سکتی ہوں عارف میاں۔ اس نے جیسے کائنات کا راز افشا کر دیا۔"

احمد ندیم قاسمی کے لیے یہ افسانہ یہاں پر ختم ہو گیا اور بہت اچھا ختم ہوا مگر سعادت حسن منٹو شاید یہاں سے اپنا افسانہ شروع کرتا اور اسی میں اردو کے ان دو قدآور افسانہ نگاروں کی شخصیت کی نفسی اساس اور فنی مقاصد میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔

بارٹر "نیلا پتھر" کا بے حد دل چسپ افسانہ ہے اور (WIFE SWAPING) کے خطرناک موضوع پر غالباً اردو کا دوسرا کامیاب ترین افسانہ ہے (پہلا راجندر سنگھ بیدی کا "کشن ڈگریا"

اس تھیم پر جان اپڈائیک نے (THE COUPLES) کے نام سے بے حد مشہور اور نزاعی ناول بھی لکھا ہے جہاں تک بیویاں بدلنے کے کھیل کا تعلق ہے تو اسے ایک نوع کا سمجھوتہ قرار دیا جاسکتا ہے جس میں خاوند محض اس لیے خاموش رہتا ہے کہ اپنی بیوی گنوائی تو نعم البدل کے طور پر دوسرے کی بیوی بھی تو ہاتھ آئی۔ قاسمی صاحب نے اس جنسی طرز عمل کو جو بارٹر قرار دیا تو یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ اگر بیوی (یا خاوند) گنوانے کے معاوضہ میں کچھ بھی نہ ملے تو یہ پھر بد چلنی قرار پاتی ہے اور سخت اذیت دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس سمجھوتہ کی اساس تنوع کا طالب جنسی طرز عمل بنتا ہے یہ خوب سے خوب تر کی جنسی تلاش ہے جسے کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ کی اخلاقیات کا ثمر قرار دیا جاسکتا ہے اور یہ سب جنسی تجسس کے محیط میں ہوتے ہیں۔

قاسمی صاحب نے بھی اس اہم نفسیاتی نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہ "بارٹر" کے میاں بیوی کا مکالمہ ہے

"رخشی نے اپنی لمبی سڈول گردن آگے بڑھائی۔ سنو، کل مختار نے مجھے زبردستی کس کرنے کی کوشش کی۔

محمود کا ہاتھ بوتل کی گردن کی طرف بڑھا مگر رخشی نے اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس پر اپنا دوسرا ہاتھ پھیرنے لگی۔ تم سنتے تو ہو نہیں میں چاہتی ہوں ذرا دیکھیں مختار کتنے پانی میں ہے۔

پھر اس نے سرگوشی کی میں کل دو چار گھنٹے اس کے ساتھ شاہ بلوط ہوٹل میں گزارنا چاہتی ہوں۔ میں صرف ٹوہ لگانا چاہتی ہوں کہ نگینہ سے شادی کے بعد بھی وہ ۔"

ہاں ہاں محمود کو بھی کرید ہوئی۔ اگر مختار نگینہ کی سی شہزادی سے شادی کر کے بھی ۔"

اس کے بعد قاسمی صاحب نے یہ دکھانے کی کوشش نہیں کی کہ رخشی نے کس طرح اپنی کرید کی تسکین کی بلکہ سارا زور محمود کے اس شدید ردِ عمل کی عکاسی میں صرف کیا ہے جس کا اظہار وہ زیادہ سے زیادہ شراب پی کر، عالیہ کو مسترد کر کے اور گلاس توڑ کر کرتا ہے کہ رخشی کے چند گھنٹے دلوں تک پھیل گئے تھے، ادھر ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ نگینہ بھی جلالی میں کسی ہنٹر والی سے کم نہیں۔ چنانچہ افسانہ محمود کے غصہ اور اس کے پیدا کردہ تناؤ کے ذریعے کلائمکس کی طرف بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ۔

"سامنے کے دروازے میں سے محمود اور نگینہ بازو میں بازو ڈالے ہال میں داخل ہوتے دونوں کے لبوں پر وہ مسکراہٹیں تھیں جو آنکھوں کو بھی چمکا دیتی ہیں اور چہروں کو بھی دمکا دیتی ہیں

مختار اور رخشی دونوں جیسے بجلی کے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوتے اور جب وہ اٹھے تو محمود اور نگینہ کے قدم جیسے فرش کی ٹائیلوں نے پکڑ لیے۔ طرفین ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے برسوں کے بعد ملے ہیں تو پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے۔

پھر ادھر سے مختار اور رخشی اور ادھر سے محمود اور نگینہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے، صاف معلوم ہو رہا تھا کہ رخشی محمود سے خوفزدہ ہے اور مختار نگینہ سے۔

مگر پھر یوں ہوا کہ محمود نے قریب آکر کہا "ہیلو مختار" اور رخشی کے بازوؤں میں بازو ڈال کر پلٹا تو مختار بولا "ہیلو"

"ہیلو" نگینہ نے بازو اٹھائے بغیر جیسے اپنا پورا جسم مختار کے جسم میں پیوست کر دیا اور پھر اس کے بازوؤں میں بازو ڈال کر دوسری سمت چل پڑی۔

"سارا معاملہ یوں چپ چاپ طے پا گیا جیسے دونوں مال کا تبادلہ کرنے آتے تھے"

OO

نیا افسانہ نئی سازش

انیس ناگی

یہ رجحان چونکا دینے والا ہے کہ پاکستان کے نئے اردو افسانہ نویسوں میں شہرت کی گرسنگی غیر معمولی حد تک تجاوز کر چکی ہے وہ بہت عجلت میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سے، ہیر پھیر سے یا تعلق سازی سے شہرت اور عظمت حاصل کر سکیں خواہ اس کی کوئی قیمت ہی ادا کیوں نہ کرنی پڑے ادیب شہرت کا مطالبہ کر سکتا ہے لیکن وہ شہرت کے لئے نہیں لکھتا۔ اس دور میں کم و بیش وہ تمام نئے افسانہ نویس شامل ہیں جنھوں نے ۱۹۷۰ کے بعد نیا یا پرانا افسانہ لکھنا شروع کیا ہے یا یوں کہ ہندوستان کے بعض ادبی رسالوں نے بعض افسانہ نویسوں کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اچھالا، ایک دو مضامین میں ان کا ذکر بھی کیا، ادھر بھیڑ چال شروع ہوئی، مراسلت کا آغاز ہوا، ایک دوسرے پر داد نچھاور کی گئی اور پاکستان کے کچھ افسانہ نویس جو تجربات کر رہے تھے ہندوستان کے افسانہ نویسوں نے اس کی تقلید کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ نئے افسانہ کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی ہے پاکستان میں نہیں۔ پھر ہندوستان کے ادیب اور افسانہ نویس کسی نہ کسی بہانے عازم پاکستان ہوئے، ان کی ضیافتیں ہوئیں، انھوں نے جواباً ان کی فنی مہارت پر آہ واہ کی لیکن واپس جا کر ایسے بیانات صادر کئے کہ پاکستانی افسانہ نویس انگشت بدنداں ہوئے۔ یہاں اندرون ملک بھی انہیں افسانہ نویسوں کو ایک اردو خواں امریکی طالبہ کے گرد طواف کرتے مستدعی دیکھا گیا کہ وہ ان کے افسانے انگریزی میں ترجمہ کر دے، ان پر انگریزی میں مضامین لکھے وغیرہ۔ اس خاتون نے مسکراتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہر افسانہ نویس اس کو دیباچہ لکھنے کی فرمائش کرتا ہے۔ دروغ برگردن رعای اس خاتون نے یہاں کے آدھے پیدل اور آدھے سائیکل سوار ایک نقاد کے بارے میں ہندوستان میں ایسے بیانات دیئے ہیں کہ اس ملک کے دانشور محظوظ ہوئے ہیں، اس امریکی طالبہ سے سب خوش تھے، وہ ہندوستان میں جا کر پاکستانی افسانوں پر ریسرچ کرتی تھی، اور یہاں وہ ہندوستان کے اردو افسانے پر غور و فکر میں مصروف تھی۔ انگریزی انگریزوں کی زبان ہے یہ کینیڈا۔ آسٹریلیا، امریکہ، نیوزی لینڈ اور نہ جانے کہاں

کہاں بولی اور لکھی جاتی ہے۔ اگر نیوزی لینڈ میں ادب کی صورت حال دگرگوں ہے تو انگریز کا دل نہیں پھڑکتا۔ اگر ہندوستان میں نئی شاعری پست سے پست ہوتی جا رہی ہے تو پاکستانی دانشوروں کی نبض تیز نہیں ہوتی، لیکن کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے شاعر ادیب پاکستانی ادب کے بارے میں متفکر رہتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ وہ دونوں ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ ناقلوں نے دعویٰ پیدا کر دی ہیں۔ کیا یہ ثقافتی معاملے ہر دو تہذیبوں کے ادغام کی سازش نہیں ہیں؟ کس قسم کے تعصب اور تنگ دلی کو درمیان میں لائے بغیر یہ استفسارات جوابات کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہر ادیب زیادہ سے زیادہ نشر و اشاعت چاہتا ہے لیکن یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہوتا ہے تاہم جب وہ ذاتی تشہیر کے لئے کوئی اجتماعی راضی نامہ کرتا ہے تو پھر تنازعہ حق بجانب ہے اس تمہید کی غایت بدلیش میں پاکستا . اد ب کی اشاعت پر قدغن لگانا نہیں ہے بلکہ ان اثرات کا جائزہ لینا ہے جو کافی سالوں سے پاکستان میں اردو ادب میں سرایت کرتے رہے ہیں۔ سرحد پار کی تحریروں میں کافی دیر سے یہ پیغام موصول ہوتا رہا ہے کہ ہم ایک ہیں، ہماری دھرتی ایک ہے۔ لیکن ہمارے ادیبوں نے واضح طور پر اس کی تردید نہیں کی کیونکہ شہرت کی تلاش ان کا اعصابی مسئلہ رہا ہے۔ یہ پیغام ایک طرح کی تہذیبی برین واشنگ ہے۔ اس کے اثرات دیکھنے ہوں تو کراچی اور لاہور سے شائع ہونے والے نئے افسانوں کے دو انتخابات کا ملاحظہ کیجئے جن میں دونوں ملکوں کے افسانہ نویسوں کو ایک دوسرے کا ناگزیر جزو بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ امریکی، برطانوی، آسٹریلین، کینیڈین شعر و ادب کے انتخابات کے سینکڑوں مجموعے دستیاب ہیں جن میں لسانی اشتراک کو بنیاد بنانے کے بجائے ملکی سطح پر ادبی تخلیقات کو پیش کیا گیا ہے لیکن ہمارے یہاں بعض ادیبوں نے اپنی شناخت کے لئے ہندوستان کے ادیبوں کی موجودگی کو مشروط ٹھہرایا ہے لیکن کیوں؟ کیا گذشتہ چونتیس سالوں میں پاکستانی اردو ادب کے نام کی کسی چیز نے جنم نہیں لیا؟ ثقافتی ہم آہنگی کا تصور ایک مہلک سازش ہے اور پاکستان کے اردو افسانہ نویس اولاً اس کا شکار ہوئے ہیں۔ حال ہی میں کشور ناہید وغیرہ کی زیر ادارت شائع ہونے والے "ادب لطیف" (شمارہ مارچ سا۸۱ء) میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا "نئے اردو افسانے" پر مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ انہوں نے جس چابکدستی سے 'ہم ایک ہیں' کے تصور کو نئے اردو افسانہ کی تفسیر کے ملمع میں پیش کیا ہے وہ دیدنی ہے اور اس مضمون کو نمایاں طور پر شائع کرنے والوں کی نیت کی داد دینی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف ایک طرف بہت سے ادبی اور تاریخی مغالطوں کا شکار ہیں اور دوسری طرف ہر دو ملکوں کی موجودہ ادبی روایت کو مدغم کرنے کے درپے ہیں۔ انہوں نے جس طرح پاکستان اور ہندوستان کے افسانہ نویسوں کی

گرد پنگ کی ہے وہ ان کی ہین السطورنیت کی غماز ہے۔ اس مضمون میں بہت سے نزاعی مقامات ہیں۔ ان میں سے بعض کا تجزیہ ضروری ہے کیونکہ پاکستان کے افسانہ نویسوں کے یہاں مقبولیت کا جنون کچھ ضرورت سے زیادہ متجاوز ہو چکا ہے۔ وہ ایک اعتبار سے اپنی ثقافتی حیثیت کو بھی محو کرنے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں کیونکہ اس دو فریقوں پر دو ان عنصرات سے آشنا نہیں ہیں جو دوسری طرف سے ان کو ضرورت سے زیادہ ترغیب دے رہے ہیں۔ اس ترغیب کی ایک شکل ڈاکٹر گوپی چند کا زیر نظر مضمون ہے جس میں وہ ابھی تک دو تمدنی روایت کے تسلسل کو ضروری سمجھتے ہیں اور اپنے استدلال کو معتبر بنانے کے لئے یونگ کے رسوا زمانہ اجتماعی لاشعور کے تصور سے استمداد لیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یہ یاد رہنا چاہئیے کہ ادب میں کتنی اور کیسی تبدیلیاں کیوں نہ آئیں ادب کا گہرا رشتہ ہمارے اجتماعی لاشعور کے صدیوں کے پرانے تقاضوں، نسلی اثرات اور مذہبی مزاج و افتاد طبع سے ضرور رہے گا"

ڈاکٹر موصوف نہ جانے کس زمانی تسلسل میں زندگی کر رہے ہیں کہ انہیں ابھی تک یہ احساس نہیں ہوا کہ اجتماعی لاشعور کا کانٹا چونتیس سال سے بدل گیا ہے، دو تمدن جو ایک وقتی مصلحت کے تحت ایک دوسرے کو قبول کرنے پر مجبور تھے بالآخر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف اجتماعی لاشعور کے تصور کے ذکر پس پشت یہ درس دینا چاہتے ہیں کہ ہر دو خطوں کے افسانہ نگاروں کا چونکہ اجتماعی لاشعور مشترک ہے اس لئے ان کی نفسیاتی افتاد طبع اور موجودہ صورت حال بھی ایک سی ہے، اس کے نتیجے کے طور پر ہر دو افسانہ نگار ایک سے ہیں، ان میں کوئی نظریاتی اور تاریخی خلیج نہیں ہے۔ یہ فراموش نہیں کرنا چاہئیے کہ دو تمدنی روایت تمام عہدوں میں ایک دوسرے کا تضاد مہیا کرتی رہی ہے اور ایک نے دوسرے کو چند رسموں اور معاشرتی عادتوں سے زیادہ قبول نہیں کیا۔ میں یہاں کوئی نیا تمدنی تنازعہ پیدا کرنے کی بجائے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ان سے مماثل ادیبوں کی برین واشنگ کی اس حکمت عملی کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جس کا نشانہ ہمارے بھولے بھالے افسانہ نویس ہیں جو اپنی شہرت کے استحکام اور اپنے ادبی مرتبہ کے قیام کے لئے سرحد پار کے سرٹیفکیٹ کے لئے تڑپتے ہیں۔

چونکہ ڈاکٹر گوپی چند ایک خاص منصوبے کے تحت لکھ رہے ہیں اس لئے انہوں نے اردو میں نئے افسانے کے آغاز اور پھر افسانہ نگاروں کی گروہ بندی میں جس استدلال اور فراست کا ثبوت دیا ہے وہ تاریخی طور پر نا قابل قبول ہے بلکہ نئے اردو افسانہ سے ان کی لاعلمی پر دلالت

کت ــــــ لکھتے ہیں تو ... ان افسانہ نگاروں کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے جو ۵۵ء سے ۵۶ء کے لگ بھگ افسانہ نگاروں میں روایت کے انحراف کے سفر پر نکلے اور جنہوں نے انسان کے بنیادی مسائل ــــ کر اردو افسانے میں ایک آفاقی انسانی جہت کا اضافہ کیا۔" افسانہ نگاری کے میدان میں جن افسانہ نویسوں نے جہاد کیا ہے وہ ڈاکٹر موصوف کے مطابق حسب ذیل ہیں... رام لال، جوگندر پال، کلام حیدری رتن سنگھ، عابد سہیل، امر سنگھ غلام الثقلین نقوی وغیرہ وغیرہ وغیرہ.... (کل نام ۱۸) ابھی تک یہ واضح نہیں ہو سکا کہ ان افسانہ نویسوں نے یا اس قبیل کے دوسرے درجے کے افسانہ نویسوں نے اردو افسانہ یا اس کے لسانی سٹرکچر میں کیا اضافہ کئے ہیں، یہ وہ نام ہیں جنہیں علم قاری رسالے میں چھپا ہوا دیکھ کر ورق الٹ دیتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تک شاعری اور افسانہ میں سابق ترقی پسند تحریک کا اثر نفوذ رہا اور بعض اچھی ریلسٹ کہانیاں لکھی گئیں، دوسری طرف فسادات اردو افسانہ کا موضوع رہے جس پر سعادت حسن منٹو کے لازوال افسانے اور قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا" معرض وجود میں آیا۔ ان کا موضوع انسان کے اندر مخفی اس کا غیر منطقی اندھا تمرا فیدہ حصہ ہے جسے انسانی تہذیب بھی مسخر نہیں کر سکی۔ منٹو اس عہد کا سب سے بڑا افسانہ نویس تھا اپنی زندگی میں ہی کلاسیک بن چکا تھا۔ اس کے افسانے ریلیزم کے اسلوب کی انتہا تھے۔ منٹو کے ساتھ ساتھ غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ ایک نئے ریلیزم کی جویائی میں مصروف تھے۔ رومانوی افسانہ نویسوں میں اشفاق احمد، اے حمید اور دوسرے رومانوی اسلوب میں نفس انسانی کی واردات رقم کر رہے تھے۔ مجموعی اعتبار سے اردو کا لسانی اسلوب جو قیام پاکستان سے پہلے ڈھیلا اور ادھڑا ہوا تھا زیادہ منظم اور زیادہ سے زیادہ اظہار پر قادر ہو رہا تھا۔ یہ افسانہ نویس اردو میں ریلسٹ افسانہ کی آخری کڑی ہیں بلکہ وہ تمدنی روایت کے آخری ترجمان ہیں لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ۵۰ ۱۹ء سے ۱۹۵۵ء کے دوران جو افسانے لکھے گئے میرا مطلب ہے وہ افسانے جنہیں "کبیر تحریریں" کہا جا سکتا ہے وہ تصوراتی سطح پر ایک الگ ملک کے قیام کے بعد، نئی صورت حال سے مطابقت پیدا کرنے کے عمل کو ظاہر کرتے ہیں چنانچہ ہمارے افسانہ نویس خصوصاً اور بعض دوسرے لکھنے والے عموماً ۱۹۴۷ء کو "تہذیبی المیہ" کہتے ہیں یہی ترکیب ڈاکٹر گوپی چند نے اپنے زیر نظر مضمون میں استعمال کی ہے لیکن یہ امر ناقابل فہم ہے کہ ۱۹۴۷ء کیونکر تہذیبی المیہ ہے؟ وادی سندھ ہماری وراثت ہے گندھارا کے علاقوں میں تین سو سال تک قائم رہنے والی یونانی حکومتیں بھی اسی طرح ہماری میراث کا جزو ہیں، کیا ہم یہاں مسلمان صوفیا، مسلمانوں کی طویل حکومت اور

پھر بعد میں انگریزوں کی حکومت کو اپنے تہذیبی سانچے سے خارج کر سکتے ہیں ؟ اس سیاق و سباق میں کونسا ایسا تہذیبی المیہ ہے جس نے ہمارے اندر خلا پیدا کر دیا ہے اور پھر بار بار یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ ہر دو ملکوں کے افسانہ نویسوں اور شاعروں کی تخلیقات ایک جیسی ہیں یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس کی تشہیر ادب کے ذریعے کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بہت بڑے پروفیسر ہیں اور گزشتہ سال انہوں نے اردو افسانہ پر سیمپوزیم پر ہمارے افسانہ نویسوں کو بھی مدعو کیا تھا علاوہ پاکستان میں نئے اردو افسانہ کے آغاز کے بارے میں وثوق نہیں رکھتے اردو کے نئے نقادوں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی اب اعلان کیا ہے کہ منٹو کا "پھندنے" ایک اہم نیا افسانہ ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا افسانہ ہے جس میں سرریلسٹ اسلوب کے ذریعے تجربے کا ادراک لفظی مونتاج کے ذریعے کیا گیا ہے اس میں تصویریں بنتی اور ٹوٹتی ہیں یہ نئے اردو افسانے کا نقطہ آغاز ہے۔ منٹو کے معاصر افسانہ نویس "پھندنے" کی ماہیت اور اہمیت کو نہ سمجھ سکے اس لئے وہ اردو میں نئے افسانے کے امکانات دریافت کرنے سے قاصر رہے نئے افسانے کی دریافت اور ساخت کا عمل ۱۹۶۰ کے لگ بھگ پاکستان کے افسانہ نویس کرتے ہیں، ان میں انور سجاد اور انتظار حسین پیش پیش تھے۔ پاکستان میں نئے اردو افسانہ کا فروغ یہاں کی معاشرتی اور تمدنی صورتحال کا نتیجہ تھا ظاہر ہے کہ اس کے برعکس ہندوستان کی مجموعی صورتحال ہمیشہ سے ہم سے مختلف رہی ہے اس لئے بیک وقت، دو مختلف صورت احوال میں ایک ہی رجحان کا فروغ قابل قبول نہیں ہے۔ اگر ادب واقعی کسی ایک معاشرے کی اندرونی کیفیت کا مظہر ہوتا ہے تو پھر ڈاکٹر موصوف کا یہ مفروضہ اور بھی نحیف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ معاشرتی سیاسی اور تمدنی شرائط ادب کا قالب و لہجہ مرتب کرتی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف آگے جا کر لکھتے ہیں کہ سائرہ ہاشمی، رشید امجد، مسعود اشعر، منشا یاد اور میرزا حامد بیگ وہ نئے افسانہ نویس ہیں جو ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آئے ہیں ان کے علاوہ اسی فہرست میں ۳۲ اور نام ہیں جن میں سے بیشتر ہندوستان کے لکھنے والے ہیں جن کی ادبی جسامت سے میں آشنا نہیں ہوں۔ یہ گڈ مڈ پنگ کسی قدر کم مضحکہ خیز نہیں ہے۔ مسعود اشعر پچھلے پچیس سال سے افسانہ لکھ رہے ہیں!

ڈاکٹر موصوف افسانے میں کہانی کے عنصر کی عدم موجودگی سے بہت ناراض ہیں اس کے بارے میں لکھتے ہیں، میرے نزدیک کہانی سے کہانی پن کا اخراج غیر افسانوی عمل ہے اور اس کی مذمت کرنی چاہیئے۔ چلئے ساعت بھر کے لئے ہم بھی اس مذمت میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر موصوف ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ ان کے نزدیک نئے افسانے کا تصور کیا ہے؟ استعارے کے استعمال کیلئے افسانے کا تمام فیبرک بدلنا ہوتا ہے وہ استعارہ جو تصویر سے عاری ہوتا ہے وہ تشبیہہ کا فریضہ ادا کرتا ہے استعارہ وغیرہ

ادراک کا وسیلہ ہوتے ہیں، دیکھنا تو یہ ہے کہ نئے افسانہ نویسوں نے انسانی معاملات میں حیات و کائنات میں کونسی ایسی جہت تلاش کی ہے جو انہیں جدید ہونے کی خلعت عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف اس کا سراغ نہیں دیتے۔ افسانے میں کہانی کے لئے اصرار اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ابھی تک افسانے کے قدیم تصور کو تھامے ہوئے ہیں۔ افسانہ ایک تشکیل ہے جو احساس کی بھی ہو سکتی ہے اور واقعہ کی بھی۔ یہ ضروری نہیں کہ افسانہ کہیں سے شروع ہو اور کہیں جا کر ختم ہو۔ چنانچہ اس طرح افسانہ زبان کی PLASTICITY ہے جو سب کچھ اپنے اندر سمو سکتی ہے اس لئے اس کے لئے کسی ماقبل شرط کے لئے اصرار اس کے عمل کو رد کرنا ہے۔ اردو میں افسانہ لکھتے ہوئے کہانی سے گریز ریلسٹ اسلوب کی جبریت سے رہائی کی شکل ہے۔ یہ افسانہ کی روایت میں تجربے کی کوشش ہے جسے ابھی سے مردود کہنا قبل از وقت ہے۔ یہ مشاہدہ پاکستان کے اردو افسانہ نویسوں کے بارے میں ہے۔ باقی ہندوستان میں نئے افسانے کی کیا حالت ہے وہ ڈاکٹر موصوف بہتر جانتے ہیں۔

OO

جدید افسانہ اور عصری صداقتیں

شہزاد منظر

جو لوگ جدید تر افسانے کا مطالعہ کرتے رہے ہیں وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ آج کا افسانہ، روایتی افسانے کی طرح صرف کہانی بیان نہیں کرتا، زندگی کے تلخ حقائق، اقدار کی شکست اور زندگی کی بے معنویت اور بے سمتی کا نوحہ بھی پیش کرتا ہے اور جبریت و استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس کا لہجہ ترقی پسندوں کی طرح براہ راست اور بلند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید افسانے میں پہلے سے زیادہ فکری گہرائی پیدا ہو گئی ہے اور آج ایسے افسانے لکھے جا رہے ہیں جو اس سے قبل کبھی نہیں لکھے گئے۔ میرا مطلب ہے کہ جدید افسانہ نگار عصری مسائل کو جس طرح محسوس کر رہے ہیں، اس سے قبل افسانہ نگاروں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ آج کے معروضی حالات ماضیٔ قریب کے حالات سے قطعی مختلف ہیں۔

جدید افسانہ نگاروں نے عصری زندگی خصوصاً حالیہ تاریخ کے تمام اہم واقعات پر افسانے لکھے ہیں لیکن ان افسانوں کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے خاص نظر کی ضرورت ہے جو افسوس! بہت کم لوگوں میں موجود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم روایتی افسانے پڑھنے اور زندگی کو مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھنے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ جب ہمارے سامنے کوئی نیا اندازِ بیان اور زندگی اور فن کو پرکھنے کے لیے نیا معیار آتا ہے تو ہم اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور مخصوص اور طے شدہ راہوں پر چلنے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں یہی رویہ ترقی پسندوں اور روایت پسندوں کے لیے جدید افسانے کی تفہیم میں مانع ثابت ہوتا ہے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ جدید افسانہ ترقی کے بامِ عروج پر پہنچ چکا ہے اور تمام جدید افسانے اعلیٰ پائے کے ہوتے ہیں لیکن میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ گذشتہ پندرہ بیس سال کے دوران ایسے افسانے ضرور لکھے گئے ہیں جن میں ہمارے دَور اور ہمارے مسائل کو نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور بعض افسانوں میں ہمارے عہد کی پوری تاریخ رقم کر دی گئی ہے اور بعض افسانوں کا ہمارے قومی سانحات سے براہ راست تعلق ہے۔ اہل نظر ان افسانوں کو ایک خاص تناظر میں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے مشرقی اور مغربی صوبوں کے درمیان تنازعہ یا سقوطِ مشرقی پاکستان کے موضوع پر مسعود اشعر کا افسانہ "دکھ جو مٹی نے دیے" یا انتظار حسین کا افسانہ "شہر افسوس" "مملوک لوگ" "نیند" "ہندوستان سے ایک خط"، وغیرہ یا جمہوری اداروں کی تباہی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے

ہونے والے واقعات اور طاقتوں کے بارے میں انتظار حسین، انور سجاد، رشید امجد، مسیح آہوجہ، اعجاز راہی احمد داؤد، احمد جاوید، مرزا حامد بیگ، منشا یاد، اے خیام، علی حیدر ملک اور رحمٰن شریف جیسے لاتعداد افسانہ نگاروں کے افسانے ۔

اس مختصر سے مقالہ میں گزشتہ دو عشرے میں لکھے جانے والے تمام قابل ذکر افسانوں کا جائزہ لینا ممکن نہیں اس لئے میں صرف چند افسانوں کے تجزیے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ یہ افسانے بلا تخصیص اور بغیر کسی اہتمام کے منتخب کئے گئے ہیں۔ بعض اہم اور قابل ذکر افسانے کا اس مقالہ میں ذکر نہ ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ افسانے کم اہمیت کے حامل ہیں۔ یہاں میں سب سے پہلے "معاصر" کے گذشتہ شمارے میں شائع شدہ انتظار حسین کے افسانے "خواب اور تقدیر" کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ افسانہ بلاشبہ اس عہد کا بہت ہی اہم افسانہ ہے جو ہر دور کی کہانی ہے ۔

یہ افسانہ جبر کے ایک ایسے دائرے کے بارے میں ہے جس سے نکلنا شاید انسانی تقدیر میں نہیں ہے۔ انسان بار بار جبر کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ بعض دفعہ وہ ظاہری طور پر کامیاب بھی ہو جاتا ہے پھر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی کوفے میں محصور ہے " جس سے نکل کر وہ مدینے میں جانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ انتظار حسین نے اس مختصر سے افسانے میں پوری انسانیت کی تاریخ رقم کر دی ہے۔ اس انسان کی تاریخ جو ازل سے جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے اور شاید ابد تک جدوجہد کرتا رہے گا۔

افسانے کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ ناقوں پر سوار تین شخص نہایت خاموشی کے ساتھ شہر پے وفا (کوفہ) کی حدود سے باہر نکل آتے ہیں اور بے اختیار سجدے میں گر کر اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یہ تینوں اس آفت زدہ شہر سے نکل آنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو کسی زمانے میں امن و امان اور راحت و عافیت کا آماجگاہ تھا لیکن اب جہاں غذائیں اپنا ذائقہ کھو بیٹھی تھیں اور ٹھنڈے میٹھے کنوئیں یک لخت کھاری ہو گئے تھے ۔

یہ سب کچھ اس شخص کے وارد ہونے کے بعد ہوا جو بالا قد گھوڑے پہ سوار سیاہ عمامہ پہنے ڈھال تلوار زیب کمر کئے شہر میں داخل ہوا۔ لوگوں نے سمجھا کہ امام زماں کا ورود ہوا۔ نجات دہندہ کا ظہور ہوا۔ گلی، گلی کوچہ کوچہ یہ خبر پھیلی۔ لوگ مسرور ہوئے نجات کے تصور سے مسرور ہوئے۔ مرحبا کہتے گھروں سے نکلے اور گرد اس کے اکٹھے ہوئے۔ قصر الامارہ کے اونچے دروازے پر پہنچ کر اس نے گھوڑے کی باگ کھینچی اور مجمع کی طرف رخ کیا۔ رخ کرتے کرتے دفعتاً ڈھاٹا کھولا۔ خونخوار صورت کف در دہاں۔ نیام سے شمشیر نکالی اور کڑک کر کہا اے لوگو! تم میں سے جو جانتا ہے وہ جانتا ہے۔ جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں آ گیا ہوں۔" سب سناٹے میں آ گئے۔ وہ بھی جنہوں نے دیکھا اور جانا کہ کون ہے جو آ گیا ہے اور وہ بھی جنہوں نے دیکھا مگر نہ جانا کہ

رن ہے جو آگیا ہے۔ لوگ دیر تک ساکت کھڑے رہے۔ آخر کو ابوالمنذر نے مہر سکوت توڑی، افسوس بھرے
لہجہ میں بولا، کوفے پر خدا کی رحمت ہو، انتظار اس نے کس کے لیے کھینچا اور وارد کون ہوا ؟ ایک دفعہ
پھر سب سناٹے میں آ گئے اور اس مرتبہ سناٹا زیادہ دیر تک جاری رہا۔ جب اس بے آرام رات کے بعد
صبح ہونے پر وہ گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر بدل چکا ہے۔ اس نے اس شہر کو بھٹی پہ چڑھے کڑھاؤ کی مثال
ابلتے دیکھا تھا۔ آج وہ اسے سینۂ اہل ہوس کی صورت ٹھنڈا دیکھ رہا تھا۔ تب اس نے جانا کہ کوفہ واقعی بدل چکا
ہے اور واقعی اُسے آہستہ بولنا چاہیے بلکہ نہیں بولنا چاہیے قیس بن مسہر کو اس نے دیکھا کہ وہ اونچی آواز میں بولا اور ہمیشہ کے
لیے چپ ہو گیا۔ اس کے بعد لوگ خوف کے صحرا میں بھٹکتے رہے۔ اس خوف کے صحرا میں پھرتے پھرتے
آخر کار صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور لوگوں نے اس شہر خراب کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے شہر سے نکلنا
بہت آسان جانا تھا مگر کتنا مشکل نکلا۔ شہر کے دروازوں پہ پہرہ تھا۔ آنے جانے والوں پر روک ٹوک تھی
کتنی مرتبہ وہ شہر کی حد تک گئے اور پہرے داروں کو چوکنا دیکھ کر پلٹ آئے۔ کوفہ ان پر تنگ ہوتا جا رہا
تھا۔ تنگ ہوتے ہوتے وہ چوہے دان کی مثال بن گیا۔ اس کے اندر وہ ایسے تھے جیسے چوہے دان میں چوہے
چکر کاٹیں اور نکلنے کی راہ نہ پائیں۔

یاس کی انتہا پر پہنچ کر وہ تین جری بن گئے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ انہوں نے اپنے آپ کو داؤں پر لگایا اور پہرے دار
کی نظریں بچا کر شہر خراب سے نکلنے میں کامیاب ہوئے لیکن سفر یہاں ختم نہیں ہوا۔ رات کالی تھی اور سفر
لمبا تھا اور ان کی آئندہ منزل مدینہ تھی۔ وہ مدینہ جو امن و آشتی اور روشنیوں اور امیدوں کا شہر تھا۔ لیکن
اس کے بارے میں بھی اندیشہ اور خدشہ تھا۔ اگر مدینہ بھی کوفہ بن چکا ہو تو ؟ یہ خوف یہ اندیشہ اس لیے تھا
کہ کوفہ بھی کسی زمانے میں مدینہ کی طرح امن و سکون کا مرکز تھا اور اب مدینہ کی سمت سے آنے والے
لوگ پریشان تھے کیوں کہ کوفہ مبارک قریوں کے بیچ پیدا ہو رہا تھا۔

انتظار حسین سوال کرتے ہیں :۔

"یہی میں سوچتا ہوں کہ کوفہ کیا اور کیوں ؟ بار بار اس خیال کو دفع کرتا ہوں اور بار بار یہ خیال
دامن گیر ہوتا ہے کہ مبارک قریوں کے بیچ کوفہ کیسے نمودار ہو گیا اور کتنی جلدی نمودار ہوا۔
ہجرت کرا بھی ایسا کون سا زمانہ گزر گیا ہے ؟

تینوں ناقہ سوار امن و سکون کی تلاش میں مدینے کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں جو شہر امن ہے اور
جس کے بارے میں انہیں یقین ہے کہ بے شک دنیا ظالموں سے بھر جائے اور زمین فساد سے تہ و بالا ہو
جائے مگر مکہ کے مبارک شہر کے امن میں خلل نہیں آ سکتا۔ تینوں ساتھی رات کی تاریکی میں مدینے کی جانب
روانہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن صبح کے تڑکے میں جب غنودگی سے بیدار ہوتے ہیں تو خود کو کوفے کے دروازے
پر پاتے ہیں۔ انتظار حسین افسانے کا اختتام معنی خیز جملوں میں کرتے ہیں :

"ابوطاہر نے ہارون بن سہیل نے، میں نے حیرت اور دہشت سے ان درودیوار کو دیکھا "مگر کیسے؟" میرے منہ سے نکلا۔

"ابوطاہر نے تامل کیا۔ پھر کہا "رفیقو! رات بہت کالی تھی۔ ہم نے راہ پر دھیان نہیں دیا۔ جس راستے پر آئے تھے آگے اسی راستے پر چل پڑے۔"

"آپ کیا کریں؟" جعفر ربیعی نے سوال کیا۔

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ابوطاہر نے بعد تامل کے کہا۔ رفیقو، واپسی اب محال ہے کہ پہرے داروں نے ہمیں دیکھ لیا ہے رکا، پھر یاس سے بولا۔ شاید مقدرت کو ہمارا اس شہر خراب سے نکلنا منظور نہیں۔

"ہارون بن سہیل نے اس پر ٹھنڈی آہ کھینچی" بزرگ تو نے بجا کہا۔ کوفہ ہماری تقدیر ہے"

میں منصور بن نعمان الحدیدی بصد حسرت و یاس بولا "ہاں کہ ہمارا خواب ہے تقدیر ہماری کوفہ ہے"

اور ہم خراب و خستہ ہو کر پھر کوفے میں آ گئے اور پھر چپ ہے مان کے اندر چکر کاٹنے لگے"

یہ تھا اردو کے معروف اور آج کے عہد کے بے حد اہم افسانہ نگار انتظار حسین کا افسانہ۔ اب ایک نئے اور قطعی غیر معروف افسانہ نگار رحمٰن شریف کا افسانہ "فیل سوار" ملاحظہ کیجیے۔ یہ افسانہ بھی صداقتوں کا عکاس ہے اور اس میں قرآنی علامات کو نہایت فن کاری سے استعمال کیا گیا ہے۔ افسانہ ان جملوں سے شروع ہوتا ہے۔

"اب کچھ یوں ہے کہ فیل سوار دندناتے پھرتے ہیں اور آسمان پر دور دور تک ابابیلیں نظر نہیں آتیں"

پہلا فیل سوار کب نمودار ہوا تھا یہ کسی کو یاد نہیں۔ البتہ اسے دیکھ کر لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔ چہ میگوئیاں ہوتی تھیں کہ فیل سوار کا یہاں آبادی میں کیا کام لیکن کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ اس کا اظہار کرتا۔ فیل سوار کا حلیہ دیکھ کر لوگوں پر دہشت طاری ہو جاتی۔ اس نے آہنی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کا پورا جسم فولادی خود میں چھپا ہوا تھا۔ اس فولاد کے پیچھے سے اس کی سرخ انگارہ جیسی آنکھیں نظر آتیں۔ اس نے اپنی ہی طرح ہاتھی کے جسم کو بھی آہنی چادر سے ڈھک رکھا تھا۔ ہاتھی جب سڑک پر جھومتا ہوا چلتا تو اسکے پیروں کی دھمک دور دور تک سنائی دیتی۔ فیل سوار کو دیکھ کر لوگ سڑک چھوڑ کر کنارے ہو جاتے اور ہاتھی سونڈ لہراتا ہوا گزر جاتا۔

سوال یہ تھا کہ فیل سوار کہاں سے آیا؟ کسی کا خیال تھا کہ وہ شمال سے آیا ہے کسی کے خیال میں وہ جنوب سے آیا تھا۔ کسی نے کہا شاید مغرب سے آیا ہے۔ ایک دانا شخص نے بتایا کہ فیل سوار جب سڑک پر آیا وہ وہیں موجود تھا۔ اس لئے بتایا کہ فیل سوار نہ شمال سے آیا ہے، نہ جنوب سے نہ مغرب سے آیا ہے اور نہ مشرق سے یوں لگا جیسے یکایک وہ زمین کے اندر سے پھوٹ پڑا ہے۔ اس کی بات پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ پہلے پہل لوگ تماشے کے طور پر فیل سوار کے گرد جمع ہوئے لیکن جب کسی کا فولادی کوڑا دو چار کی

بیٹھو لیر بیٹھا اور وہ زمین پہ ڈھیر ہوئے تو باقی لوگ جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑے ہوئے ایک منہ پھٹ شخص نے جب یہ منظر دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔ وہ چیخ کر فیل سوار سے مخاطب ہوا "کیوں بے گناہوں کا خون کرتا ہے۔"

فیل سوار کے کانوں میں جب اس کی آواز پہنچتی ہے تو وہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ اس کے اشارے پر ہاتھی اس شخص کو سونڈ پر لپیٹ کر زمین پر دے مارتا ہے۔ لوگ اس شخص کا انجام دیکھ کر اپنے ہونٹ سی لیتے ہیں۔ پہلے فیل سوار کے نمودار ہونے کے چند ہفتوں بعد دوسرا فیل سوار نمودار ہوتا ہے۔ دوسرا فیل سوار پہلے فیل سوار سے زیادہ طاقتور اور ظالم ہے۔ اس فیل سوار نے بھی آہنی لباس زیب تن کر رکھا ہے اس کے چہرے پر بھی فولادی خود چڑھا ہوا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے ہاتھ میں کوڑے کی جگہ بندوق ہے۔ اس کی قوتِ سماعت پہلے فیل سوار سے زیادہ تیز ہے۔ سرگوشی میں کہی ہوئی بات بھی اس تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی بندوق سے شعلہ نکلتا ہے اور بولنے والے کا جسم لمحے بھر میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں فیل سوار آبادی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پل بھر میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کا گذر جدھر سے ہوتا ہے، گلیاں اور راستے سنسان ہو جاتے ہیں۔ گھر کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں۔

جب دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلنے لگتے ہیں تو آہستہ آہستہ گھروں کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ لوگ بڑی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل آتے ہیں اور فیل سوار پر حملہ بول دیتے ہیں ہاتھی لوگوں کو اپنے پیروں تلے روند دیتے ہیں۔ اکا دکا فیل سوار بھی زمین پر گر جاتا ہے لوگ اس کا آہنی لباس ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ اس کا آہنی خود اتارتے ہیں تو اس کے پیچھے سے کوئی شناسا چہرہ نکل آتا ہے۔ عین اس وقت جب فیل سوار لوگوں پر بھاری پڑ رہے تھے۔ آسمان پہ ابابیلوں کے جھنڈ نمودار ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا آسمان ابابیلوں سے چھپ جاتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد کنکریاں فیل سواروں پر پڑنے لگتی ہیں۔ لوگ جوش میں آ کر نعرے لگاتے ہیں۔ لیکن ان کا جوش و خروش ماند پڑنے لگتا ہے۔ کنکریاں آہنی پوش فیل سواروں اور ہاتھیوں کے لیے بے ضرر ثابت ہوتی ہیں۔ فیل سوار دیوانہ وار قہقہے لگاتے ہیں۔ ان کی بندوقوں کا رخ آسمان کی طرف ہو جاتا ہے اور ساری زمین مردہ ابابیلوں تلے چھپ جاتی ہے۔

عصری صداقتوں کے ضمن میں رشید امجد کا افسانہ "سناٹا بولتا ہے"[۴] محمد منشا یاد کا افسانہ "دھوپ ادھوپ" مشتاق قمر کا افسانہ "بے نام وقت کی کہانی" اے خیام کا افسانہ "اجنبی چہرے" اور مسعود اشعر کا "خاموشی" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"سناٹا بولتا ہے" کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ دو شخص (جو دراصل ایک ہی شخصیت کے دو حصے ہیں) کسی طرح شہر کے گڑھے میں گر گئے ہیں۔ وہ گڑھے میں کس طرح گرے؟ یہ انہیں نہیں معلوم وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ

گٹر سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ ہر طرف تاریکی ہے انہیں نہیں معلوم کہ گٹر سے باہر نکلنے کا راستہ کس جانب ہے لیکن انہیں یقین ہے کہ کسی نہ کسی جگہ گٹر سے نکلنے کا راستہ مین ہول کھلا ہوا ضرور ہے۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے "میری عمر اب چالیس سال ہونے والی ہے اس سیلن زدگی رینگتے پانی کی سرسراہٹ اور اس لیس دار اندھیرے کے جبڑوں میں پلتے پلتے چالیس سال ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں میری زندگی کے اور کتنے سال باقی ہیں۔ ان باقی سالوں میں کھلا مین ہول ملے گا بھی کہ نہیں۔

"کیا معلوم؟ میری آواز دم توڑ رہی ہے" شاید ہمارے بچوں کو مل جائے یا شاید وہ بھی ہماری طرح ساری زندگی کھلے مین ہول کے خواب دیکھتے دیکھتے اسی گٹر میں بھٹکتے اندھیرے کے لیس دار جبڑوں میں پلتے گزار دیں۔"

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

"چاروں طرف ہڈیاں اور انسانی پنجر پڑے ہوئے ہیں وہ ایک ہڈی اٹھا لیتا ہے اور کہتا ہے
"یہ تو میرے باپ کی ہڈی لگتی ہے۔ اس کے جبڑے کی ساخت ایسی ہی تھی۔"
میں انسانی پنجروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔
وہ کہتا ہے "تو جی! میں سمجھتا ہوں میرا باپ مجھ سے اچھا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ بھی میری طرح ساری عمر کھلے مین ہول کے خواب دیکھتا رہا۔
دفعتہً اس کی آواز لرزنے لگتی ہے "ہم بھی۔ ہم بھی"
میں جھک کر دیکھتا ہوں۔ سب کے منہ پر پلاسٹر ٹیپ لگے ہوئے ہیں۔ کیڑے ان کا گوشت کھا گئے ہیں مگر ٹیپ اسی طرح ہیں۔
مگر ہم تو صرف اظہار کے حوالے سے ہی ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور ان کے منہ تو بند ہیں۔"

افسانے میں رشید امجد نے گٹر کی علامت سے بڑی معنویت پیدا کی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ اس مختصر افسانہ میں بہت ساری باتیں کہہ دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حکمران بدلتے رہتے ہیں لیکن عوام الناس کی حالت نہیں بدلتی اور وہ ہر دور اور ہر عہد میں کھلے مین ہول کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ گٹر کے اندر چاروں طرف ہڈیوں اور انسانی پنجروں کا بکھرا رہنا اس کی علامت ہے کہ انسان سدا سے ظلم و تشدد کے خلاف جدوجہد کرتا رہا ہے۔ لیکن اپنی منزل پانے سے قبل ہی لقمۂ اجل بنتا جا رہا ہے لیکن اس کی جدوجہد ختم نہیں ہوئی ہے اس نے کبھی کھلے مین ہول کا خواب دیکھنا ترک نہیں کیا ہے۔ ہر دور میں مین ہول سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے والوں کی سرکوبی کی ہے اس لیے جب گٹر کے اندر پائے جانے والے پنجروں کے منہ پلاسٹر ٹیپ سے ملتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے اور "میں" (واحد متکلم) اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ "میں سمجھتا تھا

میرا باپ مجھ سے اچھا تھا اب معلوم ہوا کہ وہ بھی میری طرح ساری عمر کھلے میں ہوا کے خواب دیکھتا رہا ہے۔"

" دھوپ، دھوپ" کا مرکزی خیال بھی جبر کے خلاف احتجاج ہے ایک رات اس کا باپ دیر تک گھر نہ لوٹا مگر پھر بستی کے سب سے اونچے مکان کی چھت سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ :۔

" لوگو! اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بستی وقت سے پیچھے نہ رہ جائے تو انصاف قائم کرو۔ انصاف ہی نیکی اور پاکبازی ہے اور تم ظلم اور ناانصافی کرنے والے ہاتھوں کو پہچانو اور انہیں ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہ دو ورنہ تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔" اس کا باپ گھر لوٹا اور اطمینان سے سو گیا۔

" خلاف معمول ہوا چل رہی تھی، اسے نیند آگئی اور جب اس کی آنکھ کھلی صبح کاذب کا وقت تھا، ہوا بند تھی اور اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا اس نے کروٹ بدلی اور ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اس کے باپ کا سر گردن سے الگ پڑا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا"

وہ اپنے باپ کی میت کو ٹھکانے لگانے کے لیے بہت پریشان ہوتا ہے لیکن وہ میت کو تنہا کس طرح دفنائے۔ میت لے جانے، غسل کرانے اور قبر کھدوانے کے لیے آدمی کی ضرورت ہے لیکن آدمی کہاں ہے۔ تمام لوگ حسب معمول روزگار پر جا چکے ہیں۔ اس کے سامنے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ سہ پہر تک ان کی واپسی کا انتظار کرے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ واپسی پر بھی اس کی مدد کو نہ آئے تو ؟ اس نے سوچا کیوں نہ وہ کام پر چلا جائے اور پوری دیہاڑی لگا کر شام کو دوسرے لوگوں کے ساتھ آ جائے۔ اسے پیسے کی پہلے سے زیادہ ضرورت تھی چنانچہ وہ کام پر حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ ایک راج مستری ہے وہاں اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے باپ کے اشتباہ کے مطابق وقت ایک جگہ ٹھہر گیا ہے۔

دوپہر ڈھلنے کا نام نہیں لیتی ہے وہ مسلسل کام کرتا رہتا ہے وہ جب کام کرتے کرتے نڈھال ہو جاتا ہے اور اس پر غشی کے دورے پڑنے لگتے ہیں تو منشی اسے آدھی دیہاڑی دے کر گھر جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ وہ بستی میں داخل ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان کے بال دھوپ سے سفید ہو گئے ہیں۔ گھروں کے اندر دھوپ گھس آئی ہے اور وہ گھبرا کر باہر آ گئے ہیں مگر سایہ کہیں نہیں تھا۔ شاید وقت رک گیا تھا اور بستی وقت سے پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ لوگوں کو میت لے جانے کی غرض سے مدد کے لیے بلانے سے پہلے میت کو دیکھ لینا چاہتا ہے۔ وہ جلدی جلدی گھر پہنچتا ہے اور دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں کہ وہ چارپائی، جس پر اس کے باپ کی لاش

تھی ، خالی پڑی ہوئی ہے ۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے ۔

مصنف نے افسانے میں دھوپ ، وقت کے ختم ہو جانے اور دھوپ کے گھروں سے ناپید ہو جانے سے بعض باتوں کی جانب محض اشارے کئے ہیں ۔ دھوپ کو اگر جور و جبر کی علامت تصور کر لیا جائے تو تمام باتیں واضح ہو جاتی ہیں ۔ اس کے باپ کی جانب سے لوگوں کو جبر دور کرنا اور انصاف قائم کرو ورنہ تمہاری بستی [illegible] رنت سے پیچھے رہ جائے گی اور یہ انتباہ کرنا کہ تم ظلم اور نا انصافی کرنے والے ہاتھوں کو پہچانو اور انہیں ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہ دو ورنہ تمہارا شمار ظالموں میں سے ہوگا ۔ ایسی باتیں ہیں جن سے مصنف کا ما فی الضمیر صاف اور واضح ہو جاتا ہے ۔

زندگی کی بے سمتی کے موضوع پر مشتاق قمر کا " بے نام وقت کی کہانی " بھی ایک قابل ذکر افسانہ ہے ۔ آج کا انسان اپنا مقصدِ حیات اور سمت کھو چکا ہے ۔ انسان کے سامنے کوئی مقصد نہیں رہا ۔ انسان آج جبریت کے دائرے میں پھنسا ہوا ہے اور اسے اس سے نکلنے کی کوئی راہ سوجھائی نہیں دے رہی ہے ۔

ایک اقتباس ملاحظہ ہو : ۔

" وہ اپنے جیسے دوسرے شخص کے قریب آتے ہوئے بولا " بھائی یہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ ہے ؟

دوسرے شخص نے اس انداز میں جواب دیا جیسے ایک نہیں بہت سے راستے ہوں " تمہیں کہاں جانا ہے " ؟ اس نے اپنی سمت کی پوری تفصیل بتا دی ۔

" اس سے کام نہیں چلے گا " دوسرا آدمی بولا " یہاں کوئی سمت نہیں " ۔

" مجھے صرف اتنا معلوم ہے " وہ مایوس سا ہو کر بولا " میں جب اس گول دائرے میں داخل ہوا تھا تو اس وقت مجھے سب کچھ معلوم تھا ۔ ہر چیز ذہن سے معدوم ہو چکی ہے صرف سمت کی یاد باقی رہ گئی ہے " ۔

" پھر تمہارے سوا کوئی دوسرا تمہاری مدد نہیں کر سکتا " ۔

دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو ۔

" اور پھر وہ اسی وقت آسمان سے ایک کونے میں چمکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر اس کے سارے دلدر دور ہو گئے ۔ اسے بالآخر اپنی سمت دریافت کرنے کا ایک کھویا ہوا ذریعہ دستیاب ہو گیا تھا ۔ سورج مشرق سے ہی طلوع ہو سکتا ہے اور سورج کو مرکز مان کر ساری سمتیں دریافت کی جا سکتی ہیں ۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سب کچھ بھول جانے کے باوجود ابھی تک اپنی سمت سے ناآشنا نہیں ہوا تھا ۔ اسے کہاں جانا تھا ، یہ تو اسے اب یاد نہیں تھا ۔ اسے کس سمت میں سفر کرنا تھا ، اس کے بارے میں اُسے کوئی شبہ

نہیں تھا۔ وہ بچپن سے بس ایک ہی سمت میں سفر کرتا چلا آیا تھا۔ اس کی زندگی کے سارے کاروبار کا مرکز یہی سمت رہی تھی۔ اس کی زندگی کے سارے راستے اسی سمت کی طرف نکلتے تھے۔ اس نے سورج کو غور سے دیکھا۔

اُسے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ سورج طلوع ہو رہا تھا یا غروب

اب وہ کافی مطمئن تھا۔ پھر بھی وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سورج کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد اپنی سمت کا تعین کرنا چاہتا تھا۔

اس کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ سورج طلوع نہیں، غروب ہو رہا تھا۔"

تیسرا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"بہت سے دن گزر گئے تو اسے یقین ہو گیا کہ سورج ایک ہی مقام سے طلوع ہو کر اسی مقام پر غروب ہوتا تھا۔

"تو اب اس کے گول دائرے کے نیچے سے آزاد ہونے کے سارے امکانات ختم ہو چکے تھے۔ اس کے اندر صحیح سمت پانے کی خواہش اب بھی زندہ تھی۔

وہ رات دن کی تخصیص کے بغیر گول دائرے میں چکر کاٹنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی کوئی معجزہ ضرور رونما ہوگا۔ وہ اپنی سمت تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

طوالت سے بچنے کے لیے یہاں صرف چند افسانوں سے بحث کی گئی ہے مندرجہ بالا افسانوں کے مطالعہ کے بعد کیا یہ کہنا درست ہے کہ جدید/علامتی افسانے کا عصری صداقتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ اس سے قبل حقیقت پسند افسانوں میں زندگی کی صرف جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ غربت اور افلاس کے خلاف احتجاج نظر آتا تھا۔ معاشرے کو بدل کر نئی دنیا تعمیر کرنے کی خواہش نظر آتی تھی لیکن ترقی پسند افسانے میں زندگی کی معنویت کی تلاش، اقدار کی شکست، عقائد کی پامالی اور بے سمتی کا احساس نہیں ملتا تھا۔ آج کا افسانہ ان تمام سوالات اور مسائل سے بحث کرتا ہے اور پاکستان کا جدید افسانہ نگار حالات و واقعات سے گہرے طور پر اثر پذیر ہو رہا ہے۔

OO

یہ رنگ اِک خواب کے لیے ہے

سراج منیر

ادب میں اجتماعی تجربے سے وابستگی کے معنی ہیں ایک مشترک تہذیبی نقطۂ نظر سے وابستگی اور اس نقطۂ نظر میں حاضر و موجود کے معنی کو دریافت کرنا۔ یہ کیفیت اعلیٰ ترین تخلیقی سطح سے تعلق تو نہیں رکھتی لیکن اس کی طرف سفر کا ایک راستہ ضرور بن سکتی ہے۔ ادب کا اعلیٰ ترین منصب تو ایک معجزاتی نوعیت رکھتا ہے یعنی اصول صداقت کو حسی تمثالوں اور علامتوں میں پیش کرنا۔ لیکن یہ کیفیت تاریخ میں ہر وقت ممکن نہیں رہتی چنانچہ اس وقت ایک اجتماعی تجربہ معاشرے میں اصول صداقت کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ اوّلین ہر قسم کا ادب زندگی، بلکہ وجود کی معنویت کو مختلف درجوں میں منکشف کرتا ہے، دوسری طرح کا ادب اس گم شدہ معنویت کو کسی بڑے تاریخی تجربے کے حوالے سے "تلاش" کرتا ہے۔ ان کے علاوہ ادب کے نام پر ایک شے اور بھی ہوتی ہے جو معنویت کے انکشاف اور اس کی تلاش کے درمیان کبھی کبھی واقع ہوتی ہے۔ یہ ادب انفرادی آشوب پر تخلیق کی بنیاد رکھ کر، مطلق معنویت سے انکار کرتا ہے، اجتماعی تجربے سے ڈرتا ہے اور بنیادی طور پر مجروح انا کی جذباتی اینٹھن سے نمو پاتا ہے۔

اردو میں ان تینوں قسموں کے ادب کی مثالیں مختلف اوقات میں دکھائی دیتی ہیں۔

پچھلے کچھ عرصے میں ہمارے ہاں ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ ادب کی ایک سطح وہ ہے جو تنقیدی نظریہ بازی کی بنیاد پر وجود میں آئی اور اس نے گروہ بند ادب کو جنم دیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں تنقیدی مباحث کا اسلوب دیکھ لیجئے۔ نئی شاعری کی تحریک مرحوم سے لے کر انشائیے کی لٹھ بند جواز جوئی تک اور اس سے آگے نثری نظم کے سلسلے میں متکبرانہ ادعائیت تک ایک ہی پیٹرن مشترک نظر آئے گا۔ ان ساری تحریکوں میں ایک امام الاصناف دکھائی دیتا ہے جو تمام اصناف کا منتہی، ایک آدھ کا موجد اور بقیہ سب کا ناسخ ہوتا ہے ایک مختلف العمر مقلدین کا ریوڑ ہوتا ہے جو اپنے سرگروہ کو

ادب کا حضرت آدم سمجھتا ہے۔ سب سے بڑھ کر اس پورے ادب میں تخلیق کو نظریہ باز تنقید کی بنیاد پر مارکٹ کرنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ اس ادب میں غوغا کی کیفیت تو بہت ہوتی ہے لیکن اسکی عمر فطری طور پر بہت کم ہوتی ہے چنانچہ اب عالم یہ ہے کہ پچھلے پانچ دس برسوں کے رسالے اٹھا کر دیکھئے تو کہیں کہیں کوئی مضمون، کوئی اپنے علم کو سب سے بلند کرتا ہوا تبصرہ، اپنے مخالفین کے رد میں مغلظات بھری تحریر یاد دلا جاتی ہے۔

کہ یہیں بھی کبھی کسو کا سر پر غرور تھا

ادب کی تاریخ سفاک ہے سر پر غرور اور پائے بے نیاز کے درمیان ایک لمحۂ عبرت بن جاتی ہے۔

مناظرہ بازی کی اڑائی ہوئی یہ گرد اور تنقیدی غوغا آرائی کی ہسٹریائی کیفیت بعض صورتوں میں تخلیقی فنکار کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں کافی حوصلہ افزا۔ اس دوران تاریخی تجربے سے جو ریڈیو واقع ہوا ہے اور کائنات نے خود کو جس طرح ایک لمحۂ حیرت میں ظاہر کیا ہے اس کے سامنے انفرادی آشوب کی جذباتی اینٹھن سے پیدا ہونے والے ادب کو لا کھڑا کرنا کتنی مہلک غلطی تھی اس کا اندازہ پچھلی دو تین نسلوں کے بہت سارے ادیبوں کے عبرتناک انجام سے لگایا جاسکتا ہے۔

پچھلے کچھ عرصے میں ہمارے ہاں نسلوں کے درمیان تخلیقی اثر و تاثیر کے نظام کے مسئلے کو اس قدر پراگندہ کر دیا گیا ہے کہ اس پر کسی سنجیدہ گفتگو کے لئے پورا لینڈ سکیپ دوبارہ ترتیب دینا پڑے گا۔ ورنہ نئی نظم کے غازیانِ صف شکن سے لے کر نثری نظم کے شہدائے بے مزار تک ہر ایک نے یہی ثابت کیا ہے کہ بامعنی تخلیقی اظہار تو ایک ہی انداز میں اور ایک ہی صنف میں ہوسکتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر جدید اور جدید تر انداز کے نام پر نئی نسل کو ہی واحد تخلیقی نسل قرار دیا جاتا رہا ہے۔ یہ نقطۂ نظر، ادب کی تاریخ نے بے رحمانہ طور پر مسترد کر دیا۔ اب ہمیں سب سے پہلے تو یہ سمجھنا ہے کہ تجربے کے تسلسل کی ہمارے ہاں کون کون سی سطحیں ہیں اور اس کے مختلف پہلو، مختلف نسلوں میں کس طرح درجہ وار انداز میں نمود پاتے ہیں اور اس طرح ان نسلوں کے درمیان ایک دوسرے سے ممیز ہونے کی کیا صورت ہوتی ہے اور ایک بڑے تجربے میں مشارکت کی کیا شکل طے پاتی ہے۔

ہمارے ہاں تجربوں کا ایک تسلسل تو وہ ہے جو پورے مسلم کلچر کی بنیاد میں موجود ہے اور اس کی ایک اہم تہذیبی جہت کا اظہار ہند اسلامی تہذیب کے مختلف اوضاع میں ہوا ہے۔ اس تہذیب میں اظہار کی ایک سطح وہ ہے جہاں علامتوں کا ایک پورا نظام انسانی تجربوں کی عکاسی

کرنے کے بجائے انسانی تعلقات کے بنیادی اوضاع کو اصولِ صداقت اور اصولِ جمال کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ اسی طرح ہند اسلامی تہذیب کی علامتوں کا بنیادی ڈھانچہ ترتیب پاتا ہے۔ اس تہذیب کے پورے نظام کا اجمال ہمیں خسرو کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔ اٹھارویں صدی تک آتے آتے اصولِ صداقت کی روشنی معاشرے میں اس طرح دمکتی دکھائی نہیں دیتی، اب وہ ایک درجے میں محدود ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد انسانی تجربے کی اہمیت بڑھنے لگتی ہے، میر تک آتے آتے ایک مابعد الطبعیاتی نظام اور اس کی علامتیں شاعری میں موجود تو ضرور ہیں لیکن اسے بنیادی اہمیت مشترک انسانی تجربے کو حاصل ہو جاتی ہے۔ یہاں آکر اشیاء اب ایک اور پہلو سے روشن ہوتی ہیں اور یہ پہلو مشترک انسانی تجربے میں مشارکت کا ہے، تاریخی یا سماجی سطح پر سلطنت مغلیہ کا زوال جس کی تکمیل ۱۸۵۷ء میں ہوتی ہے اردو شاعری کا بنیادی تجربہ ہے۔ اسی تجربے کے گرد اردو کی شاعری کا پہلا وقیع منظر نامہ ترتیب پاتا ہے اور یہی تجربہ اردو شاعری کے طرزِ احساس کو حتمی طور پر متعین کرتا ہے۔ اس عظیم مشترک تجربے کی چھوٹ زندگی کے معمولی سے معمولی واقعے تک پر پڑتی ہے اور کچھ ہی عرصے میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ فارسی غزل اور اردو کے درمیان مشترک نظامِ علامات کے باوجود طرزِ احساس کا ایک واضح فرق پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اسی انسانی تجربے نے اردو شاعری کو ایک نئی جہت دی اور کچھ ہی عرصے میں "پوچ گویانِ ہند" کہنے والے متکبر لوگ اس کیفیت کو پہنچ گئے کہ نئی شعری روایت تو خیر کیا پیدا کر سکتے پرانی روایت کے فہم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ بہر کیف مقصودِ گفتگو یہ ہے کہ اپنی ابتدائی صورت میں ہی اردو کے پاس ایک ایسا مشترک تجربہ موجود ہے جس کی تفتیش اور مختلف سطحوں پر اس کے معنی کو سمجھنے کا عمل، زندگی کی معنویت کو دریافت کرنے کا استعارہ بن جاتا ہے اس کے بعد کے سارے ادب نے اس تجربے کے وسیلے سے تین سطحیں اختیار کی ہیں۔ پہلی سطح اس سیاسی اور تہذیبی زوال کے ملال میں رہنے کا عمل ہے اور اس کی تنزیہہ عشق کے اصول کے ذریعے ہوتی ہے۔ دوسری سطح اسے بھول جانے کی کوشش ہے اس کا اصول تنزیہہ جمال موجود ہے۔ داغ سے لے کر لکھنؤ کے دوسرے درجے کے جمال پرست شعرا تک اور ان سے بھی آگے ندمانویوں کے ہاں، ایک طرح کی فراموشگاری کا انداز پایا جاتا ہے تیسری سطح اس سے چھٹکارا پانے کی ہے۔ اس نے شاعری میں ایک قومی نقطۂ نظر کو جنم دیا۔ اس کا بنیادی اصول تنزیہہ حرکت ہے اور انسانی زندگی میں اس کا استعارہ عمل۔ بات چاہے کوئی بھی ہو لیکن ہر جگہ پس منظر میں یہی ایک تجربہ سایہ فگن دکھائی دیتا ہے اور ہجر و وصال کے ہر قصے کے درمیان ندیے کی سطح پر عکس انداز ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ جو تقسیم ہیں

نے رویے کے اعتبار سے کی ہے وہ مطلق نہیں بلکہ ہر گروہ میں ایک دوسرے کے رویے بھی منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ بہرکیف اس طرح یہ تجربہ نسل در نسل لطیف تر ہوتا ہوا سفر کرتا ہے پھر ایک سطح پر آکر یہ تجربہ کسی اور ہی صورت میں مدغم ہوجاتا ہے۔ اس مشترک تجربے نے اپنے امکانات کے کامل ظہور تک کوئی آٹھ دس نسلوں کا سفر کیا ہے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک مشترک تجربے کی مار کتنی دور تک ہوتی ہے اور اس کا اظہار کتنی متنوع صورتوں میں ہوسکتا ہے۔ اس تجربے کی سرحدوں پر کہیں ترقی پسند تحریک دکھائی دیتی ہے جس کا ایک پہلو استعمار دشمن بھی تھا جو ہماری ذات میں کسی بڑے تجربے کی بازگشت پیدا کرتا تھا اور دوسری طرف اس کا عملی اور فکری رویہ استعمار پرست تھا جو پورے اجتماعی سٹرکچر اور تجربوں کے تسلسل کی نفی کی طرف بلاتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج تک اس تحریک کے ادبی رجحانات، اس سے منسلک سیاسی اور سماجی رویے اس باطنی تضاد کی وجہ سے نفاق کی کیفیت میں ہیں اور اسی سے اس رویے میں ایک سکرات کی کیفیت پیدا ہوئی ہے جو آگے بڑھ کر نوترقی پسندوں کے گروہ میں ایک ہسٹریائی تشنج کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس تحریک کی پشت پناہی کے لئے ہمیشہ سے بین الاقوامی سطح پر لطیف ادب اور ابلاغ عامہ کا نیٹ ورک فراہم تھا لیکن اجتماعی تجربے کے سامنے آنا اور اس کی نفی کی کوشش کرنا ظاہری اور باطنی طور پر بہت خطرناک اور مہلک عمل ہے اب آکر یہ بات بعض بقیتہ السیف حضرات کی سمجھ میں شاید آرہی ہے۔ بہرحال مشترک تجربے کی جب ایک عظیم اور پر جلال کیفیت وجود میں آئی تو ترقی پسند تحریک نے اس کی طرف بے نیازی کا رویہ اختیار کیا، پھر اس کی نفی کی کوشش کی، اس کے بعد حربے اور حکمت عملی کی سطح پر اس کے ساتھ ساتھ چلنے پر مائل ہوئی اور بالآخر اس عظیم تجربے کے امکانات اور اس کے طرز نمو کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے مفلوج ہوگئی۔

یہ عظیم تجربہ پاکستان کی تخلیق تھا!

(۲)

آج کل جب ہمارے ہاں پاکستانی ادب کی بات چلتی ہے تو شاید لوگوں کا تصور اس کے بارے میں یہ ہوتا ہے کہ پاکستانی ادب سے مراد وہ تحریریں ہیں جن میں ہر سطر کے بعد پاکستان زندہ باد لکھا ہوگا۔ لیکن اگر ہم پاکستان کی تخلیق کو مسلمانوں کی تاریخ کا اور تہذیب کا ایک عظیم اجتماعی تجربہ سمجھتے ہیں تو کم از کم ہمیں ادبی سطح پر اس کی معنویت کو ذرا گہرائی میں جا کر دیکھنا ہوگا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی کہ اس تجربے نے ادب میں اپنے ظہور کے لئے کون کون سے مختلف پیٹرن بنائے، لکھنے والے کی ذات کو کس گہرائی پر جا کر اس نے متاثر کیا اس کے ذریعے پورے معاشرے کی نفسیاتی بافتوں میں کون سی ایسی تبدیلیاں آئیں جنہوں نے ہمارے پورے

طرزِ احساس کو متاثر کیا۔ پھر ایک اور سطح پر طرزِ احساس کی یہ تبدیلیاں کس طرح مرحلہ وار ریاؤں میں، غزلوں میں، منظروں میں، شعر کے آہنگ میں اور افسانے کے اسٹائل میں منعکس ہو رہی ہیں اور نسل در نسل رنگ کس طرح اس تجربے کے واسطے اور وسیلے سے اپنی اجتماعی ذات کی مختلف پرتیں دریافت کر رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ادب میں نیک اور قومی جذبات سے الگ ان تجربوں کی تخلیقی معنویت کیا ہے اور یہ تجربہ کیا طرزِ نمو اختیار کر رہا ہے۔

پاکستان بننے کے ساتھ ساتھ ادبی منظر پر دو تحریکیں موجود ہیں۔ ترقی پسند تحریک اور نظمِ جدید کی تحریک۔ ان دونوں نے اس تجربے سے بے رخی کی۔ اس لئے کہ تاریخ و تہذیب کی گہری سطحیں ان میں سے کسی کا بھی مسئلہ نہ تھیں۔ ایک کا مسئلہ گروہی اور طبقاتی فرسٹریشن ہے اور دوسرے کا انفرادی فرسٹریشن۔ ایک آدھ انفرادی مثال سے قطع نظر پاکستان بننے کے عمل میں دونوں ایجابی طور پر شمولیت اختیار نہیں کر سکیں۔ اس تجربے کی ادبی معنویت کو سمجھنے کی کوشش پاکستان بننے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی حسن عسکری کے ہاں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے خصوصاً پاکستان بننے کے فوراً بعد انہوں نے پاکستان اور اسلامی ادب کا سوال اٹھایا اور اب یاروں کا بس نہیں چلتا کہ اپنے بڑے بڑے کارموں کو اور عسکری کی اس چھوٹی سی کوشش کو تاریخ سے کس طرح محو کر دیں۔

پاکستان بننے کے بعد ایک ایسی نسل سامنے آتی ہے جس نے تقسیم کو ایک روحانی واردات کے طور پر قبول کیا ہے اور ایک مشترک اجتماعی تجربے کی حیثیت سے اس کی تفتیش کی ہے۔ ایک نئی مملکت کے ظہور نے اور ہجرت نے ان کے درمیان ایک مشترک تجربے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یہاں یہ واضح رہنا چاہیئے کہ ہجرت بنیادی طور پر ایک ذہنی اور روحانی عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں بلکہ پاکستان کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جس نے عملاً تو ہجرت نہ کی لیکن اس تجربے میں اس طرح شریک ہوئے کہ ہجرت ان کے لئے ایک روحانی واردات بن گئی۔ دوسری طرف کچھ ایسے بھی ہیں جو پاکستان آ تو گئے مگر یہ جبر وا کراه، ان کے لئے پاکستان میں آنا ہجرت کے بجائے ایک جلا وطنی کی کیفیت ہے مثلاً بھارت پریم سبھا کے پجاری خواتین و حضرات۔ بہر کیف چونکہ موخر الذکر قبیلہ اس اجتماعی تجربے میں ذہنی عدم مشارکت کی وجہ سے ادبی طور پر ہلاک ہو چکا ہے لہٰذا اس کا زیادہ ذکر یہاں مناسب نہیں ہے۔

جس نسل نے پاکستان بننے کے بعد اپنے مشترک تجربے کو مختلف سطحوں پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اس میں مختلف سطحوں پر منیر نیازی، ناصر کاظمی، انتظار حسین، سلیم احمد اور عزیز

مانڈ نلی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ایک بہت اہم نام انجم رومانی کا ہے۔ انجم رومانی کے لئے یہ تجربہ ایک بہت گہری فنی معنویت لے کر ظاہر ہوا ہے۔ اس کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔

جس نسل نے ہجرت کو اپنا بنیادی تجربہ قرار دیا اس کے نزدیک استعاریاتی اہمیت اور اس یاد کی حیثیت معمولی تاریخی نوسٹیلجیا سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کے ہاں ہجرت کا تجربہ دراصل ایک بہت بڑے تہذیبی عمل کو تاریخ کے مختلف تناظرات میں سمجھنے کی کوشش ہے۔ ہزاروں برس کی تاریخ سے وابستگی ایک نئے منظور میں اپنے اجتماعی تجربے کے تسلسل کی بازیافت کی ایک صورت اور اس راستے سے ہوتا ہوا یہ تجربہ ہجرت اولیں کے تجربے تک جا پہنچتا ہے۔ ان کے ہاں ادب کی حیثیت اجتماعی حافظے اور مشترک تجربے کے محافظ کی ہے نہ کہ تیلیوں کی ہڑتال کرانے یا مجروح اور پیاسی انا کے تشنج کو دوسروں تک منتقل کرنے کے ذریعے کی۔ چنانچہ ایک نئی صورتحال اور اس کے ساتھ ایک تسلسل میں پھیلتی جاتی یاد کی تمثال اس نسل کے ہاں آمنے سامنے رکھے ہوئے دو آئینوں کی ہے جو ایک دوسرے کے لا متناہی کی حد تک منعکس ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں تجربوں کے تخالف اور مماثلت نے ان کے ہاں بہت اہم اور پیچیدہ تخلیقی نتائج مرتب کئے ہیں۔

یہاں اظہار کے اسالیب کے حوالے سے ایک بنیادی بات سمجھ لینی چاہئیے۔ انفرادیت پرست ادب میں اور اجتماعی تجربے میں مشارکت کے عمل سے پیدا ہونے والے ادب میں ایک اساسی اور قدری فرق ہوتا ہے۔ انفرادیت پرست ادب میں ہر ادیب دوسرے سے ممیز ہونے کی کوشش کرتے ہوئے ایک ہمہ گیر یکسانیت کا شکار ہو جاتا ہے جب کہ اجتماعی تجربے میں شرکت ہر فنکار کے نقطۂ تخصیص کو واضح کر کے سامنے لے آتی ہے۔ چنانچہ ادب میں ہجرت کے حوالے سے تہذیب، تاریخ کے تسلسل، فرد کے باطن اور اس کے وجود کی معنویت کے بارے میں سوال اٹھاتے ہوئے جو لوگ سامنے آئے ان میں بنیادی رویے کے اشتراک کے باوجود اپنا الگ الگ رنگ دکھائی دیتا ہے۔ سامنے کی مثال لے لیجئے۔ منیر نیازی اور ناصر کاظمی: ہجرت کا تجربہ ناصر کاظمی کو روایت کے ادراکی اور لفظیاتی سٹرکچر تک لے جاتا ہے اور میر کے زمانے کی رات اس کی اپنی راتوں میں جھلک جاتی ہے، دوسری طرف "پہلی بارش" میں پوری قومی واردات، فطرت اور شہر، انسانی رویے اور زوال کا ملال ایک جگہ سمٹ جاتا ہے۔ دوسری طرف منیر نیازی کے ہاں، ہجرت کے تجربے سے پھوٹتے ہوئے اور پھر اس میں مدغم ہو کر ایک نئے جہان کی تخلیق کرتے ہوئے یاد اور خواب کے باہم مخلوط منظر دکھائی دیتے ہیں، منیر نیازی کے شعری سفر میں آگے چل کر جب اس جہان کے منظر

واضح ہوتے ہیں تو وہ اسے قریۂ محمد کا نام دیتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ افسانے میں بھی انتظار حسین اپنی مٹی کے ذرے چنتا اور اپنی اجتماعی ذات کے بچھڑے ہوئے منظروں کو ایک نئے منظر میں مخلوط کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہیں سے ایک طرف ایک تشکیل پاتے ہوئے معاشرے کے قدری مسائل کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے سلیم احمد اور انجم رومانی دکھائی دیتے ہیں۔ پھر آج کی شاعری کا ایک اہم استعارہ شہر پوری قوت سے عزیز حامد مدنی کے ہاں ظاہر ہوتا ہے اور اس کے پس منظر میں کہیں ایک اور شہر کا عکس جھلکتا رہتا ہے۔ انجم رومانی کے ہاں پاکستان کی تخلیق کا تجربہ وجود کی بہت گہری سطحوں پر کلمہ وعدہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس کی نوعیت سب سے پیچیدہ ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو معاشرتی یا تاریخی تجربہ اسلوب اظہار میں تبدیلی لاتا ہے وہ محض خیالات میں تبدیلی لانے والے تجربے سے کہیں گہرا اور اہم ہوتا ہے بنیادی طور پر انجم رومانی کے ہاں روایت کے اسلوب فکر کی بازیافت کی کوشش ہے اور ما بعد الطبیعیاتی سطح کی دریافت نو ہے۔ اگر منیر نیازی اور ناصر کاظمی کے ہاں روایت کے جذبوں اور منظروں کی بازگشت ہے تو انجم رومانی کے ہاں کائنات کو دیکھنے کے روایتی رویے اور اس کے تعقل کی بازدید۔ انجم رومانی کے ہاں ایک نئے معاشرے کے حوالے سے دو رویے پیدا ہوتے ہیں ایک وہ جو ان کی قومی نظموں میں ظاہر ہوا ہے اور دوسرا وہ جو طنزیہ غزلوں میں اور ان دونوں کے درمیان لمحۂ توازن ان کی وہ غزلیں ہیں جن میں ایک پختہ ما بعد الطبیعیاتی اسلوب اور طرز اظہار جھلکتا ہے۔ بعد کے شعری ادب پر انجم رومانی کے اثرات بہت گہرے اور دور رس ہیں اور باقاعدہ ایک رویے کی تشکیل کرتے ہیں۔

(۳)

اس نسل کے فوراً بعد جو لوگ سامنے آتے ہیں ان میں اچھے شاعروں کی موجودگی سے انکار نہیں ہے۔ ظفر اقبال جیسا آدمی ان کے درمیان موجود ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب سامنے آنے والی نسل میں ایک مشترک اجتماعی تجربے کی کمی واضح طور پر سامنے آجاتی ہے یہ اور اس کے بعد آنے والی دو ایک نسلیں بنیادی طور پر تجربے کی گہرائی کے خلاف ردعمل کی کیفیت میں ہیں۔ ان میں شہزاد احمد سے لے کر عبید اللہ علیم تک بنیادی طور پر سطحی انفرادی آشوب کی شاعری ہوتی ہے۔ رویے بنیادی طور پر یہی ہیں جو افتخار جالب اور انیس ناگی کے ہاں لایعنیت کی حدوں کو چھوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان سب میں ایک بات مشترک ہے کہ انہوں نے اجتماعی تجربے میں شارکت سے خوفزدہ ہو کر اس کے بالمقابل اپنے

انفرادی آشوب کو اکھٹا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس حیثیت سے یہ سب ایک طرح کی درجہ وار معنویت اور تجربے کے تسلسل کی قبولیت سے منکر ہیں۔ ظفر اقبال سے لے کر آفتاب کے دور سے لے کر اقبال ساجد تک اور شہزاد احمد سے انور شعور تک سب میں ایک بات واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ یہ اجتماعی تجربے سے ٹکرا کر اسے توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر یا تو ظفر اقبال کی طرح ذہانت سے کام لے کر تائب ہوتے ہیں (اسی طرح کی ایک مثال انور شعور میں بھی دکھائی دے رہی ہے) اور اپنے آپ کو زندہ شاعر کی حیثیت سے پہچنواتے ہیں یا پھر شاعری سے تائب ہو کر ہنکاری کرتے رہتے ہیں۔

ع میں بھی کبھی کسو کا سر پر غرور تھا

ابتدا میں جس تنقیدی غوغا آرائی کا ذکر ہوا تھا اس کا اولین ظہور اپنی پوری شدت کے ساتھ اسی نسل میں ہوا تھا۔ پتہ نہیں ان کے ذہنوں میں یہ بات کس طرح راسخ ہو گئی تھی کہ تخلیقی عمل کا مقصد اجتماعی تجربے کے اسلوب کو شکست کرنا ہے اور تند نظریہ بازی کے بل پر پوری تخلیق کو بائیکاٹ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے یہ ممکن ہے کہ جیسے سچے مذہبی تجربے سے فرار ہو کر آدمی نظریے میں پناہ لیتا ہے اس طرح سچے تخلیقی تجربے کی کمی کو نظریہ بازی اور تنقیدی غوغا آرائی کے ذریعے پورا کرتا ہو۔ چنانچہ تنقید میں ان کا رویہ بہت حد تک جسٹر پائی ہے اور اس میں ترقی پسندوں کے ابتدائی دور کے تنقیدی اسالیب کی جھلک ملتی ہے اور تخلیق میں ان کی بنیادی کوشش جمال سے فرار حاصل کر کے بد صورتی محض سے فرار ہو کر لایعنیت اور کمال سے بھاگ کر اہج میں پناہ لینے کی ہے اس رویے کے بین الاقوامی مظاہر موجود ہیں جہاں سے ان میں سے اکثر نے اپنے رویے مستعار لئے لیکن اس اجمالی تعارف میں ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔

(۴)

اس پس منظر پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد ہمیں آگے اپنے مطالعے کی جہتیں اور اس کی حدود طے کر لینی چاہئیں۔ اجتماعی تجربے میں اشتراک کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ کہیں اسے بعض لوگ محض تعقل کی سطح پہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہیں اسے ذات کے گہرے عناصر کے ذریعے سمیٹا جاتا ہے۔ ہر طرح کی مثالیں اس وقت ہمارے ہاں موجود ہیں پھر کوئی اجتماعی واردات افسانے میں کسی طرح ظاہر ہوتی ہے اور نظم میں کسی اور سطح سے کلام کرتی ہے اور غزل میں کسی اور ہی نظام علامات کے ذریعے بولتی ہے۔ یہاں ہمارے پیش نظر آج اردو ادب کی وہ مرکزی رو ہے جس نے اجتماعی تجربے میں اپنی پوری ذہانت کو شریک کیا ہے۔ چونکہ اس کا بنیادی طرز اظہار غزل ہے اس لئے ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ

ایک تجربے نے اپنے ظہور کے اس نئے مرحلے میں کیا کیا رنگ اختیار کیے ہیں۔ تعقل کی سطح پر اس تجربے کو سمجھنے کی کوشش احمد ندیم قاسمی کے ہاں دکھائی دیتی ہے اور خالد احمد، نجیب احمد، امجد اسلام امجد سے ہوتی ہوئی جمیل ملال اور احسان اکبر تک پہنچتی چلی جاتی ہے۔ اس پوری نسل کے رویے اور اس کے اندر تعقل کر سمجھنے کی کوشش ایک الگ مضمون چاہتی ہے (جو اسی مضمون کے اگلے حصے کی حیثیت سے شائع ہوگا)۔

بہر کیف اس وقت ہمارے سامنے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے تجربات کو ایک مرکزی استعارے کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تجربے کی اور مرکزی استعارے کی کیا معنو   ہے اور اس کے تخلیقی امکانات کیا ہیں۔

(۵)

ٹھیک اس وقت جب پاکستان کے اردو ادب میں نفی و استرداد کا کوس بج رہا ہے ایک نسل ایک نیا طرز احساس اور مشترک تجربے کی بنیاد لے کر ظاہر ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ نہ تنقید کے نقارچی ہیں، نہ اس کے سر پر کسی امام الاصناف کا دست شفقت۔ یہ اپنے تجربے کی مٹی ہر جگہ سے چنتی ہے اور بہت بڑے تخلیقی تسلسل میں اپنا ظہور کرتی ہے۔ اس کے اپنے بنیادی استعارے ہیں، اپنے منظر اور موسم ہیں، اپنے اسالیب ہیں اور اپنی اپنی بے نیازیاں ہیں۔ ان کے ہمعصروں میں ناصر، منیر، انتظار حسین، سلیم احمد، صلاح الدین محمود، عزیز حامد مدنی کے ساتھ ساتھ مصحفی اور میر بھی ہیں۔ بیدل، غنی کاشمیری اور طالب آملی بھی، عبد الرحمن چغتائی بھی اور لورکا، پاؤنڈ اور روبن ڈیریو بھی۔ یہ وہ نسل ہے جس نے اپنا اظہار سنہ ۷۰ء اور سنہ ۸۰ء کے درمیان کیا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اس نسل کے تخلیقی ظہور کے ساتھ پاکستان کی تاریخ ایک بہت بڑی قومی واردات سے گزرتی ہے۔ اس نسل کے پورے طرز احساس پر اس موسم ملال کا ایک عکس جگہ جگہ نظر آتا ہے اور اس کے بنیادی استعاروں اور علامتوں میں دکھائی دیتا ہے۔

پاکستان کے فوراً بعد ادیبوں کی پہلی نسل کا استعارہ یاد تھا۔ یہ ایک نئے تجربے کو تجربات اور تاریخ سے جوڑ دینے کا بنیادی اصول ہے اور حقیقی علامت کی حیثیت سے یاد وجود کی مختلف سطحوں پر اپنے معنی ظاہر کرتی ہے اور بچھڑے ہوئے منظروں کو اپنی ذات میں دوبارہ جگانے کے عمل سے لے کر اس کی ماز تاریخ سے ہوتی ہوئی اس یاد قدیم تک پہنچ جاتی ہے جو انسانی ذات کی بنیادی حقیقت ہے۔ دنیا بھر میں روایتی طرز احساس ہمیشہ سے دو تصورات پر اپنی بنیاد رکھتا ہے۔ مرکز کی تلاش اور مبدا کی بازیافت۔ کلی طور پر نہ سہی

لیکن تاریخی اور معاشرتی سطح پر اس مشترک تجربے میں مرکز اور مبداء کی تلاش بہت بڑے موضوع کی حیثیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نسل کا بنیادی تجربہ کائنات کو آدم اولیں کی نگاہ سے دیکھنے کا ہے یعنی موجود کو دیکھ کر گذراں کو یاد کرنے کا۔ یہی یاد آگے بڑھ کر ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان ظاہر ہونے والی نسل میں خواب کی کیفیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ نسل بنیادی طور پر جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے والوں کی ہے یا نیند میں چلنے والے لوگوں کی۔ یہاں خواب دیکھنے کا عمل کسی نظریے کے ذریعے پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ ذات کی خوابیدہ سطحوں کے ظہور کا عمل بن جاتا ہے اور اپنی اس حیثیت میں پوری تہذیب اور پوری کائنات کی مخفی سطحوں کو شعور میں زندہ کرتا ہے۔ یہ رویہ ایک مرتکز اور تہہ دار علامت کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ بعض جگہوں پر یہ خواب ذات کی جہتوں میں رونما ہوتا ہے اور بعض جگہ یہ گذشتہ اور آئندہ کے درمیان ایک قریۂ اسرار بن جاتا ہے کہیں کہیں خواب کی یہ کیفیت پوری کائنات کے منظر میں انسانی آنکھ کا تخلیقی عمل بن کر نمودار ہوتا ہے۔

یہ زمین و آسماں دونوں حقیقت ہیں مگر
خاک پر موجود ہونے کی خبر اک خواب ہے

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خواب دیکھنے کا یہ عمل جہاں جہاں نمودار ہوتا ہے وہاں یہ لازمی طور پر پاکستان کے امکان کو ظاہر کرتا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ زیادہ تر بلاواسطہ اور کہیں کہیں بالواسطہ یہ لمحۂ خواب گھر سے، سفر سے فطرت کے منظروں سے زمین و آسمان کی حقیقت کے درمیان اپنے وجود کے گذراں منظر سے مماثل ہو کر فرد، اجتماع اور فطرت کی تثلیث میں خفتہ امکان کے اسرار کو ظاہر کرتا ہے اور وجود کی تلخی سے ماورا اور آئیڈیل کی طرف ہجرت کا نقطۂ آغاز ترتیب دیتا ہے۔ یہ بنیادی اور مرکزی استعارہ کم از کم ہمیں اتنا بتاتا ہے کہ ایک پوری نسل اپنے وجود کی معنویت کو اپنے فوری معاشرتی اور فطری منظر کے تناظر میں تلاش کر رہی ہے اور بعض حالتوں میں اسے تخلیق کر رہی ہے۔ یہ اجتماعی تجربے کی دمیدگی کا دوسرا مرحلہ ہے۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں خواب مرکزی علامت ہے، واحد نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے بہت سے استعاروں کا ایک جھرمٹ ہے جو مرکز کی تلاش اور ایک سمت میں سفر کے مختلف مراحل کی نشاندہی کرتا ہے پھر اس کے ساتھ ساتھ پورا فطری لینڈ سکیپ ان شاعروں کے ہاں ایک طرح کی الہامی حقیقت بن جاتا ہے۔ علامتوں کی اس وسیع کائنات کے مرکز میں خواب، سفر اور ستارہ واقع ہیں اور اس کے اردگرد کا لینڈ

سیکپ موجود و ماوراء کے درمیان ایک لمحۂ کشف کے اسرار کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے لیکن اس اسرار پر ایک اور شے سایہ فگن ہے جو اسے اس کی بنیادی معنویت عطا کرتی ہے۔ اب نئے شاعروں کے ہاں ایک ہمہ گیر مذہبی تجربہ جگہ جگہ عکس انداز ہو کر سمت سفر کی نشاندہی کرتا ہے اکثر جگہوں پر یہی مذہبی تجربہ تمام علامتوں کی معنویت مرتب کرتا ہے اور اپنے باطن میں زندہ رہنے والی بستی کی تلاش کو قریۂ محمد کی بازیافت کا استعارہ بنا دیتا ہے اس سطح پر آ کر علامتوں کا یہ پورا النظام ایک بہت گہری اور پیچیدہ معنویت کو اختیار کر لیتا ہے۔ ہم ایک تہہ دار کائنات علامت و استعارہ میں داخل ہو چکے ہیں۔

(۴)

ان تازہ واردان کے ہاں شعری تجربہ روایتی لفظیات میں ایک تمثال تازہ لے کر ظاہر ہوتا ہے اور ان کے لہجے میں پچھلی کچھ نسلوں کے کھوکھلے طنطنے اور کائناتی حقیقتوں کے رد و انکار کے بجائے ایک گہری تخلیقی عبودیت اور انکسار اور بحیثیت انسان اپنی حقیقت کے عرفان کی ایک بہت متاثر کن کیفیت پائی جاتی ہے۔

محمد اظہار الحق کے چند اشعار دیکھئے ؎

قرطاس و قلم ہاتھ میں ہے اور شب مہ ہے
اے رب ازل کھول دے جو دل میں گرہ ہے
میں شام سے پہلے ہی پہنچ جاؤں تو بہتر
جنگل میں ہوں اور سر پہ میرے بارِ گنہ ہے

یا پھر اس سے آگے ؎

آنکھوں کے برجوں میں شمعیں، دل میں لہو کی جھنکاریں
پھر بھی دعا کی شہر پنہ کا باب اثر معلوم نہیں

اس کے مماثل تجربات ثروت حسین کے ہاں بہت خوبصورتی سے ظاہر ہوئے ہیں دراصل یہ دعا و درود سے بھری ہوئی کائنات رد و انکار کے جہنم کے مقابل ایک کائنات رحمت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

بادِ باراں میں چلے یا تہہ محراب رکھے
رکھنے والا مری شمعوں کو ابدتاب رکھے
کوئی موسم ہو مگر میرے خیاباں کے تئیں
نخل اندیشۂ فردا کو شاداب رکھے

وہ خدا ئے رم و رفتار سپید ہر منزل
دلِ رہگیر کو آمادہ و بے تاب رکھے

تجربے پر ایک مذہبی ایڈیم کی روشنی بہت دور تک جھلکتی جاتی ہے۔

وہ دن بھی آئے کہ انکار کرسکوں ثروت
ابھی تو معبدِ حمد و ثنا کو جاتا ہوں

یا پھر ؎

ردائے سقفِ آسماں بچھانے والے ہاتھ نے
کہیں کہیں پہ نورزنِ دعا رکھا ہے کس لئے؟

اسی طرزِ عبودیت کے کچھ منظر جمال احسانی کے ہاں سے ؎

راتیں نیک خیالوں والی اور دن برکت والے
میری پونجی کب لوٹائے گا نیلی چھت والے
دیکھ عبادت گاہ کے دروازے پر بھیڑ فقیروں کی
اتنا چلے اور ایک قدم کی مسافت ان پہ بار ہوئی

لیکن جس شاعر کے ہاں یہ لہجہ اور یہ طرزِ احساس پوری طرح رچ بس گیا ہے وہ اجمل نیازی ہے۔ اس پوری نسل کے رویے اور ان کے اطلاقات اجمل نیازی کے ہاں بہت واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔

اضطرابِ خاک امجد میں کہیں رہتا ہے وہ
کائنات روحِ احمدؐ میں کہیں رہتا ہے وہ

کائنات روح احمدؐ کی روشنی اجمل نیازی کے تجربے میں جگہ جگہ دمک اٹھتی ہے چونکہ اجمل نیازی اس تجربے کی ایک اہم جہت کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کے ہاں خواب اور سرزمین ایک ہو کر قریۂ محمدؐ کی تشکیل کرتے ہیں لہٰذا ذرا آگے بڑھ کر ہمیں اس کے تجربے کو تفصیل سے سمجھنا ہوگا۔ فی الحال ان ساری مثالوں سے اس نسل کے بنیادی رویے کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ جس گہرے اور ہمہ گیر مذہبی تجربے کی جھلک ہمیں ان اشعار میں ملتی ہے وہ ایک بات ثابت کرتی ہے کہ شاعری کی یہ نئی کائنات ایک بے خدا سرزمین نہیں ہے جہاں لوگ اپنی اپنی لایعنیت کے اسیر ہو کر پوری کائنات کو لایعنی اور بے جمال بنانے پر تلے ہوتے ہوں۔ چنانچہ جب اس شعری منظر میں بنیادی علامت خواب کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہو تو یہ استخراج کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ یہ خواب شیکال کی تصویروں

کی طرح لاشعوری علامتوں کی سرریئل تصویر، یادیں بر کے مرہم جہنم سے آگے کی چیز ہے اور اس کی معنویت، انسان فطرت اور خدا کے درمیان رابطے کے لمحے میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس شاعری میں خواب کا استعارہ تجلی کے تصور سے بہت مماثلت رکھتا ہے جس کی روشنی پوری کائنات کو ایک نئی معنویت عطا کرتی ہے اور اسے ماورا کے ایک طویل سلسلے سے ملا دیتی ہے۔ چنانچہ اس شاعری میں ہم اگر یہ دیکھتے ہیں کہ خواب کے مظاہر بار بار روشنی کی علامتوں یعنی چراغ اور ستارے کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں تو یہ محض اتفاق نہیں ہے بلکہ اس طرح یہ خواب اس رویا کے مماثل ہو جاتا ہے جس کے ذریعے تجلی اس کائنات کو روشن کر دیتی ہے۔

اسی طرح یاد کے منظر کو روشنی کی تمثالوں کے ساتھ ملا دینا بھی اسی طرز احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔

گنج خزاں آثار میں تو وقت آج یہ کس کی یاد آئی
ایک شعاعِ سبز اچانک تیرگی پاتالوں میں

روشنی کا یہ استعارہ اس پورے شعری لینڈ سکیپ میں معنی کا اولین تلازمہ ہے چاہے اس کی سطح جذباتی ہو، معاشرتی یا مابعد الطبیعاتی۔ روشنی کس طرح ایک تعلق کا استعارہ بن کر ایک پرملال کائنات کو گہری جذباتی معنویت دیتی ہے محمد اظہار الحق کے ہاں دیکھیے۔

اکیلا ہوں میں اور کہیں دور وہ اوڑھنی اڑ رہی ہے
بس آنکھوں میں وصول اور سارے میں وہ چاندنی اڑ رہی ہے
اندھیرے کی لہروں پہ میں ہوں، مری کشتیاں آ رہی ہیں
کناروں پہ جل رہی ہے تری روشنی اڑ رہی ہے

خواب اور ستارے کا رابطہ ایک اور منظر میں دیکھیے۔

ستارے کا راز رکھ لیا مہمان میں نے
اک اچھے خواب اور آنکھ کے درمیان میں نے

کائنات میں روشنی کو یہ انتخاب اقبال ساجد کے ہاں ایک بہت بڑے رزمیاتی پیرا [illegible] ظاہر ہوتا ہے

[illegible]
[illegible]

[illegible] کر چکا ہے

اور اس سے منسلک کائنات کو بامعنی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے ہٹا کر ایک نئی شمع روشن کی جائے۔

اک شمع سرد تھی جو مجھے واگذاشت ہے
اور اک شرف کہ خانۂ مسمار سے ہوا
چراغِ کشتہ کے اک طاقچے پہ میرا نام
سحر ہوئی تو ہوا کی نگاہ میں آیا

اس پوری کائنات کو اصولِ نور کے حوالے سے دیکھنے اور شناخت کرنے کا رویہ اس نسل میں ایک بہت گہری معنویت رکھتا ہے۔

ع مگر میں دنیا کو دیکھتا ہوں چراغ اور آئینے کی رو سے

یا پھر

مرے نجم خواب کے روبرو کوئی شے نہیں مرے ڈھنگ کی
یہ فلک ہے کشت غبار سا، یہ زمیں ہے پانی کے رنگ کی

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ چراغ اور ستارے سے منسلک یہ کائنات خواب جب روشن ہوتی ہے تو کن کن سطحوں پر ظہور کرتی ہے اور ایک مشترک تجربے کی حیثیت سے اس کی معنویت کیا ہے۔

(۷)

اس نسل میں خواب زندگی کے بنیادی رویے کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کے گرد دائرہ معنی کا ایک پھیلتا ہوا افق مرتب ہوتا ہے۔ محمد خالد کی دو غزلیں جن کی ردیف خواب ہے اس رویے کی مختلف جہتوں کی وضاحت کرتی ہیں

مجھے دیکھ ایک عذاب میں، کبھی خواب میں
کبھی آتشِ سرِ خواب میں، کبھی خواب میں
کوئی نخل جھومتا ہے نگاہ کے روبرو
کبھی انتظارِ سحاب میں، کبھی خواب میں
کبھی باد و آتش تیز میں ہے مری نمو
کبھی خاک میں، کبھی آب میں، کبھی خواب میں
ہمیں پھر سے تازہ حقیقتوں کا سراغ دے
کبھی پردہ ہائے حجاب میں، کبھی خواب میں

دوسری غزل میں یہ رویہ اور واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔

کر رہا ہے ہمیں چلنے کا اشارہ کوئی خواب
لے چلیں رخصتِ سفر کوئی ستارہ کوئی خواب
آتشِ ساعتِ آئندہ دہکتی ہی نہ تھی
ہم نے طاقِ شبِ ہجراں میں اتارا کوئی خواب
اور کچھ دیر کو مل جائے اگر مہلت دید
ڈھونڈ لیں گے کوئی جینے کا سہارا کوئی خواب

اس پورے منظر میں خواب فطرت اور انسان کے درمیان اور سب سے بڑھ کر ایک بے ثمر صورتحال کو بامعنی بنانے کے مرکزی حوالے کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ غلام حسین ساجد کے ہاں آتے آتے اس خواب کا زمین اور معاشرے سے ربط واضح ہونے لگتا ہے خصوصاً

قریۂ حیرت میں دل کا مستقر اک خواب ہے
یہ زمیں اک آئینہ ہے، یہ نگر اک خواب ہے

جیسے شعر ساجد کے سمت سفر کو ہمارے سامنے لے آتے ہیں۔ یہ تخلیقی استعارہ ساجد کے ہاں پہلو بدل بدل کر ظاہر ہوا ہے۔

میں جن کے ہمراہ چل رہا ہوں، وہ سب اسی خاک کی نمو ہیں
مگر جو میرے وجود میں ہے وہ خواب ہے اور ہی کہیں کا

یا پھر یہ کہ۔

مری امانت میں جو بھی کچھ ہے، وہ سب اسی دہر کے لئے ہے
یہ رنگ اک خواب کے لئے ہے، یہ آگ اک شہر کے لئے ہے

ساجد کے ہاں خواب کا استعارہ کبھی ذات کے خفتہ تخلیقی رویے کے طور پہ ظاہر ہوتا ہے۔

مرے خاکداں کی سپر تو ہے کسی موجِ تیز سے آئینہ
مرے خواب سبز کی تیغ پر وہی تہہ دہکتی ہے زنگ کی

اور کبھی یہی خواب پوری کائنات سے یکجان ہونے کا استعارہ بن جاتا ہے لیکن اب آہستہ آہستہ یہ خواب ایک پوری تہذیبی روایت اور سرزمین سے ہم آہنگ ہوتا جا رہا ہے۔

رکی ہوئی ہے جو ایک موجِ سراب کی سطح پر یہ دنیا
تو میں بھی اس خواب کے نگر کا ثبوت لاؤں کہاں سے

خواب کی تہذیبی روایت، مذہبی طرز احساس اور پاکستان سے وابستہ ہونے کی اہم ترین اور سب سے واضح شکل اجمل نیازی کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔

صبحِ وصل خواب ہے اجمل کسی محبوب چہرے کی طرح
شہر میں سارے مناظر ہیں کسی اندر کے جذبے کی طرح
قریۂ عشق محمدؐ میں نگاہِ خاک سے دیکھو مجھے
ذرہ ذرہ ہو کے بکھرا ہوں کسی آباد جذبے کی طرح
حیرتِ تعبیر سے باہر نکل اے سبز خوابوں کی زمیں
اپنی آنکھوں میں بچھا خود کو کسی ہمراز خطے کی طرح
وقت کس کے نام سے منسوب ہو کر بے اماں ہے آجکل
زندگی عکسِ تمنا میں کسی بیتے زمانے کی طرح

راز اور خواب کی یہ کیفیت اجمل نیازی کے ہاں بار بار کائناتِ روحِ احمدؐ کی تمثال سے ہم آہنگ ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اک شخص جزیرہ رازوں کا اور ہم سب اس میں رہتے ہیں
اک گھر ہے تنہا یادوں کا اور ہم سب اس میں رہتے ہیں
اک خواب خزانہ نیندوں کا وہ ہم سب نے برباد کیا
اک نیند خرابہ خوابوں کا اور ہم سب اس میں رہتے ہیں

اس تجربے کے مختلف پہلو ایک جہانِ اسرار و حیرت کی مختلف جہتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور لازمی طور پر پاکستان سے اور اس کی تہذیبی روایت سے وابستہ ہیں اور ذات کے باطن میں ایک مسیّ کائنات کی دریافت پاکستان میں ایک نئے امکان کا شہود بن جاتی ہے۔

دل دریا میں کھوج ملا ہے کچھ آباد جزیروں کا
درد کی تہہ میں پایا میں نے کشف نئی تصویروں کا
اک مستی ناخفتہ آنکھ میں لامحدود زمانوں کی
اک نشہ خوابوں سے پہلے خوابوں کی تعبیروں کا
یادوں کے اخلاص میں پنہاں راز جمیل جہانوں کے
خون کے نور سے ظاہر ہوگا عہد نئی تقدیروں کا

اجمل نیازی کے ہاں پاکستان ایک روحانی واردات کی حیثیت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ کیفیت ظاہر ہے کہ ہر شاعر کے ہاں دکھائی نہیں دیتی لیکن خواب کے اس مرکزی استعارے سے داستانوں کی طرف اور حیرت کے نئے جہانوں کی طرف جو اسرار پھوٹتے ہیں وہ اپنی جگہ اس

استعارے کی ذاتی اور قومی معنویت سے ایک پراسرار ربط رکھتے ہیں اور معنویت کی تلاش کا علامتی لہجہ بن جاتے ہیں۔ محمد اظہار الحق کے ہاں ان منظروں کا ظہور کچھ یوں ہوتا ہے۔

کیا رنگت ہے، کیسی زلف اڑان اس کی
کس دنیا کے طائر میں ہے جان اس کی
کیسے کیسے اسم طلسم ہیں اس کے پاس
اُن کشتوں کی پسیاں مہمان اس کی

حیرت اور اسرار سے بھری ہوئی یہ کائنات ثروت حسین کے ہاں آکر ایک سرئیل تمثال کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ثروت نے ان میں تمثالوں کی سطح پر، آہنگ کی سطح پر اور صوتیات کی سطح پر پوری تاریخ کو تلمیحاتی انداز میں سمو دیا ہے۔

اسی کنارۂ حیرت سرا کو جاتا ہوں
میں اک سوار ہوں کوہِ ندا کو جاتا ہوں
قریب ہی کسی خیمے سے آگ پوچھتی ہے
کہ اس شکوہ سے کس قرطبہ کو جاتا ہوں
حذر کہ دجلۂ دشوار پر قدم رکھتا
شکار گاہِ فرات و فنا کو جاتا ہوں

یا اسی طرح کی اور مثال۔

فرات فاصلہ و دجلۂ دعا سے ادھر
کوئی پکارتا ہے دشتِ نینوا سے ادھر
کسی کی نیم نگاہی کا جل رہا ہے چراغ
نگار خانۂ آغاز و انتہا سے ادھر

ثروت کے ہاں ایک اجتماعی تجربے کو اپنے اندر جذب کرنے کا شعور بہت واضح ہے اور اس تسلسل اور مشارکت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا تعلق بنیادی طور پر شاعر کے معاشرتی رول سے ہے۔

[illegible] [illegible] آنگنے میں سب ہیں
میں [illegible] باجنے میں سب ہیں
[illegible] آج کی [illegible] بات
[illegible] ہیں

[illegible] کے ہاں [illegible] ایک [illegible] کے جمال کی سطح

پر ظاہر ہوتی ہے اور دوسرے گھر کے حوالے سے۔

گردشِ سیارگاں، خوب ہے اپنی جگہ
اور یہ اپنا مکاں، خوب ہے اپنی جگہ

جمال فطرت سے تعلق ثروت کے ہاں ایک طرح کی سرشاری کی کیفیت لے کر نمودار ہوتا ہے۔

آئے ہیں رنگ بحالی پر
رکھتا ہوں قدم ہریالی پر
اک سورج میری مٹھی میں
اک سورج ہل کی پھالی پر
وہی ایک چراغ دمکتا ہے
گندم کی بالی بالی پر
کوئی نور ظہور کرے ثروت
اسی حمد الحمد کی جالی پر

ثروت حسین کا شعری تجربہ، اس کا اسلوبِ بیان اور اس کا آہنگ نئے لوگوں میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور بلاشبہ ثروت ہمارا اہم ترین شاعر ہے۔

خواب کے مرکزی استعارے کی معنویت کو سمجھنے کے بعد شاعری اور اس کے تکنیکی مسائل کی طرف اس نسل کے رویے کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف یہ کہ اس دوران شاعری کا پورا لینڈ سکیپ بدلا ہے بلکہ لفظیاتی فضا سے لے کر آہنگ کے پیٹرن تک میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں آئی ہیں۔ پچھلے دس بیس برس کی شاعری میں رویوں کا ایک منتشر پیٹرن دکھائی دیتا ہے جب کہ ان شاعروں میں، ہر ایک کے ہاں اپنی ذات کو بامعنی بنانے اور اپنی کائنات کو بااثر کرنے کا ایک بنیادی اصول نظر آتا ہے یہ چیز روایت سے بہت قریب ہے۔ دوسری بات یہ کہ تکنیکی اور لفظیاتی سطح پر یہ پوری شاعری فارسی کلچر اور اس کے ایڈیم کی طرف ایک واضح میلان رکھتی ہے اس سلسلے میں افضال سید کا ذکر بہت ضروری ہے۔ افضال کی پوری کائنات فارسی کلچر سے جنم لینے والے ایک داستانی منظر میں ظہور کرتی ہے اور وہ ایک دیومالائی لہجے میں کلام کرتا ہے ثوابت و سیارے سے دشت نرد اس لہجے کے چند تیور

نشان کس کا سپہرِ سیاہ میں آیا
بہت جوان تھا کفش و کلاہ میں آیا

بس ایک شام کا خورشید تھا کہ سب غریب
تھی رکاب مری خیمہ گاہ میں آیا

یا پھر۔

وہ ایک ریگ برگزیدہ سی نہر چلنے لگی
جو میں نے چوم کے پیکاں کمان میں رکھا
گرفت تیز رکھی رخش عمر پر میں نے
بجائے جنبش مہمیز، نیشتر رکھا

آگے بڑھ کر یہ لہجہ کچھ ایسی شکل اختیار کرتا ہے۔

آئین انتقام سے آئینہ خانہ تھا
مِن تیغ بے نیام سے آئینہ خانہ تھا
اس دل کو پوچھتے ہیں گدازادگان شہر
یہ کاسہ کس مقام سے آئینہ خانہ تھا
تسلیم موج پہ تھا فنا خانۂ حباب
تقدیر خشت خام سے آئینہ خانہ تھا

افضال کے ہاں مسلم رزمیہ کی پوری روایت معنویت کی تخلیق کا اصول بن جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے روایت عشق جمال احسانی کے ہاں۔ جمال احسانی کے ہاں عشق اور اس سے پیدا ہونے والی تہذیب بنیادی انسانی رویوں کی تشکیل کرتی ہے۔ تازہ ترین غزل سے چند شعر۔

چشم حیراں کو تماشائے دگر پر رکھا
اور اس دل کو تری خیر خبر پر رکھا
یہ ممکن ہے چراغوں کو وہ خاطر میں نہ لائے
گھر کا گھر ہم نے اٹھا راہگذر پر رکھا
چمن دہر میں اس طرح بسر کی ہم نے
سایۂ گل کا بھی احسان نہ سر پر رکھا

جمال کے ہاں عشق کی پوری روایت اپنے سارے جوکھموں کے ساتھ اور اس سے پیدا ہونے والی تہذیب وہ انکسار کے ساتھ ایک اصول بن کر نمودار ہوتی ہے۔ اس غزل میں اس رویے کا بنیادی پیٹرن اجمالی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

کب پاؤں فگار نہیں ہوتے، کب سر میں دھول نہیں ہوتی
تری راہ پہ چلنے والوں سے لیکن کبھی بھول نہیں ہوتی
سر کوچہ عشق آ پہنچے ہو لیکن ذرا دھیان رہے کہ یہاں
کوئی نیکی کام نہیں آتی، کوئی دعا قبول نہیں ہوتی
ترے وصل کی آس بدلتے ہوئے ترے ہجر کی آگ میں جلتے ہوئے
کب دل مصروف نہیں رہتا، کب جاں مشغول نہیں ہوتی
کئی دشت جمال ان آنکھوں نے ہوتے ہوئے دیکھے باغ مگر
جو آگ نصیب ہوتی ہے مجھے کسی صورت پھول نہیں ہوتی

یہی روایت عشق ایک حیاتی تجربے میں ڈھل کر عطاء الحق قاسمی کے ہاں حسن کے تجربے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ تجربہ نمو پا کر ایک قومی اور معاشرتی طرز احساس میں مدغم ہو جاتا ہے۔

وہ سکونِ جسم و جاں گرداب جاں ہونے کو ہے
پانیوں کا پھول پانی میں رواں ہونے کو ہے
گم ہوا جاتا ہے کوئی منزلوں کی گرد میں
زندگی بھر کی مسافت رائیگاں ہونے کو ہے
ہیں فصیلِ جسم کے باہر کھڑا ہوں دم بخود
معرکہ سا خواہشوں کے درمیاں ہونے کو ہے
شام ہوتے ہی عطا کیوں ڈوبنے لگتا ہے دل
کچھ نہ کچھ ہونے کو ہے اور ناگہاں ہونے کو ہے
منزلیں بھی یہ شکستہ بال و پر بھی دیکھنا
تم سفر بھی دیکھنا، رختِ سفر بھی دیکھنا
حالِ دل تو کھل چکا اس شہر میں ہر شخص پر
ہاں مگر اس شہر میں اک بے خبر بھی دیکھنا
چند لمحوں کی شناسائی مگر اب عمر بھر
تم شرر بھی دیکھنا، رقصِ شرر بھی دیکھنا
جس کی خاطر میں بھلا بیٹھا تھا اپنے آپ کو
اب اسی کو بھول جانے کا ہنر بھی دیکھنا

جب گزر جاؤ سلگتی بستیوں سے ایسے
فریۂ جاں میں اُترنا، یہ نگہ بھی دیکھنا (۶)

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن کے تجربے کا قومی طرزِ احساس سے کوئی ربط نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ ایک سطحی بات ہے۔ معاشرتی اور قومی سطح کی ہر وہ شاعری جس کے پیچھے عشق کے تجربے کی بازگشت نہ سنائی دیتی ہو اکثر سطحی اور غیر معتبر ہوتی ہے۔ تخلیقی عمل میں تجربوں کی ترتیب تو ایک بہت پیچیدہ عمل ہے۔ مثلاً فلسطین میں ایک قومی واردات کے ظہور کرتے ہی عشقیہ شاعری کا بہت قومی ظہور ہوا۔ اس بات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک نقاد نے لکھا ہے کہ ایک روحانی کیمیا کے ذریعے فلسطینی شاعروں نے وطن سے ہجر اور محبوب کے ہجر کو ایک کر دیا۔ عطاالحق قاسمی کے ہاں عشق کے تجربے کا ایک قومی طرزِ احساس میں گھل مل جانا اس نوع کی ایک چیز ہے اور اپنی اس حیثیت میں موجودہ شاعری میں تجربات کے ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے کی تخلیقی صورتحال کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔

اب تک کی اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ طرزِ احساس کی سطح پر یہ پوری نسل ایک روایت سے رابطہ قائم کر رہی ہے اور اس کے مرکزی استعارے کے گرد جو منظر ترتیب پاتا ہے اس میں زندگی کی معنویت کی تلاش، ایک مملکت کے اجتماعی تجربے کے حوالے سے ہو رہا ہے اور پوری تہذیبی روایت کی بازگشت اس میں بہت واضح طور پر سنائی دے رہی ہے اس نسل کے خوابوں کے منظر میں جلتے ہوئے چراغ ہیں ایک نئے جہاں کے تجلیاتی منظروں کی طرف لے جاتے ہیں۔

مسافتِ عمر میں زیاں کا حساب ہوتا ہے جستجو سے
مگر میں دنیا کو دیکھتا ہوں چراغ اور آئینے کی رو سے

(۸)

شاعری میں تمثال کی سطح جن نفسیاتی حقیقتوں کو ظاہر کرتی ہے، اتنی کم اہم وہ حقیقتیں نہیں ہیں جو آہنگ کی سطح پر ظاہر ہوں۔ آہنگ کے جتنے تجربے اور نئے صوتی پیٹرنز کی تلاش کی جتنی صورتیں اس شاعری میں ملتی ہیں شاید اردو میں، کسی ایک گروہ کے ہاں اتنے متنوع آہنگ دکھائی نہیں دیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا رویہ صوتی ہم آہنگی کو معنوی ہم آہنگی پر فوقیت دینے کا بھی ہے یہ نسل جتنا کام بصری تمثال تراشی سے لیتی ہے اس سے کچھ کم تر صوتی آہنگ کے پیچیدہ پیٹرن تلاش کرنے پر نہیں دیتی۔ لیکن اس پورے عمل کی اہمیت وہاں ظاہر ہوتی ہے جہاں تمثال ایک صوتی فضا سے ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے اور محسوس تو کیا جا سکتا

لیکن ننگا ہول کے سامنے متشکل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عمل موجودہ اردو شاعروں میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ صلاح الدین محمود کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ نئے لوگوں میں اس کی طرف خصوصی مناسبت ثروت حسین کو ہے۔ فرات فاصلہ و دجلۂ دعا سے ادھر، یا شکارگاہ فرات و فنا کو جاتا ہول اس طرح کے مصرعوں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ شاعری سمعی متخیلہ سے کس طرح کام لیتی ہے۔ اسی سمعی متخیلہ سے جنم لینے والی تمثالوں کی ایک پوری کائنات انشال سید کے ہاں اپنا ظہور کرتی ہے اس بات سے انکار نہیں کہ کچھ عرصہ پہلے تک، نئے آہنگ کی تلاش میں ان شاعروں نے حد اعتدال سے بڑھ کر تجربات کئے اور ارکان کی کمی بیشی سے بہت جلکہوں پر یا تو آہنگ کے عجیب اور نامانوس پیٹرن خلق کئے یا بعض مقامات کہیں کہیں بے وزن بھی ہو گئے۔ ان تمام تجربات کو اگر ایک کلیت میں دیکھا جائے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک تو نیا شاعر اپنے تجربے سے سرسری طور پر گزرنا نہیں چاہتا بلکہ رک رک کر اپنی کائنات میں سفر کرنا چاہتا ہے اور اسی کی توقع اپنے قاری سے بھی رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی نفسیاتی یافتوں میں کچھ ایسی بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں آگئی ہیں جو اسے ایسی بحروں کی کائنات میں ہی نئے combinations تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور کہیں کہیں اس سے باہر نکلنے پر بھی۔ یہ انہیں تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی ضرورت بھی تھی جس نے نثری نظم کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ جن شاعروں کا ذکر ہوا ان میں سے اکثر نے نثری نظمیں لکھی ہیں لہٰذا یہ سمجھنا کہ ان کے ہاں نثری نظم مبارک احمد، عارف عبدالمتین، نسرین انجم بھٹی، شائستہ حبیب وغیرہ کی طرح شاعرانہ عجز کی وجہ سے پیدا ہوئی بالکل بے معنی بات ہوگی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نثری نظم آہنگ کے لئے پیٹرن کی تلاش میں تخلیقی تجربے کا ایک چھوٹا سا جزو تھی، لیکن شاعری میں فلاپ ہونے والوں نے اس میں ایک پناہ گاہ ڈھونڈی اور یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ اگر وہ خود شاعری نہیں کر سکتے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ عروضی آہنگ کا نظام اس جرم میں شریک ہے۔ چنانچہ جب بعد میں اسی مسئلے پر جو جنگ زرگری ہوئی اور نثری نظم، یا نثر لطیف کی ایجاد کا سہارا باندھنے کے لئے جو گنجے سر آ کے بڑھے وہ کوئی راز کی بات نہیں۔ خیر یہ بات یہاں چونکہ براہ راست طور پر متعلق نہیں لہٰذا اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ آہنگ کے نئے پیٹرن کی تلاش کا عمل ان شاعروں کے ہاں غزل، پابند نظم اور نثری نظم ہر جگہ دکھائی دیتا ہے اور اس میں تین آدمیوں کے اثرات بہت واضح ہیں۔ مجید امجد، محمد سلیم الرحمٰن اور جیلانی کامران۔ تکنیک کے معاملات میں محمد سلیم الرحمٰن کا اثر اس پوری نسل پر بہت گہرا اور اہم ہے۔

نثری نظم کی فارم میں بڑی شاعری پیدا ہوئی یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ آہنگ میں اور تمثالی لینڈ سکیپ میں اس تجربے نے بہت بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں اور ابھی کچھ عرصے تک اس ہئیت کا یہی رول نظر آتا ہے۔

(۹)

میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ یہ ایک ایسی نسل ہے جس کے ساتھ تنقید کے نقار چی نہیں ہیں لیکن اس پورے تخلیقی تجربے سے تنقید بھی تیزی کے ساتھ متاثر ہوئی ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو تنقید کے بنیادی حوالے بھی بدل کر اس تخلیقی Avalanche کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حسن عسکری کے واسطے سے تنقید کا ایک بالکل نامنظر سا میں آیا اور اسی لئے مارکسی نظریہ بازی ہمراہ وٹ گن شٹین وہائیڈیگر کے انداز کی غیابت آمیز اور غیر تخلیقی تنقید بہت کچھ زور مارنے کے باوجود نہ چل سکی۔ اس شاعری کے ساتھ پیدا ہونے والے تنقیدی نقطہ نظر میں پوری روایت اور مذہب کا فہم جھلکتا ہے۔ تصوف کے بہت گہرے اور واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ شواں، رینے گینوں کے حوالے سے تہذیبی اور مابعد الطبیعاتی سطح پر جو مباحث چھڑے اور ادب میں کہیں کہیں ان کی مبالک کنفلین رین کے واسطے سے ملتی ہے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تنقید اور تخلیقی عمل میں ایک تہذیبی طرز احساس کا فہم تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس نقطہ نظر کی نمائندگی ہمارے نئے لکھنے والوں میں سب سے زیادہ واضح انداز میں تحسین فراقی کے ہاں ہوئی ہے۔ تحسین نے دیکھتے ہی دیکھتے جس طرح اپنی جگہ بنائی اور جن نقطہ ہائے نظر کو انہوں نے اپنا بنیادی حوالہ قرار دیا اس کے پیش نظر بہت ذمہ داری سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس نسل کے اہم ترین نقاد بنتے جا رہے ہیں۔ تحسین فراقی کے ہاں جو علمی پس منظر، تہذیبی فہم اور تجزیاتی فراست ہے اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ تخلیقی سطح پر بھی اس نسل کے شعری تجربوں میں شریک ہیں ورنہ عام طور پر نوں نقادوں کا حال یہ ہے کہ مصرعہ وزن میں نہیں پڑھ سکتے اور وٹ گن شٹین کی گردان کر کے شاعری کی گردن نا پنی شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز حسین اور ان کے شاگردان رشید نے جو روش اختیار کیا تھا یعنی تنقید لکھنے کے لئے نقاد کو ہر طرح کے شعری ذوق اور فہم سے پاک رکھنے کا جو اہتمام کیا تھا وہ پورا دفتر گاؤ خورد ہو چکا ہے اب نئی تنقید اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتی جب تک اس میں روایتی نقطہ نظر اور شعری روایت کا مکمل فہم اس کے مختلف شعبہ ہائے علم پر دسترس کے ساتھ موجود نہ ہو اور اب یہ چیز رفتہ رفتہ دیکھنے میں آ رہی ہے۔ بہر کیف مقصود کلام یہ ہے کہ طرز احساس کی تبدیلی شعری منظر کے ساتھ ساتھ تنقیدی

سطح پر بھی سامنے آ رہی ہے اور اس کے چند نمائندے بھی اس تنقیدی تناظر میں اپنے کام کا آغاز کر چکے ہیں۔

(۱۰)

پاکستان کے اردو ادب میں اس نئے تخلیقی مدکر اور تاریخ و تہذیب کی پوری روایت میں اس کے تسلسل کو دیکھنے کے بعد ہم ایک بہت اہم سوال کے روبرو ہیں۔ اس مزاج اور معیار کی شاعری کی ایک سطر بھی ہندوستان میں لکھی جانے والی اردو شاعری سے نہیں پیش کی جا سکتی سوال یہ ہے کہ پاکستان میں اس شگفت ہوتے ہوئے تخلیقی منظر کے پیچھے وہ کون سی قوت ہے جو اسے ایک معیار، ایک تسلسل اور ایک خاص مزاج عطا کرتی ہے اور اگر ادب کی جاگیر تقسیم نہیں ہو سکتی تو ہندوستان میں اردو شاعری کے زوال کا سبب کیا ہے۔ اس سوال اور اس کے مضمرات کا فہم ہمیں ادب میں اجتماعی تجربے سے وابستگی کے رول کے بارے میں بہت اہم نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔

جس طرح پاکستان کی تخلیق ایک عظیم تاریخی اور اجتماعی تجربہ ہے اس طرح ہندوستانی ادیب کے لئے ہندوستان کی آزادی کوئی روحانی واردات نہیں بن سکی اور اس طرح اجتماعی تجربے کا خانہ ہندوستان کے اردو ہی کیا دوسرے زبانوں کے ادب میں بھی خالی ہے چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ شاعری کی سطح پر اجتماعی تجربے کی غیر موجودگی سے پیدا ہونے والے خلا کو انفرادی یا گروہی آشوب کے ادب نے پر کیا ہے اور اس کا معیار ہمارے سامنے ہے۔

اس ساری گفتگو سے ہندوستان میں لکھی جانے والی اردو شاعری کی کوئی تحقیر مقصود نہیں ہے اس سے تو بس اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ تخلیقی عمل کے اشتراک کے لئے محض زبان کا ایک ہونا کافی نہیں بلکہ اجتماعی تجربے میں اشتراک ضروری ہے۔ اگر امریکی اور برطانوی ادب میں زبان کے اشتراک کے باوجود طرز احساس کا زمین و آسمان جیسا فرق ہو سکتا ہے اگر سپین اور جنوبی امریکہ کے ادب میں زبان کے اشتراک کے باوجود قطبین جیسا فرق ہو سکتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک جگہ کا اجتماعی تجربہ دوسرے اجتماعی تجربے سے اپنی بنیاد میں مختلف ہے۔ پاکستان میں ہونے والی پوری شاعری مذہبی طرز احساس، پاکستان کے قریۂ محمدؐ ہونے کے خواب اور ستارے کی سمت نمائی کی داستان ہے اور اس کے پیچھے پاکستان بننے کا وہ تجربہ ہے جو ہمارے خواب کو صدیوں کے تسلسل میں زندہ رہنے والی تہذیب سے جوڑ دیتا ہے اور پاکستانی ادب کے معنی اسی اجتماعی تجربے میں مشارکت سے ہی ظاہر ہوتے ہیں اور یہیں آ کر تاریخ واقعات کے انبار کے بجائے ایک روحانی واردات بن جاتی ہے یہ پوری

شاعری بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر ایک عظیم تجربے کی شہادت دیتی ہے جو ان سب سے ماورا یاد اور خواب کے درمیان ایک لمحۂ ابد نشان میں واقع ہے اور سر تمثال بر عکس انداز ہو رہا ہے اور اسی سے وابستگی کے معنی ہیں ایک نئے، گہرے طرزِ احساس میں شامل ہونا جو ادب کے مزاج کو ایک سطح پر ذات کی گہری تہوں اور دوسری سطح پر مسلم کلچر کے پورے لینڈ سکیپ سے جوڑ دیتا ہے اور اسی طرح انفرادی آواز میں مرحلہ در مرحلہ ایک تاریخی صدا کی گونج گہری ہوتی جاتی ہے۔

○○

ژاں پال سارتر

وحید عشرت

عصرِ حاضر میں فلسفہ کو مقبولِ عام بنانے میں لارڈ ولیم برٹرینڈ رسل کے علاوہ جس شخص نے عالمگیر شہرت پائی وہ جدید وجودیت کا بانی ممتاز فرانسیسی فلسفی ژاں پال سارتر ہے۔ وہ ۱۵ اپریل کو پیرس کے ایک ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پا گیا۔ اسے ۱۲ اپریل کو ہسپتال میں داخل کیا گیا مگر وہ اپنے پھیپھڑوں کی مہلک بیماری کے ہاتھوں جانبر نہ ہو سکا۔ وفات کے وقت ژاں پال سارتر کی عمر ۷۴ سال تھی۔ وہ ۱۹۰۵ء میں پیرس میں پیدا ہوا اور اس نے علم و ادب کے ایک شیدائی، جدید وجودیت کے بانی، عظیم ڈرامہ نویس، ناول نگار اور انسان دوست فلسفی کے طور پر بڑی شہرت پائی۔ گزشتہ دنوں جب اس نے افغانستان میں برہنہ اور مسلح اشتراکی روس کی جارحیت کی مذمت کی تو پورے اشتراکی ذرائع ابلاغ نے اسے کڑی تنقید کا ہدف بنایا تھا اور اسے طرح طرح کی مغلظات سے نوازا گیا۔ طرح طرح کے اس پر فقرے چست کیے اور آوازے کسے گئے۔ ژاں پال سارتر نے ہمیشہ قوموں اور افراد کی آزادی چھین کر انہیں ظلم و جبر اور غلامی کی زنجیریں پہنانے والوں کی مذمت کی۔ اس نے اپنے وطن فرانس کے خلاف جرمن نازی جارحیت اور لشکر کشی کی بھی مذمت کی اور فرانس کی الجزائر میں بربریت کے خلاف بھی پوری قوت سے آواز اٹھائی۔ اس نے ویت نام میں امریکہ کے مظالم کی بھی کھلے بندوں مخالفت کی اور کشمیر میں بھارتی سامراجیت کو بھی ناقابلِ برداشت قرار دیا اور اسی طرح اس نے افغانستان میں روسی جارحیت کو بھی ہدفِ تنقید بنایا۔ سارتر نے ایک زمانے میں خود جب اشتراکیت کی حمایت کی تو اشتراکی پریس نے اسے عظیم فلسفی، دانشور اور راست فکر نابغہ لکھا، مگر جب اس نے اشتراکیت کا ابھرتا ہوا انقلاب دیکھا تو اسے اس کا بھیانک چہرہ نظر آیا۔ چنانچہ وہ اسی روز سے اس کا سب سے بڑا نقاد بن گیا۔ دنیائے فلسفہ میں لارڈ ولیم برٹرینڈ رسل اور ژاں پال سارتر دو ایسے فلسفی ہوئے ہیں جنہوں نے مغربی دنیا سے اشتراکیت کی حمایت میں ایک زمانے میں بھرپور آواز اٹھائی۔ تاہم یہی دو فلسفی اشتراکیت کے تھوڑی ہی دیر بعد مغربی دنیا سے زبردست نقاد بن کر بھی ابھرے اور انہوں نے اشتراکیت کو ایک نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کے طور پر رد کر کے اشتراکیت کو زبردست زک پہنچائی۔

ژاں پال سارتر دو برس کی عمر میں یتیم ہو گیا۔ اس کی والدہ اپنے بیٹے کو لے کر ساربون چلی گئی، جہاں

سارتر کا نانا چارلس شوائٹزر رہتا تھا۔ چارلس جرمن لسانیات کا پروفیسر تھا۔ وہ پروٹسٹنٹ عقیدہ رکھتا تھا، تاہم وہ متعصب عیسائی نہیں تھا۔ وہ ایک آزاد خیال اور روشن ضمیر انسان تھا۔ اپنے نانا کے اس آزادانہ ماحول میں ژاں پال سارتر بڑا ہوا۔ وہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر بھی گھنٹوں غور کرتا رہتا تھا۔ اسی سوچ وبچار نے اسے عیسائیت کے تصورِ خدا سے باغی کر دیا اور وہ خدا کے وجود کا بھی منکر ہو گیا۔

بچپن سے ہی وہ نہایت ذہین وفطین تھا گرچہ بظاہر وہ ایک ''دُبلا پتلا، بھینگا اور بیمار بچہ'' نظر آتا تھا۔ اپنی ذکاوت وفطانت کے بارے میں وہ اپنی خود نوشت سوانح ''الفاظ'' میں لکھتا ہے۔

''میری والدہ کہا کرتی تھی کہ وہ دس ماہ تھا جو زیادہ دیر تک تنور میں پکتا رہا اور یوں وہ دوسرے بچوں سے زیادہ خستہ اور تب وتاب رکھنے والا بن کر نکلا۔''

اس کی ذہنی ساخت پر جس چیز نے سب سے نمایاں اثر چھوڑا، وہ اس کی والدہ کی دوسری شادی تھی۔ جب وہ گیارہ سال کا تھا تو اس کی والدہ نے ایک بحری انجنیئر سے بیاہ رچالیا۔ والدہ کی محبت کی تقسیم اور سارتر سے اس کی والدہ کی کم توجہی سے اس کے جذبات کے آبگینوں کو سخت ٹھیس پہنچی اور وہ نفسیاتی مسائل سے گزرتا ہوا مابعد الطبیعاتی مسائل پر غور کرنے لگا۔ عیسائی دینیات میں دیا ہوا خدا کا تصور جب اس کے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کے تسلی جواب نہ دے سکا تو وہ خدا کے وجود سے ہی منکر ہو گیا۔ یوں سارتر کا یہ پہلا وجودیاتی صدمہ تھا، جو اس کی زندگی پہ گہرے طور پہ اثر انداز ہوا، جس نے اسے عورت اور مذہب دونوں سے بیگانہ کر دیا اور اس نے روایتی شادی اور روایتی مذہب دونوں سے ساری زندگی اجتناب کیا۔ اور زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر اپنانے کی طرف راغب ہوا۔

۱۹۲۶ء میں اس نے فلسفے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۲۸ء میں وہ عام تعلیم سے فارغ ہو گیا۔ دو سال تک اس نے جبری فوجی تربیت بھی حاصل کی اور کچھ عرصہ تک کسی دیہاتی سکول میں بھی پڑھاتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں وہ برلن چلا گیا، جہاں دو سال تک وہ فرانسیسی انسٹی ٹیوٹ اور فرائی برگ یونیورسٹی میں محوِ تحقیق رہا۔ برلن میں اپنے قیام کے زمانے میں اس نے ممتاز جرمن وجودی فلاسفہ ہسرل اور ہائیڈگر سے شناسائی پیدا کی۔ ان دونوں وجودی فلاسفر سے اثر پذیری کے نتیجے میں ژاں پال سارتر بھی ایک وجودی فلسفی بن کر رہ گیا تھا۔ جب وہ جرمنی کے شہر برلن سے واپس ہوا تو وہ دو سال تک لو آور میں رہائش پذیر رہا۔ اس کے بعد جب وہ لی سے پاسٹر پیرس میں فلسفے کا استاد مقرر ہوا تو اسے تصنیف وتالیف کا موقع میسر آیا۔ چنانچہ ''ناسیا'' جو کہ اس کا مشہور ناول ہے اور کہانیوں کا مجموعہ ''لی مُر'' اس نے اسی زمانے میں لکھا۔

ژاں پال سارتر اسی زمانے میں مختلف سمعی اور بصری اوہام میں مبتلا رہا۔ اسے ایک وہم یہ بھی لاحق ہوا کہ ایک مچھلی اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ ایک رات اپنی روسی محبوبہ اولگا کے ساتھ سیر کے دوران اسے اسی مچھلی کے تعاقب کا احساس رہا۔ یہ وہم اس نے اپنی محبوبہ سیمون دی بووائر کو بھی بتایا۔ اوہام پرستی

وجودی فلاسفر میں بڑی ہی مشترک قدر ہے۔ خود وجودیت کا بانی کرکیگارڈ بھی متعدد اوہام کا شکار تھا۔ اپنے باپ مائیکل کرکیگارڈ کی زندگی کے واقعات نے کرکیگارڈ کو ساری عمر شدید احساسِ گناہ اور اس سے پیدا شدہ ذہنی انتشار، مایوسی، افسردگی اور تشویش میں مبتلا کئے رکھا۔ باپ کی تردامنی بیٹے کے لئے سوہانِ روح بنی رہی۔ اور وہ ساری زندگی اس وہم میں مبتلا رہا کہ ہر جگہ موت سائے کی طرح اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ اسی طرح فریڈرک نطشے وجودی فلسفی بھی اوہام کا مارا ہوا تھا۔ ہم مکتب الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے اسے "ننھا پادری" کہا کرتے۔ ہر وقت وہ گھر میں گھسا رہتا اور عورتوں کی صحبت میں خوش رہتا۔ وہ ساری زندگی شدید جذباتی حادثوں کا شکار رہا۔ اور انہیں اوہام اور جذباتی حادثوں نے بالآخر اسے دماغی امراض کے شفاخانے میں پہنچا دیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شخص وجودی فلسفی بن ہی نہیں سکتا جو کہ اپنے وجود کی شکست وریخت اور تعمیر و تخریب کے شدید کرب سے نبرد آزما نہ رہا ہو۔

جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو سارتر کو بھی فرانسیسی فوج میں شامل ہونا پڑا۔ جنگ کے زمانے میں وہ اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح قید ہوا۔ تاہم ایک برس کی قید کے بعد عارضی جنگ بندی کے موقع پہ وہ طبی وجوہات کی بناء پہ رہا ہو گیا۔ رہائی کے بعد جرمنوں کے خلاف فرانسیسیوں کی تحریکِ مزاحمت میں سارتر نے عملی طور پر حصہ لیا۔ یہیں سارتر کو اس بے لاگ اور غیر محدود آزادی کا ابتدائی تجربہ ہوا جس نے اس کے ذہن کی ایک وجودی فلسفی کے طور پہ آبیاری کی۔ اس لئے کہ جرمنی کے خلاف لڑنے والوں اور تحریکِ مزاحمت میں شامل افراد نے مجبوراً حصہ نہیں لیا تھا، بلکہ وہ اپنی آزادی کے تحفظ کی جنگ اپنے خود انتخاب کے بعد لڑ رہے تھے۔ یہ فرانسیسی قوم سے ان افراد کی ذاتی وابستگی یا کومٹ منٹ کے نتیجے میں تھی۔ آزادی کے اس مفہوم کو سارتر اپنی کتاب "جمہوریہ سکوت" میں بیان کرتا ہے کہ

"ہم کبھی بھی اتنے آزاد نہ تھے جس قدر کہ جرمنوں کے زمانۂ اقتدار میں تھے، جبکہ ہم تمام حقوق سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ ہمیں بات تک کہنے کا حق نہ تھا۔ سرِ عام ہر لحظہ توہین کی جاتی اور ہم چپ چاپ سہتے۔ طرح طرح سے ہمیں ذلیل کیا جاتا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ جرمن تسلط کو قبول کر لیں۔ اور اسی کے خلاف ہماری مزاحمت نے ہمیں آزادی کے حقیقی تصور سے آشنا کیا۔"

سارتر نے یہیں سے اخذ کیا کہ انسان کا راز صرف اس کی اپنی آزادی کی حدود میں ہے۔ سارتر کی تعریف کسی تحریکِ مزاحمت میں تو موزوں قرار دی جا سکتی ہے لیکن یہ تمام حالات پہ منطبق نہیں ہو سکتی۔ جنگ کے بعد وہ پیرس پہنچا اور از سرِ نو اس نے لی سے پاسٹر میں درس و تدریس شروع کی۔ ۱۹۴۴ء تک وہ درس و تدریس میں منہمک رہا۔ اسی زمانے میں اس نے اپنی معروف کتاب "ہستی و لاشیئت" شائع کی۔ سارتر نے زندگی کا ایک بڑا حصہ پیرس کے ایک چائے خانے میں گزارا۔ اس کا نام کیفے فلور تھا۔

بیشتر اس کی کتب یہیں تصنیف ہوئیں۔ اس کے مخالف اور دوست اس کی چائے خانے سے وابستگی کی وجہ سے اس کے فلسفے کو چائے خانے کا فلسفہ کہتے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ گھر کی نسبت کیفے میں اس کا دل زیادہ لگتا ہے کیونکہ کیفے میں بے تعلقی اور بے نیازی کی ایک ایسی مخصوص فضا ہوتی ہے جو کہ تخلیقی کاموں میں معاون ہوتی ہے۔ کیفے میں آنے والے لوگوں کو اس کی پروا نہیں ہوتی اور نہ اسے کیفے میں آنے والوں کی فکر دامن گیر ہوتی۔ وہ گھر کا بوجھ اٹھانے سے ہمیشہ گریزاں رہا۔ سارتر کی زندگی سادگی اور عظمت کی پیکر تھی۔ اسے ابتدائے عمر سے ہی پڑھنے کا جنون تھا۔ اس کی سوانح عمری کا نام بھی شاید اسی لئے "الفاظ" ہے۔ وہ ہوٹل میں کسی کونے کھدرے میں بیٹھا چائے کی چسکیوں کے ساتھ ساتھ اپنے انکار کے تار و پود بنتا رہتا۔ سارتر نے مصر، یونان، اطالیہ، روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بھی سیاحت کی۔

سارتر ابتدائے عمر سے ہی شادی سے گریزاں تھا۔ شاید اس کی وجہ اس کی ماں کی دوسری شادی تھی یا اس کے دیگر اوہام۔ تاہم اس نے چالیس برس کی عمر میں اپنی ایک ہم جماعت دوست ممتاز ادیبہ سمون دیبوار سے بغیر نکاح اور بغیر اولاد کے میاں بیوی کی حیثیت سے اکٹھے رہنے کا معاہدہ کیا اور مرتے دم تک اس سے ایفا کی۔ سارتر نے ۱۹۳۸ء میں اپنا پہلا ناول ناسیا شائع کیا۔ دراصل سارتر نے دوسری جنگ کے خاتمہ پر کامیو کے ساتھ مل کر فلسفۂ وجودیت کا رخ فن اور ادب کی طرف کر دیا تھا۔ مگر کامیو سے علیحدگی کے بعد اس نے دوبارہ اپنا رخ فلسفے کی طرف موڑ لیا۔ سارتر ایک رجائیت پسند فلسفی تھا۔ چنانچہ وہ کہا کرتا تھا کہ:-

"آج کل کے نوجوان ہماری نسبت زندگی کا سامنا کرنے کے لئے زیادہ مستعد اور تیار ہیں وہ ہم سے زیادہ صاف گو ہیں اور ایسی باتیں جانتے ہیں جو ہمیں معلوم نہیں۔"

تاریخ فلسفہ کا پنڈولم ہمیشہ معروضیت اور موضوعیت کی دو انتہاؤں کے درمیان ڈولتا رہا ہے۔ انتہا پسندانہ معروضیت کے بعد ہمیشہ انتہا پسندانہ موضوعیت کو عروج ہوا۔ بابل و نینوا کی تہذیب میں جب موضوعیت انتہا کو پہنچی تو ایشیائے کوچک کی ریاست آرمینیا میں آئیون کے علاقے میں طالیس ملیٹس نے جنم لیا۔ یہیں سے معروضی فلسفے کا آغاز ہوا اور کائنات کی مختلف توجیہات کا دور شروع ہوا۔ تاہم دیاقریطس کے بعد یونان میں سوفسطائی موضوعیت کا دور دورہ رہا۔ اسی دیاقریطس نے موضوعیت کو یہ کہہ کر انتہا تک پہنچا دیا کہ:-

"مسرت خارجی اسباب اور ساز و سامان سے حاصل نہیں ہوتی اس کا سرچشمہ خود انسان کے اپنے بطون میں ہے۔"

سوفسطائیوں نے کائنات کے گورکھ دھندوں کو چھوڑ کر کہا کہ "فلسفے کا اصل منصب یہ ہے کہ انسان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔" پروتاغورس سوفسطائی کا یہ کہنا کہ "انسان ہی ہر شے کا پیمانہ ہے" یعنی جسے

میں نیکی سمجھتا ہوں، وہی اصل نیکی ہے۔ چنانچہ سوفسطائیوں کے زیرِ اثر انسان کو نیچر کے حوالے سے سمجھنے کی بجائے نیچر کو انسان کے حوالے سے سمجھنے کا اصول رواج پایا۔ غورجیاس سوفسطائی کہا کرتا تھا کہ معروضی علم کا کوئی وجود نہیں اور نہ ہی اخلاق میں کوئی معروضی یا قطعی معیار ہو سکتا ہے۔ سقراط کے بعد پھر فلسفے پر معروضیت کا غلبہ رہا۔ پھر جان لاک نے موضوعیت کو سہارا دیا جب اس نے یہ کہا کہ کوئی ماورائی حقیقت موجود نہیں۔ انسان کی حسیات ہی علم کا واحد ذریعہ ہیں۔ اس طرح صداقت، خیر اور حسن کو محض اضافی قرار دیا گیا۔

موضوعیت ایک بار پھر شدید دھچکے کا شکار ہیگل کے نظامِ فلسفہ میں ہوئی، جہاں تصورِ مطلق کی حکمرانی تھی۔ ہیگل کے فلسفیانہ نظام میں موضوعیت کو جو صدمہ پہنچا، آسٹریا کے فلسفی کرکیگارڈ نے اس کو محسوس کیا اور اس نے وجودیت کے نام پر انسانی موضوعیت کا دفاع کیا۔ اختصار کی خاطر ہم معروضیت اور موضوعیت کی اس چشمک زنی پر زیادہ بات نہیں کر رہے۔ تاہم کوئی سی بھی تاریخِ فلسفہ دیکھنے سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ وجودیت کی اساس موضوعیت کا معروضیت کے خلاف یہی تاریخی مجادلہ ہے۔

وجودیت کے لئے دوسری جس چیز نے اساس فراہم کی وہ حد سے بڑھی ہوئی سائنس پرستی اور عقلیت پرستی ہے۔ میکانکیت اور مشینی زندگی نے بہت سے مسائل جنم دیئے ہیں۔ ان مسائل نے انسان میں ایک مخصوص بے چینی، کشیدگی، پژمردگی، تشویش، کھچاؤ اور دہشت کو جنم دیا ہے۔ سائنس نے اگرچہ کبھی انسان کے عمرانی، سیاسی اور اس کے ملی اور ذاتی تشخص کے مسائل کو حل کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ تاہم سائنس کی محیر العقول اختراعات کے سبب بہت سے بڑے بڑے معتقدات ٹوٹ کر بکھر گئے۔ چنانچہ عام طور پر یہ چاہا گیا کہ ان معتقدات کے ٹوٹنے کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ بھی سائنس ہی پُر کرے جو کہ سائنس کا کبھی دعویٰ نہیں تھا کہ وہ پورے کرے گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں سائنس نے واضح طور پر اپنے عجز کا اظہار کیا اور اس سے شدید مسائل پیدا ہوئے۔ وجودیت نے کسی حد تک انسان کے اس اندرونی خلا کو محسوس کیا۔ انسان کے اندر کا کھوج لگانے کی کوشش کی، تاہم وہ بھی محض انسان کو اس کے اندر کے خلا کا سراغ دینے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

تیسری جس چیز نے وجودیت کو ابھارا، وہ عالمگیر جنگوں کی ہولناک تباہی تھی۔ ان جنگوں نے شرفِ انسانی کے تمام تصورات باطل کر دیئے۔ وسیع پیمانے پر املاک اور انسانوں کی بربادی اور شرفِ انسانی کی پامالی نے انسان کے نیکی، شرافت اور مذہب کے معتقدات پر کاری ضرب لگائی اور انسانوں میں یہ سوچ پیدا کی کہ کیا کوئی ایسا رویّہ موجود ہے جو انسانوں کو آئندہ اس تباہی سے بچا سکے۔

چوتھے یورپ میں عیسائیت کا رفتارِ زمانہ کے ساتھ نہ چل سکنا اور کلیسا اور ریاست کی علیحدگی تھی۔ مذہب نجی بن گیا اور اجتماعی زندگی کو چلانے والا کوئی نظام اور نظریہ نہ رہا۔ عیسائیت تیزی سے تبدیل

ہوتی عالمی اور انسانی صورتِ حال کا ساتھ نہ دے سکی۔ عیسائیت اجتہاد اور حالات اور ضرورت کے تحت اپنے اندر وسعت پذیری کی صلاحیت سے محروم تھی۔ چنانچہ عیسائیت کی تنگ دامنی کی وجہ سے اس کی قدامت پرستی اور منجمد حیثیت کی بنا پر اسے ریاست کی سربراہی کے منصب سے ہٹا دیا گیا۔ عیسائیت کی اس منصب سے معزولی کے بعد کوئی ایسا نظریہ یا تصوّر نہیں تھا جو کہ تیزی سے ترقی کرتی ہوئی یورپی ریاستوں کے لئے رہنمائی اور وژن سے معمور ہو۔ چنانچہ اس کمی نے انسان کو خلا میں معلق کر دیا، جس کے نتیجے میں اشتراکیت اور وجودیت جیسی تحریکیں اس کمی کو پورا کرنے کے لئے منظرِ عام پر آئیں۔

وجودیت کے بارے میں مختصر طور پر ان معروضات سے کچھ کچھ مفہوم واضح ہو گیا ہو گا۔ وجودیت کی کوئی جامع تعریف ممکن نہیں، تاہم وجودیت سے مراد ایک ایسا فلسفیانہ رویّہ ہے جو ہر طرح کے تجریدی منطقی و سائنسی فلسفہ کی نفی کر کے فلسفہ کو فرد کی زندگی، تجربے اور اس تاریخی اور عمرانی صورتِ حال سے گہرے طور پر مربوط کرتا ہے، جس میں کہ کوئی فرد موجود ہوتا ہے۔ وجودیت فلسفہ کو مباحث سے ماورا ایک طرزِ زندگی قرار دیتی ہے۔ وجودیت عقل کی مطلقیت سے منکر ہے۔ وجودیت میں علم کی اساس معروضی معطیہ نہیں، بلکہ کسی وجود کا اپنا حقیقی اور ذاتی تجربہ ہے۔ وجودیت فرد کی بے مثل انفرادیت پر اصرار کرتی ہے اور فلسفہ کو فرد کی زندگی، تجربے اور ذاتی علم سے منسلک کرتی ہے۔ فطرت اور طبعی دنیا سے کہیں بڑھ کر وجودیت انسانی وجود کو اہم اساسی اور مرکزی حیثیت دیتی ہے۔ وجودیت کے نزدیک اشیاء کے حوالے سے انسان کو نہیں، بلکہ انسان کے حوالے سے اشیاء کو دیکھنا چاہئے۔ انسانی تجربہ کی قطعیت ہی وجودیت کا بنیادی ستون ہے۔ چنانچہ انسان کے وجود کے چند بنیادی اظہارات جو وہ مختلف حالتوں میں کرتا ہے، وجودیت کے لئے نہایت اہم ہیں۔ لغویت، ناسیا، خوف، تشویش اور دہشت وغیرہ جو کہ انسان کی مطلق فطرت اور کائنات کے تعلق کے بارے میں سوالات پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سی اے قادر وجودیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وجودیت کا فلسفہ تنہائی اور بیگانگی یا غیریت کا فلسفہ ہے۔ یہ اس دور کی پیداوار ہے، جب انسان اپنی تمام اقدار کھو بیٹھتا ہے، مذہب سے مایوس ہو چکتا ہے اور اسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ یہ دور یورپ میں عالمی جنگوں سے پیدا ہوا۔ انسان وحشیوں اور درندوں کی طرح لڑا۔ ہر قدر کو ٹھکرا دیا گیا۔ نہ اخلاق کا پاس رہا، نہ مذہب کا۔ جنگوں نے اخلاق اور مذہب دونوں کو تباہ کر دیا۔ نوجوانوں کو احساس ہوا کہ ماضی کا اخلاق ان کے مسائل کو حل نہیں کر سکتا اور مذہب کی طفل تسلیاں ان کی بے چینی کو دور نہیں کر سکتیں۔ اگر پرانی اقدار ختم ہو چکی ہیں، مذہب بھی ناکارہ ہو چکا ہے اور فلسفہ دور از قیاس باتوں کا مجموعہ بن گیا ہے تو انسانی درد کا مداوا کیا ہے؟ اس سوال

کا جواب وجودیت نے پیش کیا۔" [1]

پروفیسر بختیار حسین صدیقی فلسفۂ وجودیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"وجودیت وہ طرزِ فکر ہے، جو انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی ترکیب کے ذہنی اور عقلی پہلوؤں کی بجائے جذبی پہلو پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ عقل تجربہ اور کلیت کے چکر میں پھنس کر دور ہی سے حقیقت کو ہاتھ لگا کر نکل جاتی ہے۔ لیکن جذبہ وجود کے اندر گھس کر ہیں دل کی گہرائیوں کا پتہ دیتا ہے۔ بعض جذبی کیفیات تو ایسی ہوتی ہیں جن کی حیثیت نفسیاتی کم اور وجودی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ ان مسائل پر روشنی ڈالتی ہے جن کا تعلق براہِ راست انسان کی اصل حقیقت اور اس کی منزلِ مقصود سے ہوتا ہے"۔ [2]

وجودیت کے بارے میں پروفیسر خواجہ غلام صادق نے ایک حقیقی صورت حال پیش کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"عدمیت کی جانب میلان کے باوصف وجودیت کا دامن وژن سے بھرپور ہے۔ جب کوئی وجودی اذیت، کرب، دہشت اور انسانی وجود کی ناگہانیت پر اصرار کرتا ہے تو اصل میں وہ ہماری توجہ انسانی صورت حال کی چند از بس اثر آفریں صداقتوں کی جانب منعطف کراتا ہے۔ وجود مصدقہ پر اس کا اصرار فرد کی اپنی تقدیر کا مالک ہونے کی حیثیت کو بحال کرنے کی تگ و دو ہے۔ وجودی دانشور انسان کو رواجوں اور روایتوں کی زنجیروں سے نجات دلانا چاہتا ہے"۔ [3]

بایں ہمہ وجودیت کی کوئی لگی بندھی تعریف ممکن نہیں۔ کچھ کے نزدیک تو وجودیت فلسفہ ہی نہیں بلکہ روایتی اندازِ فکر کے خلاف مختلف بغاوتوں کا عنوان ہے۔ خود ژاں پال سارتر اس بات کا شاکی رہا کہ لفظ وجودیت کا اتنا غیر محتاط استعمال ہوا ہے کہ اب یہ لفظ ہی مہمل ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی لئے وہ خود کو وجودی کہنے سے ہمیشہ احتراز کرتا رہا۔

ژاں پال سارتر نے اپنے پہلے ناول ناسیا میں ایک کردار جو کہ اہلِ قلم ہے، کے حوالے سے اپنے دور کی مخصوص روح یعنی لغویت کا احساس دلایا۔ اس کے ناول کا ہیرو دنیا کی لغویت میں معنی تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے اور اس کی لغویت اور بے معنویت کے احساس سے اسے متلی ہوتی ہے۔ یہ امتلاہی اسے اس کی زندگی کا سراغ دیتا ہے اور وہ اس حقیقت سے شادکام ہوتا ہے کہ کسی ایسے کام سے خود کو

---

[1] قادر، ڈاکٹر سی۔اے۔ مجلّہ اقبال لاہور جلد ۱۲، شمارہ ۴ ص ۲۷۔ مطبوعہ بزمِ اقبال۔

[2] صدیقی، بختیار حسین۔ مجلہ راوی جلد ۶۱ شمارہ ۲ ص ۷، طابع گورنمنٹ کالج لاہور۔

[3] غلام صادق، پروفیسر خواجہ "وجودیت" مصنف قاضی جاوید، کا تعارف شائع کردہ میری لائبریری لاہور صفحہ ۸

مکلف کرنا جس کا انتخاب اس نے آزادانہ طور پر خود کیا ہو، ایسی وابستگی پیدا کرتا ہے جس سے کہ لغویت کی جگہ معنی جنم لیتے ہیں۔ اسی طرح سارتر نے اپنے ناول "آزادی کی راہیں" میں دہشت، خوف اور بے چینی کی اس کیفیت کا ذکر کیا ہے جو کہ دو عظیم جنگوں کے دوران اور بعد میں ایک انسان کا مقدر انفرادی اور اجتماعی طور پر بنیں۔ قیدیوں کی مزاحمت، ظلم کی برداشت اور اپنی آزادی کے انتخاب میں زبردست مزاحمت اور اس کی حفاظت میں سب کچھ ہار جانا، اس کا مرکزی نقطۂ فکر ہے۔ یہی چیز اس کے افسانے "دیوار" میں بھی موجود ہے۔ سارتر نے اپنی کئی تمثیلوں، جن میں نواگزٹ فلائیز اور آلتونا بھی شامل ہیں، میں بتایا ہے کہ کوئی وجودیاتی موضوع لازماً تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے اور تنہائی ہی کی حالت میں اسے اپنے لئے راہِ عمل منتخب کرنا پڑتی ہے۔

"عدم و وجود" سارتر کی فلسفیانہ کتابوں میں سب سے اہم ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سارتر اپنے دو پیش رو فلاسفہ ہائیڈگر اور ہسرل کے افکار سے شدید طور پر متاثر ہوا۔ ہسرل کی ظواہر پسندی پر سارتر نے اپنی مابعد الطبیعیات کی تشکیل کی۔ اس کے نزدیک وہ چیز بحث کے قابل ہے جو کہ ہے۔ چاہیئے سے سارتر کو قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی۔ اس کی فلسفیانہ جستجو صرف ظواہر تک محدود تھی۔ سارتر کے نزدیک تمام شعور ارادی ہوتا ہے اور شعور کسی نہ کسی شے سے وابستہ ہوتا ہے۔ کانٹ اور ہیگل کی طرح حقیقت نفس الامر سارتر کے نزدیک کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ ڈیکارٹ کا قول "اندیشم پس ہستم" یا "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں" سارتر کے نزدیک بھی ہائیڈگر کی طرح غلط تھا۔ وہ بھی ہائیڈگر کی طرح سمجھتا تھا کہ ڈیکارٹ نے گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوت دیا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی وجود نہ ہوگا، سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ڈیکارٹ کا مقولہ یوں ہونا چاہیئے تھا کہ ہستم پس اندیشم۔ یعنی میں ہوں اس لئے سوچتا ہوں۔

سارتر کے نزدیک شعور کا مطلب "موجود واقعہ" ہے۔ روح و مادہ، غیب و شہود اور جبر و قدر کی روایتی ثنویت اس کے نزدیک بے معنی ہے۔ تاہم سارتر نے ایک نئی ثنویت، شے اور شعور کی اپنائی۔ اور اس کی یہ ثنویت روایتی تصوریت کی ثنویت کی طرح ہی ہے۔ یوں سارتر بنیادی طور پر تصوری فلسفی ہے۔ سارتر کے نزدیک شعور کسی شے کا شعور ہے۔ شعور اور معروض شعور ایک نہیں۔ شعور اور خارجی اشیاء دونوں امر واقعہ ہیں۔ تاہم شعور اپنے وجود کے لئے خارجی اشیاء کا مرہونِ منت ہے۔ تمام اشیاء سے علیحدہ والگ تھلگ شعور ناقابلِ فہم ہے۔ اس لئے شعور ہمیشہ کسی شے کا شعور ہوتا ہے۔ شعور کے ہر عمل میں انسان خارجی معروض کے ساتھ ساتھ خود شناسی سے بھی شادکام ہوتا ہے۔ یوں شعور ہر لمحہ "میں" اور "دنیا" دونوں کے معانی کی تخلیق کرتا ہے۔ چنانچہ سارتر کے نزدیک معنی انسان کے وجود ہی سے جنم لیتے ہیں۔ اور معروضی دنیا یا انسان سے باہر کی دنیا کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔ وہ بے معنی اور لغو ہوتی ہے

تمام خارجی اشیا مجہول محض ہیں۔ اس طرح اگر کسی چیز کے بارے میں تمام تشریحات اور بیانات موقوف ہو جائیں یا ختم کر دیے جائیں تو وہ جو کچھ باقی ہو گا وہ شے ہو گی۔ یوں وجود بذاتِ خود اور وجود برائے خود ہی وجود کے دو انداز باقی رہ جائیں گے۔ شعور ان دونوں پہلوؤں کے مابین حائل چیز ہو گی۔ شعور فاصلے اور نفی کا ہی نام ہے جو وجود بذاتِ خود اور وجود برائے خود کے مابین عدم تعلق کا باعث ہے۔ سارتر اس حالت کو لاشیئیت کہتا ہے۔ شعور لاشیئیت کے اخفا سے جنم لیتا ہے۔ لاشیئیت شعور کی اتھاہ گہرائیوں میں موجود ہے۔ لیکن شعور اسے مخفی رکھتا ہے اور اسے غیر واضح سے ممیز کرتا ہے۔ اس طرح انسان ایک ایسا وجود ہے جس کے حوالے سے لاشیئیت دنیا میں وارد ہوتی ہے۔ شعور اشیا سے علیحدہ ہو کر اپنی ساخت کو نہیں پاتا بلکہ وہ ہر لمحہ اپنی تشکیل میں مصروف رہتا ہے اور اسے مفہوم سے نوازتا ہے۔ اسی وجہ سے انسان کائنات میں موجود دوسری اشیا سے مختلف ایک وجود ہے۔ نہ اس کی فطرت کسی مقرر کردہ رخ پر متعین ہوتی ہے اور نہ اس کی جملہ صفات کو گنا جا سکتا ہے۔ بلکہ وہ لاشیئیت کے طور پہ موجود اپنی تقدیر کا خود خالق اور اپنی اقدارِ حیات کا خود تعین کرنے والا ہے۔ اسی لئے سارتر انسان کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کا وجود اس کے جوہر پہ مقدم ہے۔

سارتر کے نزدیک مجرد وجود کچھ نہیں ہوتا، بلکہ وجود شعور اور شے، جس پہ کہ شعوری عمل ہوتا ہے، پر مبنی ہے۔ تاہم شے محسوس اور ٹھوس ہے، جسے کہ دیکھا اور چھوا جا سکتا ہے۔ جبکہ شعور کا بالواسطہ ادراک ہی ممکن ہے اور اس کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ تاہم شعور اور شے کی موجودگی کی حیثیت میں فرق ہوتا ہے۔ شعور اور شے کو عدم جدا کرتا ہے۔ سارتر کہتا ہے کہ "انسان وہ نہیں ہے جو وہ ہے۔ کیونکہ وہ حال میں موجود ہونے کے باعث ماضی سے ماورا ہو جاتا ہے اور انسان وہ ہے جو وہ نہیں ہے کیونکہ اس کے سامنے مستقبل کے بالقوہ ممکنات ہیں جو کہ حال میں نہیں ہیں۔ اس طرح خالص موجودگی کالعدم ہو جائے گی اور صرف ماضی اور مستقبل کے حوالے سے اس میں معنی پیدا ہو گا۔ لہٰذا انسانی فطرت کالعدم ہے۔ صرف انسانی صورتِ احوال موجود ہے۔ لیکن دنیا میں کوئی شے تو ہونا چاہیئے جو عدم کو وجود میں قائم و بحال رکھنے کے قابل ہو۔ شعور ہی وہ شے ہے۔ اس سے وہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ "انسان وہ وجود ہے جس کے ساتھ عدم اس دنیا میں آیا۔" سارتر کہتا ہے کہ انسانی موجودگی ایک ایسی کائنات میں لغو اور بے معنی ہے جو اس سے قطعی بے خبر ہے۔ اپنے آپ کو معنویت عطا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ عدم سے کامل آزادی کا اقدام کیا جائے۔ چنانچہ انسان کی آزادی اس کی ذات کے عدم ہی سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ آخری اور قطعی آزادی جسے انسان سے چھینا نہیں جا سکتا "نہ کہنے کی آزادی۔[1] عدم کا تصور سارتر کے ہاں ہائیڈگر سے آیا۔ انسان کے وجود میں عدم کو وجودِ مطلق تسلیم کرنے سے

---

[1] جلالپوری، علی عباس۔ روایاتِ فلسفہ، المثال، صفحہ ۱۸۵

سارتر کی تمام فلسفیانہ مابعد الطبیعیات منفی ہو گئی۔ جب ہائیڈگر کے ماورائی عدم کو وہ خود انسان کے شعور ذات سے وابستہ کر دیتا ہے۔ سارتر کے نزدیک ہر باشعور انسان کا اپنا الگ اور منفرد عدم ہے۔ تاہم سارتر کی منفی آزادی یعنی صرف نہ کہنے کی آزادی میں اثبات نہ ہونے سے وہ کوئی مطلق نظام بندی یا مثبت مابعد الطبیعیات وجود میں نہیں لا سکا اور اسی قنوطیت کی وجہ سے سارتر زندگی کو چپکنے والی غلاظت کہتا ہے جو کہ بہتے بہتے جم گئی ہو۔

سارتر کے اس تصور کو کہ انسان کا وجود اس کے جوہر پہ مقدم ہے، ایک مثال میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ قلم جب بنایا جاتا ہے تو اس کا ناک نقشہ اور مقصد ہمارے ذہن میں ہوتا ہے اور پھر قلم کے تصور کے تحت جو در اصل قلم کا جوہر ہے کسی وجود کو ڈھالا جاتا ہے۔ چنانچہ جوہر پہلے ہوتا ہے جس کو کہ سامنے رکھ کر کسی وجود کو قلم کا روپ دیا جاتا ہے۔ یوں جوہر وجود پہ مقدم ہو جاتا ہے۔ مگر انسان کا کیا بنے گا وہ کیا کرے گا۔ بڑا ہو کر اس کے ارادے اور مقاصد کیا ہوں گے۔ انسان کے وجود پاتے وقت کسی کے علم میں نہیں ہوتے۔ انسان کی صورت میں وجود جو کہ جنم لیتا ہے، اس جوہر پہ جو کہ وہ مستقبل میں بنتا ہے، مقدم ہے۔ تاہم ایسا دہری وجودیت میں ہی ممکن ہے۔ جس کا کہ سارتر سب سے زیادہ قد آور فلسفی تھا۔ دینی وجودیت جو کہ کرکیگارڈ نے پیش کی اس میں تو انسان کا جوہر خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، سارتر کہتا ہے کہ دہری وجودیت جس کا کہ وہ نمائندہ ہے، میں خدا اگر موجود نہیں ہے تو کم از کم ایسی ہستی ضرور موجود ہے جس کا وجود اس کے جوہر پہ مقدم ہے جو اپنے عقلی تصور سے قبل موجود ہوتی ہے۔ سارتر اس ہستی کو انسان کہتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کچھ نہیں سوا اس کے جو کچھ وہ اپنے آپ کو بناتا ہے یہ اس کی وجودیت کا بنیادی اصول ہے۔ سارتر کا یہ تصور الحاد پہ مبنی ہے۔ یہاں سے وہ انسان کی بے کراں آزادی و خود مختاری کا جواز لاتا ہے۔ جب انسان کسی خارجی معروض یعنی خدا کی محافظت کے احساس سے محروم ہو جاتا ہے اور آزادی کے برتنے میں محض اپنی ذات میں ہی محصور ہو جاتا ہے اور انتخاب کی کلیتاً ذمہ داری اسے ہی قبول کرنا پڑتی ہے۔ تو اس پہ مایوسی وارد ہوتی ہے۔ لیکن متلی کی طرح یہ مایوسی بھی اس کی اندرونی آزادی کے تجربے پہ دلالت کرتی ہے۔

سارتر پہ یہاں دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کا جوہر اس کے وجود پہ یوں مقدم ہے کہ وجود انسانی کے جینس GENES میں خود اس بات کے جوہر پوشیدہ ہوتے ہیں کہ فلاں وجود کیا بنے گا۔ یہ جینس طبعی اور حیاتیاتی بھی ہوتے ہیں اور ثقافتی اور عمرانی بھی جو انفرادی اور اجتماعی طور پر کسی وجود کے خون اور ثقافتی اور عمرانی پس منظر میں وراثتاً داخل ہوتے ہیں۔ اس لئے بہت بڑی حد تک ان حیاتیاتی جینس اور ثقافتی، عمرانی اور خاندانی پس منظر کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی فرد یا وجود کا ارتقا جوہر کس طرح تشکیل پذیر ہوگا۔ یوں کسی وجود کے خواص سے اس کے جوہر کا تقرر ہو سکتا ہے۔

دوسرا سارتر پر اعتراض یہ ہے کہ جس بے کراں آزادی کا سارتر نے انسان کو سزاوار قرار دیا ہے، وہ صرف خدا ہی کو سزاوار ہے۔ مطلق آزادی انسان کے پاس موجود نہیں۔ مطلق آزادی تو محض خدا کے پاس موجود ہے۔ دراصل جب سارتر کی وجودیت خدا کے وجود اور تصور سے تہی ہوئی تو اسے مطلق آزادی کے ایک منبع کی ضرورت محسوس ہوئی اور سارتر نے اس مطلق آزادی کا مکلف بھی انسان کو گردانا۔ حالانکہ انسان کے پاس بہت محدود سی آزادی ہے جو کہ وہ اپنے عہد کے ثقافتی، عمرانی، سیاسی، جغرافیائی، معاشی اور نفسیاتی ماحول کے زیرِ اثر اور تابع ہی استعمال میں لانے پر مکلف ہے۔ مطلق آزادی جس کا تصور سارتر نے دیا نہ تو انسان کو حاصل ہے اور نہ اس مطلق آزادی کا کوئی استعمال کسی انسان کے حوالے سے کبھی کہنے اور سننے میں آیا ہے۔ انسان کو مطلق آزادی کا سزاوار کہنا محض سارتر کے اپنے فلسفیانہ نظام سے خدا کو خارج کر دینے کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ سارتر نے خود انسان کی آزادی کے تصور کے بارے میں بھی کسی قدر غلو سے نہیں تو خوش فہمی سے کام ضرور لیا ہے۔ سارتر نے اپنے فلسفے کو "ملحدانہ انسان پسندی" کا فلسفہ کہا۔ وہ خدا کے وجود کا محض اس لئے منکر رہا کہ اگر خدا کو تسلیم کر لیا جائے تو انسان فاعل مختار نہیں رہتا۔ اس کا خیال تھا کہ یا تو انسان فاعل مختار ہے اور خدا کا محتاج نہیں ہے اور یا وہ خدا کا محتاج ہے اور مجبور رہے۔ وہ پہلی بات کا قائل تھا۔ وہ ایک ایسی آزادی کا قائل نہیں تھا جو کہ خدا کی طرف سے امانتاً انسان کو دی گئی ہو۔ پھر کائنات میں موجود اور کائنات سے ماوراء خدا بھی سارتر کو قبول نہ تھا۔ تیسرے اگر سارتر خدا کو تسلیم کرتا تو اسے معروضی اخلاقی اقدار کو بھی تسلیم کرنا پڑتا اور اس کا موضوعی اقدار اور انسان خود اپنی اخلاقی قدروں کا خالق ہے کا یہ تصور قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ سارتر کے نظامِ فکر میں چونکہ معروضی ازلی اور ابدی صداقتوں کے کسی نظام کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا وہ ازلی اور ابدی اقدار کے کسی منبع کے وجود کو تسلیم کرنے سے بھی عمر بھر گریزاں رہا۔ یوں سارتر کائنات میں کسی معنی اور ترتیب کی موجودگی کا بھی منکر رہا۔ اسے کائنات میں کسی قسم کا توافق نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ توافق اور کائنات میں نظم خود انسان کے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔

سارتر کی اسی مطلق انسانی آزادی کی مابعد الطبیعیات سے اس کا نظریۂ اخلاقیات منسلک ہے۔ "نہ" کہنے کی آزادی سے جنم لینے والی منفی مابعد الطبیعیات کی اخلاقیات آزادی کے مثبت تصور سے محروم ہونے کی بنا پر کسی نظام اقدار کو تشکیل دینے میں ناکام رہی۔ گرچہ سارتر نے اپنی کتاب (ETHICS OF AMBIGIVITY) میں اپنی اخلاقیات کی اساس کامل آزادی کے تصور پر رکھی۔ اس کتاب میں اس نے واضح طور پر کہا کہ "میری آزادی ہی قدروں کی واحد بنیاد ہے۔ چونکہ میں ایسا وجود ہوں جس کے باعث قدریں موجود ہیں لہٰذا اس بات کا کوئی جواز نہیں ہے کہ میں ایک نظامِ اقدار کو اپناؤں یا دوسرے سے واسطہ رکھوں۔ قدروں کی موجودگی کی واحد اساس ہونے کی بناء پر میرا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے اور میری

آزادی معلوم کرکے آزادی سے دوچار ہوتی ہے کہ یہ قدروں کی ایک ایسی بنیاد ہے جس کی اپنی کوئی بنیاد نہیں۔" یہ مطلق آزادی جو سارتر چاہتا ہے، ایک معاشرتی اور عمرانی ڈھانچے میں ممکن نہیں ہے۔ مطلق آزادی انسان کے لئے خود دبال جان بن سکتی ہے۔ انسان کے لئے ایک معاشرتی حیوان ہونے کے حوالے سے وہ محض ایک ایسی آزادی کا ہی سزاوار ہو سکتا ہے جو کہ اسے معاشرتی زندگی گزارنے اور دوسرے انسانوں کی زندگی کے حسن کو مجروح کرنے کے مواقع فراہم کرے۔ اور یہ وہ آزادی ہے جس کے استعمال اور انتخاب سے کرب کی کیفیت کی شدت کم ہوتی ہے اور سارتر کے بقول انسان پر تھوپی گئی آزادی یا انسان کے کندھوں پر آزادی کی صلیب کے رکھنے کے احساس کی شدت میں کمی واقع ہوتی ہے بلکہ اس آزادی کے استعمال سے انسان کی روح مفرح ہوتی ہے جس کا کہ سارتر تصور بھی نہ رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ تو ہر انتخاب کے وقت محض کرب سے دوچار ہونے کا ہی قائل تھا۔

سارتر کہتا ہے کہ اگر وجود بذاتِ خود اور وجود برائے خود کے تصورات کو لامتناہی تک بڑھایا جائے تو خدا کا تصور وجود پاتا ہے۔ مذہب شعور و معروض کی عینیت کو خدا کی صفت سے موسوم کرتا ہے۔ سارتر کے نزدیک یہ عینیت شعور کی قاطع ہے۔ اس طرح خدا کا تصور منطق کی اصطلاح میں تناقض بالذات ہے۔ سارتر کے نزدیک :-

"وجودیت ایک لایعنی صورت حال سے مکمل نتائج اخذ کرنے کی محض ایک بسیط کوشش ہے۔"

سارتر انیسویں صدی کے فرانسیسی دانشوروں کے اس قول کو قبول نہیں کرتا کہ معاشرہ کے لئے لازم ہے کہ قبل تجربی وجود سے متصف اقدار کو اپنایا جائے۔ کیونکہ لادینی صورتِ حال کو قبول کرنے کے ساتھ ہی ماورائیت سے اقدار قبول کرنے کا سوال از خود لغو ہے۔ وہ سوفسطائیوں کی طرح سمجھتا ہے کہ انسان ہی تمام اشیاء کا ذمہ دار ہے اور مطلق آزاد ہونے کی وجہ سے تمام جمالیاتی، اخلاقی اور عمرانی اقدار کا خود خالق ہے۔ انسان کی آزادی کوئی چیز محدود نہیں کر سکتی۔

سارتر موت کو ایک خارجی حد تصور کرتا ہے جو انسان کی آزادی کی تحدید نہیں کرتی۔ آزادی کے اس شعور و ابلاغ سے سارتر کے نزدیک دہشت پیدا ہوتی ہے۔ دہشت اس لاشیئیت سے جنم لیتی ہے جو انسان کے جوہر اور اس کے انتخاب کے مابین حائل ہے۔ دہشت میں آزادی پنہاں ہے۔ سارتر کے نزدیک دہشت موضوعی ہوتی ہے جبکہ خوف کسی خارجی معروض سے جنم لیتا ہے۔ انسان پر یہ آزادی مسلط ہوتی ہے۔ انسان ہر لحظہ اس سے فرار کی کوشش کرتا ہے کیونکہ آزادی اور انتخاب اور ذمہ داری اس کے لئے اذیت کا باعث ہے۔

آزادی کی اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے انسان مذہب، اخلاق اور معاشرتی ضوابط

اقدار کے ہیولے تراشتا ہے اور یوں آزادیٔ انتخاب سے بچنے کے لئے وہ ان خولوں میں بند ہو جاتا ہے جس طرح کہ ریشم کا کیڑا خود اپنے گرد ریشمی خول بُن لیتا ہے اور بالآخر اس میں دب کر مر جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی آزادی کی اذیت سے بچنے کے لئے ان خولوں میں محصور رہنا پسند کرتا ہے اور یہی خول اس کو مار دیتے ہیں۔

ایسا شخص سارتر کے نزدیک وجود غیر مصدقہ ہے۔ حکیم دیو جانس کلبی اسی فرد غیر مصدقہ کو دام و دد سے موسوم کرتا ہے، جو کہ نفسانی خواہشات کے جنگل کے درندے اور چرندے ہیں۔ دن کے وقت چراغ لے کر جس شخص کی تلاش میں حکیم دیو جانس کلبی نکلتا ہے وہ ایسا شخص ہے جو کہ اپنی آزادی کا درست استعمال کرتا ہے اور اس کی ذمہ داری کو بھی قبول کرتا ہے۔ وہ وجود مصدقہ یا فرد مصدقہ سارتر کے نزدیک حقیقی انسان ہے جو کہ آزادی کے درست استعمال سے بہرہ ور ہے۔ سارتر کے نزدیک ذمہ داری اور آزادیٔ انتخاب سے پہلو تہی کی کوشش بداعتقادی (BAD -FAITH) ہے۔ وہ کسی کو فریب نہیں دیتا صرف اپنی ذات کو ہی سراب کی کیفیت سے دوچار رکھتا ہے۔ کوئی نہ کوئی تجربہ اسے لاشیئیت (NOTHINGNOSS) کی اس حالت میں لے آتا ہے اور آزادی سے پہلو تہی کرنے کا عمل دم توڑ دیتا ہے۔ آزاد رہنا انسان کی ایک ایسی مجبوری ہے جس سے نجات ممکن نہیں۔ سارتر کے نزدیک یہ آزادی ہم پر زبردستی ٹھوپ دی گئی ہے۔ جب فرد کو معروضات گھیر لیتے ہیں اور انسان کی آزادی کو مسدود کرتے ہیں کو فرد کو ایک شدید کراہت محسوس ہوتی ہے۔

سارتر کے نزدیک انسانوں کے لئے اجتماعی مقاصد اور ذرائع کا تعین انسانوں کی اجتماعی فطرت سے وابستہ ہے۔ اجتماعیت کے اس تصور کے تحت سارتر نے اشتراکیت سے وابستگی کا جواز پیدا کیا۔ لیکن سارتر کی اشتراکیت مارکس کی اشتراکیت سے بہت مختلف تھی۔ سارتر کے نزدیک اشتراکیت کا مقصد انسانی فلاح کے حصول کے لئے انسانوں کے آپس کے اجتماعی مقاصد اور اجتماعی ذرائع کو روبہ عمل لانا ہے۔ جبکہ مارکس طبقاتی جدوجہد کے حوالے سے ایک طبقہ یعنی پرولتاریہ کی آمریت کے ذریعے عدم طبقاتی سماج کی تخلیق کر کے انسانی فلاح کی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے۔ مارکسی وجودی فلسفہ کو بورژوا روایت پسندی کے بحران کا شاخسانہ تصور کرتے ہیں۔

شروع میں سارتر کارل مارکس سے متاثر ہوا۔ اس لئے کہ سارتر بھی استحصال سے پاک اور انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ وجودیت کے بل پر وہ کوئی ایسا معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا اس نے اشتمالیت کو بنی نوع انسان کے مصائب کے حل کے طور پر قبول کر لیا۔ اس نے مارکسیوں کے تاریخی مادیت کے نظریہ کے علاوہ بھی ان کے متعدد نظریات کو قبول کیا اور بورژوا معاشرے پر کڑی تنقید کی۔ مگر مارکسیوں کی معروضیت پسندی اور وجودیت کی موضوعیت میں صلح جوئی ممکن نہ تھی۔

اور نہ مارکسی انسان کو مختار فاعل اور اس کی مطلق آزادی کو قبول کر سکتے تھے۔ تاریخی مادیت کا جبر تو کیا سارتر کسی بھی قسم کے جبر کا قائل نہ تھا۔ مارکس موضوع پر معروض کو اور سارتر معروض پر موضوع کو مقدم سمجھتا ہے۔ یہی ان کے مابین بنیادی اختلاف ہے۔ سارتر کی مارکسیت سے نفرت اور عدم دلچسپی کی وجہ کا پیدا ہونا اس کی دونوں میں تطابق پیدا کرنے میں ناکامی کا نتیجہ تھا۔ مارکس اپنے فلسفے کا آغاز حیاتیاتی اور عمرانی عناصر سے کرتا ہے، جبکہ سارتر فرد کے ذاتی شعور اور تجربے سے اپنی جستجو کرتا ہے۔ وہ فرد کی مطلق آزادی بحال رکھنا چاہتا ہے۔ سارتر کے سامنے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ مارکسی فلسفے میں جو کہ مادی ماحول میں فرد کی تشریح کرتا ہے اور وجودیت میں جو فرد کے حقیقی تجربے کو مقدم گردانتی ہے، کس طرح تطبیق قائم کرے۔ دراصل سارتر بورژوا قدریں رد کر کے خود اپنی قدریں تخلیق کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایسا نہ کر سکنے کی وجہ سے اس نے مارکسیت کا سہارا لیا۔ مگر جب اس نے مارکسیت اور وجودیت میں تناقض بالذات دیکھا تو اس نے مارکسیت سے بھی منہ موڑ لیا۔ خود مارکسیوں نے بھی وجودیت پر اعتراضات کئے جو کہ وجودیت یا سارتر کی طرف مارکسیت کے جوابی حملے تھے۔ انہوں نے وجودیت کو بورژوا سماج کی آخری ہچکی قرار دیا۔ بعض لوگ سارتر کی کتاب "تنقید عقل جدلیاتی" کو سارتر کی مارکسیت کی طرف مراجعت قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ سارتر نے مارکس ازم کو ایک مکمل فلسفہ اور وجودیت کو محض نظام افکار کہا ہے۔ تاہم اس کے باوجود بھی سارتر مارکسیت کو مکمل طور پر خود سے ہم آہنگ نہ کر سکا۔ اس کی وجہ وہ بنیادی تضاد ہے جس کی طرف کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔

سارتر کہتا ہے کہ دنیا کی حالت کبھی بھی طبقاتی شعور پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوگی اور مارکس کے پیرو اچھی طرح یہ بات جانتے ہیں۔ اسی لئے وہ عوام کو ابھارنے اور ان میں شعور پیدا کرنے کے لئے محاربوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یعنی شعوری اور اجتماعی عمل پر سارتر مادیت کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان کے تو مقاصد ہوتے ہیں لیکن مادہ کے کوئی مقاصد نہیں ہوتے اور انسان کو انتخاب امکانات کا پورا اختیار حاصل ہے جبکہ مادہ اس سے محروم ہے۔ سارتر کی وجودیت اور مارکس کی اشتراکیت میں بنیادی فرق کی وضاحت قاضی جاوید نے اپنی کتاب وجودیت میں کی ہے۔

"مارکسیت انسان کی سماجی اور حیاتیاتی صورت حال کو اساسی معطیہ تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے اور شعور کو بالائی ڈھانچہ قرار دیتی ہے۔ اس کے برعکس سارتر نے ناسیا اور وجود ولاشیئیت میں شعور کو بنیادی معطیہ کے طور پر قبول کرتے ہوئے روایتی تصوریت سے کم و بیش ملتے جلتے نظریے کو نقطۂ آغاز بنایا ہے"[1]

اشتراکیت سے سارتر کی دلچسپی کی وجہ وجودیت کی ایک ایسے مکمل نظام حیات کو پیش کرنے میں ناکامی کے سبب تھی جو مذہب، سائنس اور عقل کے انہدام کے بعد انسان کے جملہ وجودیاتی مسائل

---

[1] جاوید، قاضی۔ وجودیت۔ مکتبہ میری لائبریری لاہور

حل کر سکتا۔ سارتر نے دراصل اشتراکیت کو قبول کر کے اپنے فلسفۂ وجودیت کے خلاؤں کو پُر کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر جب اس نے اشتراکیت کو خود انسان کی آزادی کے درپے پایا تو اس نے اسے بھی ہدفِ تنقید بنایا۔ مارکسیت کو عقیدے کی شکل دینے پر مارکس پر تنقید کرتے ہوئے سارتر نے کہا تھا کہ اشتراکیت کی ترقی اور ارتقار کی راہ اس کوشش نے روک دی ہے۔

بہر حال سارتر عصرِ حاضر کا ایک عظیم مفکر، ادیب، ڈرامہ نویس اور انسان دوست فلسفی تھا۔ اس کے متنوع اور متنازعہ افکار و نظریات نے ارسطو کے بعد عالمی ادب پر سب سے زیادہ اثرات مرتب کئے وہ دو جنگوں کے بعد پیدا ہونے والی عالمی صورتِ حال کا جراح تھا اور انسانوں کو جو کچھ ان جنگوں سے ملا اس کا تجزیہ نگار تھا۔ ان جنگوں نے پرانے سماجی، اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور ثقافتی ڈھانچوں کو جس طرح توڑ پھوڑ دیا تھا، سارتر نے اس کی منظر کشی کی۔ وہ موجودہ دور کے انسانوں کو وجودی صورتِ حال سے نکالنے کی سعی کرتا رہا اور اس میں ناکامی پر اس نے اپنی وجودیت کا رشتہ مناکحت اشتراکیت سے قائم کیا۔ مگر دونوں کے مراتب میں اساسی اختلاف سے یہ نبھ نہ سکا اور خود سارتر اس اشتراکیت کا نقاد بن گیا تاہم سارتر نے انسان کے عالمی جنگوں کے بعد وجود پذیر ہونے والے وجودی بحران کا سراغ لگانے اور اس کا ابلاغ ہمیں دینے میں جو کردار ادا کیا وہی اس کی عظمت کا ایک اچھوتا شاہکار ہے اور نسلِ انسانی اس کے لئے اس کی ممنون ہے۔ اب وہ چاہے تو سارتر کے تجزیوں اور افکار سے مدد لے کر اپنے لئے ایک نئی راہ نکال سکتی ہے۔

منیر نیازی ۔ خصوصی مطالعہ

منقش پہیہ

سہیل احمد

پال والیری نے اپنی ایک نظم میں شاعر کی کاوشوں کی تصویر دکھائی ہے نظم کچھ یوں ہے " اُسے شیشوں کے پار دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے نیلے ڈریسنگ گاؤن میں ہے۔ اس کا چہرہ اتنا تبدیل ہو سکنے والا ہے جتنا کہ موسم کبھی جوان اور کبھی بالکل بوڑھا۔

وہ اپنے کام میں مصروف ہے اور لوگ اس کو دیکھنے کے لیے پہروں رُکتے ہیں۔ کوئی اس کی طرف نفرت سے نہیں دیکھتا۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑا منقش چوبی پہیہ ہے ابھی اس سمت میں گھومتا ہوا اور ابھی دوسری سمت میں۔ کبھی اتنا تیز کہ چیزیں آنکھوں کے سامنے سے غائب ہونے لگیں اور کبھی بے حد آہستہ۔

یہ لفظوں کا پہیہ ہے اس کی آنکھیں اس کے سامنے دھرے ہوئے سفید کاغذ پر روشنی کی شعاعیں پھینکتی ہیں جن کی بدولت اس کا گردش کرتا ہوا کاغذ، جس میں پڑا ہوا قلم لفظوں کی تلاش میں مصروف رہیں، منور ہو جاتا ہے۔

اسے ہر کوئی دفتر سے اپنا سر ٹکراتے ہوئے دیکھ سکتا ہے

منیر نیازی کی شاعری کا گھومتا ہوا منقش پہیہ۔ کبھی تیزی سے گھومتا ہوا رنگوں کے پیچھے بدلتے ہوئے رنگ، منظروں کا تواتر۔ رکتے ہوئے منظر، رنگین دروازے نامعلوم کی وسعتوں کی طرف کھلتے ہوئے ہوش اڑتا جا رہا ہے۔ گرمئ رفتار سے منقش پہیہ اتنی تیزی سے گردش کرتا ہے کہ منظر، آوازیں خوشبوئیں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف یہی جب آہستگی سے گردش کرتا ہے تو ایک ایک منظر ایک ایک موسم ایک ایک شکل اتنی تاب ناک ہو کر سامنے آتی ہے کہ ہم اس کے سحر میں گم ہو جاتے ہیں مگر یہ تصویریں بھی تو محض تصویریں نہیں۔ منیر کی شعری تصویریں ہمہ گیر تہذیبی تجربوں سے معانی حاصل کر کے کچھ کی کچھ بن جاتی ہیں۔ اجڑتی ہوئی بستیاں، رستوں میں مرجانے والی امتیں، خالی شہر، چڑیلیں، جادوگرنیاں، بدروحیں، فصیلیں، آسیب زدہ مکان جن کے مکین انہیں چھوڑ گئے یہ سب چیزیں مل کر ایک بڑے اساطیری تجربے کا سا درجہ اختیار کر

لیتی ہیں۔ منیر کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد کا عکس بیان کرنے کے بجائے اس کے لئے قدیم صحیفوں، حکایتوں، نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی زبانی روایات۔ سے مماثلتیں ڈھونڈلی ہیں اور اس طرح اکہری حقیقت پسندی کی جگہ واردات اور تجربے کی کلیت" تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مختلف تجربے ایک بڑے پس منظر کا حصہ بھی ہوتے ہیں جب وہ آج کے شہروں کی کاروباری، مشینی زندگی کے لئے آسیب زدہ شہر کی تمثال استعمال کرتا ہے تو صورت حال اور زیادہ گھمبیر شکل میں سامنے آتی ہے۔ شاید اپنے جن رویّوں کو ہم نے زیادہ منفی نہ سمجھا ہو یا ان سے آنکھیں چرالی ہوں شاعر کے وجدان نے اُن کی امکانی بھیانک شکلوں کو پہلے ہی سے پہچان لیا ہو۔

بعض قدیم قبائل میں ایسے لوگ ہوتے تھے جن کا کام یہ تھا کہ اپنے وجود کی مستی میں اجداد کی روحوں، بھوتوں کے منطقوں سے پر اسرار رابطہ قائم کریں اور اپنے وجود کی مستی میں افلاک کے مختلف طبقوں کی سیاحت کریں انہیں "شامان" کا نام دیا جاتا ہے۔ شامان قبیلے کو آنے والی ممکنہ تباہی سے بھی آگاہ کرتا تھا اور علاج بھی کرتا تھا یوں تو یہ ایک طرح سے شاعری کا ایک اہم منصب ہے مگر جدید دور کے شعراء میں اس کا احساس کم کم ہی نظر آتا ہے۔ کیا منیر نیازی "شامان" کی کوئی نئی نسل ہے جو نامعلوم منطقوں کی پراسرار سیاحت کرکے انہیں ہمارے شعور کے لئے قابل قبول بنا رہا ہے۔ جو چھپی ہوئی وحشتوں، گنگ صداؤں کے درمیان ایک مہماتی سفر کرکے انسانی تجربوں کی بھید بھری سچائیاں ڈھونڈنے نکلا ہے۔ منیر نے اس مہم کو اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کیا ہے منیر مہم جو ہے اور وہ ہر وقت سفر کے لئے آمادہ رہتا ہے خواہ یہ سفر کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو خواہ مسافت افلاک کی طرف ہو یا پاتال کی طرف۔ منیر غواص بھی ہے اور خلانورد بھی، منیر کا یہ دو طرفہ سفر ہمیں تخیل کی وسعتوں سے بھی دوچار کرتا ہے اور جبلتوں اور حواس کی گہرائیوں سے بھی ــــ

اک مسافت پاؤں شل کرتی ہوئی سی خواب میں
اک سفر گہرا مسلسل زردیٔ مہتاب میں

ابھی مجھے اک دشتِ صدا کی ویرانی سے گزرنا ہے
ایک مسافت ختم ہوئی ہے ایک سفر ابھی کرنا ہے

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

کھڑا ہوں یوں کسی خالی قلعے کے صحن ویراں میں
کہ جیسے میں زینوں میں دفینے دیکھ لیتا ہوں

منیر نیازی کی شعری کائنات، تجسّس، اسرار اور حیاتی سفر کی شعری کائنات ہے اپنے بہت سے ہم عصروں کے برعکس، جن کی شاعری میں ہر چیز جانی بوجھی ہے کسی شے کے پیچھے گہرا بھید نہیں ہر چیز کی قطعی وضاحت کر دی گئی ہے۔ منیر کے ہاں ہر لحظہ کسی ان دیکھے منظر کسی انجانے بھید سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ منیر نے وحشتوں کے گنجان راستوں کے پار رنگ و نور کے جو خطے دریافت کئے ہیں وہ اس کی اسی مہم جوئی کا عطیہ ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ منیر کی شاعری کے بڑی مناظر بھید بھری سرحدوں اور پھیلتی ہوئی مکاشفاتی سمتوں نے ہمارے شعور اور احساس کے جغرافیے کو وسعت نہیں بخشی اور نئی اُردو شاعری کی حدود کو نہیں پھیلایا۔

منیر کی ہر نئی کتاب اس حقیقت کا نشان ہے کہ اس نے شاعرانہ حیرت کے شفاف آئینے کو دھندلا نہیں ہونے دیا۔ کائنات کی وسعتوں میں تنہا انسان کی یہ حیرت یہ معصومیت تخلیقی وجدان کی لازمی شرط ہے اور ہمارے بہت سے شاعروں میں شروع کے دنوں میں یہ خوشبو موجود ہوتی ہے مگر جلد ہی وہ کسی فلسفے یا کسی نظریے کے اسیر ہو جاتے ہیں ان چیزوں کی مدد سے بھی اچھی شاعری ممکن ہے مگر شعری جوہر کو قربان کر کے ایسا ممکن نہیں اگر شاعر اپنا حقیقی منصب ہی بھول جائے تو چاہے وہ معاشرے کے لئے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو شاعری کے دائرے میں اُسے کوئی اہم درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ڈانٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ازمنہ وسطیٰ کی عیسوی، رومی اور بعض دوسری تہذیبی روایات کی حکمت اور فلسفیانہ دانش کو اپنی شاعری میں کھپا دیا مگر ڈانٹے کی شاعری کا منظر نامہ، اس کا بیانیہ اس کی شاعری کی تمثالیں اور شبیہیں خود اتنے جاندار ہیں کہ فلسفہ یا نظریہ سطح پر تیرتا نظر نہیں آتا۔ یہ بڑے شاعر کی صناعانہ صلاحیتوں کا کمال ہے کہ وہ بڑے فلسفے یا بڑی حکمت کو بھی شاعری کے جوہر میں بھگو کر نیا رنگ دے دیتا ہے ورنہ عام سطح کے شاعر تو چھوٹے چھوٹے فلسفوں کو بھی شاعرانہ جوہر سے ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگر اس شاعری کو اپنے معاشرتی سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو اس میں پچھلے تیس سال کی بہت سی وارداتیں بھی نظر آئیں گی مگر عرفی وافعیت کے ذریعے نہیں۔ منیر کی شفاف معصومیت اس فضا میں بالکل انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ کھلتے ہوئے پھولوں، پھولوں سے چمٹی ہوئی تتلیوں، باغوں، سرسوں اور سبز گندم کے کھیتوں کو اوّلیں تجربوں کی طرح دیکھنے کی معصومیت، جس نے منیر کی شاعری کو گدلا نہیں ہونے دیا۔ منیر نے نعرے نہیں لگائے لیکن ظلم کے خلاف۔ بدصورتی کے خلاف، مسخ رویوں کے خلاف جیسی نفرت اس کے یہاں ہے اور حسن سے جس طرح کی مسلسل وابستگی اس کے یہاں ملتی ہے اس کو پڑھنے والا فوراً محسوس کر سکتا ہے۔ خیر

ڈانٹے کی مثال تو شاعر کے بعض بنیادی رویوں کو سمجھنے کے لئے آئی ہے منیر نے تو فلسفوں کی بجائے ہمیشہ براہ راست تمثالوں اور پیکروں سے ہی دلچسپی لی ہے۔

اب سے پندرہ سال پہلے جب میں اس شہر میں آیا تو مختلف ادبی حلقوں اور نقادوں سے منیر کی شاعری کے بارے میں بھانت بھانت کی بولیاں سنیں۔ کسی کے نزدیک منیر کی شاعری میں خوف کی کارفرمائی تھی۔ مجھے یہ چیز عجیب لگتی تھی کہ اکثر اعتراض کرنے والے ایسے تھے جو اپنے چھوٹے موٹے افسروں کے سامنے کانپنے لگتے تھے۔ اپنے سطحی خوف تو ان کے لئے وجود کی بقا کے لئے ضروری تھے مگر منیر کا کائنات کی وسعتوں اور نامعلوم کی پہنائیوں کے سامنے کھڑے انسان کا تجربہ ان کے لئے بے معنی تھا کچھ نقادوں کو منیر معاشرتی شعور سے عاری نظر آتا تھا کچھ کو اس کی شاعری حقیقت سے ماورا معلوم ہوتی تھی کیونکہ منیر کا حقیقت کے بیان کا طریقہ مختلف تھا کچھ کو اس کے موضوعات جدیدیت کے مروّج تصورات کے متضاد معلوم ہوتے تھے۔ ان پندرہ سالوں میں، میں نے انہی میں سے بہت سے نقادوں کو منیر کے لئے اپنے تنقیدی نظام میں گنجائش نکالنا چاہی۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اعتراضات بہت تھے منیر کے پاس جواب ایک ہی تھا، یعنی اپنی شاعری کے ساتھ مسلسل وابستگی اور دراصل شاعری ہی شاعری کے خلاف اعتراضات کا سب سے بڑا جواب ہوا کرتی ہے۔

○○

یہ چراغ دستِ فنا کا ہے

سراج مُنیر

موسم ملال کی ایک ڈھلتی شام میں، کسی مہجور بستی کی قدیم شہر پناہ سے کچھ دور ہمارے سامنے تین کردار ہیں۔

پراسرار خوشبوؤں والے مہلک گلاب، وقت کی آہستہ رو مگر سفاک گردشوں میں بچھڑ جانے والی ایک صورت اور ان سے الگ محراب و در کے درمیان ماہتاب، جس کی چمک کے جمال سے بادِ کہن کا جنون ہے۔

ہم شہرِ منیر کے آس پاس ہیں

وحشت اور بشارت کے درمیانی لمحے ہیں، موسمِ ہجر کی پہلی ہوا ایک افسردہ کر دینے والی یاد ہے۔ اس بجھتی ہوئی شام میں بابِ شہر کے قریب کسی بامِ بلند پر ایک ہاتھ نمودار ہوتا ہے۔

یہ چراغ دستِ حنا کا ہے جو ہوا میں اس نے جلا دیا۔

اور یہی منیر کی شاعری ہے!

کسی شاعر کو پڑھنا، پسند کرنا، اس سے زندگی کے رویے سیکھنا اور چیز ہے اور کسی شاعر میں اس قوت کا ہونا کہ وہ پڑھنے والے کو اپنے لینڈ سکیپ میں شامل کر لے اور اپنے خواب میں اسے شریک کر لے ایک اور نوعیت کی بات ہے۔ اور منیر نیازی کی شاعری ایک ایسے ہی منظر میں اور ایک ایسے ہی خواب میں واقع ہے جہاں کنٹرول کا ایک پراسرار پھل نئے جہانوں کو تخلیق کرتا ہے اور فراموش خوابوں کو یاد دلاتا ہے۔ یہ شاعری کی وہ قسم ہے جس سے یا تو ہمارا رابطہ نہیں ہوتا، یا ہوتا ہے تو مکمل ہوتا ہے۔

اس منظرِ خواب میں شاعر اور قاری کے رابطے کی نوعیت کیا ہوتی ہے اور کس طرح یہ لینڈ سکیپ ایک مشترک روحانی حقیقت بنتا ہے، اپنے طور پر ایک ایسا معاملہ ہے کہ تجزیہ اور تشریح یہاں بار نہیں پا سکتے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایک محدود معنی میں منیر کی شاعری کے ایک خاص علاقے اور ایک خاص منظر پر اپنی نگاہیں مرتکز کر کے ہم اس کائنات کی ساخت اور اس کے

ترکیبی عناصر کو کسی ممکن حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ اگر فراق صاحب کی یہ بات درست ہے کہ غزل منتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے، تو اپنے مطالعے کی نوعیت کے حوالے سے ہمیں منیرؔ کی غزل کا انتخاب کرنا چاہیئے جس میں اس کے گہرے ہوتے ہوئے تناظر، اس کی تمثال کاری کا اسلوب، اس کا لسانیاتی پیٹرن اور سب سے بڑھ کر بحر، بار اور موجود کی نغمگی سے مرتب اس کا لینڈسکیپ ایک خاص انداز میں موجود ہیں لہو کی ایک غیر واضح سرحد تک پھیلتے ہوئے اس جہان کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے ہمیں انفرادی اسلوب اور روایت کے طرز احساس کے درمیان رابطہ کی بہت سی معنی خیز اور پیچیدہ تہوں کے مطالعے کا بھی ایک ایسا موقع ملے گا جو شاید منیرؔ کی نظموں کے حوالے سے اس انداز میں ممکن نہ ہو سکے۔ اس بات کو یوں سمجھ لیجئے کہ منیرؔ نے ایک جگہ کہا ہے:

نسل در نسل کے افکارِ غزل سے نکلا
کتنی دیواروں سے میں اپنے عمل سے نکلا
سایہ اشجارِ کہن سال کا جنت تھا مگر
میں بھی کچھ سوچ کے اس خوابِ ازل سے نکلا

تو اس پورے مطالعے کے ایک مرحلے پر ہمارا سوال یہ ہوگا کہ وہ کون کون سی سطحیں ہیں جن پر انفرادی خواب ایک عظیم اور ازلی تجربے سے جدا ہوتا ہے اور وہ کون سے منظر ہیں جن میں وہ اس تجربے کی بنیادی ساخت میں شامل ہو جاتا ہے۔

بہتر ہوگا کہ اپنے سوال کی سمت آنے سے پہلے ہم چند بنیادی نوعیت کی باتیں طے کرتے جائیں مثلاً یہ کہ منیرؔ کی شاعری کا مجموعی مزاج کیا ہے اور وہ ذات کی کس سطح اور قوت متصرفہ کی کس جہت سے اپنی کائنات تشکیل کرتا ہے۔

منیرؔ کی یہ شعری کائنات، اردو میں اپنی ایک منفرد معنویت رکھتی ہے۔ اس کا بنیادی اصول اشیاء اور مناظر کو "آدم اول" کی آنکھ سے دیکھنے کا ہے۔ یعنی منیرؔ کے روبرو جو کائنات ہے اس سے منیرؔ کا تعلق ایک مرحلۂ حیرت پر واقع ہوتا ہے یہ مرحلہ حیرت وہ ہے جہاں بصیرت اور اشیاء دونوں اپنی ازلی اور سیال کی کیفیت میں ہوتے ہیں، اور تصورات اور مظاہر کے درمیان سرحدیں واضح نہیں ہوتیں۔ باہم مدغم ہوتے، اور پھر یکایک کسی اور منظر سے اشیاء کے طلوع ہونے کا عمل محض hallucination کا عمل نہیں ہے، جو سحر کی کسی کیفیت سے مشابہ ہو۔ بلکہ ہم اسے آدم اول کا تجربہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کیفیت میں ابھی حیات کے سانچے انسانی تجربے کے مسلسل اور تکراری عمل کے ڈھانچوں میں، ایک نچلی سطح پر متشکل نہیں ہوئے ہوتے اور شاعر اپنے شعری وجدان کی بنیاد پر اشیاء کے درمیان مماثلتوں کو دیکھتا ہے اور پھر حیران

ہوتا ہے۔

دور تک پانی کے تالاب تھے ہنگام سحر
شمس اس آب کے اک تازہ کنول سے نکلا

تو اس جہت سے شعر کہنا، وسیع منظروں میں بکھری ہوئی چیزوں کو اپنی چشم وا کے تناظر میں ایک نیا ربط اور ایک نئی معنویتی تنظیم فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

شعر منیر لکھوں میں اٹھ کر صحن سحر کے رنگوں میں
یا پھر کام یہ نظم جہاں کا شام ڈھلے کے بعد کروں

تو اس انداز سے منیر کی شاعری میں ایک ایسی دیو مالائی بصیرت کام کرتی دکھائی دیتی ہے جو کہ اشیاء کے درمیان تناسب تعلقات کو برہم کر دیتی ہے اور لگتا ہے عالم موجود کے اطراف اور منظروں سے ایک نئی کائنات تخلیق کرتی ہے اس عمل کی مثالیں شاعروں کے ہاں جزوی طور پر تو نظر آتی ہیں لیکن منیر وہ شاعر ہے جس کی بصیرت کو ہم خالصتاً انہیں اصطلاحات حیرت میں بیان کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے شاعر کے ہاں پہلے سے موجود شعری تجربے کے معیار کی پرکھ کے انداز بھی الگ ہونا چاہئیے اور اسے تحسین شعر کے معاملے میں بھی کچھ نئی جہتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہئیے۔ ایذرا پاؤنڈ نے ایک جگہ کیٹس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے انگریزی شاعری سے غیر شعری اور بہت سے شعری رجحانات کو بھی ابال کر پھینک دیا۔ تو ایک درجے میں منیر کی شاعری بھی پورے روایتی طرز احساس کی تشکیل نو ہے اور ان معنوں میں ایک بہت مرتب ذوق اور نیز حسیات کا تقاضا کرتی ہے۔

منیر نے جس طرز کی نظمیں لکھی ہیں اور ان کی جو اہمیت ہے اس پر ہم کسی دوسری نشست میں گفتگو کریں گے۔ فی الوقت میں منیر کی شاعری کے ایک علاقے کا جائزہ لینا چاہتا ہوں یعنی غزل کا منیر کی غزل ہمارے لئے ایک پورا منظر نامہ ترتیب دیتی ہے، یہ منظر نامہ تمثالوں، یادوں استعاروں سے مرتب ہوتا ہے اور اس کا محل وقوع ایک شہر ہے۔ اس شہر کا جذباتی موسم بام بلند پر بچھڑ جانے والی ایک منتظر صورت سے تشکیل پاتا ہے۔ لہٰذا آئیے اب ہم منیر کے شہر غزل میں اس کے مرکزی استعارے یعنی شہ نشین پر ایک صورت کے ہونے یا نہ ہونے کے تعلق سے داخل ہوتے ہیں۔

شہہ نشینوں پہ ہوا پھرتی ہے کھوئی کھوئی
اب کہاں ہیں وہ مکیں یہ تو بتاتے اس کو

یا پھر یہ کہ ـــــ

شب ماہتاب نے شہ نشیں پہ عجیب گل سا کھلا دیا
مجھے یوں لگا کسی ہاتھ نے مرے دل پہ تیر چلا دیا

یا اس سے بھی زیادہ واضح انداز میں۔

جب سفر سے لوٹ کر آئے تو کتنا دکھ ہوا
اس پرانے بام پر وہ صورت زیبا نہ تھی

لب بام اس صورت سے تعلق منیرؔ کے ہاں ہجر کے تجربے کا بنیادی ڈھانچہ ترتیب دیتا ہے اور شہر سے تعلق ایک طرف اسی صورت کی توسیع ہے اور دوسری طرف سفر کا استعارہ اسی بنیادی اور ازلی ہجر کے تجربے کی نئی جہت۔ اسی لئے منیر نیازی کے ہاں ایک طرف تو ہجر اور ہجرت کے تجربے باہم پیوست ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف سفر سے لوٹنا، یا سفر میں رہنا اپنی اصل سے مفارقت یا اس کی یاد کی ایک استعاراتی جہت پیدا کر لیتا ہے اگر منیرؔ کی شاعری صرف اسی صورت زیبا کے منظر نامے سے ابھرتی رہتی تو اس بات کا گمان ہو سکتا تھا کہ یہ ایک متاثر کرنے والی لیکن غیر اہم شاعری بن کر رہ جائے، لیکن ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وصال و ہجر کا یہ منظر ایک پھیلی ہوئی کائنات میں واقع ہوتا ہے اور ایک درجے میں اس کے ساتھ ایک معنویتی مشارکت کی جہت بھی رکھتا ہے۔ یہ پوری کائنات جس طرح اس پورے عمل میں شامل ہوتی ہے، اسے متاثر کرتی ہے اور ایک روحانی جہت تک پھیل جاتی ہے اس میں بنیادی استعارہ ماہتاب ہے۔ ماہتاب سے اس پورے منظر طلال کا ربط دراصل انسانی رویوں میں اور تعلقات کی معنویت میں کائناتی حقیقتوں کی شمولیت کا مرکزی علامیہ ہے۔

نکلا جو چاند آئی مہک تیز سی منیرؔ
میرے سوا بھی باغ میں کوئی ضرور تھا

یہ بھبھوکا لال مکھ ہے اس پری وش کا منیرؔ
یا شعاع ماہ سے روشن گلابوں کا چمن

اک مسافت پاؤں شل کرتی ہوئی سی خواب میں
اک سفر گہرا مسلسل زرد ئی مہتاب میں

تو منیرؔ کے ہاں مہتاب کی ایک حیثیت، جو اس کی مرکزی معنویت کا ایک حصہ ہے، یہ بھی ہے کہ مہتاب چھپی ہوئی چیزوں کو ظاہر کر دیتا ہے اور ان کی ظاہری ہیئت میں ایک تصرف کے ذریعے ان کی اصل کو نمودار کرتا ہے۔

زمین دور سے تارہ سا ہے خلاؤں میں
رکا ہے اس پہ قمر چشم منیرؔ ہی کی طرح

اور جب یہ بنیادی انسانی رویوں کو تموج کے ذریعے ظاہر کرتا ہے یا سطح پر لے آتا ہے تو اس میں جنون کی ایک جہت شامل ہو جاتی ہے۔

بس ایک ماہِ جنوں خیز کی ہوا کے سوا
نگر میں کچھ نہیں باقی رہا صدا کے سوا

ماہتاب کے ساتھ جنون کا یہ پراسرار تلازمہ دراصل منطق کے اسلوب کو توڑ کر اصل وجود کے ظہور کرنے کا ایک کائناتی لمحہ تشکیل دیتا ہے۔ اس گفتگو سے ہمارے سامنے منیرؔ کی غزل کا بنیادی محاکہ ترتیب پا جاتا ہے اور اس کے عناصر مجمل انداز میں سامنے آجاتے ہیں۔

منیرؔ کی ابتدائی کتابوں سے آگے بڑھتے ہی ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ منظر بدل رہا ہے۔ دراصل یہ ایک طرح کی روحانی کیمیا ہے جس کے ذریعے عناصر سے وجود کی مختلف سطحوں پر نئی کائناتیں تشکیل پا رہی ہیں لیکن چونکہ ان تمام منظروں میں بنیادی ساخت ایک ہی ہے اس لئے ہمیں منیرؔ کے مرکزی استعارے کو نظر سے جانے نہ دینا چاہیئے۔ بام بلند پر صورت زیبا، اس کے ارد گرد اپنے بام و در سمیت پھیلا ہوا شہر اور ان سب پر دمکتا ہوا ماہتاب۔

آگے چل کر ہمیں ویران مکان، رائیگاں سفر اور ہجر دائمی کے استعارے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ شہر جس کی موجودگی پہلے ہر شعر میں جھلکتی تھی اب آہستہ آہستہ یاد کے غیر واضح کناروں کی طرف اور خواب کی سرحدوں کی سمت بڑھ رہا ہے۔

وصل کی شام سیہ، اس سے پرے آبادیاں
خواب دائم ہے یہی میں جن زمانوں میں رہوں

ہے ایک اور بھی صورت کہیں مری ہی طرح
اک اور شہر بھی ہے قریۂ صدا کے سوا

چنانچہ یہاں آکر سفر کا استعارہ ایک نئی جہت سے نمودار ہوتا ہے، سفر رائیگاں، نا مختتم اور ازلی۔

ابھی مجھے اک دشت صدا کی ویرانی سے گزرنا ہے
ایک مسافت ختم ہوئی ہے ایک سفر ابھی کرنا ہے

پہلے جو شہر ایک مناسبت اور محبت کے حوالے میں ظاہر ہوتا تھا یہاں آکر ندان کی معنویت اختیار کر لیتا ہے اور اسی لمحے منیرؔ کی منفرد بصیرت ایک کمال دکھاتی ہے کہ شہر موجود اور

شہر خواب کو درجہ دار معنویت رکھنے والی ایک ہمہ جہت علامت بنا دیتی ہے۔ شہر موجود کا استعارہ بن جاتا ہے اور خواب ماورا کا اور منیر کی طویل مسافت وجود کی ان دو مہجور سمتوں کے درمیان ایک داستانی دشت ہے۔ وجود کی یہ دو نہیں منیر کے ہاں اسیری اور رہائی کی ترکیبوں کو معنویت دیتی ہیں اور کبھی کبھی اشیاء اپنے اصل سے وجود کی اس مغارقت کو پاٹ دیتی ہیں۔

نیل فلک کے اسم میں نقش اسیر کے سبب
حسن ہے آب و خاک میں ماہ منیر کے سبب
سحر ہے موت میں منیر، جیسے ہے سحر آئینہ
ساری کشش ہے چیز میں اپنی نظیر کے سبب

چنانچہ یہاں آکر وجود کی مختلف سطحوں کا ربط، جو منیر کے بنیادی تجربے میں ہی موجود تھا، آئینہ کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے اور عکس بیک وقت رابطے اور اسیری کی معنویت میں نمودار ہوتا ہے۔ استعاروں کا یہ مقابلاتی نظام جس میں اشیا اپنی ضد سے نمو پاتی ہیں منیر کے ہاں ایک طویل حدیث شہر و دشت اور حکایت آب و خاک میں نمودار ہوتا ہے۔ اس سطح پر آکر یاد اور خواب میں گم ہونے والے شہر کی سکائی لائن مدھم پڑتی ہوئی لامکان میں گم ہو جاتی ہے اور شہر موجود کے مقابل لامکاں باقی رہ جاتا ہے۔

ایک دشتِ لامکاں پھیلا ہے میرے ہر طرف
دشت سے نکلوں تو جا کر کن ٹھکانوں میں رہوں

منیر کے ہاں جو خواب کا یہ شہر ہے کہ جس کی حدیں لامکاں سے مل جاتی ہیں، میں نے ایک بار منیر سے اس بارے میں پوچھا تھا تو اس نے کہا، اسے تم پاکستان سمجھ لو جو متفق لوگوں کی بستی ہوگا، یا تم اسے قریۂ محمدؐ کا نام دے لو۔ اس طرح منیر نے یاد سے ایک خواب تشکیل کیا ہے وہ شہر گل جس کے خواب میں سچے شاعر رہتے ہیں۔

ان استعاروں سے منیر کے شعری منظر اور محل وقوع کا نیز اس کے موسم ملال کا ہمیں ایک بنیادی اندازہ ہو جاتا ہے لہذا ایک نظر اب منیر کی لسانیاتی فضا کی طرف بھی جو شاعر کا اصل وطن ہے اور اس کا ازلی اور دائمی موسم ہے۔

کاؤن نے اپنے ایک مضمون میں کارل کراز کی ایک دلچسپ بات نقل کی ہے۔ کراز کا کہنا ہے کہ "میری لسانیات ایک آفاقی طوائف ہے جسے مجھے باکرہ بنانا ہوتا ہے۔" ایک ایسے شاعر کے لئے جو محض لسانی ٹوٹکوں کے بل پر شعر نہ کہتا ہو اور ایک تیز حسیات رکھتا ہو شعری روایت ایک بڑا مسئلہ بن جاتی ہے۔ اپنی غزل میں منیر نے مختلف لسانی پیٹرن

استعمال کئے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ تجربے کی وہ سطح جہاں سے شاعری کا پورا موسم متعین ہوتا ہے۔ میرؔ کی لفظیاتی فضا میں روایت کی ساری ترکیبیں نظر آتی ہیں۔ بڑے شاعروں سے ایک تخلیقی ربط کے آثار میرؔ کے ہاں ملتے ہیں لیکن لکھنو کے دوسرے درجے کے شعرا نے جن امکانات کو بس ہاتھ لگا کر چھوڑا تھا میرؔ نے انہیں بہت سلیقے سے استعمال کیا ہے اور اس سے ایک طرح کی مشرقی تاثریت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے عشق اور اس کے متعلقات ہیں، بلکہ سماجی معاشی فلسفے کے بیان تک میں فیض نے روایت کا پورا ایڈیم استعمال کیا ہے لیکن میرؔ جس طرح روایتی ترکیبوں سے جس انداز میں کام لیتا ہے اس کی نوعیت بالکل الگ ہے اور اس لئے اس کا مطالعہ بھی ایک نیا اندازِ نظر چاہتا ہے۔ میرؔ نے اضافتوں کے استعمال سے محبوب کے وہ سارے تلازمے سمیٹ لئے ہیں جو اسے فارسی کلچر کے پس منظر میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے میرؔ نے دو بڑے فائدے اٹھائے ہیں۔ ایک تو صورت مہجور کا ذکر جو زمانی اور مکانی فاصلے کا تاثر چاہتا ہے وہ حاضر محبوب والے روزمرہ میں کسی طور پر نہیں آ سکتا تھا، دوسرے یہ کہ یہ لسانیاتی فضا اور محبوب کے حوالے سے استعمال ہونے والی فارسی ترکیبیں شعر کے معنویتی سٹرکچر میں اعلیٰ تر معنیٰ کے لئے کئی در باز رکھتی ہیں۔ پہلے اس فضا کو سمجھنے کے لئے اس پر ایک طائرانہ نظر۔

بیگانگی کا ابر گراں بار کھل گیا
شب میں نے اسکو چھیڑا تو وہ یار کھل گیا
بہنے لگی ہے ندی اک سرخ رنگ مے کی
اک شوخ کے لبوں کا، لعلیں ایاغ چھلکا
پی لی تو کچھ پتہ نہ چلا وہ سرور تھا
وہ اس کا سایہ تھا کہ وہی رشک حور تھا
قبائے زرد پہن کر وہ بزم میں آیا
گل حنا کو ہتھیلی میں تھام کر بیٹھا
غیروں سے مل کے ہی سہی بیباک تو ہوا
بارے وہ شوخ پہلے سے چالاک تو ہوا
ملائمت ہے اندھیرے میں اس کی سانسوں سے
دمک رہی ہیں وہ آنکھیں مرے نگیں کی طرح
ملتا ہوں روز اس سے اسی شہر میں منیرؔ
پر جانتا ہوں وہ بتِ زیبا بھی خواب ہے

اب ان میں یا اس طرح کے بہت سے اشعار میں منیرؔ نے روایتی تراکیب جو اب متروکات کی حد میں داخل ہیں بہت فراخدلی سے استعمال کی ہیں اور ان سے جو شعری تاثر پیدا کیا ہے وہ سامنے ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سطح پر آ کر منیرؔ کی ساری تازہ کاریوں کا روایت کے اسالیب اور خصوصاً صفات کے استعمال کے طریقوں سے کیا ربط بنتا ہے

روایت کے اسالیب کے رد و قبول کے عمل کو منیرؔ کی یہ لسانیاتی فضا ہم پر ایک نئی جہت سے ظاہر کرتی ہے۔ وہ سارا اجتماعی تجربہ جو روایتی تراکیب میں مرتکز ہوتا ہے اس کے اپنے سونے جاگنے کے موسم ہوتے ہیں اور روایت کے بعض حصے کسی بصیرت کے ظہور تک خوابیدہ ہوتے ہیں اور کسی خاص وقت میں کسی شاعر کے منظروں میں جاگتے ہیں۔ منیرؔ بھی اسی نوعیت کا شاعر ہے جس کے ہاں روایت کے بیانیہ انداز کی ایک نشاۃ ثانیہ واقع ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور ایک خواب ازل اس کے خوابوں میں کہیں کہیں چمک جاتا ہے۔ اس پہلو سے منیرؔ کی شاعری پر ہمیں زیادہ غور کرنا چاہیئے۔

منیرؔ کے اس سارے شعری سفر کے ذکر میں ایک اہم بات کا اب تک تذکرہ نہیں ہوا اور وہ اس کا وہ پیغمبرانہ لہجہ ہے جو "جزولیت از پیغمبری" کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ پہلو اپنی جگہ خود ایک مضمون کا متقاضی ہے لیکن چونکہ اس پہلو سے منیرؔ کے بارے میں کافی چیزیں لکھی گئی ہیں اس لئے میں صرف چند اشارے کئے دیتا ہوں۔

ایک شہر خواب اور شہر موجود کے درمیان جدلیات سے منیرؔ میں اپنی تخلیقی قوت کے ذریعے اس کائنات کی ترتیب نو کی خواہش موجیں مارتی ہے۔

ایک نگر کے نقش بھلا دوں، ایک نگر ایجاد کروں\
ایک طرف خاموشی کر دوں ایک طرف آباد کروں

منیرؔ کے اس لہجے کے تناظر میں شہر مرکزی استعارہ بن کر نمودار ہوتا ہے اور انسانی تعلقات، اور انسانی رویوں کا پورا جال یہیں آ کر نظر آتا ہے۔

تلخ اس کو کر دیا ارباب قریہ نے بہت\
ورنہ اک شاعر کے دل میں اس قدر نفرت کہاں

منیرؔ کی غزل میں جلال کا پہلو پوری طرح بیان ظہور پاتا ہے اور اس رویے کی نمائندگی مرکزی طور پر یہ غزل کرتی ہے۔

اس شہر سنگ دل کو جلا دینا چاہیئے\
پھر اس کی خاک کو بھی اڑا دینا چاہیئے

اک تیز رعد جیسی صدا ہر مکان میں
لوگوں کو ان کے گھر میں ڈرا دینا چاہیئے

یہ رویہ بنیادی طور پر ایک تخلیقی جلال کی حیثیت رکھتا ہے

چونکہ منیرؔ نیازی بنیادی طور پر قوت متصرفہ کا شاعر ہے اس لئے اس کے ہاں نئے جہانوں کی تخلیق اور نئے منظروں کے عدم سے یکدم وجود میں آ جانے کا عمل اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ غزل میں منیرؔ کا یہ کمال خود اس کی اپنی ایک تمثال کے مطابق ایک پرانے راگ سے ایک نئی صوت کے پھوٹتے جانے کا عمل ہے۔

منیرؔ کی غزل اپنے تمام استعاروں میں ایک غریبۂ قدیم کی طرح ہے جس کے دریچے حیرت کے ناموجود منظروں پر کھلتے ہیں جہاں ایک گلاب کی تیز خوشبو ماہِ تمام کے نور سے ہم آہنگ ہوتی ہوتی دل میں بسی ہوئی کسی صورت کی طرف اور آنکھوں میں جھلکتے ہوئے ایک نئے خواب کی سمت مسلسل ہجرت کا عمل ہے اور اس عمل میں منیرؔ کا زادِ راہ۔

یہ چراغ دست حنا کا ہے جو ہوا میں اس نے جلا دیا

OO

منیر نیازی

اصغر ندیم سید

منیر نیازی کی شاعری کو عظیم خصوصیات سے تولا جا سکتا ہے لیکن یہ آسان کام ہے۔ مشکل کام یہ ہے
کہ ہم اس کی شاعری کے بھید میں رہ کر اس کے حسی تجربوں میں آنے والی اشیاء کے معنی سمجھیں۔ اس خوشبو کو اس
سے اپنی روح کو جگوئیں جو دونوں باغوں اور دالانوں سے آ رہی ہے۔ یہ ایسی سطح ہے جہاں منیر نیازی کی شاعری
ہم فریب نہیں دے سکیں گے کیونکہ نصابی خصوصیات کے خانوں میں اصل شاعری کو نہیں بانٹا جا سکتا۔ ہر دور
میں شاعروں کی ایک ایسی کھیپ ہوتی ہے جن کے لئے نقاد جانچنے کا ایک پیمانہ سا سانچا بنا لیتے ہیں۔ وہ
شاعر خود بھی نقادوں سے تعاون کرتے ہیں اور ان کے سانچوں میں خود بخود فٹ ہوتے رہتے ہیں۔ یہ دو طرفہ
عمل ہوتا ہے اس طرح ایک مہدکی طرح سیدھی زبان تشکیل پاتی ہے جو سب شاعروں پر ایک سا رنگ چڑھاتی
ہے ایک سا چولا پہناتی ہے یہ شاعری اور تنقید ایک دوسرے کا سہارا لے کر چلتے رہتے ہیں۔ اصل شاعری
کے جلوے کے ساتھ ہی اس کی بھی موجود ہوتی ہے جس طرح سونے کی
بعض دفعہ اصل سونے سے زیادہ چمکدار معلوم ہوتی ہے اس طرح یہ شاعری بھی دیکھنے میں بھڑکیلی لگتی ہے
اس کے مقابل سہیل احمد خان نے جس شاعری کو اصل شاعری کہا ہے اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ مروجہ
تنقیدی حربوں کی گرفت میں آنے سے انکاری ہوتی ہے اس کی خوشبو آزاد ہوتی ہے ایسی شاعری اپنے
ساتھ تنقید کی نئی ساخت اور لہجہ لے کر آتی ہے۔ منیر نیازی کی شاعری کو اس لئے کسی روایتی انداز سے چھونے
کی بجائے اس کے شعری باطن میں رچے ہوئے محسوسات اور روحانی تجربوں سے رشتہ قائم کرنا پڑتا ہے
کچھ رشتہ انسانوں کو ان بھولی ہوئی چیزوں سے بھی قائم کرنا پڑتا ہے جو ہم گم کر بیٹھے ہیں اور اب وہ ایک حیرت
میں تبدیل ہو چکی ہیں جن چیزوں کی خصوصیت گم ہوتی جا رہی ہے یا زندگی کے میکانکی عمل سے بے معنی دھندلا
گئے ہیں ان کا پاسبان بھی کہیں کہیں ضرور ہوتا ہے جو ان معنوں کو دریافت کرتا ہے۔ کچھ دروازے کھولتا ہے
کچھ زمانوں اور دنیاؤں کا الہام حاصل کرتا ہے منیر نیازی اس کائنات کی غیر موجود کیفیتوں اور امکانات کی
معتبر نشانیاں اپنے وژن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ خصوصیت ان کے شعری مزاج کی تشکیل میں بنیادی حیثیت
رکھتا ہے اردو میں ایسے شاعر معجزہ نما ہوتے ہیں جن کی اپنی شعری کائنات اور شعری مزاج ہوتا ہے ۔

منیر نیازی اردو شاعری میں ایک معجزہ ہے اس کا شعر مزاج مخصوص نظام محسوسات اور کائنات کے عجائب گھر سے ذاتی انتخاب کا ایک کرشمہ ہے موجود دنیا میں ایک نہیں کئی دنیاؤں کا سراغ لگانا زندگی کے شدید ترین معانی میں زندہ رہنے کا عمل ہوتا ہے اس لئے کہ شاعر کا کام لفظوں کا سنگیری یا شاطی نہیں ہوتا شاعری کو مزاق کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے روح کی طاقت اور زندہ جذبوں کو پالنا پوسنا پڑتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے میکانکی تجرا اور تھکا دینے والے اسلوب میں اپنے خواب کو تازہ رکھنا اور اپنی یاد کو بچا لینا ہی شاعری کرنے کا نام ہے۔ خواب اور یادیں ہر کسی کے پاس نہیں آتیں یہ جادوگری کسی ایسے شاعر کے پاس ہی ہوتی ہے جو ماضی اور تہذیب کے تسلسل میں بے ساختہ اپنی اڑان میں رہتا ہے۔ سات آسمانوں اور سات سمندروں کے مقابل اپنے خوابوں کی مٹھی کھولنا بحر و بر کی وسعت میں ایک گلاب کھلنے کے مترادف ہے۔ منیر نیازی یہیں سے اپنا مکالمہ کھولتا ہے اور بعض دفعہ خود بھی کائنات کے اس منظر کا حصہ بن جاتا ہے ایک خوبصورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

خواب اور یاد درحقیقت ایک محدود منظر اور ٹھہری ہوئی صورت حال میں کا ذریعہ بنتے ہیں اور ان کھوئی ہوئی بستیوں۔ باغوں اور شاموں کو دریافت کرتے ہوئے نہ جانے والوں کے لیے ایک جو شعر مزاج کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا ہے اس کا مرکز احساساتی وحدت ہے۔ منیر نیازی کی شاعری اپنے تمام پہلوؤں اور جہتوں سمیت اس احساساتی وحدت میں گندھی ہوئی ہے اور اس وحدت کے بطن سے شاعر کا لفظ پیدا ہوتا ہے۔ منیر نیازی کی شعری لفظیات اس کے لیے ایک ایسا حصار ہے جس میں وہ خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔ یہی اس کی پہچان کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ لفظ ایک ایسی کایا بن جاتے ہیں جس سے وہ ہر منظر اور خیال کو کھولتا چلا جاتا ہے اس کا لفظ بر طاقت بخشتا ہے اور لفظ اپنے کاروباری معنی سے باہر نکل جاتا ہے یہ لفظ کا رشتہ منیر نیازی سے ہوتا ہے وہ جس طرح اس کو تخلیقی وجود دیتا ہے۔ لفظ اسی طرح حرکت میں آتا ہے۔ ان معنوں میں منیر نیازی کے الفاظ لغت سے باہر نکلے ہوئے لفظ ہیں۔ یہ کمانڈ حاصل کرنے کے بعد اس کی باتیں بھی شاعری کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اس کی شاعری ایسا محسوس ہوتا ہے کسی تخلیقی لمحے کے انتظار میں بیٹھ کر لکھی ہوئی شاعری نہیں ہے تمام لمحات اس کے لئے تخلیقی ہیں وہ ایسے شاعر نہیں ہیں جن کو کوئی ایک اشارہ یا خیال کا ایک سرا نازل ہو جاتا ہے باقی اس کے گرد اگرد اسی خیال یا اشارے کو لباس پہنانے کا کھیل ہوتا ہے۔ یہ فرق اسے اپنے عہد کے شاعروں سے ممتاز کرتا ہے اس کے متعلق کسی کی کہی ہوئی یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ اسے پتہ ہے کہاں سے نظم شروع کرنی ہے اور کہاں ختم کرنی ہے اس کی غزل اگر دو شعر ہیں اور نظم ایک مصرعے تک محدود ہے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اسے خوبصورتی کے گرد حفاظتی لشکر کھڑا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ایک خوبصورت خیال اگر مکمل طور پر آشکار ہو گیا ہے

تو اس کو دلیلوں یا اسباب و علل کے گورکھ دھندے کی کوئی پرواہ نہیں ہونی چاہیئے۔

تیز ہوا اور تنہا پھول سے لے کر چھ رنگین دروازے تک منیر نیازی کا شعری طلسم قائم رہا ہے۔ لہیں پر اس کا تجربہ ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا کہ وہ جس شے کو بھی چھوتا ہے اس میں اپنے معانی کی سرارت ڈال دیتا ہے۔ چھ رنگین دروازے صرف چھ ہی کیوں ہیں سات کیوں نہیں۔ میرا خیال ہے چھ کی معنویت یہی ہے کہ منیر نیازی کو رنگین دروازوں کی اتنی ہی تعداد پسند ہے اور ان رنگوں کے پیچھے تلازماتی سلسلہ ہے ملال کا رنگ ہو یا وصال کا۔ شام کا یا تتلی کا۔ آسمان کا یا سمندر کا۔ ان رنگوں میں داستانیں ہیں اور ان دروازوں کے پیچھے شہر ہیں اور ان شہروں میں موسم ہیں۔ یہ سارا منظر سلسلہ در سلسلہ ہے۔ ایک ہفت خواں ہے۔ شاعر کی اقلیم ہے جس میں اس کے خواب اثر پذیر ہو سکتے ہیں اس کی خواہش کو پر لگ سکتے ہیں۔ منیر نیازی ایک خوبصورت زندگی کو اپنے اردگرد دیکھنا چاہتا ہے۔ جہاں انسانی ماحول ہو۔ بدصورت اور مکروہ خیالات کا داخلہ اس میں بند ہو۔ پاؤں رکھنے کے لئے زمین! سانس لینے کے لئے تازہ ہوا ہو۔ آسمان گہرا نیلا ہو تاکہ پرندے مسرور ہو سکیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ایسی بستی میں ہے جس کے پرندوں کو ڈرا دیا گیا ہے اور درخت خالی ہو گئے ہیں۔ شہر اپنے اپنے باطن میں خوفزدہ ہو گئے ہیں۔

منیر اتنا حسن اس زمانے میں تھا کہاں اس کو کوئی بلا لے گئی

یہ صورت شاعر کے اندر ردِ عمل بھی پیدا کرتی ہے اسے ناراض بھی کرتی ہے وہ اکتا بھی جاتا ہے لیکن اس ماحول میں بنیادی معنی غائب ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس لئے اس کا غصہ کوئی نعرہ یا احتجاج نہیں بنتا ایک شاعرانہ دکھ بن کر سامنے آتا ہے۔

شکوہ کریں تو کس سے... شکایت کریں تو کیا اک رائیگاں عمل کی ریاضت کریں تو کیا

معنی نہیں منیر کسی کام میں یہاں طاعت کریں تو کیا ہے۔ بغاوت کریں تو کیا

اس دکھ میں جلتے یا کڑھتے رہنا بھی منیر نیازی کو منظور نہیں ہے وہ اپنی پسند اور ناپسند میں پردہ داری کا قائل نہیں ہے۔ اتنی قیمتی زندگی کو یا ایک عہد کو بے ثمر کر دیا جائے۔ تہذیبی دھارے کا رخ موڑ دیا جائے • اور دریاؤں کے پانی میں زہر گھول دیا جائے تو پھر پردہ داری کیسی درختوں سے پرندے اڑانے والوں کو کیا معلوم کہ ان کی اس حرکت سے شاعر کے خیال میں رہنے والے پرندے بھی اڑ جاتے ہیں لیکن معاشرہ کے لئے نہیں ہوتا وہ تو ایک بھیڑ کے لئے ہوتا ہے اسے فرد کی آرزو نہیں کسی ہوتی سایوں کے ہجوم کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ انسانی آزادیوں کی بجائے اپنے نفع نقصان کی منفعت پر ہوتی ہے۔ شاعر کو کون کہتا ہے کہ وہ یہاں پیدا ہو۔ ایک اچھے خیال کی انہیں ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک اچھے پرزے کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کی مشین میں کام آ سکے۔ شاعر بہتر دنیا کی تعمیر کرتا ہے جو ان کی بنائی ہوئی دنیا کی نفی کرتی ہے اس لئے منیر نیازی جس رات میں خواب کا بیج بو رہا ہے وہ رات کافی

طویل ہے۔ یونہی جی کا زیاں ہے اور صبر ایک طاقت ہے جو اس کے پاس ہے۔

صبر اک طاقت ہے میری سختیٔ ایام میں
اس صفت سے آدمی غم میں فغاں کرتا نہیں

جب شاعر جانتا ہو کہ وہ لوگوں سے مختلف ہے اور وہ ان حدوں کو چھو رہا ہے جو عام آدمی کے ادراک سے پرے ہیں تو پھر اس کا ملال بھی اس کے لئے ایک پناہ گاہ بن جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ابتر دن صرف یہی نہیں ہے اس سے بہت ابتر دن گذر چکے ہیں اور خود رحمی سے بچتے ہوئے وہ کائنات کے جمال میں اپنے لئے گواہی طلب کرنے لگتا ہے یہ گواہی اسے ملتی ہے کیونکہ اس کے باطن میں وہی درختوں کا ہجوم ہے۔ ہواؤں کے لئے راستے ہیں۔ باغوں پر صبح کی پہلی کرن ہے وہ معنی گم ہو کر اس کے اندر اور زیادہ پکے ہو گئے ہیں منیر نیازی کے لحن میں جو مخصوص استعارے اور فضا گونجتی ہے اس کی کلید اس کی یہ نظم ہے۔ کچھ باتیں ان کہی رہنے دو۔ کچھ چیزیں اوجھل ہو کر اچھی لگتی ہیں۔ بادل کی اوٹ میں آ کر چاند کچھ اور چمکتا ہے۔ کچھ لوگ گم ہو کر زیادہ قریب محسوس ہوتے ہیں۔ ہر چیز کا علم بھی اچھا نہیں ہوتا۔ کچھ لاعلمی بھی اس چکا چوند میں دل کو کھاتی ہے۔ کچھ چیزیں دہشت کے لئے اور کچھ چیزیں حیرت کے لئے بچی رہنی چاہئیں۔
منیر نیازی کچھ اندازوں اور گمانوں کا سہارا لے کر نکالتا ہے۔ کیا خبر کوئی ساعت ایسی بھی مل جائے جو بظاہر نظر نہ آتی ہو۔ یہ شاعرانہ اسرار برتنے میں طلسم پھونک دیتا ہے اور اس کے اندازے تلازموں کی قطاریں کھڑی کر دیتے ہیں۔

منیر نیازی کو ہم صرف آنے والے موسموں کی بشارت دینے والا خوابوں کے گلاب کھلانے والا یا یادوں کے مناظر ترتیب دینے والا نہیں کہہ سکتے۔ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے وہ بہت کچھ ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنے متعلق ہمیں اندازے دیتا ہے وہ ساری حقیقت ہمیں نہیں بتاتا۔ وہ اپنی باتوں کی طرح کچھ چھپا ہوا ہے کچھ ظاہر ہے۔ جو چھپا ہوا ہے وہ کیا ہے۔ کون سا راز ہے۔ یہی راز ہمیں عزیز ہے۔ ہم اس میں رہنا پسند کرتے ہیں

OO

بے خوابی کے خوابوں کا شاعر۔ مُنیر نیازی

سعادت سعید

اشفاق احمد نے منیر نیازی کے مجموعے "تیز ہوا اور تنہا پھول" کے پیش لفظ میں لکھا ہے "اتنی ساری خوبیوں کے باوجود منیر میں یا اس کی شاعری میں ایک خرابی بھی ہے وہ نہ جمہور کا شاعر ہے نہ عوام کا نہ قصیدہ گو ہے نہ سرکاری شاعر ہے نہ مصور فطرت ہے نہ شاعرِ انقلاب وہ تو بس شاعر ہے خالی شاعر اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں"۔ اشفاق احمد کے یہ کلمات منیر نیازی کی شاعری کی تفہیم کے ضمن میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ منیر نیازی نے کائنات، سماج، انسان اور اپنی ذات کو شاعرانہ آنکھ کی حدود میں سمیٹا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ناقد سخت مشکل میں ہیں کہ ان کی شاعری کو کس خانے میں رکھیں اور انھیں کس دبستان فکر و سیاست سے وابستہ کریں۔ اگر وہ شاعرِ جمہور یا شاعرِ عوام نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جمہور یا عوام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ یہ کہ انھوں نے ہنگامی عوامی مسائل سے کوئی سروکار نہیں رکھا اور انسانی آبادی کے دکھوں، غموں، اور پریشانیوں کو شاعرانہ طریقے سے قالبِ شعر میں ڈھالا ہے۔ وہ اگر مصورِ فطرت نہیں ہیں تو ان معنوں میں کہ انھوں نے فطری مناظر کی منظر کشیِ محض کو اپنا وطیرہ نہیں بنایا۔ فطرت اور انسانی زندگی کے تعلق کو ان کی نظموں کی ہر سطر میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ انھیں شاعرِ انقلاب کا خطاب اس لیے نہیں دیا جا سکتا کہ ان کی شاعری میں سماجی ناہمواریوں اور ماحول کے جبر کا نعرہ بازی اور پراپیگنڈے کے انداز میں تذکرہ نہیں ہے۔ سماجی بے انصافیوں اور ماحول کے نامساعد ہونے کا شاعرانہ اظہار منیر نیازی کی شاعری کا جزدِ خاص ہے سب سے بڑی بات جو منیر نیازی کو قصیدہ گوئی اور سرکار نوازی سے روکتی ہے وہ ان کا خالص غیر کاروباری نقطہ نظر ہے وہ آرڈر پر نظمیں لکھنے کا سطحی کام نہیں کرتے نہ ہی انھوں نے قلم کی تقدیس کو نیلام گھر کی زینت بنایا ہے۔ ان کے قلبِ شاعری پر جس بھی واردات کا نزول ہوا ہے انھوں نے اسے بغیر لگی لپٹی کے صفحہ قرطاس پر سجا دیا ہے یہی عمل ایک سچے شاعر کی شناخت کرواتا ہے۔ آر۔ آئی بریٹ (R I. BREH) اپنی کتاب

'عقل اور متخیلہ' REASON AND AMAGINATION میں لکھا ہے کہ جدید فلسفی اصرار کرتے ہیں کہ انھیں اپنی تحقیق کا آغاز ذہنی مسائل کی بجائے شاعرانہ زبان کے تجزیے سے کرنا چاہیے منیر نیازی کی شاعری انہی معنوں میں فکری شاعری ہے کہ انھیں علت و معلول کے دائروں میں گردش کرتے ذہنی مسائل کو منظوم کرنے سے کوئی رغبت نہیں ہے لیکن جذبے اور متخیلہ کے وصال سے ان کے شعری مجموعوں میں جو لسانی فیبرک تیار ہوا ہے اس میں زندگی، انسان اور سماج کے مسائل نقش ہو گئے ہیں ان کی نظموں کے لسانی فیبرک کے تحقیقی تجزیے سے ان کے ادراک تعقل اور ان کے شعور کے فکریاتی پھیلاؤ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

منیر نیازی ہمارے عہد کی اردو شاعری کی منفرد آواز ہیں۔ ان کے اسلوب، لہجے اور موضوعات کی انفرادیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی شاعری سب سے الگ پہچانی جاتی ہے یہی نہیں منیر نیازی کے بہت سے معاصر اور نئی نسل کے شعراء کے کلام پر ان کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان شاعروں کی نظمیں اور مصرعے منہ سے بولتے ہیں کہ ان پر منیر نیازی کی چھاپ ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ منیر نیازی کا شاعرانہ جوہر غلبے اور فوقیت کے امکانات سے معمور ہے "تیز ہوا اور تنہا پھول"۔ "جنگل میں دھنک"۔ "دشمنوں کے درمیان شام"۔ "آغاز زمستاں میں دوبارہ"۔ "ماہ منیر"۔ شاعرانہ شعور کی عظمتوں کے امین شعری مجموعے ہیں ان کے مجموعی مطالعے سے یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ ایک زندہ توانا اور متحرک شاعر جس کی قوت متخیلہ نامیاتی، زرخیز اور کائنات گر ہے ان کا خالق ہے منیر نیازی خوشبوؤں، خوبصورتیوں، روشنیوں اور رنگوں کا متلاشی ایک بے چین اور بے قرار شاعر ہے یہ بے قراری اور بے چینی شاید اس لیے ہے کہ متعفن فضاؤں نے خوشبوؤں کو جلا وطن کر دیا ہے بدصورت کرداروں نے خوبصورتیوں کو کال کوٹھڑیوں میں بند کر رکھا ہے۔ اندھیروں نے روشنیوں کو مقفل کیا ہوا ہے۔ بدرنگ ماحول نے رنگوں کو سرِ عام بکھرنے کی اجازت نہیں دی۔ شاعر بے چین اور بے قرار ہے خوشبوؤں، خوبصورتیوں، روشنیوں اور رنگوں کا متلاشی منیر نیازی کے غموں، تنہائیوں، اشکوں، ویرانیوں، جدائیوں، اندیشوں، دہشتوں آنسوؤں اور تمناؤں کے معانی اسی تناظر میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ بہتر دنیا، بہتر ماحول اور بہتر انسانوں کی جستجو ان کے آؤٹ لک کا خصوصی خاصہ ہے۔ سنگ دل شہروں کے لیے شاعر کا لائحہ عمل یہ ہے ؎

اس شہرِ سنگ دل کو جلا دینا چاہیے
پھر اس کی راکھ کو بھی اڑا دینا چاہیے

اور کبھی وہ روشنیوں اور رنگوں کے حامل شہروں کے لیے دست بدعا ہوتا ہے ۔

پاکستان کے سارے شہرو زندہ رہو پائندہ رہو

مجید امجد نے 'جنگل میں دھنک' کے فلیپ میں درست لکھا ہے " مجھے سب سے زیادہ اس کی شاعری کی وہ فضا پسند ہے وہ فضا جو اس کی زندگی کے واقعات، اس کے ذاتی محسوسات اور اس کی شخصیت کی طبعی افتاد سے ابھرتی ہے اس نے جو کچھ لکھا ہے جذبے کی صداقت کے ساتھ لکھا ہے اور اس کے احساسات کسی عالم بالا کی چیز نہیں ہیں بلکہ اس کی اپنی زندگی کی سطح پر کھیلنے والی لہریں ہیں ان ہی نازک، چنچل، بے تاب دھڑکتی لہروں کو اس نے شعروں کی سطروں میں ڈھال دیا ہے اور اس کوشش میں اس نے انسانی جذبے کے ایسے گریزپا پہلوؤں کو بھی اپنے شعر کے جادو سے اجاگر کر دیا ہے جو اس سے پہلے اس طرح اجاگر نہیں ہوئے تھے ۔ منیر نیازی نے لکھا ہے ۔

میری طرح کوئی اپنے لہو سے ہولی کھیل کے دیکھے
کالے کٹھن پہاڑ دکھوں کے سر پر جھیل کے دیکھے
میرے ہی ہونٹوں پہ لگا ہے نیلے زہر کا پیالہ
میں ہی وہ ہوں جس کی چتا سے گھر گھر ہوا اجالا

ان اشعار سے ایک اصول بھی ملیسر آیا ہے کہ حقیقی شاعر دکھوں کے ناقابل برداشت بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتے ہیں۔ اپنے لہو سے اپنے کلام میں رنگ بھرتے ہیں۔ زمانے بھر کی تلخیاں اور زہر اپنے بدن میں اتارتے ہیں اور اپنے آپ کو جلا کر آبادیوں کو روشن کرتے ہیں۔ احساس اور جذبے کی اسی اندوہناک کیفیت کے بطن سے شاعری کی روشنی پھوٹتی ہے۔ شاعروں کے سینے سوزِ نہاں کے آتشکدے ہوتے ہیں اور جب وہ سوزِ نہاں معرضِ اظہار میں آتا ہے تو معانی کے طلسمی خزانے بے نقاب ہوتے ہیں منیر نیازی کی شاعری معانی کے طلسمی خزانوں سے مالا مال ہے ۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ویسٹ لینڈ لکھی اور مغربی نقادوں اور ان کے پیروکار مشرقی نقادوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ عہدِ جدید کے بنجر پن کی گواہی دینے والی عظیم ترین نظم معرضِ وجود میں آگئی ہے اور یہ دیکھنا گوارا نہ کیا کہ مغربی حکمت عملیوں کے نتیجے میں جن پس ماندہ علاقوں میں تخلیقی اور تہذیبی بنجر پن جڑ پکڑ گیا ہے وہاں کے شاعروں نے اپنے جذبات کا اظہار کس طور کیا ہے ۔ منیر نیازی کی شاعری میں جس ویسٹ لینڈ کی تصویر کشی ہوئی ہے وہ کوئی نظری، فکری یا تخیلاتی نہیں ہے

اور ردشنیوں کے شہروں کی تقدیر کیا ہے؟ زہر، سناٹا، کالی سیڑھیاں، کنواں، پیتل کا مور خالی ڈراؤنا شہر، دھوپ میں سفید عورتیں، آسمان اور تنہا آدمی، ان مختلف اجزاء سے جو کشف ظاہر ہوتا ہے وہ ایک ایسے تہذیبی احساس کی خبر دیتا ہے جو بتاتا ہے کہ ہمارا تہذیبی تصور جامد ہو چکا ہے اور وہ تہذیب جس کے ہم وارث ہیں اپنی اصل زندگی گنوا چکی ہے اور متواتر گنوا رہی ہے۔"

منیر نیازی کی شاعری میں منعکس ہونے والی اجڑی تہذیب بیسویں صدی کا عطیہ ہے۔ بیسوی صدی جو جنگ و جدل اور ہلاکت آفرینی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ زر پرستی انسانی اخلاقیات کے برج الٹا چکی ہے۔ اغراض اور ذاتی مقاصد رشتوں کی قلب ماہیت کر چکے ہیں۔ انسان کیڑوں مکوڑوں کی عادتیں اختیار کر رہے ہیں۔ جانوروں کی جبلتیں اپنا چکے ہیں ایسا لگتا ہے جدید ادب کے علمبرداروں نے دنیاوی بدلیوں اور شیطنتوں کو صوفیا کی داخلی آنکھوں سے دیکھنے کا جتن کیا ہے۔ انتظار حسین نے آخری آدمی، زرد کتا، کایا کلپ وغیرہ میں اسی پرسیپشن کو استعمال کیا ہے۔ کافکا نے میٹا مورفسس، آئی نیسکو نے ریلینسرس اور سارتر نے فلائیز میں بھی اسی پرسیپشن کی بنیادوں کو استعمال کیا ہے۔ سو منیر نیازی کی نظموں میں چیتے، سانپ، بھوت، چڑیلیں، ڈائنیں نظر آتی ہیں تو اس میں اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ انسان اپنے وطیروں میں جانوروں اور مافوق الفطرت اشیاء کی صورت نظر آنے لگے ہیں۔ حقوق غصب کرنا۔ دوسروں کے لہو سے اپنی پیاس بجھانا، ایک دوسرے کا گلا کاٹنا۔ بے گناہ اور معصوم آبادیوں پر غاصبانہ قبضے کرنا۔ جذباتی اور فطری میل جول کو روکنے کے لیے فصیلیں کھڑی کرنا اور حقیقی انسانی تمناؤں کو دفنانا بیسویں صدی کے انسانوں اور خصوصاً سیاسی اور سماجی اداروں اور ان کے ٹھیکیداروں کا اولین مشن ہے ایسے میں ہمارے شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نویس اور افسانوی ادب کے خالق اگر "جدید کلیلہ و دمنہ" ترتیب دے رہے ہیں تو وہ عصری تقاضوں سے باخبر ہیں۔ نئے عہد کی "کلیلہ و دمنہ" نئے اخلاقی اور انسانی اسباق کا خزینہ سمیٹے ہوئے ہے۔

پھیلتی ہے شام دیکھو ڈوبتا ہے دن عجب
آسمان پر رنگ دیکھو ہو گیا کیسا غضب
کھیت ہیں اور ان میں اک روپوش سے دشمن کا شک
سرسراہٹ سانپ اور گندم کی وحشی گرم مہک

تجرباتی، حسیاتی اور مشاہداتی ہے۔ اسی ویسٹ لینڈ میں شش جہت پر تیرگی امڈی ہے، ویران شامیں ہیں خشک پتے ہواؤں میں اڑتے ہیں۔ اجنبی نگر ہیں، اداس گھر ہیں، ہوا ہزار مرگ آرزو کا غم لیے ہوتے ہے سسکیاں لیتی ہوائیں چپ رہنے کا اشارہ کرتی ہیں۔ رات کی اونچی فصیلوں پر دمکتے لال ہونٹوں والی خنجر بکف کالی جھنبنیں ہیں گپھائیں ڈراؤنی صداؤں سے بھری ہیں۔ خاموش گلیاں، زرد روگونگے مکیں۔ اُجڑے اُجڑے بام و در اور سونے سونے شہ نشین ہیں۔ پاگل جھونکے گھروں کے اجالے کو بھگا رہے ہیں سانپوں سے بھرے جنگل ہیں اور مکانوں کے ہر چھجے کی اینٹ خون دکھائی دیتی ہے۔ گئے دنوں کی دھول اڑ رہی ہے۔ لمبی چپ ہے اور تیز ہوا کا شور ہے گھائل چیخوں نے دہشت پھیلا رکھی ہے ننگی مہ پارائیں خون میں لت پت پڑی ہیں، ہیبت ناک چڑیلیں ہنس ہنس کر تیر چلا رہی ہیں۔ پیلے منہ، وحشی آنکھیں۔ گلے میں زہری ناگ اور لبوں پر سرخ لہو کے دھبے۔ یہ بھوتوں کی بستی ہے ؎

ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں

شامیں پرانے سوگ میں ڈوبی ہیں سفر مسلسل ہے لیکن راہ ادھوری ہے سارا جنگل دشمن ہے اور ہاتھ میں اک ہتھیار بھی نہیں ہے۔ کالے سایوں میں وحشی چیلوں کی آبادی ہے۔ سانپوں جیسی آنکھیں میچے بڑے پیڑ کے اوپر کچھ گدھ بیٹھے اونگھ رہے ہیں ویسٹ لینڈ کی یہ صورت حال پسماندہ علاقوں ہی کے حصے میں آتی ہے یہاں انسانوں کی قسمتیں خوابیدہ ہیں۔ زوال اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے۔ دلوں کے درمیان حائل فاصلے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ تمناؤں کی تکمیل ناممکنات میں سے ہے۔ دشمنیوں اور نفرتوں نے شب خون مارا ہے۔ جیلانی کامران نے لکھا ہے۔ منیر نیازی کی نظموں کا کشف ہماری تہذیب کے یکطرفہ رجحان سے پیدا ہوتا ہے ایک ایسے رجحان سے جو دھوپ کی طرح بے رنگ اور پیتل کی طرح بدنما ہے اس رجحان کے زیر اثر نمودار ہوتی ہوئی دنیا میں ہر طرف تنہائی اور دشمنی، بے توجہی اور افسردگی دکھائی دیتی ہے۔ شاعر اس بدنما دنیا کی تصویر پیش کرتے ہوئے قاری تک اس تصور کو پہنچانا چاہتا ہے، جسے اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ وہ تہذیب جس کی طرف یہ مختلف نسلیں رہنمائی کرتی ہیں ایک ایسے آشوب میں گرفتار ہے جہاں اس کو اپنی منزل کا علم بھی میسر نہیں ہے اور نہ اسے معلوم ہے کہ کالے پتھروں کی سڑکوں

اک طرف دیوار و در اور جلتی بجھتی بتیاں
اک طرف سر پر کھڑا یہ موت جیسا آسماں

(دشمنوں کے درمیان شام)

پیلے منہ اور وحشی آنکھیں۔ گلے میں زہری ناگ
لب پہ سرخ لہو کے دھبے۔ سر پہ جلتی آگ
دل ہے ان بھوتوں کا باکوئی۔ بے آباد مکان
چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا۔ اک لمبا قبرستان

(بھوتوں کی بستی)

یہ پرسیپشن اردو کے بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی ہے منیر نیازی نے اپنی نظموں میں اسے کمال خوش اسلوبی سے برتا ہے اس پرسیپشن کو کنسیپشن CONCEPTION کا روپ دینے کا منصب نقادوں کے سپرد ہے شاعر نے تو اپنی باطنی آنکھ سے جن منظر کو گرفت میں لیا ہے اسے با مراظہار عطا کیا ہے یہ تفصیل کہ منیر نیازی کے عہد کا سیاسی، سماجی معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی منظر نامہ کن عناصر کا مجموعہ ہے شارحین منیر نیازی کا کام ہے منیر نیازی کی امیجری اور علامتوں کے پس منظر میں آمریتوں، طبقاتی تفاوتوں، بین الاقوامی غیر منصفانہ جنگوں، انسانی خود غرضیوں اور سماجی افراتفریوں نے کیا کردار ادا کیا ہے اس کی تفصیل کسی اور وقت پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ یہاں تو فی الحال یہی کافی ہے کہ ہمارے عہد کا یہ صاحب بصیرت شاعر ہمارے عہد کی بے ضابطگیوں۔ بے ربطیوں، بدیوں، شقاوتوں اور ہلاکت آفرینیوں کی تصویر کشی میں یکتا ہے۔

منیر نیازی کی نظموں میں امیجری کا وہ روپ بھی جھلملاتا ہے جو ان کے خوابوں، تمناؤں امید دل اور بشارتوں کا پرتو لیے ہوتے ہے۔ جمالِ دوست کی۔ ۔ ح سرائی سے لے کر وصالِ بہار تک کی ثنا خوانی ان کے شاعرانہ مزاج کے ایک رخ کی نقیب ہے گیت گاتے پرندوں سے محبت چاہت کے سنگیت میں ڈوبے کومل ہونٹوں سے موانست کا ذکر دکو۔ پرنور کی بارشوں کا تذکرہ ہمہ منیر نیازی کی نظموں میں تازگی آشنا ہے۔ ان کے خواب تمنا میں ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں شاعر کا دل کیفیتِ فردا کا شاہد بھی ہوتا ہے اور در و بام محبت میں دیر وز کے سکھوں کا گواہ بھی ننھے ستارے کے ساتھ طلوع ہونے والے نئے مرحلے بھی منیر نیازی کی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں وہ سحر سیاہ شب میں خوابیدہ دروں کے باہر جگنو کی چمک کا مشاہدہ بھی کرتے

ہیں وسائل سر سبزی کی تمنا ان کے شعری ضمیر کا حصہ ہے دشمنوں کے درمیان شام گزارنے والا حساس شاعر حقیقی دوستوں کی تلاش میں ہے۔ منیر نیازی نے انسانی صورتوں کو بگڑتے دیکھا ہے مگر یہ آرزو ان کے دل سے کبھی رخصت نہیں ہوئی کہ وہ انسانوں کو انسانی روپ میں دیکھیں۔ انسانی تمثال کی تنسیخ کا اعلان نامہ ایسے معانی کا حامل بھی ہے جو انسان کے انسانی مرتبے کا اشارہ ہیں۔ منیر نیازی انسانی چہروں کے بگڑنے کے نوحے اس لیے رقم کرتے ہیں کہ انکے ویژن میں حقیقی انسان کے خدو خال موجود ہیں۔ حقیقی انسان جو خزانے کا سانپ نہیں ہے جو دوسروں کے لیے ضرر رساں نہیں ہے۔ جو دنیا کو خوشیوں، رنگوں اور خوشبوؤں کا مسکن بنانا چاہتا ہے۔ جو موسموں، پرندوں، پھولوں، ستاروں اور روشنیوں کا رسیا ہے۔ جو زمینوں کو دشمنیوں، منافرتوں کدورتوں، بے جا پابندیوں، بداخلاقیوں اور بے سرو پائیوں سے پاک کرنے کے خواب تکتا ہے۔

ے بس اک خواب نور سحر کے مقام کا
اس خواب تلخ شب کا مداوا بھی خواب ہے

OO

تحقیق

طلائی تثلیث (۲)

وزیر آغا کا فکری سومنات

رشید ملک

البیرونی اور ابوالفضل کے بعد مغربی دانش کی روشنی میں ہندوؤں کے متعلق سنجیدہ مطالعہ کی ابتدا سترھویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی۔ ہندوستان اور ہندوؤں کا ہر جہت سے ہمہ گیر مطالعہ کرنے والوں میں پہلے نمبر پر عیسائی مبلغین آتے ہیں جنہوں نے ہندوؤں کے مذہب، رسم و رواج اور ان کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ اس بنا پر کیا کہ یہاں عیسائیت کی تبلیغ کے امکانات کا جائزہ لیا جائے اور اپنے آپ کو مباحثوں اور مناظروں کے لئے تیار کر کے ان امکانات کو روشن سے روشن تر کیا جا سکے۔ ان کے مطالعات اگرچہ اس مخصوص نقطۂ نظر سے وجود میں آئے لیکن ان کے ملاحظات حقائق کے بہت قریب تھے گو وہ ان اعلیٰ مذہبی احساسات کی، جو ویدوں اور اپنشدوں میں ملتے ہیں صحیح ترجمانی نہ کر سکے تاہم انہوں نے اس وقت تک ہندوؤں کے بارے میں صحیح اور واضح تفصیلات ضرور مہیا کیں اور ان میں آج بھی کئی ایک تحریریں اس موضوع پر حرفِ آخر ہیں۔ ان مبلغین میں ہنری لارڈ نے ۱۶۳۰ء میں ایک کتاب "نیا مذہب" پر شائع کی۔ ایک ولندیزی مبلغ ابراہم راجر نے ۱۶۵۱ء میں اور دوسرے ولندیزی فلپ بالڈؤس نے ۱۶۷۲ء میں اپنی تحریریں شائع کیں۔ ولکنز نے اپنی کتاب ۱۸۰۸ء میں شائع کی جو ایک اہم تصنیف خیال کی جاتی ہے لیکن ان سب میں معتبر تصنیف ایبے ڈوبائی کی ہے جو ۱۸۱۷ء میں منظر عام پر آئی اور آج بھی ہندوستان پر تصانیف میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

دوسرے نمبر پر انگریز انتظامیہ کے وہ اہل کار اور حکام آتے ہیں جن کا کام اس سرزمین کا مطالعہ ان مختلف نقطہ ہائے نظر سے کرنا تھا جن سے ان کے روزمرہ کے انتظامی کاموں میں آسانیاں پیدا ہو سکیں اور حاکم و محکوم کے درمیان جو سات ہزار میل چوڑی خلیج حائل تھی وہ کم سے کم تر ہو جائے۔ چنانچہ علم الانسان، لسانیات، فنون، مذہب، قوانین، رسم و رواج وغیرہ کے مطالعوں کا آغاز انتظامی مقاصد کے تحت انہی لوگوں کے ذریعے عمل میں آیا ان میں سرفہرست لارڈ وارن ہیسٹنگز تھا جس نے اس موضوع پر کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز کو ایک طویل مراسلہ روانہ کیا اس کے بعد سر ولیم جونز ہیں جو کلکتہ کی عدلیہ کے سربراہ کی حیثیت سے یہاں آئے۔ وہ کئی زبانوں پر حاوی تھے اور ان کی زبان دانی نے ہندوستان سے متعلق معلومات میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ انہی کی سربراہی میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا سنگ بنیاد ۱۷۸۴ء میں رکھا گیا۔ ان میں ایسے لوگ بھی

تھے جنہوں نے اس ضمن میں مالی اعانت سے بھی دریغ نہ کیا۔ کرنل بُوڈ نے ۲۵ ہزار پاؤنڈ کی خطیر رقم سے کیمرج یونیورسٹی میں سنسکرت کی ایک پروفیسر شپ قائم کی جو آج تک چلی آ رہی ہے۔ مقصد اس ادارے کا یہ تھا کہ سنسکرت کے علم کی وساطت سے کرنل بوڈ کے ہم وطن ہندوستان میں عیسائیت پھیلانے میں زیادہ کامیاب ہو سکیں اسی زمانہ میں کولبروک نے ویدوں اور متعلقہ ادب کا براہِ راست مطالعہ کیا اور ان کا کام آج بھی احترام کا متقاضی ہے۔

تیسرے نمبر پر وہ ہندو علما آتے ہیں جو ان موضوعات پر اپنا مخصوص ہندو نقطۂ نظر پیش کرنا چاہتے تھے ان لوگوں کی روش معذرت خواہانہ تھی تاہم ان کے کام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں راجہ رام موہن رائے، بال گنگا دھر تلک، راجہ سریندر موہن ٹیگور اور بندھارکر پیش پیش تھے۔

اسی اثنا میں محکمہ آثار قدیمہ بھی اپنا کام شروع کر چکا تھا چنانچہ اس محکمہ کی کاوشوں سے اور ان تین مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے علماء کے کام کی وساطت سے وہ شعبہ وجود میں آیا جسے ہم انڈالوجی کہتے ہیں جس کا مقصد ہندوستان سے متعلق ہر موضوع پر کام کرنا ہے۔ دنیا کی ہر بڑی یا اہم دانش گاہ میں انڈالوجی کا شعبہ قائم ہو چکا ہے اور اس سے وابستہ لوگ اس موضوع پر اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔

علم الانسان کے شعبہ میں ای بی ٹائیلر، ہربرٹ سپنسر، لیوی بردہل، اینڈریو لینگ اور ایمل درخائم ایسے لوگ ہیں جنہوں نے وحشی قبائل کا مطالعہ کیا اور ان کے اساطیر کے ان مخارج تک پہنچے جن میں ٹوٹم ازم، مظاہر پرستی، مردہ پرستی، اشیا پرستی، سورج اور چاند کی پرستش اور ارواح تجسیم پرستی جیسے موضوعات ہیں۔

لسانی مطالعہ کرنے والوں میں میکس میولر، سر مونیر مونیر ولیمز، میئر اور برگینو BERGAIGNE سرفہرست ہیں ان لوگوں نے مندرجہ بالا موضوعات میں سے کسی ایک سے متعلق ہو کر لسانی مطالعات کے ذریعہ اکٹھی کی ہوئی شہادت کی بنا پر ان اساطیر کے بارے میں کوئی نہ کوئی نظریہ وضع کیا اور اس کے ابلاغ میں مصروف رہے۔

انیسویں صدی کے دور میں انڈالوجی کو فروغ دینے والوں میں فرائیڈ، ژنگ، شمٹ، فریزر، جیلن، ہیریسن اور ہک ایسے لوگ ہیں جنہوں نے وحشی قبائل کے معاشروں کا مطالعہ کیا اور پھر اس کا اطلاق ہندوستان کی صورتحال پر بھی کیا۔ دوسری طرف ڈیموزیل رینو، جے گونڈا، زمر اور کمارا سوامی جیسے علماء ہیں جو بنیادی طور پر تو انڈالوجسٹ ہی ہیں لیکن ان کے مطالعوں کے ساتھ ساتھ دوسرے شعبوں میں ان کے متعلق جو کام ہو رہا ہے اس سے بھی کماحقہٗ واقف ہیں۔ ژونک جس کے کام کی بنیاد فرائڈ کے نظریات پر تھی ARCHETYPE کے نظریہ کا بانی ہے۔ اس کے خیال میں انسان آرکیٹائپس میں سوچتا ہے جو اس کے اجتماعی لاشعور میں پیوست ہے اور اساطیر انہی آرکیٹائپس ہی کے مظہر ہیں۔ یہ نظریہ کافی مقبول رہا لیکن چونکہ ژونگ نے اساطیر کی تعبیر کرتے وقت نظر انداز کر دیا وہ یہ ہے کہ اساطیری سوچ کے ساتھ ساتھ انسان کے ذہن کی منطقی سوچ بھی چلتی رہی ہے اور اس امر کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مزید ایک اور امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اس حکیم نے مذہبی رسومات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ یہ مذہبی رسومات اور اساطیر آپس میں منطقی طور پر لازم و ملزوم ہیں[۲]۔ فریزر نے اپنے کام میں مختلف وحشی معاشروں کے جغرافیائی قرب یا بُعد کو بہت اہمیت دی اور جادو اور مذہب کو آپس میں خلط ملط کر دیا مذہبی رسوم

کا مطالعہ کرنے والی جین ہیریسن اور اس میدان میں اس کے رفقائے کار گلبرٹ مرے اور کک نے اساطیر اور مذہبی رسومات کے باہمی تعلق پر نظر ثانی کی اور اساطیر کی تاویل متعلقہ رسومات کے ذریعے کرنے کی کوشش کی۔

ان موضوعات پر تحقیقات سے مختلف علوم کے افق وسیع ہوئے اور ان میں پیش پیش اساطیر کا علم تھا۔ لیکن سماجی علم الانسان کے حکما نے اپنے نتائج کا انطباق ہندوؤں کے اساطیر پر کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ علم آثار قدیمہ ابھی وہ بنیادی ڈھانچہ مرتب نہیں کر پایا تھا جس پر ہندو اساطیر کے مطالعہ کی بنیاد رکھی جاتی۔ دوئم برصغیر ہر دو جگہوں سے بہت دور تھا جہاں علم الانسان اور اس کے متعلقات پر تحقیق ہو رہی تھی یعنی وہ وحشی قبائل جن کو ABORGINIES کہا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ متمدن علاقے جو یورپ میں واقع ہیں اس طرح ہندوؤں کے اساطیر کو بطور امثال یورپی مطالعوں میں جگہ تو ضرور ملی لیکن ان کا مفصل اور منظم مطالعہ گہری نظر سے نہ ہو سکا موجودہ دور میں ہندوؤں کے اساطیر کو بطور امثال استعمال کرنے والوں میں زمر اور ان کا شاگرد رشید جوزف کیمبل آتے ہیں کیمبل صاحب اپنی نظریاتی کتاب MASKS OF GOD چار جلدوں میں مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں۔

لسانیات کے شعبہ پر میکس میولر سایہ فگن رہا اور اس شعبہ میں اس کا سکہ چلتا رہا لیکن موجودہ دور میں ڈیوزل، گونڈا اور رینو نے اس مطالعہ کے خطوط مختلف سمتوں میں متعین کئے اس کے برعکس کماراسوامی اور زمر کے اساطیری مطالعہ پر فلسفہ کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ وہ اساطیر میں علامتی عناصر کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور بسا اوقات ان کو مابعد الطبیعاتی رنگ بھی دے دیتے ہیں۔ زمر نے ایک شوشہ تو وہ چھوڑا ہے جس سے ہمارے ہاں کے ابن الوقت قسم کے لوگوں نے جن کا اس موضوع پر مطالعہ نہ ہی گہرا ہے اور نہ ہی وسیع، حتی المقدور خوب فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس میدان میں اپنے نام کے علم وقتی طور پر بلند کرنے کی ناکام سعی بھی کی ہے۔

زمر کا شاگرد مذکورہ بالا جوزف کیمبل جس نے زمر کی وفات کے بعد اس کے کام کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے زمر سے اس حد تک متاثر ہے کہ وہ زمر کے خطوط پر ہی کام کرتا رہا اور جو شوشہ اس نے چھوڑا تھا جوزف کیمبل اسی کے ابلاغ اور اثبات میں سرگرم عمل رہا۔

اس تحقیق و تفحص سے انڈالوجی میں مطالعہ کے جو خطوط متعین ہوئے ان کا خاکہ کچھ یوں ہے:۔

۱۔ کئی حکما نے متعدد تصانیف بطور مدخلوں کے تیار کیں جو ہندومت کے عناصر اور اجزائے ترکیبی کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ تصانیف مبتدیوں کو عام فہم زبان میں ہندو مذہب اور اس کے بنیادی اصولوں سے روشناس کراتی ہیں

اسی قسم کی کئی ایسی تصانیف بھی معرض وجود میں آئیں جو ہندو دھرم کو تاریخی تناظر میں دیکھتی ہیں اور زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر موجودہ دور تک ہندومت کے ارتقا کا تاریخی جائزہ لیتی ہیں اور ان اسباب کی نشاندہی کرتی ہیں جن کے طفیل ہندو مذہب میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔

۲۔ ہندو فلسفہ پر تصانیف کے ایک سلسلے کا آغاز ہوا اور یہ عمل ابھی جاری ہے اس سلسلہ میں دو قسم کی تصانیف شامل ہیں اوّل وہ جو ہندوؤں کے تمام مکاتیب فکر کا احاطہ کرتی ہیں اور ان کے علائم و رموز پر نظر ڈالتی ہیں دوئم وہ تصانیف

جو کسی ایک مکتبِ فکر کو موضوع بنا کر اس کا گہرا اور عمیق مطالعہ کرتی ہیں۔

۳۔ ان تمام علمی کاوشوں میں بسا اوقات معروضی عنصر کی کمی نظر آتی ہے کیونکہ ان کی تصنیف میں تفسیر، تاویل، قیاس اندازے اور تخمینے دانستہ یا نادانستہ طور پر داخل ہو جاتے ہیں۔ انڈالوجی میں اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں چنانچہ ان موضوعی عناصر کے سدباب کے لئے حکماء نے اس مذہب سے متعلق بنیادی تصانیف کے تراجم کی طرف رجوع کیا تاکہ عام قاری طالب علم، مبتدی اور محقق بلاواسطہ ان کا جائزہ لے سکے اور خود ان کے مطالب و معانی کے بارے میں اپنے نظریات وضع کر سکے۔ اس قسم کے سب سے زیادہ ثقہ تراجم جرمن زبان میں ہوئے ہیں۔ دوسرے نمبر پر فرانسیسی تراجم آتے ہیں اور آخر میں انگریزی۔ راقم الحروف کی طرح جو لوگ محض انگریزی تراجم اور کتابوں پر انحصار کرتے ہیں خسارے میں ہیں کیونکہ انڈالوجی اور ہندوازم پر بہترین مواد صرف جرمن اور فرانسیسی زبان میں ہی دستیاب ہے اور وہ ہماری دسترس سے باہر ہے۔ ان تصانیف کا خال خال انگریزی ترجمہ بھی ہوا ہے لیکن ہمارے ہاں ان کا بھی مکمل فقدان ہے۔

انگریزی تراجم کی ابتدا میکس میولر نے کی۔ اس کا شروع کردہ یہ سلسلہ SACRED BOOKS OF THE EAST کے نام سے معرضِ وجود میں آنا شروع ہوا۔ اس کی پچاس جلدیں مرتب ہوئیں ان میں ہندو مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب بھی شامل تھے اس لئے ایک اور مخصوص سلسلہ شروع ہوا جس کا نام SACRED BOOKS OF THE HINDUS تھا اس کی تیس جلدیں مرتب ہوئیں۔

ان کے علاوہ مستشرقین کئی مخصوص کتابوں کے تراجم بھی کرتے رہے۔ ان کتابوں میں ویدوں کے تراجم کو اولیت حاصل ہے ان میں میکڈانل اور ایک اور فاضل گرفتھ کے رگ وید کے تراجم، ہری دامودر ویلنکر کا رگ وید کے ساتویں منڈل کا ترجمہ، بھاوے کا سوم رس سے متعلق نظموں کا ترجمہ اہم خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ عام فہم تراجم ہیں اس وجہ سے ثقہ حکما جیلنڈرا اور رینو کے رگ وید کے ترجموں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں تاہم افضل ترین ترجمہ ہرمن اولڈنبرگ کا خیال کیا جاتا ہے اور اس موضوع پر سنجیدہ تحقیق کا یہی محور ہے۔

۴۔ یہ ساری کاوشیں اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن انڈالوجی میں اہم ترین مقام ان تصانیف کا ہے جو استشاری کتب کی ذیل میں آتی ہیں۔ اگر ہم ان کتابوں کو نظرانداز بھی کر دیں جو ہندو مذاہب کا خصوصی مطالعہ نہیں کرتیں جیسے ہیسٹنگز کی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ہے جس میں دوسرے مذاہب کے علاوہ ہندوازم کے بیشتر پہلوؤں پر تفصیل نے عمیق نظر ڈالی ہے تو بھی ہمارے سامنے ایسی کتابوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ پھیلا ہوا ہے جو قدم قدم پر اس مذہب کا مطالعہ کرنے والوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ اس سلسلہ کو فروغ دینے والوں میں رادھا کرشنن، ولیم تھیوڈور، فارقوہر، کمارا سوامی، داسن، بھٹا چاریہ، نیل کنٹھ شاستری، ونٹرنز، امینو، وشوبندھو شاستری، میکڈانل، کیتھ، واکر، تھیوڈور ڈی بیری جیسے مشہور و معروف علما شامل ہیں (۴)

مندرجہ بالا سطور سے انڈالوجی کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو جانا چاہیئے اس سے یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ یہ موضوع اب دنیاوی علوم کا ایک اہم شعبہ بن چکا ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے مخصوص موضوعات کو مثلاً آریا اور ان سے متعلقہ

مسائل، ویدک مذہب پر خصوصی مطالعے، اپنشدوں کے مطالعے، اساطیر، براہمنوں کی وضع کردہ مذہبی رسومات، قربانیاں اور ان سے متعلقہ امور، قوانین، دھرم شاستر، ذات اور ورن کی بحث، بدھ مت، جین مت اور ہندو دھرم کے دوسرے فرقے اور عبادات کے طریقوں کو اختصار کے پیش نظر شامل نہیں کیا اور نہ ہی آثارِ قدیمہ سے متعلق امور کو اس جائزہ میں شامل کیا ہے۔

لیکن باقی ہندوستان کو چھوڑ کر ہمیں وادی سندھ اور اس کے متعلقات کو موجودہ بحث کے پیش نظر ایک دفعہ پھر دیکھنا ہوگا ہڑپہ کی کھدائی ۱۹۲۱ء میں شروع ہوئی اور اس کھدائی سے متعلق انکشافات، ان کی تعبیر اور تاویلات پر مبنی سر جان ہیوبرٹ مارشل (۱۸۷۶ - ۱۹۵۸ء) کی پہلی رپورٹ ۱۹۳۱ء میں تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کے بعد بھی کھدائی ہوتی رہی اور وقتاً فوقتاً اس کھدائی کی داستان مارشل کے متعین کردہ خطوط پر جاری رہی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارنسٹ جے ایچ میکے کی کتاب موہنجوداڑو پر ۲ جلدوں میں ۱۹۳۸ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۱۹۲۷ سے لے کر ۱۹۳۱ء تک کے انکشافات کا احاطہ کرتی ہے۔ مادھو سوپ والس نے اپنی کتاب ہڑپہ کی کھدائی کے بارے میں ۲ جلدوں میں شائع کی اس کا موضوع وہ دریافتیں ہیں جو ۱۹۳۴ کے بعد ہڑپہ میں ہوئیں۔ ارنسٹ جے ایچ میکے نے اپنی دوسری کتاب چنہوداڑو کے بارے میں ۱۹۴۲ء میں شائع کی۔ اس کے بعد سر مارٹیمر وہیلر کا زمانہ آجاتا ہے۔ آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے اس ماہر آثارِ قدیمہ کے کام سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ بہرحال اجمالاً عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ ماہر آثار قدیمہ مارشل کے تعین کردہ خطوط پر ہی کام کرتا رہا۔ اس کے اور مارشل کے استدلال میں کافی مطابقت پائی جاتی ہے اور ان نتائج میں بھی جو اس استدلال کی بنا پر مرتب ہوئے لیکن اب نئی دریافتوں اور شہادتوں کے پیش نظر اور پرانی دریافتوں کے نئے تجربات کی بنا پر اس ماہر کے نظریات میں بہت تبدیلی آگئی ہے جس کا ذکر آگے آئیگا۔ ان دونوں اور ان کے ایک اور رفیق کار پروفیسر پگٹ کے خیالات میں اس موضوع پر کافی ہم آہنگی ہے کہ ہڑپہ کلچر نے آریا کلچر کو بے انتہا متاثر کیا۔ لیکن اس کے برعکس کیمبرج کے پروفیسر آلچن اور ان کی بیگم کا نظریہ یہ ہے کہ اگر آریا اور ہندو مت متاثر ہوئے ہیں تو وہ دکن کے لوگوں کے عقائد، رسومات اور رواجوں سے[۱۴] لیکن اب ان کے موقف میں بھی تبدیلی آنا شروع ہوگئی ہے۔ آثارِ قدیمہ پر ابھی کام جاری ہے اور روز بروز نئے انکشافات ہو رہے ہیں اور ان کی بنا پر نئے نظریات بھی مرتب ہو رہے ہیں، جن کا ایک اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے۔

(۱) آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے عوام اور خواص دونوں میں یہ امر اعتقاد کا درجہ رکھتا تھا کہ برصغیر میں ایک قوم آباد تھی جس کو عرف عام میں دراوڑ کہا جاتا تھا یہ کالے رنگ، چپٹی ناک، موٹے ہونٹ اور تنگ پیشانیوں والے لا مذہب لوگ خیال کئے جاتے تھے ان کا اگر کوئی مذہب تھا تو اس کی صورت انتہائی بھونڈی اور مکروہ تھی۔ زندگی کے کسی شعبہ میں ان کے بارے میں ترقی کے کوئی نشانات نظر نہیں آتے تھے۔ ہندوستان کے ان لوگوں کی یہ حالت رگ وید سے اخذ کی گئی ہے اور اس وقت کے حکما نے یہ نہیں سوچا کہ ضروری نہیں یہی لوگ دراوڑ ہوں۔ یہ اور لوگ بھی ہو سکتے تھے جو شاید ہندوستان سے باہر ہی کے رہنے والے ہوں یا یہیں کے پس ماندہ قبائل میں سے ہوں۔

ان قبائل پر ان لوگوں نے حملہ کیا جو اپنے آپ کو آریا بمعنی برگزیدہ یا نوبل کہتے تھے اور ان مقامی باشندوں کو

تہس نہس کر دیا۔ پنجاب اور اس سے ملحقہ علاقوں کے لوگ اپنی جانیں بچا کر دکن اور ہندوستان کے جنوبی اور مشرقی علاقوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ آریاؤں نے ان کے گھروں، آبادیوں اور زمینوں پر قبضہ کر لیا جو دراوڑ بھاگ نہ سکے وہ غلام بنا لئے گئے اور ان کی عورتوں کو اپنے گھروں میں ڈال لیا گیا۔ ان کو داس کہا جانے لگا۔ یہ آریائی طبقاتی تقسیم کا چوتھا رکن یعنی شودر بن گئے۔ معاشرے کے گھٹیا ترین کام ان کے ذمے لگا دیئے گئے۔

آریاؤں کا شودروں اور دراوڑوں کی عورتوں کو اپنے معاشرے میں جگہ دینا ان کی عظیم ترین غلطی تھی کیونکہ اس سے ان کی نجیب الطرفینی میں فرق آ گیا اور دوم ان لوگوں کے مذہب اور عقائد پر ایسے اثرات مرتب ہونے شروع ہوئے جو آریائی مذہب کی روح کے خلاف تھے چنانچہ جہاں خون بھرشٹ ہوا وہاں ان کا مذہب بھی ناپاک غیر آریائی عناصر سے شدید طریقہ پر متاثر ہوا جس میں لنگم کی پوجا شامل ہو گئی۔ دیویاں در آئیں۔ پتھروں کی پوجا ہونے لگی جنسی لذت اور جنس پرستی اسی وجہ سے آریائی مذہب میں داخل ہو گئی وغیرہ وغیرہ اور کئی غیر آریائی دیوتا ان دراوڑ عورتوں کی وجہ سے آریاؤں نے اپنا لئے اور وہ ہندوازم کا حصہ بن گئے۔ نتیجہ کے طور پر آریائی نسلی اور مذہبی عناصر بُری طرح مجروح ہو گئے اور اس بنا پر ویدک عہد میں، براہمن عہد میں اور موجودہ دور کے ہندومت میں ارفع و اعلیٰ عناصر سراسر آریائی ہیں لیکن جنسی مظاہر پرستی کی مختلف صورتیں اور جنسی پرستی کے مختلف عناصر، غرضیکہ ہر اسفل عنصر جو اس وقت ہمیں ہندومت میں نظر آتا ہے وہ غیر آریائی ہے اور اس کا مخرج دراوڑوں اور دراوڑی تہذیب میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

(۲) اس تصویر کا دوسرا رُخ اگرچہ انہی رنگوں سے تیار ہوا ہے لیکن اس کا تاثر مختلف ہے۔ اس مکتبِ فکر کے حامی یہ خیال کرتے ہیں کہ موجودہ دور کے ہندو دھرم میں تمام عناصر غیر آریائی ہیں اور معدودے چند ایسے عناصر ہیں جن کو ہم آریائی تہذیب کی باقیات کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی صرف نشانیوں کے طور پر نظر آتے ہیں۔

(۳) یہ دونوں نظریات موجودہ تحقیق کے پیش نظر رد ہو چکے ہیں اور اس دور کے حکماء اس مسئلہ کو مختلف تناظر میں دیکھ رہے ہیں۔ ان حکماء کے بھی دو گروہ ہیں اول وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ جب آریا ہندوستان میں داخل ہوئے تو وہ مختلف اوقات میں "لہروں" کی صورت میں آئے۔ اس طرح یہ نو وارد قبائل اپنے ساتھ اپنی پوری زندگی کا اثاثہ، بیوی بچے، مویشی، گھوڑے، رتھ وغیرہ لے کر یہاں پہنچے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کی تعداد خاصی ہو گئی۔ چونکہ یہاں کے باسیوں کے اور ان نو وارد قبائل کے درمیان تہذیبی اور ثقافتی اختلافات تھے اور آریائی قبائل اپنے آپ کو مقامی باشندوں کے مقابلے میں افضل خیال کرتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی تہذیب و ثقافت اور مذہب کو غیر آریائی عناصر سے محفوظ رکھنے کے لئے اقدامات کئے۔ آریا اپنے رنگ یعنی ورن کو بہت اہمیت دیتے تھے اور آج بھی دیتے ہیں چنانچہ اس ورن کو بنیاد بنا کر انہوں نے ورن، گوتر اور ذات پات کا ایسا مربوط و منظم حصار اپنے چاروں طرف تعمیر کر لیا کہ غیر آریائی عناصر کا ان کے سماج میں داخلہ ناممکن ہو گیا۔ ورن، گوتر اور ذات پات کا یہ آہنی شکنجہ اس قدر مضبوط تھا کہ باوجود انگریزی روایات اور تعلیم اپنانے کے اور باوجود اس جہاد کے جو مہاتما گاندھی نے ساری عمر اس ادارے کے خلاف کیا، ہندو کا ذہن اس شکنجہ کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکا۔ ان کوائف کی بنا پر جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ویدک عہد سے لے کر آج تک غیر آریائی عناصر ہندوازم میں داخل نہیں ہو سکے۔ آریائی عناصر ذات پات کے اس حصار کے اندر رہ کر کروٹیں بدلتے رہے اور ان کی

نوعیت میں فرق ضرور آتا گیا لیکن انہوں نے اپنی اصلیت کبھی ضائع نہیں ہونے دی اور وہ کسی مقامی تہذیب یا تمدن سے متاثر نہیں ہوئے۔

اس نظریہ کی تائید میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ کلچر بھی چند ایک اصولوں کے تحت حرکت کرتا ہے اور ان اصولوں کی پابندی کرتا ہے۔ ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ کلچر کے ارفع عناصر نیچے کی طرف حرکت کرتے ہیں لیکن اسفل عناصر اوپر کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ یہ آزمایا ہوا اصول ہے اور تجربہ کی بنا پر قائم ہے۔ صرف ایک تاریخی مثال سے ہی بات واضح ہو جاتی ہے۔ انگریز ہمارے ہاں دو سو سال رہ کر گیا ہے اس نے ہندوستان کے کلچر کو کس حد تک اپنایا؟ اور ہم جو محکوم قوم تھے اس کے کلچر سے کس حد تک متاثر ہوئے؟ اور یہ عمل دوسری قوموں اور ممالک میں بھی نظر آتا ہے جہاں نو آبادیاتی نظام رائج رہا ہے اور اگر تاریخ میں ذرا اور پیچھے جائیں تو معاملہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

(۴) اسی نظریہ کا ایک وسیع تر اور جامع ورشن یہ ہے کہ آریاؤں کے تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی عناصر ان کے ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے، داخلہ کے وقت اور مابعد کے عناصر میں جو تبدیلیاں اور تغیرات واقع ہوئے ہیں ان کا جائزہ ان کی زندگی کے اندرونی سماجی، تمدنی اور اقتصادی حالات کی روشنی میں لینا چاہیئے۔ باغاز کوئی کے وقت ان کے دیوتا اندر، متر، ورونا وغیرہ موجود تھے اور فعال تھے لیکن ان کے ہند میں داخلے کے ساتھ ہی ان کی فعالیت اور اہمیت میں فرداً فرداً اور من حیث الجماعت فرق آنا شروع ہو گیا۔ جب آریاؤں کے قدم یہاں جم گئے اور وہ فارغ البالی سے دوچار ہوئے تو یہ دیوی دیوتا پس منظر میں چلے گئے اور ان کی جگہ دوسرے دیوی دیوتاؤں نے لے لی۔ ہند میں داخلے کے وقت ان کی تعداد ۳۳ تھی لیکن داخلے کے بعد ان کی تعداد ۳۳ ہزار اور کچھ ہو گئی اور ساتھ ہی ان کی اہمیت اور ان کے کردار میں فرق آگیا۔

دیکھنا یہ ہے کہ ان کے پیچھے سماجی اور اقتصادی عوامل کارفرما تھے یا یہ محض مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی عوامل کی پیداوار تھے یا ان پر ان کی آمد سے پہلے کی تہذیب یا تہذیبیں اثرانداز ہوتی رہیں اور آریائی عناصر کو ترمیم و تنسیخ کے مراحل سے گزرنا پڑا، یا اس میں انسانی فطرت کا دخل ہے۔ انسانی زندگی میں ایک عمل مسلسل جاری رہا ہے اور وہ ہے "تراشیدم، پرستیدم، شکستم" اور ہر دور میں انسانی فکر اپنی ضرورت اور حاجت کے مطابق اپنے خداوندوں کی تراش خراش کرتا رہا۔ اگر ایک برہمن زادہ نے جس کو "رمز آشنائے روم و تبریز" ہونے کا دعویٰ تھا یہ بھی تو کہا تھا:

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

یہ محض شاعری نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کی ایک سنگلاخ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن حکیم میں بھی اشارہ ملتا ہے (۵) اور یہ حقیقت انسانی فطرت پر اسی طرح صادق آتی ہے جیسے کوئی سائنسی اصول زندگی پر ثابت آتا ہے۔ اپنی حاجات اور ضروریات کے مطابق اپنے خداؤں کی تشکیل کے عمل کا جاری و ساری ہونا آریاؤں کے دیوتاؤں کی اہمیت اور فعالیت کے ردوبدل میں صاف اور واضح نظر آتا ہے۔

دیوموزیل نے ان دیوتاؤں کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے۔

اوّل :- وہ دیوتا جو اپنی ساحری سے کائنات میں نظم و ضبط قائم رکھتے ہیں اور فطرت کی طاقتوں پر حکمران ہیں۔

دوئم : وہ دیوتا جو جنگ و جدل پر قدرت رکھتے ہیں اور جنوں، بھوتوں، راکھشسوں سے یعنی زندگی کی منفی قوتوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور ان پر غلبہ پاتے ہیں یہ سماوی ضابطوں کا انسانوں پر نفاذ کرتے ہیں۔

سوئم :- اس زمرے میں وہ دیوتا آتے ہیں جو اقتصادی قوتوں پر اپنی گرفت رکھتے ہیں۔ اقتصادی تقاضوں پر ان کو پوری قدرت حاصل ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ نوع انسان کی افزائش کی بھی خبرگیری کرتے ہیں۔

یہی نقشہ ہمیں انسانی سماج میں نظر آتا ہے کم از کم ہند یورپی اقوام کے ہاں خواہ وہ روم میں ہوں یا یونان یا ہندوستان میں دیوتاؤں کے یہ مراتب انسانی سماج کے اصولوں پر قائم کئے گئے ہیں۔ اس سماج میں براہمن، کشتری اور ویش کے تصورات نے دیوتاؤں کی اس ترتیب کے لئے اساس مہیا کی۔ اس اصول کا مظہر ان کے سیاسی نظام میں نظر آتا ہے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عہد قدیم سے لے کر اب تک ہندوؤں کے ہاں بھی دیوتاؤں کی یہی تقسیم رہی ہے جن کو اصطلاحاً آدتیہ، رودرا اور واسیو کہا جاتا ہے۔(۶)

سماج کی اس عمودی تقسیم میں ویدک عہد میں ایک انسان اس طبقہ سے نکل کر دوسرے طبقہ میں داخل ہو سکتا تھا یعنی ایک کشتری براہمن بن سکتا تھا یا ایک ویش کشتری۔ یہ ویدک سماج کا ایک مسلمہ اصول تھا جس میں انسان کی اپنی صلاحیت کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ کوئی وجہ نہیں کہ دیوتاؤں کی اس ترتیب و تقسیم میں جو بنا بر خود انسانی معاشرہ پر مبنی تھی ایک دیوتا اپنے طبقہ سے نکل کر دوسرے طبقہ میں داخل نہ ہو سکتا ہو۔ چنانچہ ان دیوتاؤں کی اہمیت اور فعالیت رد و بدل کا اصول ایسے ہی کارفرما تھا جیسا کہ ویدک معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ رگ وید کے دیوتا سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے ہیں اور انہی حالات کے تحت ان کی فعالیت اور اہمیت میں متواتر اور مسلسل فرق آتا چلا گیا۔ کچھ دیوتا پس منظر میں چلے گئے کچھ اپنے بلند مرتبہ سے نیچے آ گئے اور وہ دیوتا جو غیر اہم تھے اور بہت کم فعال تھے حالات کی تبدیلیوں کی وجہ سے اہمیت اختیار کر گئے اور زیادہ فعال اور طاقتور ہو گئے(۷) اس عمل کی بہت سی مثالیں ہند و علم الاصنام میں نظر آتی ہیں لیکن انڈالوجی کے مختلف مکاتیب فکر کی وجہ سے شاید ان میں کچھ متنازعہ فیہ نظر آئیں اس لئے ہم اس وقت صرف ایک ہی دیوتا یعنی اندر کی مثال پر اکتفا کرتے ہیں جو رگ وید کے زمانے میں اہم ترین دیوتا تھا لیکن اتھر وید کے زمانے میں جنگ و جدال سے دست بردار ہو کر وہ منوں، تاجروں اور بقالوں کا دیوتا بن گیا(۸)

یہ انڈالوجی کے مختلف مکاتیب فکر کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس علم میں پچھلی نصف صدی میں کتنی وسعت پیدا ہوئی ہے اور تحقیق کے ساتھ اس وسعت میں مزید کتنے اضافے ہو رہے ہیں۔

اس بحث میں سب سے زیادہ دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ اس علم کی بنیاد آثار قدیمہ کے علاوہ ہندوؤں کے مذہبی ادب خصوصاً رگ وید پر قائم ہے۔ ان مکاتیب کے ہر مفکر نے اس کتاب کو اپنے خاص نقطہ نظر سے دیکھا ہے علم حیاتیات نے اس کی زبان سے استنباط کیا ہے۔ ماہرین تاریخ نے اس کی مناجاتوں میں تاریخی واقعات و انقلابات کا پتہ چلانے کی کوشش کی ہے ان دونوں طرح کی کوششوں میں کبھی تائید اور کبھی تضاد کا انکشاف ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی تاریخی یا

لسانیاتی شہادتیں حتمی اور فیصلہ کن اس وقت تک نہیں ہیں جب تک ان کی تائید آثار قدیمہ کی شہادت سے نہ ہو۔ کئی حکماء نے اس کتاب کے بیان کردہ علم الاصنام اور اساطیر سے استنباط کرکے اس زمانے کی تاریخ اور معاشرے کے خدوخال متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور کئی حکما نے اپنے مخصوص خیالات کے لئے فکری اساس اسی کتاب میں تلاش کی ہے یہ سب شہادتیں بسا اوقات متضاد نتائج مرتب کرتی نظر آتی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اس واحد دستاویزی شہادت کے بارے میں کئی امور تصفیہ طلب ہیں۔

۱۔ اس کتاب سے استنباط کرتے وقت پہلی دقت جو پیش آتی ہے وہ اس کی متروک اور مبہم زبان ہے جس کا اندازہ ۵۰۰ ق م کے لگ بھگ ہوگیا تھا اور اس کتاب کے الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لئے ایک کتاب اور وجود میں آئی ابہام کا وجود کئی حکما تسلیم کر چکے ہیں

۲۔ حکما ابھی تک یہ طے نہیں کر پائے کہ یہ کتاب کہاں مدون ہوئی۔ کوئی کہتا ہے کہ رگ وید پنجاب میں تصنیف ہوا کوئی اسے ہند میں آریاؤں کی آمد سے پہلے کی کتاب خیال کرتا ہے اور ہندو علماء اسے ازلی کتاب گردانتے ہیں جو کائنات کی تخلیق کے ساتھ وجود میں آئی۔

۳۔ جیسے اس کتاب کی تدوین کی جگہ کا تعین نہیں ہو پایا ویسے ہی اس کتاب کی تدوین کا وقت بھی ابھی طے نہیں ہو سکا اور اس کے بارے میں مختلف اندازے اور تخمینے لگائے جا چکے۔ اس کی تاریخ طے کرتے وقت یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ یہ کتاب ۱۰۲۰ مناجاتوں کا مجموعہ ہے جو مختلف رشیوں کی تصنیفات ہیں جو بیک وقت اور ایک ہی جگہ پر معرض وجود میں نہیں آسکتیں۔ ان کی تصنیف ایک عرصہ پر پھیلی ہوئی چاہیئے اور مختلف مقامات پر ہم جس طرح آج کسی کتاب کی تاریخ کا تعین کرتے ہیں (جیسے اردو شاعری کا مزاج ۱۹۶۵ء کی تصنیف ہے) اس طرح ہم اس کتاب کی تاریخ کا تعین نہیں کر سکتے کوئی ایک سال یا صدی اس کی تصنیف کا زمانہ قرار دینا عاقبت نااندیشی کو دعوت دینا ہے۔ کئی انڈالوجسٹ اس عاقبت نااندیشی کا شکار ہو چکے ہیں فی زمانہ جو تاریخیں اس کتاب کے بارے میں مروج ہیں وہ محض سہولت اور سہل انگاری کی بنا پر تعین کر لی گئی ہیں[9]

اس طرح اس کتاب سے استنباط کی صورت وہی ہو جاتی ہے جو موہنجو داڑو اور ہڑپہ کی بربادی کا رشتہ آریاؤں کی آمد سے جوڑنے میں نظر آتی ہے اس کتاب کی تاریخی اہمیت اور موضوعات پر ہری پرشاد رچیا دلی نے ۱۹۶۰ء میں بنگالی زبان میں ایک خوبصورت تقریظ لکھی تھی جو سنیتی کمار چیٹرجی کے رگ وید کے ترجمہ کے ساتھ ۱۹۶۳ء میں بھی شائع ہوئی تھا اس میں یہ تمام نکات زیر بحث آئے ہیں اس تقریظ کا ایک سادہ اور آسان ترجمہ محولا بالا کتاب میں ملتا ہے[10]

ان تمام ملاحظات پر مستزاد رگ وید میں الحاقی عنصر بھی ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس دستاویز میں یہ الحاقی عنصر کیسے کیونکر اور کب در آیا۔[10] تمام ثقہ عالم اس بات پر متفق ہیں کہ ویدک مذہب پر بہترین شہادت ویدوں کی داخلی اور اندرونی شہادت ہے لیکن یہ داخلی شہادت کئی سوالوں کے جوابات دینے سے معذور ہے۔ اس وجہ سے اس موضوع کے حکماء کے درمیان اختلافات اس بنا پر پیدا ہو چکے ہیں کہ ویدوں کی اس شہادت کی تائید

ہیں خارجی شہادت کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔ اس سوال پر حکما دو گروہوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ اوّل وہ علما ہیں جو ویدوں کو ان ہند یورپی اقوام کا مذہبی لٹریچر سمجھتے ہیں جو ان کی ہندوستان میں آمد سے پہلے ہی وجود میں آ چکا تھا۔ اس لئے ان کے خیال میں تائیدی شہادت ہندوستان سے باہر تلاش کرنی چاہیئے۔ اس ضمن میں علم لسانیات اور علم اساطیر سے انہیں امداد کی بہت توقع تھی اگرچہ سر ولیم جونز نے لسانیات کے تقابلی مطالعہ کی ابتدا کی تھی لیکن اس کا بانی مبانی جرمن عالم اے کوہن تھا جو اگرچہ ماہر آثار قدیمہ تھا لیکن اس نے اس امر کی نشاندہی کی تھی کہ آریاؤں کے بارے میں ان کے مذہب کے مطالعہ سے بھی روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس خیال کو عملی جامہ پروفیسر میکس میولر نے پہنایا۔ اس نظریہ پر بحث آگے بھی آئے گی۔ اور اس کی خامیوں اور نارسائیوں پر ہمیں ایک نظر ڈالنا ہو گی۔

دوسرے گروہ میں وہ حکما شامل ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ یہ وید ہندوستان اور صرف ہندوستان کی پیداوار ہیں اور ان سے استنباط کرنے کے لئے مقامی حالات و واقعات، تاریخ اور مقامی محققین پر انحصار کرنا چاہیئے اور ویدوں کے بعد مذہب یا فکر کے جو مکاتیب وجود میں آئے ہیں ان کا ویدوں میں رشتہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

ان دونوں گروہوں کے علاوہ ہمیں ایک تیسرا گروہ بھی نظر آتا ہے یہ وہ مکتب فکر ہے جو ان کتابوں کو ازلی ابدی کلام سمجھتا ہے اور ویدوں کا کسی سرزمین سے متعلق ہونا اس مکتب فکر کے حامیوں کے لئے قابل قبول نہیں ان کے خیال میں وید تخلیق کائنات کے ساتھ وجود میں آئے تھے اور اسی صورت میں یہ آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں اس مکتب فکر کے حامیوں کی اکثریت ہندو علما پر مشتمل ہے جو مغربی انداز فکر کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور اہمیت نہیں رکھتی۔

ان اختلافات کے علاوہ بھی چند مزید متنازعہ فیہ مسائل ہیں جو ویدوں کی تعبیر و تفسیر سے متعلق ہیں وہ یہ اختلافات بہت اہمیت رکھتے ہیں ان میں چند مکاتیب فکر آج کل کی تحقیق کے بنیادی ستونوں کی اہمیت رکھتے ہیں

۱۔ ان ویدوں کے بارے میں یہ اعتقاد بنیادی ہے کہ یہ فطری قوتوں اور ان کے درمیان ایک رشتہ تلاش کرنے کی ایک جستجو اور ایک کوشش ہے جس سے ان فطری قوتوں کا ایک تصور قائم کرنا مقصود ہے۔ یہ نظریہ میکس میولر کا ہے اور تقریباً ایک صدی پرانا۔ اس نظریہ کے تحت میکس میولر نے ویدوں کی تفسیر میں فطری (نیچری) روایت قائم کی جس کا تتبع ہمارے زمانے تک کے علما نے کیا ہے۔ ان میں سرفہرست بلوم فیلڈ، میکڈانل اور کیتھ آتے ہیں ویدوں کی یہ تفسیر اور اس کے باقی مضمرات آگے چل کر زیر بحث آئیں گے۔

۲۔ میکس میولر کی قائم کردہ اس روایت کے خلاف رد عمل کے سرخیل برگینیو، ہرمن اولڈن برگ، الفرڈ ہلیڈبرانڈ اور دیوزیل ہیں ویدوں کے بارے میں ان حضرات کے خیالات کا ایک مختصر ترین خلاصہ یہ ہے۔

(i) مذہبی رسومات کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لئے ویدوں کی ایڈیر ایجاد کی گئیں یہ نکتہ بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست ویدوں کی تحریف اور الحاقی عنصر سے ہے اور ویدوں کے قدیم ترین حصہ میں اسی تحریف اور الحاقی عناصر کی نشاندہی کہیں اور بھی کی جا چکی ہے۔

(ii) ان محققین میں سے کچھ اس خیال کے بھی حامی ہیں کہ یہ مختلف نژاد قبائل کی سیاسی کش مکش کی کہانیاں ہیں

جن میں حکیم ابہیرس کے نکتہ نظر کے مطابق سیاسی کش مکش میں کامیاب ہونے والے قبائل کے ہیرو دیوتاؤں کے مناصب پر فائز کردیئے گئے۔ یہ نکتہ بھی اساطیر کی بحث کی ذیل میں آگے آئیگا۔

(۱۱۱) ویدوں کو فطری قوتوں یعنی گناہ و ثواب، نیکی اور بدی، صواب و ناصواب روشنی و تاریکی وغیرہ کی کش مکش کا آئینہ دار بھی گردانا گیا ہے۔

(۱۷) یہ ذکر اوپر آچکا ہے کہ ہند یورپی اقوام کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں ایک عمودی تقسیم تھی اور یہ سماج تین طبقات میں انسانوں کو تقسیم کرتا تھا۔ یہ طبقاتی تقسیم تمام ہند یورپی قبائل میں پائی جاتی تھی مثلاً روم، یونان، ایران اور ہند۔ اس عمودی تقسیم کے جواز کے لئے ویدوں میں مذکور دیوی دیوتاؤں کو ایک وسیلہ بنایا گیا ہے۔ ان دیوتاؤں میں بھی وہی سماجی تقسیم منعکس ہوتی نظر آتی ہے جو ہند یورپی قبائلی سماج میں تھی اس بصیرت افروز تعبیر کو پیش کرنے والا ڈمیوزل ہے اس کے اس نظریہ میں ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ گہرائی اور گیرائی کے ایک حسین امتزاج کے علاوہ صداقت اور حقیقت کی کھنک بھی سنائی دیتی ہے اس نکتہ کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے۔

(۷) ایک اور مکتب فکر کے مطابق ویدوں کو وحدت وجود کا ایک مابعد الطبیعیاتی علامتی مظہر بھی قرار دیا جاتا ہے۔

(۷۱) انڈالوجی کے کچھ ماہرین نے ویدوں کو اس سفید جادو سے بھی تعبیر کیا ہے جس کے ذریعے مذہبی رسومات کے اجزائے ترکیبی اور کائنات کے عناصر میں ہم آہنگی مقصود ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سارے مباحث انگریزی زبان میں بالتفصیل نہیں ملتے۔ انگریزی دان طبقہ جو انڈالوجی کا گہرا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس وجہ سے خاصا بدقسمت ہے اور ہمدردی کا مستحق تاہم ان مباحث کی چند جھلکیاں اور اجمالی خاکے کہیں کہیں انگریزی تراجم میں نظر آجاتے ہیں۔(۱۱)

ویدوں کی اور خصوصاً رگ وید کی شہادت۔ ان تمام کوائف کے پیش نظر مشتبہ، غیر موثر اور مشکوک ہوجاتی ہے تاآنکہ کسی خاص نکتہ پر ہمارے پاس تائیدی شہادت کسی اور ذریعے سے موجود نہ ہو اس امر کی کچھ وضاحت ہم اس مضمون کی پہلی قسط میں کرآئے ہیں۔ یہاں صرف دو مثالوں پر ہی اکتفا کریں گے۔

۱۔ رگ وید کی شہادت کی خامی دریائے سرسوتی کے حوالے سے واضح ہوجاتی ہے اس دریا کا ذکر رگ وید میں بار بار آیا ہے اور اس کی مختلف تاویلیں ہوچکی ہیں اوّل یہ دریائے ہراوتی ہے جو افغانستان کی وادی ہلمند میں بہتا ہے دوم یہ دریائے سندھ کا وہ معاون ہے جو دریائے سندھ کے مشرق میں بہتا تھا اور پہلے کبھی گھگر یا گھاگرا کہلاتا تھا اب یہ خشک ہوچکا ہے۔ سوئم یہ وہ زیر زمین ندی ہے جو الہ آباد کے قریب گنگا اور جمنا کے سنگم پر ان سے آن ملتی ہے۔ سرسوتی دریا سرسوتی دیوی کے روپ میں بھی ہمارے سامنے آتا ہے اور رگ وید اس امر پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔

۲۔ دوسری مثال سوم رس کی ہے۔ ویدک عہد سے بہت پہلے، ویدک عہد کے دوران اور اس کے بعد آریائی قبائل کے ہاں سوم رس کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے یہ کسی پودے کا رس تھا جو پتھروں پر پیس کر نکالا جاتا تھا دودھ، دہی اور گھی کے ساتھ اس نشہ آور مشروب کو مختلف النوع قربانیوں کے وقت استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس

امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ رگ وید کا پورا نواں منڈل صرف سوم[۱۳] رس کے لئے مخصوص ہے اس میں ۱۱۴ نظمیں ہیں ان کے علاوہ کچھ مزید نظمیں بھی اسی سوم رس سے متعلق ہیں پھر اس کی اہمیت کا اندازہ مزید اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اندر اور اگنی کے بعد سوم رس تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ یہ رس ایران میں بھی ہند یورپی قبائل استعمال کرتے تھے اور اوستا میں اس کا ذکر ہوم کے نام سے آیا ہے۔

اس اہمیت کے باوجود اس پودے کی یا اس سے کشیدہ سوم رس کی کوئی صحیح تاویل یا تعبیر پچھلے تین ہزار سالوں میں نہیں ہوسکی۔ سوم رس کی بے شمار تاویلوں میں چند کا ذکر انتہائی مختصر طور پر کیا جاتا ہے تاکہ قاری رگ وید کی شہادت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر خود قائم کرسکے۔

۱۔ وہ پودا جس سے سوم رس کشید کیا جاتا تھا نا قابل شناخت ہے[۱۴]

۲۔ سوم رس کو آب حیات مانا گیا ہے اور یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ اس کے پینے والا دیوتاؤں کی طرح امر ہو جاتا ہے (اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بھنگ کا پودا ہے)[۱۵]

۳۔ اس کو بیل نما پودا بھی کہا گیا ہے جس کی ڈنٹھلوں سے یہ رس نکالا جاتا تھا۔[۱۶]

۴۔ سوم رس کو الکحل کی بھی ایک قسم مانا گیا ہے[۱۷]

۵۔ لیکن باشم اس بات سے اتفاق نہیں کرتا اس کے خیال میں یہ الکحل سے مبرا ہے کیونکہ اسے تیاری کے فوراً بعد ہی پی لیا جاتا تھا اور الکحل پیدا ہونے کے لئے کچھ عرصہ درکار ہے اور وہ وقت اس رس کو نہیں ملتا۔ اس محقق کی نظر میں یہ بھنگ ہی کا پودا ہے[۱۸]

۶۔ اندر دیوتا اس رس کا بڑا رسیا تھا اور وہ اس کے لئے خم کے خم لنڈھاتا تھا اس نسبت سے اسے دیوتاؤں کا درجہ بھی دیا گیا ہے۔ چاند کے ساتھ بھی اس کا ناتا جوڑا گیا ہے اور یہ ذکر رگ وید کی مندرجہ ذیل نظموں میں ملتا ہے۔ RV . 9. 6 .7 , RV. 9.13.6 , RV 6.5.11 .

۷۔ اس کو مادہ منویہ بھی تسلیم کیا گیا ہے[۲۰]

اور سماوی گھوڑے کا مادہ منویہ بھی مانا گیا ہے" براہمن دیا" کتاب جو براہمنوں کے آپس کے مناظروں اور مباحث پر مبنی ہے اس موضوع پر مختلف ویدوں سے یہ حوالے دیتی ہے۔

(۲۱)(RV I 164, RV VIII, 29, AV IX 9 AV/X 10)

یہ ہیں کچھ تعبیریں سوم رس کے بارے میں جن سے رگ وید کی شہادت پر انحصار کرلینے سے خطرناک نتائج مرتب ہونے کا احتمال صاف نظر آتا ہے اور رگ وید کی شہادت پر خصوصی روشنی پڑتی ہے ان تعبیروں میں اب ایک اور تعبیر کا اضافہ ہوگیا ہے یہ ابھی تک محققین کے زیر غور ہے اجمالاً اس تعبیر کے بارے میں یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ رابرٹ گارڈن واسن جو پیشے کے لحاظ سے ماہر کلاہ باراں یعنی کھمبیوں کا خصوصی مطالعہ کرتا ہے۔ کی تحقیق کے مطابق سوم رس کا یہ پودا بھی کلاہ باراں یا اس کی مختلف اقسام میں سے کوئی مخصوص قسم ہے اور اس سے نکلا ہوا رس ہی سوم رس ہے۔ واسن

نے یہ نظریہ بڑی شد ومد اور دلائل و براہین کے ساتھ اپنی کتاب

میں پیش کیا۔ یہ کتاب لندن سے بھی اسی سال شائع ہوئی

مصنف نے بڑی تحقیق و جستجو، تجربات اور سائبیریا کے لوگوں کے رسم و رواج اور رہن سہن سے استنباط کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ کھمبی رگ وید میں بیان کردہ سوم رس کے اوصاف سے عین مطابق ہے اور اس کے رس میں جو اجزا ہیں وہ نشہ آور ہیں۔ یہی رس زمانہ قبل از تاریخ میں مذہبی قربانیوں میں استعمال ہوتا تھا اور بعدہ ویدک عہد میں بھی یہ مستعمل ہو گیا اس نظریہ کو آج کل بڑی اہمیت دی جارہی ہے۔ جان برو نے اسی کتاب کے موضوع کے بارے میں ایک مقالہ لکھا ہے جو شائع ہو چکا ہے[۲۳] انڈالوجی کے ماہرین کی توجہ کا موضوع آج کل یہی نظریہ بنا ہوا ہے۔ ماہر علم الانسان لیوی سٹراس نے بھی اس نظریہ کو اپنا موضوع بنایا ہے[۲۴] اس کے خیال میں سوم رس کو چھاننے کے لئے علامتی طور پر تین چھلنیوں کا رگ وید میں ذکر آتا ہے اور وہ اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ پہلی چھلنی تو خود یہ پودا ہے دوسری چھلنی بھیڑوں کے اون کی ہوا کرتی تھی لیکن تیسری چھلنی کی کوئی وضاحت نہیں ہو پائی اس سوال نے حکما کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ رگ وید کے مبہم علامتی بیانوں سے یہ نکتہ واضح نہیں ہو پاتا تھا۔ رگ وید کی نظم ۴۔ ۲۷۔ ۱۰ یعنی دسویں منڈل کی چوہترویں نظم کی چوتھی آیت نے اس کتاب کے مترجموں کو بہت پریشانی میں مبتلا کیا ہوا تھا اور اس مصرعے کے کئی مختلف تراجم ہو چکے تھے۔ رینو نے اپنے ترجمے میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کا اردو زبان میں مفہوم کچھ یوں ہے: "یہ دیوتا اپنے پھولے ہوئے مثانوں سے تیزی سے (سوم رس) خارج کرتے ہیں"[۱] چنانچہ سوم رس کے رگ وید میں بیان کردہ خواص اور اوصاف اور سائبیریا کے رہن سہن کے پیش نظر واسن اس نظریہ پر پہونچا کہ تیسری چھلنی انسان کا خود اپنا جسم ہے جس میں کھمبی کا رس صاف ہو کر پیشاب کے طور پر خارج ہوتا ہے۔ انسانی جسم سے گزرتے وقت اس میں کئی الکلی نما چیزیں جسم میں جذب ہو جاتی ہیں اور کئی ایسی چیزیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں جس سے یہ مزید نشہ آور ہو جاتا ہے۔ واسن نے اس تیسری چھلنی کی تشریح اپنی کتاب کے صفحہ ۲۷ تا ۲۹ پر کی ہے[۲۴]

سوم رس کی اس تعبیر کی تائید سائبیریا کے لوگوں کے رہن سہن سے بھی ہوتی ہے سائبیریا کسی زمانے میں آریائی قبائل کا وطن بھی قرار دیا جا چکا ہے وہاں کھمبی کے استعمال کے دو طریقے ہیں ایک تو اس کی اپنی حالت میں اور دوم کھمبی کھانے کے بعد پیشاب کی صورت میں۔ رگ وید سے اس امر کی تائید مزید اس کی نظم 5 ، 3 ، 2 ، 6 ، 5 ، 10 سے ہوتی ہے۔

پروفیسر لیوی سٹراس کے خیال میں اگر سوم رس کی یہ توجیہہ صحیح ثابت ہوتی ہے جس کے امکانات بہت قوی ہیں تو اس سے بہت سی باتیں واضح ہو جاتی ہیں:۔

۱۔ ابھی تک سوم رس کے پودے کی شناخت نہیں ہو سکی تھی اس تعبیر سے یہ قضیہ ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رگ وید بہت ہی قدیم روایتوں پر مبنی ہے[۲۵] اس حد تک قدیم کہ ویدک عہد کے آتے آتے

---

[۱] انگریزی ترجمہ سے آزاد ترجمہ از راقم الحروف۔ انگریزی متن کے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ

اس کے ہزاروں الفاظ متروک ہو چکے تھے یا اپنے صحیح مفاہیم کھو چکے تھے جس کی وجہ سے کتاب "نروکتا" کی ضرورت پیش آئی چنانچہ یہ بات حقائق کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے اس نظریہ سے دیکھیں تو سوم رس صرف ایشیائی آریائی قبائل ہی کے ہاں نہیں بلکہ یہ بہت وسیع اور پھیلا ہوا یوریشین "کلٹ" تھا[۲۶] اور اگر یہ صورت ہے تو اس نظریہ کو مزید تقویت ملتی ہے کہ رگ دید ... اق م کے اردگرد کی کتاب نہیں بلکہ اس کا تعلق اس زمانے سے ہے جب یہ قبائل ابھی اپنے مخرج سے نہیں نکلے تھے۔ یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں کہ خود اس قسم کے نظاہر نشہ آور فریب نظر پیدا کرنے والی امبی کھمبی رہی ہو۔[۲۷]

۳ - تیسری بات جو نہایت اہم ہے اور انڈالوجی کے طالب علموں کے لئے بہت معنی خیز ہے وہ یہ امر ہے کہ ویدک عہد کے لوگ ان قربانیوں کی اہمیت اور ان پر پڑھے جانے والے منتروں کے الفاظ کے معانی سے بالکل بے خبر ہو چکے تھے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ایسا پودا جس کے بیان سے رگ وید کا پورا دسواں حصہ بھرا ہوا اس کی شناخت ہم کر نہ پائیں اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ قربانیوں اور رسومات کی ادائیگی اور ان سے متعلق لسانی بیانوں میں بہت فرق آچکا ہے۔

ان مشاہدات و ملاحظات سے رگ وید کی شہادت کا نقشہ بالکل بدل جاتا ہے ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کی شہادت کو بغیر کسی تائیدی شہادت کے، سنجیدہ مطالعہ کی بنیاد نہیں بنانا چاہیئے اور جو لوگ صرف اس پر تکیہ کرتے ہیں وہ غلط نتائج مرتب کرکے قاری کو گمراہ کرنے کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں چنانچہ مذہبی کتب سے اس قسم کی شہادت پر لیوی سٹراس نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کئی ایسے حقائق کا پتا ہے (LEVY STRAUSS, 1968 P219 - 224, 325) جہاں مقامی خیال ان اشخاص، اشیا اور واقعات کو جو کسی زمانے میں حقیقی ہوتے تھے اور جن کے لئے بعد میں جغرافیائی تاریخی وجوہ کی بنا پر معاشرہ میں کوئی عملی افادیت نہیں رہتی، فطرت کے ورا چلے جاتے ہیں معاشرہ اس بات کے لئے کوشاں رہتا ہے کہ اپنے نظریات میں ماضی کی یادوں اور ان کی پرانی یا گذشتہ افادیت کو ہم آہنگ کر سکے"[۲۸] صا

ویدوں کی شہادت سے استنباط کرتے وقت یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ کبھی زمانے میں اس کتاب کے کئی متن تھے صرف یہی ایک امر ویدوں کی شہادت کو ناقابل قبول بنانے کے لئے کافی ہے۔[۲۹]

بات انڈالوجی کے مختلف مکاتیب فکر کی ہو رہی تھی کہ درمیان میں رگ وید کی شہادت کے متعلق یہ گریز آن پڑی۔ اس قسط میں ہم اپنی توجہ صرف پہلے مکتب فکر پر مرکوز کریں گے جس کا محور خیال آریاؤں اور دراوڑوں کا تصادم ہے۔ باقی ان نتائج کا تجزیہ آئندہ اقساط میں کیا جائیگا جن پر انڈالوجی کا علم اب تک پہونچ چکا ہے۔

مندرجہ بالا پس منظر میں ہم ڈاکٹر وزیر آغا کے اس فکری سومنات کی طرف بڑھیں جس کو انہوں نے "اردو شاعری کا مزاج" کا نام دیا ہے تو سب سے پہلے ہمارا واسطہ لفظ دراوڑ سے پڑتا ہے اس لفظ کو انہوں نے نسلی، تہذیبی، ثقافتی اصطلاح کے طور پر بے محابا استعمال کیا ہے جس کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں:-

---

صا آزاد ترجمہ از راقم الحروف

۱:- "تاہم ان کی آمد سے ایک نسلی تصادم ضرور وجود میں آیا" ص ۹

۲:- "دراوڑی تہذیب بجائے خود دو نسلوں کے تصادم اور انضمام کی پیداوار تھی" ص ۵۸

۳:- "دو نسلیں جب آپس میں ٹکرائیں تو ان کے تصادم سے دراوڑی نسل نے جنم لیا" ص ۵۹

۴:- "ہڑپہ کلچر میں ان دونوں نسلوں کا وجود ثابت ہو چکا ہے" ص ۵۸

۵:- "جب یہ دو نسلیں آپس میں ٹکرائیں تو گویا دھرتی کو بیج مل گیا" ص ۵۹

۶:- "ان دو نسلوں کے تصادم سے جو تیسری نسل پیدا ہوئی وہ ارضی اور مادی تہذیب کی علمبردار تھی" ص ۵۹

مندرجہ بالا اقتباسات میں لفظ "نسل" اور "خون" بہت غور طلب ہیں کیونکہ لفظ دراوڑ ایک لسانی اصطلاح ہے اور نسل اور خون کے معنوں میں اس کا استعمال غلط اور گمراہ کن[۳۰] ہونے کے علاوہ غیر ثقہ طرز عمل ہے اور فکری انتشار کا باعث۔ بقول میکس میولر "یہ بابل کے انتشار سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور سراسر سرقہ ہے"۔[۳۱]

لفظ دراوڑ کی تاریخ بہت پرانی ہے اور جنوبی ہند کے لئے بطور استشارہ یہ بطلیموس کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ یونانی جغرافیہ دانوں کے ہاں یہ علاقہ DAMIRICA یا LIMYRIKE کہلاتا تھا" پھر نورا اور ٹنڈس آئے جو دامیریکا کی پہلی منڈیاں ہیں PERIPULUS - 53 بحوالہ نیل کنٹھ شاستری FOREIGN NOTICES OF SOUTH INDIA بطلیموس اپنے جغرافیہ میں اس علاقے کا ذکر کے نام سے کرتا ہے سنسکرت مآخذوں میں دراوڑی اور دامیلی اور بعد میں درامیڈا اور دراویڈا الفاظ ملتے ہیں جن سے ہمیں یہ لفظ "دراوڑ" ہاتھ آیا ہے[۳۲] یہ تامل زبان کا لفظ ہے اور اس لفظ کی آخری صوت جنوبی ہند کی ایک یا دو بولیوں سے مخصوص ہے جب کہ اس آواز کو تلگو اور کنہڑی سے خارج کر دیا گیا ہے[۳۳]۔ یہ ہند یورپی زبان کا لفظ نہیں ہے اور بطور لسانی اصطلاح کے اس کا اطلاق تلگو، تامل، کنہڑی، ملیالم، کرکھی، تولو جیسی بڑی بولیوں پر اور چھوٹی بولیوں میں کوٹا، ٹوڈا، بڈاگا، کوئی، اروالا، کولامی، نائیکی، پرجی، کونڈا، گادھا، پنگو منڈا، کوری، مالٹو اور کوڈاگو پر ہوتا ہے۔ ان دراوڑی زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد گیارہ کروڑ کے قریب ہے اس میں ایک براہوی پاکٹ جو پاکستان میں شامل ہے[۳۴] یہ خاص جنوبی ہند کی بولی ہے اور اس کے آثار برعظیم کے باہر کہیں نظر نہیں آتے پاکستان کی براہوی پاکٹ نے حکما کو مخمصے میں ڈالے رکھا ہے اور اس کی بنا پر کئی قیاس آرائیاں معرض وجود میں آ چکی ہیں

اس مخمصے کی صورت یہ ہے کہ پاکستان میں براہوی زبان کی موجودگی نے جس کو بولنے والوں کی تعداد ۲½ لاکھ ہے اور دراوڑی زبانوں کی یہ خصوصیت کہ یہ تصویری رسم الخط کے لئے بہت مناسب ہے اس مفروضہ کو جنم دیا ہے کہ دراوڑی زبانیں صرف وادئ سندھ ہی میں نہیں بلکہ پورے شمالی ہند میں مروج تھیں اور آریاؤں کی آمد کے ساتھ جب ان زبانوں کے بولنے والوں کو شمالی ہند سے نکلنا پڑا تو وہ لوگ جنوب کی طرف آ گئے کافی عرصہ تک یہ مفروضہ بطور حقیقت کے قبول کیا جاتا رہا لیکن موجودہ تحقیق نے اس مفروضہ کو غلط ثابت کر دیا۔ دلائل یہ ہیں :-

۱:- سکنڈے نیویا کے انسٹی ٹیوٹ آف ایشین سٹڈیز میں کام کرنے والے محقق آسکو پارپولا اور ان کے رفقائے کار

نے میونیروں کی مدرت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وادی سندھ کی مہروں اور دراوڑی زبانوں میں ایک تعلق ہے لیکن ان کو کئی بار اپنے دلائل بدلنے پڑے اور اپنے مقدمہ PREMISSES میں بھی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں زبان کے علاوہ کلچر، مذہب اور بت تراشی کو بھی لے آئے۔ تاہم اس تمام مشقت کے باوجود وہ اپنے دعویٰ کو ثابت نہیں کر پائے مثلاً وہ اس امر کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکے کہ وادی سندھ کا رسم الخط دائیں سے بائیں کی طرف کیوں جاتا ہے اور ... وہ اس خط کے الفاظ کی آوازوں یا لفظ کے تہجی ٹکڑوں کی آوازوں کے بارے میں ہماری رہبری کر سکے ہیں زیادہ سے زیادہ ... یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تحقیق ہماری پروٹو دراوڑی زبان کی تشکیل میں کچھ مدد کر سکتی ہے یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہے کہ روسی محقق KNOROZOV بھی انہی نتائج پر پہونچا ہے جن پر آسکو پارپولا اور اس کے رفقائے کار پہونچ پائے ہیں

۲۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے ان نتائج کو صحیح بھی سمجھ لیں اور یہ امر بھی تسلیم کر لیں کہ آریاؤں نے دراوڑوں کو جنوب کی طرف دھکیل دیا تھا تو بھی یہ مخمصہ اپنی جگہ ہی قائم رہتا ہے کیونکہ اگر ۱۵۰۰ ق م کے قریب وہ شمالی ہند سے نکلے تو اس وقت وہ اہل زبان تھے لیکن وہاں سے نکالے جانے کے بعد تقریباً ۲۰۰ ق م تک ہمیں ان زبانوں کے آثار ہندوستان کے کسی خطے یا گوشے میں نہیں ملتے ۲۰۰ ق م کے قریب جو کچھ ملتا ہے وہ تامل زبان کے کتبے ہیں جو خروشتی رسم الخط میں لکھے ہوئے دکن میں پائے گئے ہیں۔

۳:۔ آج تک کی تحقیق اس بات کی وضاحت نہیں کر پائی کہ دراوڑ باہر سے آئے تھے یا وہ مقامی لوگ تھے اور نہ ہی اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کسی شہادت کی امید ہے۔ چنانچہ یہ عقدہ وہیں کا وہیں رہے گا جہاں یہ اب ہے۔ دراوڑی زبانوں کی خصوصیات کی وجہ سے اس کا رشتہ ترکی زبانوں سے جوڑنے کی کوشش ہو چکی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ قرین قیاس یہ امر ہے کہ اس زبان کا سدھین زبان جسے اب FINNO UGRIAN یا TURKIE کہا جاتا ہے کچھ تعلق ہے۔

ان تمام مشکلات کی موجودگی میں اب تک کی تحقیق کے پیش نظر ہم جو بات آج قدرے وثوق سے کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگرچہ دراوڑی زبانیں ہند سے باہر کی پیداوار ہیں خصوصاً مغربی ایشیا کی، تاہم ہمارے پاس کوئی شہادت اس امر کی نہیں کہ یہ زبانیں ہندوستان سے باہر بھی موجود ہیں۔ اور نہ ہی اس بات کو محقق تسلیم کر سکتے ہیں کہ باوجود ویدی کی موجودگی کے ان زبانوں کا چلن شمالی ہند میں بھی رہا ہے۔ یہ بات کسی صورت میں بھی تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ وادی سندھ کے رہنے والے جو اس زمانے میں وہ کلچر پیدا کر سکتے تھے جس کی مثال صرف بابل، سمیریا اور مصر میں ہی نظر آتی ہے، وادی سندھ چھوڑنے پر دکن میں پہنچ کر قبائلی خانہ بدوشی اور آوارگی کی زندگی اختیار کر لیں اور ان پندرہ سو سال میں اپنی پرانی روایات کا کوئی نشان بھی دکن میں نہ چھوڑیں۔ ۳۵

اسی موضوع پر رادھا کرشنن کا ارشاد یہ ہے کہ "یہ محض ایک گمان ہی ہو سکتا ہے کہ وادی سندھ کے لوگوں کا دراوڑوں سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دراوڑ یہیں کے رہنے والے تھے یا باہر سے آئے تھے دراوڑوں کے علاوہ ایک اور قوم کی نشاندہی ہوتی ہے جن کی ناک چپٹی تھی رنگ کالا تھا اور جن کو داس کہا گیا ہے"۔

ان تمام امور کے باوجود ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی مخصوص تحقیقی چابکدستی سے بغیر کسی اعلان کے لفظ دراوڑ کو جو سراسر ایک لسانی اصطلاح ہے نسل کی بنیاد بنا دیا۔ اس کے باوجود کہ وہ جانتے ہیں کہ محققین اس حقیقت تک پہنچ چکے ہیں کہ زبان کبھی نسل کی بنیاد نہیں بن سکتی، یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم پنجابی نسل، اردو نسل یا سندھی نسل کہیں جو سراسر بے معنی ترکیبیں ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کے لئے زبان کو نسل کی بنیاد بنانا ناگزیر ہو گیا تھا کیونکہ اس کے بغیر ان کا وہ نظریہ جس کا اظہار اس شد و مد سے اس کتاب میں کیا گیا ہے اپنی موت آپ مر جاتا

اس سے بڑھ کر یہ امر بھی ان کی تحقیقی موشگافی ہے کہ انہوں نے اس "دراوڑی نسل" کو جنوبی ہند سے اٹھا کر وادیٔ سندھ میں لا بسایا اور اس کو مندرجہ ذیل اوصاف سے متصف کر دیا:۔[۳۶]

۱:۔ "یہ ایک ارضی تہذیب تھی اور مادری اصولوں پر استوار تھی" ص

۲:۔ "اس پر انجماد مسلط ہو چکا تھا" ص ۵۳

۳:۔ "وہ موت اور زیست کے دائرے میں گرفتار تھی" ص ،،

۴:۔ "اس تہذیب میں تقسیم کار اور کثرت کا عمل واضح تھا اور اس میں ذات پات کا تصور جنم لے چکا تھا" ص ،،

۵:۔ "خوف اس تہذیب پر پوری طرح مسلط ہو چکا تھا" ص ،،

یہ ان کی نظر میں دراوڑی تہذیب کے چند خد و خال ہیں جو ان کے خیال کے مطابق وادیٔ سندھ ہی کی تہذیب تھی لیکن وادیٔ سندھ کی اس دراوڑی تہذیب کو ان صفات سے متصف کرنے کی نہ تو ڈاکٹر صاحب نے کوئی دلیل دی ہے اور نہ ہی کوئی شواہد پیش کئے ہیں جب کہ دلائل اور شواہد اس لئے بھی ضروری ہو جاتے ہیں کہ آثار قدیمہ کے علوم کے ماہرین کے خیال میں وادیٔ سندھ کے بارے میں ہمارے پاس رسم الخط نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے صرف آثار قدیمہ ہی کی شہادت ہے اور یہ شہادت اس زمانے کے لوگوں کے مقاصد، نظریات، خیالات، عقائد، ان کی امیدیں، آرزوئیں، امنگیں، جستجوئیں، ان کی فکریں، پریشانیاں اور اندیشے جو اس زمانے میں ان کو لاحق تھے اس زمانے میں ہمیں سمجھانے کے لئے ناکافی ہے ہمیں ہرگز یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ اس زمانے کے انسان کے لئے اس کا فن اور فن کاری کیا اہمیت رکھتے تھے اور اس بات کا اطلاق اس زمانے کے کئی ایسے معاشروں پر بھی ہوتا ہے جن کے بارے میں دستاویزی شہادت بھی موجود ہے بغیر تحریری شہادت کے جس میں عام جزئیات دی گئی ہوں ہم اس زمانے کے انسان کے سیاسی یا سماجی نظام، اخلاقی اور قانونی ضابطوں یا اس نظام حیات کے بارے میں کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ اس سنگین مشکل کے باوجود جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے اس تہذیب کے بارے میں کہا ہے اور جس کے لئے وہ دلائل و براہین سے کام نہیں لیتے صرف ۱۹۳۰ء تک کی تحقیق تھی جو اس وقت سے حکماء اس موضوع پر کام کرتے رہے ہیں جس کی بنا پر اس تہذیب کے وہ خاکے جو ۱۹۳۰ء سے پہلے مرتب ہوئے تھے بیشتر اب ایک دفتر بے معنی ہو گئے ہیں اور اس تہذیب کے بارے میں نئے نظریات وجود میں آ چکے ہیں جن کا اجمالی تذکرہ اوپر آ چکا ہے اور جو شاید ان کی نظر سے نہ گزرے ہوں۔

قطع نظر اس امر کے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں تہذیبوں یعنی دراوڑی اور آریائی تہذیبوں کو ان اوصاف سے کیوں متصف کیا ہے اور ایسا کرنے کے ان کے پاس کیا شواہد اور کیا مقاصد ہیں؟ ہم اس کتاب کے بین السطور

مفاہیم نہ پڑھیں، تو بھی ڈاکٹر صاحب کے بیانات سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تاریخی تسلسل پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور ان الجھنوں کی کئی وجوہات ہیں۔

آج سے پون صدی پہلے ایک مورخ نے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں کہا تھا کہ "اصل دقت تاریخوں کے تعین میں ہوتی ہے۔ تاریخ کی عمارت CHRONOLOGY کے ڈھانچہ پر کھڑی ہونی چاہیئے اور بغیر CHRONOLOGY کے تاریخ ناممکن ہے"[۳۹]۔ اگرچہ یہ بات ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں کہی گئی تھی لیکن اس کا اطلاق نہ صرف برعظیم کے زمانۂ قبل از تاریخ پر بلکہ پوری دنیا کے اس دور پر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یہ مشکل تو اب بھی موجود ہے[۴۰] اور وادیٔ سندھ سے برآمد شدہ شواہد اس کی تاریخوں پر کوئی حتمی روشنی نہیں ڈالتے۔[۴۱] آثارِ قدیمہ کا طریق کار STRATOGRAPHY جس سے کھدائی کے وقت مختلف سطحوں سے تاریخوں کا یا زمانوں کا اندازہ لگاتے ہیں یہ تو ضرور بتا سکتا ہے کہ کونسی آبادی پہلے تھی اور کونسی اس کے بعد۔ دیگر واقعاتی شہادتیں مثلاً ظروف، ان کے رنگ، بناوٹ، ان کے نقش و نگار، ان کے اسلوب وغیرہ کا کسی دوسرے مقام سے برآمدہ سامان سے تقابل بھی اس طریق کار میں کافی معاون ثابت ہو سکتا ہے لیکن حتمی تاریخ کا فیصلہ آخر کار ریڈیو کاربن ۱۴ کے ٹسٹ سے ہی کیا جا سکتا ہے[۴۲]۔ مگر اس طریق کار میں بھی کئی فنی مجبوریاں ہیں ڈیڑھ سو سے دو سو سال کا اِدھر اُدھر ہو جانا اس طریق کار میں ایک معمولی سی بات ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ازمنہ قدیم میں ریڈیو کاربن کا عمل یکساں نہیں رہا۔ اس طریقہ کار سے جو ہمیں پتہ چلتا ہے وہ محض اس حد تک ہے کہ ہم ایک اضافی CHRONOLOGY مرتب کر سکیں[۴۳] اور یہ طریقہ کار دو واقعات کے مابین قرب یا بعد کو بتانے سے قاصر ہے۔ چنانچہ تمام تر کوششوں کے باوجود وادیٔ سندھ کے نہ آغاز کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی انجام کا۔ جو ہے وہ تخمینہ اور قیاس پر مبنی ہے۔ یہ صورت حال ہڑپہ، موہنجو داڑو، کالی بنگن لوتھل، کوتھل وغیرہ مقامات پر ماہرین کو پیش آئی ہے اور یہ مسئلہ جہاں تھا آج تک وہیں ہے[۴۴]۔ ڈاکٹر صاحب کے نظریہ تسلسل کے لئے یہ تاریخیں اور آریاؤں کی آمد کی تاریخیں بہت اہمیت کی حامل نہیں۔

آریاؤں کی ہندوستان میں آمد کے بارے میں بھی یہی دقتیں ہمارے سامنے ہیں۔ ۱۵۰۰ ق م یا ۱۲۰۰ ق م ایسی تاریخیں ہیں جو مورخوں نے محض سہولت کی خاطر وضع کر لی ہیں۔ آریاؤں نے رگ وید کے علاوہ اور کوئی دوسری شہادت پیچھے نہیں چھوڑی (اس نکتہ پر بحث ہم اوپر کر آئے ہیں) زہنر کے خیال میں آریاؤں کی برعظیم میں آمد کا زمانہ ۴ ہزار ق م سے ایک ہزار ق م تک ہو سکتا ہے[۴۵]۔ نراد چودھری کہتا ہے کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آریا یہاں کب آئے[۴۶]۔ رالف ٹرنر بھی اس خیال کی تائید کرتا ہے[۴۷]۔ اس کا بیان ہے کہ ہم صرف قیاس سے ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۲۴۰۰ ق م کے قریب انہوں نے جنوب کی طرف حرکت کی اور باختر پہنچے جہاں سے ان کی ایک شاخ جھیل اُرمیا کی طرف نکل گئی اور دوسری ہندوکش کو عبور کر کے برعظیم میں داخل ہو گئی[۴۸]۔ ایمن بی بھی آریاؤں کی آمد کے بارے میں انہی محققین کا ہم خیال ہے[۴۹]۔

ان باتوں سے یہ تو عیاں ہو جاتا ہے کہ آریاؤں کی آمد کے بارے میں ہمارا علم محدود ہے۔ دوسری طرف ایک اور مشکل کھڑی ہو جاتی ہے اور وہ ہے وادیٔ سندھ کی تہذیب کی تباہی کے اسباب۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مارشل، وہیلر، گمپٹ اور باشم اس نظریہ کے حامل ہیں کہ اس تہذیب کا خاتمہ آریاؤں نے

بزورِ شمشیر کیا۔ یہ نظریہ اب متروک ہوچکا ہے اور اس تہذیب کے متعلق اور اس کے خاتمے کے متعلق نظریات دوسرے نظریوں کی طرح کافی تبدیلیاں آچکی ہیں اور موجودہ پچاس سالہ تحقیق اس نظریہ کی مکمل نفی کرچکی ہے اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس تہذیب کی بربادی کے عوامل دوسرے تھے لیکن ڈاکٹر وزیر آغا آج بھی اسی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں۔

اس تہذیب کی بربادی کے عوامل میں سیلاب پہلے نمبر پر آتا ہے مکمل تباہی سے پیشتر موہنجو داڑو کے سات دفعہ غرق ہونے اور بننے کے آثار ملتے ہیں اسی قسم کی مثال ہمیں کورؤں کے آباد کردہ شہر ہستنا پور میں نظر آتی ہے جو طغیانی کی وجہ سے ۸۰۰ ق م میں تباہ ہوا اور لوگوں کو اس شہر کو چھوڑنا پڑا دریاؤں کا اپنی گزر گاہ بدل لینا دوسری وجہ ہو سکتی ہے۔ اس علاقے میں دریائے سرسوتی اور ہاکڑہ خشک ہوچکے ہیں۔ اور بیاس اپنی گزر گاہ بدل چکا ہے جس کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اس خیال کا اظہار بھی ہوچکا ہے کہ دریائے سندھ کے متوازی ایک اور دریا بہتا تھا جس کا نام مہران تھا جو اب خشک ہوچکا ہے۔ قحط اور خشک سالی ایک اور وجہ ہو سکتی ہے مزید براں اینٹوں کو پختہ کرنے کے لئے جنگلوں کی بربادی اور اس وجہ سے زرخیز زمینوں کا صحراؤں میں بدل جانا، وبا اور زلزلہ بھی اس تہذیب کی بربادی کے عوامل ہوسکتے ہیں بہرحال یہ ساری وجوہ یا ان میں سے کوئی ایک وجہ اس تہذیب کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے اور آج کل کی تحقیق اس بات پر قطعی متفق ہے کہ اس تہذیب کی بربادی کی وجوہ میں جنگ شامل نہیں ہے اور تہذیبوں کے خاموشی سے ختم ہوجانے کی مثالیں بھی ہمیں تاریخ میں ملتی ہیں مثلاً حطی خاموشی سے صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور سدھین (اس لفظ کا صحیح تلفظ سدھین ہے سکا تعین نہیں۔ اردو شاعری کا مزاج ص ۸۹) پہلے دبا کا شکار ہوئے اور میڈ (MEDE) قبیلے نے انہیں تناظر سے ہٹا دیا چنانچہ ضروری نہیں کہ تاریخی عمل کو محض تسلسل دینے کے لئے ہم صرف مفروضوں پہ انحصار کرتے چلے جائیں خصوصاً اس وقت جب تحقیق کے جدید ترین نتائج پہلے سامنے ہوں یہ کہ وادی سندھ میں دراوڑی تہذیب بھی جس کو آریاؤں نے بزورِ شمشیر ختم کر دیا۔ اب ایک بچگانہ سا خیال رہ گیا ہے جس کا اس موضوع پر جدید تحقیق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور اس معاملے میں رگ وید سے استنباط جائز نہیں کیونکہ رگ وید میں جس کلچر کا تذکرہ ہمیں ملتا ہے وہ ہندوستان سے باہر کی پیداوار ہے اور اس کتاب سے آریاؤں کی ہندوستان میں آمد پہ شہادت طلب کرنا بے سود ہے۔ اس امر کی وضاحت اوپر ہوچکی ہے۔ آج کل کے محققین اور انڈالوجسٹ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں وادی سندھ کی بربادی اور آریاؤں کی آمد کے درمیان کئی صدیاں حائل تھیں۔

ہماری بحث میں سر جان ہیوبرٹ مارشل (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۵۸ء) کا مقام سب سے پہلے ہے کیونکہ اسی کی سربراہی میں ہڑپہ کی کھدائی ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی اور اس کھدائی سے برآمدہ شہادت کی بنا پر اس نے اپنی مذکورہ کتاب مرتب کی۔ اس تصنیف کا پس منظر وہی ہے جو ہمیں "اردو شاعری کا مزاج" میں نظر آتا ہے لیکن اس کتاب میں بیان کردہ نتائج جلدی میں مرتب ہوئے اور دوسرے علوم سے ان نتائج کی ترتیب میں پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا اس وجہ سے اس تصنیف میں اغلاط کی کافی گنجائش رہ گئی ہے۔ مثلاً برآمدہ مہروں کی مذہبی حیثیت مغرب ڈھانچوں سے جنگ ہونے کا نتیجہ۔ ایک مہر کی تصویر کو رودر شیو قرار دینا وغیرہ۔ ایسے نتائج تھے جو متقدمین کو کافی متاثر کرتے رہے۔ اب جاکے کہیں ان نتائج کا طلسم ٹوٹا ہے اور محققین نے کافی غور و خوض کے بعد اس مصنف کے بہت سے نتائج کو رد کر دیا ہے لیکن اب بھی اس کے مرتب کردہ نتائج

غیر محتاط طلبا کو گمراہ کر رہے ہیں ان میں پیدو نوشیو والا خیال بھی ہے جس کو مغربی حکما تو اب بھی قبول کرتے ہیں لیکن اس موضوع کے مقامی فاضل اس کو رد کر چکے ہیں اس کی تفصیل اگلی اقساط میں کہیں آئے گی۔

ان انڈالوجسٹوں میں سب سے زیادہ دلچسپ باشم کا معاملہ ہے اس کا پہلا بیان ہے کہ ہمارے پاس اس وقت اتنی شہادت موجود نہیں جس سے ہم تعین کر سکیں کہ رگ وید کی مناجاتیں لکھنے والے پجاریوں کے قبائل نے وادیٔ سندھ کو برباد کیا لیکن یہ اغلب ہے کہ اس تہذیب کا خاتمہ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا جو رتھ استعمال کرتے تھے[۵۶] باشم کا یہ بیان مبہم ہے جس سے قاری پریشان ہو جاتا ہے۔ رتھ استعمال کرنے والے مصری تھے یا ہند یورپی قبائل۔ مصریوں کی آمد زیر غور نہیں ہے۔ زیر بحث مسئلہ ہند یورپی اقوام کا ہے اگر وہ رتھ استعمال کرتے تھے[۵۷] تو وادیٔ سندھ کی تہذیب کو ختم کرنے والے بھی لوگ ہیں اور یہی نکتہ محل نظر ہے۔ لیکن دوسری کتاب میں یہی باشم اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ نظریات خصوصاً ہندوستان کے ماضی کے بارے میں نظریات نئی تحقیق و تفتیش کے ذریعے نئے شواہد کی روشنی میں تبدیل ہوتے رہے[۵۸] ہیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ دراوڑ چھریرے بدن ستواں ناک اور تیکھے نقوش والے وضعدار لوگ تھے۔ باشم کے اس لاحظہ میں اور رگ وید کے اس بیان میں کہ آریاؤں کو یہاں موٹے ہونٹوں اور چپٹی ناک والے کالے لوگ ملے جو لنگم کی پرستش کرتے تھے، بہت بڑا تضاد ہے میں ممکن ہے کہ رگ وید کے یہ ملاحظات کسی دوسری قوم پر منطبق ہوتے ہوں جو وادیٔ سندھ کے خاتمہ اور آریاؤں کی آمد سے پہلے یہاں آن گھسی ہو جیسے کہ ردمیلا تھاپر اور رادھا کرشنن کا خیال ہے۔ باشم کا پرانا موقف تو اوپر بیان ہو چکا لیکن اس موقف میں واضح تبدیلی ان کے اس مقالے میں نظر آتی ہے جو انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں اس موضوع پر شائع ہوا ہے اور جس میں وہ وادیٔ سندھ کی بربادی کے اسباب میں جنگ کو شامل نہیں کرتا بلکہ دوسرے عوامل کو اس بربادی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے[۶۱] اس تبدیلی میں پاکستانی دانشوروں کے لئے ایک اہم اخلاقی سبق پنہاں ہے۔

اپنے موقف میں اسی قسم کی انقلابی تبدیلی ہمیں وہیلر کے ہاں بھی نظر آتی ہے وہ اپنی ایک تازہ تصنیف شروع کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی یہ کتاب ایک بڑھتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے موضوع کا ایک آزمائشی خاکہ ہے جس کا سارا مواد تحقیق کی موجودہ منزل میں منتشر اور بکھرا ہوا ہے۔ برعظیم میں آثار قدیمہ کا عمل اس وقت روز بروز بڑھتی ہوئی الجھنوں میں سے گزر رہا ہے اور یہ مرحلہ ہمیشہ موضوع کے وسیع اور ہمہ گیر ادراک اول لکل سے پہلے پیش آتا ہے۔ جو مثالیں یہاں پیش کی گئی ہیں وہ صرف مختلف ثقافتی میلانوں کی نمائندگی کرتی ہیں[۶۲]۔ کتاب کی اس تقریظ میں کسی حتمی فیصلہ پر پہنچنے یا کوئی حرف آخر قسم کا نظریہ مرتب کرنے سے گریز کا پہلو واضح ہے۔ اس کتاب میں وہ وادیٔ سندھ کی تباہی کے اسباب پر ایک نظر ڈالتا ہے اور اپنی پہلی جلد بازی پر تاسف بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس جلد بازی میں اس نے اس تباہی کا ذمہ دار آریاؤں کو ٹھہرایا تھا لیکن اب اس کے اس موقف میں تبدیلی آگئی ہے اور وہ اس ضمن میں مضروب ڈھانچوں کا ذکر کر کے یہ کہتا ہے:-

"ان تمام چیزوں کے تاریخی معانی کیا ہیں؟ میں نے پہلے جلد بازی میں ایک اندازہ لگایا تھا جس کو اب ٹھیک کرنا مقصود ہے۔ وادیٔ سندھ کے بارے میں یہ اندازہ کہ یہ غیر آریائی تہذیب تھی بالکل درست ہے اس بات کی شہادت موجود ہے کہ ۱۵۰۰ ق م کے قریب یہ تہذیب زندہ تھی اس بات کو قبول عام حاصل ہے کہ تقریباً اسی زمانہ میں یعنی ۱۵۰۰

ق م کے قریب آریاؤں کا حملہ ہوا جس کا خاکہ ہمیں ہندوستان کے قدیم ترین ادب یعنی رگ وید کی مناجاتوں میں ملتا ہے۔ ان مناجاتوں میں یہ حملہ ایک مسلسل یورش کی صورت میں نظر آتا ہے جو قبائلی لوگوں کے قلعہ بند شہروں پر کی گئی اور ایسی قلعہ بندیاں اس زمانے میں ہمیں ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے علاوہ اسی زمانے کے چند اور مقامات اور شہروں میں بھی نظر آتی ہیں۔ ان دونوں واقعات کو ایک دوسرے سے باہم ملانا اور موہنجوداڑو کے تباہ کرنے والوں میں ان بہادر لیکن وحشی خانہ بدوشوں کو دیکھنا جو ان شہروں سے بے اعتنا تھے جو ان کے ہاتھوں برباد ہوئے اور جن کے لئے شہری زندگی اجنبی تھی، ایک پرکشش اور دلچسپ بات ہے۔ واقعی یہ غیر ممکن نہیں ہے کہ ہڑپہ کا نام ہری یوپیا میں مخفی ہے جس کا تذکرہ رگ وید میں بطور ایک ایسے مقام کے آیا ہے جہاں جنگ ہوئی تھی۔ یہ سب خیالات قیاسات ہیں، خوبصورت اور شاید اغلب۔ لیکن ان کے لئے ثبوت کوئی نہیں ہے اور یہ بات بھولنی نہیں چاہیئے کہ صرف موہنجوداڑو ہی اس وقت تک واحد مقام ہے جہاں آخری قتل عام کی شہادت ملتی ہے۔"

اس بیان سے وہیلر کا اپنی سابقہ غلطی تسلیم کرنا عیاں ہے۔ فوراً بعد ہی وہ اس غلطی کے ازالہ کی طرف رجوع کرتا ہے:۔

"ہمارے پاس ۱۶۰۰ ق م سے لے کر ۱۰۰۰ ق م تک کا ایسا زمانہ ہے جس کو ابھی پاٹنا ہے چونکہ اس موضوع پہ کام ہو رہا ہے اس لئے اس پر تفصیلی بحث مناسب معلوم نہیں ہوتی۔"

"درست صورت حال یہ ہے کہ سندھ کی وادی کے کئی مقامات پر اس وادی کے کلچر کے بعد ایک اور کلچر کے آثار ملتے ہیں۔ ہڑپہ میں ہی استعمال شدہ اینٹوں اور گھٹیا سامان سے تیار شدہ گھٹیا قسم کے مکانوں کے آثار ملتے ہیں جو اس شہر کے ملبے پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ یہ اجنبی لوگ اپنے مردوں کو اجنبی طریقے سے دفن کرتے تھے جن کے ساتھ وہ اجنبی قسم کے ظروف یا برتن بھی رکھتے تھے۔ ان باتوں کے نشانات ہڑپہ کے اس قبرستان میں پائے گئے ہیں جو آثار قدیمہ میں قبرستان H کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس قبرستان H کا کلچر ہڑپہ کے علاوہ دو اور مقامات (بہاولپور) پر ملا ہے۔ اس کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہو سکی ہیں۔ سوائے اس کے یہ ہڑپہ کے بعد کا کلچر ہے اور اس میں اور ہڑپہ کلچر میں ایک بعد زمانی ہے چنہوداڑو میں جو موہنجودارو کے ۸۰ میل جنوب میں واقع ہے ایک گھٹیا قسم کے مخالفانہ قبضہ جمالینے والوں کے کلچر کے آثار ملتے ہیں جس کو اسی نام کے ایک مقام کی وجہ سے جھکر کلچر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اپنے متقدمین (یعنی اہل ہڑپہ) کے مقابلے میں بھدے برتن بناتے تھے اور گول بٹن نما مہریں بناتے تھے جن پہ ایسے نقوش ہوتے تھے جو ایران اور کوہ قاف کے ایسے آثار کی یاد دلاتے ہیں۔ اگرچہ مقصد تسلسل وقت کا نہیں ہے تاہم وادی سندھ کی تہذیب کے اختتام اور ناجائز قابضوں کا وقت قریب قریب ایک ہی نظر آتا ہے کچھ اور عرصہ کے بعد دوسرے ناجائز قابضوں نے جھانگر کلچر، پہلے قابضین کو بے دخل کر دیا۔ ان سارے واقعات کی تاریخوں کا تعین نہیں ہو سکا اور ان سے ہمیں دانش کی کوئی روشنی نہیں ملتی سوائے اس مسلسل زوال کے جو ہڑپہ تہذیب کے خاتمہ پر نمودار ہوا تھا اور جو ایران اور کوہ قاف کے علاقے سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ یہ بدلائے ہمیں ۱۵۰۰ ق م میں لے آتی ہے اور مغل گندھائی کی قبروں کی شہادت پر قائم دکھائی دیتی ہے۔ اس شہادت میں تین پاؤں کا ایک مرتبان گھوڑے کے گھنگھرو، انگوٹھیاں، چوڑیاں شامل ہیں جو وسطی ایران کے سیالک B کے مقبروں کی یاد دلاتی ہیں اور جن کی تاریخ

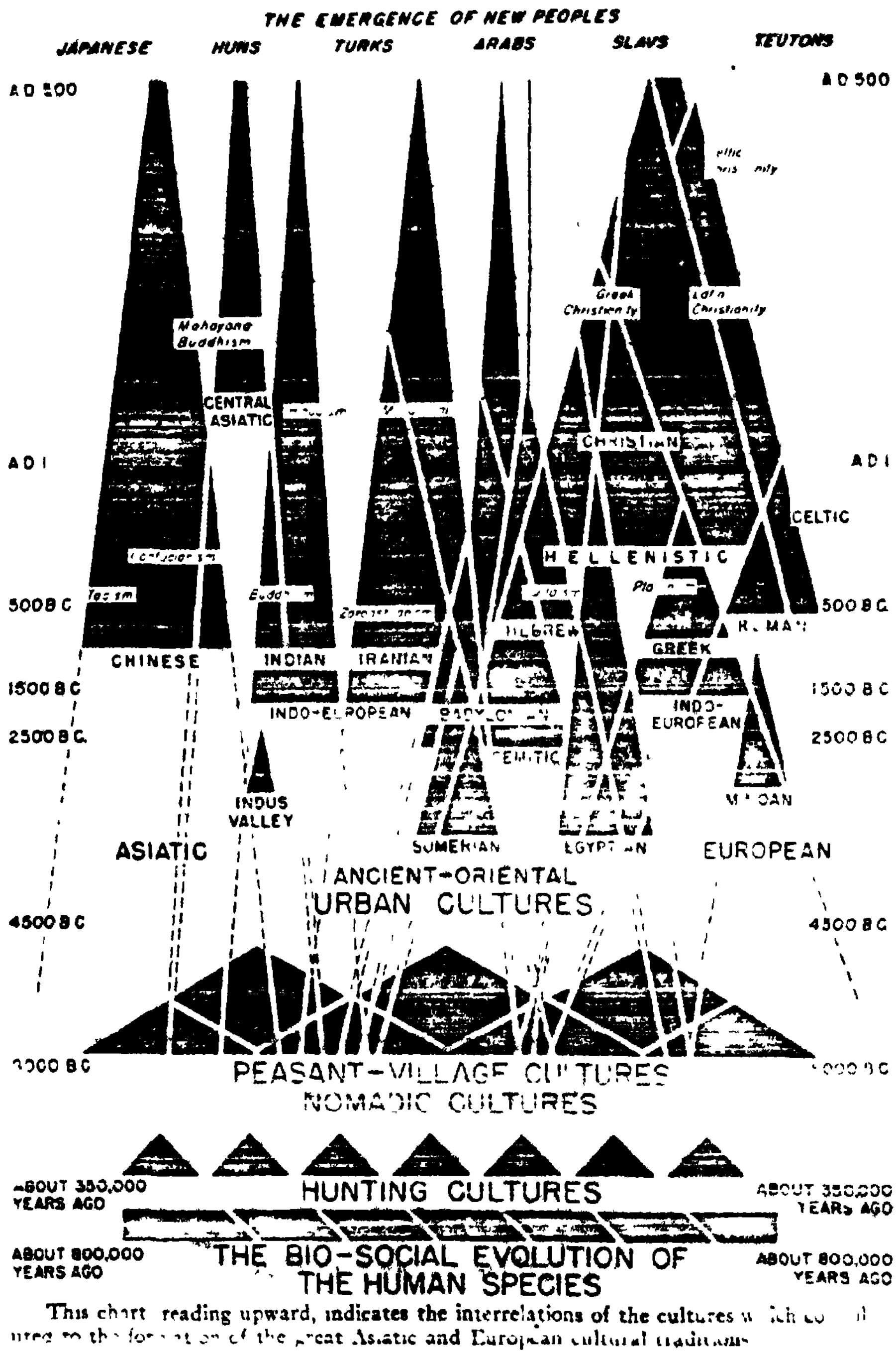
...۱۰ ق م کے قریب ہے اس کے برعکس ایسی شہادت بھی ہے کہ یہ مقبرے اس تاریخ کے بعد کے ہوں۔ یہ دوسری شہادت جس میں بارہویں صدی ق م کا کانسی کا خنجر جو فورٹ منرو پر ملا۔ تانبے کا کلہاڑا جو وادی قرم میں ملا اور دوسری شہادتیں جو مغرب سے متعلق ہیں (یعنی مغربی ایران اور کوہ قاف کی کم از کم مغرب کی طرف سے نفوذ سمجھانے کے لئے کافی ہیں۔ غیر محتاط لوگوں کی نظر میں اس شہادت کا رشتہ آریاؤں کے نفوذ سے جوڑا جا سکتا ہے لیکن ہنوز اس امر کا ثبوت درکار ہے۔" ۹۳

اس لمبے اقتباس کے لئے معذرت لیکن یہ اس لئے ضروری تھا کہ اس محقق نے پہلے یہ اعلان کیا تھا کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کو ختم کرنے والے آریا تھے لیکن اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہے اور اس پورے اقتباس میں وہ اپنی غلطی کا جواز اور اپنے موقف میں تبدیلی کا اعلان کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے موقف کی اس تبدیلی سے ہمارے محقق آگاہ معلوم نہیں ہوتے۔
اس موضوع پر پگٹ کے نظریات کی سب سے بڑی کمزوری اسکا رگ دید کی شہادت پر مکمل انحصار ہے اور ایسے انحصار کی کوتاہیوں، خامیوں اور خطرات کی نشاندہی ہم اوپر کر آئے ہیں۔ ایسی دستاویز جس کی تاریخ کا تعین ہی نہ ہو۔ کیسے ایک ناقابلِ تردید شہادت کے طور پر قبول کی جا سکتی ہے۔

ان معذرت خواہانہ روشوں کے برخلاف ہمیں ایسے حکما بھی ملتے ہیں جو واشگاف الفاظ میں اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ آریاؤں کا وادی سندھ کی تباہی میں کوئی ہاتھ نہیں تھا وہ اس امر کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان دونوں واقعات کے درمیان ۶۰۰ سال سے لے کر ایک ہزار سال تک کا عرصہ حائل ہے ان حکما میں کیمبرج کے آلچن بھی ہیں جو انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں مطبوعہ اس موضوع پر اپنے مقالے میں برملا اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ ہڑپہ کلچر کے فوراً بعد کئی گھٹیا کلچر اس جگہ قائم ہوئے جن میں سے کئی ایسے تھے جن کا تعلق ان روایات سے تھا جو ہڑپہ کلچر سے پہلے یہاں تھیں اور کئی ایسے تھے جو اسی زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔" ۹۴

رالف ٹرنر ایک اور محقق ہے جو ان نظریات کا قائل ہے اس کے خیال کے مطابق ہمارے پاس اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں جس کی رو سے قدیم ہندیورپی حملہ آوروں کی وادی سندھ کے باشندوں سے مڈبھیڑ ہوئی ہو یا انہوں نے یہاں کے کلچر کو جذب کر لیا ہو۔[۹۵] وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ ہڑپہ کلچر کے اختتام اور آریاؤں کی آمد کے درمیان تک ایک ہزار سال کا عرصہ ہے اور اس امر کی وضاحت اس نے اس نقشہ میں بھی کی ہے جو مختلف تہذیبوں کی ابتدا، ارتقاء اور خاتمہ کے سلسلہ میں اس نے ترتیب دیا ہے۔[۹۶] قاری کی سہولت کے لئے اس خاکے کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔ ۹۶

(عکس اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو)



This chart, reading upward, indicates the interrelations of the cultures which contributed to the formation of the great Asiatic and European cultural traditions.

ٹامس بی اپنے مخصوص انداز میں حکم لگاتا ہے کہ ہمارے پاس آثار قدیمہ کی کوئی ایسی شہادت نہیں جس کی رو سے ہم یہ کہہ سکیں کہ وادی سندھ کو سنسکرت بولنے والے قبائل نے تباہ کیا[66] اور آثار قدیمہ سے متعلق بی۔ بی۔ لال کے دلائل اس موضوع پر یہ ہیں کہ وادی سندھ کا خاتمہ جنگ کے ذریعے نہیں ہوا کیونکہ :۔

١ :۔ وہ ڈھانچے جن پر ضربات کے نشان ہیں کھدائی کے وقت ایک ہی سطح پر پڑے نہیں ملے بلکہ مختلف سطحوں سے برآمد ہوئے ہیں۔

٢ :۔ جس سطح پر یہ ڈھانچے ملے ہیں ان کے لئے لازم آتا ہے کہ وہ ان کھنڈروں کی آخری سطح ہو۔ جو حقیقت[67] کے خلاف بات ہے۔

٣ :۔ اس آخری سطح پر کسی غیر قوم کے آباد ہونے کے آثار ملنے چاہئیں لیکن ایسی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہوتی۔

٤ :۔ قبرستان H پر انحصار کرکے یہ کہنا کہ یہ آریاؤں کی قبریں ہیں ایک خوفناک استخراج ہے جس سے مسئلہ میں مزید الجھاؤ پیدا ہونے کا شدید احتمال ہے۔

٥ :۔ اس قبرستان اور وادی سندھ کی بربادی کے درمیان بھی ایک عرصہ حائل ہے۔[68]

بھنڈ چاریہ MAC KAY کے حوالے سے کہتا ہے کہ آریا وادی سندھ کی تباہی کے بعد ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اور ہم اس کی تباہی کے اسباب سے آگاہ نہیں۔[69]

کھنڈلاوالا اس ساری بحث کو جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وادی سندھ کی فنی روایات موریہ عہد کی فنی روایت سے پیوست کی جا سکتی ہے کیونکہ ان دونوں روایات کے درمیان ایک عرصہ حائل ہے جس پر وقت کی دھند چھائی ہوئی ہے۔

ول ڈیورانٹ ایک اور فاضل ہے جس نے تہذیبوں کے عروج و زوال کی داستان قلم بند کی ہے۔ وہ اس موضوع پر یوں اظہار خیال کرتا ہے کہ سندھ اور میسور کے آثار کے تسلسل کے باوجود ہم محسوس کرتے ہیں کہ وادی سندھ کے شباب اور آریاؤں کی آمد کے بارے میں ہمارے علم میں خلا ہیں یا دوسرے الفاظ میں ہمارا علم ماضی کی جہالت میں محض ایک اتفاق ہے![70]

آریائی قبائل کی تاریخ میں سرمئی رنگ کے ظروف جن کو آثار قدیمہ کے ماہرین PGW کا نام دیتے ہیں بہت اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان ظروف کا رشتہ ان قبائل سے مسلم ہے اور ان کی شہادت ناقابل تردید خیال کی جاتی ہے۔ ہڑپہ اور عالمگیر پور کے مقامات پر پہلی آبادی کی بربادی کے کئی تہوں کے بعد یہ ظروف ملے ہیں جس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ ان دونوں مقامات کی تباہی کے بہت دیر بعد آریائی قبائل یہاں سکونت پذیر ہوئے۔[71]

اور یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ یہ عرصہ تقریباً پانچ سو سال ہو سکتا ہے۔

ہمارے اپنے ڈاکٹر بلوچ کے اس موضوع پر اپنے نظریات ہیں۔ وہ اپنے مقالے مطبوعہ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کے آغاز میں اس بات کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں۔ سندھ کے علاقے میں اس تہذیب کے مراکز موہنجو داڑو آمری اور کوٹ ڈیجی سے یہاں سے جو شہادت دستیاب ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس تہذیب کا چلن ٢٢٠٠ ق م سے ١٧٥٠ ق م تک تھا۔ اس

کے بعد اس علاقے کی قدیم تاریخ میں جو ایران کے بادشاہ دارا (۵۲۲ - ۴۸۶ ق م) کے اس علاقے کی فتح سے شروع ہوتی ہے ایک ہزار سال سے زیادہ کا خلا ہے[۴۹]

جارج کارڈونا جو ماہر لسانیات ہیں لسانی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ جب تک وادیٔ سندھ کا رسم الخط پڑھا نہ جا سکے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہند یورپی قبائل کا تصادم وادیٔ سندھ میں ہوا یا یہ تہذیب ان کی آمد سے پہلے ہی ختم ہو گئی[۵۰]

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک اہم امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ جناب سبط حسن نے اپنی کتاب "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" ۱۹۷۵ء میں کراچی سے شائع کی اس کتاب کے صفحہ ۷۵ تا ۸۰ پر رگ وید سے وہ استنباط کر کے یہ کہتے ہیں کہ آریاؤں کی آمد کے وقت یہاں ایک قبیلہ آسور، جس کے دو دا دیوتے ورترا اور پانڑی تھے آباد تھے اس کے ساتھ ایک اور قبیلہ بھی یہاں رہتا تھا اس قبیلے کا نام داسیو تھا۔ ان قبیلوں کا اور ان کے راجاؤں کا اور ان معرکوں کا جو ان کو اندر دیوتا کے خلاف لڑتے ہوئے پیش آئے ایک مفصل تذکرہ جناب سبط حسن نے اپنی کتاب میں سپرد قلم کیا ہے۔ رگ وید سے استنباط اپنی جگہ درست اور وہ واقعات جو جناب سبط حسن نے بیان کئے ہیں ممکن ہے کہ ویسے ہی ہوں جیسے انہوں نے قلم بند کئے ہیں لیکن ان کا دی جدلیاتی عمل ان ملاحظات کے سامنے قائم نہیں رہتا جو ہم رگ وید کے بارے میں اوپر پیش کر آئے ہیں جب تک اس کتاب کی تدوین کا وقت اور محل طے نہیں ہوتا اس وقت تک اس کتاب کی شہادت موثر خیال نہیں کی جا سکتی تا وقتیکہ اس کی تائید کسی دیگر ذرائع سے نہ ہو۔ اس کتاب کو بنیاد بنا کر جو کچھ آج کل ہمارے محققین لکھ رہے ہیں وہ محض طوطا کہانیاں ہیں اور ہماری اور ہماری آئندہ نسلوں کے لئے گمراہی کا سامان!

مندرجہ بالا شہادت یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ دراوڑوں کا آریاؤں سے تصادم وادی سندھ میں نہیں ہوا اور یہ امر تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے[۵۱] اس طرح ڈاکٹر وزیر آغا کے فکری سومنات کا بنیادی ستون منہدم ہو جاتا ہے اور ان کی یہ ضخیم کتاب ایک دفتر بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے لیکن ہمارا کام ابھی جاری ہے کیونکہ ہمیں ابھی ان محرکات کا بھی تجزیہ کرنا ہے جو اس کتاب کی تصنیف کے پس پردہ بروئے کار رہے۔

اس موضوع پر کچھ کہنے سے پیشتر چند امور کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آریا، دراوڑ، یہودی، مسلمان قسم کی اصطلاحات استعمال کرتے وقت کہیں اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ ان کے نزدیک ان اصطلاحات کا نسلی پہلو اہم ہے یا لسانیاتی۔ ان اصطلاحات میں کم از کم پہلی دو یعنی آریا اور دراوڑ، لسانی اصطلاحات ہیں اور ان کا اطلاق نسل پر نہیں ہوتا۔ یہ دونوں الفاظ علم الانسان سے ثقہ علمیت کے پیش نظر خارج سمجھے جاتے ہیں۔ ویسے ان الفاظ کے ثقافتی اور تہذیبی مفاہیم بھی ہیں لیکن ان اصطلاحات کے علم الانسان پر اطلاق کے خلاف پر زور احتجاج کئے گئے ہیں ان میں پیش پیش آریاؤں پر مستند رائے رکھنے والے ماہر لسانیات میکس میولر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے جہاں ان الفاظ کو نسل کے معنوں میں استعمال کیا ہے (جس کی مثالیں ہم اوپر دے آئے ہیں) وہاں انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ لفظ تہذیب کا بھی اکثر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ پوری کتاب میں ان کا طریقہ کار یہ رہا ہے

کہ جہاں ضرورت پیش آئی انہوں نے ان الفاظ کو نسلی مفہوم میں استعمال کیا اور جہاں ان کا مدعا ان الفاظ کے ثقافتی مفہوم سے پورا ہوتا ہے وہاں انہوں نے وہی زاویہ نگاہ اپنا لیا ہے چنانچہ اس وجہ سے پوری کتاب میں ایک فکری انتشار پایا جاتا ہے۔

لفظ نسل کے اتنی معانی ہیں کہ یہ اب بے معنی ہو کر رہ گیا ہے اس کا ہلکا سا تاثر ہمیں ماہرین کے اس مقولے میں ملتا ہے کہ علم الانسان کے ماہرین کے نزدیک صرف GENETICS کے ماہرین جانتے ہیں کہ نسل کیا ہے اور GENETICS کے ماہرین کہتے ہیں کہ صرف علم الانسان کے ماہرین ہی جانتے ہیں کہ نسل کے معنی کیا ہیں" اس طرح لفظ نسل فکری انتشار کا بہت بڑا سبب ہے اور موجودہ دور میں UNESCO کے اس موضوع پر کام کے بعد ثقہ مباحث میں اس کا استعمال بہت احتیاط سے کیا جاتا ہے[۸۹] اس لفظ کے غلط مفاہیم کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

۱:۔ مشترکہ جسمانی خصوصیات کی بنا پر ہم ایک گروہ کو نسل کہہ سکتے ہیں جیسے سفید فام نسل لیکن اس میں ہمیں کم از کم تین مختلف رنگوں کی آمیزش نظر آتی ہے۔

۲:۔ ایک زمانے سے آباؤ اجداد کے کئی پیڑھیوں تک اکٹھا رہنے والوں کو بھی نسل ہی کہا جاتا ہے مثلاً انگریز، فرانسیسی جاپانی وغیرہ۔

۳:۔ اس لفظ کا اطلاق پوری نوع انسانی پر بھی ہوتا ہے۔

۴:۔ لفظ نسل مختلف ثقافتی گروہوں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے مثلاً مسلمان، بدھ، ہندو۔

۵:۔ یہ لفظ ان انسانی گروہوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جن کی اکثریت کسی مشترکہ خصوصیت کی حامل ہو مثلاً مارشل ریس، خواہ اس کے کئی افراد اس خصوصیت سے عاری ہی کیوں نہ ہوں۔

۶:۔ اس لفظ کا ایک اور گمراہ کن استعمال اس وقت عمل میں آتا ہے جب ہم مسلمان نسل، اینگلو سیکسن نسل، چینی یا جاپانی نسل کہتے ہیں[۹۰]

۷:۔ کئی دفعہ اس کا استعمال اس طرح کیا جاتا ہے کہ نسل اور قوم میں التباس پیدا ہو جاتا ہے"[۹۱]

۸:۔ زبان اور ثقافت کے اظہار کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ زیر نظر کتاب میں ہمیں نظر آتا ہے۔

اسی وجہ سے مشہور ماہر حیاتیات ٹی ایچ ہکسلے نے کہا تھا کہ انسانی گروہوں پر اطلاق کے وقت یہ لفظ حیاتیاتی مفہوم سے بالکل مبرا ہوتا ہے[۹۲]۔ ان کے خیال کے مطابق" اگرچہ کچھ عرصہ کے لئے پودوں، حیوانات اور انسانوں کے بارے میں ماہرین حیاتیات میں نسل کے تصور پر اتفاق تھا لیکن عام فہم زبان میں لفظ نسل کے کوئی واضح اور صحیح معنی نہیں ہیں اور کثرت استعمال سے اس میں ناخوشگوار اور تکلیف دہ مفاہیم پیدا ہو چکے ہیں"[۹۳]

"آریا" کی اصطلاح کو ہمیں لفظ نسل کے اس منتشر تناظر میں دیکھنا ہے کیونکہ مختلف علوم میں اس لفظ کے متواتر غلط استعمال سے زبان اور نژاد میں ایک التباس پیدا ہو چکا ہے یہ لفظ اپنی اصلی حالت میں محض ایک لسانی اصطلاح تھا۔ دوسرے علوم میں بے دریغ غلط استعمال سے بطور ایک نسلی اصطلاح کے بھی رائج رہا۔ ڈاکٹر وزیر آغا بھی اس سنگین غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں یا پھر دانستہ انہوں نے اس اصطلاحی انتشار کو اپنی کتاب میں برقرار رکھا ہے۔ اس لفظ کا یہی وہ غلط استعمال ہے جس پر کیس

میولر نے مندرجہ ذیل احتجاج کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس احتجاج سے پوری طرح واقف ہیں۔

"میں بار بار اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ جب میں آریا کہتا ہوں تو اس کا سیدھا سادھا مطلب ان لوگوں سے ہوتا ہے جو آریائی زبان بولتے ہیں اس کا اعلان ہندوؤں، یونانیوں، رومیوں، کیلٹوں اور سلاویوں پر ہوتا ہے جب میں ان لوگوں کا ذکر کرتا ہوں تو میں کسی جسمانی خصوصیات کی کومٹ منٹ نہیں کرتا۔ میرے نزدیک ایک ماہر نسل جو آریائی نسل، آریائی خون، آریائی آنکھوں اور بالوں کا ذکر کرتا ہے اتنا ہی بڑا گنہگار ہے جتنا کہ وہ ماہر لسانیات جو لمبوترے سروں کی لغات یا گول سروں کی گرامر کا ذکر کرتا ہے یہ بابل کے انتشار سے بھی بدتر ہے۔ یہ سراسر سرقہ ہے"[۸۳]

اس انتباہ کے بعد ڈاکٹر صاحب خود ہی فیصلہ کرلیں کہ وہ کس زمرہ میں آتے ہیں۔

دوسرے محققوں کی طرح رالنسن کو لفظ آریا کے غلط استعمال کا شدید احساس تھا اور کئی جگہ انہوں نے اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا ہے مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں کہ "پنجاب کے آریائی حملہ آوروں کی زبان ثقافت اور ان کے سماجی اور مذہبی روایات قدیم یورپ کے انڈو جرمانک اقوام سے اس حد تک مماثلت رکھتے ہیں کہ ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کسی زمانے میں وہ بہت قریب رہے ہوں گے اگرچہ زمانہ حال کے قاری کو اس امر کے خلاف متنبہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ زبان اور ثقافت کی یکسانیت لازمی طور پر نسل یا ایک ہی قبیلہ کا مظہر نہیں ہیں"[۸۴]

مزید، ہندوستان کے نسلی عناصر کا تجزیہ کرتے وقت یہی محقق پھر کہتا ہے کہ آریا اور دراوڑ قطعی لسانیاتی اصطلاحیں ہیں[۸۵]

مونیئر ولیمز کے مطابق لفظ آریا کا مادہ RI AR ہے جس سے مراد ہل چلانا ہے۔ لاطینی میں ARATUM کے معنی ہل کے ہیں اور AREA سے مراد کھلی جگہ۔ اس طرح آریا کا معنی ہل چلانے والے کے ہیں[۸۶]۔ بوستے بھی اس امر کی تائید کرتا ہے[۸۷]۔ اور پگٹ بھی آریاؤں کا زراعت سے متعلق ہونا تسلیم کرتا ہے[۸۸] اس صورت میں اس کا مشہور ترجمہ "نوبل" غلط ہو جاتا ہے[۸۹] اور آریا ایک پیشہ قرار پاتا ہے جس سے مراد کاشتکار لوگ ہیں۔ زراعت پیشہ، کھیتی باڑی کرنے والے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ مفتوح لوگوں سے امتیاز برتنے کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا[۸۹]۔ اس لفظ کا سب سے پہلا استعمال ہرّی (حرّی) زبان میں ملتا ہے جس کا چلن تاریخ میں ۱۴۰۰ ق م سے لے کر ۱۱۹۰ ق م تک نظر آتا ہے[۹۰]۔ ہرّی قبیلہ ایک اور قبیلہ متانی سے متعلق تھا یہ لفظ حطیوں متانیوں کے علاوہ میڈ، ایرانی اور ویدک عہد کے ہندوؤں میں بھی مستعمل تھا جو ہند یورپی اقوام کی ایک شاخ تھی۔

انیسویں صدی جرمن رومانٹک تحریک کا زمانہ ہے ۱۸۴۵ء میں جرمنی میں اے کوہن (R. KUHN) نے اپنی مشہور کتاب
ZUR ÀLTESTAU GESCHICHTU DER INDOGERMEMSCHEN VÖLKER
میں اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ آریاؤں کے بارے میں معلومات آثار قدیمہ کے علاوہ مذہب پر تحقیق سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ادھر ہندوستان میں سر ولیم جونز ۱۷۸۶ء میں پہلے ہی ایک چونکا دینے والی بات کہہ چکا تھا۔ یہ مستشرق ماہر لسانیات تھا اس نے اپنی تحقیقات میں ہند یورپی زبانوں اور سنسکرت میں حیرت انگیز صوتی مماثلت کا انکشاف کیا چنانچہ آریاؤں پر بیک وقت تین مختلف محاذوں پر کام ہونے لگا۔ آثار قدیمہ پر خود کوہن کام کرتا رہا۔ لسانیات کے شعبہ میں شلیگل SCHALEGAL

(۱۷۷۲ - ۱۸۰۹ء) پریچرڈ PRITCHARD (۱۷۸۹ - ۱۸۴۸ء) پکٹٹ PICTET اور فرانز بوپ FRANZ BOPP (۱۷۹۱ - ۱۸۶۷ء) نے ۔ سر ولیم جونز کے تیار کردہ خطوط پر اپنی تحقیقات جاری رکھیں اور ان زبانوں کے چونکا دینے والی صوتی مماثلت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا۔ اِدھر ہندوستان کی زبان اور مذہب کے شعبہ پہ فریڈرک میکس میولر نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ میولر اپنی جوانی ہی میں اپنشدوں سے بہت متاثر ہو چکا تھا[۹۲] وہ سنسکرت زبان اور ویدوں کے مطالعہ میں اتنا محو گیا کہ اس نے خود کہا کہ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ بنی نوع انسان کی تاریخ کے متعلق انیسویں صدی کی اہم ترین دریافت کیا ہے تو میں کہوں گا "سنسکرت ؛ دیوس پیتر = یونانی ؛ زیوس = لاطینی ؛ جیوپیٹر = قدیم نارس ٹائیر"[۹۳] اس کے اپنے خیال کے مطابق وہ اپنی زندگی میں دو کتابوں سے شدید طور پر متاثر ہوا تھا ایک کانٹ کی CRITIQUE OF THE PURE REASON اور دوئم رگ وید[۹۴]

یہ ابتدائی آریاؤں کے متعلق مطالعہ کی جس کی عمارت کافی حد تک سائنسی بنیادوں پر استوار نظر آتی ہے لیکن اس بنیادیں کافی رکھنے تھے میکس میولر کا مذکورہ مقولہ جہاں اپنے اندر ایک پُراسرار ہیبت لئے ہوئے ہے جو اس کے اختصار کی وجہ سے اس میں در آئی ہے۔ وہاں انسانی تاریخ سے متعلق اس کے اس انکشاف کی سطحیت کی طرف بھی ایک معنی خیز اشارہ ہے کوہن، میولر نے جو آریائی اساطیر کے تقابلی مطالعہ کے بانی مبانی ہیں آریاؤں کے بارے میں نظریات کی بنیاد اس اصول پہ استوار کی کہ اساطیر اور زبان کی گرفت انسانی دل و دماغ پر بہت مضبوط ہوتی ہے۔ اس امر کی تائید CREUZER نے اپنی کتاب SYMBOLIC میں کی۔ ان دونوں یعنی کوہن، میولر کے نزدیک اساطیر پروہتوں کے اذہان کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ان کا براہ راست تعلق مظاہر فطرت سے ہے ان کا سب سے پہلا اظہار رگ وید کی مناجاتوں میں ہوا اور ان مناجاتوں کے مطالعہ سے ہم ان لوگوں کی اساطیر کو ایک ضابطہ کے تحت مرتب بھی کر سکتے ہیں۔ ان حضرات نے صرف اس بات پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ علمی سطح پر ان کے نظریات کی بنیاد تو لسانی تقابل نے مہیا کر دی اور اس میں اعانت دوسرے علوم نے بھی کی۔ ان میں اساطیر کا علم بھی شامل ہے جس کا انہوں نے صرف تقابلی مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کے مصادر اور مخارج کا پتہ لگانے کی کوشش بھی کی چنانچہ اس مطالعہ کے حلقے میں رگ وید کے علاوہ ہومر کی ایلیڈ، زرتشت کی اوستا اور آئس لینڈ کی نارس زبان کی قدیم تصنیف ایڈا بھی شامل کر لی گئیں۔ اگرچہ ان دونوں عظیم علماء کی علمی کاوشیں تاریخ میں بہت اہمیت کی حامل ہیں لیکن ان کے نظریات کی بنیاد میں جو دراڑ پڑی وہ ان کے جوش اور جذبہ کے غیر ضروری ابال کی وجہ سے وجود میں آئی۔ ان کی بیشتر توجہ لسانی تقابل، آثارِ قدیمہ اور اساطیری تقابل پر ہی مرکوز رہی[۹۵]

عقلیت جس سے مراد انسانی شعور اور فطرت کے پوشیدہ رشتوں کی تلاش ہے اور رومانٹسزم جو ان رشتوں اور اصولوں کو انسانی تخیلات اور شعور پر مبنی قرار دینے پر مصر ہے۔ کسی مسئلہ کے حل تک پہنچنے کے دو مختلف راستے یا طریقہ ہائے کار ہیں یہ دونوں طریقہ ہائے کار ان علماء خصوصاً میکس میولر کی علمی کاوشوں کے پس منظر میں کار فرما تھے اگرچہ یہ دونوں حکماء مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں پیش آہنگ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کی اہمیت ان کے وضع کردہ اصولوں اور نظریات کی بنا پر نہیں کیونکہ ان کے نظریات کو ثقہ علماء میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ میکس میولر کا یہ نظریہ کہ مذہب زبان

کی بیماری کی وجہ سے وجود میں آیا ہے نہ مذہب ہی کوئی اہمیت دے سکا اور نہ ہی زبان کے بارے میں ناقابل تردید نظریہ قائم کر سکا۔ یہ خیال سراسر قیاسی تھا لیکن ان کو اگر ہم نظر انداز بھی کر دیں تو بھی میکس میولر کی اصل اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ اس نے مذہب کے بارے میں نہایت منضبط، منظم اور سائنٹفک طریقہ کار اپنایا اور اس بات کی اہمیت آج بھی مسلم ہے[۹۴]

جوزیکم واچ کے الفاظ میں اس وقت تک کے علماء کی ان کاوشوں کے بعد صورتِ احوال یہ تھی۔

"مذاہب کے مطالعہ کی پہلی منزل پر مذاہب کے صحیح ادراک کے پیچھے ایک سچی خواہش اور پرخلوص جذبہ کارفرما تھا اس میں قیاس آرائی کو بھی کچھ دخل تھا۔ اس مرحلہ پر لسانیات، تاریخ اور فلسفہ کے علوم اس مقصد کے لئے متحد ہو گئے تھے۔ اور الہیات کا علم پس منظر میں چلا گیا تھا۔ مذہب کی سائنس کی نئی اصطلاح اس نئے ضابطۂ مطالعہ کا فلسفۂ مذہب اور الہیات سے بالخصوص آزادی کا اعلان تھا"[۹۷]

کومن میولر نے آبائی مذہب کے بارے میں اپنے نظریات مرتب کرتے وقت زبان اور اساطیر کو تو سامنے رکھا لیکن مختلف مذاہب کی رسومات اور طریقہ ہائے عبادات کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ان کے نظریات کی خامیاں نمایاں ہونے لگیں ان کے خلاف انیسویں صدی میں ردِ عمل شروع ہو گیا تھا۔ مذکورہ بالا کوتاہیوں کے علاوہ FOLKLORE کے علم نے جو اساطیر، داستانوں کہانیوں، رسومات، رواج اور عادات کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور جس کا منصب ان سب اجزاء کا تجزیہ، تقابل اور تحلیل ہے یہ نظریہ بھی پیش کیا کہ اساطیر کے وراء بھی اساطیر کا ایک علم ہے جسے ہم LOWER MYTHOLOGY سے موسوم کر سکتے ہیں اور جس کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جن دیوی دیوتاؤں یا مافوق الفطرت ہستیوں کا ان اساطیر میں ذکر ملتا ہے وہ محض علامتیں ہیں ان اشخاص کی جو ازمنۂ قدیم میں زندہ تھے اور گوشت پوست کے انسان تھے ان لوگوں کے ہاتھوں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام پایا ہو گا۔ جس کی وجہ سے وہ عام انسانی سطح سے اٹھ کر ایک عرصہ کے بعد ایک بلند اساطیری مقام پر دیوی دیوتاؤں کی صورت میں فائز ہو گئے CENTAURS یا CYCLOPES حقیقت میں وحشی انسان تھے جو کسی وجہ سے اساطیر میں منتقل ہو گئے[۹۸] یہی حال رگ وید کے دیوی دیوتاؤں کا ہے جو اگرچہ گوشت پوست کے انسان تھے لیکن اپنے کارناموں کی وجہ سے وہ اساطیری صورتوں میں منتقل ہو گئے۔ اساطیر ایسے بیانات ہوتے ہیں جن کی سچائی کی سند ان کے اندر ہی ہوتی ہے اور اس کی وضاحت نہیں کی جاتی اور یہ ایسے حالات و واقعات بیان کرتی ہیں جو بظاہر اس دنیا سے متعلق نہیں مگر ان میں انکی ایک بنیادی حیثیت ہوتی ہے وہ زمانہ جس میں کوئی مخصوص واقعہ بیان کیا جاتا ہے ہمارے مشاہدہ میں آئے ہوئے تصورِ زمان سے مختلف ہوتا ہے اور کئی صورتوں میں وہ زمانہ ہمارے تصور سے بھی ماوراء ہوتا ہے۔ واقعات کے کردار اکثر دیوتا، مافوق الفطرت یا غیر معمولی ہستیاں ہوتی ہیں مثلاً جانور، پودے قدیم ترین انسان یا کوئی ایسی مخصوص ہستی جس نے اپنے زمانہ کے حالات کو بدل کر رکھ دیا ہو[۹۹] یہی حال آریائی زبان بولنے والے دیوی دیوتاؤں کا بھی تھا۔ یہ امر اور بھی واضح ہو جاتا ہے جب ہم اس امر کو تسلیم کر لیں کہ رگ وید ان قبائل کے ہندوستان میں وارد ہونے سے پہلے کی کتاب ہے تاہم چنانچہ یہ کہنا کہ آریاؤں کے دیوتا اندر نے یکے بعد دیگرے پوروں (دراوڑوں کے شہر پور کہلاتے تھے اور آج بھی ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر شہروں کے نام 'پور' پر ہی ختم ہوتے ہیں جیسے شاہ پور، گورداسپور وغیرہ) کو تہ تیغ کر ڈالا تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں (ص ۲۲، اساطیر کی گہرائی، اہمیت، خصوصیات اور صفات سے محض لاعلمی ہے

یہ ایک طفلانہ خوش فہمی ہے جو ثقاہت سے عاری ہے![111]

"اندر کا آریائی قبائل کی ہندوستان میں آمد سے کوئی تعلق نہیں اس کا ذکر ہمیں بوغاز کوئی کے محولہ بالا عہد نامہ میں ملتا ہے۔ جو ۱۴۰۰ اور ۵۴۳ ق م کے درمیان طے پایا تھا۔ اس وقت تک اندر دیوتا کے مقام پر فائز ہو چکا تھا اور اساطیری مقام حاصل کرنے کے لئے برسوں نہیں صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ زرتشت کا زمانہ چھٹی صدی ق م ہے وہاں بھی اس کے اساطیر میں اندر کا ذکر ملتا ہے رگ وید کی داخلی شہادت میں اس موضوع پر خلا ملتے ہیں[112] اور یہ سب شہادت اس امر کے ساتھ مل کے کہ آریاؤں کی ہندوستان میں آمد کے کوئی واضح اور حتمی شواہد موجود نہیں[113]۔ ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا بیان کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔ اندر کے متعلق کئی تاویلیں ہو چکی ہیں اور وہ ساری ڈاکٹر صاحب کی مندرجہ بالا تاویل سے کہیں زیادہ فکر انگیز اور دانشورانہ ہیں۔[114]

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بات کوہن میولر کے نظریات کی ہو رہی تھی جب مذہبی تقابل کا مرحلہ آگے بڑھا تو عیون کا ایک سلسلہ سامنے آیا جس کے کچھ آثار آریائی قبائل کے ہاں بھی نظر آتے تھے لیکن عیون کا یہ سلسلہ کوہن اور میولر کے نظریات کے چوکھٹے میں فٹ نہ ہو سکا ان عیون میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ تمام مذاہب کی بنیاد اجداد پرستی پر ہے جو بتدریج تین مراحل یعنی روح پر عقیدہ وجود غیر مادی پر اعتقاد اور پھر دیوتاؤں کے تصور سے گزرا۔ ان میں سے پہلا مرحلہ آریاؤں سے پہلے کا خیال کیا جاتا ہے اس کا تعلق مظاہر پرستی یعنی A R A H ، S M سے ہے لیکن آج کل یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوازم کا مرکزی نقطہ ہی مظاہر پرستی ہی ہے۔[105] دوسرا مرحلہ یعنی وجود غیر مادی پر اعتقاد آریاؤں سے متعلق ہے اور تیسرا آریاؤں سے بعد کا۔[106] اس کے بعد آریاؤں سے متعلق نظریات کی ایک کمزوری ۱۸۰۰ء سے پہلے ہی اس وقت نظر آئی جب لسانیات کے تقابلی مطالعہ سے اس بات کا انکشاف ہوا کہ زبانوں کی مختلف آوازوں کی مماثلت یعنی ویسی مماثلت جسے میکس میولر نے بیسویں صدی کا سب سے بڑا انکشاف کہا تھا، بالکل سطحی ہے دراصل علم صرف پر مبنی صوتی مطابقت اور مماثلت ایک مربوط نظام پر قائم ہے۔ متفق الصوت لیکن مختلف المعنی الفاظ کا ایک لمبا سلسلہ ان زبانوں میں موجود ہے۔ اس طرح وہ سطحی صوتی مماثلت جس کو سر ولیم جونز، میکس میولر اور ان کے دوسرے رفقائے کار نے اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا تھا بے معنی ہو گئی۔[107]

میکس میولر اور کوہن کے آریائی نظریات کی ان خامیوں سے زیادہ خوفناک ضرب جو ان حکماء کے آریائی نظریات پر پڑی وہ گرپ GRUPPE کا یہ انکشاف تھا کہ رگ وید کی قدیم مناجاتوں میں جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ سیدھی سادھی نظری شاعری ہیں۔ براہمنوں کی موشگافیاں اور تحریفات بھی شامل ہیں اور یہ الحاقی عنصر رگ وید کے قدیم ترین حصہ میں زیادہ نمایاں ہے اس طرح رگ وید کے بہت سارے اساطیری وجود برہمنوں کے ذہنوں ہی کی پیداوار ہیں۔

یوں یہ خیال کہ ویدک مذہب فطرت کی پرستش پر مبنی ہے غلط ثابت ہوا اور اسی طرح وہ لسانیاتی مطالعے جو دیوی دیوتاؤں کے ناموں کے "مادہ" پر استوار ہوئے ناکام ہو گئے کیونکہ اول تو ETYMOLOGY بذات خود مشکوک ہے اور دیوتا انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں بڑے ہوتے ہیں اور اپنے ناموں سے کہیں مختلف صورتیں اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی کارکردگی بھی تبدیل ہوتی رہتی تھی۔[108] گرپ کو اس امر پر یقین تھا کہ ازمنہ قدیم کے آریا مذہب سے بیگانۂ محض تھے اور ان کے اساطیر اور عبادت کے طریقوں میں یکسانیت اس وجہ سے کہ بقول CREUZER انہوں نے ان کو مصر اور مغربی ایشیا کے ممالک سے

سے اخذ کیا اور بعد میں ان کو یونان، ہند، شمالی اور وسطی یورپ میں پھیلا دیا۔

۱۹۲۰ء کے قریب مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر ثقہ حکماء اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ ان عظیم محققین کے آریائی نظریات کو قطعاً رد کر دینے کے سوا کوئی اور چارہ کار بھی ہے؟

یہ تو تھی اس زمانے میں آریائی نظریات کی ردّ و کد اور یہ تھا ان کا انجام۔ لیکن آج کے حکماء و دانشگاف الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ :-

> There never was an Aryan race and all we are entitled to infer is the existence in the second mellennium before our era of a group of peoples inhabiting the steppes of Turkistan and Central Russia with a common 'Indo-European' language and culture who over-ran or influenced a very wide area so that their tongue is the ancestor of many others including Sanskrit, ancient Greek, Latin and the majority of the languages spoken in Europe today Quite obviously the use of a common language does not mean that all individuals speaking it are of the same race, since the fact that one person speaks Chinese while another speaks English or Arabic or Russian is determined, not by biological heredity but what each has been taught "

اس فرسودہ نسلی نظریہ کے دیگر مفروضات مندرجہ ذیل ہیں:

ہند یورپی زبانوں میں سنسکرت، یونانی، لاطینی، کیلٹک (جس میں کارنش، ویلش، آئرش وغیرہ شامل ہیں) جرمانک اور سلاوٗ زبانوں کا ایک ہی خاندان سے ہونا اور ان کی سطحی صوتی مماثلت جہاں اپنی جگہ ایک حیران کن انکشاف تھا وہاں اسی کی وجہ سے مزید قیاس آرائیاں بھی وجود میں آئیں اس مماثلت اور یکسانیت کی بنا پر یہ باور کیا جانے لگا کہ ایسی ایک نسل کہیں تو ہو گی۔ جو ان سب زبانوں سے زیادہ قدیم زبان، جس سے یہ ساری زبانیں پیدا ہوئی ہوں گی بولتی ہو گی۔ اس طرح زبانوں کی یکتائی کے مفروضے سے نسل کی یکتائی کا نظریہ وجود میں آیا جو سراسر غیر منطقی اور غیر سائنسی تھا اور یوں آریا جو ایک لسانی اصطلاح تھی علم الانسان میں در آئی اور میکس میولر کو وہ احتجاج کرنا پڑا جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

جب ایک ایسی نسل کا تصور وجود میں آیا جو ایک ہی زبان بولتی تھی تو لامحالہ یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ نسل کہاں پیدا ہوئی ہو گی؟ اور اس کا وطن مالوف کہاں تھا؟ ۱۸۴۰ء کے قریب جے۔ جی۔ روڈ نے اس نسل کا وطن کوہ ہندوکش کی ڈھلوانوں کو قرار دیا لیکن پکٹٹ نے باختر کو ان آریاؤں کا وطن قرار دیا۔ میکس میولر نے اس نظریہ کی پر زور تائید کی اور اس بات کو تسلیم کیا کہ آریائی زبان بولنے والے لوگ یاقبائل ایشیائی تھے اس طرح ہندوؤں، یونانیوں، رومیوں، کیلٹوں اور جرمنوں کے اصلی آباؤ اجداد ایشیا ہی کے رہنے والے قرار دیئے گئے "صرف ایک احاطہ ہی میں نہیں بلکہ ایک چھت کے نیچے اور وہ ایسی زبان بولتے تھے جو ان مختلف زبانوں کی ماں تھی۔

آج بھی سکولوں میں بچوں کو یہی پڑھایا جاتا ہے کہ آریا وسطی ایشیا کے رہنے والے تھے لیکن اس سے آگے ان کا کوئی مقام متعین نہیں ہو پایا اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ محترمہ ڈاکٹر فرزانہ ریحانہ کی تحقیق بھی اس سے آگے نہیں بڑھ پائی۔

چونکہ ہند یورپی زبان کی شاخیں اور بولیاں یورپ میں زیادہ تعداد میں ملتی ہیں، اس لئے یہ نظریہ بھی پیش کیا گیا کہ آریا قوم کا مخرج یورپ میں واقع ہونا چاہیئے۔ اس نظریہ کے علمبردار ۵۴ HALL ۱۸۴۸ء) آر جی لیتھم (۱۸۵۱ء) اور (۱۸۵۴ء) اور شیچر (۱۸۵۳ء، ۱۸۶۱ء) تھے۔ ان محققین کے مطابق آریاؤں کا مخرج یورپ کے حوالے بحیرۂ اسود کا شمال ہو سکتا ہے ہنگری کے میدان، بحیرہ بالٹک کا جنوب، وسطی یا جنوبی روس، مشرقی یورپ، کوہ قاف یا اناطولیہ کا قرب و جوار اور یہاں تک کہ قطب شمالی کا علاقہ بھی اس نسل کا وطن قرار دیا گیا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ چند محققین نے شمالی افریقہ کو بھی آریاؤں کا وطن قرار دے ڈالا۔ ان میں پیش پیش امریکی ماہر علم الانسان برنٹن (۱۸۹۰ء) اور انگریز ماہر کین (KEANE) شامل ہیں۔

اس قسم کی قیاس آرائیوں کا قصہ تقریباً ۱۸۰۰ء تک چلتا رہا لیکن علمی حلقوں میں ان نظریات کے بارے میں شکوک و شبہات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- آریاؤں کے وطن کا تعین نہ ہونا اور اس کے بارے میں متضاد اور مشکوک نظریات۔

۲:- مسئلہ کا اندرونی پیچ در پیچ الجھاؤ جس میں آثار قدیمہ کی ہر دریافت کے بعد مزید پیچیدگیاں اور الجھاؤ پیدا ہوتے چلے گئے۔

۳:- یہ احساس کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ نوع انسانی میں بے تحاشہ ادغام ہوتا رہا ہے اور نجیب الطرفینی کا دعوٰے کوئی نسل انسانی نہیں کر سکتی۔[۱۳]

۴:- زمانہ قبل از تاریخ کے بارے میں کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے کے امکانات کی مشکلات اور مستقبل میں کسی ایسی شہادت کی دستیابی کے امکان کا فقدان جس سے اس مسئلے کو حل کرنے میں کامیابی ہو سکے۔

۵:- یہ احساس کہ محض قومی انا کی تسکین کے لئے ثقہ علمیت کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

ان اور دیگر وجوہات کی بنا پر اعلیٰ پائے کی علمی ثقاہت نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ آریائی نسل کا نظریہ پیشہ ورانہ تخیل کے شعبدے کے سوا اور کچھ نہیں کیونکہ اس کے لئے کوئی شہادت دستیاب نہیں ہوتی اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ایسی شہادت کے حصول یا ملنے کے امکانات کم سے کم تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔[۱۴]

اور اس صورتِ حال کو ..... نے طنزیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے

It was rightly inferred that there must have been an original and primeval Aryan' or Indo European' language from which all members of th fam ly deriv d their descent It was wrongly inferred that the peoples among whom t . . kindered languages were current were phy cally related in the same degree as the languages themselves and th v all descended from a primitive Aryan or 'Indo Aryan' race whi had spread conquering and to conquer east and west and north and uth from its original home a race which had brought froth the r l . . genius of Zarathustra and the Budha, artistic genius of Greece, the political genius at Rome and — a fitting climax — our noble sil . . why this was responsible for particularly all the achievement of human civilization '

اس اقتباس کے بعد اس مسئلہ پر کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اور یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ آریائیت کے اس بت کے پاؤں جو ڈاکٹر صاحب نے اپنی فکری سومنات میں نصب کئے ہیں مٹی کے ہیں اور وہ اس عظیم محقق کی ایک ضرب سے ہی پاش پاش ہو جاتا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں قدیم ذہنی روش کو چھوڑ کر نئے خیالات کو اپنانے کا عمل تکلیف دہ حد تک سست رفتار ہے اور اس کے برعکس لکیر پیٹنے کا عمل ہماری علمی دنیا میں جاری وساری رہتا ہے اسی لئے آریائیت کے اس فتنہ کی جزئیات پر ایک نظر ڈال لینا چاہیئے۔

نسل انسانی کی بحث اگرچہ سراسر علمی بنیاد پر تھی لیکن اس علمی تحریک سے کئی لوگوں نے اپنی قومیت کے جذبہ سے سرشار ہونے کی وجہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے گریز نہیں کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آریاؤں کے بارے میں مندرجہ بالا کوائف سے استنباط کر کے نسلی فضیلت کا نظریہ پیش کیا اور ان اہل قلم کی رکاب تھامے ہمارے ڈاکٹر صاحب اسی راستہ پر گامزن ہیں۔

نسلی فضیلت کا تصور آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے اہل یہود نے پیش کیا تھا اور اپنے آپ کو خدا کی منتخب قوم گردانا تھا۔ صرف وہی ایک قوم ہے جس کے بارے میں آئل سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہودی پیدا ہوتے ہیں بنتے نہیں ان میں CONVERTION کے ذریعے داخل نہیں ہوا جا سکتا۔ لیکن موجودہ تحقیق نے اس نسل کی نجیب الطرفینی کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔[۱۱۶]

انیسویں صدی کے وسط میں جرمن رومانٹک تحریک نے آریاؤں کے بارے میں اسی قسم کے نسلی فضیلت کے نظریات گھڑے تھے۔ آریاؤں کے متعلق فضیلت کے یہ تصورات اہل یہود کے نظریہ فضیلت کا ردعمل تھا ان حکمانے یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ تہذیبوں کی بنیاد اور ارتقا کا انحصار نسل انسانی کی ان خصوصیات پر ہوتا ہے جن سے وہ دوسری اقوام عالم سے ممیز ہوتی ہیں۔ ذہنی جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے آریا چونکہ ایک اعلیٰ نسل ہیں اور اس سے تعلق رکھنے والے افراد اعلیٰ نصب العین، ارفع ارادے اور بلند مقاصد رکھتے ہیں اور ان کے حصول کے لئے ان تھک محنت اور بے پناہ کوشش کرتے ہیں اس لئے صرف وہی لوگ ہیں جو زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے رہ سکتے ہیں اور وہی ہیں جو انسانی تہذیب کی ترقی اور عروج کا باعث بنتے ہیں"[۱۱۷]

اس نظریہ کا سب سے بڑا مؤید ایک فرانسیسی   جو وہاں کے جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھتا تھا   تھا

انقلاب فرانس کی ذہنی افراتفری کے پس منظر میں اس نے اس جاگیردار طبقہ کے حق میں آواز بلند کی اور اس آریائی فضیلت کے نظریہ استنباط کیا[۱۱۸] کیا واقعی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟ / اس طرح ایک انگریز ہاؤسٹن سٹیورڈ چیمبرلین نے بھی جو جرمنی کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا، اس نسلی فضیلت کے نظریہ کو اپنی کتاب FOUNDATIONS OF THE NINE TEENTH CENTURY تین جلدوں میں شائع کر کے خوب خوب ہوا دی اور اہل یہود کے خلاف کافی زہر اگلا۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اس نے یہ بھی ثابت "کر دیا کہ دانتے اور حضرت عیسیٰ بھی آریا ہی تھے"[۱۱۹] ڈاکٹر وزیر آغا بھی ان سے قدم ملا کر چل رہے ہیں یہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ چیمبرلین نے اس امر کا بھی "انکشاف" کیا کہ اہل یہود جرمن اقوام کے خلاف گہری سازش میں ملوث ہیں۔ اسی خیال نے آگے چل کر نازی ازم کے لئے بنیاد مہیا کی۔ اور اسی بنیاد پر روزن برگ نے نازی ازم کے بے معنی خیالات کی عمارت تعمیر کی اس کہ

کتاب The myth of the twentieth Century ہٹلر کی کتاب Mein kampf کے بعد اپنی مقبولیت میں اول نمبر پر تھی۔

ان حضرات کے خیال کے مطابق اس دنیا میں جتنی ذہنی، نظری، فکری، تمدنی اور تہذیبی ترقی ہوئی ہے وہ محض آریائی اقوام کی وجہ سے ظہور میں آئی ہے اور جہاں کہیں دنیا کی دوسری اقوام کے ہاتھ میں اختیار آیا وہ قومیں تباہی و بربادی سے ہم کنار ہوئیں یہی وہ خطوط ہیں جن پہ چل کر ڈاکٹر وزیر آغا نے زیر نظر کتاب تصنیف کی ہے۔

نسلی فضیلت کا یہ مکتب فکر بیسویں صدی میں دو عظیم فتنوں کا باعث بن چکا ہے اور آج سارا مشرق اس کی لپیٹ میں ہے جنوبی افریقہ میں انسانیت اسی فلسفہ کے پاؤں تلے کراہ رہی ہے اور عجب نہیں کہ یہی مکتب فکر تیسرے فتنے کا پیش خیمہ ثابت ہو ان شر انگیز نظریات سے نوآبادیاتی نظام کے لئے بھی جواز مہیا کرنا تھا[۱۲۱] اور ڈاکٹر صاحب کی اس فکر انگیز علمی کاوش سے ہی پتہ چلتا ہے کہ نوآبادیاتی قوتیں محکوم قوموں میں اس نظریہ کی تبلیغ میں کتنی کامیاب ہوئی ہیں جبکہ اس صدی کے اوائل ہی میں اقبال نے اپنے ہم وطنوں کو اس موضوع پہ ان الفاظ میں متنبہ کر دیا تھا۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

اور اس طرز فکر کے خلاف محسن انسانیت نے ان الفاظ میں اقوام عالم کو تنبیہہ کی تھی،

"نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے۔ انسان سارے ہی آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مٹی سے بنائے گئے۔ اب فضیلت اور برتری کے سارے دعوے خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جاچکے ہیں"[۱۲۲]

تدوین متن مولانا محمد شفیع
اردو ترجمہ حکیم محمد نعیم الدین زبیری
مطبوعہ ہمدرد ٹرسٹ کراچی۔

اور آج کے دور کے محققین اس آگاہی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

آج سے تیرہ سو سال قبل اسلام نے انسانی زندگی میں تکنیکی، اقتصادی، سماجی اور روحانی اتحاد کے نظریہ کی بنیاد رکھی تھی جس کو مغرب نے کہیں اب جا کے کچھ مارکس کے خیالات کی بدولت اور کچھ علم الانسان کی ابتدا ہونے سے دریافت کیا ہے اس پیغمبرانہ بصیرت کا ازمنۂ وسطیٰ کے عربوں کے ذہن میں کیا ارفع مقام ہوگا۔ مغربی دنیا جو مشینوں پر حکمران ہے اس مشینری کے وسائل، قوت اور حاضر دماغی کا بہت کم اندازہ لگا سکی ہے جسے جسم انسانی کہا جاتا ہے اور جو اعلیٰ ترین مشین ہے۔"[۱۲۳]

اس زمانے میں محققین نے نسلی فضیلت کے نظریہ کو بالکل رد کر دیا ہے۔ رالف ٹرنر نے اس موضوع کے دو ماہرین کی رائے سے استفادہ کر کے اس ضمن میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے۔[۱۲۴]

As a matter of fact, contemporary scientific investigations do not support either theory of racial determination In deed there is little scientific ground for assigning race a significant rule in history. Apparently there are no general diffearness in ability among the races which are not duplicated within each of the races; nor does interbreeding either lessen or increase ability. All - important in this connection is the fact that racial groupings cannot be correlated with any of the groupings — lingguistic, political and cultural — truely characteristic of the development of civilization

اور اس صدی کا عظیم ترین محقق جس کا احترام ڈاکٹر صاحب کو بھی ملحوظ خاطر ہے اسی موضوع پہ اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتا ہے۔ ۱۲۵

But enough has been said to justify us in dismissing the theory that a special race has been the cause and the author of transition from yien to yang, from static to dynamic in our part of the world after another since a date some six thousand years ago

صرف ان دو سندوں سے ہی نسلی فضیلت کے نظریہ کا بطلان ہو جاتا ہے اور یہ امر کہ کسی ایک نسل پر ہی دنیا میں انسانی زندگی کی تمام ترقی کا دارومدار ہے ایک بے معنی نظریہ بن جاتا ہے اور اس کا پرچار کرنا ایک گمراہ کن عمل ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود ڈاکٹر صاحب اپنے فکری سومنات کی بنیاد اسی مرتد نظریہ پر رکھتے ہیں جیسا کہ ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے جو دراوڑی تہذیب اور آریائی تہذیب کے بارے میں ہم اوپر درج کر آئے ہیں۔ ان پر مستزاد کچھ یہ بیانات ہیں اور ساتھ ہی ان کا تجزیہ۔ لیکن مندرجہ ذیل سطور کو پڑھتے وقت ہمیں ذہن میں یہ بات ضرور رکھنی چاہیئے کہ مندرجہ بالا اقتباسات اور یہ امر کہ نسلی فضیلت کے اس نظریہ کا بطلان اور ان سے متعلقہ دیگر مضمرات ڈاکٹر صاحب کی نظر میں ہیں اور وہ ان سے پورے طور سے واقف ہیں مگر پھر بھی ڈاکٹر صاحب کا اصرار اپنی جگہ پر قائم ہے۔

۱۔ ڈاکٹر صاحب نے خانہ بدوشی اور وحدتِ خداوندی کے درمیان ایک رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ خانہ بدوشی یا آوارہ خرامی سے انسان کے بندھن زمین سے کمزور ہو جاتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"ایک لیڈر اور ایک سوچ کے وجود کا احساس بالآخر ایک خدا کے تصور کو جنم دیتا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ٹھہرا ہوا معاشرہ زمین اور جنگل سے وابستہ ہونے کے باعث مادری نظام کا علمبردار ہوتا ہے۔ آوارہ اور خانہ بدوش قبیلے میں زمین سے منقطع ہونے کے باعث پدری نظام وجود میں آجاتا ہے اس لئے دھرتی دیوی کے مقابلے میں خانہ بدوشوں کے ہاں آسمانی دیوتاؤں کا وجود ابھرتا ہے اور بادشاہ اور سورج سے لے کر دیوتا اور خدا تک پدری نظام کے نقوش واضح ہوتے چلے جاتے ہیں" ص ۲۴۴، ۲۴۵۔

یہ بیان اور اس کے متعلقات کتاب کے ڈیڑھ صفحہ پر ملتے ہیں۔ اس بیان میں ڈاکٹر صاحب نے کئی علوم کے سمندروں کو صرف ایک کوزے میں بند کر کے دکھا دیا ہے۔ مادری نظامِ زندگی اور پدری نظامِ زندگی کئی علوم کی اساس ہیں مثلاً ان

کا تعلق مذہب، عمرانیات، تاریخ اور نفسیات سے بہت گہرا ہے اس پر مستزاد یہ امر ہے کہ خدا اور اس کے وجود اور پھر اس کی وحدانیت کے تمام عوامل اور مضمرات کو انہوں نے اس ڈیڑھ صفحہ پر پھیلے ہوئے بیان میں سمو دیا ہے یہ ایک انتہائی عجیب و غریب علمی کارنامہ ہے۔

جہاں تک مادری اور پدری نظام کا تعلق ہے تو یہ موضوع پوری ایک قسط کا متقاضی ہے اس لئے ہم یہ بحث اگلی قسط کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ پہلے ذرا خدا اور اس کی وحدانیت پر توجہ مرکوز کریں۔

جن دیوی دیوتاؤں کو لے کر آریا ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اور جن کی پرستش ویدک عہد میں عام تھی ان کی تعداد کا ذکر ہم پہلی قسط میں کر آئے ہیں۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ آریاؤں کے ہاں اس عہد میں خدا کا تصور باوجود ان کی آوارہ خرامی کے ابھرتا نظر نہیں آتا۔ ان کی تمام کتابوں میں جو الہامی گردانی گئیں ہیں اور جن پر ایک نظر ہم پہلے ہی ڈال چکے ہیں میں خدا اور اس کی وحدانیت کے تصور کے جراثیم یا سوچ نظر نہیں آتی سوائے اس اور اپنشدوں کے۔ ویسے ان کے ہاں دیوی کا تصور موجود تھا۔ ان کے ۳۳ دیوی دیوتا ان تمام خوبیوں یا برائیوں سے متصف تھے جن کو انسانی اوصاف یا کمزوریاں کہا جا سکتا ہے۔ رگ وید میں اغوا، رنڈی بازی، اسقاط حمل، مجرموں سے زناکاری کا ذکر ملتا ہے[۱۲۴] اس وید میں اغلام کی بھی کچھ شہادت نظر آتی ہے[۱۲۵] ہمسایوں کے مویشی چوری کرنا ان کا مشغلہ تھا[۱۲۶]۔ کئی بیویاں رکھنا اور کئی شوہر رکھنا، دلہنوں کی فروخت، اغوا یا ان کو چوری کرنا اس معاشرہ میں موجود تھا۔ جنس پرستی کے آثار بھی رگ وید میں نظر آتے ہیں[۱۲۷] بہن بھائی میں جنسی روابط کا تذکرہ بھی ہمیں رگ وید میں ملتا ہے (رگ وید ۱۰ ×)[۱۲۸] دوسروں کی بیویوں کو ورغلانے کی شہادت ہمیں اپنشدوں سے دستیاب ہوتی ہے[۱۳۰] چنانچہ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ رگ وید کو ماننے والے لوگ بھی گوشت پوست کے ویسے ہی انسان تھے جیسے کہ آج کل دنیا میں پائے جاتے ہیں اور بحیثیت انسان وہ انسانی کمزوریوں، لغزشوں اور کوتاہیوں سے کسی صورت میں مبرا نہیں تھے اور یہی تمام اوصاف ان کے دیوی دیوتاؤں میں خصوصاً اندر میں منعکس ہوتے ہیں۔ سریانی روایت تہذیب کی باقی روایات سے اسی وجہ سے مختلف ہے کہ اس میں دیوی دیوتاؤں کی تجسیم انسان اپنی ہی شکل پر کرتا ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے اپنے خداوندوں میں وہی اوصاف اس کو نظر آتے ہیں جو وہ عام انسانوں میں دیکھتا ہے۔ دراصل یہ روایت انسان کے اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی زندان میں محبوس و محدود ہونے کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔

تراشیدم صنم بر صورت خویش
بشکل خود خدا را نقش بستم — اقبال

انسان کسی ایسی چیز یا ہستی کا تصور نہیں کر سکتا جو پہلے سے اس کے مشاہدہ یا تجربہ میں نہ ہو۔ جہاں یہ تجسیم یعنی ANTHROMORPHISM کا عمل وجود میں آیا وہیں انسان کے دیوی دیوتاؤں میں انسان کے اپنے اوصاف منعکس ہونے شروع ہو گئے اور یہ دیوی دیوتا جو انسانی اوصاف سے متصف ہو کر وجود میں آئے ان کا طرز عمل بھی انسانی ہی تھا۔ وہ ویدک عہد کے انسان کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی۔ وہ انسانوں سے ناراض بھی ہوتے تھے اور قربانیوں کے ذریعہ خوش بھی۔ جو قربانیاں ان کی خوشنودی کی خاطر دی جاتی تھیں وہ ان میں حصہ بھی لیتے تھے اور ان تمام رسومات میں شامل بھی ہوتے تھے۔

یہ ضرور خیال کیا جاتا تھا کہ گروہ ان رسعات میں نظر نہیں آتے تو ان میں شامل ضرور ہیں۔ بہرحال وہ اسی ویدک عہد کے معاشرہ کا عکس تھے اور اسی معاشرہ کا حصہ بھی اور وہ ان خوبیوں یا کمزوریوں سے بالاتر نہیں تھے جو اس زمانے یا اس زمانے کے انسان میں پائی جاتی تھیں اور یہ امر رگ وید کی مناجاتوں سے واضح ہو جاتا ہے۔ ان مناجاتوں کے سیاق و سباق میں ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان کہ بے شک آریاؤں کے بھی کئی دیوتا تھے لیکن ایک تو ان کی تعداد بہت کم تھی دوسرے یہ دیوتا ارضی اور جسمانی صفات سے بڑی حد تک ماورا بھی تھے ص ۵۰۔ پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ویدک عہد کے معاشرہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی معلومات بہت ہی قلیل ہیں اور اگر واقعی ان کا مطالعہ اس معاشرہ کے بارے میں عمیق ہے تو ان کا یہ بیان حقیقت کو مسخ کرنے کی ایک واضح صورت ہے۔

ان دیوی دیوتاؤں کو سماوی مخلوق سمجھا گیا ہے اور ان کے لئے   OPER AIR کے دیوتا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں[۱۳۲] لیکن ان کو سماوی اس لحاظ سے ہرگز نہیں کہا جا سکتا جس لحاظ سے سامیوں میں فرشتہ، ملائک یا حوروں کا تصور ہے نہ یہ مخلوق انسانی سرشت سے بالاتر ہے اور ان کی انسانوں کی طرح تجسیم نہیں کی جا سکتی۔

دوئم جہاں تک ایک لیڈر کا تعلق ہے تو وہ آریاؤں کے ہاں کبھی ہوا ہی نہیں۔ یہ ہند یورپی زبان بولنے والے مختلف قبائل تھے جو ایشیا میں داخل ہونے سے پہلے لامذہب اور لادین تھے۔ مذہب اور دین کے تصورات اس وقت ابھرے جب یہ قبائل متمدن دنیا کے قریب آئے[۱۳۳]۔ ان کے ہاں خانہ جنگی عام تھی جس کی وجوہات مویشیوں کی چوری اور زمینوں کے جھگڑے ہوتے تھے ویسے بھی ان کی اس تاریخ میں جو ابھی تک سامنے آئی ہے خانہ جنگیوں کو بڑا دخل ہے۔ حملوں کے سلسلے میں ایک عہدنامہ کا ذکر اوپر آیا ہے یہ عہدنامہ داماد اور سسر کے درمیان جنگ کے بعد وجود میں آیا۔ متانی، حطی، میڈ آپس میں گتھم گتھا رہے اور آس پاس کے لوگوں سے بھی انہوں نے کبھی بنا کر نہیں رکھی۔ وہ آریائی شاخ جو ایران میں داخل ہوئی آپس ہی میں لڑ پڑی۔ جھگڑا یا تو مذہبی عقائد کی بنا پر تھا یا زمین کا تنازعہ تھا چنانچہ ان کے اس حصے کو جو شکست خوردہ تھا ایران سے نکلنا پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کے دیوتا ان کے راکشس بن گئے اور ان کے دیوتا ایرانیوں   کے دیو یا شیطان کہلائے۔ اندر ہندی آریائی شاخ کا سیرو ہے لیکن ایرانیوں کے ہاں یہ شیطان کا مقام رکھتا ہے[۱۳۵]۔ ہندوستان پہنچ کر یہ آپس میں جھگڑتے رہے انجام کار یہ خانہ جنگی مہابھارت کے روپ میں سامنے آئی[۱۳۶]۔ ویدک عہد میں کوئی آل انڈیا لیڈر نہیں ہوا اس لئے ایک لیڈر کا وجود ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں ہو تو ہو تاریخ میں آریاؤں میں تو ہمیں نظر نہیں آتا ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اشوک کا خیال آئے لیکن وہ ویدک مذہب چھوڑ کر مہاتما بدھ کا پیروکار بن چکا تھا۔

سوئم جہاں تک ان کے مندرجہ بالا بیان میں ان عوامل کا تعلق ہے جو ڈاکٹر صاحب نے خدا اور اس کی وحدانیت کے تصور کی پیدائش کے بارے میں گنوائے ہیں تو اس پر ٹائن بی کا ہی فتویٰ درج ذیل ہے۔[۱۳۷]

The Syriac civilization has three great feats to its credit It invented the Alphabet, it discovered the Al lantic and it arrived at a particular conception of God, which is common to Zorwaeterianism, christianity and Islam but alien to Egyptic, Sumeric, India and Hellenic views at religious thought

ملاحظہ بی کے مندرجہ بالا بیان کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ اس سے ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا بیان کا قطعی بطلان ہو جاتا ہے۔ تاہم چلتے چلتے ڈاکٹر صاحب کی اطلاع کے لئے یہ عرض کرتے چلیں کہ خانہ بدوشوں کے ہاں خواہ وہ کرۂ ارض کے کسی کونے میں ہوں خدا کی وحدانیت کا تصور کبھی نہیں ابھرا۔ تاریخ کی روشنی میں عظیم پیغمبروں میں حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے ہیں جو خدائے برتر اور اس کی وحدانیت کا تصور لے کر آئے اور ان میں سے کوئی بھی خانہ بدوش نہیں تھا۔ سب کے سب بڑے شہروں کے رہنے والے تھے جو بڑے مذہبی اور تجارتی مراکز تھے اور یہی شہر مختلف النوع خیالات کے لئے CLEARING HOUSE کا کام سرانجام دیتے تھے۔ ان ہستیوں کا خانہ بدوش طرز زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ اپنے اپنے خیالات کی بنا پر ان کو اپنے اپنے مولدوں سے ہجرت کرنی پڑی۔

اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو ڈاکٹر صاحب کے فکری سومنات کے تمام لات و منات درہم برہم ہو جاتے ہیں اور ان کا پورا تھیسس بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

آریاؤں کی نسلی فضیلت مستحکم کرنے کے لئے انہوں نے صرف خیالات ہی کے لات و منات نہیں تراشے بلکہ ان کو فصاحت کے حرفوں سے بھی سنوارا ہے۔ انہوں نے قبائل کو جو نامعلوم مقامات سے نامعلوم راستوں سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے تھے "مشعل بردارں کا قافلہ" (ص ۹۴) کے نام سے سرفراز فرمایا ہے لیکن کتاب میں اس مشعل کی تشریح کہیں نہیں کی گئی۔ یہاں ہمیں آریاؤں کے طرز زندگی، افکار و خیالات اور علم و ہنر کا دوسری تہذیبوں سے تقابل کرنا ہوگا یہ مرحلہ بڑا کٹھن ہے کیونکہ اس کام کے لئے ہمیں کئی پرانی تہذیبوں کے ریکارڈ کھنگالنے ہوں گے لیکن اگر ہم اپنی توجہ صرف برعظیم پر ہی مرکوز کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی آمد برعظیم کی تہذیب و تمدن میں ایک ایسا قدم تھا جس نے یہاں کی معاشرت اور تمدن کو پیچھے دھکیلا اور حکما اس بات پر متفق ہیں کہ آریاؤں سے پہلے وادیٔ سندھ کی تہذیب کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی[۳۸]

اس ضمن میں ایک اور بیان ہے۔

"اس کے برعکس آریاؤں میں تیاگ اور بے نیازی کی صفات عام تھیں اور وہ سورج کی روشنی کی تقلید میں محبت اور فیاضی کے علم بردار تھے" ص ۵۴۔

تیاگ اور بے نیازی کی صفات کا ثبوت تو رگ وید کی وہ مناجاتیں ہیں جہاں بقول خود ڈاکٹر صاحب کے وہ دھن دولت فصلوں، دودھ پوت، آل اولاد اور فتح و کامرانی کے لئے اپنے دیوتاؤں کے آگے گڑگڑاتے ہیں اور ان کو طرح طرح کی قربانیاں پیش کرتے ہیں اور بقول گارڈن چائلڈ "مذہب اور سائنس کے انتشار کے برعکس مشرقی مذہب کے مقاصد مادی نظر آتے ہیں دیوتاؤں کی پرستش کے نظام کا مقصد تقدس، طہارت اور امن کا حصول نہیں تھا بلکہ اچھی فصلیں مناسب موقع پر بارشیں، جنگ میں فتح، محبت اور کاروبار میں کامرانی اور کامیابی، اولاد، دولت، صحت اور بہت لمبی زندگی اس کا مدعا و مقصد تھا۔"[۳۹] یہ ملاحظات آریاؤں پر پورے طور پر منطبق ہوتے ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر صاحب "بے نیازی اور تیاگ" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

"فیاضی" اور "محبت" کی علمبرداری کی تفسیر تاریخی حقائق کرتے ہیں یعنی ان کا وہ کردار جو عراق، شام اور ایران میں تھا اور پھر خود ان کی اپنی خانہ جنگیاں جو مہابھارت سے پہلے کئی سو سال تک جاری رہیں۔

ڈاکٹر صاحب بار بار آریاؤں کے بارے میں خانہ بدوش کی ترکیب استعمال کرتے ہیں مثلاً

۱۔ "آریا عام سے خانہ بدوش نہ تھے بلکہ سوچ کی پراگندگی کے باعث ان میں انفرادیت پیدا ہو چکی تھی" ص ۴۹

۲۔ "آریا عام سے خانہ بدوش نہ تھے بلکہ سوچ کی پراگندگی ان کے کردار میں انفرادیت پیدا کر چکی تھی" ص ۶۹

۳۔ "مسلسل آوارگی اور تحرک کے باعث زمین سے ان کے بندھن بے حد کمزور ہو چکے تھے وہ کثرت کے مقابلے میں وحدت کے نظریہ ..."

۴۔ "......... اگرچہ آغاز میں آریاؤں کا ایک ... زیر اثر دھرتی اور اس کے لوازم سے بے نیاز رہنے کا رجحان عام تھا" ص

۵۔ "......... آریاؤں کی یلغار تاریخ تہذیب کا ایک اہم واقعہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آریا ذہنی طور پر دوسرے خانہ بدوشوں سے کہیں زیادہ متحرک تھے" ص ۶۱

۶۔ "آریا خانہ بدوش تھے اور سادہ باوقار اور متحد نظام حیات کے خوگر" ص ۷۰

۷۔ "موجودہ بحث کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ لوگ خانہ بدوش تھے" ص ۴۷

ڈاکٹر صاحب نے یہ بیانات آریائی فضیلت کے نظریہ کو مزید مستحکم کرنے کے لئے دیئے ہیں اور جن صفات سے آریاؤں کو نوازا گیا ہے ان کی وجوہات ڈاکٹر صاحب نے بیان نہیں فرمائیں۔ مثلاً زمین سے بندھن کمزور ہونا کس طرح کثرت سے وحدت کی طرف مائل کر سکتا ہے ان کی وحدت پرستی پر ڈاکٹر ثانی بی کا فتویٰ ہم اوپر درج کر آئے ہیں جو یقیناً یہ کتاب مرتب کرتے وقت ڈاکٹر صاحب کے سامنے تھا۔

اسی طرح ان کا یہ بیان کہ وہ سادہ، باوقار اور متحد نظام حیات کے خوگر تھے، تاریخی حقائق کی روشنی کا متحمل نہیں ہو سکتا شواہد اوپر پیش کئے جا چکے ہیں۔

ان بیانات سے جو چیز سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ آریاؤں کو باقی خانہ بدوشوں سے کونسی صفات ممیز کرتی ہیں؟

خانہ بدوشی اور ہجرت کے درمیان ڈاکٹر صاحب امتیاز نہیں کر سکے۔ خانہ بدوشی ایک طرز زندگی ہے ایک طریقہ بود و باش ہے ایک نظام حیات ہے جو بہت قدیم سماجی اقدار پر مبنی ہے اور دنیا کے بہت سے خطوں میں آج بھی موجود ہے جیسے ... کی طرح جس طرح یہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے ان کو اپنے صحراؤں سے پیار ہے اور ان میں شہر بسانے کی کبھی تمنا پیدا نہیں ہوئی۔

اس کے برعکس ہجرت ہے۔ مہاجر خاص وجوہات کی بنا پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں۔ آریا خانہ بدوش نہیں بلکہ مہاجر تھے۔ ممکن ہے کہیں دور عہد قدیم میں جہاں تاریخ کی روشنی پہنچ نہیں پائی وہ کبھی خانہ بدوشی کے دور سے گزرے ہوں۔ لیکن جس وقت وہ اپنے ٹھکانوں سے نکلے ہیں تو کسی مقام پر مستقل رہائش پذیر ہونے کے جذبے سے۔ چنانچہ یونان، اناطولیہ، شام اور میریا میں وہ آکر بس گئے تھے یہ علیحدہ بات ہے کہ مقامی باشندوں سے مل کر وہ ہم جوئی میں لگے رہے۔ ایران میں چار سو سال تک بسے یہ کوئی چھوٹا عرصہ نہیں ہے۔ علیحدہ عقیدہ یا زمین کے تنازعہ کے باعث جنگ میں شکست کھا کر ان کی ایک شاخ مختلف راستوں سے برصغیر میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب اس زمانے کی تاریخ کو موجودہ زمانے کے تناظر میں دیکھتے ہیں بجائے کہ وہ اسی زمانے کے تناظر میں

دیکھیں تو ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات دینے سے اجتناب کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر درج کردہ چھ کے چھ بیانات مبہم ہیں۔ ان میں کونسی سوچ کی پراگندگی تھی؟ اور کثرت کے مقابلے میں وحدت کے نظریہ کی طرف فطری طور پر مائل ہونے کی ڈاکٹر صاحب کے پاس کیا شہادت ہے؟ وہ کبھی متحد نہیں رہے۔ یہ ہند یورپی زبان بولنے والے لوگ مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور ہر وقت برسرِ پیکار رہتے تھے۔ تاریخ ایسی شہادتوں سے بھری پڑی ہے اور ڈاکٹر صاحب ہیں کہ اس شہادت کا نوٹس ہی نہیں لیتے۔

اسی طرح تاریخ سے روگردانی یا لاعلمی ہمیں ان کے اس بیان میں بھی ملتی ہے، جو انہوں نے آریائی فضیلت کو ثابت کرنے کے لئے آریاؤں کے ذات پات کے تصور کے بارے میں ناآشنائی کا دعویٰ کیا ہے۔ ہر سماج میں ہر دور میں ایک عمودی تقسیم رہی ہے جو پیشے کے اعتبار سے وجود میں آئی۔ کئی سماج صرف اس پر اکتفا کر گئے۔ دوسروں نے خصوصاً ہندوؤں نے اس میں بے پناہ وسعت پیدا کر دی جو شاید مقامی عوامل کا نتیجہ تھی۔ اس عمودی سماجی تقسیم کے شواہد ہمیں رگ وید میں بھی ملتے ہیں اور موجودہ دور کے اکثر محقق اس بات پر متفق ہیں کہ آریاؤں کے ہاں ہندوستان میں آمد سے پہلے ذات پات کا تصور وجود میں آ چکا تھا[۱۴۰] اور یہ تصور ان ملکوں میں بھی اپنی اوائلی حالت میں موجود تھا۔ جہاں یہ قبائل ہجرت کر کے آباد ہوتے مثلاً ایران[۱۴۱]، روم اور یونان میں اس کے شواہد ملتے ہیں[۱۴۲]

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات تو عیاں ہو جاتی ہے کہ گوبینو، چیمبرلین اور روزنبرگ کی تقلید میں ڈاکٹر صاحب آریائی فضیلت پر ایمان رکھتے ہیں اور زیرِ نظر کتاب انہی کے خیالات کی تجدید کی ایک پُراسرار کوشش ہے۔ پُراسرار اس لئے کہ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ادب کا ملمع چڑھا دیا ہے۔ اگر یہ محض تاریخ کی کتاب ہوتی تو شاید ہی کوئی اس کا نوٹس لیتا۔ بہر حال اس بحث کو آخری صفحات تک اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کے ایک اہم بیان کا تجزیہ مقصود ہے۔

جہاں بھی ڈاکٹر صاحب نے آوارہ خرامی کی وجہ سے ان قبائل میں بصارت کے تیز ہونے کا ذکر کیا ہے وہاں انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جذبہ کی گرانباری کے مقابلے میں تخیل کی سبک خرامی کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ اس بیان کے ثبوت میں انہوں نے کوئی شواہد پیش نہیں کئے اور نہ ہی "آریائی" تاریخ سے ہمیں ان کے تخیل کی سبک خرامی کے مظاہر نظر آتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جذبہ کو گرانبار کہنا کس حد تک مناسب ہے اور ڈاکٹر صاحب نے یہ مفروضہ کیسے اختراع کیا۔ دنیا میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں جذبہ کے تحت ہی انجام دیئے گئے۔ تخیل یا فکر بذاتِ خود کوئی گل نہ کھلا سکے۔ تمام تحریکوں اور سیاسی، سماجی، مذہبی انقلابات میں تخیل اور فکر کے مقابلے میں جذبہ کو زیادہ دخل رہا ہے۔ سقراط، افلاطون، ارسطو، فارابی، ابن رشد، ابن خلدون، کانٹ، ہیگل، مزانڈ، ژنگ وغیرہ کسی تحریک کو پیدا نہ کر سکے اور نہ چلا سکے یہاں تک کہ کارل مارکس نے بھی ایک جذبہ کے لئے فکری اساس ہی مہیا کی، وہ خود تو اس تحریک کو نہ چلا سکا لیکن اس تحریک کے چلانے والوں کی فکری تربیت کرتا رہا۔ فن کی دنیا میں بھی اولیت جذبے کو حاصل ہے جذبہ ہی تخیل کو متحرک کرتا ہے اگر انسانی زندگی سے جذبہ ہی نکال دیا جائے تو زندگی خشک اکائیوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور یہ جذبہ ہی ہے جس سے کائنات کو تحرک حاصل ہے۔ دانتے کے الفاظ میں IT IS LOVE, IT IS LOVE THAT MOVES THE WORLD اور محبت آخر ایک جذبہ ہی تو ہے اور یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ آسانی سمجھنے اور شاعری وقت کی دسترس سے باہر ہیں۔ ارسطو کے بیالوجی کے نظریات آجکل باطل تصور کئے جاتے ہیں لیکن یوریپڈیز کے ڈرامے آج بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ زندہ ہیں۔ جو ایٹیشیکا کا جوہری تصور کبھی کا دفتر بے معنی ہو گیا لیکن کالیداس کی شکنتلا آج بھی زندہ و تابندہ ہے[۱۴۳] یہی فرق فکر اور فن میں ہے۔ تخیل کی

واردات یا فکر ایک حد تک جاتے ہیں لیکن جذبے کے حرف سے پیدا شدہ پارہ ہائے فن وقت کی تلوار کو کند کر کے رکھ دیتے ہیں

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر (اقبال)

اور یہ خونِ جگر جذبہ ہی کا دوسرا نام ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک دلچسپ بیان ہے کہ :۔

" مصر کو آریاؤں نے سترہ سو قبل مسیح کے لگ بھگ فتح کر لیا تھا اور اس پر ڈیڑھ سو برس حکومت کرتے رہے۔ یہ غیر ملکی بادشاہ ہکسوز یا گڈریے بادشاہ کہلائے۔ بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ ہکسوز سامی النسل تھے لیکن ٹائن بی نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ہکسوز آریا تھے۔ اور عراق سے آئے تھے۔ پھر یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب ڈیڑھ سو برس حکومت کے بعد ہکسوز کو مصریوں نے ملک سے نکال باہر کیا تو یہ قریب قریب وہی زمانہ تھا جب حضرت موسیٰ اور ان کے قبائل نے مصر سے ہجرت کی "

اس بیان میں وضاحت طلب نکات یہ ہیں :۔

۱:۔ کیا ہکسوز واقعی آریا تھے یا سامی النسل ؟ اور اس ضمن میں ٹائن بی سے پیش کردہ شہادت کس حد تک موثر اور قابلِ اعتماد ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اس کا بیان درج نہیں کیا اس کے باوجود کہ کتاب ان کے سامنے تھی۔

۲:۔ ہکسوز کے مصر پر حملہ کرنے کی صحیح تاریخیں کیا ہیں صرف سترہ سو قبل مسیح کے لگ بھگ کہہ دینا کافی نہیں جب کہ اس واقعہ کی تاریخیں موجود ہیں۔

۳:۔ ہکسوز مصر سے کب نکالے گئے ؟

۴:۔ بنی اسرائیل مصر سے کب نکالے گئے ؟

۵:۔ یہ سب واقعات کن کن فراعین مصر کے زمانے میں پیش آئے ؟

ان سب سوالوں کے جواب اس لئے ضروری ہیں کہ ان کے بغیر قاری کا ذہن مطمئن نہیں ہوتا اور نہ افہام و تفہیم کا کام مکمل ہوتا ہے اور باوجود اتنی عرق ریزی کے جو ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کی تصنیف پر کی ہے وہ اپنے خیالات قاری تک پہنچا نہیں سکتے۔ مزید یہ کہ غلط تاریخوں سے غلط نتائج مرتب ہو سکتے ہیں اور یہ ایک خطرناک عمل ہے۔

جو سوالات ڈاکٹر صاحب کے بیان پر اٹھائے گئے ہیں ان کے جوابات دیکھنا سودمند ہوگا۔

۱:۔ ٹائن بی کی تلخیص میں جو سومرویل نے تیار کی ہے ہکسوز کا ذکر آتا ہے[144] لیکن اگر ڈاکٹر صاحب اپنی تحقیق کا نشتر ذرا گہرا لے کر جاتے اور اصل کتاب کو ایک نظر دیکھ لیتے تو انہیں ہکسوز کی نژاد کے بارے میں ٹائن بی کے دو عدد حاشیے بھی نظر آتے جن سے یہ مزید واضح ہو جاتا کہ یہ ایک انبوہ تھا جس میں کئی مختلف اقوام کے علاوہ آریا بھی شامل تھے[145] اس بیان کو واضح کہنا اور اس سے یہ نتیجہ مرتب کرنا کہ ہکسوز آریا ہی تھے غلط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہی محقق اپنی دوسری کتاب میں واضح اور واشگاف الفاظ میں ان ہکسوز کو سامی النسل کہتا ہے[146] یہی مورخ ہکسوز کے مصر پر قبضہ کی تاریخیں بھی دیتا ہے جو ۱۷۳۰ تا ۱۷۲۰ ق م ہیں اور جن کو ڈاکٹر صاحب "سترہ سو قبل مسیح کے لگ بھگ" قرار دیتے ہیں۔ ٹائن بی کی تاریخوں اور ڈاکٹر صاحب کی تاریخوں میں ۲۰ یا ۳۰ سال کا فرق ہے

جو بہت معمولی ہے۔ ولیم کیو لیکن ان کو ایشیائی گڈریئے ہی قرار دیتا ہے[۱۴۷]۔ مالف ٹرنر اس بات کا داعی ہے کہ کوئی ایک نسلی گروہ نہیں تھا بلکہ اس میں مختلف النژاد لوگ شامل تھے۔ ان میں سامی النسل بھی تھے، ہندیورپی بھی اور ہری (حری) بھی اور ان کے سرداروں کے نام ہندیورپی زبانوں میں تھے[۱۴۸]۔ ڈار لنگٹن کی تحقیق کے مطابق عام خیال تو یہی ہے کہ وہ سامی النسل تھے لیکن جب ۱۸۰۰ ق م میں وہ مصر میں آئے تو ان کے ساتھ رتھ تھے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے سرداروں کے تعلقات کسی حد تک آریاؤں سے استوار ہو چکے ہوں گے[۱۴۹]۔ اس محقق کا بیان ذرا احتیاط چاہتا ہے کیونکہ یہ مورخ نہیں ہے اور اس کی محولہ بالا کتاب کا موضوع تاریخ نہیں بلکہ انسان اور سماج کا ارتقاء ہے اس کے برعکس ول ڈیورنٹ کا خیال ہے کہ ہکسوز ایشیائی ہی تھے[۱۵۰] اور یہ بات

دل کو اس لئے بھی لگتی ہے کہ چرواہا پن آریائی نہیں بلکہ سامی النسل لوگوں کا پیشہ رہا ہے اور آج بھی ہے اور آریا کبھی گڈریے نہیں کہلائے۔ اس امر کی تائید انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا بھی کرتا ہے کہ یہ لوگ ایشیائی تھے ان کے تام سامی زبان میں تھے اور یہ مصری دیوتا سیت SETH کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن یہ کتاب ان کے حملے کا زمانہ ۱۶۷۴ ق م بتاتی ہے اس سے ڈ[ا]کٹر صاحب کی بیان کردہ تاریخ اور اس تاریخ میں ۲۶ سال کا فرق ہے[۱۵۱] جو کوئی اہم بات نہیں ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب کے بیان کی نہ صرف تردید ہو جاتی ہے بلکہ تکذیب بھی اور یہ ... ہو جاتی ہے کہ ہکسوز بیشتر محققین کی نظر میں سامی النسل تھے اور ان کے سرداروں کے نام سامی زبان میں ہی تھے اگرچہ ... کے وقت انکا آریاؤں کے ساتھ کچھ رابطہ پیدا ہو چکا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس حقیقت کو ماننے سے دانستہ گریز کیا ... کی وجوہات بعد میں بیان کی جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب نے حضرت موسٰی اور بنی اسرائیل کے مصر سے انخلا اور ہکسوز کے مصر چھوڑنے کے دو مختلف واقعات ... مخصوص مقاصد کے پیش نظر ایک ہی زمانہ یا قریب قریب "وہی زمانہ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بھی تاریخ کی روشنی میں درست ثابت نہیں ہوتا۔ اوپر دیئے گئے حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہکسوز کو مصر ۱۵۶۷ ق م میں اور ٹائن بی کے خیال کے مطابق ۱۵۸۰ ق م میں چھوڑنا پڑا[۱۵۲]۔ اہل یہود کے انخلا کی تاریخیں ان تاریخوں سے مختلف ہیں یہ واقعہ ۱۴۴۰، ۱۲۹۰ یا ۱۲۵۰ ق م میں پیش آیا۔ زیادہ اغلب تاریخ ۱۲۵۰ ق م ہے یہ وہ زمانہ ہے جب مصر پر ریمیسز دوم RAMASES II (۱۳۰۴ تا ۱۲۳۷ ق م) حکمران تھا حضرت موسٰی کی پیدائش بھی چودھویں صدی ق م کے اواخر میں ہوئی ان دونوں واقعات کے درمیان یعنی ہکسوز کے انخلا اور بنی اسرائیل کی ہجرت کے درمیان تقریباً تین سو سال کا فرق ہے جس کو ڈاکٹر صاحب خاص وجوہات کی بنا پر نظر انداز کر گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے طریق تحقیق کی دوسری مثال درج ذیل ہے:۔

"دو ہزار قبل مسیح کے بہت بعد آرمینیا (ترکی) میں حطیوں نے جو حکومت قائم کی، قیاس غالب ہے کہ اس کا تعلق ہندیورپی قبائل سے تھا۔ اس طرح کریٹ کی سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے والے بھی ہندیورپی قبائل ہی تھے" ص ۹۴

اس بیان کے پہلے حصہ میں خود اعتمادی کا فقدان ہے۔ "دو ہزار قبل مسیح کے بہت بعد" کی ترکیب تاریخ میں کیا حیثیت رکھتی ہے اور "قیاس غالب ہے" کے الفاظ سے حطیوں کے بارے میں ان کا اپنا بیان مشتبہ ہو جاتا ہے۔

حطیوں کی زبان کا ہند یورپی ہونا تاریخ میں مسلم ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں[154]۔ ان کا تعلق بھی ہند یورپی قبائل سے ہی تھا۔ یہ دو ہزار ق م کے آغاز میں بحیرہ اسود کے قرب و جوار سے مختلف راستوں سے اناطولیہ پہنچے[155][156]... ۱۸۰۰ ق م کے قریب انہوں نے دریائے دجلہ اور فرات کے منبعوں کے قریب اپنے قدم جمالئے تھے اور اپنے چاروں طرف یلغار کا آغاز کر چکے تھے۔ نئی حطی سلطنت کے پہلے بادشاہ SUPPILULIUMAS اول (۱۳۷۵ تا ۱۳۳۵ ق م) نے اپنے داماد کرتی وازہ سے جو متانی قبیلہ کا بادشاہ تھا ایک صلح نامہ کیا جس میں آریائی قبائل کے دیوتاؤں کے نام مترا، وروناء اندرا وغیرہ آتے ہیں یہ صلح نامہ حطیوں کے دارالحکومت بغازکوئی سے برآمد ہوا ہے[157] آریا اقوام کی تاریخ میں یہ سب سے پہلی شہادت اور اس لحاظ سے یہ دستاویز بہت اہم ہے۔ تاریخ کے اس نازک موڑ کو "دو ہزار قبل مسیح کے بہت بعد" اور قیاس غالب ہے" کی ترکیبوں میں اس وقت اڑا دیا جب ان کی مصدقہ تاریخیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ایک تحقیق چابکدستی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ مصنف خود اپنے بیان پر یقین نہیں رکھتا اور اس کی گرفت اپنی معلومات پر مضبوط نہیں[158]

اسی قسم کے بیانات اس فکری سومنات کے طول و عرض میں بکھرے پڑے ہیں ہم چند ایک مثالیں اور پیش کرتے ہیں۔

(۱) "تناسخ کا عقیدہ خالص دراوڑی پیداوار ہے" ص ۱۴۳

یہ بیان اسی نظریہ کی ایک شق ہے جس کے مطابق آریائی بود و باش، مذہب اور ان کے عقائد مقامی باشندوں کی معاشرت تہذیب اور نظریات سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ "مقدس" ویدک مذہب کی شکل ہی مسخ ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان کئی پہلوؤں سے محل نظر ہے باوجود ڈاکٹر صاحب کی تمام موشگافیوں کے ایک ایسے قاری کا ذہن ان کے اس نظریہ کو قبول کرنے کو تیار نہیں جسے ازمنہ قدیم کی تہذیبوں کے بارے میں ذرا بھی شد بد حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے لہجے کی تیقن سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ اس موضوع پر ان کا یہ بیان حرف آخر ہے۔ ذرا غور کیجئے "تناسخ کا عقیدہ خالص دراوڑی پیداوار ہے" جب کہ اس سے قبل اور اسی زمانے کی کئی تہذیبوں کی موجودگی تاریخ سے ثابت ہوتی ہے۔ مصری تہذیب قدیم ترین تہذیب گردانی جاتی ہے سمیریا، بابل، قدیم یونان، کریٹ اور خود آریائی قبائل کی تہذیب جو بہت حد تک ایشیائی تہذیبوں کی ہی خوشہ چین رہی اور ان سے متاثر ہوتی رہی اس وقت موجود تھیں اور وادی سندھ کی تہذیب سے مربوط بھی۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر صاحب کے بیان کو کیسے حرف آخر مان لیا جائے۔

مندرجہ بالا ساری بحث کے پیش نظر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ دراوڑوں سے اگر ڈاکٹر صاحب کی مراد ہے؟ یہ سوال بہت اہم ہے اور اس کے جواب سے اس مسئلہ کی پوری حیثیت بدل جاتی ہے۔ دراوڑوں سے اگر ڈاکٹر صاحب کی مراد وادی سندھ کی تہذیب ہے (اور جو واقعی ان کا عقیدہ ہے) تو جواب بالکل سادہ ہے اور وہ یہ کہ اول تو ان لوگوں کے مذہبی عقائد کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود اور ناقص ہیں اور ثانیاً ان حقائق کی کمی اور جو حقائق اس وقت موجود ہیں ان کے نقائص اور خامیوں کی وجہ سے اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے تیار نہیں[159]۔ اس صورت میں ہم یہ حکم کیسے صادر کر سکتے ہیں کہ تناسخ کا عقیدہ خالص دراوڑی پیداوار ہے"۔ اور ہمارے یہ دلائل ان امور پر مستزاد ہیں کہ آریاؤں کا وادی سندھ کے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا۔

تناسخ کا مسئلہ وقت کے مسئلہ کی طرح بہت ادق ہے اور اس کے کئی پہلو ہیں۔ انگریزی زبان میں مختلف مفاہیم کے

حامل الفاظ تناسخ کے لئے استعمال ہوئے ہیں مثلاً

یا RE - BIRTH وغیرہ جیسے یہ مسئلہ جبر وقدر، تقدیر، قسمت، کرم، اعمال اور ان کے نتائج وغیرہ سے اور حلول اور اوتار کے تصورات سے مربوط ہے اور یہ سارے مسائل مختلف مذاہب میں انسانی تہذیب کے آغاز سے ہی انسانی توجہ اور فکر کا مرکز رہے ہیں۔

اولڈن برگ کے خیال میں یہ نظریات بہت ہی قدیم ہیں۔ شریڈر نے بھی اس مسئلہ پر بحث کی ہے اس کے خیال میں تقدیر کا تصور قدیم ہند یورپی قبائل میں پایا جاتا تھا۔[140] ان کا عقیدہ تھا کہ قسمت یا تقدیر بچے کو ماں کی طرف سے ملا ہوا حصہ ہے۔ یہ عقیدہ رومیوں، یونانیوں اور دیگر اقوام میں بہت مقبول رہا ہے۔

محققین کا خیال یہ ہے کہ تہذیب کی ابتدائی سطح پر دنیا کے ہر خطہ میں یہ اعتقاد ملتا ہے کہ مرنے کے بعد انسانی روحیں، درختوں، جانوروں، کیڑے یا مکوڑوں کا روپ دھار لیتی ہیں چنانچہ اس خیال کے پیش نظر ہم دو خطوط پر سوچ سکتے ہیں۔ اول ہندوستان میں آریائی قبائل کے ہاں یہ عقیدہ مقامی لوگوں کے ذریعے داخل ہوا۔ جیسے کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے۔[141] دوئم اور اغلب بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ عوامی سطح پر خود آریائی قبائل میں بہت پہلے سے ہی موجود تھا بعد میں مرنے کے بعد آنے والی زندگی کے لئے "کرم" یعنی عمل کو بنیاد بنا کر عقیدے اور فلسفے کے روپ میں پیش کیا اس خیال کو اس امر سے بھی تقویت ملتی ہے کہ کائناتی سطح پر کائنات کا اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے بار بار پیدا ہونا خود ویدک عقائد میں شامل ہے جبکہ شہادت ڈاکٹر صاحب کے وہ بیانات ہیں جو ان کی تصنیف کے زیر بحث حصہ میں ملتے ہیں۔ عالم اکبر سے عالم اصغر کے درمیان رشتہ کی تلاش بھی ویدک مذہب کا ایک اہم جزو رہا ہے چنانچہ تمام ویدک اساطیر اسی بنیاد پر استوار ہیں۔ اس طرح عالم اکبر سے اس کا اطلاق عالم اصغر یعنی انسان پر انسانی سوچ کا صرف ایک ہی قدم ہے ایسے شواہد بھی ہیں کہ رگ وید کے دسویں منڈل میں جو غالباً تقویم زمانی کی مناسبت سے آخری ہے (اور جس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ دراوڑی تہذیب سے بہت متاثر ہے) تناسخ کے دھندلے دھندلے آثار نظر آتے ہیں[142]

باشم اگرچہ اس خیال کی تائید کرتا ہے لیکن اس امر کا بھی اظہار کرتا ہے کہ ویدک عہد کے اختتام تک آتے آتے اس مذہب میں تناسخ کا عقیدہ پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کی وجوہات متعین نہیں ہو سکیں۔[143] اوتار یعنی حلول کے تصور سے بحث کرتے ہوئے وہ اس امر کا بھی اظہار کرتا ہے کہ دوسری صدی ق م سے قبل سے لیکن عین اس زمانے میں حلول اور اوتار کا تصور براہمنیت میں واضح طور پر نظر آتا ہے اور اس کے خیال میں حلول اور اوتار کا تصور یہیں سے مشرق اور مغرب کی طرف پھیلا۔ اس تناظر میں بھی ڈاکٹر صاحب کا مذکورہ بالا بیان فٹ نہیں ہوتا۔ وشنو کا کئی اوتاروں کی حیثیت میں آنا اور براہمنیت میں حلول کا عقیدہ آریائی روایت کا اہم مظہر ہے۔ حلول اور اوتار کے اس عقیدے کے بعد تناسخ یعنی اس دنیا میں مرنے کے بعد بار بار کئی مختلف صورتوں میں جنم لینا اور قدریت انسانی سوچ کا اگلا قدم ہے۔ حلول یا اوتار کا یہ عقیدہ یونانیوں، رومیوں اور دوسری ہند یورپی اقوام میں بھی پایا جاتا تھا یا کم سے کم اس عقیدے کی شروعات نظر ضرور آتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو دراصل یہ بیان اس لئے دینا پڑا کہ وہ انڈالوجی کے باقی نظریات سے یا تو ناواقف ہیں یا ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ وہ صرف یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دراوڑوں نے مقدس ویدک مذہب کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیا۔ اور

جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ان کی اس ساری کاوش کا صرف ایک ہی مقصد ہے شعر و شاعری، غزل، نظم اور گیت وغیرہ کے بارے میں ان کے ارشادات محض ضمنی ہیں۔

"آریاؤں کے ہاں جسم اور زمین سے وابستگی کی کمی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ مردوں کو دفن نہیں کرتے تھے جلا دیتے تھے" ص ۹۵۔

یہ درست ہے کہ ہند یورپی اقوام کی اس شاخ نے جو ہندوستان میں داخل ہوئی مردوں کو جلانے کا رواج اختیار کر لیا تھا۔ لیکن اگر ڈاکٹر صاحب اس مسئلہ پر ذرا غور و تامل سے کام لیتے تو انہیں پتہ چلتا کہ مردوں کو جلانے کا رواج ہند یورپی قبائل کی اس شاخ میں بہت بعد میں شروع ہوا۔ ہمارے پاس اس امر کی شہادت موجود ہے کہ جلانے کے رواج سے پہلے ان کے ہاں مردوں کو دفنانے کا رواج رہا ہے۔ رگ وید کے دسویں منڈل میں مناجات نمبر ۱۸ کا موضوع ہی مردے کو دفنانے کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک اہم ماخذ بوتھے ہے وہ بھی اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ جلانے سے پہلے ان کے ہاں مردوں کو دفنانے کا رواج تھا[۱۹۵] ڈاکٹر صاحب سٹورٹ پگٹ کے نظریات کے بھی بہت قائل ہیں۔ اس نے بھی اس موضوع پہ اظہار خیال کیا ہے اور اس امر کی تائید کی ہے جب یہ قبائل جنوبی روس میں تھے تو یہ زراعت کو بطور پیشہ کے اپنا چکے تھے ۳۰۰۰ ق م کے اواخر اور ۲۰۰۰ ق م کی ابتدا میں اس کے خیال کے مطابق یہ لوگ چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں آباد ہو چکے تھے۔ ان آبادیوں سے ملحق چھوٹے چھوٹے قبرستانوں کے نشانات بھی ملے ہیں اور ہر مردے کے لئے علیحدہ علیحدہ قبر اور بعض اوقات مشترکہ قبر کا رواج بھی تھا۔ کئی قبروں سے پتھر کے بنے ہوئے کلہاڑے اور چند جگہ تانبے کے بنے ہوئے کلہاڑے برآمد ہوئے ہیں۔ ملئے کاپ MAIKOP کے مقام پر مقبروں کی نشاندہی بھی ہوتی ہے اور یہ سلسلہ خاصا دور تک چلا جاتا ہے[۱۹۶] سائرس جو بقول ڈاکٹر صاحب کے آریا تھا کا مقبرہ آج بھی موجود ہے۔ دیگر ماہرین کے علاوہ اس موضوع پر ایک عظیم محقق شریڈر کی بھی یہی رائے ہے کہ ان آریاؤں کے ہاں مردوں کو دفن کرنے کا رواج رہا ہے۔ اور اس ہندوستانی شاخ کو چھوڑ کر ہند یورپی اقوام کی باقی تمام شاخیں مردوں کو دفن کرتی تھیں۔ یونانی، رومی، حطی، ایرانی اقوام میں جلانے کا رواج بھی رہا ہے[۱۹۷]

قطع نظر اس شہادت کے جو ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا بیان کو رد کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کس طرح مردوں کے جلانے سے اس بات کا استنباط کر سکتے ہیں کہ اس سے آریاؤں کے ہاں جسم اور زمین سے عدم وابستگی ثابت ہوتی ہے۔ کیا ان قوموں کے ہاں جو اپنے مردوں کو دفن کرتی ہیں جسم اور زمین سے وابستگی لازمی طور پر پائی جاتی ہے؟ یہ منطق ذرا عجیب نظر آتی ہے کیونکہ ان لوگوں کے متعلق دوسری شہادتیں اس امر کی تائید نہیں کرتیں۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان اور آریاؤں کے بارے میں اس موضوع پر وہ بیانات جو ہم اوپر درج کر آئے ہیں اس بات کے غماز ہیں کہ آریاؤں کی زمین اور جسم سے عدم وابستگی ان کے ہاں نظریہ نہیں بلکہ ایک عقیدہ کا درجہ رکھتے ہیں ایسی قسم کے عقاید جو کسی بنیاد پر استوار نہ ہوں بہت سارے مغالطوں کو جنم دیتے ہیں۔ اس لئے اس نکتہ کو ذرا غور سے دیکھنا ہوگا۔

۱۱۔ رگ وید کی وہ مناجاتیں، اتھروید اور یجر وید کے وہ حصے جن میں آریائی قبائل دودھ، پوت اور دنیاوی لوازمات کے لئے اپنے دیوتاؤں کے آگے گڑگڑاتے تھے اور ان ٹونوں، ٹوٹکوں اور جادو سے ان کے حصول کی کوشش کرتے تھے اس امر کا

بین ثبوت ہیں کہ انہیں دنیا اور دنیاوی لذتوں سے کتنی محبت تھی اور ان کی خاطر جو خانہ جنگیاں ان میں ان وجوہ کی بنا پر ہوئیں وہ مزید اس امر کا ثبوت ہیں کہ اس دنیا سے ان کی وابستگی کتنی تھی اور وہ ان کی لذتوں کے کس حد تک قتیل تھے۔

۲:۔ رگ وید کی صرف ایک مثال سے ہی ان کی جسم سے وابستگی ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے دسویں منڈل کے سکت ۸۶ کا موضوع ہی جنس ہے اس میں اندرا رانی اپنے شوہر اندر کو بھوگ بلاس کی خاطر اکساتی ہے۔ اس کتاب کے مترجم نے اس نظم کے اشلوک نمبر ۱۶، ۱۷ کا انگریزی ترجمہ محض اس لئے نہیں کیا کہ وکٹورین عہد کی حیا اس کے آڑے آتی تھی[۱۶۸] اس نے برملا اس امر کا اظہار بھی کر دیا لیکن ڈاکٹر صاحب کی خاطر ہم اس کا انگریزی ترجمہ پیش کرتے ہیں مگر حواشی میں شاید متن اس بات کا متحمل نہ ہو سکے[۱۶۹]

۳:۔ اتریہ براہمن میں اگنی پوجا کے لئے جو ہدایات منتروں کے علامتی اظہار کے لئے دی گئی ہیں ان کے لفظ لفظ سے جنس ٹپکتی ہے جو یقیناً جنس سے وابستگی کا ثبوت ہے۔[۱۷۰]

۴:۔ اشومیدھ کی قربانی کے وقت عوام اور خواص کے ہجوم میں جب مہاراجہ کی پٹ رانی گھوڑے کی لاش کے ساتھ سوتی تھی اور جو گفتگو اس وقت براہمنوں میں اور اس کے درمیان ہوتی تھی وہ اعلانیہ جنسی ترغیبات پر مبنی ہیں یہ پوری تمثیل ایک ORGY کی صورت اختیار کر لیتی تھی[۱۷۱] کیا ڈاکٹر صاحب اس کو نفس پرستی، جنس پرستی، لذت کوشی کے بجائے سنیاس اور تیاگ کا نام دیں گے؟ ڈاکٹر صاحب ان تمام باتوں سے واقف ہیں لیکن وہ خاص مقاصد کے تحت ان تمام باتوں کو صرف نظر کر گئے ہیں۔ علم کی دنیا میں اس قسم کے اخفا کو پتہ نہیں کیا نام دیا جائیگا۔

۵:۔ جماع بالمحرمات ویدک آریاؤں کے ہاں مذہبی اہمیت کی حامل تھی۔ یاما یامی دونوں آپس میں بہن بھائی تھے رگ وید کی مناجات ۱۰ × ۱۰ میں یامی اپنے بھائی کو جنسی اختلاط کے لئے اکساتی ہے۔ ڈاکٹر سرکار کے خیال میں جماع بالمحرمات بہن اور خصوصاً ماں کے ساتھ، کی اجازت رگ وید میں رشیوں کی عطا کردہ ہے نیوگ کا مسئلہ جس کے تحت اولاد حاصل کرنے کے لئے عورت کسی بھی محرم کی طرف رجوع کر سکتی ہے۔ ہندو قانون کا انتہائی اہم اصول ہے ویدک رسم "گوساوا" کے تحت ماں سے، بہن سے یا کسی قریبی رشتہ دار عورت سے جنسی تعلق استوار کرنا سورگ کے حصول کا ایک ذریعہ ہے مہابھارت میں بھی اسی نوعیت کے جنسی تعلقات کے آثار ملتے ہیں باپ کی وفات پر بیٹے ان کی حرم سراؤں کے بھی وارث بنتے تھے اور حرم سرا کی تمام عورتوں سے سوائے اپنی ماں کے انہیں جنسی تعلقات استوار کرنے کی اجازت تھی۔ اُپادھیائے بہت سی مثالیں دینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جماع بالمحرمات غیر ویدک فعل نہیں ہے۔[۱۷۲]

۶:۔ دیرگھتما اور ممتا کا قصہ تو ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہی ہوگا جس میں ممتا کے شوہر کا بھائی اس کے شوہر کی غیر حاضری میں اس سے زنا کا مرتکب ہوتا ہے[۱۷۳] (جب کہ وہ حاملہ تھی نتیجہ دیرگھاتم کی پیدائش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو آنکھوں سے اندھا تھا رگ وید کی کئی مناجاتوں کا شاعر وہی دیرگھاتم ہے)[۱۷۴]

۷:۔ جسم سے گریز کی بجائے جسم سے وابستگی اور شہوت پرستی بطور ایک رواج کے ویدک معاشرہ میں اور اس سے قبل کے شدھ آریائی معاشرہ میں بالکل اسی طرح موجود تھے جس طرح یہ آج دنیا کے تمام معاشروں میں موجود ہیں۔ حیوانات سے خلاف

وضع فطری عمل ہندوؤں کے اساطیر، ادب اور فن میں خصوصاً ان تحریوں میں جو مندروں میں ملتے ہیں صاف نظر آتی ہے۔ ان حیوانات میں بھیڑ، بکریاں، گدھیاں اور گھوڑیاں شامل ہیں۔ سنسکرت ادب میں کوسلہ بادشاہ پرشناجیت کی بیوی مالیکا کا جنسی طور سے پالتو کتے سے اختلاط ایک مثال ہے جب کہ پرشناجیت صاحب کو بکری زیادہ مرغوب تھی۔ مہابھارت میں بھی ایسے قصے بیان ہوئے ہیں۔[۱۷۵]

۸۔ صرف بیسواؤں اور رنڈیوں کے لئے سنسکرت زبان میں تین سو تیس مترادفات ہیں اور ویدک عہد کی مشہور ترین رنڈی امباپالی تھی جو ویشالی رہنے والی تھی اور مہاتما بدھ کا اس کے ساتھ کھانا کھانا تاریخ میں موجود ہے اور پالی زبان کی ایک خوبصورت نظم کی وہی مصنفہ خیال کی جاتی ہے۔ یہ سب باتیں ڈاکٹر صاحب کے نظریہ کہ آریا جسم سے وابستہ نہیں تھے،

کی تکذیب کرتی ہیں۔[۱۷۶]

۹۔ واکر دتا اور میئر اور دوسرے محققین کے حوالے سے اس زمانے میں جنسی بے راہ روی کا تذکرہ تقریباً اڑھائی صفحات میں کرتا ہے۔ اس سے بھی ڈاکٹر صاحب کے آریاؤں کے بارے میں ارفع و اعلیٰ خیالات کی تردید ہوتی ہے۔[۱۷۷]

۱۰۔ آریاؤں کے سب سے بڑے دیوتا اندر کے کارنامے[۱۷۸] (جو سمتھاؤں اور رگ وید میں بیان ہوئے) ہیں سب ڈاکٹر صاحب کی نظر میں ہوں گے۔ اس لئے ان کو دہرانا فضول ہے۔ اب 'راجہ اندر' ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ آج کل کا بچہ بچہ جانتا ہے پھر بھی آریاؤں کو جسم اور زمین سے غیر وابستہ تسلیم کرنا اس کو ثابت کرنا اور اس کی تبلیغ بطور ایک عقیدہ کے کرنا، ایک عجیب و غریب 'عالمانہ' روش ہے۔

۱۱۔ یجر وید آریاؤں کی ایک اور مقدس کتاب ہے اس کا ایک قابل ذکر حصہ صرف جنس سے متعلق ہے (۵۲۶ میں سے ۱۴۴ عنوانات) جو اس کتاب کا تیرھواں حصہ بنتا ہے اور اس سے اس امر کا واضح انکشاف ہوتا ہے کہ اس زمانے کا انسان بھی جنسی مسائل اور ازدواجی مسائل میں اسی طرح گھرا ہوا تھا۔[۱۷۹]

جیسے آج کل کا انسان۔ یہ رائے پروفیسر زوری کی ہے جو ڈاکٹر صاحب کے اہم ترین ماخذوں میں سے ہے اور اسی پر ڈاکٹر صاحب کی جنت پسندی کی اساس ہے یہ بات ہم اگلی اقساط میں دیکھیں گے۔

۱۲۔ دراصل ویدک عہد کے ہندو کے مذہب اور جنس سے متعلق رویہ کی تہ میں اک رمز پنہاں ہے شائد وہ رمز ڈاکٹر صاحب کی گرفت میں نہیں آئی۔ وہ رمز یہ ہے کہ خواہش سے نجات پانے کے لئے بہترین اصول یہ ہے کہ اس کی تکمیل کر دی جائے۔ اس تکمیل سے خواہش خود بخود مر جائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے آریاؤں کے ہاں ازمنۂ وسطیٰ کے آریاؤں کے ہاں اور موجودہ دور کے آریاؤں کے ہاں مذہب میں جنس داخل تھی اور جنس میں مذہب،[۱۸۰]

اور اس اصول کے مظاہر ہمیں ان کے مذہبی ادب اور غیر مذہبی ادب میں ہر جگہ ملتے ہیں کہیں جگہ تو ثقہ عالموں کا قلم جو اس ادب کو یورپی ادبی سانچوں میں ڈھالنے پر مامور تھا یہ کہہ کر رک گیا کہ ان ادب پاروں کے تراجم حیا سوز ہیں۔[۱۸۱] اس سے نہ رگ وید مبرا ہے نہ یجر وید، نہ براہمن نہ آرنیکا نہ اپنشد یعنی ان کی تمام الہامی کتابیں اور ان

کے علاوہ ان کے رامائن، مہابھارت اور غیر مذہبی ادب شکنتلا میگھ دوت اور کالیداس کے علاوہ دوسرے شعرا کا کلام ان عناصر سے خالی نہیں ہیں[۱۸۲] اور اس روایت کا اظہار ان کے دیگر فنون لطیفہ میں خواہ وہ موسیقی ہو، مصوری ہو، صنم گری ہو یا پھر مقدس مندر "جو تخلیق کا منبع ہے" (ص ۲۶) ہی کی ساخت کیوں نہ ہو واضح نظر آتا ہے

۱۲:- ازمنۂ قدیم میں مذہب، جادو اور جنس کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ایسے شواہد ہمیں تمام پرانی تہذیبوں میں ملتے ہیں جنس کی ساحرانہ قوت مذہبی رسومات میں واقعاتی اور علامتی طور پر کھلے عام نظر آتی تھی۔ اس کی چند مثالیں ویدک عہد سے ہم اوپر دے آتے ہیں۔ واقعاتی اظہار میں جنسی اختلاط، دیوی دیوتاؤں کی شادیاں اور ان کا سرعام جنسی اختلاط اور جنسی اعضا کی نمائش شامل ہیں۔ علامتی اظہار کے تحت زبان سے جنس کے متعلقات کے بارے میں اظہار، جنسی سوانگ بھرنا اور جنسی نقلیں کرنا آتے ہیں۔ ان میں سے کئی رسومات کے آثار ہمارے ہاں بھی ہولی، دیوالی بیساکھی وغیرہ میلوں پر نظر آتے ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ان آوازوں، سانگوں، سوانگوں کا اصل مطلب کیا ہے۔ زرخیزی کے وسیع تر مفہوم کے پیش نظر جس کی تحدید جے گونڈا نے کی ہے[۱۸۳] جنس اور زرخیزی کا رشتہ ان طریقوں سے مذہب میں اظہار پاتا ہے:

۱:- دیوی دیوتاؤں کی شادیاں جس میں انسان ان کی جگہ لیتے ہیں اور ان کا سرعام جنسی اختلاط۔

۲:- جنسی اعضا کی نمائش اور ان کی پرستش۔

۳:- غلیظ زبان کا استعمال اور برسرعام نازیبا حرکات

۴:- جنسی اختلاط کی تصاویری نمائش بتوں، پتھروں یا عام تصویروں کے ذریعے۔

ان کے علاوہ بھی جادو کی کئی رسمیں مذہب اور زرخیزی سے متعلق ہیں لیکن جنس سے لاتعلقی کی بنا پر ان کا ذکر یہاں نہیں کیا جاتا۔

مندرجہ بالا امور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ موقف کہ آریاؤں کے بندھن زمین اور جسم سے کمزور تھے، اس وجہ سے وہ جنسی اور دنیاوی لذت کوشی سے بلند تھے درست معلوم نہیں ہوتا۔ امید ہے اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب ہماری گذارشات کا بغور مطالعہ فرمائیں گے اور تسلیم کریں گے کہ ہند یورپی اقوام مذہب اور جنس کی آمیزش سے بالاتر نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب شاید ان تمام عناصر کو یہ کہہ کر رد کر سکتے ہیں کہ یہ سب دراوڑی عناصر ہیں اور آریائی مذہب میں در آئے لیکن اب ان عناصر کو غیر آریائی عناصر یا مقامی عناصر کہنا متروک ہو گیا ہے۔ نئی تحقیق ان کو آریائی ہی قرار دیتی ہے کیونکہ اول تو دراوڑوں کا وجود ہی نہیں اور اگر ڈاکٹر کی خاطر اس مفروضہ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہمیں پتہ ہے کہ آریاؤں نے ذات پات اور چھوت چھات کے مضبوط حصار اپنے چاروں طرف تعمیر کر لئے تھے کہ غیر آریائی عناصر کا آریائی زندگی میں داخل ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ اس ضمن میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جنس اور مذہب کی آمیزش دوسری آریائی شاخوں میں بھی موجود تھی یہ بھی ہمارے ہاں کی طرح ہند یورپی اقوام تھیں اور ان کے ہاں زمین اور جسم سے وابستگی کے مظاہر عام پائے جاتے تھے۔ ان اقوام میں قدیم جرمن، قدیم یونانی اور قدیم رومن اقوام شامل ہیں۔ ان کی موجودگی میں ہم یہ کیسے فرض کر لیں کہ ہندوستان کے آریا مذہب میں

جسم اور زمین سے وابستگی کا فقدان تھا۔[۱۸۵]

جنس اور مذہب کا مسئلہ بھی ایسا ہے جو پوری ایک قسط کا متقاضی ہے۔ یہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہوگی جس میں دیگر باتوں کے علاوہ ویتھن کے مضمرات کا جائزہ بھی لیں گے۔ فی الحال ہم ڈاکٹر صاحب سے صرف ایک سوال ہی پوچھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ کیا آریا اپنے مخرج سے دربدر اور ملک ملک صرف علم وعرفان کی مشعلیں روشن کرنے کے مشن پر نکلے تھے یا یہ جوع الارض تھی جو انہیں یہاں سے وہاں اور اِدھر سے اُدھر اور آخر کار کچھ قبائل کو ہندوستان کھینچ لائی؟

ہمارا مقصد کسی مذہب یا طریقہ عبادت میں کیڑے ڈالنا نہیں اور نہ ہی ہندی کی چندی کرنا ہے بلکہ عام قاری کے لئے حقائق کا انکشاف اور ان کو تاریخ کے صحیح تناظر میں پیش کرنا ہے۔ آریاؤں کی جسم یا زمین سے وابستگی کوئی عیب کی بات نہیں۔ پیٹ کی بھوک اور جنسی بھوک موت کی طرح زندگی کی ٹھوس اور سنگین حقیقتیں ہیں۔ پیٹ کی بھوک سے تو موت واقع ہوسکتی ہے جنسی بھوک سے موت تو واقع نہیں ہوتی مگر اس کی ناآسودگی، ذہنی اور جسمانی بیماریوں کی آماجگاہ ہے۔ سوال اس کو ختم کرنے کا نہیں۔ سوال تو باقی خواہشات کی طرح حیوانی سطح سے بلند ہوکر اخلاق اور مذہب کے دائرے میں رہ کر اور اگر یوں کہیں تو بہتر ہوگا کہ انسانیت کے دائرے میں رہ کر اس بھوک کی تسکین کے لئے ضوابط وضع کرنے کا ہے۔ بیشتر مذاہب نے ایسا ہی کیا ہے جہاں جنس کو انسانی زندگی سے خارج کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہیں قباحتیں پیدا ہوئی ہیں تاریخ میں مثالیں موجود ہیں۔ جین مت، بدھ مت، تحریک احیاء العلوم سے قبل کی عیسائیت وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب اس بات کے داعی ہیں کہ آریا قبائل کی بصارت "مسلسل تحرک کی وجہ سے دوسری حیات کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوچکی تھی (ص ۴۴ اور کئی اور جگہ) اور دراوڑی تہذیب میں بقول ان کے "بصارت" کی بجائے چھونے، سننے، چکھنے اور سونگھنے کی حیات" زیادہ حاوی تھیں (ص ۶۰)

ڈاکٹر صاحب کے اس بیان پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ انسان کی تاریخِ ارتقا میں سماعت کو باقی حسوں پر سبقت زمانی حاصل ہے اور موجودہ زمانے کے انسان کا یہی المیہ ہے کہ زمانہ حال کا کلچر اس کو عضویہ کے خانوں میں تقسیم کردینا چاہتا ہے لیکن اس کا جسم حِس سماعت میں اپنے مخرج کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے اور نامیاتی تقسیم قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔[۱۸۶]

انسانی تاریخ میں مختلف تہذیبوں میں مختلف حیات کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ قدیم عبرانی اور قدیم یونانی تہذیبوں میں حِس سماعت پر اختلاف تھا۔ عبرانیوں کے نزدیک علم کا منبع سماعت اور لمس کی حسیں تھیں لیکن یونانیوں کے ہاں بصارت زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ اس امر کا اظہار یونانیوں کی جیومیٹری کے ارتقا میں نظر آتا ہے وہ ایسی اقلیدسی شکلوں میں سوچتے تھے جو وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جیومیٹری اور علم فلکیات میں حیرت انگیز ترقی کی اور نظامِ کائنات اور اپنے نظام شمسی کے بارے میں بڑے بڑے حقائق دریافت کرلئے۔ مثلاً وہ زمین کی گردش اپنے محور پر اور اس کی سالانہ گردش سورج کے گرد اس زمانے ہی میں دریافت کرچکے تھے۔

عرب تہذیب پر مختلف چھاپ تھی وہ تجربہ پر زیادہ زور دیتے تھے اور گو انہوں نے یونانیوں کے فراموش کردہ علوم کی دوبارہ ترویج کی لیکن ان کا رجحان حقائق کی تلاش کی طرف زیادہ تھا نسبتاً قیاسات کے۔

ویدک عہد کی تہذیب کے بارے میں گو ڈاکٹر صاحب حس بصارت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں مگر موجودہ تحقیق دوسری بات پر اصرار کرتی ہے۔ اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگرچہ رگ وید کے پہلے حصہ کی مناجات میں بینائی اور بصارت سے متعلق بہت سے افعال اور ان کے مادہ ملتے ہیں یہاں تک کہ لفظ رشی اور کوی سے مراد بھی دیکھنے والے ہی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ رگ وید کا پورا ایک حصہ سوم رس سے متعلق ہے اور عددی امتیاز سے یہ موضوعات میں تیسرے نمبر پر ہے۔ (اس میں ۱۲۰ مناجاتیں سوم رس سے متعلق ملتی ہیں) اور اس لحاظ سے چکھنے اور سونگھنے کی حسوں کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے لیکن ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ رگ وید کا پورا نظام تحسیس سماعت اور آواز پر قائم ہے۔ یہ مناجاتیں گانے کے لئے مرتب ہوئی تھیں۔ اس لئے صرف پڑھنے سے ہی کام نہیں چلتا جب تک ان مناجاتوں کو گایا نہ جائے اس وقت تک رگ وید کے ان مطالب تک پہنچا نہیں جا سکتا جو اس کی تہ میں نہاں ہیں۔ اس محقق کے خیال میں ویدک عہد کی تہذیب پر بصارت یا بینائی کی نہیں بلکہ حس سماعت کی چھاپ ہے۔[187] اور اس طرح ڈاکٹر صاحب کا آوارگی سے سورج کی روشنی میں بصارت کے تیز ہو جانے والا نظریہ جس کا اعادہ وہ کتاب کے صفحہ صفحہ پر کرتے ہیں غلط ہو جاتا ہے۔

اس موضوع کو حکمار نے اب اس نظر سے دیکھنا شروع کر دیا ہے اور اس کی مزید وضاحتیں ہو رہی ہیں۔ ایک محقق نے تو دیوتاؤں، علم ہندسہ اور موسیقی کے مخارج رگ وید کے زمانے سے لے کر افلاطون کے عہد تک اسی موضوع کی مزید وضاحتوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔[188]

آخر میں جو سوال اٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے محرکات کیا ہیں؟ اور ڈاکٹر صاحب ان ساڑھے چار سو صفحات میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیا واقعی ان تین اصناف شاعری یعنی غزل، نظم، گیت کے مزاج کا تعین کرنے سے پوری اردو شاعری کے مزاج کا تعین ہو جاتا ہے؟ اور ایسا کرنے کے لئے کیا یہ ضروری تھا کہ ہم ابتدائے کائنات سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کا سفر طے کریں؟ ان سب سوالات کا جواب ہمیں خود ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب سے ہی مل جاتا ہے بشرطیکہ ہم اسے ذرا گہری نظر سے دیکھیں اور ان کے بیانات کا تجزیہ کریں جو جگہ بہ جگہ کتاب میں بکھرے پڑے ہیں۔

ہم ابتدا ان کے اس بیان سے کرتے ہیں۔

۱۔ چنانچہ جن قبائل نے آریاؤں کی مصر کی طرف پیش قدمی کے وقت اپنے وطن کو چھوڑا ان میں حضرت ابراہیم کا قبیلہ بھی تھا بعد ازاں آریاؤں نے شام کو روندنے کے بعد مصر پر حملہ کیا تو حضرت ابراہیم کا یہ قبیلہ ان کے ساتھ تھا۔ مصر کو آریاؤں نے سترہ سو قبل مسیح کے لگ بھگ فتح کر لیا اور اس پر ڈیڑھ سو برس تک حکومت کرتے رہے۔ یہ غیر ملکی بادشاہ ہکسوز یا گڈریے بادشاہ کہلائے۔ بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ ہکسوز سامی النسل تھے لیکن ماٹن بی نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ہکسوز آریا تھے اور عراق سے آئے تھے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب ڈیڑھ سو برس کی حکومت کے بعد ہکسوز کو مصریوں نے نکال باہر کیا تو یہ قریباً وہی زمانہ تھا جب حضرت موسیٰ اور ان کے قبائل نے مصر سے ہجرت کی اور مصریوں نے ان کا پیچھا کیا ص ۵۰

۲:- سامی النسل قبائل کے بارے میں ڈاکٹر صاحب آگے چل کر یہ فرماتے ہیں :-

"تاہم مسلسل آوارگی اور خانہ بدوشی کی حالت میں رہ کر نیز آریاؤں اور دوسرے آوارہ قبائل کے بہت قریب آ کر ان کے ہاں روشنی کی تلاش اور پدری نظام کی تشکیل کا رجحان ابھر آیا اور انہوں نے کثرت کی بجائے وحدت کو اپنا مسلک بنا لیا اس کے باوصف یہودیوں کے ہاں ابتدائی معرقی پوجا کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود رہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت عیسٰی نے جو زرتشت کے چھ سو برس کے بعد پیدا ہوئے جب ہر طرف آریاؤں کی محبت، تیاگ اور انوار پرستی کے رجحانات عام ہو چکے تھے ایک ایسے مذہب کا پرچار کیا جو یہودیوں کی بنیادی اور نسلی رجحانات کے منافی تھا تو یہودیوں نے اس کی سخت مخالفت کی مثلاً حضرت عیسٰی نے محبت اور برداشت کا سبق پڑھایا جب کہ یہودی اپنے دشمن کی کھال تک ادھیڑ ڈالنے کے حق میں تھے (یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ موسوی نظام گڈریا جب بھیڑوں کے گلے کو ہانکتا تو اس کا عصا خوف اور سزا کی علامت بن جاتا تھا جب کہ عیسوی نظام میں گڈریے نے عصا کو ترک کر کے پچکارنے کے عمل کو اپنا لیا) پھر عیسائیت نے جنت ارضی کو بہت کم اہمیت دی بلکہ تیاگ پر زور دیا جب کہ یہودی اس دنیا اور اس کے لوازم سے بری طرح وابستہ تھے اور تیاگ کے سخت مخالف تھے آخری بات یہ ہے کہ عیسائیت میں فرد کی نجات کا دار و مدار اس کے اپنے اعمال پر تھا جب کہ یہودیوں کے ہاں فرد کی بجائے قبیلے کو اہمیت حاصل تھی اور نجات یا عذاب کا تعلق فرد کی بجائے قبیلے کے ساتھ قائم تھا دوسرے لفظوں میں یہودیوں نے اس رجحان کو ناپسند کیا جو عیسائیت کے زیر اثر عام ہو رہا تھا۔ بہرحال عیسائیت زمانے کے ان نئے میلانات سے نسبتاً زیادہ متاثر تھی جو خانہ بدوش قبائل بالخصوص آریاؤں کے تسلط کے تحت عام ہو رہے تھے" ص ۵۵۔

۳:- اور ڈاکٹر صاحب کے خیال کا نقطۂ عروج یہ ہے۔ "ویسے یہ ایک قابل غور نکتہ ہے کہ ہندوستان کی قدیم دراوڑی تہذیب کو جن میں متحرک اور اجنبی تہذیبوں کی یلغار سے نبرد آزما ہونا پڑا وہ بنیادی طور پر آریائی یلغار کی مختلف کڑیاں تھیں آریا تو خیر آریا تھے ہی مسلمان جو ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو ایک بڑی حد تک آریائی خون ہی سے متعلق تھے۔ اسی طرح انگریز بھی ایک بڑی حد تک آریائی یلغار ہی کے علمبردار تھے" ص ۱۰۰۔

ان بیانات کو اکٹھا پڑھنے سے مندرجہ ذیل نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

۱:- سامی النسل قبائل خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبیلہ کی ذہنی تربیت آریائی قبائل نے کی اور اگر متعلقہ بیان کے بین السطور پڑھیں تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذہنی تربیت بھی انہی آریائی قبائل نے کی جن کے ساتھ وہ اُر کو چھوڑ کر شام کے سفر پر نکلے اور پھر انہی آریاؤں کی معیت میں وہ مصر پہنچے۔

۲:- حضرت ابراہیم کے قبیلے کی اور باقی سامی النسل قبائل کی مصر میں تربیت انہی آریاؤں کے زیر اثر ہوئی۔ حضرت موسیٰ کی تربیت بھی انہی آریاؤں نے کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام انہی آریاؤں کی معیت میں ہی بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلے اور کنعان پہنچے۔

۳۔ کنعان اور شام میں بھی یہ آریائی قبائل سامی قبائل کو متاثر کرتے رہے اور ان آریا قبائل کی تربیت کی وجہ سے وہ اس حد تک متاثر ہوئے کہ ان کے نئے پیغمبر نے انہی آریائی اقدار کو اپنایا اور سابقہ پیغمبروں کا طرز عمل چھوڑ کر انہوں نے پچکارنے کا

عمل شروع کیا۔ اسی وجہ سے انہیں مصلوب ہونا پڑا جس کا جواز ان کا یہی آریاؤں سے متاثر رویہ تھا۔ (یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چیمبرلین نے بھی یہ ثابت کیا تھا کہ دانتے اور حضرت عیسیٰ دونوں آریا تھے)

۴:۔ مسلمان قبائل جن میں محمود غزنوی، محمد غوری اور دوسرے افغان اور ترک قبائل شامل ہیں اور ان کے بعد بابر کے مغلیہ خانوادے کی رگوں میں بھی یہی آریائی خون تھا

۵:۔ جب انگریزی اقتدار آیا تو ان انگریزوں کی رگوں میں بھی یہی آریائی خون گردش کر رہا تھا۔

خلاصہ یہ کہ اس دنیا کے طول و عرض میں جتنی ذہنی، فکری، مادی، تہذیبی، ثقافتی، تمدنی ترقی ہوئی ہے وہ سب اسی آریائی خون کا کرشمہ ہے یہی خیالات گوبنیو، چیمبرلین، روزن برگ اور ہٹلر کے تھے اور ان کو ثقہ علماء رد کر چکے ہیں۔ نسلی فضیلت کا یہ نظریہ ۱۹۲۰ء کے قریب ہی اپنی موت مر چکا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب تقریباً نصف صدی کے بعد بیارر و مالونیت اور مریض نرگسیت کے ذریعہ اس کی لاش کو حنوط کر کے اپنے فکری سومنات میں سجانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ جو ڈاکٹر صاحب کے اس فکری سومنات کے اندر چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے یہ ہے کہ:۔

مشعل برداروں کے قافلے کے لوگ جو سنہری بالوں، نیلی آنکھوں سفید جلد اور ستواں ناکوں والے تھے تیر و کمان، تلواروں اور گرزوں سے لیس، ایک ہاتھ میں علم اور دوسرے میں عرفان کی مشعل لئے ہوئے۔ سبک رفتار راہواروں پہ سوار، رگ وید کی مناجاتیں گاتے ہوئے تمام دنیا کو عرفان و معرفت کی روشنی دکھانے کے لئے اپنے قائد اندر کے پیچھے ہندوستان میں داخل ہوئے جو بت پرستی، لذت پرستی، جہالت اور گمراہی کا گہوارہ تھا یہاں وہ کالے رنگ والے دراوڑوں کو تہ تیغ کرتے رہے ان کے گاؤں جلاتے رہے جو بچ گئے وہ ان کے غلام بن گئے اور کچھ بھاگ کر دکن میں پناہ گزین ہوگئے اور ان کی عورتوں کو آریاؤں نے اپنے گھروں میں ڈال لیا۔ جو ان کی زبردست غلطی تھی۔ کیونکہ ان کے ذریعے دراوڑی مذہب کے عناصر آریائی مذہب میں در آئے اور ان کے مذہب کی اعلیٰ اقدار رفتہ رفتہ ختم ہوگئیں لیکن ان کے ختم ہونے سے پہلے آریائی ردعمل ان دراوڑی عناصر کے خلاف اپنشدوں اور بدھ مذہب کی صورت میں پیدا ہوا لیکن یہ دونوں ردعمل آریائی عناصر کو بحال نہ کر سکے۔ اور آریائیت رفتہ رفتہ دراوڑی اثرات کے تحت دم توڑ گئی۔ اس لاش میں پھر مسلمانوں نے ٹیکہ لگایا یہ بھی آریائی اقدام تھا اور جب اس ٹیکہ کا اثر زائل ہونے لگا تو آریائیت کی ایک اور لہر اہل فرنگ کی صورت میں ہندوستان میں داخل ہوگئی۔ اس طرح ہندوستان کی پوری تاریخ اور زندگی کے تمام مظاہر آریائیت ہی کی پیداوار ہیں۔

لیکن اب یہ عقیدہ ترک ہو چکا ہے اور اس کی جگہ دوسرے نظریات لے رہے ہیں جن کا تجزیہ ہم اگلی اقساط میں کریں گے اس موضوع پر ہم ڈاکٹر صاحب کے اہم ترین مآخذ کی رائے کا اظہار کرتے چلیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔

• ہندوستان کے ماضی، حال یا مستقبل کے بارے میں ہم جو کچھ آج لکھ رہے ہیں وہ آنے والے زمانے میں قابلِ ترمیم ہوگا۔ ہم صرف ایک عبوری بیلنس شیٹ ہی تیار کر سکتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اپنے مشہور ترین فرزند گوتم بدھ کا سبق ہمیں سکھاتی ہے کہ کوئی چیز پائندہ نہیں ہے۔ مضبوط ترین چٹانیں رفتہ رفتہ یا فوراً ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔ اقدار اور ادارے جو آج نہایت مستحکم نظر آتے ہیں۔ رفتہ رفتہ کمزور پڑ جائیں گے تا آنکہ وہ اپنی ہستی کی صرف نشانیاں ہی رہ جائیں گی یا پھر راتوں رات صفحۂ ہستی

سے مٹ جائیں گی۔۱۹۰

اور خرد کے نظریات کا ہر دم متغیر ہونا ایک محاورہ بن چکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے اس فکری سومنات کے ناشرین (۲) کا دعویٰ تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا برصغیر پاک و ہند کے ان گنے چنے قلم کاروں میں سے ہیں جن کی تحریروں میں ہمیشہ تنقید، تحقیق اور تخلیق کا ایک دل آویز امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ موجودہ کتاب میں یہ طلائی تثلیث اپنی بھرپور چمک دمک کے ساتھ نمایاں ہے۔"

مندرجہ بالا بحث کے پیش نظر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ طلائی تثلیث شواہد اور نئی تحقیق کی روشنی میں اپنی چمک دمک برقرار نہیں رکھ سکتی۔ کاش اس کتاب کے فاضل مصنف جان جائیں کہ نظریات بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں اور پھر ان کی جگہ دوسرے نظریات لے لیتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ خود انسان اس عمل کے شانہ بشانہ چل سکے! اور پھر ہر بت کے پاؤں مٹی ہی کے ہوتے ہیں!!

(مسلسل)

Notes and References

Abbreviations:-

E.B. Encyclopaedia Britanica, 1979 edition
Micropaedia I, II, III
Macropaedia 1, 2, 3, ... 19

E.R.E. Hastings (ed) Encyclopaedia of Religion & Ethics

E.S.S. Encyclopaedia of Social Sciences

---

1. Dunn, L.C.; Race & Biology, in Kuper (ed): Race, Science & Society, Unesco, 1975, p.37.

2. Bhattacharji, Sukumari; The Indian Theogony, Cambridge, 1970, p.2

3.i Bary, Theodore de, et al (ed) Sources of Indian Tradition, Columbia and Oxford, 1958

ii Bhattacharya, Haridas et al (ed); The Cultural Heritage of India, Calcutta, 1953-58

iii Coomaraswami; Myths of Hindus & Buddhists, New York, 1967 reprint

iv Chinmulgunda, P.I. and Mirasni, V.V.; Review of Indological Research in the last 75 years (M.M.Chitarao Shastri Facilitation Volume) Bharatiya Chiritrakosha Mandal, Poona, 1967.

v Dowson, John A.; A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion, Geography, History and Literature, London, 1878.

vi Emeneau; A Union List of Printed Indian Texts, New Delhi, 1935.

vii Farquhar, John Nicol; Outline of Religious Literature in India, Oxford and New Delhi, 1967

viii Macdonnel, A.A.; Vedic Mythology, Strassburg, 1897

ix — and Keith; Vedic Index of Names and Subjects, 2 vols, London, 1925, Delhi, 1967

x Radhakrishnan & Moore; Source Book of Indian Philosophies, Princeton, 1975.

xi Shastri, V.B.; A Vedic Concordance, 5 vols, Lahore and Hoshiarpur, 1942 65,

xii Shastri, Nilkanth; Development of Religion in South India, Bombay, 1963

xiii Theodore, William., Sources of Indian Tradition, New York, 1958.

xiv Winternitz; A Concise Dictionary of Indian Religion, Oxford 1925, New Delhi 1966

xv Linguistic Bibliographies (Utrecht - Bruxells), Spectrum 1939 ff.

xvi Annual Bibliography of Indian Archeology, Kern Institute,

xvii Potter; Bibliography of Indian Philosophies, Delhi, 1970.

xviii Walker, Benjamin., Hindu World, 2 vols, London 1968.

4. i Allchin; Neolithic Cattle Keepers of South India, Cambridge, 1935.

ii —and Bridget; The Birth of Indian Civilization, Penguin, 1968

5. Al-Quran; p. 76-79.

6. i Chaudhry, Nirad C.; Hinduism, London, 1979, .82, 83.

ii Bhattacharji; op. cit. . 12, 13

iii Kirk; Myth, Its Meaning and Function in ncient Religion, Cambridge [illegible] reprint, p. 210

7. [illegible], [illegible]: Philosophies of India, Bollingen Series, p. 34[illegible]

8. i Darian, Steven G: The Ganges, in Myth and History, Honolulu, 1978, p.56

ii Bhattacharji, op. cit. .264, 265.

9. i Chaudhry, Nirad C.; op cit. p. 30.

ii Chattopadhaya, Debiprasad: Indian Philosophy, Peoples Publishing House, [illegible]lhi, 1972 Reprint pp.32,33, 206 ff.

iii Maj[illegible]dar, R.C. (ed.):History and Culture of Indian People, The Vedic Age, London Third Impression, 1957, . 220[illegible].

10. i Boquet, A.C.; Hinduism, London, 1966, p.28

ii Chattpadhya; op. cit. p. 206, n 6.

11. i Renou, Louis: Religion of Ancient India, London & New York, 1968

ii —— ——, L'Inde Classique, Spratt, Calcutta 1957.

iii —— ——, Charnc, D.R.; The Destiny of the Vedas in India, New Delhi, 1965

iv Dandeker, R.N.; Progress of Indian Studies, Bhandarkar Oriental Institute, Poona, 1917-42

v Gonda, J.; Change and Continuity in Indian Religion, The Hague, 1965

Contd. -- Next Sheet

12. i Darian; op. cit., pp. 57, 58

ii Pulaskar; Aryan Settlements in India, in: Majumdar, op. cit. p. 242.

13. Walker; op. cit. 57, 58.

14. Rawlinson; A Short Cultural History of India, Paper back, 1965, p. 30.

15. Daniélou, Alain: Hindu Polytheism, Pantheon, 1964, p. 66.

16. Ibid.

17. Boquet; op. cit., pp. 29, 30.

18. Basham, A.L.; The Wonder that was India, London. , pp. 237, 238.

19. i Zimmer; op. cit., p 344.

ii Zaehner; Hinduism, London 1975 Reprint, pp. 19-22

iii The Lecture(?); op. cit., p. 13

20. i Zimmer; op. cit., p. 10

ii Muller, (tr.) The Upanishads, Part 2, Sacred Books of the East, vol xv. Dover Publications, 1962 I.4.6, p. 86

"Now, whatever there is moist, that he created from seed; this is soma. So far verily, is this universe either food or eater. Soma indeed is food, Agni eater . . . . "

21. Keith; The Religious Philosophy of the Vedas and the Upanishads, Harvard, 1925.

22. Brough, John: Bulletin of the School of Oriental and African Studies, No. XXXIV (1971) . 331-362.

23. Levi-Strauss, Claude: Structural Anthropology, Vol.I, Chapter XII. Mushroom in Culture: apropos of a Book by R.G. Wasson (tr.) Monique Layton, Penguin, 1978, pp. 222 - 237.

24. Levi-Strauss, op. cit. quoted by, from Renou's translation of the Rigveda

"These lords with full bladder piss (Soma) quick with movement."

25. Levy-Strauss, op. cit. p. 230.

26. Levi-Strauss, op. cit. p. 231.

27. Ibid.

Contd. -- Next Sheet

28. i Levy Strauss, op. cit, p. 236.

ii Oldenberg, H.: Ancient India, Its Language & Religion, Calcutta Reprint 1962, p. 62.

29. i Boquet, op cit., p. 27.

ii Chattopadhyaya, op. cit., p. 32.

30. E. .b. Under Dr vidians

31. See note no.83 below. Shastri, Nilkanth; A History South India, OUP, 4th edition, 1976, pp. 64, 65.

32. Marr, John: The Early Dravidians in: Basham: A Cultural History of India, Oxford, 1975 p. 81.

33. Ibid

34. E.B. Vol. III, p.658.

35. ;op. cit for the entire discussion.

36. Radhakrishnan in: Basham (ed.) op. cit. p. 61.

37. Toynbee; A Study of History, Paperback New York, 1962 Vol I, pp. 107, 108:-

"At Mohenjo-Daro in North-Western Sind and at Harappa in the Panjab, North-East of Multan excavations carried out by the Archaeological Department of the Government of India have brought to light the material remains of our ancient culture which is closely related to the ancient culture of the Sumerians in Iraq. The affinity falls short of absolute identity. It recalls the affinity of the Mycenaean culture of the Continental Greece to the Minoan culture of Crete: and we may explain this in either of the two ways. Either we may conjecture that 'the Indus Culture' like the Mycenaean, was a colonial variation produced by the transplantation overseas of a culture which had originated and grown up elsewhere in this case in the in of Tigris and Euphrates or common parent unknown, which grew up simultaneously and independently."

Also see footnote No.2 and 3 and pages 420 and 421 of this Vol.

38. Piggot, Stuart (ed.): The Dawn of Civilization, Thames & Hudson London: 1961, p. 15.

39. Smith, V.A.: The Early History of India, Oxford, 1914, p. 19.

Contd. -- Next Sheet

40. Basham, (ed): A Cultural History of India, op. cit., p.304.

41. Toynbee, op. cit p. 108.

4.. i. Piggot, op. cit., pp. 12, 13.

ii. Toynbee; Mankind and Mother Earth, Oxford, 1976, pp. 303, 362, 422.

iii. Lal , B.B.; The Indus Civilization, in: Basham (ed): The Cultural History of India, op cit. p.19.

iv. Clark & Piggot; Pre-historic Societies, Pelican, 1976 reprint . The prefatory note.

v. Possehl, Gregory L. (ed). Ancient Cities of the Indus, Vikas, New Delhi, 197 , Part X which contains the latest on the subject.

43. i. Piggot, op. cit.

ii. Possehl, op. cit.

44.i. Chaudhry, Nirad C.; Continent of Circe, Jaico, Bombay; 6th Impression, 1978, pp. 44, 45.

ii. Chaudhry, Nirad C.; Hinduism op cit. 31 ff.

45. Zaehner, R.C.; Hinduism, OUP London; 1975 Reprint 31ff.

46. Chaudhry, Nirad C.; Continent of Circe, op. cit, pp. 45, 46.

47. Turner, Ralph; The Great Cultural Traditions, New York, Vol I, 1941, p. 374.

48. , op. cit., p.225.

49. Toynbee; Mankind & Mother Earth, op. cit. p.141.

50. i. Walker, op. cit., Vol. I, p 485.

ii. Possehl, op. cit., part IX containing articles by the following on the end of Indus Civilization;

a. Dales, G.F.; The Mythical Massacre at Mohenjodaro, p. 293.

b. Raikes, R.L.; The End of the Ancient Cities of the Indus p. 297.

c. Dales, G.F.; The Decline of the Harrapans p.307

d. Lambrick, H.T.; The Indus Flood Plain and the "Indus" Civilization p.313.

iii. Lall, B.B. op. cit. p.19.

iv. Darian, op. cit. p.55.

51. Raychaudhri, H.C.; Political History of Ancient India, Calcutta, 7th edition, 1950, p.33.

52. Toynbee; Study of History, op. cit Vol I. p.107,

53. Lall, B.B., op. cit.

54. Durant, Will, Our Oriental Heritage, New York, 1942, p. 287.

Contd. -- Next Sheet

55. i. Longman's English Dictionary, 'Scythian.'
ii. Chamber's Twentieth Century Dictionary.
iii. Concise Oxford Dictionary.

56. Burrow, T.: The Early Aryans, in: Basham (ed.), op. cit., pp. 24, 25.

57. Basham: The Wonder that was India, op. cit., p.28.

"There is not enough evidence to say with certainty that the destroyers of the Indus Cities were members of the group of related tribes whose priests composed the Rgveda, but it is probable that the fall of the great civilization was an episode in the movement of charioting people which altered the face of the whole civilized world in the 2nd millenium B.C."

58. Basham, (ed), op cit. p. 487.

59. Ibid., p.6.

60. Thapor, Romila: History of India, Pelican, , Vol. I .24.
"The political continuity between the Harappan Culture and the later Aryan Culture was prevented by the intrusion of less civilized peoples who occupied the sites of the Indus Valley in the first half of the second millenium B.C "

61. E.B. 8. 908, Basham's Article on History of Hinduism particularly the Dravidian Hypothesis.

62. Wheeler, Sir Mortimer: Early India and Pakistan, Thames and Hudson, New Revised Edition, 1968, p.13.

63. Op. cit., 113ff. Further see his article on Indus Valley Civilization in Piggot, (ed): Dawn of Civilization

64. E. B. 9.344.

65. i. Turner, op.cit. Vol. I, 371.
"From the disappearance of the early Indus Valley urban culture after the middle of the Third Millenium B.C. until the appearance of the Aryan tribes - perhaps a thousand years later - almost nothing is known of the land now called India. If Aryan tradition is to be believed, north western India was sparsely settled when the Aryans arrived, but in the central India there lived a cattle keeping people who built stockaded villages. The Dravidians as the people is now called may even have had towns. But most of India was inhabitted by more primitive folk. Present evidence suggests that when the Aryans penetrated the land, India was a country of mixed races and jumbled hunting nomads and hoe cultures. This diversity, it may be noted, never disappeared."

Contd. -- Next Sheet

66. Ibid, p. 178.
"Evidence at Mohanjo-Daro, Chano-Daro, and Harappa points to the recurring disasters by flooding and probably the cities were finally abandoned because of this menace. But what happened to the people and their cultures? There is no evidence that the early Indo-Eurppean invaders of India either met or absuroed them."

67. Toyntee, Mankind & Mother Earth op cit, pp. 102, 103.,
"We have no archealogical evidence for primary Sanskrit speaking invaders if these had erupted from the Eurasian steppes in the eighteenth Century B.C. they may have reached India as rapidly as they reached Babylonia and Mesopatamia, but it is also possible that it took them several centuries longer to find their way across the Hindu Kush from the Oxus-Jakartes basin to the Indus Basin."

68. Lali, B.B. 'Basham (ed.), op. cit., p. 19.

69. Bhattacharya, Sachchidananda; A Dictionary of Indian History, New York, 1967, p. 473.

70. Khandalawala, Karl: Art of Indus Valley Civilization, ar Introduction to Smith, V.A.; History of Fine Arts in India and Ceylon, Bombay, 1969 Reprint, .xxii, xxiii.

71. Durrant, Will; op. cit., p. 396.
"Despite the continuity of the remains of Sind and Mysore, we feel that between the hey day of Mohenjodaro and the advent of the Aryas, a great gap stands in our knowledge: or rather that our knowledge of the past is an occasional gap in our ignorance."

72. Sharma, K.G., Excavations of Kausamohi, Allahaba, 1960, p. 5.

73. Marion, op. cit. p 55.

74. E.B. 10.780.

75. E.B. 9.439 and 9.345.

76. i. Dales, op. cit. and in: Scientific American, No. 5, pp. 93-100.
ii. Rao, S.R.; New Light on the Indus Valley Civilization, Illustrated London News, No. 238 p. 302-304.
iii. ———— Lothal and the Indus Civilization, Asia Publishing House, N. Delhi; 1973, p. 180.
iv. Siddiqui, Mohammad Idrees; Vadi-i-Sindh ki Tehzeeb, Archeological Dept. of Pakistan, Karachi, pp. 25, 52, 64, 163
v. Sankalia, H.D.; Indian Archaelogy Today, Ajanta Publications New Delhi, 1979, .42, 43.

77. Majumdar, R.C.; op. cit., Quoted by, p. 3.

Contd. -- Next Sheet

78. Majumdar, op. cit., p.3.

79. Ibid.

80. Ibid., p. 11.

81. Ibid, p. 1.

82. Dunn, L.C.: Race and Biology, op. cit., 37, 38, 41, 62.

83. Max Müller, quoted by (i) American Peoples Encyclopaedia, Aryans.
(ii) Crooke, W.; The Native Races of India, Pakistan Reprint, 1979, p.33.

84. Rawlinson; India in European Literature, in: Garrett (ed) The Legacy of India, Oxford, 1938, p. 12.

85. (i) Rawlinson; India, A Short Cultural History, op.cit., p.9.
(ii) Thapar, Romila; A history of India, op cit., p.27
"Aryan is in fact a linguistic term indicating a speech group of Indo European origin and is not an ethnic term. To refer to the coming of the Aryans is therefore inaccurate."

86. Monier-Williams, Sir: Indian Wisdom London, 1893, p. 227.

87. Loquet, op. cit., p.23.

88. Piggot, Stuart. Prehistoric India, Pelican, 1961 reprint p.248.

89. Zaehner, op. cit., p. 14.

90. E.B.Vol. V. p.222.

91. Durrant, op.cit., p.286.

92. Max Müller (tr): The Upanishads, Part I, New York,

93. Rawlinson; India in European Literature & Thought in: Garrett (ed): Legacy of India, op. cit. 35, 1.

94. Op. cit., p. 36.

95. E.R. & E. Vol II p.12.

96. Long, Charles H.; The History of the History of Religion, in: Adams (ed): A Readers Guide to the Great Religions, Second ... ee Press, London, 1977, p.471.

97. Wach, Joachim; A Comparative Study of Religions Columbia University Press, New York 1958, p.?

98. E.R. & E. Vol. 12, Article under 'Mythology.'

99. (i) E.B. 12.794, 12.799, 12.802.
(ii) Cicero; The Nature of the Gods, Penguin, 1978 Reprint, 147 ff.

Contd. -- Next Sheet

(iii) E.R.AE. Article on Mythology op. cit. - III part- Origin of the Myth, 3. Historical or Euhemeristic Theory.

---11 Philosopher Euhemerus (the end of 4th Century B.C.) maintained that a myth was of historical origin and that gods were men who had performed great deeds or conferred benefits upon their fellows. In proof he quoted the grave of Zues shown in Crete. He was rehabilitated by Herbert Spencer who maintained that religion was derived from ancestor worship. It was not accepted by mythologists except within certain limits. Tales of historical events of persons often show mythical accretions or transformation. But the great mass of mythology cannot be explained as transmuted history.

(iv) Brandon, S.G.F.; Religion in Ancient History, Allen & Unwin, London, 1969, p 6.

(v) Hein, Norwing, Hinduism in, Adams(ed.) op. cit., p. 112.

(vi) Bachofen; Myth, Religion & Mother Right, Princeton, 1967 pp. 48 - 50.

(vii) Walker, Benjamin; Hindu World, op. cit., Vol II, p. 104.

(viii) Toynbee; A Study of History, Abridgement by Somervell, 1968 Reprint p. 44.

(ix) Leeuw, G.van der; Primordial Time and Final Time, in: Man & Time, Bollingen Series xxx Princeton 1973, pp. 330 - 331.

(x) Krik, Myth; op. cit.

(xi) Kirk; Greek Myths, Reprint 1980, Pelican, Chapt.1, Sect.iii.

100. i) B.B. 18.407 "Iliad".

ii) Bhattacharji, Sukamari; op.cit. p. 23.

101. Zimmer; Indian Philosophies, op. cit., p. 333.

102. Adams, op. cit., p. 111.

103. Chaudhry; Hinduism op. cit., p. 62.

104. i) Zaehner op. cit., p. 22 ff.

ii) Bhatacharji op. cit, p. 12 ff.

iii) Danielou, Alain; op. cit. p. 106 ff.

iv) E.R.& E. Vol xii p. 604, Macdonnel on Vedic Religion,

105. i) E.R.& E. Vol. II p. 32. See also Vedic Animism Vol. VI p. 687.

ii) Thaper, op. cit. p. 43.

iii) Chaudhry; Hinduism op. cit. 80, 145.

106. E.R. and E, Vol. II, Shrader; Aryan Religion.

107. Ibid.

108. i) Zaehner, op. cit., p. 17.

ii) Bhattacharji op. cit., pp. 17, 18.

iii) Bouquet op. cit. pp. 27, 28. Contd. -- Next Sheet

109. i) E.R. and E. Loc. cit.
ii) De Nicolas, Antonio; Meditation Through the Rgveda (Four Dimensional Man) London, 1978, p.52.

110. i) Leiris, Michel; Race Culture, in: Kuper (ed.) op. cit. 140 - 142. Also see:
ii) Essein - udom; Tribalism Racism in: Kuper (ed.) op. cit. 235.
iii) E. B. 13.896. and Vol. 15 for Races of Mankind.
iv) Risely; People of India, Reprint, Lahore p.7.

111. De Nicolas, op. cit, p. 190
"One of the most misleading misconceptions, and at the same time the largest presuppositions, of language users and language analysts, is the existence of one universal language. This radical presupposition about the language has been explicitly stated by some, either in the form of meta language, a universal deep grammar or implied even by those who denied the above possibilities in the name of nominalism, positivism, dialectics or even realistic knowledge or ignorance "

112. i) E.S.S. Vol. II, Hanikin on 'Aryans'
ii) Turner, op. cit., Vol. I p.227 Vol. II p.735.
iii) Piggot (ed.), op. cit. p.322.
for further study refer to
a. Landor; The Home of the Indo-Europeans, Princeton, 1922.
b. Peake; The Bronze Age the Celtic World, London 1922.
c. Childe; The Aryans, the Story of their Indo-European Origin London, 1926
d. Paliakov; The Aryan Myth, Heinemen, London; 1971.

113. i) Koestler, Arthur; The Thirteenth Tribe, paper back, 1978, Chapter VIII entitled Race and Myth.
ii) Turner, op. cit. p.333.
iii) Walker, op. cit. Vol. II. or Miscegenation.

114. i) E.S.S. Vol. II hanikin on Aryans,
"Nevertheless skepticism in scholarly circles grew rapidly after 1880. The obvious impossibility of actually locating the Aryan cradleland; the increasing complexity of the problem with every addition to our knowledge of pre-historic culture; the even more remote possibility of ever learning anything conclusive regarding the traits of the mythical 'original Aryans'; the increasing realisation that all the historical peoples were much mixed in blood and that the role of a particular race in a great melange of races, though easy to exaggrate, is impossible to determine; the ridiculous and humiliating spectacle of eminent scholarship subordinating their interest in truth to the

Contd. -- Next Sheet

inflation of racial and national pride - all these and many other reasons led scholars of the first rank even before 1890 to declare either that the Aryan doctorine was a figment of a professorial imagination or that it was incapable of clarification because crucial evidence was lost, apparently for ever.

ii) Rawlinson; India, op. cit. p. 9.

iii) Eickstedt quoted by Rawlinson 9 ff.

iv) Iyer, L.A.A.; Mysore Tribes Castes, Vol. I 1935 Chapter I.

v) Census of India, Report 1931, Vol. I, iii. part, I for opposite views.

vi) Majumdar R.C.; Races and Cultures of India, op. cit., Chapter III.

115. Toynbee; Abridgement by Somervell, op. cit., p.53.

116. i) See note 66 above.

117. Majumdar op. cit. p. 9.

118. i) Toynbee op. cit. Vol. I 216 ff.

ii) E.B. Vol II, op. cit. Article "Aryan."

iii) Kuper (ed.) op. cit. Article by Dubinin on Race Contemporary Genetics p 70 - 71.

119. Toynbee, op. cit. p. 219.

120. E. B. Vol. viii p. 674.

121. Majumdar op. cit.

122. Khutba Hajj- ul-Widā.

123. Levy-Strauss, Claude: Structural Anthropology, translated by Monique Layton, Vol II, Pelican, London; p.342.

124. Turner, op. cit., p. 51, and n. 1 and p. 52.

125. Toynbee, One Volume Abridgement op. cit. p. 55.

126. Winternitz, M.; History of Indian Literature, Calcutta, 1927 Vol. I, 66-67.

127. Venkateshwara, S.V. : Indian Culture Through the Ages, London 1928 p. 14.

128. Dutt, R.C.; Translation of Ramayana Mahabharata, Every Man's Library n.d. 231.

129. Dasgupta, S.N.; Yoga as Philosophy of Religion, London, 1924, p.6.

130. Griffith, T.H (tr.) The Hymns of Rg Veda, Motilal Banarsi Das Delhi, 1973 Reprint, Rv. X. 10, See also foot notes to the Hymns pp. 534 536.

Contd. -- Next Sheet

131\. i Hume, Robert Ernest; "The Thirteen Principal Upanishads O.U.P. Second Revised Edition 1927, 169, 170.

ii) Max Muller's translation does not contain these verses due to their 'Coarseness' - cf. His translation 'The Upanishads', Sacred Books of the East, New York n.d., xxi.

iii Also see the following in Walker's Hindu World

a. Antinomianism - the obscene language and gestures used at the time of Asvamedha yajnas as part of religion, secular literature like Kalidas's Shakuntala and remarks of Griffiths regarding the translation of yajur-veda.

b. Sex Mysticism.

c. Parakriya Union - i.e. outside the wedlock.

132 Rawlinson; India in European Literature and Thought, in Garratt (ed.); Legacy of India, Oxford, 1938, p.2.

133\. See note 64 above

134\. (i) Thapar, op. cit. 33, 34.

(ii) Childe; What Happened in History, Pelican, p.175.

135\. Zaehner, R.C; Zurvan, Oxford, 1955, p.17

Toynbee, Abridgement op. cit. p. 92.

136 Zimmer; Philosophies of India, op. cit. 59, 105.

137 (i) Toynbee, Somervell abridgement, op.cit. p.92.

(ii) Also see Oldenberg, H.; op. cit. p.74.

138 Thapar, op. cit. p. 34.

Lall, E., op. cit.

(iii) Toynbee; Mankind and Mother Earth, op. cit., p.80.

iv Durrer op. cit. vol I 104 ff.

v Rawlinson; India, op. cit. 13 ff.

139 Childe; What Happened in History, op. cit., p. 145

"--The aims of Oriental religion seem to us materialistic. The cult of the gods was, in fact, designed to secure not what we call holiness, purity and the peace of God, but good harvests, rain in due season, victory in war, success in love and business, children, wealth, health and an indefinitely long life."

140\. i) Rawlinson; India, op. cit, p. 25.

ii) Zaehner; Hinduism, op. cit., pp. 18, 43, 44, 108, 109-111.

iii) Mukerjee, Radhakamal; The Culture and Art of India, London 1959, p. 54.

iv) Basham; The Wonder that was India, p. 35.

v) Bhattacharya; A Dictionary of Indian History, New York, 1964, p. 208.

Contd. -- Next Sheet

vi) Walker, op. cit., Vol I, . 201 ff.
vii) Rgveda, (tr) Griffith, I. 113.6, X. 90.12
viii) Barrow: The Early Aryans, in: Basham (ed): A Cultural History of India, op. cit., p. 22.
ix) Macdonell Keith: Vadic Index of Names Subjects, Delhi, 1967, Vol. I pp. 250 -51.
x) Piggot; Prehistoric India, op. cit., p. 259.

141. Jairazbhay; Foreign Influences in A cient India, Asia Publishing House, London, 1963, p.28.

142. i) Majumdar R.C., op. cit., p.280.
ii) Senart, M., quoted by Risley: Peoples of India & Pakistan Reprint, Lahore, p.257 and annexure cxxxiv in original French.

143. Radha rishanan, Servapali: Hinduism, in: Garrett (ed): The Legacy of India, Oxford, 1938, .264, 265.

144. Toynbee; A Study of History, Abridgement by Somervel (one olume ed), 1962 Reprint, London p.26.
"The records of ancient Egypt give evidence that within the period 2000-1500 BC. the Aryas breaking out of Russian steppe in the quarter where the Turks broke out three thousand years later anticipated the urks in their subsequent dispersion. While some, as we know from Indian sources entered India, others overran Iran, Syria and finally Egypt, where they established in the seventeenth century B.C. a rule of barbarian war-lords known to Egyptian history as the Hyksos."

145. Also see
Toynbee; Study of History, op. cit., vol. I, p. 105,
"2. That Hyksos were probably a mixed multitude of Aryas and other adventurers (e.g. Kharrians) who had joined their ranks on their way accross South-Western Asia, as the war-bands who entered Egypt with Saladin were a mixed multitude of Turks, Kurds and Syrians."
"4. The Aryan element among the Hyksos is inferred from the Aryan successors of the Hyksos in Syria and Mitanni, for which we have direct evidence in the records of 'the New Empire' of Egypt from the Sixteenth Century B.C. onwards. For the whole subject see Meyer, E.: 'Geschichte des Altertums Vol. I part (i) 2nd edition, pp 33-8."

146. Toynbee; Mankind and Mother Earth, OUP, 1976, p.91.
"The Egyptian middle kingdom seems to have been brought to an end by a similar gradual encreachment of barbarians the so-called Hyksos, who infiltrated into the north

Contd. -- Next Sheet

eastern corner of the Nile delta c 1730 or 1720 Bc. and eventually occupied Memphis and extinguished the Twelfth Dynasty's feeble Thirteenth-Dynasty's successor in 1674 Bc. To judge by their personal names Hyksos seem to have been Semitic speaking; and, if a West Semitic language was their mother tongue, they were not the Kassites kinsmen."

147. Cullican, William; The First Merchant Venturers, The Sea People of the Levant. in Piggot (ed):The Dawn of Civilisation, op. cit. p. 152.
"After the middle kingdom by about 1730 Bc the Hyksos a group of Asiatic herdsmen kings, swept over Syria and Palestine and imposed a foreign Dynasty on Egypt."

148. Turner; The great Cultural Traditions, New York, 1941, p. 226.
"Hyksos were not an ethnic group but a horde of mixed Semitic, Nubian and Indo European names. The Iranians and Aryas were undoubtedly Indo European."

149. Darlington; The Evolution of Man and Society, Allen Unwin, London; 1971 p.139, 6 Ch. I.
"The Hyksos following Josephus, have usually been thought of as semetic: but at the time they entered Egypt with chariots (1800 Bc) they must have had recent Aryan connection in their leadership."

150. Durrant op. cit., p. 152.
"Then the Hyksos, nomads from Asia, invaded disunited Egypt, set fire to the cities, ra ed the temples, squandered the accumulated wealth, destroyed much of the accumulated art, and for two hundred years subjected the Nile valley to the rule of the shepherd king's......."

151. E.B. Vol. V, p.249, 1979 edition, Vol.V, p.249.
"Hyksos, the English SHEPHERD KINGS, name given by the Greek historian Manetho (flourished 300 B.C.) to Asiatic invaders who, about 1674 BC., overran Egypt and founded the 15th Dynasty. The name Hyksos was probably a version of the Egyptian term for ruler of a foreign country (heqa-khase), and it almost certainly designated the foreign country dynasts rather a whole nation....... Although most of the Hyksos names seem to have been Semetic, there may also have been a Hurrian element among them...... the collapse of the Hyksos rule, which fina[illegible] occurred about 1567 Bc. [illegible] when the native Egyptian rulers of Thebes, who for[illegible] the 17th dynasty, [illegible] began to extend their control northward, [illegible] and found[illegible]ing the [illegible] dynasty."

Contd. -- Next Sheet

152. Toynbee; A Study of History, op. cit., p. 103.

153. E.B. 12.487.

154. Toynbee; Mankind and Mother Earth, op. cit., p.83.

155. Durrant, op. cit., p.286.

156. E.S.V. p.67.

157. i) Chaudhry; Hinduism, op. cit., pp. 42, 43.
ii) Burrow, T.; The Early Aryans, in Basham (ed.), op. cit., . 23, 24.
iii) Lloyd, Seton; The Early Settlements of Anatolia, in: Piggott (ed): The Dawn of Civilization, op.cit., 188 ff.

158. The Marg (Bombay), Vol. xxv, No.I. (Dec. 71)

159. Sullivan, Herbert; History of Religions 4, "A Re-examination of the Religion of the Indus Valley," 115-125.

160. i) E.R.E. Vol v., p.790.
ii) Oldenberg, op. cit., p. 91.

161. Ibid., Vol. xii., p 434.

162. i) Ibid. (1) vol. ii, . 16-23.
ii) (2) vol. viii, p. 34.

163. Boquet, op. cit., p.32.

164. Ibid., p.72.

165. Ibid, p.31.

166. Piggot, op. cit., pp. 298, 249.

167. E.R.E. Vol. ii, under "Aryan Religion."

168. Griffith (tr.); Rgveda x. 86. 16.

169. Chaudhry; Continent of Circe, op. cit., p.225.
"He achieves not-he whose penis hangs limp between the thighs.
Achieves he alone whose hairy thing swells up when he lies."

170. Chaudhry; Hinduism, op. cit., p. 224.

171. Campbell, Joseph; the Masks of God, Oriental Mythology, Penguin, 1977, . 194 ff.

172. Walker Vol. I op. cit. p.474.

173. Chaudhry; Continent of Circe, op. cit., pp.228, 229.

174. De Nicolas, op. cit., p. 180.

175. Walker, op. cit., vol I, p. 132, 133.

176. Ibid, vol II, pp. 246-249.

177. Ibid., vol II, . 109.

Contd. -- Next Sheet

178. Chaudhry; Continent of Circe, op. cit. p.226.

179. Zimmer, op. cit., 140 ff.

180. i) Chaudhry; Continent of Circe, op. cit. p. 269.

ii) Anand, Mulk Raj: Kama Kala; Nagel Publishers, Geneva, p. 18.

iii) Desai, Devangana; Erotic Sculpture of India, Bombay, chapter VI.

181. Max Muller (tr); The Upanishads op. cit. xx, xxi.

182. Desai, op. cit., chapter x.

183. Gonda, J.; Ascetics & Courtesans, Adyar Library Bulletin, vol. xxv, 1961.

184. Chaudhry; Hinduism, op. cit. pp. 96-98, 242.

185. i) Huxley, Aldous; Point Counter Point, Chatto and Windus, London, 1928.

ii) Scott, George Ryley: Phallic Worship, Luxor Press, London, 1962

iii) Leeson, Francis; Kama Silpa, Taraporewala, Bombay, 1962.

iv) Cutner, H.; A Short History of Sex Worship, Watts & Co. London; 1940.

186. De Nicolas, op. cit. p. 124.

187. Ibid, pp. 104, 122, 63 ff.

188. Maclain, Ernest G.; the Myth of Invariance, Shambala London:

189. De Nicolas, op. cit. p. 52.

190. Basham (ed) op. cit. p. 4-7

رطب و یابس

ظفر اقبال

(۱)

وہ تو اپنا تھا، یہ دھوکا اُسے کیا دینا تھا
میں نہیں ہوں، اُسے پہلے ہی بتا دینا تھا

میں جو ہوتا بھی تو اِس تند ہَوا نے مجھ کو
خس و خاشاک کے ہمراہ اُڑا دینا تھا

نقش کہہ کر کسی دیوار میں جڑتے نہ اگر
لفظ کر کے کسی مصرعے میں پھنسا دینا تھا

سطح پر جم گیا خود برف کی صورت آخر
جس نے ٹھیرے ہوئے پانی کو چلا دینا تھا

پاؤں پھر روک دیئے حیرتِ منظر نے مرے
یعنی، دیوار کو رستے سے ہٹا دینا تھا

بے نشاں ہوں، مگر، اتنا سا ہے پچھتاوا بھی
داغ مٹتا ہُوا اس کو بھی دکھا دینا تھا

بھرے بازار میں پھرنا تھا کھُلے منہ اُس نے
دیکھ کر میری جھجک پردہ گرا دینا تھا

میں بھی تیار تھا سڑکوں پہ بکھر جانے کو
اُس نے بھی دُور سے رُومال ہلا دینا تھا

ظفرؔ افسانے سُنا جاتے ہو جس کے آ کر
تم نے تو اُس کو مرے پاس بُلا دینا تھا

(۲)

ہَوائے دل بھی نہ تھی، موسمِ دعا بھی نہ تھا
بدن پہ وقت کچھ ایسا کبھی پڑا بھی نہ تھا

بکھر گیا تھا ذرا سا وہ رنگِ راز، تو اب
مجھے ہی فکر تھی ساری، اُسے پتا بھی نہ تھا

جُھک کے پھُول بنا اور مجھے خبر نہ ہُوئی
وہ ایک بوسہ جو کچھ اتنا بے صدا بھی نہ تھا

ذرا سی جرأتِ رندانہ چاہیئے تھی وہاں
بلند اب کے بہت خوشۂ خطا بھی نہ تھا

اُسی کے خواب سے روشن ہے تمام دشتِ ہوس
وہ داغِ عکسِ تماشا کہ جا بجا بھی نہ تھا

روا روی میں ہی خط اُس نے لکھ دیا، ورنہ
اُداس مجھ سے جُدا ہو کے وہ ذرا بھی نہ تھا

کھُلی تھی آنکھ مری منظرِ نظر سے پرے
کھڑا تھا چوک میں اور کوئی راستا بھی نہ تھا

وہاں اُچھال کے پھینکا تھا موجِ دل نے مجھے
جہاں سے خلق بھی غائب تھی اور خدا بھی نہ تھا

میں ایک سانس کی سلوٹ پہ مر مٹا تھا ظفرؔ
کہ میرے چاروں طرف ہالہ ہَوا بھی نہ تھا

ظفر اقبال

(۳)

میَں، یوں تو نہیں ہے کہ محبت میں نہیں تھا
البتہ کبھی اتنی مصیبت میں نہیں تھا

اسباب تو پیدا بھی ہوئے تھے، مگر، اب کے
اُس شوخ سے ملنا مری قسمت میں نہیں تھا

طے میَں نے کیا دن کا سفر جس کی ہوس میں
دیکھا تو وہی رات کی دعوت میں نہیں تھا

اِک لہر تھی، غائب تھی جو طوفانِ ہَوا سے
اِک لفظ تھا جو خط کی عبارت میں نہیں تھا

کیفیتیں ساری تھیں فقط ہجر تک اُس کے
میَں سامنے آکر کسی حالت میں نہیں تھا

بدلے گئے احساس کے انداز ہی اب کے
دریا کا بیاں دل کی حکایت میں نہیں تھا

بے ربط سا اِک شور رہا شہر میں کچھ دن
میَں تھا بھی یہاں پر تو حقیقت میں نہیں تھا

کیا رنگ تھے جو لہرائے جو بے راہروی میں
کیا نُور تھا جو شمعِ ہدایت میں نہیں تھا

لغزش ہوئی کچھ مجھ سے بھی طغیانِ طلب میں
کچھ وہ بھی، ظفرؔ، اپنی طبیعت میں نہیں تھا

(۴)

اب کے اُس بزم میں کچھ اپنا پتا بھی دینا
پاؤں پر پاؤں جو رکھنا تو دبا بھی دینا

یونہی انجان بنا رہتا ہے، دل کا احوال
لاکھ ظاہر بھی ہو چہرے سے، سُنا بھی دینا

شبِ انکار ہے اور روشنیٔ شعلۂ دل
ڈھب پہ آجائے تو یہ شمع بجُھا بھی دینا

آ نکلتا ہے اِدھر بھی سو غنیمت ہے بہت
وہاں جانے کا گِلہ تو اُسے کیا بھی دینا

اُس کی تائید تو کرنی ہی پڑے گی آخر
منہ سے جو کچھ بھی کہو، ہاتھ اُٹھا بھی دینا

دل کہاں ہے، کبھی اس شے کا لگانا بھی سُراغ
ہاتھ لگ جائے تو یہ خاک اُڑا بھی دینا

دشتِ دشوار کو آسان بھی کرنا مجھ پر
سانپ اگر راستہ روکے تو عصا بھی دینا

راستی پر ہوں، مجھے اور بھی کرنا محکم،
اور، اگر حرفِ غلط ہوں تو مِٹا بھی دینا

اتنے چہروں میں اُسے ڈھونڈ ہی لیتے یوں بھی
کیا ضروری تھا، ظفرؔ، اُس کو صدا بھی دینا

ظفر اقبال

(۵)

کھُلا بھی موسمِ جاں، قرضِ دل ادا بھی ہُوا
جو کام عہدِ ہوس میں نہ ہو سکا بھی ہُوا

نہاں جو رنگِ رواں تھا سکوتِ صحرا میں
اُسی کا جلوہ سرِ ساحلِ صدا بھی ہُوا

بساطِ مدرسہ اُس نے لپیٹ دی آخر
کہ تھا وہ روشنیٔ طبع سے ڈرا بھی ہُوا

لُٹا ہے رنجِ سفر عکسِ عافیت کے سبب
متاع بھی گئی، نقصانِ بوریا بھی ہُوا

بچا سکے کوئی آنکھیں کہاں بکھرنے سے
کبھی تو اُس کی طرف ہم نے دیکھنا بھی ہُوا

وہ مجھ کو چھوڑنے آیا تھا دُور تک، لیکن
مِلا تھا جیسے اُسی ناز سے جُدا بھی ہُوا

جہاں کہیں بھی ہے، وہ خوش رہے، وہ آئے تو سہی
اگر نہیں ہے مرے رُو برُو تو کیا بھی ہُوا

کہیں ٹھہر تو سہی اے دلِ تُنک تعبیر
مقابل اب کے تو اِک خوابِ خوشنما بھی ہُوا

اُڑے نہیں خس و خاشاک ابھی قفس کے ظفرؔ
اگرچہ شہر میں ہنگامۂ ہوا بھی ہُوا

(۶)

قافیے کی بند گلیوں کا گداگر کر دیا
اُس نے کیسے کام پر مجھ کو مقرر کر دیا

ہم کئی سے تھے، اور، ہمارے راستے بھی تھے کئی
وہ اکیلا تھا سو اُس نے معرکہ سَر کر دیا

جا بجا یہ ڈھول کے دھبے، دھوئیں کی دھاریاں
آسماں کا آئینہ کس نے مکدّر کر دیا

جس نے چوری کی تھی، سو بچا، سو پڑا چھوڑا اُسے
جو سڑک پر جا رہا تھا اُس کو اندر کر دیا

چھت زمیں پر آ رہی، نازک تھے شہتیر اس قدر
گِر پڑی دیوار بھی، ایسا پلستر کر دیا

روشنی اب راہ سے جھلکا بھی دیتی ہے میاں
اُس کی آنکھوں کی چمک نے مجھ کو بے گھر کر دیا

زحمتِ خواب اس کے سفر میں تھا مجھے کافی، مگر
خارزارِ خاک نے چلنا ہی دوبھر کر دیا

مَیں نے خود سے بھی چھُپا رکھا تھا زنگارِ دل
اُس کی طبعِ خام نے سب پر اُجاگر کر دیا

جھوٹ موٹ، آخر گلے مِل کر، بزعمِ خود ظفرؔ
اگلا پچھلا سب حساب اُس نے برابر کر دیا

ظفر اقبال

(۷)

توڑ ڈالیں سب حدیں اور مسئلہ حل کر دیا
خود بھی سودائی ہوئے اُس کو بھی پاگل کر دیا

ٹوٹ کر اُبھی بدن سے وصل کی سرکش ہَوا
ایک ہی جھونکے نے کیا جنگل میں منگل کر دیا

تحفۂ داغِ تمنا شاہی سے ہم خوش تھے بہت
اب کے اس نے عطر بھی رُومال پر مَل کر دیا

تھا، مگر، بارِ سفر اتنا نہ تھا پہلے کبھی
اِک ذرا سی آرزو نے دل کو بوجھل کر دیا

ایک دُھندلے نقش نے صحرا کو بخشا اضطراب
ایک زریں لہر نے دریا کو بے کل کر دیا

دیکھنا حسنِ کرامت، اِک نگاہِ نرم سے
بیرِ کال نے مرے سونے کو پیتل کر دیا

شعبدوں کے شور میں انسان سارے رہ گئے
معجزوں کی مار نے لمحے کو مہمل کر دیا

اُڑتے پھرتے سر میں رنگا رنگ ٹکڑے اَبر کے
ایسے ٹکرائے کہ پیشانی کو جل تھل کر دیا

خاتم الشعرا ہمیں مانیں نہ مانیں وہ، ظفر
شاعری کے دین کو ہم نے مکمل کر دیا

(۸)

دل میں ہوتی ہے خلا کی آہٹ
خاک پر چھائی فضا کی آہٹ

پھیل جاتے ہی دھواں آنکھوں میں
کان پڑتی ہے گھٹا کی آہٹ

سانپ سایوں میں سرکتا ہے کبھی
کبھی آتی ہے عصا کی آہٹ

کھل گئے گھر کے سبھی دروازے
آئی جب سیلِ بلا کی آہٹ

منظرِ سحرِ خزاں کے پیچھے
کھو گئی سبز ہَوا کی آہٹ

سفرِ شوق کے آغاز میں ہی
آ گئی لغزشِ پا کی آہٹ

جاگ اُٹھتے ہیں عجب دیوانے
اور، ہوتی ہے عجب کی آہٹ

موسمِ قحطِ ہَوا میں کبھی سُن
لرزشِ برگِ نوا کی آہٹ

خلق ہیبت زدہ سنتی ہے ظفر
آسمانوں پہ خدا کی آہٹ

ظفر اقبال

(۹)

جن کے رہتا ہے خود بیان میں نقص
کھوجتے ہیں مری زبان میں نقص

تھے بہت وہ بھی نیند کے ماتے
اور، تھا اپنی بھی اذان میں نقص

آنکھ سے دیکھتا ہوں، سُنتا بھی
جب سے پیدا ہُوا ہے کان میں نقص

تیر لگنے لگا نشانے پر
پڑ گیا کیا کوئی کمان میں نقص

صاف جب تک کہ خود نہیں ہوتے
نظر آئے گا اک جہان میں نقص

دل میں وہ میہماں نہیں ہوتا
رہ گیا کیا کہیں مکان میں نقص

ذائقہ منہ کا ہے خراب اب تک
تھا کوئی اُس کے پاندان میں نقص

نام دس بیس اگر نہ گِنوائے
آئے نقّاد کی دکان میں نقص

دھوپ اندر کی تیز تر ہے ظفر
کیا بتاتے ہو سائبان میں نقص

(۱۰)

کچھ ہوئے خوفِ خطا سے ناراض
اور باقی ہیں سزا سے ناراض

برگ و بار اپنے پہ قابو ہی نہ تھا
اور، رہتے تھے ہُوا سے ناراض

آنکھ بیزار ہے منظر سے بہت
کان ہیں سیلِ صدا سے ناراض

ایک ہے اپنے لیے ردّ و قبول
ہم کہ ہیں دستِ دعا سے ناراض

کیا ہمیں زعمِ کلیمی ہو یہاں!
ہم کہ پھرتے ہیں عصا سے ناراض

نقش خود مست ہے، لیکن ہے ابھی
عکسِ آئینہ نما سے ناراض

بحر ہے آبِ گہر سے ناخوش
دشت نقشِ کفِ پا سے ناراض

ظلمتِ شوق میں سونے والے
ہُوئے اک ضربِ ضیاءُ سے ناراض

خوب اپنی بھی گزرتی ہے، ظفر
خلق سے بَیر، خدا سے ناراض

تجزیے

ریگِ رواں

مصنف : صادق نسیم   مبصّر : محب عارفی

موزوں کلام کے وسیلے سے شاعر اپنی تخلیقی بے چینی میں با اہلیت قارئین کی قرار واقعی شرکت حاصل کرلے، شاعری اسی کا نام ہے۔ اس شرکت سے ایک طرف شاعر کی تخلیقی بے چینی تسکین پاتی ہے، دوسری طرف با اہلیت قارئین کا ذوقِ شعری۔ شاعری کا اصل فائدہ یہی ہے۔ یعنی شاعری اپنا جواز آپ ہے۔ یہ شرکت جسے حاصل ہوگی وہی جان سکتا ہے کہ یہ کس نوعیت اور کس درجے کی ہے۔ چنانچہ کون سی شاعری کس درجے کی ہے اس کا فیصلہ با اہلیت قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ اُن کے فیصلے ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں اس لیے کہ منطقی دلائل پر مبنی نہیں ہوتے۔ اس اختلاف سے مفر نہیں۔ تاہم اس اتفاقِ نوعیت کے یہ معنی نہیں کہ ہر نوع کی شاعری کے بارے میں ہر قبیل کے قارئین کی رائے وقیع ہوگی۔ سخن سنجی کے لیے کوئی عام استعمال کا فارمولا تو نہیں بنایا جا سکتا، لیکن ذوقِ شاعری کے فرقِ مراتب کا اندازہ کچھ نہ کچھ لگایا جا سکتا ہے۔ کسی شاعری کے مرتبے کا تعین کرنے والا صرف اس شاعری کے مرتبے کا اعلان نہیں کرتا، اپنے ذوقِ شعری کے مرتبے کا بھی انکشاف کر دیتا ہے۔ معقولیت کی نظر میں، کسی شاعری کا صحیح رتبہ متعین اس سے ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کس پائے کے ذوقِ شعری کے لیے باعثِ تسکین ہے یعنی قارئین کا وہ طبقہ جو اعلیٰ ترین ذوقِ شعری کا حامل ہو جس شاعری کا جو مرتبہ متعین کرے گا اس شاعری کا وہی مرتبہ ہوگا۔ قارئین کی عمومیت کی انفرادی رائیں اگر کچھ اور ہوں گی تو انہیں معقولیت کے فیصلے کے آگے ایک نہ ایک دن سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ آج تک یہی ہوتا آیا ہے۔ قرینِ قیاس ہے کہ آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔

میرے نزدیک، فنِ شاعری کے بارے میں مذہبِ معقولیت یہی ہے۔

شاعری کی وساطت سے شاعر اپنی تخلیقی بے چینی میں با اہلیت قارئین کی قرار واقعی شرکت حاصل کرنے کی کوشش تو مقدور بھر کرتا ہے لیکن اس میں کامیابی کبھی زیادہ کبھی کم ہوتی ہے۔ کوئی شاعر زیادہ سے زیادہ کتنے بلند مرتبے کی شاعری تخلیق کر سکتا ہے، یہ بالعموم اس کے نظامِ شعور، مبلغِ مشاہدہ و مطالعہ، مشق اور انہماک پر منحصر ہوگا۔

لیکن کسی شاعر کی ساری شاعری ایک ہی مرتبے کی نہیں ہوتی، ہاں، ان شاعروں سے قطع نظر جو پستش بہ غایت پست و بلندش بہ غایت بلند" کے زمرے میں آتے ہیں۔ سچے اور اچھے شاعروں کے ہاں بلند و پست میں عموماً زمین و آسمان کا فرق نہیں پایا جاتا۔ لیکن بعض اچھے اور سچے شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی اوسط درجے کی سطح پر کم و بیش یکساں رفتار سے چلتے چلتے اچانک چھلانگ لگا دیتے ہیں میوۂ سرِ شاخِ بلند" توڑ لاتے ہیں۔

اس چھلانگ لگانے کے عمل کا تجزیہ کرنا مشکل ہے۔ فکرِ سخن گویا شاعری کے قفلِ ابجد کے چھلّے گھمانے میں منہمک رہتی ہے کہ دفعتہً بات بن جاتی ہے اور معاً تالا کھل جاتا ہے، بہرحال ایسی چھلانگوں سے جو شہ پارے وجود میں آجاتے ہیں، عموماً جلد یا بدیر قبولِ عام کی سند حاصل کرلیتے ہیں۔ بشرطیکہ انہیں با اہلیت قارئین کی عمومیت تک پہنچ پانے کے موثر وسائل میسر آجائیں، اگرچہ لازمی نہیں کہ ایسا ہر شعر پارہ بہ حیثیت مجموعی ہمیشہ اول درجے کی چیز ہو یا اس کا خالق ہمیشہ صفِ اول کا شاعر ہو۔ ایسے پھڑکتے ہوئے چند شعر پارے کسی اوسط درجے کے شاعر کے مجموعے میں نظر آجائیں تو وہ گویا اس مجموعے کا حاصل ہوں گے۔

غزلوں کے نئے مجموعے آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں خاصی تعداد ایسی غزلوں کی مل جائے گی جو کسی اعتبار سے پست نہیں کہی جا سکتیں لیکن مذکورہ بالا قسم کے پھڑکتے ہوئے شعر پارے ان میں کم ہی ملیں گے۔ مجھے یہ مایوسی، غزل کے مسلم الثبوت فن کار مرحوم حفیظ ہوشیارپوری کے مجموعے کو پڑھ کر بھی ہوئی۔

"ریگِ رواں" غزلوں کا ایک مختصر مجموعہ ہے لیکن اس میں مذکورہ نوع کے پھڑکتے ہوئے شعر پارے اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں: مثلاً:-

آنکھ کھولی تو عجب رنگ اسی خاک میں تھے
ذرے ذرے نہ تھے آئینے مری تاک میں تھے

اب بھی ہے وہاں ستاروں اندھیرا
ہم لوگ جہاں جہاں نہیں ہیں

خود اپنے آپ میں جھانکوں تو میں بھی بیٹھ رہوں
نگاہ خود سے ہٹاؤں تو چار سو بھی میں

جن ستاروں کو خدا ان کے پہ جاتا تھا کبھی
اب انہیں پر مرے قدموں کے نشاں بھی ہوں گے

میرے لیے معلوم ہے ظلمت بھی ضیا بھی
میں صبح کے تارے کی طرح ڈوب رہا ہوں

بہ فیضِ موج نکھرتا ہے میرا حسنِ تراش
کہ ایک عمر سے میں سنگِ راہِ دریا ہوں

ہمیں یہ دکھ کہ نمودِ سحر نہ دیکھ سکے
سحر کو ہم سے شکایت کہ تا سحر نہ جلے

تمام دن کی مسافت گزار کر ہر شب
لگے جو آنکھ تو [illegible] میں بھی سفر دیکھوں

اس کو میں کوئی اور تو منزل کی سمت جائے
خود کو نگاہ [illegible] دکھائی دے

تند ہے اتنی گلستاں کی ہوا
پتہ پتے سے [illegible] جیسے

قریب آئے تو گم کردہ رہ دکھائی دیے
جو دور سے نظر آتے [illegible] کی طرح

دل کبھی غنچہ بدستاں کبھی خاک بسر
ابھی گلزار کی [illegible] کی طرح

تمہاری بزم سے اٹھنے کا بھی خیال مجھے
ذرا سی دیر ٹھہرنے کا [illegible] میں

اس بزم کی کشش ہے کہ اپنی نظر کا شوق
ہر راستہ [illegible] کو جانا [illegible] سے

مری نگاہ کا انداز اور ہے ورنہ
تمہاری بزم [illegible] میں بھی دوسروں کی طرح

میں عہد ضبط پہ قائم بھی تھا دمِ رخصت — سرِ مژہ قدمِ اشک لڑکھڑا بھی گیا

تمہارا نام کسی اجنبی کے لب پر تھا — ذرا سی بات تھی دل کو مگر لگی ہے بہت

مری کمی سی تجھے محسوس ہو رہی تھی جہاں — وہیں پہنچ کے تری راہ عمر بھر دیکھوں

اہلِ محفل کبھی آئیں مجھے تنہا دیکھیں

ستارے جس کے عناں گیر ہیں وہ ذرہ ہوں

ان شعرپاروں کو میرا ذوقِ شعری راب وہ جیسا کچھ بھی ہو) اردو کے فنا ناپذیر سرمایۂ غزل میں گراں قدر اضافہ تصور کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ میرا ذوقِ شعری اس میں حق بجانب ہے کہ نہیں اس کا فیصلہ مستقبل ہی کر سکتا ہے، دلائل نہیں کر سکتے۔

اضافہ: کچھ دنوں سے ہمارے نقادوں میں یہ خیال رواج پا رہا ہے کہ اضافے کا اطلاق صرف اس شاعری پر ہونا چاہیے جو ہماری روایات کی حدود کو آگے بڑھاتی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی شاعری کو صرف روایات میں اضافہ تصور کرنے پر اکتفا کیوں نہ کیا جائے؟ اور ہر اضافہ، روایات ہی میں اضافہ کیوں ہو؟ روایات کے دائرے میں رہتے ہوئے ایسی شاعری کیوں تخلیق نہیں کی جا سکتی جو ہمارے ذوقِ شاعری کے سامانِ تسکین کی پہلے سے موجود مقدار میں اضافہ کرتی ہو؟ مرزا غالب کی ایک مقبول غزل ہے: ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے۔ اگر اس انداز کی چند اور غزلیں مرزا کہہ گئے ہوتے تو کیا ہمارا گراں قدر ذخیرۂ غزل جتنا اس وقت ہے اس سے زیادہ نہ ہوتا؟ شاد عظیم آبادی کا یہ مصرع موجود تھا، نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم اور بہت پہلے میر تقی میر کہہ چکے تھے: اک وہم نہیں بیش مری ہستی موہوم۔

یہ دونوں مصرعے فانی بدایونی کے پیشِ نظر تھے جب انہوں نے یہ مطلع کہا:

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

کیا یہ مطلع اردو کے سرمایۂ غزل میں گراں قدر اضافہ نہیں تھا۔ حالانکہ ظاہر ہے اس سے کسی اعتبار سے ہماری روایات کے دائرے کی کوئی توسیع نہیں ہوئی۔

با اہمیت قارئین کے لیے "رنگِ رواں" میں بہت سی دل آویزیاں ہیں لیکن ان کا احاطہ کرنا اور تفصیلی جائزہ لینا فی الحال میرے مدِ نظر نہیں۔ یہ کام ان شاء اللہ کبھی آئندہ کروں گا۔ اس ابتدائیے میں صرف چند چوٹی کے شعرپارے درج کر دینے پر میں نے اکتفا کیا ہے۔ انہیں دیکھ کر اہلِ نظر کچھ اندازہ کر سکیں گے کہ جس دودھ سے یہ بالائی برآمد ہوئی ہے وہ دودھ کیسا ہوگا۔

آخر میں صادق نسیم کو ایک مشورہ دینے کی جسارت کرتا ہوں۔ ان کے وہ چھڑکتے ہوئے شعرپارے جو میں نے اس ابتدائیے میں درج کیے ہیں اور اسی نوعیت کے چند اور وہ جو "رنگِ رواں" میں ضرور موجود ہوں گے لیکن جن پر سے میری ابتدائی نظر پھسل کر گزر گئی ہوگی، قبولِ عام کی سند حاصل کر لینے کی صلاحیت میرے

خیال میں بدرجہ اتم رکھتے ہیں لیکن اس امکان کے بروئے کار آنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں با اہلیت قارئین کی عمومیت تک پہنچنے کے لیے موثر وسائل حاصل ہو جائیں۔ ان وسائل پر جن لوگوں کا آجکل قبضہ ہے وہ عبدالقادر مرحوم یا نیاز فتح پوری جیسے عالی ظرف اہل ذوق نہیں ہیں کہ فن کار کے با اثر یا ہم مسلک ہونے نہ ہونے سے بے نیاز ہو کر صرف فن کے ذاتی حسن و قبح سے غرض رکھیں۔ آپ کسی تبلیغی تحریک سے وابستہ نہیں ہیں، نہ شہرت بخشی کے اجارہ داروں کے حاشیہ بردار ہیں۔ بدھو، نتھو، خیرو بھی آپ نہیں ہیں کہ آپ کی شاعری کا زیادہ چرچا ہونا بھی اجارہ داروں کے لیے کسی تشویش کا باعث نہ ہو۔ یہ اجارہ دار، شہرت کی ٹرین کے ڈبوں کے اندر اپنے حق سے زیادہ جگہیں دبائے بیٹھے ہیں۔ ان کے لیے تقاضائے حفظ ماتقدم ہے کہ بھاری بھرکم نو واردوں کو اپنے ڈبوں میں داخل ہونے سے حتی الامکان باز رکھیں تاکہ خود سکڑ کر بیٹھنے پر کہیں مجبور نہ ہونا پڑا۔ ایک خاص طرز شاعری کے موجد، شاد عارفی کو نظر انداز کر کے ان کے ایک بھونڈے نقال راجہ مہدی علی خاں کا ڈھنڈورا پیٹنے والے مشاہیر سے آپ واقف ہوں گے۔ ایسے ڈھنڈورچیوں کے مداح نگاروں میں شامل ہو جائیے۔ یہ لوگ بہت دور اندیش نہیں ہوتے۔ خود پسندی کے نشے میں وہ کچھ کر بیٹھیں گے کہ آپ کی شاعری کا ملک بھر میں چرچا ہو جائے۔ اقرار واقعی مقبولیت پھر وہ خود ہی حاصل کرے گی۔

OO

صلو علیہ و آلہ

مصنف: حفیظ تائب　　　　مبصر: پروفیسر اسلوب احمد انصاری

نعت گوئی میں حضرت حسان انصاری اور جامی کو اپنی اپنی جگہ جو امتیاز حاصل ہے وہ عربی اور فارسی زبانوں سے شغف رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اردو میں بھی اس صنف شعر گوئی کی روایت خاصی پرانی ہے اور تاریخی اعتبار سے اس میں محسن کاکوروی کا کارنامہ قابل لحاظ ہے۔ انگریزی ادب میں حضرت عیسیٰ مسیح کی شخصیت سے متاثر ہو کر جو شعری سرمایہ وجود میں آیا ہے، وہ توجہ کو اپنی جانب کھینچتا ہے، خصوصاً ان کے مصلوب کئے جانے کے واقعے نے تو ایک شعری محرک (MOTIF) کی حیثیت اختیار کر لی ہے، اور اینگلو سیکسن ادب سے لے کر موجودہ دور تک کے ادب میں اس کی پرچھائیاں نظر پڑتی ہیں۔ یہ فرض کر لینا کہ مذہبی جذبے کی شاعری، اعلیٰ اور کھری شاعری نہیں ہو سکتی، محل نظر ہے اور عصبیت کی چغلی کھاتا ہے۔ اصل معاملہ احساس کی شدت اور اس کے مکمل شعری اظہار کا ہے۔ بہ الفاظ دیگر جس موضوع پر شعری کارنامہ وجود میں لایا جا رہا ہے اگر وہ پوری طرح شعور کی گہرائیوں میں جذب ہو چکا ہے اور اس نے شعری حس کی

خاص حد تک تحریک کیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسی شاعری میں اپیل نہ کر سکے، صلو اعلیہ و آلہٖ کا جو حفیظ تائب کے نعتیہ کلام کا ایک دلکش مجموعہ ہے، سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں محض رسمی انداز اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ جذب جذبات کی پیش کش انتہائی عقیدت مندی اور سلیقے کے ساتھ کی گئی ہے۔ رسمی نعتیہ کلام ایک خاص روایت کا پابند ہو کر رہ گیا ہے جب تک روایت کی نئے فکر و احساس کے مطابق تجدید نہ ہوتی رہے وہ رفتہ رفتہ بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ زیر نظر مجموعے میں عقیدت مندی اور شعری احساس باہم دگر آمیز کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں کہیں بھی نبی کریمؐ کا سراپا نہیں بیان کیا گیا، اور ایسا کیا بھی نہیں جانا چاہیے کیونکہ یہ سوئے ادب ہے اس میں عزت و احترام کا اس حد تک لحاظ رکھا گیا ہے، کہ اسے کہیں بھی انسانی تعلقات کے لوازمات سے ملوث نہیں ہونے دیا گیا۔ نعت گوئی کی شاعری، موثر بننے کے لئے بنیادی حزم و احتیاط کا مطالبہ کرتی ہے یعنی اس میں نبی کریمؐ کی شخصیت کے نقوش کو ابھارنے کے باوجود نعت گوئی اسے محض انسانی سطح پر نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ تقدس کے احساس (THE SENSE OF THE SACRED) کو نمایاں کرنے پر اصرار کرتی ہے اور یہ محض عقیدت مندی سے بلند تر شے ہے۔ یعنی یہ DEVOTIONAL شاعری پر ایک اضافے کا حکم رکھتی ہے اور اس کا بھی مطالبہ کرتی ہے کہ یہ آپ کے پیام اور آپ کی تعلیمات کے آفاقی پہلو کو بھی روشنی میں لائے۔ حفیظ تائب کے اندازِ بیان کا ایک نمونہ جو اپنی انفرادیت رکھتا ہے، مندرجہ ذیل تراشے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بادِ رحمت سنک سنک جائے ــــ وادیٔ جاں مہک مہک جائے

ماہِ طیبہ کا جب خیال آئے ــــ شب ہجراں چمک چمک جائے
جب سمائے نظر میں وہ پیکر ــــ ذہن میرا دمک دمک جائے
فیضِ چشمِ حضورؐ کیا کہنا ــــ ساغرِ دل چھلک چھلک جائے
نام پاک ان کا ہو لبوں سے ادا ــــ شہد گویا ٹپک ٹپک جائے
ارضِ دل سے اٹھے نوائے درد ــــ گونج اس کی فلک فلک جائے

ایک اور نعت میں جو لمبی بحر میں ہے، ان جذبات کی عکاسی کی گئی ہے جو نبی کریمؐ سے شغف کی بنا پر دل و دماغ پر طاری رہے ہیں۔ اس نعت کے اشعار میں ایک دراز ہو جانے والی کیفیت ہے۔ اور اس پر اقبال کا اثر خاص طور پر نمایاں ہے یہاں عقیدت مندی ایک عمل استغراق کے زیر اثر رہنے کے بعد ابھری ہے۔

رہی عمر بھر جو انیسِ جاں، وہ بس آرزوئے نبیؐ رہی
کبھی اشک بن کے رواں ہوئی، کبھی درد بن کے دبی رہی

سرِ دشتِ زیست برس گیا جو سحابِ رحمتِ مصطفٰے
نہ خرد کی بے ثمری رہی نہ جنون کی تشنہ لبی رہی
رہا انتشار تیرگیٔ فتن، نہ بھٹک سکا مرا فکر و فن
مری کائنات خیال پر نظرِ نشۂ عربی رہی
وہ صفا کا مہرِ منیر ہے، طلب اس کی نورِ ضمیر ہے
یہی روزگارِ فقیر ہے، یہی التجائے شبی رہی

شخصی صفات کو آپ کے پیام کے عالمگیر اثرات میں سمو کر اس طرح بیان کیا ہے:

یوں ذہن میں جمالِ رسالت سما گیا — میرا جہانِ فکر و نظر جگمگا گیا
خلقِ عظیم و اسوۂ کامل حضور کا — آدابِ زیست سارے جہاں کو سکھا گیا
اس کے قدم سے پھوٹ پڑا چشمۂ بہار — وہ دشتِ زندگی کو گلستاں بنا گیا

آخری شعر سے شاعر جرمن گوئٹے کی لافانی نظم نغمہ محمد MUHAMMED THE SONG OF کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس میں چشمے کے لفظی پیکر پر پوری نظم کی بنیاد رکھی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ یہ چشمہ کس طرح چھوٹے چھوٹے چشموں کو ساتھ لے کر آگے بڑھتا ہے اور پوری کائنات کو شادابی اور سرسبزی سے بھر دیتا ہے ایک اور نظم میں نہ صرف ذاتی اور نجی عقیدت کے پھول آپ کی بارگاہ میں پیش کئے گئے ہیں بلکہ اس تصور کو سامنے لایا گیا ہے کہ نبی کریمؐ کی ذاتِ اقدس پوری نسل انسانی کے لئے رحمت و برکت کا منبع و مخرج تھی۔

شفاف پن (TRANSPARFACY) اور اندازِ بیان کی ندرت کے مابین ایک تفاعل باہمی نظر آتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

لب پر نبی کا اسم مبارک رواں ہوا — ہر سانس فرطِ شوق سے نکہت فشاں ہوا
سمٹا ہوا تھا غارِ حرا میں جو نورِ پاک — روشن اسی سے دہر کراں تا کراں ہوا
اس کے کرم سے سرو چراغاں ہے نخلِ درد — اس کے قدم سے دشتِ وفا گلستاں ہوا
سچ لب گئیں خیال میں اس کی لطافتیں — تاب میں بے نیازِ بہار و خزاں ہوا

ایک اور نظم میں بیباکت اور موانست کو ایک طرف اور حزم و احتیاط کو دوسری طرف اس طرح پہلو بہ پہلو رکھا گیا اور ان کے درمیان اس طرح توازن قائم کیا گیا ہے۔

شوقِ نیاز و عجز کے سانچے میں ڈھل کے آ — یہ کوچۂ حبیب ہے پلکوں سے چل کے آ
امت کے اولیا بھی ادب سے یہاں دم بخود — یہ بارگاہِ سرورِ دیں ہے سنبھل کے آ
آنا ہے تو جو شہرِ رسالت مآب میں — حرص و ہوا کے دام سے باہر نکل کے آ

شورو تپش سخن میں اگر چاہتا ہے تو ۔۔۔ عشق نبی کی آگ سے تائبؔ پگھل کے آ

اور ایسا لگتا ہے کہ واقعی تائبؔ کے کلام کی تازگی اور تپش عشقِ نبی کی آگ میں جلنے سے پیدا ہوئی ہے
'صبح سعادت' کے عنوان سے ایک اور نعت میں نبی کریم کی شخصیت کی ہمہ گیری اور آپ کے پیام سعادت کی آفاقیت کو اس طرح اجاگر کیا ہے۔

بطحا کی وادیوں سے نمود سحر ہوئی ۔۔۔ آرائشِ حیات بہ رنگِ دگر ہوئی
ناگاہ تیرگی کی ردا چاک ہو گئی ۔۔۔ ہیشِ نگاہ مطلعِ انوار آ گیا
اسلوبِ زندگی کا ہوا دلکش و حسین ۔۔۔ امن و سلامتی کا علَم بردار آ گیا
سلجھیں تمام گیسوئے حکمت کی الجھنیں ۔۔۔ جیسے دہر میں وہ کاشفِ اسرار آ گیا
دم توڑتی حیات کی نبضیں سنبھل گئیں ۔۔۔ تقدیر کے ستاروں کی راہیں بدل گئیں

ایک اور نعتیہ نظم کے پہلے حصے میں جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

محفل دہر کا پھر عجب رنگ ہے ۔۔۔ زندگی کا چلن سخت بے ڈھنگ ہے

اس کے مندرجہ ذیل تین اشعار میں اس ظلمت و تاریکی، جمود اور انحطاط کی عکاسی کی گئی ہے جو نبی کریم کی بعثت سے پہلے ساری دنیا، اور خصوصاً خطۂ عرب میں موجود تھی۔

سحر زدہ ہے پتھر ضمیرِ جہاں ۔۔۔ عرصۂ زیست نادار پر تنگ ہے
پھول ہیں ہر ہوس کار کے واسطے ۔۔۔ اہلِ حق کے لئے بارشِ سنگ ہے
تار الجھے ہوئے سازِ ہستی کے ہیں ۔۔۔ بے اثر پھر صداقت کا آہنگ ہے
انبیا میں عدیم النظر آپ ہیں ۔۔۔ زیست پیکر ہے اس کا ضمیر آپ ہیں
سرورِ کائنات آپ کی ذات ہے ۔۔۔ بے نیاز سپاہ و سریر آپ ہیں
آپ ہیں خیر و برکت کی بادِ خنک ۔۔۔ جود و رحمت کا ابرِ مطیر آپ ہیں
روشنی جس کی مدھم نہ ہوگی کبھی ۔۔۔ وہ ہدایت کا مہرِ منیر آپ ہیں

عقیدت مندی کا اظہار متنوع انداز میں کیا گیا ہے اور اس کے نقوش رنگا رنگ ہیں سادگی کا ایک رُخ دیکھئے:

وقفِ ذکر شہِ حجاز رہوں ۔۔۔ ایک ہی لے میں نے نواز رہوں
کام عشقِ رسول کرنا ہے ۔۔۔ اسی دھن میں سخن طراز رہوں
لذتِ ذکر سے رہوں سرشار ۔۔۔ تپشِ فکر سے گداز رہوں
درِ اقدس کی چاکری چاہوں ۔۔۔ یوں طلبگارِ برگ و ساز رہوں

سرشاری کا دوسرا رخ، جس میں کسی قدر اہتمام و انصرام کو بھی دخل ہے، اس طرح ظاہر ہو رہا ہے۔

ہجوم رنگ ہے میری حال آنکھوں میں — بسا ہے جیسے ریاض وصال آنکھوں میں
تصورات کے صحرا میں وہ حرم ابھرا — کھلے گلاب ہری دھول دھول آنکھوں میں
فضائے فکر و نظر دھل کے ہو گئی اجلی — ہوا وہ رحمت حق کا نزول آنکھوں میں
ہری کریگا وہی شاخ آرزو تا ابد — کھلائے جس نے عقیدت کے پھول آنکھوں میں

اس سے زیادہ گہرا رنگ، جس میں سادگی اور شعوری اظہار جذبات کو باہم دگر آمیز کیا گیا ہے، ان تین اشعار میں جھلکتا ہے۔

ڈال کر ایک نظر روح کی پہنائی میں — اس خرابے کو سخن زار بنانے جاتے
نمار کو چشمۂ انوار بنانے والے — افق دل سے بھی مہتاب اگاتے جاتے
اس خنک شہر کو جاتی ہوئی اے نرم ہوا — ساتھ لے جا مرے جذبات بھی گاتے جاتے

ایک اور نظم میں جذبات زیادہ کڑھے ہوئے اور صیقل شدہ نظر آتے ہیں۔ یہاں لہجہ تمام تر ذاتی اور موضوعی ہے جو نعت گوئی میں ہونا ہی چاہیئے اور انداز بیان ایسا ترشا ہوا ہے، جو رواتی نعت گوئی سے ممیز ہے یہاں جذبہ شعری ادراک کی بھٹی میں تپ کر کندن بن گیا ہے۔

رونق عالم رنگ و بو آپ ہیں — جلوہ پیرائے ہر کاخ و کو آپ ہیں
موج در موج فیضان ہے آپ کا — ساحل قلزم آرزو آپ ہیں
آپ ہیں حوصلہ مجھ گراں بار کا — مجھ زیاں کار کی آبرو آپ ہیں

ایک اور نعت میں یہ لہجہ نہ صرف نکھرا ہوا ہے، بلکہ اس میں انتہائی تشدید-INITENSIFICATION پیدا ہو گئی ہے اور اس میں ایک عنصر آفاقیت کا بھی ابھر آیا ہے۔ یہاں انفرادی جذبے کی اختصاصیت اور

اور دوسرے حصے میں ان اثرات کی نقش گری کی گئی ہے، جو آپ کی تعلیمات کے زیر اثر رونما ہوئے یہ تسلیم کرنا بہر صورت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شعری اعتبار سے پہلا حصہ، دوسرے حصے کی نسبت زیادہ موثر اور دقیع تر ہے، نعت گوئی کی صنف میں یہ مجموعہ، جس میں جذبات عقیدت کو انتہائی سلجھے اور ٹھہرے ہوئے انداز میں پیش کیا گیا ہے ایک خاص امتیاز کا حامل ہے اور

اس امر کا وافر ثبوت فراہم کرتا ہے کہ مذہبی ارادت اور جذبے سے لبریز شاعری بھی اچھی شاعری ہو سکتی ہے۔

وصال (مجموعۂ غزل)

مصنف:۔ ناصر زیدی — مبصر:۔ پروفیسر جمیل الرحمٰن

ناصر زیدی ہمارے شعرا کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی بات کہنا بھی جانتی ہے اور منوانا بھی۔
"وصال" تاریخی ترتیب کے اعتبار سے ان کا دوسرا مجموعہ ہے لیکن ادبی ترتیب و تناظر کے اعتبار سے پہلا۔ اس بات کا خود انہیں بھی احساس ہے جس کا تذکرہ انہوں نے اپنے مختصر ترین پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔
"وصال" میں ناصر زیدی کا نے اپنی ابتدائی شعری تربیت کے دور کا کلام بھی یکجا کر دیا ہے اور نیا کلام بھی اس میں شامل ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا ذہنی سفر مکمل ہو گیا ہے یا ان کی تربیت شعری کا تکملہ ہو چکا ہے کیونکہ میرے خیال میں زندگی کی طرح شاعری بھی ایک مسلسل جستجو اور آسودگی کے عمل اور ردِ عمل کا دوسرا نام ہے اور تخلیقی ذہن کا سفر زندگی کے مانند ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

"وصال" کے شاعر کا ذہنی پس منظر بیسویں صدی کے نصف آخر کے عہد کی معاشرتی اور تہذیبی صورتحال سے پیدا ہوا ہے اس لئے وہ اس جذباتی اور احساساتی فضا سے منسلک نہیں جو اس صورتِ حال کے نتیجے میں موجود پذیر ہوتی ہے۔ وہی خواب و خیال، وہی نا آسودگی، وہی ذہنی کیفیت، وہی جذباتی اور احساساتی فضا جو ہر حساس نوجوان ذہن کا مقدر ہے ناصر زیدی کے ہاں بھی موجود ہے، اقدار کی شکست و ریخت سے لے کر ذاتی محبتوں، شکستوں، نامرادیوں، کامرانیوں اور ناکامیوں کے قصے، ہجر و وصال کی کہانیوں میں اپنا احساس شامل کرنے کا تجربہ۔ تجزیۂ ذات، یہی سب کچھ ان کی شاعری کے موضوعات ہیں اور ناصر زیدی نے اپنے انداز میں ان سے ایک تخلیقی رویہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

ناصر زیدی کے اس مجموعے کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس میں ناصر زیدی نے حمد و نعت اور سلام کے علاوہ ذاتی رومانوی نظموں اور قومی موضوعات پر لکھی جانے والی نظموں کو شامل کر کے اسے اصناف کا نگارخانہ بنا دیا ہے اور اپنی قدرتِ سخن کا ثبوت بھی دیا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے جن نظموں نے اپنی طرف کھینچا ان میں خاص طور پر "تنہا" "اس لڑکی" "ذات کا نوحہ" "سورج سے توانائی کی طلب" اور ملاوز سے تنگ کی تین مختصر نظموں کا ترجمہ قابلِ ذکر ہیں۔

ناصر زیدی کی غزلیں جدید اردو غزل کے مروجہ انداز و آہنگ کی ترجمان ہیں جن میں ذات کے حوالے سے دنیا کو سمجھنے کی کوشش بھی ہے اور روایت سے رشتے کی پاسداری بھی۔ چند شعر جو مجھے بہت اچھے لگے، آپ بھی پڑھ لیجئے ؎

مخالفت بھی ضروری ہے آگہی کے لئے ‏ ‏ ‏ تو اپنے حق میں یہ سارا جہاں کیسے کروں؟

یہ غم نہیں کہ مرا آشیاں رہا نہ رہا — خوشی یہ ہے کہ یہیں برق بے اماں ٹھہری
ہمتِ کوہ شکن ہے مجھ میں — پھر بھی صدیوں کی تھکن ہے مجھ میں
اپنے پھولوں پہ بہت ناز تھا جس ڈالی کو — سر جھکائے ہوئے اب سوچ میں غلطاں کیوں ہے
وہ ایک ہم کہ ہمیں موسموں نے کچھ نہ دیا — کسی کی دھوپ ہوئی اور کسی کے سائے ہوئے

مجموعی طور پر شاعر کے خیالات کے بارے میں مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک نوجوان شاعر کے شعری سفر اور ندرتِ فکر کی حیثیتِ اول ہے جس سے آئندہ کی تعمیر کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ڈوبتے چاند کا منظر (مجموعۂ غزل)

مصنف :- ناصر زیدی مبصر :- عارف عبدالمتین

ناصر زیدی کے اولین مجموعۂ غزل "ڈوبتے چاند کا منظر" کا دوسرا ایڈیشن سامنے ہے اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر زیدی کی شاعری جذبے کے انتشار سے وجود میں آئی ہے اور یہ انتشار ایک ایسی وسعت اور بوقلمونی کا حامل ہے جسے ان لاتعداد پھولوں کے ظہور سے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے جو اپنے اپنے فرد رنگ و بُو کے ساتھ کسی بسیط وادی میں دُور دُور تک قدرتی اور غیر مرتب ترتیب میں بکھرے ہوں، جذبے کے اس انتشار کو ناصر زیدی کی رعنا شخصیت کا تخلیقی جوہر اسی طرح ایک دلآویز وحدت عطا کرتا ہے جس طرح پھولوں کی لامحدود گوناگونی کو بہار کی نورتِ نمو اعتبار یکانگت بخشتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے کلام میں غنچوں کے چٹکنے، شگوفوں کے پھوٹنے اور شبنم کے برسنے کا ایسا احساس ہوتا ہے جو دیدہ و دل شاداب آسودگی ارزانی کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمیں ناصر زیدی کے ہاں صحراؤں کی حدت، پہاڑوں کی سنگینی اور سمندروں کے تموّج کا سراغ بھی ملتا ہے جو حیات و کائنات کے جلالی پہلو کے آئینہ دار ہیں تاہم بنیادی طور پر ان کا فن کون و مکاں کے جمالی رُخ کا عکاس ہے، اس صورت حال کے بدیہی نتیجے کے طور پر ناصر زیدی کا لہجہ نہ صرف شور کی بلند آہنگی سے محفوظ رہا ہے بلکہ اس میں ایک دل پذیر قسم کی سرگوشی کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے جس کے سوتے ہمدردی، غمگساری، خلوص اور رفیقانہ اعتماد سے پھوٹتے ہیں۔ موضوع اور طرزِ اظہار کی اس لطافت و نزاکت نے ناصر زیدی کو جدید غزل گو شاعروں کی صف میں ایک ایسے منفرد اور ممتاز مقام پر فائز کر دیا ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

○ ○

سیر و سفر

مصنف :- شفیع عقیل   مبصر :- انعام الحق جاوید

اگر ہم فرصت کے کسی لمحے میں سفرناموں کی تاریخ پر ایک نگاہِ درست انداز ڈالنے کی کوشش کریں تو محسوس ہوگا کہ یہ تاریخ ہمیں کچھ بہت زیادہ دور نہیں لے جاتی۔ بس زیادہ سے زیادہ یوسف کمبل پوش ہوتے ہوئے ہم موجودہ صدی کے اس تیسرے دہا کے تک ہی پہنچ پاتے ہیں جہاں منشی محبوب عالم اِ "سفرنامۂ یورپ" کی داستان بیان کر رہے ہوتے ہیں اور وہ بھی ایک الگ صنفِ سخن کے طور پر نہیں بلکہ ایک رواں دواں معلوماتی اور اطلاعاتی روداد کے روپ میں، لیکن پھر جب ہم اس صدی کی اگلی دہائیوں کی جانب سفر کرتے ہیں تو رفتہ رفتہ سفرنامہ صرف ایک نئی صنفِ سخن کے طور پر ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے بلکہ اس بے کنار میں دیگر کئی ایک اصناف کے دریا بھی گرتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ ابن بطوطہ کی سیاحتوں میں یا مارکو پولو کی جھوٹی سچی داستانوں میں یا اس سے قبل بابائے تاریخ و دروغ ہیروڈوٹس کی فرضی و اصلی رپورٹوں میں سے سفرنامے کے بعض اجزاء تلاش کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ جدید سفرنامے کا ابتدا موجودہ صدی کی چھٹی دہائی کی مرہونِ منت ہے اور یہیں سے سفرنامے کی مقبولیت اور مانگ میں اضافے کا اصل دور شروع ہوتا ہے بلکہ اب تو یہ رواج اتنا زور پکڑ گیا ہے کہ ہر وہ ادیب جو ملک سے باہر جاتا ہے چھاتی پر سفرنامے کا تمغہ سجائے بنا واپس نہیں لوٹتا گویا عام لوگ تو سادر سے ٹیپ اور ٹیلی ویژن لاتے ہیں لیکن ادیب سفرنامے کے تحفے لاتا ہے اور یہ غالباً اس کی مجبوری ہے ایک ایسی تخلیقی مجبوری جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ شفیع عقیل بھی جب سیر و سفر کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے تو انہیں خالی ہاتھ لوٹنا اچھا نہ لگا اور نتیجتہً ایک خوبصورت کتاب نے جنم لیا جو سفرناموں کے باب میں ایک منفرد مقام کی حامل ٹھہری اور جس کا نام اس کی پیدائش کی مناسبت سے "سیر و سفر" تجویز کیا گیا۔

"سیر و سفر" میں کیا ہے اور کیا نہیں یہ اک اہم سوال ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ "سیر و سفر" کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ شفیع عقیل کے منفرد اور متنوع تجربات خود اس بات کے متقاضی تھے کہ انہیں حیطۂ تحریر میں لایا جائے اور دوسری وجہ ان کا وہ تخلیقی کرب جو ہر مقام پر اور ہر لمحے انہیں سچے اور کھرے اظہار پر مجبور کرتا رہتا ہے، سو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں ادبی گسترانہ گفتگو بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اعترافات کی ایک عظیم دستاویز بھی ہے تاہم یہ حضرت جوش کے "یادوں کی برات" والے اعترافات ہرگز نہیں ہیں کہ پردیس میں انسان کو سہانی یادوں کی بجائے سرمائے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور شفیع عقیل کی اس روداد میں بھی ہمیں بار بار یہی احساس ہوتا ہے۔

جس طرح فن، فنکار کی شخصیت کا پر تو ہوتا ہے اسی طرح سفرنامہ سفر نامہ نگار کی طبیعت کا عکاس ہوتا ہے
یفع عقیل سے براہ راست واقفیت نہ ہونے کے باوجود بھی ہر قاری اس سفرنامے کے ذریعے شفیع عقیل سے
تعارف ہو سکتا ہے اور نہ صرف متعارف ہو سکتا ہے بلکہ بے تکلف بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس بے تکلفی
یں ادب شامل ہو۔

"سیر و سفر، مغربی جرمنی کے سفرنامے کی روداد ہے اور اس میں آٹھ شہروں کے حالاتِ زندگی بمع جملہ خواص
رکیب استعمال بیان کئے گئے ہیں ابھی تک تو ہم نے یہی سنا تھا کہ "ایک ٹکٹ میں دو مزے" لیکن میونخ کے
ارے میں مصنف نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہاں انہوں نے ٹکٹ کے بغیر مزے لوٹے۔ اور خوب لوٹے۔ تاہم
ان مزے لوٹنے والے حصے کو مزے لے لے کر بیان ہرگز نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس میں ایک انکشاف کا پہلو ہے
ایسے انکشاف کا پہلو جس میں خواب بھی ہیں اور خوابوں کی سی کیفیتیں بھی۔ بیداری بھی ہے اور بے قراری بھی۔
حیرت بھی ہے اور حسرت بھی۔ چالاکی بھی ہے اور بے باکی بھی۔ غرضیکہ ہر وہ احساس موجود ہے جس کی موجودگی ضروری
تھی اور ہر وہ سانحہ رقم ہے جو "رقم" نہ ہونے کی وجہ سے کسی بھی مسافر کو پیش آ سکتا ہے۔ بون میں ہمارے سفرنامہ
نگار کی جیب کٹ گئی لیکن وہاں وہ صرف جیب کٹوانے ہی نہیں گئے تھے بلکہ انہیں اور بھی بہت سے ضروری کام
سرانجام دینے تھے جو انہوں نے دیئے۔ تاہم ان کا لطف اصل تحریر پڑھ کر ہی لیا جا سکتا ہے۔ ہمبرگ میں قیام
کے دوران ہمارے سفرنامہ نگار چونکہ سرکاری مہمان تھے لہٰذا یہاں انہیں ایک گائیڈ کی سہولت بھی میسر تھی لیکن
یہ گائیڈ ایسا تھا کہ جب اُسے "ریپر بان" دکھانے کی فرمائش کی گئی تو وہ معذرت کے سے انداز میں بولا کہ اس
نے تو خود یہ علاقہ صرف ایک مرتبہ دیکھا ہے تاہم اُسے "ریپر بان" جانا پڑا کہ یہ ایک مہمان کی خواہش
تھی اور مہمان بھی کوئی "ایویں کیویں دا نہیں" بلکہ سرکاری مہمان۔ اب آگے کی واردات خود مصنف کی زبانی سنیئے۔

"میں آپ کا ساتھ صرف نو بجے تک دے سکوں گا۔ میں نے بیوی سے وعدہ کیا ہے کہ نو بجے گھر پہنچ
جاؤں گا۔

میں نے کہا ٹھیک ہے تم نو بجے چلے جانا۔

مگر جب نو بجے تو وہ گھڑی دیکھتے ہوئے مجھے کہنے لگا "ابھی آیا" اور جب واپس آیا تو اس نے بتایا کہ
"میں نے بیوی کو فون کر دیا ہے کہ میں دس بجے آؤں گا۔

پھر جب دس بجے تو وہ حسب سابق اٹھ کر یہ کہتا ہوا ایک طرف چلا گیا" معاف کیجئے میں ابھی آیا"

اور واپس آ کر یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ "میں نے بیوی کو ٹیلی فون کر دیا ہے کہ میں گیارہ بجے آؤں گا۔"

ہم مختلف کلبوں میں گھومتے رہے اور وہ ہر ایک گھنٹے کے بعد ٹیلی فون کرنے جاتا رہا جب بھی واپس
آتا مجھے یہی خوشخبری سناتا کہ میں نے بیوی کو ٹیلی فون کر دیا ہے کہ میں ایک گھنٹہ اور دیر سے آؤں گا۔

یہاں تک کہ رات کا ایک بج گیا۔ وہ بار بار گھڑی بھی دیکھتا جاتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"اب چھوڑئیے ــــ بیوی سے کہہ دوں گا آؤں گا ــــ دونوں گھومتے ہیں۔"

اس پر وہ پھر اپنی مجبوری اور گھر جانے کی جلدی بتاتے ہوئے بولا نہیں مسٹر عقیل میں نے گھر جانا ہے نے بیوی سے کہا تھا کہ جلدی آؤں گا۔

چنانچہ جب دو بجنے کو آئے تو وہ با دلِ نخواستہ مجھ سے کہنے لگا "اب میں چلتا ہوں۔ مجھے جلد جانا ہے۔"

دیکھا آپ نے شفیع عقیل ایک دلچسپ واقعے کو مکالمات میں ڈھال کر کس طرح اور بھی دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ یہ دلچسپی اور شگفتگی کتاب کے شروع سے آخر تک موجود رہتی ہے اور کسی مصنف کی اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ قاری کتاب کا پہلا ورق الٹتے ہی اس میں الجھ جائے اور پھر ورق پہ ورق پلٹتا چلا جائے تا آنکہ کتاب کا وہ آخری واقعہ آجائے جسے "مسافر کی ڈائری" کے عنوان سے منظوم بھی کر دیا گیا ہے تاہم آپ اس کا نثری حصہ دیکھئے جو کچھ یوں ہے۔

"واقعہ صرف اتنا ہے کہ جہاز میں لنچ آیا۔ ایئر ہوسٹس ٹرے سیٹ کے آگے لگا کر چلتی بنی۔ لیکن میں اپنے اسی چکر میں پڑ گیا کہ اس میں "ہیم" نہ ہو۔ ٹرے میں اور چیزوں کے ساتھ گوشت کا ٹکڑا بھی رکھا ہوا تھا جو سرخی مائل تھا۔ میرا دل جیسے مجھے کچھ کہہ رہا تھا۔ کوئی اندر کی آواز تھی جو اس طرف متوجہ کر رہی تھی۔ میں نے ایئر ہوسٹس کو بلا کر پوچھا۔

"کیا یہ ہیم ہے"؟

مگر وہ انگلش میں "نا ئیں" کرتی ہوئی چلی گئی۔ اس نے ایک آدمی کو بھیجا تو میں نے اس سے بھی یہی سوال کیا۔ اس پر وہ بولا۔

"نہیں صاحب! یہ ہیم نہیں ہے۔"

میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک امریکی بیٹھا ہوا تھا میری یہ گفتگو سن کر وہ بڑی ہمدردی سے کہنے لگا۔

"غالباً آپ مسلمان ہیں؟"

اس نے ٹرے میں رکھے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کو بڑے غور سے دیکھا، پھر اپنی ٹرے میں سے تھوڑا سا گوشت کاٹ کر کھایا اور اس کے بعد بولا

"نہیں یہ ہیم نہیں ہے۔ آپ بے فکر ہو کر کھائیں۔"

اس کی بات سے مجھے قدرے اطمینان تو ہو گیا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں، میں نے یونہی اس سے پوچھا۔

اگر یہ ہیم نہیں ہے تو پھر کا ہے کا گوشت ہے۔

میرے اس سوال پر وہ بوکھلا سا گیا اس نے ایک بار پھر کسی ماہر کی طرح گوشت کے ٹکڑے کو بغور دیکھا اور پھر قدرے اطمینان سے کہنے لگا۔

I Think This is donkey

یہ اس کتاب کا سب سے اہم خوبی تحریر کا بے ساختہ پن ہے ایسا بے ساختہ پن جو ایک ملائم سے بھولپن سے جنم لیتا ہے جس میں بھولپن نہ ہو تو تحریر میں بے ساختگی نہیں آتی اور جب تک یہ بے ساختگی نہ ہو قاری اعتماد کی فضا میں نہیں پہنچ پاتا۔ شفیع عقیل بھورو کریٹک رویہ اختیار کرنے کی بجائے قاری سے بے تکلفی ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے کے بدن کا ہر عضو ایک بے تکلف سی مسرت سے ہمکنار ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس سفرنامے میں تاریخ بھی ہے اور تاریخی پس منظر بھی۔ جغرافیہ بھی ہے اور جغرافیائی صورت حال بھی۔ واقعات بھی ہیں اور معلومات بھی۔ کہیں شاہراہوں کا سفر اور کہیں پگڈنڈیوں کی سیر لیکن مختصر مختصر اور ایک دوسرے سے مربوط۔ نہ غیر ضروری کھلا رنہ بے جا اختصار وہ پروفیسر اپنے میری ٹیل سے ملتے ہیں تو یوں جیسے اسے ملے بغیر ان کا سفر ادھورا رہ جائے گا اور برلن کی تاریخ بیان کرتے ہیں تو ایسے کہ تاریخ ایک تازہ واقع کا روپ دھار لیتی ہے انھوں نے ہائیڈل برگ کا قلعہ بھی دیکھا اور دریا کے کنارے شاعر مشرق علامہ اقبال کی یادگار بھی۔ عجائب گھروں میں بھی گئے اور آرٹ گیلریوں کی سرپرستی بھی کی۔ لیکن یہ سب کچھ کتاب میں یوں سمویا جیسے ڈرائنگ روم میں پڑے ہوئے مختلف ڈیکوریشن پیس یا گلدستے میں سجے ہوئے مختلف رنگوں کے پھول یا کسی لائبریری کے شیلف میں پڑی ہوئی مختلف موضوعات پر مبنی دلچسپ اور مفید کتابیں۔

یوں تو یہ کتاب اردو میں ہی لکھی گئی ہے لیکن بعض جگہوں پر بعض الفاظ کوٹ پتلون پہن کر بھی سامنے آ جاتے ہیں اسی طرح بعض لفظوں نے "لاچے" باندھے ہوئے ہیں اور "جگنی" گاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ایسی جگنی جس میں پنجاب کی مہک کے ساتھ ساتھ پاکستان کی خوشبو بھی رچی بسی ہوئی ہے۔

اور اب آخر میں کتاب کے صفحہ ۴۲ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جس طرح اس سفر میں تین کا ہندسہ میرے پیچھے لگ گیا تھا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اسی طرح انعام نام کے حضرات بھی ہر جگہ میرے ساتھ رہے کراچی میں تھا تو انعام درانی تھا۔ دمشق میں تھا تو ایک ہوٹل کے بیرے کا نام الانعام تھا۔ کرون گیا تو محمد انعام یاد آ گیا۔ لندن میں انعام عزیز تھا اور جب کیلیڈرا جانے کے لئے انڈورسمنٹ کے لئے پاکستانی سفارت خانے میں گیا تو وہاں سیکنڈ سیکرٹری انعام حسین تھے اور نیویارک میں ایک انعام الٰہی سے ملاقات ہو گئی۔ گویا اس پورے سفر میں انعام کسی نہ کسی روپ میں ہمہ اوست کے صوفیانہ مسئلے کی طرح میرے ساتھ ہی گھومتا رہا۔"

اور سچ پوچھئے تو اسی اقتباس نے ہمیں تبصرہ کرنے کا حوصلہ بھی عطا کیا کہ شاید اس طرح سے اگلے ایڈیشن

میں ہمارا نام بھی اس کتاب میں شامل ہو جائے کیونکہ ہمارا نام بھی انعام کے سے بہرہ العزیز لفظ سے ہی شروع ہوتا ہے۔

OO

افکار ۔ سیرت نمبر

مبصر :۔ ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

افکار گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور کا میگزین ہے۔ کالج میگزین، بیشتر طلبا کی نگارشات کے حامل ہونے کے سبب، خاص معیاری نہیں ہوتے لیکن میگزین زیر جائزہ اساتذہ کی تخلیقات و نگارشات کے سبب ایک بھرپور ادبی مجلہ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یہ مجلہ دو جلدوں میں بڑے جاذب نظر رنگوں اور اسلامی افکار کی حامل علامتوں اور آرٹ سے مزین سر اوراق کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ پہلا حصہ سیرت طیبہ پر مقالات و مضامین اور نعتیہ منظومات پر مشتمل اور دوسرا حصہ مطالعۂ نعت کے لئے وقف ہے۔

سیرت کے سلسلے میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و عادات، اسوۂ حسنہ اور ایک آدھ غزوہ کے پس منظر کے علاوہ حضورؐ کی معاشرتی زندگی کی جھلکیاں اور اسی قسم کے دوسرے حالات و واقعات کا تذکرہ ہے منظومات میں جہاں پُر خلوص انداز میں نذرانۂ عقیدت و احترام پیش کیا گیا ہے اور سرورِ کونین کے حضور کچھ التجائیں اور گزارشات کی گئی ہیں وہاں حضورؐ کے سراپائے مبارک کی تصویر کشی کی بھی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔ نعت گوئی ایک نہایت نازک فن ہے اس میں نعت گو کی ذرا سی بھی کوتاہی اسے گستاخی کا مرتکب بنا سکتی ہے اسی بنا پر فارسی میں یہ ضرب المثل "نعت گر پر پیچ گو مشہور ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں "نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا" بہرحال اس شمارے کی بیشتر تخلیقات بہت خوب ہیں، البتہ چند ایک مذکورہ ضرب المثل پر پوری اترتی ہیں عبدالعزیز خالد بڑے صاحب مطالعہ، پختہ کار اور منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ فنی طور پر ان کی منظومات دھوم دھڑکے والی ہوتی ہیں۔ اس شمارے میں شامل ان کی منظومات کچھ اسی ڈھب کی ہیں، ادق و ثقیل الفاظ.... ان کا درج ذیل شعر کچھ بے محل اور حضورؐ سے وابستگی کا کوئی تاثر بھی نہیں دیتا :

فضول آمیز باتوں سے عیار آلود نظروں سے   دل سادہ کو بہکاتے ہیں خوباں یا رسول اللہ

"اس سلسلے میں اگر وہ خدا سے رجوع کرتے تو وہ یقیناً اس صورت حال سے ان کی نجات کا کوئی سامان کر دیتا۔ راقم اپنی علمی بے بضاعتی کے سبب اکابر زبردست شعر سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔

محبت حسن سے کرتا ہوں آزادی پہ مرتا ہوں   تپش دل کی ہے رزق چشم حیراں یا رسول اللہ

عارف عبدالمتین کی آزاد اور غزلیہ نعتیں ان کے شدت جذبہ اور حضور سے وابستگی کا پتہ دیتی ہیں۔ اسی طرح تحسین فراقی، رضا نا ہید رضا، حفیظ صدیقی کی نعتیں جذبات احترام و عقیدت کی حامل اور رجائیت کا

رنگ لئے ہوئے ہیں۔ نظموں کے بعد نعتیہ غزلوں کے حصے میں عارف، خالد، حفیظ، حفیظ تائب، خالد بزمی، حافظ لدھیانوی، یزدانی جالندھری وغیرہ کی چار چار پانچ پانچ نعتیں ہیں۔ ان میں بھی وہی فدایانہ عقیدت ہے، حضور کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق ستودہ کا بیان ہے، درود و سلام ہے، اظہارِ عجز ہے، تمنائیں اور التجائیں ہیں اور زمانے کے فتنہ و الم سے بچنے کے لئے حضور اکرم کا دامن مبارک تھامنے کی خواہش ہے۔ بجز ایک آدھ نعت کے ان میں نعت کے ادب آداب کا بھی احساس نظر آتا ہے۔

اب مضامین کا حصہ شروع ہوتا ہے اس میں وہی کچھ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ یہ حصہ طلبا کی مذہبی و اخلاقی تربیت کے لئے بڑا مفید ہے اس کے بعد پھر نعتوں کا حصہ ہے اس میں احسان دانش، عبدالکریم ثمر اور امجد اسلام امجد کے علاوہ بعض دوسرے شعرا کی نعتیں ہیں۔ امجد کی نعتیں تغزل کا رنگ لئے ہوئے ہیں اور غزل کے اس لوچ اور رچاؤ کے باعث وہ عجیب قسم کی تازگی و تاثیر اور دلکشی کی حامل ہیں۔ مضامین کا دوسرا حصہ بھی وقیع ہے۔ یہاں ایم اسلم نے ترمذی کے حوالے سے حضور اکرم کے اخلاقِ حسنہ کی مختصر لیکن بڑی جالب و جاذب اور جامع تصویر کھینچی ہے۔ نعت کے تیسرے حصے میں مکرم احمد ندیم قاسمی کی نعتیں ان کے جذبہ صادق و خلوص، سوز دروں اور حضور سے ان کی انتہائی عقیدت و محبت کی منہ بولتی تصویریں ہیں

پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

کچھ نہیں سوجھتا جب پیاس کی شدت سے مجھے چھلک اٹھتا ہے مری روح میں مینا تیرا

دستگیری مری تنہائی کی تو نے ہی تو کی میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ ترے پیکر کا نہ تھا میں تو کہتا ہوں جہاں بھر پہ ہے سایہ تیرا

اس حصے کے دوسرے شعرا اسرار زیدی، راز کاشمیری، اظہر جاوید، جان کاشمیری اور مقبول کاوش وغیرہم ہیں۔ طلبا کی نگارشات و تخلیقات بھی قابل ستائش و داد ہیں، بالخصوص اعجاز رضوی کی نعت بڑی سہل ممتنع کی حامل اور خاص تاثیر لئے ہوئے ہے

ان کا ساتھ نہ گر پاؤ گے چلنے والو تھک جاؤ گے

ان کی قید سے بچنے والو اپنے آپ میں گھر جاؤ گے

توڑا ان سے پیار کا رشتہ پھر تم کس کے کہلاؤ گے

اقرا کا دوسرا حصہ ضخامت میں پہلے کی نسبت کمتر ہے۔ عارف عبدالمتین کا مضمون "جدید نعت" بڑے درد کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس میں عربی اور فارسی نعت کے آغاز کا سراغ لگا کر اردو کی شروع کی نعتوں کا سرسری تذکرہ ہے۔ بعض جگہ انہوں نے نعت گو حضرات کی بعض خامیوں اور گستاخیوں وغیرہ کی طرف بڑے دکھ کے ساتھ اشارے کئے ہیں۔ ان کے مضمون میں سعدی اور خسرو سے متعلق دو اشعار کی نسبت محل نظر ہے اس حصے میں حضرت احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، حفیظ تائب، عارف"

حفیظ صدیقی، راجہ عطاء الحق قاسمی اور تحسین فراقی وغیرہم کی جاندار نعتیں شامل ہیں۔ غرض انتھولوجی کے پہلے اور مطالعہ نعت کے اس حصے میں جدید نعت پر اتنا مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے کہ آنے والے محققین کے لئے پاکستان کے اس خطے کی جو اپنی ادبی روایات اور سرمایۂ تخلیقات سے مالا مال ہے، نعت گوئی کے مطالعے کا حوالے کی چیز بن گیا ہے۔ دونوں حصوں کے آخر میں پنجابی نعت کے بھی چند اوراق شامل کئے گئے ہیں۔

اے آبِ رُودِ گنگا

مصنف :۔ رفیق ڈوگر   مبصر :۔ ڈاکٹر وحید قریشی

رفیق ڈوگر کا سفر نامۂ بھارت اُردو ادب کے سیاحتی سرمائے میں اہم اضافہ ہے ——
"اے آبِ رُودِ گنگا" بظاہر ماضی کا نوحہ ہے لیکن بباطن ہماری تہذیبی اور فکری زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کا اظہار بھی ہے جس کا سلسلہ مطالبۂ پاکستان سے ملتا ہے۔ ڈوگر کو تاریخ کو واقعات و سنین کے جھرمٹ سے نکال کر تخلیقی سطح پر اپنی شناخت کو مادی اور فکری سطح پر محسوس کرنے کے لیے ماضی و حال کے درمیان ایک ایسے لمحے کو گرفت میں لینا پڑا ہے یہ لمحہ ایک خواب بیداری کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس وقت جب گائیڈ لڑکی نے قطب مینار کی تعمیر کو بھی ہندو راجے کے کھاتے میں ڈال دیا۔

"میں پوری کوشش کے باوجود اپنے جسم کو متحرک نہ کر سکا۔ پاؤں معلوم ہوتا تھا زمین میں دھنستے جا رہے ہیں میں اس زمین میں پیوست ہو گیا ہوں۔ مجھے موٹے موٹے رسّوں سے (قطب) مینار سے باندھ دیا گیا ہے۔

ان رسّیوں کو توڑنے کی جتنی زیادہ کوششیں کرتا تھا، مینار کی گرفت اتنی ہی سخت ہوتی جا رہی تھی۔ تاریخی تعلق کے بندھن اور احساسات کے رسّوں کی بندش۔ میں نے اس مینار کی تعمیر میں حصہ لیا نہ بربادی میں۔ خونی رشتے میں سے میرے کسی بزرگ کو بھی شاید یہ شرف حاصل نہیں ہوا ہوگا۔ پھر قطب مینار چھوڑتا کیوں نہیں۔ مجھے اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ آنکھیں بند کر کے میں وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں میں کتنا عرصہ وہاں اسی حالت میں بیٹھا رہا تھا کہ دور سے عارفین نے آواز دی۔ میں بوجھل قدموں سے اُس کی طرف چلنے لگا۔ لیکن جیسے جیسے میں مینار سے دُور ہٹتا جا رہا تھا، اُس کی بلندی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر ایسے معلوم ہُوا جیسے قطب مینار فلک نیلی

ظلام کو چیرتا ہُوا نکل گیا ہے۔ اس کا آخری کنارہ آسمان کی وسعتوں میں گم ہوگیا
مسجد کی شکستہ محرابوں کے بازو بھی پھیلتے جا رہے تھے۔ مَیں نے محسوس کیا وہ
مجھے دبوچنے کے لیے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ مگر مَیں اکیلا ہی مجرم نہیں۔ وہ
ہمارے صدیوں کے انفرادی اور اجتماعی جرائم کی صرف مجھے کیوں سزا دینا چاہتے ہیں"

دِلّی کے آثار کے بارے میں سرکاری پراپیگنڈہ نے جو تاثر دیا اس سے ڈوگر شدید جذباتی ہیجان سے دوچار ہُوا۔ وہ کبھی طنز سے اور کبھی تخیلی تصویروں سے اس پر قابو پاتا ہے۔ طنز ملاحظہ ہوں :-

"خاتون گائیڈ بھی اپنے گاہکوں کی قیادت کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئی تھی اور قطب مینار کو بھی ہندو دور کا شاہکار ثابت کر رہی تھی" کہتے ہیں یہ مینار پرتھوی راج نے بنوایا تھا" اور جتنی قرآنی آیات از برتھیں اس نے وہ سب اس پر لکھوا دی تھیں۔" ایک دل جلے زائر نے آدابِ سیاحت کی خلاف ورزی کی۔ خواتین و حضرات مینار کی بجائے زائر کو دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔ خاتون اس اچانک اور غیر متوقع حملے سے پریشان ہو گئی۔"

یہ سوال کہ ہمارا دِلّی سے کیا تعلق ہے؟ یہ سوال کہ ہمارا پورے برِصغیر کی مسلم آبادی سے کیا رشتہ ہے؟ یہ سوال کہ برِصغیر کی سرزمین پر مسلمانوں کے کیا لیل و نہار رہے ہیں؟ ان تہذیبی اور تاریخی سوالوں کے آس پاس کئی دوسرے سوال بھی سر اُٹھاتے ہیں۔ بھارتی پراپیگنڈہ کا یہ پہلو کہ ہم ایک ہیں اور ہماری وراثت ایک ہے؟ مادی سطح پر اسی کی نفی سے ہر قدم پر ظاہر ہونے والے مراحل کے درمیان بھارتی حکومت کے داخلی مسائل، بھارتی مسلمانوں کی حالتِ زار، اقلیتوں کے بارے میں اکثریتی گروہ کی پالیسی، تجارتی اور ثقافتی زاویوں میں فکر و نظر کے اختلافات، پاکستان کے بارے میں بھارتی حکومت کا رویّہ، ۱۹۴۷ء کے خونی مناظر، سکھ اور پنجابی حرب، پنجابی اور دِلّی کی تجارتی اجارہ داری ــــ بھارت کے لسانی مسائل اور خارجہ پالیسی کے بعض رجحانات ــــ یہ گوناگوں مسائل ڈوگر کے ذہن میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ وہ دھرتی پوجا کا قائل نہیں۔ اس لیے اس کے ہاں اپنے قدیمی وطن کے بارے میں کسی کا اظہار نہیں ملتا ــــ وہ وطنیت اور اس سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو فکری و جذباتی پیمانے سے ناپتا ہے اور ماضی میں دوسری ہمسایہ قوموں کے درمیان رہتے ہوئے مسلمانوں کو جن تجربات سے سابقہ پڑتا رہا وہ اس کا احساس کر کے اپنی پاکستانیت کے لیے عقلی جواز فراہم کرتا ہے۔ یہ سارا عمل یہ سارا تجزیہ چونکہ تخلیقی سطح پر ہے اس لیے تاریخی صداقتوں کی شماریاتی روداد نہیں بلکہ ایک ادبی اور تہذیبی تجربہ ہے۔

یہی اس سفرنامے کا بنیادی فکری نقطہ ہے اور اسی سے یہ سفرنامہ دوسرے ادیبوں کی بھارت یاترا کی رُودادوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ دوسرے سفرناموں اور "اے آبِ رُودِ گنگا" میں بیّن فرق یہی ہے کہ یہ سفر کی رپورٹ نہیں یہ ایک دردمند پاکستانی کے ذہنی سفر کی رُوداد ہے۔ اس سفر میں ڈوگر نے فنّی لحاظ سے دو طریقے اختیار کیے ہیں۔ ایک تو نیم رُومانی یا تاثراتی اسلوب ہے جس میں علامتی حسن کاری کو شامل کیا گیا ہے اور دوسرا ایک تیکھا طنزیہ انداز جس میں اس کی ہنرمندانہ تخلیقی الفاظ کی قوّت بھی شامل ہے۔ پہلے طریقِ کار کے سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"میں نے اپنے اردگرد خوابیدہ انسانوں کو دیکھا۔
وہ اس مزے سے سو رہے تھے جیسے وہ مجھ سے بھی چھوٹے گاؤں سے تعلق رکھتے ہوں۔

مجھے ان پر رحم آنے لگا
مجھے اپنے آپ پر رحم آنے لگا

اتنی بڑی کائنات میں میرا مقام اور پہچان چند درجن کچے گھروں اور گلیوں تک ہی محدود رہی۔ دوڑتی ہوئی گاڑی اور خوابیدہ انسانوں کے درمیان اکیلے بیٹھے مجھے خوف آنے لگا۔ میری ماں نے کہا تھا جب تم ڈر جاؤ تو کلمہ پڑھ لیا کرو۔ میں زیرِ لب کلمہ پڑھنے لگا۔ ریل گاڑی اسی رفتار سے دوڑتی جا رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ آسمان پر چاند کی روشنی پھیلی ہے محسوس ہوتا تھا جہاں تک چاند کی روشنی پھیلی ہے سب کچھ میرا اپنا ہے زمین، فضائیں، ہوائیں، آسمان اور اس پر چمکنے والے چاند اور ستارے سب میرے اپنے ہیں۔

تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی، جامع مسجد، قطب مینار، مدینۃ الزہرا مسجد قرطبہ، سمرقند و بخارا سب میرے ہیں۔ میری گردن پھر سے سیدھی ہوگئی۔ میں یکدم کتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ اس گاڑی میں کتنے لوگ ہیں جو میرے جتنے بڑے ہوں۔ جن کی پہچان تاج محل سے مسجد قرطبہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ جو تاج محل اور قطب مینار کے زیرِ سایہ سینہ تان کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ان کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتے ہوں۔ میری پہچان زمان و مکان کی پابندیاں توڑتی ہوئی اُندلس سے انڈونیشیا

تک پھیل گئی۔ میں یکدم ادنیٰ سے اعلیٰ ہو گیا۔ کلمہ پڑھنے سے میں کتنی عظمتوں کا وارث بن گیا ہوں۔ کتنا خوش بخت ہوں کتنا عظیم ہوں۔ دلّی اور سلطنتِ دلّی کی ساری عظمتیں اور رفعتیں میری جھولی میں آن گریں۔ عروج و زوال کی ساری کہانی میری اپنی کہانی بن گئی ہے۔"

یہ نثر پارہ علامتی ادب پارہ ہی نہیں ڈوگر کے اسلوب کی معراج بھی ہے۔ یہاں ڈوگر لفظوں کی شعبدہ گری نہیں کرتا۔ لفظوں کے حوالے سے اپنے باطن میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا انکشاف کرتا ہے اور داخل میں وارد ہونے والے ہر تجربے کو لفظوں کی مدد سے جانچتا اور پرکھتا ہے ان تجربات کو محسوس کی سطح پر لانے کے لیے لفظ کے لسانیاتی پیکر ایک نئی کشفی حالت سے دوچار ہوتے ہیں۔ سفرنامے میں ایسے ایک دو نہیں کئی مقام آتے ہیں۔ کبھی یہ سفر خارج سے داخل کا سفر ہے۔ جیسے قطب مینار کے پہلو میں کھڑے کھڑے اس نے ایک کشش محسوس کی تھی یا پھر داخل سے خارج کا سفر بھی ہے جیسے قبرستانوں کی ادا اس فضاؤں میں گھومتے ہوئے مناظر یا پھر اکبر کی قبر پر لنگوروں کی یورش۔ یہ دوسرا منظرنامہ ڈوگر کے لیے دوسرے حربے تک رسائی کا اپنا طریقِ کار ہے۔ یہی وہ مراحل ہیں جہاں ڈوگر نے طنز یہ کے بھرپور استعمال سے فضا کی تعمیر کی ہے۔ اکبر، دینِ الٰہی کا داعی، راجپوتوں سے رشتے ناطوں سے مشترکہ قربت کی طرف جانے والے رجحانات کی علامت۔

" آگے بڑھے تو دینِ الٰہی کے بانی کے آخری "بہشت آباد" میں بندروں اور لنگوروں نے ہمارا زبردست استقبال کیا۔ وہ بیوی بچوں سمیت ہمارے استقبال کے لیے آئے تھے اور ہم سے مل کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ بعض قد آور لنگوروں نے آگے بڑھ کر باقاعدہ ہاتھ ملایا اور تعارف کرایا۔

اس عزت افزائی اور مہمان نوازی کے ایسے اہتمام سے اپنی گردنیں بارِ احسان سے جھک گئیں۔ ہم تو کبھی کسی وی آئی پی کے لیے بھی اتنے بندروں اور لنگوروں کا اہتمام نہیں کر سکے جتنے انہوں نے ہم جیسے عامیوں کے لیے بلا رکھے تھے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ بندر بھی ہمیں استقبالیہ دیں گے۔ بندروں کے سردار خطبہ استقبالیہ پیش کریں گے اور "آپ سے مل کر اتنی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتے۔۔" کا اعلان کریں گے اور پھر وہی بات دہرائیں گے

"ایک صحافی نے پوچھا" آپ نے بھٹو کو گرفتار کیوں کیا ہے؟"

"میں نے تو ہرگز نہیں کیا بھٹو کو گرفتار، آپ قسم لے لیں۔"

"میرا مطلب ہے حکومت نے اسے کیوں گرفتار کیا ہے۔" اس نے زور سے پوچھا۔

"اس پر قتل کا الزام ہے۔" ہم نے مختصر سا جواب دیا۔

"بھارت کے عوام کو بھٹو کی گرفتاری پسند نہیں۔" انہوں نے ہمیں خبردار کیا۔

"شاید اس لیے کہ انہیں پاکستان کے عوام کا قتلِ عام پسند ہے۔" ہم نے جواب دیا۔

"ہم بھارت پہنچے تو بھارت کی خبروں اور رویے سے معلوم ہوتا تھا کہ مسٹر بھٹو کو پھانسی کی سزا دینے سے پاکستان میں زبردست ہنگامے ہو رہے ہیں۔ بھارت میں کانگرس پارٹی اس مسئلے کو ہر جگہ اٹھا رہی تھی۔ جمبوں میں جس سیاسی راہنما نے جلوس نکالا تھا اس کا تعلق کانگرس سے تھا۔ کانگرس کی طرف سے بھٹو کو پھانسی نہ دینے کی اس مہم کے بارے میں (میرے) ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں (اندرا گاندھی) کہا" ذاتی طور پر میں پھانسی کی سزا کے خلاف ہوں۔ میں نے اپنے دورِ اقتدار میں اسے ختم کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور تجویز کیا تھا کہ قتل کے ملزم کو عمر قید کی سزا دینے کا قانون بنایا جائے مگر ہمارے ارکان نے اس سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ اس لیے میں قانون نہ بنوا سکی۔ اس کے علاوہ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ فوجی حکومت کے وقت میں عدالتیں بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں انہوں نے کہا ہماری پارٹی کے مختلف لوگ رائے پوچھنے آتے ہیں تو میں یہی جواب دیتی ہوں کہ ہمیں اس بارے میں پوری معلومات حاصل نہیں ہیں۔ بھٹو کو موت کی سزا دینے کے اعلان کے بعد کلکتہ میں بھی اخبار نویسوں نے مجھ سے یہی سوال کیا تھا اور میں نے یہی جواب دیا تھا۔" اندرا کو تاریخی مقدمے کی کارروائی کے بارے میں پوری معلومات حاصل نہ ہوں!— مجھے یقین نہ آیا۔ اور یقین کرنے کے لیے اس سوال کا زاویہ بدل دیا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس مقدمے کی سماعت کھلی عدالت میں ہوئی تھی اور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے اس کو صفائی کا موقع دیا تھا۔" جواب میں

اندرا نے کہا "نہیں مجھے معلوم نہیں تھا" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا لیکن جب اتنی بڑی شخصیت اصرار کرے تو پھر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔"

خارجہ پالیسی کے بعد بھارت کے داخلی مسائل بھی اس کا موضوع ہیں۔ ان میں دو مسئلے سرِفہرست ہیں۔ بھارت میں لسانی تحریکات اور پنجابی صوبے کی تحریک۔ دوسرے بھارتی مسلمانوں کے مسائل۔ کرنیل سنگھ تھند سے ان کی گفتگو بہت دلچسپ ہے۔ پاکستان آ کر پاک پنجاب کو برادرِ بزرگ کی بھاشا دینے والا کرنیل سنگھ تھند بھائی چارے کی قیمت کے طور پر گورمکھی رسمِ الخط کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن پنجاب گورمکھی سے قربانی مانگتا ہے اور اسے گوردوؤں کی زبان قرار دے کر سکھوں نے پنجابی صوبے کی تحریک چلائی تھی۔ اس لیے وہ اس کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں لیکن

حال یہ ہے کہ ہندوؤں کی مخالفت کی وجہ سے اس لسانی تحریک کی بنا پر ہریانے کا الگ صوبہ بنا اور بھارتی پنجاب ایک سے زیادہ صوبوں میں تقسیم ہو کر مختصر سا پنجابی صوبہ وجود میں آسکا اور سکھ وہ سیاسی مقصد حاصل نہ کر سکے جس کے لیے یہ ساری جدوجہد کی گئی تھی۔ اب پنجابی کو بھارت میں ایک دوسری یلغار سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ لسانی سطح پر ہندی کی یورش نے نئی پنجابی سکھ نسل کی زبان کو اتنا بدل دیا ہے کہ پرانی نسل اور نئی نسل کے درمیان لسانی وسیلہ ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ ایک پروفیسر اور ایک اخبار نویس سے باتیں کرتے ہوئے دلّی کے ایک ریسٹورنٹ میں جو مکالمہ ہوتا ہے اس میں ڈوگر نے لسانی مسئلے کو وسیع تر تناظر میں پیش کیا ہے:

• اخبار نویس نے بنگلہ دیش کے قیام کی روشنی میں بقیہ پاکستان کے حال اور مستقبل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی تو پروفیسر صاحب نے ایک بار پھر لیکچر شروع کر دیا "پاکستان کو اپنے ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہیے ورنہ اسے مزید نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

میرے لیے اب خاموش رہنا ممکن نہیں تھا "اگر خدانخواستہ پاکستان کو کوئی نقصان پہنچا تو بھارت بھی محفوظ نہیں رہے گا۔"

"کیا مطلب ..." اخبار نویس اُچھل پڑا۔

"پروفیسر صاحب کے لیکچر کی روشنی میں نقصان لسانی گروہوں کے مفادات اور تصادم سے پہنچتا ہے۔"

"بالکل ..." پروفیسر صاحب نے تصدیق کی۔

"پاکستان میں زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ لسانی گروہ ہیں اور بھارت میں

سلنکیڑوں۔ پاکستان کے ان گروہوں میں اختلاف کی نسبت اشتراک کے پہلو زیادہ ہیں۔ مشترکہ مذہب، تاریخ، اور مقاصد۔۔ لیکن آپ کے ہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سینکڑوں قسم کے اختلافات ہیں۔ بھارت کے لوگوں کو متحد کرنے والی کوئی مشترکہ قدر نہیں۔"

"ہم جمہوریت کی رسّی میں بندھے ہوئے ہیں۔" اخبار نویس نے مداخلت کی۔

"لیکن یہ رسّی اتنی مضبوط نہیں کہ کوئی سُپر پاور اس کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر سکے"

"کون سی سُپر پاور؟" پروفیسر صاحب اُچھل پڑے۔

"جس کو آپ کی سرحدوں تک پہنچنے سے پہلے پاکستان روکے ہوئے ہے"

"اگر پاکستان چار لسانی ریاستوں میں تقسیم ہوتا ہے تو بھارت کم از کم سترہ ریاستوں میں تقسیم کرنا سُپر پاور کے مفاد میں ہو گا۔"

اخبار نویس نے میری تائید کی۔ "یہ بات تو ہم خود تسلیم کرتے ہیں"

"آپ کا قومی مفاد یہی ہے کہ آپ پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنائیں۔" میں نے انہیں تنگ کرنے کے لیے کہا۔ پروفیسر ہنس پڑا۔

"یہ عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں پاکستان کو مضبوط اور مستحکم کرنا بھارت کے مفاد میں ہے اور کچھ کہتے ہیں اسے کمزور کرنا بھارت کے مفاد میں ہے۔"

دلّی میں سکھوں نے عام تجارت پر غلبہ حاصل کیا ہے اور بڑے سرمائے پر پنجابی ہندو قابض ہے۔ اب وہاں سکھوں کے خلاف شدید ردِ عمل ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اس ردِ عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"سکھ نوجوان کو پرتاپ سنگھ کیروں کے قبل از وقت قتل ہو جانے کا بہت دُکھ تھا" اگر سردار جی زندہ رہتے تو پنجاب صنعتی ترقی میں بھی سب سے آگے ہوتا۔"

"آپ دلّی میں پیدا ہوئے دلّی میں رہتے ہیں تو پھر باتیں پنجاب کی کرتے ہیں؟۔"

"دراصل ان دلّی والوں نے ہمیں پنجابی کہہ کہہ کر پنجابی بنا دیا ہے۔ ہم تیس سال سے دلّی میں رہ رہے ہیں۔ یہ ہمیں پھر بھی پنجابی کہہ کر گالی دیتے ہیں۔ مگر گالیوں سے کیا ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا۔

ایک بزرگ ہندو اخبار نویس نے پنجاب اور پنجابیوں کی اس لوٹ مار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "جب ہم دِلی آئے تھے تو ہمیں زندہ رہنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ پنجابی ہندو چینی کی بوری خریدتا۔ پر چون میں چینی اسی بھاؤ بیچ دیتا جس بھاؤ پڑتی تھی۔ چینی بک جاتی تو خالی بوری منافع پر بیچ جاتی جسے بیچ کر وہ بچوں کا پیٹ پالتا۔ دلی کے سرمایہ دار ہندوؤں کے مقابلہ میں وہ اسی طریقہ سے روٹی کما سکتا تھا۔ اس طرح دلی کے ہندو کے لیے پنجابیت واقعی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس کی تجارت، اجارہ داری اور شرح منافع پر یقیناً پنجابی حملہ آور تھا۔ پنجابی ہندو کے پاس گھر تھا نہ دکان، وہ سڑک کے کنارے گڑھا کھود کر جلیبیاں بناتا تھا اور کہاں بناتا ہے۔ جلیبیاں بنانے والا دلی والوں کی نسبت سستی بیچنے کے دوران میں ایک آدھ جلیبی اپنے منہ میں بھی رکھ لیتا تھا۔ دلی کے پرانے مٹھائی فروش نے اسے دہلوی ثقافت پر حملہ قرار دے دیا۔ ان کی ثقافت میں جلیبیاں بنانے، تھال میں اٹھانے اور کھانے کھلانے کے الگ الگ آداب ہیں۔ ہمارا مسئلہ زندہ رہنا تھا اور ان کا مسئلہ ثقافت۔ اور آپ جانتے ہیں کہ زندگی ثقافت سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔"

دلی پر ہندو پنجابی اور سکھ پنجابی کا اقتدار اور تجارتی اجارہ داری ہے۔ جس سے پنجاب دشمنی کی جا رہی ہے۔ دلی کا تیسرا گروہ مسلمان ہیں جن کی تجارت سکڑتے سکڑتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔

دلی کے مسلمانوں کی بدنصیبی بھارت کے جملہ مسلمانوں کی بدنصیبی سے مختلف تھی۔ تجارت سے بے دخلی کے بعد سیاسی طور پر بھی خاتمے کے سامان پورے ہیں۔ ڈوگران حالات کا مفصل جائزہ لیتا ہے۔ دلی کا حسین بھارتی مسلمانوں کی معاشی ناکہ بندی کی علامت ہے۔ مایوسی کے بعد اپنا ملک چھوڑ کر پاکستان میں بسنے کی خواہش، تجارت میں روز بروز کا خسارہ، عدم تحفظ کا احساس، حقوق کی پامالی کا خوف، قومی دھارے سے علیحدگی کا طعنہ۔ یہ سب کچھ مسلمانوں کی بے چارگی کا ایک نوحہ ہے جسے مؤثر طور پر بیان کیا گیا ہے۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت وہاں کا قومی دھارا ہے۔ اگر وہ اپنے کسی حق کی بات کرتے ہیں تو پریس اور سیاست دان

> شور مچاتے ہیں۔ دیکھنا یہ قومی دھارے میں شامل نہیں ہو رہے۔ ہم نہ کہتے تھے کہ مسلمان وفادار نہیں ہوتے تو دھارے میں کود جاتے۔ اس پراپیگنڈہ اور الزام کے خوف سے اکثر مسلمان ہر وہ اقدام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں جس سے دھارا پسند کہلوا سکیں۔ محمد علی چھاگلہ اور ان کی قبیل کے سب سیاست دان اسی دھارا پسند گروپ سے تعلق رکھتے ہیں اور طوفانی لہروں کے تیز دھارے میں سوکھی لکڑی کی طرح بہے جا رہے ہیں۔"

یہ تجزیہ بہت کچھ تفصیل چاہتا ہے لیکن ڈوگر اس حد تک تفصیل میں جانے کا قائل نہیں۔ وہ تاریخ میں سفرنامہ لکھ رہا ہے اور سفرنامے کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ اب اس کے اندر کا فن کار صحافت کے بوجھ تلے سے صحیح و سلامت نکل آیا ہے اور الحمد للہ زندہ ہے۔ ڈوگر کی یہ کتاب پاکستانی نقطہ نظر سے لکھا ہوا پہلا کامیاب طبع شدہ سفرنامہ ہے اور پاکستان کو اس پر بجا طور پر فخر کرنا چاہیئے۔

OO

چہرہ بچہرہ رُو برُو

مصنفہ: جمیلہ ہاشمی مُبتصر: سراج منیر

منی ایچر مصوری مشرق میں فن کی بنیادی ہیئتوں میں سے ایک ہے۔ غزل اور ہائیکو کی طرح۔ اس طرزِ اظہار میں بنیادی شئے کرافٹ پر مکمل گرفت اور وژن کا ارتکاز ہے۔ اس لیے کہ نازک تفصیلات کی باہم در آویزاں لکیروں سے ایک ایسے در و بست کو تخلیق کرنا جو کائناتوں میں پھیلے ہوتے اسرار کو ظاہر کرنے کی سکت رکھتا ہو، احساس کے توازن اور ضبط کی تربیت سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ ضبط کے معنی ہیں تاثرات، احساسات اور احوال کو اپنی شخصیت میں گردش دیتے رہنا یہاں تک کہ خود اپنے دباؤ اور حرارت سے ان کی کیمیائی ساخت ہی بدل جائے۔ بعض اوقات یہ دباؤ اور حرارت ایک سطح پر خود اپنے آپ کو ظاہر کر دیتا ہے، ایک شعلہ کی لپک کی طرح یا ایک فوارہ نور کی مانند۔ قرۃ العین طاہرہ ایسا ہی ایک کردار ہے۔ عجمی تاریخ کی وہ کمزور پرت جہاں صدیوں کے سوال، پیہم انتظار سے پیدا ہونے والی جذباتی شدت، مظلومیت کی گونج سے جنم لینے والی قوت، سب یک دفت ایک آتش فشانی گرج کے ساتھ پھوٹ نکلتے ہیں لیکن اس کردار کی کہانی کے لیے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ منی ایچر مصوری تھے سے ضبط اور توازن کا تقاضا کرتا ہے۔ ناولٹ کا اسلوب اپنی بنیادی حیثیت میں منی ایچر کے اسلوب سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی کتاب "چہرہ بہ چہرہ رو برو" ایک مشکل کردار کو ایک مشکل طرز میں برتنے کا مسئلہ ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اگر اس کردار کو ناول میں برتا جاتا تو مسئلہ کافی آسان ہوتا اس لیے کہ ناول نگار کے سامنے ارتکاز کے ذریعے تاثر کو تخلیق کرنے کا مسئلہ نہیں

ہوتا۔ افسانہ بھی اس کردار کو اچھی طرح نبھا سکتا ہے۔ اس کے پس منظر کے تقاضے اتنے اہم نہیں ہوتے۔ اگر زاویہ نظر کو قرۃ العین طاہرہ پر ہی مرتکز کر دیا جاتے اور اس کی "انفرادی فطرت" سے کہانی بنی جاتی تو کہانی کامیاب ہو سکتی ہے۔ "زریں تاج" کی مثال سامنے ہے۔ اپنی کمزوریوں کے باوجود ایک کامیاب کہانی ہے۔ مگر ناولٹ اور قرۃ العین طاہرہ کا کردار ـــ یہ ایک مشکل کھیل ہے۔

بعض تاریخی کرداروں میں تخلیقی ادب کا موضوع بننے کی ایک خاص صلاحیت ہوتی ہے اور قرۃ العین طاہرہ ان میں سے ایک ہے لیکن تاریخی کردار کی تخیئلی بازیافت بہت مشکل امر اس طرح ہے کہ تخیل کو کردار تراشی کے لیے محدود میدان ملتا ہے۔ واقعات و روایات کا ایک ذخیرہ پہلے سے فراہم ہوتا ہے، اس سے بہت زیادہ دور نہیں نکلا جا سکتا۔ اسی لیے تاریخی کرداروں میں تخلیقی ادب کا موضوع بنتے ہوتے سپاٹ اور بے تہہ ہو جانے کے خطرات کہیں زیادہ قوی ہو جاتے ہیں۔ حقیقت کے مقابلے میں افسانے کے ناکام رہ جانے کا امکان ہمہ وقت موجود ہوتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے لیے طاہرہ کے کردار کو حقیقت اور خواب کی درمیانی سرحد پر سہارتے ہوئے لے جانا ایک مشکل کام تھا اور اس مشکل مرحلے پر کلارا ایچ کے ناول "طاہرہ" کی یکسر ناکامی ہمارے سامنے ہے۔

قرۃ العین طاہرہ کے کردار کی جہتیں زیادہ ہیں ـــ اس کا سیاسی اور سماجی منظر نامہ، اس کی فطرت کی مخصوص تخلیقی اور جمالیاتی افتاد، اس کی نفسیاتی ساخت، روحانی شورش، مابعد الطبیعیاتی تشنگی اور عجمی نسائیت کا گہرا رنگ یہ سب آپس میں مدغم ہو کر ایک بسیط حقیقت بن جاتے ہیں اور ان عناصر کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جمیلہ ہاشمی نے اس کردار کو ایک طویل تاریخ کے تناظر میں رکھ کر دیکھا ہے جس کے ظاہری اور باطنی عناصر اور جس کے اٹل الہیاتی سوال خود اس شخصیت کی ساخت میں شامل ہیں۔ تاریخ کے مختلف رنگ بار بار اس کی شخصیت پر لرزتے ہیں اور گم ہو جاتے ہیں۔ کربلا کا المیہ ہمہ وقت پس منظر میں زندہ ایک بنیادی وجودیاتی (ONTOLOGICAL) حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ قرۃ العین کی روحانی شورش کو جس طرح جمیلہ ہاشمی نے قبول کیا ہے اس پر عجمی سری روایتوں کا اثر واضح ہے اور اس کی نوعیت ایسی ہے کہ منصور حلاج کی شخصیت بار بار طاہرہ کے کردار پر پیرا میوز ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ منصور حلاج کے ہاں مسئلہ خالصتاً مابعد الطبیعیاتی ہے اور طاہرہ کے ہاں اس کا تعلق تاریخ اور ورائے تاریخ (META HISTORY) سے ہے۔ بہرکیف تاریخ اور الہیات کے یہ سارے تصادمات جب ایک نسائی نفسیات کے پیچیدہ کیمیائی عمل سے گذر کر ظاہر ہوتے ہیں تو معاشرے اور سیاسی نظام کی بہت سی پرتیں چیخ جاتی ہیں اور طاہرہ کے اپنے باطنی سوالوں سے جنم لینے والے فیصلے گروہوں کی تقدیر بن جاتے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے ان تمام جہتوں کو نظر میں رکھا ہے اور ایک متوازن طریقے پر بڑی مہارت سے انہیں آگے بڑھایا ہے۔ اس ناولٹ کی کامیابی کا اندازہ صحیح معنوں میں ہمیں کلارا ایچ کے ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے ہوتا ہے۔ کلارا ایچ کے لیے طاہرہ کے مابعد الطبیعیاتی بحران کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اس کے نزدیک طاہرہ کی اولین حیثیت عورتوں کی آزادی کے لیے جد و جہد کرنے والی ایک سماجی، سیاسی کارکن کی ہے۔

چنانچہ، اب اس کردار کا منطقی تقاضہ موقع بہ موقع عورتوں کی آزادی کے لیے جذباتی تقریروں کی فراہمی ہے۔ اب اس کردار کا منطقی تقاضا یہ تھا کہ مردوں کو ظالم دکھایا جاتا۔ چنانچہ اس کوشش میں ملا محمد اور طاہرہ کے پیچیدہ نفسیاتی رشتے کو جس طرح فارمولے میں ڈھال کر اسے مضحکہ خیز بنایا گیا ہے وہ اپنی جگہ خود ایک شاہکار ہے۔ حالانکہ ملا محمد اور طاہرہ کے درمیان بہت آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی مغائرت ایک نازک برتاؤ کا تقاضا کرتی تھی۔

ناول دیکھنے سے مشرق کی تاریخ، سری روایتوں کے اثرات کی اہمیت اور ایران کی سماجی زندگی۔ ان سب سے کلارا ایج کی ناواقفیت مسلم ہو جاتی ہے۔ اس کو چھپانے کے لیے جگہ جگہ مشرقی کھانوں کی طویل فہرستوں اور "ہودے" کے ذکر اور غلاموں کے افسانوی آداب کے بیان سے کام لیا گیا ہے۔ قرۃ العین طاہرہ کے مذہبی علم کا ثبوت دینے کے لیے وقتاً فوقتاً قرآن کریم کی آیتوں کے حوالے بھی ہیں۔ سماجی زندگی اور اس کے مخصوص آداب سے واقفیت کا عالم یہ ہے کہ ابتدائی صفحات میں ہی طاہرہ اور اس کے باپ کے درمیان خود طاہرہ کی شادی کے بارے میں دو دو صفحوں کے جذباتی مکالمے درج ہیں۔ جو مجموعی خاکہ اس ناول سے ذہن میں آتا ہے وہ ایک جدید عامی، کارکن کا سا ہے جو حق اصلاح میں انقلابی بن کر حکومت وقت سے ٹکر لینی پڑتی ہے اور پھر وہ مظلومیت کی موت ماری جاتی ہے۔

اس سے کہیں اچھی کردار نگاری تو مارتھا روٹ کی کتاب[1] میں ملتی ہے جو طاہرہ کی ایک عقیدت مندانہ سوانح عمری ہے اور جس کے واقعات پر کلارا ایج اور جمیلہ ہاشمی دونوں نے کافی حد تک انحصار کیا ہے۔ اصل میں مغرب میں طاہرہ کا تصور بنیادی طور پر یہ ہی رہی جس کو کسی حد تک کلارا ایج نے پیش کیا ہے۔ یہ اور بات کہ مصنفہ کی بے بصیرتی اور تخیل کی کمی نے اس کردار کو زیادہ میکانیکی اور چوبی بنا دیا ہے۔ شوقی آفندی کے ہاتھوں بہائی تحریک کی جو درگت بنی ہے اور اسے جس طرح متشرف بہ مغرب کیا گیا ہے اس سے طاہرہ کی یہی صورت ابھر سکتی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مبلغوں کی ناول نگاری سے ہم اس سے بہتر نتائج کی امید بھی نہیں رکھ سکتے۔ مقصود کلام یہ ہے کہ کلارا ایج کے ہاں قرۃ العین طاہرہ ایک محرف کردار ہے جس کے سر مغربی آئیڈیل منڈھ دیئے گئے ہیں اور جو اپنی باطنی جہت اور اپنے وجود کے بنیادی بحران سے عاری ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے طاہرہ کا تعارف ہی اس کی تخلیقی اور جمالیاتی جہت سے کرایا ہے اور آہستہ آہستہ اسے مرتفع کر کے اس کے مابعد الطبیعیاتی سوالوں اور روحانی بحران میں مدغم کر دیا ہے۔ اس کردار کو خواب اور حقیقت کی سرحد پر زندہ رکھنے کے لیے ایک مرتکز تاثراتی بیان استعمال کیا گیا ہے جو اکثر جگہ مونولاگ کی کیفیت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن لسانی دروبست میں جمیلہ ہاشمی نے اس مہارت کا مظاہرہ نہیں کیا ہے جو کردار سازی، تاریخ اور شخصیت کے باہم عمل اور ردعمل کی تشکیل میں نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک کہانی کار اپنے کردار کو روتا ہوا دیکھتا ہے اس وقت تک تو درست ہے لیکن جس لمحے وہ اس کے ساتھ شامل ہو کر گریہ کرنے لگے لسانی دروبست کا قوام بگڑ جاتا ہے۔ یہی کیفیت کہیں کہیں اس ناولٹ میں دکھائی دیتی ہے۔ جو سری روائتیں قرۃ العین طاہرہ کی ذات سے ظہور پاتی ہیں ان کے مابعد الطبیعیاتی رموز

---

[1] MARTHA ROOT. TAHIKA THE PURE KARACHI 1938

پر ایک ناولٹ نگار کی حیثیت سے جمیلہ ہاشمی کی گرفت بہت اچھی ہے۔ پھر وہ مقامات جہاں طاہرہ کے انتظار اور عشق کا ذاتی جذبہ شیعہ نظام فکر کے ایک بنیادی اصول کے ساتھ مشخص ہوتا ہے، اس عمل کا مطالعہ بھی نہایت ماہرانہ اور متوازن ہے چنانچہ اسی لیے جمیلہ ہاشمی کو طاہرہ کی شخصیت کی باطنی جہت کو عجمی سری روایتوں سے مربوط کر کے دیکھ سکنے کی اور یہ مطالعہ کرنے کی آسانی حاصل ہے کہ ایک طویل روایت کو HAUNT کرتے ہوئے سوال جب ایک شخصیت کا وجودی مسئلہ بنتے ہیں تو اس کے سیاسی اور سماجی اثرات کیا ہوتے۔

بیان کی تکنیک میں کہیں کہیں جس طرح جذبات سطح پر نمودار ہو جاتے ہیں اس کے سقم کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں لیکن مختلف تصویروں کو ایک دوسرے پر مرکوز کرنے اور پھر ایک کو مٹا کر دوسرے کو ابھارنے کے عمل کو جمیلہ ہاشمی نے بڑی مہارت سے برتا ہے۔ قرۃ العین طاہرہ کی کہانی ایک تسلسل میں جاری رہتی ہے اور یادیں، تاریخ کے ادوار، مماثل ایسے اور سوال آڑی ترچھی لکیروں میں اسے کاٹتے ہوئے گذرتے ہیں۔ پھر اس سارے عمل میں دوہرے تناظر کا ہیہم عمل اور ایک ناظر کی دوسرے سے تبدیلی بہت کامیابی سے عمل میں آتی ہے۔ ایک نگاہ خود مصنف کی ہے اور دوسری قرۃ العین طاہرہ کی ۔ یہ دونوں ہم آہنگ بھی ہوتی ہیں اور گاہے متوازی بھی چلتی ہیں اس طرح دو پیٹرن باہم آمیخت ہو جاتے ہیں۔ طاہرہ کی زندگی اور تاریخ دونوں آمنے سامنے ایک دوسرے کو منعکس کرتے رہتے ہیں، مدغم ہوتے ہیں اور متصادم بھی۔ اس تکنیک کے ذریعے تاثر کی توسیع کرنے اور اسے مرتکز کرنے کا عمل ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی تخلیقی کش مکش اس ناولٹ کے اہم ترین عناصر میں سے ہے۔

طاہرہ کی شخصیت اور سیاسی صورت حال کے ساتھ اس کے تصادم کے سلسلے میں جس نے ایک طرح سے طاہرہ کی شخصیت کے باطنی اور نفسیاتی پہلو کو نظروں سے اوجھل کر دیا تھا، ایک بہت متوازن طریقۂ کار اختیار کیا گیا ہے۔ یہ تصادم یکایک ظہور پذیر نہیں ہوتا بلکہ آہستہ آہستہ پنپ پاتا ہے۔ زرین تاج کا قرۃ العین اور قرۃ العین کا ام العالم بننا مختلف مدارج ہیں اور ایک بحران کے ارتقا کی مختلف سطحیں ہیں۔ کہانی کی سطح پر اہم ترچیز قرۃ العین طاہرہ کا تکمیل یافتہ کردار نہیں بلکہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے یہ کردار مختلف مدارج سے گزرتا مختلف سوالوں کی گونج سے ہوتا ہوا اپنے آخری المیے کی طرف بڑھتا ہے۔ افتخار جالب کو اس ناولٹ پر یہ اعتراض ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے قرۃ العین کو کمزور اور گھریلو عورت کہہ دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس شخصیت کے بارے میں کہ جس نے ایران کے سیاسی منظر کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ ایسے کلمات کہنا جمیلہ ہاشمی کی اپنی لاشعوری الجھنوں کا نتیجہ ہے اور عزیز احمد کی " زرین تاج " کے لیے توہین کے مترادف ہے۔ عزیز احمد کے زرین تاج کی کرداری ساخت کے بارے میں گفتگو یہاں بے محل ہوگی۔ ویسے شاید افتخار جالب کا خیال ہے کہ قرۃ العین طاہرہ نے اپنی پیدائش کے دن ہی ایرانی شہنشاہیت اور وہاں کے مخصوص مذہبی نظام سے ٹکر لے لی تھی۔ حالانکہ اس کردار کا کمال ہی یہ ہے کہ اس کے باطن میں وہی مشرق کی کمزور اور نازک عورت ہے لیکن اس کے سماجی ماحول کی گھٹن، اس کی تخلیقی افتاد، ما بعد الطبیعیاتی سوالوں کی گونج اور ازلی مظلومیت کا پیہم تاثر یہ سب مل کر آہستہ آہستہ ایک قابو یافتہ شدت کے ساتھ اس " عظیم نسائی زلزلے " کو تکمیل بخشتے ہیں جس کا نام قرۃ العین طاہرہ ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ افتخار جالب کے ذہن میں بھی کلارا ایبک کی طرح قرۃ العین طاہرہ کی حیثیت ایک انقلابی سیاسی سماجی کارکن سے زیادہ نہیں ہے۔ ممکن ہے افتخار جالب خود اپنی مرحوم انقلابیت

سکے پرتو "چہرہ بہ چہرہ رو برو" میں طاہرہ کے کردار میں تلاش کر رہے ہوں حالانکہ طاہرہ کی صورت حال میں سیاسی پرت کا چھٹنا ایک ثانوی عمل ہے جو اس کے کہیں گہرے سوالوں کی گونج کے لازمی نتیجے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے یہ سارا داخلی رزمیہ ایک نازک عورت کی نفسیات سے ہی ترتیب دیا ہے جو اپنے سوالوں کی گونج سے اور ان کے دباؤ سے اپنی نزاکت کو قوت بنا لیتی ہے۔ ایک پیہم انتخاب کے ذریعے۔

"چہرہ بہ چہرہ رو برو" اس طور اردو کے بڑے تاریخی ناولوں سے الگ ہے کہ ان میں عموماً ناول نگار ایک دیکھنے والے کی حیثیت میں کھڑا ہو کر دیکھتا ہے کہ تاریخ کس طرح انسانوں کی اٹل تقدیر بن گئی ہے یہاں جمیلہ ہاشمی نے ایک جہت کا اضافہ یہ کیا کہ کردار کے داخل سے اس بات کا مطالعہ کیا ہے کہ موجود تاریخ کس طرح ایک شخصیت کی تعمیر میں شامل ہوتی ہے اور پھر کیسے اس کی کیمیادی حیثیت بدل جاتی ہے اور ایک انسانی میڈیم سے گزرنے کے بعد اس کی ساخت کیا ہوتی ہے۔ اس سارے عمل کے مطالعے کے لیے بہت چھوٹی چھوٹی لکیروں سے منظر بنائے گئے ہیں، مرتکز اور شدید تاثر کے نقطے خلق کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب کردار اور تاریخ کے رشتے کے مطالعے کی حیثیت سے تو خیر بہت اہم ہے ہی، اردو ناولٹ کی روایت میں ایک منفرد اضافہ بھی ہے اور خود جمیلہ ہاشمی کے ہاں فن کی ایک نئی اور انوکھی سطح۔

○○

حسرتِ تعمیر

تصنیف: میرزا ادیب   مبصر: سید اختر جعفری

میرزا ادیب کا شمار اردو ادب کے ان چوٹی کے ادبا میں ہوتا ہے جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو داستان، ڈرامہ، افسانہ اور تنقید کے علاوہ بھی بہت کچھ دیا ہے۔ جس سے ان کی شخصیت اور فن کے بہت سے پہلو سامنے آئے ہیں۔

صحرانورد کے خطوط، رومان میں وہ ایک داستان گو، ہوا اور قالین، آنسو اور ستارے، شیشے کی دیوار، ستون، فصیل شب، پس پردہ، خاک نشین اور شیشہ و سنگ میں وہ اردو کے بلند مرتبہ ڈرامہ نگار نظر آتے ہیں۔ اسی طرح، جنگل، کمبل اور حسرت تعمیر ان کے افسانوں کے مجموعے دیکھ کر ان کی افسانہ نگاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

حسرتِ تعمیر اُن کے سترہ تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے اور اس مجموعہ کے تمام افسانے زمان و مکان کی وحدت کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں اور ان افسانوں کا بھاٹی گیٹ لاہور کے محلہ ستھاں کے چوک دیوی دتا سے تعلق ہے۔ جہاں میرزا ادیب کا بچپن اور عنفوانِ شباب کا زمانہ گزرا ہے۔ اس نوجوانی کے زمانے میں مرزا ادیب نے اپنے ارد گرد جو کچھ مشاہدہ کیا اور محسوس کیا تھا اُسے افسانوں کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ خاصا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مرزا ادیب نے عہد گذشتہ کی تمام

تصاویر کو من و عن نہاں خانہ ذہن میں محفوظ رکھا اور لکھتے وقت نہ صرف ان تصویروں کو ہو بہو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا بلکہ ان کیفیات اور محسوسات کو بھی زبان عطا کی جن سے وہ عنفوانِ شباب میں دوچار ہوئے تھے۔

مرزا ادیب نے حسرت تعمیر کے اختتامیہ میں خود اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اُن کے بچپن اور نوجوانی کا زمانہ محلہ ستھاں میں گزرا ہے اور ان افسانوں کے کردار تقریباً وہی ہیں جنھیں انھوں نے قریب سے دیکھا ہے اور بار ہا دیکھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کرداروں کو دیکھنے کا انداز مرزا ادیب کا اپنا ہے۔ انھوں نے جس زاویے سے اِن کرداروں کا مطالعہ یا مشاہدہ کیا ہے، انہیں اسی انداز میں افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ایک اعلیٰ افسانہ نگار کی سب بڑی صفت بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں ملنے والے عام کرداروں کو بھی اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان میں سے افسانوی پہلو ڈھونڈھ نکالتا ہے اور کردار کو اس کے ماحول کے پس منظر میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی خارجی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کی داخلی شخصیت بھی قارئین کے سامنے آجاتی ہے۔ مرزا ادیب نے اس فن میں مہارت کے سبب اپنے ایک افسانہ "نشہ" میں خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ اس افسانہ میں زینب کا کردار اگرچہ بظاہر خاموش ہے، مگر اپنے اندر خیالات و جذبات کا طوفان سمیٹے ہوئے ہے ایسے چپ چاپ کردار جب لاوے کی طرح پھٹتے ہیں تو اپنے اردگرد کی زمین کو بھی بنجر بنا دیتے ہیں۔

مرزا ادیب نے محلہ ستھاں کے ان کرداروں کو ایک اچھوتے انداز سے متعارف کرایا ہے کہ قاری کو قطعاً پتہ نہیں چلتا کہ کونسا کردار سیدھا راستہ چلتے چلتے کب کوئی موڑ مڑ جائے اور کب اس میں اچانک تبدیلی رونما ہو جائے؟

کاکا چڑیمار ایک ایسا ہی عجیب و غریب کردار ہے جو اپنے بیٹے طفیل کی اس لیے ٹانگیں توڑنا چاہتا ہے کہ اس نے طوائف کے کوٹھے پر جانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن افسانہ کے آخر میں یہی کاکا چڑیمار رات کے اندھیرے میں اپنی بہو طوائف خورشید کو اس وقت لالٹین پکڑاتا ہے جب وہ گھر کا سارا قیمتی اثاثہ سمیٹ کر اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہوتی ہے۔

حسرتِ تعمیر کے اِن افسانوں کی جس خصوصیت نے مجھے بیحد متاثر کیا ہے وہ جزئیات نگاری ہے۔ افسانہ نگار نے نہایت چابکدستی سے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ملا کر بڑے کینوس پر بڑی خوبصورت تصاویر بنائی ہیں۔ یہی جزئیات جہاں مرزا ادیب کے افسانوں میں پس منظر کا کام دیتی ہیں، وہاں اُن کے کرداروں کی داخلی کیفیات، قلبی واردات، بود و باش، طرزِ معاشرت اور اندازِ فکر کی بھی نشاندہی کرتی ہیں

"آپا کی مرغی" والے افسانے میں گوگی مرغی کا خیری کی پنڈلی پر ٹھونگا مارنا، خیری کا اسے دوپٹے سے پکڑ کر مٹی میں بند کر کے اوپر روزنی توا رکھ دینا۔ ایسی چھوٹی باتیں ہیں۔ جو مل کر پورے ماحول کی عمدہ تصویر پیش کرتی ہیں۔ جزئیات نگاری کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

اسی بے قراری کی شدت میں میری انگلیاں اپنے ناخنوں سے دری کے اوپر جمے ہوئے پلاؤ کے ان دانوں کو اکھیڑنے میں معروف تھیں جو دو چار دن پہلے وہاں گر پڑے تھے اور شادی بیاہ کے لیے برتن دینے والے حاجی اللہ دین کے آدمیوں نے بھی ان دریوں کو صاف نہیں کیا تھا۔"

ماضی قریب میں ہماری اکثر بڑی بوڑھیاں حقے کا شغل رکھتی تھیں۔ بعض تو پیٹ کی بیماریوں کی وجہ سے حقہ پیا کرتی تھیں اور بعض کو اپنی ہم عمر عورتوں یا خاوند کی حقہ نوشی سے یہ لت پڑ جاتی تھی۔ وہ عورتیں کس طرح اور کیوں حقہ پیا کرتی تھیں، مرزا ادیب نے اپنی باریک بین نگاہوں سے ان کا خوب مشاہدہ کیا ہے۔ لہٰذا ان کے افسانوں میں خیری کی مچی، سوہنی کمہارن والی دادی اور نیلم پری کی ساس بھی بوڑھی عورتیں حقے سے شغل رکھتی ہیں۔ افسانہ نگار نے ان کے حقہ پینے کے انداز سے ان کی باطنی بے قراری یا سکون کو ظاہر کرنے کا کام لیا ہے۔

حسرت تعمیر کے بیشتر افسانے نوخیزی اور نوبلوغی عمر کے افسانے ہیں۔ اس نوخیزی کی عمر میں انسان لڑکپن اور جوانی کی سرحد پر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ نئے جذبات، کیفیات اور قوت سے آشنا ہوتا ہے اس میں خود اعتمادی، نرگسیت اور توانائی جنم لیتی ہے اور اس عمر میں پیش آنے والے واقعات شعور اور لاشعور کی گہرائیوں میں مرتسم ہو جاتے ہیں۔ مرزا ادیب کے افسانہ نیلم پری، سوہنی کمہارن کے مرکزی کردار ایسے ہی نوجوان طالب علم ہیں۔ افسانہ نگار نے ان کی نفسیات کے حوالے سے ان کی جذباتی اور معاشرتی زندگی کی کمال ترجمانی کی ہے۔

مرزا ادیب کو عام فہم مگر دلچسپ افسانوی زبان لکھنے پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ ان کے بعض چھوٹے چھوٹے جملے اپنے اندر جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ہیں اور ان مختصر جملوں کے پیچھے لامتناہی خیالات و واقعات کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ چنانچہ ان جملوں کا علامتی انداز مرئی اشیاء سے کئی ایک غیر مرئی اشیاء کا تصور ابھارتا ہے اگرچہ یہ جملے اپنے سیاق و سباق میں بے حد لطف دیتے ہیں مگر انفرادی حیثیت میں بھی اپنا حسن اور ادبی چاشنی برقرار رکھتے ہیں۔ مثلاً افسانہ نشہ میں اشرف ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اپنی بیوی زینب کو مٹھائی کا لفافہ اور پان لا کر دیتا ہے۔

"رقم کے ساتھ اشرف بیوی کو مٹھائی کا لفافہ اور طرح طرح کے مصالحوں سے بھرا ہوا، کاغذ میں لپٹا ہوا، ایک پان بھی دے دیتا تھا اور زینب کو آرڈر تھا کہ پان سنبھال

کریگے تماٹ کے دس گیارہ بجے کھائے گا۔"

مرزا ادیب کے ان افسانوں میں لذت پرستی، لذت کوشی یا جنسی ترغیب قطعاً نہیں ہے بلکہ ایک پاکیزہ صالح معاشرہ اور سادہ ماحول ہے۔ سیدھے سادے لوگ ہیں جن کے دل محبت کے جذبات سے لبریز ہیں۔

بہرکیف نئے اور اچھوتے موضوعات پر تکرار سے دامن بچا کر ایک طویل عرصے تک لکھنا مرزا ادیب کا ہی حصہ ہے۔ حسرت تعمیر اردو افسانے میں یقیناً ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

کتابت کی چند ایک اغلاط کے باوجود کتابت معیاری اور طباعت نہایت عمدہ ہے۔

OO

اس وقت میرے سامنے ڈاکٹر سلیم اختر کی مشہور تالیف "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کا چھٹا اضافہ شدہ ایڈیشن

اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

مصنف: ڈاکٹر سلیم اختر مبصر: مشکور حسین یاد

رکھا ہے کتاب کا آغاز حسب دستور اردو زبان کی لسانیات سے ہوتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کی وسعت مطالعہ نے اس آغاز کو بھی اختصار کے باوجود کمال پر پہنچا دیا ہے یعنی آپ کو اردو زبان کے مختلف ناموں اور اس کے آغاز کے بارے میں جدید ترین تحقیقات سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ اردو کے مختلف ناموں کی بحث کو ڈاکٹر موصوف نے اے ڈی اظہر کے مقالہ تک لاکر چھوڑا جس میں اظہر صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جب روس کی زبان کو روسی، چین کی زبان کو چینی، جاپان کی زبان کو جاپانی کہا جاتا ہے تو پھر پاکستان کی زبان اردو کو پاکستانی کیوں نہ کہا جائے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے محض اے۔ ڈی اظہر کے مقالہ کے حوالے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ موصوف نے اس مقالے کے منطقی مغالطے پر اظہار خیال بھی فرمایا اور قارئین کو متنبہ کیا ہے کہ اردو کو پاکستانی کہنا اردو زبان کے ساتھ انصاف نہ ہوگا۔ یہ اُسے محدود کر دینے کے مترادف ہے۔

اردو کے ناموں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس بحث کا آغاز کیا ہے کہ اردو کس طرح وجود میں آئی۔ اس موضوع کو بھی ڈاکٹر صاحب کے تبحر علمی نے وہی بات کہ اختصار کے باوجود بے حد دلچسپ اور معلومات افزا بنا دیا ہے۔ موصوف نے اردو کے آغاز سے متعلق جدید ترین نظریات کو اپنی اس مختصر سی کتاب میں اس خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اجمال میں تفصیل کے سارے لطف

پیدا ہو گئے ہیں۔

عام طور پر اردو کی عمر چار پانچ صدیوں سے زیادہ نہیں بتائی جاتی لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے جدید ترین تحقیقات کے پیش نظر اس کی عمر کو قدیم ویدوں سے بھی آگے بڑھا دی ہے۔ اس ضمن میں موصوف نے پہلے ڈاکٹر سہیل بخاری کے مقالہ کا حوالہ دے کر انہیں یہ بتایا ہے کہ اردو ہندو مسلم ملاپ کا نتیجہ ہرگز نہیں ہے اس کے الفاظ تو آریاؤں کی اولین کتاب رگ وید میں موجود ہیں سہیل بخاری کے نظریہ کے مطابق اردو کا اصل گھر مہاراشٹر کا مشرقی علاقہ ہے اور یوں اردو و مرہٹی کی سگی بہن قرار پاتی ہے اور پھر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ عین الحق فرید کوٹی کے نظریہ کے مطابق اردو ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی دراوڑی زبانوں سے پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح بے چاری سنسکرت بھی اردو زبان سے کہیں پیچھے جا پڑتی ہے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں۔ سنسکرت کا تعلق آریاؤں سے ہے اور آریاؤں کی زبان کو دراوڑی زبانوں نے متاثر کیا تھا۔ جن کا تعلق ہماری اردو زبان سے۔ براہ راست نکلتا ہے۔ غرض ڈاکٹر سلیم اختر نے لسانیات کے خشک سے موضوع کو بھی اپنی صداقت پر مبنی بیانہ ندرت سے نہایت دلچسپ بنا ڈالا ہے جدید تحقیق کے اقتباسات کے ساتھ ڈاکٹر موصوف جب اپنی رائے کا اظہار فرماتے ہیں تو قاری کے ذہن کو مزید جلا ملتی ہے۔ وہ پڑھنے والے کو قدم قدم پر افراط و تفریط کا شکار ہونے سے بچانے کی سعی میں مصروف رہتے ہیں اور ایسے ہی مقامات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کس طرح ایک تالیف و تصنیف کے درجہ پر فائز کیا جا سکتا ہے

" جنوبی ہند میں اردو " یہ ہماری زیر بحث کتاب کے تیسرے باب کا عنوان ہے ڈاکٹر سلیم اختر اس باب کے آغاز ہی میں دو چار واضح جملے لکھنے کے بعد کس قدر سچی اور خوبصورت بات کہتے ہیں۔ "جنوبی ہند میں اردو نے ایک باقاعدہ زبان کا رتبہ حاصل کر کے مخصوص ادبی اصناف میں تخلیقات کے چراغ فروزاں کئے جب کہ شمالی ہند کے گلشن فارسی میں اردو ابھی محض سبزہ بیگانہ کی حیثیت ہی رکھتی تھی تا خوبصورت بات کا ذکر آیا ہے تو اسی باب کی ایک اور خوبصورت بات ملاحظہ فرماتے چلیے۔ قلی قطب شاہ جنوبی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ یہ بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ عاشق مزاج بھی بلا کا تھا اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ اس بادشاہ شاعر نے اپنے کلیات میں ۱۹ معشوقوں کا ذکر کیا ہے۔ چلیئے بات یہیں ختم ہو جاتی تو یہ ایک عام سی معلومات کے علاوہ اور کچھ نہ تھی لیکن ہمارے مؤلف نے اس اطلاع کو مزید خوبصورت اس طرح بنایا کہ کتاب کے حاشیے میں ان ۱۹ معشوقوں میں سے بارہ کے نام بھی لکھ دیئے راقم الحروف کو تو مؤلف کی یہ ادا بہت ہی بھلی لگی ہے۔ لایئے جب تک آپ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی اس کتاب کا باقاعدہ مطالعہ فرمائیں اتنے میں آپ کو ان معشوقوں کے نام کیوں نہ بتا دیئے جائیں۔

وہ نام یہ ہیں۔ ننھی، سانولی، کنولی، پیاری، گوری، چھبیلی، لالہ، موہن، لالن، محبوب، مشتری

حیدر محل۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اجمال کے باوجود کتاب کا دلچسپ تفصیلی پہلو بھی حتی المقدور مولف نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اسی باب میں اردو کی پہلی شاعرہ پر بھی بحث ہوئی ہے پہلے ماہ لقا چندا کو پہلی شاعرہ بتایا جاتا تھا۔ جدید تحقیق نے یہ سہرا لطف النساء امتیاز کے سر باندھ دیا ہے امتیاز کا ایک شعر سنیئے۔

ہم سے نظروں کو چرا غیروں سے کرتا باتیں
رس بھری آنکھیں پھرا کر وہ رسیلا میرا

اس بحث کے علاوہ اس باب کے اہم موضوع دکھنی غزل اور دکھنی ادب کی اہمیت ہے۔ لیکن یہاں بھی ہمارے ڈاکٹر صاحب نہایت مختصر الفاظ میں نہایت پتے کی باتیں کہہ گئے ہیں اور ان کی یہ باتیں محققین اور اہل قلم کے لیے مہمیز کا بہت کچھ سامان مہیا کرتی ہیں۔

چوتھا باب "شمالی ہند میں اردو" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ اس عنوان کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس میں شاہ حاتم، شاکر ناجی، مظہر جان جاناں، مصطفیٰ یکرنگ، میر اور سودا کا ذکر ہوگا لیکن ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے یہاں بھی ایک محققانہ جدت سے کام لیا ہے۔ اس باب کا آغاز افضل کے عشق سے ہوتا ہے اور پھر اگلا عنوان خاصا چونکا دینے والا ہے یعنی چکوال میں اردو۔ یہ لیجئے ان حضرت نے خان پور ضلع چکوال کا ایک شاعر شاہ مراد ڈھونڈ نکالا۔ ویسے تو یہ صوفی شاعر ولی کا ہمعصر لیکن بقول ڈاکٹر موصوف اس کی زبان کی صفائی ولی سے کسی طرح کم نہیں۔ سراج الدین علی خاں آرزو کی شخصیت اپنے زمانے کی بڑی علمی شخصیت تھی۔

اس ضمن میں بھی ڈاکٹر سلیم اختر بڑے کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ شاہ حاتم کی لسانیات کے پیش نظر صحیح طور پر کیا حیثیت متعین ہوتی ہے آپ کو اس مختصر ترین تاریخ ادب اردو میں یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اختصار کے مدنظر اگر ڈاکٹر صاحب سرسری نگاہ ڈال کر بھی گذر جاتے تو ہمیں شکایت کا حق نہیں پہنچتا تھا لیکن مولف نے شاہ حاتم کی اس حیثیت کی اہمیت کو فراموش نہیں ہونے دیا۔ میر تقی میر کے ذکر میں ڈاکٹر سلیم اختر کو اسعد کی "غیر نفسیاتی" تنقید سے یہ شکایت ہے کہ اس تنقید کی وجہ سے میر کی جنس دب کر رہ گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر موصوف نے میر کے کلام کا بطور خاص مطالعہ کیا ہے ورنہ میر تو خیر عظیم شاعر ہے یہ جنس تو ایسی نامراد چیز ہے کہ ایک معمولی سے شاعر کے یہاں بھی کسی طور دبائے نہیں دبتی۔ البتہ دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ عمدہ شاعری میں جنس کس طرح ابھر کر سامنے آئی ہے۔ معیاری اور غیر معیاری اشعار ہر بڑے سے بڑے شاعر کے یہاں موجود ہوتے ہیں میر اس سے کس طرح مستثنیٰ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ غیر معیاری اشعار کے پیش نظر میر کی جنس کا اندازہ لگانا ہمارے

خیال میں صحیح تنقید نہ ہوگی۔ ورنہ جہاں تک جنس کے ابھر کر سامنے آنے کا سوال ہے ان مشہور اشعار میں بھی بڑے زوردار انداز میں سامنے آئی ہے اور ان اشعار کو ثقہ لوگ بھی مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے　　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بھوسے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

پانچواں باب لکھنؤ کے دبستان شاعری سے متعلق ہے۔ دبستان شاعری سے قطع نظر اگر آپ لکھنؤ کے نوابوں کا حیرت انگیز اور عبرت خیز حال معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا صرف ۲ صفحہ یعنی ۱۱۵ اور ۱۱۶ پورا پڑھ جائیے تمام نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے گا اور اس حوالے سے لکھنؤ کی شاعری کی زبوں حالی کے اسباب بھی واضح ہو جائیں گے لکھنؤ کے دبستان کو سمجھنے کے بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے نہایت اہم بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں" لکھنؤ کے دبستان شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس امر کو ذہن نشین رکھنا لازم ہے کہ لکھنؤ کے بیشتر نامور شعراء بذات خود لکھنؤ کے نہ تھے" اسی باب میں مرثیہ اور مثنوی پر بھی ڈاکٹر صاحب کی تنقید خاصے کی چیز ہے۔ چھٹا باب اردو نثر اور مستشرقین کے بارے میں ہے یہاں بھی ڈاکٹر صاحب نے کسی ضروری بات کو فراموش نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور گارساں دتاسی سے متعلق جملہ ضروری معلومات نہایت سلیقے کے ساتھ فراہم کردی ہیں۔ ساتواں باب فورٹ ولیم کالج کے

کے بیان سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن یہاں بھی سلیم اختر صاحب نے قاری کو جدید ترین تحقیق سے پوری طرح آگاہی بخشی ہے۔ جان گل کرائسٹ کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل تھا مگر جدید تحقیق نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے چنانچہ پتہ چلا ہے کہ جان گل کرائسٹ اس کالج میں ایک پروفیسر تھا اور اس کا پرنسپل ریورنڈ ڈیوڈ براؤن نامی کوئی پادری تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جان گل کرائسٹ کی اس کالج میں بھی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ لارڈ ولزلی اس کے مشوروں پر عمل کیا کرتا تھا۔ یہ لیجئے اسی باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ میرامن کو اولین سلیس نگار نہیں سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے بقول شمالی ہند میں سلیس اردو نثر کے آغاز کا سہرا مہر چند کھتری کے سر ہے! مگر ڈاکٹر سلیم اختر باغ و بہار پر بحث کرتے ہوئے آخر میں ایک چبھتا ہوا لیکن خیال انگیز سوال اٹھاتے ہیں جو آنے والے محققین کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کیا باغ و بہار محض زبان کی وجہ سے زندہ ہے؟ میرے خیال میں تو ایسا نہیں اس میں زبان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے ورنہ آج یہ بھی بعض اور داستانوں کی مانند داستان پارینہ بن چکی ہوتی۔ جدید نثر کے آفتاب کی پہلی کرن نہ ثابت ہوتی"

آٹھویں باب میں دہلی کے نامور شعرا کا ذکر ہے۔ غالب اس کے ضمن جہاں ڈاکٹر سلیم اختر نے جدید تحقیق د

آمادر کے حوالے دیئے ہیں وہاں وہ اپنے طور پر غالب کی نرگسیت کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ نفسیات ڈاکٹر صاحب کا خاص موضوع ہے ۔ وہ جب اس پر خامہ فرسا ہوتے ہیں تو ہمارے دل میں نجانے کیوں ان سے اختلاف کرنے کو گدگدی سی اٹھتی ہے۔ تعلّی اگر نرگسیت کا دوسرا نام ہے تو اس نرگسیت سے کون شاعر بچا ہے ۔ ہماری دانست میں نرگسیت قطعی طور پر بیمار ذہنیت کی علامت ہے اس کے برعکس تعلّی کو ہم صحت مندانہ رویے کے طور پر بھی قبول کر سکتے ہیں ۔ اس صحت مند رویے کی طرف خود ڈاکٹر صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے موصوف نے کلام غالب کو مجموعی اعتبار سے دو جذباتی دھاروں کا مجموعہ کہا ہے ۔ ایک جذباتی دھارا غالب کو فن کار اور آزاد بے فکر دکھاتا ہے اور دوسرا جذباتی دھارا اسے پریشان اور رنجور انسان کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں ان جذباتی دھاروں کی وجہ سے کلام غالب دو حصوں میں تقسیم ہونے کے بجائے وسعت بے پایاں کا حامل ہو گیا ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ غالب کے یہاں زندگی کے جس قدر زاویہ ہائے نگاہ کی نمائندگی ملتی ہے اس کی مثال شاید ہی اردو شاعری میں کہیں دستیاب ہو سکے ۔ یہی تو وہ نمائندگی ہے جس نے کلام غالب کی اپیل کو عالمگیر بنا ڈالا ہے اور جس کی ہم صحیح معنوں میں داد بھی نہیں دے سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کی داد کیلئے موزوں الفاظ نہیں ہیں غالب کے بعد ذوق پر بحث کرتے ہوئے بھی ہمارے مؤلف نے جدید تنقید کے جملہ پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے لیکن ذوق کے کلام کو ایک پہلو سے محمد حسن عسکری مرحوم نے بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے مگر ہم سمجھتے ہیں یہ کوشش ایک محض ایک اشارہ ہے غالباً اسی لیے ڈاکٹر سلیم اختر نے اس پہلو کا ذکر نہیں کیا ۔ اس کے علاوہ یہ پہلو قبل از وقت بھی معلوم ہوتا ہے ۔ ابھی تو ہماری اردو تنقید مغربی انداز فکر سے ہی اپنا دامن نہیں چھڑا سکی ہے۔ کہاں اس میں یہ سکت پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے شاعروں کے کلام کو مابعد الطبیعاتی نقطہ نظر سے پرکھنا شروع کر دے محمد حسن عسکری مرحوم نے اپنے آخری دور کے مضامین میں سے ایک مضمون میں ہی کوشش کر کے دکھائی ہے ۔

ہم ابھی تک آٹھ ابواب کا ذکر کر سکے ہیں حالانکہ ہمارے مؤلف ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی زیر بحث کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ستر۷۰ ابواب پر مشتمل ہے ۔ ہم بقایا ابواب کو قارئین کے لیے چھوڑتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم جن ابواب کا ذکر کر چکے ہیں ان پر سیر حاصل تبصرہ ہو گیا یا جو ابواب باقی ہیں ان پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ ایسی بات قطعی نہیں ہے مذکورہ ابواب میں بہت سے خزانے ایسے ہیں جن کی ایک جھلک بھی ہم نہیں دکھا سکے ۔ اسی طرح جن ابواب کا ہم نے ابھی تک ذکر نہیں کیا وہ بھی بے شمار خیال افروز تحقیق و آراء سے بھرے پڑے ہیں مسئلہ اجمال کے ساتھ ایک بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ جب کوئی لکھنے والا کسی تفصیل کو اجمال کے کوزے میں بند کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری بڑھ

جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہے اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ذمہ داری کے اس بصیرت افروز احساس سے وہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتے۔ اجمال کا سب سے بڑا تقاضا بھی یہی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو بصیرت کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں بصیرت ایک خداداد عطیہ ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر انسان اپنی آنکھیں کھولے رکھے تو بصیرت اس کے دل کی گہرائیوں سے جگمگاتی ہوئی صبح کی طرح نمودار ہوتی ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ اس کے کسی گوشے کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ ظاہر ہے لکھنے والے کی نگاہ خود سورج نہیں ہوتی وہ تو سورج تخلیق کرتی ہے، یعنی جہالت اور بے خبری کے اندھیروں کو دور کرتی ہے۔ اندھیرے دور ہوتے ہیں تو تخلیق کا ایک جہان معنی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ کتاب بھی ایک جہان معنی ہے۔ ایک کوزہ ہے جس میں مطالب کا ایک دریا ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ ایسا دریا جس کی تہ میں اگر بصیرت کے بے شمار موتی ہیں تو سطح پر ذہانت کے شاداب کنول اپنی تازگی کی بہار دکھا رہے ہیں۔ آپ کو جگہ جگہ ڈاکٹر صاحب کی دانش افزا عبارت کے چمن کھلے ہوئے نظر آئیں گے۔ ان چمن ہائے رنگ رنگ سے جہاں کتاب کی رنگینی و زیبائی ہزار چند فزوں ہوگئی وہاں قاری کے لیے بہت بڑی دولت کی فراہمی کا انتظام بھی ہوگیا ہے۔ یعنی ڈاکٹر صاحب کی فکر انگیز عبارت نے ہر جگہ توازن کے ستون کھڑے کر دیئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں توازن انسانی ذہن کے لیے ایسی ٹانک کا کام کرتا ہے جس کی بدولت نہ صرف ذہن کے سوچنے کی استعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ ذہن کے لیے تخلیق کی بہت سی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتاب کیسا دریا ہے کیسا کوزہ ہے اور اس کی تہ میں کتنے گوہر ہیں اور اس کی سطح پر کیسے کیسے شاداب کنول کھلے ہوئے ہیں۔

○ ○

تخلیقی ادب جلد اول اور دوم

مرتبین: مشفق خواجہ، پاشا رحمان، آمنہ مشفق۔ مبصر: افضل آرش

ممتاز محقق اور شاعر مشفق خواجہ نے تخلیقی ادب کو دو جلدوں میں چھاپا ہے۔ پہلی جلد کے اظہاریہ میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں "اس کتابی سلسلہ کی اشاعت بالکل اتفاقی امر ہے ایک غیر ملکی دوست نے خواہش ظاہر کی کہ وہ پاکستان کے گذشتہ دس برسوں کے بارے میں معلومات چاہتے ہیں۔ چنانچہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ پچھلی دہائی کے ادب کا جائزہ مرتب کر دیا جائے۔

" اس طرح تخلیقی ادب کا کتابی سلسلہ جاری ہو گیا " گویا تخلیقی ادب کی اشاعت ایک اتفاقی امر

ہے مگر اس اتفاقی امر نے بڑے بڑے ادبی پرچوں کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں۔ ہمارے پیش نظر اس وقت تخلیقی ادب کی پہلی جلد ہے۔ اس میں جناب احسان دانش کی حمد و نعت کے علاوہ کئی شعبے قائم کئے گئے ہیں مثلاً "کتاب" کے شعبہ میں ممتاز شاعر اور نقاد جناب سلیم احمد کا ایک طویل مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے محمد حسن عسکری ہی کے ایک اہم مضمون انسان اور آدمی کے حوالے سے عسکری صاحب کے فکری اور نظری مباحث کا بڑا جامع موازنہ کیا ہے۔ یہ شاید اس جلد کا اہم ترین اور طویل ترین مضمون ہے۔ سلیم احمد نے اپنے مضمون میں ابن عربی کا ایک قول نقل کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ شریعت کو اہمیت نہیں دیتے اپنی معرفت میں جسم کو شامل نہیں کرنا چاہتے۔ اب جسم کے معنی ہماری اصطلاح میں "جوہر" کے ہیں۔ عسکری صاحب انسان ہیں اور آدمی بننا چاہتے ہیں۔ یعنی ان کی شخصیت انتہائی ترقی یافتہ ہے اور اب ان کا مسئلہ ہے اپنے جوہر کو ترقی دینا۔ اس لحاظ سے شریعت پر زور دینے کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ شریعت ان کے جوہر کو ترقی دینے کا ذریعہ ہے ۔اس طرح عسکری صاحب کے مذہب میں عسکری صاحب کی دونوں ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ وہ اس مذہب کے ذریعہ سے عام آدمی کو بھی پا لیتے ہیں اور اپنے جوہر کو بھی۔ عسکری صاحب کا مذہب عسکری صاحب کے عمیق ترین روحانی مطالبات سے پیدا ہوا ہے" ۸۰ صفحات کے اس طویل تجزیئے میں جس طرح سلیم صاحب نے عسکری صاحب کی شخصیت اور ان کے مزاج کا احاطہ کیا ہے امر واقعہ ہے کہ انہوں نے عسکری صاحب کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے

اس جلد میں شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصہ میں جوش ملیح آبادی کی تین نظمیں جن میں لفظوں کا شکوہ اور بانکپن پوری طرح نمایاں ہے شامل ہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم اور دو غزلیں ندیم صاحب کے خاص جمالیاتی رنگ میں موجود ہیں۔

قاسمی صاحب کی شاعری میں اب تخیل کی جگہ تجربوں نے لے لی ہے اور ان کے تجربات نے ان کی شاعری میں شامل ہو کر ان کی شاعری کو مزید نکھار دیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی طویل نظم آدھی صدی کے بعد" ڈاکٹر صاحب کی اپنی زندگی اور ماحول کی خوبصورتی سے عکاسی کرتی ہے۔ اس ساری نظم میں ڈاکٹر صاحب نے خود تخاطبی کا انداز اختیار کیا ہے۔

مرحوم شان الحق حقی۔ جمیل الدین عالی۔ ادا جعفری۔ سلیم احمد اور کئی دوسرے شاعروں کے علاوہ ممتاز شاعر عبدالعزیز خالد کی دو غزلیں بھی شامل ہیں۔ خالد صاحب "ارادتاً" آسان گوئی کی طرف آ رہے ہیں۔ بلکہ آ گئے ہیں اور ادبی حلقوں کی طرف سے ان کی سادہ گوئی کی طرف مراجعت کو خوش آئند قدم کہا جا رہا ہے۔

سلیم احمد جتنے خوبصورت نقاد ہیں اتنے خوبصورت شعر بھی کہتے ہیں۔ دھیمے دھیمے لہجے میں تلخ سے

تلخ بات کہہ جانے کا ڈھنگ سلیم احمد کو خوب آتا ہے۔ اس شمارہ میں ان کی سات غزلیں شامل ہیں۔

مقالات کے شعبہ میں محمد ہادی حسین کا مضمون کلچر اور فنون لطیفہ" ڈاکٹر وزیر آغا کا پاکستان میں اردو افسانہ، جمال پانی پتی کا "دینے گینوں کا تصور روایت اور عصر جدید" اور جناب پاشا رحمان کا سارتر کا فکر کا سرچشمہ، اہم مضامین ہیں۔ پاشا صاحب نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ سارتر کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان اپنی کائنات خود تخلیق کرتا ہے وہ اپنی صفات سے پہلے ہی وجود میں آگیا تھا اس طرح BEING IN IT SELF اور BEING ITSELF میں ایک کشمکش جاری رہتی ہے کیونکہ BEING IN ITSELF کے بعض عناصر اس کی راہ میں مستقل طور پر مزاحم ہوتے رہتے ہیں"

عالمی ادب کے سیکشن میں فرانسیسی۔ انگریزی اور روسی تحریروں کے اردو تراجم ہیں۔ مترجمین میں محمود ہادی حسین، رفیق خاور۔ محمد سلیم الرحمٰن اور عبدالعزیز خالد کے علاوہ اور بہت سے ادیب شامل ہیں۔ عبدالعزیز خالد نے ایک روسی شاعر رسول حمزہ کی ایک تخلیق میرا داغستان" کا ترجمہ اردو میں کیا ہے میرے خیال میں ہمارے ہاں اب تک ہونے والے تراجم میں یہ ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ خالد صاحب نے ترجمہ کرتے وقت ایک طرف تو ترجمہ نگاری کے جملہ تقاضوں کو احسن طریقے سے پورا کیا ہے اور دوسری طرف "تخلیق" کی اصل روح کو جوں کا توں اردو میں برقرار رکھا ہے۔ اس ترجمہ کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیے میں اس کو اردو میں بہت بڑا ترجمہ مانتا ہوں۔

"کچھ گرہیں ایسی سخت ہوتی ہیں کہ ہاتھوں سے نہیں کھولی جا سکیں اور دانت بھی استعمال نہیں کئے جا سکتے کیونکہ وہ غلاظت سے لتھڑی ہوئی ہوتی ہیں"

"گولیاں اور تمغے ایک ہی چھاتی میں پیوست اور آویزاں ہوتے ہیں"

"کہتے ہیں کہ سب سے بڑی مچھلی وہ ہوتی ہے جو کانٹے سے نکل جائے۔ سب سے بڑا شکار وہ ہوتا ہے جو ہاتھ سے نکل جائے اور سب سے حسین عورت وہ ہوتی ہے جو ہاتھ نہ آئے"

"ابوطالب نے کہا، اگر تم ماضی پر پستول سے گولی چلاؤ گے تو مستقبل تم پر توپ سے گولہ باری کرے گا"

انشائیہ۔ خود نوشت اور ڈرامہ کے حصہ میں ڈاکٹر وزیر آغا۔ انور سدید، مرزا ادیب اور انور عنایت اللہ شامل ہیں۔ شاعری کے دوسرے حصہ میں شفقت شہاب ظفر۔ محمد ہادی حسین۔ پاشا رحمان اور شفیق خواجہ کی پانچ نظمیں اور ایک غزل شامل ہے۔

افسانوں کے حصہ میں غلام عباس کا روحی۔ مرزا ادیب کا "کاغذ کی ناؤ" رضیہ فصیح احمد کا ٹیسٹ کے ٹاپو

اور مرزا حامد بیگ کا "دھوپ کا چہرہ" پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شخصی خاکوں کے حصے میں کنہیا لال کپور پر لکھا ہوا مرزا ادیب کا خاکہ اور جعفر طاہر مرحوم پر لکھا ہوا ڈاکٹر محمد زکریا کا خاکہ خوب صورت خاکے میں اس خاکے ہیں۔ اس خاکے میں خواجہ صاحب نے بڑے ہی سیدھے سادے اور بے تکلف انداز میں جعفر طاہر کی نجی اور مجلسی زندگی کے کئی گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔

تخلیق ادب کی دوسری جلد بہ اعتبار ضخامت پہلی جلد سے کمتر ہے لیکن ٹھوس علمی مضامین کی بدولت پہلی جلد سے کہیں زیادہ وقیع اور اہم ہے۔ اس جلد میں ناول، افسانہ، نظم، غزل، سفرنامہ، انشائیہ، خاکہ نگاری، طنز و مزاح، تنقید اور اسلامی ادب پر گراں مایہ مقالے تقریباً تمام اہم ادیبوں سے لکھوائے گئے ہیں۔ ہر مقالہ دس سال یعنی ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۹ تک کے عرصہ میں تخلیق کئے گئے ادب کا جائزہ لیتا ہے۔ ان میں بعض جائزے نہایت اہم اور مکمل ہیں بعض جائزے نامکمل ہونے کے علاوہ غیر معیاری بھی ہیں۔

مثلاً جمیل آذر کا جائزہ "انشائیہ" کے سلسلہ میں نامکمل ہے آذر صاحب انشائیہ پر لکھنے بیٹھے ہیں مگر ان کی نظر سرگودھا سے باہر نہیں گئی"۔ "توازن" والے محمد علی صدیقی کا مضمون "ادبی رجحانات" بھی ستم کا شکار رہے وہ ادبی رجحانات کا تعین بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ نہیں کر سکے۔ ان کی تنقید کی طرح یہاں بھی زبان گنجلک اور ناہموار ہے۔ دوسرا مضمون سلیم احمد کے بھائی اور ۲ + ۲ = ۵ والے شمیم احمد کا "ناول نگاری کا غالب رجحان" ایک اہم مضمون ہے۔ وہ قرۃ العین حیدر کو بہت بڑی ناول نگار مانتے ہیں اور انتظار حسین کے ناول "بستی" کو اوسط درجے کا ناول کہتے ہیں۔ عجب کہ اسی جلد میں شہزاد منظر نے ناول کی مختصر تاریخ کا خاصا وقیع مطالعہ پیش کیا ہے اور انتظار حسین کے ناول کو چند اہم ناولوں میں شمار کیا ہے۔ منظر صاحب بتاتے ہیں کہ ادب میں نوسٹلجیا کوئی عیب نہیں۔ دنیا بھر کے ادب میں نوسٹلجیا کے جذبے کے تحت بڑا شاہکار ادب تخلیق کیا گیا ہے۔ انتظار پر محض نوسٹلجیا کا الزام لگانا درست نہیں"۔ اور میرے خیال میں بستی کو اوسط درجے کا ناول یا قرۃ العین حیدر کے زیر اثر لکھا جانے والا ناول کہنا انتظار حسین اور "بستی" دونوں سے زیادتی ہے۔

عتیق احمد نے افسانہ کا دس سالہ جائزہ لیا ہے اس جائزہ میں محمد سلیم الرحمٰن، آغا سہیل، مسعود اشعر، انور سجاد، انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب اور عذرا اصغر اور بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کو شامل جائزہ کیا گیا ہے مگر لاہور کی ایک اہم افسانہ نگار سائرہ ہاشمی کی "ریت کی دیوار" کو مطالعہ کا حصہ نہیں بنایا گیا۔

ڈرامہ پر مقالہ مرزا ادیب کا ہے۔ انہوں نے ڈرامہ کو چار عنوانات کے تحت بیان کرنے کی کوشش کی ہے تھیٹر، ریڈیو، ٹیلی وژن ڈرامہ، ادبی ڈرامہ یا کتابی ڈرامہ۔

غزل کا دس سالہ جائزہ محترم نظیر صدیقی نے لیا ہے یہ جائزہ بھی کئی اعتبار سے نامکمل ہے یہ جائزہ اگرچہ اس جلد کا طویل ترین جائزہ ہے مگر محض طوالت اور چیز ہے اور جامعیت اور چیز۔ جناب نعیم صدیقی اور عبدالعزیز خالد ہماری شاعری کی دو معتبر اور توانا آوازیں ہیں ان کے علاوہ بے شمار اہم شاعروں کو اس جائزہ میں شامل مطالعہ نہیں کیا گیا۔ پچھلی دہائی میں نعیم صدیقی کا مجموعہ دہ سورج بن کر ابھرے گا منصۂ شہود پر آیا ہے اگرچہ یہ نظمیں مولانا مودودی کے بارے ہیں۔ مگر نعیم صاحب مسلسل غزلیں بھی کہہ رہے ہیں اور باقاعدہ جسارت اور دیگر ادبی پرچوں میں چھپتی بھی رہی ہیں۔

اسی طرح عبدالعزیز خالد کی اس دہائی میں تقریباً پانچ کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں غبار شبنم، پروازِ عقاب، ماتم یک شہر آرزو، دانہ ہائے ریختہ اور خمیازہ ساحل شامل ہیں انکے علاوہ ایک اور کتاب حدیث خواب بھی ۱۹۷۷ء میں چھپی۔

کیا نعیم صدیقی، عبدالعزیز خالد اور اسی طرح کے کئی اور اہم شعراء کے ذکر کے بغیر جنھوں نے گزشتہ دہائی میں غزلیں لکھی بھی ہیں اور وہ چھپی بھی ہیں۔ غزل کا دس سالہ جائزہ مکمل ہو سکتا ہے؟

سفرنامہ کا دس سالہ جائزہ محترم انور سدید نے مرتب کیا ہے۔ انور سدید ہمارے ادب کی ایک ایسی ان تھک شخصیت ہیں جنھوں نے بہت تھوڑے وقت میں بہت زیادہ لکھا ہے۔ اگرچہ بسیار نویسی سے اعلیٰ ادب تخلیق نہیں ہوتا، تاہم یہ بات انور سدید پر صادق نہیں آتی۔

سفرنامے کی صنف ہمارے ادب میں بہت دیر آئی۔ بہر حال جب اشفاق احمد، عطاالحق قاسمی اور رفیق ڈوگر وغیرہ نے اس صنف پر طبع آزمائی کی تو یہ صنف بھی اپنی کم سنی کے باوجود اردو ادب کی ایک قابل توجہ صنف بن گئی۔ چنانچہ اب یہ صنف "محض ڈریٹ رپورٹنگ" نہیں رہی۔

" سفرنامہ نگاری کے لیے سفرنامہ نگار کو ایک ادیب کا دل اور سیاح کی آنکھ درکار ہوتی ہے۔

اپنے سفرنامہ میں ایک بات انور صاحب نے یہ کہی ہے کہ بعض سفر صرف سفرنامے لکھنے کی غرض سے کئے جاتے ہیں اور عطا کا سفرنامہ "مشاقین" یعنی ہندوستان کا سفرنامہ اسی ذیل میں آتا ہے اور اس کے لیے موصوف دلیل یہ دیتے ہیں کہ چونکہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی ہندوستان کا سفر کیا۔ مگر انہوں نے سفرنامہ نہیں لکھا تو عطا نے سفرنامہ کیوں لکھا؟ اس کا جواب ہم کیا دیں اس کے بارے میں تو عطاالحق قاسمی ہی بہتر طور پر جواب دے سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں رفیق ڈوگر کو بھی شامل کر لیا جائے کیونکہ وہ بھی ہندوستان

کا سفر نامہ لکھ رہے ہیں ۔

اس جائزے میں اشفاق احمد، محمد کاظم اور محمد خالد اختر کے علاوہ کئی اور سفر نامہ نگاروں کا ذکر ہے مگر رفیق ڈوگر بطور سفر نامہ نگار انور سدید کے جائزہ میں شامل نہیں ہیں ۔

پچھلے دس سال کی تنقید کا جائزہ محترم تحسین فراقی کے حصہ میں آیا ہے۔ تحسین صاحب اردو ادب کے منفرد شاعر اور بالغ نظر نقاد ہیں۔ مجھے ان میں عسکری صاحب کی تنقیدی حس کی لہریں کبھی بہت واضح اور کبھی تہ موج رواں دواں نظر آتی ہیں۔ جن لوگوں نے محمد حسن عسکری کی تنقیدی روایت کو جس بھرپور طریقے سے نبھایا اور نبھا رہے ہیں ان میں جناب سلیم احمد، نوجوان نقاد سراج منیر اور تحسین فراقی شامل ہیں گویا تحسین اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہیں ۔ اللہ کرے اس سلسلہ کی مزید کڑیاں بنتی رہیں اور یہ سلسلہ جاری و ساری رہے ۔

تنقید دو اور دو کو چار کہنے کا فن ہے اس میں خیال آرائی کی قطعاً گنجائش نہیں اگر تنقید میں خیال آرائی کی گنجائش ہوتی تو آج مولانا حالی پہلے نقاد نہیں ۔ مولانا محمد حسین آزاد پہلے نقاد ہوتے ۔ کیونکہ آزاد نے حالی سے پہلے تنقید شروع کی تھی۔ اس لیے کہ جب نقاد خیال کے تابع ہوا وہ تنقید کی ذیل سے نکل گیا لیکن اگر خیال نقاد کے تابع رہے تو تنقید پر بعض مقام پر بے شک تخلیق کا گمان ہوتا ہے ۔

ان کا مضمون شاید اس جلد کا وقیع ترین جائزہ ہے اس جائزہ میں انہوں نے مختلف تنقیدی رجحانات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے جائزہ میں ترقی پسند نقادوں سے لے کر غیر ترقی پسند نقادوں تک تقریباً تمام اہم نقاد اور تنقیدی کتابیں شامل ہیں ۔ اس جائزہ میں انہوں نے کئی دلچسپ جملے بھی مارے ہیں اور یہاں ان کی کالم نگاری والی حس بہت کام آئی ہے ۔ مثال کے طور پر انہوں نے فتح محمد ملک اور محمد علی صدیقی کی تنقیدی کتب کا جائزہ لینے کے بعد ایک مشورہ دیا ہے کہ ملک صاحب اپنی کتاب کا نام تعصبات کی بجائے توازن رکھ لیں اور تعصبات محمد علی صدیقی کے لیے رکھ چھوڑیں ۔

اس جلد میں ایک اور اہم اور خاصا بھرپور جائزہ" طنز و مزاح کے دس سال ہیں جسے ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر معین الدین عقیل نے مرتب کیا ہے طنز و مزاح کی باقاعدہ روایت ہمارے ہاں منشی سجاد حسین کے اودھ پنچ سے شروع ہوتی ہے پھر یہی روایت اکبر الہ آبادی سے ہوتی ہوئی ۔ رشید احمد صدیقی ، پطرس بخاری اور اقبال تک اور اقبال سے اس عہد تک پہنچتی ہے اس عہد کے مزاح لکھنے والوں میں چند اہم نام جناب شفیق الرحمان ، مشتاق احمد یوسفی ، محمد خالد اختر اور عطا الحق قاسمی کے [illegible]

ڈاکٹر [illegible] کے اس جائزہ میں فکر کی گہرائی اور تجزیہ کی صلاحیت، ان کی بے پناہ فکری صلاحیتوں پر دال ہے ۔

خاکہ نگاری کا دس سالہ جائزہ ڈاکٹر غلام حسین اظہر نے مرتب کیا ہے اس جائزہ میں محمد طفیل نقوش ممتاز مفتی، گلزار وفا چوہدری کے علاوہ کئی اور خاکہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے۔ گلزار وفا چوہدری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "گلزار کے اسلوب میں بلا کی کاٹ اور تیکھا پن ہے وہ کم سے کم الفاظ میں دور رس بات کہنے پر قدرت رکھتا ہے"

احمد ہمدانی نے "نظم" کا دس سالہ جائزہ لیتے ہوئے منیر نیازی کی نظم پر خصوصاً بحث کی اور فیصلہ دیا ہے کہ منیر نیازی کی شاعری پر اب بھی پراسرار طاقتوں اور وحشت ناک فضاؤں کا تسلط ہے حالانکہ اب منیر نیازی کی شاعری ان گورکھ دھندوں سے آگے نکل چکی ہے۔ اب منیر کی شاعری کی فضا بڑی اجلی اجلی اور شفاف ہے جس میں پڑھنے والا کو اپنے عکس دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ایک مسئلہ ہے جس نے اب بھی منیر کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ اس کی اپنی عادت ا جہاں رہنا بیزار رہنا۔

تم نے تو بنا لی ہے عادت ہی منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

اور اس کی اکتاہٹ کا باعث کیا ہے معاشرے میں بسنے والے انسانوں کی منافقتیں نا انصافیاں اور بد دیانتی ملاحظہ ہو!

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

اس جلد کا آخری جائزہ اسلامی ادب کے گزشتہ دس سال ہیں، جس میں پروفیسر فروغ احمد نے بڑے عالمانہ انداز میں اسلامی ادب کے گزشتہ دس سالوں کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اسلامی ادب کے حوالے سے جن ادیبوں کی تخلیقات کو پیش نظر رکھا ہے اس کے سرخیل جناب نعیم صدیقی ہیں۔ پھر اسعد گیلانی اور عبدالعزیز خالد کے علاوہ بہت سے نئے لکھنے والے بھی شامل ہیں۔

اس جلد کا آخری حصہ خاصہ خاصان ادب کے عنوان سے مرزا یگانہ چنگیزی کے لیے مختص ہے مرزا صاحب سے نقادوں نے وہی سلوک کیا ہے جو ہمارے قدیم نقادوں نے نظیر اکبر آبادی کے ساتھ کیا تھا ترقی پسندوں نے نظیر اکبر آبادی کو سب سے پہلے عوامی شاعر کے طور پر پیش کیا۔ مشفق خواجہ صاحب نے مرزا کے کلام اور ان کی شخصیت پر جامع مقالات لکھوا کر مرزا کو عوام کے قریب لانے کی ایک نہایت اہم کوشش کی ہے اور اس کے لیے خواجہ صاحب خصوصی مبارک کے مستحق ہیں۔

دوسری جلد پہلی جلد سے کئی اعتبار سے جامع اور اہم ہے پیشتر اس کے کہ میں "تخلیقی ادب" کی دونوں جلدوں پر اپنی بات ختم کروں، ایک اور عرض کروں کہ اگر دوسری جلد میں اقبال کے لیے بھی ایک سیکشن علیحدہ بنا دیا جاتا جس میں صرف اقبال پر گذشتہ دس سال میں ہونے والے کام پر مباحث کو سمیٹ جاتا تو

بہت بہتر ہوتا اگر جہ تحسین فراقی کے تنقیدی جائزہ میں ضمنی طور پر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی اقبال کا ادبی مقام ڈاکٹر وحید قریشی کی "اقبال اور پاکستانی قومیت" اور پروفیسر منور مرزا کی ایقان اقبال کا ذکر شامل ہے مگر یہ کافی نہیں ۔ بہر حال جناب مشفق خواجہ، پاشا رحمان اور آمنہ مشفق مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے انتہائی محنت شائستہ اور کمال ہنرمندی سے تخلیقی ادب کی اشاعت کا اہتمام کیا ۔

تخلیق ادب کی ہر جلد کی قیمت /۵۰ روپے ہے اور اسے عصری مطبوعات اے/ ۲۲۲ . بلاک ڈی ۔ ناتھ ناظم آباد کراچی نمبر ۳۳ سے حاصل کیا جاسکتا ہے ۔

OO

کالے لوگوں کی روشن نظمیں

مصنف امجد اسلام امجد ۔ مبصر منو بھائی

امجد اسلام امجد کو بعض لطیفے اپنے شعروں سے بھی زیادہ پسند ہیں چنانچہ انہیں بار بار سناتے ہیں اور انہیں سن کر میں بار بار ہنستا ہوں ۔ امجد پر نہیں لطیفوں پر ۔

آج میں بھی ایک لطیفہ دوبارہ سنانے لگا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ امجد اسلام امجد بھی اس پر ہنسیں گے ۔

یہ لطیفہ نہیں گزشتہ سال کا واقعہ ہے ملتان میں اصغر ندیم سید کے تراجم کی کتاب "زمین زاد کا افق" کی تقریب رونمائی تھی ۔ کشور ناہید مہمان خصوصی تھیں کہ یہ اپنے گھر کے علاوہ جہاں بھی ہوں مہمان خصوصی ہی ہوتی ہیں میں ان کا اور یہ میری اسکالر تھیں ۔ اپنے مضمون کے سلسلے میں کشور آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتیں چنانچہ انہوں نے اپنا مضمون پیشگی لکھ رکھا تھا جبکہ مجھے ابھی لکھنا تھا اور تقریب سے چند گھنٹے پہلے لکھنا تھا ورنہ اصغر ندیم سید نے میرا سر پھوڑ دینا تھا اور سر پھوڑ دینے سے زیادہ خطرہ یہ تھا کہ وہ میرے کالموں اور ڈراموں کی خامیاں بیان کرنا شروع کر دے گا یعنی میرا چھاپہ اتار دے گا ۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ملتان جاتے ہوئے کشور ناہید اور میرے ایک ہمسفر نے ایک ایسا لطیفہ سنا دیا جو میرے مضمون کی ابتدا بن گیا ۔ ابتدا اچھی ہو تو مضمون چل جاتا ہے جیسے "وارث" "اچھا ہو تو" "دہلیز" بھی چل جاتا ہے

مسئلہ میرا یہ تھا کہ حالیہ سالوں میں ہمارے شاعروں نے غیر ملکی شاعری کے تراجم پر اتنا زور دینا کیوں شروع کر دیا ہے اور لطیفہ یوں سنا کہ ایک چیل سے کسی نے پوچھا کہ تمہاری شکل عقاب جیسی ہے ۔ تمہاری چونچ بھی عقاب جیسی ہے، تمہاری اڑان اور تمہاری لپک اور تمہاری جھپٹ بھی عقاب جیسی ہے ۔ مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ تم شکار کی بجائے مردار کھاتی ہو ۔ چیل نے جواب دیا یہ درست ہے کہ میری شکل عقاب جیسی ہے میری چونچ بھی عقاب جیسی ہے میری

اڑان، لپک اور جھپٹ بھی عقاب جیسی ہے میں اپنے شکار پر عقاب ہی کی طرح لپکتی اور جھپٹتی ہوں مگر جب شکار کے قریب پہنچتی ہوں تو "میرا ہاسا نکل جاتا ہے"

چیل کی اس بصیرت افروز حقیقت بیانی سے پتہ چلا کہ ہمارے شاعروں کے ساتھ بھی یہی مصیبت ہے کہ عقابی خصوصیات کے باوجود شکار کے قریب پہنچ کر ان کی ہنسی نکل جاتی ہے اور وہ دوسروں کے شکار سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور یوں اپنی زندگی کا اہتمام کرتے ہیں اور اپنے وجود کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں

یہ تو تھی گزشتہ سال اصغر ندیم سید کے تراجم کی کتاب "زمین زاد کا افق" کی بات مگر آج کالوں کے یوم سفید کے سلسلے میں امجد اسلام امجد کے تراجم کی کتاب "کالے لوگوں کی روشن نظمیں" پر بات ہو رہی ہے امجد نے یہ کتاب مجھے اٹھارہ جنوری کو دی ہے مگر میں اسے گزشتہ سال پڑھ چکا ہوں کہ مجھے روحی بانو نے خرید کر دی تھی اور پھر اس کی چار جلدیں بازار سے خرید کر میں نے بیرونِ ملک اپنے کچھ دوستوں کو بھجوائی تھیں اپنی طرف سے نہیں امجد اسلام امجد کی طرف سے کہ میں اس کے دستخط کر لیتا ہوں۔

اس دوران میں نے بھی کالے لوگوں کی روشن شاعری اور اس شاعری کے بارے میں کچھ پڑھا ہے اور اس شاعری کے حوالے سے اپنے بال و پر، اپنی چونچ، اڑان، لپک اور جھپٹ کا جائزہ بھی لیا ہے اور اس چیل کے لطیفے پر نظرثانی کرنے پر مجبور رہا ہوں جس کا شکار کے قریب پہنچ کر" ہاسا نکل جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہماری قوم چیلوں کی قوم نہیں ہے۔

ہوا صرف یہ ہے کہ ؎

خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ

یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی ہمارے ساحلوں پر لنگر انداز ہوئی اور پھر بقول اشفاق احمد یہیں رہ گئی بلکہ ساتواں بحری بیڑہ بن گئی۔ سر سید احمد خاں نے کہا کہ انگریزی پڑھو کہ یہی سب سے بڑا ہتھیار ہے جو امریکہ نے برطانیہ کے خلاف استعمال کر کے آزادی حاصل کی تھی اور پھر انگریزی پڑھنے والوں نے کہا کہ کرکٹ کھیلو کہ عمران خاں اور ظہیر عباس کی وجہ سے ملک و قوم کو شہرت نصیب ہوئی اور ہمارے ادب نے بھی کاؤنٹی کرکٹ کھیلنا شروع کر دی۔ ہماری دانش گاہیں انگریزی دانش سے لد گئیں۔ انگریزی چھری کانٹے کے ذریعے ہمارے معدوں میں اتر گئی رگوں میں دوڑنے اور دلوں میں دھڑکنے لگی اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت بلو کے بیگوں کی وساطت سے ہمارے دماغوں کو چڑھ گئی۔ ہمارے لنڈے بازار میں بیل باٹم، میکسی، ہش پپی، میکس فیکٹر، ڈسکو، سگمنڈ فرائڈ، وی سی آر، پلے بوائے، ماتھری کانسنٹراں دی فاؤنڈیشن، ڈونا خر، سیکس ملین ڈالرمین، امریکن ڈرنگ اور ڈیپ تھروٹ کے انبار لگ گئے ہیں اور کارڈیکس کلینک والوں نے قومی تشخص کے اعزازات تقسیم کر کے خون، پیشاب، تھوک اور پاخانہ ٹسٹ کرنے کے کانٹریکٹ حاصل کر لیے

ہماری حقائق نگاہوں نے مارلین میزو کی لاش کو لپیٹنے والی چادر کی تہیں تو گن لیں مگر پڑوس میں کیا شور برپا ہے یہ نہ معلوم کر سکیں کہ پڑوس میں اندھیرا تھا اور اندھوں کے لیے اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے اندھیرے سے ڈرنا بھی ہمیں انگریز نے ہی سکھایا تھا۔ شب تاریک، سیاہ بختی کا کالک، جدائی، محرومی اور خوف کی علامتیں بنیں۔ گوری، چٹی، روشن، چمکتی، دمکتی اور بھڑکتی چیزیں اچھی لگیں۔ شمع سرطور سے لے کر ید بیضا تک اور پیغمبروں کے جمال سے خداوندِ ذوالجلال تک کا تصور نور کی صورت ذہن میں آیا۔ رقیبوں کو

اور سیاہ اور انتہائی ظالمانہ جرم کو منہ کالا کرنے کی صورت میں یاد کیا جانے لگا

آپ ہنسیں گے یا محض مسکرا دیں گے کہ میں نے جو پہلا "رنگ کاٹ" شعر سنا وہ یہ تھا

میاں مجنوں نوں کسے طعنہ دتا تیری لیلیٰ رنگ دی کالی
میاں مجنوں اوہنوں جواب دتا تیری اکھ نئیں ویکھن والی

شاہین بچے کی یہ دیکھنے والی آنکھ صحبت زاغ میں خراب ہوئی تھی کہ اور وہ صلاح الدین محمود کا "نابینا طائر" ہو گیا تھا۔ میرے نابینا طائر کو صلاح الدین محمود نے ہی کالوں کی شاعری کی ایک کتاب دے کر آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا اور میں نے تاریک براعظم کے انتہائی اندھیرے گوشوں میں نور کی مشعلیں دیکھی تھیں چنانچہ میرے لیے صلاح الدین ایوبی سے کم نہیں

جنوبی افریقہ کے ایک اخبار نویس لیوس نکوسی لکھتے ہیں کہ کالوں کا شعور اس صدمے کے ساتھ بیدار ہوا کہ وہ محض کالے ہی نہیں غیر سفید بھی ہیں وہ جنوبی افریقہ کے کالوں پر سفید معاشرہ کے مظالم کا حوالہ دے رہے تھے مگر یہ مظالم صرف جنوبی افریقہ تک محدود نہیں ہیں جن سفید سوسائٹیوں نے کالوں کو برداشت بھی کیا ہے اپنی شرائط پر کیا ہے۔ ان کی شرائط یہ ہیں کہ کالے مغرب کی سفید سوسائٹی کے کلچر، مذہب اور آداب کو اپنا لیں اور اپنے دلوں میں یہ حقیقت بٹھا لیں کہ غیر سفید ہونا بری بات ہے" اپنی زندگی اور روزگار برقرار رکھنے کے لیے کالے اپنی امیر مگر تباہ شدہ دنیا چھوڑ کر منعکس مگر چمکدار مغربی دنیا کو اپنانے پر مجبور ہو گئے جیسے کوئی یتیم اپنی ماں کو چھوڑ کر کسی شفقت پدری سے عاری شخص کے ہاں ملازم ہو جائے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا۔ ایمی سیزار کہہ رہا ہے جس کی ایک طویل نظم "وطن واپسی" کا میں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

امجد اسلام امجد مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے افریقہ کے مختلف حصوں سے کالے شاعروں کی نظمیں جمع کر کے انہیں اردو میں ترجمہ کیا اس کے علاوہ امریکہ کے نیگرو شاعروں کے خیالات بھی اردو میں منتقل کئے اور یوں وجدان کی نئی راہیں کھولنے اور سوچ کے نئے دریچے وا کرنے کا فریضہ سرانجام دیا اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ اس سے پہلے امجد اسلام امجد "عکس" کے عنوان سے فلسطین کی مزاحمتی

شاعری کے ترجموں کا ایک مجموعہ اردو ادب کے حوالے کر چکے ہیں اور مزید تراجم کا ارادہ رکھتے ہیں اردو اد کے گورے گورے گالوں پر یہ کالے اور سالونے تل بہت اچھے لگیں گے ۔ یہ کام آج سے بہت پہلے ہو جانا چاہیئے تھا اگر ہمارے شاہین بچوں کو صحبت زاغ خراب نہ کر گئی ہوتی اور ہم جنسوں کو ہم جنسوں کے ساتھ پرواز کے مواقع ملے ہوتے تو آج ہمارے ادب میں وہی لہر بہر ہوتی جو افریقہ کے کالے لوگوں کی روشن نظموں میں دکھائی دیتی ہے ۔ ہماری چیلوں کا شکار کے قریب پہنچ کر ٴ یا سانہ نکل جانا ہمارے نابینا طائر کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتیں ۔

میں آپ حضرات کو مڈغاسکر کے ایک کالے شاعر کا ایک شعر سنا کر اجازت چاہوں گا جس نے مغربی تہذیب کو اپنایا اور اتنا اپنایا کہ جب اسے فرانس جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا گیا تو اس نے خودکشی کر لی تھی اور اس سے پہلے یہ شعر کہا تھا ۔

"غلطی میری اپنی تھی کہ میں نے رات کے دل پر پاؤں رکھ دیا تھا ۔
اب ستاروں کے جال میں پھنس کر رہ گیا ہوں ۔"

○○

جستجو

مصنف تحسین فراقی ۔ **مبصر** ڈاکٹر محمد احسان الحق

تنقید کے لغوی معنی ہیں "کھوٹا کھرا پرکھنا" ادبی اصطلاح میں تنقید سے وہ عمل مراد ہے جس کے تحت کسی تحریر کی خوبی یا برائی، حسن و قبح اور جمال و بدصورتی کے متعلق چھان بین کر کے فیصلہ صادر کیا جاتا ہے ۔ پرکھ پہچان کا وہ عمل جسے تنقید کا نام دیا گیا ہے ہوا میں انجام نہیں دیا جا سکتا ۔ اس کے کچھ لوازمات و مقتضیات ہیں ۔ کوئی ادب پارہ ایسا مطلق اور قائم بالذات نہیں ہو سکتا کہ اس کو اس کے مصنف کی ذات یا شخصیت سے مکمل طور پر علیحدہ کر کے دیکھا جا سکتا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ کسی مصنف یا شاعر کی ذات ایسی شے نہیں ہوتی جو خلا میں معلق ہو ۔ مصنف یا شاعر بھی دوسرے انسانوں کی طرح اسی دنیائے آب و گل کا مکین ہوتا ہے وہ بھی کسی سماج یا معاشرے کا فرد ہوتا ہے اور تہذیبی و تمدنی اثرات سے متاثر ہوتا ہے ۔ اس کو کچھ ادبی روایات ورثے میں ملتی ہیں وہ خود بھی اور اس کا فن بھی گرد و پیش کے عوامل سے بے نیاز نہیں ہو سکتا مصنف یا شاعر کے متعلقات کے سلسلے کی یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن میں حسن و جمال اور فنی کمال کا سوال کم اور حقیقت و واقعیت زیادہ مدِنظر ہوتی ہے لیکن ان باتوں سے کوئی متوازن اور مکمل تنقیدی ضابطہ کسی طرح بھی گریز نہیں کر سکتا ۔ یہ درست ہے کہ اردو تنقید کے دورِ اول میں فن پارے کی پہچان کے لیے اس طرح تحقیقی نظر سے گہرائی میں اترنے کی روایت کا کوئی سراغ نہیں ملتا ۔ یہ وہ دور تھا جب نقادوں کو ادبی تخلیق کے صرف حسن ہی سے سروکار ہوتا تھا اور حسن بھی وہ جو فن پارے کی سطح پر تیرتا تھا ۔ تماشئی لفظی

اور سطحی ۔ یہ ہماری تنقید کا عہدِ طفلی تھا۔ ظاہر بین اور غیر متوازن ۔ تاہم وقت اور ماحول کے تقاضوں کے تحت تنقید میں گہرائی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ مصنفوں اور شاعروں کی تخلیقات کو ان کی ذات، ان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی ماحول کو باہم مربوط کر کے دیکھنے اور پرکھنے کی شعوری کوشش کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہوا۔ اردو تنقید کے اس نئے دور کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ اس میں تنقید کے لوازمات و مقتضیات کا شعور کارفرما نظر آتا ہے لیکن توازن اور اعتدال سے یہ دور بھی خالی ہے ۔ دورِ اول کی تنقید اگر اسے تنقید کہا جا سکتا ہے تنقیدی شعور سے تہی دست تھی اس لیے قابلِ معافی ہے لیکن جدید تنقید کو جسے اپنے روشن خیال، باشعور اور صاحبِ علم ہونے کا دعویٰ ہے کیا کہا جائے کہ یہ اپنی تمام ترادعا پسندی کے باوجود افراط و تفریط کا شکار ہے ایسے نقاد بھی ہیں جو ایک طرف تو کسی ادب پارے کے معمولی سے مقصدی و اخلاقی رنگ کو بھی دیکھ لیں تو انہیں ہذیان ہو جاتا ہے اور وہ فن کی دہائی دینے لگتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ شرمناک حد تک بے اخلاقی بلکہ بداخلاقی کو بھی ابنارمل اور پیچیدہ شخصیتوں کے مطالعہ کے نام پر ابھارنے اور اچھالنے میں بڑا لطف محسوس کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو ادب اور جذبہ کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ادب میں جذبہ ہی سب کچھ ہے ان اصحابِ تنقید کے نزدیک جذبے سے مراد جنسی جذبات ہیں اس ایک جذبے کے علاوہ باقی اور کوئی جذبہ ان کے خیال میں وجود ہی نہیں رکھتا اردو تنقید کے یہ غول بیابانی یا تو خود گمراہ ہیں یا ادب اور ادیب کو گمراہ کرنے پر مامور ہیں "تنقیدِ جدید" کے ایسے مشنریوں اور نرسریوں کے علاوہ وہ نقاد بھی ہیں جنہوں نے کبھی محض سہل انگاری و آسانی پسندی کی بنا پر اور کبھی پسند و ناپسندیدگی کے ذاتی میلانات کی وجہ سے، کبھی تعقل و تفکر اور تجزیے اور دلیل کی بنا پر محض جذبات کو چراغِ راہ گذر سمجھ لینے کی روش کے سبب اور کبھی معاشرتی تہذیبی اور اخلاقی معیاروں کو بلاکم و کاست قبول کر لینے کی عادت سے مجبور ہو کر اور اکثر و بیشتر غیر ذمہ دارانہ و نامنصفانہ طور طریقے اختیار کر کے ایسی آراء کا اظہار کیا ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کی صحیح شناخت اور پہچان کروانا تو دور کی بات ہے ان کے چہرے بگاڑ دیئے ہیں۔

ہمارے ہاں ایسے نقادوں کی بھی کمی نہیں جن کی مثال اس گنوار کی سی ہے جس کو اتفاق سے ایک خوبصورت پیالہ ہاتھ آ گیا اسے بتایا گیا کہ اس میں شربت پیتے ہیں۔ اس نے دن رات اس کثرت سے شربت پیا کہ ہیضے کا شکار ہو گیا۔ ہمارے اس قسم کے گنوارے نقادوں نے بھی یہی کیا ہے کسی کو مارکس ازم یا کسی کو فرائیڈ کے بارے میں چند باتوں کا علم ہو گیا، قیامت آ گئی ۔ بس موقع بے موقع بات بات پر وہی بگل بجائے جا رہا ہے ۔ ایک دیہاتی بچے کو دھوپ کا چشمہ مل گیا وہ رات کو سوتے وقت بھی اسے آنکھوں سے الگ نہیں کرتا تھا

تنقید بچوں کا کھیل نہیں ہے یہ ایک " مرکب اور پیچیدہ تجزیاتی و تحقیقی عمل ہے اس کے راستے متعدد ہیں اور جتنے ہیں سب اپنی جگہ درست ہیں۔ اس لیے ایک اچھا ناقد سبھی شاہراہوں پر نظر رکھتا ہے

شاعری کے ترجموں کا ایک مجموعہ اردو ادب کے حوالے کر چکے ہیں اور مزید تراجم کا ارادہ رکھتے ہیں اردو ادب کے گورے گورے گالوں پر یہ کالے اور سالونے تل بہت اچھے لگیں گے۔ یہ کام آج سے بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا اگر ہمارے شاہین بچوں کو صحبت زاغ خراب نہ کر گئی ہوتی اور ہم جنسوں کو ہم جنسوں کے ساتھ پرواز کے مواقع ملے ہوتے تو آج ہمارے ادب میں وہی لہر بہر ہوتی جو افریقہ کے کالے لوگوں کی روشن نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ ہماری چیلوں کا شکار کے قریب پہنچ کر "با سانہ نکل جانا۔ ہمارے نا بینا طائر کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتیں۔

میں آپ حضرات کو مڈغاسکر کے ایک کالے شاعر کا ایک شعر سنا کر اجازت چاہوں گا جس نے مغربی تہذیب کو اپنایا اور اتنا اپنایا کہ جب اسے فرانس جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا گیا تو اس نے خودکشی کر لی تھی اور اس سے پہلے یہ شعر کہا تھا۔

"غلطی میری اپنی تھی کہ میں نے رات کے دل پر پاؤں رکھ دیا تھا۔
اب ستاروں کے جال میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔"

○○

جستجو

مصنف تحسین فراقی۔ مبصر ڈاکٹر محمد احسان الحق

تنقید کے لغوی معنی ہیں "کھوٹا کھرا پرکھنا" ادبی اصطلاح میں تنقید سے وہ عمل مراد ہے جس کے تحت کسی تحریر کی خوبی یا برائی، حسن و قبح اور جمال و بدصورتی کے متعلق چھان بین کر کے فیصلہ صادر کیا جاتا ہے۔ پرکھ پہچان کا وہ عمل جسے تنقید کا نام دیا گیا ہے ہوا میں انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے کچھ لوازمات و مقتضیات ہیں۔ کوئی ادب پارہ ایسا مطلق اور قائم بالذات نہیں ہو سکتا کہ اس کو اس کے مصنف کی ذات یا شخصیت سے مکمل طور پر علیحدہ کر کے دیکھا جا سکتا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ کسی مصنف یا شاعر کی ذات ایسی شے نہیں ہوتی جو خلا میں معلق ہو۔ مصنف یا شاعر بھی دوسرے انسانوں کی طرح اسی دنیائے آب و گل کا مکین ہوتا ہے وہ بھی کسی سماج یا معاشرے کا فرد ہوتا ہے اور تہذیبی و تمدنی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کو کچھ ادبی روایات ورثے میں ملتی ہیں وہ خود بھی اور اس کا فن بھی گردو پیش کے عوامل سے بے نیاز نہیں ہو سکتا مصنف یا شاعر کے متعلقات کے سلسلے کی یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن میں حسن و جمال اور فنی کمال کا سوال کم اور حقیقت و واقعیت زیادہ مدِنظر ہوتی ہے لیکن ان باتوں سے کوئی متوازن اور مکمل تنقیدی ضابطہ کسی طرح بھی گریز نہیں کر سکتا۔ یہ درست ہے کہ اردو تنقید کے دورِ اول میں فن پارے کی پہچان کے لیے اس طرح تحقیقی نظر سے گہرائی میں اترنے کی روایت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ وہ دور تھا جب نقادوں کو ادبی تخلیق کے صرف حسن ہی سے سروکار ہوتا تھا اور حسن بھی وہ جو فن پارے کی سطح پر تیرتا تھا۔ نمائشی، لفظی

اور سطحی - یہ ہماری تنقید کا عہدِ طفلی تھا۔ ظاہر بین اور غیر متوازن۔ تاہم وقت اور ماحول کے تقاضوں کے تحت تنقید میں گہرائی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ مصنفوں اور شاعروں کی تخلیقات کو ان کی ذات، ان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی ماحول کو باہم مربوط کر کے دیکھنے اور پرکھنے کی شعوری کوشش کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہوا۔ اردو تنقید کے اس نئے دَور کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ اس میں تنقید کے لوازمات و مقتضیات کا شعور کارفرما نظر آتا ہے لیکن توازن اور اعتدال سے یہ دَور بھی خالی ہے۔ دَورِ اول کی تنقید اگر اسے تنقید کہا جا سکتا ہے تنقیدی شعور سے تہی دست تھی اس لیے قابلِ معافی ہے لیکن جدید تنقید کو جسے اپنے روشن خیال، باشعور اور صاحبِ علم ہونے کا دعویٰ ہے کیا کہا جائے کہ یہ اپنی تمام تر ادعاپسندی کے باوجود افراط و تفریط کا شکار ہے ایسے نقاد بھی ہیں جو ایک طرف تو کسی ادب پارے کے معمولی سے مقصدی اُخلاقی رنگ کو بھی دیکھ لیں تو انہیں ہذیان ہو جاتا ہے اور وہ فن کی دہائی دینے لگتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ شرمناک حد تک بے اخلاقی بلکہ بداخلاقی حتیٰ کہ ابنارمل اور پیچیدہ شخصیتوں کے مطالعہ کے نام پر ابھارنے اور اچھالنے میں بڑا لطف محسوس کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو ادب اور جذبہ کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ادب میں جذبہ ہی سب کچھ ہے ان اصحابِ تنقید کے نزدیک جذبے سے مراد جنسی جذبات ہیں اس ایک جذبے کے علاوہ باقی اور کوئی جذبہ ان کے خیال میں وجود ہی نہیں رکھتا اردو تنقید کے یہ غول بیابانی یا تو خود گمراہ ہیں یا ادب اور ادیب کو گمراہ کرنے پر مامور ہیں "تنقیدِ جدید" کے ایسے مشنریوں اور نرسریوں کے علاوہ وہ نقاد بھی ہیں جنہوں نے کبھی محض سہل انگاری و آسانی پسندی کی بنا پر اور کبھی پسند و ناپسندیدگی کے ذاتی میلانات کی وجہ سے، کبھی تعقل و تفکر اور تجزیے اور دلیل کی بنا پر محض جذبات کو چراغِ راہ گذر سمجھ لینے کی روش کے سبب اور کبھی معاشرتی تہذیبی اور اخلاقی معیاروں کو بلاکم و کاست قبول کر لینے کی عادت سے مجبور ہو کر اور اکثر و بیشتر غیر ذمہ دارانہ و نامنصفانہ طور طریقہ اختیار کر کے ایسی آراء کا اظہار کیا ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کی صحیح شناخت اور پہچان کروانا تو دُور کی بات ہے ان کے چہرے بگاڑ دیئے ہیں۔

ہمارے ہاں ایسے نقادوں کی بھی کمی نہیں جن کی مثال اس گنوار کی سی ہے جس کو اتفاق سے ایک خوبصورت پیالہ ہاتھ آگیا اسے بتایا گیا کہ اس میں شربت پیتے ہیں۔ اس نے دن رات اس کثرت سے شربت پیا کہ ہیضے کا شکار ہو گیا۔ ہمارے اس قسم کے گنوارے نقادوں نے بھی یہی کیا ہے کسی کو مارکس ازم یا کسی کو فرائیڈ کے بارے میں چند باتوں کا علم ہو گیا، قیامت آ گئی۔ بس موقع بے موقع بات بات پہ وہی بگل بجائے جا رہا ہے۔ ایک دیہاتی بچے کو دھوپ کا چشمہ مل گیا وہ رات کو سوتے وقت بھی اسے آنکھوں سے الگ نہیں کرتا تھا

"تنقید بچوں کا کھیل نہیں ہے یہ ایک مرکب اور پیچیدہ تجزیاتی و تحقیقی عمل ہے اس کے راستے متعدد ہیں اور جتنے ہیں سب اپنی جگہ درست ہیں۔ اس لیے ایک اچھا ناقد سبھی شاہراہوں پر نظر رکھتا ہے

کیونکہ اسے معلوم ہے کہ کسی ایک شاہراہ پر چلنے سے منزل دور سے دور تر ہو جاتی ہے وہ جانتا ہے کہ انسانی ذہانت و طبیعت کی نیرنگیوں کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب، لہذا چشمِ تنقید کو سخت خانہ نیرنگ ہونا چاہیئے اور اس آنکھ کو جمالِ معنی کی تلاش میں ہر سو نگراں رہنا چاہیئے . . . . . تنقید میں جس طرح نفسیات کا طریقِ جستجو نتیجہ خیز ہے اسی طرح عمرانی اجتماعی طریقِ تحقیق بھی مفید ہے ۔ اسی طرح تنقید کے سائنسی طریقے اور تنقید کے جمالیاتی انداز ۔ ایک ناقد سبھی پر نظر رکھے تو کام چلتا ہے ورنہ لغزش کا ہر ہر گام پر خطرہ ہے" (ڈاکٹر سید عبداللہ)

تحسین فراقی کی تنقید کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے ۔ ان کے دائرہِ تنقید میں اقبال، ابوالعلاء معری اکبر الہ آبادی، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور انتظار حسین جیسے تخلیقی فن کاروں کے علاوہ دورِ جدید کے بڑے بڑے تنقید نگاروں کے نام بھی آتے ہیں موضوع خواہ کوئی ہو، تحسین فراقی کی تنقید کی ایک خصوصیت جو ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے جدت و ندرت ہے ۔ تنقید کا منصب تخلیق کی ماہیت کو اس کے مکمل متن میں سمجھنا اور اس کے سیاسی و سماجی اور ذہنی و نفسیاتی پس منظر میں رکھ کر اس کی قدر و قیمت متعین کرنا ہے ۔
تحسین فراقی نے منصبِ تنقید کی اس ذمہ داری کو ہر جگہ گہرے احساسِ فرض کے ساتھ نبھایا ہے اس کی خوبصورت مثالیں یوں تو ان کے سبھی مضامین میں ملتی ہیں لیکن "علامہ اقبال اور تماشائے خواجہ" "اقبال اور ابوالعلاء معری" اور "بشنو از نے چوں حکایت می کند" کے عنوانات کے تحت لکھے جانے والے مقالات بطورِ خاص ذکر کئے جا سکتے ہیں آخر الذکر مقالے سے دو اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:

" انتظار کا تاریخی، تخلیقی اور تہذیبی شعور اپنے اظہار کو کسی ایک سانچے میں مقید نہیں کرتا، زمینوں اور زمانوں پر حاوی یہ شعور متنوع اسالیب کو جنم دیتا ہے . . . .
انتظار کے بیشتر افسانوں میں مسلم کلچر کہیں واضح اور کہیں تہہ موج کی صورت میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے . . . . انتظار کا مسلم کلچر یا پولر شیعہ ہدایت کے تال میل سے مرتب ہوا ہے . . . . انتظار حسین اپنی اصل میں شدید طور پر مذہبی ہیں لیکن ان کی مذہبیت میں صدیوں کے جمے ہوئے روایتی ماحول کے رسوم و رواج، مترتبہ توہمات اور تجربات کی گونج صاف سنائی دیتی ہے"

"انتظار حسین کو اپنے آپ کو دہرانے کی بہت عادت ہے ۔ شاید ہر بڑی مربوط شخصیت کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے ۔ ایف آر لوئیس کے بقول جو گم ہو گیا ہے اس پر اصرار کرنا ضروری ہے تاکہ وہ فراموش نہ ہو جائے ۔ انتظار گم شدہ چیزوں پر اصرار کرتا ہے ان کو نئے نئے اسالیب کے واسطے سے دہراتا ہے یاد اور خواب اس کی تحریروں کے مرکزی

استعارے ہیں۔ انتظار کی شخصیت کا قفل ابجد یاد اور خواب کی شاہ کلید سے کھلتا ہے۔ یہ قفل ابجد اس کی شخصیت کا ساتواں در ہے۔"

نقاد کا اولین فرض تخلیق کی ماہیت کو اس کے مکمل متن میں سمجھنا ہے۔ شاعر یا ادیب کے عہد کے سیاسی و سماجی اور ذہنی و ادبی حالات کو پس منظر میں رکھ کر چھان پھٹک کرنا بعد کا مرحلہ ہے۔ نقاد اپنے اس فرض سے دامن نہیں چھڑا سکتے لیکن پہلو بچانے کے مرتکب ضرور ہوتے ہیں اس کی وجوہ کم فہمی میں تلاش کی جائیں یا تن آسانی میں اس کے اثرات ادب کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ زیر تنقید مصنفوں کی تصانیف کو بار بار پڑھنے اور غور سے پڑھنے کی عادت کے فقدان سے ایسے سطحی نتائج سامنے آتے ہیں جو ادب کے عام قارئین کو تو گمراہ کرتے ہیں تاہم اہلِ نظر کے معمولی تجزیے کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔

ہر چند کہ تحسین فراقی کا شمار بھی تنقید کے نئے غواصوں میں ہوتا ہے لیکن انہوں نے اپنی تنقیدی آراء کو ادب اور متعلقہ سماجی علوم کے گہرے اور وسیع مطالعے پر جس غور و فکر سے استوار کیا ہے اس سے اردو نقادوں میں ان کی انفرادیت قائم ہو گئی ہے تحسین فراقی کی تنقید سہل انگاری اور کم فہمی کے سست رگ رویوں سے بہت بلند ہے اس کی بنیاد تخلیقی تجربے اور اس کے طرز اظہار کی سنجیدہ فہم پر ہے انہوں نے اپنے موضوعات پر گفتگو کرنے سے پہلے تمام متعلقہ تحریروں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور زیر بحث مصنفوں اور شاعروں کی فکری اور تخلیقی ساخت میں بروئے کار آنے والے اجزا کا سراغ لگایا ہے ان کے مزاج اور افتادِ طبع کی پہچان کی ہے اس طرح پرکھ پہچان کی ضروری منزلوں سے گزر کر وہ رائے ظاہر کی ہے جو مبنی بر حقیقت ہے اور جس کی بنیاد استقرائی استنباط پر ہے۔

اردو تنقید کے مایوس کن تاریک پسِ منظر میں فکر صالح، توازن و اعتدال اور تفکر و تعقل کے گنے چنے مشعل برداروں میں تحسین فراقی کا اضافہ اردو ادب سے مایوس نہ ہونے والے اصحاب کی تقویت کا استعارہ ہے۔

گمشدہ کلمات

مصنف: مرزا حامد بیگ   مبصر: شمیم احمد

یہ بات خاصی قابل توجہ ہے کہ ہمارے لکھنے والوں کی وہ نسل جس کے شعور نے قیام پاکستان کے فوراً بعد آنکھ کھولی تھی، تقریباً ایک ہی تجربے سے گزری ہے۔ ان اقدار کی پامالی جن کے ہونے "پر ہمارے یہاں صرف زبانی طور پر اصرار کیا جاتا ہے۔ قول و عمل کے درمیان ایک گہری خلیج اور ایسا رجحان جس میں صرف انسانی خواہشات کی آبیاری ممکن ہو۔ اپنی معاشرتی اقدار پر شدید احساس کمتری اور بیرونی معاشرت کی

اور نگوں سے لکھے گئے ہیں مگر ان میں سے بعض مضامین کو پڑھ کر اردو تنقید کی کم مائیگی اور انحطاط کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس حصے میں دو مضامین البتہ قابلِ ذکر ہیں۔ سراج منیر اور سلیم اختر کے مضامین سراج منیر نے جوش کی لفظیات کا لسانی و تہذیبی پس منظر پیش کیا ہے اور سلیم اختر نے جوش کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے ان دونوں مضامین سے کئی جگہ اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ان کو میراجی کے اس تجزیے کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے جو انہوں نے اس نظم میں جوش کی بعض منظومات پر کیا تھا اور جو افکار کے اس شمارے میں بھی موجود ہے۔ تو اردو تنقید کو اس رخ کا تعین کرنے میں آسانی ہو گی جس پر چل کر جوش کے فن کا ایک مستند اور سیر حاصل جائزہ لیا جا سکتا ہے

افکار کے اس شمارے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ملک بھر کے اخبارات سے جوش کے انتقال کی خبریں کی خبریں، کالم، تبصرے، اداریے وغیرہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں مولانا کوثر نیازی کے مضمون سے لے کر سلیم احمد کے کالم تک اور انتظار حسین کے لاہور نامے سے لے کر جناب حفیظ جالندھری کے افسوسناک رویے تک وہ تمام مختلف تاثرات اور ردِ عمل سمٹ آتے ہیں۔ جو جوش کی ہنگامہ پرور (متنازعہ فیہ) شخصیت نے پیدا کئے یہ تراشے جہاں جوش کی زندگی کے اختتام پر ایک مستند دستاویز بن جاتے ہیں وہیں یہ تاریخی ریکارڈ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں کہ جوش کی موت جیسے تہذیبی اور قومی سانحے پر لوگوں نے کیا رویے اختیار کئے۔

افکار کے جوش نمبر میں صہبا لکھنوی نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ ''بیادِ جوش'' اس کا تکملہ ہے۔ جوش کی شخصیت ہی اتنی گراں مایہ تھی کہ افکار کے بھاری بھر کم نمبر اس کے لیے عین مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضخیم رسالہ بھی، یوں معلوم ہوتا، کہ پورے جوش کو نہیں سمیٹ پایا لیکن جوش بھی تو وہ جن نہیں کہ ایک بوتل میں بند ہو جائیں۔ افکار کی اس خصوصی اشاعت میں صہبا لکھنوی نے جن کو تو نہیں بند کیا۔ البتہ اس جن کو پکڑنے کا وظیفہ ضرور بتا دیا ہے۔

اس خصوصی شمارے میں تقریباً پانچ سو صفحات ہیں اور اس کی قیمت تیس روپے ہے جو آج کل کے حساب سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی۔ کتابت و طباعت بھی افکار کے حسب روایت معیاری ہیں۔ صہبا لکھنوی اس شمارے کی اشاعت پر مبارک باد کے مستحق ہیں اور امید ہے کہ یہ شمارہ بھی افکار کے دوسرے خصوصی شماروں کی طرح قبولِ عام حاصل کرے گا۔

○ ○

بھنور کی آنکھ

مُصنّف :- خاقان خاور   مُبصّر :- ارشاد صدیقی

"بھنور کی آنکھ" سے آنکھیں چار کیجئے تو درمیان میں اسلم کمال آکھڑے ہوتے ہیں اور بیداد یہ ہے کہ خاقان خاور سے پہلے داد چاہتے ہیں اور ہم داد دیئے بغیر رہ بھی نہیں سکتے کہ شعروں سے پہلے تصویریں اپنی طرف کھینچتی ہیں اور مفاہیم کی لمبی مسافتوں پر لے نکلتی ہیں۔ مفاہیم کی ان لمبی مسافتوں پر اسلم کمال کی تصویریں خاقان خاور کے نقشِ قدم پر پاؤں دھرتی آگے بڑھتی اور ہمیں ساتھ لے کر چلتی ہیں مگر خود خاقان خاور ان مسافتوں سے تنہا گذرا ہے

مَیں فرزانوں کی بستی میں تنہا ہوں
مجھ جیسے دو چار تو ہوں دیوانے بھی

تنہائی اور دیوانگی ایک دوسرے کا سایہ ہیں اور سائے ہیں کہ بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ بقول جگر مراد آبادی ؎

عقل و خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

عقل نے لمبی مسافتیں طے کر لی ہیں۔ مزید لمبی مسافتوں کی طرف رواں ہے۔ مگر ساتھ ہی دلوں کے درمیان فاصلے بھی بڑھ گئے ہیں۔ دل کو دل سے جانے والی راہیں بھی گم ہو گئی ہیں اور اس طرح گداز قلب کی باتوں کا ابلاغ بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ؎

مَیں جو کہتا ہوں کسی پر بھی عیاں ہوتا نہیں
کرچیوں سے بٹ گیا ہے آئینہ گفتار کا

مَیں زمانے بھر سے تنہا برسرِ پیکار ہوں
ایک ذرّے کو ہے خاور سامنا کہسار کا

کوئی آتا ہے، نہ جاتا ہے، وہ تنہائی ہے
دل پہ آسیب زدہ گھر کا گماں ہوتا ہے

خاقان خاور تنہائیوں، تاریکیوں، بلاؤں اور طوفانوں کا ذکر تو کرتا ہے کہ یہ سب کچھ

اُس کے اِردگرد ہے اور دوسروں کو بھی ان کے وجود کا احساس دلانا ایک جاگتے شاعر کا فرضِ منصبی ہے، اگر وہ خود ان اندھیروں، بلاؤں اور طوفانوں کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکتا بلکہ عزم و حوصلے کی مشعل روشن کرتا ہے ؎

اندھیری شب ہے، صدائیں ہیں اور اکیلا مَیں
اُجاڑ گھر ہے، بلائیں ہیں اور اکیلا مَیں

کتنے طوفاں ہیں، سباں اکیلی ہے
پھر بھی مضبوط یہ حویلی ہے!

شاید اسی مضبوط حویلی کے زعم پر انسان نے اُس بارِ گراں کو قبول کر لیا تھا جس نے پہاڑوں پر بھی گرانی کی تھی مگر کبھی کبھی جب محرومیوں کے گھیرے بہت تنگ ہو جاتے ہیں تو انسان پھر یوں بھی کہہ اُٹھتا ہے ؎

مَیں نے دنیا بھی گنوائی خاور
گیان بھی مجھ کو گیا سے نہ ملا

گیان مل جائے تو کپل وستو کی سلطنت چھوٹنے کا غم نہیں ہوتا۔ مگر غم تو یہ ہے کہ اکثر لوگ محروم رہتے ہیں اور خصوصاً وہ جو سوچنے والا ذہن اور محسوس کرنے والا دل رکھتے ہوں۔ یہ محرومی ہوش کی ابتدائی منزلوں سے عمر کی آخری سانسوں تک بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ خاقان خاور ان محرومیوں کو کچھ اس طرح مصوّر کرتا ہے ؎

کٹ رہی ہے ان دنوں یوں زندگانی جس طرح
مَیں کسی میلے میں ہوں اور جیب میں پیسے نہیں

ہر چند نہیں نام کی تختی بھی یہاں پر
لے آئی ہے خوشبو ہمیں پھولوں کی دکاں پر

خاور کہیں ہوا کا ہے نہ دھوپ کا گزر
اونچے ہیں سب مکان مرے آس پاس کے

دھوپ اُتری بھی تو دیواروں سے ہی لپٹی رہی
یُوں بھی اِک ٹھٹھرے ہوئے آنگن کو ترسایا گیا

ڈوبتے کو ایک تنکے کا سہارا ہی سہی !
آس کی کوئی کرن اُترے کبھی زندان میں

خاقان خاور کے اس زندان پر غور کرتے ہوئے قرآنِ پاک کی یہ آیت یاد آگئی کہ ہم نے تمہیں قبیلوں اور خاندانوں میں بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ قبیلے، برادری کنبے اور خاندان کی پہچان اور اُس کے نام و مقام کی خاطر سوچنے والے ذہن کے لیے بڑا کرب ہے۔ خدمت، ایثار اور قربانی اُس کا انتخاب اور پھر مقدر بنتا ہے۔ برادری کنبے اور خاندان کے زندان خانوں سے نکل کر مغربی دنیا نے اپنی معاشرتی قدریں ڈھیلی اور اپنا نظری و فکری منزلیں گم کر دی ہیں۔ مگر ہماری مشرقی دنیا میں خاندانوں کے تناور اور چھتنار درخت پر اعزاء و اقربا کی آکاس بیل بھی کچھ زیادہ قابلِ برداشت نہیں ہے۔ ؎

میں پاؤں پر کھڑا ہُوا تو سارا خاندان
آکاس بیل کی طرح مجھ سے چمٹ گیا

کرگسوں کا اُسی پہ ڈیرا تھا
پیڑ کوئی جہاں بھی اونچا تھا

اس صورتِ حال پر خاقان خاور کو ترس بھی آتا ہے ؎

اُسی پھول سے بچے پہ ہے کنبے کا گذارہ
اِک کوہِ گراں ٹوٹ پڑا ننھی سی جاں پر

تاریکیوں میں ڈوب نہ جائے تمام گھر
مجھ کو نہ توڑ، میں کسی کنبے کی آس ہوں

اور کبھی کبھی وہ اس صورتِ حال پر جھنجھلاتا بھی ہے ؎

سانپ ہی سانپ نظر آتے ہیں ہر سُو خاور
مجھ کو تو مار گیا میرا خزانہ ہونا

میں ہوں وہ پیڑ جسے راس نہیں اپنا ثمر
اس قدر بوجھ ہے مجھ پر کہ میں ڈھنا چاہوں

اور بوجھ تو زندگی اور زندگی کے مختلف مسائل بھی ہیں۔ کہیں خواب ڈراؤنے ہوتے ہیں تو کہیں خواب کی تعبیریں جان لیوا۔ کہیں غربت مصیبت ہوتی ہے تو کہیں امارت عذابِ جان۔ کہیں اولاد کی تمنا سکھ چھین لیتی ہے تو کہیں خود اولاد کے اعمال کی دکھوں کی پٹاری کما لاتے ہیں۔ کہیں عفتیں نیلام ہوتی ہیں تو کہیں عزتیں سُولی چڑھ جاتی ہیں۔ کہیں جینا مرنے کے مترادف ہوتا ہے تو کہیں مرنا جینے سے بہتر۔ کیا کیا رنگ ہیں زندگی کے اور کس کس ڈھنگ سے خاقان خاور نے انہیں شعروں میں باندھا ہے ؎

زندگی سے ہیں یہ کہیں خواب سہانے خاور
سونے والوں کو خدارا نہ جگایا جائے

بے خطا ہوں وہ جانتا ہے مگر
میں ہوں مفلس مری صفائی نہ دے

اولاد اُس کی دیکھ کے یہ سوچتا ہوں میں
کیوں نیکیوں کے پیڑ سے کڑوے ثمر لگے

کس آس پہ دن رات کی چکی میں پسیں ہم
جینا یہی جینا ہے تو مر کیوں نہیں جاتے

کیا سوچ کے فٹ پاتھ پہ آ بیٹھے ہو خاور
ایسی ہی تھکاوٹ ہے تو گھر کیوں نہیں جاتے

تھکاوٹ ایک داخلی کیفیت کا نام ہے۔ مگر اس داخلی کیفیت کو خارجی ماحول سے طمانیت اور سکون بھی میسر آتا ہے۔ شجر اور ثمر وہ استعارے ہیں جو "جنت گم گشتہ" کی یاد اور پھر اس کی بازیافت سے ہمارا رشتہ جوڑتے ہیں۔ شجر اور ثمر [illegible] انسان کا رشتہ اتنا ہی پرانا

ہے جتنا خود انسانی دل میں خواہشوں کے بیج بونا۔ اُمیدوں کے پیڑ اُگانا، پھر اُن کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں مستقبل کے حسین خواب دیکھنا۔ موسموں کی سختیوں سے اُنہیں بچانا اور خونِ جگر سے اُنہیں سیراب کرنا انسان کا ہمیشہ سے ہی محبوب مشغلہ رہا ہے — یہاں کبھی تمنائیں خاک بھی ہوتی ہیں، کبھی شجر سوکھ بھی جاتے ہیں۔ کبھی طوفانوں سے اُکھڑ بھی جاتے ہیں، کبھی اُن کی سبز چادریں بھی چھن جاتی ہیں اور کبھی کبھی وہ بے ثمر بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر انسان کا رشتہ شجر کے ساتھ ازل سے ہے اور ہر صورتِ حال میں کسی نہ کسی طور پر یہ رشتہ برقرار رہتا ہے۔ خاقان خاور بھی "جنت گم گشتہ" کی یاد اور اس کی بازیافت کے تجربے سے گذرتا ہے تو اشعار یوں ڈھلتے ہیں ؎

کچھ تمنائیں خاک بھی ہوں گی
کب اُگے ہیں یہاں شجر سارے

تُو نے سمجھی نہ موسموں کی زباں
دیکھ وہ گر پڑے ثمر سارے

سب کو طوفان نے ایک سا کر دیا
باثمر شاخ بھی بے ثمر ہو گئی

جس جگہ چھاؤں تھی، اب دُھوپ وہاں رہتی ہے
ہم سے کاٹے تو گئے، پیڑ اُگائے نہ گئے

کس کو خبر ہے پیڑ سے جا کر
کون سا پتّہ کب ٹوٹے گا

دُھوپ میں سائے کی چادر تو میسّر ہو گی
ننگی سڑکوں پہ درختوں کو اُگایا جائے

درختوں کو اُگانے کے لیے نرم مٹی اور پھر پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خشکیوں پر پانی چشموں، دریاؤں اور بارشوں سے آتا ہے۔ استعارے کی لغت میں دیکھیں تو دریا کی طغیانی،

موجوں کی روانی، ساحلوں کے درمیان پانیوں کا بہنا اور ساحلوں سے اُچھل کر کھڑی فصلوں، درختوں اور بستیوں کو بہالے جانا ــــ پانیوں کا خشک ہو جانا، نرم مٹی کا دھول بن کر اُڑنا، صحراؤں کی قلمرو کا وسیع ہونا ــــ پانی کا بھاپ بن کر اُڑنا۔ پھر بادلوں کا برسنا اور ہر طرف جل تھل ہو جانا۔ مردہ زمین میں زندگی کا پھر سے انگڑائی لینا، درختوں سے نئی کونپلیں پھوٹنا، ٹہنیوں پر پرندوں کا چہچہانا، گیت گانا۔ یہ سب کچھ انسانی جذبے کی مختلف صورتیں ہیں اور جذبے کی ان مختلف صورتوں کو پانی اور روانی کے استعارے میں خاقان خاور نے بھی بیان کیا ہے ؎

اب تو اُس کی زد میں ہے سارا نگر آیا ہُوا!
وہ بھی دن تھا سیل تھے جب ساحلوں کے درمیاں

دُور ہونے لگا ہوں دریا سے
جانے کیا سوچ کر اُڑا ہوں میں

اِک ایک بھنور کھولے ہوئے آنکھ ہے خاور
ہر سیلِ بلا ہم کو تو بیدار ملا ہے

ہر قدم آگے بڑھاتا ہوں میں دریا کی طرح
ایک ہی بات دوبارہ نہ کہنا چاہوں

ریت ہی ریت ملی جا کے جو دیکھا خاور
میں نے دریا جسے جانا تھا، وہ صحرا نکلا

آنسو بھی ہیں پت جھڑ کے افسانے بھی
آنکھوں میں دریا بھی ہیں ویرانے بھی

چھوٹے لوگوں نے بڑے لوگ بنائے خاور
ندیاں جیسے جنم دیتی ہیں دریاؤں کو

چھوٹی چھوٹی ندیاں جس طرح بڑے دریاؤں کو جنم دیتی ہیں، اُسی طرح چھوٹی چھوٹی صنعتیں کلام کے حسن میں بڑی خوبیاں پیدا کرنے اور چار چاند لگانے کا سبب بنتی ہیں۔ صنائع لفظی اور بدائع معنوی سے آج کے بیشتر یا تو آگاہ نہیں یا پھر ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ غزل کی فطری لطافت و نزاکت کو جدید لفظیات سے اس قدر بوجھل کر دیا گیا ہے کہ غزل، غزل نہ رہی کہ غزال کی نزاکت، سبک رفتاری، چلبلاپن، حیرانی اور اضطرار و اضطراب میں ہی حسن ہے نہ کہ اُس میں اور جانوروں کی خوبیوں اور خامیوں کے نفوذ کی کوشش کی جائے — خاقان خاور نے غزل کو غزل رہنے دیا ہے۔ زندگی کے تازہ تر مسائل کو اپنی غزل میں زبان تو دی ہے۔ مگر اس زبان کو جدید تر نہیں ہونے دیا۔ لہجے اور اسلوب میں کلاسیکیت برقرار رکھی ہے۔ صنعتوں کا خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ اس طرح اُس کی غزل قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہوتے ہوئے بھی" اپنے اجزائے ترکیبی اور اپنی تاثیر کے اعتبار سے کلاسیکی ہی کہی جا سکتی ہے —"
خاقان خاور کا ایک بڑا کمال مجھے یہ دکھائی دیتا ہے کہ اس نے اچھوتی تشبیہیں ایجاد کی ہیں ؎

کون دیتا ہے توجہ میں اگر ٹوٹ بھی جاؤں
مَیں بھی ہوں جیسے کرائے کا مکاں ہوتا ہے

نیکی کی طرح اچھا بھی مجھ کو سبھی کہیں
میرا جہاں میں کوئی خریدار بھی نہیں

اُس کا باطن بدنما، ظاہر بڑا رنگین تھا
ٹوٹے پھوٹے فرش پر جیسے نیا قالین ہو

یوں ہوا دشت کی پُرخطر ہو گئی
فاختہ ایسی بکھری کہ پَر ہو گئی

عجیب تجربہ ہے فاختہ کا پَر ہو کر بکھر جانا۔ مگر سوچیے تو یہ کس قدر قریب کی حقیقت ہے اور کس قدر انوکھی سچائی ہے۔ ایسی ہی کچھ سچائیاں خاقان خاور کے دوسرے عجیب و غریب تجربات میں بھی آئی ہیں جو ہمیں حیران تو کرتی ہیں، پریشان نہیں کرتیں ؎

اُ، دل ڈالی کو ڈالی کہتے ہو
تم بھی خاور بات نرالی کہتے ہو

نظر سے ایک مدت دی ہے دستک
بڑی مشکل سے وہ جب جا کر کھلا ہے

جب کسی پیڑ پہ پتھر برسے
مجھ کو نیکی کا ثمر یاد آیا

سوچوں تو ہے محال سا اُس سے مرا ملاپ
دیکھوں تو راہ میں کوئی دیوار بھی نہیں

اِک لکیروں کا جال ہے خاور
قید جس میں مری ہتھیلی ہے

میں اُس قبر میں جسم اپنا چھوڑ آیا ہوں
وہ رشتہ توڑ گیا تھا، میں جوڑ آیا ہوں

اُس کی قبر میں اپنا جسم چھوڑنے کا تجربہ بھی کس قدر المناک ہے۔ مگر یہ الم ہم پر ٹوٹا کہ اُس نے اپنی قبر کھود دی اور ہم نے اُس کی قبر کھودنے میں مدد کی۔ اُس نے ہم سے رشتہ توڑنے کی بات کی اور ہم نے رشتہ برقرار رکھنے کی کوئی سبیل نہ نکالی — وہ ہمارا خون تھا، ہمارا بھائی تھا۔ ہمارا بازو تھا سب کچھ ہمارے سامنے ہُوا، ہمارے ہاتھوں ہُوا اور ہم نے دم نہ کھینچا۔

دیکھتے ہی دیکھتے آپس میں دشمن ہو گئے
خون کا دریا رواں تھا، بھائیوں کے درمیاں

مدت سے جس کا نام مرے بھائیوں میں تھا
ایسی ہوا چلی کہ وہ بلوائیوں میں تھا

بھائی مقابل آکر یوں ٹوٹ جائیں گے
کب سوچا تھا، بازو بھی کٹ جائیں گے

رو رہا ہوں کہ اپنی دھرتی سے
مَیں بھی دریا کی طرح بچھڑا ہوں

سچا شاعر وہی ہے جو اپنے گرد و پیش کو کھُلی آنکھ سے دیکھے۔ معروضی صورتِ حال اور قدیم روایات کو پرکھے اور رواں دواں زندگی کے دھارے میں ایک تنکے کی طرح بہنے کے بجائے چپّو سنبھالے اور کشتی کا رُخ متعین کرے۔ بھنور کی آنکھ کے اشارے کو سمجھے اور بھٹکے ہوئے جہازوں کو ساحلی پرندوں کی طرح ساحلوں کی بشارت دے۔ اسے آپ چاہیں تو سیاسی شعور کا نام دے لیں۔ خاقان خاور نرا "سوچتا اور کھوجتا ہُوا" رُومانی شاعر نہیں ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے باخبر بھی ہے اور بے خبر لوگوں کو خبردار کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ وہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیوں کو پہچانتا ہے اور گھر میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے ؎

شفاف پانیوں میں ہیں منظر نئے نئے
موسم ہمیشہ ایک سا گدلائیوں میں تھا

کیوں اپنے جسم و جان کے دشمن ہوئے ہو تم
کیوں بھیڑیوں کو سونپ دی ہیں پاسبانیاں

جس پہ برسا ہوں صدا پیار کا بادل بن کر
ہائے وہ شخص مرے خون کا پیاسا نکلا

گھٹے ماحول کو تازہ ہواؤں کی ضرورت ہے
پرانے سب در و دیوار کو اب توڑنا ہوگا

دیوار و در سے آگ کے شعلے بلند ہیں
اور گھر میں کوئی آدمی بیدار بھی نہیں

خود گرے گی تو کئی لوگوں کا مدفن ہوگی
کیوں نہ بوسیدہ عمارت کو گرایا جائے

نظام ہائے سیاسیات کی بوسیدہ عمارتوں کے گرنے کا مشاہدہ بارہا تاریخ نے کیا ہے اور بارہا ان کا ملبہ عالمِ انسانی کا مدفن بنا ہے۔ عقل والے وہ لوگ ہیں جو ان کی بوسیدگی کا ادراک کرتے ہوئے نئی، مضبوط اور پائیدار عمارتوں کی تعمیر کا منصوبہ بناتے ہیں۔ مگر المیہ یہ رہا ہے کہ نظام ہائے سیاسیات کے وہ تمام ایوان جو انسانی عقل نے تعمیر کیے وہ کسی بھی بادِ مخالف کے لیے تاش کے گھر سے زیادہ اہمیت کے حامل نہ ہوئے سوائے ان کے کہ آسمانی رہنمائی نے جن کی ترتیب و تشکیل میں نمایاں حصہ لیا۔ خاقان خاور فکر و عمل کے اعتبار سے روایتی دیندار آدمی تو نہیں جان پڑتا مگر اندر سے وہ پکا مذہبی آدمی ہے۔ اس کی لغت، اس کا اسلوب، اس کی تلمیحات، اور اور اس کی اخلاقیات پہ گہری مذہبی چھاپ ہے ؎

جانے ہو جاتا ہوں خائف کس لیے
میں ابابیلوں کا لشکر دیکھ کر

حملہ شاہ کے برائی کو روکنا چاہوں
میں ایک جگنو سے سورج نکالنا چاہوں

تو بھلا ہے تو پھر بھلائی کر
یوں بدی کے عوض برائی نہ دے

ملی ہوں اور نہ ہمسر ہوں، پھر بھی حق کے لیے
عجیب شخص ہوں شعلوں میں کودنا چاہتا ہوں

چھپا ہے جذب زمیں کی تہوں میں سب پانی
لبوں پہ ذکر نہیں بس رہا ہے اندر وہ

سبھی رشتے وہیں جاتے ہیں خاور
وہی سارے زمانے کا خدا ہے

نور سے میں نے بھر لیا دامن
لوگ اُلجھے رہے دلیلوں میں

سب میں اُسی کا نور ہے۔ وہ سارے پر محیط ہے۔ حیات و کائنات کا کون سا رنگ ہے جو اُس نور سے روشنی اخذ نہ کرتا ہو۔ خاقان خاور نے جب اس نور سے اپنا دامن بھر لیا تو حیات و کائنات کے تمام رنگ اُس کی شاعری میں سمٹ آئے اور اس کا ایک ایک مصرعہ رنگ و نور کا غرور بن گیا۔

OO

عوام، پارلیمنٹ، اسلام

تصنیف : ایس ایم ظفر مبصر : عطاء الحق قاسمی

ایس ایم ظفر صاحب کی کتاب "عوام، پارلیمنٹ، اسلام" پر اظہار خیال میرے لیے بوجوہ خاصا مشکل کام ہے۔ کیونکہ مجھے اس پر کچھ لکھنے کے لیے بنیادی تعصبات کی شدید کمی محسوس ہو رہی ہے۔ مثلاً اس سلسلے میں پہلی رکاوٹ یہ ہے کہ ایس ایم ظفر صاحب میرے دوست نہیں ہیں۔ اگر دوست ہوتے تو میں کتاب پڑھے بغیر اس کے ڈانڈے افلاطون کی "ریاست" سے ملاتا اور "عوام، پارلیمنٹ، اسلام" کے مصنف کو گزارتے ہوئے عرض کرتا کہ عزیزی افلاطون۔ ایس۔ ایم۔ ظفر صاحب سے صرف عمر میں دو ایک ہزار سال بڑے ہونے کی وجہ سے بڑے بن بیٹھے ہیں، ورنہ جو کام ہوا ان سے وہ رستم سے نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ

ایس۔ ایم ظفر صاحب میرے دشمن بھی نہیں ہیں۔ ورنہ اگلے پچھلے تمام بدلے چکانے کا یہ بہترین موقع تھا۔ چنانچہ میں کتاب پڑھے بغیر با آسانی لکھ سکتا تھا کہ ایس۔ ایم ظفر صاحب کو یہ کتاب لکھنے سے پہلے آمریت کے حق میں شرعی دلائل دینے والے کسی بزرگ کے سامنے ایک عرصے تک زانوئے تلمذ تہہ رکھنے چاہییں تھے تاآنکہ اس کے نشان ان کے گھٹنوں پر بھی نظر آنے لگتے۔ یہ نشان پڑنے سے ایک بزرگ یاد آئے جو ایک عرصے سے آمروں کی دہلیز پر سجدہ ریز ہیں اور یوں ان کے ماتھے پر محراب کا نشان ہے۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ یہ محراب ان سجدوں کی وجہ سے بھی نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ ماتھے پر سگریٹ بجھاتے ہیں۔ ہم نے انہیں بتایا کہ وہ تو سگریٹ پیتے ہی نہیں۔ تو کہنے لگے پھر لوگ ان کے ماتھے پر سگریٹ بجھاتے ہوں گے! اصل بات ایک اور تھی، آہ بھی

اور اصل بات یہ ہے کہ اگر ایس۔ ایم ظفر صاحب میرے دوست ہوتے یا دشمن ہوتے تو بھی دریں حالات اس کتاب پر پوری دیانتداری سے اظہار خیال "شہادت گہ الفت" میں قدم رکھنے کے برابر تھا۔ اس کا متن ایسا ہے ہے جس کے متعلق ایک شاعر نے کہا ہے کہ اس کی دوستی اچھی نہ اس کی دشمنی ایم۔ ظفر صاحب نے اگر شہادت گہ الفت میں قدم رکھا ہے تو ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں؟

مگر اس کتاب پر اظہار خیال کے ضمن میں موجود رکاوٹوں میں سے ایک بڑی رکاوٹ کا ذکر تو میں نے کیا ہی نہیں اور وہ یہ کہ "عوام، پارلیمنٹ اسلام" اپنے سٹائل اور دلنشین پیرایۂ اظہار کے باوجود بہرحال ایک سیاسی کتاب ہے اور ایک ادبی سکول آف تھاٹ کے مطابق ادیب کو صرف غزل، نظم، افسانہ، مرثیہ اور قصیدہ وغیرہ ہی سے سروکار رکھنا چاہیے۔ بلکہ ان میں سے بھی صرف مرثیے اور قصیدے لکھنے ہی کی طرف پوری توجہ مرکوز کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ایسی کتاب پر اظہار خیال سے جو اس ملک کے بنیادی نظریئے اسلام اور اس

ملک کے کروڑوں عوام کے مستقبل کے حوالے سے لکھی گئی ہے، میرا ادبی کیریئر تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ باقی میرے موٹر سائیکل کا کیریئر رہ جاتا ہے اور روز افزوں مہنگائی کی وجہ سے فی زمانہ یہ بھی کوئی کام کی چیز نہیں۔

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں نے اس کتاب کے بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں، تو پھر لفظوں کے طوطے مینا کیوں بنا رہا ہوں؟ تو اس کا جواب بہت آسان ہے اور وہ یہ کہ اس انجمن میں، میں تنہا نہیں ہوں بلکہ اخباروں کے اداریئے اور فاضل تجزیہ نگاروں کے مضامین اٹھا کر دیکھ لیں۔ الحمد للہ سبھی یہی کرتے ہیں جب کہ ظفر صاحب نے حرف آغاز میں ہی آئیں بائیں شائیں کئے بغیر اپنی تحقیق کا خلاصہ کھلے لفظوں میں بیان کر دیا کہ نظام حکومت کے بارے میں چند بنیادی اصولوں کو بیان کرنے کے بعد اسلام نے امت مسلمہ کو مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں از خود فیصلہ کرنے کی اجازت دی ہے اور اس لحاظ سے ملت

اسلامیہ ہی وہ پہلی امت ہے جس نے اپنے ہادیٔ برحق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان اصولوں کی مدد سے باقاعدہ طور پر ایک نظریاتی مملکت قائم کی ہے"۔ اور پھر آگے چل کر ظفر صاحب مزید کھلتے چلے گئے اور پوری اسلامی تاریخ کے پس منظر اور پھیلاؤ میں اپنا نقطۂ نظر اس مرکزی نقطے کے گرد سمیٹ لائے کہ آمریت نہ صرف یہ کہ ملک و قوم اور مسلمانوں کے لیے کبھی رحمت ثابت نہیں ہوئی بلکہ یہ اسلام کے لیے بھی مضر ثابت ہوئی۔ حتیٰ کہ مذہبی فرقہ بندیاں بھی اسی نظام کی وجہ سے مضبوط ہوئیں ان کے لفظوں میں "جس ملک میں سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی جاتی ہے، وہاں زیر زمین جماعتیں ہی کام کرتی ہیں اور یا پھر مذہبی اور علاقائی گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن سے ملکی یکجہتی اور وحدت کی جگہ خلفشار حق جنم لیتے ہیں خود تاریخ اسلام پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ خلافت جو خالصتاً سیاسی مسئلہ تھا اس پر کیا اختلاف رونما ہوا۔ اس وقت اگر سیاسی جماعتوں کی تشکیل کی جا سکتی جو ممکن نہ تھی کیونکہ اس زمانے میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل کا تصور ہی پیدا نہیں ہوا تھا، تو یہ معاملہ صرف سیاسی رنگ ہی اختیار کرتا۔ لیکن سیاسی جماعتیں چونکہ بن نہ سکیں اس لیے بات مذہبی انداز میں آگے بڑھی اور امت مسلمہ مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹتی چلی گئی"۔ اور آخر میں ایس ایم ظفر صاحب نے اسلامی تاریخ، مسلمان مفکروں، مغربی دانشوروں، تجربوں اور مشاہدوں کے بیشمار بکسوں میں سے جو پرچیاں برآمد کی ہیں ان سب پر پارلیمانی جمہوریت کے لیے کراس لگا ہوا ہے اور ایس ایم ظفر صاحب کے نزدیک یہی ہمارے مسائل اور مصائب کا حل ہے۔

تاہم جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ میں تو ادیب ہوں، یہ مسائل میرے سوچنے کے ہیں ہی نہیں لہٰذا ان پر رائے ظاہر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں تو آپ کو اس دانا دکاندار کا لطیفہ سنا دوں گا جو گاہک کو بہرصورت اپنے دام میں پھنسا لیتا تھا۔ یعنی اگر کا ہک نے کلس صابن مانگا ہے تو اس نے کہا کہ جناب وہ تو ختم ہو گیا ہے۔ آپ ریکسونا لے جائیں۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔ لیکن ایک گاہک نے ان سے بلیڈ طلب کیے۔ دکاندار نے معذرت کی اور کہا جناب بلیڈ تو ختم ہو گئے ہیں۔ آپ رینگ مارے جائیں"۔ دانا دکاندار تو ہمارے سابق حکمران بھی تھے۔ چنانچہ ایوب خاں سے اگر کوئی جمہوریت طلب کرتا تھا تو وہ معذرت کرتے تھے۔ اور کہتے "جمہوریت ختم ہو گئی ہے، آپ بنیادی جمہوریت لے جائیں"۔ ذوالفقار علی بھٹو سے جمہوریت طلب کی جاتی تھی تو وہ کہتے تھے "معاف کیجئے جناب جمہوریت ختم ہو گئی ہے۔ آپ عوامی جمہوریت لے جائیں"۔ اور اگر ایس۔ ایم۔ ظفر صاحب ایسے گاہک ان دونوں بازار گئے اور پارلیمانی جمہوریت طلب کی تو ہمیں خدشہ ہے کہ ان سے معذرت کی جائے گی اور کہا

کہ محکمہ جناب پارلیمانی جمہوریت ختم ہو گئی ہے۔ آپ بنیادی جمہوریت سے جا ملیں۔
(مرحوم پارلیمینٹ کے مرحوم کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا)

۵۵

گیت

حسن رضوی

ساحل ساحل
دریا دریا
لکھتے رہیں گے اک دوجے کا نام
ہم تم صبح و شام
موج موج لہراتے رہیں گے
پیار کا رس بکھراتے رہیں گے
ہم سب جھوم کے گاتے رہیں گے
قریہ قریہ ۔ بستی بستی ۔
پھول کھلے ہیں عام ۔ دیکھیں صبح و شام

تیز ہوا کا جھونکا آئے ۔ خوشبو مہکے پیار کی لائے
اپنے خوابوں کو بہکائے
شہر شہر اور نگری نگری
چاہت کے پیغام ۔ آئیں صبح و شام

سبز کنارے نیلا پانی مہکی مہکی رات کی رانی
اک اک پیڑ ہے پیار نشانی
ان پیڑوں پر لکھتے رہیں گے اپنے کل کا نام
ہم تم صبح و شام

حسن رضوی

شام سے پہلے لوٹ آنا
تم شام سے پہلے لوٹ آنا
صبح کے پنچھی لوٹ آتے ہیں
سرمئی شام سے پہلے
اور نہ مجھ کو راہ دکھانا
اور نہ مجھ کو ستانا
شام سے پہلے لوٹ آنا
میں نے اپنے من آنگن میں پیار کے دیپ جلائے
یادتمہاری آئے
خوابوں کی دہلیز پہ میں نے دیکھے روپ کے سائے
جیسے تم ہی آئے
کب تک ان دیکھے خوابوں سے
جیون کو بہلانا شام سے پہلے لوٹ آنا
ایک پرندہ پیڑ پہ بیٹھا اُڑنے کو پر تولے
منہ سے کچھ نہ بولے
ڈالی ڈالی تیز ہوا سے کھاتی ہے ہچکولے
من کو کون ٹٹولے
پیار کی نگری کا ہر موسم
موسم آنا جانا شام سے پہلے
برس رہی ہے کب سے برکھا جانے کب تک برسے
بوچھوں میں ساگر سے
راہ میں تیری آنکھیں بچھانے کیسے نکلوں گھر سے
دیکھوں بس میں در سے
یاد آتا ہے چاند کا اکثر
بدلی میں چھپ جانا ۔ شام سے پہلے لوٹ آنا
بات یہ بھول نہ جانا
شام سے پہلے لوٹ آنا

حسن رضوی

ساتِ رنگی میری اوڑھنی کا اک اک رنگ نرالا
میرا ماہی بھولا بھالا
پہلا رنگ ہے پیار کا موسم
دوجا ایک پہیلی
جیون پیار سہیلی
ساتِ رنگی میری اوڑھنی کا اک اک رنگ نرالا
میرا ماہی کرماں والا
تیسرا رنگ ہے خواب سہانا
چوتھا ایک بہانہ
جیون ایک فسانہ
ساتِ رنگی میری اوڑھنی کا اک اک رنگ نرالا
میرا ماہی چاند کا ہالا
پانچویں رنگ میں پھول کھلے ہیں
چھٹے میں ہجر کی راتیں
کس سے کریں ہم باتیں
ساتِ رنگی میری اوڑھنی کا اک اک رنگ نرالا
میرا ماہی نخرے والا
ساتویں رنگ کی ریت نرالی
آٹھواں رنگ ہے میرا
جیون ایک سویرا
ساتِ رنگی میری اوڑھنی کا اک اک رنگ نرالا
میرا ماہی بھولا بھالا

حسن رضوی

اک رنگ تیرا
اک رنگ میرا
دونوں رنگوں کے رنگیں نظارے
سپنے ہمارے
سپنوں کی وادی میں کلیاں کھلی ہیں
بھونروں سے پھولوں کی اکھیاں ملی ہیں
سپنوں میں دیکھے ہیں
جیون کے دھارے

رنگیں فضاؤں کے سنگ چلیں گے
آنکھوں میں چاہت کے پھول کھلیں گے
لہروں کو دیکھیں گے
دریا کنارے

منزل پہ تاروں کی محفل سجی ہے
تیری خوشی اب میری خوشی ہے
خوشیوں کی کرنوں سے
چہرے ہیں نیارے
اک رنگ تیرا
اک رنگ میرا

ایمانیات

مولانا ابوالخیر مودودی
بتوسط: حکیم محمد نبی خاں جمال سوید

سورۂ ابراہیم

اس سورہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انبیائے کرام کے ظہور اور اس کے احوال وظروف اور نتائج مجموعی طور پر بیان کیے گئے ہیں۔

بیان حضرت موسیٰؑ کی زبانی ہے۔ یعنی اس باب میں ان کی موعظت نقل کی گئی ہے۔ پھر سلسلۂ بیان دعوتِ قرآن کے ظہور پر متوجہ ہو گیا ہے اور واضح کیا ہے کہ جو نتائج ہمیشہ نکل چکے ہیں ویسے ہی نتائج اب بھی نکلیں گے

آخر میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دعوتِ قرآن دراصل دعوتِ ابراہیمی کی تجدید ہے، اور اسی عہدِ الٰہی کا ظہور ہے جو حضرت ابراہیم سے کیا گیا تھا۔

ایک خاص بات یہ بھی نمایاں ہے کہ خطاب کا رُخ زیادہ تر رؤسائے قریش کی طرف ہے جن کے ہاتھ میں ملک کی ریاست و پیشوائی کی زمام تھی:

فرمایا: —— الٓرٰ كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ ٱلنَّاسَ مِنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَٰطِ ٱلْعَزِيزِ ٱلْحَمِيدِ ۝ ٱللَّهِ ٱلَّذِى لَهُۥ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْكَٰفِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ۝ ٱلَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا عَلَى ٱلْءَاخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ فِى ضَلَٰلٍۭ بَعِيدٍ ۝

ہدایت روشنی ہے اور ضلالت تاریکی۔ سُنّتِ الٰہی یہ ہے کہ جب تاریکی پھیل جاتی ہے، تو وہ ہدایت وحی کے زور سے انسانوں کو تاریکی سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے۔ قرآن کا ظہور اسی روشنی کا پیام ہے، اور ایسا ہی پیام حضرت موسےٰؑ نے بھی دیا تھا۔

اس کے بعد سلسلۂ کلام یوں شروع ہوتا ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِـَٔايَٰتِنَآ أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ وَذَكِّرْهُم بِأَيَّىٰمِ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝

حضرت موسیٰؑ کو وحی الٰہی سے ایما ہوا کہ اپنی قوم کو ایامُ اللہ کی عبرتیں اور بصیرتیں یاد دلائیں کیونکہ ان میں صبر شکر کرنے والوں کے لیے فتح و کامرانی کی بڑی بڑی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔

بنی اسرائیل مصر میں مدت تک غلامی و مقہوری کی زندگی بسر کر چکے تھے۔ اس سے طبیعتوں میں مایوسی و بے ہمتی سرایت کر گئی تھی۔ مستقبل کے فتح و اقبال کی بشارتیں سنتے، مگر اپنے دل میں عزم و ثبات کے ولولے نہ پاتے۔ پس حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ انہیں "ایام اللہ" کے تذکرے سناؤ۔ ان تذکروں میں قوانینِ حق کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں، یعنی بڑی بڑی دلیلیں ہیں۔ یہ دلیلیں واضح کر دیں گی کہ جو لوگ مصائب و محن کے مقابلے میں ہمت نہیں ہار دیتے، سچائی کی راہ میں جمے رہتے ہیں، اور سعی و عمل سے گھبراتے نہیں، ان کی کامیابی قطعی اور اٹل ہوتی ہے اور ہمیشہ ایسے ہی لوگ فتح و مراد سے ہم کنار ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فرمایا، اس تذکرے میں شکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

صبر کے معنے یہ ہیں کہ مشکلوں، مصیبتوں کے مقابلے میں جمے رہنا۔ شکر کے معنے یہ ہیں کہ اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں کی قدر کرنا، اور انہیں ٹھیک ٹھاک کام میں لانا۔ پھر فرمایا، خدا کا یہ مقررہ قانون ہے کہ جو قوم شکر کرتی ہے، یعنی خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر بجا لاتی اور انہیں ٹھیک طور پر کام میں لاتی ہے، خدا اُسے اور زیادہ نعمتیں عطا فرماتا ہے، لیکن جو کفرانِ نعمت کرتی ہیں، یعنی قدر شناسی نہیں کرتی، وہ محرومی و نامرادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہیں، اور یہ اللہ کا سخت عذاب ہے، جو کسی انسانی گروہ کے حصے میں آتا ہے،

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ
عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ٥

غور کرو، حقیقتِ حال کی کتنی سچی تعبیر ہے۔ جو فرد یا جو گروہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر کرتا ہے، مثلاً خدا نے اُسے فتح مندی و کامرانی عطا فرمائی ہے، اور وہ اس کی قدر پہچانتا، اسے ٹھیک ٹھیک طور پر کام میں لاتا اور اس کی حفاظت سے غافل نہیں ہوتا، وہ اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا مستحق ہو جاتا ہے، اور جو ایسا نہیں کرتا، اس کی نامرادی و تباہی اٹل ہو جاتی ہے۔ دیر ہو سکتی ہے مگر تباہی ٹل نہیں سکتی۔

سورۂ ہود کے آخر میں بھی ایام و وقائع کا ذکر تھا، یہاں ایک دوسرے اسلوب سے ان پر نظر ہے اور تمام ایام و وقائع کے مجموعی نتائج و سُنن بیان کیے جا رہے ہیں، اور ان کی جزئیات کو ایک کلی حقیقت کی صورت میں بیان کیا جا رہا ہے، یعنی سب کا ظہور ایک ہی طرح ہوا تھا۔ سب کے ساتھ ان کی قوموں نے ایک ہی طرح کا سلوک کیا تھا۔ سب کی دعوت ایک ہی تھی، سب کو جواب ایک ہی طرح کے ملے تھے، اور پھر نتیجہ بھی ہر واقعہ میں ایک ہی طرح کا نکلا۔ ہر رسول اور اس کے ساتھی کامیاب ہوئے۔ ہر سرکش اور مقابل نامراد ہوا۔

قرآن کے یہی مقامات ہیں جنہوں نے ایام و وقائع کے سُنن و بصائر صاف صاف واضح کر دیئے ہیں۔

اور اس باب میں ہم نے جو مبادی و اصول مرتب کیے ہیں، وہ تمام تر انہی تصریحات سے ماخوذ ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، کیا پچھلی قوموں کے ایام و وقائع تم تک نہیں پہنچے؟ یعنی تم نہیں سُن چکے ہو؟ پھر تین قوموں کا ذکر کیا، جن کے حالات سے نہ تو بنی اسرائیل بے خبر تھے، نہ مصر کے باشندے بے خبر ہو سکتے تھے، جہاں ان کی نشو و نما ہوئی تھی۔ بقیہ قوموں کا حال چونکہ اس درجہ مشہور نہ تھا، اس لیے صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا۔ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ط یہ جو کہا اِلَّا اللّٰہ، اس میں یہ پہلو صاف نمایاں ہے کہ اور بہت سی قومیں تھیں، جن کا شمار اللہ ہی جانتا ہے، تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط
يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى ط قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ط تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا
عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ط

قوموں کا ہمیشہ یہی جواب رہا کہ ہمیں تمہاری دعوت کی سچائی میں شک ہے۔ ہم نہیں مانتے۔ لیکن پیغمبروں کی دعوت ہمیشہ یہی رہی کہ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ؟ کس بارے میں تمہیں شک ہو رہا ہے؟ اللہ کے بارے میں؟ جو آسمان و زمین کا بنانے والا ہے! اس کے بارے میں جس کا اعتقاد تمہاری فطرت کے خمیر میں موجود ہے، اور تمہارے دل کا ریشہ ریشہ کہہ رہا ہے کہ ایک فاطر السمٰوٰت والارض ہستی موجود ہے۔ دنیا کی ہر بات میں تم شک کر سکتے ہو، لیکن اس بارے میں تم شک نہیں کر سکتے۔ تم کیونکر جرأت کر سکتے ہو کہ اپنے دل کے یقین سے انکار کر دو، اپنی رُوح کے اعتقاد سے منکر ہو جاؤ، خود اپنی نسبت شک کرنے لگو؟

یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے کہ صرف ایک چھوٹے سے جملے اور استفہام تقریری میں وہ سب کچھ بیان کر دیا جو زیادہ سے زیادہ اس بارے میں کہا جا سکتا ہے، اور جو استدلال کی انتہا، اثبات کی تکمیل، اور سارے برہانوں اور حجتوں کا جامع و مانع خلاصہ ہے: اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ؟ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ!

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ط یہاں "ہدایت" سے مقصود ہدایتِ ربوبیت کا عام فیضان ہے، اور اسی میں اسلوبِ خطاب کا استدلال پوشیدہ ہے، یعنی ہم تمہارے ظلم و تشدد سے کیوں ہراساں ہوں؟ کیوں اللہ کی تائید و نصرت پر بھروسہ نہ کریں؟ جس نے زندگی و معیشت کی تمام راہوں میں ہماری رہنمائی کا سامان کر دیا ہے؟ کیا حق و باطل کی اس آویزش میں ہم پر راہِ نجات نہ کھول دے گا؟ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد کہا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ط ہم ضرور صبر کریں گے، اور ضرور ایسا ہوگا کہ صبر کا نتیجہ ہمارے حصے میں آئے۔

حضرت موسیٰؑ کی زبان تذکرِ ایام اللہ کا جو وعظ آغاز سورہ سے شروع ہوا تھا، وہ آیت پر انجام کو

پہنچتا ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ نِاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ط لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ٥

اور اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ سے نیا خطاب شروع ہوتا ہے کیا یہ نیا خطاب اسی پچھلے بیان کا نتیجہ ہے۔ فرمایا، کیا تم تخلیق بالحق کی حقیقت پر غور نہیں کرتے؟ یعنی اس بات پر کہ کائنات ہستی کی ہر شے اس طرح واقع ہوئی ہے کہ صاف نظر آتا ہے، یہ سب کچھ کسی خاص مصلحت و مقصد سے بنایا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بغیر کسی سوچے ہوئے مقصد اور ٹھیرائی ہوئی مصلحت کے ویسے ہی ظہور میں آگیا ہو، پھر اگر تم دیکھ رہے ہو کہ آسمان و زمین کی ہر چیز کسی مصلحت کے ساتھ بنائی گئی ہے۔ تو کیوں کر ممکن ہے خود تمہاری ہستی کی پیدائش میں کوئی خاص مصلحت پوشیدہ نہ ہو، اور کرۂ ارض کی یہ سب سے بڑی اور اشرف مخلوق محض بیکار و عبث بنا دی گئی ہو؟

مگر وہ چاہے تو تمہیں چھانٹ دے اور ایک نئی قوم کی تخلیق کا سامان کر دے۔ کیونکہ اس کا ٹھہرایا ہُوا قانون یہی ہے کہ جو جماعت غیر نافع ہو جائے اسے مٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ نافع جماعت کو ظہور میں آتا ہے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ٥

اس کے بعد جماعتوں کی گمراہی کی ایک سب سے بڑی علت کی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی اپنے گمراہ سرداروں، امیروں، بادشاہوں اور پیشواؤں کی اندھی پیروی و فرمانبرداری کرنا، اور خود اپنی عقل و بصیرت سے کام نہ لینا۔ فرمایا؟ کیا تمہارے یہ پیشوا تمہیں نتائج اعمال کی گرفت سے بچا سکتے ہیں؟ قیامت کے دن جماعتوں کے کمزور افراد یعنی عوام اپنے اپنے پیشواؤں اور سرداروں سے کہیں گے: دنیا میں ہم نے تمہاری پیروی کی تھی، آج عذاب الٰہی کی پکڑ سے ہمارا بچاؤ کر دو۔ وہ کہیں گے: ہم خود اپنے کو نہیں بچا سکتے، تمہیں کس طرح بچائیں۔ ہم تو خود ہی عذاب میں پڑے ہوئے ہیں۔ لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ٥

وقتی طور پر قریشِ مکہ کی طرف اشارہ ہے، جو قوم کے سردار و پیشوا تھے۔ اور نہ صرف قبائل حجاز بلکہ تمام عرب ان کے طور طریقے کی پیروی کرتے تھے۔ جب انہوں نے دعوتِ اسلام کی مخالفت میں قدم اٹھایا تو تمام قبائل عرب نے ان کی پیروی کی۔

قرآن نے ہر جگہ ایمان کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ سرتاسر سلامتی ہے اور کفر کی پہچان یہ بتائی ہے سرتاسر اضطراب و محرومی ہے۔ جنت کی زندگی کے مرقع میں سب سے زیادہ نمایاں بات یہی نظر آتی ہے وہ سلامتی کی زندگی ہوگی، اور وہاں ہر طرف سے سلامتی ہی کی پکاریں سنائی دیں گی۔ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ

اس کے بعد فرمایا، عجائب آباد ہستی کا کوئی گوشہ دیکھو، تمہیں دو رُخ کی باتیں نظر آئیں گی۔ ایک کو قرار ہے دوسری کو قرار نہیں۔ ایک میں جماؤ ہے دوسری میں جماؤ نہیں۔ ایک اس پیڑ سے ہے کہ پھلے پھولے،

دوسری اس لیے ہے کہ پامال ہو۔ پہلی کلمۂ طیبہ ہے، دوسری کلمۂ خبیثہ ہے۔ یعنی پہلی اچھائی ہے، پاکیزگی ہے، نفع و فیضان ہے، دوسری بُرائی ہے، گندگی ہے، ضرر و نقصان ہے۔

پہلی کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھا درخت، اچھے درخت کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟ جڑ کی مضبوطی، کہ اکھڑنے والی نہیں۔ شاخوں کی بلندی کہ اُلجھیں نہیں۔ دوسری کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک نکمّا درخت۔ زمین میں جڑ پکڑ نہیں سکتا۔ ٹہنیاں معدوم، پھل نابود، جب چاہو پکڑ کے کھینچ لو، جڑ سمیت اُکھڑ آئے!

اس کے بعد فرمایا، اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو ایمان لاتے ہیں، وہ انہیں جمنے والی اور مضبوط باتوں میں جماؤ دے دیتا ہے۔ ان کی یہ خصوصیت دنیا کی زندگی میں بھی نمایاں ہے اور آخرت میں بھی نمایاں ہوگی۔ لیکن جو لوگ ظلم و نافرمانی کی راہ اختیار کرتے ہیں، انہیں یہ بات نہیں مل سکتی۔ ان پر جماؤ اور استقرار کی راہ بند ہو جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ساری باتیں جماؤ اور مضبوطی کی باتیں ہوتی ہیں۔ مٹنے والی، اُکھڑ جانے والی اور اپنی جگہ سے ہل جانے والی نہیں ہوتیں۔ ان کا اعتقاد، ان کا عمل، ان کا طور طریقہ، ان کے دلائل و شواہد، ان کے تمام کام القول الثابت ہوتے ہیں اور ان کی مثال شجرۂ طیبہ کی ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ ایمانِ حق سے محروم ہیں، ان کی کوئی بات بھی القول الثابت کی بات نہیں ہو سکتی۔ ان کی مثال شجرۂ خبیثہ کی ہوتی ہے کہ مالہا من قرار۔

اس کے بعد قریشِ مکّہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ملک کی ریاست و پیشوائی پر فائز تھے اور عامۃ الناس ان کے پیچھے چلتے تھے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِۙ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝ فرمایا، ان کی محرومی دیکھو کس طرح اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کر رہے ہیں، اور کلمۂ طیبہ کو اپنا شعار بنانے کی جگہ کلمۂ خبیثہ کو اپنا شعار بنا لیا ہے؟ اللہ نے انہیں قوم کی پیشوائی دی تھی، ان کا فرض تھا کہ دعوتِ حق کی قبولیت میں سب سے آگے ہوتے، اور قوم کی سچی رہنمائی کرتے، مگر انہوں نے نعمت کی راہ پسند کی۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور اپنی قوم کو بھی گمراہی میں دھکیل دیا۔

قریشِ مکّہ کے کفرانِ نعمت کے ذکر کے بعد ہی روئے سخن مومنوں کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ قُلْ

لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۝ فرمایا، میرے بندوں سے کہہ دو کہ نعمتِ الٰہی کی قدر بجا لائیں اور ناشکری سے بچیں۔ نماز قائم کریں، اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے انفاق کریں۔ علانیہ اور پوشیدہ، جب تک زندہ رہیں ان دونوں کاموں میں سرگرم رہیں۔ قبل اس

کے کرو وہ دن آپہنچے جب نہ کسی طرح کا لین دین کام دے گا نہ کوئی دوستی!

پھر اس سے متصل برہان ربوبیت کا استدلال ہے : اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۚ فرمایا، اپنی زندگی کی احتیاجوں کو دیکھو، اور پھر ربوبیتِ الٰہی کی بخششوں اور کارفرمائیوں پر نظر ڈالو۔ زندگی کی کوئی قدرتی احتیاج ایسی نہیں ہے جس کا قدرتی انتظام نہ کر دیا گیا ہو، اور کارخانۂ عالم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تمہارے لیے افادہ و فیضان نہ رکھتا ہو۔ حتیٰ کہ معلوم ہوتا ہے، دنیا کی ہر چیز صرف اسی لیے بنی ہے کہ تمہاری کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کر دے اور کسی نہ کسی شکل میں خدمت و نفع رسانی کا ذریعہ ہو۔ پھر کیا ممکن ہے کہ یہ سب کچھ بغیر کسی ارادے کے ظہور میں آگیا ہو، اور کوئی ربوبیت رکھنے والی ہستی موجود نہ ہو؟ اور اگر ایک ایسی ہستی موجود ہے تو ہر طرح کی عبادت کی مستحق اس کی ذات ہے، یا ان کی جو اپنی احتیاجوں میں خود کسی پروردگار کی پروردگاریوں کے محتاج ہیں۔

اس مقام میں اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا کہہ کر جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ نہایت اہم ہے۔

پچھلی آیت میں انسان کی اس غفلت کا ذکر کیا تھا کہ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر گزار نہیں اور یہی گمراہی اس کی ساری محرومیوں کا سرچشمہ ہے۔ ان الانسان لظلوم کفار۔ یہاں اس ناشکری کی مناسب مقام مثال بیان کر دی۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ فرمایا اس سے بڑھ کر ناشکری اور کیا ہو سکتی ہے جو قریش مکہ نے کی ہے؟ وہ دنیا کے ایک ایسے گوشے میں سکونت رکھتے ہیں جو انسانی آبادی   ناموزوں ترین مقام تھا، بے آب و گیاہ ریگزار! لیکن اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اسے ایسا محبوب مقام بنا دیا کہ انسانی گروہوں کے دل بے اختیار اس کی طرف کھنچنے لگے، اور زمین کی ساری پیداوار میں جو کسی سرسبز و شاداب ملک میں مل سکتی ہیں، اس بنجر زمین میں مہیا ہو گئیں۔ یہ انقلاب حال کیسے ظہور میں آگیا؟ اس طرح کہ خلیل اللہ نے یہاں دینِ حق کی عبادت گاہ بنائی اور اس کی پاسبانی اپنی اولاد کے سپرد کی۔ انہوں نے دعا مانگی کہ خدایا! اس ویرانے کو آباد کر دیجیو۔ ان کی دعا قبول ہوئی اور یہ ویرانہ اس طرح آباد ہو گیا کہ تمام عرب و اطراف عرب کے سالانہ اجتماع کا مرکز بن گیا۔

رؤسائے قریش انھی کی نسل سے ہیں اور انھی کی برکتوں کا ظہور ہیں۔ لیکن انھوں نے اس نعمت کا حق کس طرح ادا کیا؟ یوں کہ ملتِ ابراہیمی سے منحرف ہو گئے۔ ظلم و گمراہی کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ وہ دینِ حق جس کے قیام کے لیے یہ عبادت گاہ بنائی گئی تھی اصنام پرستی سے بدل گیا اور اب اپنی تمام طاقتیں اس دعوت کی عداوت میں استعمال کر رہے ہیں، جو اسی ملتِ ابراہیمی کی تجدید ہے۔

قریش کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ تمھارے باپ ابراہیم کی دعا تو یہ تھی: رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ۔ پھر تم اپنے باپ کے رستے کو چھوڑ کر کہاں بہکے چلے جا رہے ہو؟ یاد رہے کہ قریش یہی کہتے تھے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کا دین کیسے چھوڑ دیں! اس کا صرف یہی ایک جواب تھا اور اس کے سوا کوئی دوسرا جواب نہیں ہو سکتا۔

اور پھر تختِ عظمت و جلال منکروں سے صرفِ نظر کر لیتا ہے اور اپنے پیغمبر سے خطاب کرتا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۥ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۥ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۥ

اور یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل ہے۔ در اصل ان کا معاملہ اس دن تک مؤخر کر دیا ہے، جب (نتائجِ عمل کی ہلاکتیں ظہور میں آئیں گی) آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ حیران، سراسیمہ، نظریں اٹھائے، دوڑ رہے ہوں گے۔ نگاہیں ہیں کہ لوٹ کر آنے والی نہیں، اور دل ہیں کہ اڑے جا رہے ہیں۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۥ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۥ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۥ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۥ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۥ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۥ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۥ

آگاہ کر دو اس دن کی آمد سے جب ان پر عذاب مسلّط ہو گا۔ اس دن یہ ظلمی کہیں گے: پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مہلت دے دے۔ ہم تیری دعوت کا جواب دیں گے اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں گے۔ (لیکن) کیا تم وہی نہیں ہو کہ اب سے پہلے قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے،

ہمیں کسی طرح کا زوال نہ ہوگا - اور تم انہی کی بستیوں میں بسے تھے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اور تم اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ اور ہم نے تمہیں سمجھانے کے لیے طرح طرح کی مثالیں بھی دی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی ساری تدبیریں کر ڈالی تھیں مگر اللہ کے پاس ان کی ہر تدبیر کا توڑ تھا، ہر چند کہ ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ پہاڑوں کو ہلا ڈالیں۔ یہ نہ سمجھو کہ اللہ اپنے رسولوں سے جو وعدہ کر چکا ہے اس سے پھر جائے گا۔ وہ غالب ہے اور (برا دانش عمل کی) سزا دینے والا ہے۔

فرمایا، اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ، بے شک اللہ غالب ہے، اور اس غلبے کی شرح کر دی کہ اتنا غالب ہے کہ تم تصور ہی نہیں کر سکتے۔

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ وَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ ۝ سَرَابِیْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰی وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝

ایک دن یہ زمین بدل کر ایک دوسری ہی زمین ہو جائے گی اور آسمان بھی بدل جائیں گے اور سب لوگ خدائے غالب و یگانہ کے حضور حاضر ہوں گے۔ تم اس دن مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں جکڑے ہیں، ان کے جامے گندھک کے ہوں گے اور چہرے آگ کے شعلوں میں ڈھپے ہوئے۔ یہ اس لیے کہ اللہ ہر نفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دے دے۔ بلاشبہ وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

اور خاتمۂ سورہ میں فرمایا، یہ ایک پیام حق ہے کہ لوگوں کو فساد و بدعملی کے نتائج سے آگاہ کر دے اور وہ جان لیں کہ ان کا ایک ہی اللہ ہے، ہرگز کوئی دوسرا نہیں، اور جو دانشمند ہیں وہ نصیحت پذیر ہیں۔

OO

انگریزی تحریر :- محمد حسن عسکری (مرحوم)
اردو ترجمہ :- مظفر علی سید

تفسیرِ قرآن اور فلسفۂ جدید

فرانسیسی ترجمۂ قرآن کے دیباچہ نگار محمد ارکون کے نام ایک خط

محمد ارکون ایک ممتاز الجزائری عالم ہیں جو فرانس کی مختلف یونیورسٹیوں سے فلسفۂ تمدن و تقابلی مذہبیات میں تحصیلِ علم کے بعد اب پیرس یونیورسٹی نمبر ۳ میں فلسفۂ اسلام کے استاد ہیں اور "مغرب ذہن" اور چند ایک دوسری کتابوں کے مصنف۔ انہوں نے ایک عیسائی ماہرِ اسلامیات کے فرانسیسی ترجمہ قرآن پر (ممتاز مسلمان عالم ڈاکٹر حمید اللہ کا ترجمہ بعد میں شائع ہوا ہے) ایک عالمانہ دیباچہ تحریر کیا تھا جو انہوں نے عسکری صاحب مرحوم کی رائے معلوم کرنے کے لیے ارسال کیا۔ مکتوبِ ذیل اسی کے جواب میں لکھا گیا۔ محمد ارکون صاحب نے قرآن حکیم کی تفہیم و توضیح (یا دوسرے لفظوں میں تفسیر و تاویل) کے لیے جدید مغربی فلسفوں (بالخصوص اسٹرکچرل ازم) سے استفادہ کرنے کی کوشش اور دعوت دی ہے اور ادھر عسکری صاحب کے نزدیک اسٹرکچرل ازم (جس کا ترجمہ یہاں کسی نے "ساختیات" کیا ہے مگر جسے عربی اور فارسی اجزائے کلام کو ملحوظ کئے بغیر "ترکیبیت" کہنا مناسب تر ہوگا کہ اس میں مختلف تہذیبوں، زبانوں اور علوم و فنون کے عناصرِ ترکیبی معلوم کر کے ان سے بحث کی جاتی ہے) مغربی فلسفے کا ایک ایسا جدید مکتبِ خیال ہے جس کا شمار مغرب کی نئی گمراہیوں میں ہونا چاہیئے (ملاحظہ ہو ان کی بعد از وفات کتاب "جدیدیت" میں اس موضوع پر ان کا مختصر تبصرہ) چنانچہ مطالعہ قرآن کے سلسلے میں اس طرزِ فکر کی نامناسبت کو انہوں نے اپنے مسلمان بھائی " پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کو یہاں ایک نئی قسم کے معذرتی اور مرعوب اندازِ فکر کا گمان گزرا ہے اس کے علاوہ عسکری صاحب نے اور بھی بہت سے مفید مطالب کا اظہار اسی ایک خط میں کیا ہے اور اپنے بارے میں ایسی بہت سی باتیں بتائی ہیں جن کا جاننا خود عسکری صاحب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اصل خط عسکری صاحب کی وفات (۱۸ جنوری ۱۹۷۸ء) سے کوئی سوا دو سال پہلے ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء کو انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ اس کا متن پہلی بار پاکستان ٹائمز کے شمارہ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۷۹ء کے میگزین سیکشن میں شائع ہوا تھا مگر اس میں چند ایک طباعتی اغلاط رہ گئی تھیں جن کو عسکری صاحب کے برادرِ خورد جناب محمد حسن مثنیٰ نے اصل مسودے سے مقابلہ کر کے درست کیا اور مترجم

کو اصلاح شدہ متن مرحمت فرمایا۔ ترجمے کے ساتھ جو تصریحات وادین میں چھاپی گئی ہیں۔ ان کی ذمہ داری مترجم کے سر ہے بعض مفصل تراشارات کو البتہ نمبر لگا کر آخر میں درج کرنا مناسب سمجھا گیا۔

(م-ع-س)

جناب محترم آپ کا خط وصول کر کے مجھے بے اندازہ مسرت ہوئی ہے اور میں اس عنایت کے لیے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ مجھے بلا تکلف فرانسیسی میں خط لکھا کیجیے کہ میں اسے آسانی کے ساتھ سمجھ لیتا ہوں کیونکہ میں نے (اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز کے عظیم فرانسیسی ناول نگار) استاندال کا اردو میں ترجمہ کیا ہے (یہ ترجمہ "سرخ و سیاہ" کے عنوان سے دو جلدوں میں چھپ چکا ہے) مجھے بس اتنی حسرت ہے کہ میں اس زبان میں روانی کے ساتھ لکھ سکوں مگر آج کل ایسے مواقع مجھے بہت کم ملتے ہیں۔ پھر بھی میں نے اپنی بے ڈھنگی فرانسیسی میں تقریباً ۳۰۰ صفحے اسلام اور ہند و پاکستان کے مسلمانوں کے بارے میں لکھ رکھے ہیں، (فرانسیسی مجلے) "روایتی مطالعات" کے مرحوم مدیر شل والساں کے نام (خطوط کی شکل میں) جنہوں نے ان کو اپنے جریدے میں شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر ان کی وفات پر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

معاف کیجیے گا۔ اگر میں ایک طویل خط لکھ کر آپ کا وقت صرف کروں مگر میرے دل میں آپ کے لیے اور آپ کے کام کے لیے اس درجہ احترام موجود ہے کہ میں آپ سے قریبی رابطہ قائم رکھنا پسند کروں گا۔

قرآنِ حکیم پر آپ کے دیباچے کا تعارف (اس سے پہلے) ایک خاتون نے مجھ سے کرایا تھا جنہوں نے پیرس نمبر ۶ سے (پروفیسر) "شارل پنجم" اور میری نگرانی میں کام کر کے درجۂ تخصیص حاصل کیا ہے، اور اب آپ ہی کے پیرس نمبر ۳ سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کے لیے مصروفِ تحقیق ہیں۔ وہ آپ کے دیباچے کی اس قدر شیفتہ تھیں کہ اسے بار بار پڑھتی رہتی تھیں۔ مسلمان مصنفین جو یورپ کی زبانوں میں اسلام پر لکھتے ہیں، زیادہ تر سطحی قسم کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں فوراً آپ کی اس خصوصیت سے متاثر ہوا کہ آپ کس قدر سہولت کے ساتھ مغربی خیالات میں رواں دواں چلے جاتے ہیں پھر آپ کے ذہن کی رسائی سے اور آپ کی وسیع النوع دانشورانہ دلچسپیوں سے فطری طور پر، میں آپ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا اور میں نے مشہور حیدرآبادی عالم اسلامیات اور مدت سے پیرس میں مقیم ڈاکٹر حمید اللہ کو آپ کی ذاتِ گرامی، آپ کے علم و فضل اور خلوصِ نیت کے بارے میں تحسین سے بھرپور پایا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں کبھی وہ چیز ہوا کرتا تھا جسے "ادبیات کا آدمی" کہا جاتا ہے اور آپ کے ہمکار پروفیسر گیبں بر تیرو نے اپنے مقالے "معاصر ادب ۔ دنیا کے درمیان" (مطبوعہ" ہاشیت ۱۹۶۱ء) میں مجھ پر ایک آدھ کلمۂ خیر لکھ رکھا تھا۔ میرا میدان ذرا محدود ہے (یعنی ادب) اور میں جن چیزوں کو سمجھ

نہیں پاتا، ان میں ضرورت سے زیادہ دخل بھی نہیں دیتا۔ تاہم میری دو ایک معمولی سی چیزیں فرانسیسی میں چھپ چکی ہیں اور پیرس میں سہولت سے دستیاب ہوں گی

(۱) "مغرب و مشرق - ابنِ عربی اللہ کیئر کے گرد" جس کا اردو سے ترجمہ کر کے پروفیسر گیس بریلئیر نے (فرانسیسی) مجلہ "مابعد الطبیعات و اخلاقیات" میں، جنوری - مارچ ۶۳ء کے شمارے میں، شائع کیا اور اس کے ساتھ ہی (فلسفۂ وجود کے مورخ) ژاں وال کی لکھی ہوئی چھ صفحوں پر مشتمل تردید بھی چھپی، یہ سلسلہ جون ۶۴ء کے شمارے میں ایک اور تردید کے ساتھ جسے (مستشرق) آنزی کوربین نے لکھا تھا۔ در آگے چلا

(۲) "روایت اور جدیدیت۔ دنیائے ہند و پاک میں" جو فرانسیسی مجلے "روایاتی مطالعات" کے مئی جون اور جولائی اگست ۱۹۷۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اسی مجلے نے اس موضوع پر میرے خطوط سے اقتباسات جنوری/فروری ۶۹ء میں طبع کئے تھے۔ میں نے اس مؤقتی جریدے کے لیے فارسی اور اردو سے تصوف کے چند ایک متون بھی ترجمہ کئے تھے مگر وہ ابھی تک شائع نہیں ہوئے شاید خود یہ جریدہ بھی اب تک جاری نہ رہ سکا ہو۔

مجھے خوشی ہے کہ آپ اس خطۂ عالم میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر انگریزی میں کئی ایک کتابیں موجود تو ہیں مگر بدقسمتی سے ان کے مصنف (محض) تاریخی یا عمرانی رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور مابعد الطبیعاتی بنیاد کا کوئی مناسب فہم نہیں رکھتے۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے عرب برادر بھی ہمارے بارے میں اچھی واقفیت نہیں رکھتے اور یہ حقیقت تو بالکل نہیں جانتے کہ سترھویں صدی کے بعد علوم اسلامی کو محفوظ کرنے اور آگے بڑھانے کا ذمہ اس برصغیر کے علما نے اپنے سر لیا تھا۔ (۱) اس سلسلے کا اعلیٰ ترین کارنامہ (فارسی زبان میں) ایک مجموعہ مکاتیب ہے جسے شیخ احمد سرہندی نے، جن کو (یہاں) "مجددِ الفِ ثانی" کا لقب دیا گیا ہے، سترھویں صدی کے نصفِ اول میں لکھا تھا۔ ان مکاتیب کا عربی میں بھی ترجمہ ہوا ہے، انیسویں صدی میں اور حال ہی میں اسے ترکیہ سے دوبارہ شائع کیا گیا ہے آپ کو دلچسپی ہو تو آپ ناشر کو مکمل مجموعے یا اس کے انتخاب کے لیے ایک ذرا سا خط لکھ ڈالیے اور یہ آپ کو مفت مل جائے گا کیونکہ اس کے ترک ناشر ایک انجینئر ہیں اور دنیا بھر میں اس کتاب کو مفت تقسیم کرتے رہے ہیں یہ ہیں حسین حلمی عشق، عشق کتابوی، دار الشفاکہ جادیسی نمبر ۲۷، پی کے ۳۵، فاتح استانبول (ترکیہ)

اس کے بعد اٹھارہویں صدی کے شاہ ولی اللہ کی تصانیف آتی ہیں (جو زیادہ تر عربی میں ہیں) جن کو عرب ملکوں میں شیخ الدہلوی کہا جاتا ہے۔ ان کتابوں پر بہت سے مستشرق کام کر رہے ہیں اور میرے خیال میں آپ ان کی حجۃ اللہ البالغہ سے آشنا ہوں گے جو بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔

آپ کی خواہش ہو تو مجھے ان کی بعض عربی تصانیف آپ کو بھیج کر خوشی محسوس ہو گی (فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیو کو ان سے بے حد مدد ملی ہے) پھر ان ہزاروں عربی کتابوں میں سے جو یہاں لکھی گئیں مجھے فلسفے کی ایک کتاب نہیں بھولنی چاہیئے جو سترھویں صدی میں لکھی گئی۔ یہ ہے ملا محمود جونپوری کی "الشمس البازغہ"
۲- میں تو یہاں تک بھی کہنے کو تیار ہوں کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں "اردو زبان" عربی اور فارسی کے بعد تیسری اسلامی زبان کے طور پر نشوونما پا چکی ہے۔

اگر آپ کو کسی وقت بھی برصغیر میں علوم اسلامی کی دستاویزات کے بارے میں کسی اطلاع یا معلومات کی ضرورت ہو تو میں ہمیشہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں اور آپ کو جو بھی درکار ہو، اس کو ارسال کرتے ہوئے مجھے مسرت ہو گی۔

اب میں قرآن حکیم کے ترجمے پر آپ کے دیباچے کی طرف آتے ہوئے، تفصیلات میں جائے بغیر، چند ایک کلی اور عمومی ملاحظات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں، نکتہ چینی کے تقاضے سے نہیں بلکہ متفرق خیالات کے طور پر جو آپ کا دیباچہ پڑھتے ہوئے مجھے سوجھتے رہے آپ بہر حال، فلسفہ، زبان شناسی اور دوسرے موضوعات میں ایک متخصص کا مقام رکھتے ہیں اور اسی طرح مطالعات اسلامی میں بھی۔ جب کہ میں ادب میں بھی محض ایک شوقیہ فن کار واقع ہوا ہوں۔ چنانچہ آپ بہتر جان سکتے ہیں

(۱) آپ کی خواہش کہ مغرب کے لوگ قرآن حکیم کو ہمدردی کے ساتھ پڑھیں، کلیتہً جائز بلکہ لازمی ہے۔ مگر کوئی شخص اتنے ہی جواز کے ساتھ پوچھ سکتا ہے کہ جب معاملہ کسی مقدس یا الہامی کتاب کا ہو تو کیا قارئین کی ممکنہ جماعت کی ذہنیت کو بڑی بڑی مراعات دینی چاہئیں؟ کیا آدمی کو ایک الہامی کتاب اسی طریقے سے پیش کرنی چاہیئے جس طریقے سے اس کے معتقدین اس کو دیکھتے ہیں، یا باہر کے لوگ جو اسے دیکھنا چاہیں گے، ان کے لیے کوئی خصوصی رعایت برتی جائے؟ مغرب کا ایک عام پڑھنے والا صرف اسی لیے قرآن حکیم کو اٹھا کے دیکھنے کا امکان رکھتا ہے کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ مسلمان کس چیز میں عقیدہ رکھتے ہیں۔
(۲) کیا ایسے پڑھنے والے کے لیے یہ زیادہ تسلی بخش نہ ہو گا کہ اسے قرآن حکیم کا ایک تثبیت شدہ اور راسخ العقیدہ تصور فراہم کر دیا جائے؟ وہ بے شک اس تصور سے اتفاق نہ کرے مگر جیسی معلومات کی اسے ضرورت ہے وہ تو اس کو مل جائیں گی۔ پھر ہم مغرب زدہ مسلمان کتنی دیر تک دفاعی اور معذرتی انداز اپنائے رہیں گے؟ آپ کا دیباچہ ۱۹۷۰ء میں لکھا گیا تھا اور تب سے اب (۱۹۷۰ء) تک دنیا میں کئی ایک چیزیں رونما ہو رہی ہیں۔ کیا نئے حالات کا تقاضا یہ نہیں کہ ہم اپنے طور پر کوئی نیا انداز اختیار کر لیں؟ از راہ کرم مجھے ذرا زیادہ صاف گوئی کی اجازت دیجیے۔ میں عربی کے روزنامے اور جریدے ذرا جھجک کے دیکھتا رہا ہوں اور فارسی زبان کے بھی۔ میں نے کویت میں منعقد ہونے والے عرب دانشوروں کے ایک مذاکرے کی روداد بھی پڑھی ہے اور ایران میں ایک تہذیبی کانفرنس کے کوائف بھی مطالعہ کئے ہیں۔ مجھ پر ایک عجیب

اور غیر معمولی حقیقت یکایک آشکار ہوئی ہے۔ جب کہ غرب دانشور مزید مغرب زدگی کی طلب کرتے ہیں، وہاں ایرانیوں کا "ذہنی ہراول" خالص راسخ العقیدگی کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ یہ مؤخرالذکر رجحان مجھے پاکستان اور دوسرے مسلمان ملکوں میں بھی نظر آتا ہے مگر ایرانیوں کے مقابلے میں بے حد نحیف (۴) چنانچہ میں اس اعتقاد تک پہنچ چکا ہوں کہ کوئی بھی آدمی، ان دو ایرانی کتابوں سے آگاہ ہوئے بغیر عصر حاضر کے مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں انصاف نہیں کرسکتا۔ (اوّل تو) اسلام شناسی از ڈاکٹر علی شریعتی (۵) جو الجزائر کے فرانسیسی ادیب کاتب یلیین کے دوست ہیں اور پھر ایک چھوٹی سی کتاب "غرب زدگی" یا مغربیت اختیار کرنے کا عارضہ از جلال آلِ احمد جو استاندال "فلوبیئر، سارتر، کامو، دستوئیفسکی وغیرہ کے مترجم تھے (۵) دوسری کتاب (ایران کے)" ذہنی ہراول" کے لیے ایک مینی فیسٹو کا درجہ اختیار کرچکی ہے اور یونیورسٹی کے بہت سے طلباء وطالبات کو یہ کتاب پوری کی پوری ازبانی یاد ہے۔ بات یہاں تک جا پہنچی ہے کہ آخری کور میں ایرانی ادیبوں کی نظر میں ایک برخود غلط قسم کا مسخرا بن چکا ہے جو ان پر اس لیے مسلط کیا جاتا ہے کہ شہاب الدین (مقتول) سہروردی یا ملّا صدرا کے مطالب کی تشریح کرے۔ یوں عالم اسلام میں ایک نئی لہر چل رہی ہے اور خود اپنے سرچشموں کی طرف لوٹنے کی پیاس محسوس ہوتی ہے یہاں تک کہ مطالعہ شعر میں بھی مستند طریق کار اختیار کرنے کا تقاضا ہو رہا ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ زیادہ تر مسلمان ملکوں کے بہترین اذہان عین مین ایک ہی طرح کے خطِ حرکت سے گزر رہے ہیں۔ بودیلیئر، ریں بو، سارتر، کامو، ہیڈگر کے گرد۔ ابن عربی، قرآن حکیم اور حدیث (۶) مجھے یقین ہے کہ آپ فرد ان نے حقائق سے بخوبی آگاہ ہوں گے اور قرآن حکیم پر اپنی نئی کتاب لکھتے ہوئے فطری طور پر ان کو سامنے رکھیں گے اور میں اس کتاب کا بے تابی سے منتظر رہوں گا

(۲) آپ نے تجویز فرمایا ہے کہ قرآن حکیم کا مطالعہ اب (جدید) زبان شناسی، تہذیبی لبشریات اور ترکیبیت (اسٹرکچرل ازم) وغیرہ کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔ میں اس خواہش کو نہ صرف جائز سمجھتا ہوں بلکہ اسے تحسین کی نظر سے دیکھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ایک شخص جو اس کام کے لیے لازم قسم کی "ذہنی بُراقی" کا حامل ہو، جیسے کہ آپ یقیناً ہیں، اس فریضے سے برجستہ طور پر عہدہ برا ہوسکتا ہے۔

عرصہ ہوا، جس زمانے میں (مابعد فرائڈ کے دور کا ماہر نفسیات) ولہلم رائخ، تجزیۂ نفس والوں کے لیے نقلِ محفل بنا ہوا تھا مگر اس دور سے عین پندرہ برس پہلے جب وہ پیرس کے طلباء کا تہذیبی ہیرو قرار دیا گیا تو میں نے اپنے ناقص دانشورانہ ذرائع کے باوجود اس کی کردار شناسی کو کونیات (علم موجودات) کی مدد سے مطالعہ ادب کا ایک مکمل طریق کار وضع کرلیا تھا۔ اور (اب) مجھے بے حد شرم کے ساتھ (۷) یہ اعتراف کرنے کی اجازت دیجیئے کہ میں نے قرآن حکیم کا مطالعہ ۱۹۰۹ء سے پہلے شروع بھی نہیں کیا تھا اور کیا بھی تو اس تجسس میں کہ اس کے اندر (رائخ کے تصور کردہ) کائناتی "اورگونیائی" تموجات

کا سراغ لگاؤں، اس لیے کہ اس زمانے میں رائج کا رواج، ۱۹۷۵ء میں زبان شناسی کی نسبت، خاصا زیادہ ہو چکا تھا۔ میں تو مطالعاتِ اسلامی تک کے سلسلے میں تازہ ترین مغربی علوم کے اطلاق کے امکانات پر ایک جھرجھری سی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تاہم اس میں ایک خطرہ بھی موجود ہے آپ بلا شبہ اس دانشورانہ سرو سامانی اور عصر کے حامل ہیں اور وہ مسئولیت کا احساس بھی رکھتے ہیں جو اس کام کے لیے لازمی ہے مگر ان لوگوں کا کیا ہوگا جو آپ کے نئے راستے کی پیروی کریں گے، ان خصوصیات کے حامل ہوئے بغیر محض مہم جوئی کی خواہش میں کیا یہ "مصیبت کی پٹاری" کھولنے کے مصداق نہیں ہوگا؟ پھر ایک اس سے بھی زیادہ وزنی امر، ملاحظہ کرنے کو موجود ہے۔ مغرب میں دانشورانہ رجحانات اس تیزی سے بدلتے رہتے ہیں جس تیزی سے بیکینی سوٹوں کا عرض بدلتا ہے جب تک آپ اس نقطۂ نظر یا اس نقطۂ نظر سے اپنا مطالعۂ قرآن مکمل کر چکیں گے تو "عصری شعور" جس کی توجہ آپ اس طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں، کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوگا اور کوئی اَن سنا، اَن دیکھا تماشا کر رہا ہوگا۔ مجھے ۱۹۷۰ء میں لوئی گارسے کا اپنے یہاں تشریف لانا یاد آتا ہے۔ محض مروت کے طور پر میں نے ان سے ذکر کیا کہ انگریزی بولنے والی دنیا میں (فرانس کا ماہر بشریات) لیوی سٹراؤس کس قدر مقبول ہو رہا ہے، تو انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اب سٹراؤس کو بھلا کون پڑھتا ہے؟! اور میں نے خود کو احمق دکھائی دینے سے بچانے کے لیے چند لک الفاظ (جدید تر فرانسیسی فلسفیوں میں سے) لاکاں، فوکو، اور آلتوسیے کے بارے میں بڑبڑانے شروع کر دیئے، دوسری طرف گارودے (جرمن امریکی فلسفی) مارکوزے سے پُر تھا جس کی گرفت امریکہ میں ابھی سے ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ ایک زیادہ عمومی مثال لینی ہو تو یہی دیکھ لیجیے کہ "فرانس کے عصری شعور" سے فرائڈ کا ٹکراؤ اتنی دیر سے ہوا کہ اینگلو سیکسن ملکوں کے ماہرینِ تجزیہ نفس اپنے فرانسیسی مدِمقابل لوگوں پر ہنسا کرتے تھے کہ وہ تو (فرائڈ کے وفادار شاگرد) شٹیکل کو بھی سنجیدگی سے قبول کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ "عصری شعور" آخر ہے کیا چیز؟ برادرِ عزیز! آپ ایک فلسفی ہیں اور آپ کے لیے خیالات اور دانشورانہ رجحانات یکے بعد دیگرے "کی شکل میں موجود رہتے ہیں۔ میں ادب کا ایک معمولی طالبِ علم ہوں میرے لیے ان کا وجود "بیک وقت" صورت میں ہوتا ہے۔ مثلاً آج کے "مقبولِ عام" "پوپ کلچر" میں جو چیز بھی اس کے چاہنے والوں کو "نئی، تازہ اور کھلبلی پیدا کرنے والی محسوس ہوتی ہے، وہی مجھے اتنی ہی پرانی، باسی اور بیزار کن لگتی ہے جتنی کہ آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کے "دادا ازم" کی پیداوار۔ چنانچہ جب بھی دانشورانہ فیشنوں کا سوال پیدا ہوتا ہے تو میں اپنے "فسادِ باطن کی بنا پر" اس پر ایک طرح کے تمسخر کی انداز کے بغیر سوچ بھی نہیں سکتا اور خود سے سوال کرتا ہوں، کیا قرآن حکیم کو، جسے مسلمان ازلی اور ابدی مانتے ہیں، کسی لمحاتی اور متغیر ہونے والے رواج کا محکوم بنانا کوئی بھی جواز رکھتا ہے؟(۸) اس کے جواب میں شاید یہ کہا جائے کہ محض مغرب ہی کسی معروضی اور علمی نقطۂ نظر سے اشیاء کی تحقیق و تدقیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور بدلتے ہوئے

فیشن حقیقت کی ہمہ وقت جاری رہنے والی تلاش کا محض ایک حصہ ہیں، لہٰذا ہمیں مغرب ہی کے ساتھ چلنا چاہیئے، چلیے یہی مانے لیتے ہیں۔ مگر آپ کا ستانیدا کی کتاب جو اس نے امریکہ کے ریڈ انڈین لوگوں کے مذہب پر لکھی ہے، اس کی بے پناہ مقبولیت سے آگاہ ہوں گے اور آپ خود (لیوی ستراؤس کی کتاب) "فکرِ وحشی" کے بہت قائل ہیں۔ اب اگر ریڈ انڈین لوگوں اور دوسرے وحشی اور بدوی اقوام کو اپنا مخصوص نقطۂ نظر رکھنے کا امتیازی حق عطا کیا جا سکتا ہے، تو کیا صرف مسلمانوں کو اس بنیادی حق سے محروم رکھنا چاہیے؟ ایک ایسے وقت میں جب کہ وحشی طریقِ فکر کو نہ صرف جائز قرار دیا جا رہا ہے بلکہ اس کو مقبول تک بنا کے پیش کیا جاتا ہے، اور اس سے بھی آگے چلیے تو مغرب کے ہزاروں نوجوان اس کی عملی پیروی میں مصروف ہیں، تو کیا فقط اسلام کی راسخ العقیدہ تعبیر کی زبان بندی اور گلوگیری ہونی چاہیئے۔؟

(۳) آپ کی خواہش کہ (جدید) علم زبان شناسی کی ترویج، قرآن حکیم کے مطالعے کے ایک ذریعے کے طور پر کرنی چاہیئے، ستائش کے قابل ہے مگر کوئی شخص قرآن حکیم کو وہ اہمیت دیتا ہو جو بطور ایک الہامی کتاب کے اس کا حق ہے اور جو اہمیت کہ مجھے یقین ہے کہ آپ اس کو ضرور دیتے ہیں، تو ایک ایسی ناآزمودہ مہم پر روانہ ہونے سے پہلے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جو وسیلہ اختیار کیا جانے والا ہو، اس کی نوعیت اور اس کے مبدا اور اس کی جہت کے بارے میں مخصوصاً بہت غور و فکر کر لیا جائے؟ زبان شناسی کو ایک جدید علم متصور کیا جاتا ہے علم اپنے بنیادی تقاضوں میں کیا چیز ہے؟ تو میں اس سلسلے میں آپ کی توجہ خود آئن سٹائن کے اس مصدقہ قول کی طرف مبذول کروں گا کہ "میں ایک علمی نظریہ یا کوئی دوسرا علمی نظریہ دریافت کرنے میں ہرگز دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ خود خدا کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے؟" جہاں تک زبان شناسی کا تعلق ہے تو آدمی اس کی جڑوں کو بھول کر جو برطانیہ کی منطقی اثباتیت اور ویانا کے مکتبِ فکر میں پیوست ہیں، صرف اپنے آپ کو خطرے میں ڈال سکتا ہے اور ان دونوں مکاتبِ فکر کی قوتِ محرکہ ان کے اس مراق میں مخفی تھی کہ کسی نہ کسی طرح مابعد الطبیعات کے امکان کو خارج کر دیا جائے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک الہامی کتاب کو بطور ایک الہامی کتاب کے، کس منطق کے زور پر اس قسم کی بازپرسی یا تفتیش کا ہدف بنایا جا سکتا ہے؟ (۹) اور اگر کوئی "عصری شعور" کا احترام رکھتا ہو تو وہ یہ بھی دیکھ سکتا ہے کہ ایسے فلسفوں کو ابھی سے رد کیا جا رہا ہے (اس حالیہ مجموعۂ مقالات کے حوالے سے جو "تاریک دھنک" کے زیرِ عنوان شائع ہوا) مزید برآں، زبان شناسی کا اطلاق، ادبی متن کے سلسلے میں، اپنے عقب میں ایک تاریخ رکھتا ہے دس ایک سال پہلے فرانس میں ایک بڑے زور کی (قلمی) جنگ چھڑی تھی۔ پروفیسر رولاں بارت اور پکارد کے درمیان رولاں بارت فرانسیسی ناقدین پر فردِ جرم لگا رہے تھے کہ وہ بہت بعید از وقت قسم کی چیز ہیں اور مطالعۂ ادب پر زبان شناسی کے طریقِ کار کا اطلاق کرنے میں اینگلو سیکسن ناقدین کے غبارِ کارواں میں گم ہیں۔ پانچ ایک برسوں کے اندر، خود امریکنوں اور برطانویوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ زبان شناسی کے علم

میں، فرانس کے علماء ان سے بہت آگے ہیں اور ۱۹۷۰ء تک انہیں یہ بھی احساس ہو گیا کہ وہاں بارت
زبان شناسی کے طریق کار میں دنیا کا عمدہ ترین ناقد ہے۔ نادرے کے جیکولبسن[۷] سے بھی بالاتر۔ بارت چونکہ
ترین "تہذیبی ہیرو" ہے اس لیے دیکھ لینا چاہیئے کہ حال ہی میں اس نے کیا کام کیا ہے۔ اس کی کتاب
" ایس یا زیڈ" ہی کو لے لیجیئے جس میں اس نے ایک ادیب (بالزاک) کو زبان شناسی کے وسیلے سے
سمجھنے کی کوشش کی ہے[۸] پھر جاپان پر اس کی کتاب جس میں اس نے ایک پوری تہذیب کی تفہیم کرنا چاہی
ہے آخر یہ کتابیں، بنیادی طور پر، کیا چیز ہیں؟ سوائے فینٹسی (یا خیالی افسانے) کے؟ اگر کوئی آدمی بس اتنی
ہی آرزو رکھتا ہو کہ جاگتی آنکھوں کے خواب میں مست ہو جائے، یا امریکنوں کی طرح "پینک" میں غرق ہو تو
اس کے لیے زبان شناسی کا اٹرم کھڑدم جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کوئی شخص بس یہی کمال دکھانا چاہتی ہو کہ
زمین پر پڑا ہوا مٹر کا ایک دانہ اٹھائے تو اس کے لیے ایک ہاتھی جتنے بڑے حیوان کی طاقت سے مدد لینا کیوں
لازم ہو؟

(۳) لگتا ہے آپ محسوس کرتے ہیں کہ کلود لیوی ستراؤس مطالعۂ قرآن کے سلسلے میں خاصا معاون ثابت ہو
سکتا ہے۔ اس سوال سے قطع نظر کردہ فیشن میں شامل ہے یا اس سے خارج ہو چکا ہے اس کی بنیادی حیثیت
دوگانہ ہے (ا) وہ علم کے معروضی طریق کار سے نامطمئن ہے اور کوئی "وجدانی" وسیلہ اختیار کرنا پسند کرتا ہے
کم از کم تہذیبی بشریات کے میدان میں۔ مگر نتائج کی تریش کے لیے وہ پھر معروضی طریق کار کی طرف لوٹ جاتا ہے
وہ دونوں کے درمیان کسی ایک کو منتخب کرنے یا متحد کرنے میں کلیتہً ناکام ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، وہ کوئی
محکم اور مکمل طریقِ کار فراہم نہیں کر سکتا۔ (ب) وہ اتنا کشادہ دل ہے کہ جادو اور رسوم کے سلسلے میں کومٹ کے
قائم کردہ تصور کو جس کے تحت یہ چیزیں علم کا محض درمیانی مرحلہ ہیں، رد کر دیتا ہے اور "فکرِ وحشی" کو "فکرِ علمی"
کے مقابل، ایک متوازی راستے کے طور پر، ایک مثبت، نہج قرار دیتا ہے پھر بھی وہ اہلِ مغرب کے اس یقینِ
عادی سے رہا نہیں ہو سکتا کہ بالآخر، جب سب کچھ کہا اور کیا جا چکے تو، علمی طریقہ ہی بالاتر ہے۔ لیوں وہ انگریزی
کے ایک سوقیانہ محاورے کے مطابق، ایک پارہ خنزیر سے دوسرے پارۂ خنزیر پر منتقل ہوتا رہتا ہے۔
یہیں سے ان آدھے درجن معانی کی لچک داری پیدا ہوتی ہے جو اس نے لفظِ "حق" یا "حقیقت" کو
عطا کیے ہیں، اکثر اوقات ایک ہی صفحے پر۔ میرے نزدیک تو (اس کے مقابلے میں) والعلم راسخ کا تصورِ حقیقت
کہیں زیادہ باہم مربوط اور یک پارچہ ہے، آج کے مغرب میں دستیاب کسی اور چیز کی نسبت اور "عصری شعور"
اس کو ایک جدید اسطورے کے مرتبے تک لے جانے میں بصیرت کا ثبوت دے رہا ہے آکسفورڈ میں کہا
جاتا ہے کہ ستراؤس بے حد مشکل ہے، لہٰذا ایک عظیم مفکر ہے، میں نہایت انکسار کے ساتھ عرض کروں گا کہ وہ
بے حد مشکل ہے کیونکہ اس کی سوچ میں الجھاؤ بہت ہے ایک واحد مثال ہی لے لیجیئے۔ ہر کوئی ہمیشہ یہی کہتا رہا
ہے کہ ایک فن پارہ استعارہ ہوتا ہے۔ ستراؤس نے دریافت کیا ہے کہ علمی طریقِ کار ایک قسم کا کنایہ ہے (جزوالعم

"مملکتِ دھشتِی" کا انگریزی ترجمہ (ص نمبر ۲۵) باقی کتاب پڑھتے ہوئے ہم اس کے فکر کی زیرکی پر حیرت زدہ ہونے رہتے ہیں اور یہ بھی تعجب کرنے لگتے ہیں کہ یہ مثال کہاں تک درست ہے کیونکہ اگر سائنس، نتیجے کو سبب میں تبدیل کر دیتی ہے تو یہی کام محض قدم زنی سے بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ بھی کنا یہ کھلانے کی مستحق ہے ہم تعجب ہی تعجب میں صفحہ نمبر ۲۰۵ پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں ہم ایک فخریہ اعلان دریافت کرتے ہیں ۔ "ہمیں اس کام میں صرف ونحو والوں کی باریکیوں تک محدود نہیں سمجھنا چاہیئے۔" یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ "معصری شعور" کا کوئی بہت بڑا کمال ہے! کیونکہ اس تصور کے تحت کسی بھی لفظ کے معنی متعین کرنے کی کوشش کا مفہوم ہوگا' اس قابل نفرت "باریک بینی" میں مبتلا ہونا، دوسری طرف اس کا محبوب جملہ ہے ، " بات کو اکھڑ پن کے ساتھ کہتے ہوئے . . . . . مجھے بس اتنی حسرت ہے کہ کاش سترادس نے امریکی مفکر کینیتھ برک کی کتاب جو اس نے چار صنائع پر لکھی ہے، پڑھنے کی زحمت قبول کی ہوتی، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ جب کسی معاشرے میں کنائے اور "جز وبرائے کل" (یا "مجاز") کے مابین التباس پیدا ہو جائے تو اس معاشرے کو کون سا مرض لاحق ہوتا ہے ۔۱۳)

(۵) اپنے دیباچے میں آپ اس مکان کے سلسلے میں بھی کافی پرامید نظر آتے ہیں کہ قرآن حکیم کے مطالعے میں ایک اور نیا طریق کار بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ "انسان پرستی کی توضیع، ہمارے دَور کے پیمانے سے (ص ۳۰) چونکہ میں اپنے "دور کے پیمانے" کے سلسلے میں اس قدر معلومات نہیں رکھ سکتا جتنی کہ آپ کو پیرس میں رہ کر حاصل ہوں گی مگر میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اس انسان پرستی کی نمائندگی کون کرتا ہے؟ سترادس؟ یا فوکو؟ مارکوزے؟ رانخ؟ یا "چارلی ہیبڈو"؟ اگر مادام سمون دلوار جیسی ممتاز انسانیت پرست پر اعتقاد کیا جائے تو پھر مادموا زیل برٹریت بار دو بھی "ہمارے دَور کے پیمانے کی انسان پرستی" کے دودھ سے چھلکتی نظر آتی ہے اور پیچھے ہی چھینے، مادام لایا کاری ایسی ہستی نے بھی، جو ان تمام تناسبوں کی حامی ہیں جو ایک "اساطیری ترکیب" کے لیے ضروری ہیں، خود کو اس عالی مرتبہ انسان پرستانہ احساس سے آزاد کر لیا ہے جو اس کے تصوراتی آدمی میں سوزش کی کمی پیدا کر دیتا ہے، "نتیجے کو سبب میں تبدیل کرنے کے ذریعے" (بحوالہ سترادس) ۔میں دل لگی نہیں کر رہا بلکہ ان مظاہر کو اتنی ہی سنجیدگی سے لے رہا ہوں جتنی کہ "عصری شعور" کے عظیم ترین نمائندے "اپنے دور کے پیمانے" کو دیتے ہیں۔

(۶) آپ قرآن حکیم کی زبان کو ایک "اساطیری ترکیب" کے طور پر دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ "اسطورے" کے ان جدید تصورات کی روشنی میں اس کا مطالعہ کریں جو کہ جدید نفسیات اور تہذیبی بشریات نے پیش کئے ہیں۔ یہ خیال سود مند سہی مگر ساتھ ہی آپ کا یہ کہنا ذرا پریشان کن ہے کہ "اسرار و اساطیر سے رہائی" حاصل کی جائے (ص ۱۳) اس جملے میں آپ نے واضح طور پر "اسطورے" کی اصطلاح

کو اٹھارویں صدی کے (تعقل پرستانہ) معنوں میں استعمال کر دیا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دونوں کام (یعنی اساطیری تصورات کا استعمال اور اساطیر سے رہائی) بیک وقت کیسے انجام دیئے جا سکتے ہیں؟ یا شاید اس کا مفہوم یہ ہو کہ پہلے تو اسلامی نظریے کو اٹھارویں صدیوں کی کٹھالیوں میں گھول پیٹ کر ایک ضمیر کی شکل میں منتقل کیا جائے اور پھر اس ضمیر کو بیسویں صدی کے سانچوں میں بھر کر ایک عجیب و غریب چیز "ہمارے دور کے پیمانے کے مطابق" تیار کی جائے۔ مجھے وہ امتیاز جو آپ "اسطورہ سازی (یا شکنی)" اور "اسطوری حالت (یا عدم حالت)" کے درمیان قائم کرتے ہیں، واضح طور پر نظر آتا ہے مگر عملاً اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ ان معاملات کو انفرادی لکھنے والوں کے مخصوص طرزِ فکر پر چھوڑ دیا جائیگا۔

(۷) مجھے شک پڑتا ہے کہ آپ نے محی الدین والملت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کی "قسطاس المستقیم" کے ساتھ قدرے بے انصافی سے کام لیا ہے۔ اگر انہوں نے قرآنِ حکیم میں ارسطاطالیسی صغریٰ و کبریٰ سے استدلال کی صورتیں دریافت کیں، تو آپ نے بھی تو اس میں ایک "اساطیری ترکیب" دریافت کی ہے۔ اس عمل کی دو صورتوں میں آخر کہاں کا فرق ہے؟ کیا یہ فرق اس حقیقت میں مضمر ہے کہ ان دونوں "اساطیر" اور "ترکیب" کو بہت زیادہ "اعتبار" حاصل ہے؟ اور کیا ارسطو اتنا ہی بعد از وقت بن چکا ہے؟ آپ نے خود (فرانسیسی کیتھولک فلسفی) ماریتیں کی جانب مسلمان لکھنے والوں کی توجہ مبذول کی ہے اور میں خود یہاں کے متجددین کو یہی سفارش کروں گا۔ مگر ماریتیں نے جو ارسطو کی منطق کا دفاع کیا ہے، کیا ہمیں اس کو نظر انداز کر دینا چاہیئے؟ (۱۳) میں عمداً امریکی دانشوروں کا ذکر نہیں کرتا جن کے لیے اب بھی ارسطاطالیت ایک زندہ اور لرزندہ طریق کار ہے۔ یہ اس لیے کہ آپ نے کسی بھی امریکی مفکر کو جدید عمائدین کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔ شاید پیرس نمبر ۳ میں کسی بھی امریکی کو "عصری شعور" کا حامل نہیں سمجھا جاتا جبکہ پیرس نمبر ۷ یا ۸ میں ممکن ہے صورت حال مختلف ہو۔

(۸) آپ چاہتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کے ساتھ "مظہریاتی" انداز میں ایک "انسانی مظہر" کے طور پر سلوک کیا جائے بالفاظِ دیگر، ایسے نہیں جیسے مسلمان اس کو دیکھتے ہیں بلکہ ایسے جیسے آپ اس کو اہلِ مغرب کی نظروں میں جائز بنانے کے لیے دیکھنا پسند کریں گے۔ مگر اس صورت میں تو قرآن حکیم ایک الہامی کتاب کے بجائے محض ایک تاریخی دستاویز بن کے رہ جائے گا، آپ کی تمام "تخیلاتی ماورائے تاریخ بصیرت" کے باوجود اور ایک عام مغربی قاری کے لیے بھی یہ شاید ہی کسی دلچسپی کا حامل نہ بن پائے کیونکہ وہ بھی تو اسے مسلمانوں کی الہامی کتاب سمجھتے ہیں پھر بھلا آپ کس کے لیے اپنی کتاب تصنیف کریں گے؟ کیونکہ مسلمان تو یقیناً آپ کی اس کوشش کے لیے ممنون نہ ہوں گے قرآنِ حکیم ایک الہامی کتاب کے طور پر قائم ہے اور اس کا کوئی بھی دوسرا ربطِ زمانی ممکن ہی نہیں۔

(۹) جہاں تک آپ کی اس کوشش کا تعلق ہے کہ مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والے نئے پروٹسٹنٹ قسم کے دینی علماء کو آگے لایا جائے تو، برادرِ عزیز! یہ آخری حد پر جانے کی بات ہے کیونکہ مغرب تک نے اس قسم

سے ضعیف العقل لوگوں کا کوئی دوسرا گروہ پیدا نہیں کیا۔ میں تو دہریہ (پروٹسٹنٹ پادری) کارل بارتھ کی نسبت (فوق الواقعیت کے رہبر) آندرے بریتوں کی پیروی پسند کروں گا یعنی چاہیئے وہ عقل سے ماوراء جانا چاہتا ہو۔ مگر عقل سے معذور تو نہیں!)

(۱۰) آپ اہلِ تصوف اور اہلِ تشیع کی جانب بے حد مہربان ہیں مگر کیا ماضی میں یا حال میں کوئی ایسا بھی صوفی یا شیعی کہیں رہا ہے جو خود اپنے عقیدے کا پاس بھی رکھتا ہو اور قرآن حکیم کو ایک "اتفاق منظر" سے طور پر دیکھنے کی تجویز سے متفق ہو؟ (۱۴)

(۱۱) آپ قرآن حکیم کا تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں جو کہ بلاشبہ ایک عجیب قسم کی ذمے داری ہے میں اب ایک مؤدبانہ درخواست یہ بھی کروں گا کہ سترکوس یا بارت کا بھی صرف ایک ایک صفحہ تجزیاتی اور تنقیدی نظر سے دیکھ لیجئے

(۱۲) مجھے یہ دیکھ کر انتہائی خوشی محسوس ہوئی ہے کہ آپ "بے احتیاط تشکیلات" قائم کرنے (کی خرابیوں) سے خود آگاہ ہیں (ص ۳۵)۔ یہ آپ کے دیباچے کا سب سے زیادہ پرلطف فقرہ ہے

میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ ایک نہایت فاضل شخص ہیں اور میں علم وفضل کے میدان میں محض ایک اناڑی مگر پچھلے چالیس ایک برسوں میں میں نے بھی اپنے ناچیز طریقے سے "عصری شعور" کے ساتھ اور "اپنے دور کے پیمانے" کے ساتھ ہر و کار قائم رکھا ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ اتنا طویل اور اکتا دینے والا خط لکھ کر بھی میں نے کوئی بے محل بات نہیں کی۔ مگر مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ آپ کی توہین کروں۔ میں نے آپ سے ایسی صاف گوئی سے بات کی ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے روا رکھنی چاہیئے اگر میں آپ کے لیے عمیق احترام نہ رکھتا اور تہہ دل سے آپ کی صلاحیتوں کا معترف نہ ہوتا تو شائد میں آپ کو کچھ بھی نہ لکھتا تاہم اگر اب بھی میرے خط میں کوئی ایسی بات آگئی ہو جو آپ کے احساسات کو مجروح کرے تو میں پوری صمیمت کے ساتھ آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ اس خط کو نذرِ آتش کر دیجئے اور میرے بارے میں سب کچھ فراموش کر دیجئے لیکن اگر آپ کو میرے ناچیز معروضات میں کوئی بھی معقول بات دکھائی دے تو ہم تفصیل سے بحث کو جاری رکھ سکتے ہیں، ایک برادرانہ تعاون کی روح کے ساتھ (۱۵) کیونکہ میں اب بھی یقین رکھتا ہوں کہ اگر آپ مستند اور راسخ العقیدہ نقطۂ نظر اختیار کر لیں تو آپ دنیا بھر کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کا تشکر حاصل کرنے میں کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں گے۔

عمیق احترام اور تعظیم کے ساتھ، میں اس خط کو تمام کرتا ہوں

مع السلام التام علیکم
اخیکم فی الاسلام
محمد حسن عسکری

اشارات از مترجم

(۱) یہ کہ ہمارے عرب بھائی سترھویں صدی کے بعد ہمارے یہاں کے علوم اسلامی اور اس سلسلے میں ہماری خدمات سے بے خبر ہیں، شائد کلیتہً درست نہ ہو۔ مرحوم مسعود عالم ندوی کی عربی تصنیف "دعوۃ الاسلامیہ فی الہند" اور اس کے بعد مولانا ابوالحسن علی میاں کی متعدد تصانیف اور ان سے پہلے ان کے والد مولانا عبدالحیٔ کی "نزھۃ الخواطر" تو بہت سی جلدوں میں عرب دنیا میں شائع ہو چکی ہے اگرچہ شائد یہ کہنا درست ہو کہ پھر بھی زیادہ تر لوگ بلکہ اکثر علماء تک اس سلسلے میں خاصی محدود معلومات رکھتے ہیں۔ مگر یہ توقع کہ وہ ہمیں اس دور میں علوم اسلامیہ کے "واحد محافظ" قرار دے دیں گے، یا شیخ احمد سرہندی کو ہمارے یہاں کی طرح مجدد تسلیم کر لیں گے، یا پھر شاہ ولی اللہ کی شان میں وہ کچھ کہنے کو تیار ہوں گے جو ہم آئے دن سنتے رہتے ہیں، پوری ہونے والی نہیں تاہم اپنے بزرگوں کے کام سے دوسروں کو آشنا کرنا ہمارا ہی فریضہ ہے۔

(۲) شمس بازغہ، ایک اس قسم کی نصابی کتاب ہے جیسی آجکل بھی فلسفے کے تعارف کے لیے لکھی جاتی ہے، جونپور کے مدرسوں میں پڑھے جانے کے بعد، جب سے اس کا شمول درسِ نظامی میں ہوا ہے اس کی شہرت اور اہمیت ذرا زیادہ ہی محسوس کی جانے لگی ہے۔ ورنہ یہ کہنا شائد درست ہو کہ معقولات کے میدان میں شائد برصغیر کے مسلمان علماء اس تعارفی کتاب سے بہت کم آگے بڑھ پائے ہیں۔

(۳) کوئی آدمی کسی دوسرے مذہب کی الہامی کتاب کو یقیناً یہ جاننے کے لیے بھی پڑھتا ہے کہ اس مذہب کے معتقدات معلوم کر سکے مگر وہ بے حس اور کم فہم یا اپنے مذہب کا متشدد پیروکار نہ ہو، تو اس نئی الہامی کتاب سے کسی نہ کسی سطح پر متاثر بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ ہم میں سے کئی ایک لوگ بائبل سے اور مغرب میں قرآنِ حکیم سے ہوتے ہیں۔ اور یہ تاثر ضروری نہیں کہ محض سکہ بند تعبیرات کو تواتر سے دہراتے رہنے کی وجہ سے پیدا ہو، اس میں متاثر ہونے والوں کی اپنی صلاحیت کے علاوہ ان لوگوں کا دخل بھی ہو سکتا ہے جو ایک الہامی کتاب کو نئے دور کے چیلنج کا خیال کرتے ہوئے مناسب طریقے سے پیش کریں۔ عالم اسلام کے علماء نے چونکہ یہ کام ابھی محض شروع ہی کیا ہے اس لیے لامحالہ ان کو مخاطب لوگوں کے نفسیات اور ان کے فکری رویوں کو سمجھنے میں ابھی کافی وقت لگے گا۔ اسی طرح کوئی ایسا طریق کار معلوم کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں جس کی رو سے یہ طے ہو کہ مخاطب کے لیے کن باتوں کو اولیت دی جائے اور کن باتوں کو وقتی طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ بہرحال محض معلومات حاصل کرنا تو کوئی بڑے کمال کی بات نہیں، نہ ان معلومات کو امرِ واقع کی طرح پیش کر دینا۔ زیادہ سے زیادہ یہ رویہ احکام کے سلسلے میں روا رکھا جا سکتا ہے یا دوسرے لفظوں میں فقہی تفسیر کے سلسلے میں مگر اس میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت کہاں سے پیدا ہو گی؟

(۴) ۱۹۵۰ء میں عسکری صاحب کا عالم اسلام کے رگ و پے میں دوڑتی ہوئی ایک نئی لہر کو محسوس کر لینا ان کے وسیع مطالعے کے ساتھ ساتھ، ان کے ذہن کی انتہائی حساسیت کی دلیل ہے، خصوصاً مغرب زدگی میں چند ایک عرب مندوبین کا توغل اور اس کے برعکس ایرانی کانفرنس مندوبین کا، شہنشاہیت کے باوجود، راسخ العقیدہ ہونے پر اصرار۔ تب سے اب تک صورت حال بہت کافی بدل چکی ہے، ان معنوں میں کہ مغرب زدہ لوگ عرب دنیا میں اب کسی نہ کسی طرح اپنے دفاع یا ذاتی حفاظت پر توجہ مرکوز کئے ہوئے ہیں اور ہمارے یہاں کی نحیف آواز شاید اور بھی نحیف ہو گئی ہے

(۵) ڈاکٹر علی شریعتی (جن کو اس مکتوب کی تحریر سے تقریباً دو سال کے بعد خفیہ شہنشاہی تنظیم "ساوک" نے لندن میں گولی مار کے شہید کر دیا) اب تو پوری دنیا میں اپنے خطبات کی وجہ سے مشہور ہو چکے ہیں، جن سے ایک نیا انقلابی ذہن پیدا کرنے میں ناقابلِ یقین امداد ملی مگر ۱۹۷۵ء میں شاید فرانس اور الجزائر کے علاوہ ایران سے باہر انہیں خال خال ہی کوئی جانتا تھا "اسلام شناسی" سے یہاں مراد وہ خطبات نہیں جو حسینیہ ارشاد میں اس عنوان سے دیئے گئے (اور جن کا جزوی ترجمہ ۱۹۷۹ء میں امریکہ سے شائع ہوا) جبکہ وہ مفصل تر کتاب ہے جو ۱۹۶۸ء میں ان کی مشہد یونیورسٹی سے برخواستگی سے پہلے اس عنوان کے تحت مشہد ہی سے شائع ہوئی تھی اور جسے عسکری صاحب پڑھ چکے تھے۔

(۷) اس خطِ حرکت کا نقطۂ اوّل (یا بومرینگ کی طرح نقطۂ آخر میں) بودیلئر یا ہیں لو کو ہونا چاہیئے مگر مشرقی ذہن کی حرکت میں درحقیقت اس سے پہلے بھی ایک مرحلہ آتا ہے یعنی اپنی تہذیبی صورت کا مطالعہ یا اس کا کوئی مرکزی نقطۂ توجہ، اسے عسکری صاحب چھوڑ گئے ہیں۔ اگر سب چیزیں اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی ہیں تو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ "مراجعت" ارتجاعی (یا رجعت پسندانہ) تو نہیں؟ علی شریعتی یا جلال آل احمد کی واپسی۔ قرآن و حدیث کی طرف ۔ قرآن و حدیث کے کسی ایسے تصور یا تعبیر کی طرف نہیں جو محض ان کی فکری تلاش کی بے حاصلی یا پسپائی کی دلیل ہو۔ وہ تو ان تمام بصیرتوں کے ساتھ واپس آتے ہیں جو ان کو اپنے طویل ذہنی سفر میں حاصل ہوئیں اور لہٰذا یہ واپسی خود ایک متحرک قوت بن جاتی ہے اور کسی قسم کے معذرتی اور دفاعی لہجے سے ہمیشہ مختلف رہتی ہے اس کے برعکس عالم اسلام کے بہت سے دوسرے مغرب زدہ لوگوں کا اسلام کی طرف لوٹنا کسی قسم کی متحرک قوت میں تبدیل نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ جس تہذیبی نقطے سے وہ چلے تھے اور جہاں وہ لوٹ آئے، وہ خود بھی نئے دور کے چیلنج کے لیے ایک پناہ گاہ سے زیادہ کچھ نہ بن سکتا تھا، نہ انہوں نے خود اس کی مخفی قوتوں کو نمودار کرنے کی کوئی کوشش کی

(۶) جلال آلِ احمد جن کا ۱۹۶۹ء میں پراسرار حالات میں انتقال ہوا۔ اپنی وفات سے پہلے صادق ہدایت کے بعد ایران کے ممتاز ترین افسانہ نگار، ڈاکٹر مصدق کے انقلاب کے بعد تو پارٹی لائن کے اہم ترین ناقد اور ایک "تیسری قوت" کے سرگرم نظریہ ساز تھے۔ ان کا طویل مقالہ "غرب زدگی" جس کی اشاعت پر شہنشاہی دور میں

قدمن ہگئی، اس کے باوجود چوری چوری چھپتا اور تقسیم ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ طلبہ اور دانشوروں کے درمیان اسے فاقی نئے دور کے مینی فیسٹو کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس کے اجزا لوگوں کی زبان پر جاری وساری رہنے لگے۔ اس میں انھوں نے مغرب کے اقتصادی اور تہذیبی تسلط اور استعماری قوت کے خلاف تیسری دنیا میں ایک مضبوط مزاحمتی رویہ پیدا کرنے کی تحریک کی اور بالخصوص عالم اسلام کو مغرب کی پیروی کے خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اپنی تہذیب کو سمجھنے اور اپنی صورت حال کا خود تجزیہ کرنے کی دعوت بھی۔ عسکری صاحب نے ۱۹۷۵ء ہی میں یہ مقالہ پڑھا تھا اور اس خط کے علاوہ کامو کے ناول "اجنبی" کے اردو ترجمے پر دیباچہ لکھتے ہوئے بھی اس کا ایک اقتباس نتیجے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ بات البتہ درست نہیں کہ جلال نے دستوئیفسکی کامو، سارتر (اور آندرے ژید) کے علاوہ استاندال اور فلوبیئر کے بھی تراجم کئے ہیں (اگرچہ یہ آخری کام خود عسکری صاحب نے اردو میں انجام دیئے!)

(۷) "شرم کی بات شاید اس وجہ سے ہو کہ ولہلم رائخ نے اپنے فکری نتائج انسانی جسم کے مطالعے سے حاصل کئے تھے اور بعد میں ان کی تطبیق انسانی معاشرت، سیاست اور افکار وخیالات پر کی تھی۔ اس کے نزدیک دو اجسام کے تواصل سے ایک نئی حیاتیاتی قسم کی قوت" اورگون" پیدا ہوتی ہے جو ہر وقت تموج کی حالت میں رہتی ہے اسی طرح کی قوتیں کائنات میں بھی پائی جاتی ہیں اور عسکری صاحب کائنات کی الٰہی اور کونیاتی قوتوں کے تموجات کی شہادت یا توثیق قرآن حکیم کے مطالعے سے کرنے نکلے تھے۔

(۸) قرآنِ حکیم کو کسی لحاظ، ہر لحظہ متغیر ہونے والے رواج کا محکوم بنانا تو یقیناً درست نہیں مگر کیا اس رواج سے تحت ان افکار وخیالات کا شمار بھی ہوگا جو بکینی سوئٹ کے فیشن کی طرح ہر دوسرے دن نہیں بدلتے بلکہ کئی ایک نسلوں تک چلتے رہتے اور انسانی زندگیوں پر عمل وتعامل کرتے رہتے ہیں ؟ اگر ان کو بھی حرام کر دیا جائے تو پھر ماضی کی عمدہ ترین تفاسیر جیسے کشاف، تفسیر کبیر اور کشف الاسرار تک اس فتوے کی زد میں آجائیں گی، اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام فلسفہ، حکمت وتصوف بھی جو غیر عرب علوم کے چیلنج کے جواب ہیں، خود انہی علوم کی مصطلحات اور مضمرات کو لے کے آگے چلتا ہے اس سلسلے میں جہاں ابوکون صاحب کی رائے امام غزالی پر نا قابلِ قبول ہے وہاں جدید علوم وافکار کو تفسیر سے دور رکھنے کا تصور بھی زیادہ سے زیادہ رسمی تفاسیر کے لیے مددگار ہو سکتا ہے۔

(۹) قرآنِ حکیم کو جدید زبان شناسی کا ہدف بنانا، اس نئے علم کے مالۂ وماعلیہ کو جانے بغیر، یقیناً خطرے سے خالی نہیں، ان معنوں میں کوئی بھی تخلیقی کام کسی نہ کسی خطرے کا شکار ہو سکتا ہے، پھر بھی ایک نئے طریق کار کو برتنے والا اس خطرے سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کو اس سے خوف زدہ کرنے کی بجائے سلامتی سے گزر جانے کا راستہ دکھانا بہتر ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانیہ کی منطقی اثباتیت (جس کی نمائندگی پروفیسر آئر کی کتاب "زبان، صداقت اور منطق" سے ہو سکتی ہے) اور ویانا کا مکتبِ فکر (جس کا ممتاز ترین رکن وٹگنسٹائن کو قرار دیا جاتا ہے)۔ ان دونوں کی توجہ فلسفے کی زبان پر رہی ہے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کوئی بھی فکری

نظامِ محض الفاظ کا گورکھ دھندا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرزِ فکر کوئی مثبت فلسفیانہ تخلیق نہیں دے سکتا کیونکہ یہ ہر تخلیق کو "حقیقت" سے بے نیاز سمجھتا ہے مگر یہ کہنا شائد پوری طرح درست نہ ہو کہ جدید زبان شناسی محض انہی لوگوں کے خیالات پر مبنی ہے (ترکیباتی) زبان شناسی میں "اثباتیت پرستوں" کا اپنا ایک ذیلی مکتب ہے جو پورے علم پر محیط نہیں اور ویسے بھی اس مکتب کے پاس ادب تک پر اطلاق کا کوئی متفق علیہ طریقِ کار موجود نہیں) زبان شناسی کے دیگر ذرائع میں سے قدیم علوم لسانی کا احیاء اور نفسیات و عمرانیات کے وہ مکاتبِ فکر بھی ہیں جو برطانیہ اور دیاآنا کے ممنون نہیں کہے جا سکتے

(۱۰) جیکوبسن نام کے یوں تو بہت سے مفکر اور ادیب شمالی یورپ میں ہوئے ہیں۔ مگر شائد یہاں مراد رامون جیکوبسن سے ہی ہو سکتی ہے جو (زاردے کی بجائے) روس کے "ہیئت پرستوں" کا رکن تھا، پھر چیکوسلواکیہ میں "پراگ" کے مکتبِ زبان شناسی" کا رکنِ رکین بنا اور چند ایک مضامین میں اس نے زبان شناسی کے طریقِ کار کو شعر و ادب پر بھی استعمال کر کے دیکھا ہے اگرچہ عسکری صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ اس کام میں وہ رولاں بارت کے رتبے کو پہنچا جس نے یہ طریقِ کار ایک مدت تک بہت سے ادبی متون پر آزما کے دیکھا ہے۔

(۱۱) "ایس با زیڈ؟" S/Z، رولاں بارت کی تصنیف جس میں اس نے بالزاک کے ایک افسانے کا تجزیہ زبان شناسی کے نقطۂ نظر سے کیا ہے اور تان اس پر توڑی ہے کہ فلاں جگہ ایسے ہونا چاہیئے تھا یا زیلڈ؟ اس کتاب کو یا جاپانی تہذیب کے عناصر ترکیبی پر اس کے مشاہدات کو "محض ایک خیالی افسانہ" قرار دے کر پھر [illegible] ہے کیونکہ بارت نے جہاں چند ایک (ضروری یا غیر ضروری) مفروضات سے کام لیا ہے، وہاں موجود [illegible] یا وضعِ موجود کے بہت سے عناصر کا نہایت باریک بینی سے تجزیہ بھی کیا ہے۔

(۱۲) کنائے کو مجاز سمجھنے پر لیوی ستراؤس پر جو گرفت کی گئی ہے اور امریکی نقاد اور مفکر کی جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے، دونوں نہایت برمحل ہیں مگر لیوی ستراؤس سے علومِ ادب کے سلسلے میں اس قسم کا التباس غیر متوقع بھی نہیں۔

(۱۳) ماریتیں کے مطالعے کی سفارش اور ارسطو کی منطق کے سلسلے میں اس کا دفاع لازم و ملزوم نہیں ماریتیں اس لیے اہم ہے کہ اس کے ذریعے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کی مذہبی توضیحات کو لے کر آگے چلا جا سکتا ہے مگر اس قسم کی علمی منفعتوں کے لیے ارسطو کی منطق پر ایمان لانے کی کوئی شرط شائد خود ماریتیں نے بھی نہ لگائی ہو۔ یہ البتہ درست ہے کہ آج کے علوم سے بہرہ اندوز ہو کر قرآنِ حکیم کو "عصری شعور" کی مدد سے سمجھنا اسی طرح ہے جیسے قرونِ وسطیٰ میں امام غزالی اور دوسرے علماء نے کیا تھا۔

(۱۴) ایسا کوئی صوفی یا شیعی تو واقعی نہ ملے جو قرآنِ حکیم کو "محض" ایک انسانی مظہر قرار دے سکے مگر قرآنِ حکیم کا تاریخی دستاویزات کے طور پر مطالعہ کوئی قباحت نہیں رکھتا کہ علم تاریخ بھی رضائے الٰہی کو سمجھنے کا ایک طریقہ ہے۔

(۱۵) یہ بحث آگے چلی کہ نہیں، اور کوتن صاحب اور عسکری صاحب کا رابطہ اس مکتوب کے بعد کہاں تک قائم رہا،

پھر قرآن حکیم پر ان کی مجوزہ تصنیف کا کیا ہوا؟ اس کا کوئی جواب ہمارے پاس موجود نہیں۔ شاید پروفیسر لئیق بابری یا خود ڈاکٹر حمید اللہ کچھ روشنی ڈال سکیں کہ مکتوب الیہ پر اس مکتوب کا کیا اثر ہوا؟ کیا خدانخواستہ وہ اپنے ارادے سے ہی دستبردار ہو گئے یا انہوں نے خطرات سے عہدہ برآ ہونے کا کوئی مثبت راستہ بالآخر تلاش کر لیا؟ اس اطلاع میں مزید معلومات کا انتظار رہے گا۔

○○

مذہب کا تصوّر

احسان دانش

اس مخلوق کی رنگا رنگ بھیڑ اور کائنات کے انسانی شعبے میں اگر کوئی سمجھنے کی چیز ہے تو صرف مذہب ہے انسانی نگاہ فطرتاً اول سے اپنے سے بڑی ذات کی تلاش میں ہے لیکن جب یہ مندر، مسجد، گرجے اور مختلف قسم کے معبد نظر آتے ہیں تو دل و دماغ کو ورطۂ حیرت گھیر لیتا ہے کہ آخر سمجھنے اور سوچنے کی اصل سمت کون سی ہے اور حقیقت کس طور جلوہ فرما ہے۔

مسجدیں، شوالے، کلیسا، مڑھیاں اور اسی قسم کی سینکڑوں علامتیں دیکھ کر خود بخود یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ تو انسانی صناعی کی چیزیں ہیں وہ زمین و آسمان اور چاند سورج بنانے والا صناع کہاں اور کس عبادت گاہ میں دستیاب ہوگا۔

وہ نمازیوں کے سجدوں سے خوش ہوتا ہے یا مورتیوں کی پوجا سے۔ اسے آگ کا رقص یا طواف پسند ہے یا برہمن کا زنار پرورش ہوتا۔ وہ شوالے میں آرتی پر جھومتا ہے یا قوالی میں ڈھولک کی تھاپ پر؟ اسے نذر و نیاز مرغوب ہے یا ہون اور دان پن کے انواع و اقسام کے طریقے؟

یہ بات تو درست ہے کہ ہر شخص انسان سے ماورائی طاقت کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اس کے مختلف علامات قائم کر کے مطمئن سا بھی ہے لیکن یہ اس سوال کا جواب نہیں کہ حقیقت کس طرف ہے ہمیں کس طرف جھکنا سجدہ مند ہوگا۔

دنیا میں چاروں طرف مذاہب کے کاروبار پھیلے ہوئے ہیں اور کوئی خود کو گمراہ محسوس بلکہ بصد ارادت و عقیدت یہ تمام سجدہ گاہیں اور عبادت کے مراکز بامراد نہ سہی آباد چلے آ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام کو اس قدر فرصت بھی کہاں ہے کہ ان اسرار ماضیہ کی تہ تک پہنچے اور انسانوں کا جھوٹ اور سچ معلوم کرے ہر چند کہ جاہل ہو یا پڑھا لکھا شہری ہو یا دیہاتی، سب اس راز کی فکر میں ہیں لیکن کوئی روا، ناروا کے متعلق زبان نہیں کھولتا۔ فرض و یقین کے تاروں میں الجھے ہوئے دل و دماغ اسی میں لذت و سکون ڈھونڈ لیتے ہیں۔ مگر وہ سکون مستقل نہیں ہوتا۔ صدیاں گزر گئیں یہ ورثے میں ملے ہوئے خیالات و عقائد کو لے کر اسی راہ پہ گامزن ہیں اور اب تک کوئی یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کون سا مذہب سچا اور کون سا دین

حق کا دین ہے۔

مذہب کی سچائی کا معیار کیا ہے اور کون سا شارہ کائنات کے منشا کو صحیح سمجھا ہے۔ یہ تو دین و مذہب کا معاملہ ہوا۔ اب تک ذات خدا کے متعلق فیصلہ نہیں ہو سکا اور اس کی ہستی کے متعلق کوئی متفق علیہ دلیل انسانی دل و دماغ کو میسر نہیں آسکی۔ یہ منتہائے زندگی کا راز عظیم اور ابھی تک اندھیرے میں انسانی آہوٹ کا منتظر ہے موت کے دبیز پردے کو اب تک کوئی محقق نہیں اٹھا سکا۔ یہ دروازہ سعی و عمل کے باوجود اس قدر بچھو ہو گیا ہے کہ کھلنے میں نہیں آتا۔ علم ریاضی، علم تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کے سینکڑوں شعبوں پر ہندو سکھ، عیسائی اور مسلمان ایک خیال اور ایک یقین ہو کر کام کر رہے ہیں اور اس سے آئے دن ایجادات و اختراعات میں اضافے ہو رہے ہیں۔ ہر طرف قوت و عمل کی راہیں کھلی نظر آتی ہیں۔

لیکن مذہب جیسی چیز اب تک باعث نزاع چلی آ رہی ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دیگر مذاہب کے ماننے والے بدستور دست و گریبان ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ آخر ان اہل عرفان نے مذہب کو کیوں ایسی شے خیال کر لیا ہے کہ یہ آپس کے فاصلے سمٹنے میں نہیں آنے۔ اگر یہ سب سچائی کے دلدادہ اور حق پسند ہیں تو صداقت کی اتنی بڑی اکثریت کسی ایک نقطہ مشترک پر کیوں نہیں آتی؟ ہر شخص اپنے مذہب کے علاوہ تمام مذاہب کو غلط کیوں سمجھتا ہے؟ جس کی تحقیق نہیں ہیں اسے غلط کہنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ اگر اس اختلافات کی فصیل کو ہر مذہب میں بلند کرنا رہا ہے تو صداقت اور سچائی کا دعویٰ کہاں تک درست اور مضبوط قرار پاتا ہے؟

کیا عالم انسانی کی بڑی بڑی جنگیں اور روئے زمین پر مشہور خونریزیاں، ہولناک فساد، خوفناک مقاتلے اور حیران کن کشت و خون اختلاف مذہب سے ظہور میں نہیں آئے؟ کیا اس دنیا میں سینکڑوں قومیں قریے اور شہر تباہ نہیں ہوئے۔؟

اگر یہ اختلافات اور آپس کے جھنجھٹ اسی طرح پھلتے پھولتے رہے اور انسانی رہنماؤں کے ایما پر ایک قوم دوسری قوم کو اسی طرح ڈستی رہی تو ایک دن نسل انسانی یا ناپید ہو جائے گی پھر موسموں کے تقاضے سے درختوں کے پت جھڑ کی طرح یہ سلسلہ قیامت سے جا ملے گا اور لوگ شاید اسی مار دھاڑ اور دھر پکڑ کو منشاء ایزدی سے تعبیر کریں گے۔ جو بالکل غلط ہوگا۔

حیرت کی بات ہے کہ انسان جو خود کو اشرف المخلوق، خدا کا نائب اور پیغمبر کا جانشین کہتا ہے وہ امن کی حد مشترک قائم نہیں کر سکا۔ جب کہ وہ ایک قوت کا پیدا کردہ ہے جو محرک اول ہے۔ ایک ہی نسل انسانی ہے جو اجسام و ارواح کے اعتبار سے جدا نہیں۔

اس کے باپ دادا بھی انسان ہی تھے۔ ان کا منشا بھی امن عالم تھا اور ان کی تعلیم میں بھی انسان کے لیے سکون ڈھونڈنا تھا لیکن آج تک کسی مذہب کو ایسا ہادی یا رہنما نہیں ملا جو ان سب کو اپنی حقیقت سے آگاہ

کر کے ان کے علم و یقین کو روزمرہ میں داخل کر دیا۔

جس قدر کتابیں آسمان سے اتریں اور جتنے پیغمبر مبعوث ہوئے انہوں نے فطرت کے خلاف کبھی کسی انسان کو نہیں چلایا۔ جب وہ ایک ہی طاقت یا قوت کی طرف سے آئے تھے قرآن کی تعلیم بھی ایک ہوگی۔ منشا بھی ایک ہوگا اور مقصد بھی دو نہیں ہوں گے۔ وہ سب یہی سوچتے چلے آئے ہوں گے۔ کہ یہ سب کیا ہے؟ اور کیوں ہے! اور کس لیے ہے؟ کسی نے بات کا ایک پہلو سمجھا اور کسی نے دوسرا مگر اس ذات سے کسی نے انحراف نہیں کیا جس کے قبضۂ قدرت میں انسان کی حیات و موت ہے۔ دیکھا جائے تو جس نے جتنا سمجھا اسی قدر وہ دنیا کو بتاتا بھی رہا۔ اس کار خیر میں انہیں جو جو کسالے اٹھانا پڑے ان سے تاریخ کا سینہ لہو لہان ہے۔ کوئی زندان میں زنجیروں سے وہی باتیں کرتا رہا کہ شاید اہل زندان کی سمجھ میں کوئی بات آجائے، کوئی دار پر چڑھ کر وہی تعلیم پکارتا رہا کہ شاید کوئی ذات واحد کو پہچاننے والا نکل آئے لیکن وقت کے ساتھ حقائق دشمن اور خدا ناآشنا لوگوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ انسانی برادری کو خوف اور لالچ کی بنا پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

خدا کے پیغام کو غلط قرار دے کر گروہ در گروہ دشمن حق پیدا کر دیئے جو اصل میں بغاوت تھی حق و صداقت سے۔ اسی خاردار جھاڑی کی شاخیں پھیلتی چلی گئیں، تقدس کے راستے کانٹوں کے بستر بن گئے اور دنیا میں ایسی فضا پیدا کر دی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرقے کا خدا الگ، رسول جدا اور اخلاقی اقدار مختلف ہیں ایسے مختلف جو کبھی نوع انسان کو ٹھنڈے چولہے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ وہ بالکل نہیں سوچتے کہ کمزور قوم کو مٹانے کے بعد بھی تو کمزور اور طاقت ور باقی رہیں گے۔ یہ جنگ و جدل تو چلتی رہے گی۔ مجھے بدھ مت کے ایک درویش کا فقرہ یاد ہے جس نے ۱۹۳۹ء کی جنگ میں موجودہ حالات پر گفتگو کرتے ہوئے کشی نگر میں کہا تھا کہ جب تک جنگ کے خیالات انسانی ذہن میں ہیں انسانیت مکمل اور امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس فقرے کا منشا بھی وہی ہے کہ ابھی یہ انسان انسانیت کے اعتبار سے ناقص ہیں انہیں انسان کی عظمت کو سمجھنا درکار اور تکمیل کی طرف قدم زن ہونا لازم ہے۔

اس میں کیا شک ہے کہ مذہب کج فہمی تنگ ظرفی اور نسیان و اوہام سے نکالتا ہے لیکن آگے چل کر یہی مذہب جب خوف اور لالچ کی راہ سے مقاصد پرستوں اور تعیش پسندوں تک پہنچتا ہے تو اتحاد و اشتراک کی ضد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کا علم مادی تشریح و تحلیل میں الجھ کر نئے نئے تصورات کو تشکیل دے لیتا ہے۔ جو علم نبوت سے بے بہرہ نہیں شرع پیغمبری کو سامنے رکھتے ہیں، ان میں سعی و عمل کا جذبہ زندہ و بیدار ہوتا ہے اور دل و دماغ کے سکوت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔

پیغمبر کے اصول حیات کے تحت جس قدر کام ہوتے ہیں ان میں جدال و قتال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو حفظ و امن کا پیغام ہے جو عمل میں ڈھلتا رہتا ہے۔ اور حقیقی علم اس کی نگرانی کرتا ہے۔

سب لوگ وہ ہندو ہوں یا مسلمان سب شہد کو میٹھا اور حنظل کو تلخ کہتے ہیں۔ دن کو روشن اور رات کو تاریک

سے تعبیر کرتے ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ وہ مبنی حقائق ہیں لیکن تمام مذاہب کے سرپرست یا حکمران مل جل کر اپنے اپنے مذہب کو علم کی کسوٹی پر نہیں کستے اور نہ ان باتوں کی تحقیق کرتے ہیں جن پر وہ ارادی طور پر کاربند ہیں سب نے اپنی اپنی جگہ مقاصد کے چاروں طرف دیواریں کھینچ رکھی ہیں اور ان احاطوں میں علم تحقیق کا داخلہ جرم بھی ہے اور گناہ بھی۔

اگر آج یہ سب لوگ ایمانداری پر آجائیں اور خدا کو حاضر و ناظر خیال کر کے یہ ریاکاری اور غلط بینی کی دیواریں مسمار کر ڈالیں تو پلک جھپکنے میں اس اساس مشترک اور حقیقت مجرد تک پہنچ جائیں گے جسے صوفیا اور علماء اپنی مکتبی اصطلاح میں نفس الامر کہتے ہیں جو فی الحقیقت تمام مذاہب کی روح اور زندگی کی قوت مشترک ہے جس کو صرف آخری پیغمبر نے دیکھا اور اس کے منشا و مقصد کو متفق علیہ کر دیا۔ اگر سب مذاہب کے رہنما اور فرقوں کے داعی اسی نظریئے سے اس محرک اول اور ذات قدیم کو دیکھیں تو بڑی آسانی سے مخلوق متحد الخیال اور متفق الاعمال ہو سکتی ہے۔ آج بھی اسی لمحہ دنیا کے مجادلے اور مغالطے حرف غلط کی طرح مٹ سکتے ہیں۔ حکومت کے لیے زمین کا مالک خدا ہے اس کا استعمال اور صحیح مصرف اس کے رسول یا پیغمبر نے ہی بتایا ہے۔

پیغمبر کے احکام نسل انسانی میں اتفاق و اتحاد پیدا کرتے ہیں اور شریعت کا منشا بھی یہی ہے کہ انسان انسان کا خیرخواہ رہے اور نظریاتی خلیجیں پٹ جائیں دل و دماغ ایک مشترک سطح پر انسانی بہبود کے لیے سوچیں نہ کہ اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا اپنا راگ الاپتے پھریں۔ حقیقی راستے کو اختیار کرنا دل کو واہموں سے رہائی دینا، فرضی یقین سے دستبردار اور ایمان کامل سے بہرہ ور ہونا ہی صحیح انسانیت ہے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ انسان اپنی راہ سے اس قدر دور نکل آیا ہے کہ وہ اصل تعلیم انسانی سے بھی کوسوں دور ہٹ گیا۔ آج کون سے عالم میں یہ برتا ہے۔ کون سا فقیہ سینہ تان کر سامنے آتا ہے اور کون سا محدث خم ٹھونک کر آگے بڑھتا ہے یا ماتھے پر کلاہ کج کر کے یہ بتا سکتا ہے کہ آخر وہ حق کیا ہے کونسا ہے جس کے لیے آسمانی کتابیں اتری ہیں اور پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ وہ کوئی فقرہ تھا، کتاب تھی، اسم تھا یا اعمال بھی آخر وہ تھا کیا؟

جو حق کو نہ سمجھ سکے وہ اہل حق کیسے ہو سکتا ہے وہ زندگی اور موت دونوں میں سکون سے کیسے بسر کر سکتا ہے! سوچا جائے تو کیا تمام اہل مذہب غیر مطمئن نہیں مرتے؟ اسلام کے سوا کونسا مذہب سینے پر ہاتھ رکھ کے کہہ سکتا ہے کہ میں موت کے بعد کے حالات سے من و عن آگاہ ہوں۔

وہ صدق ازل اور حقیقت بسیط کیا تھی؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا علم کیا تھا؟ اس کی تعلیم کون سی ہے؟ اگر انسان ذہنوں کی دھند ہٹا کر دیکھے ایک حس مشترک سے محسوس کرے اور اپنے تمام اختلافات کو ختم کر کے ذہن کو ایک سطح پر لے آئے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس ذات بے نیاز نے جو ہر قید سے آزاد اور اسم سے بری ہے جو کچھ پیغمبر آخرالزمان سے کہا؛ وہ اس نسل انسانی کی بہتری اور بہبود کے لیے ہی کہا

ہے اس کے سوا اور کوئی رخ تو سامنے آتا ہی نہیں اس کا منشا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی امی اور جاہل مخلوق کیسے رہے کیسے چلے اور کیسے سوچے کہ اس کی سعی و عمل سے اس کے لیے امن و امان کے راستے کھلتے چلے جائیں اور ارتقا کی نبض پر انگلی رکھ کر اپنے فکر و فن کی حفاظت اور نگرانی کرے۔

یہی پیغام ہے جو ماضی کے پیغمبروں کو اس آستانۂ قدس سے ملا اور اسے رائج کرنے والے نبی، پیغمبر اور رسول وغیرہ کہلائے۔ اسی انسانی بہبود کا علم دنیا کے علوم کا خلاصہ ہے۔ اسی سے انسان انسان بنتا ہے۔ یہی ایک وظیفہ ہے جو امن عالم کے لیے وظیفۂ تسکین ہے اور خشک جنگلوں کے لیے بادِ بہار۔

یہی صحیح علم آخر ہے اور یہی کشف و اکتشاف کا منبع۔ اسی حقیقت کی وسعت میں حقائق الاشیاء گملوں کے پودوں کی طرح ہیں اور علم مرایہ آرائش خانہ کے مختلف کتبے۔ اسی رسدگاہ سے قضاء و قدر کے جلوے نظر آتے ہیں اور الہٰی فیصلے مرتب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی منارے سے اگر چاروں طرف کھڑکیوں میں سے جھانکا جائے تو آسمان کے راستے اور پستی کے غار انلارح ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ یہیں سے سزا و جزا کا معیار اور عدل کا دستور اپنا اعلان کرتا ہے جس پر فرشتوں کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور چرند پرند تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اگر تمام فرقے اپنے رسم و رواج اور طریقہائے عبادت کے جعلی پردے چاک کر لیں تو اب بھی اندر سے وہی صداقت مجردہ نکلے گی جس کی تشنگی میں انسان آج تک زبان نکلے پیاسا مرتا پھر رہا ہے۔ مگر یہ رنگ رنگ کی بولیاں بولنے والے اور طرح طرح کے سوانگ بھر کر حلوا مانڈہ کھانے والے لوگ کہاں ایسا ہونے دیں گے۔

ان کی عقل مردہ، علم گمراہ اور نگاہ و دل واہی ہو چکے ہیں۔ یہ بالکل ناواقف ہیں کہ پیغمبروں کو جو جنون مقدس اور بقا و رضائے الٰہی کا انعام الاقتصادی انسانیت کے لیے بہبود کا راستہ ہے اور یقین کے ساتھ عمل ہو تو کون سی بلندی ہے جو احاطہ انسانی سے باہر جا سکے۔ وہاں تو جو فکر ہے مکمل ہے حق ہے بلند ہے۔ جو نظر ہے گہری ہے وسیع ہے اور حق شناس ہے۔ انبیاء نے آئین حیات اور اصول و جبر کے کارخانے میں اسی کا اعلان ڈنکے کی چوٹ کیا ہے۔

اسی سزا و جزا کے دستور نے اس زمین پر بسنے والے انسانوں کو رہن سہن کے طریقے بتلائے فنا سے بقا کی طرف کا راستہ دکھایا۔ قوموں کے عروج و زوال کے معائب و محاسن بیان کئے اور امتوں کو سیدھی راہ پر ڈال کر صدیوں تک کے لیے آرام و سکون مقدر کر دیا۔ پیغمبروں نے جو ہمیں اصول حیات دیئے وہ سبھی ایسے تھے جن سے خدا خوش اور مخلوق مطمئن رہتی تھی۔

رسول آخر سے پہلے بھی انبیاء کو اس محکمہ قدرت اور دفتر کبریٰ کا علم ان کی شفاف نیت، بے غبار بصیرت، انتہائے غور و فکر اور تدبر کے منارہ بلند سے ملا تھا اور زمین ہی سے نہیں انہوں نے تو ستاروں

لیئے کوئی اصول وضع نہیں کر سکی۔ وہ جس قدر تجربات کرتے جاتے ہیں اسی قدر اس مرکز کی تلاش شدید ہوتی چلی جاتی ہے اور پتہ نہیں لگتا کہ اس کائنات کا منبع کہاں ہے؟ کیا ہے؟ اور اس کا صانع کون ہے۔

صفائی اور شجر کاری کی طرح اب تک کوئی خوش اخلاقی کا ہفتہ یا روحانی بلندی کا جشن نہیں منایا گیا۔

البتہ یہ مشاہدہ ہے کہ آزادی کا ہفتہ منانے اور جشن نوروز کے بعد بھی حکام کے دلوں سے افسرانہ خو بو نہیں جاتی جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بد اخلاقی معدوم کرنے کے لیے اخلاق کا حوالہ کوئی کامیاب علاج نہیں اور سوسائٹی کی اصلاح کے لیے اخباروں اور پوسٹروں میں گناہ و جرم کے الفاظ ایسے معنی اور تاثیر نہیں رکھتے جو سوسائٹی کے نظم و ضبط کی تعمیل کے لیے دلوں کو آمادہ کریں۔ حالانکہ جرائم کی سزا کا اعلان بھی ہوتا ہے مگر شاید سوسائٹی کے خسارے یا دنیاوی نقصان کے اندیشے میں وہ ہیبت نہیں جس سے جرائم پیشہ جرم سے دست بردار ہو جائیں۔

روز کا مشاہدہ ہے کہ لائبریریوں میں مطالعہ کرنے والے اساتذہ اور طالبان علم و فن تاکید کے باوصف کتابوں میں سے تصویریں اور حوالے کے اوراق غائب کر دیتے ہیں تاکہ ان کی اوریجنلٹی کا پردہ فاش نہ ہو۔ اسی طرح ریلوے میں قومی نقصان کے پوسٹروں کے باوجود نلکوں سے پیتل کی ٹونٹیاں، کھڑکیوں کے شیشے اور روشنی کے بلب غائب ملتے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قوم کا نقصان اور سوسائٹی کا خسارہ کسی کی نظر میں نہیں۔ سب پر شخصی اور ذاتی مفاد غالب ہے ورنہ یہ حق تو دیکھنے والوں کو بھی پہنچتا ہے کہ قومی نقصان نہ ہونے دیں۔

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اجتماعی زیاں پر ذاتی مفاد کو ترجیح دی جاتی ہے جو جرم بھی ہے گناہ بھی اور ملک و قوم سے غداری بھی اور یہ غداری صرف پبلک تک محدود نہیں بلکہ جس قدر بڑے بڑے منصوبوں کے اعلان ہوتے ہیں۔ ان کے سرمائے کا بڑا حصہ منصوبوں پر لگنے کی بجائے بڑے لوگوں کے حسابات میں جاتا رہا ہے اور منصوبے ناتمام پڑے رہ گئے ہیں۔

پوری قوم حکومت کی نوازشات کے باوصف اس معیار حیات سے محروم ہے جو قومی تعمیر اور ملکی بہبود کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کچھ حکام اس سے غافل بھی نہیں۔ سد باب کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے لیکن اب تک کوئی انفرادی یا اجتماعی کوشش کامیاب نہیں ہوئی یہ تمام خرابیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس بے خدا تہذیب نے انسانیت کو ایسے میلے کی بھیڑ میں پھنسا دیا کہ اسے اپنے سفر کی سمتوں کا بھی علم نہیں رہا۔ اب اگر اس کا کوئی علاج ہے اور کوئی تدبیر اسے غرقابی سے بچا سکتی ہے تو صرف یہ کہ انسانیت اپنے معبود کی طرف پلٹے اور مذہب کے مفاد کو تسلیم کرے۔ اس کے بغیر کسی دوسری بنیاد پر زندگی اور ملک و ملت کی تعمیر ممکن نہیں۔

مادی تعلیمات سے لیس اور فکر و خیال کے دلدادہ لوگ لیاقت کے اعتبار سے ارسطو اور افلاطون کی

شامل کیوں نہ ہو جائیں یہاں تک تو آ ہی جاتے ہیں کہ روحانی اور اخلاقی قدریں بڑی ہی سودمند ہیں۔ لیکن آج کل کی ماڈرن تہذیب میں انہیں برقرار کیسے رکھا جائے جب ہر طرف نئے نئے رجحانات کے سیلاب امڈے چلے آتے ہیں۔

صنعتی ترقی کی زرق برق رفتار کوئی بری بات تو نہیں کیونکہ اس میں خام اشیا، فاضل سرمایہ اور صلاحیتوں کے علاوہ مہارت فن کا بہتر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے صنعتی گنگا جمنی خواب کو خوش گوار بنانے کے لیے یہ بھی سوچنا درکار ہے کہ اس سے معاشرے کی خرابیوں میں تو اضافہ نہیں ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا توڑ کیسا ہے۔ کہیں یہ جسمانی ہم فرم ہماری روحانی تشنگی اور معتقدانہ ضرورتوں میں حرص و ہوس کے دروازوں کو فراخ تو نہیں کر دے گی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ سائنسی علوم سے خارجی ترقی اور جسمانی نشوونما کے علاوہ معاشرے میں تزئین و تکلف تو آ جاتا ہے لیکن یہ فنی مہارت اور سرمایہ کی فیکٹری میں ڈھلے ہوئے قواعد و ضوابط تمدنی، تہذیبی سیاسی اور عمرانی خلا میں سودمند ثابت نہیں ہوتے۔ اس بے خدا تہذیب میں ترقی کی اسکیم کا شخصی نظریہ اس کے عمرانی مطالبات سے ٹکراتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی زندگی کا مقصد و منہاج ایک خوشحال معاشرے کی تعمیر ہوتا ہے لیکن یہ تصور صرف مادیات تنظیم و ترتیب اور اثرات و خواص تک رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ ان کی خواہشات کے معیار پر پورا نہیں اترتا اور کیسے اتر سکتا ہے جب کہ آرزو اور خواہش ہی ناکام اور ادھوری ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب تک مادی تجربات اور ان کی فلسفیانہ قلابازیاں زندگی کو حقیقی مقصد میں کامیاب نہیں کر سکیں۔

مادی خوشی، ترقی اور کامیابی کے یہ معنی ہرگز نہیں نکلتے کہ ہر شخص اپنی جسمانی اور روحانی خواہشات ساتھیوں کو خوش رکھتے ہوئے پوری کر لیتا ہے۔ کہیں نہ کہیں مفاد ضرور ٹکرا جاتا ہے۔ کیونکہ فرد کی خوشی اور کامرانی ہرگز اجتماع کی مسرت و کامرانی کا لقب نہیں پا سکتی۔ وہاں تو دوسروں کا سکون و اطمینان درہم برہم کر کے اپنا اپنا سکون ڈھونڈھا جاتا ہے۔

چنانچہ آئے دن حق تلفی، بددیانتی، غبن، چوری، رشوت اور کشت و خون کے ہنگامے گرم رہتے ہیں اور اس طرح ہر مذہب کا باغی دین کا منکر اور خدا ناآشنا انسان دوسروں کو بھی اپنے جیسے حالات میں مبتلا کر دیتا ہے اور لوگ اسے بحران کا نام دے دیتے ہیں۔

مادہ پرستوں کی شادیاں

شادی ہمارے معاشرہ کا فریضہ بھی ہے اور ضرورت بھی۔ مادہ پرست جوڑے محبت کی شادیاں کرکے جب ایک دوسرے کے جسم کی یکسانیت اور بے پردگی سے اکتا جاتے ہیں تو اپنے اپنے جنسی چٹورپن کے لیے نئے نئے اجسام اور نئے نئے چہروں کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ گھروں میں محبتوں کی جگہ نفرتوں کے پردے گرنے لگتے ہیں۔ یہی پردے جب دبیز اور گہرے ہو جاتے ہیں تو شوہر اور بیوی ایک دوسرے سے بیزار ہو کر علیحدگی میں عافیت خیال کرنے لگتے ہیں اور ان کی زندگی کے روزمرہ کا ہر لمحہ طلاق کا کا غذ ڈھونڈنے میں صرف ہونے لگتا ہے۔ جب طلاق عمل میں آ جاتی ہے تو ان کے بچوں کے لیے سماج میں جگہ نہیں نکلتی۔ ماحول سے بیزاری ان کے آزادی کے خیال کو بھی کھا جاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ مجرموں کی فہرست میں آ جاتے ہیں۔

ان میں کچھ جوڑے ایسے بھی ہوتے ہیں جو طلاق کو توہین سمجھتے ہیں اور گھر میں ایک خاموش قیامت برداشت کرتے کرتے مختلف امراض سہہ بیٹھتے ہیں۔ جرائم پیشہ نوجوان ایسے ہی ماں باپ کی نشانیاں ہوتے ہیں جو بزرگوں اور خاندانوں پر بھی داغ لگاتے ہیں۔ مگر پوچھیے تو خود کو خوش و خرم بتاتے ہیں اور یہ ہٹ دھرمی احساس ندامت سے پیدا ہوتی ہے۔

ایسے لوگ خود بھی اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی کر دیتے ہیں مگر جو حقیقی شادیاں ہوتی ہیں، ان میں اس قسم کے نقص نہیں پائے جاتے کیونکہ حقیقی چیز ہی زندگی کے لیے اہم پیوند ہوتی ہے۔ اصل میں جو باتیں ہمیں تہذیب و تمدن کو برقرار رکھنے کے لیے درکار ہیں ان کا ذخیرہ تو صرف مذہب اسلام میں ہے۔

وہی ایک مذہب حقیقی قانون ساز کی طرف ہماری راہنمائی ہی نہیں کرتا بلکہ سمت کا تعین کر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور پھر چادروں سے قانون کی موزوں و مناسب نیو رکھتا ہے۔ اور وہ صرف تہذیبی اور عمرانی الجھنوں کے سلجھانے ہی میں ممد و معاون ثابت نہیں ہوتا بلکہ ہر شعبہ حیات میں صحیح بنیاد فراہم کرتا اور مشکلات میں آسانیوں کے راستے کا ڈول ڈالتا ہے وہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان ترک و طلب کے جھمیلوں کو مساوات اور عدل سے نمٹانے کا شعور دیتا ہے جو جہاں بانی کی اصل، حقیقی اور بنیادی شکل ہے۔

مذہب سے انسان میں ایسا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے جو خرابی و برائی کے علاوہ غلط روی و غلط فہمی کے انسداد کو ایک مقدس کارنامہ قرار دے کر انسانوں کو جدوجہد کے لیے متحد و متفق کر دیتا ہے اور اس کی روشنی میں موت جیسی بھیانک شے خوبصورت اور خوبرو نظر آنے لگتی ہے۔ اس تبلیغی رخ اور جذبے کی پشت پناہی اسی ایک خالق کائنات کا تصور کرتا ہے جو صالح انسانوں کے ہر گوشہ فکر کی بلندی پر نظر آتا ہے۔

ہر مذہب کی شریعت انسانی ضمیر کی تصدیق کا اعلان اور اس کی فہرست عمل کی قبولیت کا قبالہ ہوتی ہے لیکن بعض مخ اور ظاہر میں تعلیمات بھی انسانی دل و دماغ میں جگہ پا جاتی ہیں اور جب یہ دل و دماغ، اتفاق یا جستجو کی منزلیں مار کر متحد ہو جاتے ہیں تو یہی خوش پوش تعلیمات رسم و رواج کی طرح چل پڑتی ہیں اور ابھری ہوئی سطح کے متورم اذہان

کو اپنا مسکن بنالیتی ہیں۔ اور پھر نیک اور جاہل لوگوں کا راستہ کھوٹا کرتی رہتی ہیں۔ مگر صاحب فکر لوگ اس قسم کے رواں کو اچھا خیال نہیں کرتے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو خود کو نمایاں کرنے اور اپنی پستیوں کو بلندیوں میں بدلنے کے لیے مختلف مذاہب کی اچھی باتوں اور زریں اصولوں کو اپنا کر ایک مسلک بنا لیتے ہیں۔ مقصد تو شاید ان کا بھی رہنمائی ہی ہوتا ہوگا لیکن اس قسم کے انتخابی ذہن رکھنے والوں کا یہ فعل قبیح قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس سے ایک نیا فرقہ وجود میں آنے کا قوی امکان ہوتا ہے اور اس قسم کے جعلی فرقوں کی پوری اور پوچ تعلیمات گہرے عقائد کا نتیجہ نہیں ہوتیں اور ان میں قول و فعل کا تضاد چاند سورج کے فاصلے رکھتا ہے۔

تصوف اور درویشی

صوفیوں اور درویشوں کا کہنا ہے کہ ہر فرد اپنے کل کی طرف اشارہ تو کرتا ہے نام نہیں بتاتا۔ اس گستاخی کا الزام ادبا و محققین پر آتا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ زمین کی ناف سے لے کر سفید سر کے مونگیا قطبین تک انسانی فہم و ادراک نے رسائی کی چھاپ لگا رکھی ہے۔ لیکن سن و سال کے جاننے سے کئی نظریات حلق سے نیچے نہیں اترتے اور آثار و قرائن اسی پر مصر ہیں۔ شاید جد و جہد جاری رکھنے کے لیے آسمانی کتابوں نے بھی اسی پر حرف تصدیق ثبت کی ہے۔

اس کے علاوہ بزرگان دین اور صوفیا کی تمام کوششیں اور کرامتیں اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ سبھی نے کہا ہے کہ ہر جزو کل کی گرفت میں ہے اور جزو کا شعور کل تک پہنچا دیتا ہے۔ یہاں کا کوئی ذرہ بھی فنا نہیں ہوتا۔ ہاں حیثیت بدل لیتا ہے۔

اور یہ عمل ہر لحظہ تغیر پذیر ہے۔ یہ تغیر زینہ ہے۔ فکری کارواں کے حقیقت کائنات تک پہنچنے کا منکران خدا اگر یہ سمجھ جائیں کہ کائنات کے محرک اول کی روح ہم میں موجود ہے تو شاید تسکین کا سورج ان کے تاریک سینوں سے طلوع ہونے لگے اور انہیں یہ اقرار کرنا پڑے کہ روشنی کے کارخانے اور رنگ و نور کی فیکٹریاں انسانی دسترس سے باہر نہیں اور فطرت کے غیر مرئی نقشوں پر مادہ جس طرح کام کرتا ہے اس کا ادراک انسانی ذہن سے باہر کی کوئی بات نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دلیل کو علم سے محکم کرنا درکار ہے اور حجت و برہان کے بغیر حکم لگانا مضبوط بات نہیں۔ کیونکہ مذہب تو دلائل و براہین کی چھلنیوں میں چھن کر ہی دلوں، ذہنوں اور عقائد میں مرتسم ہوتا ہے اس لیے بے علم اور کم علم لوگوں کا دین میں فہم و تمیز کے بغیر ہی یقین کی منزلوں میں سفر آسان ہوتا ہے۔

حجت تو اور بھی راستہ دشوار کر دیتی ہے۔ ویسے تحقیق و تفتیش بری بات نہیں۔ مگر اس میں حقیقی علم سے آراستگی ضروری ہے کہ انسانوں کے سینے تو جواہر اور مختلف قسم کی قیمتی دھاتوں کی کانیں ہیں۔ جو لوگ ایام جاہلیت

ہیں اچھے تھے وہی اسلام میں آکر بھی نمودار ثابت ہوئے۔

آئینۂ احساس

انسان کے بنیادی مطالبے کھانے پہننے اور قیام و سکون تک ہی نہیں اسے تعلیم، جنسی تسکین اور ہسپتال کے علاوہ اور سینکڑوں چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ان ضروریات کے مطالبوں سے آگے بڑھ کر آدمی وقت کی رو کے ساتھ بہنے لگتا ہے۔ مگر جب بھی اسے وقت ملتا ہے اس کے دل میں خود بخود یہ سوال ابھرتے ہیں کہ میں کیا ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ آنے کا مقصد کیا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ مجھے سنبھالنے والا کون ہے؟ یہ چاند ستارے کیا ہیں؟ کیوں ہیں، سورج سے ہمارا رشتہ کیا ہے؟ پہاڑوں کا کیا مصرف ہے؟ آندھیاں کیوں آتی ہیں؟ ہوا جس پر زندگی کا دارومدار ہے اور پانی جس سے ہم پیاس بجھاتے ہیں اتنی بڑی مقدار میں کہاں سے آتا ہے؟ اور یہ گردوپیش کا ماحول انسانی خدمت میں کیوں لگا ہے؟ تمام سوالات زنجیرہ بن کر آتے ہیں۔

بعض صاحب فکر جو کھوج لگاتے ہیں وہ کچھ تو ایجادات و اختراعات کے ہو جاتے ہیں اور کچھ تیز قدم بڑھتے چلے جاتے ہیں وہ اس دنیا کے کام کے نہیں رہتے۔ ان کی حیرت، دیوانگی میں داخل ہو جاتی ہے، لیکن کوئی اس خواہش سے خالی نہیں اور جب تک یہ سوال حل نہیں ہو جاتے کوئی انسان سکون کا سانس نہیں لے سکتا۔

مزدور اور کسان بھی کام سے فراغت پاکر انہی خیالات میں الجھے الجھے پھرتے ہیں۔ کیونکہ انسان کی فطرت میں ایک مالک و معبود کا شعور پیدائشی طور پر ودیعت ملتا ہے اور وہ اس کے لاشعور کا جزو لازم ہے۔ کبھی کبھی یہی تشنگی کسی دوسری مصنوعی یا غیر فطری شے کی طرف بھی چل پڑتی ہے۔ مگر اس میں بھی یہی تڑپ ہوتی ہے کہ کوئی مجھ سے بلند و بالا قوت یا ذات ملے اور میں اپنا سب کچھ اس کے حوالے کردوں۔ کیونکہ یہ سب کچھ حقیقت میں میرا نہیں بلکہ کسی اور ذات والا صفات کا ہے۔

ہر چند کہ آدمی، پہاڑوں، درختوں، پرچموں، مقبروں، مجسموں، پیروں، اور فقیروں کے سامنے جھک کر یا نذرانہ پیش کر کے اپنے جذبہ عبودیت کی تسکین کرتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبودیت کے نذرانے کا مستحق نہیں۔ یہ موجودہ صورت تو شرک ہے۔

شرک کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اصل جگہ سے دوسری جگہ رکھ دینا۔ جب کوئی دکھیا اور مجبور و معذور انسان اپنے نفسیاتی خلا کو پاٹنے کے لیے غیر اللہ کی طرف رجوع ہوتا یا اسے مطمح نظر قرار دیتا ہے تو وہ اپنے اصل مقام سے ہٹ جاتا ہے۔

یعنی تلچھٹ ہو کے رہ جاتا ہے۔ ردی اور تلچھٹ کی تعریف بھی یہی ہے کہ جو چیز اپنے مقام پر نہ رہے وہ تلچھٹ ردی اور بیکار ہے۔

خدا کے بجائے انسان جن تصورات اور معتقدات کو جگہ دیتا ہے، اسے اس میں خدائی صفات تسلیم کرنا پڑتی ہیں۔ جو درست نہیں۔ اسی لیے شرک ہے۔ ان تمام باتوں کو دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدائی کمی خدا کے تصور کے بغیر پھل پھول نہیں سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ انسانی دنیا کے جنگل میں ہزاروں بے خدا انسان خدا اور دین کو بے معنی کہہ کر اپنے انتخاب کردہ اور خود ساختہ و پرداختہ خداؤں کے سامنے اظہار عبودیت کرکے خود کو جھوٹی تسکین دے لیتے ہیں۔ کیونکہ خدا کا تصور انسانی ضرورت ہے۔ اگر اصل اللہ نہیں تو نقلی اللہ سے اپنی اندرونی طلب پوری کرتے ہیں مگر اس فریب کی تکرار انہیں عمر بھر اس چکر سے باہر نہیں آنے دیتی اور تذبذب میں رکھتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غیر اللہ اور مادیاتی علوم اور ایجادات کا جنون بھی خدا کے تصور کی فرصت نہیں دیتا۔ اور صاحبان ایجاد کو اس سے ذرا تسکین بھی رہتی ہے۔ مگر اس طرح جیسے کوئی بے اولاد کسی کو متبنیٰ بنا کر اولاد کا خلا پورا کرے۔ اصل میں اسے حقیقی سکون نہیں ملتا یا جیسے ایک غیر شاعر نثری فکروں کو نثری شاعری کا نام دے کر شہرت کا جھوٹا خواب دیکھتا ہے۔ ایک ملحد کتنا بھی کامیاب کیوں نہ ہو جائے، ایک وقت اس پر ایسا آتا ہے جب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ حقیقت تو اس کے سوا کچھ اور ہے۔ جو مجھے میسر نہیں اور وہی حقیقی مرکز ہے تسکین کا۔

تہذیبِ نو

نئی تہذیب کے لوگ یوں تو خوش و خرم نظر آتے ہیں لیکن ان کی مسرت حقیقی مسرت نہیں ہوتی۔ ان کی بنیادی علالت کے وجوہ نفسیات کے ماہرین کی نظر میں بے اطمینانی، شک، حسد، احساس جرم، اندیشہ، خوف، غصہ، مایوسی، تذبذب، خود غرضی اور اکتاہٹ جیسی الجھنیں ہیں۔ اگر ٹھنڈے دل سے ان الجھنوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ سب بے خدا زندگی کے نتیجے ہیں۔

اقرارِ خداوندی

خدا پر ایمان رکھنے سے انسان کے جسم میں وہ غدود مضبوط ہوتے ہیں جن سے اعتماد پیدا ہوتا ہے اور جرأت عمل کو مدد ملتی ہے۔ خدا کا اقرار ایسا محرک دیتا ہے جو تمام اخلاقی محاسن کی بنیاد ہے۔ خدا کے تصور سے عقائد میں روامیت آتی ہے۔ اور روامیت کی بدولت عزائم اور عزائم سے عمل کے خشک چشمے جاری ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ خدا خود ایک بیکراں اور لازوال قوت محرکہ اور سرچشمہ شعور و ادراک ہے جسے نہ تو کوئی پیمانہ ناپ تول سکتا ہے اور نہ کوئی عقل اس کی تحلیل کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

حاکمیت

حاکم اپنے اردگرد ایسے صالح اور صاحب یقین عمال چنتا ہے جن کی آواز سے سنگدل گداز آشنا ہو جائیں اور اپنی طبائع عبادت شوق اور سوز محبت اور خلوص سے نرم اور روشن ہو جائیں۔ درندہ خو اور وحشی صفت انسان اس قدر حلیم اور بردبار ہو جائیں کہ ان کا اخلاقی حربہ خونخوار دشمنوں کو جانثاری پر مجبور کر دے۔ حیوانیت میں لت پت انسان ان کی تعلیمات کے فیوض و برکات سے انسان دوست اور خدا ترس ہو جائیں اور ملک گیری و کشورکشائی کا جذبہ عیش کوشی کی بجائے اتباع و اطاعت میں ڈھل جائے، کیونکہ صدیوں کے روایات کو تباہی و بربادی سے بچانا معمولی لوگوں کا کام نہیں اور روایات وہ اصول حیات ہوتے ہیں جو سینکڑوں برس کے تجربات سے چھن کر رائج ہوتے ہیں اور ان پر تنقید کا بوتا کسی میں نہیں ہوتا۔

میرا خاکساری کے زمانے کا تجربہ ہے کہ رہزن، ڈاکو، چور اور قاتل جب تک اپنی ذات کے خول میں ہوتے ہیں، مجرم بھی ہیں گناہ گار بھی، ملزم بھی ہیں اور معاشرے کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بھی۔ لیکن جب یہ اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر ایک ہو جائیں اور ان کی جماعت مجاہدین کی جماعت کا نام پا جائے، اس وقت وہ حکومت سے زیادہ تحفظ و پاسبانی کے فرائض کے امین ہو جاتے ہیں۔

یوں تو اول سے ہی یہاں کی قیادت معاشرہ و زندگی کو سنبھالنے والے افراد پیدا کرنے سے معذور رہی ۔ لیکن وقت نے جو نہی انسان سازی اور سیرت آرائی کے منصب عطا کئے وہ اس قابل نہیں تھے کہ اس اہم فرض کو انجام دیتے ہیں وہ خلوص کی طرف سے دیوالیے۔ ایمان کی طرف سے مایوس، ضمیر کی طرف سے مفلس اور اخلاق کی طرف سے قلاش تھے۔ ان میں سیرت اور شریعت کے مفہوم کو سمجھنے کا رواج نہیں تھا۔ وہ انسانیت کے فضائل سے ناآشنا اور بزرگوں کے احترام سے غافل تھے اور اس انداز و اطوار کے افراد ہرگز صالح معاشرہ اور خدا شناس سوسائٹی ترتیب نہیں دے سکتے اور جب یہ عالم ہو تو امن و سکون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب کہ ان پر کسی وقت بھی حق گوئی اور شرف انسانی سے آگاہی کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ انسان دوست اور خدا ترس معاشرہ تو صرف اخلاق نبوی سے ظہور میں آتا ہے اور اس کے پاس ایسے آلات ہوتے ہیں جو مسکینوں کو شجاع کر دیتے ہیں۔ ان کے سانسوں سے دلوں کی آگ کے شعلے سرخ کلیوں میں بدل جاتے ہیں اور نفس امارہ کی سرکشی حلم و بردباری کا لقب پا جاتی ہے گناہ کا جذبہ عبادت و ریاضت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور دنیا کی قوی ترین جماعتوں کا مقابلہ اس کے لیے کوئی بات نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ لوگ شوق شہادت کو ہر ذوق پر غالب کر دیتے ہیں۔ اور راہبر ہوتے ہوئے بھی رہنمائی سے بے بہرہ نہیں ہوتے۔ کیمیا کا نسخہ بھی ہاتھ آ جائے تو اسے دوسروں تک پہنچانے میں بخل نہیں کرتے۔

وہ دولت کے صحیح مصرف سے آگاہ ہوتے ہیں اور قوت کا صحیح استعمال ان کی علامت بن چلا آتا ہے۔ وہ

مخلوق میں خالق کا راستہ اور عظمت کی تلاش کرتے ہیں اور کائنات سے استفادہ بھی وخیال نہیں کرتے۔ بلکہ اس حصول مفاد کو اپنا حق جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ خدائے قدوس کی ذات سے استفادہ کرتے کے اصول وضوابط جانتے ہیں اور ہر قابل حصول نعمت کو اپنا حق اور حصہ سمجھتے ہیں اور یہ سب ہیں تربیت اسلامی کی برکتیں۔ کیونکہ اخلاق و عدل کے علاوہ فیاضی، سخاوت اور اعلیٰ افکار سب خدائی صفات ہیں۔ کفر و الحاد سے ان کا پیدا ہونا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔

الحاد

الحاد تو خود پروری اور غلط فکری کی ایک صورت ہے جس میں آدمی خود کو خدا کے مقام پر خیال کرنے لگتا ہے۔ اور ملاحدہ کو یہ بات دیر میں معلوم ہوتی ہے کہ ایمان اور عقیدے کے بغیر کوئی تہذیب تباہی سے نہیں بچ سکی۔ الحاد سے ہر قسم کی تنظیم خود بخود بگڑ جاتی ہے اور نفس پر قابو کے امکان ختم ہو جاتے ہیں۔

اس رت میں صرف برائی پھلتی پھولتی، رنگ لاتی اور اپنی تباہ کن خصوصیات کو عام کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج کے زرق برق جھبجھاتے اجسام اندر کے حقیقی سکون اور اطمینان سے محروم ہیں۔ یہ فلک بوس ایوان اور آسمان کا منہ چڑاتی عمارتیں، مایوس کوکھوں، ویران دلوں اور اجڑی ہوئی آنکھوں کے بسیرے ہیں۔ یہ گنگناتے ہوئے برزن و بازار اور جگمگاتے ہوئے شہروں کی دلہنوں کی طرح بنی ہوئی دکانیں دیکھا جائے تو اخلاق کے مقبرے اور تہذیب کے مرگھٹوں کے سوا کچھ نہیں۔ ان پر حکومت کرنے والے بے دین عمال خونریز سازشوں اور بے یقینی کے جنگلوں میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے کرسیوں پر متمکن ہیں اور عوام کو گردن جھکائے احکام مانتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے بھیڑیوں کی حکومت بھیڑیوں کو مذبح کی طرف ہنکا کے لے جا رہی ہو۔

یہ بے دین حکام نااہل بھی ہوتے ہیں اور احساس سے محروم بھی۔ ان کے تعمیری منصوبے جہالت اور خود غرضی کے باعث سود مند نہیں ہوتے۔ کیونکہ تعمیری منصوبوں کے لیے تو فکری بلندی ازبس ضروری ہے۔ حالانکہ وہ اپنی انسان دشمنی اور ایمان فروشی کی قیمت اس قدر وصول کر لیتے ہیں کہ تمام عمر توبہ استغفار میں گزار سکتے ہیں۔ لیکن نہیں۔ ان کی ذہنی الجھنوں کے احاطوں میں صحت مند کھڑکیاں نہیں کھلتیں اور یہ لوگ محسوس بھی نہیں کرتے کہ یہ سب ایمانی کا عذاب صرف اس لیے ہے کہ ہم نے اپنے خالق سے منہ پھیر لیا ہے اور اب عمر بھر شفاف چشموں کے سامنے رہنے کے باوصف پیاسے ہی رہیں گے۔ وہ خود کو اس نعمت سے محروم کر لیتے ہیں جو خدا نے ان کے لیے مہیا کی تھی۔

OO

تراجم

اگستس جرمن زبان سے ترجمہ

ہرمن ہیس ـ ترجمہ: محمد اسحاق بیر

مستاکر سٹریٹ میں ایک نوجوان عورت رہتی تھی جو شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک حادثے کے باعث اپنے شوہر سے محروم ہو چکی تھی اور اب کسمپرسی اور بیچارگی کے عالم میں ایک چھوٹے سے مکان میں بیٹھی اپنے بچے کی ولادت کا انتظار کر رہی تھی جو پیدائش سے پہلے ہی یتیم ہو چکا تھا۔ چونکہ وہ اکیلی تھی اس لیے اس کے خیالات ہمیشہ اس متوقع بچے کی ذات پر ہی مرتکز رہتے اور دنیا کی کوئی ایسی جنس، خوبصورت اور قابلِ رشک شے نہ تھی جو اس نے اپنے بچے کے بارے میں نہ سوچی ہو اور جس کی خواہش اس کے دل میں نہ پیدا ہوئی ہو۔ وہ سمجھتی تھی کہ پتھروں سے بنا ایک ایسا مکان، جس کی دیواریں شیشے کے ٹکڑوں سے مزین ہوں اور اس کے پائیں باغ میں ایک فوارہ بھی لگا ہو اس کے بچے کے لیے کافی ہوگا۔ بچے کے مستقبل کے بارے میں اس کی یہ آرزو تھی کہ وہ بڑا ہو کر کم از کم پروفیسر یا بادشاہ بنے۔

اس غریب الزبتھ کے پڑوس میں ایک بوڑھا رہتا تھا جو اپنے مکان سے صرف کبھی کبھار ہی باہر نکلتا تھا۔ اس کا قد پستہ اور داڑھی سفید تھی۔ وہ ایک پھندنے دار ٹوپی پہنتا اور اس کی سبز رنگ والی چھتری کی سلاخیں پرانے رواج کے مطابق مچھلی کی ہڈی سے بنی ہوئی تھیں۔ بچے اسے دیکھتے ہی ڈر جاتے اور بڑے بوڑھے بھی سوچتے کہ اس شخص کی گوشہ نشینی خالی از علت نہیں ہو سکتی۔ وہ اکثر کئی دنوں تک کسی کو دکھائی نہ پڑتا لیکن گاہے بگاہے شام کے وقت اس کے پست اور بوسیدہ مکان سے کئی نازک سازوں کی ملی جلی اور ہلکی سُروں والی موسیقی سنائی دینے لگتی اور جو بچے ایسے موقعے پر ادھر سے گزرتے وہ گھر جا کر اپنی ماؤں سے پوچھتے: "کیا وہاں پر فرشتے یا جل پریاں گا رہی ہیں؟" مائیں اپنی لاعلمی کی بنا پر انہیں یہ کہہ کر ٹال دیتیں: "نہیں، نہیں! یہ تو کوئی سُروں کی پٹاری معلوم ہوتی ہے"

اس بنسوانگر نامی پستہ قد بوڑھے اور الزبتھ کے درمیان ایک انوکھی قسم کی دوستی کا رشتہ استوار تھا۔ وہ ایک ایک دوسرے سے کبھی نہ بولتے لیکن جب یہ ٹھگنا بوڑھا الزبتھ کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتا تو وہ اسے بڑے تپاک سے سلام کرتا اور الزبتھ بھی بطور شکریہ اپنی گردن ہلا دیتی۔ اسے بھی بوڑھے سے عقیدت تھی اور دونوں اپنے اپنے دل میں یہ سمجھتے تھے کہ اگر خدانخواستہ کبھی کوئی افتاد آن پڑی تو ہمسائے کا مشورہ ضرور آڑے آئے گا۔ جب رات کی تاریکی چھا جاتی اور الزبتھ کھڑکی میں اکیلی بیٹھی اپنے مرحوم شوہر یا ہونے والے بچے کے خیال میں کھوئی ہوتی،

تو منسو انگڑ چپکے سے اپنے دریچے کا ایک پٹ کھول دیتا اور اس کے اندھیرے مکان سے ایک لطیف، نقرئی اور دلچسپ موسیقی کا سوتا اس طرح پھوٹ پڑتا جیسے بادلوں میں شگاف پڑتے ہی چاندنی کا دریا بہہ نکلتا ہے۔

دوسری جانب، بوڑھے کی پچھلی کھڑکی کے نیچے پھولوں کے چند بوٹے تھے جن کی آبیاری کو بوڑھے نے مدت ہوئی ہے سے بھلا رکھا تھا مگر یہ پودے پھر بھی ہمیشہ ہرے بھرے ہی نظر آتے اور ان پر ایک بھی زرد پتہ دکھائی نہ دیتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ الزبتھ ہر روز صبح سویرے ان پودوں کو پانی دیتی اور ان کی دیکھ بھال کرتی رہتی تھی۔

جب خزاں کا موسم آیا اور ایک دن اچانک طوفانِ باد و باراں کا نزول ہوا اور ساری متا کراسٹریٹ پر عجب سناٹا چھا گیا تو الزبتھ نے دفعتہً محسوس کیا کہ اس کی زچگی کا وقت اب آن پہنچا ہے، لیکن وہ اس نازک گھڑی اپنے آپ کو بے یار و مددگار پا کر بہت گھبرائی۔ جب رات ہوئی تو ایک بڑھیا ہاتھ میں لالٹین اٹھائے اس طرف آئی اور اس نے الزبتھ کے گھر میں داخل ہو کر حسبِ ضرورت پانی گرم کیا، کپڑوں کے ٹکڑوں کو نکال کر قرینے سے رکھا اور اس کے علاوہ بھی اس نے وہ سب کچھ کیا جو ایسے موقعے پر کیا جانا چاہیے تھا۔ الزبتھ پہلے تو خاموشی سے سب کچھ دیکھتی رہی لیکن جب بچہ اپنی پیدائش کے بعد نئے نوبلے کپڑوں میں ملبوس ہو کر دنیا کی پہلی نیند کا مزا چکھنے لگا تو الزبتھ نے بڑھیا سے پوچھا "تم کہاں سے آئی ہو؟" بڑھیا نے جواب دیا: "مجھے منسو انگڑ نے بھیجا تھا" اور یہ جواب سنتے ہی تھکی ماندی الزبتھ کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ صبح کے وقت بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے لیے اُبلا ہوا دودھ پہلے ہی تیار رکھا ہے گھر بھی صفائی دھلائی کے بعد شیشے کی طرح چمک رہا ہے اور ننھا بچہ اس کے پہلو میں بھوک کے مارے رو رہا ہے البتہ بڑھیا گھر سے جا چکی تھی۔ الزبتھ نے اپنے بچے کو سینے سے لگایا اور وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ اس کا بچہ بڑا حسین اور توانا ہے لیکن جب اسے اپنے مرحوم شوہر کی یاد آئی جو اپنا بچہ دیکھے بغیر ہی مر چکا تھا، تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنے یتیم بچے کو اپنی چھاتی سے چمٹایا اور پھر بے اختیار ہنسی پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد زچہ اور بچہ پھر سو گئے۔ جب الزبتھ کی آنکھ کھلی تو اس کے لیے دوبارہ دودھ اور شوربا تیار رکھا تھا اور بچے کی پوشاک بھی تبدیل کی جا چکی تھی۔

جب ماں جلد ہی تندرست و توانا ہو کر اپنے بچے کی نگہداشت کے قابل ہو گئی تو اس نے سوچا کہ اب بچے کو گرجے میں بپتسمہ دیا جائے گا مگر اس تقریب پر بچے کا دینی باپ کون بنے گا؟ چنانچہ جب شام کا دھند لکا چھانے لگا اور پڑوسی کے مکان سے موسیقی کی تانیں سنائی دینے لگیں تو الزبتھ نے بوڑھے کے گھر جا کر تاریکی میں اس کے مکان پر دستک دی۔ بوڑھا "اندر آ جاؤ" پکار کر الزبتھ کی پیشوائی کے لیے آگے بڑھا، تو موسیقی یک لخت بند ہو گئی۔ اس کے کمرے کے اندر ایک کتاب کے سامنے ایک چھوٹا سا لیمپ رکھا تھا اور باقی تمام چیزیں بھی عام گھروں کی طرح معمول کے مطابق تھیں۔

"میں یہاں اس لیے آئی ہوں" الزبتھ نے کہا "تاکہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں کیونکہ آپ نے میرے یہاں ایک نیک بخت بڑھیا کو بھیجا تھا جیسے ہی میں کام کرنے اور تھوڑا بہت کمانے کے قابل ہو گئی

سے متعارف ہو چکی تھی اور اس کے خیر خواہوں کی تعداد اس کی توقعات سے کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اس طرح بچے اور اس کی ماں کی زندگی بڑے چین سے گزرنے لگی۔ جب وہ دونوں باہر نکلتے تو آس پاس کے لوگ انہیں بڑے اشتیاق سے سلام کرتے اور دیر تک پیچھے سے دیکھتے رہتے۔

آگستس کے لیے حسین ترین شے اس کے دینی باپ کی صحبت تھی۔ بڑھا اکثر شام کے وقت اسے اپنے گھر بلاتا، جہاں ہر وقت تاریکی چھائی رہتی اور صرف انگیٹھی میں ایک چھوٹا سا انگارہ دہک رہا ہوتا۔ بوڑھا بچے کا ہاتھ پکڑ کر اسے فرش پر بچھی ہوئی جانور کی کھال پر اپنے قریب بٹھاتا اور اس کے بعد وہ دونوں آگ کے انگارے کو دیکھتے اور بوڑھا اسے کوئی لمبی داستان سنانے لگ جاتا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ جب داستان ختم ہونے کو آتی اور آگستس کی آنکھوں میں نیند کا خمار بھر چکا ہوتا تو اچانک اندھیرے میں موسیقی کی ملی جلی اور مدھ بھری تانیں سنائی دینے لگتیں اور وہ دونوں خاموش بیٹھے اس موسیقی کو دیر تک سنتے رہتے۔ اکثر یہ اتفاق بھی ہوتا کہ سارا کمرہ دیکھتے ہی دیکھتے ننھے نورانی فرشتوں سے بھر جاتا اور وہ اپنے چمکیلے سنہری پروں کی مدد سے پرواز کرتے ہوئے چکر کاٹتے اور جوڑوں کی صورت میں ایک دوسرے کے ارد گرد گھومتے ہوئے ایک ایسے حسین رقص کا مظاہرہ کرتے جس سے حسن و مسرت کو ہزاروں چاند لگ جاتے۔ اس سے حسین تر نظارہ آگستس نے اپنی ساری زندگی میں نہ دیکھا تھا، چنانچہ جب وہ بڑا ہو کر اپنے بچپن کے بارے میں سوچتا تو اسے اپنے دینی باپ کا تاریک اور پرسکوت گھر، انگیٹھی کا سرخ انگارہ، موسیقی اور فرشتوں کی روپہلی طلسماتی پروازیں یاد آجاتیں اور اس کا دل اداس ہو کر غمگین ہو جاتا۔

جب آگستس بڑا ہوا تو الزبتھ اکثر اس کی وجہ سے پریشان ہو کر اپنی مراد کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی۔ آگستس گلیوں میں کھیلتا، کودتا پھرتا اور وہ جہاں بھی جاتا، لوگ اس کی خوب آؤ بھگت کرتے۔ اسے اخروٹ، ناشپاتی، کیک اور کھلونوں کے تحفے ملتے۔ لوگ اسے کھلاتے پلاتے اور لاڈ سے اپنے گھٹنوں پر بٹھاتے۔ اسے ہر باغ سے پھول توڑنے کی کھلی چھٹی مل چکی تھی۔ لیکن جب وہ رات گئے گھر لوٹتا اور ماں اس ~~سے سامنے کھانا رکھتی تو آگستس ...~~ ہو کر بڑبڑاتے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ جاتا۔ جب ماں اسے کسی بات پر جھڑکتی یا مارتی پیٹتی تو وہ واویلا مچا کر دہائی دینے لگتا: "ہائے ہر کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن صرف میری اپنی ماں ہی مجھ سے پیار نہیں کرتی۔"

اس طرح بسا اوقات الزبتھ پر پریشانی کی گھڑیاں بھی آتیں اور کبھی کبھی اسے اپنے لڑکے پر طیش بھی آجاتا۔ لیکن جب بعد میں وہ اپنے بچے کو تکیوں کے درمیان سویا ہوا پاتی اور موم بتی کی روشنی میں اس کے دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھتی تو اس کا سارا رنج و ملال کافور ہو جاتا اور وہ بڑی احتیاط سے اپنے بچے کا منہ چومتی تاکہ وہ کہیں بیدار نہ ہو جائے۔ وہ سوچتی اگر آگستس سے ہر کوئی پیار کرتا ہے تو اس کی ذمہ دار خود میں ہوں۔ اکثر افسردہ اور پریشان ہو کر وہ اس نتیجے پر بھی پہنچی کہ اگر میں نے بچے کے لیے دلی مراد نہ مانگی ہوتی تو شاید یہ اس کے حق میں بہتر ہی ہوتا۔

ایک مرتبہ جب وہ اپنے پڑوسی بلسوانگر کی کھڑکی کے پاس مرجھائے ہوئے پتوں کو قینچی سے کاٹ رہی تھی۔ تو اچانک اسے دونوں گھروں کے مشترکہ پائیں باغ سے اپنے لڑکے کی آواز سنائی دی اور اس نے جھک کر اس طرف

دیجیداس کا لڑکا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی پیاری لگ رہی تھیں اور اس کے چہرے پر بھی بانکپن کھیل رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک قدرے بڑی لڑکی کھڑی تھی جو بڑے خوشامدانہ انداز میں اس سے کہہ رہی تھی:

"میں جانتی ہوں کہ تم بہت حسین ہو۔ کیا اب بھی تم مجھے بوسہ دو گے؟"

"میرا جی نہیں چاہتا" یہ کہہ کر آگستس نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون میں ڈال دیئے۔

"مان بھی جاؤ نا۔" لڑکی نے دوبارہ کہا۔ "دیکھو میرے پاس تمہارے لیے ایک تحفہ بھی ہے۔"

"کیسا تحفہ؟" آگستس نے پوچھا۔

"میرے پاس دو بڑے خوبصورت سیب ہیں۔" لڑکی نے شرما کر کہا۔

آگستس نے منہ موڑ کر ناک بھوں چڑھالی۔

"سیب مجھے اچھے نہیں لگتے۔" اس نے حقارت سے کہا اور وہاں سے جانا چاہا لیکن لڑکی نے فوراً اسے مضبوطی سے پکڑ کر بڑی عاجزی سے کہا:

"میرے پاس ایک بڑی خوبصورت انگوٹھی بھی تو ہے۔"

"دکھاؤ۔" آگستس نے کہا۔

لڑکی نے انگوٹھی پیش کی، تو آگستس نے پہلے اسے اچھی طرح سے دیکھا اور پھر اسے لڑکی کی انگلی سے اتار کر اپنی انگلی میں پہن لیا۔ جب اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر روشنی میں انگوٹھی کا جائزہ لیا تو وہ اسے بہت پسند آئی۔

"ٹھیک ہے اب تمہیں بوسہ مل جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے لڑکی کے منہ کو محض سرسری طور پر چوم کر چھوڑ دیا۔

"آؤ! اب ہم مل کر کھیلیں۔" لڑکی نے پُراعتماد ہو کر کہا اور اس کے کاندھے پہ اپنی بانہیں رکھ دیں۔ آگستس لڑکی کو پرے دھکیل کر چلایا:

"خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ کھیلنے کے لیے مجھے اور بھی بہت سی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔"

جب لڑکی روتے ہوئے وہاں سے کھسک گئی تو آگستس کے چہرے پر حقارت اور ناراضگی کھیلنے لگی۔

اس نے انگوٹھی کو اپنی انگلی کے گرد گھما کر دیکھا اور پھر سیٹی بجاتے ہوئے وہاں سے چل دیا۔

اس کی ماں ہاتھ میں قینچی پکڑے مبہوت ہو کر رہ گئی۔ اسے اس بات پر انتہائی صدمہ ہوا کہ اس کے لڑکے نے کتنی سنگدلی اور نفرت سے اس لڑکی کی محبت کو دھتکار دیا ہے۔ وہ پھولوں کے پودوں کو بھول گئی اور حیرت سے سر ہلاتے ہوئے سوچنے لگی: "یہ لڑکا بہت بُرا ہے، یہ لڑکا سنگدل ہے۔"

کچھ دیر کے بعد آگستس گھر آیا تو ماں نے اسے اس بات پر جھڑکنے کی کوشش کی۔ آگستس نے اپنی نیلی آنکھوں سے

ماں کو دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں ندامت یا پشیمانی کا نام و نشان تک نہ تھا وہ گاتے ہوئے ماں کی خوشامد کرنے لگا اور اس سے اس قدر ہنسی مذاق اور لاڈ پیار کیا کہ وہ مجبور ہو کر مسکرا پڑی اور اس نے محسوس کیا کہ بچوں کی ہر بات پر فوراً سنجیدہ ہونا ہرگز مناسب نہیں۔

اس کے باوجود اگستس کو اپنی شرارتوں پر کبھی کبھی سزا بھی ملتی۔ وہ صرف اپنے دینی باپ سے ڈرتا تھا اور جب وہ کسی دن شام کے وقت اس کے گھر جاتا تو بوڑھا اسے مخاطب کر کے کہتا:

"آج انگیٹھی میں آگ نہیں جلے گی کیونکہ فرشتے تمہاری شرارتوں پر سخت ناراض ہیں۔" یہ سن کر اگستس چپ چاپ اپنے گھر آ جاتا اور بستر پر لیٹ کر خوب روتا اور اس کے بعد کئی دنوں تک اپنے آپ کو ایک اچھا لڑکا ثابت کرنے کی کوشش میں کرتا۔

اب انگیٹھی میں کبھی کبھار ہی آگ جلتی۔ اگستس کے آنسو اور اس کا لاڈ پیار بوڑھے کے دل کو رام نہ کر سکے جب وہ بارہ سال کا ہوا تو ننھے فرشتوں کی پرواز کا نظارہ اس کے لیے ایک بہت پرانا خواب بن چکا تھا۔ اگر کبھی کسی رات وہ خواب میں اس نظارے کو دیکھتا تو دوسرے دن اس کی شرارتیں پہلے سے دگنی ہو جاتیں اور وہ اپنے دوستوں کو ہمراہ لیے سارا دن دھما چوکڑی مچائے رکھتا۔

لوگوں سے اپنے بچے کی تعریفیں سن سن کر اب الزبتھ کی طبیعت اکتا چکی تھی۔ بے شک اس کا لڑکا بڑا حسین اور پیارا تھا مگر اس کی وجہ سے الزبتھ کو کئی پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔

ایک دن اگستس کے استاد نے آ کر الزبتھ سے کہا کہ ایک شخص اس کے بچے کو حصول تعلیم کے لیے باہر بھیجنا چاہتا ہے۔ چنانچہ الزبتھ نے اس بارے میں بوڑھے سے مشورہ کیا اور اس کے فوراً بعد موسم بہار کی ایک شام کو کہیں سے ایک بگھی آئی اور اگستس نئے کپڑوں میں ملبوس ہو کر اس میں بیٹھ گیا۔ اس نے ماں، دینی باپ اور پڑوسیوں کو الوداع کہا! اب وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر جا رہا تھا۔ ماں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے بالوں میں کنگھی پھیر کر مانگ نکالی اور اس کی بلائیں لی۔ بالآخر گھوڑے حرکت میں آئے اور اگستس پردیس چلا گیا۔

کئی سالوں کے بعد اسے ایک بار گھر آنا پڑا۔ وہ اب ایک باقاعدہ طالب علم بن چکا تھا اس نے سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی اور اس کی مونچھیں بھی نکل آئی تھیں۔ اس اچانک آمد کا باعث یہ تھا کہ اس کے دینی باپ نے اسے بذریعہ تار یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری ماں سخت بیمار ہے اور اب اس کے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ وہ شام کے وقت اپنے گھر پہنچا تو ہمسایوں نے بڑے اشتیاق سے اسے بگھی سے نیچے اترتا دیکھا۔ اس کے پیچھے کوچوان بھی ایک سوٹ کیس اٹھائے گھر میں داخل ہوا۔ اس پست اور بوسیدہ مکان میں اس کی ماں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ جب خوبصورت بیٹے نے سفید سرہانے پر اپنی ماں کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا تو ماں نے بھی خاموش نگاہوں سے اسے خوش آمدید کہی۔ اگستس نے روتے ہوئے

اپنا سر ماں کے بستر پر رکھ کر اس کے سفید ہاتھوں کو چوما اور ساری رات گھٹنوں کے بل وہیں بیٹھا رہا؛ حتیٰ کہ ماں کے ہاتھ ٹھنڈے اور آنکھیں بے نور ہو گئیں۔

جب الزبتھ کو دفنایا جا چکا تو دینی باپ سیبو گرگنتی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے گیا۔ آگستس کو بوڑھے کا گھر پہلے سے بھی پیچا اور تاریک نظر آیا۔ دونوں کافی دیر تک اکٹھے بیٹھے رہے لیکن جب کمرے کی سیاہی روشنی مانند پڑنے لگی تو بوڑھے نے اپنی نرم و نازک انگلیوں کو اپنی سفید داڑھی پر پھیرتے ہوئے کہا: "اب میں انگیٹھی میں آگ جلاؤں گا تاکہ ہمیں لیمپ جلانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ صبح تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اب تمہاری ماں مر چکی ہے اور مجھے امید نہیں کہ تم دوبارہ یہاں آؤ گے۔" اس کے بعد بوڑھے نے انگیٹھی میں آگ جلائی اور کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ آگستس بھی اپنی کرسی وہیں لے آیا اور وہ دونوں دیر تک جلتی ہوئی لکڑی کو دیکھتے رہے۔ جب چنگاریاں کم سے کم تر ہونے لگیں تو بوڑھے نے آہستہ سے کہا: "آگستس! خدا تمہیں خوش رکھے، میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ تمہاری ماں واقعی بڑی نیک عورت تھی اور جو کچھ اس نے تمہارے لیے کیا اس کا اندازہ لگانا تمہارے لیے ممکن نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں ایک بار پھر موسیقی سناؤں اور پاکیزہ فرشتے بھی دکھاؤں، لیکن تم تو خوب جانتے ہو کہ اب یہ میرے بس کی بات نہیں رہی، مگر تم ان فرشتوں کو ہرگز نہ بھولنا اور یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو کہ فرشتے اب بھی گاتے ہیں اور اگر کبھی تم نے اپنے دل میں یاس و حسرت محسوس کی اور تمہیں فرشتوں کی یاد نے ستایا تو ممکن ہے کہ تمہیں ان فرشتوں کے گیت سننے کا دوبارہ موقع مل جائے۔ میرے نوجوان دوست! اب مجھ سے ہاتھ ملاؤ! کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور مجھے نیند کی اشد ضرورت ہے۔" آگستس نے بوڑھے سے مصافحہ کیا اور کچھ کہے بغیر غمزدہ حالت میں اپنے اجڑے ہوئے گھر میں آ گیا اور اپنے وطن میں آخری رات گزارنے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا۔ آنکھ لگنے سے ذرا پہلے اس نے محسوس کیا کہ کسی دور دراز مقام پر اس کی بچپن والی موسیقی کی تانیں گونج رہی ہیں۔

آگستس بہت جلد اپنے دینی باپ اور اس کے ننھے فرشتوں کو بھول گیا۔ اس کے چاروں طرف امیرانہ زندگی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور وہ اس سمندر کی لہروں پر سوار ہو کر سفر کر رہا تھا۔ کسی دوسرے نوجوان کی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ اس کی طرح معروف بازاروں میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے گزرے، دیکھنے والی لڑکیوں کو نادیدہ اور شرارت بھرے انداز میں سلام کرے۔ کوئی اور اس کی طرح سبک اور دل موہ لینے والے انداز میں رقص نہ کر سکتا تھا۔ کسی کو اس کی طرح چابکدستی اور مہارت سے بگھی کے گھوڑوں کو ہنکانے کا سلیقہ نہ آتا تھا۔ کوئی بھی اس کی طرح گرمیوں کی راتوں میں اتنی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے محفلِ مے نوشی برپا نہ کر سکتا تھا۔ اب وہ ایک امیر کبیر بیوہ کا منظورِ نظر تھا جو اسے روپے پیسے، پوشاک، گھوڑے اور ہر قسم کی ضروری اشیا مہیا کرتی تھی۔ وہ جو کچھ چاہتا اسے فوراً مل جاتا۔ اپنی داشتہ کے ساتھ وہ کبھی پیرس اور کبھی روم کی سیر کرتا اور رات اپنی محبوبہ کے ریشمی بستر پر گزار دیتا۔ لیکن آگستس کی حقیقی معشوقہ ایک معزز شہری کی نازک اندام اور گوری چٹی لڑکی تھی اور وہ رات

کے وقت اپنی جان پر کھیل کر اس لڑکی کو ملنے کے لیے اس کے آبائی باغ میں جاتا تھا۔ جب گستس سفر پر ہوتا تو یہ لڑکی اسے بڑے لمبے محبت نامے لکھتی۔

ایک بار وہ اپنے سفر سے واپس نہ لوٹا کیونکہ پیرس میں اسے چند اچھے دوست مل گئے تھے اور متمول بیوہ سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ تعلیم کو وہ مدت سے خیرباد کہہ چکا تھا۔ اب اس کا سارا وقت دور دراز ملکوں میں گزرتا اور اس کی زندگی کا ٹھاٹھ امیرانہ تھا۔ اس نے گھوڑے اور کتے پال رکھے تھے۔ عورتوں کی بھی اسے کوئی کمی نہ تھی۔ جب وہ جوا کھیلتا، تو سونے کی سلیں داؤ پر لگاتا۔ لوگ اس کے پیچھے پیچھے پھرتے، جو کوئی اسے ایک بار دیکھ لیتا، پھر ہمیشہ کے لیے اسی کا ہو جاتا۔ لوگوں کو اس کی خدمت گزاری کا بڑا اشتیاق اور ارمان تھا۔ گستس بادلِ نخواستہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتا بالکل اسی طرح جیسے اس نے ایک بار اپنے لڑکپن میں ایک لڑکی کی انگوٹھی کو قبول کیا تھا۔ اس کی ماں کی دلی مراد کا طلسم اس کی آنکھوں اور ہونٹوں میں پنہاں تھا۔ عورتیں پروانوں کی طرح اس کا طواف کرتیں۔ دوست دل و جان سے اس پر نثار تھے لیکن کسی کو ... حتیٰ کہ خود گستس کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا دل اب اجڑ چکا ہے اور اس میں حرص اور طمع کے اُلّو بول رہے ہیں اس کی روح مضمحل اور دکھیاری ہو چکی تھی۔ وہ کبھی کبھی محبت کی بہتات سے تنگ آ کر کسی دوسرے شہر چلا جاتا، مگر وہاں بھی وہ انسانوں کو سادہ لوح اور احمق ہی پاتا۔ محبت، جو سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی، اب اس کی آنکھوں میں اپنی وقعت کھو بیٹھی تھی۔ وہ عورتوں اور مردوں سے بیزار ہو چکا تھا؛

کیونکہ ان میں عزتِ نفس اور خودداری کا فقدان تھا۔ وہ سارا دن کتوں سے کھیل کر گزار دیتا یا پھر کبھو شکار کھیلنے کے لیے پہاڑوں کی طرف نکل جاتا۔ جب وہ گھات لگا کر کسی ہرن کو بندوق کی گولی سے گھائل کرتا تو وہ اپنے دل میں کسی عورت کو مغلوب کرنے سے کہیں زیادہ فرحت محسوس کرتا۔

ایک بحری سفر کے دوران اس کی ملاقات ایک سفیر کی نوجوان بیوی سے ہوئی جو بڑی نازک اندام اور تنک مزاج تھی اور اس کا تعلق شمالی علاقے کے ایک عالی نسب خاندان سے تھا۔ یہ خاموش طبع اور خوددار عورت جب خوبصورت عورتوں اور خوبرو مردوں کے جھرمٹ میں کھڑی ہوتی تو اس کا حسن سب سے نرالا نظر آتا اور یوں دکھائی دیتا کہ اس کے حسن کا کوئی جواب نہیں۔ جب گستس کی پہلی نگاہ اس عورت پر پڑی اور اس عورت نے بھی اسے تجاہلِ عارفانہ سے ایک بار دیکھا تو گستس کو یوں لگا جیسے اسے اپنی زندگی میں پہلی بار یہ معلوم ہوا ہے کہ محبت کسی چیز کا نام ہے؛ چنانچہ اس نے اس عورت پر ڈورے ڈالنے کا پختہ عزم کر لیا۔ ہر وقت اسی کی قربت میں رہتا اور کبھی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوتا۔ وہ خود بھی عورتوں اور مردوں سے ہر وقت گھرا رہتا کیونکہ اس کے مداح ہر وقت اس کی قربت کے متلاشی رہتے اور اس جھرمٹ میں گستس اور اس کی محبوبہ یوں لگتے جیسے ایک شہزادے کے ساتھ اس کی شہزادی کھڑی ہو۔ اس اجنبی عورت کا شوہر بھی گستس کا مشتاق بن گیا اور وہ اس کی ناز برداری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا۔

آگسٹس کو ابھی تک اس حسینہ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ ایک بندرگاہ پر جب سیاح شہر دیکھنے اور زمین پر چہل قدمی کے لیے جہاز سے نیچے اترے تو آگسٹس اور اس کی محبوبہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک بازار کے چوک میں جہاں بڑی گہما گہمی تھی، آگسٹس نے اپنی محبوبہ کو باتوں میں لگا کر دوسرے سیاحوں سے جدا کر لیا۔ اس چوراہے پر کئی بازار آکر ختم ہوتے تھے۔ جب حسینہ نے دیکھا کہ دوسرے سیاح اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور وہ آگسٹس کے ساتھ تنہا رہ گئی ہے تو وہ شرما سی گئی۔ آگسٹس نے اسے شوخ نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا! "آؤ ہم کہیں بھاگ جائیں" یہ سنتے ہی حسینہ کا چہرہ فق ہو گیا اور اس کی آنکھیں شرم کے مارے زمین میں گڑ گئیں "آخر یہ کہاں کی شرافت ہے" اس نے دھیمی آواز میں کہا "جو کچھ تم نے ابھی ابھی کہا ہے میں اسے بھول جانا چاہتی ہوں" آگسٹس نے بلند آواز میں کہا "شرافت سے میرا کوئی سروکار نہیں۔ میں تو محض ایک عاشق ہوں اور عاشق اپنی محبوبہ کے سوا کسی اور چیز کو نہیں جانتا۔ اس کے دل میں اپنی معشوقہ کے وصل کے سوا کوئی دوسرا خیال نہیں ہوتا۔ اے نازنیں! تو میرے ساتھ چل تاکہ ہم زندگی کے لطف سے محظوظ ہو سکیں" عورت نے پہلے اپنی چمکیلی آنکھوں سے آگسٹس کو گھورا اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولی "تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتی اس لیے میں مانتی ہوں کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو اور کئی بار میرے دل میں یہ خیال بھی گزرا ہے کہ کاش! میں تمہاری بیوی ہوتی کیونکہ تم ہی وہ پہلے مرد ہو جس سے مجھے محبت ہو گئی ہے، لیکن کیا محبت اس حد تک گمراہ ہو سکتی ہے؟ میں نے کبھی خواب و خیال میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ میں ایک ایسے مرد سے محبت کر سکتی ہوں جو پاکیزہ اور نیک انسان نہ ہو؟ لہٰذا میں اپنے شوہر کی رفاقت کو ہزار بار ترجیح دوں گی۔ بے شک مجھے اس سے دلی لگاؤ نہیں۔ مگر وہ ایک شریف النفس اور عالی منصب انسان ہے لیکن تم میں مجھے ایسی کوئی بھی خوبی نظر نہیں آتی۔ بس اب کچھ اور کہنے کی جسارت نہ کرو اور مجھے فوراً جہاز تک پہنچا دو ورنہ میں تمہاری بے حیائی کے باعث شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر لوں گی۔"

آگسٹس نے لاکھ منت سماجت کی۔ اپنے کیے پر دانت پیسے مگر حسینہ منہ موڑ کر وہاں سے چل پڑی اور اگر آگسٹس چپ چاپ اس کے ساتھ نہ چلتا تو اکیلی ہی جہاز پر پہنچ جاتی۔ بندرگاہ پر آتے ہی آگسٹس نے اپنا سارا سامان جہاز سے اتروا لیا اور کسی سے ملے بغیر ہی وہاں سے غائب ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد آگسٹس کی قسمت کا زوال شروع ہو گیا۔ وہ عصمت اور پاکدامنی سے متنفر ہو کر اسے اپنے پاؤں تلے روندنے لگا۔ وہ پاکباز عورتوں کو اپنی کشش کی شعبدہ بازی سے گمراہ کر کے بڑی فرحت محسوس کرتا۔ وہ بھولے بھالے انسانوں کو جو بلا سوچے سمجھے اس پر لٹو ہو جاتے، لوٹ کر حقارت سے ٹھکرا دیتا۔ وہ عورتوں اور دوشیزاؤں کا مال ہضم کر کے انہیں کنگال بنا دیتا اور پھر طوطے کی طرح ان سے آنکھیں پھیر لیتا۔ وہ ہمیشہ عالی نسب خاندانوں کے نوجوانوں کی تلاش میں رہتا تاکہ وہ انہیں گمراہ کر کے تباہ و برباد کر سکے۔

کوئی عیش نہ تھا جسے پاکر اس نے انتہا تک نہ پہنچایا ہو۔ کوئی بدکاری نہ تھی جو اس نے جی بھر کے نہ کی ہو۔ اس کا دل صحیح مسرت سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اور انسانوں کی محبت، جو ہر جگہ اس کے قدم چومتی، اب اس کے دل کے لیے کشش نہ رکھتی تھی۔

وہ سمندر کے کنارے ایک خوبصورت بنگلے میں غم و اندوہ سے لبریز زندگی بسر کرنے لگا۔ عورتوں پر ستم ڈھانا اور دوستوں کو، جو بڑے اشتیاق سے اسے ملنے آتے، اپنی بدمزاجی اور ستم ظریفی کا تختۂ مشق بنانا اب اس کا روزمرہ کا دستور بن چکا تھا۔ اسے انسانوں کی تذلیل اور تحقیر میں بڑا لطف آتا تھا۔ اس کا دل محبت کی فراوانی سے بالکل اکتا گیا تھا کیونکہ یہ محبت اسے بن بلائے، بن مانگے اور بے مشقت مل جاتی تھی۔ وہ اپنی برباد زندگی کو ایک حقیر شے پاکر اس سے بھی دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ کچھ دیر کے لیے فاقہ کشی بھی کرتا تاکہ وہ دل میں کوئی صحت مند خواہش محسوس کرکے اسے حاصل کرنے کی کوشش کر سکے۔

اس نے اپنے دوستوں میں یہ افواہ پھیلا دی کہ وہ سخت بیمار ہے اور اسے آرام اور تنہائی کی اشد ضرورت ہے۔ دوست اسے خط لکھتے مگر وہ انہیں پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کرتا۔ لوگ پریشان ہو کر نوکروں سے اس کی خیریت پوچھتے رہتے مگر وہ خود سمندر کے سامنے والے بڑے کمرے میں تنہا بیٹھا غم و اندوہ میں ڈوبا رہتا۔ اس کی زندگی کھوکھلی اور اجاڑ ہو چکی تھی۔ وہ کھارے سمندر کی موجوں کی طرح بے فیض اور بے مصرف ہو چکی تھی جب وہ کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اپنے نفس کا محاسبہ کرتا تو اس کی صورت پر مردنی سی چھا جاتی۔ سفید بھری بگلے ساحلی ہواؤں کے دوش پر اڑتے ہوئے اس کے سامنے سے گزرتے تو وہ حیرت بھری آنکھوں سے انہیں دیر تک دیکھتا رہتا۔ اس کی آنکھیں مسرت اور مروت سے ناآشنا ہو چکی تھیں جب وہ کسی ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی بجاتا تو اس کے ہونٹوں پر ایک منحوس اور بے مروت مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔

اس نے اپنے دوستوں کو ایک خاص مقصد کے لیے ایک جشن میں شرکت کی دعوت دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب اس کے دوست اس موقع پر آئیں گے تو میرے ویران گھر اور میری لاش کو دیکھ کر خائف اور کھسیانے ہو جائیں گے وہ اس دعوت سے پہلے زہر پی کر مر جانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ چنانچہ مقررہ جشن سے ایک دن پہلے اس نے شام کے وقت اپنے سارے ملازموں کو اپنے گھر سے باہر بھیج دیا اور جب سارے کمروں میں ہو کا عالم ہو گیا تو اس نے اپنی خوابگاہ میں جا کر قرمزی شراب سے بھرے گلاس میں ایک زود اثر زہر ملایا اور گلاس کو اپنے ہونٹوں سے لگایا ہی تھا۔ وہ شراب پینے ہی والا تھا کہ کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور جب اس نے اندر سے کوئی آواز نہ دی تو دروازہ خود بخود کھل گیا اور ایک پستہ قد بوڑھا اندر داخل ہوا۔ اس نے اگستس کے قریب آکر اس کے ہاتھ سے شراب سے بھرا گلاس چھین لیا اور اس کے بعد اپنی مانوس آواز میں بولا:

"اگستس تمہیں یہ شام مبارک ہو، کہو زندگی کیسے گزر رہی ہے؟" اگستس کھسیانا ہو کر ظریفانہ انداز میں مسکرا کر بولا "مسٹر فنسوا شرا کیا تم ابھی تک زندہ ہو؟ تمہیں دیکھے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا ہے مگر تم اب بھی پہلے سے

زیادہ بوڑھے نظر نہیں آ رہے، دیکھو! میں بہت تھکا ہوا ہوں اور نیند آور شراب کا ایک گلاس پینا چاہتا ہوں "
یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ تم خواب آور شراب پینا چاہتے تھے اور یہی وہ آخری جام شراب ہے جو تمہاری مشکلات کو آسان کر سکتا ہے۔ لیکن برخوردار میں اس سے پہلے تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں ایک لمبا راستہ طے کر کے یہاں پہنچا ہوں لہٰذا اگر میں تازہ دم ہونے کے لیے شراب کا ایک چھوٹا سا گھونٹ پینا چاہوں تو تمہیں اس پر ہرگز ناراض نہ ہونا چاہیئے" یہ کہہ کر بوڑھے نے گلاس کو منہ سے لگایا اور پیشتر اس کے کہ آگستس کوئی مزاحمت کر سکتا، بوڑھے نے ایک ہی سانس میں سارا گلاس خالی کر دیا۔

یہ دیکھ کر آگستس کا چہرہ زرد ہو گیا اور وہ فوراً بوڑھے پر جھپٹا اور اسے کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے زور سے چلایا " بوڑھے! کیا تم جانتے ہو کہ تم نے کیا پیا ہے ؟" بنسوانگر نے اپنے سفید بالوں والے سر کو حکیمانہ انداز میں ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا "یہ تو قرمی شراب تھی اور یہ بڑی اچھی چیز ہے۔ تمہارے ہاں تو واقعی کسی بھی چیز کا کال نہیں۔ لیکن میرا وقت بہت تنگ ہے اور اگر تمہیں میری ایک بات سننا ناگوار نہ ہو تو میں دیر تک تمہاری سمع خراشی نہ کروں گا "

آگستس حیران و پریشان ہو کر بوڑھے کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو گھورتا رہا؛ کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ بوڑھا اب بے ہوش ہو کر زمین پر گرنے ہی والا ہے، لیکن بوڑھا بڑے اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے آگستس کی طرف محبت بھرا اشارہ کر کے کہا "شاید تمہیں یہ ڈر ہے کہ میں اس شراب کو پی کر مر جاؤں گا۔ مگر تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ تمہاری نوازش ہے کہ تم میرے لیے اس قدر فکرمند ہو حالانکہ مجھے تمہاری ذات سے ایسی کوئی توقع نہ تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم پرانے زمانے کی طرح آپس میں بیٹھ کر کچھ باتیں کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ عیش و آرام کی زندگی تمہارے لیے سوہان روح بن چکی ہے اور یہ سب کچھ درحقیقت میرا ہی کیا دھرا ہے۔ تم چاہو تو میرے جانے کے بعد بھی شراب کا گلاس پی سکتے ہو مگر میں اس سے پہلے تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں "

آگستس دیوار کے سہارے کھڑا تھا جب اس نے ٹھیگنے بوڑھے کی محبت بھری آواز سنی تو اس نے اپنے دل میں ایک قسم کی راحت محسوس کی۔ یہ آواز اس کے لیے بچپن سے جانی پہچانی تھی اور اسے سن کر اس کی روح پر بھولی بسری زندگی کا پرتو چھا گیا اور جب اسے اپنا بچپن یاد آیا تو اس کا دل کرب اور حزن سے بھر گیا۔

" تمہارا زہر میں نے پی لیا ہے" بوڑھے نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "کیونکہ تمہارے دکھ کا حقیقی باعث میری ہی ذات ہے۔ جب تمہیں بپتسمہ دیا گیا تو تمہاری ماں نے تمہارے لیے ایک دلی مراد کا اظہار کیا جسے میں نے پورا کر دیا، حالانکہ یہ مراد احمقانہ تھی۔ اب تمہیں اپنی ماں کی اس دلی مراد کو معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ تم خود محسوس کر رہے ہو کہ یہی مراد تمہارے لیے لعنت کا طوق بن گئی ہے۔ بہرحال جو کچھ ہو چکا ہے مجھے اس پر بہت رنج ہے۔ اگر تم کبھی میری زندگی میں میرے گھر آؤ اور انگیٹھی کے قریب بیٹھ کر فرشتوں

سکے گیت سنو تو مجھے اس سے بے انتہا مسرت ہوگی مگر یہ بات کوئی آسان کام نہیں کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارا دل پہلے کی طرح تندرست، پاک اور پُر مسرت نہیں ہو سکتا، لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ اب بھی ممکن ہے صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ تم اپنی طرف سے اس کی کوشش کرو۔ تمہاری ماں کی دلی مراد تو تمہیں راس نہیں آئی لیکن اگر تم چاہو تو میں تمہاری بھی کوئی دلی مراد پوری کر سکتا ہوں۔ اب تمہیں مال و دولت کی کوئی حرص نہیں رہی۔ جاہ و جلال اور عورتوں کی محبت سے بھی تمہارا دل بھر چکا ہے تم اچھی طرح سے سوچ لو۔ اگر تمہیں کسی ایسے طلسم کی خواہش ہو، جو تمہاری تباہ حال زندگی کو دوبارہ حسین اور اچھا بنا سکے تو میں تمہاری اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

آگسٹس خیالات کے بھنور میں ڈوبا خاموش بیٹھا رہا کیونکہ اس کا دل مایوس اور بیزار ہو چکا تھا، لیکن چند لمحوں کے بعد اس نے کہا "میرے دینی باپ! میں تمہارا ممنون ہوں لیکن میری زندگی میں جو الجھنیں پڑ چکی ہیں انہیں کوئی بھی ناخنِ تدبیر سلجھا نہیں سکتا۔ آپ نے جو یہاں آنے کی زحمت فرمائی ہے، میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔" "ہاں" بوڑھے نے دھیمی آواز میں کہا "میں بھی جانتا ہوں کہ یہ کوئی آسان بات نہیں، لیکن اگر تم غور کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون سی شے ہے جس کی کمی تم نے ہمیشہ محسوس کی ہے۔ ذرا اپنے بچپن کے بارے میں سوچو۔ وہ وقت یاد کرو جب تمہاری ماں زندہ تھی اور تم کبھی کبھی میرے گھر بھی آیا کرتے تھے کیا اس وقت بھی تم اپنے دل میں مسرت محسوس نہ کرتے تھے؟"

"ہاں، صرف اسی وقت" آگسٹس نے سر ہلا کر کہا اور اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ کسی بوسیدہ آئینے میں اپنے بچپن کی جھلک دیکھ رہا ہو۔ لیکن گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے دوبارہ ایک بچہ بنا دیا جائے کیونکہ اس طرح تو مجھے اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کرنا پڑے گا۔"

"نہیں، یہ تو ایک حماقت ہوگی۔ تمہاری رائے درست ہے۔ لیکن ذرا اس وقت کو یاد کرو جب تم اپنے وطن میں ہمارے درمیان رہتے تھے۔ اس لڑکی کے بارے میں سوچو جسے ملنے کے لیے تم اس کے آبائی باغ میں جایا کرتے تھے اور اس گوری حسینہ کے بارے میں غور کرو جسے تم نے ایک بحری سفر کے دوران ایک جہاز میں دیکھا تھا۔ اپنی زندگی کی ان گھڑیوں کو یاد کرو جن میں تم نے اپنے دل میں خوشی محسوس کی تھی اور زندگی تمہیں حسین و دلکش نظر آئی تھی۔ اس طرح تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون سی چیز تھی جس کو پاتے ہی تمہارا دل خوش و خرم ہو جاتا تھا اور اس کے بعد تم اس چیز کی خواہش کو بھی محسوس کر سکو گے۔ میرے بچے، تم میری خاطر ایک بار اس کی کوشش کرو۔"

جب آگسٹس نے آنکھیں بند کر کے اپنی گزشتہ زندگی پر ایک نگاہ ڈالی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک تاریک غار کے اندر کھڑا ایک دور دراز مقام پر روشنی کا ایک نقطہ دیکھ رہا ہے۔ وہ اس جگہ سے اس غار میں داخل ہوا تھا اور اس وقت اس کے چاروں طرف حسن اور روشنی کا ظہور تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے ارد گرد اندھیرا چھانے لگا اور وہ رات کی سیاہی میں ڈوب کر حقیقی مسرت سے وہ بہت دور ہو گیا۔ وہ جتنا سوچتا، روشنی کا یہ نقطہ اسے اتنا ہی پیارا اور دلکش نظر آنے لگتا اور جب اس نے اس نقطۂ نور کو پہچان لیا تو اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

"اب میں ضرور کوشش کروں گا۔" اس نے بوڑھے سے کہا "تم اپنا پرانا طلسم مجھ سے چھین لو اور اس کے عوض مجھے ایک ایسا طلسم عطا کرو جو مجھے انسانوں سے محبت کرنے پر مجبور کر دے۔"

جب وہ بوڑھے کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں بوڑھے کی محبت آگ کی طرح بھڑک اٹھی ہے اور وہ اپنی یادداشت کی راکھ میں بھولے ہوئے الفاظ اور کنایے کریدنے لگا۔ دینی باپ نے اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا کر بستر پر لٹا دیا اور اس کی پیشانی پر سے بالوں کو پرے ہٹایا۔

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔" بوڑھے نے آہستہ سے کہا "میرے بچے! یہ بڑی اچھی بات ہے۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اگستس نے محسوس کیا کہ وہ انتہائی طور پر تھک گیا ہے اور اس کی عمر میں آناً فاناً کئی سالوں کا اضافہ ہو چکا ہے اور جب غنودگی اس پر مسلط ہو گئی تو بوڑھا چپکے سے اس ویران گھر سے باہر چلا گیا۔

جب گھر شور و غوغا سے گونج اٹھا تو اگستس کی آنکھ کھل گئی۔ ہر طرف سے ہلڑ ہنگامے کی صدائیں آ رہی تھیں۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو مکان کے سارے کمرے اس کے سابقہ دوستوں سے بھرے پڑے تھے۔ وہ یہاں جشن میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے لیکن گھر کو خالی اور ویران پا کر وہ مایوس اور غضبناک ہو گئے تھے۔ اگستس نے قریب آ کر اپنی مسکراہٹ اور طنز و مزاح سے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کا پرانا طلسم اب اپنا اثر کھو بیٹھا تھا۔ لوگ اسے دیکھتے ہی طیش میں آ کر چیخنے اور چلانے لگے اور اگستس کھسیانہ سا ہو کر ہنسنے لگا۔ اس نے اپنے بچاؤ کی خاطر ہاتھ اٹھائے مگر لوگ اس پر دیوانہ وار پل پڑے۔

"کمینے انسان!" ایک انسان چلایا "جو روپیہ تم نے مجھ سے ادھار لیا تھا وہ کہاں ہے؟" دوسرے نے آوازہ کسا "وہ گھوڑا تم نے مجھ سے عاریتاً لیا تھا۔ وہ اب کہاں ہے؟" ایک عورت غصے سے لال پیلی ہو کر لیلی۔ "ہائے تم نے میرے سارے راز افشا کر دیئے ہیں اور ساری دنیا کے سامنے میرا بھانڈا پھوڑ ڈالا ہے۔ اے ابلیس صفت انسان! میں تجھ سے انتہائی نفرت کرتی ہوں۔" ایک پچکے ہوئے گالوں والے نوجوان نے منہ بگاڑ کر آواز دی "اے شیطان، اے نوجوانوں کو گمراہ کرنے والے دیکھ تو نے میرا کیا حال بنا دیا ہے۔" یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ ہر شخص گالی گلوچ سے اس کی تواضع کر رہا تھا۔ بہتوں نے اسے مارا پیٹا اور واپس جاتے ہوئے تمام آئینے پھوڑ دیئے اور بیش قیمت چیزیں اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔

اگستس مار کھا کر اور ذلیل و رسوا ہو کر فرش سے اٹھا۔ جب وہ اپنی خوابگاہ میں منہ دھونے لگا تو اسے آئینے میں اپنا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی صورت سے نحوست اور وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور پیشانی سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

"یہ تیرے گناہوں کا خمیازہ ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اس نے چہرے سے خون کو دھویا اور ابھی وہ کچھ سوچنے ہی لگا تھا کہ شور و غوغا دوبارہ بلند ہوا۔ لوگ سیڑھیوں

وہ اپنی بچی کھچی پونجی نچھاور کر دیتا اور یہ سرمایہ محبت بھری نگاہ، ہمدردانہ علامتِ شوق اور اپنی ہمدردی اور خلوص کا مظاہرہ ہوتا۔ اسے ہر بار اس بات پر سخت حیرت ہوتی کہ دنیا میں دکھ درد کی اس قدر فراوانی کے باوجود انسان کیسے چین سے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اس بات کا بار بار مشاہدہ کر کے بھی دنگ رہ جاتا کہ ہر دکھ کے پہلو میں ایک انبساط بھری ہنسی کھیل رہی ہوتی ہے۔ ہر ماتم کے جلو میں ایک بچوں کا گیت پنہاں ہوتا ہے اور ہر مصیبت یا کمینگی کی تہہ میں ایک سلیقہ، ایک ظرافت اور ایک مسکراہٹ جلوہ گر ہوتی ہے۔

وہ انسانی زندگی میں ایک نمایاں نظم و ضبط پاتا۔ جب وہ کسی گلی میں مڑتا اور سامنے سے لڑکوں کی ایک ٹولی اس کی طرف دوڑتی ہوئی آتی تو اسے ہر بچے کی آنکھ میں شوخی، ارمان اور نوخیز حسن بجلی کی طرح کوندتا ہوا دکھائی دیتا۔ اگر لڑکے اس سے مذاق کرتے یا اسے دق کرنے کی کوشش کرتے تو وہ اس بات پر ناراض نہ ہوتا، بلکہ وہ اس حرکت کو قابلِ درگزر سمجھتا کیونکہ وہ اکثر دکانوں کے شیشوں اور پانی پیتے وقت چشمے کے پانی میں اپنا بدنما اور مضحکہ خیز حلیہ دیکھتا رہتا تھا۔ اب اسے لوگوں کو اپنے چہرے کی کشش سے غلام بے دام بنانے کا شوق نہ رہا تھا کیونکہ اس کی طبیعت اس بات سے اکتا چکی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد مسرت اور راحت ہوتی کہ اب دوسرے بھی ان راستوں پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں، جن پر سے کبھی وہ خود بھی گزرا تھا۔ یہ نظارہ بھی اس کے لیے بڑا روح پرور تھا کہ ہر انسان کس ہمت، وقار اور مسرت سے اپنے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔

اسی اثنا میں سردیاں ختم ہوئیں اور گرمیوں کا موسم آگیا۔ آگستس بیمار ہو کر کافی دیر تک ایک خیراتی ہسپتال میں زیر علاج رہا اور یہاں اسے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ غریب اور درماندہ انسان کس جرأت اور ارمان سے زندگی سے چمٹ کر موت پر غلبہ حاصل کرتے ہیں۔ شدید بیمار انسانوں پر صبر کی جھلک اسے بڑی دلکش نظر آئی اور مُردوں کی خاموش اور پروقار صورت بھی اسے بڑی پیاری لگتی، مگر اس کے لیے سب سے زیادہ حسین شے پاک طینت نرسوں کی محبت اور استقلال تھا۔ گرمیوں کا موسم ختم ہوا تو خزاں کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں۔ آگستس نے موسم سرما کی جانب اپنا سفر جاری رکھا، لیکن وہ اپنی سست رفتاری دیکھ کر بہت بیقرار ہوا کیونکہ ابھی اسے ہر جگہ پہنچ کر زیادہ سے زیادہ انسانوں کو دیکھنے اور ملنے کی آرزو تھی۔ اس کے سر کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے اور اس کی سرخ آنکھوں اور دکھتی پلکوں کے پس پردہ اب دیوانگی مسکرا رہی تھی۔ اس کی یادداشت بھی رفتہ رفتہ اس حد تک مکدر ہوتی چلی گئی کہ اب اسے آج اور کل میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن تھا کیونکہ دنیا اب اسے بڑی پیاری اور دلفریب نظر آ رہی تھی۔

جب سردیاں شروع ہوئیں تو وہ ایک شہر میں پہنچا، جس کی سڑکوں پر برفباری کے ساتھ تیز ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ صرف چند بازاری لڑکوں نے اس مسافر پر برف کے گولے پھینکے ورنہ ہر طرف شام کا سکوت چھایا

ہُوا تھا۔ تھکا ماندہ اگستس جب ایک تنگ گلی کی جانب مڑا تو یہ اسے بڑی مانوس اور جانی پہچانی نظر آئی اور جب وہ ایک دوسری گلی میں داخل ہوا تو اسے اپنے آبائی گھر اور دینی باپ کا مکان نظر آگئے جو اس سردی اور برفباری میں اسے بڑے پست اور خستہ حال دکھائی دیئے۔ اس سرد رات میں اس کے دینی باپ کی کھڑکی سے ایک سرخی مائل روشنی جھلک رہی تھی۔ اگستس نے اس گھر میں داخل ہو کر دروازے پر دستک دی تو بوڑھے نے دروازہ کھولا اور خاموشی سے اگستس کو اندر لے گیا۔ اس گرم کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا اور صرف انگیٹھی کے اندر ایک چھوٹی سی آگ جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

"کیا تمہیں بھوک لگی ہے؟" دینی باپ نے پوچھا، مگر اگستس بھوکا نہ تھا اُس نے صرف مسکرا کر اپنا سر ہلا دیا۔ "لیکن کیا تم تھکن محسوس نہیں کر رہے؟" بوڑھے نے یہ کہہ کر فرش پر جانور کی کھال بچھائی اور دونوں بوڑھے اس پر بیٹھ کر آگ کی طرف دیکھنے لگے۔

"تم کافی لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے ہو؟" بوڑھے نے کہا۔

"جی ہاں، مگر میرا سفر بڑا حسین تھا۔ میں صرف تھکن سی محسوس کر رہا ہوں کیا تم مجھے آج رات اپنے گھر میں سونے کی اجازت دو گے؟ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"ہاں! بے شک تم یہاں سو سکتے ہو۔ اور غالباً تم فرشتوں کا رقص بھی دیکھنا چاہو گے؟"

"ہاں! اگر میں دوبارہ بچہ بن سکتا تو یہ رقص مجھے بہت اچھا لگتا۔"

"ہم بڑی مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں۔" بوڑھے نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا "تم اب کتنے حسین ہو گئے ہو۔ تمہاری آنکھیں بھی اب پہلے کی طرح بڑی بھولی اور معصوم نظر آتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے یہ تمہاری ماں کی زندگی میں ہُوا کرتی تھیں۔ میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے ملنے کی زحمت گوارا کی ہے۔"

مسافر پھٹے کپڑوں میں سمٹا ہوا اپنے دوست کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کی تھکن نے ابھی تک شدت اختیار نہ کی تھی۔ گرمی کی راحت اور آگ کے شعلوں نے اس کے ذہن کو اس حد تک مبہوت کر دیا کہ اسے حال اور ماضی کی تمیز نہ رہی۔

دینی باپ ہنسوا نگرا" اس نے بوڑھے سے کہا دیکھو میں پھر ایک شریر لڑکا بن گیا ہوں اور میری ماں گھر میں دودھ ہی ہے براہِ کرم اس سے بات کر کے سمجھاؤ کہ میں پھر ایک مرتبہ اچھا لڑکا بن جاؤں گا۔ بتاؤ کیا تم ایسا کرو گے؟"

"میں ضرور ایسا ہی کروں گا۔" بوڑھے نے ملائمت سے کہا "تم اطمینان رکھو کیونکہ تمہاری ماں تم سے بہت پیار کرتی ہے۔"

جب آگ بجھنے کو آئی تو اگستس اپنے بچپن کے ابتدائی زمانے کی طرح اپنی خمار آلود آنکھوں کو اچھی طرح کھول کر آگ کی مدھم سرخی کو غور سے دیکھنے لگا۔ اور جب دینی باپ نے اُس کے سر کو اپنے زانو پر رکھا تو کمرے کی

وہ اپنی بچی کھچی پونجی نچھاور کر دیتا اور یہ سرمایہ محبت بھری نگاہ، بے ساختہ عالم شوق اور اپنی ہمدردی اور خلوص کا مظاہرہ تھا۔ اسے ہر روز اس بات پر سخت حیرت ہوتی کہ دنیا میں دکھ درد کی اس قدر فراوانی کے باوجود انسان کیسے چین سے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اس بات کا بار بار مشاہدہ کر کے بھی دنگ رہ جاتا کہ ہر دکھ کے پہلو میں ایک انبساط بھری ہنسی کھیل رہی ہوتی ہے۔ ہر ماتم کے جلو میں ایک بچوں کا گیت پنہاں ہوتا ہے اور ہر معصیت یا کمینگی کی تہہ میں ایک سلیقہ، ایک ظرافت اور ایک مسکراہٹ جلوہ گر ہوتی ہے۔

وہ انسانی زندگی میں ایک نمایاں نظم و ضبط پاتا۔ جب وہ کسی گلی میں جاتا اور سامنے سے لڑکوں کی ایک ٹولی اس کی طرف دوڑتی ہوئی آتی تو اسے ہر بچے کی آنکھ میں شوخی، ارمان اور نوخیز حسن بجلی کی طرح کوندتا ہوا دکھائی دیتا۔ اگر لڑکے اس سے مذاق کرتے یا اسے زچ کرنے کی کوشش کرتے تو وہ اس بات پر ناراض نہ ہوتا، بلکہ وہ اس حرکت کو قابلِ درگزر سمجھتا کیونکہ وہ اکثر دکانوں کے شیشوں اور پانی پیتے وقت چشمے کے پانی میں اپنا بدنما اور مضحکہ خیز حلیہ دیکھتا رہتا تھا۔ اب اسے لوگوں کو اپنے چہرے کی کشش سے غلام بے دام بنانے کا شوق نہ رہا تھا کیونکہ اس کی طبیعت اس بات سے اکتا چکی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد مسرت اور راحت ہوتی کہ اب دوسرے بھی ان راستوں پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں، جن پر سے کبھی وہ خود بھی گزرا تھا۔ یہ نظارہ بھی اس کے لیے بڑا روح پرور تھا کہ ہر انسان کس ہمت، وقار اور مسرت سے اپنے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔

اسی اثنا میں سردیاں ختم ہوئیں اور گرمیوں کا موسم آگیا۔ آگستس بیمار ہو کر کافی دیر تک ایک خیراتی ہسپتال میں زیر علاج رہا اور یہاں اسے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ غریب اور درماندہ انسان کس جرأت اور ارمان سے زندگی سے چمٹ کر موت پر غلبہ حاصل کرتے ہیں۔ شدید بیمار انسانوں پر صبر کی جھلک اسے بڑی دلکش نظر آئی اور مُردوں کی خاموش اور پروقار صورت بھی اسے بڑی پیاری لگتی، مگر اس کے لیے سب سے زیادہ حسین شے پاک طینت نرسوں کی محبت اور استقلال تھا۔ گرمیوں کا موسم ختم ہوا تو خزاں کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں۔ آگستس نے موسم سرما کی جانب اپنا سفر جاری رکھا لیکن وہ اپنی سست رفتاری دیکھ کر بہت بیقرار ہوا کیونکہ ابھی اسے ہر جگہ پہنچ کر زیادہ سے زیادہ انسانوں کو دیکھنے اور ملنے کی آرزو تھی۔ اس کے سر کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے اور اس کی سرخ آنکھوں اور دکھتی پلکوں سے پس پردہ اب دیوانگی مسکرا رہی تھی۔ اس کی یادداشت بھی رفتہ رفتہ اس حد تک مکدر ہوتی چلی گئی کہ اب اسے اور کل میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن تھا کیونکہ دنیا اب اسے بڑی پیاری اور نظر آ رہی تھی۔

جب سردیاں شروع ہوئیں تو وہ ایک شہر میں پہنچا، جس کی سڑکوں پر برفباری کے ساتھ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ صرف چند بازاری لڑکوں نے اس مسافر پر برف کے گولے پھینکے ورنہ ہر طرف شام کا سکوت

ہوا تھا۔ تھکا ماندہ اگستس جب ایک ۔۔۔

آئی اور جب وہ ایک دوسری گلی میں داخل ہوا تو اسے اپنے آبائی گھر اور دینی باپ کا مکان نظر آئے جو اس سردی اور برفباری میں اسے بڑے لپیٹ اور خستہ حال دکھائی دیئے۔ اس سردرات میں اس کے دینی باپ کی کھڑکی سے ایک سرخی مائل روشنی جھلک رہی تھی۔ اگستس نے اس گھر میں داخل ہو کر دروازے پر دستک دی تو بوڑھے نے دروازہ کھولا اور خاموشی سے اگستس کو اندر لے گیا۔ اس گرم کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا اور صرف انگیٹھی کے اندر ایک چھوٹی سی آگ جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

" کیا تمہیں بھوک لگی ہے ؟" دینی باپ نے پوچھا، مگر اگستس بھوکا نہ تھا اس نے صرف مسکرا کر اپنا سر ہلا دیا۔ " لیکن کیا تم تھکن محسوس نہیں کر رہے ؟" بوڑھے نے یہ کہہ کر فرش پر جانور کی کھال بچھائی اور دونوں بوڑھے اس پر بیٹھ کر آگ کی طرف دیکھنے لگے۔

" تم کافی لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے ہو۔" بوڑھے نے کہا۔

" جی ہاں، مگر میرا سفر بڑا حسین تھا۔ میں صرف تھکن سی محسوس کر رہا ہوں کیا تم مجھے آج رات اپنے گھر میں سونے کی اجازت دو گے ؟ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا ۔"

" ہاں! بے شک تم یہاں سو سکتے ہو۔ اور غالباً تم فرشتوں کا رقص بھی دیکھنا چاہو گے ؟"

" ہاں! اگر میں دوبارہ بچہ بن سکتا تو یہ رقص مجھے بہت اچھا لگتا ۔"

" ہم بڑی مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں ۔" بوڑھے نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا اب کتنے حسین ہو گئے ہو۔ تمہاری آنکھیں بھی اب پہلے کی طرح بڑی بھولی اور معصوم نظر آتی ہیں بالکل طرح جیسے یہ تمہاری ماں کی زندگی میں ہوا کرتی تھیں۔ میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھ سے ملنے کی زحمت کی ہے ۔"

مسافر پھٹے کپڑوں میں سمٹا ہوا اپنے دوست کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کی تھکن نے ابھی تک شدت نہ کی تھی۔ گرمی کی راحت اور آگ کے شعلوں نے اس کے ذہن کو اس حد تک مبہوت کر دیا کہ اسے حال ماضی کی تمیز نہ رہی۔

دینی باپ بنسوانگر!" اس نے بوڑھے سے کہا دیکھو میں پھر ایک شریر لڑکا بن گیا ہوں اور میری روح ہی ہے براہِ کرم اس سے بات کر کے سمجھاؤ کہ میں پھر ایک مرتبہ اچھا لڑکا بن جاؤں گا۔ بتاؤ کیا تم ایسا کرو گے۔

" میں ضرور ایسا ہی کروں گا۔" بوڑھے نے ملائمت سے کہا " تم اطمینان رکھو کیونکہ تمہاری ماں تم سے رُوٹھی ہے ۔"

جب آگ بجھنے کو آئی تو اگستس اپنے بچپن کے ابتدائی زمانے کی طرح اپنی خمار آلود آنکھوں کو کھول کر آگ کی مدھم سرخی کو غور سے دیکھنے لگا۔ اور جب دینی باپ نے اس کے سر کو اپنے زانو پر رکھا

وہ اپنی بچی کھچی پونجی نچھاور کر دیتا اور یہ سرمایہ محبت بھری نگاہ، بیساختہ عالم شوق اور اپنی ہمدردی اور خلوص کا مظاہرہ تھا۔ اسے ہر روز اس بات پر سخت حیرت ہوتی کہ دنیا میں دکھ درد کی اس قدر فراوانی کے باوجود انسان کیسے چین سے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اس بات کا بار بار مشاہدہ کر کے بھی دنگ رہ جاتا کہ ہر دکھ کے پہلو میں ایک انبساط بھری ہنسی کھیل رہی ہوتی ہے۔ ہر ماتم کے جلو میں ایک بچوں کا گیت پنہاں ہوتا ہے اور ہر مصیبت یا کمینگی کی تہہ میں ایک سلیقہ، ایک ظرافت اور ایک مسکراہٹ جلوہ گر ہوتی ہے۔

وہ انسانی زندگی میں ایک نمایاں نظم و ضبط پاتا۔ جب وہ کسی گلی میں مڑتا اور سامنے سے لڑکوں کی ایک ٹولی اس کی طرف دوڑتی ہوئی آتی تو اسے ہر بچے کی آنکھ میں شوخی، ارمان اور نوخیز حسن بجلی کی طرح کوندتا ہوا دکھائی دیتا۔ اگر لڑکے اس سے مذاق کرتے یا اسے دق کرنے کی کوشش کرتے تو وہ اس بات پر ناراض نہ ہوتا، بلکہ وہ اس حرکت کو قابلِ درگزر سمجھتا کیونکہ وہ اکثر دکانوں کے شیشوں اور پانی پیتے وقت چشمے کے پانی میں اپنا بدنما اور مضحکہ خیز حلیہ دیکھتا رہتا تھا۔ اب اسے لوگوں کو اپنے چہرے کی کشش سے غلام بے دام بنانے کا شوق نہ رہا تھا کیونکہ اس کی طبیعت اس بات سے اکتا چکی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد مسرت اور راحت ہوتی کہ اب دوسرے بھی ان راستوں پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں، جن پر سے کبھی وہ خود بھی گزرا تھا۔ یہ نظارہ بھی اس کے لیے بڑا روح پرور تھا کہ ہر انسان کس ہمت، وقار اور مسرت سے اپنے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔

اسی اثنا میں سردیاں ختم ہوئیں اور گرمیوں کا موسم آگیا۔ آگستس بیمار ہو کر کافی دیر تک ایک خیراتی ہسپتال میں زیر علاج رہا اور یہاں اسے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ غریب اور درماندہ انسان کس جرأت اور ارمان سے زندگی سے چمٹ کر موت پر غلبہ حاصل کرتے ہیں۔ شدید بیمار انسانوں پر صبر کی جھلک اسے بڑی دلکش نظر آئی اور مُردوں کی خاموش اور پُروقار صورت بھی اسے بڑی پیاری لگتی، مگر اس کے لیے سب سے زیادہ حسین شے پاک طینت نرسوں کی محبت اور استقلال تھا۔ گرمیوں کا موسم ختم ہوا تو خزاں کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں۔ آگستس نے موسم سرما کی جانب اپنا سفر جاری رکھا، لیکن وہ اپنی سست رفتاری دیکھ کر بہت بیقرار ہوا، کیونکہ ابھی اسے ہر جگہ پہنچ کر زیادہ سے زیادہ انسانوں کو دیکھنے اور ملنے کی آرزو تھی۔ اس کے سر کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے اور اس کی سرخ آنکھوں اور جھکتی پلکوں کے پس پردہ اب دیوانگی مسکرا رہی تھی۔ اس کی یادداشت بھی رفتہ رفتہ اس حد تک مکدر ہوتی چلی گئی کہ اب اسے آج اور کل میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن تھا کیونکہ دنیا اب اسے بڑی پیاری اور دلفریب نظر آ رہی تھی۔

جب سردیاں شروع ہوئیں تو وہ ایک شہر میں پہنچا، جس کی سڑکوں پر برفباری کے ساتھ تیز ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ صرف چند بازاری لڑکوں نے اس مسافر پر برف کے گولے پھینکے ورنہ ہر طرف شام کا سکوت چھایا

ہُوا تھا۔ تھکا ماندہ آگستس جب ایک تنگ گلی کی جانب مڑا تو اسے بڑی مانوس اور جانی پہچانی نظر آئی اور جب وہ ایک دوسری گلی میں داخل ہوا تو اسے اپنے آبائی گھر اور دینی باپ کا مکان نظر آئے جو اس سردی اور برفباری میں اسے بڑے پست اور خستہ حال دکھائی دیئے اس سرد رات میں اس کے دینی باپ کی کھڑکی سے ایک سرخی مائل روشنی جھلک رہی تھی۔ آگستس نے اس گھر میں داخل ہو کر دروازے پر دستک دی تو بوڑھے نے دروازہ کھولا اور خاموشی سے آگستس کو اندر لے گیا۔ اس گرم کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا اور صرف انگیٹھی کے اندر ایک چھوٹی سی آگ جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

"کیا تمہیں بھوک لگی ہے؟" دینی باپ نے پوچھا، مگر آگستس بھوکا نہ تھا اس نے صرف مسکرا کر اپنا سر ہلا دیا۔ "لیکن کیا تم تھکن محسوس نہیں کر رہے؟" بوڑھے نے یہ کہہ کر فرش پر جانور کی کھال بچھائی اور دونوں بوڑھے اس پر بیٹھ کر آگ کی طرف دیکھنے لگے۔

"تم کافی لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے ہو۔" بوڑھے نے کہا۔

"جی ہاں، مگر میرا سفر بڑا حسین تھا۔ میں صرف تھکن سی محسوس کر رہا ہوں کیا تم مجھے آج رات اپنے گھر میں سونے کی اجازت دو گے؟ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"ہاں! بے شک تم یہاں سو سکتے ہو۔ اور غالباً تم فرشتوں کا رقص بھی دیکھنا چاہو گے؟"

"ہاں! اگر میں دوبارہ بچہ بن سکتا تو یہ رقص مجھے بہت اچھا لگتا۔"

"ہم بڑی مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں۔" بوڑھے نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا "تم اب کتنے حسین ہو گئے ہو۔ تمہاری آنکھیں بھی اب پہلے کی طرح بڑی بھولی اور معصوم نظر آتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے یہ تمہاری ماں کی زندگی میں ہوا کرتی تھیں۔ میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے ملنے کی زحمت گوارا کی ہے۔"

مسافر پھٹے کپڑوں میں سمٹا ہوا اپنے دوست کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کی تھکن نے ابھی تک شدت اختیار نہ کی تھی۔ گرمی کی راحت اور آگ کے شعلوں نے اس کے ذہن کو اس حد تک مبہوت کر دیا کہ اسے حال اور ماضی کی تمیز نہ رہی۔

دینی باپ منسوانگر!" اس نے بوڑھے سے کہا دیکھو! میں پھر ایک شریر لڑکا بن گیا ہوں اور میری ماں گھر میں دور ہی ہے براہِ کرم اس سے بات کر کے سمجھاؤ کہ میں پھر ایک مرتبہ اچھا لڑکا بن جاؤں گا۔ بتاؤ کیا تم ایسا کرو گے؟"

"میں ضرور ایسا ہی کروں گا۔" بوڑھے نے ملائمت سے کہا "تم اطمینان رکھو کیونکہ تمہاری ماں تم سے بہت پیار کرتی ہے۔"

جب آگ بجھنے کو آئی تو آگستس اپنے بچپن کے ابتدائی زمانے کی طرح اپنی خمار آلود آنکھوں کو اچھی طرح کھول کر آگ کی مدھم سرخی کو غور سے دیکھنے لگا۔ اور جب دینی باپ نے اس کے سر کو اپنے زانو پر رکھا تو کمرے کی

تاریکی سے ایک سریلی اور مدھ بھری موسیقی کی تانیں اپنے حسن اور دلربائی کا جادو جگانے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں ننھے نورانی فرشتے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے آئے اور حلقہ بنا کر جوڑوں کی شکل میں ایک دوسرے کے گرد رقص کرنے لگے۔ اگستس بڑے غور سے سنتا اور دیکھتا رہا اور اس کا طفلانہ ادراک گم گشتہ جنت کو دوبارہ پاکر وجد میں آگیا۔

ایک مرتبہ اسے ایسا لگا جیسے اس کی ماں نے اسے پکارا ہو مگر وہ اب تھک کر چور ہو چکا تھا اور اس کے علاوہ دینی باپ نے بھی اس کی ماں کو سمجھا بجھا کر راضی کر لینے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جب اگستس سو گیا تو دینی باپ نے اس کے دونوں ہاتھ آپس میں ملا کر اس کے خاموش دل پر اپنا کان رکھا اور کمرے میں رات کی سیاہی چھا گئی۔

○○

آئینے کے پار

THROUGH THE LOOKING GLASS

لیوس کیرل

آئینہ گر ترجمہ: محمد خالد اختر

ایک چیز یقینی تھی کہ سفید بلونگڑے کا اس میں کوئی ہاتھ نہ تھا۔ یہ سارے کا سارا کالے بلونگڑے کا کیا دھرا تھا۔ کیونکہ سفید بلونگڑا پچھلے چوتھائی گھنٹے سے اپنا منہ بوڑھی بلی سے دھلوا رہا تھا (اور کافی تمیز اور بردباری سے اس مرحلے میں سے گزر رہا تھا)، تو تم دیکھ ہی سکتے ہو کہ اس کا اس شرارت سے دور کا تعلق بھی نہ ہو سکتا تھا۔

اب سنوڈینا کا اپنے بچوں کے منہ دھلانے کا طریقہ کار یہ تھا۔ پہلے تو وہ غریب ننھی سی چیز کو اپنے پنجے میں کان سے پکڑتی تھی پھر دوسرے پنجے سے اس کے منہ کو خوب ملتی تھی۔ الٹی طرح یعنی یہ عمل اس کے ناک سے شروع ہوتا تھا۔ اور اب اس وقت وہ سفید بلونگڑے پر یہ مشقت کرنے میں لگی تھی۔ سفید بلونگڑا ساکت لیٹا ہوا تھا اور خرخرانے کے لیے منہ کھول رہا تھا۔ بلاشبہ یہ محسوس کرتا ہوا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کی بھلائی کے لیے ہے۔

لیکن کالے بلونگڑے کے منہ کی دھلائی اور رگڑائی تو پہلے ہی سہ پہر کے وقت ہو چکی تھی اور اس طرح جب ایلس بڑی آرام کرسی کے ایک گوشے میں کچھ کچھ خود سے باتیں کرتی اور کچھ سوئی سوئی اکٹھی ہوئی بیٹھی تھی، بلونگڑا بُنی ہوئی اون کے گولے سے جسے ایلس لپیٹنے کی کوشش کرتی رہی تھی دھینگا مشتی کا مزیدار کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ اسے کبھی ادھر کبھی اُدھر لڑھکاتے جاتا تھا کہ وہ پھر سارے کا سارا کھل گیا۔ اور اب وہ گانٹھیں اور گرہیں بنا آتشدان کے قالین پر پھیلا تھا۔ بلونگڑے صاحب حیران اور بوکھلائے ہوئے بیچ میں اپنی ہی دم کے پیچھے دوڑ لگا رہے تھے۔

" اف تم نٹ کھٹ بلونگڑے " ایلس چلائی۔ اس نے یہ کہتے ہوئے بلونگڑے کو پکڑ کر اٹھایا اور اسے یہ ذہن نشین کرانے کے لیے چوما کہ وہ اب موردِ عتاب ہے

" سچ مچ۔ ڈینا کو تمہیں تمیز کی باتیں سکھانی چاہیے تھیں۔ . . . او ڈینا۔ "

" تمہیں سکھانی چاہیے تھیں۔ تمہیں سکھانی چاہیے تھیں " اس نے بوڑھی بلی کو تکتے اور اتنی خفگی کا لہجہ پیدا کرتے ہوئے جو ممکن تھا، اضافہ کیا۔ اور پھر وہ اپنی آرام کرسی میں گھسٹ گھسٹا کر جا چڑھی معہ

... اون کو پھر گولے پر لپیٹنے لگی۔ لیکن اس کام میں اس کی رفتار نہایت سست رہی کیونکہ سارا وقت کبھی تو بلونگڑے سے باتیں کرنے لگتی اور کبھی اپنے آپ سے۔ بلونگڑا بڑے پیلے دیئے انداز میں اس کے گھٹنے پر بیٹھا اون کے چڑھانے کی رفتار میں جھوٹ موٹ دلچسپی لے رہا تھا (سوچ وہ کچھ اور رہا تھا) وقتاً فوقتاً وہ ایک چھوٹا پنجا بڑھا کر نرمی سے گولے کو چھوتا گویا کہ اگر کوئی اسے کرنے دے تو اسے اس کام میں ایلس کا ہاتھ بٹا کر عین مسرت ہوگی۔

"ارے کٹی" ایلس کہنے لگی "تم جانتی ہو۔ کل کیا ہوتی ہے۔ تم میرے ساتھ کھڑکی میں ہوتیں تو یہ بوجھ لیتیں۔ لیکن تمہاری ماں ڈینا تمہیں چاٹ پونچھ رہی تھیں اس لیے تم کیسے میرے ساتھ ہو سکتی تھیں۔ میں لڑکوں کو جشن کے الاؤ کے لیے شاخچے اکٹھا کرتے دیکھ رہی تھی۔ کٹی اس کے لیے بہت، بہت سارے شاخچے درکار ہوتے ہیں۔ کسر یہ ہوئی کہ بلا کی سردی ہوگئی اور برف گرنے لگی، اس لیے کام کو بیچ میں چھوڑنا پڑا۔"

یہاں ایلس نے بلونگڑے کی گردن کے گرد اون کے تاگے کے تین چار لپیٹے دے دیئے صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیسے نظر آتا ہے۔ اس میں بلونگڑے کے بھاگنے کی وجہ سے ایسی گڑبڑ ہوئی کہ گولا فرش پر گر کر لڑھکتا چلا گیا اور اس کے گز کے گز پھر کھل گئے۔

"تم جانتی ہو۔ کٹی۔ میں اتنے غصے میں تھی" جونہی وہ اور کٹی بلونگڑا پھر آرام سے کرسی میں متمکن ہو گئے ایلس کہنے لگی۔ "کہ جب میں نے وہ ساری شرارت دیکھی جو تم کرتی رہی تھیں تو ایک دفعہ تو میں نے تہیہ ہی کر لیا تھا کہ کھڑکی کھول کر تمہیں باہر برف میں اچھال پھینکوں اور تم چھوٹی نٹ کھٹ سی لاڈو! تم مستحق بھی اسی سلوک کی ہو! اب بتاؤ تو، تمہارے پاس اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے ہے؟ اب بس مجھے ٹوکو مت!" وہ ایک انگلی اٹھا کر کہتی "میں تمہیں تمہارے سارے عیب گنانے لگی ہوں۔

نمبر ایک، جب ڈینا اس صبح تمہارا منہ دھو رہی تھی تو تم نے دو دفعہ چوں چوں کی تھی۔ اب دیکھو۔ اس سے انکار نہ کرو۔ کٹی! میں نے خود سنا! اری کیا کہہ رہی ہو تم! (یہ فرض کرکے کہ بلونگڑے نے جواب میں کچھ کہا ہے!) اچھا تو تم کہتی ہو کہ تمہاری ماں کا پنجہ تمہاری آنکھ میں چلا گیا تھا۔ ہوں! تو اری یہ تمہارا اپنا قصور ہی تھا کہ تم نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ اگر تم ان کو ذرا زور سے بھینچ لیتیں تو یہ بات نہ ہوتی! اب بہانے، حیلے اور بہلانے بنانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن آگے سنو! نمبر دو! جیسے ہی میں نے سنو ڈراپ کے سامنے دودھ کی پرچ رکھی تم نے اس بچاری کو دم سے کھینچ کر ایک طرف کر دیا۔ کیا! تم پیاسی تھیں! خوب میری لاڈو! اور یہ تم کیونکر جان گئیں کہ سنو ڈراپ پیاسی نہیں تھی۔ اب نمبر تین جب میں دیکھ نہیں رہی تھی تو تم نے اون کا گولا سارے کا سارا کھول ڈالا۔

کٹی! یہ ہیں تمہارے تین قصور! اور ابھی تک تمہیں ان میں سے ایک کی بھی سزا نہیں ملی۔ تم جانو! میں تمہاری سزائیں اگلے ہفتے آنے تک اکٹھی کرتی جاؤں گی۔

سوچوں تو! اگر وہ میری سزائیں اسی طرح جمع کرتے جائیں۔" وہ بولنگڑے کی بجائے اب اپنے آپ سے باتیں کرتی چلی گئی۔ "تو سال کے ختم ہونے پر وہ مجھ سے کیا سلوک کریں۔ میرا خیال ہے جب وہ دن آئے تو وہ مجھے جیل بھیج دیں گے۔ یا۔ دیکھیں تو۔ فرض کیا۔ ہر سزا یہ ہو کہ یہ لڑکی بھوکی رہے اور اسے کھانا مت دو۔ پھر جب سال بعد وہ منحوس دن آئے گا، مجھے ایک ہی بار پچاس سو کھانوں کے بغیر رہنا پڑے گا۔ اچھا تو بجائے میں اس بات کی پرواہ مطلقاً نہیں کروں گی۔ میں انہیں کھانے کی بجائے ان کے بغیر رہنے کو کہیں زیادہ پسند کروں گی۔

"کٹی! تم کھڑکی کے شیشوں پر برف گرتے سن رہی ہو نا! اس کی آواز کتنی اچھی سی اور نرم ہے۔ جیسے کہ کوئی کھڑکی کو باہر سے چوم رہا ہو۔ سوچو، تو کہ آیا برف درختوں اور کھیتوں سے اتنی محبت کرتی ہے جو انہیں ایسی ملائمت سے چومتی ہے اور پھر وہ انہیں ایک سفید لحاف کے نیچے آرام سے ڈھانپ دیتی ہے اور شاید وہ ان سے یہ بھی کہتی ہوگی۔

پیارو! سو جاؤ اور تب تک سوتے رہو جب تک گرما دوبارہ نہیں لوٹ آتی۔ اور جب گرما آنے پر وہ سرتاسر سبز پوشاک پہن لیتے ہیں اور ادھر اُدھر ناچتے ہیں (جب ہوا چلتی ہے تو) اف وہ بڑا ہی خوبصورت نظارہ ہوتا ہے" ایلیس خوشی سے چلا اٹھی اور تالی بجانے میں اون کا گولا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے آ رہا "کاش یہ سب کچھ یوں ہی ہوتا ہو! مجھے یقین ہے کہ پت جھڑ کے موسم میں جب پتے زرد ہونے لگتے ہیں تو درخت ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے سو رہے ہوں۔

کٹی! شطرنج کھیلنا آتا ہے تمہیں۔ اب دیکھو میری پیاری اس بات پر مسکراؤ تو نہیں۔ میں بالکل سنجیدگی سے تم سے سوال کر رہی ہوں۔ کیونکہ ابھی جب ہم کھیل رہے تھے تم پاس کھڑی اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے تم اس کو پوری طرح جانتی ہو اور جب میں کہتی تھی تم خرخراتی تھیں۔ ویسے کٹی! یہ شہ تھی زوردار اور میں بازی جیت بھی جاتی اگر وہ۔ بیہودہ گھوڑا میرے مہروں کے بیچ میں آ کر ترچھا چلتا نہ آن پڑتا۔ پیاری کٹی۔ آؤ جھوٹ موٹ یوں کریں۔"

اور یہاں میں چاہتا ہوں، میں تمہیں ان سے آدھی ہی باتیں بتا سکتا جو ایلیس اپنے چہیتے فقرے "آؤ جھوٹ موٹ یوں کریں" سے آغاز کر کے کہا کرتی تھی۔ ایک دن پہلے ہی تو اس کی اپنی بہن سے ایک لمبی بحث چھڑ گئی تھی۔ اور وہ صرف اس لیے کہ ایلیس نے اپنی بات اس طرح شروع کی تھی "آؤ جھوٹ موٹ یوں کریں۔ بادشاہ ... اور ملکہ بن کے چہل قدمی کریں۔"

اور اس کی بہن جو بالکل باقاعدہ ہونا پسند کرتی تھی، اس پر اس سے بحث کرنے لگی کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے، کیونکہ ہم تو صرف دو ہیں۔ اور ایلیس آخر لاچار ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو گئی "اچھا تم ان میں سے ایک

بن جاؤ۔ باقی سب میں بن جاتی ہوں۔"

اور ایک دفعہ تو اس نے اپنی بوڑھی آیا کے کان میں یہ چلا کر اس بے چاری کو سچ مچ خوف زدہ کر دیا تھا "آیا۔ آؤ جھوٹ موٹ یوں کریں۔ کہ میں بھوکا بھیڑیا بن جاؤں اور تم ہڈی ہو جاؤ۔"

لیکن یہ ہم ایلس کی بلونگڑے سے بات چیت سے دور ہٹ گئے ہیں۔ آؤ کٹی! ہم جھوٹ موٹ یوں کریں کہ تم سرخ ملکہ بن جاؤ۔ تم جانو۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم بیٹھ جاؤ اور اپنے بازو سینے پر باندھ لو تو تم ہو بہو سرخ ملکہ لگنے لگو گی۔

اب کر کے دیکھو۔ کرو نا۔ میری پیاری سی کٹی اور ایلس نے میز پر سے سرخ ملکہ کو اٹھا کر بلونگڑے کے سامنے ایک نمونے کے طور پر دھر دیا۔ تاکہ بلونگڑا اس کو دیکھ دیکھ کر اپنی وضع قطع بھی ویسی ہی بنائے پر یہ ترکیب کچھ کامیاب نہ رہی۔ اور ایلس نے سوچا بنیادی طور پر اس لیے کہ بلونگڑے کو اپنے بازو مناسب طریق سے باندھنے میں تامل تھا۔ اس لیے اس کو سزا دینے کی خاطر اس نے اسے آئینے کے سامنے پکڑے رکھا تاکہ وہ دیکھ سکے کہ اس کے چہرے سے خواہ مخواہ کتنی آزردگی ٹپک رہی ہے۔

"اور اگر تم فی الفور اچھی نہیں ہو گی" اس نے اضافہ کیا "تو میں تمہیں ابھی ابھی آئینہ گھر کے بیچ میں گزارتی ہوں۔ پھر پتہ چلے گا تمہیں۔"

اور اب اگر تم میری طرف توجہ کرو اور یہ باتیں کرنا بند کرو تو میں تمہیں آئینہ گھر کے متعلق اپنی ساری باتیں بتاؤں گی۔ پہلے تو یہ کہ اس طرف ایک کمرہ ہے جسے تم آئینے کے بیچ میں سے دیکھ سکتی ہو۔ وہ بلکل ہمارے ڈرائنگ روم کی طرح کا ہے۔ ہاں چیزیں الٹ دکھائی پڑتی ہیں۔ کرسی پر چڑھ کر میں سارا کمرہ دیکھ سکتی ہوں۔ سارا سوائے آتشدان کے پیچھے کے چھوٹے سے حصے کے۔ اوہ میں کتنا چاہتی ہوں کہ کاش میں وہ حصہ بھی دیکھ سکتی۔ مجھے یہ جاننے کی بہت ہی خواہش ہے کہ آیا ان کے یہاں سرما میں آگ جلتی ہے۔ تم جانو۔ یہ تم کبھی نہیں بتا سکتیں جب تک ہمارے آتشدان کی آگ کا دھواں بھی تو ہو سکتا ہے۔ ہم پر ظاہر کرنے کے لیے کہ ان لوگوں کے آتشدان میں بھی آگ جلتی ہے۔ ہاں تو کتابیں کچھ کچھ ہماری کتابوں کی طرح ہیں۔ مگر ان کے الفاظ الٹے سلٹے چھپے ہیں۔ میں یہ جانتی ہوں کیونکہ میں نے اپنی کتابوں میں سے ایک کو آئینے کے سامنے پکڑ کر رکھا اور پھر دوسرے کمرے میں وہ بھی ایسا ہی کرنے لگی۔

کٹی! بھلا آئینہ گھر میں جا کر رہنے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ پسند کرو گی اس بات کو۔ سوچو تو وہ تمہیں وہاں دودھ ودودھ بھی دیں گے یا نہیں؟ شاید آئینے والا دودھ پینے میں اتنا مزیدار نہیں ہو گا۔ لیکن اوہ! کٹی اب ہم گیلری پر آتے ہیں۔ تم آئینہ گھر میں گیلری کی تھوڑی سی جھلک دیکھ سکتی ہو بشرطیکہ

ہمارے ڈرائنگ روم کے دروازے کو پورا کھلا چھوڑ دو۔ اور جتنی دور تک تم دیکھ سکتی ہو یہ بہت سی ہماری والی گیلری کی طرح ہے مگر کٹی تم جانو! اس سے پرے یہ بالکل مختلف ہو سکتی ہے۔ اوہ کٹی کتنا مزا آئے گا اگر ہم دونو آئینہ گھر کے بیچ میں سے گزر کر پرلی طرف جا سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں بڑی خوبصورت چیزیں ہیں۔ آؤ اب جھوٹ موٹ یوں کریں کہ سوچ لیں کہ کسی نہ کسی طرح کٹی" ہم اس کے بیچ میں سے گزر سکتی ہیں۔ اور جھوٹ موٹ یوں خیال باندھیں کہ آئینہ شفاف چاندنی کی مانند ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم اس میں سے بآسانی گزر کر دوسری طرف پہنچ سکتی ہیں۔ اوہو۔ میری بات مانو۔ یہ اب ایک طرح کی دھندسی میں بدلتا جا رہا ہے۔ اب تو اس میں سے گزر جانا آسان سا لگتا ہے۔۔"

یہ کہتے وقت وہ آتشدان کی تختی پر چڑھی ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ میں یہاں کیونکر جا پہنچی اور سچ مچ شیشہ ایک چمکیلی، چاندنی کی رنگت کی دھند میں پگھلتا جا رہا تھا۔

ایک لمحے میں ایلس آئینے کو پار کر چکی تھی اور آئینہ گھر کے کمرے میں سبک قدموں پر پھلانگ گئی تھی وہاں پہنچ کر سب سے پہلے تو اس نے آتشدان کے پیچھے جھانک کر یہ دیکھا کہ وہاں آگ جل رہی ہے یا نہیں اور اسے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہاں سچ مچ آگ جل رہی تھی۔ اس کے اپنے کمرے کی آگ کی طرح روشن بھڑکتی ہوئی۔

"ہاں تو میں یہاں بھی اتنی ہی گرم رہوں گی جتنی پرانے کمرے میں" ایلس سوچنے لگی" بلکہ کچھ تھوڑی سی زیادہ گرم کیونکہ یہاں مجھے کوئی آگ سے دور ہو کر بیٹھنے کے لیے نہیں جھڑکے گا۔ کوئی مجھ سے یہ نہیں کہہ سکے گا" اری لڑکی آگ سے دور ہو کر بیٹھو۔ بچوں کو آگ کے اتنا قریب نہیں بیٹھنا چاہیے۔" اف! کتنا مزا آئے گا جب وہ مجھے شیشے میں سے اس کمرے میں بیٹھا دیکھیں گے اور مجھ تک پہنچ نہ سکیں۔"

پھر وہ ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ اس نے دیکھا کہ یہاں کا جو کچھ منظر پرانے کمرے سے دکھائی پڑتا تھا اس میں خاص بات نہ تھی اور وہ دیکھا بھالا اور بے لطف تھا۔ لیکن باقی سب کچھ اس قدر مختلف تھا جتنا ممکن تھا۔ مثلاً آگ کے پاس دیوار پر لٹکی ہوئی تصویریں بالکل زندہ لگتی تھیں اور آتشدان کے تختے پر رکھا کلاک (تم جانو تم آئینے میں سے صرف اس کی پیٹھ ہی دیکھ سکتے ہو) ایک چھوٹے بوڑھے آدمی کا چہرہ بنا تھا۔ ایلس کو دیکھ کر وہ پوپلے منہ سے ہنس پڑا۔

"یہاں والے اس کمرے کو اتنا صاف ستھرا نہیں رکھتے جتنا دوسرا کمرہ ہے۔" ایلس نے انگاروں کے درمیان انگیٹھی میں بہت سے شطرنج کے مہروں کو پڑے پا کر اپنے آپ میں سوچا۔ لیکن اگلے ہی لمحے حیرت کی چھوٹی سی اوہ! کے ساتھ وہ اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں پر ہو کر ان کو غور سے تکنے لگی۔ مہرے، جوڑے بنے

ہوئے ادھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔

"یہ رہے سرخ بادشاہ اور سرخ ملکہ" ایلس نے کہا (سرگوشی میں اس ڈر سے کہ کہیں وہ خوف زدہ نہ ہو جائیں) "اور وہ کرچھے کے سرے پر سفید بادشاہ اور سفید ملکہ بیٹھے ہیں۔ اور یہ بازو بازوؤں میں ڈالے دو رخ چلے آتے ہیں۔ میرا خیال نہیں کہ یہ مجھے سن سکتے ہیں۔" وہ اپنے سر کو اور نیچے کر کے کہتی گئی۔ "اور مجھے تقریباً یقین ہے کہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ مجھ کو یوں احساس ہو رہا ہے جیسے میں غائب ہو رہی ہوں اور وہ دوسرے مجھ کو نہیں دیکھ سکتے۔"

یہاں کوئی چیز ایلس کے پیچھے میز پر چوں چوں کرنے لگی۔ اس نے پلٹ کر جو دیکھا تو ایک سفید پیادہ چاروں شانے چت جا پڑا تھا اور ٹانگیں چلا رہا تھا۔ وہ اسے بڑے تجسس سے تکنے لگی کہ دیکھوں اب آگے کیا ہوتا ہے۔

"یہ میرے بچے کی آواز ہے" سفید ملکہ بادشاہ کے پاس سے جھپٹ کر گزرتے چیخ اٹھی۔ اتنی تندی سے کہ اس نے بادشاہ کو انگاروں میں پٹخ دیا "میری راج دلاری للی۔ میری لعل جیسی شہزادی بلونگڑی!" اور سفید ملکہ آتشدان کے جنگلے کی دیوار پر دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔

"شہزادی۔ میرا پاؤں!" بادشاہ، جسے گرنے سے اچھی خاصی چوٹ آئی تھی اپنی ناک سہلاتے ہوئے بولا۔ اسے ملکہ سے تھوڑا سا برہم ہونے کا حق بھی تھا۔ آخر سر سے پاؤں تک راکھ میں لتھڑا بھوت بھی تو وہ بے چارا ہی بنا تھا۔

ایلس بڑی بے تاب تھی کہ میں کچھ کام آؤں اور چونکہ چھوٹی للی بلا بلا کر بے حال ہوتی جا رہی تھی، ایلس نے جلدی سے ملکہ کو اٹھایا اور میز پر اپنی دہائی مچاتی چھوٹی بیٹی کے پہلو میں رکھ دیا۔

ملکہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور وہ بیٹھ گئی۔ ہوا میں سے تیز سفر نے اس کا سانس خشک کر دیا تھا اور ایک دو منٹ تک سوائے اُسکے کہ چپ چاپ اپنی بیٹی کو اپنے سے چمٹائے رکھے اس سے کچھ اور بن نہ پڑا۔

جونہی اس کا قدرے دم میں دم آیا اور ہوش حواس قائم ہوئے اس نے سفید بادشاہ کو آواز دی (وہ راکھ کے بیچ میں اکھڑا اکھڑا بیٹھا تھا) "آتش فشاں پہاڑ کا خیال کرو!"

"کونسا آتش فشاں پہاڑ" بادشاہ نے آگ میں بے چین نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ جیسے کہ وہ سمجھتا ہو کہ یہ چیز وہیں کہیں موجود ہوگی۔

"اس نے مجھے اوپر پھونک اڑایا" ملکہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ابھی تک اس کا سانس کچھ کچھ چڑھا تھا۔ "خبردار رہنا۔ باقاعدہ۔ مناسب راستے سے آنا میری طرح پھک سے اڑ کر نہ آنا ادھر!"

ایلس سفید بادشاہ کو سلامتی سے سلام تک گھٹتے گھسٹتے ہوئے نکتی رہی حتی کہ وہ مزید نہ سکی۔

"بھلے آدمی! اس چال سے تو تمہیں میز تک پہنچنے میں گھنٹے لگ جائیں گے۔ کیا اس سے کہیں اچھا نہیں ہو گا کہ میں تمہاری مدد کروں" مگر بادشاہ نے اس سوال کو قابل التفات نہ جانا۔ یہ اب بالکل واضح تھا کہ ایلس کو وہ نہ سن نہ دیکھ سکتا تھا۔

سو ایلس نے اُسے نہایت نرمی سے ہاتھ میں لیا اور آہستہ اس سے زیادہ آہستگی سے اٹھایا جس سے اس نے ملکہ کو اٹھایا تھا تاکہ اس کا سانس حلق میں نہ اٹک رہے۔ مگر میز پہ دھرنے سے پہلے اس نے سوچا کہ کیوں نہ بے چارے کی تھوڑی بہت جھاڑ پونچھ کر دوں۔ وہ بالکل بھبھوت ملا جوگی لگتا تھا۔ اس نے بعد میں یہ کہا کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں ویسا منہ نہیں تھا۔ جیسا کہ بادشاہ نے اس وقت بنایا جب ایک نہ نظر آنے والے ہاتھ نے اسے ہوا میں پکڑے رکھا اور اسکی آواز تک نکل سکی۔ اس کی راکھ پونچھی جانی مگر اسکی آنکھیں اور اس کا چہرہ پھیل کر بڑے اور بڑے ہوتے گئے۔ یہ دیکھ کر ایلس کو ہنسی کا دورہ پڑا تو اس کا ہاتھ ہلنے لگا اور بادشاہ سلامت کو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے فرش پہ آ رہنے میں بس تھوڑی سی کسر رہ گئی۔

"اُف۔ دیکھو۔ میرے پیارے۔ ایسا منہ تو نہ بناؤ" وہ چلا اٹھی۔ بالکل یہ بھولتے ہوئے کہ بادشاہ کو اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی" تم مجھے اتنا ہنسا رہے ہو کہ میں بمشکل ہی تمہیں پکڑے رکھ سکتی ہوں۔ اور بھائی جی! یہ اپنا منہ اس قدر تو نہ پھاڑو۔ ساری راکھ اس کے اندر چلی جائے گی۔ چلو۔ اب میرا خیال ہے تم کافی صاف ستھرے ہو گئے ہو"۔ اس نے اضافہ کیا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بالوں کو ہاتھ پھیر کر جمایا اور بادشاہ کو ملکہ کے پہلو میں میز پہ کھڑا کر دیا۔

بادشاہ فوراً چاروں شانے چت گر گیا اور ساکت پڑا رہا۔ یہ حالت دیکھ کر ایلس اپنی کارگزاری پہ شدید مشوش ہوئی اور کمرے میں گھومتی پھری کہ کہیں کوئی پانی مل جائے جو اس کے اوپر ٹپکاؤں اور چھینٹے دوں پر اسے سوائے سیاہی کی دوات کے اور کچھ نہ ملا اور جب وہ اس کو لیے لوٹ کر آئی تو اس نے دیکھا کہ بادشاہ سلامت کی طبیعت بحال ہو گئی ہے اور ملکہ ایک خوفزدہ سرگوشی میں آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ اتنی نیچی سرگوشی میں کہ وہ ان کی باتوں کو بڑی مشکل سے سن پائی۔

بادشاہ کہہ رہا تھا" جان من یقین کرو۔ میں تو اپنی مونچھ کی نوکوں تک سرد برف ہو گیا"

"اس کا ملکہ نے یہ جواب دیا۔" مونچھ تو تمہاری ہے ہی نہیں"

"اس لمحے کی دہشت!" بادشاہ کہتا رہا" میں کبھی بھی نہ بھولوں گا"

"ویسے تم بھول ضرور جاؤ گے" ملکہ نے کہا" اس کی یاد داشت ڈائری میں نوٹ کر لو تو دوسری بات ہے۔ ایلس نے بڑی دلچسپی سے دیکھا کہ بادشاہ نے ایک بڑی سی روزنامچے کی کتاب اپنی جیب سے برآمد

کی اور اس میں لکھنے لگا۔ ایک ناگہانی خیال اس کو آیا اور اس نے پنسل کے سرے کو جو بادشاہ کے کندھے سے کافی اوپر تک آیا ہوا تھا، ہاتھ میں لیا اور بادشاہ کی طرف سے خود لکھنے لگی۔

غریب بادشاہ بڑا بوکھلایا ہوا اور ناخوش لگتا تھا اور کچھ کہے بغیر اس نے تھوڑی دیر تو پنسل کے ساتھ کھینچا تانی کی۔ مگر ایلس کا مقابلہ وہ کیونکر کر سکتا تھا۔ آخرکار اس کا دم پھول گیا اور وہ ہانپ ہانپ کر بولا "جان۔ م۔ ن۔ یں۔ مجھ کو اس سے پتلی پنسل درکار ہے۔ اس کو سنبھالنا تو میرے بس سے باہر کی بات ہے۔ یہ تو ایسی ایسی باتیں لکھ رہی ہے جو میرے وہم میں بھی نہیں اور نہ ہی جن کو لکھنے کا میرا ارادہ ہے!"

"کس قسم کی باتیں" ملکہ نے کتاب کے اوپر جھانکتے ہوئے کہا۔ (کتاب میں ایلس کے ہاتھ میں بادشاہ کی پنسل نے یہ عبارت لکھی تھی "سفید گھوڑا آگ کریدنی پر سے رپٹتا آ رہا ہے!"

ملکہ بادشاہ سے بولی "یہ تو تمہارے احساسات کی یادداشت نہیں!"

ایلس کے قریب میز پر ایک کتاب رکھی تھی اور جب وہ بیٹھی سفید بادشاہ پر نظر جمائے تھی (کیونکہ ابھی تک وہ اس کے بارے میں کچھ فکرمند تھی کہ کہیں وہ دوبارہ غش نہ کھا جائے اور وہ اس پر سیاہی انڈیلنے کے لیے پوری طرح تیار تھی) اس نے کوئی ایسا حصہ ڈھونڈنے کے لیے جسے وہ پڑھ سکے اس کتاب کے ورق الٹے۔

"یہ ایک ایسی زبان میں ہے" اس نے اپنے باپ سے کہا "جو مجھے نہیں آتی" یہ عبارت اس طرح تھی۔

گربڑاکی

برس برس مچلاوسش کھاڑی کو چکنائے
مچھل گا بڑ گو بڑ گہنم فلٹائے
سب الو بلو کلو چڑھ اوپٹل کھاڑ
مینیا استرا فاخو پر کچھ نہ اس کو آئے
گڑ بڑ گڑ بڑاکی سے بچ کر رہو بیٹے
جبڑے اس کے کاٹیں ناخن تیز بہت
جب جب، نام پرندہ اس سے بچنا لازم
اور بجزیلا سانتو فوربس! وہ بڑا تیز بہت
اور ہاتھ میں لے لی اس نے اپنے گھوبلی تلوار
دشمن ڈھونڈا ادھر ادھر بارہ تیو بار

تھام کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا ستانے
کھڑا ہو کر پیڑ کے نیچے لگا وہ گانے گانے
کھرڑے کھرڑے اور گاتے گاتے آیا اس کے پاس
سائنو فوزسن ۔ گرد بلا کی اور مٹیالی
منہ سے اس کے دھواں نکلے ۔ آنکھیں لال چقندر
شورکتا جنگل سے نکلا اور بولا شا ۔ شاباش

"گیت تو بڑا خوبصورت لگتا ہے" اس نے نظم پڑھ چکنے کے بعد کہا "لیکن کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آتا۔" (تم جانو! وہ خود اپنے سامنے کبھی یہ تسلیم کرنا پسند نہیں کرتی تھی کہ اس کی اسے بالکل سمجھ نہیں آئی)۔ "کس طرح اس نظم کے پڑھنے سے بہت سارے خیالات میرے ذہن میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ گو میں صحیح صحیح نہیں بتا سکتی کہ وہ ہیں کیا۔ جیسے کوئی کسی کو مارنے پر تلا تھا۔ یہ تو میرے خیال میں واضح ہے۔"

"لیکن اوہ" ایلس یک لخت اچھل کھڑی ہوئی اور سوچنے لگی "اگر میں جلدی نہیں کروں گی تو بیشتر اس کے کہ میں دیکھ سکوں کہ باقی گھر کیسا ہے۔ مجھے پھر آئینے میں سے واپس پرانے کمرے میں جانا پڑے گا۔ چلو پہلے باغ پر تو ایک نظر ڈالیں۔"

اور ایک لحظے میں وہ کمرے سے باہر تھی اور زینہ پھلانگنے لگی۔ یا کم از کم ٹھیک ٹھیک پھلانگنا تو نہیں کہہ سکتی مگر (جیسا کہ ایلس نے خود کہا) یہ سیڑھیوں پر سے آسانی اور جلدی سے اترنے کا ایک نیا ایجاد کردہ طریقہ تھا۔ اس نے بس اپنی انگلیوں کے پور زینے کے جنگلے پر ٹکائے اور پاؤں سے سیڑھیوں کو چھوئے بغیر مزے اور آرام سے نیچے تک بہتی چلی آئی پھر وہ اسی طرح بڑے ہال کمرے میں سے بہتی ہوئی گذری اور اسی طریقے سے سیدھی دروازے میں سے باہر پہنچ جاتی مگر اس نے عقل سے کام لے کر دروازے کے کواڑ کو پکڑ لیا۔ ہوا میں اتنی دیر تک یوں بہنے کے بعد اس کا سر چکر کھانے لگ گیا تھا۔ اور وہ خود کو پھر قدرتی طریقے سے چلتے ہوئے پا کر کافی خوش ہوئی۔

جیتے ہوئے پھولوں کا باغ

باغ کا منظر مجھے زیادہ اچھا دکھائی دے گا" ایلس نے خود سے کہا "اگر میں کسی طرح پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ سکوں اور ایلو یہ رہا وہ راستہ جو سیدھا اوپر تک جاتا ہے۔ نہیں بھائی یہ راستہ سیدھا اوپر تو نہیں جا رہا اس لیے کہ راستے پر چند گز چلنے اور بہت سے تنگ موڑ مڑنے کے بعد اسے اس کے متعلق اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آخرکار یہ پہنچے گا چوٹی کے اوپر تک مگر یہ کتنے عجیب طریقے

سے پیچ کھاتا جا رہا ہے۔ راستے کی بجائے یہ تو کسی کارک سکرو کی سی بات ہے۔ ہاں تو! یہ موڑ شاید پہاڑی پہ جائے گا۔ نہیں۔ یہ تو سیدھا واپس گھر کی طرف جاتا ہے۔ ہاں تو میں دوسری سمت چل کے دیکھتی ہوں۔"

ایسا ہی اس نے کیا وہ کبھی اوپر جاتی۔ کبھی نیچے آتی اور ایک موڑ کے بعد دوسرے موڑ پر چل کے دیکھتی ۔ لیکن جو کچھ بھی وہ کرتی راستہ واپس گھر کی طرف پلٹنے لگتا۔ اور ہاں ایک بار جب وہ معمول سے زیادہ پھرتی سے ایک کونے پر سے مڑی تو پیشتر اس کے کہ وہ اپنے کو روک سکتی اس کونے سے جا ٹکرائی۔

"اس کے متعلق تمہارا بات کرنا فضول ہے" ایلس نے گھر پر نگاہ ڈالتے اور جھوٹ موٹ یہ فرض کرتے ہوئے کہ گھر اس کے ساتھ بحث کر رہا ہے کہا "میں ابھی تو اندر آنے سے رہی وہ اس لیے کہ جو میں نے ایسا کیا تو مجھے آئینے کے بیچ میں سے گزرنا اور پرانے کمرے میں جانا پڑے گا اور میری یہ سیر ختم ہو جائیں گی۔"

سو بڑے عزم سے گھر پر اپنی پیٹھ پھیر کر وہ پھر راستے پر چل پڑی۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ اس وقت تک ناک کی سیدھ چلتی جائے گی جس وقت تک کہ پہاڑی پر نہیں پہنچ جاتی۔ چند منٹ تو سب کچھ ٹھیک رہا اور وہ اپنے سے کہنے لگی تھی "اس بار تو واقعی میں ۔۔" کہ راستہ یکبارگی مڑا اور زور سے ہلا بھی (ایلس نے بعد میں اس طرح بیان کیا) اور اگلے لمحے دیکھتی کیا ہے کہ دروازے میں سے گھر کے اندر چلی جا رہی ہے۔

"اف یہ تو بڑی مصیبت ہے" وہ چلائی "میں نے ایسا خواہ مخواہ دخل در معقولات دینے والا گھر تو کبھی دیکھا نہیں۔ جدھر جاؤ۔ یہ موجود!"

خیر پہاڑی ساری کی ساری اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ اس لیے سوائے اس کے کہ وہ دوبارہ اس پر چڑھنے کو روانہ ہو چلتی اور کرتی بھی کیا! اس بار وہ ایک بڑے پھولوں کے تختے پر آئی۔ حاشیے میں ڈیزی کے پھول کھلے تھے اور بیچ میں ایک بانکا بید کا پیڑ اگا تھا۔

"او۔ سوسن" ایلس نے ایک پھول کو خطاب کرتے ہوئے کہا جو ہوا میں بڑے البیلے انداز میں جھومتا تھا "کاش تم بات کر سکتے!"

"ہم بات کر سکتے ہیں" سوسن نے کہا "جب کوئی ایسا آدمی ہو جس سے بات کی جا سکتی ہو!"

ایلس اس پر اتنی ششدر رہ گئی کہ ایک منٹ تک اس سے بولا نہ گیا۔ اس کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا سانس باہر رہ گیا۔ آخر چونکہ سوسن پھر خاموش جھومنے لگا تھا۔ وہ پھر ایک سہمی آواز میں بولی تقریباً سرگوشی میں "کیا سب پھول باتیں کر سکتے ہیں؟"

"اتنی ہی اچھی طرح جیسے تم" سوسن نے کہا "اور کہیں زیادہ اونچی آواز میں۔"

"تم جانو۔ گفتگو میں پہل کرنا ہم پھولوں کے نزدیک خوش اخلاقی نہیں"، گلاب کا پھول بولا" اور میں واقعی سوچ رہا تھا کہ تم کب کوئی بات کرو گی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا:۔
اس لڑکی کا چہرہ اگرچہ زیادہ ہوشیار تو نہیں پر اس سے کچھ عقل بوجھ ضرور جھلکتی ہے۔ ویسے تم ہو ٹھیک اور موزوں رنگت کی۔ اور تم جانو۔ اس سے بڑا فرق پڑتا ہے۔"

"میں رنگت کی فکر نہیں کرتی" سوسن بولی" اگر اس کے پتے تھوڑے سے کچھ اور لہراتے ہوئے ہوتے تو یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوتی۔"

ایلس کو یہ نکتہ چینی مطلقاً نہ بھائی۔ اس لیے اس نے سوال پوچھنے شروع کر دیئے "کیا تم لوگ یہاں پر لگے ہونے پر جہاں تمہاری رکھوالی کرنے والا کوئی نہیں، کبھی خوف زدہ نہیں ہوتے؟"

"بیچ میں وہ برج ہے" گلاب نے کہا" اور اس کا فائدہ ہے کیا؟"

"لیکن اگر کسی طرف سے کوئی خطرہ ہو تو وہ کیا کر سکتا ہے؟" ایلس نے دریافت کیا۔

"وہ بھونک تو سکتا ہے اور کچھ نہیں تو" گلاب نے کہا۔

"وہ آواز لگاتا ہے۔ 'ووہ۔ شاخ۔ ووہ'" ایک ڈیزی نے کہا" اسی لیے اس کی ٹہنیوں کو شاخ کہتے ہیں۔"

"تم یہ نہیں جانتیں تھیں" دوسری ڈیزی چلائی اور وہ سب ایک ساتھ چیخنے چلانے لگے۔ یہاں تک کہ ننھی ننھی تیز آوازوں سے معمور ہو گئی۔

"سب لوگ خاموش ہو جائیں" سوسن نے شدید جذبات سے مغلوب ہو کر جھومتے ہوئے اور اضطرابی کیفیت میں کپکپاتے ہوئے کہا" وہ جانتے ہیں کہ میں ان تک نہیں پہنچ سکتا،" (اس نے لرزتے سر کو ایلس کی طرف جھکاتے اور ہانپتے ہوئے کہا) ورنہ کیا مجال جو وہ ایسا کرنے کی ہمت کرتے۔

"چلو کوئی بات نہیں" ایلس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا اور وہ ڈیزیوں کے اوپر جو پھر اپنا ہنگامہ و تشنیع شروع کر رہی تھیں، جھکی اور انہیں سرگوشی میں ڈانٹ پلا رہی تھی" تم زبان بند نہیں کرو گی تو ابھی میں تمہیں چن لوں گی۔"

ایک لمحے میں خاموشی ہو گئی اور کئی گلابی ڈیزیاں سفید پڑ گئیں۔

"بس یہ اچھا کیا تم نے" سوسن نے کہا" یہ ڈیزیاں سب سے بڑھ کر بدتمیز اور منہ پھٹ ہیں۔ جب ایک بولتی ہے تو سب شروع ہو جاتی ہیں اور جس طرح سے یہ کتر کتر کرتی چلی جاتی ہیں، اچھا بھلا شریف آدمی مرجھا نے

لگتا ہے۔"

"یہ کیونکر ہے کہ آپ نے اتنی اچھی اچھی باتیں کر لیتے ہیں" ایلس نے سوسن کو داد دے کہ اس کے پر طیچ پڑے پن کو مدد کرنے سے کہا "میں پہلے بھی کئی باغوں میں گئی ہوں مگر کسی بھی پھول کو بولنا نہیں آتا تھا۔"

"اپنا ہاتھ نیچے رکھو۔ اور زمین کو چھوؤ۔ ٹھیک" سوسن نے کہا" اور تمہیں خود ہی معلوم ہی جائے گا۔" ایلس نے ایسا ہی کیا۔

"یہ تو بڑی سخت ہے" وہ بولی" مگر تمہارے بولنے کا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت سے باغوں میں" سوسن بولا" وہ پھول کی سیج کو بڑا نرم رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ پھول ہمیشہ سوتے رہتے ہیں۔"

یہ ایک بڑی معقول وجہ معلوم ہوتی تھی اور ایلس اسے جان کر بڑی خوش ہوئی۔

"مجھے تو پہلے کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا" اس نے کہا۔

"میری رائے یہ ہے کہ تم کبھی سوچتی ہی نہیں ہو" گلاب نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ "سوچو تو کوئی خیال بھی آئے۔"

"میں نے ساری عمر اس سے زیادہ احمق لڑکی نہیں دیکھی" ایک بنفشے کا پھول یکبارگی بول اٹھا اور ایلس اس پر چونک پڑی کیونکہ اس نے پہلے بات نہیں کی تھی۔

"زبان بند رکھو" سوسن بولا" جیسے تم نے کبھی کسی کو دیکھا ہو۔ سر تو تم اپنا ہمیشہ پتوں میں دیئے رکھتے ہو اور وہاں پڑے خراٹے لیتے رہتے ہو۔ یہاں تک کہ تمہیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دنیا جہاں میں کیا ہو رہا ہے۔ ایک کلی بھی تم سے زیادہ جانتی ہوگی۔"

"کیا میرے علاوہ اس باغ میں کوئی اور لوگ بھی ہیں" ایلس نے گلاب کی پچھلی بات کو توجہ نہ دیتے ہوئے کہا

"باغ میں بس ایک پھول تمہاری طرح کا ہے جو تمہاری ہی طرح چل پھر سکتا ہے" گلاب بولا" میں حیران ہوں کہ یہ تم کیسے کرتی ہوگی۔" "تم ہمیشہ حیران ہی ہوتے رہتے ہو" سوسن نے کہا، لیکن وہ تم سے زیادہ جھاڑی دار ہے۔"

"کیا وہ مجھ جیسی ہے" ایلس نے شوق سے دریافت کیا۔ کیونکہ اس کے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ ضرور باغ میں کہیں ایک اور چھوٹی سی لڑکی ہے۔

" اچھا تو۔ اس کی شکل بھی ہے تو تمہاری طرح بے ڈھب سی" گلاب نے کہا" لیکن اس کی رنگت زیادہ سرخ ہے اور میرا خیال ہے اس کی پنکھڑیاں کچھ چھوٹی ہیں۔"

" وہ ڈھالیا کے پھول کی طرح کچھ چھوٹی چھوٹی ترشی ہوئی ہیں" سوسن نے کہا" تمہاری طرح پریشان پھرتی نہیں۔"

"مگر یہ تمہارا قصور نہیں ہے" گلاب نے تلطف کا مظاہرہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ "تم اب مرجھانے لگی ہو۔ تم جانو! اور جب یہ وقت آتا ہے تو کوئی بھی پھول کا اپنی پنکھڑیوں کے کچھ بے ترتیب ہونے پر بس نہیں رہتا۔"

ایلس کو یہ خیال ذرا بھی پسند نہ آیا۔ اس لیے موضوع کے بدلنے کی خاطر اس نے پوچھا "وہ کبھی ادھر آتی بھی ہے؟"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ تم جلد ہی اسے دیکھ لوگی" گلاب نے جواب دیا "وہ اس قسم کی ہے جس کے تم جانو نو ڈھنٹل ہوتے ہیں۔"

"وہ ان کو پہنتی کہاں ہے؟" ایلس نے کچھ تجسس سے پوچھا

"ہاں تو! اپنے سر کے چاروں طرف، اور کہاں!" گلاب نے جواب دیا "مجھے حیرت تو ہو رہی ہے کہ تمہارے کیوں نہیں، میرا خیال تھا یہ باقاعدہ اصول ہے۔"

"وہ آ رہی ہے" لارکسپر کا پھول بولا "میں اس کے بجری کے راستے پر پڑنے کی دھپ دھپ سن رہا ہوں"

ایلس نے بے تابی سے نظر اٹھا کر دیکھا کہ سرخ ملکہ چلی آ رہی ہے۔

"واہ یہ تو کافی بڑی ہو گئی ہے" ایلس نے اسے دیکھ کر پہلی بات یہی کی ... اور سچ مچ وہ بڑھ ضرور گئی تھی۔ جب ایلس نے پہلے پہل اسے راکھ میں پڑا پایا تھا۔ وہ صرف تین انچ اونچی تھی۔ اور یہاں وہ اب خود ایلس سے بھی ایک ہاتھ اونچا قد نکالے تھی۔

"یہ سب تازہ ہوا کا فیض ہے" گلاب نے کہا "کیا تروتازہ عمدہ ہوا ہے یہاں پر"

"میرا خیال ہے، میں جا کر اس سے ملتی ہوں" ایلس نے کہا۔ اگرچہ پھول بات چیت میں دلچسپ تھے۔ ایلس نے محسوس کیا کہ ایک اصلی ملکہ سے گفتگو کرنا بڑا شاندار ہوگا۔

"تم کسی ممکن طریق سے یہ نہیں کر سکتیں" گلاب نے کہا "میں تمہیں صلاح دیتا ہوں کہ دوسری سمت چلنے کی کرو۔"

ایلس کو یہ صلاح مہمل سی لگی۔ اس لیے وہ بولی کچھ نہیں اور فوراً سرخ ملکہ کی طرف چل پڑی۔ حیرت سے اس نے دیکھا کہ ایک لمحے میں سرخ ملکہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور وہ ایک دفعہ پھر گھر کے سامنے کے دروازے سے اندر چلی جا رہی تھی۔

اس پر جھلاہٹ میں وہ پیچھے ہٹی اور ملکہ کو ہر طرف تلاش کرنے کے بعد (جب آخرکار اُس کی نظر پڑ ہی گئی تو وہ بہت دور چلی جاتی تھی) اس نے سوچا کہ اس بار بالکل الٹی سمت کو چلنے کی ترکیب آزما کر

دیکھوں۔

اور یہ ترکیب بڑی خوبی سے کامیاب ہوئی۔ وہ ایک منٹ ہی چلی ہوگی کہ اس نے خود کو سرخ ملکہ کے روبرو پایا اور وہ پہاڑی جس کا اس نے قصد کیا تھا۔ بالکل اس کی نظروں کے سامنے تھی۔

"تم کہاں سے آئی ہو؟" سرخ ملکہ نے کہا "اور کدھر جا رہی ہو۔ اوپر میری طرف دیکھو، تیزی سے بات کرو اور یہ ہر وقت اپنی انگلیوں کو گھماتی نہ جاؤ۔"

ایلس نے ان سب ہدایات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا اور اتنی اچھی طرح جیسا کہ وہ کر سکتی تھی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح وہ اپنا راستہ کھو بیٹھی ہے۔

"میں نہیں جانتی کہ اپنے راستے سے تمہاری کیا مراد ہے" ملکہ نے کہا "یہاں کے سب راستے میری ملکیت ہیں۔ لیکن تم یہاں آخر آئی کیوں نکلیں؟" اس نے ایک زیادہ شفیق لہجے میں اضافہ کیا۔ "ہاں ا جب تم سوچ رہی ہو کیا کہوں تو لڑکی اتنا عرصہ آداب بجالاتی جاؤ۔ اس سے وقت کی بچت ہوتی ہے۔"

ایلس اس بات پر حیران ضرور ہوئی مگر اس پر ملکہ کی اتنی دہشت طاری تھی کہ اسے ملکہ کی بات کا یقین کرتے ہی بنی۔

"گھر لوٹ کر میں یہ کر کے دیکھوں گی" اس نے اپنے آپ میں سوچا "اب کے جب مجھے کھانے پر کچھ دیر ہوئی تو۔"

"اب تمہارا جواب دینے کا وقت پورا ہو چکا ہے" ملکہ نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "بولتے وقت اپنے منہ کو ذرا زیادہ کھولتے ہیں اور ملکہ کو ہمیشہ حضور ملکہ عالیہ کہہ کر خطاب کرتے ہیں کیا تمہیں یہ سکول میں نہیں پڑھایا گیا؟"

"حضور ملکہ عالیہ۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ باغ کس قسم کا ہے۔"

"یہ درست ہے۔ شاباش" ملکہ نے ایلس کا سر تھپکتے ہوئے کہا (ایلس کو یہ بات بالکل نہ بھائی) اگرچہ جب تم "باغ" کہتی ہو۔ تو لڑکی! میں نے ایسے ایسے باغات دیکھے ہیں جن کے سامنے یہ باغ اجاڑ بیابان لگے گا۔"

ایلس نے اس بات پر بحث کرنے کی ہمت نہ کی اور اپنی بات جاری رکھی "اور میں نے سوچا کہ میں کوشش کروں گی اور اس پہاڑی کے اوپر جانے کا راستہ تلاش کروں گی۔"

"جب تم پہاڑی کا نام لیتی ہو تو" ملکہ نے دخل دیا "میں تمہیں ایسی ایسی پہاڑیاں دکھا سکتی ہوں جن کے مقابلے میں یہ پہاڑی بالکل وادی لگتی ہے۔"

"نہیں۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں" ایلس نے کہا۔ ملکہ کی بات پر وہ اتنی حیران ہوئی کہ آخرکار اسے جھٹلائے بغیر اس سے نہ رہا گیا "آپ سمجھیں۔ ایک پہاڑی وادی کیونکر ہو سکتی ہے۔ یہ تو مہمل لایعنی سی بات ہے۔

سرخ ملکہ نے سر ہلایا "تمہارا جی چاہے تو تم اسے مہمل یا جو مرضی ہے کہہ سکتی ہو" اس نے کہا "مگر میں نے ایسی ایسی مہمل باتیں سنی اور دیکھی ہیں۔ جن کے مقابلے میں یہ بات اتنی ہی عقل اور سمجھ کی ہے جتنی ڈکشنری"

ایلس جھک کر آداب بجا لائی کیونکہ ملکہ کے لہجے سے برہمی اور رنجش کا گمان ہوتا تھا اور وہ خاموش چلتی گئیں۔ حتیٰ کہ چھوٹی پہاڑی کی چوٹی پر جا پہنچیں۔

کچھ منٹوں تک تو ایلس بات کئے بغیر نظر نیچے دوڑاتی، کھڑی رہی۔ اور کتنا عجیب منظر یہ تھا! اس میں کئی ننھے ننھے جھرنے ایک طرف سے دوسری طرف بالکل سیدھ میں بہتے تھے اور بیچ کی زمین میں چھوٹی سبز باڑ کی جھاڑیوں نے حاشیے ڈال کر مکمل مربعے بنا رکھے تھے۔ یہ جھاڑیاں ایک جھرنے سے دوسرے جھرنے تک چلی گئی تھیں۔

"میں یقین سے کہہ سکتی ہوں" ایلس نے کہا "کہ شطرنج کے ایک بڑے بورڈ کی طرح اس پر خانے بنے ہیں۔"

"ویسے ادھر ادھر چلتے پھرتے آدمی بھی کہیں ہونے چاہئیں! ہیں تو!"

اس نے خوشی کے لہجے میں اضافہ کیا "یہ ایک بہت بڑی وسیع شطرنج کی بازی ہے۔ جو ساری دنیا میں کھیلی جا رہی ہے۔ تم جانو! اگر یہی ساری دنیا ہے ... آہ۔ کتنا مزا آ رہا ہے! کاش میں بھی ان مہروں میں سے ایک ہوتی۔ اگر کوئی مجھے اس میں شامل کرے تو مجھے پیادہ بننے میں بھی کچھ عار نہیں ہوگا۔ اگرچہ سب سے زیادہ تو میں ملکہ ہونا پسند کروں گی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے کچھ شرما کر اصلی ملکہ کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ مگر وہ اس بات پر بڑے خوشگوار انداز میں مسکرا دی اور کہنے لگی "اس کا انتظام تو آسانی سے ہو جاتا ہے۔ تم چاہو تو سفید ملکہ کا پیادہ بن سکتی ہو۔ کیونکہ سوسن ابھی اس کھیل کے لیے بہت چھوٹی ہے اور آغاز میں۔ سمجھیں! تم دوسرے مربعے میں کھڑی ہو۔ جب تم بڑھتی بڑھتی آٹھویں مربعے تک پہنچ چکو گی تم ملکہ ہو جاؤ گی۔"

اسی لمحے۔ کسی نہ کسی طرح۔ وہ دونو دوڑنے لگ گئیں۔

بعد میں اس بارے پر دوبارہ غور کرنے پر بھی ایلس یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ اس کی اور ملکہ کی یہ دوڑ شروع کیونکر ہوئی۔ اس کو فقط اتنا ہی یاد آتا ہے کہ ملکہ اور وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بھاگی جا رہی تھیں اور ملکہ اتنی تیز دوڑ رہی تھی کہ

کہ ایلس کو اس کے ساتھ قدم چلانے میں اپنا پورا زور لگانا پڑا۔ اور پھر بھی ملکہ چلائے چلی جاتی تھی اور تیز۔ اور۔ تیز!" مگر ایلس نے محسوس کیا کہ اس سے زیادہ تیز تو میں جا نہیں سکتی۔ اس کا سانس اتنا پھولا ہوا تھا کہ وہ ملکہ کو یہ بتا نہیں سکتی تھی

اس دوڑ کی سب سے عجیب چیز یہ تھی کہ ان کے اردگرد درخت اور دوسری چیزیں وہیں کی وہیں تھیں ان کی صورت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوتی تھی۔ جتنی بھی تیز وہ دوڑتیں۔ کسی چیز سے گزر کر نکل نہ پاتیں "سوچیں تو کیا یہ سب چیزیں بھی ہمارے ساتھ آگے دوڑ رہی ہیں" غریب بوکھلائی ہوئی ایلس سوچنے لگی اور ملکہ بھی گویا اس کے خیالات کو بھانپ گئی۔ کیونکہ وہ چلائی اور تیز! بولنے کی کوشش مت کرو"

یہ نہیں کہ ایلس کا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ تھا۔ وہ تو یوں محسوس کر رہی تھی کہ اب اس سے کبھی بھی نہیں بولا جائے گا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اور پھر بھی ملکہ چلائے جا رہی تھی " اور تیز" اور اس کو گھسیٹے جاتی تھی۔

"کیا ہم تقریباً وہاں پہنچ گئے ہیں" اس نے کسی نہ کسی طرح ہانپتے ہوئے یہ جملہ پورا کیا۔

" تقریباً وہاں!" ملکہ نے دوہرایا" اری۔ ہم تو وہاں سے دس منٹ ہوئے گزر بھی چکے۔ اور تیز"

اور وہ کچھ دیر خاموشی میں بھاگتی گئیں۔ ہوا ایلس کے کانوں میں سیٹی بجا رہی تھی۔ اور اس کے بالوں کو تقریباً اس کے سر پر سے اڑائے جا رہی تھی (ایلس کو یہی گمان تھا)

" اب! اب" ملکہ چیخی" اور تیز" اور وہ اتنی تیز ہو گئیں کہ آخر وہ ہوا میں سے اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور ان کے پاؤں زمین پر مشکل لگ رہے تھے۔ اچانک جب ایلس انتہائی تھک ہار چکی تھی۔ وہ رک گئے اور اس نے خود کو زمین پر بیٹھے ہوئے پایا۔ سر چکراتا ہوا اور بے دم نڈھال۔

ملکہ نے اسے ایک درخت کی ٹیک دے کر بٹھا دیا اور نرمی سے بولی" اب تم تھوڑا سستا لو" ایلس نے بڑی حیرانی سے اپنے اردگرد نظر دوڑائی" ارے! مجھ کو تو یقین ہے کہ ہم سارا عرصہ اس درخت کے تلے رہے ہیں۔ آس پاس کی ہر ایک شے اسی طرح ہے جیسے تھی۔"

" ہے تو! تم کیا کہتی ہو۔ نہ ہوتی" ملکہ نے کہا۔

" اچھا تو! ہمارے وطن میں" ایلس نے ابھی تک کچھ ہانپتے ہوئے کہا" تم عموماً کہیں اور پہنچ جاتے ہو۔ یعنی اگر تم بڑی دیر تک بڑی تیز دوڑو جیسے کہ ہم کرتی رہی ہیں"۔

" بڑا سست رفتار قسم کا وطن ہے تمہارا" ملکہ بولی" اب تم جانو! یہاں ایک ہی جگہ پر ٹھہرے رہنے کے لیے تمہیں اتنی دوڑ لگانی پڑتی ہے جتنی تم لگا سکتی ہو۔ اگر تم کہیں اور پہنچنا چاہتی ہو۔ تو تم کو اس سے کم از کم دوگنی تیز رفتاری سے دوڑنا ہوگا"

"میں یہ نہ ہی آزماؤں تو ٹھیک ہے" ایلس نے کہا "میں یہیں ٹھہرے رہنے پر بالکل خوش ہوں۔ مارے بدن میں آگ بھری ہے اور پیاس کے مارے برا حال ہے۔"

"میں جانتی ہوں تم کیا پسند کروگی۔ اس وقت" ملکہ نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا ساڈبہ نکالتے ہوئے خوش دلی سے کہا "لو۔ ایک بسکٹ کھاؤ۔"

ایلس سوچنے لگی کہ "نہیں" کہنا خوش اخلاقی سے بعید ہوگا حالانکہ بسکٹ کو اس کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اُسے لے لیا اور جتنی اچھی طرح اس سے ممکن تھا اُسے کھانے لگی۔ بسکٹ بہت خوش تھا اور اس نے سوچا کہ اپنی ساری عمر میں میرے گلے میں ایسی پھانس کبھی نہیں اٹکی۔"

"تم بسکٹ کھا کر تازہ دم ہو جاؤ" ملکہ بولی "اور میں اتنے میں ماپ وغیرہ لے لوں۔" اور اس نے ایک فیتا جس پر انچوں کے نشان تھے جیب سے نکالا اور زمین کی پیمائش کرنا شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہاں وہاں میخیں بھی ٹھونکتی جاتی۔

دو گز کے ختم ہونے پر اس نے فاصلے کے نشان پر میخ ٹھونکتے ہوئے کہا "میں تمہیں ہدایات دوں گی۔ ایک بسکٹ اور لو!"

"نہیں۔ آپ کا شکریہ" ایلس نے کہا "ایک بہت کافی ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ اب تمہاری پیاس بجھ گئی ہوگی" ملکہ نے کہا۔

ایلس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا کیا جواب دے۔ مگر خوش قسمتی سے ملکہ نے جواب کا انتظار نہ کیا اور آگے بولنے لگی "تین گز کے اخیر پر میں ان کو دہراؤں گی کہ کہیں تم انہیں بھول نہ جاؤ۔ چار کے آخر پر میں خدا حافظ کہوں گی اور پانچ کے آخیر پر میں روانہ ہو جاؤں گی۔"

اس نے اس وقت تک سب میخیں ٹھونک لی تھیں اور ایلس نے بڑی دلچسپی سے ملکہ کو درخت کی طرف لوٹ کر آتے اور پھر میخوں کی صف کے ساتھ ساتھ آہستہ سے چلتا دیکھا۔

دو گز والی میخ پر وہ ایلس کی طرف پلٹ کر بولی "ایک پیادہ پہلی چال میں دو خانے بڑھتا ہے۔ تم جانو! اس لیے تم تیسرے خانے میں سے بڑی جلدی سے گزرنے کی کوشش کروگی۔ میرا خیال ہے بذریعہ ریل گاڑی اور بس تم پلک جھپکنے میں چوتھے خانے میں ہوگی۔ اچھا تو وہ چوتھا خانہ ٹویڈل ڈی ڈم کا ہے اور پانچواں تو زیادہ تر پانی ہے۔ چھٹے میں ہمپٹی ڈمپٹی رہتا ہے۔ مگر تم نے میری ہدایات پر کچھ بھی تو نہیں کہا۔"

"میں۔ میں! مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت مجھے کچھ کہنا بھی ہے۔" ایلس نے اٹک اٹک کر کہا۔

"تمہیں کہنا چاہیے تھا" ملکہ پر متانت سرزنش کے لہجے میں بولی "حضور ملکہ عالیہ آپ کی انتہائی عنایت ہے کہ آپ نے مجھے یہ سب کچھ بتایا۔ خیر ساتواں خانہ سارے کا سارا جنگل ہے۔ وہاں ایک گھڑسوار

تمہیں راستہ دکھانے گا۔ اور آٹھویں [illegible] خانے میں ہم دونوں اکٹھی ملکہ بن کر راج کریں گی اور یہ خانہ جشن میلوں اور کھیل کود کا ہے"

ایلس اٹھ کھڑی ہوئی اور جھک کے آداب بجالائی۔ اور پھر بیٹھ گئی۔

اگلی میخ پر ملکہ نے پھر مڑ کر دیکھا اور اس بار اس نے کہا "جب تمہیں کسی چیز کی انگریزی نہ آئے تو فرانسیسی میں بولو۔ چلو۔ تو اپنے پاؤں کے پنجے اسلٹے کر لو۔ اور یہ یاد رکھو کہ تم کون ہو کون؟" اس نے ایلس کے آداب بجالانے کا انتظار نہ کیا اور جلدی سے اگلی میخ پر ٹپ ٹپ کرتی جا پہنچی۔ یہاں وہ اس وقت ایک لمحے کے لیے "خدا حافظ" کہنے کے لیے پلٹی اور پھر آخری میخ کی سمت تیز تیز جانے لگی۔

ایلس کو کبھی یہ پتہ نہ لگا کہ یہ ہوا کیونکر! مگر جونہی ملکہ آخری میخ پر پہنچی وہ چلی گئی۔ وہ ہوا میں گم ہو گئی یا تیزی سے جنگل میں بھاگ گئی (اور ایلس نے سوچا، اس میں کوئی شک نہیں کہ ملکہ بڑی تیز بھاگ سکتی ہے) یہ بتانا بہت مشکل تھا۔ بس وہ چلی گئی۔ اور ایلس کو یاد آیا کہ وہ ایلس ایک پیادہ ہے اور جلد ہی اُسے (چال) چلنا ہے۔

OO

دوگز زمین

مرکزی خیال ٹالسٹائی کی کہانی ،

HOW MUCH LAND DOES A MAN REQUIRE

سے لیا گیا ہے

•

تحریر :- امجد اسلام امجد

•

کردار

۱ - نور محمد ـــــ ہوٹل والا -

۲ - پہلا گاہک

۳ - رشیدہ ـــــ نوجوان لڑکی

۴ - چوہدری اشرف

۵ - بوڑھا

۶ - مسافر

۷ - سجاول

۸ - ایک آدمی

۹ - دوسرا آدمی

(چند اور آدمی)

...ہے کا چائے خانہ۔ ایک کمرے میں لکڑی کی دو تین میزیں اور آٹھ دس
شکستہ کرسیاں دھری ہیں۔ ایک طرف ایک چارپائی پڑی ہے۔ دروازے سے دائیں
ہاتھ چند چولہے بنے ہیں، جن پر چائے اور کھانا پکانے کے برتن دھرے ہیں۔ قدرے اونچی
جگہ پر چائے خانے کے مالک، نور محمد کے بیٹھنے کی سیٹ ہے۔ اس کے زانو کے قریب لوہے
کی ایک صندوقچی ہے جسے وہ کیش بکس کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ نور محمد ایک
جاہل، العمر، غریب، دیہاتی ہے۔)

(کیمرہ نور محمد کی دکان پر اوپن ہوتا ہے۔ چائے خانے میں چار پانچ دیہاتی مختلف میزوں پر بیٹھے
چائے پی رہے ہیں۔ ایک آدمی کھانا کھا رہا ہے۔ باہر ایسا شور ہے جیسے وہاں بسیں وغیرہ رکتی ہیں۔
نور محمد معمولی کپڑوں میں ملبوس ایک تھڑے میں چائے کے بھبھکے اور پرانے برتن لگا رہا ہے)

پہلا گاہک : ارے بھئی نورے، وہ تیرا لونڈا کدھر ہے آج، خود ہی چائے بنا رہے ہو۔"

نور : (چائے بناتے ہوئے) کیا بتاؤں چوہدری صاحب۔ میں تو تنگ آگیا ہوں اس سے۔ ہر وقت بیمار
رہتا ہے۔ کبھی پیٹ میں درد ہے، کبھی ٹانگیں دکھتی ہیں کبھی سر چکراتا ہے، کبھی آنکھیں خراب
ہیں۔ ایک مصیبت ہے۔

چوہدری اشرف : حکیم جی کو دکھانا تھا۔

نور : ادھر ہی گیا ہے تھا۔ بیماری دیمار، کوئی نہیں آسے ہلیں، کام چور ہے۔"

پہلا : نہیں یار وہ تو صورت سے ہی بیمار لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تم اسے کھانے کو ٹھیک نہیں دیتے!

نور : (چائے میز پر لگاتے ہوئے) کمال ہے چوہدری صاحب۔ کم بخت آدھی آدھی دیگچی ایک
وقت میں صاف کر دیتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ کھانے کو نہیں دیتا۔

اشرف : (پینک سے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے۔ ایک چسکی لیتا ہے) ارے چینی تو ڈالو اس میں،
ہمیں بھی کوئی شہری بابو سمجھا ہے، جو ایک ایک دانہ گن کر ڈالتے ہیں (پہلے گاہک سے) وہ
اپنے چوہدری احسان کا لڑکا ہے نا اکبرا

پہلا : اکبرا۔۔ ! کون !

اشرف : ارے، چوہدری احسان کا چھوٹا لڑکا۔ وہ جو شہر میں پڑھتا ہے۔

پہلا : ہاں۔ اکبر۔ کیا ہوا اسے۔

اشرف : (کسی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے) آیا ہوا ہے آج کل۔ کل میں چوہدری کے ہاں بیٹھا
بیٹھا تھا۔ چائے آئی۔ اب جو جناب چوہدری البرنے ایک گھونٹ بھرا ہے تو قیامت آگئی۔

وہیں تھوک دیتے۔ اور لگا نوکر کو گالیاں دینے!

پہلا : کیوں!

اشرف : کہنے لگا۔ چینی بہت مہنگی ہے۔ اب آدمی پوچھے بھئی چینی نہیں ڈالنی تو چائے کیوں پیتے ہو۔ (اپنی بات پر خوش ہو کر زور زور سے ہنستا ہے۔ پہلے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے۔ دونوں ہنستے ہیں)

اشرف : کیوں بھئی نورے، کوئی فلمی رسالہ نہیں آیا۔

نور : کیا بتاؤں چوہدری صاحب! ساری چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں۔ اب ایک روپے سے کم میں کوئی رسالہ نہیں ملتا۔ میں نے لینا ہی چھوڑ دیا ہے۔

اشرف : ہاں بھئی مہنگائی تو بہت ہو گئی ہے۔ کل بدر پور میں ایک ایکڑ اٹھائیس ہزار میں بکا ہے۔ پچھلے سال اٹھارہ میں بل رہا تھا مگر کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔

نور : (دلچسپی سے) اچھی زمین تھی؟

اشرف : ہاں ٹھیک ٹھاک ہے بس۔ کیوں!

نور : کچھ نہیں جی بس۔۔۔ اب تو زمینیں اور مہنگی ہوتی جا رہی ہیں۔ (ٹھنڈی سانس بھرتا ہے)

اشرف : (اخبار اٹھاتے ہوئے) پھر وہی زمین کا چکر! ارے تم اچھا خاصا کماتے ہو، اپنی دکانداری ہے، نہ کسی کا لینا نہ دینا۔ زمین میں کیا رکھا ہے۔

نور : (خلا میں گھورتے ہوئے) سب کچھ زمین میں ہی تو رکھا ہے۔ اگر میرے پاس زمین ہوتی تو میں بھی آپ لوگوں کی طرح چوہدری کہلاتا۔ کلف لگے کپڑے پہن کر، سر پر شملہ باندھ کر گھر سے نکلا کرتا، اپنی زمین پر آپ محنت کرتا۔ غلہ اگاتا۔ زمیندار کہلاتا۔

اشرف : (ہنستے ہوئے) کیا رکھا ہے زمیندار کہلانے میں۔ نام ہی نام ہے، کیا ہوتا ہے۔ ہمیں دیکھو ہم سب زمیندار کہلاتے ہیں۔ مگر کیا ہے ہمارے پاس۔ سارا سال محنت کرتے ہیں مگر پھر بھی پوری نہیں پڑتی۔۔

نور : عزت تو ہے آپ کے پاس۔ میرا کیا ہے، سارا دن بیٹھے روٹی کے چکر میں رہتا ہوں تب جا کر چار پیسوں کا منہ نظر آتا ہے۔ اوپر سے ہر کوئی نورے کا نورا

ایک بوڑھا : (چارپائی پر دوسرے بڑے کے ساتھ بیٹھا ہے) ہاں بہت اچھے ہو تم۔ شام کو چار پیسے تو ہوتے ہیں تمہارے پاس۔ ہماری طرح جان سولی پر تو نہیں ٹنگی رہتی۔ ہر وقت ایک نیا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ بارش۔ بیج۔ چوری۔ ڈنگر۔ الیکشن۔ بڑے ہیں روگ ہیں۔

زندگی عذاب بنی رہتی ہے۔ میری مالو تو تم سے بہت اچھے ہو۔

نور : یہ ٹوٹا پھوٹا ہوا (چاروں طرف دیکھتا ہے) چند برتن، پیٹیں، کرسیاں اور کیا ہے میرے پاس! ۔ سوچتا ہوں کسی طرح آتنا زمین مجھے مل جائے سب سے اور کچھ نہیں بس دوا۔ ہیوں کا سنہ پیا نکل آئے۔

پہلا : ارے یہ دوسرا کون ہے!

نور : دوسرا۔ ہے ایک! مگر وہ زمین کے بغیر مجھے نہیں مل سکتا۔

CUT

{ گاؤں کے باغ کا ایک کونا۔ نور محمد صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس رشیدہ سے باتیں کر رہا ہے۔ رشیدہ گاؤں کی ایک الھڑ جوان لڑکی ہے۔ }

رشیدہ : اے اللہ اب بس بھی کرو یہ باتیں۔ دیر ہو رہی ہے۔

نور : تمہیں کونسا دفتر جانا ہے۔ چلی جانا دو چار گھنٹے بعد۔

رشیدہ : اے ہے ہے۔ (نقل اتارتے ہوئے) چلی جانا دو چار گھنٹے بعد۔ میرے تائے کو پتہ چل گیا تو دونوں کو ہسپتال پہنچا دے گا۔

نور : اچھا ہے۔ وہاں اکٹھے رہیں گے۔

رشیدہ : بڑے ڈھیٹ ہو! اچھا اب میں چلتی ہوں!

نور : اوں ہوں! پھر وہی ضد! ایک تو میں تمہاری اس عادت سے بہت تنگ ہوں۔ اور کوئی بات نہیں آتی تمہیں۔ مجھے بھی تو دیکھو۔ دکانداری کا ہرج کر کے آیا ہوں!

رشیدہ : یہ بات نہیں نورے۔

نور : نور محمد۔ کم از کم تم تو مجھے نور محمد کہا کرو۔ اسی لیے کہتا ہوں کاش میرے پاس زمین ہوتی۔

رشیدہ : (افسردہ ہوتے ہوئے) زمین ہوتی تو رونا ہی کس بات کا تھا۔ (ایک دم کچھ یاد کرتے ہوئے) مگر تم نے مجھے یہ بات کیوں کہی ہے۔ کیا میں تمہیں زمین نہ ہونے کی وجہ سے نورا کہتی ہوں۔ ہیں، ذرا مجھے بتاؤ تو سہی۔

نور : ارے ارے تم تو ناراض ہو گئیں۔ میرا مطلب تھا۔ دراصل میں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ لوگ مجھے نور محمد کہیں۔ تم سے تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔

رشیدہ : (فیصلہ کن انداز میں) اچھا بھئی بس۔ اب مجھے جانے دو۔ ماں کو پہلے ہی شک پڑ چکا ہے۔

نور : (خوفزدہ ہو کر) کیا۔ تو کیا اُسے ۔ ۔ ۔

رشیدہ : ارے مرے کیوں جاتے ہو! اُسے پتہ نہیں کسی بات کا۔ اور اگر لگ بھی گیا تو کیا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو اس راز نے کھلنا ہی ہے۔

نور : اُس دن سے مجھے بہت خوف آتا ہے رشیدہ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ تمہارے تائے کو ہر وقت اپنی ناک کا خیال رہتا ہے۔ یہ بات کیسے طے ہو گی۔

رشیدہ : حوصلہ رکھو اور خدا سے دعا کرو۔ تقدیر سے کچھ دُور نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ غیب سے کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔

نور : (دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے) خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔

رشیدہ : (مٹھیاں کھولتے ہوئے) یہ کیا ہے۔ (ہاتھ میں ایک کنگن ہے)

نور : میں نے خریدا تھا تمہارے لیے۔ اصلی رولڈ گولڈ کا ہے!

رشیدہ : (احسان مندی اور شرم کے درمیان) مگر کیوں! تم نے ۔ ۔ کتنے اچھے ہو تم۔

نور : ذرا پہن کر دکھاؤ۔ پورا ہے۔

رشیدہ : (پہنتے ہوئے) بالکل پورا ہے۔

(کیمرہ رشیدہ کے کنگن کا کلوز لیتا ہے)

DISSOLVE

نور محمد کا ہوٹل — بڑھا بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ اشرف اخبار پڑھ رہا ہے اور چائے پی رہا ہے۔ نور محمد اپنی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا ہے

مسافر کی آواز : میں اِدھر بیٹھا ہوں۔ ٹائر لگ جائے تو مجھے بلا لینا۔ (اندر آتا ہے۔ قیمتی دیہاتی کپڑوں میں ملبوس ہے۔ کُرسی گھسیٹ کر بیٹھتا ہے۔ ایکدم اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) اوہ — بھئی یہ کرسیاں تو صاف رکھا کرو۔

نور : (تیزی سے اُٹھ کر آتے ہوئے۔ ایک کپڑے سے کُرسی صاف کرتا ہے) او معاف کرنا جی۔ شاید پانی گر گیا تھا آپ اِدھر آجائیں (دوسری کرسی صاف کرتا ہے)

مسافر : (قدرے ناراضگی سے کپڑے سمیٹ کر بیٹھتا ہے) کیا ہے تمہارے پاس!

نور : چائے۔ کھانا۔ سب کچھ ہے جی۔

مسافر : (چاروں طرف دیکھتا ہے نظر برتنوں پر پڑتی ہے۔ کچھ سوچتا ہے) چائے ہی لے آؤ۔ پتی تازہ

ڈالنا اور کپ اچھی طرح صاف کرنا گرم پانی سے !

نور : (متاثر ہوتے ہوئے) بہت اچھا جناب۔ چائے کے ساتھ کچھ کھائیں گے آپ۔ بسکٹ، پیٹیز، کریم رول۔

مسافر : (پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) انکا ؤ کیسے ہیں۔

نور : (تیزی سے مڑتے ہوئے) ابھی لایا۔ (چائے بنانے لگتا ہے)

مسافر : (چاروں طرف دیکھ کر تھکاوٹ دور کرنے کے انداز میں انگڑائی لیتا ہے۔ اشرف سے) کوئی فالتو صفحہ ہو اخبار کا تو دیجئے گا۔

اشرف : (پورا اخبار دیتے ہوئے) لیجئے۔

مسافر : ارے نہیں، میرا مطلب تھا آپ شوق سے پڑھیئے میں تو ——

اشرف : میں بھی بس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ لیجئے، ویسے کوئی کام کی خبر نہیں ہے۔

مسافر : (اخبار لیتے ہوئے) اخبار بھی آج کل اخبار کم اور اشتہار زیادہ ہیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر خبریں نکالنا پڑتی ہیں۔

اشرف : ہاں کچھ چاشنی نہیں رہی اخباروں میں۔ وہی قتل۔ ڈاکے۔ ایکسیڈنٹ۔ لیڈروں کے اُلٹے سیدھے بیانات اور بس۔

مسافر : ایسی ایسی خبریں ہوتی ہیں۔ مگر یہ اخبار والے لکھتے ہی نہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے میں بہادر پور میں تھا وہاں کے جاگیردار سجاول خاں نے آج کل ایک عجیب و غریب اعلان کر رکھا ہے۔ لیکن اخبار والوں کو پتہ ہی نہیں۔

اشرف : بہادر پور والا سجاول خاں۔ وہ تو بہت چوٹی کا جاگیردار ہے۔

مسافر : سارے علاقے میں اس جتنی زمینیں کسی کے پاس نہیں۔

اشرف : کیا اعلان کیا ہے اُس نے !

مسافر : کہتا ہے دو ہزار روپے دے کر جتنی مرضی زمین لے لو۔

نور : (جو چائے کے برتن میز پر رکھنے والا تھا۔ برتن ہاتھ سے گرتے ہیں ٹوٹتے ہیں۔ اشرف اور مسافر چائے سے بچنے کے لیے اُچھلتے ہیں) کیا؟

مسافر : کیسے بے وقوف آدمی ہو تم۔ (اپنے کپڑے دیکھتے ہوئے) ابھی چائے گرانے لگے تھے۔

نور : مم... معاف کیجئے۔ دراصل آپ نے بات ہی ایسی کی تھی کہ... کیا کہہ رہے تھے آپ!

مسافر: تمہارا سر! چائے لاؤ جلدی سے!

نور: (برتن اٹھاتے ہوئے) جی بہتر — (معمولی وقفے کے بعد) وہ آپ زمین کی کیا بات کر رہے تھے۔

اشرف: دراصل اسے زمین دار بننے کا بہت شوق ہے۔ ہر وقت اسی کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔

نور: دو ہزار روپے میں زمین — کہاں ملتی ہے۔ . .

مسافر: بہادر پور میں۔

نور: (سوچتے ہوئے) بہادر پور — یہ کہاں ہے جی —

مسافر: ارے بھئی ضلع راول کی مشہور تحصیل ہے۔

نور: اوہ — کیا نام بتایا تھا آپ نے جاگیردار صاحب کا۔

مسافر: سجاول خان! مشہور آدمی ہے۔

نور: کیا مطلب — یعنی اگر میں دو ہزار روپے دے دوں تو زمین مجھے مل سکتی ہے۔

مسافر: یقیناً!

نور: کتنی۔

مسافر: جتنی تم چاہو۔

نور: (بے یقینی سے ہنستے ہوئے) آپ تو مذاق کرتے ہیں۔

مسافر: کمال ہے بھئی میں تم سے کیوں مذاق کروں گا۔ یقین نہیں تو پوچھ لو جا کر

نور: بنجر زمین ہے کیا!

مسافر: اکیدم زرخیز — نہری علاقہ ہے۔

نور: تو پھر — میرا مطلب ہے — کیسے ہو سکتا ہے یہ!

مسافر: ہو سکتا نہیں — ہو رہا ہے — جا کر خود پتہ کر لو — سورج نکلنے سے سورج غروب ہونے تک جتنی زمین پر تم چل کر نشان لگا لو — تمہاری۔

نور: (گرتی ہوئی پیالیاں سنبھالتے ہوئے) نہیں۔

مسافر: (غصے سے) تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔

نور: نہیں جی — میرا یہ مطلب تو نہیں۔ . . تو اگر میں . . . (سوچتا ہے)

DISSOLVE

باغ کا وہی کونا۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس نور محمد کندھے پر ایک
انتظار میں کھڑا ہے۔ انداز سے سخت بے چینی ظاہر ہوتی
ہے۔ رشیدہ آتی ہے

نور : (بے چینی سے لپکتے ہوئے) بہت دیر کر دی تم نے! (رشیدہ خاموش رہتی ہے) کیا بات ہے
تم اتنی چپ چپ کیوں ہو۔

رشیدہ : تو تم سچ مچ جا رہے ہو!

نور : (گڑگڑا کر) دیکھو رشیدہ۔ یہاں رہ کر تو میں ساری عمر تمہیں حاصل نہیں کر سکتا۔ میں ذرا ہل
والا ہوں اور تم چوہدری فضل الٰہی کی بیٹی ہو۔ تمہیں حاصل کرنے کے لیے مجھے چوہدری نور محمد
بننا ہے۔ مجھے جانا ہی پڑے گا۔

رشیدہ : لیکن۔

نور : خدا کے لیے میری راہ کھوٹی نہ کرو۔ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔

رشیدہ : کوئی اس طرح کی باتوں پر اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل پڑتا ہے۔

نور : وہ مسافر سچ کہہ رہا تھا رشیدہ۔

رشیدہ : میرا دل نہیں مانتا۔

نور : اب جو ہو سو ہو۔ ہوٹل تو میں نے بیچ دیا۔ پیسہ پیسہ کر کے کچھ رقم جمع کر رکھی تھی اسب مل ملا کر
تین ہزار ہو گئے ہیں۔ دو ہزار زمین کے دوں گا اور۔۔۔۔

رشیدہ : دو ہزار میں بھلا کہیں زمین ملتی ہے۔۔۔ اور اگر مل بھی گئی تو کیا ہو گی۔ مجھے تو یہ سب کوئی چکر
لگتا ہے۔

نور : (قدرے سختی سے) رشیدہ!

رشیدہ : مجھے معاف کر دو۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل ڈر رہا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ زمین تمہیں مجھ
سے جدا کر دے گی۔

نور : (ہنستے ہوئے) پگلی۔ تم دیکھنا میں اتنی زیادہ زمین حاصل کروں گا کہ گاؤں میں کسی کے پاس نہ
ہو گی۔ پھر دیکھوں گا تمہارا تایا کیسے میرا رشتہ ٹھکراتا ہے۔

رشیدہ : (کانوں سے جھمکے اتارتے ہوئے) یہ لو۔

نور : (روکتے ہوئے) کیوں!

رشیدہ : پردیس جارہے ہو! سفر میں ہزار طرح کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

نور : ہنو! نہیں! تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ اب کیا میں تمہارے گہنے بیچوں گا۔

رشیدہ : تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے!

نور : تمہیں تو میں اپنی جان سے پیارا سمجھتا ہوں۔ مگر میرا کام تمہیں کچھ دینا ہے تم سے لینا نہیں۔

رشیدہ : وہ سب ٹھیک ہے مگر یہ جھمکے تمہیں لینے ہی پڑیں گے۔ انہیں میری نشانی سمجھ لو۔

نور : مگر ——

رشیدہ : (زبردستی جھمکے جیب میں ڈالتے ہوئے) بس اب میں ایک بات نہیں سنوں گی۔

نور : (خلا میں گھورتے ہوئے) زمین۔ میری زمین — میری اپنی زمین — ہر طرف زمین ہی زمین۔
چوہدری فتح داد کی زمینوں سے بھی زیادہ۔ دُور تک فصلیں ہی فصلیں۔ لہلہاتی ہوئی — سنہری
فصلیں — میں ٹریکٹر پر بیٹھ کر انہیں کاشت کروں گا۔ اپنے لیے۔ تمہارے لیے۔

رشیدہ : اچھا اچھا اب زیادہ خواب نہ دیکھو۔!

نور : (چونکتے ہوئے) تمہارے لیے حویلی بنواؤں گا۔ اتنی بڑی (ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے۔)

DISSOLVE

(آؤٹ ڈور میں۔ ایک ٹیلے پر سجاول چند آدمیوں سمیت کرسی پر بیٹھا ہے
نور محمد اپنی گٹھڑی کھول رہا ہے۔ پو پھٹنے کا وقت ہے۔ کیمرہ اوپن ہوتا ہے
تو سجاول خاں دُور تک پھیلی ہوئی زمینوں کی طرف نور محمد کے انداز میں ہاتھ
پھیلا رہا ہے۔)

سجاول : یہ ساری زمین جو تم دیکھ رہے ہو اس شرط میں شامل ہے!

نور : (بے یقینی سے آنکھیں جھپکتے ہوئے) ساری۔

سجاول : ہاں۔ سورج ڈوبنے سے پہلے جتنی زمین پر تم نشان لگا لو وہ تمہاری ملکیت ہوگی۔ لیکن یاد
رکھو اگر تم سورج ڈوبنے تک اس جگہ نہ پہنچے (کیمرہ کٹ کر کے ایک گہری کھدی ہوئی
لائن پر جاتا ہے) تو تمہاری رقم ضبط کر لی جائے گی۔

نور : (تھوک نگلتے ہوئے) مجھے منظور ہے۔ (بہت سے نوٹ نکال کر) یہ لیجئے پورے دو ہزار ہیں

سجاول : (ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے) نہیں وہیں رکھ دو جہاں سے تم نے چلنا ہے۔

نور : (رقم کو لائن پر رکھتا ہے) میں جاؤں۔

سجاول : (ایک لوہے کی سلاخ اُس کی طرف پھینکتے ہوئے) یہ لو!

نور : یہ کیا ہے!

سجاول : اس سے نشان لگاتے جانا تاکہ بعد میں پیمائش میں آسانی ہو۔ نشان ذرا گہرا لگانا۔

نور : (کمر پر کپڑا کستے ہوئے) بہتر۔ اب جاؤں۔

سجاول : (مسکراتے ہوئے) بہت جلدی ہے تمہیں۔

نور : (شرماکر) جی نہیں۔

سجاول : سورج تو نکل لینے دو۔ (کیمرہ اُفق پر جاتا ہے جہاں سورج نکلنے والا ہے)

نور : (بے تابی سے پاؤں زمین پر مارتے ہوئے) اوہ۔

ایک آدمی : تمہارا نام کیا ہے بھائی۔

نور : نو۔ نو۔ نور محمد۔ چوہدری نور محمد (مسکراتا ہے)

ایک آدمی : بھائی میری مانو تو کچھ کھانے پینے کو ساتھ لے لو۔ راستے میں پیاس لگے گی۔

نور : کوئی بات نہیں۔

دوسرا آدمی : (پانی کی ایک چھاگل دیتے ہوئے) لو یہ رکھ لو۔

نور : (سوچتے ہوئے) اچھا (چھاگل گلے کے گرد باندھتا ہے) شکریہ ۔۔۔ اب میں چلوں۔

سجاول : چند منٹ اور صبر کرو۔

نور : (اضطراب کے عالم میں اِدھر اُدھر چلتا ہے)۔ کیمرہ کٹ کرکے اُبھرتے ہوئے سورج پر جاتا ہے)
سورج نکل آیا۔

سجاول : ٹھیک ہے اب تم روانہ ہو سکتے ہو۔

[دوڑ کے درمیان BACK GROUND میوزک رکھا جائے جو موقع بہ موقع بدلتا رہے۔ بھاگتے ہوئے قدموں اور چڑھی ہوئی سانسوں کی آواز تمام دوڑ میں آتی رہے گی۔]

نور : خدا حافظ۔ (سلاخ کو زمین میں گاڑ کر لکیر کھینچتا ہے۔ مسکراتا ہے)

سجاول : یاد رکھنا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے تمہیں واپس پہنچنا ہے۔

نور : مَیں بہت پہلے لوٹ آؤں گا (کیمرہ کٹ کرکے سجاول پر جاتا ہے جو اس بات پر مسکرا رہا ہے)

(نور چلنا شروع کرتا ہے۔ اس کا سایہ اُس کے آگے پڑ رہا ہے۔ چند قدم چل کر رُکتا ہے ہے کہ سلاخ سے لکیر گہری نہیں پڑی۔ لکیر کو گہرا کرتا ہے۔ کیمرہ بار بار نور محمد کے چہرے، ٹانگوں، سلاخ، لکیر اور سورج کو فریم میں لیتا ہے۔ نور محمد رُکتا ہے پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے — LONG SHOT میں دکھاتے ہیں کہ وہ سجاول اور اس کے آدمیوں سے خاصی دُور آ چکا ہے۔ پسینہ پونچھتا ہے اور پھر چلنا شروع کرتا ہے)

(کیمرہ پھر نور محمد کے ساتھ ساتھ چلتا ہے جو پسینے سے بھیگا ہُوا تیز تیز چل رہا ہے۔ ایک جگہ بیچ کر رُکتا ہے۔ سجاول اور آدمی بہت دُور رہ گئے ہیں۔ دو گھونٹ پانی پیتا ہے۔ پھر چلنا شروع کرتا ہے۔ کیمرہ اس کے چہرے کا کلوز لیتا ہے جو پسینے سے بھیگا ہُوا ہے۔ اس کے بعد اس کا چہرہ اور چلتی ہوئی ٹانگیں سکرین پر سپرامپوز ہوتی ہیں اور پیچھے فلم چلتی ہے)

(فلم میں نور محمد زمینداروں کا لباس پہنے ٹریکٹر پر بیٹھا ہے۔ سامنے سے "پہلا گاہک" آ آ دکھائی دیتا ہے۔ نور محمد اسے دیکھ کر ٹریکٹر رد کتا ہے۔)

پہلا گاہک : سلام چوہدری صاحب۔

نور : وعلیکم السلام۔ کیا حال چال ہے بھئی خیر دین۔

پہلا گاہک : اللہ کا شکر ہے جی آپ سنائیں اُنسا ہے آپ شہر سے نیا ٹیوب ویل منگوا رہے ہیں۔

نور : ہاں بھئی۔ آرڈر تو دیا ہے۔ ہفتے دس دن میں لگ جائے گا۔

پہلا گاہک : پھر تو ماشاءاللہ لہریں بہریں ہو جائیں گی۔

نور : بس یار تمہاری دعا چاہیئے اور سناؤ بیوی بچے تو اچھے ہیں۔

پہلا گاہک : اللہ کریم کا بڑا شکر ہے، بڑا لڑکا تو اب شہر میں پڑھتا ہے گیارہویں جماعت میں۔ آپ تو کبھی آتے ہی نہیں ہماری طرف — بڑے آدمی ہیں نا۔

نور : ارے نہیں یار — دراصل زمینوں کے کام سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

پہلا گاہک : پھر بھی کبھی کبھار۔

نور : اچھا بھئی وعدہ رہا کل ضرور آؤں گا۔

پہلا گاہک : اچھا رب راکھا۔

نور : (ٹریکٹر آگے بڑھاتے ہوئے) رب راکھا۔

(فلم ختم ہوتی ہے۔ کیمرہ کٹ کرکے نور محمد پر آتا ہے جو ایک پتھر پر بیٹھا ہانپ رہا ہے۔ چہرہ اور کپڑے گرد سے بھرے ہیں۔ پیچھے دُور تک ایک ٹیڑھی میڑھی لائن کھنچی ہے۔ پانی کے دو گھونٹ پیتا ہے۔ سلاخ اُٹھا کر پھر چلتا ہے۔ حسبِ سابق کیمرہ کچھ دیر اس کے ساتھ چلتا ہے۔ نور محمد کے پاؤں لڑکھڑانے لگے ہیں۔ سُورج کی طرف دیکھتا ہے۔ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اُن پر ہاتھ رکھتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ سوائے لائن کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر طرف زمین ہی زمین ہے۔ سورج کی طرف دیکھتا ہے۔ سلاخ سے نیم دائرہ بناتا ہے جیسے مُڑنے والا ہو۔ ایکدم رُک جاتا ہے اور سامنے دیکھتا ہے۔ ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ چند لمحے دیکھتا ہے۔ پھر چلنا شروع کر دیتا ہے جیسے اُس زمین کو بھی اپنے تصرّف میں لانا چاہتا ہو۔ سکرین پر پھر اُس کا تھکا ہُوا چہرہ اور لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگیں SUPER IMPOSE ہوتی ہیں۔ پیچھے فلم چلتی ہے)

(ہرے بھرے درختوں کا جھنڈ ہے۔ پھول کھلے ہیں۔ رشیدہ کا آنچل ہوا میں لہرا رہا ہے۔ وہ خوشی سے اُچھلتی اور گاتی ہوئی نور محمد کی طرف بڑھتی ہے۔ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دے کر چلتے ہیں۔)

رشیدہ : اوہ مَیں کتنی خوش نصیب ہوں!

نور : تم نہیں مَیں۔

رشیدہ : نہیں، مَیں۔

نور : اوہوں — مَیں

رشیدہ : چلو ہم دونوں سہی۔ (خوش ہو کر ہنستے ہیں) تم نے سے بات کی تھی!

نور : (شرارت سے) اوہوں۔

رشیدہ : (رُک کر غصّے سے) کیوں؟

نور : اس لیے کہ اس نے مجھ سے پہلے بات شروع کر دی تھی۔

رشیدہ : (اُچھل کر ایک پتہ توڑتے ہوئے) کیا!

نور : یہی کہ میری بیٹی سے شادی کر لو۔

رشیدہ : (ادا سے) جھوٹے۔

نور : نہ الو۔ (اکیلنگ سے اکڑتا ہے)

رشیدہ : اچھا، اور کیا کہا تھا۔

نور :- اور ــ اور کیا کہا تھا کہ . . . بس تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔

رشیدہ : (ہاتھ چھڑاتے ہوئے) مہربانی!! ــ صورت دیکھی ہے کبھی اپنی (جانے لگتی ہے)

نور : ارے ــ ارے سُنو تو سہی ــ وہ تو میں نے کہا تھا تمہارے تائے سے کہ تا! تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔

رشیدہ : بڑے شیطان ہو تم ــ پھر

نور : پھر کیا ــ میں نے کہا میں ساری زمین لکھ کر دینے کو تیار ہوں، رشیدہ کا ہاتھ مجھے دے دو!

رشیدہ : ہائے ــ پھر ــ

نور : (ہاتھ پکڑتے ہوئے) پھر کیا۔ دے دیا اُس نے۔

رشیدہ : ہائے اللہ (شرما کر منہ پھیرتی ہے)

(کٹ کرتے ہیں۔ فلم ختم ہوتی ہے۔ نور محمد چند قدم لڑکھڑاتا ہے۔ پھر زمین پر گر جاتا ہے زور زور سے ہانپتا ہے۔ جُوتے اُتارتا ہے۔ پاؤں کا کلوز جن سے خون بہہ رہا ہے۔ جُوتے وہیں چھوڑ دیتا ہے۔ پانی پیتا ہے۔ چھاگل خالی ہوگئی ہے۔ اُسے پھینکتا ہے۔ لڑکھڑاتا ہوا چلتا ہے۔ کیمرہ اس کا سایہ رجسٹر کرتا ہے جو اب اس کے پیچھے پڑ رہا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ سورج ڈھلنا شروع ہوگیا ہے۔ نور محمد سورج کی طرف دیکھتا ہے۔ سلاخ کو رگڑتا ہوا چلتا ہے۔ کیمرہ چھاگل اور جوتوں سے ہوتا ہوا نور محمد کے ننگے پاؤں اور سُوکھے ہوئے ہونٹوں پر جاتا ہے۔ نور محمد تیز تیز چل رہا ہے۔ بار بار سورج کی طرف دیکھتا ہے۔ تھکن سے چور ہو چکا ہے اس کے بعد کیمرہ پھر اس کے حصے کے۔ لکیر۔ سلاخ۔ پاؤں اور ٹانگوں پر آتا ہے۔ نور محمد کے پوائنٹ آف ویو سے دیکھتے ہیں جیسے وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ کیمرہ آؤٹ آف فوکس ہوتا ہے۔ نور محمد رک کر اپنے سر کو جھٹکتا ہے۔ چند قدم چلتا ہے گر پڑتا ہے۔ کیمرہ گرے ہوئے نور محمد کا کلوز لیتا ہے۔ پیاس، بھوک اور تھکن سے

اس کا بُرا حال ہے۔ چاروں طرف زمین ہے۔ سر پہ کھُلا آسمان اور تیزی سے ڈھلتا ہُوا سورج ہے۔ اُٹھتا ہے اور بھاگنا شروع کرتا ہے۔ سلاخ پتھروں سے بج کر آواز پیدا کرتی ہے)

(قدموں کی چاپ بے ترتیب دوڑ کی آوازوں میں بدلتی ہے، سانس کی آواز تیز تر ہوتی ہے۔ بھاگتے ہوئے نور محمد پر مختلف STILLS کو SUPER EXPOSE کیا جاتا ہے۔)

(نور محمد بطور چوہدری۔ نور محمد ٹریکٹر پر۔ نور محمد ہنستے ہوئے۔ نور محمد اور رشیدہ نور محمد کھیتوں کے کنارے۔ نور محمد گھوڑے پر۔ نور محمد سہرے میں۔ نور محمد اور رشیدہ ہنستے ہوئے۔)

(یہ سب STILLS تیزی سے بھاگتے ہوئے نور محمد پہ SUPER EXPOSE ہوتی ہیں۔ کیمرہ لانگ شاٹ لیتا ہے۔ بہت دُور ٹیلہ نظر آتا ہے جہاں سے دوڑ شروع ہوئی تھی۔ آسمان کا رنگ سُرخ ہو رہا ہے۔ سورج ڈوب رہا ہے۔

نور محمد گرتا پڑتا ہانپتا کانپتا بھاگ رہا ہے۔ کیمرہ بار بار ڈوبتے ہوئے سورج اور بھاگتے ہوئے نور محمد پر جاتا ہے۔ نور محمد گرتا ہے۔ ٹیلہ ذرا قریب آتا ہے سورج اور نیچے آتا ہے۔ نور محمد اُٹھتا ہے۔ کیمرہ کٹ کر کے سجاول اور اس کے آدمیوں پر جاتا ہے)

ایک آدمی: (غور سے دیکھتے ہوئے) وہ آگیا۔

دوسرا: کہاں۔

ایک آدمی: وہ (اُنگلی سے اشارہ کرکے) وہ ....

دوسرا: (غور سے دیکھتے ہوئے) کہاں بھئی۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔

ایک آدمی: (دوسرے کے قریب جاکر اسے اپنی اُنگلی کے ساتھ دکھاتا ہے) وہ دیکھو۔ آیا نظر...

دوسرا: (غور سے دیکھتے ہوئے) کوئی چیز ہل تو رہی ہے۔

(کیمرہ کٹ کر کے سجاول کے جھکسمر پر آتا ہے جو بالکل خاموش ہے۔ کٹ کرتے ہیں۔ نور محمد پھر زمین پر گرا ہُوا ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ سین اس پہ SUPER EXPOSE ہوتا ہے)

رشیدہ: ارے اٹھو بھی۔ کب تک سوتے رہوگے۔

نور : (کسمساتے ہوئے) کیا ہے بھئی!

رشیدہ : آج تمہیں شہر پہنچنا ہے زمین کی رجسٹری کرانے کے لیے! یاد ہے کہ نہیں۔

نور : (ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے) شہر۔ مجھے پہلے کیوں نہیں جگایا۔ میرے کپڑے نکالو جلدی سے۔ میں ذرا نہالوں۔

رشیدہ : تم نہالو۔ کپڑے میں پہلے ہی نکال چکی ہوں۔

نور : کتنی اچھی ہو تم۔ (ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا ہے)

رشیدہ : یہ نخرے پھر کر لینا۔ اب اٹھو جلدی سے۔

نور : اچھا بابا۔ (اٹھتا ہے)

(SUPER EXPOSITION فلم ختم ہوتی ہے۔ نور محمد آنکھیں کھولتا ہے۔ اٹھتا ہے سورج ڈوب رہا ہے۔ لڑکھڑا کر کھڑا ہوتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اب چلنا اس کے اختیار میں نہیں۔ لیکن دانت بھینچ کر فیصلہ کن انداز میں چلتا ہے۔ پاؤں اِدھر اُدھر پڑتے ہیں۔ سلاخ کی لکیر ٹیڑھی میڑھی پڑ رہی ہے۔ پوری جان سے بھاگتا ہے۔

کیمرہ سورج نور محمد اور ٹیلے پر تیزی سے کٹ کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ ٹیلہ قریب آتا ہے۔ نور محمد گھسٹنے کے انداز میں چل رہا ہے۔ کیمرہ افتتاحی لائن اور اس پر رکھی پوٹلی پر پڑتا ہے۔ آہستہ آہستہ لائن قریب آنے لگتی ہے۔ سانسوں کی آوازیں اکھڑنے لگتی ہیں۔ ڈوبتے سورج میں نور محمد کا سایہ لائن پر پڑتا ہے۔ لائن سے تین چار فٹ دور وہ گرتا ہے رشیدہ کے دیئے ہوئے جھمکے اُس کی جیب سے نکل کر آگے گرتے ہیں۔ کیمرہ اُن کا کلوز لیتا ہے۔ نور محمد آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ سب چیزیں گھوم رہی ہیں۔ سجاول، آدمی، سورج، ٹیلہ، لائن۔ سب ایک دوسرے میں MIX ہوتے ہیں۔ بڑی مشکل سے اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ اِدھر اُدھر ٹٹول کر سلاخ پکڑتا ہے اور پوری طاقت سے اپنی کھینچی ہوئی لائن کو افتتاحی لائن سے ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ میوزک تیز ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ دونوں لائنیں مل جاتی ہیں۔ سلاخ نور محمد کے ہاتھ سے گر جاتی ہے — سانسوں کی آواز بند ہوتی ہے۔)

(پہلا آدمی سوالیہ نظروں سے سجاول کی طرف دیکھتا ہے۔ سجاول آنکھ کے اشارے سے کہتا ہے جاؤ دیکھو۔ پہلا آدمی چند قدم چل کر نور محمد تک پہنچتا ہے۔ اس کا چہرہ اوپر اٹھاتا ہے

نور محمد کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔)

پہلا آدمی : (خوفزدہ آواز میں) یہ۔۔۔ یہ تو مر گیا ہے۔

سجاول : (لمبی سانس بھرتا ہے۔ کرسی کے پیچھے سے ایک بیلچہ نکال کر آدمی کی طرف پھینکتا ہے) اس کی قبر یہیں کھود دو۔ اسے اتنی ہی زمین کی ضرورت تھی۔

(پہلا آدمی نور محمد کی سلاخ سے اُس کے چاروں طرف نشان لگاتا ہے۔ پہلا اور دوسرا آدمی نور محمد کی لاش کو ایک طرف ہٹاتے ہیں۔ پھر لائن لگی ہوئی جگہ کھودنے لگتے ہیں۔ کیمرہ رشیدہ کے جھٹکوں سے ہوتا ہوا نور محمد کے جھٹکے پر جاتا ہے۔ لانگ شاٹ میں سارا منظر کور (COVER) کرتے ہیں۔

(دُور تک سناٹا پھیلی ہوئی ہے۔ نور محمد کے لیے قبر کھودی جا رہی ہے)

OO

واپسی

JACQUES PRÉVERT

ترجمہ: انور سجاد

برتیاں کا ایک باسی اپنے جنم استھان کو واپس آتا ہے
کاروبار میں کئی تیز رفتار کامیابیوں کے بعد
وہ دوارنے نیز کی فیکٹریوں کے سامنے سے گزرتا ہے
وہ کسی کو نہیں پہچانتا
کوئی اسے نہیں پہچانتا
وہ بہت اُداس ہے
وہ کریپ کھانے کے لیے کریپ کی دکان میں داخل ہوتا ہے۔
لیکن وہ کھا نہیں سکتا
جانے کس وجہ سے وہ نگل نہیں سکتا
وہ رقم ادا کرتا ہے
اور باہر نکل جاتا ہے
وہ سگریٹ سلگاتا ہے
لیکن پی نہیں سکتا
کچھ ہے
اس کے ذہن میں یقیناً کچھ ہے
کوئی بُرائی
وہ اور بھی اُداس ہو جاتا ہے اور بھی اُداس
پھر یک لخت اُسے یاد آنے لگتا ہے :
جب وہ چھوٹا تھا تو کسی نے اُس سے کہا تھا
« تمہارا انجام پھانسی کے تختے پر ہوگا »
اور سالہا سال

اس میں کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ کچھ بھی کر سکے
گلی ہی پار کر سکے
بحری سفر پر جا سکے
کچھ نہیں، قطعی کچھ نہیں۔
اسے یاد آتا ہے۔
یہ پیشگوئی کرنے والا اس کا چچا جیرارد تھا
چچا جیرارد جو سب کے لیے بدقسمتی کا باعث تھا
سٹورا
اور بریتانی اپنی بہن کے بارے میں سوچتا ہے، جو واجیرارد میں کام کرتی ہے
اور اپنے بھائی کے بارے میں جو جنگ میں مارا گیا تھا
ان تمام چیزوں کے بارے میں سوچتا ہے جو اس نے دیکھی ہیں
جو کچھ بھی وہ کرتا رہا ہے
اس کو اداسی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے
وہ پھر کوشش کرتا ہے
سگریٹ سلگانے کی
لیکن اس کا جی سگریٹ پینے کو نہیں چاہتا
تب وہ اپنے چچا جیرارد سے ملنے کا فیصلہ کرتا ہے۔
وہ جاتا ہے
دروازہ کھولتا ہے
چچا اسے نہیں پہچانتا
لیکن وہ چچا کو پہچان لیتا ہے
اور اس سے کہتا ہے
'صبح بخیر۔ چچا جیرارد'
پھر وہ اس کی گردن مروڑ دیتا ہے
اور کوئمپر میں پھانسی کے تختے پر اپنے انجام کو پہنچتا ہے
دو درجن کریپ کھانے کے بعد
ایک سگریٹ پی کر۔

پھول والی کے پاس

JACQUES PRÉVERT

انور سجاد

ایک شخص پھولوں کی دکان میں داخل ہوتا ہے
اور چند پھول پسند کرتا ہے
پھول بیچنے والی ان پھولوں کا گلدستہ بناتی ہے
وہ شخص اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے
پیسے نکال کر
پھولوں کی قیمت ادا کرنے کے لیے
لیکن عین اس لمحے
وہ یکدم اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھتا ہے
اور گر جاتا ہے
جس لمحے وہ گرتا ہے
پیسے فرش پر لڑھکنے لگتے ہیں
پھر پھول بھی گر جاتے ہیں
عین اس لمحے، جس لمحے وہ شخص گرتا ہے
اسی لمحے کہ جب پیسے فرش پر لڑھکنے لگتے ہیں
پھول والی وہیں کھڑی ہے
اور اس کے قریب
پیسے لڑھکتے ہوئے
برباد ہوتے پھول
اور وہ شخص مرتا ہوا
ظاہر ہے یہ سب کچھ بہت اندوہناک ہے

اور اسے کچھ تو کرنا چاہیے
لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آغاز کہاں سے کرے
اسے معلوم نہیں
کہ وہ کس آخر سے آغاز کرے
اسے اتنے کام کرنا ہیں
اور مرتا ہوا یہ شخص
برباد ہوتے یہ پھول
اور لڑھکتے ہوئے پہیے
گردش میں ہیں، رکتے ہی نہیں۔

تحریر: ڈاکٹر پی۔سی۔جوشی
تعارف و ترجمہ: مظفر علی سید

پریم چند اور گاندھی

مماثلت اور امتیاز کا ایک جدلیاتی مطالعہ

ڈاکٹر پورن چند جوشی کسی زمانے میں ہندوستان کے ایک ممتاز بائیں بازو کے دانشور تھے مگر اب عملی سیاست سے زیادہ علمی و فکری سرگرمیوں میں مصروف ہیں ان کا یہ مقالہ ادیبوں کے افریشیائی تنظیم کے ترجمان لوٹس (LOTUS) میں پچھلے برس شائع ہوا تھا، اس کے اصل عنوان کا لفظی ترجمہ تو "منشی پریم چند اور ہندوستانی گاؤں" ہوگا، تاہم اس لیے کہ یہاں پریم چند کے گاندھی ازم سے متاثر ہونے پھر اس سے نامطمئن ہونے اور بالآخر دیہات کے بارے میں اپنا الگ رویہ اختیار کرنے پر توجہ دی گئی ہے، شائد یہ عنوان مشمولات کے لحاظ سے مناسب ہو،

یوں تو جن خیالات و تاثرات کا اظہار اس مقالے میں ہے اسی قسم کے ارشادات مدن گوپال کی مفصل تصنیف "پریم چند۔ ایک ادبی سوانح" میں بھی جا بجا ملتے ہیں مگر یہاں پریم چند اور گاندھی کے فکری مماثلات اور امتیازات کو ایک ذہنی کشمکش کی صورت میں پیش کیا گیا ہے مثالوں کے لیے پریم چند کے مختصر افسانوں کی بجائے ناولوں کو۔ اور ان میں سے بھی چند ایک کو۔ منتخب کیا گیا ہے شائد اس لیے کہ اجتماعی فکر و احساس کی جو نقاشی ناولوں کے ذریعے ممکن ہے، ایک مختصر سا افسانہ بہت کم اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔

مقالہ نگار نے ان ناولوں کے صرف ہندی عنوان استعمال کئے تھے، ہم نے اردو عنوان بھی ساتھ لکھ دیئے ہیں البتہ "گئودان" کا ایک اقتباس جو آخر میں آتا ہے وہ یہاں اردو کے متن سے نقل کیا گیا ہے۔

دیہاتی زندگی کے مسائل پر چند ایک فکری رویّے اور ان کے لیے مخصوص اصطلاحیں جو اس مقالے میں بار بار آتی ہیں، ان کی تفصیل یوں ہے۔ دیہات پرستی (اصل میں VILLAGISM) سے مراد ہے دیہات کو شہری زندگی کے مقابلے میں زیادہ توجہ اور ترجیح کا مستحق سمجھنا "مزارعیت" (PEASANTISM) یعنی کسانوں کی زندگی میں کسی بنیادی تبدیلی کا تصور کئے بغیر پرانی زمین سے

ان کی جذباتی وابستگی پر زور دینا اور یوں ان کو راضی برضا سمجھ لینا۔ اور آخر میں "مزدور سازی" (PROLETARIANIZATION) یعنی کسانوں کو یا تو شہری صنعتوں کی طرف دھکیل دینا یا خود زراعت کو صنعتی بنیادوں پر منظم کرکے ان کو محض اجرت پر کام کے لیے مجبور کرنا ———— (مترجم)

یہ خیال کہ تاریخ اور ادب کے کارناموں میں بہت کچھ مشترک ہوتا ہے، اب علمی و ادبی حلقوں میں عام ہوتا جا رہا ہے جس طرح کارلائل، مارکس، ٹوئن بی، ای ایچ کار یا ایرک ہوبز بوم (۱) کی تصانیف اونچے معیار کی ادبی خصوصیات کی حامل کہی جاتی ہیں، اسی طرح بالزاک، زولا، تولستوئے، یا ماکسیم گورکی کے ناول اپنے تاریخی ادوار کی آئینہ داری کا فریضہ بہترین تاریخی نوشتوں سے بھی عمدہ تر انداز میں دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ کسی رسمی مورخ کی نسبت جو محض واقعہ نگاری سے کام لیتا ہے اور اس لیے تاریخ کا بس اوپری ڈھانچہ ہی تیار کر سکتا ہے۔ ایک ناول نگار تاریخ کو ایک زندہ اور دھڑکتی ہوئی حقیقت کی صورت بخشتا ہے یہ ناول نگار ہی تو ہے جو ایک تاریخی گرد و پیش میں کرداری سانچوں کے افراد خلق کرتا ہے اور تاریخ میں ایک وژن پیدا کرنے اس کے اندر انسانیت کی روح پھونکتا ہے۔ ناول کی یہ تعبیر ابطور اجتماعی تاریخ کے، پریم چند کے اس قول میں مضمر ہے "تاریخ میں سب کچھ غلط ہوتا ہے۔ بجز نام اور سنین کے اور افسانے میں سب کچھ صحیح ہوتا ہے بجز نام اور سنین کے۔" (۲)

اگر ہندوستان کے جملہ ادب سے کوئی ایک نام تاریخی حس اور ادبی وجدان کے اجتماع کی مثال کے طور پر خیال میں آتا ہے تو وہ ملشی پریم چند ہی کا ہو سکتا ہے اور ڈکنس کو عالمی ادب میں لافانی مقام اس وجہ

---

(۱) کارلائل اور ٹوئن بی، انیسویں اور بیسویں صدی کے مشہور مؤرخ ہیں، مارکس کی چند ایک تصانیف بھی براہ راست تاریخ نگاری کے ضمن میں آسکتی ہیں۔ کار نے مختلف ملکوں اور زمانوں میں اشتراکیت کی لوازع پر تاریخی کام کیا ہے اور برطانوی جریدے "ماضی و حال" کا مدیر ہوبز بوم بھی اجتماعی تاریخ اور یورپ سے باہر کی دنیا کی تاریخ نگاری میں ایک اہم نام ہے مگر ان سب میں برابر کی ادبی خصوصیات ملنی محال ہیں (م س ع ۔ س)

(۲) یہ قول پریم چند کا اپنا نہیں۔ "میرے بہترین افسانے" میں انہوں نے یوں لکھا ہے کہ "کسی نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ کہانی میں نام اور سن کے سوا باقی سب کچھ سچ ہے اور تاریخ میں نام اور سن کے سوا کچھ بھی حقیقت نہیں۔" بعیران کا مقالہ "مختصر افسانے کا فن" یہی بات کچھ اس طرح دہراتا ہے "ایک ناقد کا کہنا ہے کہ تاریخ میں سب کچھ واقع ہوتے ہوئے بھی حقیقت نہیں ہوتا اور افسانوی ادب میں سب کچھ تمثیلی ہوتے ہوئے حقیقت ہوتا ہے" (مضامین پریم چند مرتبہ عتیق احمد انجمن ترقی اردو پاکستان۔ ۱۹۸۱ء) شاید یہ قول کسی ناقد کا نہیں بلکہ آسکر وائلڈ یا کسی اور ظریف کا ہے جسے حرمت سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ لینا درست نہ ہوگا (م ۔ ع ۔ س)

سے حاصل ہوا تھا کہ انہوں نے جاگیرداری کے زوال اور تجارتی دور کے آغاز سے مربوط عظیم ڈرامائی تاریخ کے سلسلے میں اپنی ژرف نگاہی کے ثبوت فراہم کئے تھے۔ پریم چند بھی ناول کے فن میں عالمی معیار تک اس وجہ سے پہنچے کہ انہوں نے ہندوستانی دیہات پر برطانوی استعمار کی دخل اندازی سے جو المیہ پیدا ہوا تھا اس کی زندہ و لرزندہ تصویر کشی کی۔

ہندوستان پر برطانوی استعمار کی دخل اندازی کے سلسلے میں مارکس نے اپنے پرمعنی ترین نتائج افکار کے دوران، ہندوستان کے لیے کی شناخت اس حقیقت کے ذریعے کی تھی کہ "انگلستان نے ہندوستانی سماج کا تمام ڈھانچہ توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا جبکہ تعمیر نو کا کوئی نشان نمودار نہیں ہو پایا تھا"، مارکس کی نظر میں "پرانی دنیا کی یہ گم گشتگی کسی نئی دنیا کے فوائد کی تحصیل کے بغیر، ہندوستانیوں کی موجودہ مصیبت کو ایک خاص قسم کی افسردگی کا رنگ دے دیتی ہے اور برطانوی غلبے میں آتے ہوئے ہندوستان کو اپنی قدیم روایات اور اپنے سارے ماضی کی تاریخ سے جدا کر کے رکھ دیتی ہے" (کارل مارکس: "استعمار کے بارے میں") پریم چند کی تصانیف میں "اس خاص افسردگی کے رنگ" کی جو "پرانی دنیا میں گم گشتگی" سے "کسی نئی دنیا کے فوائد کی تحصیل کے بغیر"، پیدا ہوا تھا، بہترین تصویر کشی ملتی ہے، وہ افسردگی جو گوشت پوست کی لاکھوں ہستیوں کو تاریخ ہند کے ایک خاص نقطے پر اپنے رگ وپے میں محسوس ہوئی تھی۔ اس ہندوستانی کسان کا المیہ جو صدیوں پرانے دیہاتی نظام سے اکھڑ چکا تھا، پریم چند کی گرفت میں کچھ ایسی اثر انگیزی، شدت احساس اور گہرائی کے ساتھ آیا ہے کہ کوئی بھی تاریخی تحریر اس درجے کو نہیں پہنچتی۔ پریم چند کی تخلیقات میں استعمار زدہ کسان ڈرامائی کرداروں کی طرح اس لیے ابھرتا ہے کہ ایک طرف تو مصنف کو ہندوستان میں استعماری دور کے حالات سے گہری بصیرتیں حاصل ہوتی ہیں اور دوسری طرف اس کو ادبی تخیل کے مستحکم جوہر ملے ہیں۔ یہ دونوں خصوصیات۔ تاریخی حس اور ادبی وجدان ۔ متحد ہو کر پریم چند کے "گئودان" میں ہوری کا المیہ اور لافانی کردار تخلیق کرتے ہیں جو استعمار زدہ ہندوستان میں کسان کی زندہ تجسیم ہے یہاں ہم ایک ناقابل فراموش چہرے کے آشنا ہوتے ہیں جس میں ہندوستانی کسان کی مضبوط کشمکش حیات بھی شامل ہے اور استعماری سماجی نظام کے اندر رہتے ہوئے مکمل مایوسی کا احساس بھی۔

استعمار زدہ کسان کی مصیبت کے گہرے فہم کی خاطر پریم چند کو لازماً طبقاتی نقطۂ نظر کے نیم جاگیردارانہ زمینداروں کے اشرافیانہ جذبات اور استعمار پسند طبقے کے پار جانے کی ضرورت پڑتی ہے چنانچہ صورت حال کو باہر سے پوری پیچیدگی کے ساتھ دیکھنے کے لیے لازم تھا کہ ان سب نظریوں سے اوپر اٹھا جائے جو استعماری اور نیم جاگیرداری نظام کے دفاع میں یا اس کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئے تھے سب سے پہلے اس مخصوص تاریخی نقطۂ نظر سے باہر نکلنا ضروری تھا جسے "دیہات پرستی" کہا جاتا ہے اور جس نے ہندوستانی کی صدیوں پرانی سماجی شکل کو آدرش بنا رکھا تھا۔ برطانوی سامراج کے شیطانی تسلط کے مقابلے میں ماضی کے

رام راج کو لاکر یہ نقطۂ نظر رام راج کی طرف واپسی کے لیے بلاتا تھا[۴۳]۔ لازم تھا کہ کوئی صاحبِ فکر و احساس "مربیانہ زمینداری" کے اس تصور کے ماورا جا سکے جو "قدیم اور نیک نفس زمیندار" کو کوشش بنانے پر مُصر تھا مگر جس کا زندہ روپ معاشیات و دولت کے بل پر اور بھی مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔

اس سے اگلے مرحلے پر "مزارعیت" کے اس تصور سے بھی رہائی پانا ضروری تھا جو کسانوں کی "مزدور سازی" کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو دھندلاتا تھا اور کسان سماج کو ایک نئے جنت کے بہلاوے میں رکھنا چاہتا تھا دوسرے لفظوں میں کسان سماج کی درجہ بندیاں ـ نیک کے مقابلے میں بد زمیندار، گاؤں کے مقابلے میں شہر کسان کے مقابلے میں مزدور۔ ایسی مضبوط ذہنی رکاوٹیں تھیں جو استعمار زدہ کسان کی مصیبت کے مکمل فہم کے راستے میں حائل تھیں جبکہ کسان ہمیشہ زمین سے مکمل علیحدگی (مزدور سازی) کے کنارے کھڑا تھا۔ لہٰذا استعمار زدہ کسان کبھی رہائی نہ پا سکتا تھا جب تک کہ اچھے برے زمیندار کے مابین امتیاز سے قطع نظر کر کے استعماری اور قدیم جاگیرداری نظام کو مجموعی طور پر اپنی مصیبت کا اصل باعث نہ سمجھ سکے اور وہ اس نظام کو چیلنج کرنے والی ایک سماجی قوت بھی اس وقت تک نہیں بن سکتا تھا جب تک وہ دیہات پرستی، مربیانہ زمینداری اور تنگ نظر مزارعیت کے واہموں سے نجات نہ حاصل کر سکے اور سماجی، معاشی اور سیاسی قلبِ ماہیت کی مرکزی دھارا میں شامل نہ ہو جائے۔

انسانی صورتِ حال کو باہر سے دیکھنے کی بجائے اندر سے محسوس کرنا پریم چند کے لیے اور بھی دشوار تھا۔ ان کسانوں کے اجتماعی مصیبت کی تصویر کشی مقصود تھی اور ادیب کے درمیان جو ایک غیر طبقہ اور "جاتی" سے آیا تھا، ایک بڑی وسیع خلیج حائل تھی[۴۴] اونچے طبقے اور جاتی کا نقطۂ نظر رکھنے اور ذہنی عادات کے راسخ ہونے کی بنا پر ادیب ایک اجنبی تھا پچھلے ہوئے کسانوں کے جذبات و احساسات اور تجربات کے لحاظ سے کیونکہ سماجی درجہ بندی میں ان کا مقام بہت نیچے تھا۔ سماجی حقیقت کا جو ادراک ادیب کو حاصل ہو سکتا تھا، اس کی کیفیت کا انحصار اس بات پر تھا کہ استعمار زدہ کسان جو فن کا موضوع تھا۔ ادیب کا اس سے براہ راست رابطہ کس قدر ممکن تھا اور وہ اس کے ساتھ کتنی روحانی یکتائی محسوس کرتا تھا۔ اس کا انحصار اس بات پر بھی تھا کہ وہ اپنے تنگ نظرانہ تعصبات سے اور اپنے طبقاتی محسوسات سے جو اس کے باطن میں شروع سے موجود رہے ہوں گے اور جنہوں نے

---

(۴۳) انڈین نیشنل کانگریس کے سیکولر اعلانات کے پس پردہ رام راج کو چھپا ہوا دیکھنے والے "اقلیتی رہنما اور دانشور اس وقت یہ بات کہتے تھے تو انہیں فرقہ پرست قرار دیا جاتا تھا یا پھر ایم این رائے کی طرح بائیں بازو کے گمراہ" (م۔ ہا۔ س)

(۴۴) "جاتی" یا ذات پات کے لحاظ سے جو طبقاتی سماج کی منجمد ترین صورت ہے۔ اس میں پریم چند کے لیے جو کائستھ یعنی حکمرانی کے ملازمین کے خاندان سے تھے، کسانوں کی صورت حال کے اندر سے محسوس کرنا واقعی بہت مشکل تھا مگر یہ مشکل انہوں نے اپنی فنی حساسیت سے آسان کی (م۔ ہا۔ س)

اس کے سماجی نقطۂ نظر کو راسخ کیا ہوگا ۔ خود رہائی حاصل کرسکے ۔ لہٰذا پریم چند کے لیے یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کہ استحصال زدہ کسان کے اندر دھڑکتی ہوئی ستمرحراتی زندگی کو گرفت میں لاسکیں یہ عمر بھر کی عذاب وہ کشمکش تھی جس کا پختہ ترین ثمر ان کی آخری تصنیف "گئودان" میں ملتا ہے ۔

پریم چند کی مثال سے واضح ہوسکتا ہے کہ ماہرین فن کی ادبی تصویر کشی، سماجی حقیقت کی محض عکاسی یک کلیوں محدود نہیں ہوتی اور یہ حقیقت کی تنقید کی صورت میں کیونکر نمو پذیر ہو جاتی ہے بدیہی طور پر حقیقت کی جانب ایک تنقیدی رویہ اختیار کئے بغیر پریم چند استحصال زدہ کسان کی معصیت کو اپنی گرفت میں کبھی نہ لاسکتے صرف اسی وقت جب کہ پریم چند اونچے طبقے اور نیم جاگیرداری سماجی نظام کے برقرار رکھے ہوئے جعلی شعور پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں سماجی ادراک کے ایک اعلیٰ درجے تک پہنچ پاتے ہیں — جیسا کہ "گئودان" میں ۔

پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کی دیرپا اہمیت محض اس حقیقت پر مبنی نہیں کہ ان میں استعماری اور نیم جاگیردارانہ ہندوستان کی سماجی حقیقت کا عکس ملتا ہے ان کی اصل اہمیت تو اس انقلابی خصوصیت کی وجہ سے ہے جو پریم چند کے ناول اپنے بالغ ترین دور میں حاصل کر لیتے ہیں ۔ ادبی تصویر کشی کو تنقیدی واقعیت کی آبیاری عطا کرکے ۔ اور یہی چیز ان کی فکشن کو بطور سماجی تنقید کے جملہ ہندوستانی ادب کی پیش روی کا اہل بنا دیتی ہے یہ ناول کے وسیلۂ فن کے ذریعے ، پریم چند کی ، استعماری اور نیم جاگیرداری سماج پر تنقید ہی تو ہے جس نے ان کو نہ صرف ہندوستانی ادب بلکہ ہندوستانی تاریخ کی ایک عہد آفریں شخصیت کا درجہ عطا کیا ہے ۔ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ انقلابی مبارزوں کی کئی ایک نسلوں نے ہندوستان کی سماجی حقیقت کے سلسلے میں تنقیدی سمت کا احساس اوّل اوّل پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے حاصل کیا ہے یہاں ناول ، بطور ایک فنی ہیئت کے ، اس درجے تک پہنچا ہوا نظر آتا ہے جہاں یہ سماجی حقیقت کو محض روشن ہی نہیں اور انسانی حسیت کو محض بیدار ہی نہیں کرتا بلکہ اس کو بدلنے کا شعوری ارادہ بھی زندہ کرکے رکھ دیتا ہے ۔

ناول کی ایک ایسی قلبِ ماہیت کا تقاضا ہے کہ فن کار کے فلسفیانہ نقطۂ نظر اور اس کی ادبی حسیت کے درمیان ایک تخلیقی تناؤ کی حالت موجود ہو ۔ پریم چند کے معاملے میں ہمیں ان کے سماجی ادراک کی قوتیں اس وقت پوری طرح کارفرما نظر آتی ہیں جب وہ "گاندھی واد" نظریے (یا گاندھی ازم) سے ذہنی طور پہ منقطع ہو جاتے ہیں ، اس نظریے سے جس نے سماجی حقیقت کے سلسلے میں ان کی بصیرت پر ایک رنگین پردہ ڈال رکھا تھا ، خصوصاً ان کی ابتدائی تحریروں "پریم آشرم" (گوشہ عافیت) اور "کرم بھومی" (میدانِ عمل) میں ۔ یہ ناول اس مفاہمت کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو پریم چند نے اپنی ادبی حسیت کے تقاضوں اور گاندھی واد نظریے کی ضرورتوں کے درمیان پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ ان ناولوں میں مرکزی شبیہ کسان کے بجائے اصلاح

شدہ زمیندار کی ہے جو ایک ایسے رحمدل سماج کا مکھیا بنتا ہے جس میں کسان زمیندار پر بھروسہ کرتے ہیں "گئودان" میں پریم چند ایک ایسی بھرپور اور بے جھجک حسیت کا ثمر پیش کرتے ہیں جو گاندھی واد نظریے کی حدود قیود سے آزاد ہو چکا ہے "گئودان" کا مرکزی کردار ہوری ایک ایسا کسان ہے جس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں رہتا، ہوری جس کا المیہ انجام نیم جاگیرداری نظام کی اصلاح کے سارے خوابوں اور وہموں کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ ہوری کی مکمل تباہی نظام کی حدود کو واضح کرتی ہے اور نظام کی اصلاح کے ذریعے کسان سدھار کے جملہ منصوبوں کی بے حاصلی ⑤

ایک طرف اپنے دیہاتی پس منظر سے حاصل شدہ مضبوط احساسِ حقیقت اور دوسری طرف اپنے عمیق ادبی وجدان کی مدد سے پریم چند نے "گئودان" میں اس وسیع خلیج کو واضح کر دیا ہے جو گاندھی کی آدرش وادی (عینی) تصورات اور فارمولوں اور ہندوستان کے دیہاتی سماج کے درشت اور وحشیانہ حقائق کے درمیان موجود ہے۔

پھر جہاں پریم چند کے "گئودان" میں گاندھی دور کے غالب تصورات پر زور دینا ضروری ہے، وہاں یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیئے کہ گاندھی نے پریم چند کی ادبی نشوونما میں ایک مثبت کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ منشی پریم چند نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے ہندوستانی ادب کے میدان میں مشکلات کے درمیان سے ایک ایسا ہی راستہ نکالا ہے جیسا کہ ہندوستانی سیاست کے میدان میں گاندھی نے نکالا تھا۔

اگر گاندھی نے دیہات کو دریافت کر کے⑥ جو ہندوستانی تاریخ میں سماجی توانائی اور سیاسی قوت سے ایک ناآزمودہ چشمے کی طرح پڑا تھا، ایک عہد آفریں کردار انجام دیا ہے تو پریم چند نے بھی دیہات کو دریافت کر کے جو نئے موضوعات، اساطیر اور کرداری سانچوں کا ایک خزانہ تھا، ہندوستانی ادب کے نئے جنم کا آغاز کیا۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ استعمار زدہ گاؤں اور استعمار زدہ کسان کے جن مسائل پر گاندھی نے سیاسی سطح پر توجہ کی، پریم چند نے انہی سوالوں کو ادبی سطح پر اٹھایا۔ ہم یہ بھی پہچان سکتے ہیں کہ پریم چند کی کردار نگاری اور گاؤں کی مصوری کا لہجہ اور سماجی عمل اس تناظر سے قوی طور پر متعین ہوتا ہے جو گاندھی نے گاؤں کی زندگی کے پس پردہ دیکھا تھا گاندھی نے سیاسی اکھاڑے کے عین درمیان میں گاؤں اور شہر کے تنازعے کو جگہ دی تھی، ہندوستانی قومیت اور برطانوی

---

⑤ جس طرح پنجاب میں آزادی سے پہلے یونینیسٹ پارٹی نے کسانوں کی اصلاح کا علم بلند کر کے وقتی طور پر طاقت حاصل کر لی تھی اسی طرح گاندھی کا دیہات سدھار بھی شروع شروع میں بڑے زور و شور کی مقبولیت لے کے آیا جب تک کہ کانگریس نے استعماری تائید کے ساتھ یونینیسٹ پارٹی سے وزارتی اتحاد نہیں کر لیا۔ (م۔س۔ع)

⑥ یہ فرق پھر بھی رہے گا کہ دیہات کی دریافت سیاسی مقاصد کے لیے وہی معنی نہیں رکھ سکتی جو ایک تخلیقی فن کار اس میں مضمر دیکھتا ہے اسی لیے سیاسی دریافت زیادہ سے زیادہ ایک استحصالی حکمت عملی سے آگے نہیں جا سکتی جبکہ ادیب اپنی دریافت کو نت نئے پہلوؤں سے دیکھتا رہتا ہے (م۔ع۔س)

استعماری مفادات کے بنیادی تصادم کو رد کرتے ہوئے۔ اس تنازعے میں شہر مفت خور استعماری معیشت کا محور تھا اور گاؤں قوم کی پیداواری معیشت کا اور خلافِ استعمار مزاحمت کا بڑا سرچشمہ تھا۔ گاؤں اور شہر کا درمیانی شگاف جو گاندھی جی کی سیاست پر غالب تھا، تخلیقی تحریر پر بھی اپنا اثر و نفوذ چھوڑے بغیر نہ رہ سکا (۵)

پریم چند کے ممتاز ناول جیسے "رنگ بھومی" (چوگانِ ہستی)، "کرم بھومی" (میدانِ عمل)، "پریم آشرم" (گوشۂ عافیت) اور "گئودان"، ان کی متعدد کہانیوں کی طرح اسی گاؤں اور شہر کے درمیانی شگاف کے موضوع کے گرداگرد گھومتے ہیں اور اس سوال کے آس پاس کہ شہری مفت خوروں اور دیہاتی تولید کاروں کے درمیانی تصادم کا کوئی تصفیہ ممکن نہیں اور یہ کہ برطانوی استعماری نظام کا محور یہی تضاد ہے اپنی بیشتر تخلیقی تحریروں میں پریم چند اپنے بہترین معیار کو اس وقت پیش کرتا ہے جب وہ شہری طبقے کی خوشحالی، دولت اور جائیداد کا، جو اقتصادی مفت خوری کی مختلف شکلوں مثلاً سٹے بازی، بیاج اور ٹھیکے کی زمینداری سے جنم لیتی ہے، (دیہات کی عام غربت کے ساتھ۔ مترجم) نمایاں تقابل کی باریک بینی کے ساتھ تصویر کشی کرتا ہے۔ وہ تعلیم یافتہ طبقے کی مفت خوری کی مصوری بھی نہایت موثر طریقے سے کرتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو سرکاری کارندوں یا زمینداروں، وکیلوں، طبیبوں، سیاست والوں یا دوسرے پیشہ وروں کے طور پر، دیہاتی عوام کی بے علمی، ناخواندگی اور سماجی اقتصادی پسماندگی سے ذاتی منفعت حاصل کرتے ہیں (اس فہرست میں اس وقت کے اہلِ سیاست کا شمار دلچسپ ہے بشرطیکہ یہ معلوم ہو وہ لوگ کن جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ پریم چند اس سلسلے میں "دیہات پرستی" کے نمائندہ سیاست والوں کو بھی نہیں بخشتے!۔ مترجم) پریم چند کو شہر کے تعلیم یافتہ خواص کی شقاوتِ قلبی میں، جو دیہاتی عوام کے سلسلے میں روا رکھی جاتی ہے، پھر ذہنی اور جسمانی محنت کشوں کے درمیان جو ناقابلِ عبور خلیج حائل ہے، شہر اور گاؤں کے درمیانی شگاف کا سب سے نمایاں اظہار نظر آتا ہے۔ یہاں گاندھی کے اس نظریے کے ساتھ ناقابلِ تردید یگانگت ملتی ہے جس کے تحت شہری طبقوں کا بالعموم اور تعلیم یافتہ طبقے کا بالخصوص مفت خوروں جیسا کردار تصور کیا گیا ہے (تھوڑا سا فرق سیاست والوں کے اس طبقے میں شامل ہونے کا بھی یاد رہے تو یہ بینہٖ یگانگت کسی قدر قابلِ تردید ضرور بن جاتی ہے۔ مترجم) اور یہیں ان لوگوں کے استحصالی عمل میں پریم چند کی بصیرتوں کا سراغ ملتا ہے "کرم بھومی" (چوگانِ ہستی) اور "پریم آشرم" (گوشۂ عافیت) جیسے ناولوں میں پریم چند نے زمیندار طبقے کے استحصال کو شہر اور گاؤں کے درمیان شگاف کی توسیع کے طور پر پیش کیا ہے، جس حد تک کہ ان کی توجہ کا مرکز نیم جاگیردارانہ ٹھیکے کی زمینداری ہے یا تجارتی زمینداری جو برطانوی حاکموں کی لائی ہوئی معاشیات

---

(۵) اس امتیاز کے ساتھ کہ ادبی تخلیقات میں شہری اور دیہاتی زندگی کا تقابل، رومانی آدرشی نقطۂ نظر کا شکار ہونے کے باوجود، اتنا "غیر واقعی" پھر بھی نہ ہوا کہ شہروں کی جملہ مخلوق کو دیہات کی جملہ مصیبتوں کا باعث بنا کے رکھ دے۔ یہ رویہ سیاست سے مخصوص رہا (م ح س)

دولت کے زیادہ تر پھل رہی تھی۔ ان کو ابھی اس امتیاز سے سروکار نہیں جو فالتو پیداوار کرنے والے آسودہ حال کسانوں میں اور گزارے کے لیے کھیتی باڑی کرنے والے غریب کسانوں میں ہوتا ہے اس کے علاوہ زمیندار طبقے اور اشرافیہ کے کردار کھینچنے میں اور ان کے سماجی عمل کی ارزیابی میں پریم چند کا میلان گاندھی کی طرح، اس طرف ہے کہ اس طبقے سے بذاتہٖ استعمار کے شکار کی طرح سلوک کیا جائے، اس سے زیادہ کہ انہیں دیہات کے طاقتور آقا اور عوامی استحصال کے اہم ترین وسیلے کی حیثیت دی جائے۔ گاندھی اور پریم چند دونوں اپنی توجہ کو استعماری حاکموں پر مرکوز رکھتے ہیں جنہوں نے دیسی اشرافیہ کو فاسد بنا دیا ہے اور دیسی طبقۂ حاکمہ کو ایک اہم مقام تفویض کرکے زمیندار خواص اور کسان عوام کے درمیان ایک بہت بڑا دراڑ پیدا کر دی ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ کرم بھومی (میدانِ عمل) اور "پریم آشرم" (گوشۂ عافیت) میں پریم چند نے پرانے انداز کے مشفق و مہربان زمینداروں کا (جن کی مثال پربھا شنکر میں ملتی ہے) نئی قسم کے حریص اور بیدار قسم کے زمینداروں (مثلاً گیان شنکر) کے ساتھ مقابلہ کیا ہے جبکہ اول الذکر قسم کے کردار دں، رسوم، ریتوں کے تقاضوں کا اور "مریادا" (مروت یا دید لحاظ) کا خیال رکھتے ہیں، سابق الذکر کے نزدیک یہی رسمیں اور ریتیں اقتصادی دانشمندی سے بعید ہیں اور وہ برہنہ ذاتی مفاد کی پیروی کو جائز ثابت کرتے رہتے ہیں "رنگ بھومی" (چوگان ہستی) اور "پریم آشرم" (گوشۂ عافیت) دونوں میں پریم چند واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ برطانوی استعمار کے پیدا کردہ نئے طبقے کی تجارتی قوت محرکہ کس طرح عوام کے اجتماعی مفاد سے صریحاً متصادم ہوتی ہے "رنگ بھومی" (چوگان ہستی) میں یہ تصادم اس وقت منتج ہوتا ہے جب (اندھے اور غریب) سورداس کی زمین جو عوام کے ڈھور ڈنگروں کے چرنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ اب اس کو ایک عیسائی تاجر جون سیوک اپنے قبضے میں لانا چاہتا ہے تاکہ وہاں سگریٹ بنانے کا کارخانہ لگ سکے۔ تاہم ان ناولوں میں پریم چند اس قسم کے تصادم کو ایک موجود نظام کے اندر ناقابلِ تصفیہ قرار نہیں دیتے وہ ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کا ایک راستہ بھی سجھاتے ہیں۔ جیسے "پریم آشرم" (گوشہ عافیت) میں پریم شنکر کو ایک مصلح کی طرح ابھار کر اور مایا شنکر کو ایک ایسے نئی قسم کے روشن خیال زمیندار کی طرح پیش کر کے جو اپنے مزارعین کے ساتھ امن و آشتی سے رہتا ہے۔ مزید براں، پریم چند کسانوں کی مزاحمت کی بے حوصلگی کو بھی نمایاں کرتے ہیں خصوصاً انفرادی دہشت گردی کی صورت میں، جب وہ غوث خاں کے قاتل منوہر کی خودکشی کو بیان کرتے ہیں حالانکہ غوث خاں، زمینداری نظام کے ایک نئی قسم کے بے رحم کارندے کی صورت میں نمودار ہوا تھا۔ مزاحمت کے بجائے اصلاح کا راستہ جو پریم چند نے پسندیدگی کے ساتھ ایک حل کے طور پر پیش کیا ہے، گاندھی کے اس سماجی تصور سے بہت حد تک مشابہ ہے جس کے تحت زمینداروں اور مزارعین کے درمیانی رشتے کی آدرشی شکل وجود میں آنی چاہیے

یہیں سے ہم پریم چند کے "گئودان" کی طرف مائل ہوتے ہیں جس میں انہوں نے حقائق کی تصویر کشی کرتے ہوئے کسی نظریاتی مفاہمت سے کام نہیں لیا۔ اس ناول میں کسانوں کے مسئلے کو حل کرنے کی وہ کوشش ترک کر

دی گئی ہے جس کی رو سے موجودہ نظام میں جائیداد کے بل پر دھونس دھڑی سے کام لینے والوں کا "دل بدلنے کی آرزو" کی باتی تھی۔ میاں مرکزِ توجہ دوشن خیال زمیندار کی جگہ اس کسان کی طرف تبدیل ہو جاتا ہے جو شعور کے ایک اونچے درجے کی حد تک بیدار ہو رہا ہے۔ "گئودان" ہوری کی داستان ہے ایک ایسے کسان کی جو پانچ بیگھے زمین پر کاشت کرتا ہے اور ہمیشہ کسان اور مزدور کے درمیان معلق رہتا ہے۔ ناقابلِ برداشت لگان، بیاج، مالیانے اور بیگار کی وجہ سے ہوری کی بس ایک ہی تمنا ہے کہ کسی طرح ایک قطعہ زمین اور ایک راس گائے اس کی ملکیت بن جائے اور وہ اس کے لیے سب مزدوری مفاہمتیں کرتا ہے جو "کسانوں کی اس ننھی منی خیالی دنیا" کو حاصل کرنے کے لیے لازمی ہیں۔ مگر یہ خیالی دنیا اس کے ہاتھ نہیں آسکتی بلکہ وحشی سماج کی قوتیں اس خواب کو ہی ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔

پریم چند اب گاؤں کے "بیرونی دشمن" پر توجہ مرکوز رکھنے پر مطمئن نہیں چاہے وہ ٹھیکے پر زمین اٹھانے والا زمیندار ہو، ساہوکار یا وکیل ہو، یا ان سرکاری کارندوں میں سے ہو جو کبھی کبھی گاؤں پر ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہوتے ہیں۔ "گئودان" میں پریم چند تصویر کے عین درمیان میں "اندرونی دشمن" کو رکھتے ہیں۔ گرام پنچائت کو، برادری کو اور آسودہ حال کسانوں کے نمائندے پردہیت کو، گاؤں کے مہاجن کو، گاؤں میں بسے ہوئے زمیندار کے کارندوں کو اور چھوٹے سرکاری ملازمین کو ڈراماتی میدان کے عین مرکز میں پریم چند کسان کو اپنی تقدیر پرستی کو بھی رکھتے ہیں اور اس کی مسکینی کو، مفاہمت کے لیے اس کی رضامندی کو اور دھونس دھڑی سے کام لینے والوں کے ساتھ کسی قیمت پر صلح کی آمادگی کو بھی۔ "گئودان" مفاہمت کی راہ کے المیہ انجام کا حاصل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور اس عاجزی و مسکینی کا بھی جو "گئودان" کے مرکزی کردار ہوری کی آخری فریاد کی صورت میں یوں بیان کی گئی ہے۔

> .... (ہوری کے) منہ سے ایک لفظ نہ نکلا گویا ذلت کے اتھاہ سمندر میں گر پڑا ہو اور گرتا چلا جا رہا ہو۔ آج تیس سال زندگی سے لڑتے رہنے کے بعد وہ ہار گیا اور ایسا ہارا ہے کہ گویا اس کو شہر کے پھاٹک پر کھڑا کر دیا گیا ہے اور جو جاتا ہے وہ اس کے منہ پر تھوک دیتا ہے۔ اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ بھائیو میں رحم کا مستحق ہوں، میں نے نہیں جانا کہ جیٹھ کی لو کیسی ہوتی ہے اور ماگھ کی برکھا کیسی ہوتی ہے۔ اس بدن کو چیر کر دیکھو اس میں کتنی جان رہ گئی ہے اور وہ کتنی چوٹوں سے چور اور ٹھوکروں سے کچلا ہوا ہے؟ اس سے پوچھو کبھی تم نے اس کے درشن کئے ہیں، کبھی تو چھاؤں میں بیٹھا ہے؟ اس پر یہ ذلت اور وہ اب بھی جیتا ہے۔ نامرد، لالچی، کمینہ! اس کا سارا اعتقاد جو بہت گہرا ہو کر ٹھوس اور اندھا ہو گیا تھا، گویا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو......

ہوری کی موت، کسان کی خیالی دنیا کے مکمل انہدام کی علامت بنتی ہے اور اس کے بعد عاجزی و مسکینی

اور مفاہمت کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ ہوری کے گھر والوں کی کسانوں کے طرزِ حیات سے بیری علیحدگی اور اس کے بیٹے گوبر کا روزی کی تلاش میں شہر کی طرف اخراج بھی "دیہات پرستی" اور "مزارعیت" کے انتہائی انجام کی علامت ہیں اور قدیم سماج پر دولت کے بالآخر غالب آنے کی مثال۔ پرانے سماج کے پیدا کئے ہوئے کسان کی موت دوسرے معنوں میں پرانے سماج کی موت ہے جس کو اندر سے سدھارنے کا کوئی امکان باقی نہیں تھا پرانے اور پراچین (سماج) کا مرجانا ناگزیر ہے تاکہ اس کی راکھ سے نیا سماج جنم لے سکے۔ یہی پریم چند کا واضح پیغام ہے جو "گئودان" کے ذریعے ادا ہوتا ہے۔

انگلستان میں صنعتی انقلاب کے زیر اثر غریب کسان کی تقدیر پر تبصرہ کرتے ہوئے برطانوی مؤرخ ایرک ہوبز بوم نے اپنی تصنیف "انقلاب کا دور" (۱۹۶۳ء) میں لکھا ہے۔

"ان غریبوں کے لیے جو خود کو بورژوا سماج کی راہ میں حائل دیکھتے تھے اور جو روایتی سماج کی دشوار گزرگاہوں میں اپنا اثر و رسوخ کھو چکے تھے، ان کے بس تین امکانات باقی رہ گئے تھے بورژوا بننے کی کوشش کرنا، اپنے پس جانے پر راضی ہو جانا اور بغاوت۔"

تاہم استعمار زدہ کسان کے لیے (ہندوستان میں) صرف دو ہی راستے کھلے تھے اور پہلا راستہ مسدود تھا وہ یا تو پس سکتا تھا یا بغاوت کر سکتا تھا۔ "گئودان" کا ہوری دوسرے امکان کے المیے کی مثال پیش کرتا ہے تاہم ایک واقعاتی فن کار ہوتے ہوئے پریم چند کو ایک "ابتدائی قسم کے باغیانہ پن" کی لرزشیں استعمار زدہ کسان کے ہونٹوں پر بھی سنائی دیتی ہیں ایسی لرزشیں جو ابھی تیسرے امکان یعنی ایک مؤثر بغاوت کی صورت میں بار آور نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے ادبی واقعیت کے تقاضے پریم چند کو مجبور کرتے ہیں کہ "گئودان" کا خاتمہ امید اور فتح کے بجائے شکست اور مایوسی کے لہجے پر ہو۔

OO

غزلیں

○

غلام جیلانی اصغر

کچھ لوگ پانیوں میں جو غور یدہ سر ہو گئے
موتی سمندروں کی تہوں میں اُتر گئے

سیلاب سے گھروں کے اُجالے تو بجھ گئے
دیوار و در سے نقش پُرانے اُتر گئے

خوشبو کے ساتھ ساتھ ہوا کے جلو میں تھے
ہم تیری خلوتوں میں برنگِ دِگر گئے

کچھ آشیاں اسیر رہے عمر بھر تمام
کچھ طائرانِ شوق بہ توفیقِ پر گئے

اے دوست تجھ سے ترکِ تعلق کا کیا گلہ
ہم خود ہی چاہتوں کے تسلسل سے ڈر گئے

تحریرِ نقشِ پا کی ہوا لے کے اُڑ گئی
جو شام کو ملے تھے مسافر کدھر گئے

○

غلام جیلانی اصغر

وہی پہاڑ جو اتنے عظیم پیکر تھے
انہیں قریب سے دیکھا تو صرف پتھر تھے

میں کس کو دیتا چمن میں ہوا کا سندیسہ
یہاں تو جتنے بھی تھے لوگ سب مسافر تھے

انہیں چھُوا تھا۔ ابھی تک چبھن سی باقی ہے
وہ شاخِ گُل کی طرح کس قدر معطّر تھے

اب اپنا نام بھی مشکل سے یاد آتا ہے!
کبھی وہ دن تھے کہ لوگوں کے نام ازبر تھے

بچھڑ رہے تھے سرِ شام تم خموشی سے
میری نظر میں رُتوں کے اُداس منظر تھے

خدا خیر کہ قبیلوں میں کس نے بانٹ دیا
سفر پہ لوگ چلے تھے تو سب برابر تھے

○

○

غلام جیلانی اصغر

موسمِ گُل میں اگر شاخ سے ٹوٹے ہوتے
کچھ شگوفے بھی اسی شاخ سے پھوٹے ہوتے

دِل بڑا سخت تھا، ہر سنگِ بلا جھیل گیا
ورنہ ہم شدّتِ احساس سے ٹوٹے ہوتے

تم نے جانا تھا تو پہلے ہی جدا ہو جاتے
اِس طرح روز کے مرنے سے تو چھوٹے ہوتے

ہونٹ چُپ چاپ سہی، آنکھ ہی کچھ کہہ جاتی
رُوٹھنے والے سلیقے سے تو رُوٹھے ہوتے

مَیں تیرے کانوں کے آویزوں میں حدّت بھرتا
کچھ ستارے جو سرِ عرش سے ٹوٹے ہوتے

ہم نے ہنس ہنس کے بھرم اہلِ وفا کا رکھا
ہم بھی رو دیتے اگر عشق میں جھوٹے ہوتے

○

غلام جیلانی اصغر

اُفق سے شام اُترنے لگی ہے ڈیروں پر
پرندے لَوٹ کے جانے لگے بسیروں پر

طویل شب کی مسافت سے میں بھی گذرا ہوں
میرا بھی حق ہے تیرے شہر کے سویروں پر

مَیں بام و دَر کو بڑی حسرتوں سے تکتا ہوں
پرندہ چھوڑ گیا نقش ان منڈیروں پر

جبیں سے نقشِ عزیمت تو ہم نے دھو ڈالے
ندامتوں کے صحیفے لکھے ہیں چہروں پر

کبھی گلی سے مسافر کوئی تو گذرے گا
دِیے جلا کے مَیں رکھتا چلوں منڈیروں پر

○

انجم رومانی

ہم کو تو بس ہجومِ مقابر دکھائی دے
دیکھو اگر تمہیں کوئی زائر دکھائی دے

خاموش ہو تو اس پہ گماں ہو کلیم کا
باتیں کرے تو دل کوئی ساحر دکھائی دے

کانوں میں آ رہی ہیں نوائیں ہزار ہا
آنکھوں کو صرف ایک ہی طائر دکھائی دے

چاہیں جو دیکھنا تو دکھائی نہ دے کہیں
ہر وقت ہر جگہ جو بظاہر دکھائی دے

پھرتے ہیں دشت دشت غزالانِ تشنہ کام
شاید کوئی سراب کہیں پھر دکھائی دے

ہم ہیں کہ اک غبارِ تمنا سفر میں ہے
رستہ دکھائی دے نہ مسافر دکھائی دے

درپیش اُسے بھی تھا یہی آشوبِ آگہی
آدم مجھے تو اپنا معاصر دکھائی دے

پیدا کیے ہیں اُس نے کچھ ایسے بھی نیک لوگ
ہر شخص جن کو فاسق و فاجر دکھائی دے

نکلے ہو ٹیکتے ہوئے انجم عصائے نور
اندھوں کو کیا ورائے مظاہر دکھائی دے

قتیل شفائی

ان گیسوؤں کی چھاؤں میں دم لینا چاہیئے
تپتی رُتوں میں لطفِ ارم لینا چاہیئے

رہے دشمنِ قرار، غمِ عاشقی — مگر
جاں دے کے بھی ملے تو یہ غم لینا چاہیئے

پھیلا ہے اتنا حسن، کہ اس کائنات میں
انساں کو بار بار جنم لینا چاہیئے

مَیں ہوں خدا پرست مگر کہہ رہا ہے دِل
اک بوسۂ جبینِ نم لینا چاہیئے

جو بھی فسادِ خلق سے واقف نہ ہو، اُسے
گھر درمیانِ دیر و حرم لینا چاہیئے

دیتے ہیں پھل بدی کا جہاں نفرتوں کے پیڑ
نام اس دیار کا ہمیں کم لینا چاہیئے

پہلے تو مہرباں تھیں بہت ہم پہ آندھیاں
اب امتحانِ ابرِ کرم لینا چاہیئے

چاہے وہ کوئی ہو مرا فتویٰ ہے یہ قتیل
ظالم سے انتقامِ ستم لینا چاہیئے

قتیل شفائی

زندگی کی دلدل ہے اور ناتواں انساں
دامِ خاک سے بچ کر جائے گا کہاں انساں

دھوپ بن کے چمکا ہے برف بن کے پگھلے گا
صورتیں بدلتا ہے، زیرِ آسماں انساں

سوچتے سمجھتے بھی، پتھروں کی بارش میں
جانے کیوں بناتا ہے کانچ کے مکاں انساں

شام تک تو شعلہ تھا، اس کے بعد کیا کہیئے
رات جب پڑی شبنم، بن گیا دھواں انساں

آگ تو برستی ہے گیلے بادلوں سے بھی
کس طرح بچائے گا اپنا آشیاں انساں

اس نے لوحِ فردا پر لکھنا چاہا نام اپنا
بن کے رہ گیا لیکن یادِ رفتگاں انساں

کر رہا ہے رکھوالی بے ثمر درختوں کی
زرد موسموں پر ہے کتنا مہرباں انساں

اس کو خاص نسبت ہے جب تبسمِ گل سے
کیسے جھیل جاتا ہے صدمۂ خزاں انساں

گو قتیل قدموں سے بے بسی بھی لپٹی ہے
پھر بھی راہِ ہستی پہ ہے رواں دواں انساں

قتیل شفائی

اب میرے دل کی راہ سے ہوتا ہے یوں اس کا گزر
جیسے چلے باد صبا، خوشبو کی چادر اوڑھ کر

دیکھو تو اک چہرہ ہے وہ سوچو تو سامان سخن
گاہے غزل، گاہے سبو، گاہے کلی، گاہے قمر

ہم کو ملی آوارگی، اک دوسرے کی کھوج میں
گھوما ہے وہ بھی کو بہ کو، بھٹکا ہوں میں بھی دربدر

دونوں کی منزل ایک ہے، کچھ فرق دونوں میں نہیں
ارمان کوئی دل میں ہو یا راکھ میں کوئی شرر

کیا جانیئے اس رنگ میں انجام کیا ہو عشق کا
جذبات سے مجبور میں حالات سے وہ بے خبر

کٹتے رہے سب فاصلے کچھ دائروں کے درمیاں
درپیش تھا پرکار کو بس ایک نقطے کا سفر

کچھ روز سے ہے زندگی یوں بے سکون و بے قرار
جیسے کسی عاشق کا دل جیسے کسی مفلس کا گھر

جو کچھ سر منزل ہوا سب میرے ایماء پر ہوا
میں آپ اپنا راہزن، میں آپ اپنا راہبر

مت گل رخوں کا نام لے ان واعظوں کے سامنے
میں اک شریف انسان ہوں اے دل مجھے رسوا نہ کر

راہوں کی رونق ہی نہیں انسان کے محسن بھی ہیں
دیکھو نہ ان کو کاٹنا دیتے ہیں سایہ جو شجر

مجبور مجھ سا بھی قتیل اس عشق میں کوئی نہ ہو
باقی ہیں سو رسوائیاں اور زندگی ہے مختصر

قتیل شفائی

کہنے کو تو پیارا سا گھر لگتا ہے
مجھ کو اس ویرانے سے ڈر لگتا ہے

شہر میں ہے یہ حال ترے دیوانے کا
جس رستے سے گزرے پتھر لگتا ہے

چوٹ بھی کھا کر جب وہ چومے پتھر کو
ایسے میں انسان پیمبر لگتا ہے

اس نے ہاتھ چھڑا کر موڈ بگاڑ دیا
اب وہ مجھ کو زہر برابر لگتا ہے

جو پروانہ اپنی جان کی فکر کرے
وہ عشاق کی ذات سے باہر لگتا ہے

آیا جس کے ہاتھ پرایا آئینہ
اپنی ذات میں وہ اسکندر لگتا ہے

نہر تو بہتی ہے شیریں کی آنکھوں سے
تیشہ کیوں فرہاد کے سر پر لگتا ہے

کھینچا ہے جو خلد کا نقشہ واعظ نے
مجھ کو اپنی سوچ سے کم تر لگتا ہے

کون مسیحا بنا ترا دمساز قتیل
حال ترا پہلے سے بہتر لگتا ہے

فارغ بخاری

ہوا پہ لکھ کے بتاتے ہیں زخم کاری ہے
بڑے کمال کی یاروں میں بردباری ہے

تغیراتِ زمانہ عجب سہی لیکن
یہاں تو زرد رُتوں ہی کا فیض جاری ہے

تم اپنی ذات کے کہسار سے اُتر نہ سکے
میری نظر میں مگر کائنات ساری ہے

تم اژدہے کی طرح شب کے پہرہ دار رہے
کرن کرن سحرِ زرفشاں ہماری ہے

جہاں بھی چاہو تم اِترا کے سانس لیتے رہو
مگر کبھی نہ یہ سوچو، ہوا تمہاری ہے

نڈھال ہوکے رُکے ہیں جہاں قدم فارغ
کسی کی یاد نے آ کر تھکن اُتاری ہے

صبا اکبر آبادی

اُجالا کر کے ظلمت میں گھرا ہوں — چراغِ رہگزر تھا بجھ گیا ہوں
تری تصویر کیسے بن سکے گی — ہر اک سادہ ورق کو دیکھتا ہوں
مجھے طوفان سے شکوہ نہیں ہے — ہلاکِ بے رُخیٔ ناخدا ہوں
سبھی کو ادعائے دوستی ہے — میں اپنے دشمنوں کو دیکھتا ہوں
وہ میری زندگی ہے کیسے کہہ دوں — کہ اپنی زندگی سے میں خفا ہوں
بسا ہے دل میں اک نقشِ خیالی — کسے سمجھاؤں کس کو چاہتا ہوں
سناؤں داستانِ ظلم کیسے — نگاہِ لطف کا مارا ہوا ہوں
تمہیں سو رُخ نظر آئیں گے اپنے — میں آئینہ ہوں اور ٹوٹا ہوا ہوں

صبا آہستہ آہستہ اُڑوں گا
میں دستِ نازکا رنگِ حنا ہوں

صبا اکبر آبادی

شمعِ اُمید کیوں جلا دی ہے — عشق تاریکیوں کا عادی ہے
آپ نے خود مجھے صدا دی ہے — یا مری قوتِ ارادی ہے
اب دعا پر بھی اعتماد نہیں — نامرادی سی نامرادی ہے
دل کی افسردگی پہ سرد آہیں — تم نے پھر آگ کو ہوا دی ہے
تم سا بیدادگر کہاں ہوگا — لبِ ہر زخم نے دعا دی ہے
دیکھ فطرت کی بزم آرائی! — خاک پر چاندنی بچھا دی ہے
مختلف ہیں تصوراتِ جمال — یہ عقیدہ بھی انفرادی ہے
یہ چھوٹی سی ہے کلی سرِ شاخ — باغ کی بادشاہ زادی ہے
لبِ تصویرِ دوست کچھ تو بتا — کس نے یہ خامشی سکھا دی ہے

اے صبا کیمیائے غم کے لیے
زندگی خاک میں ملا دی ہے

○

عارف عبدالمتین

جب کبھی غزل چھیڑوں، تیرے روپ ناؤں سے — ذہن گونج اٹھتا ہے، ان کہی صداؤں سے!
تتلیاں سی اڑتی ہیں، چار سو فضاؤں میں — آشنا ملیں جس دم، اپنے آشناؤں سے!
کیسی پاپ نگری میں پڑ گیا مجھے جینا — نام باپ کا بیٹے، پوچھتے ہیں ماؤں سے!
انگلیاں تو ہاتھوں کی، کٹ گئی تھیں گھر ہی میں — دشت میں نکالوں میں، کیسے خار پاؤں سے!
کون جانے کیا ہوگا، حال میرے کھیتوں کا — اک زمانہ گزرا ہے، ابر چلا تھا گاؤں سے!
چلتے چلتے میں شاید آ گیا نگر تیرے — باس تیری آتی ہے، مجھ کو ان ہواؤں سے!
کس طرح میں سستاؤں، عارف اس کے پہلو میں
ناگ سے لپٹتے ہیں، ہر شجر کی چھاؤں سے!

○

عارف عبدالمتین

تو میرے دل کا سکوں بھی ہے، اضطراب بھی ہے — کہ تیرا روپ حقیقت بھی ہے، سراب بھی ہے!
حیات چھوڑ گئی مجھ کو کس دورا ہے پر — کہ جاگتا ہوں، مگر آنکھ محوِ خواب بھی ہے!
وہ شاخ جس سے ہر اک شخص کو چبھے کانٹے — کسے خبر کہ اسی شاخ پر گلاب بھی ہے!
میں پھر رہا ہوں لیے پیاس جلتے صحرا کی — یہ اور بات مری آنکھ میں سحاب بھی ہے!
میں اپنے آپ میں اک بیکراں سمندر ہوں — مرے وجود میں موجیں بھی ہیں، حباب بھی ہے!
نجانے کب مجھے فرصت ملے کہ اس کو لکھوں — کتابِ زیست میں راحت کا ایک باب بھی ہے!
میں اپنے آپ سے کرتا ہوں گفتگو عارف
مگر کچھ ایسے کہ سب سے مرا خطاب بھی ہے!

عارف عبدالمتین

میں تیرے ہجر کے ہر زخم کو ہرا دیکھوں،
خزاں کی رُت میں بھی موسم بہار کا دیکھوں
اُفق سے تا بہ اُفق پھیل جائے پیار مرا،
ہر ایک چہرے پہ چہرا ترا سجا دیکھوں
مرے بدن سے سراپا تیرا نمایاں ہو،
تیرے ہی عکس کو دیکھوں، جب آئینہ دیکھوں
مری نگاہوں پہ چھا جائے تو دھنک کی طرح
تمام رنگ ترے میں جُدا جُدا دیکھوں
یہ معجزہ بھی کبھی رات مجھ کو دکھلائے
تو چُپ ہو اور بدن تیرا بولتا دیکھوں
ترا وجود کہیں تجھ سے ماورا تو نہیں،
میں تجھ کو پا کے بھی کیوں تیرا خواب سا دیکھوں
بلا سے تیری جھلک ایک پل بھی پا نہ سکوں
ازل سے تا بہ اَبد تیرا راستہ دیکھوں

عارف عبدالمتین

مرے فسانے میں گُم ہیں حکایتیں اُس کی،
تلاش کر مرے رُخ میں شباہتیں اُس کی!
بجا کہ میرے لیے کم نہ تھیں قیامت سے،
میں یاد کرتا ہوں اب تک رفاقتیں اُس کی!
خدا کرے کہ وہ مجھ سے سدا کشیدہ رہے،
کہ چاہتوں سے ہیں دلکش عداوتیں اُس کی!
گلہ گزار تھا، لیکن میں بدگماں تو نہ تھا،
شکوک دے گئیں دل کو وضاحتیں اُس کی!
یہ اور بات کہ ہوں مجھ کو اَن گنت شکوے،
مرے لبوں پہ نہیں ہیں شکایتیں اُس کی!
ہمیں نے طرزِ تجاہل میں عافیت جانی
وگرنہ فاش تھیں دل پر بجھارتیں اُس کی!
وہ میرے سامنے کیوں ہونٹ تک ہلا نہ سکا
بہت بلیغ تھیں عارف فصاحتیں اُس کی

○

احمد ظفر

کہاں تک چلچلاتی دھوپ میں اے دل جلوں گا میں
شجر بن کر کسی صحرا کے سینے میں رہوں گا میں

کسی مینار نے چپ چاپ گنبد سے کہا جیسے
فلک جھکتا ہے جھک جائے مگر کیسے جھکوں گا میں

کوئی اڑتا ہوا لمحہ مجھے غم سے رہائی دے
کہ تتلی کے پروں سے کوئی نغمہ بھی سنوں گا میں

تری رعنائیوں کا زور جنگل جب پکارے گا
تو اپنی خامشی کو معجزہ شاید کہوں گا میں

ظفر اپنے لہو میں ڈوب کر ساحل پہ جا پہنچا
سمندر پر بقا کا راز بن کر کب کھلوں گا میں

○

احمد ظفر

جھونکا ہوا کا مجھ کو بھگا کر چلا گیا
لیکن چراغ دل کا بجھا کر چلا گیا

سورج کو میں نے دیکھ لیا ہر لباس میں
پتے شجر کے خاک بنا کر چلا گیا

اس پار زندگی کے چلے گئے
دریا بھی میری پیاس بڑھا کر چلا گیا

غیروں سے مل رہا ہے وہ ہنس ہنس کے دیکھئے
کچھ دوستوں کے دل جو دکھا کر چلا گیا

دیکھیں وہ مجھ کو دیکھنے آتا ہے کب ظفر
لٹنے سے پیشتر جو مٹا کر چلا گیا۔

○

○

محشر بدایونی

یوں قتل نسب تو کوئی پیکار نہیں ہے
یارو مرا سر ہے میری دستار نہیں ہے

یہ ضربتِ تیغہ سے کھلا تیشہ زنوں پر
دیوار فقط ایک ہی دیوار نہیں ہے

جو حادثہ آئے وہ فراغت سے گزر جائے
اب گھر کی زمین ایسی بھی ہموار نہیں ہے

وہ یورشِ افسوس ہے کہ اس موسمِ شب میں
رہ جائے گا سویا ہی جو بیدار نہیں ہے

میدانِ شہادت میں ڈھلان آئی یہ کیسی
خود میرا لہو میرا طرفدار نہیں ہے

کیا زخم اسے موسم نے کیا ہے جو مسافر
سائے میں بھی چلنے کا گنہگار نہیں ہے

اب عمرِ تمنا کا سفر یوں ہی سمجھ لو
بازار ہے اور رونق بازار نہیں ہیں

○

خاطر غزنوی

سائباں تھا دھوپ کا اور مہر کا سایہ نہ تھا
وسعتِ امکاں میں ورنہ اے خدا کیا کیا نہ تھا

میں تو اس کو زندگی کا پاسباں سمجھا سدا
اپنا خوں بھی دشمنِ جاں ہے کبھی سوچا نہ تھا

اس کے آتے ہی سمٹ آئی نگہ میں تشنگی
اس طرح دیکھا اسے جیسے کبھی دیکھا نہ تھا

شے جو کھو جائے اسے دل میں بھی کرتے ہیں تلاش
تو نے کھویا تھا مجھے، میں نے تجھے کھویا نہ تھا

اس نے کیا دیکھا کہ تصویرِ بہاراں بن گیا
اس سے پہلے یوں کبھی آئینہ آئینہ نہ تھا

جانے اس نے کس غرض سے عمر بھر پیچھا کیا
وہ جو اک سایہ سدا ہمراہ تھا اپنا نہ تھا

میرے ہاتھوں سے من و سلویٰ جھپٹ کر لے گیا
اک پرندہ جو زمینوں پر کبھی اترا نہ تھا

نامرادی عشق کی منزل، اندھیرے زادِ راہ
اس سفر پہ جو بھی نکلا راہ سے بیگانہ تھا

اونچے پیڑوں کا ثمر اس دور میں اس کو ملا
قد و قامت میں جو خاطر مجھ سے بھی اونچا نہ تھا

○

سیّد رضی ترمذی

کنجِ عزلت سے اُٹھو، صبحِ بہاراں دیکھو　　دوستو، نغمہ گرو، رقصِ غزالاں دیکھو
مٹ گیا راہگذاروں سے ہر اک نقشِ خزاں　　ورقِ گُل پہ لکھے اب نئے عنواں دیکھو
مطرباں بہرِ قدمبوسیٔ شیریں دہناں　　محفلِ گُل میں چلو، جشنِ بہاراں دیکھو
مژدہ، پھر خاکِ خزاں رنگ کی قسمت جاگی　　آگیا جھوم کے ابرِ گہر افشاں دیکھو
ہمنوا ہو کے مرے تم بھی غزلخواں ہو جاؤ　　جو لبِ جوئے رواں، سروِ خراماں دیکھو
یہ جلوسِ گُل و ریحاں ہے کہاں نغمہ زناں!
اُٹھ کے دروازے سے باہر تو مری جاں دیکھو

○

سیّد رضی ترمذی

اس بزمِ ہاؤ ہُو میں دل زار کیا نہیں　　لیکن کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہیں
اِک ہم کہ اُن کی یاد ہو جیسے خدا کی یاد　　اور ایک وہ کہ جیسے ہمارا خدا نہیں
جانِ عزیز، جاں سے گذرنا ضرور ہے　　شہرِ وفا کا اور کوئی راستہ نہیں
راہِ طلب میں ہم نکل آئے ہیں کس طرف　　اُن کی خبر ملی ہے تو اپنا پتہ نہیں
جانِ وفا بھی ہے وہی بیگانۂ وفا
جس سے ہزار ربط سہی رابطہ نہیں

○

شان الحق حقی

اے راتِ شبانہ دامن نہ کھینچ میرا
دو گام کے سفر میں کیا شام کیا سویرا

کیا فائدہ جو ڈالا طوفاں کے رُخ پہ ڈیرا
شاخوں سے درگزر کر سینوں میں کر بسیرا

کیا رنج کیا کلپنا کیا آپ جینا !
تُو بھی نہیں خود اپنا، کچھ بھی نہیں ہے تیرا

جب تک ہے سر سلامت باقی ہے نوبتِ غم
چاہے تو جی بدل لے، یہ تیرا اور وہ تیرا

اُس کوئے آشنا سے اُٹھے قدم تو اُٹھے
کن راستوں نے روکا کن بازوؤں نے گھیرا

یہ تہمتیں ہیں ہم پر کیا عرض کون ہو ہر
کیا تجھ سے میں جُدا ہوں کیا تُو نہیں ہے میرا

پیغامِ شوقِ حُسن لے دامن میں پھول چُن لے
ہوتا ہے جوگیوں کا سو سو برس میں پھیرا

چلتی رہیں زبانیں، بدلی نہ چال اُس نے
گرتی رہیں چٹانیں، عالم نے رُخ نہ پھیرا

کیا جانے کیا دکھائے برسے کہ سر سے جائے
چھایا ہُوا ہے یارو بادل بہت گھنیرا !

شان الحق حقی

بھیگی بھیگی روشن روشن ہے یہ رات ہماری
بیت نہ جائے دیکھو سُن لو، سُن لو بات ہماری

سہکی سی بولائی سی ہے چنچل سی چندرائی سی ہے
پھر بھی رات ہماری ہے یہ پھر بھی رات ہماری

کیا جانے کب ہاتھ لگے پھر یہ سُکھ کا سنجوگ
بیٹھی ہیں آفات لگائے کب سے گھات ہماری

اس کا من تو مان بھرا ہے اپنا من ارمان بھرا
ہم سب سمجھ لیں وہ نہ اُٹھائے آدھی بات ہماری

ایک ہی دھرتی پر یہ چہکتے پیڑ مہکتے پھول
ایک ہی رُت میں یہ ڈالیں بے پُشپ[1] اور پات ہماری

ان کی بولی میں ہے یارو دھرم اسی کا نام
مانیں ایک تمہاری ہم تو مانو سات ہماری

دھرتی کا دم کھینچ رہا ہے کل چکّر کا جال
دھیرے دھیرے موڑ رہا ہے کل اسپات ہماری

جی کو پیار کے موہ بچائیں غیروں کو جا پُوجیں
اس دھرتی پر یہ ہے یارو بس اوقات ہماری

کیا تھا اس ریوالی میں گر رکھتے ہمارے بات
اچھا جاؤ سکھ تمہاری اور پربھات[2] ہماری

[1] پشپ : پھول
[2] پربھات : طلوعِ صبح

شان الحق حقی

کل کے ڈر سے آج یہ دنیا کرتی ہے انیائے
کل تو اچھی ہوگی بدھنا، کل جلدی سے آئے

ہم کس جوگے ہم کس گُن کے جب یہ کلجگ آئے
جو کوئی لے پاپ سے ٹکر وہ پاپی کہلائے

اے میرے دو نینوں تم اِک تھور نہ ہونے پائے
جیون بھر اب بھٹکو تم کو کل کل ترسائے

رُوپ پہ مرنا پُن ہے مہا پن بھوک سے مرنا پاپ
پاپ بھی ایسا پاپ جو چل کر لاکھوں کے سر جائے

دیپ تلے اندھیر نہ دیکھیں اُجلے نین کٹھور
جب مچھلی کا جال بنا اور جھیل کنول مسکائے

دیکھو یہ ست رنگی لیلا سنت کی نہ پوچھو بات
جیون بھر انجان رہے اور جیون بھر پچھتائے

درد کی سنگت اور ہی کچھ ہے رُوپ کی سنگت اور
رُوپ سے آنکھیں مُوند بھی لوں تو موہ مجھے بلمائے

موت نے آکر ڈھانپے سب کے روگ اور دکھ اور دوش
ایک جنم کا مارا وہ جو مرکر مٹ نہیں پائے

چاہے جتنے ریاں پڑے ہوں چاہے جتنے گھاؤ
عورت کیا، وہ مرد نہیں جو چھاتی کھول دکھائے

آشا سے ہم دھائے پُوجے دیکھا خوب تماشا
کر جوڑے کرموں سے اپنے جگ بھرے بھر پائے

من میرا چکرائے حقی ان دونوں کے بیچ :
جیبھ کا نعرہ ہے بھگوان اور جیو کا نعرہ ہائے

---

۱ بدھنا : کرتار، کارساز (حکیم مطلق) ۲ لیلا : تماشا، سانگ
۳ بلمائے : روکنا، کھینچنا ۴ کر : ہاتھ
۵ جیبھ : زبان۔

شان الحق حقی

اُن سے کیا حالِ سوزِ جاں کہیے — اور ہی کوئی داستاں کہیے
کر گیا ابرِ نو بہاری کیا — خاک کا جذبۂ جواں کہیے
سج رہی ہیں دکاں دکاں جن کو — میرے دامن کی دھجیاں کہیے
خوب ہے چھت کے روزنوں کا سماں — ذوقِ آرائشِ مکاں کہیے
ہے اسی میں ازل اسی میں ابد — ایک لمحے کو جاوداں کہیے
ہے وہی مطلعِ ازل کہ جسے — مقطعِ جادۂ زماں کہیے
مجھ سے وہ شوخِ چشم کہتا ہے — آیئے دردِ دو جہاں کہیے
خلطِ بحث ہے قصۂ دوراں — گو بقصدِ خوبیٔ بیاں کہیے
اور ہے زرگری و سیاسی! — کیوں اسے سرِّ دلبراں کہیے
کیا شرارت کو بدخصالوں کی — خوش جمالوں کی شوخیاں کہیے
جو بھی لکھنا ہو واشگاف لکھیں — نہ کہ ایہام و چیستاں کہیے

یہ جو اپنا ہے حالِ غم حقّی
کس طرح کہیے اور کہاں کہیے

راغب مراد آبادی

نغمے دل کش ہیں تو فقط بلبل کے ہیں
میر کے شعروں جیسے ہلکے پھلکے ہیں

صحنِ چمن میں بوم بسے یا زاغ رہے
جھگڑے پیارے سارے موسمِ گل کے ہیں

جس پر سے ہر رنگ و نسل کے گزریں لوگ
ہم تو قائل دل سے ایسے پل کے ہیں

ذرّے سے خورشید ہزار افضل ہی سہی
جزو میں بھی جو رنگ ہیں وہ سب کل کے ہیں

اکثر دشمن دیتے ہیں جینے کی دعا
منتظر اکثر دوست ہمارے قتل کے ہیں

سامنے آتے ہیں بھی اب شرماتی ہو
بچپن میں کھیلے تو ہم رل جل کے ہیں

شہریوں کا دل گاؤں میں آکر خاک لگے
یہ بے چارے عادی شور و غل کے ہیں

کھیتوں کی قسمت اب شاید جاگ اٹھے
برسے تو کچھ بادل کل شب کھل کے ہیں

دَور نیا ہے، طَور نئے، فیشن بھی نئے
زلف کے پھندے اب، نہ وہ بل کاکل کے ہیں

ناداروں کے جاڑے بھی کٹ جاتے ہیں
اہلِ زر محتاج مگر فند غل بے کے ہیں

چشمِ خریدار ان پہ نہ کیوں سو بار پڑے
لالہ و گل نازاں کانٹوں میں پل کے ہیں

جہلم کے گبھرو تو ہیں کچھ ان سے بھی سوا
مانا راغب خوب جواں کابل کے ہیں

راغبؔ مرادآبادی

رات کو روز، تہی دست نہ گھر آئے کوئی
رمقِ نانِ شبینہ جو نظر آئے کوئی

پھر رہا ہوں اِسی اُمید پہ مارا مارا
اس بڑے شہر میں اپنا بھی نظر آئے کوئی

یہ بھی خواہش کہ رہے سلسلۂ رازو نیاز
یہ بھی اندیشہ کہ الزام نہ سر آئے کوئی

سادہ لوحی نے محبت کی، تراشا یہ خیال
راستہ بھول کے اے کاش اِدھر آئے کوئی

نوعِ انساں کی تباہی نہیں دیکھی جاتی
عرش سے فرش پہ اے کاش اُتر آئے کوئی

تابِ نظارہ نہیں ہے مری آنکھوں کو اگر
بوئے گُل بن کے مرے دل ہی میں در آئے کوئی

پا پیادہ نہ پھریں شہر میں یوں اہلِ کمال
شعر گوئی کے علاوہ جو ہُنر آئے کوئی

دُور کر دے جو اندھیرے کو، سوادِ جاں کو
سحر آتی تو ہے ایسی بھی سحر آئے کوئی

اپنا دروازہ سمجھ کر، مَیں جہاں دستک دُوں
اے مرے ہمسفر، ایسا بھی تو گھر آئے کوئی

جس کو سمجھوں میں سراب، آبِ رواں کی ہو دکاج
ایسا منظر بھی تو دورانِ سفر آئے کوئی

اسی اُمید پہ بیزارِ شفا ہوں راغبؔ
پُوچھنے حال مرا بارِ دگر آئے کوئی

راغب مراد آبادی

نغمے دل کش ہیں تو فقط بلبل کے ہیں
میر کے شعروں جیسے ہلکے پھلکے ہیں

صحنِ چمن میں بوم بسے یا زاغ رہے
جھگڑے پیارے سارے موسمِ گل کے ہیں

جس پر سے ہر رنگ و نسل کے گزریں لوگ
ہم تو قائل دل سے ایسے پل کے ہیں

ذرّے سے خورشید ہزار افضل ہی سہی
جزو میں بھی جو رنگ ہیں وہ سب کُل کے ہیں

اکثر دشمن دیتے ہیں جینے کی دعا
منتظر اکثر دوست ہمارے قتل کے ہیں

سامنے آتے ہیں بھی اب شرماتی ہو
بچپن میں کھیلے تو ہم رل جُل کے ہیں

شہریوں کا دل گاؤں میں آ کر خاک لگے
یہ بے چارے عادی شور و غل کے ہیں

کھیتوں کی قسمت اب شاید جاگ اُٹھے
برسے تو کچھ بادل کل شب کھل کے ہیں

دَور نیا ہے، طور نئے، فیشن بھی نئے
زلف کے پھندے اب، نہ وہ بل کاکل کے ہیں

ناداروں کے جاڑے بھی کٹ جاتے ہیں
اہلِ زر محتاج مگر فند غل کے ہیں

چشمِ خریدار اُن پہ نہ کیوں سو بار پڑے
لالہ و گل نازاں کانٹوں میں پل کے ہیں

جہلم کے گھبرو تو ہیں کچھ ان سے بھی سوا
مانا راغب خوب جواں کابل کے ہیں

راغب مراد آبادی

رات کو روز، تہی دست نہ گھر آئے کوئی
رمقِ نانِ شبینہ جو نظر آئے کوئی

پھر رہا ہوں اِسی اُمید پہ مارا مارا
اس بڑے شہر میں اپنا بھی نظر آئے کوئی

یہ بھی خواہش کہ رہے سلسلۂ رازو نیاز
یہ بھی اندیشہ کہ الزام نہ سر آئے کوئی

سادہ لوحی نے محبّت کی، تراشا یہ خیال
راستہ بھول کے اے کاش اِدھر آئے کوئی

نوعِ انساں کی تباہی نہیں دیکھی جاتی
عرش سے فرش پہ اے کاش اُتر آئے کوئی

تابِ نظّارہ نہیں ہے مری آنکھوں کو اگر
بُوئے گُل بن کے مرے دل ہی میں در آئے کوئی

پا پیادہ نہ پھروں شہر میں یوں اہلِ کمال
شعر گوئی کے علاوہ جو ہُنر آئے کوئی

دُور کر دے جو اندھیرے کو سوادِ جاں کو
سحر آتی تو ہے ایسی بھی سحر آئے کوئی

اپنا دروازہ سمجھ کر، مَیں جہاں دستک دُوں
اے مرے ہمسفر، ایسا بھی تو گھر آئے کوئی

جس کو سمجھوں مَیں سراب، آبِ رواں کی ہو موج
ایسا منظر بھی تو دورانِ سفر آئے کوئی

اسی اُمید پہ بیزارِ شفا ہوں راغب
پُوچھنے حال مرا بارِ دگر آئے کوئی

اختر انصاری اکبر آبادی

حیات کیسے گزاری ہے، کیا بتاؤں تمہیں
غزل کہی ہے، کہو تو غزل سناؤں تمہیں

بدل کے فاصلے صدیوں کے چند لمحوں میں
یہ چاہتا ہوں نظر کے قریب لاؤں تمہیں

مرے جنوں مری تنہائیوں پہ ہنس دینا
اگر کبھی کسی محفل میں یاد آؤں تمہیں

خیال و خواب میں کھویا ہوا ہوں برسوں سے
خیال و خواب کی دنیا میں کیا بلاؤں تمہیں

مجھے بھی نیند سی آنے لگی ہے آخرِ شب
یہی ہے وقت رفیقو کہ اب جگاؤں تمہیں

یہ سانحہ بھی مری زندگی میں ہونا تھا
جھپک کے آنکھ جو کھولوں تو پھر نہ پاؤں تمہیں

وہ دل میں ہیں جو مرے دوستوں کی باتیں ہیں
تمہی بتاؤ یہ اختر کہ کیا بتاؤں تمہیں

اختر انصاری اکبر آبادی

اہل نظر تھے وہ جنہیں خود سر کہا گیا
کیا وعظ تھا جو بر سر منبر کہا گیا

دراصل ان کے طنز کا اک شعبدہ سا تھا
جس زخم کو کرشمۂ نشتر کہا گیا

اک نو بہار ناز کا جب تذکرہ چلا
ظالم کو آشتی کا پیمبر کہا گیا

نا آشنائے بحر تھے ڈوبے جو بحر میں
ساحل پہ جو تھے ان کو شناور کہا گیا

لب ہل سکے نہ مصلحت وقت سے مرے
جو راز آ گیا تھا زباں پر کہا گیا

جو دور سے گزر گیا جگنو کا ہما کا تھا
جو سر تک آ گیا اسے پتھر کہا گیا

تم ماہتاب حسن ہو، تم کیوں خفا ہوئے
مجھ کو جو بزم شعر میں اختر کہا گیا

اختر انصاری اکبرآبادی

کوششِ پیہم کو سعیٔ رائیگاں کہتے رہو — ہم چلے اب تم ہماری داستاں کہتے رہو
گفتنی باتیں سہی، ناگفتنی باتیں سہی — چپ نہ بیٹھو، کوئی افسانہ یہاں کہتے رہو
مصلحت کیا، بات جو حق ہے وہ کہہ دو برملا — لاکھ ہوں احباب تم سے بدگماں کہتے رہو
ہم کہ تھے آزاد، آزادی کی خاطر مر گئے — جینے والو تم قفس کو آشیاں کہتے رہو
صرف کہنے سے زمیں کیا آسماں ہو جائے گی — کچھ نہیں ہوگا زمیں کو آسماں کہتے رہو
راہ کیا، منزل ہے کیسی، ہر حقیقت ہے فریب — کارواں کو بھی غبارِ کارواں کہتے رہو

کیوں کرو اختر کی باتیں وہ تو اک دیوانہ ہے
تم تو یارو اپنی اپنی داستاں کہتے رہو

کلیم عثمانی

فرقت کی کڑی دھوپ میں جلتی رہیں آنکھیں — یادوں کا تیری زہر اُگلتی رہیں آنکھیں
دھندلا گئے رنگوں کی طرح یادوں کے منظر — لمحوں کی طرح روپ بدلتی رہیں آنکھیں
دل خلوتیٔ غم تھا کسی طور نہ بہلا — چہروں کے کھلونوں سے بہلتی رہیں آنکھیں
کیا شخص تھا کیا اس کے خد و خال بتائیں — کلیاں بھی اسے دیکھ کے ملتی رہیں آنکھیں

ہم عہدِ وفا اپنا نبھاتے رہے ہر طور
یاروں کی بہر طور بدلتی رہیں آنکھیں

○

رفعت ظفر

جب بھی گھر سے باہر جھانکا، بارش، دھند اور کہرا
خشک شجراں کے پتے سا دل، سب دن دیکھ کے ترسا

یادوں میں وہ حبس مچا ہے، جیسے گرد زدہ ہوں
بہتی آنکھیں سپنے مانگیں، کچھ ٹھنڈک کچھ سبزا

اِک حسیں کی پھولوں سی آنکھیں، پھولوں سے لب پھولوں سے ہاتھ
سینے میں مٹی کی مانند دل گھٹتا — پھر مچلا

رات گئے کی بارش، خوشبو، خنکی، نرم ہوا
رُت کا جوبن دیکھ کے کوئی ہو بے سُدھ سے گزرا

گہری آنکھوں سے لپٹی خواہش کی وحشی بجلی
سینے میں اُتر آئی تو جھپٹ سارا جل گندا

○

تاج سعید

سُناتی ہے مجھے پیاری کہانی   یہ سکھ دریا کے موجوں کی روانی
کبھی دیکھا ہے تم نے یہ کھنڈر بھی   کبھی تم نے سُنی اس کی کہانی
شجر جو آج بوڑھا دِکھ رہا ہے   تجھے بھولی نہیں اس کی جوانی
یہ جنگل جو سدا لگتا ہے تم کو   یہ ہے سب موسموں کی مہربانی
نگارِ صبح کا منظر سہانا!   دلوں کو بخشتا ہے شادمانی
نگارِ شام کی یادِ اداسی   سناتی ہے مری یادیں پرانی
زمیں سے آسماں تک جائے دیکھی
خلاؤں کی وسعتوں کی بیکرانی

○

نذیر ناجی

مٹی میں نہ سارا خون ملا، اوپر بھی بُوند اچھال کوئی
ان بنتے بگڑتے نقشوں میں تو اپنی لکیر بھی ڈال کوئی

نشّے کے لیے مے اور بھی ہے، معشوق برائے عشق بہت
ہر کیف ہو جسم سے آگے تک، تو ایسی راہ نکال کوئی

کیا چاکِ گریباں ناپوگے، تم دہر کشا دیوانوں کا!
سب اس کی درازی میں سمٹے، موسم ہو کوئی یا سال کوئی

ذرّوں کی طرح آوارہ یہ گھر، صحرا میں بھٹکتی ہے صرصر
لگتا ہے کہ نغمہ بننے کو، سُر ڈھونڈ رہے ہیں تال کوئی

حیران ہوں کہ میری بستی میں، کیا پایا سحر نے گہوارہ
بیزار کوئی بے خوابی سے اور خوابوں میں ہے نڈھال کوئی

ڈرتے ہو عمل سے ڈرتے رہو، باتیں ہی کرو سچائی کی
تعمیل تو ہو ہی جاتی ہے، نکلے جو سفر پہ خیال کوئی

پل بھر کے لیے اتنا سوچو، اس وقت کروگے کیا ناجی
چپکے سے اٹھا کے چل دے اگر، یہ خالی پن کا جال کوئی

نذیر ناجی

اُڑتے رہو فضا میں چھتوں پر نہ بیٹھنا
خوشیوں کو ٹھونگ لینا دکھوں پر نہ بیٹھنا

چڑیا تجھے عزیز سہی اے مری تھکن
جب یہ نہا رہی ہو پروں پر نہ بیٹھنا

اپنی تنی کماں سی اُڑانوں کو چھوڑ کر
ان کانپتے لرزتے گھروں پر نہ بیٹھنا

اے طائرانِ معنی و الفاظ احتیاط
اُس شہد کے فریبی لبوں پر نہ بیٹھنا

بہتے لہو میں بھی نہ صداقت جہاں ملے
میرے عزیز ایسی آنکھوں پر نہ بیٹھنا

○

نذیر ناجی

یہ آنسو رات میں بو جائیں گے ہم
بہت جاگے ہیں، اب سو جائیں گے ہم

لگے ہیں داغ جو دامن پہ تیرے
وہ اپنے خون سے دھو جائیں گے ہم

کہیں سایہ نہ پاؤ گے ہمارا
کسی دن روشنی ہو جائیں گے ہم

ڈھلے پاؤ گے منہ پھولوں کے ہر صبح
کچھ اس انداز سے رو جائیں گے ہم

ہمیں پانا ہے تو دل صاف رکھنا
غبار آیا تو پھر کھو جائیں گے ہم

اندھیرے کی رفاقت ہو چکی بس
اُٹھو شمعیں جلا دو، جائیں گے ہم

○

نذیر ناجی

بتوں کے فیض سے تقدیر جگمگا نہ سکی
کہ بارِ سجدہ مری بندگی اُٹھا نہ سکی

دکھا گئی ہمیں نفرت وہ خد و خال ترے
کبھی نگاہِ محبت جنہیں دکھا نہ سکی

حیات لغزشِ قوسین میں لرزتی رہی
خطِ سفر سے کوئی دائرہ بنا نہ سکی

بہت فضول رہا شغلِ خانہ بندی بھی
کہ شکل کوئی بھی ذوقِ طلب کو بھا نہ سکی

عجیب سوجھی بگولوں سے گھر بنا بیٹھے
پھر ایسے سوئے، خموشی بھی نیند اُڑا نہ سکی

یہ انتہا ہے کہ ہم کارِ گریہ سے بھی گئے
جو وقت آیا تو آنکھ اشک تک بہا نہ سکی

○

شبنم رومانی

چُپ ہوں خود اپنے باب میں جیسے
آگ بری ہو خواب میں جیسے

سب سخن اُس لبِ سخن کے اسیر
سارے موسم گلاب میں جیسے

آئینہ آنسوؤں سے بھیگ گیا
عکس ہو ڈوبے آب میں جیسے

زندگی کا سفر — عجیب سفر
کوئی چلتا ہو خواب میں جیسے

وہ نظر — وہ نظر ہے کتنی بلیغ!
سادہ کاغذ جواب میں جیسے!

خواہشوں کے تراشتا ہوں بدن
رُوحِ آزر سماب میں جیسے

ربط کرتا ہوں زندگی میں تلاش
غلطی ہو کتاب میں جیسے

شبنم رومانی

سبز شجر سے توڑ کے رشتہ، اب پچھتاتے ہیں
پتّے پاؤں کے نیچے آکر، شور مچاتے ہیں

جتنے رستے ہیں انجانے دیس کو جاتے ہیں
جانے والو! پیچھے پیچھے ہم بھی آتے ہیں

کچھ میرے تیرے دُکھ ہیں، کچھ دُکھ ہیں موسم کے
اولے، پتھر برسا کر، آنسو بن جاتے ہیں

اپنی اپنی مجبوری ہے، جو جس کا ہو جائے
سچ پوچھو تو جھوٹے سارے رشتے ناتے ہیں

لاکھ جتن پر بھی نہیں ہوتے سُونے گھر آباد
بسنے والے چُپکے سے دل میں بس جاتے ہیں

ہم نے کھنگالے سات سمندر، چھانے سات افلاک
پھر بھی ایک جزیرے کے قیدی کہلاتے ہیں

یہ دو چار گھڑی کا ملنا، یار، غنیمت ہے
تم بھی حال سناؤ، ہم بھی شعر سناتے ہیں

عالمتاب تشنہ

میں تجھ بن بھی اگر کچھ ہوں تو کیا ہوں
بچھڑ کر تجھ سے اکثر سوچتا ہوں

اسی ساحل پہ ڈوبوں گا جہاں سے
سمندر کا تماشا کر رہا ہوں

گذرنا ہے جسے صحرا سے ہو کر
میں اس دریا کے دکھ سے آشنا ہوں

نگارِ آئینہ میں غور سے سن
شکستِ شیشۂ جاں کی صدا ہوں

غنیمت ہے کہ اس شہرِ ہوا میں
چراغِ رہ گذر ہوں جل رہا ہوں

ہے کارِ عشق بھی کارِ انا بھی !
میں اپنی راہ کا پتھر بنا ہوں

کہاں تک ایک ہی موسم میں رہنا
میں اب تجھ سے بچھڑنا چاہتا ہوں

چراغِ شہرِ ابر و باد ہوں میں
سرِ دیوارِ جاں رکھا ہوا ہوں

دریچے کھول دے زندانِ جاں کے
میں شہرِ عشق کی تازہ ہوا ہوں

گری ہے جب سے میرے گھر کی دیوار
میں سائے کو ترستا پھر رہا ہوں

مجھے برباد کر کے جانے والے
تجھے اب تک دعائیں دے رہا ہوں

غنودہ ساعتوں کی شب ہے تشنہ
طوافِ عارض و لب کر رہا ہوں

عالمتاب تشنہ

گنتی میں بے شمار تھے کم کر دیئے گئے
ہم ساتھ کے قبیلوں میں ضم کر دیئے گئے

پہلے خضابِ عدل ہوا ہم سے انتساب
پھر یوں ہوا کہ قتل بھی ہم کر دیئے گئے

پہلے لہولہان کیا ہم کو شہر نے
پھر پیرہن ہمارے علم کر دیئے گئے

کچھ بڑھ گئی تھی تیرگیٔ قدِ ستم
محفل سے کچھ چراغ بھی کم کر دیئے گئے

اس دورِ ناشناس میں ہم سے عرب نژاد
لب کھولنے لگے تو عجم کر دیئے گئے

جب درمیاں میں آئی کمانِ بشر کی بات
ہفت آسمان زیرِ قدم کر دیئے گئے

تشنہ جو لفظ مصلحتاً ہم نہ کہہ سکے
دیوارِ وقت پر وہ رقم کر دیئے گئے

عالمتاب تشنہ

ساری دنیا سے پناہیں مانگتا رہ جائے گا
بے یقیں مت ہو کہ تو بے آسرا رہ جائے گا

دشت کی اس دھوپ میں جل جائے گا تیرا وجود
تیرے قدموں پر ترا سایہ پڑا رہ جائے گا

کارواں تو خیر کیا دیکھے گا مڑ کر تیری سمت
تو غبارِ کارواں کو دیکھتا رہ جائے گا

اِک ہجومِ عکس ہوگا آئینہ در آئینہ
اپنے چہرے کو بھی تو پہچانتا رہ جائے گا

سرخیٔ خونِ شہیداں کا مجھے طعنہ نہ دے
کیا ترے ہاتھوں پہ یہ رنگِ حنا رہ جائے گا

نوکِ مژگاں تارِ جاں پر لاکھ مضرابی کرے
پھر بھی سازِ عشق بے صوت و صدا رہ جائے گا

دھجیاں ہو کر بکھر جائے گا ملبوسِ بہار
دامنِ گُل کے لیے دستِ صبا رہ جائے گا

کارِ تخریبِ جہاں یونہی رہا تو ایک دن
اس زمین و آسماں میں بس خدا رہ جائے گا

بھول جائیں گے یہ ساری انجمن آرائیاں
یاد بس اپنے ہی گھر کا راستہ رہ جائے گا

میں تو خوشبو کا ہیولا ہوں سرِ دوشِ ہوا
تو مجھے محسوس ہی کرتا ہوا رہ جائے گا

تشنہ اب وہ تیری آوارہ شبی کے دن گئے
جانے کس کس گھر کا دروازہ کھُلا رہ جائے گا

عالمتاب تشنہ

گھر کی لڑائی گلی میں لڑنا اچھی بات نہیں
دیکھو دیواروں پہ لکھنا اچھی بات نہیں

یہ تو پت جھڑ کے موسم کی ایک علامت ہے
پیڑوں سے پتّوں کا گرنا اچھی بات نہیں

کوئی تو رستہ طے ہو جائے کوئی تو منزل ٹھہرے
سدا ہوا کے رُخ پر چلنا اچھی بات نہیں

جنگ میں ہوگا لاکھ یہ جائز لیکن عشق میں تو
آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنا اچھی بات نہیں

عشق میں آنسو پی لینا بھی ایک روایت ہے
حالِ غمِ دل سب سے کہنا اچھی بات نہیں

یہاں تو لوگ دِلوں کے دیپ بجھا کر رہتے ہیں
روشنیوں کے شہر میں بسنا اچھی بات نہیں

تشنہ عشق میں تم پر سو الزام بھی آئیں گے
عشق میں رُسوائی سے ڈرنا اچھی بات نہیں

عالمتاب تشنہ

پہلے دل اختیار میں رکھنا
پھر قدم کوئے یار میں رکھنا

چل رہی ہے ہوائے شب آثار
روشنی کو حصار میں رکھنا

لوگ کیوں تیرگی میں ہوں مصلوب
اک دیا طاقِ دار میں رکھنا

عشق مشرب ہیں ہم ہمارا نام
فہرسِ اعتبار میں رکھنا

ہم کہ صحرا گزیدہ ہیں ہم کو
شجرِ سایہ دار میں رکھنا

پہلے دل کو چراغ کر لینا
پاؤں جب رہگذار میں رکھنا

عکسِ جاں کو سمیٹ کر تشنہ
دستِ آئینہ دار میں رکھنا

انور شعورؔ

کچھ اور دیر نہ لگ جائے اب سویرے میں
میں جل رہا ہوں دیے کی طرح اندھیرے میں

تجھے مرا تو مجھے تیرا دھیان رہتا ہے
یہی تو فرق ہے تیرے میں اور میرے میں

اندھیری رات ہے، تنہا ہوں، دل کا ڈر دل ہے
نہ جانے کیوں نہیں ہمت کسی لٹیرے میں

ہزار قافلے بے چھت پڑے رہے لیکن
رُکا نہ کوئی مسافر ہمارے ڈیرے میں

ہم اُس سے دُور ہیں کوسوں مگر قسم لے لو
جو ایک پل بھی لگاتے ہوں ایک پھیرے میں

حیات ہے وہ مسلسل سفر کہ دن تو کیا
گنوائی رات نہ ہم نے کبھی بسیرے میں

قضا کا تیر بھی آئے تو ٹوٹ جائے شعورؔ
کچھ اِس طرح مجھے اُس نے لیا ہے گھیرے میں

انور شعورؔ

کئی دن سے سناٹا مجھ میں ہے
کوئی مجھ سے شاید خفا مجھ میں ہے

کسی دن اچانک بکھر جاؤں میں
یہ امکان بے انتہا مجھ میں ہے

جُدا مجھ سے رکھتی تھی دنیا اُسے
وہ دنیا سے ہو کر جُدا مجھ میں ہے

اکیلا نہیں ہونے دیتا مجھے
کوئی دوسرا تیسرا مجھ میں ہے

میں ہوں اپنا رفتہ بھی آئندہ بھی
جو ہے مجھ میں ہوگا، جو تھا مجھ میں ہے

کسی اور کو کیا پڑی ہے شعورؔ
بھلا کون میرے سوا مجھ میں ہے

○

انور شعور

سامنا کیا اُس سے میرا ہوگیا
بیچ سپنے میں سویرا ہوگیا

قافلے کا کیا، چمن میں رُک گیا
یا بیاباں میں بسیرا ہوگیا

اتفاقاتِ زمانہ دیکھیے
آج اِدھر بھی اُن کا پھیرا ہوگیا

شام سے ٹھیرا مسافر صبح تک
اور پھر ویران ڈیرا ہوگیا

شہر والو! گاؤں کی کیا بات تھی
رات آئی اور اندھیرا ہوگیا

عشق میں مجنوں کا کیا ہوتا شعور
جو ہوس میں حال تیرا ہوگیا

○

انور شعور

کچھ دنوں قبل ساتھ تھا، نہ رہا
ہاتھ میں اُس کا ہاتھ تھا، نہ رہا

دورِ اقبال میں ہمارا بھی
اِک شریکِ حیات تھا، نہ رہا

صحبتِ صالحین سے پہلے
مَیں بہت واہیات تھا، نہ رہا

اُس سے ملنے کا یا بچھڑنے کا
شغل دن ہو کہ رات تھا، نہ رہا

گر فسادی تھا لشکرِ آدم!
رونقِ کائنات تھا، نہ رہا

ایک دل تھا شعور تو سینہ
محشرستانِ ذات تھا، نہ رہا

○

○

ارشد ملتانی

ہر نظر اک جنت منظر بھی ہے
ہر نفس پیکار خیر و شر بھی ہے

منزلوں کی روشنی ہے ذہن میں
راستوں کی ظلمتوں کا ڈر بھی ہے

آنکھوں میں روشن ہے اک تصویر بھی ہے
سامنے دھندلا سا اک منظر بھی ہے

رقص فرماواہموں کی دھند میں
آگہی کا جلوۂ مضطر بھی ہے

صرف باہر کی کھلی سڑکیں نہ دیکھ!
اک تماشا شہر کے اندر بھی ہے

فکر کی پیچیدگی کے ساتھ ساتھ
سوچ کا اک راستہ بہتر بھی ہے

خیر مانگوں کیوں نہ اپنے شہر کی
شہر کی گلیوں میں میرا گھر بھی ہے

آئینہ سامانیوں کے ساتھ ساتھ
زندگی کے ہاتھ میں پتھر بھی ہیں

سلسلہ ہے اختیار و جبر کا
زندگی دیوار بھی ہے در بھی ہے

○

ارشد ملتانی

عشرتوں کے سراب ہی دیکھو
اب شرابوں کے خواب ہی دیکھو

موجزن زندگی کے قلزم میں
تشنگی کے عذاب ہی دیکھو

یہ حقیقت کی مصلحت کیا ہے؟
خواب دیکھو تو خواب ہی دیکھو

شب کی بے نور خوابگاہوں میں
کوئی روشن کتاب ہی دیکھو

لاکھ پیچیدگی ہے مطلب میں
حسن طرز خطاب ہی دیکھو

خرمنوں کی تباہیوں پہ نہ جاؤ
رقص برق و سحاب ہی دیکھو

چھوڑ گہرائیوں کی دھن ارشد
رونق سطح آب ہی دیکھو

○

اشفاق نقوی

میں شفاعت کا طلبگار کہاں سے لاؤں — اتنا معصوم گنہگار کہاں سے لاؤں
چڑھتے سورج کے پجاری تو بہت ہیں لیکن — اے خدا تیرے پرستار کہاں سے لاؤں
کتنے یوسف میرے سینے میں چھپے بیٹھے ہیں — دوستو مصر کا بازار کہاں سے لاؤں
میں بھی تیری ہی طرح فتح کا دعویٰ کرتا — تیرے تیور تیری تلوار کہاں سے لاؤں
روز کہتے ہیں کہ دل آج تو دے دو ہم کو — روز کہتا ہوں کہ سرکار کہاں سے لاؤں

سارے ماحول پہ جب گرد چڑھی ہو نقوی
میں چمکتے ہوئے اشعار کہاں سے لاؤں

جمیل ملک

پیار کی راہ میں مرنا مشکل — کہنا آساں ہے، کرنا مشکل
دل سمندر ہے جو اُترا، ڈوبا — دوستو، پار اُترنا مشکل
زُلف اُلجھے تو سُلجھ سکتی ہے — بخت بگڑے تو سنورنا مشکل
پیاس بُجھتی نہیں انگاروں سے — قلزمِ خوں سے گزرنا مشکل
آئینہ گھر میں اُتر سکتے ہیں — دل کے شیشے میں اُترنا مشکل
کاسۂ جاں تھا ازل سے خالی — اب ابد تک اسے بھرنا مشکل
اپنی ہی ذات گواہی دے گی — سامنے اپنے مُکرنا مشکل
قافلہ دل کا رُکے تو ٹھہریں — ورنہ رستے میں ٹھہرنا مشکل

پہلے ہم چیخ تو سکتے تھے جمیل
اب تو فریاد بھی کرنا مشکل

جمیل ملک

ہر طرف خون کے دریا نکلے — بستیاں چھوڑ کے ہم کیا نکلے
حبس اتنا ہے کہ دم گھٹتا ہے — کنجِ لب سے کوئی جھونکا نکلے
رات کی کوکھ سے کچھ بھی نہ مِلا — تیری زُلفوں سے سویرا نکلے
میرے پیکر سے سرِ شامِ وصال — ہو بہو تیرا سراپا نکلے
شہر آباد کریں چاہت کا — جس جگہ کوئی خرابہ نکلے
ساری دنیا نے تماشا دیکھا — ہم ہی محرومِ تماشا نکلے
ڈھونڈھ کر لاؤ اُسے تو شاید — سر سے اُس شخص کا سودا نکلے
اُس کو اندر سے ٹٹولو تو سہی — کیا خبر وہ بھی اکیلا نکلے

یوں تو معصوم ہے ظاہر میں جمیل
جانے اندر سے وہ کیسا نکلے

○

جمیل ملک

شمع جل جائے گی جلتے جلتے — رات ڈھل جائے گی ڈھلتے ڈھلتے
پھیل جائے گی سمندر بن کر — موج دریاؤں میں پلتے پلتے
بڑھ کے یہ کس نے قدم چوم لیے — ہم کہاں آ گئے چلتے چلتے!
کر گئے سارے جہاں کو روشن — اپنی ہی آگ میں جلتے جلتے
جل اُٹھا ہے ابدیت کا چراغ — آج فریاد میں ڈھلتے ڈھلتے
زندگی سے ہوں اگر وابستہ — موت مل جاتی ہے ٹلتے ٹلتے
سہہ گئے وار بھی قاتل کا جمیل
رہ گئے ہاتھ وہ ملتے ملتے

○

جمیل ملک

سحر میں رنگِ شفق گھلا ہے — دریچۂ زندگی کھلا ہے
مَیں جذب ہو جاؤں چار سُو میں — تمام منظر دھلا دھلا ہے
مَیں مَس کروں جب تو شہد ٹپکے — فضاؤں میں کس کا رس گھلا گھلا ہے
زمیں ہوئی تنگ طائروں پر — فلک کا نیلم کھلا کھلا ہے
ہے زندگی اُس کی دسترس میں — جو نوکِ شمشیر پر تُلا ہے
محیط ہے کائنات، جس میں — یہ آسمان ایک بلبلا ہے
حسین پھولوں میں پلنے والا
جمیل کانٹوں میں بھی تُلا ہے

○

○

انور مسعود

جس طرح کی ہیں یہ دیواریں یہ در جیسا بھی ہے
سر چھپانے کو میسّر تو ہے گھر جیسا بھی ہے

اُس کو مجھ سے مجھ کو اُس سے نسبتیں ہیں بے شمار
میری چاہت کا ہے محور یہ نگر جیسا بھی ہے

چل پڑا ہوں شوقِ بے پروا کو مُرشد مان کر
راستہ پُر پیچ ہے یا پُر خطر جیسا بھی ہے

سب گوارا ہے تھکن، ساری دُکھن، ساری چبھن
ایک خوشبو کے لیے ہے یہ سفر جیسا بھی ہے

وہ تو ہے مخصوص اِک تیری محبت کے لیے
تیرا انور باہُنر یا بے ہُنر جیسا بھی ہے

○

ناصر زیدی

○

اِس توقع پہ کھُلا رکھا گریباں اپنا
جانے کب آن ملے جانِ بہاراں اپنا
لمحے لمحے کی رفاقت تھی کبھی وجہِ نشاط
موسمِ ہجر ہُوا، اب سروساماں اپنا
نت نئے خواب دکھاتا ہے اُجالوں کے لیے
وہ کہ ہے دشمنِ جاں، دشمنِ ایماں اپنا
نکہتِ گُل ہی نہیں خاک بھی ہے ہم کو عزیز
اپنا صحرا ہے چمن اپنا، خیاباں اپنا
دیکھ لیتی ہے جہاں عزم و یقیں کے پیکر
رُخ بدلتی ہے وہاں گردشِ دوراں اپنا
یہ تو مانا کہ ہوئی عشق میں رُسوائی بہت
ہو گیا نام غزل میں تو نمایاں اپنا،
اُس سے بچھڑے ہیں تو محسوس ہُوا ہے ناصر
حال اِتنا تو نہ تھا پہلے پریشاں اپنا

○

کرامت گردیزی

وہ نقشِ خرام مٹے دیر ہوگئی
دل میں صدا کے پھول کھلے دیر ہوگئی

کس عالمِ سکوت میں ڈوبا ہوا ہے دل
ہنگامۂ طلب کو رُکے دیر ہوگئی

معلوم تو ہو میں ہوں وہی یا بدل گیا
آئینہ دو کہ خود سے ملے دیر ہوگئی

پلکوں پہ اب کہاں سے جلاؤں چراغِ گل
آنکھوں سے خونِ دل کو بہے دیر ہوگئی

جسموں کے رنگ رُوپ پہ باقی ہے کچھ بھرم
رُوحوں میں ٹوٹ پھوٹ ہوئے دیر ہوگئی

اُمڈے پڑے ہیں کب سے تمنا کے رت جگے
تنہائیوں کی بزم سجے دیر ہوگئی

کوئی صدا کا سنگ کوئی نشترِ زباں
زخمِ جگر کے چاک سِلے دیر ہوگئی

اب وہ خیال و فکر کی صورت گری کہاں
تخلیق کے چراغ بجھے دیر ہوگئی

آیا نہیں یہاں تو کرامت کہاں گیا
یارو اُسے تو گھر سے چلے دیر ہوگئی

کرامت گردیزی

بستا ہے سراپا مرا گھر بند نہ کرنا
نظروں ہی میں رہنے دو نظر بند نہ کرنا

ممکن ہے کہ حالات کی گردش کبھی لے آئے
زندانِ خیالات کے دَر بند نہ کرنا

دیکھو گے اگر مُڑ کے تو بن جاؤ گے پتھر
ماضی بھی پکارے تو سفر بند نہ کرنا

پابند کبھی رہ نہیں سکتا دُرِ یکتا
پھر سیپ کی مُٹھی میں گُہر بند نہ کرنا

پھیلی ہوئی سطریں کبھی تاریخ بنیں گی
یہ سلسلۂ عرضِ ہنر بند نہ کرنا

بن جائیں گھٹن سے نہ کہیں خون کی لپٹیں
خوشبو گُلِ احساس کی سر بند نہ کرنا

تخئیل کی تتلی کی ہے پرواز جہاں تک
اُڑنے دو کرامت اسے پر بند نہ کرنا

ناصر زیدی

○

اِس توقع پہ کھُلا رکھا گریباں اپنا
جانے کب آن مِلے جانِ بہاراں اپنا

لمحے لمحے کی رفاقت تھی کبھی وجہِ نشاط
موسمِ ہجر ہُوا، اب سرو ساماں اپنا

نِت نئے خواب دکھاتا ہے اُجالوں کے لیے
وہ کہ ہے دشمنِ جاں، دشمنِ ایماں اپنا

نکہتِ گُل ہی نہیں خاک بھی ہے ہم کو عزیز
اپنا صحرا ہے چمن اپنا، خیاباں اپنا

دیکھ لیتی ہے جہاں عزم و یقیں کے پیکر
رُخ بدلتی ہے وہاں گردشِ دوراں اپنا

یہ تو مانا کہ ہوئی عشق میں رُسوائی بہت
ہوگیا نام غزل میں تو نمایاں اپنا،

اُس سے بچھڑے ہیں تو محسوس ہُوا ہے ناصر
حال اِتنا تو نہ تھا پہلے پریشاں اپنا

○

○

کرامت گردیزی

وہ نغمۂ خرام گئے دیر ہو گئی
دل میں صدا کے پھول کھلے دیر ہو گئی

کس عالمِ سکوت میں ڈوبا ہوا ہے دل
ہنگامۂ طلب کو رُکے دیر ہو گئی

معلوم تو ہو میں ہوں وہی یا بدل گیا
آئینہ دو کہ خود سے ملے دیر ہو گئی

پلکوں پہ اب کہاں سے جلاؤں چراغِ گل
آنکھوں سے خونِ دل کو بہے دیر ہو گئی

جسموں کے رنگ روپ پہ باقی ہے کچھ بھرم
رُوحوں میں ٹوٹ پھوٹ ہوئے دیر ہو گئی

اُجڑے پڑے ہیں کب سے تمنا کے رت جگے
تنہائیوں کی بزم سجے دیر ہو گئی

کوئی صدا کا سنگ کوئی نشترِ زباں
زخمِ جگر کے چاک سِلے دیر ہو گئی

اب وہ خیال و فکر کی صورت گری کہاں
تخلیق کے چراغ بجھے دیر ہو گئی

آیا نہیں یہاں تو کرامت کہاں گیا
یارو اُسے تو گھر سے چلے دیر ہو گئی

○

کرامت گردیزی

بستا ہے سراپا مرا گھر بند نہ کرنا
نظروں ہی میں رہنے دو نظر بند نہ کرنا

ممکن ہے کہ حالات کی گردش کبھی لے آئے
زندانِ خیالات کے دَر بند نہ کرنا

دیکھو گے اگر مڑ کے تو بن جاؤ گے پتھر
ماضی بھی پکارے تو سفر بند نہ کرنا

پابند کبھی رہ نہیں سکتا دُرِ یکتا
پھر سیپ کی مٹھی میں گہر بند نہ کرنا

پھیلی ہوئی سطریں کبھی تاریخ بنیں گی
یہ سلسلۂ عرضِ ہنر بند نہ کرنا

بن جائیں گلستاں سے نہ کہیں خون کی لپٹیں
خوشبوئے گلِ احساس کی سر بند نہ کرنا

تخییل کی تتلی کی ہے پرواز جہاں تک
اُڑنے دو کرامت اسے پر بند نہ کرنا

افتخار بخاری

کیوں آب، خاک، آگ، ہوائیں سفر میں ہیں — کس کھوج میں یہ چار بلائیں سفر میں ہیں
میں چار سمت پھیل گیا ہوں مجھے نہ ڈھونڈ — اب میں نہیں ہوں میری صدائیں سفر میں ہیں
ہونا ترا ہے جس پہ موقوف کیا کریں! — اے کاغذوں کے شہر ہوائیں سفر میں ہیں
منکر اسے کس سے تو نہیں کہ ہے آسماں سراب — مانگی تھیں ہم نے جو وہ دعائیں سفر میں ہیں
پڑتی ہے اب پھوار کہ گرتی ہیں بجلیاں — پھر میرے گھر کے گرد گھٹائیں سفر میں ہیں

حمید رگردینی

دھنک کا رنگ ہے اپنی کلائیوں کی طرح — دعائیں نکلی ہیں منہ سے دہائیوں کی طرح
مجھے شمار کیا بھی تو حرف لا لکھ کر — میں منفرد رہا پھر بھی اکائیوں کی طرح
ہر اک نے منفی عمل ڈھونڈنے کی کوشش کی — مجھے اچھالا گیا ہے برائیوں کی طرح
حسد سے جھوٹ کے چھوڑے ہیں بھیڑیے مجھ پر — مرے عزیزوں نے یوسف کے بھائیوں کی طرح
ستم ہوا ہے بھرے دن میں دھوپ کے ہاتھوں — لپیٹ لی گئی چھاؤں چٹائیوں کی طرح

خبید رگردینے

احسن التقویم کا اعلان فرمایا گیا — آدمی کو سانس کی سولی پہ لٹکایا گیا
بند دروازوں کے پیچھے جاگ اٹھی تھی روشنی — دستکوں میں جب مرا انداز دہرایا گیا
پیڑ تنہا رہ گئے سایوں سے سائے مل گئے — مجھ کو تیری دوستی میں یوں بھی ترسایا گیا
بند مٹھی سے مری تقدیر کے جگنو اڑے — غم کی تاریکی میں یہ منظر بھی دکھلایا گیا
فکر کے اندھے کنویں میں آگہی کے ہاتھ سے — میری اپنی ذات کا پتھر بھی برسایا گیا
اب تو سو جاؤ کہ اک پاگل پھرے ہے شہر — کتنے معصوموں کو یہ کہہ کہہ کے دہلایا گیا

طفیل داراؔ

صبا کا حق ہے کہ آغوشِ گلستاں میں رہے
مری نظر ترے رُخسار کی اماں میں رہے

رہا ہوں دشت میں جن کی تلاش میں اک عمر
تمام عمر وہ آ کر مرے مکاں میں رہے

گلی کے زخم نگاہوں سے چھپ نہیں سکتے
ہزار بار نظر چشمِ مہرباں میں رہے

کسی کے ریشمی گیسو مرا مزاج بنیں
کسی کے ہاتھ کی نرمی مرے بیاں میں رہے

ہر ایک شخص پہ سجدے کا راز کھل جائے
اگر خدا کی بلندی، تری اذاں میں رہے

اگر یہ بوئے چمن سنگِ میل ہے کوئی
تو میری سیر بھی کیوں حدِ باغباں میں رہے

اُبھر کے سامنے آیا تو چاند کہلایا!
وہ چاند ہو نہیں سکتا جو کہکشاں میں رہے

جنونِ قُرب کی لذّت عجیب لذّت ہے
ترے یقین سے نکلے ترے گماں میں رہے

مرا سفینہ کنارے پہ جا لگے داراؔ
جو دو گھڑی بھی ہوا کوئی بادباں میں رہے

طفیل داراؔ

ساقی عہد کے سب ٹوٹ گئے پیمانے
ہم یہاں آئے نہیں کرچوں کی چُبھن اپنانے

مدّتیں بیت گئیں شاخ سے ٹوٹے مجھ کو
میری خوشبو کے سوا کون مجھے پہچانے

مجھ کو ہر گام جلاتے ہیں ہزاروں سورج
گھومتا پھرتا ہوں حالات کی چادر تانے

خشت باری کو گرا اپنی سنہری دیوار
اب کے گزریں گے تری راہ سے کچھ دیوانے

آدمی طلسم ہے، ظالم بھی ہے، مظلوم بھی ہے
آپ کس رُوپ سے مجھ کو ہیں لگے ملوانے

خول چہروں پہ ثقافت کے چڑھے ہیں ہر سُو
آشنا لفظ، مطالب ہیں سبھی بیگانے

جانے کس ہاتھ میں پہنچی ہے ہماری دنیا
دشت آباد ہوئے، شہر بنے ویرانے

ہم وہی رہتے ہیں، رہتی ہے وہی یہ دنیا
اپنے افکار ہی آتے ہیں ہمیں بہکانے

محفلِ دوست میں ٹھکرا یا گیا میرا خلوص
مفلسی! تیرے سبب ٹوٹ گئے یارانے

رام ریاض

تیرگی محفل میں ستارے کوئی جگنو لایا
میں وہ پاگل کہ فقط آنکھ میں آنسو لایا

جب بھی دنیا میں کسی قصر کی بنیاد پڑی
سنگ کچھ میں نے فراہم کیے کچھ تو لایا

تو نے عالم سحر و شام میں تقسیم کیا
اور میں دل میں نہ کبھی فرق سرِ مو لایا

مطلعِ جاں پہ کرن ایسی نمودار ہوئی
جیسے کوئی نرمی آواز کی خوشبو لایا

مجھ کو اک عمر ہوئی خاک میں تحلیل ہوئے
تو کہاں سے میری آنکھیں مرے بازو لایا

ان میں کوئی نہیں لگتا ہے شناسا چہرہ
رام کس آئینہ خانہ میں مجھے تو لایا

○

رام ریاض

بلند پیڑوں کو بھی فرصتِ ذات دینا ہے
خزاں جو آئی تو پھر پات پات دینا ہے

سفر سے پہلے شریکِ سفر سے پوچھ تو لوں
مگر اسے تو زمانے کا ساتھ دینا ہے

میں کل نہ ہوں گا مگر کاتبو! یہ دھیان رہے
کبھی تمہیں بھی حسابِ حیات دینا ہے

کبھی تمہیں بھی ستائے گی یاد پانی کی
تمہیں بھی قبضۂ نہرِ فرات دینا ہے

چراغِ شام ہیں! واماندگانِ منزل کو
ہمارا کام سفر سے نجات دینا ہے

○

رام ریاض

جدا ہوا تھا تو فرقت گوارا بھی کرتا
مرے بغیر کوئی دن گذارا بھی کرتا

بچھڑتے وقت وہ شاید اس انتظار میں تھا
میں اس کا نام بھی لیتا اشارا بھی کرتا

تمہارے بعد تو وہ کربلا کی شام آئی
کوئی نہ تھا کہ امید ستارا بھی کرتا

حدودِ شہر میں میرے لیے یہ مشکل تھا
کہ اس کے پاس بھی رہتا کنارا بھی کرتا

بھلا ہوا کہ مجھے زندگی نہ راس آئی
کہ اس فریب کی خواہش دوبارا بھی کرتا

تعلقات کی تسبیح رام ٹوٹ گئی،
جو اس بہانے کبھی استخارا بھی کرتا

تاجدار عادل

وہ جو اک اپنے گھر کا رستہ ہے
خواہشِ در بدر کا رستہ ہے

اُس کی یادوں کی رہگزر تھی جہاں
اب وہ شہرِ ہنر کا رستہ ہے

ہجر کی رات کہہ رہا تھا کوئی
شب کی منزل سحر کا رستہ ہے

عشق آساں سفر ہے کس کے لیے
یہ مری جان سر کا رستہ ہے

اس سے ملنے کی خواہشوں کے لیے
ایک تنہا سفر کا رستہ ہے

ایک لمحہ کو اُس کی منزل ہے
اور پھر عمر بھر کا رستہ ہے

جو مرے ہجر کی مسافت ہے
وہ تری اِک نظر کا رستہ ہے

عشق کی راہ مت چلو عادل
یہ تو اس کے ہی گھر کا رستہ ہے

تاجدار عادل

ہر ایک چہرے پہ دل کو گمان اُس کا تھا
بسا نہ کوئی یہ خالی مکان اُس کا تھا

مَیں بے جہت ہی رہا اور بے مقام سا وہ
ستارہ میرا سمندر نشان اُس کا تھا

شکستِ شام کے منظر میں اِک ستارہ سا
کہیں بھی چمکا مگر پاسبان اُس کا تھا

تمام دُکھ مری آنکھوں میں بجھ گئے لیکن
جو دھیرے دھیرے جلا تھا نشان اُس کا تھا

مَیں اُس طلسم سے باہر کہاں تلک جاتا
فضا کھلی تھی مگر آسمان اُس کا تھا

ادا شناس فقیروں میں مصلحت کیسی
وہ جو بھی کہتا گیا ہم زبان اُس کا تھا

پھر اُس کے بعد کوئی بات بھی ضروری نہ تھی
مرے خلاف سہی وہ بیان اُس کا تھا

سلیقہ عشق میں جاں اپنی پیش کرنے کا
جنہیں بھی آیا تھا اُن کو دھیان اُس کا تھا

محبتوں کی کہانی میں کون شامل تھا
مجھے تو بارہا خود پر گمان اُس کا تھا

ہوا نے اب کے جلائے چراغ رستے میں
کہ میری راہ میں عادل مکان اُس کا تھا

غافل کرنالی

ہر اک سائے سے ڈرنا اور دل کو بدگماں رکھنا
ہوس کیا چیز ہے پانی پہ بنیادِ مکاں رکھنا

سلگتی شام ہی کربِ تمنا لے کے آتی ہے
سرِ دیوارِ جاں بجھتے چراغوں کا دھواں رکھنا

رُخِ ہستی پہ کوئی قہقہوں کی تہہ نہ جم جائے
ہجومِ سرخوشی میں وقفۂ آہ و فغاں رکھنا

اندھیروں کی مسرت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی
کہ ہر تازہ اُجالے کو سرِ نوکِ سناں رکھنا

کوئی نوحہ نہ لکھنا اشکِ شبنم کے بکھرنے کا
گلوں کی انجمن کو حرفِ خوشبو سے جواں رکھنا

وفا کے نام لیواؤں کی شرطِ اوّلیں یہ ہے
امیرِ شہر کو ہر گام پر نامہرباں رکھنا

بکھرتے ٹوٹتے انساں کا عزم و حوصلہ دیکھو
کہ اپنے دوش پر احساس کا بارِ گراں رکھنا

کوئی جلتا ہُوا لمحہ اگر رستے میں مِل جائے،
تو اس کے سر پہ غافلؔ! آنسوؤں کا سائباں رکھنا

غافل کرنالی

اَلم زادوں سے کوئی واسطہ رکھا نہیں جاتا
کبھی اُجڑے منڈیروں پر دِیا رکھا نہیں جاتا

کسی کم فہم سے عرفانِ جاں کی گفت گو کیسی
ہَوا کے دوش پر سنگِ نوا رکھا نہیں جاتا

وہ انساں سینکڑوں رنگوں کا دلآویز منظر ہے
فقط اِک نام اُس کے حسن کا رکھا نہیں جاتا

مَیں اُس تہذیبِ رعنائی کا نغمہ سنج ہوں جس میں
کنواری لڑکیوں کا سَر کھُلا رکھا نہیں جاتا

محبت اَن کہے جذبوں کی اِک موزوں تکلم ہے
زباں پر خوشبوؤں کا ذائقہ رکھا نہیں جاتا

صداقت کی تمنا میں قضا سے بھاگنا کیسا؟
سوادِ کربلا میں راستہ رکھا نہیں جاتا

وہ کھلتی چاندنی بہتی ہوئی خوشبو ہے جب غافلؔ
تو کیوں آنکھوں میں اُس کا نقشِ پا رکھا نہیں جاتا

ریاض حسین چودھری

مرے چمن سے خزاں کو جدا بھی ہونا ہے　　سیاہ زرد کا اب انخلا بھی ہونا ہے
یہ اضطراب کا موسم ضرور بدلے گا　　تونگروں کو سکوں آشنا بھی ہونا ہے
ہر ایک گھر کی منڈیروں پہ پھول مہکیں گے　　یہ معجزہ تو ابھی رونما بھی ہونا ہے
اتر کے آنا پڑے گا دھنک کو گنبد سے
اغیارِ شب سے سحر کو رہا بھی ہونا ہے
کروں گا دوستی میں آسمان سے بھی لیکن　　ابھی تو قرض زمین کا ادا بھی ہونا ہے
کھڑا ہوں شہرِ ہنر کی فصیل کے باہر　　درِ حروفِ مقفل کو وا بھی ہونا ہے
بجھا رہی ہو سرِ شاخ پھول کی مشعل　　تجھے اے خاک بسرِ ہوا بھی ہونا ہے
میرا اعتقادِ بہاراں ریاض اپنی جگہ
روش روش پہ ابھی تبصرہ بھی ہونا ہے

ریاض حسین چودھری

میرے لہو سے تر ہے آنچل نئی صدی کا　　پرچم لیے کھڑا ہوں پھر بھی میں زندگی کا
اب شام زندگی کی ممکن نہیں سحر ہو
آسیب رقص میں ہے انساں کی خودسری کا
اس شہرِ بے ضیا میں آواز کس کو دو گے　　چہرہ بجھا بجھا ہے ہر ایک آدمی کا
دیوارِ شب تو گھر کے اندر بھی آ گئی ہے
دیکھا تھا خواب میرے بچوں نے روشنی کا
کشکولِ جاں میں مانگوں سانسوں کی بھیک کیسے　　آتا نہیں ہے مجھ کو یہ فن گداگری کا
کاغذ کی ناؤ سطحِ آبِ رواں پہ رکھ کر
دیکھا کرو تماشا موجوں کی سرکشی کا
جب بھی ریاض آ کر دستک سحاب دے گا　　چشمہ ابل پڑے گا ہونٹوں سے تشنگی کا

○

غلام رزمی

نگر میں جھکتی چھتوں کے جتنے ہیں گھر، مرے ہیں
تمام تر بے سکون دیوار و در، مرے ہیں
وہی جو اپنی کمر پہ ڈھوتے ہیں اب بھی پتھر
کسی بھی رستے پہ ہوں، مگر ہمسفر مرے ہیں
مرے قبیلے سے ہیں، جو صیدِ ستم ہیں طائر
ہوا میں اڑتے ہوئے سبھی بال و پر مرے ہیں
چمن کو بخشے مرے ہی زخموں نے پھول لیکن
جہاں بگولوں کا رقص ہے وہ کھنڈر مرے ہیں
میرا لہو تھے، جو نجم بکھرے ہیں ظلمتوں میں
رُلے ہیں جو خاک میں وہ شمس و قمر، مرے ہیں
تھی جو فصیلِ سحر سے ہیں وہ مرے ہیں آنگن
کرن رُتوں میں بجھے بجھے بام و در مرے ہیں
کئی زمانوں سے خیمہ بردوش پھر رہا ہوں
مَیں دشت زادہ ہوں بے نشاں رہگذر مرے ہیں
ہر اک مسافر پہ چھاؤں کرنے کو راستوں پر
کھڑے ہیں جو دھوپ میں برہنہ، شجر مرے ہیں
حوارح سمائوں کے جلتے ہیں جن سے رزمی!
کسی بھی بستی کے ہوں وہ اہلِ ہنر مرے ہیں

○

خادم رزمی

برکھا نہ گلِ تر سے ملاقات ہماری　　تجھ بن ہے کوئی چیت نہ برسات ہماری
کانٹوں پہ کٹے رات تو دن دشتِ سفر میں　　اک عمر سے ہے یوں گزر اوقات ہماری
کل دیکھنا رہ جائے گا وہی اپنی صدا کو　　اب سننا نہیں وہ کوئی بات ہماری
میراث نہیں فتح کی دستار کسی کی　　نت بنت ہے ان کی نہ سدا مات ہماری
سب خاک سے تخلیق ہیں زردار بھی، ہم بھی　　وہ سج کے بیٹھے ہیں نہ تب ذات ہماری
وہ اہلِ خرد، ان کی رسومات جدا ہیں　　ہم اہلِ جنوں اور روایات ہماری
ہم لوٹ کی سجدوں میں، ملاوٹ نہیں کرتے　　واعظ سی سمجھنا نہ عبادات ہماری
ہیں دیس بھی ہم دیس سے نکلے ہوئے جیسے　　خاشاک سی ہے صورتِ حالات ہماری

ہم کون سے موسم کے مسافر ہیں کہ رزمی!
ہے اپنا یہاں دن نہ کوئی رات ہماری

حبان کاشمیری

وہ آج سرِ راہ اس انداز سے ملا　　ڈس ڈس لیا زباں کو گئی رُت کا ذائقہ
کیا شمع کی بساط کہ جل پائے اک ذرا　　پروانوں کا لہو ہے کہ جو رات بھر جلا
سونے کے کانٹے راہ میں آخر بچھا گئے　　یاروں کو کس قدر مری غربت کا پاس تھا
اب تک وہاں اترتے ہیں خوشبو کے قافلے　　بھولے سے لکھ دیا تھا ترا نام جس جگہ
کم انگلیوں کے لمس کی حدت نہ ہو سکی　　گرچہ بدن کا خون بھی تبدیل کر دیا!

یوں وقت نے دبائی صدائے ضمیرِ جاں
انساں رہا جو زندہ تو فنکار مر گیا!

○

شمیم سہگل

تن من اپنا خاک کیا تب نگری ایک بسائی تھی
جاتے سمے جو لوٹ کے دیکھا ایک اک اینٹ پرائی تھی
کس در کی زنجیر ہلاتے کس سے جا کر کرتے فریاد
میرے ساتھ تو ایک خدا تھا، تیرے ساتھ خدائی تھی
میرے گھر کا پتہ نہ پوچھو، میرا ٹھور ٹھکانہ کیا!
میں نادان پرائے گھر پہ جانے کیوں اترائی تھی
من پنچھی تو کالے کوسوں بولے کہیں منڈیروں پر
کسی نے خالی پنجرے ہی سے گھر دیوار سجائی تھی
ایک ہی بندھن پیار کا بندھن، سب بندھنوں کا انت بنے
مورکھ یہی نہ باندھ سکے تم جس میں قید رہائی تھی
کھائیاں کھڈے ٹیلے پتھر سب کچھ دیکھا بھالا تھا
جانے پہچانے رستے تھے جن پر ٹھوکر کھائی تھی
یوں تو آنسو پونچھ چکے اور من اپنا بہلا ہی چکے
سچ پوچھو تو چھپ چھپ روئے برسوں نیند نہ آئی تھی

○

شمیم سہگل

دیکھ رہے ہیں چڑیاں لڑتی بازوں سے
بستی چپکی بیٹھی ہے دروازوں سے

جب بھی مَیں نے ہونٹ سیئے اور چپ سادھی
گونج اُٹھا تب شہر مری آوازوں سے

بے حس راج محل کی ہے زنجیرِ عدل
دستک کا رشتہ ٹوٹا دروازوں سے

جن سے نبھ نہ پائے شانِ سکندر کی
ادنیٰ لوگ بھلے ایسے شہبازوں سے

آئینہ اصلی صورت دکھلا دے گا!
بات بنے گی کیا انشاء پردازوں سے

نصراللہ خان ناصر

سرابِ غم کے سفر سے وہ جب بھی لوٹے گا
تو میری جھوک میں اِک دن ضرور ٹھہرے گا

طلب کا صدق ہے قائم تو آسمانوں سے
تمہارا قرب میرا رزق بن کے اُترے گا

ترس رہی ہے بہاروں کو ہجر کی رُت بھی
کبھی تو ابرِ عنایت ادھر بھی برسے گا

زباں ہے چُپ تو نگاہوں سے لفظ اُتریں گے
ہمارے ضبط کا گوتم بشارتیں دے گا

ہمارے عجزِ محبت پہ آج ہنستا ہے
ہمارے بعد ہمیں یاد کر کے روئے گا

میرا خلوص رُتوں کا سفیر ہے ناصر
ہر ایک گھر میں کھجوروں کی ڈالیاں دے گا

حفیظ الرحمٰن احسن

جو خاص تھیں ترے غم سے، وہ لذتیں نہ رہیں
وہ فاصلے نہ رہے اور وہ قربتیں نہ رہیں
شبِ فراق عجب کیف کا رہا عالم
خیالِ دوست سے کیا کیا رفاقتیں نہ رہیں
جو بات خاص تھی عہدِ وفا سے اب وہ کہاں
کسی کے ناز اٹھانے کی طاقتیں نہ رہیں
گلوں سے رنگ اڑا، موسموں نے منہ موڑا
جمالِ دوست کی رنگیں رفاقتیں نہ رہیں
دلوں کو جبرِ تمدن نے مسخ کر ڈالا
خیال و فکر و نظر کی لطافتیں نہ رہیں
بدل کے رہ گئے کیا خیر و شر کے سب معیار
محبتیں نہ رہیں، اور وہ نفرتیں نہ رہیں
وہ کیا ہوئے مرے یارانِ باصفا احسن
خلوص و مہر کی اگلی حلاوتیں نہ رہیں

حفیظ الرحمٰن احسن

ہر چند کہ آلامِ زمانہ میں گھرا ہوں
صد شکر کہ ہر حال میں راضی برضا ہوں
اک زخمِ وفا دل میں ہرا تھا، سو ہرا ہے
نازاں ہوں کہ منجملۂ اربابِ وفا ہوں
اسلوبِ وفا سیکھا، تری خوئے جفا سے
کیا کچھ ہے ترے غم کی عطا دیکھ رہا ہوں
برسوں کی رفاقت کا ثمر، دردِ جدائی!
گردِ رہِ تسلیم ہوں، صحرا کی صدا ہوں
ہے مرکزِ جاں جس کی تمنا، وہ کہاں ہے
فریاد کہ اے ذوقِ وفا، کس سے جدا ہوں
مارا دلِ خو کردۂ آزار نے احسن!
سختی کشِ تکمیلِ تقاضائے وفا ہوں

احمد شریف

یہ کیسے ہمسفر بنایا ہے / ہر قدم پر فریب کھایا ہے
نشترِ چارہ گر بھی دیکھ لیا / اک نیا زخم دل پہ کھایا ہے
جینے والوں کا حوصلہ دیکھو / موت کو آسرا بنایا ہے
چشمِ بینا اب اُس مقام پہ ہے / جس جگہ روشنی بھی سایا ہے
سنگدل شہر دیکھ تیرے لیے / مَیں نے شیشے کا گھر بنایا ہے
جس تمنا کو پائمال کیا / اُس نے پھر دل میں سر اُٹھایا ہے

بیدل حیدری

کبھی لہریں ترا چہرہ جو بنانے لگ جائیں / میری آنکھیں مجھے دریا میں بہانے لگ جائیں
ہم کبھی شہرِ محبت جو بسانے لگ جائیں / کبھی طوفان کبھی زلزلے آنے لگ جائیں
کبھی اک لمحۂ فرصت جو میسّر آ جائے / میری سوچیں مجھے سُولی پہ چڑھانے لگ جائیں
رات کا رنگ کبھی اور بھی گہرا ہو جائے / کبھی آثار سحر کے نظر آنے لگ جائیں
انتظار اُس کا نہ اتنا بھی زیادہ کرنا / کیا خبر برف پگھلنے میں زمانے لگ جائیں
آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں تجھے دن میں ہم لوگ / شب کو کاغذ پہ ترا چہرہ بنانے لگ جائیں
ہم بھی کیا اہلِ قلم ہیں کہ بیاضِ دل پر / خود ہی اک نام لکھیں خود ہی مٹانے لگ جائیں
عجب انسان ہیں ہم بھی کہ خطوں کو ان کے / خود ہی محفوظ کریں خود ہی جلانے لگ جائیں
وہ ہمیں بھولنا چاہیں تو بھلا دیں پل میں / ہم انہیں بھولنا چاہیں تو زمانے لگ جائیں
اُن مکانوں پہ خدا اپنا کرم فرمائے / جن میں خود ان کے مکیں نقب لگانے لگ جائیں
نہیں جلتا تو اُترتا نہیں قرضِ ظلمت / جلنا چاہوں تو مجھے لوگ بجھانے لگ جائیں

گھر میں بیٹھوں تو اندھیرے مجھے نوچیں بیدل
باہر آؤں تو اُجالے مجھے کھانے لگ جائیں

کاوش بٹ

زندگی کا نہ کر اعتبار آ بھی جا
میرے یار آ بھی جا غمگسار آ بھی جا

خشک سالی کا غلبہ چمن در چمن
اب نہ کر دیر ابرِ بہار آ بھی جا

اک صدی کٹ گئی راستہ دیکھتے
ہو کہاں تک تیرا انتظار آ بھی جا

خلقتِ شہر کے حق کو تسلیم کر
سن شکستہ دلوں کی پکار آ بھی جا

لوگ بیٹھے ہیں اک عمر سے منتظر
آسماں سے اتر غمگسار آ بھی جا

رات کی کوکھ سے دن نکلے گا
پیار کی چاندنی کے سنگار آ بھی جا

پھول مرجھا گئے گھاس کملا گئی
موسمِ گل کے پروردگار آ بھی جا

اس سے پہلے کہ گھبرا کے سر پھوڑ لیں
غم نصیبوں کے صبر و قرار آ بھی جا

رت بدلنے لگی پھول کھلنے لگے
سبزہ و گل کے نقش و نگار آ بھی جا

○

ندی نالے سمندر بن گئے ہیں
جو کنکر تھے وہ گوہر بن گئے ہیں

یہ دور آیا کہ اونچے ظرف والے
ستم یہ ہے ستمگر بن گئے ہیں

وہ چہرے جو کبھی تسکین جاں تھے
شعور آیا تو پتھر بن گئے ہیں

اداسی بے دلی آشفتہ حالی
یہ لفظ اپنا مقدر بن گئے ہیں

سخنور خود بروکر بن گئے ہیں
ہیں خود ناشر بھی ناقد ممتحن بھی

جو بوئے بیج ہم نے نفرتوں کے
وہ پودے اب قد آور بن گئے ہیں

ہوا بستی میں قبروں کا اضافہ
مگر ارشاد یہ کہ گھر بن گئے ہیں

مصائب کے یہ دن کب ختم ہوں گے
کہ لوگ اب غم کا منظر بن گئے ہیں

○

لطیف ساحل

ہوا، گرائے گی کیا اور کب سنبھالے گی
نئی اُڑان، نئے بال و پَر نکالے گی

یہ دل ہی ہے جو اُجڑ کر کبھی نہیں بستا
نظر کا کیا ہے، نئی بستیاں بسا لے گی

میں لفظ بکھر جاؤں گا سمندر میں
اُداس لہر، مرے گیت گنگنا لے گی

مری نگاہ سے چھینے ہیں جس نے سب منظر
وہ ایک روز مری سوچ بھی چرا لے گی

کوئی نہ روک سکے گا پھر آندھیوں کی یورش کو
چٹان خود کو زمیں پر اگر بچھا لے گی

مرا مقام، تہوں میں نہیں ہے اے ساحل
حیات مجھ کو سمندر سے خود نکالے گی

لطیف ساحل

دیوار و در و بام کو ڈر میرا نہیں ہے
ویرانی کا ڈیرہ ہے یہ گھر میرا نہیں ہے

لوگوں کی ضرورت کے سوا کچھ بھی نہیں میں
جو کاٹ رہا ہوں وہ سفر میرا نہیں ہے

پروان چڑھا ہے وہ مرے ساتھ ہی لیکن
پھل توڑ لوں کیسے کہ شجر میرا نہیں ہے

جو اپنی مُروّت کے سبب سب میں ہے مقبول
وہ شخص سبھی کا ہے مگر میرا نہیں ہے

تتلی کے تعاقب میں گُل و برگ مسلنا!
اوروں کا ہے یہ ذوقِ نظر میرا نہیں ہے

ساحل مری آنکھوں میں سمایا ہے کوئی اور
چشمہ ہے مرا، دیدۂ تر میرا نہیں ہے

لطیف ساحل

طلسمِ خواب سے نکلوں تو خواب بن جاؤں
میں اپنی جان پہ خود ہی عذاب بن جاؤں

نمودِ ذات، کچھ ایسا ہے میری قسمت میں
سمندروں سے اُٹھوں تو حُباب بن جاؤں

حیات زخم تو لے آئی ہے مری خاطر
مَیں سوچتا ہوں کہ تازہ گلاب بن جاؤں

اُتر رہا ہوں زمیں پر حروف بن بن کر
کہیں نہ مَیں بھی مقدس کتاب بن جاؤں

تُو جب کبھی بھی جُدا کر کے خود سے لکھے مجھے
تری حیات کا مَیں انتساب بن جاؤں

سیاہ رات میں بکھرا ہوں جگنوؤں کی طرح
کہ چاند نکلے تو اُس کا شباب بن جاؤں

ریحانہ سلیم دیپ

زندگانی کے تیقن کو فنا سمجھے تھے ہم
عافیت کی ہر گھڑی کو پُر قضا سمجھے تھے ہم

خبطِ دردِ عشق پر حاصل ہوا ہم کو عبور
درد کی اس کیفیت کو لا دوا سمجھے تھے ہم

ہم ہوئے واقف رموزِ زندگانی سے ابھی
ورنہ گوہرِ چشمِ غم کو بے بہا سمجھے تھے ہم

کیوں طرب کی بزم میں طوفانِ غم برپا ہوا
اس جہاں میں غم کی خوشیوں کو دعا سمجھے تھے ہم

کاش اپنی سوچ کا دریا ٹھہر جائے کہیں
اپنی ہر اک سوچ کو موجِ بلا سمجھے تھے ہم

امتحاں کیا راس آتا ہم کو فرقت کا بھلا
ہجر کے ہر پل کو بس تیری رضا سمجھے تھے ہم

یہ تخیل کا کمالِ اوج ہے جب ہی تو دیپ
آندھیوں کے زور کو بادِ صبا سمجھے تھے ہم

ریحانہ سلیم دیپ

گلستانِ زیست پہ بادل خزاں کا چھا گیا
درد کے احساس کو کچھ اور بھی بہکا گیا

ہیں مسلط پھر میرے احساس پہ ویرانیاں
کتنا سناٹا میرے قلب و جگر میں آ گیا

دل مرا اپنے غموں سے آج تک نہ چھٹ سکا
پھر بھلا کیوں عرش میرے درد پر تھرا گیا

اپنی سوچوں کا کروں پرچار دنیا میں مگر
یاں تو ہر انسان میری سوچ سے گھبرا گیا

ہیں بہت پر پیچ میری منزلوں کے راستے
کارواں کیا راہنما ہی راہ سے کترا گیا

کیوں تیقن کو بنا کے روگِ جاں بیٹھے رہیں
ہے لقا کس کو یہاں اک بلبلہ سمجھا گیا

یہ اداسی، یہ خموشی بن گئی تقدیر کیوں
دیکھ کر دنیا نے غم پھر دیپ بھی گہنا گیا

رب نواز مائل

کسی کے حسن کا اِک ذکر سا سُنا کرتے   جو اور عمر بھی ملتی یہی دعا کرتے
پھر اُس کے بعد یہی چاہتے گئے ہم لوگ   زمانے بنتے بگڑتے رہے، اُنہیں ملا کرتے
عجیب رنگِ تسلسل سے زیست ٹھہری ہے   یہ دردِ خوش کو نہ کیوں اور لا دوا کرتے
ہمارے خواب سدا، لمحۂ ثمرِ عنواں   ہمارے خواب مگر اب نہ یوں ہُوا کرتے
فسانۂ انت میں کیا اور سا کہے مائل
ملی ہے زیست تو کچھ اُس کا حق ادا کرتے

رب نواز مائل

قید ہوں ایسے ایک لمحے میں   اب کے دُکھ ہی ملیں گے رستے میں
سوچ کر یہ سدا پلٹ آئے   کھیل جھُوٹے سے ہیں تماشے میں
شب نہ احوال یہ، بتائے کچھ   صبح خوش کیا ہے اپنے ناتے میں
ساری سوچیں ہوئی ہیں اپنی صرف   اُس کے چہرے سے کچھ، بنانے میں
ہر طرف زندگی کی باتیں ہیں!   حُسن کیا کم ہے یہ خرابے میں
عشق کیا ہے گیا کہ اب مائل
لفظ پھیکے لگیں فسانے میں

ڈاکٹر ظفر علی راجا

دامن سے اُلجھنے کے بہانے نہ رہیں گے   آنکھوں میں جو ساون کے خزانے نہ رہیں گے
یوں تو تری نظروں کی یہی آب رہے گی   کچھ لوگ مگر تیرے نشانے نہ رہیں گے
جنگل سے یہ آتی ہیں پرندوں کی صدائیں   بستی میں وفاؤں کے گھرانے نہ رہیں گے
آؤ ملو ہم سے۔ ہمیں دیکھو۔ ہمیں سُن لو   کچھ روز میں ہم لوگ پرانے نہ رہیں گے
راجا میں مسلسل تجھے اس خوف سے دیکھوں
جھپکی جو پلک تو یہ زمانے نہ رہیں گے

منیر فاطمی

دلوں کا کرب سمندر، چناب مانگے گا
خود اپنی ذات سے باہر سراب مانگے گا

رُتوں کو ڈھونڈنے نکلے گا خامشی لے کر
اُداس دھرتی سے تازہ گلاب مانگے گا

ورق ورق پہ لہو رنگ داستانیں ہیں
وہ شخص روشنی جیسی کتاب مانگے گا

خیالِ یار ہے طاری ابھی جگا نہ اُسے
حقیقتوں کو سمجھتا ہے خواب مانگے گا

دُکھوں کی اپنی کہانی ہے لازوال منیر
خوشی نہ بانٹ زمانہ حساب مانگے گا

منیر فاطمی

فصلِ غم کٹتی رہی تیغِ ستم کے ہاتھوں
دردِ دل بڑھتا رہا چشمِ کرم کے ہاتھوں

ہم نے احساس کی دولت میں خسارہ پایا
دُکھ اُٹھائے ہیں بہت اہلِ قلم کے ہاتھوں

عمر کی قید میں ہیں اپنے قبیلے کے جواں
بے بسی، پیرِ مغاں، اپنے جنم کے ہاتھوں

صبح کے شوق میں کاٹی ہیں بلا کی راتیں
کس قدر دھوکے ملے شامِ الم کے ہاتھوں

جس کو ایجاد کیا اس سے ہی ہیں خوف زدہ
منفعل اہلِ ہوس اپنے ہی سم کے ہاتھوں

شبنم شکیل

○

اب اپنے تحفظ سے وہ رغبت بھی نہیں ہے
اور بھول کے اُس کو، کوئی عزت بھی نہیں ہے

کس مُنہ سے گلہ ایسی نگاہوں سے کہ جن میں
پہچان کی موہوم علامت بھی نہیں ہے

کچھ تم سے شکایت ہے تو کچھ خود سے، کہ مجھ کو
ہر حال میں خوش رہنے کی عادت بھی نہیں ہے

اب دفن رہوں گی یونہی ریشم کے کفن میں
جب اُس کے سوا دوسری صورت بھی نہیں ہے

اب اُن کو بھی میں شعر سنانے پہ ہوں مجبور
جن کو کسی فن سے کوئی نسبت بھی نہیں ہے

میں بھول تو جاؤں کہ یہی حکم ہے اُن کا
اس کام میں لیکن کوئی عجلت بھی نہیں ہے

جاں بیچ کے بھی حرفِ وفا کی ہوں خریدار
پر اب تو یہاں جان کی قیمت بھی نہیں ہے

شاعر ہوں مگر ایسے قبیلے میں ہوں شبنم
شاعر کی جسے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے

شبنم شکیل

○

تدبیر تو اپنی سی ہر ایک میں کر گزری
اب مجھ سے یہ مت پوچھو، کیوں خاک بسر گزری

کیوں اتنی پریشاں ہوں جب وقت نہیں تھمتا
یہ شام بھی گزرے گی، جیسے کہ سحر گزری

دُھندلایا ہُوا چہرہ پہچان نہ پائی میں
آئینے میں اپنے پر جب میری نظر گزری

اس شہر کی گلیوں سے کیا میرا تعلق تھا
کیا سوچ کے میں ان سے سو بار مگر گزری

سُورج کے تجسس میں کس شب کے مسافر ہو
کیا تم پہ اندھیروں میں، اے اہلِ نظر گزری

کیوں نام مرا شبنم رکھا تھا عزیزوں نے
کیوں گریۂ پیہم سے یہ زندگی تر گزری

شبنم شکیل

○

سوکھے ہونٹ، سلگتی آنکھیں، سرسوں جیسا رنگ
برسوں بعد وہ دیکھ کے مجھ کو رہ جائے گا دنگ

ماضی کا وہ لمحہ مجھ کو آج بھی خون رلائے
اکھڑی اکھڑی باتیں اس کی طعنوں جیسے ڈھنگ

تارہ بن کے دور افق پر کانپے لرزے ڈولے
کچی ڈور سے اڑنے والی دیکھو ایک پتنگ

دل کو تو پہلے ہی درد کی دیمک چاٹ گئی تھی
روح کو بھی اب کھاتا جائے تنہائی کا زنگ

انہی کے صدقے یا رب میری مشکل کر آسان
میرے جیسے اور بھی ہیں جو دل کے ہاتھوں تنگ

سب کچھ دے کر ہنس دی اور پھر کہنے لگی تقدیر
کبھی نہ ہو گی پوری تیرے دل کی ایک امنگ

کیوں نہ اب اپنی چوڑیوں کو کرچی کرچی کر ڈالوں
دیکھی آج اک سندر ناری، پیارے پی کے سنگ

شبنم کوئی جو تجھ سے ہارے، جیت پہ مان نہ کرنا
جیت وہ ہو گی جب جیتو گی اپنے آپ سے جنگ

شبنم شکیل

○

مصلحت کے کسی سانچے میں نہ ڈھالا اب تک
دل کا انداز رکھا سب سے نرالا اب تک

یہ تو خوابوں کی مسافت ہے تھکن ہے جس کی
ہوش میں پاؤں جہاں گھر سے نکالا اب تک

خود تو برسوں سے ہیں مانوس اندھیروں سے مگر
بانٹتے پھرتے ہیں لوگوں میں اجالا اب تک

زندگانی کڑی دھوپ میں پھرتی ہے ابھی
آرزو جس کو بڑے ناز سے پالا اب تک

اچھی قسمت بھی کہیں سینت کے رکھ دی ہوتی
یوں تو ماں نے تھا سبھی راج سنبھالا اب تک

چاند چہرہ وہ ہوا آنکھ سے اوجھل کب کا
دل کو گھیرے ہے مگر یاد کا ہالہ اب تک

ابتدا ہی سے نہ تھا ربط و تسلسل جس میں
ایسی بے جان کہانی کو سنبھالا اب تک

خود کو ظاہر کریں ہر غم سے شفایاب مگر
دل میں چبھتا تھا جو کانٹا نہ نکالا اب تک

کسی گمنام سخن ور کو پرکھنے کے لیے
اک بڑے نام کا چلتا ہے حوالہ اب تک

شبنم شکیل

○

میرے ہونے ہی کا احساس دلا دے مجھ کو
میں بھی زندہ ہوں کوئی آکے بتا دے مجھ کو

اپنا تاوان مجھے خود ہی ادا کرنا ہے
اُسے بھولوں جو کبھی یاد دلا دے مجھ کو

یہ نہ ہو میں بھی اسی بھیڑ میں گم ہو جاؤں
راستہ کوئی الگ ہو تو دکھا دے مجھ کو

کسی تنکے کا سہارا نہیں منظور مجھے
اب کے طوفان جو آئے تو بہا دے مجھ کو

مجھ سے ہوتی نہیں برداشت بُرائی اُن کی
میرے پُرکھوں کے گناہوں کی سزا دے مجھ کو

اس نمائش کے تو خاکے ہیں ادھورے سارے
اب مکمل کوئی تصویر دکھا دے مجھ کو

شبنم شکیل

○

ہاتھ نہ آئی دُنیا بھی اور عشق میں بھی گمنام رہے
سوچ کے اب شرمندہ ہیں کیوں دونوں میں ناکام رہے

اب تک اس کے دم سے اپنی خوش فہمی تو قائم ہے
اچھا ہے جو بات میں اس کی تھوڑا سا ابہام رہے

ہم نے بھی کچھ نام کیا تھا۔ ہم کو بھی اعزاز ملے
عشق میں ہم بھی اِک مدت تک موردِ دشنام رہے

میرے پاس تو اپنے لیے بھی اکثر کوئی وقت نہ تھا
ہاں جو فراغت کے لمحے تھے تیری یاد کے نام رہے

واقفِ حال تو ہے وہ اپنا۔ منصف جانب دار سہی
اُس کے ہر انصاف کا لیکن میرے سر الزام رہے

آج کا دن بھی بے مصرف سی سوچوں ہی میں بیت گیا
آج کے دن بھی یوں ہی پڑے پھر گھر کے سارے کام رہے

شبنم شکیل

○

دل کی باتوں کو بڑے پیار سے ٹالا ہوگا
خود کو جب ایک نئی راہ پہ ڈالا ہوگا

اُس سے منسوب ہوں جتنے بھی فسانے، سُننا
اُن میں شاید کہیں میرا بھی حوالہ ہوگا

ہم تو کہتے تھے دیئے گُل نہ کرو آخرِ شب
تم کو اصرار کہ کچھ دم میں اُجالا ہوگا

سوچ کر آج بھی حیرت سی مجھے ہوتی ہے
کس طرح میں نے کبھی دل کو سنبھالا ہوگا

یہ ہیں پروردۂ غم ان سے شکایت کیسی
ان کا ہر ڈھنگ زمانے سے نرالا ہوگا

دل میں پھر بیٹھ گئیں آ کے کئی غم کی سطور
میں نے ماضی کی کتابوں کو کھنگالا ہوگا

شبنم شکیل

○

قتلِ خورشید پہ تاروں نے بھی دم سادھ لیا
شب بھی خاموش تھی گردوں بھی سراسیمہ تھا

میرا پندار مرے راہ کی دیوار بنا
اسی دیوار میں آخر مجھے چنوایا گیا

اپنی حیثیت و توفیق سے بڑھ کر اب تک
دلِ بدحال و شکستہ نے مرا ساتھ دیا

اب تو حق بات بھی کہتے ہیں تو یہ سوچتے ہیں
ہم نے ناحق ہی کشادہ لبِ اظہار کیا

جو ہو سکے چمن سے اُس شخص کا قصہ چھیڑو
مجھ تک آئے کسی جانب سے تو جاں بخش ہوا

زخم کھا کر جو بڑی دُور سے چلایا تھا
کیا کسی نے سُنی اُس طائرِ بسمل کی صدا

زیست میں اپنا بظاہر کوئی دمساز نہ تھا
کون پھر گیت محبت کے سناتا ہی رہا

کل کا بھی رزق فضاؤں میں میسر ہوگا
محوِ پرواز پرندوں نے یہ کیوں سوچ لیا

شہر آباد خرابہ نظر آتا ہے مجھے
یہ کس آسیب کا سایہ میری آنکھوں پہ پڑا

اپنی آنکھوں میں تھے اشکوں کے دمکتے جگنو
کبھی روشن کبھی دھندلی ہی اس دل کی فضا

میر کے شعر مجھے دُکھ میں بہت کام آئے
میں نے ہر غم کو محبت میں سلیقے سے سہا

میری ہی گود میں سر رکھ کے بڑے پیار کے ساتھ
سب جواں سال تمناؤں نے دم توڑ دیا

خالد شریف

○

کسی کو دیکھوں تو ماتھے پہ ماہ و سال ملیں
کہیں بکھرتی ہوئی دھول میں سوال ملیں

ذرا سی دیر دسمبر کی دھوپ میں بیٹھیں
یہ فرصتیں ہمیں شاید نہ اگلے سال ملیں

یہ شعر و شاعری سب ہے عطا ان آنکھوں کی
وہ اک نگاہ اٹھائے تو سو خیال ملیں

سجے ہوئے تھے وہ کل شب کسی کے بالوں میں
جو پھول شہر کی گلیوں میں پائمال ملیں

جو اپنے چہرے کو محفوظ دیکھنا چاہے
وہ کیا کرے کہ یہاں آئینوں میں بال ملیں

میں بے ہنر تھا سو حیرت میں گم ہوا خالد
کہ ہر قدم پہ یہاں صاحبِ کمال ملیں

خالد شریف

○

جب سے قلم کو خامۂ مانی بنا لیا — ہم نے جگر کے خون کو پانی بنا لیا
یوں ہم نے شہر شہر تری داستاں کہی — ہر سنگِ رہ کو دشمنِ جانی بنا لیا
میں نے پرو دیے ترے بالوں میں سرخ پھول — اور اپنے روز و شب کو کہانی بنا لیا
کیا جانے کس خیال میں اٹھی تھی وہ نظر — اور ہم نے اس سے شہرِ معانی بنا لیا
سب محوِ خواب ہوں تو مہک اس کی جاگ اٹھے — ہم نے غزل کو رات کی رانی بنا لیا

خالد وہ سانحہ تو اسے یاد بھی نہیں
جو ہم نے عمر بھر کی نشانی بنا لیا

خالد شریف

وہ تو گیا اب اپنی انا کو سمیٹ لے
اے غم گسار دستِ دعا کو سمیٹ لے

بالوں میں اپنے ڈال لے اب خاک کوئے یار
بانہوں میں اُس گلی کی ہوا کو سمیٹ لے

مٹی کی اک لکیر بھی کہہ دے گی داستاں
چلنے کا شوق ہے تو ردا کو سمیٹ لے

ان آبلوں کی روشنی بھٹکے گی شہر میں
اے کوچہ گرد، گردشِ پا کو سمیٹ لے

لفظوں کو ترک کر دے کہ ان کو نہیں ثبات
آنکھوں میں آج اپنی وفا کو سمیٹ لے

بس ایک چپ ہی تیرے لبوں پہ سجی رہے
بس اپنے دل میں سیلِ بلا کو سمیٹ لے

چہرے پہ اہلِ شہر کی آنکھیں سجا کے چل
ورنہ ہجومِ سنگِ سزا کو سمیٹ لے

خالدؔ کبھی تو تذکرۂ جاں سنا ہمیں
اپنی صدا میں خوفِ صدا کو سمیٹ لے

خالد شریف

رخصت ہُوا تو بات مری مان کر گیا
جو اُس کے پاس تھا وہ مجھے دان کر گیا

اب شہر بھر میں کوئی بھی پہچانتا نہیں
وہ اپنے ساتھ مجھ کو بھی انجان کر گیا

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

دلچسپ واقعہ ہے کہ کل اِک عزیز دوست
اپنے مفاد پہ مجھے قربان کر گیا

کتنی سُدھر گئی ہے جُدائی میں زندگی
ہاں وہ جفا سے مجھ پہ تو احسان کر گیا

خالدؔ میں بات بات پہ کہتا تھا جس کو جان
وہ شخص آخرش مجھے بے جان کر گیا

خالد شریف

○

نارسائی ہے تو ہے کیا ہے
یاد تیرے بنا جی ڈولتا ہے

اے غمِ جاں ترے غم خواروں کا
صبر اب حد سے سوا پہنچا ہے

آئینہ تھا کہ مرا پیکر تھا
تیری باتوں سے ابھی بکھرا ہے

آنکھ کس لفظ پہ بھر آئی ہے
کون سی بات پہ دل ٹوٹا ہے

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں کوئی
زندگی بن کے چھپا بیٹھا ہے

مردہ دل ہم بھی نہ تھے پر اب کے
حادثہ ہم پہ عجب گزرا ہے

اس سے پہلے کئی صدیاں پہلے
جیسے خود کو بھی کہیں دیکھا ہے

آسماں جھانک رہا ہے خالد
چاند کمرے میں اُتر آیا ہے

خالد شریف

○

رکے ہوئے ہیں کہ ہم حالتِ سفر میں ہیں
جہاں بھی ہیں غمِ ہستی کی رہگزر میں ہیں

ابھی کہاں ہے لبوں پر فدائے جاں کی صدا
ابھی تو ولولے مضطرب بال و پر میں ہیں

پڑی ہے خاک پوترِ صبح چہروں پر
بلندیوں کے نشاں دفن کنجِ در میں ہیں

وہ سنگِ در سے لپٹنے کا راز کیا جانیں
جو آئینے کی طرح قید اپنے گھر میں ہیں

کہاں کہاں پہ رکھیں پنبۂ تسلی ہم
کہ اب تو روزنِ دیوار بام و در میں ہیں

رمق حیات کی اس کے سوا نہیں خالد
کہ چند کونپلیں سوکھے ہوئے شجر میں ہیں

حفیظ صدیقی

ہر ایک منظر ہے روز و شب کا سراب جیسا
ہُوں دشتِ جاں میں، ہر ایک پل ہے عذاب جیسا

میں جاگتا ہوں، کہ سو رہا ہوں، خبر نہیں ہے
کہ جاگتے کا بھی سارا منظر ہے، خواب جیسا

کڑے حوادث کی دھوپ سے زرد پڑ چکا ہے
وہ ایک چہرہ کہ ہو بہو تھا، گلاب جیسا

کسے خبر کب سے جل رہا ہوں، بکھر رہا ہوں
میں جو کہ اندر سے اب بھی ہوں، آفتاب جیسا

طبیعت اپنی کو موسمِ ابر ہی نہ بھائے
لگے ہے بادل بھی غم کے اندھے سحاب جیسا

کتاب کی طرح خوبصورت تو ہے وہ بے شک
مگر وفا میں بھی کاش ہوتا، کتاب جیسا

حفیظ صدیقی

اس عہدِ بے بصر میں، بصیرت کب آئے گی
واپس ہُنر کی، فن کی، فضیلت کب آئے گی

روحوں سے کب چھٹے گی، کدورت کی تیرگی
آنکھوں میں اک ذرا سی، مروّت کب آئے گی

کب جذبۂ خلوص سے معمور ہوں گے دل
باتوں میں آشتی کی حلاوت، کب آئے گی

کیا لوگ تھے کہ دشمنی کے بھی تھے کچھ اصُول
ان دوستوں کو طرزِ عداوت، کب آئے گی

اپنی تباہیوں کا سبب بھی ہمیں تو ہیں
اپنے کیے پہ ہم کو ندامت، کب آئے گی

ہر شخص کی جبیں پہ ہے پژمردگی کا عکس
چہروں پہ زندگی کی تمازت، کب آئے گی

اس درجہ رنگ و بو سے تہی ہو گئی حیات
بچے بھی پوچھتے ہیں، قیامت کب آئے گی

یاروں سے تُو نے ڈنک تو کھائے مگر انھیں
عقرب کا نام دینے کی جرأت کب آئے گی

○

نوید انور نوید

دل کے دروازے سے جونہی اس کی دربانی گئی
چاہ کی دولت لٹی، خواہش کی سلطانی گئی

وہ دغا دے کر مجھے نہ رکھ سکا اپنا بھرم
آنکھ سے رنگِ وفا، چہرے سے تابانی گئی

تام وہ سمجھے لے شہیدوں میں کریں کوشش نئی
رائیگاں تو عمر بھر کی لیں بھی قربانی گئی

تیرے اشکوں کی شفق میں ڈھل گیا سارا غبار
وہم کی خفت مٹی، سوچوں کی حیرانی گئی

گھر کی دیواروں کے بہرے کان بھی بجنے لگے
تیری آہٹ سے مرے آنگن کی ویرانی گئی

زور دے کر حافظے پر دیر تک سوچا بہت
وہ شناسا سی لگی لیکن نہ پہچانی گئی

○

نوید انور نوید

جس کی آنکھوں میں بھی ہجراں کا ستارا ہوگا
وہ یقیناً ترے الطاف کا مارا ہوگا

اپنے عشاق میں رکھے کہ مجھے غیروں میں
اس کا ہر فیصلہ اس دل کو گوارا ہوگا

وہ تو اس سوچ میں ساحل پہ کھڑا ڈوب گیا
کتنا گہرا ترے دریا کا کنارا ہوگا

تو شجر میں بھی چھپے گا جو پیغمبر کی طرح
وقت کے ہاتھ میں ابلیس کا آرا ہوگا

گو مجھے یاد نہیں پھر بھی یقیں ہے مجھ کو
میں نے بے ہوشی میں تم کو ہی پکارا ہوگا

آج ہے گھر کی ہر اک اینٹ پہ کرنوں کا ہجوم
اس نے آنگن میں کوئی چاند اتارا ہوگا

وہ مرا ہو کے بھی محروم رہا مجھ سے نوید
کیا کوئی میری طرح جیت کے ہارا ہوگا

○

نوید انور نوید

کٹ رہی ہے زندگی انداز گو اچھا نہیں ،
غم ترا اپنے پاس ہے اور درد بھی بیچا نہیں

وہ بھی بچھڑا مسکرا کے زندگی بھر کے لیے
میں بھی اس کی یاد سے یارو کبھی بچھڑا نہیں

گو تڑپ کر کاٹ لی ہیں اَن گنت راتیں صنم
پر تیری چلمن کی جانب ایک پل دیکھا نہیں

یوں رہے پیشِ نظر خلق خدا کے مسئلے
اپنے بارے میں تو ہم نے آج تک سوچا نہیں

آج کیا کچھ اہتمام راز ہے اس بزم میں
اس سے پہلے تو کسی نے بھی ہمیں روکا نہیں

رات کشتی سے وہ کودا دیکھ کر تیری شبیہ
ڈوبتے والے کو عکسِ ماہ نے تھاما نہیں

تم نے آنکھیں کھول دیں بتلا کے کردارِ نوید
وہ بظاہر دیکھنے میں تو برا لگتا نہیں ،

نوید انور نوید

کب تلک ہوتا رہے گا خواہشوں کا قتل عام
تیغ ابرو کے لیے لائے کوئی دل کی نیام

جب سے روٹھے ہیں مری شب سے ستارے آنکھ کے
چاند چہرہ پھر کبھی لایا نہیں کرنوں کا جام

ہائے وہ مے کش کہ تجھ بن مے کدے میں رات بھر
کھنکھناتے ساغروں میں بھی رہا تھا تشنہ کام ،

اب کہاں وہ دل کی پہلی سی رواں بے تابیاں
عمر کے ڈھلتے ہوئے احساس نے کھینچی لگام

وہ محبت میں جنوں کی آخری حد سے پرے
قوسِ تنہائی میں سرِ دم خود سے ہے وہ محوِ کلام

اس طرب کی شام میں بھی ہم نے کر ڈالا نوید
اپنی محفل میں ترے غم کا خصوصی اہتمام ،

بشیر احمد خاں ضاحک

میں درد کی لذت جان چکا۔ اس مرنے میں بھی جینا ہے
دیتا جا دعائیں دکھیوں کو گر زہر پیالہ پینا ہے
ہو فرصت جو اک دم بھر کی تو دید کے پیاسوں سے ملنا
ان خاک نشینوں ہی نے تیرا، یہ چاکِ گریباں سینا ہے
افلاک کی گردش کا شکوہ ، آلام کی یورش سے ڈرنا
یہ ڈرنا، جلنا ، پھر مرنا ، حیران یہ چشمِ بینا ہے
ملنے کو تو یوں سو بار ملے کچھ لالہ رخاں کچھ ماہ وشاں
جینے کا سلیقہ غائب ہے سب بے کیف یہ جام و مینا ہے
آزردہ دِل و لاچار بہت ، بیتاب بہت ، غمخوار بہت
پہلو میں چھپا یا ضاحک نے وہ درد جو تم سے چھینا ہے

انوار فیروز

ہر سمندر میں نیا طوفان ہے
ساحلوں پر کس لیے بحران ہے

بٹ رہا ہوں لمحہ لمحہ سوچ میں
میرا دشمن تو میرا عرفان ہے

دشت میں تو ہر طرف اِک شور ہے
شہر لیکن صورت شمشان ہے

مَیں کسی فرعون سے ڈرتا نہیں
دوستو میری یہی پہچان ہے

ہم تو ہنس کر سُولیوں پر چڑھ گئے
بات کہنے کو بڑی آسان ہے

کس سے ہم انوار اب شکوہ کریں
آدمیت کا یہاں فقدان ہے

کرشن ادیب

چاہے جانے کا سنہری خواب آنکھوں کو دیا
دل نے تیرے جو کیا وہ فیصلہ اچھا کیا

جنگلوں کی رات میں جلتا ہے یادوں کا دیا
دیکھنا اس کو بجھا نہ دے نہ کہیں پاگل ہوا

دل کے کورے کاغذوں پر نام تیرا لکھ دیا
سلویا اے سلویا، اے سلویا، اے سلویا

ہجرتوں کی سرحدیں ہیں، غم کے لمبے فاصلے
دوریوں کا زہر آخر تنہا تنہا پی لیا

کو بہ کو پھرتی ہے شہرت تیرے میرے عشق کی
ہم تو رسوا ہیں ازل سے، تم کو رسوا کیوں کیا

سوچتا ہوں کب ملیں گے آج سے بچھڑے ہوئے
بس یہی اک سوچ جس نے اور تنہا کر دیا

دل کا دروازہ کھلا رکھنا تو میرے واسطے
تجھ سے ملنے میرا شاعر ایک دن تو آئے گا

کرشن ادیب

محبت رنگ کے خوشبو کے فسانے کیا کیا
چھوڑ آیا ہوں ترے ساتھ زمانے کیا کیا

بین کرتی ہوئی پھرتی ہیں ہوائیں دل میں
راکھ کے ڈھیر ہوئے خواب سہانے کیا کیا

اب نہ سن پائیں گے ساحر کی نشیلی باتیں
قہقہے چھین لئے آج قضا نے کیا کیا

وہ بھی گم سم سا رہا کرتا تھا دل کے ہاتھوں
میں بھی کچھ سوچتا رہتا تھا نہ جانے کیا کیا

ایک میں ہی تو نہیں رسمِ جنوں کا خالق
دشت میں پہلے بھی تھے ہم سے دوانے کیا کیا

اے شبِ زیست ترا قرض چکانے کیلئے
اس نے ڈھونڈے تھے خرابی کے بہانے کیا کیا

اب نہ ساحر ہے مرے پاس نہ ابنِ انشا
ہو گئے ہم سے جدا یار پرانے کیا کیا

کرشن ادیب

تشنگی، دیکھ ترا قرض نہ رکھا ہم نے
جو ملا زہر زمانے کا وہ چکھا ہم نے

وہ تو اک عام سی لڑکی تھی جسے آج تلک
اک مصور کے تصور سے تھا سوچا ہم نے

ہونٹ یاقوت نہ تھے اور نہ آنکھیں نیلم
کیسا پیکر تھا جسے ٹوٹ کے چاہا ہم نے

رونقِ بزم بنا کو تھا بویا اک دن
فصلِ تنہائی کو اک عمر ہے کاٹا ہم نے

وہ نہ شبنم تھی، نہ موتی، نہ شگفتِ گل تھی
شعر کہنے کے لیے روگ تھا پالا ہم نے

زہر چپ چاپ پیا کاسے گلابوں کا ادیب
جی کا رونا نہ کسی شخص سے رویا ہم نے

○

صبا وسیم

وہی گلی وہی خاموش سائبان بھی ہے — ترا غرور بھی ہے جوگیوں کا مان بھی ہے

اُدھر کے لوگو اندھیرے میں اتنا سوچا کرو — ندی کے پار پُرانا سا اِک مکان بھی ہے

سفر پہ نکلا ہوں جس دن سے مَیں تو میرے ساتھ — نگر نگر تیری تنہائیوں کا دھیان بھی ہے

کوئی صدا مجھے کہتی ہے مت رُکو کہ ابھی — زمین پاؤں تلے ہے سر پہ آسمان بھی ہے

اُفق کے پار ہے وہ شہر اپنے خوابوں کا — جہاں کی رات مقدس بھی ہے مہان بھی ہے

یہی نہ ہو میرا ساتھی کہ اُس کے ماتھے پر — وہی لکیر ہے وہی زخم کا نشان بھی ہے

سفر کے پھول تو ہیں لیکن اپنی جھولی میں
سفر کے پھولوں کی اِک لمبی داستان بھی ہے

○

صبا وسیم

عجب وہ رُوح تھی یہ رُوح میں بکھر سی گئی
کہ سارے جسم میں اِک روشنی اُتر سی گئی

شفق کے بجھتے ہی گھر میں چراغِ شام جلا
لہو کی موج درو بام پہ ٹھہر سی گئی

مَیں اُس کو بھولنے کی حد میں تھا کہ وہ صورت
ہوا کی طرح مرے پاس سے گذر سی گئی

خوشا وہ شخص کہ جس نے سمیٹ رکھا تھا
پھر اُس کے بعد تو یہ زندگی بکھر سی گئی

مَیں ایک عمر سے جس کے لیے سفر میں ہوں
وہ ایک دُور کی آواز آج مر سی گئی

دیئے کی طرح مرا دم بھی بجھا دیتی
ہوا مگر مری بیچارگی سے ڈر سی گئی

○

○

صابر وسیم

اُڑنے والا پرندہ پھر نہیں آئے گا
آنگن میں سب دانہ پڑا رہ جائے گا

دھوپ میں جلتی سڑکیں کہاں کو جائیں گی
پوچھوگے پر کون تمہیں بتلائے گا

آخر کو تنہائی تمہیں آگھیرے گی
ایک خیال کہاں تک ساتھ نبھائے گا

تم نہ رہے تو اِک انجانی صورت کی
دیواروں پر شکلیں کون بنائے گا

چلتے چلتے شام پڑے گی راہ میں جب
کوئی تمہیں پھر اپنی اور بُلائے گا

سناٹے میں کوئل زور سے کوکے گی
درد کا جھونکا سینے میں در آئے گا

رات گھنیری شاخوں سے جب اُتریگی
خوف کا سایہ آنکھوں میں لہرائے گا

ایک ستارہ ٹوٹ کے اپنے محور سے
تم کو ساری ساری رات جگائے گا

تنہا بیٹھ کے وہ بھی صابر آج کی شب
تیری طرح اِس چاند کو تکتا جائے گا

○

قدسیہ قدسی

کچھ دل کے شہر تک بھی نہ رستہ دکھائی دے
کوئی تو اس اُجاڑ میں بستا دکھائی دے

چہرے چھپے ہوئے ہیں پسِ گردِ غیریت
اے کاش کوئی شکل شناسا دکھائی دے

ہر شخص ہم سے ملتا ہے اپنی ہی ذات میں
ہے آرزو کہ کوئی تو ہم سا دکھائی دے

مدت سے ہے پڑی ہوئی سونی یہ رہگزر
اے کاش کوئی اجنبی آتا دکھائی دے

چلتا ہے ہر کوئی ہمیں اوڑھے ہوئے نقاب
چہرہ کوئی تو ہو کہ جو اپنا دکھائی دے

دیکھا ہے بے بسی سے کبھی سوئے آسماں
شامِ الم میں کوئی ستارا دکھائی دے

نیرنگیاں جہان کی قدسی نے دیکھ لیں
جب دیکھنے کو کچھ نہ رہا کیا دکھائی دے

○

ڈاکٹر صفی حسن
(برمنگھم)

وہ شخص جس سے توقع کتنی چاہتیں دے گا ۔ خبر نہ تھی کہ ہمیں اتنی نفرتیں دے گا
اُسی شجر نے بھرے گھر میں آگ پھیلائی ۔ گماں تھا جس پہ کہ اِک روز راحتیں دے گا
سجا نہ یونہی خیالوں میں بزمِ تنہائی ۔ کہ یہ سکوت بھی اِک روز وحشتیں دے گا
ملے جو اُس سے تو کوئی گماں نہ تھا دل کو ۔ کہ اس کا ذکر بھی اِک دن ندامتیں دے گا
ہزار شکوے سہی یہ کبھی نہ سوچا تھا ۔ کہ اپنا گھر بھی ہمیں اتنی ذلتیں دے گا
اگرچہ شاخ سے توڑا تو کیا ہُوا گلچیں ۔ مرا لہو بھی تو گلشن میں نکہتیں دے گا
صفیؔ عجب تو نہیں میری بے گنا ہی کی
کبھی یہ خود مرا قاتل شہادتیں دے گا

محمد نواز

انساں کے زخم اتنے گھٹائے جہان نے ۔ مجھ کو خرید کر دیا میری دکان نے
صحرا نوردیوں کی تمنّا نہیں رہی ۔ حیران کر دیا مجھے کچّے مکان نے
جذبے نے ارتعاشِ معانی کی قدر کی ۔ لفظوں کو کچھ حقیر سا سمجھا زبان نے
پنکھے پہ آشیانہ بنانے کی فکر میں ۔ کتنے ستم اُٹھائے ہیں چڑیا کی جان نے
کون و مکاں کی چشمِ تحیّر نکھار دی ۔ صحنِ بدن میں گونج کے دل کی اذان نے
اب آرزو ہے تا بہ ابد منعم ہو رُو برُو ۔ اتنا کرم کیا ہے کسی مہربان نے
گلشن کی زرد دھوپ سے آنکھیں پگھل گئیں
بے نُور کر دیا مجھے اونچی اڑان نے

اویس المصطفیٰ

وہ تم سے وعدہ جو ہو گیا تھا سنبھال رکھا
نظر کے ہر حال میں تمہارا خیال رکھا

اُسے دکھایا کہ ہم بھی کتنے ہیں ظرف والے
زباں نہ کھولی مگر نظر میں سوال رکھا

ہمیں تو جیسے شکست سے ہی موافقت تھی
عروج پر تھے تو نام اپنا زوال رکھا

اُسے یہ ڈر تھا کہ اس کی تخلیق مٹ نہ جائے
اسی لیے اس کو اپنی صورت مثال رکھا

اس انجمن میں حسین چہروں کی رونقیں تھیں
وہاں مقابل میں ہم نے تیرا جمال رکھا

بڑا ہی احسان ہے خدا کا اویس مجھ پر
کہ اس نے میری صداقتوں میں کمال رکھا

اویس المصطفیٰ

ہو کوئی صورت مرے خدایا گلاب جیسی
نظر سے اترے یہ نارسائی عذاب جیسی

وہ جس کے آغاز میں مرا انتساب آئے
وہ شکل مجھ کو نظر تو آئے کتاب جیسی

میں لمحہ لمحہ ترے تعاقب میں کھو چکا ہوں
ابھی تلک میری منزلیں ہیں سراب جیسی

مرے سخن کے تمام موسم اجڑ گئے ہیں
بس ایک ہی رات ہے مستقل اب حجاب جیسی

جہاں جہاں تیری خامشی یاد آ گئی ہے
صدائیں کانوں میں گونج اٹھی ہیں رباب جیسی

میں کون سے روپ میں بھلا اس کے پاس جاؤں
وہ شکل تو بچپنے میں بھی ہے شباب جیسی

زبانِ اغیار سے سنا ہے وہ نام جب سے
لہو میں طغیانیاں ہیں برپا چناب جیسی

میں جب سے مشکل ہوا نئے شہرِ الم ہوا ہوں
وہ اپنی عادت میں ہو گئی تیزاب جیسی

مجھے یقین ہے کہ تو بھی ایسے ہی خوار ہو گا
ہے تیری خو بھی اویس خانہ خراب جیسی

اقبال ارشد

دوستوں کی انجمن ہے آشنا کوئی نہیں
دل میں کیا کیا حسرتیں ہیں جانتا کوئی نہیں

میں کسے آواز دوں اپنی مدد کے واسطے
مجھ کو قاتل کے سوا پہچانتا کوئی نہیں

اس خرابے میں مرے چہرے کی یہ نیرنگی
دیکھنے والے بہت ہیں دیکھتا کوئی نہیں

شہر کے ویران در و دیوار سے باتیں کریں
رات کا پچھلا پہر ہے جاگتا کوئی نہیں

آج پھر اس کے لیے میں نے جلائے ہیں چراغ
جس کا میری ظلمتوں سے واسطہ کوئی نہیں

ہم تحیر کے بیاباں میں کھڑے ہیں دوستو
منزلیں چاروں طرف ہیں راستہ کوئی نہیں

سوچ کی اک لہر ارشد ذہن سے ٹکرا گئی
جب کسی نے مجھ سے پوچھا کیا ترا کوئی نہیں؟

اقبال ارشد

سرخ پھولوں میں بھی گرمی ہے اجالوں جیسی
وہ مگر بات کہاں زہرہ جمالوں جیسی

کوئی رستہ نہیں دھرتی پہ تمنا جیسا
کوئی بستی نہیں دنیا میں خیالوں جیسی

جب بھی پڑھتا ہوں کتابوں میں غزل کی تعریف
تیری تصویر ابھرتی ہے حوالوں جیسی

پھول چہرہ ہے شفق لب ہیں ستارہ آنکھیں
ایک انسان کی صورت ہے مثالوں جیسی

سو گئی ریت کے ٹیلوں سے لپٹ کر آخر
ایک آواز تھی صحرا میں غزالوں جیسی

[illegible] گرد ہواؤں سے جو بچ کر نکلے
روشنی لائیں گے ہم جاگنے والوں جیسی

کھو گئے شہر کے آوارہ سفر میں ارشد
بن گئی ذات ہماری بھی سوالوں جیسی

سلیم الحق

جو غم پہاڑ کی مانند تھا وہ آب ہوا
ہر ایک لمحہ مری زندگی کا خواب ہوا
عجب طرح کی خموشی تھی میرے چار طرف
عجیب لفظ تھا جو پھیل کر کتاب ہوا
ہم ایسے لوگ کہ خود پر بھی منکشف نہ ہوئے
وہ اور لوگ ہیں جن کا کہا نصاب ہوا
بہا کے لے ہی نہ جائے تصورات کی جھوک
کہ ایک اشک مری ذات میں چناب ہوا
بکھر کے ٹوٹی ہے اک پل میں میری
ترے خیال کا انگارہ آفتاب ہوا
تو اپنی تشنہ لبی کو تھپک تھپک کے سلا
کہ پانیوں کا بدن سورتِ سراب ہوا
سلیم اب تو میں خود سے بھی ہمکلام نہیں
ریا کا دور ہے پہ سچ بولنا عذاب ہوا

انور جمال

خزاں کے بے مہر موسموں میں برہنہ شاخوں پہ بور سچ ہے
ہے تیرا فرمان تو زرد شعلوں میں برگِ گل کا ظہور سچ ہے

سکوت کے ٹھہرے پانیوں میں صدا کے کنکر گرائے میں نے
گماں کی اس منجمد فضا میں بجا ہے میرا قصور سچ ہے

دیارِ ملتاں کی دھول دھرتی پہ زرد سورج سے جل رہا ہوں
میں سچ ہوں جیسے عرب کے صحرا کی چاندنی میں کھجور سچ ہے

فسردہ لمحوں کی دھڑکنوں میں خمار سا جگمگا اٹھا ہے
تمہارے ہونٹوں کو چھونے والی ہوا میں کیف و سرور سچ ہے

صداقتیں ایسے مصلحت ہیں کہ گوش و لب بر کریں گی ماتم
جو حرفِ کاذب کو سن کے بولے جناب سچ ہے حضور سچ ہے

میں صدقِ خواہش میں منفرد ہوں۔ تو ذوقِ بخشش میں بے بدل ہے
درست ہے میری تمکنت بھی۔ ترا بھی فخر و غرور سچ ہے

برنگِ الزام نام میرا ہر ایک دیوار پر لکھا ہے
اگر مکمل نہیں تو انور یہ کچھ نہ کچھ تو ضرور سچ ہے

○

جعفر بلوچ

درد شدت پکڑ نہ جائے کہیں — سانس اب اکھڑ نہ جائے کہیں
جسم کے کھیت سینچنے والو — مزرعِ جاں اجڑ نہ جائے کہیں
بحث کیجے مگر اصول کے ساتھ — رنگِ محفل اجڑ نہ جائے کہیں
سخت نازک ہے شیشۂ خاطر — حرف سے بال پڑ نہ جائے کہیں
تیز چل تیز اور تیز ابھی — رات رستے میں پڑ نہ جائے کہیں
جس کو رشکِ بہار ہونا ہے — غنچگی ہی میں جھڑ نہ جائے کہیں

ضد میں مشہور ہے بہت جعفر!
اپنے موقف پہ اڑ نہ جائے کہیں

○

جعفر بلوچ

شگفتِ دل کے لئے ذکرِ یار تو ہوتا — کچھ اہتمامِ ورودِ بہار تو ہوتا
مشرف ان کی زیارت سے ہم اگر ہوتے — ہمارا اہلِ نظر میں شمار تو ہوتا
ہم اپنے آنسو اگر خود نہ پی گئے ہوتے — بجھے بجھے ہوئے رخ پر نکھار تو ہوتا
نہ ہوتی کاتبِ سراسر سیاہ فردِ عمل — جوازِ حاشیۂ انکسار تو ہوتا
جو ہوتا اذنِ تکلم مجھے تو میرا سخن — خود اپنے حسن کا آئینہ دار تو ہوتا

بلائے جان ہے جعفر یہ برملا گوئی
تمہیں خیالِ یمین و یسار تو ہوتا

○

وحید الدین وحید

نگر نگر میں ہوئی آج اپنی رسوائی !
نہ پوچھ جرمِ صداقت کی کیا سزا پائی

میں سہمی سہمی نگاہوں سے دیکھتا ہی رہا
کہ پھونکتے تھے مرا گھر مرے ہی شیدائی

سکوت چیختا پھرتا ہے رہگذاروں میں
یہ جستجوئے صدا کس جگہ پہ لے آئی

میں خود کو بھول کے جب تجھ کو ڈھونڈنے نکلا
تمام عمر ہوئی صرفِ بادہ پیمائی

حقیقتوں میں گھرا اس طرح کھڑا ہوں میں
ہجومِ سنگ میں جیسے ہو کوئی سودائی

ہم اپنی زات کے اپنی صفات کے مجرم
کہ ہم نے بیچ دی اپنی تمام رعنائی

جبینِ شوق پہ لکھتا ہوں داستاں ایسی
زمانہ یاد کرے گا یہ خامہ فرسائی

جہانِ عقل میں بھی اک مقام پیدا کر
مرے جنوں نے نئی راہ مجھ کو دکھلائی

مرے نصیب تجھے تیری دشمنوں کی قسم
خوشی کے نام سے کیوں تیری آنکھ بھر آئی

وہ صبح جس کے لیے ساری رات ہم تڑپے
وہ صبح آئی تو ہم ہی تھے جن کو نیند آئی

ہر ایک پھول کے سینے سے خون رستا ہے
یہ کس ادا سے مرے عہد میں بہار آئی

شریکِ درس نہ تھا میں کوئی حکیم نہ تھا
ہزار ٹھوکریں کھائیں تو آئی دانائی

وحید کہہ نہ سکا جو حجاب کے مارے
زبانِ شعر سے وہ بات اُس نے کہلائی

افضل آرش

کوئی بھی صورت ہو حرکت کا عمل چلنے لگے
سمت طے ہو یا نہ ہو لیکن سفر ہونے لگے

اس کی باتیں کر رہے ہو وہ تو ایسا شخص ہے
آپ ہی باتیں بنائے آپ ہی رونے لگے

دیکھتے ہی دیکھتے بستی کی بستی جل گئی
پہلے میرا گھر جلا، پھر گھر بہ گھر جلنے لگے

اب کے موسم نے ہواؤں سے بھی نرمی چھین لی
اُس کے میٹھے بول بھی اب زہر سے لگنے لگے

ہولے ہولے بھیڑ میں اک راستہ بنتا گیا !
میں چلا، پھر وہ چلا، پھر سب کے سب چلنے لگے

شوذب کاظمی

آنکھوں میں تو رتجگے بسے ہیں
اور ہم ہیں کہ خواب ڈھونڈتے ہیں

پہلے تھا فقط شبوں کا رونا
اب دن بھی عذاب ہو گئے ہیں

جو دُور ہیں شہر کی فضا سے
وہ لوگ بھی کس قدر بھلے ہیں

چل تو پڑے راستوں پہ لیکن
کھلتا نہیں کس طرف چلے ہیں

چہروں پہ ہے روشنی بلا کی
سینوں میں اندھیرے جاگتے ہیں

وہ شعر ہی زندگی ہیں شوذب
جو شعر ابھی نہیں ہوئے ہیں

سلمان غنی

زندگی ہم یوں کفایت سے بسر کرنے لگے
جتنی خوشیاں بچ گئیں اُن میں گزر کرنے لگے

جلتی آنکھوں کو یہ منظر بھی دکھایا دھوپ نے
جسم تو ٹھہرے رہے، سائے سفر کرنے لگے

شب ڈھلے خاموش گلیوں کو سسکتا دیکھ کر
گفتگو آپس میں سب دیوار و در کرنے لگے

ایک جھونکے سے چٹانیں ہل گئیں احساس کی
پتھروں پہ پھول سے لہجے اثر کرنے لگے

گر کے سنبھلے بھی نہ تھے حالات کی یلغار سے
پھر سے اُڑنے کا تقاضہ بال و پر کرنے لگے

یہ بھی ہے سلمان اک ترکیبِ تسکینِ انا !
ہم سخن جو امتیازِ خیر و شر کرنے لگے

ممتاز اطہر

اطہر وقت کو ساجن لکھ، ہر جائی لکھ
اس کے آگے بندھن لکھ، گیرائی لکھ

ناؤ آئینوں کی پتھر لہروں میں
ہر ضربت کو مدفن لکھ، گہرائی لکھ

اے پردیس میں رہنے والے اپنوں کو
اپنے دل کی اُلجھن لکھ، تنہائی لکھ

گھنگرو جس کے پاؤں میں دستار رہتا ہے
اُس کے نام بھی آنگن لکھ، شہنائی لکھ

اک جانب سے تیروں کی تو بارشیں مار
اِک جانب سے شیون لکھ، پسپائی لکھ

اطہر اپنے بارے میں بھی رائے دے
آگ لگاتا ساون لکھ، صحرائی لکھ

○

عطاء الحق قاسمی

یہ نیلا آسماں اب درمیاں دیکھا نہیں جاتا
وہاں تک دیکھنا چاہوں جہاں دیکھا نہیں جاتا
وہ رہتا ہے انہی بینا جہانوں میں کہیں لیکن
زمیں کی آنکھ سے وہ آسماں دیکھا نہیں جاتا

○

عطاء الحق قاسمی

پہلے جو اپنا حال تھا، اب کے برس بھی ہے
اُڑتے ہیں اور اُڑان میں شامل قفس بھی ہے

وہ بازوؤں میں یوں ہے کہ جُوں جِلد میں کتاب
شامل نصابِ عشق میں بابِ ہوس بھی ہے

اس نے سکوں دیا بھی تو مانندِ اضطراب
تارِ نفس بھی ہے، وہ فشارِ نفس بھی ہے

دُنیا میں ایک درد کا رشتہ ہے لازوال
لیکن یہ کیا کہ درد کا رشتہ عبث بھی ہے

عطاءالحق قاسمی

○

یہ چتائیں، اے زمانے کس لیے ہیں
روگ یہ اتنے پرانے کس لیے ہیں

تیرے بچے مر رہے ہیں بھوک سے کیوں
اے زمیں تیرے خزانے کس لیے ہیں

آئینہ در آئینہ ان کی شکلیں ایک جیسی
جھوٹ، سچ کے شاخسانے کس لیے ہیں

چشمِ حیراں پوچھتی پھرتی ہے اب تک
یہ حقیقت، یہ فسانے کس لیے ہیں

موسموں سے پوچھتی ہیں خود ہوائیں
شاخِ گل پر تازیانے کس لیے ہیں؟

عطاءالحق قاسمی

○

وہ سکونِ جسم و جاں گردابِ جاں ہونے کو ہے
[illegible] بھول پانی میں رواں ہونے کو ہے

ماہیِ بے آب ہیں آنکھوں کی بے کل پتلیاں
ان نگاہوں سے کوئی منظر نہاں ہونے کو ہے

گم ہوا جاتا ہے کوئی منزلوں کی گرد میں
زندگی بھر کی مسافت رائگاں ہونے کو ہے

میں فصیلِ جسم کے باہر کھڑا ہوں دم بخود
معرکہ سا خواہشوں کے درمیاں ہونے کو ہے

جاگتا رہتا ہوں اس کی وسعتوں کے خواب میں
چشمِ حیراں سے بیاں اک داستاں ہونے کو ہے

شام ہوتے ہی عطاؔ کیوں ڈوبنے لگتا ہے دل
کچھ نہ کچھ ہونے کو ہے اور ناگہاں ہونے کو ہے

عطاءالحق قاسمی

○

ہم مسافر کہاں منزل کی خبر مانگتے ہیں
ہم تو رستوں سے فقط اذنِ سفر مانگتے ہیں

اب تو یوں ہے کہ فلک بوس پہاڑوں کے نگر
سانس لینے کے لیے روزنِ در مانگتے ہیں

ہم بھلانا اسے چاہیں تو بھلا بھی نہ سکیں
اب دعاؤں میں بس اتنا سا اثر مانگتے ہیں

کام کو چھوڑ کے ہم نام کے پیچھے ہیں عطاؔ
وہ شجر بوئے نہیں جن کے ثمر مانگتے ہیں

عطاءالحق قاسمی

○

کانٹوں سی اس دنیا میں وہ پھولوں جیسی
جیون بھول بھلیوں میں وہ رستوں جیسی
اجلی اجلی مہکی مہکی روشن روشن
میری سوچوں جیسی، میرے جذبوں جیسی
جھلمل جھلمل کرتی اترے دل آنگن میں
رات اندھیروں میں وہ چاند اجالوں جیسی
جاگتی آنکھوں سے بھی اس دیکھتے رہنا
وہ خوابوں میں آنے والی پریوں جیسی
لو برساتی دوپہروں میں اس کی یادیں
ٹھنڈی کرنوں جیسی، ہلکے رنگوں جیسی
اک چہرے کا لپکا میرے چاروں جانب
میں ہوں اور یہ دنیا ہے آئینوں جیسی

عطاء الحق قاسمی

O

جہاں بھی رہنا خوشبو بن کر رہنا بھول نہ جانا
دل بھی اِک چھوٹا سا گھر ہے اپنا بھول نہ جانا

من آنگن میں تیرے نام کا دیپ رہے گا روشن
جیون رستے بھول بھلیاں رستا بھول نہ جانا

پھولوں کی وادی سے گزریں تیرے گھر کے رستے
اُس کے ہاتھ میں ملنا یا نہ ملنا بھول نہ جانا

بھیگی آنکھوں، ہجر نصیبوں والا ایک مسافر
میرے سجناں، دیکھنا اس کو دیکھنا بھول نہ جانا

کڑی مسافت میں اِک پیڑ تمہاری راہ میں ہو گا
پیاس کے صحراؤں میں تم اِک دریا بھول نہ جانا

عطاء الحق قاسمی

O

مجھ کو خود سے بے خبر کرنے لگی ہے
کیسا جادو اِک نظر کرنے لگی ہے

باغ کی جانب کھلی سب کھڑکیوں کو
ایک لڑکی بے بصر کرنے لگی ہے

قید ہوتا جا رہا ہوں دائروں میں
فاصلے وہ مختصر کرنے لگی ہے

ایک نقطے میں سمٹتا جا رہا ہوں
یہ خلش پھر در بدر کرنے لگی ہے

لوریاں دیتا ہوں اپنی آگہی کو
شاخ خود کو بے ثمر کرنے لگی ہے

عکس تو سارے ہیں گدلے پانیوں میں
زندگی اُجلے سفر کرنے لگی ہے

سیّد نظر زیدی

ہر ذرّے کے دل میں ہے کہ صحرا بن جائے
ہر قطرے کی آرزو ہے دریا بن جائے
دریا دل کے ارماں کیا ہے، کیا ہے صحرا کی طلب
یہ جان لے آدمی، تو جانے کیا کیا بن جائے

(۲)

یوں ہم سے ہے صبحِ گلستاں اُردو کی طرح
آ ہم کو سنوار اپنے گیسو کی طرح
اے جانِ بہار! ہم کو بارِ خاطر نہ سمجھ
ہیں تیرے چمن میں تیری خوشبو کی طرح

(۳)

مظلوم کے غم سے ہو جو سینہ پہ داغ
جل اُٹھتے ہیں دل میں علم و حکمت کے چراغ
ہے جوہرِ عقل دردمندی کا صلہ
یہ شمع جلے تو جگمگاتا ہے دماغ!

(۴)

کانٹے ہیں بُرے خیال، دامنِ دل میں نہ رکھ
زنہار! اس برق کو خرمنِ دل میں نہ رکھ
خود تیرا نشیمن زخم زخم ہو جائے گا
پھولوں کے سوا کچھ اور گلشنِ دل میں نہ رکھ

ڈاکٹر وحید قریشی

میرزا ادیب

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب "ادبِ لطیف" کا دفتر شیخ نقی کی عمارت واقع سرکلر روڈ کی دوسری منزل میں قائم تھا۔ اس عمارت کی ایک دکان میں "سویرا" کا دفتر اور "نیا ادارہ" کی مطبوعات آج بھی موجود ہیں۔

اس دفتر میں میں نے کئی سال تک پرچے کے ادارتی فرائض انجام دیئے تھے۔ یہاں ہر روز فعال اور غیر فعال ادیبوں کی موجودگی سے رونق رہتی تھی۔ بعض احباب تو روزانہ ہی آتے تھے اور بعض کبھی کبھی۔ ان کبھی کبھی آنے والوں میں سید امجد الطاف بھی شامل تھے۔

جی ہاں سید امجد الطاف جو ایک مدت سے اردو دائرہ علوم اسلامیہ کے شعبے میں کام کر رہے ہیں۔ مگر میں یہ عرض کر دوں کہ اس زمانے کے سید امجد الطاف اور آج کے سید امجد الطاف میں گو کوئی خاص اور نمایاں فرق نہیں ہے تاہم کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔

وہ دور اُن کی جوانی کا دور تھا۔ چھریرا بدن، رنگ سرخ و سفید، ہنس مکھ اور قہقہہ باز۔ وہ آج بھی ہنس مکھ، بذلہ سنج، حاضر جواب، اور قہقہہ باز ہیں مگر ایک تو مائل بہ فربہی ہیں بلکہ اچھے خاصے معتبر قسم کے فربہ ہو چکے ہیں، اور دوسرا فرق یہ ہے کہ آج کل ان کے نورانی چہرے پر ایک نورانی داڑھی بھی سج گئی ہے۔ ایک اور فرق بھی ہے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے شاعر بھی ہو گئے ہیں اور سنا گیا ہے کہ مستقبل قریب میں ان کا مجموعۂ کلام بھی منظرِ عام پر آجائے گا

ایک روز میں دفتر میں تنہا بیٹھا تھا کہ سید صاحب طلوع ہوئے اور بجائے اس کے کہ سلام کے بعد کوئی فقرہ چست کریں، فرش پر کھڑے ہو کر ایک تاریخی فلم کے حاجب کی طرح بہ آوازِ بلند اعلان کرنے لگے

"نگاہ روبرو، باادب، باملاحظہ ہوشیار، اُردو ادب کے رستم زماں تشریف لاتے ہیں۔ ایں!"

میں ان کی اس ادا پر ایک دم پریشان ہو گیا۔ اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی کیوں لگا جیسے بھونچال آگیا ہے۔ دھک دھک دھک دھک۔

کیا امجد الطاف بھونچال سے آگاہ کرنے آئے ہیں مگر... اُردو ادب کے۔ رستم زماں

لیکا یک دفتر کے دروازے پر ایک پہاڑ سی چیز نمودار ہو گئی۔ یا اللہ خیر! میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اور دوسرے لمحے میں کم از کم تین آدمیوں کے برابر ایک انسانی وجود ہانپتا ہوا اندر آ گیا۔ اپنی کرسی سے الگ تو میں اُسی وقت ہو گیا تھا جب امجد الطاف نے رستمِ زماں کی آمد کا اعلان کیا تھا اور اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

"میرزا صاحب! ہوش و حواس تو قائم ہیں؟" سید صاحب مسکرا کے پوچھ رہے تھے۔

"جی ہاں۔ آج تو آپ نے کمال کر دیا ہے" میں نے جواب دیا۔

"میں نے جو کمال کیا ہے سو کیا ہی ہے۔ کم کمال آپ بھی نہیں کر رہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی آئے ہیں اور" میں نے مرعوب لہجے میں ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تشریف رکھیے جناب!"

اور انھوں نے تشریف رکھ دی

یہ تھی ڈاکٹر وحید قریشی سے میری پہلی ملاقات کی روداد۔

ڈاکٹر صاحب سے دوسری ملاقات اُن کے آبائی شہر گوجرانوالہ میں ہوئی۔

میں عالم اردو کے ایک پرچے کا ممتحن تھا۔ میرے ممتحنِ اعلیٰ گوجرانوالہ میں رہتے تھے نام ان کا صوفی جمال اللہ تھا۔ میں ریل کے ذریعے پرچے ان کی خدمت میں بھیج سکتا تھا لیکن چاہا کہ خود چلا جاؤں۔ خیال رہے کہ اس وقت تک گوجرانوالہ جانے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔

پرچے ممتحنِ اعلیٰ کے حوالے کیے۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا۔ اُٹھنے لگا تو جی میں آئی کہ ڈاکٹر وحید قریشی بھی گوجرانوالہ میں رہتے ہیں۔ ان سے بھی ملتا چلوں۔

اُن صاحب سے ڈاکٹر صاحب کا پتا پوچھا۔

"ارے صاحب! وہ تو خود گوجرانوالہ ہیں۔ ان کا کیا پتا پوچھتے ہیں؟"

یوں کہا جیسے وہ صاحب امجد الطاف کی طرح فرما رہے ہیں۔

"باادب، باملاحظہ ہوشیار! گوجرانوالہ تشریف لاتے ہیں۔ ایں۔"

وہ مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھ رہے تھے اور میں یقیناً حیرت سے ان کو تک رہا ہوا تھا۔

انھوں نے شاید میری حیرت کو زیادہ امتحان لینا مناسب نہ سمجھا اور اپنے نواسے کو میرے ساتھ بھیج دیا کہ مجھے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے گھر تک پہنچا دے۔

"آپ ہی نیّر صاحب ہیں؟"

"جی ہاں، آ گیا ہوں۔"

"اب آ ہی گئے ہیں تو آپ کو واپس نہیں بھیجا جائے گا"

"میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ مسکراہٹ کافی معنی خیز تھی۔ جیسے اس میں کوئی شرارت چھپی ہوئی ہے۔

وہ اندر چلے اور میں بھی ان کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانے لگا۔ اندر آ گئے تو انہوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے دوسری کرسی اپنے لیے مخصوص کر لی۔

"تو کہیے کیا احوال ہیں؟" ان کی آواز پر ایک خاص رنگ کا گمان ہوتا تھا

"جی ٹھیک ہوں۔"

"کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی یہاں آنے میں؟"

"جی نہیں۔ آپ تو ماشاءاللہ خود گوجرانوالہ ہیں؟"

ان کی مسکراہٹوں میں سنجیدگی سی ابھر آئی۔

"میں گوجرانوالہ ہوں۔ کس نے بتایا آپ کو؟" انہوں نے بڑے غور سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جمال صاحب نے۔"

"میں گوجرانوالہ ہوں تو وہ خود کیا ہیں۔ ہیں" اور ان کا ضخیم چہرہ ایک بلند قہقہے کی لہر میں تیرنے لگا۔

"میں نے پہلی مرتبہ گوجرانوالہ دیکھا ہے۔" میں اُن کے بلند قہقہے سے پریشان سا ہو گیا۔

"تو کیسا پایا؟"

"شہر چھوٹا ہے لوگ زیادہ ہیں۔"

انہوں نے ہنستے ہوئے اس زور سے کہا گویا میں بہرہ ہوں۔

"گوجرانوالہ پہلوانوں کا شہر ہے۔"

وہ جب یہ الفاظ کہہ رہے تھے تو مجھے وہ واقعی خود ایک پہلوان دکھائی دے رہے تھے جو ابھی ابھی اکھاڑے سے باہر نکلا ہو۔

باتیں ہوتی رہیں۔ ادب کی، ادبِ لطیف کی۔ وہ ہر بات کے خاتمے پر مختلف سائز کے قہقہے بکھیرتے

رہے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ ساڑھے بارہ بج گئے تھے۔ میری انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ نکلوں جلدی یہاں سے اور کہیں سے پاؤ ڈیڑھ پاؤ دودھ ہی پی لوں۔ میں بھاگنے کی تدبیر سوچ رہا تھا کہ بولے

"کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

میں نے از راہِ تکلف کہا

"مجھے اجازت دیجیے۔ شکریہ۔"

انہوں نے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کھانا نہیں کھائیں گے؟"

میں نے رسماً معذرت کی تو پہلے ایک شاندار قہقہہ لگایا پھر کہنے لگے۔

"کھانا صرف آپ کے لیے نہیں ہے۔ میرے لیے بھی ہے۔ آپ میرے ساتھ ماحضر تناول فرمائیے۔"

اور وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے جانے پر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ فرنیچر قیمتی نہیں تھا مگر ہر چیز بڑے سلیقے سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ چیزوں کی مجموعی ترتیب سے ذہن میں اہلِ خانہ کی نفاست پسندی کا احساس جاگ اٹھا تھا۔

میری نظریں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب واپس آ گئے۔

"آئیے"

اور وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ یہ کمرہ بھی پہلے کمرے کا تاثر دے رہا تھا۔ کمرے کے وسط میں ٹیبل اور اس پر کھانے کے برتن سلیقہ مندی سے رکھے ہوئے۔

وہاں روٹیاں تھیں۔ سالن کے دو ڈونگے تھے۔ چٹنی، اچار تھا۔ ان کے علاوہ کٹے ہوئے ٹماٹروں کی ایک پوری پلیٹ بھری ہوئی تھی۔ ٹماٹروں کی یہ پلیٹ سب سے نمایاں تھی اور میں نے سوچا جب ہر شے ایک معقول مقدار میں نظر آ رہی ہے تو یہ بے ہنگم پلیٹ کیوں۔ اس نے تو حسنِ ترتیب کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے مگر کھانا شروع کیا تو یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہر لقمے کے ساتھ کم از کم دو ٹماٹر منہ میں ڈالنے لگے۔ کھانے کی میز پر جب تک میرے اور ان کے ہاتھ حرکت کرتے رہے انہوں نے لقموں اور ٹماٹروں کا توازن برقرار رکھا۔ اور کھانا ختم ہوا تو باقی ساری چیزوں کے باقیات الصالحات موجود تھے لیکن ٹماٹروں کی پلیٹ مکمل طور پر خالی ہو چکی تھی اور یہ عرض کر دوں کہ میں نے ان کی بے تحاشا ٹماٹر خوری دیکھ کر اور خوفزدہ ہو کر ٹماٹر کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی طرف بھی ہاتھ بڑھانے کی جرأت نہیں کی تھی۔

جب میرے اور ڈاکٹر صاحب کے دوستانہ روابط بڑھ گئے اور ہمیں کئی بار چائے یا کھانے کی میز پر بیٹھنے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ صرف خوش خوراک ہی نہیں کثیر خوراک بھی ہیں۔ اپنے کسی کام میں کتنے بھی مصروف کیوں نہ ہوں اور کتنے بھی انہماک سے بحث میں حصّہ کیوں نہ لے رہے ہوں ماکولات و مشروبات سے غافل نہیں ہوتے۔ اگر دوسرے ایک بسکٹ کھاتے ہیں تو یہ دو تین سے کم پر قانع نہیں ہوتے۔ ابھی دوسروں کے ہاتھ ایک ایک بسکٹ ہی کی طرف بڑھتے ہیں کہ وہ دو بسکٹ منہ میں ڈال چکے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آئے دن کسی نہ کسی بہانے احباب کی تواضع کرتے رہتے ہیں۔ کوئی صاحب کہیں باہر سے ملنے کے لیے آجائیں تو ان سے ابتدائی اور رسمی گفتگو کے فوراً بعد چپڑاسی کو آرڈر مل جائے گا کہ فلاں فلاں چیزیں فلاں بیکری سے لے آؤ۔ اسی اثنا میں جو صاحب بھی کسی کام کی غرض سے آئیں گے ڈاکٹر صاحب انہیں باصرار بٹھا لیں گے۔ کسی صورت بھی انہیں جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔

ویسے تو ڈاکٹر صاحب کا موٹو ہے "کھاؤ اور کھلاؤ" مگر کبھی کبھی وہ پہلی شق پر عمل نہیں کر سکتے یا یوں کہیے کہ پوری طرح عمل نہیں کر سکتے اور یہ وقت ہوتا ہے جب وہ علیل ہوں، مگر چیزیں منگوانے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایسے موقعے پر چائے کے ساتھ جو کچھ آئے گا اسے وہ لذّتِ کام و دہن کا ذریعہ نہیں بنائیں گے۔ اب معاملہ صرف آنکھوں کی سرگرمیوں تک رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی ہے تو ہوتی ہی رہے گی۔ ذرا ان کے خاندانی حالات پر نظر ڈالتے چلیں۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق صوفیہ کی اُس شاخ سے ہے جو بہت مدّت پہلے عرب سے واردِ ہند ہوئی تھی۔ ان کے ایک بزرگ شاہ جمال اپنے دور کے بڑے معروف صوفی تھے۔ گوجرانوالہ میں ان کی گدّی بھی ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے بزرگوں نے ادھر توجہ نہیں کی۔ نتیجتہً یہ گدّی ان کے دُور کے رشتہ داروں میں چلی گئی۔ اور اس کا افسوس نہ تو ڈاکٹر صاحب کے بزرگوں کو ہوا تھا اور نہ خود ڈاکٹر صاحب نے اس معاملے کو کبھی اہمیت دی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے نانا چالیس برس تک گوجرانوالہ میونسپلٹی میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ یہ ایک قابلِ رشک اعزاز ہے جو ان کے نانا کو حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پردادا پینتیس برس تک تحصیلدار رہے۔ والدِ گرامی محمد لطیف قریشی سب انسپکٹر پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور اب سارا وقت گھر میں گزارتے ہیں۔

کہاں میونسپلٹی کی سپرنٹنڈنٹی۔ کہاں تحصیلداری اور کہاں محکمہ پولیس کی افسری۔ ڈاکٹر صاحب

کہ ڈاکٹر صاحب کو عموماً کچھ نہیں بھولتا۔

کلرک ان کے سامنے کاغذ ہاتھ میں لیے، حیران و پریشان کھڑا ہے۔ اسے موجودہ مسئلے کا "سیاق و سباق" معلوم نہیں۔ کبھی سر کھجلانے لگتا ہے اور کبھی یونہی کاغذوں پر نظریں ڈالنے لگتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ بڑے مزے سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ مسکرا رہے ہیں۔ فقرے چست کر رہے ہیں۔

"کچھ پتا چلا۔ ہیں؟"

کلرک نفی میں سر ہلا دیتا ہے۔

"جاؤ۔ نیلے رنگ کی فائل دیکھو۔ سب سے نیچے ہوگی۔"

ڈاکٹر صاحب کلرک کی پریشانی کا پورا پورا لطف اٹھانے کے بعد اسے ہدایت دے دیتے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کے حافظے کی بے پناہی پر حیرت ہوتی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ فلاں کیس کے کاغذات کس فائل میں محفوظ ہیں۔ اور کونسی فائل کس الماری میں بند ہے۔ نہ صرف انہیں تمام فائلوں کا علم ہے بلکہ کلرکوں کی ذاتیات سے بھی خوب واقف ہیں۔ مثلاً اگر کوئی کلرک مطلوبہ کاغذ لانے میں تاخیر کردے تو وہ بتا دیں گے۔ یہ حضرت فلاں کمرے میں فلاں صاحب سے گفتگو کر رہے ہیں۔ یا فلاں جگہ چائے پی رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا حافظہ صرف تیز ہی نہیں، "ہمہ گیر" بھی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں کے ہجوم میں وہ کسی کتاب کے مطالعے کے لیے دن کو وقت نہیں نکال سکتے تاہم رات کو ۹ بجے سے گیارہ بجے تک پڑھتے رہتے ہیں۔ کوئی کتاب اگر پندرہ سال پہلے بھی ان کی نظروں سے گزر چکی ہے تو انہیں دوبارہ اس کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں ہے۔

اپنے تعلیمی زمانے میں وہ بہت کچھ پڑھ چکے ہیں۔ اور یہ سب کچھ انہیں یاد ہے۔ کوئی محقق اپنے کسی مقالے میں کوئی گھپلا کر دے تو ڈاکٹر صاحب کی نظروں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

ایک تو حافظے کی تیزی اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ان کے ذخیرہ کتب میں ہر قسم کی کتاب ہے کتابیں جمع کرتے چلے آئے ہیں۔ میں یہ ذخیرہ دیکھ چکا ہوں۔ پورے دو کمرے کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں ان کا یہ ذخیرۂ کتب عام لائبریری سے کسی صورت بھی کم تر نہیں ہے۔

ان کتابوں کی بہت حفاظت کرتے ہیں۔ اس ذخیرے سے نکالا بہت کم جاتا ہے، اضافہ برابر ہوتا رہتا ہے۔

عام طور پر اپنی کتاب کسی کو نہیں دیتے۔ کوئی بہت اصرار کرے تو چند روز کے لیے مستعار دے دیتے ہیں۔ مگر بڑی احتیاط کے ساتھ، بڑے عہد و پیمان لے کر۔

ایک طالبہ ان کی زیر نگرانی تھیسس لکھ رہی تھی۔ اسے کسی کتاب کی اشد ضرورت تھی اور اسے معلوم تھا کہ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے پاس ہے۔ ان کے پاس آئی۔

" سر مجھے یہ کتاب چاہیئے۔ "

" یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری کا راستہ بھول گئی ہو؟ "

" جی نہیں۔ دونوں لائبریریاں دیکھ چکی ہوں۔ ان میں یہ کتاب نہیں ہے۔ ایشو ہو چکی ہے۔ "

" انتظار کرو۔ "

" سر آپ دے دیں۔ "

" نہیں بیٹی، میں تمہیں اپنی کتاب ہرگز نہیں دوں گا۔ "

" سر یہ کیوں۔ "

" یاد ہے تم نے ایک کتاب مجھ سے لی تھی ۔۔ اور لوٹائی تھی تو اس کی جلد خراب کر دی تھی۔ میں اب اس تجربے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ "

مجھے یاد نہیں کہ مطلوبہ کتاب ڈاکٹر صاحب نے طالبہ کو دی ہو۔

مجھے محمد عمر نورالٰہی کی تالیف "ناٹک ساگر" کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے گھر سے لا کر دے تو دی مگر ایک ہفتے کے بعد ہر روز کتاب کی واپسی کا اصرار ہونے لگا تو میں نے اپنی بہتری اسی میں سمجھی کہ خاموشی سے کتاب واپس کر دوں۔ کتاب واپس کی تو ڈاکٹر صاحب نے اس کا پوری طرح جائزہ لیا کہیں بے احتیاطی سے تو نہیں پڑھی گئی۔ جب اطمینان ہو گیا تو اسے اپنے بریف کیس میں رکھ کر پوچھا۔

" میری کوئی اور کتاب تو آپ کے پاس نہیں ہے؟ "

میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ دیئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کنکھیوں سے میری یہ حرکت ملاحظہ فرمائی اور کاغذوں پر دستخط کرنے لگے۔

وہ بڑی محبت، شفقت اور دلچسپی سے اپنے شاگردوں کی مدد کرتے ہیں۔ ان کی مشکلات دُور کر دیتے ہیں۔ انہیں کتابوں کی ضرورت ہو تو یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیتے ہیں۔ اپنی ذاتی لائبریری کا راستہ نہیں بتاتے۔

کسی سے کوئی کتب مستعار لیتے ہیں تو اُن کے ہاتھ ایک سستا نسخہ آ گیا ہے۔ کتاب کے اہم

حصّوں کی فوٹوسٹیٹ کاپی نکلوالیتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو پوری کی پوری کتاب کی نقل کروالیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے میرے توسط سے مرحوم بذلِ حق محمود سے ایک نہایت نادر قلمی نسخہ حاصل کیا۔ بذلے کتاب دینے کے معاملے میں ڈاکٹر صاحب سے بھی دو قدم آگے تھے۔ صرف تین دن کے وعدے پر کتاب دی۔ اب ڈاکٹر صاحب ہیں کہ کتاب واپس کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ میں پوچھتا تو کہہ دیتے " رات طبیعت بڑی خراب ہوگئی تھی سو نہ سکا۔ صبح افراتفری میں کالج آگیا ہوں " بیماری کا بہانہ ایک دن چلا، دوسرے روز کوئی اور بہانہ۔ ہر روز نئے سے نئے بہانے سے مجھے ٹرخایا جانے لگا۔ آخر کتاب اس وقت ملی جب ڈاکٹر صاحب پوری کتاب کی فوٹوسٹیٹ نقل کروا چکے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابیں جمع کرنے کی حرص کبھی کم نہیں ہوتی۔ آئے دن کتابیں آتی رہتی ہیں اور ان کی ذاتی لائبریری میں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ انھیں میری اس کمزوری کا علم ہے کہ کوئی اچھی کتاب دیکھ لیتا ہوں تو ان سے فوراً مانگ لیتا ہوں۔ ادھر ڈاکٹر صاحب بھی بڑے کائیاں ہیں۔ کتابیں کہیں سے آتی ہیں تو میرے پوچھے بغیر کہہ دیتے ہیں۔

" کالج لائبریری کی ہیں — یا لائبریری سے ایک دوست کے لیے اشو کروائی ہیں" اور اسی وقت چپڑاسی کو بلاکر ساری کتابیں الماری میں بند کروا دیتے ہیں۔

ہندوستان سے مالک رام کی نئی کتاب آئی اور میں نے جھپٹنے کی کوشش کی تو کہنے لگے۔

" میری نہیں ہے مشفق خواجہ کو بھجوانی ہے۔"

اور دوسرے روز میں نے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ خود مشفق خواجہ نے انہیں یہ کتاب بھجوائی تھی۔

یہ معاملہ صرف کتابوں تک محدود نہیں۔ جو کام وہ کرنا پسند نہیں کرتے وہ نہیں کریں گے۔ ان کا عزیز سے عزیز دوست بھی ان سے وہ کام نہیں کروا سکتا۔ مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر وحید قریشی ملنے کے بادشاہ ہیں۔ میں کہتا ہوں بادشاہ نہیں شہنشاہ ہیں۔

⁘

ڈاکٹر صاحب اس اعتبار سے بڑے خوش قسمت انسان ہیں کہ انہیں ایسے استادوں سے کسب فیض کا موقع ملا جن میں سے ہر ایک یگانۂ روزگار ہے۔ مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر سید عابد علی عابد اور ڈاکٹر سید عبداللہ۔

ڈاکٹر صاحب نے صحبت کی طرح ہر ایک استاد سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی سے انھوں نے بال کی کھال نکالنے کا فن سیکھا ہے۔ تحقیقی معاملات میں وہ بال کی کھال بھی نکالتے

ہیں اور کبھی کسی کھال کا ایک ایک بال بھی الگ کر دکھاتے ہیں۔ مؤخرالذکر صورت اس وقت پیش آتی ہے جب وہ کسی کے بخیے ادھیڑنا شروع کر دیں۔ جب وہ اپنے حریف کی کھال کے بال نوچتے ہیں تو وہ بے چارا تلملا کر رہ جاتا ہے۔

میری دانست میں ڈاکٹر صاحب نے حافظ محمود شیرانی سے نہ صرف وہ فن سیکھا ہے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے بلکہ اسلوب بھی سیکھا ہے۔ حافظ صاحب کی ژرف نگاہی اور وقتِ نظر سے انکار ممکن ہی نہیں۔ لیکن وہ صرف محقق ہی نہیں، صاحبِ طرز ادیب بھی ہیں۔ ان کا اسلوب بڑا شگفتہ ہوتا ہے۔ بہت خوبصورت اور دلآویز۔ ہمارے اکثر محققین کی تحریر کڑوی کسیلی گولی ہوتی ہے جسے حلق سے نیچے اتارنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ مگر حافظ صاحب میں یہ خوبی ہے کہ وہ خشک سے خشک مباحث کو بھی بڑے دلنشیں انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ شاعر بھی تھے۔ ٹیپو سلطان پران کی نظم ایک یادگار نظم ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں بھی یہی اسلوبی خصوصیت نمایاں ہے۔ غالباً یہاں بھی یہ کہا جائے گا کہ ڈاکٹر صاحب شاعر ہیں۔ کیا شاعر ہونے سے نثری اسلوب شاعرانہ ہو جاتا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے مگر ہر جگہ نہیں۔ محمد حسن عسکری شاعر نہیں تھے لیکن کتنے خوبصورت اسلوب کے مالک ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ شاعر ہونا اور شعریت بر تنا لازم و ملزوم ہیں بھی اور نہیں بھی۔ حافظ صاحب نے اپنی زندگی کے ایک مختصر سے حصّے میں شاعری کی تھی۔ اور میں ان کی صرف دو ہی نظمیں دیکھ سکا ہوں۔ سلطان ٹیپو اور کلکتے کا میوزیم۔ ممکن ہے انہوں نے اور بھی کچھ کہا ہو۔ نثر انہوں نے آخر تک لکھی ہے اور بے تکان لکھتے چلے گئے۔ ان کی نثری شعریت ان کے شاعر ہونے کی محتاج نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت کم شاعری کی ہے۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی شعر کہہ دیتے ہیں۔ نظم کم اور غزل زیادہ کہتے ہیں۔ تاہم یہاں بھی مجھے وہی کچھ کہنا ہے جو حافظ صاحب کے ضمن میں کہہ چکا ہوں۔

مرحوم شفیع ایک متبحّر عالم تھے۔ مگر کم آمیز۔ استادی شاگردی کے معاملے میں مشرقی روایات پر سختی کے ساتھ کاربند۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی صحبت میں بیٹھ کر علم کا بے پایاں شوق پایا مگر جہاں تک ان کی دوسری خصوصیات کا تعلق ہے وہ ان سے بے بہرہ ہی رہے۔ سیّد عابد علی عابد شعر فہمی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ خوش مزاج تھے۔ اپنے شاگردوں سے گھل مل جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اس استاد کی بذلہ سنجی سے متاثر ہوئے ہوں گے اور ان کے ذوقِ شعر فہمی سے بھی۔ اپنے جس استاد سے وہ نہایت درجہ متاثر ہوئے ہیں وہ ہیں ڈاکٹر سیّد عبداللہ۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ روایتاً مشرقی استاد ہیں۔ مگر اپنے شاگردوں سے پُر تکلّف سلوک روا رکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔ جب پڑھاتے تھے تو کلاس میں بذلہ سنجی سے بھی کام لیتے تھے اور شاگردوں کو لطیفے

سب سے بڑی خوبی جو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار سے مخصوص ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے ایک ایک طالب علم اور طالبہ کے نام اور شکل سے واقف ہوتے ہیں۔ دوسرے پروفیسروں کے لیکچر کے وقت تو کوئی طالب علم بالخصوص کوئی طالبہ بڑی آسانی اور سہولت سے کسی کلاس فیلو کا رول نمبر پکارے جانے پر حاضری لگوا دیتی ہے مگر ڈاکٹر کی کلاس میں یہ ممکن نہیں۔

ایک بار ایک طالبہ نے۔ فرض کیجئے اس کا نام عائشہ ہے۔ اپنی سہیلی شاہدہ کی بھی حاضری بول دی۔

ڈاکٹر صاحب جب ساری کلاس کی حاضری لگا چکے تو مسکرا کر بولے۔

" امیر خسرو کا ایک شعر سنا ہے جس کے ایک مصرعے کے الفاظ ہیں "من تو شدم تو من شدی" آج معلوم ہوا یہ بات ٹھیک ہے کہ ایک ہستی میں دوسری ہستی بھی گم ہو سکتی ہے؟"

کلاس شور مچانے لگی " یہ کیسے سر؟"

ڈاکٹر صاحب چند لمحے مسکرانے کے بعد بولے

" دیکھئے نا۔ میں سمجھتا تھا کہ عائشہ تنہا ایک لڑکی ہے۔ لیکن آج معلوم ہوا ہے کہ اس کی سہیلی شاہدہ بھی اس میں رچ بس گئی ہے۔"

قہقہوں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اور بے چاری عائشہ کی جو حالت ہوئی وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔

لگتا ہے جب ڈاکٹر صاحب کلاس میں جاتے ہیں تو اپنی پوری کلاس کو نظروں کے جال میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ کیا مجال جو کلاس میں کوئی حرکت ہو اور اس کی خبر انہیں نہ ہو سکے۔ مگر کلاس کے اندر کسی کو ڈانٹتے ڈپٹتے نہیں۔ کوئی بلی کی آواز نکال دے تو بس یہ کہیں گے۔

" آج ہمارے ہاں ایک بلی بھی آگئی ہے۔ ہماری مہمان ہے۔ ہم اس کا احترام کریں گے۔"

کلاس اس واقعے کو کوئی اہمیت نہیں دے گی۔ مگر دوسرے روز ڈاکٹر صاحب کا چپڑاسی ہاتھ میں ایک رقعہ لے کر ادھر اُدھر گھومتا ملے گا۔ وہ ایک خاص لڑکے کی تلاش میں ہو گا۔

وہ لڑکا نظر آجائے گا تو رقعہ اس کے حوالے کر دے گا۔ اس رقعے کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے اسے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔

لڑکا پہنچے گا تو ڈاکٹر صاحب اکیلے بیٹھے ہیں۔

" آیئے۔ تشریف رکھئے۔ معاف کیجئے میں آپ کی خاطر تواضع نہیں کر سکتا۔ چائے پیش کر سکتا ہوں مگر آپ کی خوراک تو چھیچھڑے ہیں جو میں لا نہیں سکا۔

وائے پر ون پانی چڑھاتا ہے۔ اس کی یہ حالت ہے اور ادھر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ فقرے پر فقرہ کستے چلے جاتے ہیں۔ اور آخر میں بڑی سنجیدگی سے کہتے ہیں۔

"جائیے۔ تشریف لے جائیے۔ مَیں جانتا ہوں آپ کی رگوں میں ایک شریف انسان کا خون گردش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے انسانی شریف خون بلّی کا خون نہیں ہو سکتا۔"

ڈاکٹر صاحب کسی کو بھی اس خفیف الحرکتی پر معاف نہیں کرتے۔ اس کے باوجود وہ کالج کے سب سے مقبول بلکہ محبوب، استاد سمجھے جاتے ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے شاگردوں سے بڑی محبت ہے۔ شاگرد کی ہر مشکل دُور کرنا اپنا ذاتی فریضہ سمجھتے ہیں۔

اپنے کمرے میں احباب کے ساتھ بیٹھے ہوں اور خواہ کتنی بھی پُر تکلف گفتگو ہو رہی ہو، جہاں کسی شاگرد نے ایک لمحے کے لیے اندر جھانکا اور ان کی نظر اس پر پڑ گئی تو فوراً بول اُٹھے۔

"آؤ بیٹا — یا آؤ بیٹی"

اب سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کریں گے۔ اور جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، محفل پر سکوت طاری رہے گا۔

❖

ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر ایک معلّم ہیں، مگر انہوں نے معلّمانہ دائرے میں رہ کر بھی بہت کام کیا ہے۔ انہوں نے مجلس ترقی ادب، کے علمی مجلّے صحیفہ کی ۱۴ برس تک ادارت کی ہے۔ اس وقت تک یہ ایک ادبی پرچے کی حیثیت سے شائع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے علمی جریدے کی حیثیت دے دی اور اتنی ہی لمبی مدت تک اس کی ادارت کی۔ انہوں نے "صحیفہ" کے کچھ بہت معرکے کے نمبر نکالے۔ غالب نمبر ۵ خاص نمبر، تاج نمبر، عابد نمبر، دس سالہ نمبر، حالی نمبر۔

رائٹرز گلڈ کے صوبائی سیکرٹری کا عہدہ سنبھالا تو اپنی مختصر مدتِ نظامت میں گلڈ کے دفتر کے لیے آہنی الماریاں مہیا کیں۔ وہ زمانہ پاک و ہند کی جنگ کا تھا۔ فضا میں قومی ترانے مسلسل بلند ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جہاں بیسیوں ترانے نصف درجن کے قریب کتابچوں میں محفوظ کر دیے وہاں نثری مضامین کو بھی شامل کر لیا۔ نظم و نثر کے ان مجموعوں کی اس اعتبار سے بڑی اہمیت ہے کہ ایک تو ان میں اچھی تحریروں کا انتخاب درج ہو گیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ قابل قدر کام پاکستان کے مصنفین کی ایک نمائندہ تنظیم نے سرانجام دیا تھا۔

❖

۔۔۔۔۔۔ ہے ایک پیرہم جد وجہد کی۔ کامرانیوں کی، منصبی ترقیوں کی اور فتح یابیوں کی۔ یہ نہیں کہ انہیں اپنی زندگی میں صرف کامیابیاں ہی حاصل ہوئی ہوں اور ناکامی نے ان پر کبھی اپنا سایہ نہ ڈالا ہو۔ اس دنیا میں کسی شخص کی زندگی بھی "نغمۂ عشرت" نہیں بن سکتی۔ اگر سحر تک شمع ہر رنگ میں جلتی ہے تو زندگی کے چراغ کی لو آندھی کے کسی نہ کسی جھونکے سے کیوں نہیں لرزے گی؟ ڈاکٹر صاحب بھی اس معاملے میں استثنائی حیثیت نہیں رکھتے۔

وہ ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ ہنستے رہتے ہیں۔ فقرہ بازی سے کبھی باز آتے ہی نہیں۔ خوش مزاجی شگفتہ طبعی اور حاضر جوابی ان کا "پیرایۂ حیات" ہے۔ اور ان کے اکثر احباب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ شخص بہت خوش نصیب ہے کہ اسے کبھی غم، محرومی یا شکست سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ یہ محض خوش فہمی ہے۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود اور طبعی طور پر شگفتہ مزاج ہونے کے باوصف وہ بھی اَن گنت کرب آفریں لمحے گزار چکے ہیں۔ انہیں محرومی کا شکار بھی ہونا پڑا ہے اور ان کا ذہن شکست سے بھی آشنا ہو چکا ہے۔

ان کی سب سے بڑی محرومی — خوشگوار صحت سے محرومی ہے۔ ان کی فربہی ان کے لیے متعدد عوارض لے آئی ہے۔ بلڈ پریشر، ضیقِ تنفس — وہ دمے کے مریض ہیں — اور جب ان پر اس کا دورہ پڑتا ہے تو وہ بے حال ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو جلد اور بعض اوقات دیر سے ان کا سانس درست ہوتا ہے اور وہ بات کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

تنفس کی تکلیف غالباً دنیا کی سب سے بڑی تکلیف ہے۔ انسان ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔ اگر اسے مرگِ مسلسل کہا جائے تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب ایک وفد کے ساتھ دورۂ چین پہ گئے تھے۔ واپسی پر انہوں نے اُردو ڈائجسٹ میں اپنے سفر کی روداد لکھنی شروع کی۔ بہت دلچسپ تھی مگر اس روداد نگاری میں انہوں نے کچھ ایسی باتیں بھی لکھ دیں جو ایک رکنِ وفد کی طبیعت پر سخت گراں گزریں اور اس رکن نے اس معاملے کو ازالہ حیثیت عرفی تک پہنچا دیا۔ ڈاکٹر صاحب کو ڈائجسٹ میں ان صاحب سے معافی مانگنا پڑی۔ اس طرح جب گلڈ کی صوبائی مجلس عاملہ نے کثرتِ رائے سے ان کے خلاف عدمِ اعتماد کا اظہار کر دیا تو انہیں مستعفی ہونا پڑا۔ یہ بھی ان کی انا کی شکست تھی۔ ممکن ہے اس قسم کے اور واقعات بھی ہوں۔ لیکن بہر حال ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا — اگر فتح مندیوں کو انسانی زندگی پر حق حاصل ہے تو شکست کو کیوں نہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خنکی، فکر اور توازن

ذہنی اور تکمیلِ تجربہ کے لیے کبھی کبھی خونِ آرزو کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ آرزوؤں کی لالہ کاری سے اگر زندگی کے اُفق پر دھنک کا سماں پیدا ہو سکتا ہے تو شکست خوردہ آرزو کے لہو سے روانِ حیات رنگین بھی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی عظمتِ کردار یہ ہے کہ انہوں نے محرومیوں اور شکستوں کو بھی اسی خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے جس خندہ پیشانی سے وہ خوشیوں، کامیابیوں اور ظفر مندیوں کا استقبال کرتے رہے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔

وہ آج بھی پوری مستعدی، پوری ہمت و استقامت اور ان کے ساتھ ساتھ ذوقِ یقین سے زندگی کے میدان میں جہد آزما ہیں۔ قدم اُٹھا رہے ہیں۔ آگے ہی آگے۔ آگے ہی آگے۔

OO

اور مبارک احمد پر اس سے زیادہ جامع تبصرہ کیا ہو سکتا ہے کہ یہ

اس کی خالہ کا خدا حافظ ہے
جس کا خالو ہو مبارک احمد

مجھ کال کھاتے کی زبان سے یہ نکل گیا کہ انجم صاحب غالب کو جانے دیجیئے۔ آپ ہمارے زمانے کے مرزا سودا بن جائیے۔ صاحب ایس نے کیا غلط کہا۔ آج کے شہسواروں کے گھوڑوں کا حال بھی کم خستہ تو نہیں ہے بس اتنا ہی تو فرق ہے کہ مرزا سودا کے زمانے میں فاقوں کی وجہ سے ان میں ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی تھی ہمارے زمانے میں دانے کی افراط نے ان سے ہنہنانے کی طاقت چھینی۔ عجیب بات ہے کہ ہنہنانے کی طاقت دونوں ہی صورتوں میں سلب ہوتی ہے۔ فاقوں کی صورت میں بھی، بہت کھانے کی صورت میں بھی۔ خیر تو یہ کہنا غضب ہو گیا۔ انجم صاحب مجھ سے بدک گئے۔ انجم صاحب کو اکثر سایہ شاخ گل پر الفی کا گمان گزرا ہے میری بات سے وہ یہ سمجھے کہ میں انہیں راہ سے ہٹا کر ناصر کاظمی کے لیے رستہ صاف کر رہا ہوں۔

بس ایسے ہی اوہام ان کے مجموعۂ کلام کی اشاعت میں حارج ہوتے رہے۔ بیٹی کی شادی اور مجموعے کی اشاعت اپنے وقت پر ہو جانی چاہیئے مگر بعض مائیں چھانتی بہت ہیں۔ جو رشتہ آتا ہے اس میں نئی نکالتی ہیں۔ بس اسی میں بیٹی کی عمر بڑھ جاتی ہے اور پھر برادری کی بیبیاں کہتی ہیں کہ فلاں کی دھی تھک گئی ہے۔ اس کے بعد کوئی تھکا ہارا ہی اس کے ساتھ نکاح کے دو بول پڑھا کر گھر لے جائے تو اور بات ہے ورنہ رشتے آنے بند ہو جاتے ہیں انجم صاحب نے بھی اپنی خوبصورت شاعری کے ساتھ وہی کیا ہے جو بال کی کھال نکالنے والی مائیں اپنی چاند سی بیٹیوں کے ساتھ کرتی ہیں۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں انجم صاحب کی شاعری بھی تھک تو نہیں گئی۔ کم از کم انجم صاحب خود ضرور تھک گئے ہیں ان کے تھک جانے کا احساس مجھے یہ خبر سن کر ہوا کہ ہمارے بزرگ قیوم صاحب نے مسلم مسجد کے زیر سایہ جو حلقہ کھولا ہے اس میں انجم صاحب بھی پناہ گیر ہو گئے ہیں۔ میرا مطلب غلط نہ سمجھا جائے لازم نہیں کہ تھکے ہاروں کی آماجگاہ میں ہر پناہ لینے والا تھکا ہارا سمجھا جائے میں تو اس طرح سے سوچ رہا ہوں کہ انجم صاحب کے حلقے میں عمر بھر جن سے نبرد آزما رہے اب انہی کے ساتھ انہیں گزارا کرنا پڑ رہا ہے۔

ایک وقت وہ تھا کہ انجم صاحب کے حلقے کے اندر اور حلقے سے باہر ایک زمانے سے لڑائی مول لے رکھی تھی جب ترقی پسندوں کا زور تھا تو ایک ترقی پسند نے لال پیلی نظروں سے انہیں دیکھا اور کہا تم ہماری تحریک کو رن ڈاؤن کرتے ہو۔ انجم صاحب تنک کر بولے کہ تم کیا تمہاری تحریک کیا میں تو مارکس اور لینن کو رن ڈاؤن کرنے کو پھر رہا ہوں۔ مگر اب شائد انجم صاحب میں لڑنے اور ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی ہے ہے

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

انتہا سی انتہا اور خاک سے خاک کر انجم صاحب کو قیوم نظر کے ساتھ نباہ کرنا پڑ رہا ہے۔

○○

علاؤالدین کلیم

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

وہ ۲۶ اپریل ۱۹۶۵ء کی ایک دوپہر تھی۔ میں انارکلی سے گذر رہا تھا۔ اتنے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک پروفیسر پاس سے گذرتے ہوئے رکے اور مجھ سے یوں مخاطب ہوئے۔

"تمہیں معلوم ہو گیا ہے؟"

"میں اچانک سنجیدہ ہو گیا" نہیں تو۔ کیا بات ہے"؟

"علاؤالدین کلیم کا انتقال ہو گیا ہے۔"

خبر بڑی ہی اچانک۔ بڑی ہی حیران کن تھی اور موت کی خبر پر مجھے تو اس وقت تک یقین ہی نہیں آتا جب تک کسی کو سفید لٹھے کی چادر میں لپٹا ہوا نہ دیکھ لوں۔

میں نے کہا "اچانک کیا ہوا، وہ تو اچھے بھلے تھے۔"

"کثرت شراب نوشی سے جگر پھٹ گیا۔"

"جنازہ کس وقت ہے؟" پانچ بجے شام

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ کلیم گارڈن ٹاؤن میں رہتے تھے، لیکن گھر کا نمبر یا محل وقوع معلوم نہیں تھا اور معلوم بھی کیسے ہوتا! کلیم کسی کو گھر پر مدعو نہیں کرتے تھے۔ ممکن ہے اس کلیے کی مستثنیات بھی ہوں لیکن مدہوش اشخاص ہی کے لیے ہوتی ہوں گی۔ ایک دفعہ پروفیسر مرزا منور نے میری موجودگی میں کلیم سے کہا۔

"اپنے گھر کا نمبر بتا دیں۔ میں ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں۔ گارڈن ٹاؤن میرے راستے میں ہے کبھی حاضر ہو جاؤں گا۔"

کلیم نے انتہائی خشک لہجے میں جواب دیا "آپ آئیے، مگر خیال رہے کہ میں پانچ بجے گھر پہنچتا ہوں اور ۶ بجے کے بعد کسی سے نہیں ملتا۔" اتنی ہمت مجھ میں تو نہیں تھی کہ یہ گفتگو سن کر بھی ان کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔

غرض میں کلیم کے جنازے میں شرکت نہ کر سکا۔ لیکن دس سال تک میری یہ کیفیت رہی کہ جب بھی گارڈن ٹاؤن سے گذرتا، کلیم مجھے شدت سے یاد آجاتے۔ خدا جانے اس کا سبب کیا تھا۔ حالانکہ میں سمجھتا تھا کہ کلیم سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

شروع شروع میں وہ مجھے اچھے لگے پھر ان کے علم اور شخصیت کے بارے میں مجھے شبہات ہونے لگے اور آخر آخر میں ان سے بدظن ہو گیا۔ یہ تھی میرے ان کے تعلقات کی مختصر ترین تاریخ۔

یہ بات سنہ ۱۹۵۸ء کی ہے۔ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کا طالب علم تھا اور بی۔ اے کے ساتھ انگریزی آنرز بھی کر رہا تھا۔ انگریزی آنرز کی تیاری کے لیے رہنمائی درکار تھی۔ میرے بڑے بھائی نے مجھے بتایا کہ ان کے ایک سابق رفیق کار اور انگریزی کے استاد مظفر گڑھ سے تبدیل ہو کر انٹر کالج گلبرگ میں آگئے ہیں۔ میں ان سے رہنمائی لینے گیا۔ مین روڈ گلبرگ پر کافی تلاش کے بعد کوٹھی نما کالج کی عمارت میں داخل ہوا۔ سٹاف روم میں پہنچا تو خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک صاحب آہستہ آہستہ اور نپے تلے قدموں سے چلتے، انگلیوں سے بال سنوارتے ہوئے سٹاف روم میں داخل ہوئے۔ میری طرف متوجہ ہوئے بغیر رجسٹر وغیرہ سے میز پر رکھ دیا۔ چہرا ساتھ، جوانی ادھیڑ عمر کی طرف جاتی ہوئی، سوٹ فیشن کے برخلاف مگر قیمتی اور بالکل تازہ استری کیا ہوا۔ نظر کی عینک لگائے ہوئے جس کے شیشوں میں ہلکے نیلے رنگ کی جھلک، فریم سبک مگر قیمتی۔

میں نے پوچھا۔ پروفیسر چشتی صاحب کہاں ملیں گے؟ بولے۔ وہ آج چھٹی پر ہیں۔ بڑے بھائی سے میری مشابہت اور انداز تکلم میں یکسانیت کے سبب انہوں نے مجھے پہچان لیا۔

کہنے لگے۔ تم کبریا کے بھائی ہو۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ جب وہاں آنے کے سبب سے آگاہ ہوئے تو خود ہی میری ہلکی پھلکی رہنمائی کی۔ یہ علاؤ الدین کلیم سے میری پہلی ملاقات تھی۔

چند ماہ کے بعد میں ایک روز گورنمنٹ کالج لاہور کے ہال میں کالج کا ایک امتحان دے رہا تھا۔ اردو آپشنل کا پرچہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ نگران اساتذہ میں کلیم بھی موجود ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہو گیا ہے۔ پرچہ شروع ہوا، تین گھنٹے ختم ہوئے اور کسی نگران استاد نے پرچہ مجھ سے چھین لیا۔ میں پن وغیرہ سمیٹ کر اٹھا تو دیکھا کہ کلیم میرے پاس کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

کس مضمون کا پرچہ تھا؟

اردو آپشنل تھا۔

اس کے باوجود تم اتنی سنجیدگی سے لکھتے رہے اور تین گھنٹے سر تک نہ اٹھایا۔

چند ماہ کے بعد یہی ہال تھا اور کلیم تھے۔ میں ایم۔ اے انگریزی میں داخلے کا ٹیسٹ دے رہا تھا۔ تین سو لڑکے ٹیسٹ میں شریک ہوئے جن میں سے چالیس کامیاب قرار دیئے گئے۔ ان میں میں بھی شامل تھا لیکن میں نے ایم۔ اے (اردو) میں داخلے کو ترجیح دی اس پر بڑے بھائی ناخوش ہوئے اور کہنے لگے۔

" تم تو پرچہ دے کر چلے گئے۔ لیکن کلیم تمہاری خاطر شام تک بیٹھا رہا۔ کیونکہ پرچوں کے نمبر اسی شام کو لگ جانے تھے۔" مجھے بڑی ندامت ہوئی کچھ اپنی نالائقی کے خیال سے اور کچھ کلیم کے خلوص کی قدر نہ کرنے پر اگرچہ

میں بھی سمجھتا تھا کہ میرا رویہ خراب نہیں ہوا تھا۔ ہم نے چند دنوں بعد کلیم سے معذرت کی۔ آپ کو میری وجہ سے زحمت ہوئی جب کہ میں نے داخلہ بھی نہیں لیا۔ کوئی اور ہوتا تو کہتا مجھے تمہاری خاطر متعدد لوگوں کی منتیں کرنی پڑیں یا کم از کم یہ ضرور کہتا کہ میاں تم ہمارے عزیز اور دوست کے بھائی ہو۔ تمہاری خاطر اگر چند گھنٹے صرف بھی ہو گئے تو کیا ہوا۔ مگر کلیم نے کہا: تم نے بہت کچھ کیا ہوا تھا۔ مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا۔

میں اورینٹل کالج میں داخل ہو گیا۔ تنگ و تاریک سی عمارت، آدھے اساتذہ باریش، باقی آدھے شیروانی پہننے والے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی کشادہ فضا سے یہاں آ کر دل ہی نہیں لگتا تھا اور میں ہر روز پیریڈ پڑھ کر گورنمنٹ کالج چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی کلیم سے ملاقات ہو جاتی تو اس قسم کی گفتگو کرتے۔

تمہارے اساتذہ بہت نالائق ہیں۔ خود پڑھا کرو۔

بجا ارشاد فرمایا۔

تمہارے ایک استاد کی ایک انعام یافتہ کتاب میں پڑھنے کے لیے خرید لایا۔ لیکن پڑھ کر سخت غصہ آیا۔ بس جعفر علی اثر کے مضامین کو الٹ پھیر کر لکھ دیا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے کتاب کو زمین پر رکھ دیا اور زور سے ٹھوکر رسید کی۔

پھر ایک دفعہ یوں گویا ہوئے: "تمہارا فلاں فلاں استاد بھی اپنے آپ کو نقاد سمجھتا ہے۔ ایک مرتبہ اس کی ایک کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ معز طول کلامی کا بادشاہ ہے۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ کہنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو پھر بھی آٹھ آٹھ سو صفحے کس طرح سیاہ کیے جاتے ہیں۔

کلیم اس قسم کی گفتگو کرتے رہتے تھے۔ میں نے شاید ہی ان کی زبان سے کسی کے بارے میں کلمہ خیر سنا ہو۔ ان کی مردم بیزاری اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ ایک دن جب ہم چند لوگ کالج کی کینٹین میں بیٹھے تھے۔ مرزا محمد منور اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے غلطی سے ایک آدھ جملہ ان کی تعریف میں کہہ دیا۔

بولے: "آدمی تو ٹھیک ہی ہے لیکن جس طرح ہاتھ ہلا ہلا کر گفتگو کرتا ہے میرے لیے قابل برداشت نہیں۔"

اس سے یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ کلیم پیٹھ پیچھے اس قسم کی گفتگو کرتے تھے۔ وہ کسی کے روبرو بھی بے لحاظی کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور جو کچھ محسوس کرتے تھے اس کا اظہار بلا تکلف کر دیتے تھے۔

جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار مقرر ہوا تو قیوم نظر پہلے دن مجھے چائے پلانے کالج کینٹین پر لے گئے وہاں کلیم بھی موجود تھے۔ چائے کا ہاف سیٹ پڑا تھا۔ انہوں نے اصرار کر کے مجھے چائے پلانا چاہی۔ قیوم نظر نے کینٹین کے ٹھیکے دار سے کہا۔

"بابو جی، کچھ کھانے کے لیے بھی" کلیم فوراً انگریزی میں بولے۔

خلوص انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔ ان میں شعبہ اردو کے ایک استاد بھی تھے جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ وہ ملتان میں بھی رفیق کار رہ چکے تھے۔

کلیم ان کے واقعات مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کلیم نے بتایا کہ ملتان میں یہ صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ میں کلاسیکی موسیقی کا ایک ریکارڈ سن رہا تھا۔ ان صاحب نے سر ہلانا شروع کر دیا کیونکہ انہیں راگ شناسی کا دعویٰ تھا۔

میں نے کہا۔ کون سا راگ ہے۔ خاموش رہے۔ میں پوچھا چھیڑنے والا کہاں تھا۔ پھر پوچھا۔ بتاؤ تو سہی کونسا راگ ہے۔ بولے بھیرویں۔

" میں نے کہا۔ اسی پر راگ شناسی کا دعویٰ کرتے ہو یہ تو دیپک ہے۔ وہ بھی ماننے والے کہاں تھے۔ کہنے لگے استاد نے درباری میں بھیرویں کا ٹچ دے دیا ہے۔

ایک روز میں اور کلیم کالج کی کینٹین میں بیٹھے تھے کہ نواب ناطق کی شاعری کا ذکر چل نکلا۔ وہ نواب صاحب کے کلام بلاغت نظام سے شناسا تھے۔ مسکرانے لگے۔

میں نے کہا کلیم صاحب کبھی نواب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے: بہت عرصہ ہوا میں ایک دوست کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس میں گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ نواب صاحب وارد ہوئے اور اس دوست سے علیک سلیک کرکے بیٹھ گئے۔ اس نے کہا کلیم صاحب فن شناس ہیں۔ انہیں کچھ سنائیں۔ میں پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوا۔ جب نواب صاحب نے پہلا شعر سنایا تو میں ہنستے ہنستے کرسی سے نیچے جا گرا۔ میں نے نواب صاحب کا یہ شعر کلیم کو سنایا۔

جام آتش زدہ میں سیلئ سبلے آب نہیں
آب و تاب ابکت بیداد گر جاں پیئے بے تاب نہیں

ہنسنے لگے۔ اتنے میں مذکورہ بالا استاد دور سے آتے دکھائی دیئے۔ کلیم کہنے لگے ۔ یہ شخص بالکل جاہل ہے۔ یہی شعر اسے سناؤ اور کہو نسخہ حمیدیہ سے پڑھا ہے اتنے میں وہ صاحب آگئے لیکن میں شعر کو غالب سے منسوب کرکے پڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کلیم نے کہا: نسخہ حمیدیہ کا جو شعر تم مجھے ابھی سنا رہے تھے پروفیسر صاحب کو بھی سناؤ۔ میں نے ایک مصرع سنجیدگی سے پڑھ دیا۔ پروفیسر صاحب نے داد دی۔ مجھے ہنسی آگئی۔ پروفیسر صاحب شعر فہم نہ سہی معاملہ فہم ضرور تھے۔ تاڑ گئے۔ کہنے لگے۔

" بدمعاشی کرتے ہو۔"

یہی پروفیسر صاحب ایک روز کہنے لگے: میں نے اب کلیم کو خوش کرنے کی پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ

بیٹھے ہیں ۔ ایک مرتبہ کلیم سے ملاقات ہوئی تو ان سے یوں مخاطب ہوئے۔ کل میں ایک دوست کے ہاں گیا۔ ان کے ڈرائینگ روم میں راوی کا تازہ شمارہ پڑا تھا۔ اس میں آپ کی غزل تھی وہ غزل میں نے اسے سنائی اور وہ شخص بھی شعر فہم تھا کہنے لگا: بہت اچھی غزل ہے دوبارہ سناؤ۔

کلیم کا ردِعمل یہ تھا: بس وہ غزل صرف دو مرتبہ سنی جانے کے قابل تھی۔

مجھے کلیم پر کبھی رحم آتا تھا اور کبھی غصّہ۔ اس کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ بالکل تنہا تھا۔ نہ کوئی سچا دوست، نہ گھر گرہستی، ماں باپ اور بھائی بہن میں سے کسی سے اس کے تعلقات خوش گوار نہ تھے۔ رفقائے کار کو بھی وہ قریب نہ آنے دیتا تھا۔ بعض نوجوانوں کو اس نے قریب لانے کی کوشش کی ان کے پسندیدہ جنسی مسائل پر گفتگو کی، ناؤ نوش کیا۔ دو چار نوجوان قریب آئے۔ ان میں سے ہر ایک کو کہا کہ میں صاحب جائیداد ہوں اور تمہیں متبنّیٰ بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن خدا جانے کیا ہوتا تھا۔ یہ نوجوان بھی کچھ عرصے کے بعد کلیم کے خلاف ہو جاتے تھے۔

کلیم محفل آرا نہیں تھے میں نے انہیں اوّل تو ادبی محفلوں میں بہت کم شریک ہوتے دیکھا ہے لیکن اگر کبھی گورنمنٹ کالج لاہور میں مجلس اقبال کے کسی جلسے میں شریک ہوتے تو بالکل خاموش رہتے۔ یوں بھی ہوتا تھا کہ صدارت کالج کے کسی استاد کی ہوتی اور وہ کلیم کو بالاصرار بحث میں شریک ہونے کی دعوت دیتا لیکن وہ اس کے باوجود خاموش ہی رہتے۔ روزمرہ زندگی میں بھی وہ بہت کم بات کرتے اور وہ بھی کسی کسی کے ساتھ۔ اور ایک دو جملے بولتے لیکن بہت سوچ سمجھ کر۔ میری عادت تھی اور ہے کہ میں بولتا چلا جاتا ہوں۔ میری کسی ایسی ہی بے فرصت گفتگو پر کلیم نے ایک مرتبہ بزرگانہ انداز میں کہا۔ عزیزم! پہلے تولو، پھر بولو۔ میں نے اسی رفتار سے جواب دیا۔

رکاوٹ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

کلیم ہمیشہ بہت وسیع المطالعہ ہونے کا تاثر دیتے اور وسیع المطالعہ تھے بھی مگر محفل میں بات کرنے سے جھجکتے تھے۔ یہاں تک کہ میرے طالب علمانہ استفسارات کا جواب بھی نہیں دیتے تھے بلکہ ہمیشہ ٹال جاتے تھے۔ ان سے فقط اس قسم کے جملے سننے کو ملتے: کبھی فارغ وقت ہوگا۔ تو آپ کو بتاؤں گا کہ عظیم ادب کے بارے میں میرا ذاتی نظریہ کیا ہے۔ اگر کوئی شخص مجھے یہ سب کچھ پہلے بتا دیتا تو میری بیس سال کی محنت بچ جاتی۔ مگر میں نے ان سے ایک ہی تنقیدی جملہ سنا۔

یعنی سارا عظیم ادب پہلو دار ہوتا ہے۔ لیکن میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں نے اپنے ایک استاد سے پہلو دار کا لفظ اتنی مرتبہ سنا تھا کہ اس سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ اس لیے میں اس عظیم نظریے کی خاطر خواہ تحسین پر کبھی آمادہ

سکا تو دوسرے دن مجھے کلیم نے بتایا۔
کل میں بول پڑا تھا۔ پھر کوئی اور شخص بات نہ کر سکا۔

افسوس کہ محفل کو صم بکم کر دینے والی ان کی اس گفتگو کی سماعت سے بھی میں محروم رہا۔ البتہ ایک دفعہ مجھے ان کا بہت سا کلام سننے کا موقع ضرور ملا۔ ایک دن سٹاف روم میں صرف کلیم اور میں تھے۔ ہم دونوں کا پیریڈ خالی تھا۔

جدید غزل پر گفتگو ہونے لگی۔ کلیم کسی جدید شاعر کو اہمیت نہ دیتے تھے۔ یکایک کہنے لگے۔ کسی دن مجھے کچھ غزلیں سنانے کا موقع دیجئے۔ میں بعض اشعار کی تشریح بھی کروں گا۔ آپ میرے عزیز ہیں۔ محسوس نہ کیجئے گا۔ میں نے ہامی بھر لی۔ دوسرے دن کلیم کہنے لگے۔ بیاض لے آیا ہوں۔ ہم لوجیا میں جا بیٹھے اور کلیم نے مجھے ایک ہی نشست میں پچاس ساٹھ غزلیں سنائیں۔ ان کی غزل گوئی کا جو تاثر میرے ذہن میں ہے وہ اسی نشست کی وجہ سے ہے۔ کلیم کی غزل کا ظاہر ایک حد تک روایتی ہے۔ ان کی غزل سن کر بہت کم ایسا ہوگا کہ کوئی چونک پڑے مگر پڑھیے اور غور کیجئے تو زمینوں، ترکیبوں اور علامتوں میں جدت کے پہلو نظر آنے لگیں گے۔ یہی کیفیت موضوعات کی ہے۔ میرے خیال میں کلیم کو جدید غزل کا ایک اہم نام ہونا چاہیے تھا۔ مگر کچھ تو غزل کی روایت سے گہری خارجی مشابہت کے باعث اور کچھ ان کی مردم بیزاری کی وجہ سے ان کا کلام نہ تو زیادہ چھپا اور نہ ہی لوگوں نے اسے اہمیت دی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کا کلام پندرہ برس تک ڈاکٹر نذیر احمد سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کے پاس پڑا رہا۔ ڈاکٹر نذیر احمد کو کلیم سے اور ڈاکٹر صاحب سے تعلق خاص تھا۔ جب گورنمنٹ کالج لاہور سے ڈاکٹر نذیر احمد کا تبادلہ بعہد نواب کالا باغ ہوا تو کالج میں ہڑتال ہو گئی۔ نیا پرنسپل جب کالج میں پہنچا تو اس کی کار پر پتھراؤ کیا گیا اور وہ بھاگ گیا۔ جب حالات زیادہ بگڑے تو اس سخت گیر حاکم کو شاید زندگی میں پہلی مرتبہ جھکنا پڑا۔ تبادلہ منسوخ ہوا۔ اس تبادلے سے اساتذہ میں سب سے زیادہ دکھ کلیم کو ہوا۔ وہ روزانہ کالج میں ہونے والے واقعات کے پس منظر میں علامتی غزلیں لکھتے۔ ان میں بعض غزلیں مجھے بھی سننے کا موقع ملا۔

کلیم اس واقعے کے بعد ایک ڈیڑھ سال زندہ رہے اس لیے ان کی وفات کے بعد ان کے والد تمام بیاض ڈاکٹر نذیر احمد کو دے گئے۔ مگر ڈاکٹر صاحب موصوف پندرہ برس میں اپنی بے جہت مصروفیات کے سبب کلام مرتب نہ کر سکے۔ اب انہوں نے مہربانی فرما کر یہ کلام مجھے دے دیا ہے۔ ترتیب شروع ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ جدید غزل کے اس توانا شاعر کا کلام جلد منظر عام پر آ سکے گا۔

اک چراغ بے تجلی اک درائے بے صدا
کاروان جستجو کا ساز و سامان دیکھنا

○○

بارے صادق کا کچھ بیاں ہو جائے

محسن احسان

صادق نسیم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۸ء میں ہوئی جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ سر پر پھندے والی ترکی ٹوپی رکھتا تھا۔ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنتا تھا اور بزرگوں کی محفلوں میں مودب بیٹھتا تھا۔ اس زمانے میں شوکت واسطی اور فارغ بخاری کے گھروں کے علاوہ پشاور میں مظہر گیلانی کا گھر بھی ادیبوں اور شاعروں کی پناہ گاہ تھا۔ یہاں ضیا جعفری، مرزا محمود سرحدی، شوکت واسطی، جگر کاظمی، کوکب تبریزی، عشرت ملک، رضا ہمدانی، حنیف اثر، خاطر غزنوی، احمد فراز، یوسف رجا چشتی اور بہت سے دوسرے احباب اکٹھے ہوتے تھے۔ مظہر مرحوم کو ادب کے ساتھ ساتھ سیاست کا بھی چسکا تھا۔ پاکستان کی تحریک میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس لئے حلقہ احباب میں بعض سیاسی رفیق بھی تھے جو وہاں جمع ہو جاتے اور ادب اور سیاست کے لازم و ملزوم ہونے کی گواہی دیتے۔ مظہر گیلانی بڑا خوش شکل، خوش لباس اور خوش خوراک اور خوش گفتار شخص تھا۔ وہ یاروں کا یار تھا اور بہت سی ادبی صلاحیتوں سے لدا پھندا۔ مگر چونکہ سیاست میں داخل ہونے کے بعد ادب کی محبوبہ کی ناز برداریاں اٹھانے کی فرصت اسے کم ہی ملتی تھی مگر جب کبھی ادھر آتا تو اس کے کانوں میں غزل کی بالیاں ملتے تھے پہ نظم کا جھومر اور گلے میں افسانوں کی مالا ضرور ڈال جاتا۔

صادق نسیم سے میری پہلی ملاقات شوکت واسطی کے توسط سے اسی گھر میں ہوئی۔ گورکی نے جب ٹالسٹائی کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو اسے اس پر دیوتا کا گمان گزرا تھا۔ میں نے صادق نسیم کو جب پہلی دفعہ دیکھا تو دیو کا دھیان آیا۔ اس بہت اونچے قد و قامت چوڑے چکلے سینے لمبے لمبے ہاتھ پاؤں اور محدب شیشے والے موٹے موٹے خدوخال کے مالک شخص نے جب گلے لگایا تو مجھے گمان گزرا کہ رستم اور شاہ سہراب کی لڑائی کے بعد صلح اور ملاپ کا منظر کچھ اسی طرح کا ہوگا۔ میں نے اس پہاڑ نما آدمی کے گرد اپنے بازو پھیلائے اور جس احساس کمتری کا شکار اس دن ہوا اس سے آج تک نجات حاصل نہیں کر سکا۔ صادق نسیم اس زمانے میں تازہ تازہ "لفٹیننٹ" ہوا تھا اور فوجی وردی میں بڑا جاذب، وجیہہ، بلند اور بارعب دکھائی دیتا تھا۔ اس سے پہلے میں نے جتنے شاعر دیکھے تھے وہ صرف شاعر ہی تھے۔ یہ پہلا

سماعت سے بیٹھ جائیں۔ قہقہے اتنے بلند کہ اگر کمک ناہنجار اتنا دور نہ ہوتا تو یقیناً ان سے جا ٹکراتے لطیفے ایسے کرارے کہ ہنسی کے فوارے بند کرنے کے باوجود چھوٹ پڑیں۔ فقرے ایسے پہلودار کہ سننے والے داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں۔ غزل میں الفاظ ایسے جیسے سپاہی قطار اندر قطار۔ یہ شخص مجھے اپنے لمبے چوڑے حدود اربعہ کے باوجود اچھا لگا۔ آج تقریباً تیس برس گزر گئے میری اور اس کی دوستی میں کوئی ناراضگی یا کشیدگی کا لمحہ نہیں آیا اور نہ ہی اس عرصے میں میں نے کبھی اسے رنجیدہ طبیعت یا کبیدہ خاطر پایا ہے وہ ہمیشہ ہنستا ہے، قہقہے لگاتا ہے لطیفے سناتا ہے فقرے کستا ہے خوش رہتا ہے خوش رکھتا ہے اپنوں اور بیگانوں سبھی کے کاموں کے لئے یکساں دوڑتا ہے۔ اپنی دانست میں اچھے مشورے دیتا ہے اور پیران کا پروپیگنڈا کرتا ہے یاروں کی محفلوں میں یوں چہکتا ہے جیسے کسی نے ہاتھی کے گھنگھرو باندھ دیئے ہوں صادق بولتا ہے تو اس کی زبان کے ساتھ ساتھ سارا جسم بھی دائیں سے بائیں ہلتا ہے وہ ہنستا ہے تو اس کی باچھیں کانوں تک کھل اٹھتی ہیں اور داڑھ کے ساتھ ساتھ حلق بھی دکھائی دیتی ہے وہ شعر سناتا ہے تو اس کی آواز میں بڑی خود اعتمادی ہوتی ہے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے سر کو ہلا کر دوسروں سے داد لینے اور اپنے آپ کو وجد کی کیفیت سے بھی دوچار رکھتا ہے لیکن جب شعر تخلیق کر رہا ہوتا ہے تو کرب کی جس کیفیت سے گزرتا ہے وہ فوج میں نئے بھرتی ہونے والے رنگروٹ کی سی ہوتی ہے وہ غزل لکھتے ہوئے ہمیشہ اپنے پاس ربڑ رکھتا ہے جونہی اسے کوئی نیا لفظ یا مصرع سوجھتا ہے ربڑ کا استعمال عمل میں آجاتا ہے۔ اگر کبھی آپ کو اس کے رف شعروں کی کاپی نظر آجائے تو آپ کو اس پر پنسل سے زیادہ ربڑ کے نشان دکھائی دیں گے۔ مجھے اس کی اس حرکت سے پشاور کے ایک بہت بزرگ شاعر قاضی محمد عمر غفاروی کہ حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے یاد آجاتے ہیں وہ ہمیشہ غزل سلیٹ پر لکھتے تھے اور کئی کئی مرتبہ لفظ مٹاتے اور پھر لکھتے ۔

صادق نسیم کے لئے کسی محفل میں گھل مل جانا کوئی دشوار کام نہیں۔ جن منزلوں کو ہم آپ گھنٹوں سر نہ کر سکیں وہ دوسرے ہی لمحے پار کر جاتا ہے اس کا شعر ہے۔

تیری محفل میری محفل بن جائے   اذن مل جائے جو گویائی کا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ دوسرے مصرعے کے تکلف کا انتظار نہیں کرتا۔ بغیر اذن کے بڑی بے تکلفی سے آغاز گفتگو کر دیتا ہے اور یوں اس محفل کو اپنا لیتا ہے جیسے برسوں وہاں اٹھتا بیٹھتا رہا ہو۔ وہ ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے سے ناراض ہو کر لوگوں کو پہچاننے کی کوفت سے بھی بالاتر رہتا ہے۔ وہ ہر دوست کے ہر کام کے لئے وقت

وہ جیب پہ نکلا ہے اپنی وعدے وہ کر لیتا ہے اور پھر پورے کرنے اسے یاد نہیں رہتے لیکن میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ بعض اوقات اپنے ذاتی کاموں کو پس پشت ڈال کر آپ کی خدمت کے لئے دست بستہ کھڑا رہتا ہے اور ایسے اپنے ذاتی کام کو دوسرے کے کاموں پر ترجیح دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعض دوست اس اخلاص کو دنیاداری سمجھتے ہیں اور بعض اس دنیاداری کو اخلاص گردانتے ہیں حالانکہ وہ خود ان کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں رکھتا۔

صادق نسیم کا حلقۂ یاراں بے حد وسیع ہے ادیبوں شاعروں دانشوروں صحافیوں اور فوجی افسروں کے علاوہ ان میں ڈاکٹر وکیل منشی کلرک پٹواری نمبردار تحصیلدار دکاندار ڈرائیور مستری اور خدا جانے اور کون کون لوگ شامل ہیں وہ سب کے ساتھ اس بے تکلفی کا مظاہرہ کرتا ہے کہ بعض اوقات آپ کو اس حرکت پر غصہ بھی آتا ہے اور ہنسی بھی۔ مثلاً جب وہ ٹیکسی میں بیٹھے گا تو ڈرائیور سے گفتگو شروع کر دے گا۔ اس کی ٹیکسی کا حال، اس کا ماڈل، اس کا پٹرول کا خرچ اس کی آمدن اس کی بیوی بچوں کا حال اس کا گاؤں اس کے گاؤں کا نمبردار اور پٹواری تھانیدار اور سپاہی سب کا احوال پوچھے گا۔ لیکن اس اثنا میں ڈرائیور کو اپنی منزل نہیں بتائے گا۔ بلکہ دائیں چلو، بائیں چلو، سیدھے نکل جاؤ آگے بڑھو پیچھے ہٹو کہتا کہتا منزل پر آ جائے گا۔ میں نے کتنی مرتبہ ٹوکا کہ ڈرائیور کو جگہ بتا دو وہ خود پہنچا دے گا۔ مگر اس کی سمجھ میں میری یہ بات نہیں آتی۔

مجھے صادق کے گھر جا کر محبت مسرت اور سکون میسر آتا ہے۔ وہ پاکستان کے جس شہر میں رہا مجھے اس کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کی بیگم مجھے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتی ہے اور اس کے تینوں بچے سگے چچوں کی طرح پیار اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ دراصل ان کے اس برتاؤ میں صادق کا اپنا اخلاص بدرجۂ اتم موجود ہے۔

صادق اپنی بیگم سے جتنی محبت کرتا ہے اتنا ہی اس کی گرم مزاجی کے چرچے بھی کرتا ہے اس میں اس کے تجربے سے زیادہ اس کا تفنن طبع شامل ہے مجھے اس کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھول سکتا جب اس نے پہلی مرتبہ بیگم سے یوں متعارف کروایا کہ Meet Zahara she my husband

صادق نسیم کے بعض بہت قریبی دوست اس کی بیوی کی صاف گوئی اور حقیقت پسندی سے بڑا چڑتے ہیں اور انہیں اس کی یہ ادا ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ بلکہ ان کی بیگمات کو بھی یہ خاتون بڑی زبردست دکھائی دیتی ہے۔ میں چھوٹے بھائی کی حیثیت سے اس بہن کو پیار سے تھانیدار کہتا ہوں مجھے بے حد خوشی ہے کہ وہ میرے اس نام سے کبھی چڑتی نہیں اور نہ ہی میرے ساتھ کبھی تھانیدارانہ جیسا سلوک روا رکھتی ہے دراصل یہ خاتون بڑی مہمان نواز نیک دل نیک سیرت نیک طبیعت

کے ناز نخرے اور مختلف انداز دیکھے ہیں لیکن کبھی بیگم صادق نسیم یا صادق نسیم کے ملتے پر شکن نہیں دیکھی۔ ان دونوں نے ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے مہمانوں کی تواضع کی ہے کوئٹہ میں صادق کے ہاں جب میرا قیام تین دن سے پھیل کر تین ہفتوں تک پہنچ جاتا اور میرے اصرار کے باوجود یہ دونوں مجھے جس محبت سے روک لیتے ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ان کے گھر میں لگے ہوئے بادام کے درختوں کی رُت مجھے کبھی نہیں بھول سکتی اور وہ دوپہریں ذہن سے کبھی نہیں اتر سکتیں جب ہم دھوپ میں رکھے ہوئے باداموں کو چوری چوری کھاتے اور چھلکوں کو کبھی قالین کے نیچے، کبھی صوفے کے پیچھے اور کبھی پلنگ کی نواڑ کے اندر چھپا دیتے اور اس کا انکشاف اس وقت ہوتا جب میں واپس پشاور پہنچ چکا ہوتا، صادق دورے پر چلا گیا ہوتا اور بیگم اور بچے گھر کی صفائی میں مصروف ہوتے۔ چوری کئے ہوئے ان باداموں کی ٹک ٹک میں جو مزے ہم نے اٹھائے ہیں ان کا کیف کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ لٹن روڈ پر چناروں کے سائے میں اور چاندنی رات میں کوئٹہ کے بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں میں نے اور صادق نے جو آوارہ گردی کی ہے وہ بھی بڑی یادگار ہے۔ آدھی آدھی رات تک ہم چاندنی سے لطف اندوز ہوتے اور ایک پُل پر بیٹھ کر شعر سنتے بحث کرتے دوستوں کو یاد کرتے کبھی خوش ہوتے اور کبھی ان کو کوس کر محظوظ ہوتے۔ کوئٹہ کے ان شب و روز نے صادق نسیم کے ذہن پر بڑا گہرا تاثر چھوڑا ہے اور اس کا ثبوت ریگِ رواں کے یہ اشعار ہیں کہ

ہیں داغ داغ مرے دل پہ کوئٹہ کے چنار
روشن روشن جو فروزاں تھے مشعلوں کی طرح

جب شگفتِ گلِ بادام کی رُت آئے گی
کوئٹہ کو نہیں بھولیں گے جہاں بھی ہونگے

فراقِ یوسف گم گشتہ کم نہ تھا صادق
کہ میرے ہاتھ سے کنعانِ کوئٹہ بھی گیا

کوئٹہ کی وہ رات بھی ناقابلِ فراموش راتوں میں سے ہے جب مہدی حسن سلیم گیلانی شہزاد احمد خاطر غزنوی اور میں صادق نسیم کے ہاں قیام پذیر تھے۔ مہدی حسن نے اپنا ساز اٹھایا اور اساتذہ کے کلام کو اپنی آواز کے رس سے ایک نئی زندگی بخشنے لگا۔ ہم سب سنتے رہے جھومتے رہے اور داد تحسین کے ڈونگرے برساتے رہے۔ رات دو بجے ڈرائنگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ صادق بھاگا وہاں صادق کی والدہ کھڑی تھیں انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا کہ دو بج چکے ہیں نہ تم خود سوتے ہو نہ دوسروں کو سونے دیتے ہو۔ بند کرو یہ گانا وانا۔ صادق نے برجستہ جواب دیا کہ اماں جی ہم

... دیوار سے ساتھ کان لگائے دل سے اٹھتا ہے جاں سے اٹھتا ہے۔ یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے پڑھتے، کبھی بیگم صاحبہ سنتی رہیں اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہتی رہیں۔ اذان صبح ہوئی تو وہ نماز صبح کے لئے اٹھیں اور یاروں کی یہ ٹولی صبح کی سیر کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔ واپس پہنچے تو بیگم صادق نے ناشتہ دیا اور اس کے بعد سارا دن گھوڑے بیچ کر ایسے سوئے کہ کسی کو کوئی ہوش نہ رہا۔

ایک مرتبہ میں صادق نسیم کے لئے کلیات بیدل کا تحفہ لے کر گیا تو وہ بے حد خوش ہوا۔ بڑے سائز پر چھپے ہوئے غزلیات کے اس دیوان کا وزن کم از کم پانچ سیر ہے۔ ہم دونوں بیدل سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اتنے میں صادق کا بیٹا جمی جناب ڈاکٹر جاوید [illegible] جو اس وقت تیسری جماعت کا طالب علم تھا، کمرے میں داخل ہوا۔ ہم نے دیوان رکھ کر جمی سے دل لگی شروع کر دی۔ تھوڑی دیر میں اس نے دیوان اٹھایا اور سر سے اوپر لیجانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا ڈیڈی یہ تو میری ورزش کے لئے بہت اچھا ہے۔ ہمیں بڑی ہنسی آئی۔ لیکن حقیقت بھی یہ ہے کہ بیدل کیساتھ ورزش کرتے کرتے تو اسد اللہ خاں غالب بھی قیامت سے دوچار ہو گئے تھے۔ جمی اب ۲۶ برس کا گبھرو جوان ہے اور میرا بیٹا ۱۱ برس کا ہے لیکن ان دونوں میں دوستی کا رشتہ میری اور صادق نسیم کی دوستی کی طرح بڑا مضبوط ہوتا جا رہا ہے در اصل علی احسان کا آئیڈیل آج کل جمی ہے عمر اور علم کے اس تفاوت کے باوجود ان دونوں میں قدر مشترک کرکٹ ہے یہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے تجربات یوں بتاتے ہیں جیسے ہم اپنی تخلیقات صادق نسیم سقراط کو بڑا بے وقوف سمجھتا ہے کہ اس نے سچ کے لئے زہر کا پیالہ پی کر اپنی جان یونہی گنوا دی اس لئے یہ بڑے تیقن کے ساتھ خوف فساد خلق سے بچنے کے لئے، جھوٹ بول دیتا ہے لیکن اکثر اوقات اس کے بے ضرر جھوٹ کی معصومیت اس کی آنکھوں کے آئینوں اور چہرے کے خدوخال میں بول پڑتی ہے۔ وہ خود پر سنجیدگی طاری کر لیتا ہے لیکن یہ کچھ زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہتی اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسے بعض دوست جھوٹوں کا بادشاہ کہنے لگے ہیں۔

صادق بعض احباب کا ذکر جس محبت اور اخلاص سے کرتا ہے۔ ان میں سرفہرست میجر بخاری مرحوم ہے کہ اس کا فوج کا ساتھی تھا۔ امرتسر کا رہنے والا یہ بانکا بڑی کراری گفتگو کرتا اور اپنی پھلجھڑیوں سے محفل کو زعفران زار بنا دیتا۔ اس کی یاد سے اب بھی صادق کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ عبدالعزیز فطرت، حفیظ ہوشیارپوری، اے آر ملک، ذوالفقار علی بخاری اور تقی مرحوم کا ذکر بھی بڑی عقیدت اور احترام سے کرتا ہے اس کا شعر ہے

کتنے ہی رنگ بکھرتے تھے اس اک محفل میں
یاد کچھ لوگ بخاری کے سوا بھی آئے

زندہ شخصیتوں میں وہ احمد ندیم قاسمی، پروفیسر شیخ منظور احمد صاحب عارفی کو بڑی محبت سے یاد کرتا ہے اور مجھے اکثر رشک و حسد کے جذبات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ میں اس انتظار میں ہوں کہ میرے عروج طالع لعل و گہر کی باری کب آتی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ صادق نسیم حفظ مراتب اور رکھ رکھاؤ کا بڑا قائل ہے اور بعض اوقات تو وہ اس شعر کی پکی تصویر دکھائی دیتا ہے کہ

بہر کجا کہ روم وصفِ دوستاں گویم
برائے یار فروشی دکاں نمی باید

صادق نسیم کا فارسی شاعری کا ذوق بھی بڑا نکھرا ستھرا ہے۔ اسے بیدل، نظیری، حافظ، جامی اور اقبال کے بہت سے عمدہ اشعار ازبر ہیں اور انہیں فارسی دان دوستوں کی محفلوں میں جھوم جھوم کر سناتا ہے۔

صادق نسیم اتنے بڑے تن و توش کے باوجود سردیوں میں شدید سردی اور گرمیوں میں شدید گرمی کی شکایت کرتا رہتا ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ

یہ جہنم ہو کہ فردوس بریں — اسی دھرتی پہ ہمیں رہنا ہے

سردیوں میں وہ سر سے پاؤں تک گرم ملبوسات میں لپٹے ہوئے ہونے کے باوجود کانپتا ہے۔ مستقل طور پر سر پر ایک چترالی ٹوپی رکھتا ہے جو تیل کی کئی تہوں کے باوجود گذشتہ کئی برسوں سے تبدیل نہیں ہوئی۔ حتے کہ بستر میں بھی وہ اس تاج زریں سمیت گھستا ہے اور جب بستر سے طلوع ہوتا ہے تو سر پر اس کے مختلف زاویے شب وصل کی ساری حکایتیں بیان کر رہے ہوتے ہیں لیکن صادق کو جب ذرا کسی معقول تقریب میں شرکت کرنا ہوتی ہے تو وہ بڑے اہتمام سے کابلی قراقلی نکالتا ہے۔ سوٹ پہننے کے بعد سر پر مختلف انداز سے اُسے سجاتا ہے پھر اونچی ایڑی کے بوٹ پہن کر لیستہ قامتی دوستاں پر ہنستا ہے۔ گرمیوں میں صادق گھر میں کرتے بنیان کی قید سے آزاد ہو کر صرف شلوار زیب تن کئے ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں گھومتا پھرتا ہے۔ شاید بیدل کے اس شعر کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے کہ

مجاز پردۂ ناموسِ حقیقت نیست
بہ ہوش باش کہ زیر لباس عریانیست

میں نے اسے اکثر بہار میں ایسی حالت میں غالب کا یہ مصرع سنایا ہے کہ "تو ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود ہے"۔ صادق اپنے آپ کو بڑے متوازن مزاج کا آدمی سمجھتا ہے اور اس توازن کے لئے وہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اس نے پہلے اسلام آباد میں ایک گھر بنایا اور پھر دوسرا گھر بنایا اور یوں توازن برابر کر دیا اور آجکل میر کا یہ شعر پڑھ کر بے حد خوش ہوتا ہے کہ

مستیاں سے ہیں دونوں پہلے بھرے
بہار اک طرف، اک طرف ابر ہے

صادق کو لکھنے پڑھنے سے زیادہ باتیں کرنے کی لت ہے شاید اس کام کے لئے اس کی دینی مصروفیات اور خانگی جھمیلے آڑے آتے ہیں وہ سرکاری مصروفیات سے زیادہ امور خانہ داری میں الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ گاؤں کے جھگڑے، زمینوں کے مقدمے کچہریوں کے چکر، وکیلوں کے پھیرے بھائیوں کے مسائل بہنوں کے کام دفتروں کی بک بک دوستوں کی بیگاریں، بچوں کی فرمائش خاندانی اختلافات اور [illegible] بیگم کے احکامات غرض "انسان آدمی دوہرا جانور ہوا"۔ کبھی کبھی تو صادق کی ایسی حالت دیکھ کر مجھے وہ دیہاتی گائے یاد آجاتی ہے جس کے دونوں سینگوں پر زمین ٹکی ہوتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کا خیال ہے کہ تنگ دستی نہ ہو تو تندرست آدمی کی تمنا کا دوسرا قدم گرہستی حدود کے باہر پڑتا ہے۔" لیکن صادق نسیم کی تمنا کا پہلا قدم باہر رکھتے ہی پورا
About Imran
ہو جاتا ہے اور گرہستی کا خوف تمنا کا دوسرا قدم اٹھانے کی اجازت ہی نہیں دیتا وہ رسم فرہاد ادا کرنے کے لئے دریاؤں کی طرح چٹانوں سے سر ٹکرانے کی بجائے اسے ریگ صحرا میں چھپانے کو غنیمت جانتا ہے۔

صادق نسیم کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے یہ ہے کہ "صادق نسیم کے ہاں دل کی بستی پوری گہما گہمی سے آباد ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ باہر کی دنیا سے بھی اس کا رشتہ پورے طور پر قائم ہے۔" میرے خیال میں یہ بڑی سچی اور کھری حقیقت ہے اسی طرح احمد ندیم قاسمی کا یہ کہنا کہ "یاد رکھئے، صادق نسیم دو پہلوؤں میں شاعری کرنے والا غزل گو ہے وہ ایک فوجی ہے اور الفاظ کے علاوہ اسلحہ کا استعمال بھی جانتا ہے اس طرح اس کی دیانت اظہار کی اہمیت بڑھ جاتی ہے" دیانت اظہار کے سلسلے میں اگر صادق نسیم کا یہ شعر پیش کر دوں تو آپ کو یقیناً قاسمی صاحب کی رائے سے اتفاق ہوگا کہ

شاید صبا کے ہاتھ میں خنجر ہے ان دنوں
ہر پھول اپنے خون میں ڈوبا دکھائی دے

OO

یادیں

حلقہ اربابِ ذوق (لندن)
(یعنی نام میں کیا رکھا ہے)

اعجاز حسین بٹالوی

لندن میں حلقہ اربابِ ذوق کا پہلا جلسہ غالباً نومبر یا دسمبر ۱۹۵۱ء میں مشہور افسانہ نگار غلام عباس صاحب کے ہاں منعقد ہوا۔ غلام عباس ان دنوں بی بی سی کی اُردو نشریات کے سیکشن سے متعلق تھے اور میں لنکنز ان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

اس سے کوئی دو ہفتے پہلے غلام عباس اور میں ایک اداس سے پب میں بیٹھے حفیظ جاوید کا انتظار کر رہے تھے۔ باہر سڑکوں پر لندن کی مخصوص دھند چھائی ہوئی تھی جس سے چیزیں کچھ دھندلا کر دُور دُور سی ہو جاتی ہیں۔ غلام عباس کو شکوہ تھا کہ لندن میں ساری رونق اور ہنگامے کے باوجود ایک طرح کی اداسی ہے جو ہر وقت دل کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ ایک ایسی بے کیفی ہے کہ لکھنے لکھانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ لکھنے کا خیال تو آتا ہے مگر تحریک اور توفیق نہیں ہوتی یہیں سے بات حلقہ اربابِ ذوق تک پہنچی۔ تقسیم سے پہلے ہم نے دلی میں حلقے کی ایک شاخ قائم کی تھی جسے ہم اگست ۱۹۴۷ء میں پریم ناتھ در اور م، م، راجندر کے حوالے کر کے خود لاہور آ گئے تھے۔ وہاں بھی حلقے کا آخری جلسہ غلام عباس کے مکان پر ہوا تھا۔ اب خیال آیا کہ لندن میں مل بیٹھنے کا سامان کریں تو شاید طبیعتیں لکھنے لکھانے پر مائل ہوں اور غلام عباس کی طرح سب لوگوں کی اداسی کا مداوا ہو سکے جو لندن کے ہنگاموں کے باوجود دل کے ساتھ لگی رہتی ہے۔

چنانچہ بی بی سی کے پاکستانی اور ہندوستانی سیکشن میں پرچہ لگ گیا کہ لندن میں حلقے کی شاخ قائم ہونے والی ہے۔ بی بی سی میں ان دنوں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک اچھا خاصا گروہ موجود تھا۔ غلام عباس، صدیق احمد صدیقی اور حفیظ جاوید تو خیر بی بی سی کے سٹاف پر تھے۔ ان کے علاوہ غیب الرحمٰن۔ انور انصاری ان کی بیگم عزالہ انصاری، ڈاکٹر مقبول، عطیہ حسین، ڈاکٹر محمد اجمل، حمید شیخ اور شاکر علی جو اُردو ادب لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے، اپنے اپنے کام سے یا تعلیم کی غرض سے لندن میں مقیم تھے اور بی بی سی کے اُردو پروگراموں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ بی بی سی کی اُردو نشریات کی رونق انہیں کے دم سے تھی۔ ہندوستانی سیکشن میں آلِ حسن تھے جو بیک وقت لکھنؤ کے کلاسیکی مزاج کے نمائندہ اور ترقی پسند

تحریک کے عاشق تھے۔ موہن لعل طوفان تھے۔ جن کے تعارف پر ڈاکٹر تاثیر نے پوچھا تھا طوفان آپ کا تخلص ہے یا پیشہ۔ پتیش بھٹناگر تھے جن کی شادی پر پاکستان اور ہندوستان والوں نے مل کر غالب کی زمین میں سہرا لکھا تھا۔

پاکستانی سفارت خانے میں چوہدری محمد علی ردولوی کے صاحبزادے سلطان احمد علی پریس اتاشی تھے جو نہایت شستہ اردو لکھنؤ کے لہجے میں بولتے تھے لیکن مضمون لکھنے کے سلسلے میں ان کی طبع بہانہ جو بہت رسا تھی۔ کالج آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں علی گڑھ کے ڈاکٹر مسعود حسین تھے جو لسانیات میں پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہے تھے۔ بدیہہ گوئی میں مہارت خاص رکھتے تھے۔ پہلی دفعہ حلقے میں نظم پڑھنے کے لئے بلایا تو نظم سے پہلے دو بیتی سنائی۔

دیارِ غیر میں آ کر یہ ہو گئی حالت ۔۔۔ نہ اپنی صبح یہاں نہ اپنی شام یہاں
یہ کس کے لطف کا اعجاز ہے کہ اے مسعود ۔۔۔ سنانے ہم بھی چلے آئے ہیں کلام یہاں

غرض کہ یہی لوگ تھے جنہوں نے حلقے کے انعقاد کی تجویز کو خوش آمدید کہا اور غالباً دسمبر کے پہلے ہفتے کی شام کو غلام عباس کے ہاں مجلس منعقد ہوئی۔ ایک مختصر سے تعارفی مضمون کے بعد جس کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی تھی غلام عباس نے اپنا افسانہ "سایہ" پڑھا اور ڈاکٹر مسعود حسین نے اپنی تازہ غزل پیش کی اور یار لوگ دیکھتے ہی دیکھتے اسی بے تکلفی سے تنقید کرنے لگے جو ہمیشہ سے حلقے کی مجالس کا خاصہ رہا ہے۔

غلام عباس اس زمانے میں ارلز کورٹ کے ٹیوب اسٹیشن کے قریب رہتے تھے۔ ایک تو ان کا کمرہ خاصا بڑا تھا۔ دوسرے ان کا گھر زیر زمین گاڑی کے سٹیشن سے زیادہ دور نہ تھا۔ پہلی میٹنگ میں طے یہ پایا کہ حلقے کے جلسے باقاعدگی سے اسی جگہ منعقد ہوں۔ ایک انتظامی کمیٹی بنا دی گئی اور سیکرٹری کے فرائض مجھے سونپ دیئے گئے۔ شروع شروع میں حاضرین کی تواضع کے لئے چائے وغیرہ کا انتظام بھی اہل خانہ کے ذمے رہا مگر جب حاضرین میں اضافہ ہونے لگا یہ رواج ختم ہوتا چلا گیا۔ جوں جوں حلقے کے انعقاد کی خبر پھیلی زیادہ سے زیادہ لوگ شمولیت کے لئے آنے لگے۔ حسین آزاد، ظفر السلام اور مجیب حسن خاں جو ان دنوں سفارت کاری کے عہدے کے لئے زیر تربیت تھے باقاعدگی سے آنے لگے۔ نواب شمیم الدین خاں پتہ پوچھتے ہوئے پہنچے اور پریم بخشی جو ربع صدی سے لندن میں مقیم تھے کہنے لگے جب سے لندن میں سر عبدالقادر کی اردو مجلس ختم ہوئی تھی یہ لذت بھی غائب ہو گئی تھی۔ ناصر حسین تو انور انصاری کے ساتھ چلے آئے اور یاور عباس ربع آباد والے محمد علی خاں کو لے آئے جو تیس پینتیس سال سے گھر بھولے ہوئے مسافر کی طرح لندن میں آباد تھے۔ باغ و بہار آدمی تھے۔ مرصع اردو بولتے اور شعر کہتے۔ ایک عمر لندن میں گزارنے

کھا جائے تو اس کے ساتھ کھانا کھانے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ پھر ڈاکٹر اشرف کو خبر ملی اور وہ بھی کشاں کشاں چلے آئے۔ وہ ہندوستانی سیاست سے بدظن ہو کر لندن میں بس گئے تھے ان کے مزاج میں علی گڑھ کی تہذیب اور ذہن پر جرمن فلسفے کی چھاپ تھی۔ ان کے آنے سے حلقے کی رونق میں اضافہ ہوا اور بحث میں نیا رنگ چمکا۔

صدر ہر جلسے کے شروع میں حاضرین محفل میں سے چنا جاتا تھا۔ ابتدائی چند مہینوں میں ایک ایسا حادثہ ہو گیا کہ آج بھی اس کا خیال آتا ہے تو جسم پر جھرجھری طاری ہو جاتی ہے۔ مجلس شروع ہونے کا وقت ہو چکا تھا۔ بیشتر حضرات موجود تھے کہ دروازہ کھلا اور غلام عباس ایک اور صاحب کو ساتھ لئے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ صاحب غلام عباس کے ساتھ بی بی سی میں کام کرتے تھے۔ ادب آداب کے بہت پابند اور لئے دیئے رہنے والے آدمی ہیں۔ ادب دوست اور باذوق انسان ہیں۔ بخاری اور تاثیر کی صحبتیں دیکھ چکے تھے اور حلقے کے جلسوں میں باقاعدگی سے شرکت کیا کرتے تھے۔ میں نے انہیں اندر آتے دیکھا تو صدارت کے لئے ان کا نام تجویز کیا۔ کسی صاحب نے تائید کی اور وہ کرسی صدارت پر آ بیٹھے۔ گزشتہ جلسے کی کارروائی پڑھی گئی اور منظور ہوئی۔ پروگرام میں سب سے پہلی چیز ڈاکٹر مسعود حسین کی نظم تھی۔ مسعود حسین بہت وضع دار اور دھان پان آدمی ہیں۔ بلند آواز میں بولنے کو بدتمیزی سمجھنے والے انسان ہیں۔ انہوں نے بہت شائستہ لہجے میں اپنی نظم پڑھی ــــ

گھٹی گھٹی سی یہ شامیں دیار مغرب کی　　میں رو رہا ہوں کہ ان کی سحر نہیں معلوم

لمبی نظم تھی۔ معلوم ہوتا تھا مغرب کی معاشرتی زندگی کی طرف ایک خالص مشرقی انسان کا رد عمل ہے۔ نظم پڑھنے کے دوران صاحبِ صدر خاموش بیٹھے رہے اور جونہی نظم ختم ہوئی انہوں نے پہلے شاعر کی طرف اور پھر حاضرین کی طرف دیکھا اور بولے "یہ کیا بکواس نظم ہے" میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی میں نے صاحب صدر کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو وہاں تو بیئر کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ آہستہ سے ان کے قریب جاکر بات کی تو ان کی سانس سے بیئر کا ایک ایسا بھبکا برآمد ہوا کہ میں سوچنے لگا کہ آخر صورت حال پر کیسے قابو پایا جائے گا۔

میں نے ذرا بلند آواز سے کہا "حضرات صاحبِ صدر کا خیال ہے کہ پہلے اس نظم پر گفتگو ہو جائے" صاحب صدر نے میری بات کاٹ کر کہا "موضوع ز خیر اس نظم میں ہے ہی کہاں۔ البتہ زبان پر بات کیجئے اور دیکھئے کہ کیسی غلط اور بے کیف زبان استعمال کی گئی ہے" یہ کہہ کر صاحبِ صدر نے سرخ پنسل ہاتھ میں لے کر دھڑا دھڑ بزعم خود اس نظم کی غلطیاں شمار کرنا شروع کر دیں۔ اب محفل پر ایسی لمبی کی خاموشی چھا گئی۔

[illegible] صاحبِ صدر شراب خوری میں بسیار خوری کے قائل تھے لیکن ان کا یہ عالم تو کبھی کبھی اور وہ بھی رات دس گیارہ بجے کے قریب ہوا کرتا تھا۔ ابھی تو شام کے چار ہی بجے تھے اور ہم میں سے کسی کو خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ اس عالمِ کیف میں حلقے کے جلسے میں چلے آئیں گے۔ ایک خیال یہ آیا کہ حاضرین سے معذرت کی جائے۔ جلسے کے خاتمے کا اعلان کیا جائے۔ صاحبِ صدر کو رخصت کرکے از سرِ نو جلسے کا آغاز کیا جائے، پھر سوچا شاید موصوف سنبھل جائیں اور اس بدمزگی کی نوبت نہ آئے۔ میں ان کے کان میں مسلسل آہستہ آہستہ باتیں کرکے صورتِ حال پر قابو پاتا رہا مگر پھر بھی تھوڑی تھوڑی مدت بعد ان کے آتش فشاں دہانے سے ایسا لاوا نکلتا کہ جو سامنے آتا جھلس جاتا۔ آخر خدا خدا کرکے جلسہ ختم ہوا۔ صاحبِ صدر رخصت ہوئے۔ میں نے غلام عباس کی طرف دیکھا بس آنکھوں میں آنسوؤں کی کمی تھی۔ ہر شخص کو اس واقع کا غم تھا۔ میں نے ان سے معذرت چاہی۔ وہ شریف آدمی ہیں، مسکرا دیئے۔ اگلے جلسے میں بھی آئے لیکن سارا وقت خاموش رہے۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد میں نے حلقے کے لئے مضمون لکھنے کو کہا تو پھر مسکرا دیئے۔ میں اپنی جگہ نادم تھا، وہ اپنی جگہ برہم تھے۔ بس اپنی مسکراہٹ سے انتقام لیتے رہتے تھے۔

آخر ایک روز میں نے ٹیلیفون پر ان سے کہا "مسعود صاحب اگلے ہفتے تو آپ کو حلقے میں مضمون پڑھنا ہی پڑے گا۔ موضوع کا انتخاب خود کر لیجئے۔ کہنے کی باتیں کے سلسلے میں بحث کا آغاز کرنا ہے۔ دس پندرہ منٹ کا مضمون کافی رہے گا۔" ڈاکٹر صاحب بڑی مشکل سے مانے اور کہنے لگے۔ "میں آج کل برٹش میوزیم میں کام کر رہا ہوں۔ وہاں مجھے ایک عجیب خزانہ ہاتھ لگا ہے غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام مل گیا ہے وہ لیتا آؤں گا اور اسی پر گفتگو رہے گی۔" میں نے کہا "بہت اچھا خیال ہے۔ یہ تبرک لیتے آیئے۔"

ان دنوں ہمارے ہاں کچھ تو کہیئے کی طرح ایک عام بحث ہوتی جس کا عنوان تھا "کہنے کی باتیں"۔ ڈاکٹر مسعود حسین وقت پر پہنچے اور غالب کا غیر مطبوعہ کلام اور اس کی نقلیں ساتھ لائے۔ سیکرٹری نے کہا "ڈاکٹر مسعود حسین آج کل برٹش میوزیم میں کام کر رہے ہیں۔ ہمارے لئے ایک خاص چیز وہاں سے لائے ہیں اور آج اسی پر گفتگو رہے گی۔" ڈاکٹر مسعود حسین نے غالب کی غیر مطبوعہ غزل پڑھی۔ نقلیں حاضرین میں تقسیم ہوئی۔

تیری افسردہ دلی بادۂ خوش رنگِ خمار
میری افسردہ دلی داغِ سویدائے بہار
جنسِ بازارِ محبت کہ ہے وصلِ زنگار
سرِ من خمیازہ ایجاز کہ نقشِ دیوار
زندگی گرسنہ و کرہن و تپستہ ت
صحن صحرائے چمن شرق کو احرامِ بہار

جادۂ غم نگہِ کم ہے کہ جنبش نہیں
قیمتِ شورشِ پیہم بھی نہیں زخمۂ تار

کتنا اندوہ رہا ہے یہ ربابِ ہستی
کس قدر عربدہ جو ہے نگہ موجِ غبار

کفِ گردوں میں اگر جامِ زمرد نہ ہوا
حسرتِ دل میں بھی ممکن نہیں عالم کا فشار

محفلِ عیش نہیں دادِ طلب اے غالب
خفرِ خامہ یہ ہے طعنۂ اغیارِ دیار

غزل پڑھی گئی تو اس پر گفتگو شروع ہوئی۔ اکثر لوگوں نے غالب کی شاعری کو سامنے رکھ کر اس غزل کے انداز سے اس کا دور متعین کرنے کی کوشش کی کہ شاید یہ غزل غالب کے ابتدائی اور مشکل پسند دور سے تعلق رکھتی ہے۔ بعضوں نے اس کی لغت اور تراکیب پر نظرِ غائر ڈالی۔ چند ایک نے غالب کے کلام سے کچھ اور شعر موازنے کے لئے پڑھے۔ وہ بزرگ جو اس روز صدارت کرتے ہوئے عالمِ کیف میں ڈاکٹر مسعود حسین پر ہاتھ جھاڑ گئے تھے آج ہر اعتبار سے بقائمی ہوش و حواس بحث میں شریک تھے۔ انہوں نے بعض اشعار کی تعریف کی اور جب وہ بعض استعاروں اور تراکیب سے پوری طرح لذت لے چکے تو ڈاکٹر مسعود نے مسکرا کر کہا "صاحبو! مجھے معاف کر دیا جائے۔ یہ غزل غالب کی نہیں ہے اور نہ مجھے برٹش میوزیم کے کتب خانے سے ملی ہے۔ یہ تو محض ایک علمی مذاق تھا۔ ہاں یہ غزل خود ہی لکھ کر لے آیا تھا کہ اس روز تو میری نظم اور اس کی زبان آپ کو پسند نہ آئی مگر آج غالب کے نام پر ہم میں سے اکثر دوست ان بے معنی اشعار سے بھی معنی کشید کرنے کو تیار ہو گئے"۔

اس پر محفل میں قہقہہ بھی پڑا، جھرجھری بھی آئی۔ ایک صاحب بولے "کوئی حرج نہیں۔ ہم اسے ڈاکٹر مسعود کا کلام سمجھ کر گفتگو جاری رکھیں گے" لیکن بات ہو چکی تھی۔ جس جس نے بحث میں حصہ لیا تھا وہ کچھ کھسیانا سا لگ رہا تھا اور ڈاکٹر مسعود حسین اپنے کو فاتح محسوس کر رہے تھے۔ فائدہ اس لطیفے کا یہ ہوا کہ مسعود صاحب کے دل کا غبار دھل گیا اور ان کو حلقے سے ایسی محبت ہوئی کہ فریفتہ ہو گئے۔ جب تک پیرس نہیں چلے گئے شاید ہی کوئی محفل ایسی ہو جس میں وہ شریک نہ ہوئے ہوں۔ ایک مرتبہ صاحبِ مضمون عین وقت پر بیمار پڑ گئے۔ ایک روز پہلے میں نے ڈاکٹر مسعود حسین کو ٹیلیفون کیا اور وہ رات بھر بیٹھ کر اگلے روز کے لئے مضمون لکھتے رہے اور مضمون سنانے سے پہلے اپنے انداز میں قطعہ بھی پڑھا۔

حلقۂ زلف سے بڑھ کر مسعود   اپنے حلقے کے گرفتار ہیں ہم

جب بھی آپ کو چھی نہ ملے　　　　باسرو چشم گرفتار رہیں ہم

اب بقول شخصے حلقہ لندن میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ لوگ شوق اور باقاعدگی سے جلسوں میں شرکت کرتے اور اپنے مضامینِ نظم و نثر پڑھنے کے منتظر رہتے مگر پھر بھی بعض احباب ایسے تھے جن سے مضمون لکھوانا اور حلقے میں پڑھوانا معرکہ سے کم نہ تھا۔ اسی لئے اپنی داد دینے کو جی چاہتا ہے ڈاکٹر محمد اجمل سے مضمون لکھوانے کے لئے مجھے سارتر کی دو نئی کتابیں خریدنا پڑیں کیونکہ یہ ان کا آخری بہانہ تھا کہ چونکہ یہ کتابیں لائبریری سے دستیاب نہیں ہوئیں اس لئے مضمون وقت پر نہ لکھا جا سکے گا۔ میں نے فوراً دونوں کتابیں خریدیں اور ان کے دروازے پر دستک دی۔ اجمل اپنی موٹی موٹی آنکھیں لئے دروازہ کھولنے آئے اور کتابیں دیکھ کر ان کی آنکھیں پوری کھل گئیں مجھے یقین ہے یہ منظر بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے۔

سلمان احمد علی مضمون لکھنے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ کوئی لکھنوی حجاب حائل تھا انہوں نے اُردو شعر کے اساتذہ کو اچھی طرح پڑھا ہے اور اس زمانے میں جدید نفسیات کو غور سے پڑھ رہے تھے۔ ایک روز باتوں باتوں میں کہنے لگے میرا ارادہ ہے انیس کے مرثیوں کو جدید نفسیات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ ہم لوگوں نے حلقے کے اگلے پروگرام میں ان کے مضمون اور عنوان کا اعلان کر دیا۔ یہ بات سلمان صاحب کی وضع داری کے خلاف تھی کہ ان کے نام اور مضمون کا اعلان ہو جائے اور وہ کھسک جائیں۔ چنانچہ ایسا انقلابی مضمون پڑھا کہ گھنٹوں حلقے میں میرانیس اور سگمنڈ فرائیڈ کے درمیان پنجہ آزمائی ہوتی رہی۔

حادثہ یہ ہوا کہ غلام عباس کے ہاں چوری ہو گئی۔ وہ دفتر میں تھے کہ کوئی چور ان کے گھر میں گھس آیا اور ان کے سوٹ اور جوتے اٹھا کر لے گیا۔ چائے دانی اور گلاس چھوڑ گیا۔ گھر میں تھا کیا جو تمام اسے غارت کرتا۔ غلام عباس نے دل برداشتہ ہو کر مکان تبدیل کر لیا اور اب حلقے کے جلسے میرے ہاں ہونے لگے۔ کوئی سال بھر یہ محفل برومپٹن روڈ پر میرے فلیٹ میں جمتی رہی۔ شروع شروع میں لینڈ لیڈی کو تشویش ہوئی کہ اتنے لوگ یہاں آتے ہیں مگر یہ کیسی پارٹی ہے کہ نہ باجا بجتا ہے نہ جام چلتا ہے نہ رقص ہوتا ہے نہ لطیفہ بازی اور ہنسی کھیل ہوتا ہے۔ ایک روز اس نے مجھ سے پوچھ ہی لیا کہ آخر اتنے لوگ جو تمہارے ہاں جمع ہوتے ہیں کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا "گفتگو" اس پر وہ ایسے خاموش ہو گئی جیسے مشرقی تصوف کا کوئی گہرا راز اس کی سمجھ میں آگیا ہو۔

حلقے کے اس دور کا ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ خبر ملی کہ فیض راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کر لئے گئے۔ پھر ٹوٹی ٹوٹی غیر مرتب خبریں ملتی رہیں اور ہم سب فیض صاحب کے بارے میں مشوش رہے۔ حلقے کی ایک مجلس میں حبیب الرحمٰن نے تجویز پیش کی کہ فیض کی گرفتاری کے خلاف ہمیں حلقے میں ایک قرارداد پاس کرنی چاہیے اور پھر اشاعت کے لئے انگلستان کے اخباروں، رسالوں اور بی بی سی کو

نہ بھی چاہیے ۔ [illegible]

"آپ لوگ مردہ پرست ہیں۔ کوئی مر جائے تو ریزولیوشن داغ دیتے ہیں۔ کسی کو زندہ گاڑ دیا جائے تو خاموش رہتے ہیں" غیب الرحمٰن بہت جذباتی آدمی ہوا کرتے تھے۔ یاور عباس نے ڈرتے ڈرتے کہا "غیب صاحب یہ سیاسی مسئلہ ہے قانونی مسئلہ ہے، ادبی مسئلہ نہیں "

غیب الرحمٰن کے غصے کے بند ٹوٹ گئے بولے "سیاست کو آپ ادب سے الگ کیسے رکھ سکتے ہیں۔ پندرہ سال سے یہ انجمن سیاست سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کر رہی ہے اور شاید اسی لئے آپ لوگ نہایت مدقوق قسم کا مریضانہ ادب پیدا کر رہے ہیں۔ اگر آپ سچ مچ سیاست سے الگ تھلگ رہتے ہیں تو پھر آپ نے منٹو کے مقدمے پر احتجاج کیوں کیا تھا" ایک طرف سے آواز آئی "وہ ایک ادبی مسئلہ تھا"

"آپ کو کیا خبر ادبی مسئلہ کیا ہوتا ہے۔ آپ گل و بلبل کی باتیں کرتے رہئے شوق سے" اور یہ کہہ کر غیب الرحمٰن کھڑے ہو گئے۔

ہر شخص نے غیب الرحمٰن سے یہ کہنے کی کوشش کی کہ فیض ہم سب کو عزیز ہیں اور شاید ہم میں سے بعضوں کے ذاتی تعلقات فیض سے غیب کی نسبت زیادہ گہرے ہوں مگر غیب اس زمانے میں بائیں بازو کے وجدان کی اس منزل میں تھے جہاں ذاتی تعلقات بے معنی چیز ہوتے ہیں۔ اور اصل کائناتی فلسفہ تو جدلیاتی ہوتا ہے اور سیاست اور ادب ایک ہی شے کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ اس واقع کے بعد کئی ہفتے غیب حلقے سے ناراض رہے پھر ان کا غصہ اس وقت کم ہوا جب وہ طالب علموں کی ایک امن کانفرنس میں شرکت کو یورپ گئے اور وارسا سے واپسی پر شوپاں کے وطن پر ایک اچھی انقلابی نظم لکھ کر ساتھ لائے۔ مجھے بی بی سی کے سٹوڈیو زمینظے تو الگ لے جا کر کچھ بند سنائے۔ میں نے کہا اچھی نظم ہے حلقے میں کیوں نہیں پڑھتے۔ غیب اپنی غصہ ور طبیعت کے باوجود اچھے دوست اور معصوم آدمی ہیں۔ مان گئے اور نظم پڑھنے حلقے میں آ گئے۔ لندن یونیورسٹی میں فارسی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ پھر جب تک لندن میں رہے حلقے کی مجلسوں کی رونق بنے رہے۔

پھر ایک افتاد حلقے پر پڑی۔ میری لینڈ لیڈی نے مکان بیچ ڈالا اور نئے مالک مکان نے پرانے کرائے داروں کو ایک ایک مہینے کا نوٹس دے دیا۔ حلقہ اربابِ ذوق بے گھر ہو گیا اور کئی ماہ تک حلقے کے جلسے مختلف حضرات کے ہاں ہوتے رہے۔ آخر خدا خدا کر کے لندن کے حلقے والوں کو بھی لاہور کی طرح اپنا وائی ایم سی اے ہاتھ آ گیا۔ وکٹوریہ لیگ والوں نے اپنے کمیٹی روم میں ہمیں جلسے کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ مرکزی لندن میں حلقے کے جلسوں کے لئے نہایت مناسب جگہ تھی اور وکٹوریہ لیگ کا کمیٹی روم نہایت خوبصورت کمرہ تھا۔

[illegible] ان میں لاہور کے پروفیسر عبدالرؤف اور دلاور محمود تھے اول الذکر پی ایچ ڈی کرنے لندن آئے تھے اور موخر الذکر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرتے کشمیر والے محمود ہاشمی تھے جو برسوں سے لندن میں آباد تھے۔ حیدر آباد دکن کے رحیم الدین کمال تھے۔ لاہور کے اقبال شہزاد تھے۔ امتیاز تاج تھیں جو شادی کے بعد امتیاز کمال ہو گئیں۔ شکیلہ معظم علی تھیں جنہوں نے اس زمانے میں قاہرہ پر ایک دلچسپ رپورتاژ لکھا تھا۔ کے ایچ خورشید تھے جو اس زمانے میں حلقے میں افسانے پڑھتے تھے پھر آزاد کشمیر کے صدر ہو گئے۔ راز مراد آبادی تھے جو اب بی بی سی کی ملازمت کے سلسلے میں لندن آگئے تھے۔ شیخ خورشید احمد تھے (جو بعد میں پاکستان کے وزیر قانون ہوئے) امریکہ سے واپسی پر لندن آئے تو معلوم نہیں کہاں سے حلقے کا پتہ پوچھتے ہوئے وکٹوریہ لیگ کے جلسہ میں پہنچ گئے۔ ایک بزرگ تھے جن کو یار لوگ ڈاکٹر لف و نشر غیر مرتب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ لندن کے اورینٹل اسکول میں شعبہ اردو سے متعلق تھے۔ اس سے پہلے ہندوستان میں تدریس کا کام کرتے تھے۔ موصوف لندن میں اردو مشاعروں کی صدارت کیا کرتے تھے اور اشعار پر ایسی ثقہ قسم کی داد دیا کرتے" واہ واہ کیا صنعت تلمیح سے فائدہ اٹھایا ہے" یا پھر فرماتے" کیا کہنے صنعت تضاد نے شعر کو چار چاند لگا دیئے"۔ ایک دفعہ شعر سنا تو فرمایا" سبحان اللہ کیا لف و نشر غیر مرتب استعمال کی ہے"۔ موصوف کے پاس چونکہ ڈاکٹریٹ کی ڈاکٹری تو تھی ہی یار لوگوں نے انہیں ڈاکٹر لف و نشر غیر مرتب کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب قرۃ العین حیدر کراچی سے ٹکٹ کٹا کر لندن پہنچیں اور انہوں نے لندن کی محفلوں میں ایک نئی رونق کا اضافہ کر دیا۔ انہوں نے حلقے کو "لندن کی ادبی سرائے" کا نام دیا کہ مسافرانِ فرنگ پاکستان اور ہندوستان سے لندن آتے ہیں اور غریب الوطنی کے مارے ہوئے اس ادبی سرائے میں پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ روحانی اور لسانی طور پر سستاتے ہیں اور آگے نکل جاتے ہیں۔ اس ادبی سرائے میں نئی دوستیاں جنم لیتی ہیں۔ نئے مسافروں سے تعارف ہوتا ہے اور مسافروں کا چل چلاؤ بھی جاری رہتا ہے

تقی احمد سید کو میں نے حلقے میں اپنے ایک مضمون کے ذریعے مقبول ہوتے دیکھا۔ وہ لندن آئے تو بہت کم لوگ انہیں جانتے تھے۔ میں نے صدیقی اور یاور سے تعارف کرایا۔ تقی صاحب اس زمانے میں خاموش آدمی تھے اور ان کی شخصیت پر جامعہ ملیہ کے ایک خاموش اور سنجیدہ طالب علم کی چھاپ تھی۔ یاور عباس نے کہا" بی بی سی میں میرے ایک ڈرامے میں حصہ لیجئے" مگر تقی صاحب نے مائیکرو فون پر اپنے حصے کے چند فقرے اس آہستگی سے بولے کہ مائیکروفون کو بھی خبر نہ ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ بی بی سی والے تقی صاحب کو ہاتھوں ہاتھ نہیں لے رہے چند ہفتے بعد تقی صاحب نے حلقے میں اپنا پہلا مضمون آرٹ اور حقیقت پسندی پڑھا اور یہ بی بی سی والے جو تقی صاحب کے بارے میں نیم گرم سے تھے اس گرم جوشی سے تقی صاحب کی طرف بڑھے کہ تقی صاحب کے لئے لندن اجنبی نہ رہا اور ان لوگوں کے دوستوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا۔

یاور عباس اور پھر تقی احمد سید سال بسال سیکرٹری مقرر ہوتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں ضیا محی الدین سیکرٹری مقرر ہوئے۔ وہ اس زمانے میں ڈرامے کی درسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی اسٹیج پر تانک جھانک کر رہے تھے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی بھی اس زمانے میں لندن پہنچ گئے تھے اور حلقے کی مجلسوں میں شریک ہونے لگے تھے۔

حلقے کے جلسوں میں شخصیتوں کی مجادلت اور زیرِ سطح کھینچاؤ دیکھنے اور محسوس کرنے کی چیز ہوتی تھی۔ ڈاکٹر اجمل اس زمانے میں فرائیڈ اور یونگ سے برسرِ پیکار تھے، لہٰذا ان کے ہاں ہر چیز کسی اور شے کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ ہر شے سمبل تھی۔ اور ہر سمبل حقیقتِ کاملہ کی تلاش پر روانہ ہوجاتا تھا۔ انور انصاری علی گڑھ کے بائیں بازو کے دانشور تھے۔ ادب کے سماجی پہلوؤں پر لندن یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ ان کے ہاں ادب ایک سماجی مظاہرہ ہوتا ہے۔ ادب کو سمجھنے کا راستہ طبقاتی نزاع سے پیدا ہونے والے تصورات سے ہو کر جاتا ہے۔ ادیب کو ہر وقت برسرِ پیکار رہنا ہوتا ہے اور ہمیشہ امید کی جھلک دکھاتے رہنا چاہیے۔ منیب الرحمٰن کلاسیکی فارسی کے طالبِ علم بھی تھے اور انقلاب کے نقیب بھی تھے۔ انہیں بازارِ مغرب روحِ انسانی کی چاک دامانی اور نفرتوں کی ارزانی سے معمور نظر آتا تھا (اس وقت کسے معلوم تھا کہ منیب الرحمٰن کو زندگی کا بقایا حصہ ایک امریکی یونیورسٹی میں درس و تدریس میں گزارنا پڑے گا) وہ مارکسزم کے سنجیدہ طالبِ علم تھے۔ شاعری میں آدمی کے جنون اور انسانیت کے نالہ ہائے زبوں کی تصویریں پیش کرتے مگر اس یقین کے ساتھ کہ ؎

رحلتِ شب کی داستاں ہے یہ وقت کی آخری فغاں ہے یہ

غلام عباس آنکھیں کھول کر لندن کی رنگینیوں کا نظارہ کرتے تھے۔ قیامِ لندن ان کے لئے ایک بڑا تجربہ تھا جس کا رس وہ افسانوں میں نچوڑتے رہتے تھے وہ افسانہ لکھتے اور پڑھ دیتے۔ نقاد بولتے رہیں۔ اجمل سمبل تلاش کرتے رہیں منیب الرحمٰن اور انور انصاری کرداروں کے طبقاتی نزاع پر گفتگو کرتے رہیں وہ اتنے میں دوسرے افسانے کی تیاری میں جت جاتے تھے۔

یاور عباس کلاسیکی اُردو شعر کے قتیل اور انگریز بیوی کے شوہر تھے۔ کالج کے دور میں فراقؔ صاحب کی صحبتیں دیکھ چکے تھے۔ شعر میں مذاق اچھا تھا مگر جوشؔ کو بڑا شاعر سمجھتے تھے۔

صدیق احمد صدیقی سب سے دلفریب شخصیت تھے۔ علی گڑھ کے محرکہ آرا مقرر گھر میں انگریزی بولتے تھے۔ دوستوں میں انیس کا مرثیہ پڑھتے تھے۔ خطیب اور ادیب بات بات پر بحث کرنے کو تیار تاکہ تقریر کا موقع ملے۔ الفاظ کے پارکھ، گفتگو کے رسیا۔ خیالات کے

اعتبار سے اور انکساری سے ہم دوا ئیں جذبات کے اعتبار سے غزل کے ادیب اور شعر کے مزاج داں۔ سخن صراف ایسے کہ اچھا شعر سن کر یوں مزا لیتے جیسے پلاؤ کھا رہے ہیں۔ کہیں اچھا فقرہ پڑھتے، سنتے یا لکھتے تو فوراً ٹیلیفون کرتے کہ بھئی ایک اچھا فقرہ سن لو۔ دوستی اس وضع داری سے نبھاتے جیسے پرانے زمانے کی کتابوں میں لکھا ملتا ہے۔ دائیں بازو اور بائیں بازو والوں میں لفظی جنگ ہو جاتی تو صدیقی تلوار سونت کر میدان میں آ جاتے اور دونوں طرف کشتوں کے پشتے لگا دیتے اور آخر میں پتا چلتا کہ جنگ صرف نظریوں ہی کی نہیں شخصیتوں کی بھی تھی۔

محمد علی خاں ملیح آبادی ہم سب کے بزرگ تھے جوانی میں ہندوستان کی جنگ آزادی لڑنے وطن سے ہجرت کر کے لندن آئے تھے پھر لندن پاؤں کی زنجیر ہو گیا اور یہیں کے ہو رہے۔ ایک زمانہ گزرتا چلا گیا ملیح آباد ایک یاد بنتا گیا۔ انگریز خواتین کے مزاج دان ایسے کہ جوانی میں جو تجربات حاصل کئے تھے ان کے تعصب سے سرمو تبدیلی کرنے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے گذشتہ چار دہائیاں اسی سرزمین پر گزاری تھیں۔ ہٹلر کے ہوائی حملوں کا زمانہ انہوں نے لندن کی خندقوں میں گزارا تھا۔ ان کی صحبت میں ایک داستان کا لذت تھی حلقے کی مجلس میں زیادہ نہ بولتے لیکن حلقے کے بعد قریب ترین پب میں جو محفل جمتی اس میں ان کی گل افشانیٔ گفتار جانِ محفل ہوتی۔ عمر بڑھ رہی تھی اس لئے کھانے پینے میں احتیاط برتتے تھے۔ پہلے گلاس پر حافظ کا شعر پڑھتے دوسرے گلاس کے دوران عمر خیام کی رباعی سناتے اور تیسرے گلاس کے خاتمے پر "سر مدگلہ اختصار می باید کرد..." کہہ کر اٹھتے اور گھر کی راہ لیتے۔

حلقے کی اس تتمہ مجلس میں جو جلسے کے خاتمے پر قریب ترین پب میں جمتی تھی ایک طے شدہ اصول یہ تھا کہ کوئی کسی انگریزی خاتون کو ساتھ نہ لائے۔ وجہ یہ تھی کہ اس محفل یاراں میں انگریزی کوئی نہیں بولنا تھا نہ بولنا چاہتا تھا۔ لطیفہ گوئی، ضلع جگت اور شعر خوانی کی اس بے تکلف گفتگو کے دوران اگر کسی کی انگریز گرل فرینڈ آ جاتی تو بس کباب کی ہڈی کا سماں پیدا ہو جاتا۔ سب لوگ اس اصول کی پابندی کرتے تھے مگر بے چاری الزبتھ چچا صدیقی پر ایسی فریفتہ ہوئی کہ سایے کی طرح چچا کے ساتھ رہتی۔ اس شام بھی الزبتھ چچا کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ محفل زوروں پر تھی کہ کسی نے اصغر گونڈوی کا شعر پڑھا ؎

دل میں اک بوند لہو کی نہیں رونا کیسا
اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

لندن میں اتنے دن انگریزی بولنے اور سننے کے بعد جیسے ہی کوئی شعر پڑھا ذہن گل و گلزار ہو جاتا اور ہائے والے اور واہ واہ کی آوازیں آنے لگتیں۔ آج بھی یہی ہوا۔ محفل میں جیسے ہی شعر پڑھا گیا داد دینے والوں نے ہائے ہائے کر کے کہرام مچا دیا۔ الزبتھ حیران تھی کہ کیا ہوا۔ کبھی اس کا منہ دیکھتی، کبھی اس کا۔ اسی حیرانی کے عالم میں اس نے چچا صدیقی سے کہا "پلیز میرے لئے اس شعر کا ترجمہ کرو"

چچا بے تکان بولے THERE IS NOT A DROP OF BLOOD IN MY HEART
NO GARDENS FALL FROM MY EYES

یہ سن کر الزبتھ کی حیرانی میں کمی کی بجائے اضافہ ہوگیا اور وہ رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولی WHAT IS THE NAME OF THE POET? میں نے بے تکان چچا صدیقی کے لہجے میں کہا THE YOUNGER ONE OF GONDA

میں حلقے کو انہیں لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ کر ۱۹۵۵ء کے اواخر میں لندن سے رخصت ہوا۔ پھر ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۰ء میں لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ چند دن کا قیام تھا۔ دوستوں سے حلقے کی خیر خیریت پوچھی۔ معلوم ہوا، چل رہا ہے۔ کوئی چار سال بعد افریقہ سے واپس آتے ہوئے لندن میں چند دن کے لئے رکا تو احباب صف شکستہ نظر آئے۔ تقی صاحب ایک روز اختر رضی صاحب سے شکایت کر رہے تھے کہ صاحب آپ نے اس مہینے بھی "محفل" کا جلسہ منعقد نہیں کیا۔ میں نے پوچھا تقی صاحب یہ "محفل" کیا چیز ہے؟ بولے "محفل" ایک ادبی محفل ہے جس کا جلسہ مہینے میں ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا "اور حلقہ؟" بولے "اب حلقۂ اربابِ ذوق ہی کو محفل کہتے ہیں اور اختر رضی صاحب اس کے سیکرٹری ہیں۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "تقی صاحب لیکن حلقے کا نام آپ لوگوں نے کیوں بدل دیا؟"

معلوم یہ ہوا کہ پچھلے برس ہندوستان کے ایک مشہور ادیب اور پاکستان کے ایک مشہور شاعر ماسکو سے واپسی پر لندن ٹھہرے۔ ان سے کہا گیا کہ حلقہ ارباب ذوق کے حلقے میں آکر کچھ پڑھیے۔ پاکستانی شاعر خاموش رہے مگر ہندوستانی ادیب بولے "صاحب۔ حلقہ ارباب ذوق ایک خاص نکتۂ نظر کی جماعت کا نام ہے۔ حلقے کا ایک اپنا طرز فکر ہے اور میں تو اس نکتۂ نظر سے کبھی وابستہ نہیں رہا۔ آپ لوگ کسی اور محفل میں بلائیں تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

یار لوگوں نے ان کی پذیرائی کے لئے جو جلسہ کیا اس کا نام محفل رکھ دیا۔ میں نے تقی صاحب کی طرف دیکھا تو وہ بولے "صاحب نام میں کیا رکھا ہے۔ حلقہ تو چل رہا ہے۔ صرف نام بدل گیا۔" میں نے کہا "اگر میرا یا آپ کا نام بدل جائے؟"

تقی صاحب بولے "اگر ہم کام وہی کرتے رہیں تو کیا فرق پڑے گا؟"

دو برس ہوئے گرمی کی چھٹیوں میں لندن جانا ہوا تو یاروں نے کہا چلو آج حلقے کی میٹنگ میں چلو۔ میں نے حیرت سے پوچھا "حلقہ؟" تقی صاحب بولے "جی ہاں، اب نام پھر حلقۂ ارباب ذوق ہو گیا ہے۔ میں نے آپ سے عرض تو کیا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ حلقہ بھی عجب سخت جان ہے۔ بے وطن ہو کر بھی جڑ پکڑ گیا اور نام بدل کر بھی اپنی اصل کی طرف لوٹ آیا۔

چاندگلی (الندن کے حلقے میں پڑھا جانے والا ایک افسانہ)

عطیہ حسین

کلو باورچی کو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ اسے اس گھر میں کام کرتے کتنے سال ہو گئے ہیں۔ وہ شروع میں اوپر کے کام کے لیے ملازم رکھا گیا تھا۔ خانساماں کا ہاتھ بٹانا اور دن بھر کبھی برتن مانجھتا، کبھی مسالہ پیستا اور بھاگ دوڑ کر ادھر ادھر کا کام کرتا اور جب ایک روز غلطی سے افیون کی ذرا بڑی چسکی لگا لینے سے بوڑھے خانساماں کا انتقال ہوگیا تو باورچی کی ملازمت اور افیون کی چسکی دونوں کو ورثے میں مل گئیں۔ کلو کی گھٹی میں ایک خاص قسم کی سست مزاجی تھی اور جب اس میں افیون کا نشہ بھی شامل ہوگیا تو کلو اس گھر کا ہو رہا۔ اس کو کبھی کبھی خیال آتا کہ اگر وہ چاہے تو یہ ملازمت چھوڑ کر کہیں زیادہ پیسوں کی نوکری بھی ڈھونڈ سکتا ہے مگر کون خواہ مخواہ استعفیٰ دے کر در در کی نوکری تلاش کرتا پھرے اور پھر برسوں یہاں نوکری کرنے کے بعد یوں معلوم ہونے لگا تھا جیسے وہ اس گھر کی اینٹوں تک سے مانوس ہوگیا ہے۔ اس نے اس گھر میں بچوں کو پیدا ہوتے، بچپن گزارتے، بڑھتے پھولتے اور جوان ہوتے دیکھا تھا۔ گھر کے بیٹوں کو دیکھ کر اسے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ان کا بڑا بھائی ہے۔

اسے اپنی عمر کا صحیح اندازہ تو نہ تھا لیکن جب وہ تھوڑی سی افیون کھا لیتا تو جیسے رگوں میں جوانی سی دوڑ جاتی اور اس شام وہ آنکھوں میں سرمہ لگائے، کان میں عطر کا پھویا رکھے، سر پر کڑھی ہوئی ٹوپی رکھے ایک طرف جھکائے جھومتا ہوا جاتا اور چاند گلی کا ایک آدھ چکر لگا آتا۔ اگلے روز صبح کو اس کی چال میں ایک خاص قسم کی سستی اور کام کرنے میں ایک دھیما پن آجاتا اور صبح کو جب وہ گودام سے دن بھر کے لیے آٹا، دال اور گھی لینے جاتا تو چاول تولتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپنے لگتے اور مغلانی کھانستے ہوئے کہتی، "تم مردوں کے تو قبر میں پاؤں لٹکے ہوں جب بھی باز نہیں آتے۔ کلو میاں میں کہتی ہوں تمہیں تو جورو کی ضرورت ہے جو تمہیں گھر بر رکھا کرے۔" یہ کہتے کہتے مغلانی جب گودام کا تالا لگانے لگتی تو اسے دمے کی کھانسی کا دورہ پڑ جاتا اور کلو کہتا "نہیں مغلانی مجھے تو بس اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی باورچی خانے کا چھوٹا موٹا کام کر دیا کرے دن بھر سارا کام خود کرتے کرتے میرے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں سر بوجھل ہو جاتا ہے" لیکن اس جواب کے

بچپن میں کبھی کلو کی شادی ہوئی تھی۔ تھوڑے عرصے بعد بیوی مر گئی مگر اس کی نشانی ایک لڑکا تھا جس کے ہاتھوں کلو ہمیشہ تنگ رہتا۔ ویسے یوں تو اپنے ننھیال میں رہتا مگر آئے روز پیسے لینے کے لیے کلو کے سر پر سوار رہتا۔ جب آتا یہی کہتا کہ "میری نوکری چھوٹ گئی ہے۔ کھانے کو پیسہ نہیں" اور کلو کا غصہ طوفان بن جاتا "پیسے زمین سے نہیں اگتے مردود! کام کرے گا تو پیسے بھی ملیں گے۔ کام نہیں ملتا تو یہاں چلا آ۔ میں تمھیں باورچی کا کام سکھا دوں گا جب تک کام نہیں سیکھتا بیگم صاحبہ سے دو چار روپے مہینے دلوا دیا کروں گا۔ تیرے باوا نے بھی تو اسی طرح کام شروع کیا تھا" یہ سن کر منے ہنسنے لگتا۔ "تو باوا نے کون سا تیر مار لیا ہے۔ یہاں نوکری کر لوں اور تیری طرح ساری عمر بیس روپلی پر پڑا رہوں۔ کلکٹر صاحب کے خانساماں کو دیکھو ساٹھ روپے لیتا ہے اور تو ابھی باورچی کا باورچی رہا۔ مجھے کہیں دکان میں کام مل گیا تو تمھیں دو چار روپے مہینے دے دیا کروں گا۔" کلو کا غصہ اور بھڑک اٹھتا "باپ تیرا ہی دیا تو کھاتا ہے الو کے پٹھے۔ دور ہو جا یہاں سے۔" لیکن اس کے باوجود بیٹے کی باتوں میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو ٹن سے کلو کے دل پر لگتی اور وہ سوچتا آخر میں نرا باورچی تو نہیں ہوں جو صرف ہندوستانی کھانا پکاتا ہو، میں تو خانساماں ہوں انگریزی کھانا پکانا جانتا ہوں اور پھر ذرا سوچیے کتنے آدمیوں کے لیے کھانا پکانا پڑتا ہے مجھے۔ خاں صاحب ایک، بیگم صاحبہ دو، دو لڑکے، پھر ہر روز دو تین مہمان بھی چلے آتے ہیں۔ سات آٹھ تو یہی ہو گئے پھر نوکر الگ رہے مغلانی ایک، بیوہ نصیبن جو مغلانی کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ نورا بیرا تین، خاں صاحب کا بیرا چار، اس کا چھوکرا حسنو پانچ اور پھر کبھی کبھی مہمانوں کے ساتھ بھی ایک دو نوکر چلے آتے تھے۔ غضب خدا کا صبح و شام درجن بھر آدمیوں کا کھانا پکاؤ اور بیس روپلی تنخواہ پاؤ" اور کلو سوچتا "یہ نوکری چھوڑ دوں گا تو مجھے کہیں بھی کام مل جائے گا میں تو انگریزی کھانا بھی پکا لیتا ہوں" مگر یہ غصہ جس تیزی سے آتا اسی تیزی سے چلا جاتا اور نوکری چھوڑنے کا خیال باورچی خانے کے دھوئیں میں تحلیل ہو جاتا۔ اور دن گزرتے جاتے۔ وہ صبح صبح بازار جاتا۔ سودا سلف خریدتا دکانداروں سے جھگڑتا۔ واپسی پر بیگم صاحبہ کو حساب لکھاتے ہوتے کسی نہ کسی بات پر بحث ضرور ہو جاتی اور سارا دن کھانا پکانے میں گزر جاتا اور جب وہ رات کو تھک ہار کر چارپائی پر لیٹتا تو مغلانی کی بات اس کے ذہن میں گھنگرو کی طرح بجنے لگتی اور وہ سوچتا سچ مچ بیوی ہوتی تو پاؤں ہی دبا دیتی۔ میٹھی چاپی ہی کر دیتی رات گزر جاتی اور اگلی صبح کو پھر وہی چکی کا دور شروع ہو جاتا۔

جب نصیبن چند دنوں کے لیے گھر چلی گئی تو کلو نے بالکل محسوس نہ کیا کہ اسے ایک آدمی کے لیے کم پکانا پڑ رہا ہے لیکن جب نصیبن واپسی پر اپنی بیٹی بھی ساتھ لیتی آئی تو کلو کو ایک آدمی کا اضافہ ضرور محسوس ہوا لڑکی کے آنے سے گھر میں ایک نئی لہر سی دوڑ گئی۔ آج سے پہلے نصیبن کو کسی نے گھر کا کوئی اہم رکن سمجھا تھا وہ تو سائے کی طرح ادھر سے ادھر گھومتی۔ مغلانی دن بھر اس پر حکم چلاتی اور وہ بے چاری سارا دن

گھر کے کام کاج میں لگی رہتی۔ اب اس کی بیٹی نے جیسے ماں کی اہمیت میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اب نصیبن محض ایک بدصورت بیوہ ہی نہ تھی اور دیکھنے والوں کو تو حیرت ہوتی کہ ایسی بدصورت ماں حسینہ جیسی بچی کیسے جن سکتی ہے۔ کلو نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "لو اب ایک اور پیٹ بھرنے کا بندوبست کرو اور دوسری طرف مرچ مسالہ تو اتنا ہی ملے گا۔ مجھے تو جادوگر سمجھتے ہیں کہ اسی آٹے دلیے میں کبھی بارہ کا پیٹ بھرے کبھی پندرہ کا۔" اور نصیبن جب باورچی خانے میں آئی تو اس کے لہجے میں معذرت سی تھی۔ "کلو میاں میں بچی کو ساتھ نہ لاتی تو گاؤں میں تم جانو اس عمر میں نوجوان لڑکی کا رکھنا اچھا نہ تھا۔ تمھیں اس سے کوئی دقت نہ ہوگی۔ میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھ لیا ہے وہ باورچی خانے میں تمھارا اوپر کا کام کر دیا کرے گی۔ اللہ رکھے بھرا پرا گھر ہے ہم غریبوں کی تو بچے کھچے کھانے پر ہی گزر ہو جاتی ہے اور میں تو ویسے بھی بڑھیا ہو رہی ہوں کلو میاں۔ بچی یہاں رہے گی تو میرا بھی خیال رکھے گی۔" "ٹھیک کہتی ہو۔ لو!" کلو کا لہجہ بدل گیا۔ "اب تم دیکھو خود میرا لڑکا ہے اللہ اسے سمجھے ایسا ناکارہ ہوا ہے کہ میرے کسی کام کا نہیں۔ میرے لیے تو کیا مشکل ہے مجھے تو کھانا پکانا ہے جہاں بیس وہاں اکیس۔"

"جگ جگ جیو کی تو دعائیں ہیں کلو میاں" اور نصیبن دعائیں دیتی ہوئی اندر چلی گئی۔

کلو نے پیاز کاٹتے ہوئے قمیص کے بازو سے آنکھیں پونچھیں اور جی ہی جی میں خوش ہوا۔ "چلو اب پیاز کاٹنے کو تو کوئی اور ملا۔"

اگلے روز جب کلو گودام میں آٹا اور گھی تول رہا تھا تو مغلانی بڑبڑانے لگی۔ "کس مشکل میں جان پھنس گئی کلو میاں۔ اب دیکھو نصیبن مجھے کہتی ہے کہ اس کی لڑکی کو چھوٹا موٹا گھر کا کام کاج سکھا دوں۔ لیکن لڑکی کو دیکھو تو دن بھر سر سے مسکی سے فرصت نہیں۔ اس عمر میں تو لڑکیوں کے دو دو بچے ہوتے تھے اور اس کی طرف دیکھو تو نہ سینا پرونا جانے نہ کھانا پکانا۔ میں نے نصیبن سے کہا اس کو جو تو نے اس طرح پالا ہے تو کون راجہ اس سے شادی کرے گا جسے یہ دن بھر بیٹھی اپنا حسن دکھایا کرے کلو میاں میں دن بھر تو اسے گھر کا کام کاج سکھاؤں گی اور شام کو وہ باورچی خانے کا کام کیا کرے گی تمھیں کھانا پکاتے دیکھے گی تو آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی۔ غریب کی بچی ہے تمھارا کیا ہے کسی کا بھلا ہو جائے گا۔"

"ٹھیک کہتی ہو مغلانی۔" کلو بولا۔ "اب میرے بیٹے ہی کو دیکھ لو۔ نہ کام نہ کاج نہ بڑوں کا ادب لحاظ میں کہتا ہوں مغلانی یہ نئی پود تو اللہ جانے کیا کر کے رہے گی۔" کلو نے کمر جھکائی سودا سلف اٹھایا اور باورچی خانے کے دھوئیں میں کھو گیا۔

کلو چولہے میں پھونکیں مار رہا تھا کہ وہ اندر آ گئی۔ "خانساماں جی" اس نے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا۔ "بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ حساب لکھا جاؤ پھر ان کو باہر جانا ہے۔" کلو نے لڑکی کی طرف دیکھا اور بولا

[illegible]

"تو مجھ سے کیا کہتے ہو، جو بیگم صاحبہ نے کہا میں نے تمہیں کہہ دیا ہم سے خواہ مخواہ ناراضی ہے" لڑکی کھلکھلاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ کلو بڑبڑاتا ہوا اپنا جوتا ڈھونڈنے لگا۔

جب وہ بیگم صاحبہ کو حساب لکھا رہا تھا تو وہ پھر آئی اور برآمدے کے ایک طرف سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے پانوں کی ڈھولی تھی اور وہ پان صاف کر کر کے گیلے کپڑے میں لپیٹ رہی تھی۔

بیگم صاحبہ نے بگڑ کر کہا۔ "دو روپے کے انڈے، کلو یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟"

کلو کو یوں محسوس ہوا جیسے حسینہ کی آنکھیں اس کی ہنسی اڑا رہی ہیں۔ "بیگم صاحبہ جو خرچ ہوتا ہے اسی کا حساب لکھاتا ہوں۔ میں خود تو انڈے نہیں کھاتا" کلو نے جیسے ناراض ہو کر کہا۔ پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بیگم بولیں۔ "لیکن گوشت تو کھاتے ہو نا کلو۔ اور اس عمر میں بھی سالن پکانا نہیں آیا تو کہیں سے سیکھ لیا ہوتا۔ کھانے کا ذائقہ روز بروز خراب ہو رہا ہے۔ پانی اور شوربے میں کچھ تو فرق ہوتا ہے۔ کلو، میں کہتی ہوں یہ گھی جو روز مغلانی سے لیتے ہو کہاں جاتا ہے۔" اب کلو نے دیکھا کہ لڑکی نے اپنے منہ پر دوپٹے کا پلو ڈال لیا لیکن اس کی آنکھیں جیسے ہنستی ہی جا رہی تھیں۔ کلو نے کہا۔ "جو مجھ سے بن پڑتا ہے کر دیتا ہوں بیگم صاحبہ! میں چور نہیں ہوں گھر کا خادم ہوں چولہے میں پھونکیں مارتے مارتے آنکھیں اندھی ہو گئی ہوں۔ اور پھر اس کا صلہ یہ ہے سارے باورچی خانے کا کام اکیلا دم کرتا ہوں اور جو تنخواہ ملتی ہے وہ تو آپ کو معلوم ہے۔ میں تو اس کام کے کہیں اور سے ساٹھ ستر روپے لوں لیکن یہاں پڑا ہوا ہوں کہ گھر کی بات ہے۔ اور پھر اس پر آپ بھی مجھے چور سمجھتی ہیں۔"

"کلو تم تو پاگل ہو گئے ہو۔" بیگم صاحبہ کی آواز بلند ہوئی۔ "ہر بات کے جواب میں یہی کہانی لے بیٹھتے ہو جاؤ جب افیون کا نشہ کم ہو تو آنا۔"

کلو نے لڑکی کی طرف نہیں دیکھا۔ اسے معلوم تھا اس کی آنکھیں اب بھی ہنس رہی ہیں وہ چپ چاپ اٹھا اور باورچی خانے میں چلا آیا۔

اس کے بعد کلو نے لڑکی سے جو باورچی خانے کا کام کرانا شروع کیا تو گویا زچ کر دیا۔ آگ جلاؤ برتن مانجھو، مسالہ پیسو، پیاز کاٹو اور اس پر وہ دن بھر اسے کوستا۔ کبھی کبھی مغلانی سے شکایت کرتا تو مغلانی رہی سہی کسر پوری کر دیتی، کبھی نصیبن سے کہہ کر دو چار تھپڑ لگوا دیتا۔ وہ نصیبن سے کہتا۔ "نصیبن یہ تمہاری لونڈیا کوئی کام نہیں کرتی۔ جب دیکھو لڑکوں سے دیدے لڑاتی رہتی ہے اور جہاں کہیں حسنو نظر آتا ہے وہیں جم کر کھڑی ہو جاتی ہے۔"

حسنو نوجوان تھا اور اپنی پگڑی پر کلف لگا ہوا طرہ لگائے رکھتا۔ بیرے کی سفید پگڑی پر سبز رنگ کی

"حسینہ؟" کلو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور منمناتی بولی۔ "نہیں نہیں کلو میاں میں یہ تو نہیں کہتی۔ لیکن میں آخر دن بھر تو وہاں نہیں بیٹھ سکتی نا۔ لو یہ چاول ترازو میں ڈالو۔"

کہنے کو تو بات ختم ہو گئی۔ لیکن کلو کے دل میں جیسے زہر کی بوند پڑ گئی ہو۔ اس نے اپنے لڑکے اور حسینہ کی ایک ایک بات کو غور سے دیکھنا شروع کیا اور اب اسے ان کی باتوں میں، ان کی ہنسی میں، ان کی آنکھوں میں ہزار ہزار معنی نظر آنے لگے۔ اگر کلو حسینہ کے پاس ہوتا تو حسینہ اکثر خاموش رہتی۔ کلو جتنی بات کرتا وہ سن لیتی۔ لیکن جونہی منے آتا تو جیسے ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگتے۔ ایسے موقعوں پر وہ کلو کے آرام و آسائش کا پہلے سے کہیں زیادہ خیال رکھتی۔ اب تک تو کلو کو ان باتوں کا خیال ہی نہ آیا تھا لیکن اب اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ کیوں اس کے دوست آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے تھے۔ کیوں ان کی خاموشی کے پیچھے قہقہوں کی گونج سنائی دیتی تھی۔

کلو کا قاعدہ تھا کہ وہ ہر روز خود سودا خریدنے جاتا۔ وہ سمجھتا اول تو منے کے ہاتھ میں پیسے دینا غلط اور پھر اس کی طرح بھلا کون دیکھ دیکھ کر سبزی گوشت خرید سکتا تھا۔ صبح اسے بازار میں سودا سلف لینے میں دو گھنٹے لگ جاتے اور پھر شام کو بھی کم از کم ایک گھنٹہ خرید و فروخت میں صرف ہوتا۔ کلو نے محسوس کیا کہ اس کے لڑکے کی آوارہ گردی کی پرانی عادت جیسے ایک دم ختم ہو گئی ہو۔ ایک روز اس نے کہا "منے کل سے سودا خریدنے تو جایا کرے گا۔ ادھر میری طبیعت کچھ اچھی نہیں اور اب تجھے سودا سلف خریدنے کا بھی ڈھنگ سیکھنا چاہیئے۔" کلو نے دیکھا کہ یہ سنتے ہی اس کے لڑکے کے چہرے پر ناخوشی کا اظہار جھلکنے لگا۔ حسینہ کلو کے پیچھے کھڑی تھی اس کی صرف آواز سنائی دی۔ "کیوں تمہیں کیا ہو گیا ہے اچھے بھلے تو نظر آتے ہو۔"

"تم سے کون پوچھ رہا ہے۔" کلو نے بگڑ کر کہا۔

"میں کیا کہتی ہوں۔ میرے لیے تو کوئی سودا خریدے، مجھے کیا۔ میں تو بیگم صاحبہ کی وجہ سے کہہ رہی تھی کہ کہیں حساب میں گڑبڑ ہو گئی تو؟"

"گڑبڑ کیسے ہو گی؟" کلو نے رعب سے کہا۔ "منے کوئی دودھ پیتا بچہ ہے۔" یہ کہہ کر کلو کوٹھڑی سے باہر نکل آیا اور ایک طرف لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر منے باہر نکلا۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا اور سیٹی بجاتا ہوا باورچی خانے کی طرف چل دیا۔ کلو اپنی کوٹھڑی میں واپس چلا آیا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو حسینہ آہستہ آہستہ بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ کلو نے کواڑ بھیڑ دیے۔ حسینہ نے تیزی سے کہا "کیوں کیا بات ہے؟" کلو آگے بڑھا تو جیسے حسینہ کے لہجے میں نفرت کی تلخی بڑھتی گئی۔ "نہیں نہیں

ابھی نہیں، مگر کلو نے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔

اب کلو احتیاط رکھتا کہ اس کے دوستوں، گھر کے لوگوں، دوسرے ملازموں کو اس کے بدلے ہوئے رویے کا پتہ نہ چلے، لیکن دوسری طرف وہ ہر وقت اس کوشش میں لگا رہتا کہ کبھی حسینہ اور منے کو اکیلے رہنے کا موقع نہ ملے۔ کلو نے دیکھا اب حسینہ بے چین سی رہتی اور اس کی بدمزاجی بڑھتی جاتی اب اس کا سنگار کا شوق بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا ہوتا۔ نصیبن اور مغلانی نے دیکھا تو ایک دوسری سے کہنے لگیں۔ بُوا، پہلے بچے کی پیدائش پر ایسا ہی ہوتا ہے۔

کلو کا لڑکا بھی اب منہ سوجائے رہتا اور اس کا انداز پھر اسی طرح گستاخانہ ہوتا جا رہا تھا۔ کلو نے ایک روز اسے دھمکایا اور کہا کہ وہ اسے واپس بھیج دے گا۔ اس دھمکی کے بعد اس نے پھر دل لگا کر کام کرنا شروع کر دیا۔ اب کلو اس کو سودا لینے بازار بھیجتا۔ کبھی کبھی اسے اپنی تنخواہ میں سے وہ رقم پوری کرنی پڑتی جو بیگم کو حساب سکھاتے وقت کم پڑتی۔ لیکن اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ ان دونوں کو اکٹھے رہنے کا موقع نہ دے گا۔

کلو کے دل میں شک اب گھر کر گیا تھا کہ جوں جوں دن گزرتے رہے اسکو یہ غم کھائے جاتا تھا۔ اس نے چوکس رہنے کے لیے افیم کی چسکی کم کر دی تھی جب سے منے آیا تھا وہ دونوں کمرے میں سوتے اور منے باہر چھپر کے نیچے پڑا رہتا۔ حسینہ بار بار رات کو گرمی اور حبس کا تذکرہ کرتی اور کلو کو مجبوراً دروازہ کھولنا پڑتا کلو کا شک اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ وہ سوتا بھی تو معلوم ہوتا جیسے اسکا ایک حصہ جاگتا رہتا اور چوکیداری کا فرض انجام دیتا ہے۔

رات بھر بھی کئی کئی بار اس کی نیند کھل جاتی اور کچھ دنوں کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ رات بھر نیند کے خلاف جدوجہد کر کے جاگنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ حالانکہ دن بھر کے کام کاج کے بعد اس کا رواں رواں سونے کا آرزومند ہوتا ہے۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے اور پھر اس نے بے نیاز ہو کر گہری نیند سونا شروع کر دیا۔ مگر چند ہی دنوں بعد جب اس نے دیکھا کہ حسینہ کی خوش مزاجی لوٹ آئی ہے اور منے پھر دل لگا کر کام کرنے لگا ہے۔ تو شبہات کا طوفان پھر پوری شدت سے ٹوٹ پڑا۔

ایک صبح کلو کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ یوں وہ علی الصبح اٹھنے کا عادی تھا اور آج جب وہ اس قدر دیر سے اٹھا تو اسے اس خیال سے گھبراہٹ ہوئی کہ اس وقت تک تو وہ اپنا کام ختم کر چکا ہوتا ہے پھر اس کی نظر حسینہ کے فکرمند چہرے پر پڑی اور اس کے کانوں میں اس کی آواز آئی۔ شکر ہے تم سو کر اٹھے ہو۔ میں تو گھبرا گئی تھی اسی لیے میں مغلانی سے جا کر کھانے کا سامان

وہ حسینہ کی پرواہ کرتے ہوئے منہ ہاتھ دھونے کے لیے نل کی طرف بڑھا۔ جی میں سوچ رہا تھا کہ آج دیر سے اٹھنے کا کیا جواب دے گا لیکن معلوم ہوتا ہے جیسے اس خیال کے نیچے دماغ کی دوسری لہر سے شبہات کا طوفان اٹھ اٹھ کر ہر خیال پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔

جب حسینہ اپنی ماں سے ملنے چلی گئی تو کلو چپکے سے اپنے کمرے میں آیا اور اپنا صندوق کھول کر اپنی افیم تلاش کرنے لگا آخر وہی ہوا جس کا اسے شک تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حسینہ اسے رات کو سونے سے پہلے افیم کھلا دیتی ہے اور کل رات شاید بے دھیانی میں ذرا زیادہ ہی دیدی گئی ہو لیکن آخر یہ ہوتا کیسے ہے اور سوچتے سوچتے اسے خود ہی جواب مل گیا۔ وہ ہر رات اپنے ہاتھوں سے پان لگا کر اسے کھلاتی تھی۔

اس رات جب حسینہ نے اسے پان دیا تو اس نے چپکے سے منہ میں رکھ لیا۔ لیکن کسی بہانے باہر چلا آیا۔ اس نے پان تھوک ڈالا اور دوسرا پان منہ میں رکھ کر کمرے میں چلا آیا۔ کچھ عرصے بعد وہ پڑ کر سو گیا اور یوں خراٹے لینے لگا جیسے گہری نیند میں کھویا ہوا ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ حسینہ پلنگ سے اٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔ اب اس کی سانس اس کے چہرے کو چھو رہی تھی مگر وہ خاموشی سادھے لیٹا رہا۔ اب وہ آہستہ سے پلنگ سے نیچے اتر آئی اور کلو نے اس کے قدموں کی چاپ سنی جو آہستہ آہستہ کمرے کے دروازے تک گئی اور پھر وہ باہر نکل گئی۔ اب اس نے اندھیرے میں دونوں کی سرگوشیاں سننی شروع کیں۔ پھر منے کی چارپائی کے چرچرانے کی آواز سنائی دی جیسے وہ اس پر بیٹھ گئی ہو۔ اب کلو نے آنکھیں کھولیں۔ مگر اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اور یوں محسوس ہوا جیسے اس کا بدن لاش کی طرح سخت ہو گیا ہے پھر جیسے وہ کسی دہشت کے اثر سے اٹھ بیٹھا۔ اور دروازے کی طرف بڑھا۔ یقیناً ان دونوں نے اس کے قدموں کی آواز سنی ہو گی جبھی تو منے چارپائی کے ایک طرف دبک کر بیٹھا تھا اور وہ چارپائی کے دوسرے کنارے دوپٹہ لپیٹے منہ چھپائے گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ کلو کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور وہ سہارے کے لیے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جیسے اس کے غصے اور دہشت پر گہری ندامت نے سایہ ڈال دیا۔ معلوم ہوتا تھا رات کی یہ گہری خاموشی اس کی دشمن ہے جو ابھی چیخ چیخ کر اسکی ندامت کی تشہیر کر دے گی۔ سارا گھر جاگ اٹھے گا اور گھر کی ایک ایک اینٹ ہنسنے لگے گی۔

اس کی آواز مدھم تھی مگر اس کی کرختگی سے کہا "چلو اندر چلو" اور خود گرتا پڑتا اندر چلا آیا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ اب اس کو نیچی آواز میں بات کرنے کی کوشش سے کام لینا پڑتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ چیخ اٹھتا۔ مگر اس نے آہستہ سے "اگر میرا بس چلتا تو تمہیں ابھی مار ڈالتا۔ اس

[illegible]

...“ اس کی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی اور آنسو اس کے چہرے کی جھریوں پہ پھیل گئے منے اندھیرے میں کمرے کے کونے کی طرف بڑھا جہاں اس کا چھوٹا سا صندوق پڑا رہتا تھا۔ اس نے خاموشی سے اسے اٹھایا اور اپنی وحشت زدہ آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ کمرے کی خاموشی میں محض حسینہ کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کلو خاموش کھڑا تھا اور کمرے کے باہر منے کے بستر پیٹنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ابھی صبح ہونے میں کچھ دیر تھی باہر صحن میں منے کے قدموں کی چاپ صحن سے ہوتے ہوتے پھاٹک کے قریب مڑ کر غائب ہو گئی اور کلو سوچنے لگا گھر میں اس وقت کون کون اس شور سے جاگ اٹھا ہوگا حسینہ ابھی تک رو رہی تھی۔ کلو نے دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔

اگلے روز سب لوگوں نے منے کی غیر موجودگی کو محسوس کیا لیکن کلو کی سرخ آنکھوں اور سوجے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کسی کو پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے خود ہی غصے سے کہا۔

“وہ مردود پھر بھاگ گیا ہے۔ کمبخت کسی جگہ ٹک کر بیٹھنا نہیں جانتا۔” حسینہ دن بھر منہ لپیٹے پڑی رہی اور کلو نے نصیبن سے کہا۔ ”تمہاری بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں اس کا خیال رکھنا۔“ نصیبن نے یہ بے حیائی کی بات سنی تو بیٹی کے پاس جا کر زار زار روئی۔ اس نے منہ سے کچھ نہ کہا لیکن اسکی اداس آنکھیں اس پر ہزاروں لعنتیں بھیجتی رہیں۔ مغلانی بھی خاموش رہی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس جذباتی طوفان کی لہریں بھی ختم گئیں اور سیدھی سادی زندگی پھر اسی راستے پر آ گئی۔ کلو دن بھر کی تھکن میں یہ تلخی بھول جاتا اور حسینہ پھر گھر کے کام کاج میں لگ گئی ہاں البتہ اب اس کی آنکھوں میں وہ نرمی نہ رہی تھی نہ اس کے ہونٹوں کا وہ خم دلدوز رہا تھا۔ پان اور نسوار کھا کھا کر اس کے دانت کالے پڑ گئے تھے۔ لڑکپن کی کوئی سادگی اب اس کے چہرے پر باقی نہ رہی تھی اب کبھی کبھی اپنے پیٹ میں بچے کا بوجھ اسے برا لگتا تھا اور ایک روز وہ اندھیرے میں ٹھوکر لگنے سے گر گئی۔ جب دائی کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تو کلو ڈاکٹر کو لے آیا لیکن کچھ نہ ہو سکا۔

کلو کا غم کے مارے برا حال ہو گیا۔ اور نصیبن نے رو رو کر آنکھیں لال کر لیں جیسے حسینہ کا نہیں اس کا اپنا بچہ ضائع ہو گیا ہو۔ اس بیماری کے طفیل حسینہ کو ایک بار پھر توجہ اور آرام کے دن میسر آ گئے اور تمام درد اور تکلیف کے باوجود اس کے دل کا کوئی نہ کوئی حصہ مطمئن تھا۔ جب وہ صحت مند ہو گئی تو اس کی ماں نے کہا۔ ”میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھ لیا ہے میں تیری جگہ باورچی خانے میں کام کروں گی اور تو زنانے میں میرا کام کر دیا کر۔“ حسینہ کو اس بات پر خوشی ہوئی یوں بھی اسے باورچی خانے کا

... ... اسے روپیے دیئے رہائی مل گئی تھی کلو بھی کمبخت کیسے ہر وقت اس پر نظر رکھتا تھا۔

اب وہ زنانے میں مغلانی کا ہاتھ بٹاتی اور نصیرن کا کام کرتی لیکن اسے سب سے زیادہ بیگم صاحبہ کا کام کر کے خوشی ہوتی تھی۔ وہ ریشمی کپڑے تہہ کرتی تو اس کا بار بار ان پر ہاتھ پھیرنے کو جی چاہتا کیسا لطف آتا تھا ریشم کو چھو کر جیسے سارے بدن میں جھرجھری دوڑ جاتی اور پھر پوڈر، سرخی، عطر اور سنگار کا دوسرا سامان! اگر کوئی ان چیزوں کو سجانے کو کہتا تو وہ سارا دن اسی میں صرف کر سکتی تھی آج تک تو اسے کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی لیکن اب تو وہ بیگم صاحبہ کی ذاتی ملازمہ تھی اور کاموں کے ساتھ ایک یہ کام بھی حسینہ کے ذمے تھا کہ وہ دونوں وقت کھانے کے بعد پان لگایا کرے اور پھر وہ پان لگا کر الائچی اور چھالیہ کے ساتھ چاندی کے خاصدان میں رکھ کے حسنو کے حوالے کرتی کہ مردانے میں لے جائے۔ حسنو منے سے بڑا اور شکل صورت میں اس سے بہتر تھا۔ مگر منے کے واقعے کے بعد تو حسینہ کا دل جیسے بجھ سا گیا تھا۔ حسنو اس کی طرف دیکھتا بھی تو وہ آنکھیں جھکا لیتی مگر پھر کبھی کبھی راکھ میں سے کوئی چنگاری چمک اٹھتی۔ کلو نے دیکھا اب حسینہ کی خوش مزاجی واپس آ رہی تھی اور جونہی حسینہ کی خوش مزاجی واپس آئی کلو کے شبہات بڑھنے لگتے لیکن اس دفعہ تو کلو کو اس کی خوش مزاجی کی وجہ بھی سمجھ میں نہ آئی تھی البتہ اس کے دماغ پر اس کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر مغلانی نے دیکھا کہ حسنو اب اندر کے کمروں کے کچھ زیادہ ہی چکر کاٹنے لگا تھا۔ کبھی کبھی مغلانی دبے پاؤں کمرے میں چلی جاتی تو دیکھتی کہ حسنو کا سایہ تو جلدی سے دوسرے دروازے سے غائب ہو جاتا اور حسینہ ادھر ادھر کسی کام میں مصروف نظر آنے لگتی یا جھاڑن لیے چیزیں پونچھنے لگتی۔ ایک دو مرتبہ تو اس نے ان دونوں کو ہنس ہنس کر باتیں کرتے بھی دیکھ لیا تھا۔ آخر اس نے حسینہ سے کہا۔ "بے شرم! کیا تو نے ابھی تک سبق نہیں سیکھا۔ بے حیا کیوں ہنس ہنس کر غیر مردوں سے باتیں کرتی ہے۔"

"تو اس میں کیا برائی ہے۔" حسینہ نے تنک کر کہا "تم تو چاہتی ہو کہ میں نہ ہنسوں، نہ بولوں تم تو ہمیشہ لوگوں کے بارے میں برا ہی سوچتی ہو۔" اب حسینہ ناراض ہو کر روہانسی ہو گئی تھی۔ مغلانی نے کہا "تو خود ہی اپنے کیے پر پچھتائے گی، لڑکی! کلو کو چاہیے تھا کہ تجھے پردے میں ڈالتا۔"

یہ بات کلو کے کانوں تک پہنچانا مغلانی اپنا فرض سمجھتی تھی۔ لیکن کلو بے چارہ کیا کرتا۔ حسینہ نے ہزار قسمیں کھائیں کہ کوئی بات ہی نہیں ہے کلو کو جب گھبراہٹ ہوتی تو وہ افیم کا رخ کرتا یہی تو سہارا تھا جس سے دکھ بھی غلط ہو جاتا تھا۔

ایک دن شام کو جب کلو چپکے سے کوٹھری میں آیا تو اس نے دیکھا حسینہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہے اس کا خیال تھا وہ اس وقت لتانے میں کام کر رہی ہو گی مگر وہ تو کھڑکی کے سامنے کھڑی آئینہ دیکھ رہی تھی اور جونہی کلو اندر آیا حسینہ کونے کی طرف کھسکنے لگی اور اپنا پاجامہ نیچے کھینچ کھینچ کر پاؤں چھپاتی جاتی تھی۔ کلو نے آگے بڑھ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ "اوہ خدایا!" کلو کے منہ سے بے ساختہ نکلا "کمبخت کی بچی یہ کیا کر رہی ہے"

حسینہ کا چہرہ پوڈر کی دبیز تہوں، گال اور ہونٹ سرخی اور لپ سٹک کے دھبّوں سے لپے ہوئے تھے۔

"کہاں سے لیا ہے یہ سامان تو نے" کلو نے کڑک کر پوچھا۔ "کمبخت کی بچی بازاری عورتوں کی طرح پوڈر لگاتے تجھے شرم نہیں آتی"

"بیگم صاحبہ جو سرخی پوڈر لگاتی ہیں تو انھیں بھی یہی کہو گے"

"تو، تو بیگم صاحبہ کا مقابلہ کرے گی۔ سچ بتا یہ تجھے کس نے دیا ہے"

"انھوں نے خود ہی مجھے دیا ہے"

"سچ بتا ورنہ میں ابھی جا کر بیگم صاحبہ سے پوچھتا ہوں"

"نہیں خدا کے لیے نہیں۔ میں خود ہی لے آئی تھی۔ میں واپس کر دوں گی۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا میں تو صرف ایک دفعہ لگا کر دیکھنا چاہتی تھی" اب حسینہ ڈر کے مارے کلو کی منتیں کر رہی تھیں وہ کیسے بتاتی کہ یہ سب کچھ تو حسنو کی وجہ سے ہوا تھا جو ہمیشہ اسے شہر کی عورتوں کے قصے سناتا ان کے حسن اور معاشقے کی کہانیاں سناتا کہ وہ کیسے کیسے بن سنور کر اس پر ڈورے ڈالتی تھیں۔ اب کلو نے اسے کھینچ کر کہا "اور وہ کیا ہے جو تو چھپا رہی ہے" اس نے اس کے پاجامے کے پائنچے اٹھا کر دیکھا حسینہ ریشم کی جرابیں پہنے کھڑی تھی۔ "میرے اللہ!" کلو پلنگ پر بیٹھ گیا "اب تو نے چوری بھی شروع کر دی ہے نامراد مجھے اس گھر کا نمک کھاتے بیس پچیس سال ہو گئے ہیں۔ آخر میں نے کیا گناہ کیا تھا کہ تو میری قسمت میں لکھی تھی" مگر حسینہ جیسے مری ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی "میں انھیں واپس رکھ آؤں گی کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا"

"لیکن میں تو بیگم صاحبہ کو بتا کے رہوں گا مجھ سے برداشت نہ ہو گا"

"نہیں خدا کے لیے نہیں، تمھیں میری قسم، میں تمھارے پاؤں پڑتی ہوں پھر کبھی ایسی حرکت نہ کروں گی"

اس دن کے بعد کلو نے اسے بات نہیں کی دنیا کی نظر میں وہ اس کی بیوی تھی لیکن وہ اسے

[illegible] جیسے رام
[illegible] غائب ہو گیا ہے نصیبن ہر دم اسے روکر مری جا رہی تھی۔ مغلانی نے کہا میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ اس کو ذرا پردے میں رکھنا چاہیئے تھا۔ حسنو کے باپ نے کہا اس بدچلن نے تو میرے لڑکے کو بھی خراب کر ڈالا۔ میرا لڑکا تو واپس آ کے گا بس اس کے پیسے ختم ہونے دو پھر دیکھوں گا کیسے اس چھنال سے ملتا ہے۔ نصیبن نے ایک دن روتے ہوئے کہا میرے لیے تو وہ مر گئی۔ خدا مجھے اس کی شکل نہ دکھائے۔

کلو اس زمانے کو بھول ہی جانا چاہتا تھا کوئی حسینہ کی بات بھی کرتا تو وہ منہ پھیر لیتا اور کچھ عرصے بعد جب حسنو سچ مچ واپس چلا آیا اور اس کے باپ نے منت سماجت کر کے اور اپنی ساری عمر کی نوکری کا واسطہ دے دے کر اسے خان صاحب سے بھی معافی دلا دی تو لوگوں نے دیکھا کہ کلو نے حسنو کے خلاف کسی غصے یا نفرت کا اظہار نہ کیا۔ نصیبن نے البتہ اس سے کبھی بات نہ کی لیکن مغلانی کے دل میں جو کھد بد تھی اس کا کیا کرتی۔ آخر اس نے پتہ چلا کر گھر والوں تک یہ بات پہنچائی کہ حسینہ کسی کے ہاں نوکر ہو گئی ہے۔ جب حسنو کے سب پیسے ختم ہو گئے تو حسنو نے اسے کہیں ملازمت دلوا دی تھی۔ باپ کے ڈر سے وہ اس سے شادی نہ کرتا تھا۔ لیکن اب بھی چھپ چھپ کر اس سے ملنے چلا جاتا تھا۔

جب کبھی مغلانی کلو سے حسینہ کی بات کرنا چاہتی تو کلو سنی ان سنی ایک کر دیتا۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ادھر ادھر کسی کام میں لگ جاتا۔ مگر کبھی کبھی جب مغلانی باز ہی نہ آتی تو کلو کہتا "وہ تو چڑیل تھی، مغلانی، ڈائن تھی ڈائن۔ میں کہتا ہوں نصیبن اس کی جگہ سنکھیا پھانک لیتی تو اچھا تھا"۔ ایک دفعہ کلو نے یہاں کہہ دیا۔ "خدا کا شکر ہے میرا تو ڈائن سے پیچھا چھوٹا"۔

لیکن جوں جوں کلو کی چوٹ کم ہونے لگی اسے اس کا بار بار خیال آنے لگا۔ کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا مغلانی حسینہ کی باتیں کرے اور وہ سنتا رہے یہ بھی تو معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے پھر حسنو نے مغلانی سے کہا کہ اب وہ اسے بتائے بغیر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

کلو جب افیم کی چسکی لگا لیتا اور اردگرد کی دنیا کے نقوش دھندلے پڑ جاتے اور ان پر یادوں کے اچھے اچھے سائے ابھر کر حکمرانی کرنے لگتے تو پھر ایک مسکراتی، ہنستی، کھلکھلاتی ہوئی جوان لڑکی ذہن کے کسی کونے سے ابھر آتی وہ شریر تھی معصوم تھی، جوان تھی بالکل اس حسینہ کی طرح جس سے کلو کی شادی ہوئی تھی اور یہ سایہ کلو کے ذہن سے چمٹا ہوا تھا اور کلو ہر دوسرے تیسرے دن افیم کی چسکی لگائے چاند گلی کی سیر کو نکل جاتا۔

ایک شام وہ چاند گلی کے ہجوم میں کھویا ہوا ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور قمقموں کی روشنی میں

کھڑکیوں میں بیسیوں حسینائیں مسکرا مسکرا کر گزرنے والوں کو بلاوا دے رہی تھیں۔ اتنے میں کلو کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔

اوپر ایک کھڑکی میں حسینہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرمے کی دھاری تھی۔ اس کے بے جان زرد چہرے پر پوڈر کی تہیں تھیں۔ لعل ہونٹوں کی سرخی کے پیچھے تمباکو کے مارے ہوئے سیاہ دانتوں کی مسکراہٹ جھانک رہی تھی۔

کلو الٹے پاؤں پاگلوں کی طرح چاند گلی سے بھاگا جا رہا تھا اور کسی نے اس سائے کا گلا گھونٹ دیا تھا جو کبھی کبھی اس کے ذہن کے پردوں سے ابھر کر مسکرانے لگتا تھا۔

OO

اجلاسوں کی روئیداد۔ چند اقتباسات

حلقے کے رجسٹر سے

حلقۂ اربابِ ذوق کا گزشتہ ماہانہ اجلاس چار اکتوبر کو وکٹوریہ لیگ کے کمیٹی روم میں شام کے نو بجے منعقد ہوا۔ حمید شیخ نے صدارت کے فرائض ادا کیے۔ گزشتہ جلسے کی کاروائی پڑھی گئی جو منظور ہوئی۔

آج کے پروگرام کی پہلی چیز غیب الرحمٰن کی نظم تھی جس کا عنوان تھا "یاد کرنا"؛ نظم کا آغاز اس بند سے ہوتا تھا۔

جب یہ تاریک رات ڈھل جائے   اور مشرق سحر بداماں ہو
بامِ گردوں پہ آفتاب آئے   پھر طربناک بزمِ انساں ہو
یاد کرنا یہ بھیگیں لمحات
یہ عذاب دستور یہ آفات

اس کے بعد نظم کے تین اور بند تھے جس میں شاعر نے موجودہ انسانیت کے نالہ ہائے نزل اور آدمی کے جنوں کی تصویریں پیش کی تھیں۔ روحِ انسانی کی چاک دامانی اور نفرتوں کی ارزانی کا تذکرہ تھا۔ جن سے بازارِ غرب ہے معمور نظم اس شعر پر ختم ہوئی تھی۔

رحلتِ شب کی داستاں ہے یہ
وقت کی آخری فغاں ہے یہ

نظم کے خاتمے پر صاحبِ صدر نے حاضرین کو دعوتِ تنقید دی۔

اعجاز نے نظم کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس کا ابتدائی بند بہت کامیاب ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے پہلے بند میں جو بات جذباتی طور پر محسوس کی ہے اگلے بندوں میں اسے Intellectual انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تقی نے کہا مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے نظم کے آخر میں جذبات کا کلائمکس موجود ہے اور نظم سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر جو کچھ کہہ رہا ہے وہ محض ایک خوش آئند خواب ہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک پورا سلسلۂ فکر موجود ہے۔

یاور عباس کو نظم کے عنوان پر اعتراض تھا۔ انھوں نے جون کے ایک شعر کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ "یاد کرنا" ایک رومانی طرزِ تخاطب ہے اور نظم کے موضوع سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر "یاد کرنا" نہیں "یاد رکھنا" کہہ رہا ہے۔ "کرنا" میں کچھ ایسا Nostalgia شامل ہے جو اس نظم کا جذباتی جزو معلوم نہیں ہوتا۔

اعجاز کا خیال تھا کہ نظم میں Nostalgia کا احساس تو نہیں ہوتا البتہ یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے آپ پر رحم آ رہا ہے اور وہ آنے والی نسلوں سے اس بات کی توقع کر رہا ہے کہ وہ آنے والی صبح کو اس کی اور اس کی نسل کے لوگوں کی قربانیوں کا منطقی نتیجہ تصور کریں اور اس دوزخ کا خیال کریں جس نے اس کی اور اس کے ساتھیوں کی روح کو جھلس ڈالا ہے۔

تقی نے کہا نظم پر بحث کرتے ہوئے ہمیں دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔ شاعر اس پورے دور پر تنقید کر رہا ہے اور وہ خود بھی اس دور سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ جذباتی طور پر بھی اس میں شامل ہے اور عقلی اعتبار سے اس کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نظم میں عقل اور جذبے کا بہت مناسب امتزاج ملتا ہے۔

صاحبِ صدر نے کہا مجھے اس نظم پر یہ اعتراض ہے کہ اس کے تین بندوں میں جہاں موجودہ دور کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہاں صرف بازارِ مغرب کو نفرتوں کی ارزانی سے معمور کیا گیا ہے۔

مجلس میں بعض اصحاب کا خیال تھا کہ نظم کے پہلے بند میں "اور مشرق سحر پہ اماں ہو" اور تیسرے بند میں بازارِ مغرب کے تذکرے نے ایک جغرافیائی اور سیاسی تقسیم مقصود ہے۔ افتخار ملک کا خیال تھا کہ جہاں تک انسانیت کا سوال ہے مشرق اور مغرب دونوں بازاروں میں نفرت کی ارزانی ہے اور انسانیت کے مسائل ایسے الگ الگ نہیں ہیں مگر خورشید کا خیال تھا کہ مشرق اور بازارِ مغرب کے اس تذکرے سے کوئی سیاسی حد بندی مقصود نہیں بلکہ شاعر ساری انسانیت کو مخاطب کر رہا ہے۔

صاحبِ صدر کا خیال تھا کہ نظم پر کافی بحث ہو چکی ہے لیکن پیشتر اس کے کہ وہ نظم کی بحث ختم کرتے یاور عباس نے کہا میں اس سے پہلے نظم کی ڈکشن کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں فارسیت کی بہت بھرمار ہے اور کم از کم "مثلو" جیسے الفاظ بہت گراں گزرتے ہیں۔

○○

حلقۂ اربابِ ذوق کے گزشتہ ماہانہ اجلاس تین اکتوبر کو شام کے ساڑھے آٹھ بجے وکٹوریہ لیگ کے کمیٹی روم میں منعقد ہوا۔ صدیق احمد صدیقی نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔

گزشتہ اجلاس کی کارروائی پڑھی گئی جو منظور ہوئی۔ پروگرام کی پہلی چیز تقی احمد سید کا مضمون تھا "آرٹ

[illegible] پڑھنے کے بعد انہوں نے آرٹ اور حقیقت پسندی
کے باہمی تعلق کا رشتہ ظاہر کیا حقیقت پسندی کے تین مفہوم واضح کرنے کے بعد حقیقت پسندی کا وہ مفہوم متعین کیا جو ان کے نزدیک درست مفہوم تھا۔

مضمون کے خاتمے پر صاحبِ صدر نے مضمون تنقید کے لئے پیش کیا۔ ضیا محی الدین نے کہا مضمون ضرورت سے زیادہ بیانیہ ہے اور کہیں کہیں تو تضاد پیدا ہو گیا ہے۔

صاحبِ مضمون نے کہا میں نے مقالے کے شروع میں چند سوال کئے ہیں اور پھر ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

صاحبِ صدر نے بحث کا دائرہ مقرر کرنے کے لئے مقالے کا خلاصہ پیش کیا۔

اعجاز نے کہا اس مضمون کا کوئی محور معلوم نہیں ہوتا اس لئے مضمون کے مختلف حصے الگ الگ بیانات معلوم ہوتے ہیں۔

صاحبِ مضمون نے کہا مجھے اس بات سے اتفاق ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مضمون میں ایک چیز بالکل واضح ہے کہ لکھنے والا اچھا اور مفید ادب اسی کو سمجھتا ہے جو ارتقائی عمل میں ممد ثابت ہو۔

صاحبِ صدر کا خیال تھا کہ اس مضمون میں کچھ باتیں اصولی ہیں اور کچھ فروعی۔ اکثر بنیادی اور اصلی باتیں فروعی باتوں میں دب گئی ہیں۔

اعجاز نے کہا کہ حقیقت پسندی اور آرٹ کے سلسلے میں صاحبِ مضمون کا بنیادی خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت پسند مصنف وہ ہے جو اخلاقی اعتبار سے ایک واضح نقطہ نظر رکھتا ہو۔

انور انصاری کا خیال تھا کہ سوال یہ نہیں کہ بعض ادیب ایک واضح اخلاقی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ یاور عباس نے کہا اگر مصنف یہ کہنا چاہتے تھے تو پھر بات مبہم ہو گئی ہے اور مضمون میں اقتباسات ضرورت سے زیادہ ہیں۔

صاحبِ صدر نے کہا اگر مقالے میں کوئی مثال پیش کی جائے تو اس کی ضرورت صرف اس حد تک جائز ہے کہ اس کو زندگی پر منطبق کر کے دکھایا جائے۔

پروگرام کی دوسری چیز ن۔ م راشد کی نظم تھی "سباویراں" جو انہوں نے امریکہ سے حلقہ اربابِ ذوق کو بھیجی تھی۔

سلیماں سر بزانو اور سبا ویراں
سبا ویراں، سبا آسیب کا مسکن
سبا آلام کا انبار بے پایاں

ضیا نے کہا کہ راشد اپنی شعری زبان یعنی ڈکشن میں اتنے عمیق ہو گئے ہیں کہ اب وہ کبھی اس قسم کی زبان سے باہر نہیں نکل سکتے۔

انور انصاری نے ڈکشن سے نظم کے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہا کہ سارا سیر پھر سلیمان

اور سب [illegible] سلیمان و سبا [illegible]

غزالہ نے کہا شاید سبا سے مراد زندگی ہے۔

لیکن انور کا خیال تھا کہ سلیمان سے مراد اقتدار ہے اور سبا کوئی ملک ہے۔

لیکن ضیا نے کہا کہ راشد ایسے واضح قسم کے سمبل کم استعمال کرتے ہیں۔

صاحبِ صدر نے کہا اگر اس نظم کے الفاظ کے معانی کے ساتھ ساتھ اس کے سمبل بھی سمجھ میں آجائیں تو پھر اس کا لطف آ سکتا ہے۔ اس نظم سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض انسان اور بعض ادارے پریشانی کے عالم میں سے گزر رہے ہیں ہر چیز انتشار کے عالم میں ہے اگر وہ ادارہ ترقی پذیر انسانیت سے متعلق ہے تو یہ نظم بے حد قنوطی ہے نظم کا خاتمہ اس مصرعے پر ہوتا ہے۔

کہاں سے کس سبو سے کاسہ پیری میں مے آئے۔

ضیا نے کہا یہ ایک بہت ہی ذاتی نظم ہے۔

انور نے کہا ہم شاعر کے ذاتی معاملات میں کیسے دخل دیں

علی محمد خواجہ نے کہا شاید سلیمان سے مراد عاقل انسان ہیں یعنی دنیا کے intellectuals موجودہ دنیا کی موجودہ حالت پر اس قدر پریشان ہیں کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب اور حل موجود نہیں۔

اعجاز نے کہا یہ تشریح نظم کو بہت حد تک واضح کر دیتی ہے مگر میں یہاں ایک بات خاص طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نظم کی قطعیت نثر کی قطعیت سے مختلف ہوتی ہے اگر آپ نظم سے ایک نثری قطعیت کا تقاضا کریں گے تو ظاہر ہے کہ اس میں آپ کو کامیابی نہ ہوگی۔

صاحبِ صدر نے کہا نظم میں بے پناہ قنوطیت ہے۔

اعجاز نے کہا تو آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے، دنیا کی بعض اچھی نظمیں بڑی قنوطی نظمیں ہیں۔

صاحبِ صدر نے کہا یہ بجا سہی لیکن مجھے وہ نظمیں پسند ہیں جن میں جوش ہو اور امید ہو۔

اعجاز نے کہا مجھے یہ تقاضا سرے سے غلط معلوم ہوتا ہے کہ آپ نظم پڑھنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیں کہ نظم میں رجائیت ہونا چاہیئے اور میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ نظم قنوطی نہیں ہے اس کے بنیادی سمبل یا تو موجودہ بین الاقوامی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا پاکستان کے موجودہ حالات کی طرف اور سلیمان ایسے intellectuals کا سمبل ہے جن کو حالات کا تو علم ہوتا ہے مگر اپنی قدروں پر قطعیت سے بات نہیں کرتے۔ اس نظم کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا لہجہ ہے اور یہ نظم اپنے لہجے کی مدد سے ایک بڑی مؤثر کیفیت قاری تک پہنچاتی ہے اور اس اعتبار سے بڑی کامیاب نظم ہے۔

OO

حلقہ اربابِ ذوق کا گزشتہ اجلاس سات دسمبر کو شام کے ساڑھے آٹھ بجے وکٹوریہ لیگ کے کمیٹی روم

... جس کی کارگزاری یاور

عباس نے پڑھ کر سنائی جو منظور ہوئی ۔

اس کے بعد اعجاز حسین بٹالوی نے اپنا مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا۔ نغمہ جراح نہیں یہ مضمون فیض احمد فیض کی نظموں کے نئے مجموعے دستِ صبا پر ایک تنقیدی مقالہ تھا جس میں دستِ صبا کی نظموں پر بالخصوص اور فیض کی شاعری پر بالعموم بحث کی گئی تھی۔ مجموعے کی بعض نظموں پر تفصیلی تنقید کرنے کے بعد اور فیض کے دیباچے کو زیر بحث لانے کے بعد صاحبِ مقالہ نے فیض کی نظم میرے ہمدم، میرے دوست، کو ایک ایسی نظم قرار دیا جس کا تجزیہ فیض کی شاعری کا نیا انداز سمجھنے کے لئے ضروری ہے ۔

پر میرے گیت تیرے دُکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جراح نہیں مونس و غم کے خوار سہی

ان کے خیال میں اس نظم میں شاعر ایک ایسی الجھن میں گرفتار ہے جب ادبی تخلیق ایک ذمہ داری ہو جاتی ہے اور شعر جمالِ محض کی منزلوں سے آگے جا کر کسی اخلاقی قدر کی تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اخلاقی اقدار کے اس شعوری احساس کی روشنی میں فیض کی نئی نظموں کا تجزیہ کیا گیا تھا: دو آوازیں" "صبحِ آزادی" اور "زنداں کی ایک شام" پر تفصیلی بحث کی گئی تھی اور صبحِ آزادی کو ایک عہد آفریں نظم قرار دیتے ہوئے فیض کی شاعری کو تقسیم ہند کے بعد خطۂ پاکستان کی شعری اور ذہنی اور احساساتی تاریخ قرار دیا گیا تھا ۔

تقی احمد سید نے مضمون پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا یہ فیض کی شاعری پر بہترین مضمون ہے جو اب تک میرے سننے یا دیکھنے میں آیا۔ فیض کی شاعری پر جو اب تک تنقید ہوئی ہے وہ بدقسمتی سے میری نظر سے نہیں گزری ۔

یاور عباس نے مضمون کی عمومی تعریف کرنے کے بعد ایک اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ صاحبِ مضمون نے یہ بہت بڑی omission کی ہے کہ فیض کے سیاسی اندازِ نظر اور اس کی گرفتاری کو زیر نظر رکھے بغیر ان نظموں سے شعری حظ نہیں اٹھایا جا سکتا کچھ عرصہ اس موضوع پر بحث ہوتی رہی صاحبِ مقالہ نے کہا کہ اس کی وضاحت کے لئے ہمیں دستِ صبا کے دیباچے سے مدد لینا چاہیئے جس میں فیض کہتا ہے کہ مجاہدِ فن کا کوئی فردوان نہیں رہتا اور شاعر کو اپنی اقدار کے لئے عملی قدم اٹھانے کے لئے تبلیغ کرتا ہے ۔

خورشید نے کہا کہ دستِ صبا کی بہت سی نظمیں ہنگامی ہیں اور جب صاحبِ مضمون نے ان سے مثال کا تقاضا کیا تو انہوں نے پہلے قطعے کی مثال دی ۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

ہونٹوں پہ مہر ثبت ہے لیکن رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

حاضرین میں سے اکثر کو خورشید کی اس رائے سے اتفاق نہیں تھا۔ اور وہ اس قطعے کو اور اس مجموعے میں فیض کی نظموں کو ہنگامی ماننے سے منکر تھے۔ ہنگامی نظموں پر ایک تفصیلی تقریر کرنے کے بعد صدیق احمد صدیقی نے کہا کہ ہنگامی ادب سے مراد وہ ادب نہیں ہے جو کسی واقعے سے متاثر ہو کر لکھا جائے بلکہ ہنگامی ادب وہ ہے جو دیرپا نہ ہو۔ شاعر کسی بھی ہنگامے یا واقعے سے متاثر ہو کر ادبی تخلیق کر سکتا ہے سوال یہ ہے کہ اس ادبی تخلیق میں کس حد تک عمومیت موجود ہے اور وہ ادبی اصولوں پر کس حد تک پوری اترتی ہے خورشید نے ہنگامی نظموں کے سلسلے میں ظفر علی خاں کی شاعری کا تذکرہ کیا۔ اعجاز نے ظفر علی خاں اور فیض کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ ظفر علی خاں واقعات پر نظمیں لکھتا ہے اور فیض کی نظمیں اقدار پر ہوتی ہیں۔ ظفر علی خاں نے نظم اگر ایک فرنگی لڑکی رودوفر کے اغوا پر ہوتی ہے تو رودوفر کے اغوا سے آگے نہیں بڑھتی مگر فیض کی نظمیں اگر اس کی گرفتاری سے متعلق ہیں تو بھی ان میں ایک معاشرے کی تنقید اور اخلاقی اقدار کا موازنہ موجود ہے۔

ڈاکٹر کمال کا خیال تھا کہ اس مقالے میں فیض کی پہلی کتاب "نقش فریادی" کا جائزہ لیتے ہوئے صاحب مقالہ کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ اس مجموعے سے فیض کی شاعری میں کیا نئی تبدیلیاں نظر آتی ہیں اور اس کے ہاں کون سے نئے رجحانات پیدا ہوئے ہیں یا کون سے رجحانات پختہ تر ہو گئے ہیں۔ صاحبِ صدر اور احباب کو ڈاکٹر کمال کی رائے سے اتفاق تھا۔

ضیا محی الدین نے کہا کہ دستِ صبا میں فیض کی نئی غزلوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے اپنے مضمون میں صاحب مقالہ نے فیض کی غزلوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا حالانکہ فیض کی شاعری کا محاسبہ کرتے ہوئے ان کی غزلوں پر تنقید کرنا بڑا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جمیل احمد حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کے ایک پرانے کارکن بھی اس مجلس میں شریک تھے ان کو لندن کے حلقے کی اس مجلس پر ایک اعتراض تھا کہ یہاں لوگ بڑی بے تکلفی سے انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کو آج شام کے مقالے پر بھی یہ اعتراض تھا کہ اس میں اردو کی بجائے انگریزی کے بعض الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ صاحبِ مقالہ نے کہا انہیں اس میں انگریزی کے تین الفاظ استعمال کرنے پر ندامت ہے ان میں دو الفاظ کے لئے وہ عنقریب اردو کے مترادفات حاصل کر لیں گے البتہ "ڈکشن" کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ اس کے لئے کوئی موزوں لفظ نہیں ملتا۔

OO

حلقۂ اربابِ ذوق (شاخ لندن) کا گذشتہ ماہانہ اجلاس سات دسمبر کو شام کے ساڑھے آٹھ بجے

پروگرام میں پہلی چیز خورشید احمد خورشید کی کہانی تھی "دالپسی" کہانی ایک خط کے فارم میں لکھی گئی تھی جس میں ایک دوست دوسرے دوست کو اپنے بچپن اور جوانی کے بعض حالات لکھتا ہے۔ اُس نوجوان کو ابتداء میں لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ سکول میں ایک ہم جماعت کو استاد سے پٹتے دیکھ کر استاد پر پل پڑتا ہے اور کالج کے دوران میں ذہنی طور پر ایک شاعر کی صحبت سے بہت متاثر ہوتا ہے جو کشمیر کے مرغزاروں میں بیٹھ کر قدرت کا حسن دیکھتا اور نظمیں لکھتا ہے اور پھر اسے ایک ایرانی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے اور پہلی مرتبہ اسے عورت کے حسن کا احساس ہوتا ہے اس کے بعد افسانہ محبت اور انسانی زندگی فانی اور غیر فانی مسائل سے دو چار ہو کر روح کے ابدی یا غیر ابدی ہونے کے سوالات پر غور کرتا ہے۔ پھر شہناز اس کی محبوبہ رخصت ہو کر چلی جاتی ہے۔ وہ اس کے تعاقب میں ایران جاتا ہے اور ایران کی سرحد پر پاسپورٹ کی غیر موجودگی میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور حوالات میں ایک ایرانی مجاہد سے اس کی ملاقات ہوتی ہے جس کی محبوبہ سپیدہ دین نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ وہ گلے سے تعویذ اتار کر اسے دکھاتا ہے جس میں اس کی محبوبہ کی تصویر لگی ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ سپیدہ دین لندہ رہے گی یہ میری سپیدہ دین ہے۔ اس کے بعد افسانے کا ہیرو جیل سے رہا ہو کر واپس چلا آتا ہے۔

افسانہ ختم ہوا۔ صاحب صدر نے تنقید کی اجازت دی۔

یاور عباس نے کہا۔ اگر کوئی ہیرو انگریز لڑکی سے عشق کرے تو یہ سوال نہیں اٹھتا کہ گفتگو کس زبان میں ہوئی لیکن اگر ایرانی لڑکی سے محبت کی جائے تو سوال ہوتا ہے کہ گفتگو کس زبان میں ہوئی۔ گویا میں تنقیداً یہ پوچھ رہا ہوں کہ اگر آپ ایرانی لڑکی کو ہیروئن بنائیں گے تو یہ سوال ذہن میں ضرور آئے گا۔

حلقے کے اکثر حاضرین نے کہا کہ یہ سوال ان کے ذہن میں نہیں آتا۔ اعجاز نے کہا یہ افسانہ عنفوانِ شباب کا افسانہ ہے اور ایک رومانی کہانی ہے۔ افسانوں میں عنفوانِ شباب کی کیفیات کی تصویریں کھینچنا تو بجا ہے لیکن اس افسانے میں صرف موضوع ہی عنوانِ شباب نہیں ہے بلکہ اس کا اسلوب بھی عنفوانِ شباب کا سا ہے۔

جمیل نے کہا عنفوانِ شباب کی کیفیت کے علاوہ ایک اور کیفیت بھی ہے جسے فراریت کی کیفیت کہا جا سکتا ہے جو بچپن سے شروع ہو کر بڑھاپے تک رہتی ہے۔ انسان اپنی زندگی سے گریز کرتا ہے تو اپنی الگ زندگی بنا لیتا ہے۔ آدمی عشق کی مروجہ قدروں سے ہٹ کر اپنی قدریں بناتا ہے۔ یہ افسانہ ان قدروں سے متعلق ہے۔ افسانے کا ہیرو اپنے ذہن اور دماغ کی وسعتوں میں سفر کرتا ہے لیکن ہیرو کی اپنی ذہنی قدریں ابھی متعین نہیں ہوئیں اس لئے افسانے میں قطعیت نہیں آئی۔ صرف اس کی فراریت کا عکس ہے۔

یہ ہے کہ اگر کوئی کسی شخص میں اس تضاد کے ذہن میں پیدا کرتے ہیں۔ ہیروئن کا کردار ایک ایسی لڑکی کا کردار ہے جس کو مادیت پر ایمان ہے لیکن ضمیر کی بھی قائل ہے۔ انسانوں میں اکثر یہ تضاد پائے جاتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہیرو کا خود اس تضاد کی طرف نکتہ نظر کیا ہے۔

جمیل نے کہا اس کے علاوہ افسانے میں جتنے افراد ہیں وہ ابھاگر نہیں ہوتے ان کی کوئی الگ الگ شخصیت نظر نہیں آتی۔

صاحب صدر نے کہا اس میں مربوط اقدار نظر نہیں آتیں۔

اعجاز نے کہا یہ عمل کا افسانہ نہیں خیال اور فلسفے کا افسانہ ہے۔

جمیل نے کہا لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا فلسفہ کیا ہے۔ اس کا یہ روحانی سفر کہاں ختم ہوتا ہے اور وہ کیا حاصل کرتا ہے۔

اعجاز کا خیال تھا کہ وہ سیاسی قیدی کی باتوں سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے اس بنیادی خیال کی طرف واپس آ جاتا ہے کہ اُسے اپنی محبت کی ابدیت پر ایمان ہے اور محبوبہ دراصل وہی محبوبہ ہے جسے ان کے تخیل نے پیدا کیا ہے۔ اعجاز نے یہ بھی کہا کہ اس افسانے کے شروع میں ہیرو کی ہم جنسی کے میلانات کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔

آج جو لوگ شریکِ محفل ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔ قاضی ممتاز، اقبال شہزاد، حمید احمد، یاور عباس خورشید احمد خورشید، محمود ہاشمی، جمیل احمد، ارشد محمود اور اعجاز حسین بٹالوی اور تقی احمد سید۔

OO

حلقۂ اربابِ ذوق کا گذشتہ ماہانہ اجلاس چھ فروری کو شام کے ساڑھے آٹھ بجے وکٹوریہ لیگ کے کمیٹی روم میں منعقد ہوا۔ آلِ حسن نے صدارت کے فرائض انجام دیئے اور کرسیِ صدارت پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے کہا کہ سب سے پہلے میں اس بات کی معذرت کرنا چاہتا ہوں کہ میں گذشتہ دو سال میں باوجود نیک نیتی کے حلقے کی مجلسوں میں شمولیت نہیں کرتا رہا اور میں کوشش کروں گا کہ آئندہ باقاعدگی سے ان مجلسوں میں آسکوں۔

گزشتہ اجلاس کی کارروائی پڑھی گئی جو منظور ہوئی۔

پروگرام میں ضیا محی الدین کا افسانہ تھا "یسوع مسیح اور اس کی بھیڑیں"۔ یہ مسز سکیٹا کی کہانی تھی جو دو بچوں کی ماں ہے اور بندرگاہ کے ایک شہر میں عیسائی کالونی میں رہتی ہے اور سرِ شام بچوں کو کھانا کھلا کر، مار پیٹ کر کے مسیح کی تصویر کے سامنے سر جھکا کر روزانہ کی دعا کے بعد ایک مشہور ہوٹل میں چلی جاتی ہے تاکہ کوئی "گاہک" پھنسا کر چار پیسے کی یافت ہو سکے۔ افسانے میں اس ہوٹل کی بڑی واضح اور پراثر تصویریں

سینما میں ، ماحول میں مسز جلٹ کا کردار اجاگر ہوتا تھا۔

کہانی ختم ہوئی۔ صاحب صدر نے اذنِ تنقید دیا۔ یاور عباس نے کہا کہانی جس انداز میں لکھی گئی ہے وہ بڑا اکھڑا اکھڑا ہے۔ مکالمے اکھڑے اکھڑے ہیں اور بیانیہ بھی رواں نہیں ہے۔ دوسرے مجھے یہ پوچھنا ہے کہ اگر اس مخلوط تہذیب کے بارے میں لکھا جائے تو کیا ضروری ہے کہ زبان بھی ویسی ہی لکھی جائے کم از کم جہاں افسانہ نگار اپنی طرف سے کوئی بات لکھتا ہے وہاں اینگلو انڈین محاورہ اور ان کی زبان لکھنے کا کیا جواز ہے۔ اس کے بعد یاور عباس نے اسی انداز کی چند مثالیں پیش کیں۔

اعجاز نے کہا یہ انداز ارادی معلوم ہوتا ہے اور کہانی کی فضا قائم کرنے کے لئے مناسب ہے اور نقطہ اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا زبان اور اسلوب دو الگ چیزیں ہیں اور ان دونوں کو الگ الگ رکھ کر ہمیں افسانے پر بحث کرنا چاہیئے۔

صدیقی نے کہا کہانی میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو پوری طرح سمجھ میں آ جاتی ہے البتہ زبان میں تبدیلی اور ترقی کی بڑی گنجائش ہے افسانہ نگار نے کہیں کہیں ایسے محاورے استعمال کیئے ہیں جن سے وہ خود روزمرہ کی زندگی میں مانوس نہیں ہے۔ اور وہ افسانے کی باقی تحریر سے بالکل الگ معلوم ہوتے ہیں۔

کرشنا نے کہا مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جو باتیں تفصیل سے کہی گئی ہیں وہ اگر تفصیلات کے بغیر کہی جاتیں تو اچھا ہوتا اور اگر تفصیلات کی بجائے suggestion سے کام لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

یاور عباس نے کہا کہانی میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ کہانی کو مثالی نہ بنایا جائے چنانچہ آخر تک پتہ نہیں چلتا کہ یہ کہانی کس جگہ کی ہے مگر آخری حصّوں میں ایک جگہ سندھی کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ اعجاز نے کہانی کی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس میں جو الفاظ محض صوت کے لئے استعمال کیے گئے ہیں وہ بڑے کامیاب ہیں اور ان سے کہانی کی فضا قائم کرنے میں بڑا فائدہ اٹھایا گیا۔ صاحب صدر کا خیال تھا کہ کہانی کی تفصیلات کم کی جا سکتی ہیں۔

صدیقی نے اعجاز کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہانی میں ایسے صوتی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کی مدد سے بعض تصویریں ذہن کے سامنے آ جاتی ہیں اور صدیقی کا خیال تھا کہ جس ملک کی فضا اس کہانی میں قائم کی گئی اس کے خیالات اور تصورات اس میں بڑی خوبصورتی سے واضح کئے گئے ہیں اور یہ افسانہ بعض جگہ بڑے موثر اور گہرے اشاروں سے زندگی کے بڑے بنیادی مسائل پر ہے انڈین کرسچین اپنی جگہ ایک کلاس ہے اور یہ کہانی اس کی ایک نہایت اچھی تصویر ہے۔ خورشید نے کہانی کی تعریف کی اور اعجاز نے صدیقی سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ انڈین کرسچین زندگی کے کردار اردو افسانے میں نووارد ہیں عسکری اور منٹو نے ان کرداروں پر بعض بھرپور افسانے لکھ کر اردو افسانے سے ان کا تعارف کرایا تھا اور موجودہ کہانی اس سلسلے میں ایک اگلا قدم ہے۔

اس کے بعد سیکرٹری نے چند ضروری اعلانات کئے۔ حلقے کے اگلے جلسوں کے لئے مضامین نظم و نثر کی ترتیب کی گئی۔ متفقہ رائے سے ضیا محی الدین حلقے کے سیکرٹری منتخب ہوئے اور اس کے بعد حلقے کا اجلاس ختم ہوا۔

آج جو لوگ شریک محفل ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔ علی محمد خواجہ، عبدالمنتقیم چوہدری۔ صدیق احمد صدیقی، قاضی ممتاز علی، آلِ حسن، کرشنا حسن، رتن رضوی، یاور عباس اور اعجاز حسین بٹالوی۔

OO

طنز و مزاح

مکاتیب خضر

محمد خالد اختر

شفیق مکرم رشید ملک صاحب۔ درویش کا سلام و دعا قبول فرماؤ۔

تم نے میرا حال پوچھا اور یہ یاد آوری تمہاری کرم گستری اور عنایت ہے۔ مجملاً میری حقیقت سنو۔ میں مع الخیر وطن پہنچا۔ ٹرک میں گھر کا سب اثاثہ لدا تھا۔ ایک یار باصفا ساتھ میں تھے۔ دریا کا پل عبور کرکے بہاولپور داخل ہوئے تو پو پھٹ رہی تھی۔ مرغان سحری نوا سنج تھے۔ طالب علمی کے ایام کے آشنا راستوں اور سڑکوں اشجار و اثمار کو دیکھ کر دل شاد ہوا چونگی پر رکے۔ محرران چونگی نے بے جا باز پرس کی۔ ان کو بتایا کہ پنشن پانے کے بعد لاہور سے آتا ہوں اور یہ گھر کا سامان ہے محصول چونگی ایسے سامان پر قابل ادائیگی نہیں۔ آخر رد و قدح اور تلخ کلامی کے بعد ان سے نجات پائی۔ آگے روانہ ہوئے۔ لاریوں کا اڈا۔ اسٹیڈیم۔ شیر باغ، بیکانیری گیٹ۔ ان کی صورت اب بدلی ہوئی دیکھی۔ لاریوں بسوں کا اڈا پہلے کہاں تھا۔ اسٹیڈیم میرے زمانہ ملازمت میں ریاست کے وزیر اکبر عالیجاہ مخدوم زادہ حسن محمود بہادر نے بنوایا تھا۔ شیر باغ اب جانوروں کا چڑیا گھر اور ایک عجائب گھر قائم ہے۔ اللہ اللہ ہمارے وقتوں کا بیکانیری دروازہ، فرید گیٹ ہوگیا نہ دروازہ نہ گیٹ۔ نہ اس کی گمٹیاں کنگرے۔ اس کے پاس حاجی عبدالرحمٰن اینڈ سنز کی عالیشان حویلی نما دوکان تھی۔ وہاں شرق و غرب کا مال خریداری پٹا ہوتا۔ رؤسا وہاں آکر اشیائے ضرورت خریدتے تھے اور حاجی صاحب حاجی لٹ کے عرف سے مشہور تھے اس دوکان کا اب پتہ نہیں۔ حبیب بنک اور نیشنل بنک کا وہاں تصرف ہوا۔ قصہ مختصر اپنی حویلی پر پہنچے۔ اس پر کس مپرسی کا عالم طاری تھا اور وہ بھوت پریت اور غول بیابانی کا مسکن بنی تھی۔ ملک صاحب! پانچ چھ برس سے یہ خالی اور ویران پڑی تھی۔ وہ لوگ جنہوں نے میرے والد مرحوم و مغفور کی زندگی میں اس کی شان اور چہل پہل دیکھی تھی اب اس کے سامنے سے گزرتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اس واسطے کہ اس کے اجڑنے کا منظر دیکھ نہیں سکتے۔ یہاں سامان ٹرک سے اتارا گیا۔ ہم نے آس پاس کے چند آدمیوں کی مدد سے اس حویلی کے ایک کمرے میں الم غلم ڈھیر کر دیا پھر امن و چین کا سانس لیا کہ ایک مرحلہ جو درپیش تھا بخیر و خوبی اس کو سرانجام کو پہنچایا پھر بجلی پانی کے

پیچھے چھوڑ گئے۔ بارے ان کا بھی انتظام ہو گیا۔

تین چار مہینے پنشن کے باب میں الجھا رہا۔ میرے اللہ نے عنایت کی کہ یہ مسئلہ ایک عزیز کی مداخلت سے حل ہو گیا۔ محوِ حیرت ہوں کہ کیونکر اتنی جلد حل ہوا۔ پنشن چھ سو اسی روپے ماہانہ منظور ہوئی ہے۔ یہ روپیہ خزانہ سے فقیر کو ماہ بماہ ملا کرے گا۔ خوش ناخوش گزارا ہوتا رہے گا۔ اقبال سیالکوٹی کہتا ہے۔ بیت

تیری خاک میں ہے اگر شرر، تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

تم کو معلوم ہو کہ قوتِ حیدری کی میں نے کبھی خواہش نہیں کی۔ اور اس عمر میں وہ کہاں سے آئے گی۔ بدن میں حرارتِ عزیزی قائم رہے چلتا پھرتا رہوں یہی غنیمت ہے۔ دو وقت کی روٹی چار پیالے کافی کے ایک ڈبہ گولڈ لیف سگریٹ کا اور کتابوں کا مطالعہ۔ ملک صاحب اسی کو میں عیش گردانتا ہوں۔ اس سے سوا اگر یارانِ طریقت و بامروت کی صحبت میسر آ جائے جن سے اختلاط و انبساط کی باتیں ہو سکیں تو آدمی اس دنیا میں اور کیا چاہے۔ سو یہ نعمتیں مجھے اس شہر میں میسر ہیں۔ حرفِ شکایت اپنے لبوں پر لا کر کیوں احساناتِ ایزدی کی ناشکری کا سزاوار ٹھہرایا جاؤں۔

اس بار ماہ صیام میں میں نے کل پندرہ روزے رکھے اور چودہ روزے کھا کھا کر کاٹے۔ اس مہینے میں میرا یہ معمول تھا کہ گھڑی کے الارم پر ایک پہر رات رہے جاگ جاتا۔ بجلی کے چولہے پر کافی بناتا اور اسے گھونٹ گھونٹ سڑکتا۔ دو سگریٹ گولڈ لیف کے مزے لے کر پیتا۔ جب سحری کا وقت ختم ہو جاتا اور پاس کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی تو میں اپنے موزے اور جاگر بوٹ چڑھاتا۔ ایک بید کی چھڑی میں نے ان دنوں خرید کی تھی۔ اسے ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکل آتا۔ میرے بھائی کا السیشین کتا جوڈی میرے برآمد ہونے کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہوتا (میرے بھائی کے بچے بھی اب یہاں آ گئے ہیں اور نصف مکان ان کے پاس ہے۔ رمضان کے مہینے میں وہ لاہور گئے تھے جہاں میرا بھائی محکمہ آبپاشی میں نوکر ہے) اس حیوان کی والہانہ الفت اور دمسازی کا مجھے اپنی زندگی میں اولین بار تجربہ ہوا۔ یہ میرے دروازے سے نکلتے ہی خوشی سے دھیمی آواز میں گڑگڑاتا۔ اگلے پنجے اٹھا کر مجھ سے گلے ملنے کی کوشش کرتا اور میں ڈانٹ ڈپٹ کر اسے اپنے سے دور کرتا۔ یہ پھر اسی طرح گڑگڑاتا ہوا میرے قدموں میں لوٹتا اور جب تک میں برآمدہ عبور کرتا یہ فرطِ مسرت سے اچھلتا کودتا کدکڑے مارتا حویلی کے پھاٹک پر پہنچ کر میرا انتظار کر رہا ہوتا۔ پھاٹک کھلتے ہی جوڈی اور میں بجلی کے قمقموں سے روشن سڑک پر مکان سے باہر ہوتے۔ جوڈی مجھ سے دس قدم آگے ہوتا اور پھر رک کر شوخ آنکھوں سے میری راہ دیکھتا۔ جوڈی ان دنوں بڑا صحت مند اور شوخ

... نہیں پایا۔ اُسے

... بارے میں کوئی جھجک نہ تھی۔ وہ لوگ جو محبت میں شدتِ جذبات کے قائل نہیں جوڈی کو علامت بے درمان اور مصیبت عظیم گمان کرتے۔ ان کی بدسلوکی اور ردِ الفت کی رد کھائی پر جوڈی کے دل کو ٹھیس ضرور پہنچتی ہوگی مگر اس نے اپنے رویے میں تبدیلی نہ کی۔ میں اور چھوٹا لڑکا شاہد اس کے چہیتے تھے اور وہ ہمیں عاشقانہ نظروں سے تکتا تھا۔ لیکن ہم بھی اُسے تھپکنے یا اس سے الفت جتانے سے جھجکتے کہ کہیں وہ فرطِ مسرت و انبساط سے دیوانہ نہ ہو جائے۔

کتا اور میں سڑک پار کر کے سامنے کے چھوٹے سے پھاٹک میں سے صادق پبلک لائبریری کے ملحقہ سبزہ زاروں میں داخل ہو جاتے ہیں پگڈنڈیوں پر چلتا اور جوڈی گھاس پر پودوں کی جڑوں کو سونگھتا اپنی دم کو منہ میں لینے کی غرض سے چک پھیریاں اور عجب مضحکہ خیز حرکات کرتا جن کو دیکھ کر ہنسی آتی۔ کبھی وہ کوّوں اور ہوا میں کلیلیں بھرتی چڑیوں کے پیچھے دوڑ لگاتا۔ وہ یہ سب کچھ لطف طبع کی خاطر کرتا، ورنہ لیقین جانیں، جوڈی کو طائروں کی مخلوق سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ جوڈی کو کوّوں اور چڑیوں سے کیا واسطہ! میں بتانا بھول گیا کہ جب جوڈی رحیم یار خان میں تھا اُسے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ اس نے ایک جاتے ہوئے ٹریکٹر کو سامنے سے جا کر لینے کی کوشش کی تھی نتیجہ یہ کہ بائیں ٹانگ ٹریکٹر کے پہیے کے نیچے آ گئی اور کچلی گئی۔ اب جوڈی اپنے پنجے کو اٹھائے تین ٹانگوں پر پھدک پھدک کر چلتا دوڑتا ہے قسمے لو جو اس کتے نے اس سانحے سے سبق سیکھا ہو۔ بلکہ تب سے سب ٹریکٹروں لاریوں اور مشینی گاڑیوں کو اپنا دشمن جانتا ہے۔ انہیں دوڑتے دیکھ کر اس کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ کتنا ہی روکو، منع کرو۔ وہ ان کو امن سے نہیں گزرنے دیتا۔ بے قابو ہو کر ان کو عین سامنے سے جا کر لینا اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔

یہاں اس علاقے کے مختلف قد و قامت رنگ و نسل کے کتوں کی ایک ٹولی ہمارے جوڈی کے سواگت کے لیے تیار ہوتی۔ یہ کتے غالباً جوڈی کو اس کے نو وارد اور بدیسی ہونے کی بنا پر ناپسند کرتے تھے۔ جوڈی ہمارے کو بھانپ کر میرے قریب آ جاتا۔ وہ مختلف سمتوں سے جبڑے وا کیے غراتے جوڈی کی طرف لپکتے۔ مگر ایک فاصلے پر رک کر بھونکنے پر اکتفا کرتے۔ علم حیوانات میں مجھ کو شغف نہیں۔ پھر بھی جہاں تک میرا خیال ہے جوڈی اس دھاوے سے بے طور متوحش نہ ہوتا۔ وہ ان بازاری کتوں کو خاطر میں نہ لاتا۔ کبھی کبھی وہ جواب میں بھونکتا ضرور۔ اور نبرد آزمائی کے لیے دشمن کی جانب قدم بڑھاتا ضرور مگر پھر کھڑے ہو کر ان کے ناز بیا کرتوں کو بد بلانہ اور کسی قدر حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتا۔ اس وقت اس کے دنبے وار منہ سے ایک بیچ تک نہ نکلتی۔ میں نے بید کی چھڑی اس ٹولی اور دوسری ٹولیوں کو جوڈی سے دور رکھنے کے لیے خرید کی تھی۔ یہ خوب کام آئی۔ ملک صاحب افسوس اس وقت کا جوڈی اب کا جوڈی نہیں۔ اس کی رنجوری کی ذلت و خواری کا قصہ لمبا ہے پھر کبھی سناؤں گا۔

کمہاروں کے علاقے میں آن نکلتے۔ یہاں نور کے تڑکے میں قبرستان کی سی خموشی ہوتی اور وکیلوں کے کلکٹری کے کا بک یکسر ویران۔ جوڈی مجھ سے کچھ دیر کے لئے بچھڑ کر کابکوں میں سونگھتا۔ پھر مجھ سے آن ملتا۔ کمشنر بہادر کے نئے دفتر سے آگے کچہری روڈ گزرتی ہے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب آئی جی بہادر کے دفاتر اسی سڑک پر ہیں۔ جب کوئی اکا دکا ٹرک یا ٹریکٹر سڑک پر سے گزرتا جوڈی کا جذبۂ انتقام جوش میں آ جاتا اور وہ میری ڈانٹ کو ان سنی کر کے دشمن کو سامنے سے جا للکارتا۔ وہ بال بال بچ جاتا۔ جوڈی کے بے حد احمق ہونے میں کلام نہیں۔ اس کی حکم عدولی پر مجھے طیش آتا اور میں اس کے سر اور جسم پر بید سے تڑاک تڑاک ضربیں لگاتا وہ بید کھاتے ہوئے بچھ جاتا اور التجائی نگاہوں سے مجھے دیکھتا۔ اب ملک صاحب میرا گمان ہے کہ جوڈی کو خوب معلوم تھا کہ میں نے اُسے بیدکیوں مارے مگر ایک ناقابل اصلاح بچے کی طرح اس کے طور طریقے وہی رہے۔ تب ہی سے اس کے دل میں سمائی کہ میں نے بید کی چھڑی اسے سزا دینے کی خاطر حاصل کی ہے۔ وہ مجھ سے کچھ کچھ دہشت زدہ رہنے لگا اور جب وہ گھر پہ چھڑی کو میرے ہاتھ میں دیکھتا وہ مجھ سے فاصلے پر بیٹھتا اس کے دل معصوم میں میرے لئے تحفظ پیدا ہوئی میرے بلانے پر بھی وہ مجھے گھور گھور کر تکتا ہوا دور بھاگ کھڑا ہوتا بعد میں میرے بھائی نے مجھے کہا کہ کتے بچوں کی مانند ہوتے ہیں اور میرا جوڈی کو بید مارنا غلط تھا۔ اس نے مجھے جوڈی کی عادتیں بگاڑنے کا قصوروار ٹھہرایا اور سمجھایا کہ مجھے اس کے گلے میں پٹہ ڈال کر سدھانا چاہیئے تھا۔ ملک صاحب تم نے کتے رکھے ہیں! تم بتاؤ! کتوں کی تربیت کیونکر کرتے ہیں۔ میں اس مضمون میں نابلد محض ہوں۔ خیر جوڈی اور میری سیر کی داستان تھوڑی اور سن لو۔ کلب روڈ چوراہے پر جا کر ملتی ہے۔ جو فرید گیٹ سے نہر کے دفاتر اور آگے بغداد کے ریل کے سٹیشن پر جاتی ہے۔ کلب روڈ سے ہم فرید گیٹ اور اپنے گھر کا رخ کرتے ڈویژن کے حکام اعلیٰ کے دولت کدے جرنیل صاحب کا نیلگ سٹاف ہاؤس، جنرل پوسٹ آفس، بنک، ہائی سکول یہ سب چوراہے اور فرید گیٹ کے درمیان واقع ہیں۔ صاحب کمشنر بہادر کی اقامت گاہ کے پھاٹک پر گارڈ متعین ہے۔ توپوں کے دو پیتل کے دہانے کنکریٹ کے ستونوں پر نصب ہیں جوڈی یہاں ضرور رکتا اور توپوں کے دہانوں کو غور اور حیرت سے دیکھتا وہ اقامت گاہ میں اندر جانے کی کوشش کرتا مگر گارڈ اُسے دھتا بتاتے۔ ڈاک میں ڈالنے کے خط میرے پاس ہوتے تو ہم ڈاک خانے میں جاتے۔ جوڈی مجھے دلچسپی سے لیٹر بکس میں خط ڈالتے دیکھتا۔ ڈاک خانے سے ہم اپنے پرانے جامعہ کے کھیل کے میدانوں میں سے چلتے اپنی حویلی تک پہنچ جاتے۔ جامعہ کی کنگوروں پیازی گنبدوں والی عمارت اب گورنمنٹ ہائی سکول بنی ہے اور ہاسٹل اے کی چوکور عمارت جس میں ہم ہاسٹل کے مانیٹر احمد شاہ سے اس کی تازہ بتازہ نظمیں سنا کرتے تھے۔ وہاں اب گورنمنٹ کمرشل انسٹی ٹیوٹ ہے دیواروں پر کالی سیاہی سے

اس سوری مجلاوں میں اردو اور انگریزی میں مارقم ہیں۔ سلامتی کی ایک ہی راہ الجہاد الجہاد ہو رہی کھلی دو۔ ملک صاحب
تم یہاں پڑھے نہیں اس کا حال تم کو بتانے سے فائدہ! تم کو دلچسپی ہو تو اپنے رفیق اور ہم خوار اور ہم مشرب احمد
ندیم قاسمی کے نام ایک خط میں میں نے یہ سارا رونا رویا ہے ان کے پاس جا کر اس میرے خط کو دیکھو۔ اللہ
اللہ کیا زمانہ تھا اور کیا رونقیں تھیں۔ ہاسٹل ہی کی عمارت پر نکبت و ادبار کے آثار دیکھ کر جگر میں جو
گھاؤ پڑے وہ کس کو دکھاؤں۔ جوڑی اور میں حویلی میں داخل ہوئے گھر کی خادمہ جس کا نام منظوراں ہے
ابھی تک اپنے چھوٹے بچے شادی کو سینے سے چمٹائے لان میں پڑی کھاٹ پر محو خواب ہوتی۔ وہ
بے چاری زندگی کے دکھوں کی ماری ہے اور بے حد لاغر اندام۔ نسوار کے نشے کی عادی چنانچہ نسوار کا
ایک بڑا پڑا دن رات اس کے سرہانے پر موجود ہوتا ہے وہ بیرون چڑھے جاگتی ہے اور میں اس کو نہیں جگاتا۔
میرے بھائی کے بچے یہاں آئے تو یہ اپنے بچے شادی کو گود میں اٹھائے خود بھاگن وارد ہوئی۔ چند
سال پہلے میری بہن کے پاس ملازم تھی اور میری بہن کہتی ہے کہ اپنی جوانی میں سلیقے سے گھر کی
جھاڑ پونچھ کرتی اور سلائی کڑھائی کے کام میں تو اتنی طاق تھی کہ محلے والیاں اس کے پاس
کپڑے لے کر آتیں اور اس کی منتیں کرتی پھرتیں۔ وہیں خلل دماغ کا شکار ہوئی اور کبھی کو کچھ کہے سنے
بغیر بال بچے چھوڑ کر غائب ہوئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ملک صاحب منظوراں اور اس کا
چھوٹا سا کا شادی دونوں کی باتیں لکھنے بیٹھوں تو یہ خط ختم ہونے میں نہ آئے۔ کاش میرا محسن
میرا یار سحر نگار یکتا سعادت حسن منٹو زندہ ہوتا وہ اس زمانے کی سچی باولی عورت اور
اس کے چھوٹے بچے شادی کو دیکھتا تو ان دونوں کو اپنے کمال قصہ گوئی سے حیات دوام بخش دیتا۔
میرے پاس سعادت مرحوم کا قلم کہاں۔ میں تو اس میدان میں گھٹنوں کے بل چلنا بھی نہ سیکھ سکا۔
جوڑی کو پاؤڈر کا دودھ اور دو ٹوسٹ کھلا کر میں دوپہر تک آرام کرتا۔ میرے جاگتے ہی شادی
صاحب آ کر موجود ہوتے اور سہ پہر شام تک میری جان نہ چھوڑتے۔ یہ بچہ بڑا ذہین بڑا گنی ہے۔
ملک صاحب اس کی صحبت میں میں اپنے بچپن کے ایام میں دوبارہ جیتا ہوں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں
پیٹر پن کی طرح ان لوگوں میں سے ہوں جو کبھی بڑے نہیں ہوتے اور ساری زندگی بچے ہی بنے رہتے ہیں۔
سچ پوچھو تو بڑوں کی صحبت مجھے کبھی راس نہ آئی۔ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہنستے بولتے میں نے سدا
دکھ غیر مطمئن سا پایا کس واسطے کہ مسرت قلبی کا تعلق بڑی حد تک حیرت اور معصومیت سے ہے۔
مشفق من، یار طرحدار محمد کاظم لاہوری نے مجھے دانہ ڈالا کہ اور کچھ نہیں کرتے تو اپنی آپ بیتی ہی
ڈالو۔ آپ بیتی خاک لکھوں کیوں لکھوں؟ آپ بیتی وہ لکھے جس نے زندگی میں کوئی معرکے سر
ہوں۔ دنیا جہاں کی مٹی چھانی ہو۔ سترہ اٹھارہ فتنہ سامان ڈومنیوں سے عشق لڑائے ہوں۔
سے دریا تیر کر پار کئے ہوں اور ماؤنٹ ایورسٹ پر جھنڈا گاڑا ہو۔ میں محروم و مغموم آدمی میری

زندگی میں ہے ہی کیا جو اس کے واقعات کو رقم کرنے کی زحمت مول لوں اور معاصروں کو اس سے جلا کیا کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنے لکھانے کا عمل کر چھوڑ گیا ہے اور مجھے لکھنے کے عمل سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ ماسوا چند خطوط کے حرام ہے جو گزشتہ ڈیڑھ دو برس میں کچھ لکھا ہو۔ قصہ و داستان ہو۔ طنز و مزاح کا مضمون ہو۔ آپ بیتی و جگ بیتی ہو۔ اس کے لکھنے کو دل چاہیے۔ ظرافت چاہیے۔ جوش و ولولہ چاہیے۔ میری باسٹھ برس کی عمر۔ بازار میں جاؤ تو بہاولپور کے سائیکل رکشا والے گدی کو تھپتھپا کر کہیں "بابا جی آؤ رکشا میں لے چلوں"۔ اس عمر میں ادب میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی سعی لاحاصل اور بے منفعت ہے۔ بہتر ہے کہ آدمی اللہ اور اس کے رسول سے لو لگائے اور کسی سے قرض لے کر حج کا قصد کرے۔ آپ بیتی لکھو تم جو زمانے کے سرد و گرم چشیدہ ہو۔ جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ برملا اور دن دھاڑے عشق کئے ہیں یا محمد کاظم لاہوری لکھیں کہ حقیقت حال مرقوم کرنے میں یکتا ہیں اور میں ان کے دلفریب فن کا مداح اور قائل۔ عمر بھر میں دو نہیں عشق تو انہوں نے بھی کئے ہیں اور ایک کا ذکر انہوں نے مجھ سے بھی کیا تھا۔ یہ عشق انہوں نے اپنی صغر سنی میں کیا جب ان کی عمر گیارہ برس کی تھی اور ایک بیس بائیس برس کی ننھی جہاں ڈومنی نے ان پر ڈورے ڈالے۔

ملک الشعرا رئیس المتغزلین ظہور احمد المتخلص بہ نظر لدھیانوی سے یہاں گاہے گاہے صحبت ہوتی رہتی ہے اس باغ و بہار شخص کے پاس سے اٹھ کر آنے کو جی نہیں کرتا۔ پہروں اس کی شیریں گفتار کے مزے لوٹتا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ بڑے ہی زندہ دل بزرگ ہیں گو خود کو کل امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور گردانتے ہیں۔ میرے علم میں وہ ایک مدت سے نیند کے عارضے میں مبتلا ضرور ہیں۔ ان کا دولت کدہ میرے مسکن سے ایک تیر پرتاب کے فاصلے پر محلہ غوث پورہ میں ہے جاؤ تو اکثر سوتے ملتے ہیں اور اس میں ان کا کوئی قصور نہیں گیارہ بارہ بجے دن سے پہلے نہیں اٹھتے ہیں ان کو کچی نیند نہیں جگاتا۔ ان کے کبوتروں کو دانہ کھلا کر حویلی کو لوٹ آتا ہوں۔

ملک صاحب۔ تم کیا کرتے ہو۔ محمد کاظم عید کے موقع پر لاہور سے بہاولپور آئے تو انہوں نے بتایا کہ تمہارے معرکتہ الآرا مضمون حدوث تثلیث پر دلبستان سرگودھا میں صف ماتم بچھی ہے اور وہ لوگ تمہارے ٹکڑے اڑانے کے درپے ہیں تم دل پر میل نہ لاؤ اور خم ٹھونک کر معترضین کا مقابلہ کرو۔ ان کا رویہ معقول اور راست نہیں برہمن کار برہمن سے ہونا چاہیے۔ صاحب میں نے تم کو کام کرتے دیکھا ہے تم بلا شبہ میدان تحقیق کے شہسوار ہو۔ خدا تمہیں اس معرکہ میں سرخرو کرے۔

حضرت مجھے لاہور بلاتے ہیں، جلدی کیوں نہ آؤں گا؟ یہ دیکھو سردی آگئی لحاف توشک کا انتظام کر لوں تو ادھر کا رخ کروں۔

یارب! جب تک لاہور میں اپنے دوستانِ غمگسار اور یارانِ دلنا شمار کو نہ دیکھ لوں اللہ

... وہ لاہور کی جنہیں میں ان کو اصل سرمایۂ زندگی جانتا ہوں۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کی خدمت میں سلام نیاز۔ محمد کاظم کی جناب میں سلام۔ سیاح خوش دل ضمیر احمد خان کو مجرا۔ اخوان عالی شان معین صاحب اور رشید چغتائی کو بندگی۔ ہماری لائق و فائق بیٹی منصورہ کو ہماری دعا کہنا۔

صبح جمعرات۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء

وزیرے چنیں...

کرنل محمد خان

ایک تھا بادشاہ جیسے کہ بادشاہ ہوتے ہیں، عالی جاہ سخی داتا، زود رنج ۔ جی چاہا تو کسی کو خلعت بخش دی اور جی چاہا تو توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دیا۔

اور ایک تھا وزیر، باتدبیر بلکہ کایاں اور چالاک۔ مجال ہے بادشاہت میں کوئی فتنہ سر اٹھائے۔ منٹوں میں کچل کر رکھ دیتا تھا جسے اپنی شہرت کے اعتبار سے صداقت شعار بھی تھا، خدا پرست بھی اور خدا جانے کیا کیا کچھ۔ اتنی خوبیوں کا وزیر ہو تو بادشاہ کی مسرت کا کیا ٹھکانا۔ مگر آپ جہاں پناہ کی اس حیرت کا اندازہ بھی کریں جب ایک روز حضور نے یہ دیکھتے ہیں کہ وزیر موصوف شاہی خزانے سے ایک بوری زر و جواہر سے بھر کر پیٹھ پر ڈالے، چپکے سے دروازے سے نکل رہے ہیں۔ شاہی غضب کا پارہ حسب معمول ایک لمحے میں کھولاؤ کے درجے پر پہنچ گیا۔ اسی لمحے میں آپ نے تالی بجائی اور اگلے لمحے میں شاہی حفاظتی دستہ حاضر خدمت ہو گیا۔ جلالت مآب نے کمانڈر کو حکم دیا کہ وزیر کا سر فی الفور قلم کر دیا جائے۔

وزیر نے فرمان شاہی سنا تو براہ راست بادشاہ کے قدموں پر جا گرا اور شاہی گھٹنے تھام کر عرض پرداز ہوا: "رحم، میرے آقا، رحم۔ میرا قصور معاف فرمائیں کہ میں کوئی عادی چور نہیں ہوں۔ آج کی لغزش تھی۔ میں گنہگار سہی لیکن ظلِ الٰہی میرے ساتھ اتنی رعایت ضرور کیجیے جتنی نائی نے حکیم کے ساتھ کی تھی۔ محض اضطراری لغزش۔"

"یہ نائی اور حکیم کا کیا قصہ ہے؟" بادشاہ نے پوچھا، "مگر قصہ شتابی سے بیان کرو کہ تمہارا قتل زیادہ دیر ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔"

قصہ نائی اور حکیم کا

"ایک تھا نائی جہاں پناہ،" وزیر نے قصہ شروع کیا، "جس کا دعویٰ تھا کہ اس کے پاس گنجے سر پر بال اگانے کا نسخہ ہے۔ سمجھنے میں تو خیر کچھ نہ تھا مگر نائی تھا بے حد چرب زبان، کسی گاہک کو نسخہ خریدے بغیر جانے نہ دیتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ شہر کے امیروں میں شمار ہونے لگا اور بڑا منہ زور ہو گیا۔ ایک روز ایک حکیم کہ بال اس کے سر کے چٹے تھے، نائی کی دوکان پر حجامت کرانے آیا۔ نائی نے حسب معمول اپنا نسخہ اس کے سر بھی تھوپنا

... سے دیکھا اور اس کی شہ رگ پر استرا رکھ کر بولا؛ "تم شریف

نائیوں کی دیانت پر شبہ کرتے ہو۔ سو، تیار ہو جاؤ۔ میں تمہاری گردن کاٹنے لگا ہوں۔ بتاؤ آگے سے کاٹوں یا

پیچھے سے؟"

"ٹھہرو میرے پیارے نائی،" حکیم نے لجاجت سے کہا، "میں اپنی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ رحم کرو

اس غریب پر۔ کم از کم اتنا رحم ضرور کرو جتنا جن نے معمار کے ساتھ کیا تھا۔"

"کیا قصہ ہے جن اور معمار کا؟" نائی نے استرا ہٹاتے ہوئے پوچھا "سناؤ کہ میں بہت مہلت نہیں دے سکتا۔"

قصہ جن اور معمار کا

"محترم نائی،" حکیم نے آغاز کیا، "ایک تھا معمار، دیانت دار، محنت شعار اور انجمن معماراں کا رکن۔ دیوار

یعنی قواعد انجمن کے مطابق ایک دن میں ایک سو سے زائد اینٹیں کسی صورت میں نہیں چنتا تھا

مگر ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ کام ختم کرنے کے بعد جب تعمیر کردہ دیوار کی اینٹیں گنیں تو ایک سو تین نکلیں۔

انجمن کی نافرمانی کے ڈر سے اس نے فوراً تین اینٹیں اکھاڑیں اور دور جا پھینک دیں مگر تیسری اینٹ

کا پھینکنا تھا کہ ایک دہشت ناک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی ایک دیو قامت جن نمودار ہوا۔

"ذلیل معمار،" جن چلایا "تم نے اینٹ پھینک کر میری آنکھ پھوڑ دی۔ اب تیار ہو جاؤ میں تمہارا سر

پھوڑتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنا گرزا اٹھایا۔

"رحم میرے پیارے جن، رحم!" معمار نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں نے تمہاری آنکھ جان بوجھ کر نہیں پھوڑی

تھی۔ میں اتنے رحم کا ضرور مستحق ہوں جتنا خاتون نے اپنے جھگڑالو شوہر پر کیا تھا۔"

"یہ کیا قصہ ہے؟" جن نے گرز زمین پر ٹیکتے ہوئے پوچھا۔ "چلو بیان کرو، قصہ بیان کرنے تک تم

زندہ رہ سکتے ہو۔"

قصہ خاتون اور اس کے جھگڑالو شوہر کا

"ایک تھا نوجوان،" معمار نے قصہ شروع کیا، "لکھا پڑھا تو ایسا نہ تھا مگر بے حد چالاک تھا۔ اس نے کچھ

محنت کی مگر زیادہ چالاکی سے بے شمار دولت جمع کر لی اور دھوکے سے ایک ایسی خاتون سے شادی کر لی

جو حسن ہی میں نہیں دانائی میں بھی یکتا تھی۔ بلکہ جنات پر بھی قدرت رکھتی تھی۔ شادی کے پہلے چند ماہ تو پرلطف

گزرے مگر کم ظرف شوہر رفتہ رفتہ اپنی بیوی کی برتری سے جلنے لگا اور اس باعث بات بات پر بھڑک اٹھتا جب

بہتر یہ ہے کہ تم گھر کے کام میں دلچسپی لو اور اپنے مجازی خدا کے آرام کا خیال رکھو۔"

ایک نکمّے خاوند کے منہ سے یہ ہتک آمیز کلمہ سن کر خاتون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔

"اب تم ناقابل برداشت ہو چلے ہو۔ مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔" اور ساتھ ہی اپنی ایک انگوٹھی دوسری پر رگڑی۔ اس پر فی الفور ایک پہاڑ سا حبشی نمودار ہوا اور خاتون سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"غلام حاضر ہے، کیا حکم؟"

خاتون نے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حبشی سے کہا، "اس بدتمیز شخص کو شہر کے سب سے اونچے مینار پر لے جاؤ اور وہاں سے نیچے پھینک کر اس کا چورا کر دو۔"

اس پر حبشی آگے بڑھا مگر شوہر دست بستہ بیوی سے مخاطب ہوا، "رحم نیک خاتون رحم۔ کم از کم اتنا رحم اس بدنصیب پر ضرور کرو جتنا درویش نے مسخرے پر کیا تھا۔"

"کیا کیا تھا درویش نے مسخرے کے ساتھ؟" خاتون نے حبشی کو تھمنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اور ہاں کہانی بیان کرنے کے لئے تمہیں صرف دو منٹ دیتی ہوں۔"

کہانی درویش اور مسخرے کی

شوہر بولا، "ایک درویش ایک لمبے سفر کے بعد ایک اجنبی شہر میں وارد ہوا۔ سخت بھوکا اور پیاسا تھا۔ ایک نوجوان سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس سے بولا "نوجوان، کسی ایسی دکان کا پتہ بتا سکتے ہو جہاں مجھے کچھ کھانے پینے کو مل سکے؟" نوجوان بولا "آؤ میرے ساتھ۔" اور پھر اسے ایک عالی شان عمارت میں لے گیا۔

"کیا یہی ہے وہ جگہ جہاں سے مجھے کچھ کھانے پینے کو ملے گا؟" درویش نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"نہیں یہ تو عجائب گھر ہے۔ میں نے سوچا تمہیں یہ مشہور مقام دکھا دوں۔" نوجوان نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ نوجوان دراصل اپنے مسخرہ پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

درویش بولا "بے شک نہایت عمدہ عمارت ہے مگر مجھے شدت کی پیاس لگ رہی ہے۔ اگر شربت یا پانی کی دکان . . . ."

"فکر نہ کرو بابا" نوجوان بولا "چلو میرے پیچھے پیچھے۔" اور کوئی میل بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد نوجوان ایک محراب کے روبرو رکا۔ کہنے لگا "دیکھتے ہو یہ عظیم الشان محراب بابا! یہ ہماری فوج کی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کی گئی تھی۔ ہمیں اس پر بڑا فخر ہے۔"

"بے شک" درویش نے تائید کی "مگر میرے عزیز، پیاس نے یہ ابتر حال کر دیا ہے۔ اب کسی ایسی

سوال اُٹھانا

غلام جیلانی اصغر

سوال اُٹھانا فطری بات ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تکلیف اُٹھانا۔ چنانچہ جب بچہ عالمِ غائب سے عالمِ وجود میں آتا ہے تو سب سے پہلے والدین اور دوسرے نزدیک کے رشتہ دار یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ نومولود کا کیا نام رکھا جائے۔ عام طور پر ایسے خوشگوار موقعوں پر ہی خاندان کے افراد کے درمیان مستقل محاذ آرائی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ ننھیال والوں کا خیال ہوتا ہے کہ بچے کی شکل و صورت کیونکہ بڑی حد تک ماں سے ملتی جلتی ہے اس لئے اس کا نام بھی ایسا ہونا چاہیے جس سے ننھیال کی بو آ سکے۔ بچے کی ماں کی ہمدردیاں عموماً اسی فریق سے وابستہ ہوتی ہیں لیکن ددھیال والوں کا موقف اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بچے کا والد حسنِ اتفاق سے اسی خاندان کا ایک عظیم فرد ہے جس نے بچے کی تخلیق میں مثبت کردار ادا کیا ہے۔ اور دوسرا یہ استدلال کہ بچہ آئندہ چل کر اپنے دادا یا اسی قبیلے کے کسی اور فرد سے قریبی مشابہت قائم کرے گا، اتنا پختہ اور ناقابلِ تردید ہوتا ہے کہ فیملی پلاننگ والے بھی اسے رد نہیں کر سکتے۔ بڑے بزرگ جو عام طور پر صلح کُل ہوتے ہیں، ایسے موقعوں پر یہ حل تجویز کرتے ہیں کہ پچھلے چند سالوں میں میٹرک میں پاس اور فیل ہونے والے طلباء اور طالبات کی فہرست دیکھ لی جائے اور جو نام بھی زچہ بچہ سے کچھ مناسبت رکھتا ہو وہی رکھ لیا جائے۔ اس طرح سوال کا عارضی یعنی PROVISIONAL حل تو ہو جاتا ہے لیکن آگے چل کر بچہ اپنے لئے خود نام تجویز کرتا ہے۔ کبھی ماں باپ کے رکھے ہوئے نام سے بالکل الگ اور کبھی اُسی نام میں ہی ترمیم و اضافہ۔ مثلاً میرا دوست سیٹھی خان سکندر علی چوہدری بن جاتا ہے اور نذر محمد نام ور شد۔

نام میں یہ تبدیلی محض اتفاقی نہیں بلکہ اس کی نوعیت بنیادی ہے۔ بچہ جب تک ننھیال و ددھیال کی جامد روایات کا پابند ہوتا ہے، وہ اپنے نام کی اسی طرح تکریم کرتا ہے جیسے افریقہ کے کچھ قبائل ٹوٹم کی تکریم کرتے ہیں، کیونکہ ٹوٹم قبیلے کے جملہ مفادات کا محور ہے۔ لیکن جونہی بچہ قبیلے کی حدود سے باہر نکلتا ہے تو وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ نام تو محض اتفاقیہ یا حادثاتی تھا جس کا اس کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں۔ پیدائش کے وقت بچہ سیال صورت میں تھا اسے کسی بھی سانچے میں ڈالا جا سکتا تھا لیکن جب ذہن بچہ مائع کی سیال کیفیت سے ٹھوس اور واضح حقیقت میں بدلنا شروع ہوتا ہے تو نام محض ایک تجریدی علامت بن جاتا ہے۔ "منا" یا "ببلی" ایک خاص عمر تک تو بچے کی نامعلوم حیثیت کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن اب یہ تجریدی نام بچے کے اندر سے اُبھرتی ہوئی شخصیت کا احاطہ نہیں کر سکتا جو لگاتار اس کے اندر سے نمودار ہو رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر درخت کا آغاز اور انجام عمل پر

ہوتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک حقیقت اپنے واشگاف اور واضح روپ میں ہمارے سامنے نہیں آتی ہم اس کا رشتہ ایک ایسے نشان یا علامت سے جوڑ دیتے ہیں جو اسی طرح غیر واضح جیسے نام اور مبہم ہے۔ مثلاً ریاضی میں یہ ایک بنیادی کلیہ ہے کہ الف مساوی ہے ب کے۔ جب تک آپ اس حقیقت عظمیٰ کو تسلیم نہ کریں آپ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ لیکن درحقیقت یہ کلیہ ایک غیر منطقی مفروضہ ہے۔ الف کی اپنی الگ شخصیت ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، رنگ و روپ 'ب' سے بالکل جداگانہ ہے۔ اسی طرح 'ب' کی اپنی شخصیت ہے جس کی انفرادیت سے کوئی بھلا انکار نہیں کر سکتا۔ اب ان دونوں کو جڑواں بھائی بہن کی حیثیت دینا بالکل ایسا ہی غیر معقول استدلال ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ گھوڑا اور گدھا برابر ہیں کیونکہ ان میں ٹانگوں اور کانوں کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ اب آپ ریاضی سے ذرا نذر محمد کی طرف آئیں۔ جب وہ تجرید کی علامتی سطح سے اوپر اٹھتا ہے تو وہ ایک ایسی واضح شخصیت بن جاتا ہے جس میں 'ہونے' اور 'بننے' یعنی BEING اور BECOMING کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔ یہی خوابیدہ صلاحیتیں جب بیدار ہوتی ہیں تو وہ ماں باپ کے رکھے ہوئے نام کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور اپنے لئے ایک ایسا نام تجویز کرتا ہے جو اس کے اندر کے پوشیدہ انسان کی پوری غمازی کر سکے۔ چنانچہ ن۔م کا اصلی نام تو راشد ہے۔ نذر محمد تو محض ایک علامت تھی جو شاعر نے بلوغت کے پہلے مرحلہ پر ہی ترک کر دی تھی۔ ن۔م کے علاوہ بھی کئی نام ہیں جن کے متعلق یہی سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ خیر یہ کام اب قاری کو کرنا چاہیئے۔

آپ نے اکثر ہر شاعر کے ساتھ ایک تخلص بھی دیکھا ہوگا بالکل اسی طرح جس طرح ہر شادی شدہ عورت کے ساتھ بچہ ہوتا ہے۔ یہ تخلص اس بات کا کھلا اظہار ہے کہ وہی فرد جو ابتدا میں ماں باپ یعنی 'ظالم سماج' کا غلام تھا اب صاحب اولاد ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ آزاد ہے۔ شعر دراصل اس کی آزادی کا میگنا کارٹا ہے۔ جب کبھی شاعر شعر کے انتہائی ناپائیدار لیکن خوبصورت میٹریل سے ایک نیا مکان تعمیر کرتا ہے اور اس کے آگے تختی یا نیم پلیٹ لگاتا ہے تو وہ آبائی نام کی نہیں ہوتی، بلکہ اس تخلص یا آزاد فرد کی ہوتی ہے جو آباؤ اجداد کی آہنی گرفت سے آزاد ہو کر ایک الگ شخصیت بن گیا ہے۔ اس شخصی آزادی کا سب سے بڑا مظہر غزل کا مقطع ہوتا ہے۔ کوئی شاعر مقطع میں اپنا پورا خاندانی نام نہیں لکھتا، بلکہ محض تخلص لکھتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر نے دانستہ طور پر اپنی تخلیق سے اپنے والدین کو خارج کر دیا ہے اور وہ اب اپنی تخلیق کا خود ہی خالق ہے اور خود ہی رازق ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جب شعر تخلیق کرنے والا اصلی گوشت پوست کا بچہ تخلیق کرتا ہے تو پھر یہ دل کے راستے یہی سوال اٹھاتا ہے کہ بچے کا کیا نام رکھنا چاہیے؟

سوال اٹھانا اس لئے بھی ایک دائمی اور بنیادی حقیقت ہے کہ جب تک سوال یعنی چیلنج وجود میں نہ آئے دوسری طرف سے جواب یا RESPONSE کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ٹائن بی نے تاریخ کی ساری سرگزشت کو ان دو لفظوں میں مقید کر دیا ہے۔ تخلیق کائنات کی ابتدا بھی غالباً سوال سے ہوئی تھی (یہ میرا اندازہ ہے۔ آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں) سوال کچھ اس نوعیت کا ہوگا۔ یہ خلا کیا ہے؟ اتنی تاریکی کیوں ہے؟ [illegible]

[illegible] سے کائنات سے وقت اٹھائے جا سکتے تھے ۔ تو بتا یا کہ کیا چیز ہے ہوا کیا ہے یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ غالب کی یہ الہامی غزل ایسے ہی کئی سوالوں سے بھری پڑی ہے ۔ ان کا تسلی بخش جواب اس لئے ممکن نہیں کہ سائنس تو واقعہ یا Fact کی تشریح یا توضیح کرتی ہے ۔ ایسے ہی جیسے غالب کے شارحین اس کے شعروں کی شرح کرتے ہیں لیکن کوئی بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ خود شعر کس طرح وجود میں آیا ۔ غالب خود بھی نہیں جانتا ۔ ورنہ لوگ سرکش کہہ کر ایک مذکورہ اپنی اخلاقی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے ۔ لیکن ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ یہ کوئی معقول جواب نہیں ۔ یہ تو محض شریف لوگوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ کو بہلانے کی ایک کوشش ہے ۔

تخلیق کائنات تو خیر بہت دور کی بات ہے ۔ اس موقعہ پر جو سوال اٹھائے گئے یا اٹھائے جا سکتے تھے مابعد الطبیعات کا علاقہ ہیں اور میں مابعد الطبیعات سے اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا غیاث اللغات سے ۔ البتہ آج سے کوئی پانچ چھ ہزار سال قبل جب انسان خاصا مہذب ہو چکا تھا تو اس نے اپنے وجود ، اپنے ماحول اور اپنے خالق کے متعلق سوال اٹھانے شروع کر دیئے ۔ کیوں ؟ کیا ؟ کیسے ؟ اس کی ابجد کے ابتدائی حروف تھے ۔ اور یہی سوال جو ابتدائی انسان نے اٹھائے تھے ان تمام علوم کا ماخذ اور سرچشمہ ہیں جو ہر مکتب اور یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں اور پڑھائے بھی اس خوبصورتی سے جاتے ہیں کہ ہمارے دانشور جنہیں عرف عام میں اساتذہ کہا جاتا ہے ان سوالوں میں مزید سوالوں کا اضافہ کرتے جاتے ہیں ۔ جواب سے اس لئے گریز کرتے ہیں کیونکہ اس سے مزید الجھاؤ کا خطرہ ہے ۔ یوں بھی ہمارے آباؤ اجداد اتنے دور اندیش اور عقلمند تھے کہ وہ ہمیں ورثہ میں ایسے ایسے دلچسپ سوال دے گئے ہیں کہ اگر ہم انہی پر غور کر کے آپس میں لڑتے رہیں تو مزید کسی عالمی جنگ کی چنداں ضرورت ہی نہ رہے ۔

سوال کیسے وجود میں آیا ؟ دلچسپ سوال ہے ۔ میرے خیال میں سوال اٹھانے کا آغاز ریاضی سے ہوا ۔ یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ریاضی کا آغاز سوال اٹھانے سے ہوا ہو ۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ جب انسان جنگل سے نکل کر شہر میں آباد ہوا تو اس نے مکان تعمیر کرنا ضروری سمجھا ۔ چنانچہ مستری اور مزدور کو دیہاڑی پر لگایا گیا ۔ یہاں اتنا طویل اور تکلیف دہ تھا کہ مالک مکان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ایک مستری اور دو مزدور ایک کام کو چار دن میں ختم کرتے ہیں تو بارہ مستری اور چار مزدور بالکل اسی کام کو کتنے عرصے میں ختم کریں گے ؟ یہ سوال عارضی [illegible] تھا بلکہ انتہائی بنیادی نوعیت کا تھا ۔ اور آج تک کوئی ماہر ریاضی دان اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے [illegible] ۔ ایک دفعہ ایک ریاضی دان نے اس کا جواب دریافت کر لیا تھا اور وہ "پا لیا پا لیا" کہتے ہوئے ننگے بدن گھر سے [illegible] ہر مالک مکان [illegible] کچھ کہتا ہے کہ جب مکان تکمیل کے آخری مراحل میں [illegible] [illegible] ننگے بدن اور ننگے پاؤں [illegible] اور کبھی [illegible] میں [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] مستری [illegible] موقوف ہے ۔ [illegible] بات [illegible]

ہوا۔ جواب تولیدی بات ہے

میں نے اکثر سوچا ہے (ممکن ہے آپ اس سے اتفاق نہ کریں) کہ سوال ایک ایسا عالمِ برزخ ہے جس کے ایک طرف نہ جاننے کی ذہنی اذیت ہے اور دوسری طرف جاننے کی بے پایاں عقوبت۔ ہم ایک عذاب سے نکل کر جب دوسرے عذاب میں داخل ہوتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ نہ جاننے کا عذاب تو اپنے اندر آگہی کی شباہت بھی رکھتا تھا لیکن جاننے کا عذاب اس لئے زیادہ تکلیف دہ ہے کہ اس سے اپنی جہالت یا حماقت کا احساس اور گہرا ہو جاتا۔ سنا ہے کہ عمر بھر کی ریاضت اور جستجو کے بعد نیوٹن کو یہ احساس ہوا تھا کہ وہ محض ایک طفلِ ناداں ہے جو ساحلِ سمندر پر علم کے چند "ناتراشیدہ سنگریزے" چُنتا رہا ہو (واوین میرے ہیں)۔ سقراط کا المیہ نیوٹن سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا اُس نے اپنی موت سے کچھ قبل اپنی بیوی سے کہا تھا "میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا" اس لحاظ سے سقراط اس مالک مکان سے کم دُکھی ہے جو مستری اور مزدور کو جاننے کے باوجود کام پر لگاتا ہے اور عرفان کے آخری مرحلے پر گھر سے بھاگ نکلتا ہے۔ اس لحاظ سے آگہی کا شعور نا آگہی سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔

ذکر ریاضی کا ہو رہا تھا۔ ریاضی میں سوال اسلئے اُٹھایا جاتا ہے کہ اس کے دامن میں سوالوں کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ باقی تمام علوم میں مثبت اور ٹھوس اشیا سے واسطہ پڑتا ہے۔ شاعری کو ہی لے لیجئے۔ اس میں شاہ شمشاد قداں۔ خسروِ شیریں دہاناں، کی وہ فراوانی ہے کہ لطف آجاتا ہے۔ لیکن ریاضی اور ریاضی دان کا سارا کاروبار سوال اُٹھانے اور جواب دبانے سے وابستہ ہے۔ البتہ اس سارے عمل میں ایک بات قابلِ غور ہے کہ سوال اُٹھانے والے کے ذہن میں جواب پہلے ہی موجود ہوتا ہے۔ مثلاً جب وہ آپ سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ اگر آپ سادگی یا خلوص سے پانچ کہہ دیں تو وہ بلاتوقف بول اُٹھتا ہے 'چار'۔ اب آپ ہی بتائیں کہ جب وہ جانتا ہے کہ اس سوال کا مطلوبہ جواب چار ہے تو آپ سے اُسے ایسا غیر معقول سوال کرنے کا کیا حق ہے۔ سوال تو اُس وقت پوچھا جاتا ہے جب آدمی کا ذہن کسی مسئلہ کے متعلق اُلجھا ہوا ہو۔ مثلاً اگر باپ بیٹے سے یہ سوال کرے کہ کیا وہ آج سکول گیا تھا؟ تو یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے دو جواب ہو سکتے ہیں اور دونوں انتہائی پریشان کن۔ بالخصوص اُردو ادب میں بھی یہی خوبی ہے کہ سوال کرنے والے کا ذہن بھی اتنا ہی اُلجھا ہوا ہوتا ہے جتنا کہ جواب دینے والے کا، اسلئے سوال اُٹھانے والے کو بھی اتنی ہی دقت ہوتی ہے جتنی کہ سوال بٹھانے والے کو۔ ادب میں سوال دراصل اُونٹ کی طرح ہے جس کا اُٹھانا اور بٹھانا دونوں مشقت طلب اور حماقت آمیز عمل ہیں۔ مجھے اس امر کا اس وقت شدید احساس ہوتا ہے جب میں ادبی رسالوں میں ایسی بحثیں پڑھتا ہوں جن میں باقاعدہ طور پر سوال اُٹھائے جاتے ہیں۔ سوال اُٹھانے والا بڑی معصومیت سے پوچھتا ہے کہ اُردو ادب میں جدیدیت کی لسانی تشکیلات کے مضمرات کیا ہیں؟ یا اُردو ناول میں ارتقائی تنصیبات کی جدلیاتی توجیہات کا پس منظر اور پیش منظر کیا ہے؟ سوال اُٹھانے والا صاحب توضیحی جواب بھی دیتا ہے اور پھر اپنے سوال کو جواب سمیت میدانِ جنگ میں پھینک دیتا ہے۔ ناقدین اپنے تمام آلاتِ حرب کے ساتھ جنگ میں شریک ہو جاتے ہیں اور آخرکار یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ محرکِ بحث نے جو تفصیلی جواب، سوال

[illegible] بحث بھی جو صفائی سے اتر کر ذاتی سطح پر بھی آجاتی ہے

بہرصورت اس مشق یا کاوش سے اُردو ادب کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ کیونکہ سوال و جواب کا عمل تخلیقی نوعیت کا ہوتا ہے اس سے ادب کے وہ تمام گوشے قاری کے سامنے آجاتے ہیں جو ابھی تک دانستہ یا غیر دانستہ چھپے بیٹھے تھے۔ سوال کا بنیادی مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ ناقص حقائق کو مسلّمہ حقائق میں بدل دے۔ پولیس والے بھی تفتیش کے دوران اسی طریق کار پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا یا سنا ہوگا کہ ابتدائی رپورٹ تو محض چند سادہ سوالوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن تفتیش کے دوران یہی سادہ اور عام فہم سوال اتنے پیچیدہ اور گرہ دار بن جاتے ہیں کہ خود سوال کرنے والا یعنی رپورٹ درج کرانے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ادب میں تحقیقی کام کرنے والے اس لحاظ سے پولیس سے زیادہ بدنصیب ہیں کہ وہ ابتدائی رپورٹ بھی خود ہی درج کراتے ہیں۔ تفتیش بھی خود ہی کرتے ہیں اور آخر کار وہ اپنی تفتیش کی مکمل رپورٹ پڑھنے کی سزا بھی خود ہی بھگتتے ہیں۔ اس لحاظ سے ادب میں سوال اُٹھانا انتہائی جرأت کا کام ہے۔ حال ہی میں کچھ محققین نے علامہ اقبال کے اصلی یوم پیدائش پر اتنے گراں قدر سوال اُٹھائے ہیں کہ مرحوم اگر زندہ ہوتے تو انہیں خود اپنی پیدائش پر شک ہونے لگتا۔

جب سے ادب میں سوال اُٹھانے کا رواج ہوا ہے عالمی سیاست بھی اس سے متاثر ہوئی ہے۔ پہلی جنگ عظیم تک صرف تلوار اُٹھائی جاتی تھی، سوال نہیں اُٹھایا جاتا تھا۔ عام طور پر ملکوں میں شریفانہ طریق کار رائج تھا۔ جب ذرا سی غلط فہمی یا شکر رنجی پیدا ہوتی تو ملک کا سربراہ ہمسایہ ملک کو الٹی میٹم دے دیتا جو وہ عام طور پر قبول کر لیتا۔ دوسرے دن دونوں ملک متنازعہ سرحدوں پر اکٹھے ہو کر کشتوں کے پشتے لگا دیتے۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔ لیکن اب عالمی سیاست کا انداز اور مزاج انتہائی ادبی ہو گیا ہے۔ اب جب کہیں بحران پیدا ہوتا ہے یا پیدا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے تو تمام ملکوں کے مندوبین اچھے اچھے کپڑے پہن کر ایک خوبصورت سے ہال میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایک مندوب سوال اُٹھاتا ہے: حضرات کیا یہ صحیح ہے کہ جنوبی لینڈ نے شمالی لینڈ کی سرحدوں کی سمت کو بدل دیا ہے؟ دوسرا مندوب نہایت شائستگی سے جواب دیتا ہے کہ یہ شمالی لینڈ کا داخلی معاملہ ہے اور جنوبی لینڈ کا خارجی مسئلہ اسلئے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ برادر ملکوں کے داخلی یا خارجی معاملات میں دخل دے۔ مسئلہ فوراً ایک سبجیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو اس پر غور و خوض کے لئے دس سال کا مختصر عرصہ طلب کرتی ہے۔ اس طرح ملکوں کی سرحدیں بدل جانے کے باوجود سوال اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ ایک اچھے سوال کی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ اپنی تازگی اور نیرنگی کو ہر دور میں برقرار رکھتا ہے جواب کا تو محض اتنا جواز ہے کہ وہ مزید سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ تو پھر آؤ مل کر ایک نیا سوال اٹھائیں کہ کیا سوال اٹھانا حماقت ہے؟

سفرنامے

ایک خوشگوار سفر

محمد خالد اختر

اکتوبر ۱۹۷۹ء کی بارھویں تاریخ ۔ مجھے مدتوں بعد راولپنڈی جانا نصیب ہوا۔ ایّامِ جوانی میں، مَیں گویا پیمائے گیتی نورد اور جہانیاں جہاں گشت تھا۔ اور جس ریل گاڑی کو دیکھتا تھا اس میں سوار ہو جانے اور اس کی منزل تک جانے کو دل مچلنے لگتا۔ اب کئی ایک برس سے یہ کیفیت ہے کہ سفر کے خیال سے دل ڈوبنے لگتا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ پچھلے چند سالوں میں سفر کے جھنجھٹ اور صعوبتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اور گاڑی یا بس میں کہیں آنا جانا اتنا آسان اور آرام دہ نہیں رہا جتنا کہ یہ میری جوانی کے دنوں میں تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک اُوپر ساٹھ برس کی عمر قوئے میں اضمحلال کے ساتھ دل بجھ اور مر گیا ہے اور گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر جھوکوں میں پڑنے کی ہمت اپنے میں نہیں پاتا۔ مَیں لاہور میں بسلسلۂ ملازمت ماسوا ڈیڑھ دو سال کے بیس بائیس سال سکونت پذیر رہا اور تم یقین نہیں کرو گے کہ اس مدت میں اب کے دوسری بار راولپنڈی جانا ہوا۔ حالانکہ میرے لڑکپن اور جوانی کا دوست شفیق الرحمٰن[1] وہاں رہتا ہے اور اکثر بلاتا رہتا ہے۔

اب اس بارہ تاریخ کو وہاں ایک خاندانی شادی کی تقریب تھی اور دولہا جو ایک سول انجینئر ہے اور رشتے میں میرا بھتیجا، بہ نفسِ نفیس گھر آ کر مجھے شمولیت کی دعوت دے گیا تھا۔ عذر داری کی صورت نہ تھی ورنہ ٹال ہی جاتا۔ یہ شادی میرے پنڈی جانے کا جواز بنی۔

صبح کی ریل کار سے میں بارہ بجے کے دوپہر پنڈی پہنچا۔ راستے میں اپنے آبائی گاؤں کی بہی کی پہاڑیوں اور دریا کے کنارے جہلم شہر کے پُر تصویر منظر کو دیکھ کر میرا دل اُچھلا۔ اپنے کالج کے ایام میں مَیں اسی جہلم شہر سے سائیکل پر ٹلہ جوگیاں کی خطرناک مہم پر روانہ ہوا تھا۔ اوہ! وہ امنگ! وہ جوانی!

ریل کار کچھ لیٹ پہنچی۔ وہ اس لیے کہ دینے سے کچھ آگے اسے ایک حادثہ پیش آ گیا۔ ہم ایک بے پھاٹک کی کراسنگ پر ایک سکوٹر سوار اور اس کے پیچھے بیٹھے ایک سکول کے بچے پر چڑھ دوڑے۔ ڈرائیور کے فی الفور بریکیں لگانے سے ان دونوں کی جانیں معجزانہ طور پر بچ گئیں۔ گو سکوٹر تڑ مڑ گیا۔

---

[1] ممتاز طنز و مزاح نگار ۔ افسانہ نگار

... ہوئے سفید بال، سرخ و سپید خوشی سے چمکتا چہرہ۔ اپنی رنگین دھاری دار قمیض اور خاکستری پتلون میں چاق و چوبند۔

شفیق اور میں ہم عمر ہیں وہ ساٹھ برس سے کچھ کم، میں کچھ زیادہ۔ اس نے مجھے گرمجوشی سے بانہوں میں لیا اور مجھے اس اردو شعر کا خیال آیا جس کا مطلب ہے کہ ایک دیرینہ دوست کا ملنا خضر اور سکندر کی ملاقات سے بہتر ہے۔ شفیق کا سب سے چھوٹا بیٹا امین الرحمن بھی اس کے ساتھ تھا۔ سولہ سترہ برس کا شرمیلا، کچھ کچھ پر یمین لڑکا، آنکھوں میں چاہت کی چمک اور چہرے پر تپاک کی مسکراہٹ۔ شفیق کے تین بیٹے ہیں۔ سب سے بڑا عتیق ایک چھ فٹا، خوش رو، من موجی دیو ہے جس نے میڈیکل کورس کو چھوڑ کر کیونکہ اس کی طبیعت انسانی ہاتھوں کی چیر پھاڑ سے اکتانے لگی تھی آرٹس کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ عتیق باسکٹ کا بڑا اچھا کھلاڑی ہے اور ایسے آدمی کی طرح آتشیں مزاج، بے صبر اور ہٹیلا، اور میرا خیال ہے کہ شفیق اس سے کچھ کچھ ڈرتا ہے۔ عتیق سے چھوٹا خلیق، ہموار، قائم مزاج اور محنتی لڑکا ہے وہ میڈیکل کے لیے تیاری کر رہا ہے اور ان لڑکوں میں سے ہے جو سکول اور کالج میں اول آتے ہیں اور ثابت قدمی سے اپنے پیشے کی بلندی حاصل کر کے دم لیتے ہیں سب سے چھوٹا امین، نان میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں ہے اور انجینئر بنے گا۔ ایسے تین چھیلے اور تندرست بیٹوں کا باپ ہونا شفیق کی بڑی خوش قسمتی ہے۔ مگر ان تینوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو بڑا ہو کر باپ کی طرح کتابیں لکھے گا۔

امین نے میرا بیگ اٹھایا اور ہم سٹیشن سے باہر آئے۔ شفیق نے خود گاڑی ڈرائیو کی۔ اگرچہ مجھے شک ہے کہ اکثر آرٹسٹ اور ادبی لوگوں کی طرح وہ مشینوں سے آسودہ خاطری سے نہیں نپٹ سکتا۔ اپنی اس نئی موٹر کے گیئروں سے اس کی جھجک اب تک کلی طور پر دور نہیں ہوئی۔ اس کا بیٹا عتیق اب بیشتر ڈرائیونگ کرتا ہے اور والد صاحب ڈرائیو کیے جانے میں آنند پاتے ہیں۔

ہم ویسٹ ریج کی طرف گئے جہاں دوسرے افسروں کے بنگلوں کے درمیان شفیق کا اپنا ایک اچھا سا خوشگوار گھر ہے۔ سلیقے سے سجا ہوا مگر نمائشی سامان کے بغیر۔ میرا بیگ اوپر کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں مجھے ٹھہرنا تھا۔ اس کے سامنے شفیق کا اپنا کمرہ تھا۔ صحیح معنوں میں ایک روم۔ ایک کتابوں کی سائیڈ بورڈ، دو کرسیاں، بستر اور ایک اونچا ڈرائنگ کرنے کا ڈیسک۔ پچھلے چند سال سے امریکی ناولسٹ ارنسٹ ہیمنگوے کی طرح شفیق اپنا سب لکھنے پڑھنے کا کام کھڑے ہو کر ڈرائنگ ڈیسک پر کرتا ہے۔

میرے اور شفیق کے کمروں کے درمیان ایک بالکل نما کوٹھری سی ہے جہاں میں نے کسرت کرنے کے کئی آلات پڑے دیکھے۔ ڈمبل، میڈیسن بال، چیسٹ ایکسپینڈر، باکسنگ کے دستانے، مگر مجھے یقیناً وہاں دکھائی نہیں دیے۔ اس کوٹھری میں کئی بڑے مقفل سیاہ ٹرنک رکھے ہوئے ہیں۔ کتابوں، البموں، پرانی وردیوں، نمونوں وغیرہ سے بھرے ہوئے۔ جنہیں شفیق نے فوج اور نیوی میں اپنی عسکری ملازمت کے دوران اکٹھا کیا ہے۔ یہاں میں یہ بتاتا جاؤں

کہ سیشن جج بننے سے اپنی عسکری ملازمت سے سبکدوش ہونے سے پہلے [illegible] صاحب [illegible]
پاکستان نیوی میں ریئر ایڈمرل کا تھا۔

میں شادی کی تقریب میں پہلا پھلا کر شفیق کو اپنے ساتھ لے گیا اور چونکہ مری روڈ پر مطلوبہ محلے میں گلی نمبر ۸ کی کھوج لگانا کوئی آسان کام نہ تھا ہم وہاں عین اس وقت پہنچے جب نکاح پڑھایا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ خاندانی شادیاں کچھ فائدے سے خالی نہیں ہوتیں۔ وہاں میں اپنے ان چچیروں، ممیروں، ماموؤں، خالوؤں سے برسوں کے بعد ملا جن کے بارے میں بھول چکا تھا کہ ان کا وجود بھی ہے اور جن کی ہیئت اس مدت میں انقلابی طور پر بدل چکی تھی۔

بارات کو جو ایک گھنٹہ پہلے ٹیکسی کی پہاڑیوں کے دامن میں آباد ہمارے آبائی گاؤں کھوڑی سے بس پر پہنچی تھی اسی دن لوٹنا تھا۔ اس لیے تقریب نے معمول کا طول نہ پکڑا اور ہم جلد ہی فارغ ہو کر وہاں سے کھسکے۔ چکنے، مرغن اور لذیذ شادی کے کھانے کو چلانے کے لیے شفیق اور میں نے راولپنڈی صدر تک پیدل چلنے کا قصد کیا۔ شفیق پہلے دوپہر کا کھانا مطلقاً نہیں کھایا کرتا تھا لیکن اب ایک عرصے سے اپنے اصول پر کاربند نہیں رہا۔ اکتوبر کے آخری دنوں کے سورج میں ابھی کچھ حدت تھی اور راستے میں ہم نے ایک ٹیکسی لی جس نے ہمیں صدر کے علاقے میں جا اتارا۔ جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے سب دوکانیں بند تھیں۔ مگر جیسا کہ اہلیان پنڈی جانتے ہیں اس روز یہاں ایک میلہ سا لگتا ہے بازار کے چوک میں چاروں سمت PAVEMENT پر پرانی کتابوں، رسالوں، میگزینوں کے ڈھیر بچھے ہوتے ہیں اور ان گاہکوں کی ریل پیل سے اندازہ ہوتا تھا کہ پنڈی کے لوگ کافی لٹریری ہیں اور کتابیں پڑھنے پر مائل ہیں۔ لاہور میں کتابوں کا میلہ ہر جمعے کے روز انارکلی میں بائبل سوسائٹی کے آس پاس لگتا ہے پنڈی کے میلے کا پاسنگ بھی نہیں

شفیق اپنے جوڑ ۱۹۴۷ کے گورکھا ہیٹ میں رجسے اور ڈھے وہ شادی کی تقریب میں شامل ہوا تھا، پرانی کتابیں بیچنے والوں کے لیے ایک شناسا، جانی پہچانی صورت ہے۔ ان میں سے دو تین نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور اس کی خیریت دریافت کی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ہم نے اس میلے کی سیر کی۔ چند کتابیں خریدیں اور کچھ پرانے SATURDAY REVIEW OF LITERATURE اور PUNCH کے پرچے۔

اب شام کے ساڑھے چار پانچ بج چلے تھے اور اپنے بنڈلوں پیکٹوں سے لدے پھندے ہم نے گھر چلنے کی ٹھانی۔ چوک پار کر کے شفیق نے ایک پھل فروش سے اپنے منجھلے بیٹے خلیق کے لیے ڈیڑھ دو سیر سیب خریدے کہ اس کا پسندیدہ پھل سیب ہے یہاں تک کہ وہ اسے آم سے بھی بہتر سمجھتا ہے، سیبوں کے اس بڑے لفافے نے ہمارے مختلف النوع پیکٹوں اور بنڈلوں میں جنہیں ہم اٹھائے ہوئے تھے ایک اور اضافہ کر دیا۔

ٹیکسی کرنے کی بجائے ہم پاس ہی واقع جی۔ ٹی بسوں کے اڈے پر گئے جہاں سے میں نے اگلے روز کے لیے ڈی لکس سروس میں ایک سیٹ ریزرو کرائی۔ پھر میں نے شفیق سے کہا کہ میں کرنل محمد خاں سے ملنا چاہتا ہوں

... صاحب کرنل کو ملنے کے لیے چل پڑے۔ ہو ...
ہمارے حلق میں قطعی یقین نہ تھا کہ وہ اپنے دولت کدے میں موجود ہوگا۔

"چلو دیکھ لیتے ہیں، پنڈی کلب پاس ہی ہے۔" اور ہم بیئت کذائی سے اپنے بنڈلوں، پیکٹوں اور لفافوں ... پنڈی کلب کرنل گھر پہنچے۔ عقبی کلب میں اپنے کمروں کے SUITE میں اس کے نوکر نے بتایا کہ کرنل صاحب سوتا ہے، مگر ہم کو عزت دار ملاقاتی جانچتے ہوئے چھوٹے صاف ستھرے ڈرائینگ روم میں بٹھا کر کرنل صاحب کو جگانے چل دیا۔ ہم نے فوراً اپنے بقچوں اور پوٹلیوں سے اپنی خلاصی کرائی اور انہیں کمرے میں مناسب مقامات پر ٹھکانے لگوا دیا۔

کرنل نے آنے میں دیر نہ کی۔ بکھرے بال، آنکھوں میں خوش آمدید کی ٹمٹماہٹ، شلوار اور کرتا پہنے کرنل ایک چست، خوشگوار، چھوٹا سا آدمی ہے اور اس کی مونچھیں اکڑی ہوئی ہیں، مگر کنے واسطے فوجیوں میں سے نہیں جنہیں دیکھ کر اپنی بے بضاعتی پر افسوس ہوتا ہے۔ اس کا انداز ملائم میٹھا ہے اور آپ اسے بخوبی سلیم الطبع بوڑھوں کے طبقے میں جگہ دے سکتے ہو (میں بھی اسی کیٹگری میں آتا ہوں۔)

ویسے پنڈی کلب یا بجنگ آمد کرنل قطعاً بوڑھا نہیں۔ وہ غالباً اٹھاون سال عمر کا ایک چھیل چھبیلا رنگین نوجوان لڑکا ہے جیسا کہ اس کی پچھلی کتاب "بسلامت روی" کے لفظ لفظ سے مترشح ہے۔ ہم اپنی جہاں گردی سے کافی تھکے ہوئے تھے اور کرنل کی سینڈوچز اور بسکٹوں پر قدرے تدیدے پن سے ٹوٹ پڑے۔ اچار پر ہم نے کتابوں اور ناشر حضرات کی باتیں کیں اور ناشر حضرات اگر وہاں موجود ہوتے تو شاید چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے۔ شفیق کو اپنے ناشروں کے ہاتھوں کئی رنج پہنچے۔ اس کی مقبول عام کتابوں کے درجنوں ایڈیشن چھپے، مگر شفیق اپنی مروت، دوستی اور سادہ لوحی کی مار کھاتا رہا۔ کرنل کو بھی اس کے ناشروں نے ابتدا میں شیشے میں اتارنے کے جتن کیے اور جب اس کی پہلی کتاب بجنگ آمد طبع ہوئی تو اسے اس کا ایک پیسہ بھی معاوضہ نہ ملا۔ کرنل اپنے ملائم انداز کے باوجود کافی کڑا آدمی تھا۔ وہ بھی اپنے ناشروں سے پورا اترا۔ ان پر نالش کر دی اور ان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس نے اپنے ناشر بدل ڈالے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں بجنگ آمد جس نے اردو مزاح میں مستحقاً جھنڈے گاڑ دیئے ہیں اس کے کوئی دس ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ اور وہ ایڈیشن چار پانچ ہزار سے کم نہ تھے۔ میرا خیال ہے کہ شفیق الرحمٰن کی کتابوں کو چھوڑ کر اردو مزاح میں قبول عام کی سند جتنی بجنگ آمد کو نصیب ہوئی ہے کسی اور کتاب کو نہیں ملی۔ کرنل کی اس سال میں لکھی دوسری کتاب بسلامت روی بھی جسے کرنل نے خود طبع کیا تھا اب غالباً چوتھے پانچویں ایڈیشن میں ہے۔

اب شفیق اور کرنل نے اپنی نئی کتابیں باقاعدہ معاہدے سے ایک ہی ناشر کو چھاپنے کے لیے تھما رکھی ہیں۔ شفیق کی نئی تصنیف کا نام دجلہ ہے۔ یہ اس کی پچھلے اٹھارہ بیس سال میں پہلی کتاب ہوگی اور اس میں اس کی نئی طبع

یہاں وقصد بھی سا تھی ہوئی بچھا اں سے پہلے اندازہ کرنل زیدی سے ہوتا ہے۔ کرنل کی کتاب اس نے سفر [illegible] سے چند
اور چھوٹے ٹکڑوں کا انتخاب ہے جو اس نے جنگ آمد کے بعد وقتاً فوقتاً تحریر کئے۔

ہماری باتیں خوب پُرلطف تھیں۔ کیونکہ شفیق اور کرنل دونوں چٹکلا رگفتگو کرنے والے ہیں اور عام واقعات کے بیان کو بھی ظرافت کی چاشنی سے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھول اللہ سے زیادہ بات کرنی نہیں آتی۔ مگر اس کا کیا؟ میں ایک اچھا سننے والا ہوں اور صحیح قسم کی صحبت میں میرے قہقہے اونچے اور مسرت بھرے ہوتے ہیں (صورت شکل سے میں ایک ٹریجک ایکٹر دکھائی دیتا ہوں اور اس میں مجھ سے زیادہ میرے جگر کا قصور ہے)۔

ان اختلاط و انبساط کی باتوں میں وقت اُڑتا گیا اور جب ہم کرنل سے رخصت ہوئے شام گہری ہو چکی تھی ہم نے پھر اپنی پوٹلیوں اور رقعوں سمیٹا اور کرنل اس معاملے میں ہماری جسارت اور حیرانی پر ششدر رہ گیا۔ وہ ہمیں کلب تک چھوڑنے آیا۔ اس نے معذرت کی کہ اس کی گاڑی مرمت کے لیے ورکشاپ میں ہے ورنہ وہ ہمیں پہنچا آتا کلب کے گراؤنڈ میں کوئی بارات اُتری تھی۔ دولہا کی پھولوں اور گجروں سے سجی MERCEDES کے علاوہ بہت سی دوسری جھلمل موٹر کاریں ایک دوسرے سے ناک بھڑاتی کھڑی تھیں۔ آدھ درجن موٹے پلے ہوئے لوگ مختلف سائزوں میں اور بھڑکیلی پیس سوٹ ڈانٹے اتراتے پھر رہے تھے۔ ان میں ایک کرنل کو جانتا تھا اور اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ بعد میں، میں نے کرنل سے پوچھا کہ کیا وہ بھی ویڈنگ گیسٹ ہے۔

"نتھنگ ڈوئنگ" کرنل بولا۔ "NOT ME"

موٹے پلے ہوئے بطخ نما آدمی ہمیشہ کی حس ظرافت کو بھڑکانے کا موجب بنتے ہیں۔ وہ انہیں اس طرح پلے سوئے تو ندیل ہونے پر معاف نہیں کرتا۔ وہ ایسی وضع قطع کیونکر اختیار کر لیتے ہیں اور انسانوں سے زیادہ بطخوں سے کیوں مشابہت رکھنے لگتے ہیں۔ اس کے بارے میں شفیق کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ اسے سچ مچ افسوس ہوتا ہوگا (اگرچہ شفیق جیسے بشاش صحت مند آدمی کو کم ہی کسی قسم کا افسوس ہوتا ہوگا) کہ پچھلے دس بارہ سالوں میں ملک میں موٹے پلے ہوئے چھوٹے قد کے لوگوں کی تعداد بے حد بڑھ گئی ہے اور وہ ہر جگہ اپنے شارک سکن سوٹوں، چکنے چہروں، خالی ذہنوں اور ری کنڈیشنڈ ٹیوٹا اور ڈاٹسن کاروں کے ساتھ پائے جانے لگے ہیں۔

اس HENOMENON کی باتیں کرتے ہوئے جو اس مملکتِ خداداد پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا ہم پنڈی کلب سے باہر آئے اور خنک نیلی رات میں گھر کی سمت چلنے لگے۔ ہم ٹیکسی لینا چاہتے تھے کیونکہ دبستان سے کلب تک کم و بیش چار میل کا فاصلہ تھا۔ ابھی تک سڑکوں پر اچھا خاصا ٹریفک رواں تھا۔ تین چار جگہ چوکوں اور SQUARES پر ہم نے ٹیکسیوں کو روکنے کے لیے ہاتھ ہلائے بلکہ بنڈل ہلائے) اور لیکن وہ کسی اور جگہ کا قصد کئے ہوئے تھے یا انہوں نے ہمیں درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ ویسے پنڈی میں ٹیکسی کا ملنا لاہور سے کہیں زیادہ آسان ہے اور ٹیکسیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے (لاہور میں تو وہ اب کسی وجہ سے خال خال نظر آتی ہیں اور

... سے تمام ایک پوسٹ سے دوسرے پوسٹ تک

مارچ کرتے رہے اور بالآخر ویسٹ رج جانے والی لمبی چوڑی پشاور روڈ پر نکل آئے۔ ہمارے سینڈل اب ہمارے پانوؤں اور ایڑیوں سے پھسل پھسل جاتے تھے۔ مگر دوپہر نے چھتروں کو جن کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے بہت کچھ ہو سڑکوں کے بیچ میل بھی نہیں تھکا سکتا۔ ہمیں ٹیکسی مل جاتی تو ہم اسے ضرور خوش آمدید کہتے مگر نا یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ دوسال یار ہوتا۔

ہم نے گھر کا آدھا راستہ طے کیا تھا کہ دکھن کی جانب سے بادل گرجنے لگے اور گھنے درختوں کی شاخوں میں سے بجلی تین چار بار کوندی۔ ہم نے بادلوں کا مذاق اُڑایا کہ وہ مری کی پہاڑیوں پر ہونے کی بجائے اُلٹی سمت پر گھر رہے ہیں۔ اور ہمارا خیال تھا کہ اتنی جلدی بارش پڑنے کا کوئی خدشہ نہیں۔

اور پھر یک لخت اولوں جیسے موٹے اور ٹھنڈے بارش کے پہلے قطرے گرے۔ میں نے پہلا نہیں اولے ہی سمجھا۔ ہم ان قطروں کو نظرانداز کرتے ہوئے اندھیری SIDE WALK پر چلتے گئے اور بارش ٹپ ٹپ تیز ہوتی گئی۔ اُلٹے رخ سے گھرنے والے بادل اب ہم پر ہنس رہے تھے۔

ویسٹ رج اور ہمارے گھر کو جانے والی سڑک پر بجلی کے اکا دکا لیمپ روشن تھے۔ موٹر گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی اور ان کی تیز ہیڈ لائٹس دو بھیگے ہوئے اور پھلوں سے لدے پھندے راہیوں کو درختوں کے اندھیرے میں راستہ سجھاتی تھیں۔ مجھے شفیق کا ایک بار رُکنا اور مجھ سے کہنا یاد ہے "بھئی دیکھو اس ملک میں موٹر گاڑیاں کس قدر ہیں، پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ غریب ملک ہے"

ہم تیز بوندا باندی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تاریک، گیلے راستے پر چلتے گئے۔ کیچڑ میں شپ شپاتے ہوئے پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں میں گرتے پڑتے۔ شفیق جو مجھ سے کئی قدم آگے چل رہا تھا۔ مڑ مڑ کر میری حوصلہ افزائی کرتا جاتا "بس یار گھر اب تھوڑی دور رہ گیا وہ جو سامنے سٹریٹ لائٹ نظر آ رہی ہے وہیں سے ہم نے مڑنا ہے" وہ شاید اس طرح پنڈی کے موسم کی عذرداری کرنا چاہتا تھا۔ ہم اس سٹریٹ لائٹ پر پہنچ گئے جہاں ہمیں گھر کی سمت جانے کے لیے سڑک پار کرنا تھا۔ مگر یہ غلط سٹریٹ لائٹ تھی۔ ہماری سٹریٹ لائٹ ابھی آدھ فرلانگ۔ فرلانگ، دو فرلانگ، تین فرلانگ اور آگے تھی۔

میں نے اس بارے میں سوچنا ترک کر دیا اور بارش اب واقعی سنجیدہ ہو گئی۔ باقاعدہ موسلادھار ہم اب اس کا مذاق نہیں اُڑا سکتے تھے۔ ہم اس کے زور سے بچنے کے لیے پانی میں شرابور سائیڈ واک کے پاس ایک چھدری شاخوں اور چوڑے پتوں کے درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ کہنے کو تو یہ درخت تھا مگر اسے اگر درخت سے زیادہ اُگا ہوا جھاڑ کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس جھاڑ نے حتی المقدور ہمیں بوندوں کی یورش سے پناہ دی۔ شفیق کا چوڑا چھجے کا گرکھا ہیٹ اس کے سر پر تھا، اور اس نے اُس کے سینے چھتری کا

اپنی اس چھوٹی سی بدبختی پر ہم راز داری سے گھٹی گھٹی ہنسے اور پھر میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ میں پکڑے لفافے میں سے بھتیجے شفیق کے سیب آئزک نیوٹن کے اصول ثقل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نیچے بلبی گھاس میں گر رہے ہیں۔ لفافے کا کاغذ گیلا ہو ہو کر بالکل گل چکا تھا۔ ہم نے پانچ دس منٹ بھر سوا اندھیرے میں سیبوں کو ڈھونڈنے میں صرف کئے اور بالآخر ان سب کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب ان سب کو سنبھالا کیونکر جائے؟ میں نے ایک مونے سیب کو اپنی پتلون کی جیب میں ڈالا۔ دوسرے کو دوسری جیب میں شفیق نے گو۔ لھا ہیٹ اتارا اور بچے ہوئے چار سیبوں کو اس میں ڈال دیا۔ بڑی مفید چیز ہے یہ گول کھا ہیٹ

اب بوندوں کی ٹپ ٹپ مدھم ہو گئی اور ہم درخت کو باقاعدہ "تھینک یو" کہہ کر ویسٹ رنج لوگ ان رواں ہو گئے۔ ایک سٹریٹ لائٹ سے دوسری سٹریٹ لائٹ تک جو پانچ چھ کھمبے چھوڑ کر آتی تھی۔ آخر ایک بگہ شفیق رکا اور اپنے حدود اربعے کو متعین کرنے کے بعد سڑک پار کرنے لگا۔

"بھئی یہاں سے گھر کو جانا ہے۔" اس نے مجھے آواز دی۔ میں لڑکتا پھڑکتا کافی پیچھے رہ گیا تھا کیونکہ مجھے اندھیرے میں بہت کم دکھائی دیتا تھا اور میں پانی بھرے گڑھوں سے بہت ڈرتا ہوں۔

آخر کار ہم بارش میں دو گھنٹے کے اس ایڈونچر کے بعد صحیح سلامت شفیق کے ویسٹ رنج کے مکان میں پہنچ گئے جہاں سب روشنیاں جل رہی تھیں۔ ہمارے گیلے سیلے بنڈل محفوظ تھے اور مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ شفیق کے سیبوں میں سے کوئی بھی بچ کر نکل نہیں پایا۔

اوہ! ایک روشن، محبت بھرے گھر کا آرام!

شفیق نے کہا۔ بھئی ہاتھ منہ دھو لو اور پھر ادھر آجاؤ۔

میں نے اپنے کیچڑ میں لت پت بوٹ اتارے۔ گیلی پتلون اور قمیض سے چھٹکارا حاصل کیا اور صاف ستھرے باتھ روم میں شاور باتھ نے میری ساری تھکن اتار دی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرا بدن میرے لیے نیا نیا بنا ہو۔ بہت سالوں سے اس احساس کو بھول جاتا تھا اور اس کے بتے قطعی بیگانہ ہو چکا تھا۔ میں شلوار قمیض پہن کر شفیق کے کمرے میں چلا گیا جہاں اس کا پرانا STEWARD گل ہمارے لیے قہوہ لے آیا۔ پھر ہم نے کتابوں اور دنیا جہان کی باتیں کیں۔

ہم نے WORLD'S BET BOOKS کی جلدوں کی سیر کی جو میں نے شفیق سے اس زمانے میں خرید والی تھیں جب وہ آئی۔ ایم۔ ایس (انڈین میڈیکل سروس) میں لفٹننٹ تھا۔ مجھے یاد ہے اس وقت یہ چھ کی چھ جلدیں تیس ساٹھ مترید بے میں مل گئیں۔ اب ان کی لاگت تین ساڑھے تین ہزار۔ ا۔ ت سے کم نہ کی مگر پھر بھی دنا اسے۔ ۔

... رہا ہے ان سے مجھے

بھایا اس کے پاس ALPHA OF THE PLOUGH (اے ۔ جی ۔ گارڈنیر) کے خوبصورت ESSAYS کی ساری کتابیں ہیں۔ دلشاد کالج کے دنوں میں ہمارا محبوب ESSAYIST تھا۔ ایک پکا سچا کامریڈ بخشنے اور جادو جگانے والا دوست۔ افسوس کہ ایلفا کی بیسیوں کتابیں اب کہیں بھی نہیں ملتیں اور کسی کو اس کا نام یاد نہیں اس وقت اردو ادب میں انشائیہ کو ایک نئی ادبی صنف کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اور بہت سے لوگ دعویدار ہیں کہ انشائیہ فقط وہی چیز ہے جو وہ لکھتے ہیں۔

مگر میرے ان دوستوں نے شاید ایلفا کے سحرانگیز ESSAY نہیں پڑھے اور اس کے جادو تلے نہیں آئے ورنہ وہ جان جاتے کہ قدرتی ESAYIST ہونا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ ایلفا جیسے ESAYIST لکھنے کے لیے ایک شاداب۔ تربیت یافتہ ذہن، ایک گرم دھڑکتے ہوئے دل اور ایک بے داغ نثری اسلوب کا مالک ہونا ضروری ہے۔ ہم میں سے کتنے یہ جوہر رکھتے ہیں؟ اور واقعہ ہے کہ ایں سعادت بزور بازو نیست، یہ کہا جاتا ہے کہ ESSAY نگاری اردو زبان میں بالکل انوکھی اور جدید صنف ہے میں اس کو کبھی نہیں سمجھ سکا ہماری زبان میں ESSAY لکھے جاتے رہے ہیں۔ کیا محمد حسین آزاد نے اپنی بے بہا تصنیف نیرنگ خیال میں ESSAYS نہیں لکھے جنہیں پڑھنے سے جی نہیں بھرتا۔ ہم مہدی الافادی اور عبدالحلیم شرر اور کئی دوسروں کے ESSAYS کو کیوں بھول جاتے ہیں جو خوبیوں کے بغیر نہیں۔

شفیق نے مجھے اپنی نئی کہانی دھند کے بارے میں بتایا جو مکمل ہو چکی ہے مگر جس پر ابھی تک فن کارانہ تراش خراش اور کیریکٹر بیونٹ کا عمل جاری ہے۔ اس نے سائیڈ بورڈ پر دھری ہوئی پانچ چھ نوٹ بکیں مجھے دکھائیں جن میں دھند کے مختلف ٹکڑے، سین اور EPISODES درج ہیں اور پوری کہانی موجودہ شکل میں اچھے خاصے ناول کی طوالت کو جا پہنچے گی۔ شفیق اسے اپنی مشہور طویل کہانی بوساتی کے مطابق تراشنا چاہتا ہے اور اسے ناول بنانے کے حق میں نہیں۔

میں نے اس سے اتفاق کیا، کیونکہ ناول کی وسعت میں تاثیر کی وحدت کو دھچکا پہنچنے کا احتمال رہتا ہے پی۔ جی۔ ووڈ ہاؤس کا مزاج بھی اس کے لمبے ناولوں میں قدرے منتشر اور مشینی ہو جاتا ہے اور اس کی کہانیاں یقیناً اس کے ناولوں سے زیادہ کامیاب اور دیرپا ہیں۔ شفیق نے مجھے بتایا کہ اب اس کے پاس کافی فراغت ہے اور روزانہ اپنے ڈیسک پر دو تین گھنٹے دھند کو فیئر آوٹ کرنے میں صرف کر سکے گا۔ اس رفتار سے وہ اس کہانی کو پندرہ بیس روز میں اس کے آخری روپ میں صاف کر سکے گا۔

اس نے میری رائے پوچھنے کے لیے دھند کے کئی حصے پڑھ کر سنائے۔ دھند کے واقعات کا منظر اداس

بھی اس کے پاس دو تین مہینے رہا ہے میں دھند سے کافی متاثر ہوا۔ کہانی اس کی مسودہ تریں آہنگ میں لکھی ہوئی ہے مزاج قدرتی اور جگمگاتا ہوا ہے۔ اور بعض مناظر تو اس انوکھی چابکدستی سے رنگے گئے ہیں کہ آدمی اس کے طبعی جوہر کا قائل ہو جاتا ہے۔ اردو میں اس کے پائے کے نثر نگار کم ہی ہوں گے۔ ایک ٹکڑا جس میں چینستاتی خطے کے رنگا رنگ پرندوں کی مختلف اوقات میں بولیوں کو انسانی آوازوں سے مطابق کیا گیا ہے حقیقتاً استادانہ صنعت کا نمونہ ہے۔ صرف شفیق ہی اتنی خوبصورتی اور لطافت سے پرندوں اور انسانوں کو ازلی رفاقت میں منسلک کر سکتا تھا۔ اس کے دھند سنانے کے دوران میں کئی بار بے طرح ہنسا۔ میرا خیال ہے کہ دھند نوک پلک سے سنورنے کے بعد برساتی اور ڈینیوب سے کئی لحاظ سے بڑھ چڑھ کے ہوگی، کیونکہ اس میں پختہ دور کے شبنم کے زندگی کے فلسفے کی تاب ہے اور بعض کردار جیتے جاگتے اور جانے پہچانے لگتے ہیں۔

ٹھیک سوا نو بجے زندگی کی سب اچھی چیزوں کی طرح یہ شادان محفل آخر ہوئی اور گل دبے پاؤں ہمیں بتلا گیا کہ کھانا لگ گیا۔ ہم ذہنوں میں دمک سی لیے نیچے کھانے کے کمرے میں اترے۔ شفیق کے تینوں بیٹوں میں سے صرف مسکراتے ہوئے امین نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا پچی داڑھی والے خانساماں کا پکایا ہوا، لذیذ تھا اور ہم نے گھوڑوں کی طرح کھایا۔ شفیق تلی ہوئی چیزوں سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ اس کے لیے ابلے ہوئے چاول تھے، چھلکوں سمیت ابلے ہوئے آلو اور تھوڑے گھی کے سالن۔ سلاد پر اس نے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے اس نے مرغ پلاؤ کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا جس کا ڈونگہ ہمارے سامنے رکھا تھا اور جس پر امین اور میں نے مل کر ہاتھ صاف کیا۔

ہماری اشتہا چمکی ہوئی تھی اور برسوں میں مجھے کھانے نے اتنا مزہ نہیں دیا۔ کھانے کے بعد ہم سونے کے لیے اوپر چلے گئے۔ میں نے سونے سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد کی بنات النعش کی کچھ ورق گردانی کی۔ مگر دو چار ورق ہی الٹے ہوں گے کہ آنکھیں مندنے لگیں اور نیند نے غلبہ پا لیا۔

گل نے بیڈ ٹی کے لیے مجھے صبح سات بجے جگا دیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد شفیق کے معمولات زندگی کچھ اس طرح سے ہیں، اور جہاں تک ہو سکتا ہے وہ اوقات کی پابندی کرتا ہے۔ سات بجے صبح بیڈ ٹی راس نے اب ایک مدت سے سگرٹ پینا ترک کر دیا ہے جس سے اسے ورزش کرتے وقت کبھی کبھی کھانسی ہونے لگی تھی۔ مگر وہ کہتا ہے کہ روزانہ آٹھ دس سگرٹ تک پینے سے کسی کو کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کمرے میں یا صحن میں آدھ گھنٹہ صبح کی کسرتیں کرتا ہے اور نہا دھو کر نو بجے ناشتے کے لیے اترتا ہے۔ ایک نیم پختہ بھرتا بنا ہوا انڈہ، دو ٹوسٹ، ایک مارملیڈ کے ساتھ اور

وردی حوراں سمجھتا ہے ۔ ناشتے پر وہ اخبار کے صفحات پر اچٹتی نگاہ ڈالتا ہے اس نے کبھی ا[illegible]

اور دلچسپی سے نہیں پڑھا جو بہت سارے لوگوں کا طریقہ ہے ۔ گویا کہ دنیا میں اور کرنے کا کوئی کام

ناشتے کے بعد وہ اپنے گھر کی شمالی پہاڑیوں کی طرف اکیلا سیر پر نکل جاتا ہے اور خوب تھک چور کر گیارہ

لوٹتا ہے ۔ پھر دو ڈھائی گھنٹے جم کر ڈیسک پر اپنی نئی کہانی ڈھنڈ کو فیئر آؤٹ کرتا ہے ۔ وہ دو تین صفحات سے

نہیں کر پاتا ۔ ڈیڑھ بجے گھی سے مبرا ہلکا متوازن لنچ ۔ سہ پہر کو چائے کی پیالی اور پھر شام کو لمبی سیر یا سٹیڈیم میں

پھر دو تین گھنٹے VOTES وغیرہ لیتا ہے یا پڑھتا ہے ۔ وہ ٹیلیویژن سے قطعی لگاؤ نہیں رکھتا اور میرے شام

چار پانچ گھنٹے مستقلاً ٹیلی ویژن کے سامنے گذرتے ہیں ۔ نو بجے رات کے کھانے کے بعد دس بجے تک

بستر میں ہوتا ہے ۔

پنڈی میں اس کے دلی دوست بہت کم ہیں جو لمبی سیر پر اس کے ساتھ جا سکیں یا جن سے اسے

خاطر کا احساس ہو ۔ طبعاً وہ ہمیشہ سے ایک شرمیلا آدمی رہا ہے اور کبھی ڈرائنگ روم کا چھیلا یا سوشل ڈنیئر

نہیں بنا ۔ SNOBBERY اور نمائش اسے چھو تک نہیں گئی ۔ اور وہ اپنے پرانے لنگوٹیے یاروں کی صحبت میں

اصل اطمینان اور خوشی پاتا ہے ۔

ناشتے کے بعد ہم فوراً ہی لمبی سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے ۔ ونیسٹ رج کے خوش نما گھر جلد ہی ہمارے

عقب میں تھے اور ہم مرغالہ کی گھاس سے ڈھکی ہوئی حنائی اور نارنجی پہاڑیوں کے درمیان تھے ۔

لڑھکتے ہوئے ، سبزہ زاروں میں اترتے اور چڑھتے ، بیتی ہوئی دور دراز کے ایڈونچرز کی باتیں کرتے کتنے

اور کلو کی وادیوں میں گزارے ہوئے دنوں کی یادوں کو پھر سے بلاتے اور مختلف پرندوں کی راگنیاں سنتے ۔ ہمارے

اردگرد ساری قدرتی دنیا پیلی سنہری دھوپ میں نہائی ہوئی تھی اور مکمل سکوت اور شانتی کا راج تھا ۔

پنڈی کے دلفریب ہونے کی ایک وجہ اس کی پہاڑوں سے قربت ہے ۔ رنگین پہاڑ جنہیں دیکھتے ہی روح

کے آزاد ہونے کا احساس ہوتا ہے ۔

شفیق نے مجھے بتایا کہ یہ پہاڑ مرغالہ پہاڑ کہلاتے ہیں ۔ ان کے پیچھے وہ کوہ شوالک کا سلسلہ ہے اور اس

کے پرے کوہ ہمالیہ کی رینج ہے ۔ نانگا پربت ہمالیہ کی آخری اونچی چوٹی ہے ۔ اگر فضا میں یہ ہلکی سی دھند نہ

ہوتی اور ہم ذرا سویرے نکلتے تو غالباً یہاں سے پیر پنجال پر برفوں کی جھلملاہٹ دیکھ سکتے ۔ لیکن آج ہم اتنے

خوش قسمت نہیں ۔

شفیق نے مجھے اپنی کہانی دھند کا پورا ڈھانچہ سنایا ۔ کسی خاص وجہ سے اس نے اس پہاڑی مقام

پوری TOPOGRAPHY اس کے سارے منظر اس کے چپے چپے کو جانتے تھے۔ وہ ایک البم کی طرح ہمارے ذہن میں محفوظ تھی۔

میں نے شفیق سے کہا کہ اگر اس پہاڑی مقام کا نام دے دیا جائے تو کوئی ہرج نہیں ہوگا۔ اس نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور پھر میں نے اس کے فیصلے کی حکمت دیکھی۔ اس پہاڑی مقام کو بے نام ہی رہنا چاہیے۔ دھند میں لپٹا ہوا کوئی 'SHAGRILA'۔ ہم نے کہانی کے مختلف EPISODES پر بحث کی کہ کون سے EPISODE کو رکھا جائے، کون سے حذف کیا جائے، اور کون سے ٹکڑے کو دوبارہ لکھا جائے تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں وحدتِ تاثر اپنا بھرپور نقش چھوڑے۔

ہم نے اپنی نئی زندگی کے لیے نقشے بنائے کہ ہم اب آنے والے ماہ و سال کس ڈگر سے گذاریں گے۔ اور کیا کیا نئے ایڈونچرز کریں گے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اب کچھ نہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اس طرح جیوں گا جیسے میرا دل چاہے گا۔ میں کتابیں پڑھوں گا اور تھوڑا سا بہت لکھوں گا۔ مگر لکھنے کی خواہش جو کبھی مجھے تلملاتی تھی اب بجھ چکی ہے اور میں لکھنے والا کبھی تھا ہی نہیں۔

شفیق نے کہا کہ یہ فقط میرا وقتی اور عارضی احساس ہے اور میں اس احساس سے گذر جاؤں گا۔

اُس نے بتایا کہ وہ اب باقاعدگی سے لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کی اس بارے میں سنجیدگی سے میں خوش ہوا۔ کیونکہ پچھلے اٹھارہ بیس سال سے اس کے قلم سے کوئی نئی کتاب نہیں آئی۔

ہم ریل کے پشتے پر آ گئے۔ پرے ایک ڈھلوان میدان کے پار بلندی پر پہنچتا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا LIMESTONE گھروندوں کا ننھا سا جھرمٹ۔ اس کے مکان ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے اور درختوں کی پھنگیں اس کی سالم پیوستگی کو جا بجا چھید رہی تھیں۔ اس گاؤں کے بیچ میں ایک فیروزی گنبد تھا۔ گاؤں کے پیر کا مزار۔

مجھے وہ گاؤں رومانس یا سچی مسرت کی تصویر لگا جہاں جا کر آدمی دنیا کے فکروں کو بھول سکتا تھا۔ میرا وہاں جانے کو جی چاہا، مگر شفیق نے کہا کہ گاؤں اتنا نزدیک نہیں جتنا کہ نظر آتا ہے۔

ہم ویسٹرج سے کوئی چار میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ پھر ریلوے ورکشاپ کی عمارت کا چکر کاٹ کر ایک پکی سڑک سے واپس لوٹے۔ میں مڑ مڑ کر اس گاؤں کو دیکھتا رہا۔ اور اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔

لنچ کے بعد ہم اوکلی میں جا بیٹھے۔ وہاں وہ آرام کرسیاں تھیں جن پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ دھوپ میں ابھی کچھ حدت تھی اور ہم نے محرابی بے پٹ دریچوں پر پڑے ہوئے پردے مناسب طور پر ٹھیک کیے۔ شفیق کے پیچھے سیاہ ٹرنکوں میں برسوں کی جمع کی ہوئی محبوب کتابیں، پرانی تصویروں کے البم، آئی ایم ایس کے دنوں کی وردیاں، تمغے اور ٹوٹم تھے

[illegible] سے خود لکھا ہے۔ یہ نہ ہو

گواں کا پتہ نہ ملتا۔ میری طرح جس کے پاس فوٹو گراف نہیں، وہ بھی ان فوٹوؤں کو ادھر ادھر رکھ کر کھو چکا ہوتا اور اپنے بچپن اور لڑکپن کو پھر سے نہ پا سکتا۔

اپنی کاہلی کی وجہ سے میں نے کبھی ان پرانی چیزوں، تصویروں، مسودوں اور خطوط کو سنبھال کر نہیں رکھا جو اس عمر میں جس میں میں اب ہوں زندگی کا قیمتی سرمایہ ہونے کا جواز بن سکتی ہیں۔ اگرچہ میں نے کبھی موپساں کی کہانی پڑھی جس میں ایک تنہا پنشن یافتہ سول سرونٹ اپنے پرانے خطوط پڑھتا ہے جن سے اس کو اپنی موجودہ ویرانی اور بے رونقی کا اتنا شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ ان خطوط کو جلا کر خودکشی کر لیتا ہے۔ موپساں کی کہانی کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے پرانے خطوط کبھی مت پڑھو۔

شفیق کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے اپنی زندگی میں کسی نے ایسے خطوط نہیں لکھے۔ محبت کے جذبے سے رنگین، جیسے موپساں کے ریٹائرڈ سول سرونٹ کی محبوبہ اسے لکھا کرتی تھی۔ اس لیے میں اگر خودکشی کروں گا تو اس کی وجہ پرانے خطوط نہیں ہوں گے۔

میں نے ان موٹے البموں کے ورق الٹے۔ یہ خاندانی البم بھی حیرت خیز چیزیں ہوتے ہیں۔ وہ کہیں وقت اور سالوں کے سفر پر لے جاتے ہیں۔ الفت اور رفاقت میں بندھے ہوئے بچوں، لڑکوں اور بڑوں کے شوخ، شاداں یا متین چہرے جو اب گردش ایام اور برسوں کے گزرنے سے اتنے بدل چکے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے کہ یہ وہی ہیں یا جو فنا کے [illegible] میں گم ہو چکے ہیں اور خیال اور یاد بن گئے ہیں۔

میں کسی البم کو گلے میں پھانس اور دل کی دھک دھک کے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔ البم مجھے مسحور کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس کرے پر حیات انسانی کی بے ثباتی اور بے ثمری پر اداس کر دیتے ہیں۔

میں نے اپنا البم نہیں بنایا۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں دکھ جھیلنے کے معاملے میں بزدل ہوں، بلکہ اس لیے کہ مجھے کیمرے سے تصویر کھینچنا نہیں آتا اور میں تصویروں کو کھو دیتا ہوں۔ میرے پاس ایک کیمرہ کچھ عرصہ ضرور رہا مگر میں نہیں جانتا کہ وہ اب کہاں گیا۔؟

ایک تصویر میں گنجان درختوں کی دیوار کے آگے ایک ندی کے کنارے چست کوٹ اور برجس میں ایک لمبا اکہرے بدن کا آدمی کھڑا تھا۔ وہ کسی آلے غالباً تھیوڈولائٹ میں سے ندی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک شائستہ شفقت اور حلم کی کیفیت تھی۔ شفیق نے بتایا کہ یہ اس کے مرحوم والد تھے۔ جن کو قدرتی مناظر اور آؤٹ ڈور زندگی سے بے حد لگاؤ تھا۔

زندگی کے مختلف دوروں میں خاندان کی کئی ایک تصویریں تھیں اور شفیق مجھے بتاتا جاتا کہ کب اور کہاں یہ تصویریں کھینچی گئی تھیں۔ میں ورق الٹتا گیا اور پھر ایک جگہ ٹھٹکا۔ یہ ہمارا اسکول کے دنوں کا ایک گروپ

فوٹوگراف تھا غالباً ۱۹۴۰ء کا جب ہم بہاولپور کے صادق ڈین ہائی سکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ہم پانچ دوستوں نے یہ فوٹو خاص طور پر بہاولپور کے واحد فوٹو گرافر فلا نعت راشے سے کھنچوایا تھا جو اپنی ٹیک چہرے والا دھوتی ٹوپی اور داڑھی کے ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویروں سے مشابہ تھا اور ہمارے شہر کی سب سے زیادہ کامور ہستی تھا۔ اس فوٹو میں اگلی صف میں شفیق، منظور اور ریاض کرسیوں پر براجمان تھے پیچھے میں اور حمید کھڑے تھے۔ کتنا شوخ رنگ اور تازہ لگ رہا میں اس تصویر میں لگتا تھا۔ شفیق اپنی پگڑی اور مکمل شلوار قمیص میں اصل راجکمار لگتا تھا۔ کتنا خوش اور شگفتہ۔ آہ۔ وہ دن!

اس تصویر میں پانچ لڑکوں میں سے چار ابھی اس دنیا میں ہیں۔ منظور APPENDICITIS سے میو ہسپتال میں مرا جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے۔ (فائنل) کا طالب علم تھا۔ باقی چار اب پنشن یافتہ ہیں ساٹھ کے ہیں مگر ابھی اس دنیائے فانی کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ وہ رابرٹ براؤننگ کے مزاج میر کی طرح اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ بہترین وقت نے ابھی آگے آنا ہے۔ کیسا OPTIMISTIC خوش اندیش ہیں ہم۔

پھر وادیٔ کشمیر اور کلو وادی کے اطالوی جنگی قیدیوں کے کیمپ میں لی ہوئی تصویریں تھیں۔ ان جگہوں اور محافل کی تصویریں بھی جہاں شفیق کی دوسری جنگ عظیم کے دوران بطور لفٹیننٹ (کندھے پر دو ستار) کپتان (تین ستار) اور میجر (ایک کراؤن) تعیناتی ہوئی۔ وہ ان دنوں اپنے ستاروں اور کراؤنوں پر اتراتا تھا اور میں اس پر رشک کیا کرتا۔ اگرچہ اب وہ ان پر ہنستا ہے۔ کچھ تصویریں تب کی جب شفیق اڈنبرا یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ پھر اس کی شادی کی تصویر اور ساتھ کے صوفے پر سویلین سوٹ میں ملبوس فیلڈ مارشل محمد ایوب خان جنرل برکی سے کوئی بات کرتے ہوئے اور میری اور شفیق کی ایک اور تصویر (آٹھ آنے میں پانچ منٹ میں تیار ہونے والی تصویر) ۲ سال پہلے لڑھکتے لگ گئے۔

میں جب بہاولپور کالج میں ایف اے میں پڑھتا تھا اور چند دنوں کے لیے لاہور میں ایک مشہور نمائش دیکھنے آیا تھا، جس کی بڑی دھوم تھی اور جو منٹو پارک میں لگی تھی۔ وہاں شام کو کارنیوال میں شفیق مجھے مل گیا۔ وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں فرسٹ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا۔ اتفاقاً اس طرح ملنے سے ہم بڑے ہی خوش ہوئے۔ ہم نے کارنیوال کے سب کھیل تماشے دیکھے۔ چرخ چوں کے لکڑی کے گھوڑوں پر بیٹھے۔ جھولے میں دنیا کی چوٹی پر پہنچے جہاں تک تم سارا لاہور دیکھ سکتے تھے۔ قسمت آزمائی کے ربڑ کے حلقے پھینکے۔

ہم نے ایک حلوائی کے سٹال سے دو موٹے گول بیر تر بتر شیرے کے قتلے کھائے جو بڑے مزیدار لگے اور جو اب اس عمر میں ہمارے سامنے رکھے جائیں تو ہم کانوں کو ہاتھ لگائیں۔ وہیں ہم نے ایک چلتے پھرتے فوٹو گرافر سے یہ تصویر کھنچوائی۔

[illegible] دیے تھے جہاں سے دوسری جانب عظیم اور بھ
کے سوئس لکریوں میں چھپتے تھے۔ شفیق کو جب دو نمبری میں بریگیڈیئر تھا۔ اپنی طویل لائق و صیف خدمات کے سلسلے میں ہلال امتیاز بھی مل چکا ہے۔ ایک تصویر میں شفیق تمغوں سے سجا ہوا اپنی ریر اینڈ مرل کی چاک سی سفید یونیفارم میں کھڑا ہے اور صدر مملکت مسکراتے ہوئے اس کے سینے پر ہلال امتیاز آویزاں کر رہے ہیں۔ میں نے اس فوٹو کو پسند نہیں کیا کیونکہ FLASH LIGHTS کی کسی چمک کی وجہ سے شفیق اس میں اپنا آپ نہیں لگتا اور اس کی عمر زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ پھر وہ تصویر جب پاکستان کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز کے کنووکیشن پر اسے فیلوشپ کی سند مل رہی ہے۔

اس کے فوجی میں درجہ بدرجہ مناصب کی ستاروں اور کراؤنوں اور CROSSED تلواروں سے زرنگار وردیاں بھی اسی ٹرنکوں میں تہہ ہیں۔ اس نے انہیں رکھ چھوڑا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ اسے اپنی زندگی کے مختلف مراحل یاد کراتی رہیں۔ کیونکہ پرانے کپڑوں سے تمہاری نسبت، تمہارا لگاؤ حقیقی اور محکم ہوتا ہے اور انہیں کبھی بے دردی سے اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہیے۔

پھر ہم نے ٹرنکوں تہہ بہ تہہ سجائی کتابیں دیکھیں۔ مارک ٹوئین۔ ای۔ وی۔ لوکس، جی کے۔ چسٹرٹن، پی بیلئے کی بھولی بسری نایاب جلدیں جن سے ہم اپنے آغاز شباب کے ایام میں محبت کرتے تھے اور جن کو موجودہ نسل میں کوئی نہیں پڑھتا۔ اور پھر ایک کونے میں چپکے سے سمٹی ہوئی ALPHA OF THEPLOUGH کی چھ ESSAYS کی کتابیں تھیں۔ چھ سبز چھوٹی سی کتابیں۔ ایلفا کو آج کل کوئی نہیں جانتا اور انگریزی ادب کی تاریخوں میں اس کے نام کا کہیں ذکر نہیں ہوتا۔ مگر کیسے خوبصورت مسرت بخش ESSAYS وہ لکھتا تھا اور ملنے میں وہ کتنا شفیق، ہنس مکھ خوش گفتار رفیق ہوگا۔ اب میں نے اس کی کتابیں سالوں کے بعد دیکھیں۔ ایک پھانس سی میرے حلق تک آئی اور میں نے انہیں بھیگی ہوئی آنکھوں سے، احترام سے اس گوشے سے اٹھایا۔ ان کی سبز جلدوں کو رجن پر ایک مسافر کو اپنے ہاتھ میں کتاب لیے اور جنگل کی راہ گزر میں چلتے دکھایا گیا ہے۔ اپنے سے بار بار کہا۔ ایلفا پیارے ایلفا تم نے ہمیں ہماری جوانی میں کیا کچھ نہیں دیا۔ تمہارے جیسے ESSAY زندگی کے حزن، اس کی شادمانی اور خوبصورتی سے مہکتے ہوئے، اب کون لکھ سکے گا۔ میں نے ایلفا کے SET کو پھر اپنی آرام گاہ میں لٹا دیا۔ الوداع الوداع! پیارے دوست!

بعد میں ہم آرام کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ دو گھنٹے پرانی چیزوں کے دیکھنے میں گویا پلک جھپکتے گزر گئے۔ اب پونے چار بج چکے تھے۔ ڈی لکس بس کی روانگی کا وقت پانچ بجے تھا۔ مگر بس یا ٹرین کے سفر مجھے بے کل اور حیران کر دیتے ہیں اور میں بس کے اڈے پر ساڑھے چار بجے تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ہمارا خوش شکل طویل قامت باسکٹ بال پلیئر ٹیوشن پڑھنے کے لیے کار لے گیا تھا اور شفیق نے کہا کہ اسے ساڑھے چار بجے تک کار لے آنے

کے لیے کچھ رہا گیا تھا۔ اس نے ایک قالب کا پیکٹ لا کر اپنے باپ کو دیا۔ اس کی ہوی دا جسٹ کا ایک صفحہ بھر برآمد ہوا۔ ابوالاعلیٰ مودودی چشمے اور بھوان داڑھی کے ساتھ فرنٹ کور پر غور و فکر کی حالت میں۔ ایک آدمی جو اپنے آپ میں ایک انجمن تھا، یقیناً اس دور کا سب سے بڑا دینی عالم، ملک کی سب سے نامور ہستی۔ جس کے سوگ میں نہ سکولوں اور دفتروں میں تعطیل ہوئی نہ سرکاری عمارتوں پر جھنڈے سرنگوں لہرائے۔ کیسی قوم ہیں ہم!

تین ماہ پہلے شفیق کی لمبی کہانی دھند کا ایک ٹکڑا قومی ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا، تب سے اسے یہ رسالہ باقاعدگی سے آنے لگا ہے۔ اس کی ورق گردانی کرتے کرتے ایک جگہ دیکھا کہ ہمارے دوست مستنصر حسین تارڑ نے رسالے کے قارئین کو یہ بتایا ہے کہ وہ کیوں اور کس لیے لکھتا ہے۔ "کیوں اور کس لیے" کے بارے میں تو کچھ نہیں تھا مگر نوجوان مصنف نے ہر ایک کو یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی تھی کہ اردو میں اصلی اور حقیقی سفرنامے صرف اسی نے لکھے ہیں۔ پیشروؤں کو یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ سفرنامہ ہے کیا بلا اور بعد میں آنے والوں نے تارڑ کی نقالی کی اور بقول اس کے اس کے اجزائے ترکیبی کو استعمال میں لائے۔ اس نے یہ بھی ذہن نشین کرایا کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے اسے دوام حاصل ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور جو کچھ بعض دوسرے ادیب جھاڑ پھونک رہے ہیں وہ نقلی مال ہے جس سے گاہک خبردار رہیں۔

اس پیراگراف کا طنز و تعریض سے بھرا ہوا لہجہ لکھنے والے کی خود پسندی اور نرگسیت کی خبر دیتا ہے کیونکہ مستنصر ہمارے چند اور لکھنے والوں کی طرح ان لٹریری جنٹلمینوں میں سے ہے جو تن وہی اور کسوٹی سے خود اپنی جانچ کرتے ہیں اور اپنے تماشائے جمال میں محو ہیں۔ ان کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ بر سر بازار، ہم چو ما دیگرے نیست کی لاف زنی کسی کو زیب نہیں دیتی اور خاص طور پر ایک سنجیدہ لکھنے والے کو۔ آخر ہمارے لکھنے والوں پر کیوں کسی نہ کسی ادبی صنف کا موجد ہونے کا بھوت سوار ہے؟ وہ اکھاڑا جیت کر اپنے حریفوں کو گرد کرنے کے درپے کس لیے ہیں؟

میں تعجب کرتا ہوں کہ آیا مستنصر نے کبھی سٹیونسن، ڈی ایچ لارنس، ماہام، ملر، گراہم گرین، اولعزوڈ قی سائجر اور بیسیوں دوسرے مغربی مصنفوں کے سفرنامے پڑھے ہیں؟ وہ اپنے سفرناموں کو ان کے مقابلے میں کہاں مقام دے گا؟ ابدیت، بڑا لفظ ہے مسٹر مستنصر! اور چند خوش نصیب ہی اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ ماضی کے کتنے ہی صاحب جوہر اور باکمال جو اپنے دور میں اپنے فن میں سرِ دفتر اور پیشوا مانے جاتے تھے، ان کے نام اور کام سب خاک ہوئے۔

ان کو یاد کرنے والا کوئی نہیں۔ میرا ALPHA فراموش ہو گیا اور تو اور بیچارے ارنسٹ ہیمنگوے کے اسلوب کی بھی ہنسی اڑائی جا رہی ہے۔ دلی اتنی نزدیک نہیں!

اب سوا چار بج چکے تھے اور شفیق نے کہا کہ ہمیں چلنے کی تیاری کرنی چاہیے۔ میرا سوٹ کیس پہلے ہی سے

"... جب ... بہت زیادہ ... سے ... تھا۔"

"اسے پتہ ہے" شفیق نے کہا "وہ تیاری ہوگا۔"

ساڑھے پینتیس، چار چالیس، عتیق کا نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھ پندرہ دس ہوگیا۔ کچھ زیادہ نہیں۔ میں ڈی لکس بوئنگ کو اپنے بغیر اڈے رکنے کیلئے روانہ ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ میری نشست بک تھی مگر میں نے جلدی اڈے پر پہنچ کر خریدنا تھا۔ اگر بس نکل بھی گئی تو اس سے آسمان نہیں ٹوٹے گا۔ اگلے دن میری دفتر سے چھٹی تھی اور نہ بھی ہوتی پھر بھی وہاں کوئی یہ چیک نہ کرتا کہ میں آیا ہوں یا نہیں۔ میرا دفتر اسی قسم کا ہے۔ شفیق نے کہا کہ ٹیلیفون پر بس کے اڈے سے ڈی لکس کی روانگی کا وقت کنفرم کرلو۔

میں نے اڈے پر رنگ کیا اور اپنے کوائف بتائے تو

"پانچ بجے کی ڈی لکس شاید نہیں جائے گی۔ اس میں کچھ خرابی ہوگئی تھی۔ اگر ٹھیک ہوگئی تو شاید جائے آپ پندرہ منٹ تک کنفرم کرلیں۔" دوسری طرف سے ایک آدمی نے کہا۔

جب میں فون کررہا تھا تو عتیق موٹر میں سیج بج آ ہی پہنچا۔ سوٹ کیس ڈکی میں رکھا اور ہم اڈے کی طرف کوئی ساٹھ میل کی رفتار سے چلے۔

میں دل ہی دل میں خواہش کررہا تھا کہ ڈی لکس نہ جائے تو اچھا ہے۔

اپنے باپ کی گاڑی آہستہ چلانے کی نصیحت کو ان سنا کرتے ہوئے اس نے کار خوب تیز چلائی۔ وہ فرسٹ کلاس ڈرائیور تھا مگر سب آتش خو نوجوانوں کی طرح وہ بے صبرا ہے اور انتظار نہیں کرسکتا۔ ایک جگہ آگے سڑک بلاک ہونے کی وجہ سے ہمیں بائیں طرف سڑک کی دوسری شاخ پر موڑ گھومنا پڑا۔ ہمارے دائیں سے ایک لڑکھڑاتی ہوئی بس بھی ہمیں بیچ کے پشتے کی طرف دباتی ہوئی موڑ گھومنے میں پہل کرنے لگی۔ اب عتیق اس کی کیسے اجازت دیتا اور اس نے کار کو نہ روکا اور مڑتی ہوئی بس چھوتی ہوئی ہمارے اوپر یلغار کرتی آئی دونوں گاڑیوں کے BONNET دست و گریبان ہوتے ہوتے رہ گئے۔ بس ڈرائیور نے آخر مونچھ نیچی کرلی، اپنی بس کو بریک لگائی اور ہم کو موڑ گھومنے کی اجازت دے دی۔ ہمارا طویل قامت رچہرہ غصے سے سرخ ہ) جیت گیا تھا، مگر ہم حقیقتاً ایک خطرناک ٹکر سے بال بال بچ گئے تھے۔

"بھئی عتیق!" باپ نے اسے تنبیہ کی" ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تم گاڑی کو SLOW ڈاؤن کرلیتے۔"

"ابا!" اس نے تیز لہجے میں جواب دیا: "غلطی بس والے کا تھا۔ جو بائیں طرف سے کیوں اوور ٹیک کررہا تھا۔"

"عتیق!" باپ نے کہا" بات مانا کرو۔ آج کل ٹریفک کے قواعد کی کون پرواہ کرتا ہے۔ ہمیشہ اپنے آپ

وہ چپ رہا لیکن بزرگوں کی یہ تنبیہہ اسے ناگوار گزری۔ یہ میں اس کے چہرے سے بھانپ سکتا تھا۔ صدر میں سے گذرتے ہوئے جہاں گورنمنٹ بس کا اڈا ہے، وہ اڈے بائیں طرف چھوڑتا ہوا آگے چلا گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اڈا پیچھے رہ گیا ہے۔ جسے شفیق نے بھی دوہرایا۔

"ابا!" اس کے لہجے میں رنجیدگی اور جھلاہٹ کی رمق تھی" یہ تو لاہور جانے والی بسوں کا اڈا نہیں ہے یہاں سے تو وہ لوکل WAGONS چلتی ہیں جو اسلام آباد وغیرہ کو جاتی ہیں۔ لاہور والی بسوں کا اڈا تو ادھر دور مری روڈ پر ہے"

میں نے کل بکنگ تو یہیں سے کرائی تھی" میں نے کہا" جی۔ ٹی۔ ایس بھی یہیں سے چلتی ہیں"

"ابا مجھے پتہ ہے کہ لاہور کی بس کا اڈہ آگے جاکر مری روڈ پر ہے"

عتیق کو کبھی بس میں لاہور جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مگر جوانی کے تیقن اور ہیکڑپن سے وہ اصرار کرتا رہا کہ وہ جانتا ہے کہ لاہور جانے والی بسیں آگے مری روڈ سے کہیں چلتی ہیں۔ وہ ہمیں سرپھرے، الٹی کھوپڑی والے سمجھ رہا تھا جو اس کا وقت ضائع کر رہے تھے اور اسے غلط جگہ پر لے جا رہے تھے۔

آخر وہ کار گھما کر بڑی نارضامندی سے جی۔ ٹی۔ ایس کے اڈے پر لے گیا۔ ہم سے کچھ کچھ خفا کہ ہم صحیح تھے اور وہ غلط۔ کیونکہ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ لاہور کی بسیں اسی اڈے سے جاتی ہیں۔ میں اس کے احساسات کو بھانپ سکتا تھا کیونکہ میرا بھی ہوبہو عتیق جیسا ایک بیٹا ہے۔ مگر کیا نوجوانی کی اس خودسری اور بڑوں کے لیے کچھ بے لحاظی کا برا ماننا چاہیے؟ ہم بھی کبھی جوان تھے اور ایسے ہی تھے۔ ویسے عتیق ایک کیپٹن، پراعتماد، زندگی سے چھلکتا دمکتا لڑکا ہے۔ بازوؤں میں بل مارتا ہوا جوانی کا جوش اور سپورٹس سے شیفتگی، اور کوئی باپ بھی ایسے بیٹے پر دل میں غرور کر سکتا ہے۔

کاؤنٹر کے آدمی سے پوچھ گچھ کر کے کنفرم کیا کہ پانچ بجے کی ڈی لکس کینسل ہو گئی ہے اور نہیں جائے گی۔ مگر ایک ایکسپریس۔ جی۔ ٹی۔ بس لاہور جانے والی ہے اور میں اس میں سیٹ لے سکتا ہوں۔ مجھے سکھ کا احساس ہوا۔ کیا میرا جانا اتنا ہی ضروری تھا! کہاں مجھے جانا تھا اور کیوں! میں پنڈی میں ایک دن اور اپنے دیرینہ دوست کی دلنواز صحبت میں بسر کرنا چاہتا تھا اور پھر میں ایک ہارٹ پیشنٹ آدمی ہوں اور پایانِ عمر میں اپنی ہڈیوں کو آرام اور راحت سے رکھنا چاہتا ہوں۔

"نہیں" میں نے کہا "میں ڈی لکس سے جاؤں گا" اور میں نے اگلے دن سب سے پہلے ڈی لکس میں جو دس بجے روانہ ہوتی ہے ایک سیٹ ریزرو کرائی۔

ہمارا طویل قامت جواب خوش طبعی کے موڈ تھا ہمیں ویسٹ رج واپس لے گیا۔ شام کا حبٹ

[illegible] ہم ریلوے لائن

تک گئے اور پھر وہاں سے لوٹے۔ شفیق سارا وقت اپنے دائیں بازو کو ایک چکر میں حرکت دیتا رہا جیسے وہ سبز HTC اے پر کسی بیٹسمین کو فاسٹ بولنگ کر رہا ہو۔ کالج کی کرکٹ ٹیم میں وہ ایک فاسٹ بولر تھا تب اسے تین COLOUR ملے تھے۔ کرکٹ، ہاکنگ اور سوئمنگ کے اور اس کی کہانی فاسٹ بولر اس کی سب سے قہقہہ آور کہانیوں میں سے ہے) سارا وقت وہ اپنی چمکدار، جانفزا باتیں کرتا رہا۔ جس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہو سکتا ہے۔

نیلے اندھیرے میں ہم روشن گھر میں تھکے ماندے آئے اور پھر گل کی لائی ہوئی کافی پر نو بجے تک بیٹھے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے دھند کے ڈھانچے پر کچھ اور بحث کی اور اس نے مجھے کچھ ان لوگوں کے حلیوں اور عادات سے بہلایا جو دھند کے مذکر اور مونث کرداروں کے اصل پروٹوٹائپ تھے۔

دس بجے کھانا کھایا۔ بڑی بڑی دلگداز آنکھوں اور کنول کی مانند کھلے چہرے والا امین حسب معمول کھانے کی میز پر تھا۔ میں اس سے انسیت محسوس کرنے لگا اور میرا خیال ہے کہ اپنے باپ کے تین بیٹوں میں سے وہ اپنے مذاق اور فکر میں اس سے سب سے زیادہ نزدیک ہے اور اسے سب سے زیادہ سمجھتا اور ایڈمائر کرتا ہے یقیناً تینوں شاندار لڑکوں میں میرا چہیتا بھتیجا۔

گیارہ بجے بستر میں۔ اور میں کسی وجہ سے دیر تک جاگتا رہا۔ دوسری صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے بس کا ٹائم ہو گیا۔ عتیق نے باسکٹ بال کے میچ یا ٹیوشن پر جانا تھا اور شفیق نے اس سے کہا کہ وہ مجھے بس کے اڈے پر چھوڑ کر اپنے کام پہ چلا جائے اور پھر گھر لوٹتے ہوئے اسے لندن بک کمپنی سے لے لے۔

پنڈی کے جی۔ ٹی۔ ایس کے اڈے پر جو بھاگڑ مچی رہتی ہے میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ کیونکہ اڈے کی چار دیواری کے اندر ان سب بسوں کے لیے جگہ نہیں جو وہاں ہر وقت آتی جاتی رہتی ہیں۔ بسیں وہاں ٹاپنے میں بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح شانہ بشانہ گردنیں ملا کر گتھی رہتی ہیں اور ایک بڑا ہی کائیاں ڈرائیور بہت سے داؤ گھات کر کے اور حکمت عملیاں بروئے کار لا کر اپنی بس کو مسافر بٹھانے کے لیے پلیٹ فارم پہ لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ جو افراتفری اور بے نظمی ہمارے ملک میں پھیلی ہے وہی پنڈی کے بس کے اڈے پر ہے کیونکہ مسافر وہاں اترتے نہیں اور سوار ہو کر اپنی منزل کو روانہ ہوتے ہیں۔ حیرت انگیز ہے۔

میں نے ٹکٹ خریدا۔ دس بجنے والے تھے۔ مگر ڈی لکس کہیں دکھائی نہ دی۔ ہم اس کے پلیٹ فارم پر لگنے کا انتظار کرنے لگے۔ ہمارے دل اس وداع اور جدائی پر قدرے غمناک۔ ہم نے اکٹھے دو خوبصورت دن گزارے تھے۔ علمی سیروں اور علمی گفتگو میں اور میں اس کے لیے قسمتوں کا شکر گزار تھا۔

سوا دس ! کہاں ہے بس ؟ پھر شفیق نے ایک بس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بھئی وہ تمہاری بس ڈی لکس۔ وہ آگے اور پیچھے بسوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اگر ڈرائیور اسے راہ راست پر لے آئے تو یہ بڑا ہیٹ ٹرک ہوگا "

داڑھی والا ڈرائیور، کنڈکٹر اور چار پانچ دوسرے گلا پھاڑ پھاڑ کر مناسب ہدایتیں دینے والا لوگوں کی مدد سے بس کو اس گورکھ دھندے سے نکالنے کے جتن کر رہے تھے۔ اس نے پندرہ، بیس منٹ تک سب گُر استعمال کئے۔ وہ کامیاب نہ ہوا سوائے اس بات کے کہ بیک کرتے ہوئے پیچھے کھڑی ایک بس کی ہیڈ لائٹ اللہ کو پیاری ہوگئی۔ دوسری بس کا ڈرائیور جو ہدایات دینے والا تھا ہیڈ لائٹ کے ٹوٹنے پر داڑھی والے ڈرائیور پر بگڑا اور دونوں کے درمیان نہ چھپ سکنے والے مواد کا تبادلہ ہوا۔ پھر داڑھی والے ڈرائیور کی جگہ ایک اور ماہر ڈرائیور نے لی۔ جس نے نوکیلی ڈاڑھی کے علاوہ عینک بھی لگائی ہوئی تھی اور جو کافی معتبر اور قابل معلوم ہوتا تھا یہ بس کو پلیٹ فارم سے پیچھے اس پوزیشن میں لانے میں کامیاب ہوگیا کہ مسافر اس میں سوار ہو سکیں۔

میں نے اپنی ریزرو سیٹ پر اپنا سوٹ کیس رکھا اور پھر نیچے شفیق کو الوداع کہنے اور لمبا ہینڈ شیک کرنے کرنے اترا ـــــ اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں نومبر میں ریاض کے ہمراہ ضرور آؤں گا۔ میں اب اپنی نشست پر آبیٹھا اور جب ہم دس منٹ کے بعد حرکت میں آئے تو شفیق اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑا تھا - گورکھا ہیٹ میں لمبا تڑنگا، چست، کھلنڈرا لڑکا سا، مگر قدرے تنہا اور کھویا کھویا۔

یہ میرا بچپن اور لڑکپن کا دوست جس نے پڑھنے والوں کی دو نسلوں کو چھپے ہوئے لفظ سے کسی اور شخص سے زیادہ ہنسایا تھا اور خالص صاف ستھرے اور طنز سے پاک مزاح کی پُر بہار کتابیں لکھی تھیں۔ اور جو شرمیلا اور ہر طرح کی بناوٹ سے دور، اتنا دلسوز اور من بھاون ساتھی تھا۔ اس کی موجودگی نے دنیا کے دکھ دردوں میں ہمیشہ میرا دل بڑھایا۔ الم زدہ دل کو کملانے نہ دیا۔

بس اور اڈے پر اتنی ہڑبونگ اور طوفانِ بدتمیزی بپا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو BYE نہ کرسکے

OO

(۱) یہ مضمون ۱۹۸۰ء کے اوائل میں لکھا گیا تھا

(۲) یہ خوبصورت نوجوان اب اس دنیا میں نہیں ہے (ایڈیٹر)

لندن

سلمیٰ یاسمین نجمی

پھر وہی بلائے جاں شہر نگاراں تھا اور ہم تھے۔ وہ شہر جو کبھی عالم میں انتخاب تھا۔ جہاں منتخب روزگار رہتے تھے آبادی اس کی آج بھی بڑھ رہی ہے۔ مگر وہی بات سو گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے، شہر پھیل رہا ہے روایتیں سکڑ رہی ہیں۔ ہر نسل اور ہر قوم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ البتہ انگریز کم نظر آتے ہیں۔ پہلے ہندوستانی، پاکستانی اور سیاہ فام باشندے زیادہ نظر آتے تھے۔ اب عرب اور خلیج کی ریاستوں کے لوگ زیادہ نظر آتے ہیں۔

لندن کیا ہے انسانی کوک ٹیل، چھلکتا ہوا جام، حلیم کی دیگ، کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔ سب اپنی کھال اور حال میں مست، متضاد رویوں کا شہر ہے علم اور جہالت، نیکی اور بدی، بلندی و پستی، تاریکی اور روشنی سب باہم گڈمڈ ہیں۔ سوہو کے سٹرپ ٹیز کلب بھی ہیں اور اعلیٰ تعلیمی درسگاہیں بھی نائٹ کلبوں میں ہونے والے گھٹیا اور ننگے شو بھی ہیں اور ایسے تھیٹر بھی جہاں شیکسپئر اور برنارڈ شاہ کے ڈرامے سالوں چلتے ہیں۔

نوٹنگھم کورٹ پر ہم اترے، کمال اترنے لگا تو دروازہ بند ہو گیا۔ ٹیوب چل پڑی میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میں دم بخود کھڑی دیکھتی رہی اور گاڑی میرے بچے کو لے کر نظروں سے غائب ہو گئی۔ آنسو تھے کہ امڈے چلے آ رہے تھے۔ انور نے تسلی دی "مت گھبراؤ مجھے امید ہے وہ اگلے اسٹیشن پر اتر جائے گا۔ میں ابھی جا کر اُسے لے آتا ہوں۔"

"اور اگر وہ نہ اترا تو اسی طرح گول گول گھومتا رہے گا۔"

"آخر اس اسٹیشن پر تو کسی وقت پہنچے گا نا۔ ہم انتظار کریں گے۔"

میں نڈھال ہو کر بنچ پر بیٹھ گئی اور وہ چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد بچھڑوں کا ملاپ ہو گیا وہ واقعی اگلے اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔ اب سوچتی ہوں تو بڑی معمولی سی بات لگتی ہے اور خود پہ ہنسی آتی ہے دل بھی عجیب شے ہے کبھی غموں کا کوہ گراں اٹھا لیتا ہے اور کبھی ایک تنکے کا بوجھ بھی نہیں سہار سکتا۔

اگلے روز کوچہ گردی کے لیے نکلے پہلے وکٹوریہ سٹریٹ گئے وہی بات

سو

چھٹے اسیر تو بدلہ ہوا زمانہ تھا

وکٹوریہ سٹریٹ وہ وکٹوریہ سٹریٹ ہی نہیں تھی۔ نہ عمارتوں کی وہ صورت باقی تھی نہ سڑکوں کی وہ حالت البتہ کبوتر اب بھی موجود تھے اور شاید تا قیامت رہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے غار والے اپنی طویل نیند سے بیدار

پچھلے صدیوں میں جو تبدیلیاں آئی تھیں وہ اب سالوں میں آنے لگی ہیں۔ فاصلوں کی طنابیں کچھ کا کچھ سمٹ گئی ہیں۔ آوازیں لمحوں میں ہزاروں میل کا سفر طے کر لیتی ہیں۔ نگاہیں برِاعظموں کے پیچھے پیچھے دوڑتی ہیں۔ وکٹوریہ سے ہم نے بیکر اسٹریٹ کی بس لی۔

ہم آسمان کو چھوتی کنکریٹ اور شیشے کی بلند اور دلکش عمارتوں کے درمیان سے گذر رہے تھے۔ پہلے بیکر اسٹریٹ کا پروگرام بنایا تاکہ لڑکوں کو میڈم توسوڈ اور پلینٹوریم دکھا دیں۔ اسلامی سنٹر دیکھنے کا بھی ارادہ تھا۔ ایک تو آس پاس مناظر بدل گئے تھے۔ کچھ ہماری یادداشت پر بھی وقت کی دھول جم گئی تھی۔ چنانچہ پتہ ہی نہ چلا اور ایکدم سامنے تانبے کا عظیم الشان گنبد جگمگاتا نظر آگیا۔ یہ اسلامک سنٹر کی زیرِ تعمیر مسجد کا گنبد تھا۔ ہم لوگ مسجد میں داخل ہو گئے اپنی طالب علمی کے زمانے میں یہ پانچ سال تک اس سنٹر کے صدر رہے تھے سیکریٹری ایک عراقی لڑکا ریاض درو بی تھا۔ جو سنٹر میں ہی رہتا تھا۔ تعلق تو اب بھی اس سنٹر سے تھا مگر رہائش کہیں اور تھی۔ ان کا پتہ اور فون نمبر لیا عورتوں کا حصہ بند تھا۔ بالائی حصہ بن رہا تھا۔ ہم وضو کر کے زیریں حصے میں چلے گئے۔ بڑا سا ہال تھا براؤن اور زرد پھولدار قالین کی پٹیاں سی بچھی ہوئی تھیں۔ چار موٹے موٹے گول ستونوں پر ہال کی چھت ایستادہ تھی۔ سادگی اور دلکشی کا حسین امتزاج تھا۔ خاموشی اور سکون سے دوگانہ ادا کیا کچھ اور لوگ بھی آ گئے تھے نماز کے بعد وہ ان سے اور لڑکوں سے گلے ملے۔ نہ زبان ایک تھی نہ نسل۔ مگر دل ایک ہی طیبہ کلمے کی تال پر دھڑک رہے تھے۔ روحوں کے اندر ایک ہی اسمِ اسم محمد کا اجلا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے نہیں مگر پہچانتے تھے اور اصل رشتہ پہچان ہی کا تو ہوتا ہے۔

دیکھتے پیروں کو مزید دکھاتے۔ پیدل ہی میڈم توسوڈ کی طرف چل دیئے۔ راستے میں کھوکھے والے سے سونے کے مول آڑو اور سٹرا بیریز خریدیں۔

یہاں بھی پہلے والی بات نہ تھی۔ ترتیب بدل گئی تھی۔ مجھے تو بہت چھوٹا اور تنگ تنگ سا لگا، پہلے مرحلے پر کھلاڑیوں، ٹی وی اسٹارز اور پی جی وڈ ہاؤس کے مومی مجسمے تھے آگے تاریک ہال میں مختلف مجسموں پر وقفوں، وقفوں سے روشنی ڈالی جاتی تھی۔ یہاں پر سپیس مین، محمد علی باکسر اور کوجیک ٹیلی سوالس اپنے گنجے سر کے موجود تھے گرینڈ ہال میں انگلستان کے قدیم بادشاہ اور ملکائیں اور موجودہ خاندان کے جملہ ارکان موم میں ڈھلے یوں کھڑے تھے کہ نقل پر اصل کا گماں ہوتا تھا۔ قائدِ اعظم کا مجسمہ اب موجود نہیں تھا۔ ان کو ہٹانے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی جبکہ گاندھی جی اپنی لنگوٹی سمیت کھڑے تھے۔ پچھلی مرتبہ جب ہم نے انہیں دیکھا تھا تب بھی ان کے کپڑے سخت میلے کچیلے تھے۔ قائدِ اعظم جیسی نفاست پسند شخصیت کو اس حال میں دیکھ کر بڑا غم اور غصہ محسوس ہوا تھا۔ باقی تمام ملک کے سربراہ اور انگلستان کی کابینہ کے ارکان بھی موجود تھے۔

چیمبر آف ہورر CHAMBER OF HORROR میں اتنا شور اور ہنگامہ برپا تھا کہ خوف کی بجائے غصہ اور گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ ایچ ایم وکٹری کا پورا جہاز تھا۔ عرشے پر مردہ زخمی اور جاں بلب ملاح سسک

۔ سوڈن کیا حیثیت ۔

اس ہنگامے کے بعد پلینٹوریم کی پرسکون نیم تاریک فضا تھپکیاں سی دینے لگی۔ گول چھت سیاہ آسمان کی طرح سروں پر تن گئی۔ کروڑوں جھلملاتے ستارے آنکھیں جھپکانے لگے۔ ۔ تھکن سے چور بدن میں رات نشہ بن کر اترنے لگی دیکھتے ہی دیکھتے سو گئے۔ خدا جانے کب یہ طلسم ٹوٹا۔ مجھے تو یوں لگا کہ محض چند لمحے ہی بیتے تھے۔ بادل نخواستہ اٹھے لڑکھڑاتے قدم گھسیٹتے گھر کو چلے۔ یادوں کی کھڑکی کھل گئی اور بی اے میں پڑھا ہوا ایک مضمون یاد آگیا WHY NOT STAY AT HOME اس سیاح کا بھی شاید ہمارے جیسا حال ہوا ہوگا۔ پہلی بار اس مضمون کی سچائی اور اہمیت کا اندازہ ہوا۔ مگر اس قسم کی سوچیں وقتی ہوتی ہیں۔ اگلے روز انسان پھر نئی مہمات کے لیے تازہ دم ہو جاتا ہے۔ بالکل ان عورتوں کی طرح جو بچے کی پیدائش پر کان پکڑتی ہیں کہ اللہ میری توبہ اتنی اذیت اب آئندہ نہ برداشت کریں گی۔ بس یہی ایک کافی ہے اور پھر اگلے سال تیار ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کرکٹ کی ٹیم مکمل ہو جاتی ہے۔ اصل میں ACHIEVEMENT (اچیومنٹ) کا احساس ساری صعوبت بھلا دیتا ہے۔

بارش کی وجہ سے ٹیمز کی سیر کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ ریاض الدروبی سے ملنے چلے گئے اور پھر آکسفورڈ کے ایک بہت بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور سیلفریجز میں گھومتے رہے۔ نت نئی چیزیں دیکھ کر دل کو شاد کام کرتے رہے خریداری کا اپنا لطف ہوتا ہے مگر دیکھنے کا بھی مزا ہوتا ہے بعض اوقات دیکھتے دیکھتے اتنی سیری ہو جاتی ہے کہ خریدنے کا خیال دل سے نکل جاتا ہے۔

اتنا بڑا سٹور ہے کہ راستہ بھول بھول جاتے رہے۔ رش اتنا تھا کہ واقعی کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اس بار لندن میں بھیڑ بھاڑ بہت نظر آئی۔ ہر طرف انسان ہی انسان بھاگتے دوڑتے، چلتے پھرتے، آتے جاتے، خریدتے بیچتے۔ بمشکل اس بھول بھلیاں سے نکلے اور پیدل ہی ہائیڈ پارک کریسنٹ کی طرف چل پڑے۔ گھر پہنچ کر کھانا کھایا برتنوں اور کپڑوں کی دھلائی میں خاصا وقت لگ گیا۔ رات کا کھانا ایک صاحب کے ہاں تھا۔ کچھ فالتو وقت ہمارے پاس تھا۔ بچوں کے اصرار پر ان کو سٹار وارز دکھانے لے گئے۔ ایک ٹکٹ ڈھائی پونڈ یعنی پچاس روپے کا تھا بچوں سے کہا بھی کہ یہ فلم پاکستان ضرور آئے گی وہاں دیکھ لینا۔ مگر بات ہٹ ہٹ ہی ہوتی ہے۔ میں فلم کے درمیان سوتی جاگتی رہی۔ گھر میں سونے کے لیے لیٹتے، رات کے بارہ بج جاتے تھے۔ مگر یہاں تو لمحہ بھر سکون ملا تو نیند یا رانی اپنا جادو جگانے لگتی تھیں۔ ایسی بے تحاشہ نیند تو پہلے کبھی نہیں آتی تھی۔ اللہ جانے یہاں کی ہوا، فضا میں کوئی نشہ آور چیز گھل گئی تھی۔

قیام انگلستان کے دوران جس خاندان سے ہمارا تعلق سب سے زیادہ رہا وہ ۔ صاحب کا خاندان تھا۔

[illegible]

مڈل کلاس طبقہ سے تعلق رکھنے والی ٹیپیکل خاتون تھیں۔ خاصی قدامت پسند تھیں۔ پردہ کرتی تھیں مگر لندن آکر پردہ چھوڑنا پڑا۔ ان کو بے پردگی پسند نہ تھی۔ ہر وقت کوٹ اور سکارف میں ملبوس رہتی تھیں۔ یہیں رہ کر انگریزی میں شد بد حاصل کی تھی۔

صاحب اس زمانے میں سلپ ڈسک کی وجہ سے مستقلاً بستر پہ دراز تھے۔ اندر باہر گھر اور بچوں کی تمام تر ذمہ داری بھابی کے سر پہ آن پڑی تھی۔ وہ پاکستانی شوہروں کی طرح ہر دم ان پہ اپنا رعب جماتے۔ ان کے کام میں کیڑے نکالتے ان کو حقیر کرتے رہتے اور وہ بے چاری سب کچھ صبر شکر سے برداشت کرتیں اور خاموشی سے خدمت کرتی رہتی تھیں۔ شوہر کے اٹھارویں گریڈ کے مقابلے میں انہوں نے اپنا دوسرا یا تیسرا گریڈ بخوشی قبول کر لیا تھا۔ مجھے ان پر بڑا ترس آیا کرتا تھا۔ میرے ذہن میں سب کچھ جوں کا توں تھا اور اب ہم ان سے چودہ سال کے بعد ملنے والے تھے۔

بارش تیز ہو گئی تھی۔ برفیلی ہوا چھتری اڑائے لیے جا رہی تھی۔ کافی انتظار کے بعد مطلوبہ بس ملی۔ نمبر وہی پرانا نمبر تو۔ بی تھا۔ یہ جگہ بہت دور تھی۔ ٹیمز کے اس پار بس سٹاپ پر اترے۔ اب گھر ڈھونڈنے کا مسئلہ تھا پرانا گھر تو وہ بدل چکے تھے۔ پیدل ہی چل کر گھر تلاش کیا جا سکتا تھا۔ لندن پھیلا چہرہ ہو رہی تھی۔ جہاں اتنا چلنا پڑتا تھا۔ میری ٹانگ کی رگیں کھچ جاتی تھیں اور میں لنگڑانے لگتی تھی۔ قدم اٹھانا محال ہو جاتا تھا۔ اللہ انسان کو ہمیشہ برے وقت سے بچائے۔ ساڑھے آٹھ بجے شب کہیں جا کر ان کا "دولت کدہ" ملا۔ دروازہ کھلا۔ سامنے بھابی سلیکس اور بلاؤز میں پھنسی کھڑی تھیں۔ دوپٹہ سکارف نام کی کوئی چیز دور دور تک موجود نہ تھی۔

انہیں ہمارے خیالات کا بھی علم تھا مگر انہوں نے دکھاوے کے لیے بھی کوئی ایسا اہتمام نہ کیا تھا۔ یا تو یوں کہیے کہ کبھی منافقت نہیں کی۔ جو ہیں سامنے ہیں۔ یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنی دیدہ دلیری یا بے حسی پیدا ہو گئی ہے کہ اپنی روایات کا احترام بالکل ہی اٹھ گیا ہے۔ دوسری حیرت ناک بات یہ تھی کہ انہوں نے ایک مخصوص وقت تک ہمارا انتظار کیا اور پھر کھانا کھا لیا۔

پاکستان میں ایسا نہ ہوتا تھا۔ جب تک مہمان نہ پہنچے میزبان پہ لقمہ توڑنا حرام ہوتا ہے بچے لاکھ بلکتے رہیں۔ مگر چاولوں کا دم تبھی کھولا جاتا ہے جب مہمان تشریف لے آتے ہیں۔ بہر حال میاں بیوی ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان کی چار پانچ سالہ معصوم بھولی بھالی بیٹی اب انیس سال کی خوب رو دوشیزہ تھی جو یونیورسٹی میں تاریخ کی طالب علم تھی کسی طرف سے بھی مسلمان یا پاکستانی نظر نہیں آتی تھی سکرٹ، شاکنگ، چھوٹا سا کوٹ۔ سفید مکھڑے کے گرد سیاہ گھونگھریالوں کا ہالہ۔ لباس کے ساتھ انداز بھی مغربی تھے۔ اردو بالکل نہیں بول

میں سوچ رہی تھی کہ کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ دوسرے ملک کے لوگ پاکستان میں آ کر رہے ہوں اور ا
اسکے جیسا اپنی تہذیب اور زبان بھول گئے ہوں۔ یہ طرۂ امتیاز بھی ہمیں ہی حاصل ہے۔ ہم تو اپنے ملک میں
رہ کر اپنی زبان بھول جاتے ہیں۔ ان بیچاروں کی تو زندگی یہاں گذر گئی۔ مگر پھر بھی میں سوچ رہی تھی کہ ایسا کیوں ہوتا
ہے کہ ہم اپنی زبان، طور طریقے، معاشرت، اپنے پہننے کے آداب، اپنا مذہب سب کیوں اتنی جلدی بھلا
دیتے ہیں اور پھر اس بھول پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اگر انسان کو اپنے مسلمان ہونے، مشرقی ہونے پر فخر ہو اور
خود کو بہترین امت کا ایک فرد سمجھے تو کبھی خود کو یوں بھول نہ جائے۔ اس طرح ملیا میٹ نہ کرے اپنی
پہچان اس طرح غیروں میں گم نہ کرے۔

انہوں نے ہنستے ہوئے بتایا کہ آج ہماری وجہ سے حلال اور پاکستانی کھانا پکا ہے۔ اور مجھے آج سے
برسوں پہلے والی بھابی سِل پر کوفتوں کا قیمہ رگڑتی نظر آئیں۔ کن مشکلوں سے انہوں نے سِل بٹے کا بندوبست کیا
تھا اور کن جتنوں سے وہ حلال گوشت کی دکان سے گوشت لایا کرتی تھیں۔ انہوں نے سلسلۂ کلام جاری
رکھا۔ ان چودہ برسوں میں وہ صرف دو بار پاکستان گئے ہیں۔ بڑھاپے میں پاکستان جا کر رہنا چاہتے ہیں۔
کیونکہ انگلستان میں بڑھاپا بڑا خوار ہوتا ہے۔ بھابی نے بات کاٹی وہ ہرگز پاکستان جانا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ ان
زنجیروں کو دوبارہ پہننے کو تیار نہ تھیں جن کو وہ بیس برس پہلے توڑ آئی تھیں۔ انہیں بڑھاپے کی خواری سے زیادہ
یہ پیاری آزادی پسند تھی وہ دوبارہ رشتہ داروں کے چکر میں پھنسنا نہیں چاہتی تھیں اور بات بھی صحیح تھی۔
انسان جب ایک بار حقوق و فرائض کے بندھنوں سے آزاد ہو جائے تو پھر دوبارہ کیسے خوش دلی سے ان جکڑ
بندیوں کو پسند کر سکتا ہے۔ قربانی دینا۔ دکھ درد میں شریک ہونا اتنا آسان بھی نہیں سات سمندر پار کرنے والے
نہ لین کے قائل ہیں نہ دین کے بس اپنی ذات کے خول میں بند کولہو کے بیل کی طرح اپنے ہی کھونٹے کے اردگرد
گھومنا چاہتے ہیں۔ اور لیکن گھومتے گھومتے یا تو خود ہی بےدم ہو کر گر پڑیں گے ورنہ بڈھوں لاوارثوں کے کاٹج
ہاؤس میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

بچی سے رائے لی گئی تو وہ بولی کہ اُسے پاکستان جانے پر کوئی خاص اعتراض نہیں وہاں جا کر
کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں کے ماحول میں پوری طرح جذب ہو کر بھی یہ احساس نہیں ملتا۔ کیونکہ یہاں کے
باشندے ہر لمحہ یہ جتاتے رہتے ہیں کہ تم اصل نہیں نیا بستی ہو۔ رشتے داروں میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے
اتنے بہت سے چاہنے والے اور خیال کرنے والے پا کر قدرتی بات ہے کہ خوشی ہوتی اپنے اہم ہونے کا احساس
ہوا۔ جس چیز سے ماں گھبرا رہی تھیں وہی بیٹی کو کشش انگیز محسوس ہو رہی تھی۔
صاحب بولے جب ہم نے اس ملک میں مستقل رہائش کا فیصلہ کیا تو پھر یہی سوچا کہ جیسا دیس ویسا بھیس

اچھا نہ ... چاہیے تاکہ بچے دوسروں کی اولادوں سے بچ جائیں اور دوسروں پر چھا جائیں ایک [illegible] راہ اختیار کریں۔ چنانچہ انہیں مذہبی تعلیم نہیں دی۔ اردو نہیں سکھائی، بچوں کو وہی آزادی دی جو یہاں کے بچوں کو حاصل ہے۔ کوئی پابندی اور روک ٹوک نہیں (اپنی کوتاہیوں اور بے پرواہیوں کا کتنا خوبصورت جواز پیش کیا جا رہا تھا)

انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ ہمیں ان کے گھر یہاں کچھ بھی پاکستانی نظریہ آئے گا۔ بچے علیحدہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی مرضی۔ بڑے نے سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ہے وہ آج کل امریکہ میں ہے۔ وہاں پیسے زیادہ ملتے ہیں وہ شادی کا قائل نہیں۔ دوسرے لفظوں میں محض گرل فرینڈ سے کام چلانا چاہتا ہے۔ جب پکی پکائی ملتی ہو تو کون توے چولھے کا اہتمام کرے آٹا گوندھے۔ پھلکا ڈالے۔ رہی بیٹی کی شادی تو وہ تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتی ہے کہ اس کی شادی کا فیصلہ اس کے والدین بھی کر سکتے ہیں۔ چلیئے ایک اور فکر سے آزاد ہوئے میں نے سوچا لڑکیوں کے والدین کی تو نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ ان کے پاس نیندیں کرنے والا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ انہوں نے اپنی بات ختم کی کہ ہم اپنے بچوں کی پرورش اور خیالات سے پوری طرح مطمئن اور متفق ہیں۔ دنیاوی لحاظ سے یہ بچے کامیاب بچے ہیں اور یہی اصل کامیابی ہے جس کا خواب کوئی ماں باپ دیکھ سکتے ہیں۔ رہ گئی بات نماز روزے کی تو اس میں بھلا کیا رکھا ہے اصل نیکی یہ ہے کہ آدمی رشوت نہ لے، بے ایمانی نہ کرے، دوسرے کا دل نہ دکھایا جائے۔

جب تک ہم وہاں رہے مسلسل انگلستان اور پاکستان کا تقابل ہوتا رہا۔ بے چارے پاکستان کے حصے میں نفرت، حقارت اور تمسخر کے سوا کچھ نہ آیا۔ ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ پاکستان کی گندی آب و ہوا میں صحت کمزور رہتی ہے اور انسان جلد بوڑھا ہو جاتا ہے۔

میرا خیال ہے ایسے لوگوں کے لیے پاکستان مناسب ٹھکانہ ہے بھی نہیں۔ ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ انگلستان کے تیسرے درجے کے شہری بن کر رہیں۔ بڑھاپا بھی گذر ہی جائے گا۔ اللہ سلامت رکھے بوڑھوں کے گھر اور محتاج خانوں کو، ہسپتال بھی موجود ہیں اور علاج مفت ہے اور پھر مرنے کے بعد مردوں کو جلانے کا بھی بہترین انتظام ہے۔

یہ بے چارے لوگ ہیں جو ماضی سے ہر رشتہ توڑ چکے ہیں۔ حال نے ان کو کیا دیا ہے۔ سوائے اس کے کہ لندن کے گھٹیا علاقوں میں تنگ و تاریک سیلن زدہ گھر، کسی کو چند ڈگریاں اور کسی کو یہ بھی نہیں۔ انگریزی بولی اور انگریزی لباس۔ مستقبل میں ان کے لیے کیا امید ہے۔ اگر انگریزوں نے نکال باہر نہ کیا تو انہی تاریک کمروں میں آتش دان کے سامنے بیٹھ کر موت کا انتظار، اور رہ گئے بچے تو ان کی انفرادیت تو انہوں نے خود گم کر دی ہے۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ ہم لوگ جانے کے لیے اٹھے۔ بیٹی بھی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ماں نے دبے لفظوں

تھا ادر کنا چاہا کہ بہت رات ہو گئی ہے صبح چلی جانا مگر صاحبزادی نے صاف کہہ دیا کہ وہ رک نہیں سکتی ۔ کہتہ بس شاپ پہ لینے کو آیا ہوگا ۔

میری نگاہوں میں ننھی منی سی پیاری سی بچی گھوم گئی ۔ جو کبھی کبھی دن گزارنے میرے گھر آتی تھی ۔ شلوار اور فراک میں ملبوس مینا کی طرح چہکا کرتی تھی ۔ اپنی توتلی زبان میں کلمہ سناتی تھی وہ بچی کہاں کھو گئی ۔ کافروں، مشرکوں اور اہل کتاب کو مسلمان کرنے والے میلو ایک مسلمان لڑکی اور کم ہو گئی ہے ۔ جس کے پیٹ سے کئی اور مسلمان جنم لیتے انگلستان کا بلیک ہول آہستہ آہستہ وہاں رہنے والے مسلمانوں کی نئی نسلوں کو نگل رہا ہے اپنے اندر جذب کر رہا ہے مختلف اسلامی سینٹرز ایم ۔ ایس اے اور باقی مبلغین کیا کر رہے ہیں ۔ ہم انہیں کلمہ پڑھوانے کی فکر میں ہیں اُدھر ہمارے لوگ پڑھا ہوا کلمہ بھولتے جا رہے ہیں ۔

پہیہ الٹا گھوم رہا ہے ۔ مسلمان لڑکیاں ہندو سکھ اور عیسائیوں سے بیاہ رچا رہی ہیں ۔ ہماری عزت پر کوئی تازیانہ نہیں لگتا ۔

رات دس بجے واپسی ہوئی ۔ ماربل آرچ تک بچی ہمارے ساتھ رہی ۔ ہم اتر گئے اُسے اور آگے جانا تھا ۔ بھاری دل کے ساتھ بستر پہ لیٹی ۔ مگر سوچ کے کانٹے ایسے ۔ بکھرے تھے کہ کافی دیر تک نیند ہی نہ آئی ۔

صبح سویرے اٹھ کر تیار ہوئے ۔ ایونز سے آکسفورڈ کا گائیڈ ٹور لیا ۔ ہمارے گائیڈ میونخ یونیورسٹی کے پروفیسر فلپ تھے جو آکسفورڈ کے طالب علم رہ چکے تھے میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اور وہیں پڑھانے لگے ۔ چھٹیوں میں زائد رقم کمانے کیلیے یہ دھندا کرتے تھے ۔

پروفیسر علم اور معلومات کا پٹارہ تھا ۔ حس مزاح بھی بہت عمدہ تھی ۔ سارے راستے کھٹ مٹھی باتیں کرتا رہا ۔ ایک بات رٹو طوطے کی طرح ہزاروں دفعہ دہرانے سے اس کے مزے میں فرق آجاتا ہے اور وہ یکسانیت کا شکار ہو جاتی ہے ۔ مگر پروفیسر فلپ کی باتوں کا انداز یوں تھا جیسے وہ پہلی بار ہمیں لے کر جا رہا ہو ۔ یہ ساری باتیں بالکل نئی نکور چمکتی دمکتی ہوں ۔ زیادہ استعمال سے نہ میلی ہوئی ہوں نہ گھسی ہوں ۔

موسم بہت اچھا تھا ۔ دھوپ چمک رہی تھی ۔ سڑک کے دونوں کناروں پر گھاس کے سبز مخملیں وسیع قالین بچھے ہوئے تھے ۔ درخت اکا دکا ہی تھے ۔ بڑے بڑے فارم ہاؤس تھے ۔ ہائی وکم کا قصبہ اب اچھا خاصا شہر بن گیا تھا کہیں کہیں جنگل کے ٹکڑے نظر آئے مگر چراگاہیں زیادہ تھیں ۔

۱۹۶۲ء جولائی میں بھی ہم یہاں سے گذرے تھے ۔ اس وقت کی یادداشتیں بھی میں نے قلم بند کی تھیں میں نے لکھا تھا "سڑک کے دونوں طرف گھنے اور اونچے درخت ہیں ۔ درختوں کی چوٹیاں اوپر جا کر باہم مل گئی ہیں درختوں سے ڈھکی سڑک پر پھیلے سبز جالوں سے ہم گذر رہے ہیں ۔ بیلوں نے تمام درختوں کو باہم جکڑ کر

ایک سبز فصیل تیار کرلی ہے ۔ جھاڑیاں اور درخت اتنے گھنے ہیں گنجان کہ حال ہے جہاں درختوں کی دیواریں ختم ہوتی ہیں ۔ وہاں ہلکے سبز ریشمی اور سبز گھاس کے میدان آجاتے ہیں ۔ جنگلی پھولوں سے ڈھکی پہاڑیاں آجاتی ہیں ۔

باٹوکم بے حد حسین قصبہ ہے سرخ اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے دلکش مکان ، نرم گھاس کے میدان گھنے درخت پراسرار تاریک جنگل ۔ بادلوں سے ڈھکا آسمان افق پہ نیلے آسمان کو چھوتی ہوئی سبز پہاڑیوں کی لائن سڑک کے درمیان بہتی ہوئی نہر جس میں برف کی سی سفید مرغابیاں اور بطخیں تیر رہی تھیں ۔ کنارے پر سرخ پھول پانی پر جھکے اپنا عکس دیکھ رہے تھے ۔ ڈھلوانوں پر بنے گھر "

یہ سب چیزیں آج کیوں نظر نہیں آئیں ۔ کیا سڑک دوسری ہے ۔ شاید نئی بن گئی ہو آبادی بڑھنے کی وجہ سے ہو سکتا جنگل صاف کر دیئے ہوں ۔ پرانے مکان نئے مکانوں کی پشت پر چھپ گئے ہوں ۔ کچھ تو ہوا ہے مناظر اتنے کیسے بدل گئے ۔ میں نے تحقیق نہیں کی اتنا وقت نہیں تھا ۔ اب ہم آکسفورڈ پہنچ چکے تھے ۔

پہلے کا نی پی پھر شہر اور کالجوں کی سیر کو نکلے ۔ دوسرے کالجوں اور کرائسٹ کالج گھوم کر اس سڑک پہ آئے جہاں آرچ بشپ کریمر کو زندہ جلایا گیا تھا ۔ اس حصے پر کراس کا نشان بنا ہوا تھا ۔ لائبریری دیکھی ۔ پروفیسر نے وہاں کے کئی دلچسپ اصول بتائے ۔ لائبریری میں بغیر گاؤن کے داخلہ ممنوع ہے ۔ گاؤن کی لمبائی سے طالب علموں کی ذہانت کے معیار کا پتہ چلتا ہے یعنی جتنا بڑا حصہ گھاس پر صرف فیلو چل سکتے ہیں ۔ باقی سب کو پختہ سڑک کے راستے پہ چلنا ہوتا ہے ۔ ہر اصول کے توڑنے پر پانچ پونڈ جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے ۔ کرائسٹ کالج صرف کرائسٹ اور باقی سٹریٹ محض ہال کہلاتی ہے کمروں میں دوست لڑکیاں لانے کی اجازت نہیں ہے ۔

ڈگری والے ہال کے اوپر جانے کے لیے ہمیں ایک سو اکیاون سیڑھیاں چڑھنی پڑیں ۔ کباڑا ہو گیا ۔ اوپر سے شہر بہت پیارا لگ رہا تھا ۔ ہر طرف مینار ہی مینار تھے ۔ پختہ اینٹوں کی گلیاں تھیں ۔ پورے شہر کی فضا میں ایک وقار خاموشی سکون اور گمبھیرتا کا احساس ہو رہا تھا ۔ نئے پن کی بیچ دھج اور شور شرابہ نہیں تھا ۔ وہاں سے اتر کر مختلف چیلیز دیکھے ۔ ایک چیپل میں آکسفورڈ کا میئر اور ساٹھ شہری ہمیشہ آکر بطور سزا بیٹھتے تھے اور ایک پینی جرمانہ ادا کرتے تھے ۔ یہ روایت چارلس دوم کے زمانے سے چلی آرہی تھی ۔ اس زمانے میں شہریوں اور طالب علموں کے مابین کوئی جھگڑا ہوا تھا ۔ بادشاہ نے طلباء کا ساتھ دیا اور شہری سزا کے مستحق قرار دیئے گئے ۔ پانچ سو سال تک یہ روایت قائم رہی اور پھر ختم کر دی گئی ۔ کرائسٹ کالج میں ذریعہ تعلیم لاطینی زبان ہے اور یہاں ہی وہ شہرہ آفاق کتاب ایلس ان ونڈر لینڈ لکھی گئی ۔

لڑکوں کے لیے یہ ٹرپ بڑا دلچسپ اور معلوماتی رہا ۔ دوپہر کو واپسی ہوئی ۔ ورپول سے اتر کر بیلی کورٹ

لین چلے گئے۔ وہاں ایک یہودی کا ریسٹورنٹ تھا۔ جہاں سالٹڈ بیف گوشت بڑا مزیدار ہوتا تھا۔ پین کوٹ لین میں کھوکھے اور چھابڑی والے ہوا کرتے تھے۔ اتوار کے دن بازار لگتا تھا۔ اپنے جمعہ بازار کی طرح اور خوب سستی چیزیں ملتی تھیں۔ مشہور یہ تھا کہ چوری کا مال بکتا ہے۔ میں نے یہاں سے ایک بے حد خوبصورت ڈنر سیٹ صرف تین پونڈ میں خریدا تھا۔ یہ جگہ بھی اب خاصی بدل گئی تھی۔ بے شمار نئی عمارتیں بن گئی تھیں بڑے بڑے سٹور کھل گئے تھے۔ پھلوں اور کپڑوں کے کچھ کھوکھے اب بھی موجود تھے۔ وہ پہلے والا شاندار ریستوران تو نظر نہیں آیا۔ مگر بھوک سے برا حال تھا۔ اس جیسا ایک خستہ حال یہودی ریستوران نظر آیا۔ اسی میں چلے گئے۔ اس میں وہی پرانا آدمی نظر آیا۔

ہم نے پہچان لیا۔ گو وقت نے اس سے بھی اپنا خراج لے لیا تھا۔ اس نے بھی یہی ظاہر کیا کہ وہ بھی ہمیں پہچان گیا ہے وہ بے چارہ ریسٹوران بند کر کے جا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر رک گیا۔ شکر ہے سالٹڈ بیف موجود تھا۔ کچھ پکے پکے فضول سے چاول تھے۔ کھیرے کا اچار تھا۔ گذارہ ہو گیا۔ وہ اردو بول سکتا تھا۔ کافی عرصہ بمبئی میں گذارا تھا اس نے بتایا کہ ریستوران کے سابق مالک برنارڈ نے اپنی ریستوران والی زمین پانچ ملین پونڈ میں فروخت کر دی۔ اور اب وہ کروڑ پتی ہے اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ ریستوران کی کھکھیڑ پالے۔ یہ پہلے اس کا ملازم تھا۔ اس نے پیٹ پالنے کے لیے یہ ریستوران کھول لیا ہے۔ یہ پہلے بھی پھٹیچر حال تھا سو اب بھی ہے۔ لکشمی دیوی اس پر مہربان نہ ہو سکی۔ حالانکہ اس معمولی سے کھانے کے بھی اس نے ہم سے بیس پونڈ وصول کر لیے۔

گھر پہنچ کر گرما گرم خوشبودار کافی پی اور اگلے پروگرام بناتے رہے۔ پیدل چلنے کی عادت نہ تھی اسی وجہ سے ہمارے پروگرام شیڈول کے مطابق نہیں ہو رہے تھے کچھ نکلنے میں دیر ہو جاتی کچھ تھک اتنا جاتے کہ اگلا پروگرام موقوف کر دینا پڑتا۔ اور یہ سب میری وجہ سے تھا۔ ورنہ یہ لوگ اتنی تھکن محسوس نہیں کرتے تھے بہرحال اب تو اوکھلی میں سر بلکہ پیر دیئے جا چکے تھے۔

وعیہہ کو ان کے سابق استاد اور بوس مسٹر کو ہلر نے انسٹیٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنسی میں لنچ پر بلایا تھا۔ پروفیسر فلپ نے فرمایا تھا کہ جس نے لندن ٹاور نہیں دیکھا گویا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس کا سفر ضائع ہو گیا۔ یہی تو ہماری وراثت اور تاریخ کا امین ہے۔ جس نے اس کو دیکھا اس نے سب کچھ دیکھا۔ ہم بچوں کا سفر ضائع کرانا نہیں چاہتے تھے، ورنہ ہم تو اس سے بہت پہلے فیض یاب ہو چکے تھے۔ صبح پہلے وہاں چلے گئے۔ محافظ اپنی سرخ وردیوں میں چاق و چوبند کھڑے تھے ایک صاحب ہمارے گروپ کو لے کر چلے سیر کراتے کراتے انہوں نے انگلستان کی پوری تاریخ سنا ڈالی جس میں سوائے قید اور قتل کے اور کوئی نمایاں کارنامہ نظر نہ آیا۔ لیڈی جین گرے اور الزبتھ اول کہاں قید رہیں۔ کرامویل کہاں قید رہے اور

کو لندن ٹاور پر عوام کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ نرم و نازک سترہ سال کی دوشیزہ جین گرے کو بھی نہیں بخشا گیا اور اُسے بلڈی ٹاور یں لہو میں نہلا دیا گیا۔ چیپل کا فرش اکھاڑا گیا تو وہاں سے دو ہزار لاشوں کے پنجر برآمد ہوئے۔ عجائب گھر میں پرانے ہتھیار اور زرہ بکتر وغیرہ سجائے گئے تھے۔ سلطان ٹیپو کے زمانے کی اشیاء بھی موجود تھیں۔ وہ تمام زیورات بھی جھلمل جھلمل کر رہے تھے جو قدیم بادشاہ اور ملکائیں خاص خاص موقع پر پہنتی تھیں اور جو حکومت کی ملکیت ہیں۔

یہیں وہ مشہور ہیرا کوہ نور بھی تھا جو تاج برطانیہ میں جڑا دمک رہا تھا۔ کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا۔ نہ جانے کن کن خزانوں کی زینت بنا۔ کن کن تاریخ ساز ہاتھوں نے اُسے چھوا۔ مقدر کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ یہ بھی دربدر پھرتا پھراتا آخر لندن ٹاور کے شوکیس میں قید ہو گیا۔ یہاں سے رہائی ملتی ہے کہ نہیں یہ تو آنے والی صدیاں ہی بتا سکیں گی۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم نے واپسی کا کارٹلینا اور انسٹی ٹیوٹ پہنچے، ڈائننگ ہال میں نظر دوڑائی ایک کونے میں چاندی کی طرح چمکتے بال نظر آئے۔ سرخ سپید معصوم بھولا بھالا پاکیزہ سا چہرہ آسمان کی طرح گہری نیلی اور نتھری نتھری آنکھیں۔ اب سفید داڑھی کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ چودہ سال پہلے بھی اسی طرح سفید تھے مگر چہرہ شاداب اور جوان تھا۔ عمر رفتہ نے جاتے جاتے کچھ نقش قدم چھوڑ دیئے تھے کمر جھکا دی تھی۔ عقیدے کے اعتبار سے کونکر (Black Rod) ہیں۔ پاکبازی پارسائی اور اخلاقیات کے تمام اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ اندر کی صفائی اور نیکی چہرے کے گرد نورانی ہالہ بن گئی تھی بہت دلنشیں آدمی ہیں۔

ہمیں دیکھ کر یا انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے وہ ان کے لاڈلے شاگرد تھے۔ اس زمانے میں اکثر مجھے الگ بٹھا کر ان کے بارے میں لمبی لمبی باتیں کرتے تھے۔ جیسے یہ عام انسان نہ ہوں کوئی آتش فشاں ہوں جس کے اندر بہت سی سوچوں، بلندیوں کو چھونے، انقلاب برپا کرنے کی آرزوؤں اور تمناؤں کا لاوا ابل رہا ہو۔ بہر حال وہ وقت تو گذر گیا وہ عمر ہی اور ہوتی ہے۔ جب انسان چاند ستاروں کی باتیں کرتا ہے۔ عرش اُس کے ہاتھ کی پہنچ سے دور نہیں۔ آفتاب اس کی مٹھی میں ہوتا ہے وہ ان جہانی دنیاؤں کے خواب دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان خوابوں کی تعبیر وہ اپنی دنیا میں ڈھونڈے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ایسا کہاں ہوتا ہے۔ وقت اور تجربات بہت جلدی عرش سے کھینچ کر زمین پر لا کھڑا کرتے ہیں۔

میں بھی کہاں سے کہاں نکل گئی بات جناب کوہلرکی ہو رہی تھی۔ آج بھی ان کی گفتگو کا انداز وہی دھیما دھیما اور ٹھہرا ٹھہرا سا تھا۔ جیسے باد نسیم ہولے ہولے چل رہی ہو۔ خوبصورت زبان، گفتگو میں فلسفیانہ رنگ مگر احساس کی شبنم میں بھیگا ہوا۔ اگلی شرافت اور تہذیب کا نمونہ آج کے انگلستان میں ایک کمیاب چیز۔ ہم کھانا کھا رہے تھے وہ ان سے باتوں میں اس قدر محو ہو جاتے کہ بار بار میری اور بچوں کی موجودگی سے

بے خبر ہو جاتے پھر معذرت کرتے اور تبرکاً دو ایک باتیں ہم سے بھی کر لیتے۔ کان بھی قدرے اونچے ہو گئے تھے۔ ہم کون سا انہیں کچھ سنانے آئے تھے، سننے آئے تھے۔

اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ تصنیف اور تالیف کا کام کر رہے ہیں ایک رسالے REYNARD کو مرتب کرتے ہیں۔ ہم نے اپنا تحفہ ان کو پیش کیا۔ انہوں نے رسالہ اور اپنی کتابیں ہمیں عنایت کیں۔ یہ بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ سن لائٹ اینڈ شیڈو کہانیوں کی کتاب اور وین بلیک تھورنز وائٹ WHEN BLACK THORN'S WHITE نظموں کا مجموعہ ہے۔ ایک کتاب پر انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔

TO MAHBOOB AND SALMA AND THEIR TALENTED FAMILY
IN RECOLLECTION OF A TREASURED FRIENDSHIP

CHARLES KOHLER
JUNE 1978

یہ الفاظ ہمارے لیے ایسے قیمتی چراغوں کی طرح ہیں جو دل کے نہاں خانوں میں ہمیشہ جلتے رہیں گے زندگی کے آخری لمحے تک۔

ہم کوئی روم میں بیٹھے کوفی پی رہے تھے اور لوگ سیاست مذہب معاشرت اور نہ جانے کن کن موضوعات پر باتیں کر رہے تھے۔ چودہ برسوں کی پیاس چودہ گھڑیوں میں کہاں بجھ سکتی تھی۔ کوہلر صاحب موجودہ اخلاقی اور تہذیبی انحطاط پر آزردہ تھے۔ پرانی روایتوں کی ٹوٹ پھوٹ پر وہ بھی ماتم کناں تھے۔ نئی نسل کی بے راہ روی اور بزرگوں کا ادب اٹھ جانے پر دکھی تھے اپنی بے بسی پر افسردہ تھے۔ گراوٹ کی رفتار اتنی تیز ہے کہ مضبوط سے مضبوط ہاتھ بھی روکنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس دھارے کو جو ہر ایک کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ روکنا ناممکن ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو ساحل پر کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں اور خود کو بچائے رکھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے آگے بڑھ کر گراوٹ کے مضرات بتائے تو نئی نسل کہے گی جاؤ بڑے میاں اپنا کام کرو۔ تم اپنا وقت گزار چکے۔ ہر بوڑھا ایسی باتیں کرتا ہے۔ وہ نوجوانی کے تقاضے ان کے جذبات اور احساسات کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے تمہارے درمیان عمر کی خلیج حائل ہے۔

یہی بات ہماری نئی نسل بھی اپنے بزرگوں سے کہتی ہے۔ انسان بنیادی طور پر ایک ہے خواہ کسی رنگ و نسل اور وطن سے تعلق رکھتا ہو۔

کوہلر صاحب رخصت ہونے لگے تو ان کی نیلی چمکدار آنکھوں کو آنسوؤں کی شبنم نے تر کر دیا تھا۔ آنسو بہانا تو مشرق کا طریقہ ہے۔ روح مشرق اور مغرب کی تقسیم سے آزاد ہے۔ دلوں کا رشتہ سب سے سچا سب سے گہرا ہے اور اپنا بھی یہ حال تھا کہ

اس گل تر کی یاد میں تا صبح   رقص شبنم رہا ہے آنکھوں میں

کون جانے پھر کبھی ہم یہ من موہنا تابناک چہرہ دیکھ سکیں گے کہ نہیں۔ شاید وہ نہ رہیں شاید ہم نہ رہیں۔

رات کا کھانا خواجہ قمرالدین صاحب کے ہاں تھا۔ لندن ٹاور کا بقیہ حصہ دیکھنے کے بعد گھر جانے کا وقت نہ تھا اس لیے سیدھے انہی کے ہاں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ جب ہم وطن واپس آ رہے تھے تو ہمارا گھر خواجہ صاحب نے خرید لیا تھا۔ ان کی شادی ہم سے کچھ عرصہ پہلے ہوئی تھی۔ ان کی بیگم سے میری گاڑھی چھنتی تھی۔ اپنی ہم عمر جو تھیں۔ بھابی خاصی سنیئر تھیں اس لیے اتنی بے تکلفی نہ تھی۔

گویا اب ہم اس پرانے گھر جا رہے تھے جہاں ازدواجی زندگی کے پہلے دو سال بلاشرکت غیرے گذارے تھے یہ یادوں کا سفر تھا۔ ہم برکسٹن سے گذر رہے تھے۔ جہاں کی سڑکوں کی خاک خوب چھانی تھی۔ وہی پرانے نمبر کی بس ہرن ہل جیسے جا رہی تھی۔ ہاف مون لین پر اترے سب کچھ ویسا تھا۔ وہی چھوٹے چھوٹے باغیچے وہی ڈھلوان چھتیں۔ وہی نمبر لگے دروازے۔

سبزی کی دوکان بھی وہی تھی اس میں پرنس فلپ کی شکل کا آدمی سبزی بیچا کرتا تھا میں نے کھڑکی میں سے اندر جھانکا۔ اسے اب تک وہی ہے سفید ایپرن باندھے آلو پیاز الٹ پلٹ رہا تھا۔ کمال تو یہ ہے کہ ویسے کا ویسا تھا اس کی سرمئی نیلی آنکھیں مجھ سے ٹکرائیں۔ ان میں پہچان کی کوئی لہر نہ اٹھی، اس کے برابر نائی کی دکان تھی مگر وہ خواتین کی آرائش گیسو کی دکان میں تبدیل ہو چکی تھی گر دوسری کی دوکان تھی۔ جہاں سے میں شاپنگ کے بعد آئس کریم سٹک خریدا کرتی تھی اور بچوں کی طرح چوستی ہوئی گھر آتی تھی۔ میرے کہے بغیر ہی دوکاندار خاتون دودھیا سٹک مجھے پکڑا دیتی تھی۔ میں ساکت کھڑی تھی۔ میں بے خبر تھی اور آنسو میرے رخسار بھگو رہے تھے۔ وہ وقت گذر گیا۔ اب کبھی لوٹ کر نہیں آ سکتا۔ نہ ہم واپس ہو سکتے ہیں۔ اس وقت کی یادیں خوشیاں، دکھ ہر چیز وقت کے بیکراں سمندر نے اپنے دامن میں چھپا لی ہیں۔ وہ سیدھی سادھی لڑکی جو کبھی ان گلیوں، سڑکوں، دوکانوں، بازاروں میں گھومتی پھرتی تھی۔ اب چار بچوں کی ماں تھی۔ وقت نے اس سے بہت کچھ چھینا مگر دیا بھی اتنا کہ مالا مال کر دیا۔ مگر ہم وہ لوگ ہیں جنہیں ملنے کی اتنی خوشی نہیں ہوتی، جتنا چھن جانے کا غم ہوتا ہے۔

انہوں نے آہستہ سے میرا شانہ ہلایا دیر ہو رہی ہے۔ ذرا اپنا حلیہ ٹھیک ٹھاک کرو۔ یہ سامنے ٹیلی فون بوتھ ہے۔" میں ٹیلی فون بوتھ میں گھس گئی۔ یوڈی کلون بھیگا ہوا خوشبودار کاغذی رومال چہرے پر پھیرا۔ بالوں میں کنگھی کی، قدرے تر و تازہ ہو کر باہر نکل آئی۔

وہی دروازہ تھا جس میں سے سینکڑوں بار اندر داخل ہوئی تھی پہلے اپنے گھر میں داخل ہوتی تھی آج

کسی اور کے گھر داخل ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب نے دروازہ کھولا۔

گھر کی ہر چیز وہی تھی یہاں تک کہ فرش پر بچھا لائنو قالین، فرنیچر، ڈائننگ ٹیبل؛ اور پردے بھی، گھر اور چیزوں کی حالت خستہ تھی۔ پائیں باغیچے میں گھاس بڑھی ہوئی تھی۔ اسی طرح گلاب کھلے ہوئے تھے ایک درخت تھا مگر اب نہیں تھا۔ خواجہ صاحب پہلے وو کنگ مسجد میں امامت کرتے تھے۔ اب محض ٹیوشن پڑھانے پر گزر بسر ہے پانچ بچے ہیں بڑا مجاہد اسلام میرے بیٹے طاہر سے دو سال بڑا ہے آج کل اسے لیول کا امتحان دے رہا ہے۔

یہاں کا ماحول۔ صاحب کے گھر کے ماحول سے قطعی مختلف بلکہ متضاد نکلا بچے اردو بول رہے تھے قرآن پاک اور اردو خواجہ صاحب خود پڑھاتے ہیں۔ باقاعدہ بچوں کو با جماعت نماز پڑھواتے ہیں نماز کا وقت ہوا تو بڑے بیٹے نے تکبیر پڑھی۔ سب بچوں نے خواجہ صاحب کے پیچھے نماز ادا کی۔ ۶ سالہ بچی نعمانہ نے ہمیں نماز سنائی۔ لہجہ عربی تھا۔ شین قاف بالکل درست۔ بڑی لڑکی باورچی خانے میں ماں کی مدد کر رہی تھی۔ لڑکیوں نے پاجامے پہنے ہوئے تھے۔ سلطانہ حسب معمول ساڑھی میں تھی۔ کمزور بہت ہو گئی تھی۔ یہاں زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ صاحب کو دیکھ کر جو مایوسی ہوئی تھی وہ قدرے کم ہوئی۔ مگر خواجہ صاحب یہ بند کب تک باندھیں گے کل جو خدانخواستہ آنکھیں بند ہوئیں تو پھر یہ بھی اسی ہیل کا ایک حصہ ہوں گے۔ بہت ممکن ہے ان کے بچوں پر کچھ اثر رہ جائے مگر اگلی نسل کا وہی مقدر ہوگا یہ تو محض وقت کی بات ہے ذرا آگے پیچھے کی۔ مگر بالآخر یہ پناہ گاہ بھی کام نہ دے گی۔

کھانا بڑی محنت سے پکایا گیا اور بڑے خلوص اور محبت سے کھلایا گیا۔ بریانی۔ مرغی۔ تکے، ساگ گوشت اور گاجر کا حلوہ تھا۔ دل کی طرح دستر خوان بھی بڑا تھا۔ خوشحالی تو نہیں تھی مگر گھر میں اطمینان سکون اور خوشی محسوس ہوئی۔

رات دس بجے یہاں سے نکلے۔ ایونیو کی زرد روشنیوں میں انسان بھوت لگ رہے تھے۔ بہر حال تھکے ماندے گھر پہنچے اور غرقاب سے بستر میں غرق ہو گئے۔

آج دس جون ہے لندن میں ہمارا آخری دن۔ بچوں کو برٹش میوزیم دکھانے لے گئے۔ بچے خاص طور پر ممیاں دیکھنا چاہتے تھے۔ تین چار گھنٹوں میں بمشکل مصر، یونان اور روم کے حصے دیکھ سکے۔ اس سے زیادہ کا نہ وقت متحمل تھا اور نہ جسم مزید صعوبت اٹھانے کو تیار۔ برہنہ بت دیکھ دیکھ کر سچی بات یہ ہے کہ میں اکتا سی گئی تھی۔ مردہ خانے میں بچوں نے بڑی دلچسپی لی۔ ہزاروں سال پرانے لاشے سفید پٹیوں میں لپٹے پڑے تھے۔ انسانی ہڈیاں اور ایک سالم ڈھانچہ بھی تھا۔ جس کی ہڈیاں کسی وجہ سے گلنے سڑنے کے عمل سے بچ گئی تھیں۔ وہ جوں کا توں ایک ٹانگ سمیٹے اوندھے منہ پڑا تھا۔ سر کے بال سنہرے گھونگریالے تھے۔ یہ سب

وہ لوگ تھے جو کبھی زندہ تھے اور جنہوں نے ہماری طرح بھرپور زندگی گزاری تھی۔

اس وقت ان کو اپنے مسائل کتنے حقیقی اور گھمبیر لگتے ہوں گے۔ انہوں نے بھی زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کی ہوگی۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے پاپڑ بیلے ہوں گے۔ شادی بیاہ کئے ہوں گے۔ جنگ وجدل میں حصہ لیا ہوگا۔ قتل کئے ہوں گے۔ قتل ہوئے ہوں گے۔ حسد رقابت، عشق و محبت اور تمام انسانی جذبوں کو محسوس کیا ہوگا۔

اگر انسان کو اپنا انجام معلوم ہو جائے اور پتہ چل جائے کہ سب کچھ غیر حقیقی ہے۔ بس چند لمحوں کا کھیل، پھلجھڑی چمکی اور راکھ ہوگئی، پھول کھلا اور مرجھا گیا۔ آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا۔ تو پھر شاید اس کی یہ تمام خوشیاں، دکھ، جذبات اور احساسات بھی اپنی اہمیت اور وقعت کھو بیٹھیں۔ چند روزہ عارضی زندگی کے لیے اتنا ہنگامہ کیوں۔ دنیا ہے کیا، محض خواب جسے دیکھ رہے ہوں تو سب کچھ سچ لگتا ہے اور آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہیں ؎ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

دنیا کی بے ثباتی اور خاک کے ان پتلوں کی بے چارگی دیکھ کر طبیعت بہت افسردہ ہوئی۔ جو کبھی نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہوں گے۔ جنہوں نے حکمرانی اور جہاں بانی کی ہوگی۔ جن کے ان فانی بدنوں نے اطلس و کمخواب پہنے ہوں گے خوشبوؤں میں بسے ہوں گے۔ جن کے قدموں نے ریشم اور دبیز قالینوں کے سوا اور کوئی سختی نہ دیکھی ہوگی وہ آج یہاں سفید سوتی کپڑوں کی پٹیوں میں لپیٹے تھے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو کی تصویر بنے پڑے تھے۔

یہاں سے نکل کر ایشیا اور برطانیہ کا کچھ حصہ دیکھا۔ سب سے اچھا Fossil والا حصہ لگا۔ جہاں وقت نے اشیاء کو مٹانے کی بجائے منجمد کر کے پتھر بنا دیا ہے مثلاً روٹی، مرغی کے انڈے، انار، انجیر، گیہوں کھجوریں بطخ کا گوشت اور دلیہ وغیرہ پتھریلی صورت میں رکھے تھے۔ لائبریری دیکھی اور باہر نکل آئے سیڑھی پر بیٹھ کر امی کو خط لکھا۔ کچھ ضرورت کی چیزیں خریدیں۔ کھانا کھایا اور گھر لوٹ آئے۔ اگلے روز گیارہ بجے نیویارک کے لیے فلائیٹ تھی اور بہت سے کام کرنے تھے۔

نظمیں

محبوب کا پڑاؤ

صلاح الدین پرویز

کجاوے کس لو،
محبوب کا پڑاؤ اب اٹھنے کو بیتاب ہے
اس کے رخشاں سے،
اب رونقیں غسل میں ہیں
چاند ڈوبے گا اور سورج نکلے گا
اور دیدار پرسے نقاب اٹھا دی جائیگی ... !
اس کی پریشان زلفیں کون دیکھے گا
جو ہوا کے جھکوروں سے ابربنا رہی ہونگی
بہتر یہی ہے کہ ہم
کسی نرگس میں چھپ جائیں
یا اپنی پارسائی مستوں کے ہاتھ فروخت کردیں
تمہارا چہرہ ایک گلدستے کی طرح ہے
جو صبا کے گلدان میں سجا ہوا مہک رہا ہے
اے پری خرام !
ایک پھول ادھر بھی بھیج دے
دل میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔
اور ہماری عمر دراز ہو گئی ہے
اے گل اندام !

جب تو ہمارے اوپر سے گزریو
تو اپنے نیزے کی انی،
ہمارے قلب پر ضرور رکھیو
اے بلند اختر !
میں اپنی موت کی دعا مانگتا ہوں
اور تمہارے پاؤں کو بوسہ دیتا ہوں
میری نماز پوری ہو گئی
تم چاند سے
پہلے ڈوبے پھر ... پھر اوس میں نہائے
اور سورج بن کر نکل آئے
پھر تمہاری سواری ہمارے قلب سے گزری
ہم مقتول ہوئے .... دھیرے دھیرے پہاڑوں میں رات اترتی
اور شہر ہول میں ڈوب گئی !!
ہم نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے
تم نے سنا نہیں نہیں !
تو تم بھی ہمیں سنو
اور آمین کہو . . . .

زخمی انگلیوں سے ایک نظم

فاطمہ حسن

وہ لڑکی کسی اور بستی کی رہنے والی تھی
جو پتھر پہ پھول اگانے کی خواہش میں
انگلیاں زخمی کر بیٹھی۔
سنا ہے اس کی بستی میں پھول اور محبت
جیون کا لازمی حصہ تھے۔
وہاں لفظوں میں پھول کھلتے
تھے اور آنکھوں سے محبت
کی کرنیں پھوٹتی تھیں
جو کوئی اس بستی میں آتا
چند اچھے لفظوں کے بدلے
ڈھیروں محبت لے جاتا

ایک دن اس بستی میں
ایک جادوگر آیا اور
اس نے ایسا منتر پھونکا
کہ پوری بستی پتھر ہو گئی
لڑکی جو کہیں باہر گئی ہوئی تھی
لوٹی تو اس کی دنیا بدل چکی تھی
اس دن سے وہ لڑکی
جا کہیں بھی پتھر دیکھتی
ہے اسے پھول بنانے
کی خواہش میں زخمی
ہو جاتی ہے۔

مماثلت

عابدہ نرجس

نیلی آنکھیں، ریشمی بال، گلابی رُخسار
مُسکراتے ہوئے لب
وہ پلک نہیں جھپک سکتی
اس کے بال ایک ہی انداز میں سنورے رہتے ہیں
چمکیلی لمبی کار میں
وہ ونڈ اسکرین کے ساتھ مصلُوب رہی ہے
چمکیلی لمبی کار میں
اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی لڑکی بھی
اس کے جیسی ہے۔

آرزو

عابدہ نرجس

پیروں تلے ریت پھسلتی ہے
سطحِ آب پر بُلبلے ٹوٹ رہے ہیں
بپھرتی موج ناکام لوٹتی ہے
ہَوا تیز ہے
ساحل پر گیت نہ گاؤ
میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر
ایک مضبُوط چھت تلے
مجھے اپنا کہو

خوف

عابدہ نرجس

سب مجھ سے میٹھے بولوں کی فرمائش کرتے ہیں
سب کو شیریں نغموں کی چاہت ہے
تو مَیں کس کے لیے سچ بولوں
مَیں ابھی جینا چاہتی ہوں
مجھے 'دار' سے ڈر لگتا ہے۔

تلاش

عابدہ نرجس

آؤ —
کہ ہم بیتی رُتوں کے گذرے ہوئے لمحوں میں
جھانک کر
اپنا سُراغ لگائیں
شاید — !!
کوئی وعدہ، کوئی حرف، کوئی آواز، کوئی نشانی
یادوں کے اُفق پر دھنک بن کر بکھرے
اور ہم شناخت کریں
اُسی رشتے کو
جس کے موہوم احساس نے ہمیں یکجا کر دیا ہے۔

○

ننّھا فرشتہ

عابدہ نرجس

چمکتی ہوئی ستارہ آنکھوں
اور
گھنگھریالے بالوں والا
یہ ننّھا فرشتہ
جو آنگن میں چُپ چاپ کھیلتا رہتا ہے
نہیں جانتا
کہ وہی ایک ایسا تعلق ہے
جو گھر کی چار دیواری میں باقی بچا ہے
ورنہ 'ہم دونوں'
اجنبی ہیں

○

تہیّہ

عابدہ نرجس

مَیں لفظ کہاں سے لاؤں
امر جذبے — !
لفظوں میں محدود ہو کر
کاغذ کے ننّھے پُرزے پر نہیں اُتر سکتے
یہ لامحدود — امر جذبے
لفظوں میں محدود ہو کر
پرائے ہو جائیں گے
یہ امر جذبے
تو میرے اپنے ہیں
مَیں انہیں لفظوں کے حوالے نہیں کروں گی

○

حسرت

عابدہ نرجس

آوازیں —
یہ کیسی آوازیں ہیں — ؟؟؟
کانوں کے پردے پھاڑنے والی
پگھلا ہُوا سیسہ بن کر کانوں میں اُتر جانے والی
نامانوس قاتل آوازیں
ان کا چہرہ نظر نہیں آتا
یہ کیسی آوازیں ہیں — ؟؟؟
ہَوا کے ساتھ پھیپھڑوں میں اُتر رہی ہیں
لہُو کے ساتھ رگوں میں دوڑ رہی ہیں
سارا وجود آوازوں سے بھر گیا ہے
یہ شور و ہنگامہ کیسا ہے
شور — شور — شور
اس سے پہلے کہ میرا دَم گھُٹ جائے
مجھے میری ماں کی لوری سُنا دو

دھرتی کا دُکھ

عابدہ نرجس

سیاہ رات میں
ستارے ٹوٹ کر
شیطانوں کا نشانہ لیتے ہیں
ٹوٹتے ہوئے تارے تو دکھائی دیتے ہیں
لیکن شیطان — !!!
نظر نہیں آتے
شیطانوں سے چھٹکارا پانے کو
آسمان کے پاس اَن گنت تارے ہیں
لیکن دھرتی کے پاس
کیا ہے — ؟

ہم جولیاں

عابدہ نرجس

دُلہن سنوارتی ہوئی لڑکیاں
جُھک جُھک کر
دُلہن کی آنکھوں میں
اپنے ارمانوں کے رنگ دیکھتی ہیں
اُسے گدگدا کر
اپنی تمناؤں کے اُجلے پھول اُس کے لبوں پر کھلتے دیکھتی ہیں
اس کی مانگ میں افشاں چُنتے ہوئے
انجانی راہوں کے خواب دیکھتی ہیں
خواب اور لڑکیاں
ازل سے سہیلیاں ہیں
لمحوں کی گردش
ہم جولیوں میں جُدائی نہیں ڈالتی
وقت کی گرد ہم جولیوں میں دُوری نہیں بانٹتی
اُن کا رنگ رُوپ نہیں ڈھلتا
ماں کی سکھی — بیٹی کے ساتھ ہو لیتی ہے
دونوں ہم جولیاں —
ہاتھوں میں ہاتھ دیئے
اس نرالے راستے پر چل پڑتی ہیں
جس کی منزل نامعلوم ہے۔

وعدہ

عابدہ نرجس

لبوں کو چھوتے ہوئے لفظ
ہوا کے دوش پر نہ جانے کہاں نکل گئے ہیں
انہیں گویائی عطا کرنے والا انہیں بھول گیا ہے
جن جذبوں نے انہیں سنوارا تھا وہ سرد پڑ گئے ہیں
گزرتے لمحوں نے ان کا مفہوم بدل دیا ہے
اور وہ — !!!
جس کے لیے وہ لفظ ایک مقدس وعدہ تھے
اس کے ایفا کی آس میں
لمحے لمحے سے پوچھ رہی ہے
وہ امر لمحہ کب آئے گا
جب وہ ان لفظوں کو جگانے آئے گا

چاہت

عطیہ عثمانی

اے ربِ انام !!!
جس لمحے تیرے لیے شہادتیں رقم ہوئیں
اور کالے حرفوں کے بطن سے اُجیالوں کے چاند کِھلے
تو گُلاب چہرے تیری صباحتوں کے امین ہوئے
سیاہ راتوں کی روشن صبحوں نے
مجھے خوش نام لِکھا
اور میری چاہت معتبر ٹھہری

خوشبُو

عطیہ عثمانی

مرا سروپ
خوشبوؤں کی شرمیلی چاندنی میں سمٹا
جگمگا رہا ہے
جیسے رِم جِھم پھوار سے بِھیگے جنگلوں میں
لہُو کی نکہتیں مور بن کے ناچتی ہوں
سُرخ گلابوں کی کلیوں پر پھیل رہی ہے
ہَری رُت کی مُسکان
پیاسی دھرتی کے دامن میں
اِک میگھا برسا
اور میَں
عود و عنبر کے گھنے بادلوں میں لپٹی مہک رہی ہوں

اعوذ باللہ

عطیہ عثمانی

ننگی راتیں، بھوکے دن
زیر و زبر زمین و آسمان
دھرتی کے پاتال تک
نفرت کی اُبلتی دھڑکنیں
اندھے رنگوں کے کہرام میں
وحشی جنگل شہر میں ڈیرہ جمائے
تو کون کہاں جائے ؟؟؟
اے وارثِ کُل !!!
خالی سینوں بیچ
اِک دیپ داس مَن
تیری پناہ کا طالب ہے۔

آس نراس

عطیہ عثمانی

ہم یوسف کے خریدار
خوش فہمیوں کی پونیاں کاتنے والے
آتی جاتی رُتوں میں
ماضی دُھنیں یا مستقبل بُنیں
ہمارا حال ہماری چادر کی کمبل سے باہر نڈھال
تو آج میں پھر
متاعِ دِل ہتھیلی پہ رکھے
زندگی کے لیے بولی لگانے چلی ہوں

بدلتے موسموں میں

عطیہ عثمانی

زندگی جو دبک گئی تھی
جاڑے کی گلابی مسکراہٹیں تھامے جاگ رہی ہے
لچکتی سونا دھوپ
جب ممٹیوں اور چوباروں سے اُتر کر
سُوندھی خوشبو سے بسے بدن کی انگنائی میں
اپنے گرم ہونٹ ٹکا دیتی ہے
تو روش روش زندگی سر اُٹھاتی ہے
اور
ننگی شاخوں پر ہریالی اپنے دبے ارماں رقم کر دیتی ہے۔

خوف

آمنہ ابوالحسن ۔ نئی دہلی

میرے ذہن کی ہزاروں آنکھیں
کھلے دریچوں کی طرح
تازہ ہوا لے رہی ہیں
اور میرے وجود کا گھنا درخت ،
بھر بھر پیالے روشنی کے
اپنے اندر انڈیل رہا ہے
پھر بھی تاریکی سے خائف ہے ۔

لاعلمی

دھوپ بال کھولے آنگن میں کھڑی ہے ۔
اور زندگی کے گھیرے درخت سے ،
گزرے ہوئے دن ،
سوکھے پتّوں کی طرح ٹوٹ رہے ہیں
آنے والے دنوں کے نئے قافلے
شاداب شگوفوں کی طرح
خالی جگہوں پر پھوٹ رہے ہیں ۔
سڑک بیچاری صدیوں سے خاموش
قدموں کو راہ دے رہی ہے ۔
مگر ہوائیں نئے نئے سندیسے لے کر

ہوشیار ! خبردار !
کہ ہوگئی اگر چوک ذرا بھی
لاٹھی نگل جائے گی تم کو
اور پھر دھوپ
آنگن میں نہ آئے گی کبھی ۔

کتبہ

سوکھے ہوئے پیڑ پہ سوچ کے
کانٹے کرب کے اُگے ہوئے ہیں ،
اور سلوٹیں غموں کی
مصروفِ ماتم ۔
لوگ یوں چل پھر رہے ہیں جیسے
زخم زندگی کے ۔
نشتروں سے ڈرے ،
اور میں —— ایک کتبہ
گونگا تماشائی ،
تمنائی —— گنگوں کا
کہ آئے موسم بہار تو
پھول مجھ کو بھی چومیں !

مات

ٹہرو !
سنبھل کے رکھنا پاؤں

یہاں میرے خیالوں کی ہریالی پھیلی ہے
اور میری سوچ کی کیاریاں
آنگن میں آباد۔
رات کے آنسو پی پی کر یوں مہکتی ہیں
جیسے میں خود غموں سے آباد،
زندگی کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈالے۔
کہتی ہوں!
دے سکو تو دے دو رات

لمحہ

بے حد شور شرابے میں
خاموشی کا قلم اٹھا کر
اُس نے لکھا
رکو!
ایک لمحے کو
کہیں تو بیٹھو!
کچھ تو سوچو!......

بے ربط

اُفوہ!
تنگ ہو گئی طبیعت
ہر طرف چہرے ہی چہرے
جسم ہی جسم
کوئی تو ایسا ہو جس کا
نہ ہو چہرہ نہ ہو جسم

صرف دل
بربط کی طرح بجتا جائے

رقص

مہک رہا ہے دل کا آنگن
مست ہوائیں بے فکری سے کھیل رہی ہیں۔
فکر کے ننھے ننھے موتی
اِدھر اُدھر کو ڈول رہے ہیں
اور
زندگی کے پاؤں میں
ایک پائل
کھنک کھنک کے کہہ رہی ہے
رقص کرو! ــــــ رقص کرو!
ورنہ نیند آجائے گی۔

تحریر

کتابِ دل کے ورق جو کھولے
تو دیکھا
ایک بہت پرانے پچھلے صفحے پر لکھا ہوا ہے
امن ــــــ دوستی ــــــ محبت
مگر اگلے صفحے کورے پڑے ہیں۔
اُن پر بھی تو کچھ لکھا جائے!
پر کیا ــــــ؟
سوچا بہت،
لیکن ڈھونڈے سے بھی لفظ نہ ملے
تھک کر چاہا
لکھے صفحے بھی کورے کر دوں

تبھی کہیں سے آواز یہ آئی
لکھے ہوئے کو مت مٹاؤ۔
جو ہو سکے تو نئے صفحوں پر بھی
پرانے لفظ ہی تحریر کر

آتش کدہ

آتش کدے میں یقین کے
ارمانوں کا ایندھن
ڈالا تھا سر جھکا کے
عقیدت سے
کہ تپ کر ارمان
بن جائیں کندن
اور عقیدہ ایک عصا
باور کر سکوں کہ اپنا پن
ایمان ہے ایک
کوئی آنچ جلا نہیں سکتی جسے
لیکن
جل گیا سب کچھ
ٹوٹا عصا
خاک ہوا اپنا اپن
رہ گئی صرف وہ شکن
جو آج بھی ماتھے پر معبود کے
چوٹ کی طرح ابھری ہوئی ہے
یخ ہے امکان
مگر آتش کدہ دہک رہا
نیا ایندھن لینے کے لیے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے

رخشندہ کوکب

ایسا کیوں ہوتا ہے بعض لوگ ہمیشہ کے لیے آنکھوں میں بس جاتے ہیں
ان کا ٹھکانہ ان کا پتہ نہ جانتے ہوئے بھی وہ اپنے سے لگتے ہیں
ان سے سارے دکھ درد۔ سارے افسانے ساری حقیقتیں کہہ دینے کو جی چاہتا ہے
یہ پردیسی لوگ کیا ہوتے ہیں ان کا اپنا تو کوئی دیس نہیں ہوتا
لیکن دیس والوں کو بھی پردیسی کر جاتے ہیں

جن راستوں پہ ہم گامزن تھے۔

رخشندہ کوکب

وہ راہیں وہ رستے کبھی ہم تم جن پر گامزن تھے۔
ان راہوں پر اب تم کبھی گزرے ہو نہ ہم نے وہ راہیں کبھی دیکھی ہیں
ہم وہ رستے چھوڑ چکے ہیں اور تم کہیں اور کھو چکے ہو
وہ راہیں وہ رستے کاش ویران ہو چکے ہوں یا دریا بن چکے ہوں
کچھ بھی رنگ ہو چکا ہو ان راہوں کا لیکن
وہ راہگذر نہ رہی ہوں۔ ہمارے قدموں کے نشان مٹ چکے ہوں اور ان قدموں پر کسی
اور کے نشان نہ پڑے ہوں۔

مجھے تو اعتبار نہیں ہے

رخشندہ کوکب

مجھے تو اعتبار نہیں ہے یہ بات اس نے کہی ہے۔
لیکن کیا کروں سچ یہی ہے
یہ بات اس کے ہونٹوں سے نکلی ہے
"جب تک ساتھ رہتا ہے
دل اسی کے لیے دھڑکتا رہتا ہے"

محبت اور چاہت اسی کے لیے ہوتی ہے
اور جب راستے جدا ہو جائیں
یا کچھ انتظار کرنا پڑے
تو وہ دل سے اتر جاتا ہے
اور پھر وہی اچھا لگتا ہے جو ساتھ ہو
پھر وہی یاد رہتا ہے جو پاس ہو
اور یہ کسی نے غلط کہا ہے
کہ محبت زندگی میں صرف اک بار ہوتی ہے"

○

انتظار حسین ۔ بستی، جنگل اور شہر

جیلانی کامران

(۱)

شاید آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ کہانی جس قدر قاری سے دور ہو کر گزرتی ہے اُسی نسبت سے بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ مثلاً حاتم طائی کے قصّے یا طلسم ہوشربا کے منظر۔ مگر جب کوئی کہانی قاری کے پاس سے گزرتی ہے تو اُسے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پاس سے گزرنے والی کہانیاں بے شمار ہیں اور اُنہیں ہم واقعات حادثات اور اتفاقات کے ناموں سے پہچانتے ہیں۔ انتظار حسین کی حالیہ کہانی، جو اُن کے ناول سے ظہور کرتی ہے ہمارے اتنے قریب سے گزرتی ہے کہ اُسے کہانی کے طور پر پہچاننا اور سمجھنا مشکل نظر آتا ہے۔ اور چونکہ پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش ادھوری رہ جاتی ہے اس لیے کہانی بے چین کر دیتی ہے اور دل کسی انجانے خوف سے اُداس ہو جاتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں، واقعے اور حادثے کی سی کیفیت کو پیدا کرتی ہیں۔ تاہم یہ کہانی، کہانی بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا افسانوی چہرہ اتنا باریک ہے کہ اس کے پیچھے ہر شئے مانوس اور جانی پہچانی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی اور فن کا اتنا قریبی رشتہ بھی اس کہانی کو مشکل بنا دیتا ہے۔ میری ہم عمر نسل جو خلافت تحریک کے زمانے میں پیدا ہوئی اور جس نسل میں اس کہانی کے بیشتر کردار بھی شامل ہیں، اس کہانی کے عین وسط سے گزرتی ہے اور جب ناول کے در و بام سے باہر آتی ہے تو اس سوال کے ساتھ دوچار ہوتی ہے کہ کیا ہمارا ہر زمانہ افسانہ بن چکا ہے، کیا ہم باقی نہیں رہے؟ اور کیا ہم زندہ انسان نہیں رہے، گزری ہوئی کسی داستان کے کردار اور اسم بن چکے ہیں؟ اس ناول کا سب سے نمایاں تاثر غالباً یہی ہے کہ اس نے زندہ انسانوں کی ایک نسل کو افسانہ اور ایک واقعاتی حقیقت کو داستان میں بدل دیا ہے۔ اردو فکشن میں ایسی تکنیک کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان داتا، پندرہ اگست، یا خدا، چور بازار، ایسی بلندی ایسی پستی، آگ کا دریا اور ہاؤسنگ سوسائٹی میں انسان، کہانی اور افسانہ بنتے ہوئے بخوبی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر واقعاتی حقیقت، داستان میں بدلتے دکھائی نہیں دیتی۔ اس ناول کا یہی ایک رنگ، بے چین اور پریشان کر دیتا ہے اور اسی رنگ سے اس ناول کی تکنیک اپنا گہرا اور دیرپا اظہار بھی اخذ کرتی ہے۔

اس کہانی میں داخل ہونا بھی اُسی طرح مشکل ہے جس طرح کسی حادثے میں داخل ہونا دشوار ہے جب وہ حادثہ

خودہم پر ہی داضح ہوا انتظار حسین نے اپنی تکنیک کے ذریعے ناول میں داخل ہونے کے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں۔ کرداروں کی مدد سے کہانی میں داخل ہونا اس لیے بھی مشکل ہے کہ کردار کہانی کو پیدا نہیں کرتے بلکہ کہانی کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ ہر کردار اس اعتبار سے محض ایک رپورٹر ہے اور اُن کی رپورٹنگ سے کہانی کا علم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کرداروں کے ساتھ ایک یہ امر بھی رونما ہوا ہے کہ کردار اُن معنوں میں کردار بھی نہیں ہیں جن معنوں میں اُن کو بالعموم پہچانا جاتا ہے۔ یعنی وہ اس قوت سے محروم ہیں جو اُن کو ارادے کی توانائی بخشتی ہے اور اس قابل بناتی ہے کہ وہ ارادے کو استعمال کر کے ماحول پر اپنی مرضی اور اپنی بصیرت نافذ کر سکیں۔ صابرہ، ذاکر، اجمل، افضال، عرفان اور سلامت سب کے سب زندہ ضرور ہیں مگر ارادے کی قوت سے محروم ہیں۔ کہانی کے دوران، ان کرداروں کی زندگی بھی دم بدم سلب ہوتے دکھائی دیتی ہے اور وہ محض نام رہ جاتے ہیں۔ اپنا اپنا اسم بن جاتے ہیں اور جب قاری اُن سے اِن مقامات پر ملاقات کرتا ہے تو وہ ایک پھیلا ہوا، ہلکتا ہوا سایہ دکھائی دیتے ہیں اور یہ سائے کہانی کے اردگرد ایسا تماشہ پیدا کرتے ہیں جو غیر مرئی پُرانی داستانوں میں پیدا کرتی ہے۔

(۲)

انتظار حسین کے فن اور فکر پر رائے دیتے ہوئے اکثر اہل نظر تنقید نگاروں نے حافظے کی بازیافت اور یادداشت کے سفر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ انتظار حسین، ماضی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں اور گم ہوتی ہوئی یادوں کا سوانح نگار ہے۔ حافظہ اور یادداشت، انتظار حسین کو ماضی کی جانب لوٹنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ مجبوری، فکری اعتبار سے غیر صحت مند رویے اور تخلیقی اعتبار سے آشوب پرستی کی جانب راغب کرتی ہے۔ انتظار حسین کے نقادوں میں غالباً شمس الحق عثمانی کی رائے ایسی ہے جو تلخ اور پُر مذمت ہے اور جس نے انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر دونوں کو یادوں کے مسافر ٹھہرا کر انہیں بُری طرح معتوب کیا ہے۔ ہماری زبان، دہلی کے ۸ راگست ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شمس الحق عثمانی کا کہنا ہے کہ تقسیم کے بعد کے افسانے میں انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کا شمار اُن چند لوگوں میں ہوتا ہے جو کسی سانحے کے تماشے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس سانحے کو بار بار اپنے باطن میں برپا کرتے ہیں۔ اس کی بازدید کرتے اور اس کی وجوہ تلاش کرتے ہیں اور اس طرح اپنے ماحول کو ایک بھولا بسرا حوالہ یاد دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس رائے کی قدر و قیمت صرف اتنی ہے کہ شمس الحق عثمانی بھی حافظے اور یادداشت کا ذکر کرتا ہے اور ماضی کے اس حوالے کو اہم قرار دیتا ہے جس سے ٹوٹ کر، ہجرت اور آشوب کے رویے پیدا ہوئے ہیں اور انتظار حسین کے فن نے اپنی صورت اختیار کی ہے۔ تاہم ان نقادوں کے ساتھ اور ان کی ہمراہی میں بھی انتظار حسین کے موجودہ ناول کی کہانی میں داخل ہونا آسان دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کہانی میں یادداشت، ماضی کی جانب سفر نہیں کرتی، بلکہ زمانہ بحال ہی میں ہم سفر کے طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اس ناول میں حافظے اور یادداشت کا ایک مختلف اور نیا مزاج ظاہر ہوا ہے۔

(۳)

اس ناول کی مقامیت اور اس کا انسانی محلِ وقوع، یادداشتوں کے ایک وسیع و عریض حلقے میں ہے۔ اس ناول کے مکان، شہر، درخت، پرندے، آسمان، چاند اور ستارے، باپ، مائیں، عورتیں، جاندار اور کتابیں سب کے سب ایک لمحے یا دو لمحوں کے لیے اپنی جسامت اور حدود اربعہ کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر پھر فوری طور پر یادداشتوں کی دنیا میں اتر جاتے ہیں اور یادداشت بن جاتے ہیں۔ کردار اپنی شخصیت اور پہچان یادداشتوں سے اخذ کرتے ہیں، اور یادداشتوں کے بغیر ان کا وجود قائم نہیں رہتا۔ یادداشتیں ان کا وجود ہیں۔ ان کا نظر آنے والا طبعی وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان کا اصل وجود یادداشتوں کی توانائی سے مرتب ہوتا ہے۔ یادوں کے بارے میں یہ نقطۂ نظر اس ناول کے مزاج کی نشاندہی کرتا ہے۔ ناول کے منظر نامے میں یادداشتیں، یادداشتوں کے مختلف سلسلوں کو کاٹتی ہیں۔ ان کے ٹوٹتے ہوئے رشتوں کو جوڑتی ہیں، نئی یادداشتوں کو پیدا کرتی ہیں اور اس طرح برابر متحرک، کارفرما اور زندہ رہتے ہوئے ایک بہاؤ کے ساتھ مسافت طے کرتی ہیں۔ یادداشتوں کا مسلسل بہاؤ اس ناول کے منظر نامے کا ایک واضح چہرہ ہے۔ واقعات اور حالات کے متغیر ہونے، بدلنے اور گزر جانے کا عمل، یادداشتوں کے بہاؤ کے عین متوازی کام کرتا ہے: واقعات اور حالات کی منطق یادداشتوں کی منطق سے بہت کم تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے واقعات اور حالات ظاہر ہوتے ہی یادداشت بن جاتے ہیں اور اپنے طبعی و انسانی حدود اربعہ میں زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتے۔ یادداشت کی منطق ہر شے پر غلبہ پاتی ہے، ہر شے کو اپنے میں جذب کر لیتی ہے اور واقعے کو داستان میں بدل دیتی ہے!

یادداشتوں کے اس پھیلے ہوئے منظر میں جس میں وابستگیوں کے بچھڑے ہوئے منظر بھی شامل ہیں آوازوں کا شور بھی سنائی دیتا ہے۔ آوازوں کی گونج سے نعروں کی گونج پیدا ہوتی ہے اور نعرے انسانی ذہنوں کے اندر اتر کر رویے مرتب کرتے ہیں۔ اس طرح ذہنوں کے اندر اترنے والا رویہ بھی نعرے کی یادداشت میں جذب ہو کر انسان کو اس کے طبعی جغرافیہ سے کاٹ دیتا ہے۔ اس طرح فزیکل کی بجائے سائیکولوجیکل اور جسم کی بجائے ذہن سامنے آتا ہے اور ناول ایک نئی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔

یادداشت، ایک تخلیقی اصول کے طور پر ناول کے انسانی منظر کو دو الگ الگ حلقوں اور درجوں میں تقسیم کرتی ہے اور دو مختلف نوع کے انسان برآمد ہوتے ہیں۔ ایسے انسان، جو یادداشتوں کے رشتے سے قائم ہیں اور ایسے لوگ، جو اس بنیادی رشتے سے کٹے ہوئے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو بغیر کسی رنگ اور بغیر شعور اور دماغ کے بغیر ماضی کی یادداشتوں سے کٹے ہوئے انسانوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یادداشت کی ایسی تفریق جنگل اور شہر کے جغرافیہ کو مرتب کرتی ہے اور ان دونوں حلقوں سے گزرتے ہوئے انسان صدیوں کا سفر طے کرتے ہیں۔ ان کے سر سلیمہ ہو جاتے ہیں اور وہ ملبے کا ڈھیر بن جاتے ہیں: یادداشتوں کا جنگل ہر شخص کو اس کی بساط کے مطابق یادداشتوں کا درخت مہیا کرتا ہے اور یادداشتیں انفرادی یادداشت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جنگل

سے بے تعلق لوگ صرف ایک موسم میں جیتے ہیں جو کاسے بالوں، دھوپ اور شور کا موسم ہے اور صرف ایک کام کرتے ہیں، جو موسم سرما کے خوف میں چوہے گرمی کے دنوں میں کیا کرتے ہیں۔ یا دیمک انجام دیتی ہے — اشیاء کو، ماضی کو، زمانے کو کترنے کا کام۔ اس حوالے سے انسانوں کا یہ گروہ یادداشتوں سے محروم لوگوں کا اجتماع، چوہوں میں بدل جاتا ہے اور ایسے ان گنت لوگوں سے شہر کی سرزمین جلسہ گاہ اور شہر کی زخمی روح، لاٹھی بردار جلوس میں بدل جاتی ہے۔ جنگل کے اندر سکوت اپنی گہرائی میں سانس لیتا ہے اور جنگل کے اس طرف شہر میں شور، جلوس اور ہنگامے کی صورت میں اپنی تقدیر کی طرف جاگتا ہے۔ اس کش مکش میں یادداشتوں سے بندھے ہوئے انسان ٹوٹتے ہیں۔ ذاکر ٹوٹتا ہے۔ جسم ٹوٹتے ہیں، سایہ ابھرتا ہے۔ قدم چلتے ہیں چاپ سو جاتی ہے اور انسان، ہر دو نوع کے انسان، یادداشتوں سے بلند تر صحت اور بنیست کے طوفان میں ڈوبنے لگتے ہیں! انتظار حسین کے اس ناول میں یادداشتوں کے رشتے بھی ٹوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اس بے چینی کو پیدا کرتے ہیں کہ اگر یادداشتیں بھی باقی نہ رہیں تو انسان کیسے باقی رہ سکتا ہے۔ اور اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے کس کی جانب دیکھ سکتا ہے۔ اس ناول میں انسانی کرداروں کا ماضی بڑی تیزی کے ساتھ گم ہوتے دکھائی دیتا ہے۔

اس ناول میں انتظار حسین نے زمینی صورت حال کے محور کو جس لوک ذریعہ — لوک عقائد میں قائم کیا ہے وہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ کیونکہ اس فکری بنیاد کے ساتھ یادداشتوں کے نقطۂ نظر کا قریبی تعلق ہے۔ زمین کس چیز پر قائم ہے؟ اور قیامت کب آئے گی؟ یہ بنیادی سوال ناول کی فکری اساس مرتب کرتے ہیں۔ زمین جس چیز پر بھی قائم ہے خواہ وہ سانپ کے پھن پر ٹکی ہوئی ہے یا گائے کے دو سینگوں پر قائم ہے، یا خود گائے مچھلی کی پشت پر کھڑی ہے اور مچھر گائے کو حرکت کرنے سے روکتا ہے، یہ امر بہر طور دائم و قائم ہے کہ زمین زلزلوں کی پہنچ میں ہے زمین کا عالم سکون میں دائم رہنا غیر ممکن ہے۔ کیونکہ مچھر برابر مرتا ہے اور گائے برابر بے خوف ہو جاتی ہے اور زمین کے طبق اپنے توازن کھو بیٹھتے ہیں اور زلزلے آتے ہیں اور مکان، انسان، تہذیب و اقوام ملبے میں بدل جاتے ہیں۔ مگر نہ تو انسان غرور کو اپنے فانی دامن سے الگ کرتا ہے اور نہ حاکم ظلم سے توبہ کرتے ہیں اور نہ رعایا خلک چاٹنے سے چھٹکارا پاتی ہے۔ بنی امیہ کے ظلم کی صبح ختم نہیں ہوتی اور نہ ناری جوگ سے رجھتی ہے اور شہر جھنوان دھن سے اور جھتیا چاری، جھتیا چار سے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ گیدڑوں کا شور تیز تر ہوتا ہے اور شیر کا گرجنا بند ہو جاتا ہے۔ چیتے کے بنستے باتیں کرتے ہیں اور دانائوں کی زبان جپ ہو جاتی ہے۔ یروشلم کے کھنڈروں پر یرمیاہ نوحہ کرتا ہے۔ جہاں آباد کا بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں پناہ ڈھونڈتا ہے اور دلی یروشلم کی طرح بیوہ ہو کر بین کرتی ہے اور وہ جا کر ڈوبنے لگتا ہے۔ ۔ زلزلے، زلزلے اور زلزلے!

قیامت! قیامت! قیامت!

(۹)

مگر یہ محبوب کون ہے ؟

اس ضمن میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس ناول کے اہم کردار اپنی کردار سازی یادداشتوں اور وابستگیوں سے حاصل کرتے ہیں۔ کردار ان دو کیفیتوں سے اپنا وجود پاتے ہیں۔ ذاکر اپنی یادداشتوں اور وابستگیوں سے پیدا ہوتا ہے اور اپنی کا نام ذاکر ہے۔ اس کا محبوب، اس نئے شہر میں برابر روپوش رہتا ہے اور سامنے آنے سے گریز کرتا ہے، اس لیے اُس کے شہر کا سارا پیش منظر ٹوٹتے ہوئے گنبدوں، جلتی ہوئی کاروں، بکھری ہوئی اینٹوں بند کالجوں، پولیس کے اہل کاروں اور دھوئیں میں لپٹی ہوئی عمارتوں سے بھر جاتا ہے۔ اس پیش منظر میں بیٹھے بابوں کو جاہل اور نادان کو کنیزوں کی شکل میں پہچانتے ہیں اور اشتہار اور جلوس میں گم ہو کر نعرہ بن جاتے ہیں۔ ہوٹل کی میزیں گم سم محض ایک بجھا بجھا ماحول بن جاتی ہیں اور سفید سر والا آدمی اپنے سفید سر میں کسی بھولے ہوئے سورج کو تلاش کرتا ہے اور پھر سائرن بجتے ہیں، کرفیو سے بلیک آؤٹ سے شہر اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے اور پرندے درختوں سے اڑ جاتے ہیں۔ انسان اپنا عکس اندھیرے میں ڈھونڈتے ہیں اور خود کو مکروہ اور بدوضع ہوتے دیکھتے ہیں۔ سڑکوں پر سناٹے چلتے ہیں اور ان کی بو پھیلتی ہے اور پیلے نیچے پھاڑ کر کے بتاتے ہیں کہ زمانے کی عمر لمبی ہو چکی ہے اور زندگی زلزلے اور قیامت کے ساتھ دوچار ہے . . . ذاکر اس ماحول میں صابرہ کا نعم البدل تلاش کرتا ہے!

زندگی، زلزلے اور قیامت کے رستہ کاٹتے ہوئے مقام پہ ذاکر اپنے محبوب کی تلاش میں نکلتا ہے، اُس کی ایسی تلاش دراصل اس کے اندر موجود یادداشتوں کی سوچی ہوئی تلاش ہے۔ جنگ کے دوران لکھی ہوئی ڈائری اس سفرنامے کی نشاندہی کرتی ہے۔ ذاکر اپنے کرفیو لگے شہر سے گزر کر قدر کے شہروں میں گھومتا ہے اور اُجڑی ہوئی دلی سے ہمکلام ہوتا ہے اور اُسے مسلمانوں کی تاریخ پامال ہوتے دکھائی دیتی ہے۔ سترھویں صدی اپنے ہوش رُبا دکھ کے ساتھ مسلمانوں کی سطوت کو درباری سازشوں کے سامنے بے آبرو ہوتے دیکھتی ہے اور تخت اور مرتبے کے لیے مسلمان ظالم بنتے نظر آتے ہیں۔ دارا شکوہ، اورنگ زیب، بخت خاں، مرزا مغل، مرزا غوث، نواب حضرت محل اور تانتیا توپی۔ ان کے ساتھ ایک گزرا ہوا زمانہ، ایک گہری یادداشت صورت اختیار کرتی ہے اور تانتیا توپی کی آواز اک کے کانوں میں گونجتی ہے کہ تم مسلمان لوگ اب صرف تخت کے لیے لڑتے ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک بوڑھے باپ کی وصیت اور دو بھائیوں کی تمثیل سامنے آتی ہے جو پھیل کر ہاتھی اور گھوڑے کی لڑائی میں بدل جاتی ہے اور انسانی تاریخ اپنے ابتدائی دور کے منظر میں سمٹ جاتی ہے جب آدم زمین پہ نووارد تھا اور اس کے دو بیٹوں، ہابیل اور قابیل کے درمیان لڑائی ہوئی تھی اور بھائی کے ہاتھوں بھائی قتل ہوا تھا۔

ذاکر کا محبوب تاریخ کی یادداشتوں سے بھی حزن آلود برآمد ہوتا ہے۔ لوٹا ہوا، پریشان، ہراساں، بےآبرو اور ستم رسیدہ۔ یادداشتوں میں بھی زخمی اور واقعات میں بھی گھائل۔ یادداشت اور واقعات ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں اور شاید خود کو پہچان لیتے ہیں۔ اور اس موقع پر ذاکر بھی اپنے محبوب کو پہچان لیتا ہے۔ وہ محبوب جو عذابوں کا نعم البدل ہے۔

ذاکر کا محبوب ہم سب کا محبوب ہے اور پچھلے تیس برسوں کے دوران اردو ادب میں جتنی بھی باتیں ہوئی ہیں اور جتنے بھی نقطۂ نظر ادب کے بارے میں ترتیب دیئے گئے ہیں، وہ اسی محبوب، اسی غیر مرئی کردار ہی سے متعلق رہے ہیں۔ خواہ لکھنے والے انسانی جغرافیے کا ذکر کرتے ہوئے، یا علامتوں کی زبان میں علامتِ اولیٰ کا تذکرہ اُن کے سامنے رہا، یا وہ ایسے سوال پوچھتے رہے کہ میں کون ہوں؟ یا ہم کون ہیں؟ ادبی فکر کے تمام راستے ذاکر کے محبوب ہی کے آستان تک پہنچتے تھے۔ عصرِ حاضر کی ادبی تاریخ میں شاید ہم اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ہم غیر مرئی محبوب کو حقیقت سے مجاز کے عالم میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور ہم اسی فلسفے کی روشنی میں یادوں کے علاقے میں لیسے ہوئے محبوب کو امنگوں کے بناتے ہوئے عالمِ مجاز میں پانے کی آرزو کرتے ہیں اور ہمیشہ کی طرح ہمارے دل برابر ٹوٹتے ہیں کہ عالمِ حقیقت اور عالمِ مجاز کی دوری ختم نہیں ہوتی اور ہم انسانی جغرافیے کو اپنی یادداشتوں اور امنگوں کے ساتھ مربوط کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ہماری ایسی تمام جدوجہد ہماری محبتوں میں دکھ اور ہماری خواہشوں میں تشویش کے اجزا شامل کرتی ہے۔ اگر دکھ بہنے سے محبت کا اندازہ ممکن ہے تو جتنا دکھ اردو ادب کے عصرِ حاضر میں موجود ہے اس سے وہ محبت ناپی جا سکتی ہے جو لکھنے والوں نے اپنے اس محبوب کو دی ہے جو انتظار حسین کے اس ناول کا مرکزی کردار ہے! وہ محبوب جو جنگل اور شہر پر پھیلا ہوا ہے اور جس کا چہرہ صرف یادداشتوں اور امنگوں کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ ناول اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں عالمِ حقیقت اور عالمِ مجاز کی دوری کو ختم کرنے کی راہ دکھائی دیتی ہے یہ دونوں عالم یادداشت کا حصہ بن کر مسافتوں، فاصلوں اور بعدِ زمان و مکاں کو ختم کر دیتے ہیں اور انسان کم از کم ذہنی سطح پر ایک وحدت کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر اس ناول کا المیہ یہ ہے کہ اس کا انسانی جغرافیہ، یادداشتوں سے برابر کٹا ہوا جغرافیہ ہے اور اس طرح ایک میکانکی صورتِ حال میں گم ہے۔ اس لیے ناول کے خاتمے تک پہنچتے پہنچتے ناول کا تاثر اداس تر ہو جاتا ہے اور افق دھندلا جاتا ہے۔ یاس اور ناامیدی کے جذبات ابھرتے ہیں اور ارسطو کی زبان میں ان کا کتھارسس بھی ممکن نہیں ہوتا۔ صورتِ حال کسی عفریت کی طرح قد آور، سنگین اور بے درد دکھائی دیتی ہے اور اس میں گھرے ہوئے کردار۔ بے معنی، بے مقصد، بے ارادہ اور بے بس نظر آتے ہیں۔ بعض اہلِ فکر ایسی کیفیت کو انسانی قوتِ تدبیر کے خاتمے کا نام دیتے ہیں اور

کے نام سے پکارتے ہیں۔ انسان اپنے طبعی اور انسانی جغرافیے میں بے سہارا جس تجربے سے گزرتا ہے

اُسے اس ناول کے آخری صفحے پر عرفان اور افضال کی گفتگو میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں عرفان، ذاکر اور افضال خاموش ہیں اور افضال کا کہنا ہے بشارت ایسے ہی وقت میں ہوا کرتی ہے!

مگر کیا بشارت ممکن بھی ہے؟ یہ سوال اس ناول کے اختتام کو اور زیادہ پریشان کن بنا دیتا ہے۔ جہاں تک ناول کے مزاج کا تعلق ہے اس میں دو مختلف موقعوں پر بشارت کا ذکر ہوا ہے اور بشارت ہوئی ہے۔ پہلا ابتدا میں طاعون کی وبا کے دوران، ذاکر کے گھرانے کی بزرگ خاتون کو بشارت ہوتی ہے کہ امام کی سواری آئی ہے اور وبا ٹل جاتی ہے۔ دوسرے موقع پر ذاکر کے والد وفات کے وقت جناب امیرؑ کی زیارت کرتے ہیں۔ ان دونوں کرداروں کا ذہنی جہان یقیناً اس انسانی جغرافیے سے مختلف ہے جو عرفان، ذاکر اور افضال کا جہان ہے (اور خود یہ جغرافیہ ان تینوں کے اپنے باطن کا بھی ہے) اس لیے وہ بشارت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ مگر یہ ناول ایسے مقام پر اپنی کہانی کو پہنچا کر ختم ہوتا ہے جہاں بشارت تو شاید ممکن نہ ہو البتہ ایک صدا ضرور سنی جا سکتی ہے جو انسان ویرانے میں پکارتے وقت بلند کرتا ہے اور وہ جو مذہبی صحیفوں میں مختلف انداز میں گونجتی ہے، اور وہ صدا ہے ایلی ایلی لما سبقتنی! اے میرے رب! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ جس قدر کوئی قومیں دکھ جھیلتی ہیں اُسی نسبت سے اُن کے اچھے دن قریب آتے ہیں

انتظار حسین پر چند نوٹ

انور سجاد

پہلا نوٹ:

یہ نوٹ میں نے انتظار حسین کا ناول "بستی" پڑھ کر الل ٹپو لکھے ہیں، اس امید پر کہ اگر یہ بے ترتیب، غیر مربوط سے تاثرات اور بعض اوقات متضاد بیانات کسی ثقہ محقق یا نقاد کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ خوش نصیب ان میں مضمر امکانات سے اس طور استفادہ کرے کہ انتظار کو اپنے فن پر ایک عمیق اور جامع کتاب یا کم از کم ایک طویل مضمون میسر ہو اور لکھنے والا شہرت دوام پا سکے۔

دوسرا نوٹ:

ایسا کوئی شخص میرے ان نوٹس سے استفادہ کرنے کی کوشش نہ کرے جس نے انتظار حسین کے تمام تر فکشن کو پوری توجہ سے نہ پڑھا ہو۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی اگر وہ ایسی صورت میں خود کچھ لکھنے کی کاوش کرے گا تو اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

تیسرا نوٹ:

ہر اچھے مصنف کی کتاب کو اسی طرح چھپنا چاہیے جیسے صلاح الدین محمود نے "بستی" کو چھاپا ہے۔ خوب صورت کتاب بدصورت شخص کے ہاتھ میں بھی ہو تو ایسے کتاب کی دمک سے وہ شخص بھلا لگنے لگتا ہے اور بھلا لگنے کے لیے ایسی کتاب کی جو بھی قیمت ہو، مناسب ہوتی ہے۔

باقی نوٹ:

اگر انور عظیم کی بات مان لی جائے تو۔ منٹو، کرشن چندر، بیدی وغیرہم والی نسل اور میری، مین را، اور خالدہ حسین وغیرہم والی نسل کی درمیانی کڑی میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور انور عظیم وغیرہم آتے ہیں۔ ان تینوں کی جڑیں منشی پریم چند کی قدیم حقیقت پسندی کی روایت میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان تینوں نے اس زمین پر ایک دوسرے سے اور پریم چند سے بھی انتہائی مختلف سمتیں معین کی ہیں۔ ہو سکتا ہے ان تینوں کی یہ سیراب کن سمتیں نہ ہوتیں اور ان پر منٹو کے پھندنے نہ جھولتے

تو میری بین را اور خالدہ حسین وغیرہم والی نسل کا روپ اور ہی ہوتا۔ نئی سمتیں جمع تفریق، ضرب، تقسیم ایسے سادہ حساب کتاب سے لے کر پیچیدہ ہائر میتھمیٹکس ہی کے جوڑ توڑ اور دائمی توازن کے نتیجے میں متعین ہوتی ہیں۔

فکشن لکھنے والا ہر کوئی اپنا MICROCOSM، اپنی دنیا خود تعمیر کرتا، بساتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کی تخلیق کردہ دنیا اس کے اپنے سیاق و سباق میں، (چاہے وہ کسی بھی نظریے سے کسی بھی انداز میں کی گئی ہو) قائل کرتی ہے یا نہیں۔ اس دنیا کی تعمیر کے اغراض و مقاصد سے نظریاتی اختلاف تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس پر فتوے دینے، حد جاری کرنے یا ملامت کرنے سے بہتر طریقہ یہ نہیں کہ کہ اس سے بہتر دنیا زیادہ قائل کرنے کے انداز میں تخلیق کی جائے؟ یا ایسی تخلیق کے امکانات کی نشاندہی کی جائے؟ اس ضمن میں سلسلہ بندی یا لیبل لگانے کی ضرورت بھی شاید سہل پسندی کی دلالت ہے یا عقیدہ پرستوں کا محبوب مشغلہ۔ سلسلہ بندی، تجنیس یا لیبل چسپاں کرنا سائنسی علوم کی تو بنیادی ضرورت ہے لیکن ادب میں ایسی تجنیس کہیں محض اس لیے تو نہیں کی جاتی کہ گلشن کا کاروبار چلے؟

ناول کی تاریخ میں سب سے قدیم، طویل داستانیں، اساطیر ہیں۔ ویسے انتظار حسین کے جد امجد رتن ناتھ سرشار کے بعد مرزا رسوا سے آگے چند نام گنوانے میں کوئی حرج نہیں۔ نذیر احمد (دہلوی)، محمد حسین آزاد (مولانا)، راشد الخیری (مصور غم) پریم چند (منشی)، ایم اسلم، نقاش فطرت، رئیس احمد جعفری، رشید اختر ندوی۔ اور پھر نسیم حجازی کہ تاریخ شاہانِ اسلام جن کے تابع ہے۔ شوکت صدیقی، اے حمید نے بھی ناول کو خوب کھنگالا۔ خواتین کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ ناول کو جتنا انھوں نے نوازا ہے اس کی مثال کسی اور صنف میں نہیں ملتی۔ عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی کے قبیلے کا معاملہ الگ ہے۔ حجاب امتیاز علی اور مسز عبدالقادر بھی اپنی ذات میں انجمن ہیں لیکن اے آر خاتون کی قیادت میں خواتین کے انبوہ کثیر نے ناول کے میدان کو جس طرح باورچی خانہ بنایا ہے اور لنگر جاری کیا ہے اس میں ہم صرف خود کفیل ہی نہیں بلکہ یہی ایک ایسی پیداوار ہے جس کی مقدار ہماری ضروریات سے بہت فاضل ہے اور جسے ہم اپنی کسی پی ایل فور ایٹی کے تحت ایڈ کے طور پر دے سکتے ہیں اور اگر اسے کوئی قبول کرنے پر تیار نہ ہو تو کم از کم سمندر میں ڈمپ کرا سکتے ہیں (پھر سمندری مخلوق کا کیا ہوگا یہ اس مخلوق کا مسئلہ ہے) اور یا پھر خاندانی منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ ناول کی منصوبہ بندی کا شعبہ بھی کھلوایا جا سکتا ہے۔ ڈبلیو ایچ او کو اس کام بھی آنا چاہیے۔

انور غالب کا ناول میری اس رائے سے مستثنیٰ ہے (یاد رہے سید انور، انور عظیم، انور جلال انور سجاد یا دوسرے مرد انوروں کے برعکس انور غالب خاتون کا نام ہے) معلوم نہیں ابھی تک اہل نظر کی نظر ان کے ناول "رات کا سورج" کیوں نہیں دیکھ سکی۔ سر ہیلسنٹ انداز میں یہ ایک عجیب داستان ہے جس کے مطالعے اور

پرکھ سے اہلِ نظر، ناول کی ایک اور جہت سے روشناس کرا سکتے ہیں اور انور خالد کو مزید ناول لکھنے پر اکسا سکتے ہیں۔

ناول کی ضخامت؛ علی پور کا ایلی، دیکھنے میں ہمارے ادب کا شاید سب سے صحت مند بھاری بھرکم ناول نظر آتا ہے۔ لیکن ذیابیطس کے بعض مریض بھی ایسے ہی نظر آتے ہیں۔

کاش "اداس نسلیں" "آگ کا دریا" کے بعد نہ لکھا جاتا۔

عزیز احمد اردو ناول میں کلاسیکی روایت کی انتہا ہیں۔

وہ لکھنے والے جن میں اپج نہیں ہوتی پنپنے کے امکانات نہیں ہوتے قوتِ نشوونما نہیں ہوتی وہ ٹھٹھر بن کر رہ جاتے ہیں اور اگر لکھتے رہنے پر مصر ہوں تو ان کی تحریریں CRETINISM (بونے پن) میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو بڑھنے پھولنے کے غدودی عرق کے نظامِ انہضام میں گڑبڑ یا غدود کے بے کار ہونے پر لاحق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ادب کو یہ مرض ادیب ہی کے واسطے سے چمٹتا ہے۔ "آگ کا دریا" نے ناول کو اس مہلک مرض سے بچایا اور انتظار حسین کا "بستی" ناول کے لیے ایک اور توانائی کی دریافت۔

کسی بھی انداز کو اس کی انتہا تک پہنچانے والے، نیا روپ، نیا انداز دینے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں پھر بھی انگلیاں بچ رہتی ہیں۔

"بستی" کو پڑھتے وقت انتظار کے افسانوں کو یکسر بھول جانا چاہیے اگر کوئی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو تو احساس ہوگا کہ جو کچھ انتظار نے جس انداز میں ناول میں کہا ہے وہ کہیں بہتر طور پر اپنی کہانیوں میں کہہ چکا ہے۔

انتظار ایک ماہر، چابکدست کہانی کار ہے۔ بے زبان نہیں، بے لگام نہیں۔ زبان پر مکمل عبور کے باعث لفظوں کو پلاسٹی سین کی طرح جیسے چاہے ڈھال لیتا ہے۔ داستانی اسلوب اس کی مجبوری بھی ہے کہ اس کے طرزِ احساس کے لیے یہ پیرایۂ اظہار قدرتی ہے۔ قدامت پسندی، ماضی کی طرف مراجعت، پدرم سلطان بود، اگر اسلوب اور زبان اس طرزِ احساس سے لگا کھاتے ہوں تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔ لیکن فرانز فینن یہی تو کہتا ہے کہ نو آزاد ممالک کے لوگوں، خاص طور پر دانشوروں کا ردِعمل آزادی کے بعد انتہائی ہوتا ہے کہ جتنی شد و مد کے ساتھ وہ اپنے حاکموں کی بندر نقالی کرتے ہیں سامراجی رشتوں سے یکسر منقطع ہونے کے لیے اسی شد و مد کے ساتھ اپنی اصل کی تلاش اور شناخت کے لیے ماضی کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ روایت سے خود کو شدت سے جوڑتے ہیں اور یہ ایک انقلابی اقدام ہوتا ہے۔ میرے اس اشارے سے انتظار کو خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے اس کی فکشن

سے کلی سیاق و سباق میں شاید اس کا یہ انقلابی اقدام انقلابی نہیں رہتا اس کے لیے اور بھی لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔

"بستی" ایک طویل ناول ہے۔ شعوری رو، اجتماعی لاشعور، فلیش بیک، حال اور آخری ابواب میں فلیش فارورڈ بھی معروضی صورت حال کو دیو مالا، تاریخ اور حکایتوں کی وساطت سے سمجھنا، بیان کرنا کنکریٹ صورت حال سے گریز نہیں بلکہ ماضی کے ساتھ حال کا تسلسل قائم کر کے قاری کے ذہن پر نقش بنانے کا بہت کامیاب طریقہ ہے۔

انتظار ایک ماسٹر کرافٹس مین ہے۔ لیکن کسر نکالنے والے بھی کہاں چوکتے ہیں۔ مائیکل اینجلو نے جب شہرۂ آفاق مجسمہ داؤد تراشا تو ایک نقاد نے اعتراض کیا کہ اگر اس کی ناک قریباً ایک سوت اور تراش دی جائے تو یہ ایک لاثانی مجسمہ ہوگا بیچارے مائیکل نے ہاتھ میں چھینی کے ساتھ نقاد سے چوری تھوڑا سا سنگ مرمر کا برادہ لے کر مجسمے کی ناک کے قریب ٹھوکا ٹھاکی کی نقاد ہاتھ سے گرتا برادہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ مائیکل نے اس کے زریں مشورے پر عمل کیا ہے مائیکل اینجلو نے فارغ ہو کر تحسین طلب نظروں سے نقاد کو دیکھا۔ نقاد نے گرم جوشی سے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ اب یہ لاثانی ہے۔

انتظار کے فن کا ارتقاء اس کی نشوونما اور اس کے آخری مظہر "بستی" کے تجزیے اور اس کے مقام کی جانچ اور اس کے فن پر اسکے اپنے اثرات کے علاوہ دوسروں کے اثرات جاننے کے لیے نزدیکا، کافکا، آئنیسکو، صادق ہدایت، کامیو، اور اسی قبیل کے دوسرے لکھنے والوں کی تحریروں سے واقفیت نقادوں کی مجبوری ہوگی اور اگر مابعد الطبیعاتی جوڑ دیکھنا ہوا تو ڈی ایچ لارنس اور جیمز جوائس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

ہندی دیو مالا (آریائی دیو مالا کہ جسے بعد میں ہندو دیو مالا کہا گیا) اور عربی اساطیر (جنھیں اسلامی اساطیر بھی کہا جاتا ہے) کی کہیں مماثلت اور کہیں ان کو گڈمڈ کر کے مدعا کا بیان، اکثر و بیشتر دیو مالا اور تاریخ ایک دوسرے میں ڈوبتے ابھرتے۔ کچھ صوفیانہ انداز نظر کہیں کہیں بھگتی تحریک کے احیاء کی خواہش۔ لیکن بات منڈھے چڑھتے رہ جاتی ہے۔ میری بات کی تصدیق وہ لوگ کر سکتے ہیں جو تصوف میں درک رکھتے ہیں اور امام غزالی، ابن العربی اور ابن رشد کو ان کی تحریروں اور عمل کے حوالے سے جانتے ہیں اور حسین ابن منصور حلاج ایسے عارفین کے انجام کو بھی۔ یہ لوگ دانشور تھے، شاعر تھے لیکن ان کی زندگی اور انجام گواہ ہیں کہ انھوں نے حاکم طبقوں اور پاپائیت کے گٹھ جوڑ کو کس نظر سے دیکھا، علی کٹھ ملائیت، حقیقت شناساؤں کو قتل تو کر سکتی ہے لیکن مار نہیں سکتی۔ صوفیا کا

مسلکِ عشق کے حوالے سے حتمی سچائی اور حقیقت کا عرفان اپنی ذات کا ادراک ہے۔ ان کے نزدیک امام غزالی کے قول کے مطابق مذہب کی مربی اور نفسیاتی شمولیت بنیادی اور فطری طور پر ایک ہوتی ہے عارفِ کامل اور حقیقی صوفی نہ صرف راہِ عمل کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ اس پر چلتا بھی ہے۔ تصوف میں بے عمل صرف وہ درویش ہوتے ہیں جو اس راہ میں بھٹک جاتے ہیں یا جن کی نشوونما موجود رک جاتی ہے۔ سو تاریخ سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ حقیقی صوفی مسلک کے معنی بالآخر حاکم طبقوں اور پاپائیت کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں مروجہ انسان کش نظام اور انحطاط پذیر اخلاقی اقدار کے خلاف جدوجہد ہے۔ عاشق ظالم نہیں ہوتا نہ وہ ظلم کو برداشت کر سکتا ہے۔ سو انتظار حسین فرار ہو جاتا ہے خواہ مخواہ کی تشکیک اسے ڈانواڈول کر دیتی ہے اور انجام اسے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ صابرہ اس کی گواہ ہے اور انیسہ بھی۔ لیکن یہ بھی کیا ضروری ہے کہ ادیب کسی خاص مسلک کا لازماً پیرو ہو۔

بزدلی جب اندر سے ملامت کرتی ہے تو احساسِ ندامت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک طریقہ شاید یہ بھی ہے کہ انسان خود اذیتی سے تلذذ حاصل کرنے لگے۔ آہ و زاری کرے اور یاد کرے ان زمانوں کو، حکایتوں کو کہ شاید اسی طرح کوئی قوت نمو پائے۔ مقابل ڈٹ جانے سے صورت حال میں تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے انتظار تبدیلی نہیں چاہتا کہ نیا پن اسے خوف زدہ کرتا ہے اور پھر طبیعت میں جو گریز ہے اس کا کیا بنے گا ماہرین کا کہنا ہے کہ رویے بچپن ہی سے متعین ہو جاتے ہیں۔ جانے فرائیڈ کے حوالے سے بات کہاں تک پہنچے۔ انتظار کی سائیکی میں گڑبڑ غالباً اس وقت ہوئی جب اس کے گاؤں میں نئی نئی بجلی آئی تھی اور اس نے بجلی کے کھمبوں سے تنے تاروں سے بندروں کو لٹکے مرتے دیکھا تھا۔ سو ہر وہ شے جو تبدیلی کی علامت ہے۔ چاہے بہتری ہی کی نشاندہی کرے، انتظار اس سے بدک جاتا ہے۔ لڑکیوں کے ساتھ بھی یہی کہ جانے کیا ہو جائے۔ مدتوں بعد جب انیسہ کے ساتھ کوئی امکان بنتا نظر آتا ہے، کچھ کھلنے کی جرأت بھی کرتا ہے پر انیسہ کی طرف سے ایک پیاری سی ڈانٹ اور پھر اپنے کمرے میں آنے کی دعوت انتظار وہیں ہراساں ہو جاتا ہے یا پھر انتظار فطرتاً شریف آدمی ہے۔ اگر وہ انیسہ کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا بھی جاتا تو، تو وہاں سے بھاگ جاتا۔

میں نے "بستی" کے انتظار حسین اور "روپ نگر" کے ذاکر کو گڈمڈ کر دیا ہے یا خود ہی ہو گئے ہیں۔ تخلیق میں تخلیق کار کی اپنی جھلک کسی نہ کسی طور تھوڑی بہت تو ہوتی ہی ہے لیکن بعض تحریروں پر خود نوشت سوانح کا گمان شدت سے ہوتا ہے۔ مصنف کے ساتھ مرکزی کردار کی مماثلت کی وضاحت بھی شاید صوفی طریقے سے بہتر طور پر ہو سکے۔ صوفیاء کے ہاں اسم کی خاص اہمیت ہوتی ہے ہر اسم ماخذ کی طرف بلاتا کر ابجد کے حوالے سے ضرورت ہو تو دوبارہ ترتیب دے کر اس کے مخفی معنوں کو واضح کیا جاتا ہے۔

ذاکر اور انتظار کے اسموں پر توجہ دی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ذاکر اور انتظار باآخر باطنی معنوی اعتبار سے ایک ہی راستے پر ہیں۔ ذاکر کا ماخذ ذکر ہے۔ ذکر کہ جو درویشوں کی ابتدائی مشقوں میں سے ایک مشق بھی ہے۔ اس کا بنیادی مطلب ہے یادوں کے حوالے سے یاد کرنا یعنی ماضی کو حافظے میں لانا۔ بار بار ایک ہی بات کو کہنا۔ دونوں حوالوں سے مرکزی کردار کا نام ذاکر بہت مناسب ہے اور اسی نام میں انتظار کی شناخت کی گھنٹی بھی ہے۔ ذاکر سے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن انتظار کو حکیم ثناقی کی یہ بات اب پلے باندھ لینی چاہیے جو انھوں نے بار بار ماضی کو حافظے میں لانے یا ایک ہی بات کو بار بار کہنے کے متعلق کچھ یوں کہی ہے کہ حد سے بڑھ کر ذاکر عارفوں کی مجلس میں نہیں پایا جاتا اور جہد کے بغیر ذکر کے کوئی معنی نہیں۔

"بستی" کے کردار بظاہر دھندلے دھندلے، جیسے ململ کے پردے سے دکھائی دیتے ہیں اگر خود بھی ذرا محنت کی جائے تو معلوم ہوگا کہ مائیکل اینجلو نے سنگ مرمر میں پیکروں کے نقوش معین کر دیے ہیں اب یہ ہماری اپنی صلاحیت پر منحصر ہے کہ ہم ان پیکروں کو کس مہارت سے تراشتے ہیں۔ تخلیقی قاری اور غیر تخلیقی قاری میں بہت فرق ہوتا ہے حکایتوں، استعاروں، پیچیدہ مرکزی علامتوں کی معنویت اور ہئیت کے تجربوں اور مکالموں کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے کچھ تو سوجھ بوجھ درکار ہوتی ہے۔

انور عظیم نے کہا ہے کہ انتظار حسین رُوحانی اور اخلاقی اقدار کے بنجر بن کو ٹی ایس ایلیٹ کی طرح مذہبیت سے سیراب کرنا، ہرا بھرا کرنا چاہتا ہے۔ درست۔ لیکن عظیم روایت اور عظیم تاریخ کے خالی خولی حوالوں سے نشاۃ الثانیہ کا خواب پورا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے لیے دوسرے بہت سے اہم عوامل کو بھی شامل نہیں کرنا ہوگا۔؟ وہ عوامل کہ جنھیں شامل نہ کر کے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہوئی اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا۔ جس کا گریہ 'بستی' پر بھرپور چھایا ہے۔ اسی انداز میں ایسے متوقع آشوب کی نشاندہی خلیش فارورڈ میں بھی کی گئی ہے۔ اگر ان عوامل کو حقیقت جان کر ان کا تجزیہ نہ کیا جائے اور اسے صورتِ حال کی کلیت میں شامل نہ کیا جائے تو اچھے خوابوں کی الٹی تعبیروں کے معنی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ جھنجھلایا جا سکتا ہے۔ کفِ دست ملا جا سکتا ہے، بے عمل ہوا جا سکتا ہے یا پھر ماتم کیا جا سکتا ہے۔

جانے کیوں مجھے ناول کا زاویۂ نظر اس زمین کا سپتر کا محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک خارجی (مذہبی اصطلاح میں نہیں) کا لگتا ہے۔ وسطی ہند کی تہذیب، خاص طور پر وہاں کے مسلمانوں کی تہذیب کو وادیٔ سندھ کی تہذیب، یہاں کے مسلمانوں کی تہذیب میں گرافٹ کرنے کی کوشش انتظار کی خواہش ہے۔ ہجرت اس کے لیے وصال کا وسیلہ بن نہیں پاتی بلکہ اجنبیت کٹ جانے کا احساس پیدا کرتی ہے سمجھ میں نہیں آتا، راماین، مہابھارت اسی وادی سندھ میں لکھی گئیں۔ جاتک کہانیاں اسی وادی کے ٹیکسا شیلا کی پیداوار ہیں۔ اسلامی تہذیب کا منبع یہی سرزمین ہے۔ یہ علاقہ اس تہذیب کا سرچشمہ ہے جس نے

باقی ہندوستان کو سیراب کیا۔ صدیاں بعد، ہجرت کے وسیلے سے انتظار اپنی اصل، اپنے ماخذ کو لوٹا ہے پھر بھی بھولا بادشاہ خود کو گمشدہ سمجھتا ہے اور ناسٹالجیا میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے اس احساس کا پوسٹ مارٹم کر کے دیکھا جائے تو کیا یہ کٹ جانے کا احساس اور ماضی کے لیے بے قراری دراصل اس نے پردہ تو نہیں ڈالا اپنے روپ نگر کی مٹی سے وابستگی پر؟ کہ جہاں اسے سب سے پہلے اپنے جسم کی آگہی ہوئی۔ جس جگہ جس کے حوالے سے انسان کے جسم میں پہلی سنسنی دوڑتی ہے۔ وہ جگہ وہ شخص وہاں کے باسی، وہاں کے چرند پرند، درخت پھول پودے، عمارتیں وہاں کی بسر کی ہوئی زندگی ساری عمر کے لیے ذہن سے چپا کنکھجورا بن جاتے ہیں۔ ہجر ایک اذیت، اس پر ہجرت اس سے بڑی اذیت۔ فرائڈ تین نفسیات میں چابی کس بات کی علامت ہے۔ چابیوں کا گچھا جو اتنے برس بعد بھی زنگ آلود نہیں ہوتا، چابیوں کا گچھا کسی اور معمہ کی کلید بھی ہے؟

انتظار حسین کے اجزائے ترکیبی میں کربلا کے بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ باقر مہدی نے اپنے مضمون میں انتظار کا ایک بیان نقل کیا ہے۔ "میں ۱۸۵۷ء کا گمشدہ سپاہی ہوں جو افسانہ نویس بن گیا ہے"۔ درست۔ انتظار اور سپاہی؟ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ جنگ آزادی ناکام کیوں ہوئی۔

بعض وقت میں حیران ہوتا ہوں اگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کامیاب ہو جاتی؛ اگر وطن عزیز کا ایک حصہ علیحدہ نہ ہوتا، کشمیر کا مسئلہ حل ہو جاتا اور اگر واقعہ کربلا نہ ہوا ہوتا تو؟ لیکن یہ سب کچھ کیوں نہ ہوتا۔ اگر کی گنجائش کا سوال ہی کیا پھر بھی "چھیڑ خوباں" ہی کے لیے سہی اگر یہ سب کچھ مثبت نتائج کا حامل ہو جاتا اور انتظار وہیں رہتا جہاں سے ہجرت کر کے آیا ہے تو کیسی کہانی لکھتا ہے؟ ٹکسالی میں نفسیاتی کہانیاں؟ یا اپنی مٹی کے ساتھ والہانہ وابستگی کے باعث روپ نگر کا پٹواری ہوتا؟

ہومو سیپئنس جب خود کو فطرت سے بلند کر لیتا ہے اور نظامِ فطرت میں اپنے شعور کے باعث اپنی حیثیت ایک انسانی فطری وجود کے حوالے سے مسلّم کر لیتا ہے تو فن ایک ایسی کارگزاری بن جاتا ہے کہ جس کے وسیلے سے اس کی یہ خاص قابلیت جسے بھی چھوتی ہے اسے انسانیالیتی ہے۔ لہٰذا تخلیقی قوت انسان کی سرشتِ اول ٹھہرتی ہے۔ فن اس کے لیے وہ میدان ہوتا ہے جس میں وہ اپنی تخلیقی قوتوں کو لامتناہی طور پر بروئے کار لاتا ہے چونکہ یہ ایک تخلیق ہوتی ہے۔ اس لیے فن پارہ ہمیشہ یکتا ہوتا ہے اور فنکارانہ کاوش ایک قسم کا ایڈونچر۔ فن حقیقت کا محض عکاس ہی نہیں ہوتا بلکہ نئی حقیقت کو جنم بھی دیتا ہے۔ فن ہی ایک ایسی قوت ہے جو انسانی حقیقتوں، انسانیائی ہوئی اشیا کو محنت کے واسطے سے انھیں لامتناہی طور پر وسیع کرتی ہے، سیراب کرتی ہے۔ حقیقت کے ساتھ ہمارا رابطہ، تعلق بیک وقت عمیق بھی ہو جاتا ہے اور وسیع بھی۔

تو ہو بہو تیت فن میں کوئی شے نہیں ہوتی کہ حقیقت کو کاپی کیا جا سکتا ہے نہ تو الدر جب فنکار حقیقت کا سامنا کرتا ہے تو وہ اس کی فوٹو سٹیٹ نہیں بناتا بلکہ وہ اسے اپنے بس میں کر کے انسانی معنی دیتا ہے۔ اسی لیے فن کے تخلیقی جوہر کے بارے میں کوئی حتمی اصول قائم نہیں کیا جا سکتا یہ تو معاشرتی ڈھانچوں کی ڈھلائی اور تخلیقی قوتوں کے مابین جدلیات سے ظہور میں آتا ہے اگر اس رشتے کو سمجھ لیں تو صرف انتظار حسین ہی نہیں کسی بھی لکھنے والے کے سلسلے میں دو انتہاؤں سے بچ سکتے ہیں ایک تو مارکسی کٹھ ملائیت جو فن کے مخصوص ادبیت حتیٰ کہ خود مختار کردار کو یکسر نظر انداز کر دیتی ہے اور جمالیاتی کٹھ ملائیت جو فن کو حتمی طور پر خود مختار قرار دے کر اور انتشار کا فنکار بنا دیتی ہے۔ ادب تاریخی، معاشی، معاشرتی، عصری سیاق و سباق ہی میں تخلیق ہوتا ہے چونکہ سیاق و سباق جامد نہیں ہوتا اس لیے اظہار کے وسیلے بھی مسلسل وسیع ہونے رہتے ہیں اور اظہار کے نئے پیرائے کی تلاش یا برائے پیرایہ اظہار میں ایج پیدا کرنا ایک ضرورت بن جاتا ہے کہ ان وسیلوں سے اظہار و ترسیل ممکن نہیں ہو پاتی جو ایک خاص وقت میں لکھنے والے کو میسر ہوتے ہیں ہر فن اپنی فطرت میں اختراعی ہوتا ہے۔ اجتہاد کرتا ہے عظیم فن پارے کی عظمت شاید روایت سے ناطہ توڑنے قوت میں بھی مضمر ہوتی ہے۔ جو نیا ہے، تخلیقی ہے۔ انقلابی بھی ہے (انتظار کو اس لفظ سے سراسیمہ نہیں ہونا چاہیے اس سے میری مراد محض جدت سے ہے کمال مخصہ ہے کہ بیل گاڑی کے فراق میں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیے جائیں لیکن خود سفر کرنا ہو تو ہوائی جہاز سے کم کی سواری پر مانتے نہیں) لیکن ادب اور فن میں روایت سے دو ٹوک انحراف اس نوع کا حتمی یا بنیادی نہیں ہوتا جو سائنس اور اس سے متعلقہ شعبوں میں ہوتا ہے۔ جدلیاتی معنوں میں ہر نفی اپنے اندر ماضی کی مثبت اور قیمتی اقدار کو اپنے اندر جذب کیے ہوتی ہے اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہر نئی فنی تخلیق اس انتہا سے شروع ہوتی ہے کہ جس پر فنی تخلیق تاریخی طور پر پہنچ چکی ہو۔

؎ میکسیکو کا مارکسی ادیب ' اڈولفو سانچے واسکوتے ' "فن اور سماج"

طبقاتی معاشرے میں انسان کا وجود اور کچھ نہیں ماسوا اس کے تخلیقی جوہر کی تعطیر کے اسی لیے وہ اپنی ذات سے منہا ہو کر، متروک ہو کر لا انسان بن جاتا ہے۔ عملیت، بے مقصدیت کیونکہ جدوجہد کی ناکامی اس ذاتی جدوجہد کی کہ جو وہ تنہا طور پر منظم بے انصافوں کے خلاف کرتا ہے اگر انتظار کے ذاکر کو یوں دیکھا جائے جیسے واسکوتے کافکا کے "کے" کو دیکھتا ہے تو اپنی تخیل پرستی، حکایتوں، داستانوں، تاریخ پرستی کے حوالوں سے محض نیک خواہشوں اور ان خواہشوں کی تکمیل کے لیے زرخیز فضا کے باوجود اس فضا سے استفادہ نہ کرنے کی بے عملی جو بانجھ پن پر منتج ہوتی ہے۔ انتظار حسین اتنا قنوطی، یاسیت کا مارا، منفی سوچ رکھنے والا یا دوسرے معنوں میں غیر ترقی پسند نظر نہ آئے۔ واسکوتے کے مطابق کافکا کا "کے" ہمیں انفرادی جدوجہد کے بانجھ پن کا احساس دلاتا ہے لیکن اس کی دنیا میں اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں کہ اس

قسم کی جدوجہد کو باثمر ہونے کے لیے اس کا رخ معاشرتی، معاشی نظام کی جانب ہونا چاہیے جس نے اُسے کاٹ کر ایک کٹی ہوئی دنیا میں چھوڑ دیا ہے۔ اس دنیا میں کہ جس نے تکّے کو مجرم ٹھہرایا ہے۔ اس دنیا میں اس قسم کی ہر خواہش بے ثمر ہوگی اور جدوجہد بھی تاآنکہ یہ جدوجہد طبقاتی معاشرے کا ادراک کرے اور اس کی معاشی معاشرتی بنیادوں کو جڑ سے کھود ڈالے اور یہ ذاتی جدوجہد ان سماجی ڈھانچوں کو تبدیل کرنے کے لیے اجتماعی عمل کا حصہ بن جاتے۔ ایسی صورت حال کا بیان (زرد کتا۔ آخری آدمی) ایک جبلی انفرادیت سے پردہ اٹھانا اس صورت حال پہ تنقید کا درجہ رکھتا ہے کہ یہ دنیا کا فکار/انتظار کے لیے قابل قبول نہیں۔ نیم جاگیردارانہ، نیم سرمایہ دارانہ اور نئے نوآبادیاتی دلالی نظام میں جبلی اقدار اور معاشرتی دیوالیہ پن کا اظہار، بے عملی سے الجھن، خالی خولی نعروں کے کھوکھلا پن اور مجموعی صورت حال سے بیزاری متقاضی ہے کہ انتظار کو ایک نظر واسکوئے کی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا جائے۔

اتنے سوالوں میں سوال یہ بھی کہ آزادی کے ۳۲ برس اور ملک کا حصہ گنوانے کے باوجود اپنے تشخص کی تلاش ابھی جاری ہے؟ یوں تو نہیں کہ اس طرح ہم اپنی نیلبتوں پر پردہ ڈالتے ہیں؟ یا ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہونا چاہتے یا اس کی اہلیت نہیں رکھتے جو تاریخ کا تقاضا ہے؟ یا پھر ہم ریت میں سر دبا لینے والوں کی قبیل سے ہیں؟ بشارتوں کی کئی صدیوں کو محض توہم کی سطح پر سمجھا سمجھایا گیا کہ حال مست یا مال مست رہیں؟ جب بشارتوں کا وقت ہو تو بات کو بیچ ہی میں چھوڑ دو کہ گمشدہ سپاہی کے لیے بشارتوں کی رمز کو جاننے میں بڑی خواری ہے، لیکن سید الساجدینؑ نے پالنے والے کی قسم کھا کر برملا کہا کہ انھوں نے صبح بنو امیہؔ کے ظلم میں کی۔ ذاکر کے ابا کا کہنا ہے کہ تب سے اب تک وہی صبح چل رہی ہے اور ظہور تک چلے گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ ظہور کی شناخت کرنا اور اس کا ساتھ دینا بھی عمل اور جہد میں شرکت کے لیے مجبور کرتا ہے۔ وقت کے نظام سے مبارزت طلب کرنا ہے۔ تخارب کی صورت پیدا کرتا ہے۔ کیا تب انتظار حسین افسانہ نویس "گم شدہ" ہو کر پھر سے سپاہی بن سکے گا؟ شاید ہمیں ظہور کا بھی انتظار نہیں بلکہ کسی ایسے نجات دہندہ کا انتظار ہے جو آئے، ہماری شرکت کے بغیر ہمارے معاملات ہمارے لیے سب ٹھیک ٹھاک کر دے اور چلا جائے۔

لیکن کوفے سے بھاگنے کی کوشش تو پھر کوفے ہی میں لا پھینکے گی۔ اب یہ اپنے ظرف پر منحصر ہے کہ کوفے کو چوہے دان سمجھ کر اس میں چوہے بن کے چکر کاٹنے لگیں یا ـــــ

اور اگر مگر ہمارا جواب ہے اور تقدیر ہماری کوفہ ہی ہے تو انتظار کے لیے حضرت امام حسینؑ سے لے کر آج تک پیش کی گئی تمام بڑی چھوٹی شہادتوں کے کیا معنی بنتے ہیں؟ انتظار حسین بہت کا تیا ل ہے۔ وہ اپنی خوف‌زدگی کو سکوت میں ڈھال لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کی بے زبانی کو زبان

سمجھا جاتے۔

آخری نوٹ:

"بستی میں ماسٹر فکشن رائٹر اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ یہ اس کی فکشن کی سمیٹ ہے تکمیل ہے۔ اس کے بعد دائرہ ہے۔ گنبد ہے۔ حبس ہے۔ اب اگر استادِ فن کو اپنا سفر جاری رکھنا ہے تو اسے یہ دائرہ تو توڑنا ہوگا۔ تازہ ہوا کے لیے گنبد سے باہر نکلنا ہوگا۔ سفر کے لیے نیا راستہ تلاش کرنا ہوگا خود کو بدلنا ہوگا۔ اب اسے یہ جرأت کرنی ہی پڑے گی کہ زندہ رہنا جرأت چاہتا ہے اور اگر استاد اس میں اپنی سبکی نہ سمجھے تو فی الحال اس ہیچمدان راقم الحروف ہی کے تجربات سے جائز، ناجائز فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

فٹ نوٹ:

قارئین، محققین، ناقدین، حتیٰ کہ انتظار حسین کا بھی میری رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

OO

مکروہ بستی میں بشارت کا لمحہ

راحت نسیم ملک

ایک سوال کرنے والے نے سوال کیا کہ سیّد الساجدین آپ نے صبح کس عالم میں کی؟ آپ نے فرمایا "پالنے والے کی قسم، ہم نے بنی اُمیہ کے ظلم میں صبح کی" اباجان یہ کہہ کر افسردہ ہو گئے، کہنے لگے "بیٹے، تب سے اب تک وہی صبح چل رہی ہے" چپ ہو گئے۔ پھر بولے۔ "اور ظہور تک چلے گی"۔ انتظار حسین کا یہ ناول بنیادی طور پر ایک ایسی بستی کا استعارہ ہے، جہاں ظلم کی صبح چل رہی ہے اور ظہور تک چلے گی اور جس کے کردار اپنی سوچوں کے اُفق پر قیامت کے سائے لیے پھرتے ہیں۔ اس قیامت کا شعور ہمیں ناول کے مرکزی کردار کے ذہن کا احاطہ اس وقت سے کیے ہوئے نظر آتا ہے، جب ابھی تحیّر اور خوف اس کے لیے زندگی کی دیو مالا کے اسرار کی تفسیر کر رہے ہوتے ہیں۔ قیامت کب آئے گی؛ اس اسرار کی گرہیں ناول کے پہلے ہی باب میں یوں کھلتی ہیں۔

"جب کلام کرنے والے چپ ہو جائیں گے اور جوتے کے تسمے باتیں کریں گے"

"اور کلام کرنے والے کب چپ ہوں گے اور جوتے کے تسمے کب باتیں کریں گے؟"

"جب حاکم ظالم ہو جائیں گے اور رعایا خاک چاٹے گی"

اس حوالے سے دیکھا جائے تو روپ نگر کے دیو مالائی عہد سے ناول کے آخری باب کے قبرستان تک کا سفر جہاں ذاکر قبروں کے بیچ اپنے ارد گرد کی رستاخیز سے پناہ ڈھونڈھتا ہے، قیامت کے منظر کو چھوتا ہُوا چلتا ہے اور وہ تازہ زمین اور اس پر کا تازہ آسمان جس پر پہلے پاکیزہ دن ذاکر ایک زمانے کے بعد آزادانہ چلتا ہے، اس اندیشے کے بغیر کہ ابھی کوئی برابر سے گزرتے گزرتے چھرا اس کے اندر اتار دے گا۔ اس سفر میں بعض گھڑی پل کا پھلاوہ ہیں۔ یہ شہر جو روپ نگر کے ساتھ اس کے اندر گھل مل کر ایک بستی بناتا ہے اور اس کے تصور میں آباد روپ نگر کے ساتھ ساتھ اس کی دعا کا مقدر ٹھہرتا ہے، جلد ہی اس رستاخیز کا اسیر نظر آتا ہے، جہاں سے پناہ کے دروازے یا تو ان جنگلوں میں کھلتے ہیں، جو اس کے اندر تہہ زمانوں کی دین ہیں الا یا قبروں کے درمیاں کیونکہ "اللہ تعالیٰ نے زمین کو کشادہ بنایا تھا، مگر آدمیوں کے ہاتھوں وہ تنگ ہوتی جا رہی ہے"۔ ناول کے آخری حصے تک پہنچتے پہنچتے اس بستی کا منظر کوفے، کربلا، عبداللہؓ ابن زبیر کے مکے اور بغداد ہوتے ہوئے جہان آباد کا منظر بن جاتا ہے۔ جہاں جوتے کے تسمے بولتے ہیں، بولنے والے کا سر طشت میں ہے، مرد درویش کی لاش شہر مبارک کے وسط میں سولی پر ٹنگی ہے اور وہ جو امامت کے لیے

کھڑا ہوا تھا تو نمازی صف بصف مسجد کی آخری حد تک کھڑے تھے، جب سلام پھیرنے کے بعد مڑ کر دیکھتا ہے تو صفیں صاف ہوتی ہیں اور مسجد خالی۔

اس تناظر میں مجھے بریخت کی ایک نظم یاد پڑتی ہے۔

I ATE MY FOOD BEETWEEN MASSACRES
THE SHADOW OF MURDER LAY UPON MY SLEEP
AND WHEN I LOVED, I LOVED WITH INDIFFERENCE.

بستی کے کردار بھی یہیں کٹتے ہوئے سروں کی فصل کے درمیان رزق چنتے ہوئے رزقِ خاک بنتے نظر آتے ہیں، ان کی نیندوں پر بھی موت کے زخموں کی پرچھائیاں ہیں اور ذاکر کی تینوں محبتیں اکھڑی اکھڑی محبتیں ہیں۔ بریخت کا حوالہ یہاں سرسری طور پر نہیں در آیا۔ انسانی ہڈیوں اور لہو کے گارے سے تخلیقی ادب کی ترتیب میں انتظار حسین اور بریخت کے ہاں پائے جانے والے رویوں کا امتیاز ہمیں اس ناول کی تفہیم کے لیے کلید مہیا کرتا ہے۔ بریخت ان لکھنے والوں میں سے ہے، جن کے لیے تاریخ ایک معروضی حقیقت ہے اور ادب بنیادی طور پر تاریخ کی ایک صورت ہے، جو ایک خاص لمحے کے انسانی تجربات کی پہچان فراہم کرتی ہے۔ انتظار حسین کے ناول میں تاریخ انسانی تجربے کی اخلاقی جہت کے طور پر ابھرتی ہے۔ بستی کے مرکزی کردار کے لیے زمانہ بنیادی طور پر اس کے اندر کی واردات ہے۔ زمانہ کہ گزر جاتا ہے پر نہیں گزرتا۔ آس پاس منڈلاتا رہتا ہے۔ اور اندر بند رہ کر جنگل بن جاتا ہے۔ چنانچہ ذاکر کا اپنے ارد گرد کے تاریخی عمل سے تعلق صرف اتنا ہے کہ باہر گولیوں کا مینہ برس رہا تھا اور اندر وہ جنگلوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا، جنگل پھر جنگل اور پھر جنگل ——— وہ بڑھتا جا رہا تھا اور جنگل گھنے ہوتے جا رہے تھے۔ "اور بالکل ٹھیک، باہر کچھ ہوا کرے" وہ بڑبڑایا ——— "باہر کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ سب کچھ میرے اندر ہو رہا ہے۔ وہ سب جو ہو چکا ہے، ہو رہا ہے..."

انتظار حسین کی کہانیوں میں فرد کے لیے اپنے ماحول سے رابطے کا واحد حوالہ اس کی اپنی واردات ہے۔ اس کے اندر کی واردات کیونکہ فرد بہ حیثیت فرد ہوتے ہوئے اور غیر انسانی صورتیں اختیار کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان تنہا سے تنہا تر ہوتا جا رہا ہے۔ بستی میں بھی ذاکر اپنی تنہائی کا شکار ہے۔ وہ اپنے ارد گرد دیکھتا ہے۔ "ارد گرد کے چہرے ——— لگا کہ کھنچ کر لمبے ہو گئے ہیں اور پھر پھیلنے ہونے لگے۔ کھنچی گردنیں، پچکے چہرے، منہ سرخ اور بدن جیسے پورے بدن پر بال کھڑے ہوں" اور پھر سوچتا ہے "کیا میں ان میں سے ہوں یا ان کے ساتھ اٹھایا جاؤں گا؟" تنہا سے تنہا تر ہوتے ہوئے فرد، ایک ایسے فرد جو اپنے ارد گرد کی روزمرہ کی صورت حال میں جزیرہ بن چکا ہو اور اسے دوسروں کے ساتھ کوئی قدر مشترک نظر نہ آتی ہو، کی واردات کے اظہار کے لیے کہانی میں پلاٹ کی تلاش سعیِ لاحاصل ہی ہے اور لایعنی بھی۔ اسی لیے بستی کی بھول بھلیاں میں پلاٹ کی روایتی رسی آپ کی کچھ مدد نہیں کر سکتی۔ اپنے اندر کے جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے فرد اور سماجی عمل کو آپس میں صرف اور صرف تجربے کے ذریعے مربوط کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے تجربے کی شدت کے حوالوں میں اپنے کرداروں کے اظہار کے لیے انتظار حسین علامتوں اور حکایتوں کی باہم بُنت پر انحصار کرتا نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے

جنگ کے دنوں کی ڈائری اور ناول کے آخری حصوں میں علامتوں اور حکایتوں کے موثر تاثر بلاشبہ انتظار حسین کی تخلیقی صلاحیتوں کا خوبصورت ترین اظہار ہیں۔ علامتوں اور حکایتوں کی یہ باہم بُنت انتظار کا اصل کمال بھی ہے اور فنی مجبوری بھی۔ اسلوب کے اس پیرایہ سے ہمارے پچھلے تیس چالیس سال پر محیط تاریخی عمل ایک مفرد کا ذاتی دیومالا بن کر رہ گیا ہے اور اس دیومالا کی ساری کش مکش محض ایک تجرید کی سطح پر پڑھنے والے کا تجربہ بنتی ہے۔ یہاں تک کہ ناول کے بیشتر کردار بھی تجرید اور محض تجرید کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں ماسوائے ابا جان کے کردار کے اور وہ بھی شاید اس لیے کہ ابا جان ذاکر کے لیے اس ساری دیومالا کے مفسر ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ "ہمارے ارادے اس کی مرضی کے تابع ہیں، جو اُسے منظور ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے اور یہ کہ حالات کے بہتر ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، اعمال بہتر ہونے چاہئیں۔" بستی کا آشوب اپنے عروج پر اس وقت پہنچتا ہے جب ابا جان کہتے ہیں "اب ہمیں مر جانا چاہیے۔ بہت زمانہ دیکھ لیا جو نہ دیکھنا تھا، وہ بھی دیکھ لیا۔ اب آگے دیکھنے کی تاب نہیں۔" لیکن ذاکر جس کے لیے ابا جان اس کی ساری واردات کے مفسر ہیں اور ان کی قبر جس کے لیے پناہ بنتی ہے، خود کیا ہے۔ اس کی اپنی پہچان کیا ہے؟ تاریخ کا یہ پروفیسر محض یہ کہہ کر کہ "میں اپنی تاریخ سے بھاگا ہوا ہوں اور زمانہ حال میں سانس لے رہا ہوں۔ فراریت پسند۔ مگر بے رحم حال ہمیں تاریخ کی طرف دھکیل دیتا ہے" ہمیں تجرید کے دھوئیں میں چھوڑ دیتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح آخر میں اس کی پناہ گاہ قبرستان دھوئیں سے بھر جاتی ہے۔ کیا اس شہر آشوب کے مرکزی کردار کی بنیادی کش مکش صرف یہ ہے کہ "کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ میں آج کس چیز کے حق میں ہوں اور کس کے خلاف ہوں۔" ذاکر کے دوستوں کے کردار بھی اس کی ہمدردیوں کو کسی طور واضح نہیں کرتے۔ اس کے ایک جانب عرفان ہے جو کہتا ہے کہ "میرا گورنمنٹ نہ جنگ روک سکتا ہے نہ جنگ شروع کرا سکتا ہے" اور دوسری جانب افضال ہو جنگی جہاز دیکھ کر صرف یہ سوچتا ہے کہ "یار، یہ مدرے بہت پریشان ہیں۔" مجھے انتظار حسین کے یہ کردار بریخت کے لفظوں میں اس مصور کی طرح نظر آتے ہیں جو ایک ڈوبتے ہوئے جہاز کی دیواروں کو اپنی نئی سٹل لائف سے سجا رہا ہو۔ اپنے اندرونی دیومالا میں گرفتار ان کرداروں کے لیے شاید کسی حقیقی معروضی سچائی کا وجود نہیں سوائے اس کے کہ "یار ہم بھی طیب نہیں ہیں ―― ہم ظالم ہیں، ہم بھی ―― کوئی طیب آدمی نہیں ہے۔" کسی کے طیب نہ ہونے کی ساعت میں بستی کے افضال کا کشف بشارت کے لمحے کی آمد کا بھی اعلان کرتا ہے۔ انتظار حسین کی بستی کے کرداروں کے لیے بشارت کا لمحہ کہاں سے آئے گا۔ ان کے لیے تو تاریخی عمل میں شریک ہونا اپنے اندر موجود ممکنات سے منہ پھیر لینے کے مترادف ہے کیونکہ ہمارے ارد گرد کی ہر پل بدلتی دنیا ان کے اندر کے نظاموں اور زمینوں کو درہم برہم کر دیتی ہے اور ذاکر کے لفظوں میں کبھی کبھی بالکل پتہ نہیں چلتا کہ کہاں، کس جنگ میں ہوں۔ میں انتظار سے اس سوال کا جواب ہرگز نہیں مانگوں گا کیونکہ میں انتظار کے نقطۂ نگاہ سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ وہ مجھے یہی بتائے گا کہ یہ ہمارا خواب ہے اور کوفہ ہماری تقدیر اور یہ کہ بے شک انسان خسارے میں ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ بشارت کا لمحہ اسی وقت آئے گا جب کوفے کا باسی یہ کہنا چھوڑ دے گا کہ مت بولو، مبادا کہ پہچانے جاؤ اور جب انتظار ہمیں یہ بتائے گا کہ خسارا انسان کی تقدیر کیوں ہے اور اسے پیدا کرنے میں کس کا کتنا حصہ ہے۔

○ ○

بشارتوں کے درمیاں

سراج منیر

اس شہر کے یہیں کہیں ہونے کا رنگ ہے
اس خاک میں کہیں کہیں سونے کا رنگ ہے

(منیر نیازی)

اور کچھ ہو نہ ہو، ناول نگاری کے نقطۂ نظر سے بستی ایک "پرابلم ناول" ہے۔ اس اصطلاح کا اطلاق انتظار حسین کے حوالے سے بھی ہوتا ہے اور اردو میں فکشن کی موجودہ کیفیت اور اس کے معیارات کے اعتبار سے بھی۔ یوں تو ہر تخلیقی تحریر کسی نہ کسی درجے میں لکھنے والے کے ذاتی مسئلے سے پھوٹتی ہے لیکن بستی میں انتظار حسین نے اپنے تخلیقی کیریئر کے اہم ترین مسئلے کو اس کی مرکزی جہت سے گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ اس مسئلے کو مکمل طور پر گرفت میں لینے میں کامیاب ہیں تو یہ ایک بڑی خطرناک بات ہے اور اگر وہ مسئلہ گرفت میں نہیں آسکا ہے تو بستی کی حیثیت انگریزی محاورے کے مطابق ایک بے ثمر ورزش کی ہے لہٰذا بستی کی سرحد میں قدم رکھنے سے پہلے ہم ذرا اس مسئلے کے خاکے کو سمجھ لیں جو بستی کے پس منظر میں ایک پھیلتے ہوئے تناظر کی طرح موجود ہے اور بستی کے اندر کا سارا تخلیقی عمل اور ردِ عمل اپنا تجرباتی مواد اور اپنی فنکارانہ معنویت اسی سے مستعار لیتا ہے۔

کہانی کار کی حیثیت سے انتظار حسین بظاہر ایک متنوع اسالیب اور موضوعات پر لکھنے والے آدمی ہیں۔ یہ بیان انتظار حسین کی عام شہرت کے بالکل برعکس ہے۔ اصل میں "زرد کتا" اور "آخری آدمی" تخلیق کرنے والا انتظار حسین ایک مکمل اور مختلف الاسالیب افسانہ نگار کے لیے ہمارا حجاب بن گیا ہے اور اگر کوئی اس سے ذرا آگے بڑھے تو شہرِ افسوس اور ہندوستان سے ایک خط جیسے افسانے انتظار حسین کی ایک اور جہت میں ہمیں الجھا لیتے ہیں۔ لیکن انتظار کے ہاں چھوٹے بڑے بہت سے افسانے مختلف تجربوں اور مختلف اسالیب کے دائرہ عمل میں پہنچتے ہیں۔ ان بچپن کی محبتوں سے تعلق رکھنے والے دیولا اور پٹ بیجنا جیسی کہانیاں بھی ہیں اور گلی کوچے میں خالہ عقیلہ جیسی کہانیاں بھی

پھر اس سے بھی آگے پاکستان کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں لکھی گئی وہ کہانیاں بھی ہیں جو کسی قومی واردات میں تاریخی استعاروں کی لڑی پر دے کے بجائے عام انسانی برتاؤ اور ردعمل کا مطالعہ کرتی ہیں یہ درست ہے کہ ان ساری کہانیوں میں ایک زیریں رو ایسی ہے جو انھیں انتظار حسین کے مرکزی مسئلے سے مربوط کرتی ہے لیکن شخصیت کے نیوکلیئس سے اس ربط کے ساتھ ساتھ اتنے متنوع اسالیب اور موضوعات کی موجودگی ایک تہہ دار شخصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کی ہر سطح مظاہر کی دنیا میں اپنے مقابل کی سطح سے عمل اور ردعمل کی کیفیت میں ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے کیریر میں مختلف جگہ انتظار حسین نے ان میں سے کئی سطحوں کو ایک ہی لینڈ سکیپ میں سمونے کی کوشش کی ہے لیکن ایک افسانہ چونکہ بیانیہ اعتبار سے موضوعات اور اسالیب کے تنوع کو صرف جزوی طور پر ہی سمو سکتا ہے اس لیے اس نقطہ نظر سے وہ کہانیاں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس نقطہ نظر سے کہانی کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں رائے ادبی لحاظ سے ان کی اہمیت یا کمزوری پر کوئی محاکمہ نہیں ہے اس لیے کہ پوری شخصیت کو ایک کہانی میں سمونے کی کوشش اور کہانی کا اس عمل میں اپنی تحدید کے آخری سرے تک پھیلتا جانا بعض اوقات ایک بہت بڑے تخلیقی TENSION کو جنم دیتا ہے بہر کیف تو بستی دراصل اسی ذاتی مسئلے سے وجود میں آنے والا ناول ہے بستی کا بنیادی مسئلہ اپنی شخصیت کی مختلف سطحوں کو ان کے مرکز کے گرد، باہم در آویزاں لیکن ایک قدری ترتیب میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش ہے اور اگر ہم رضا آراستہ کی زبان میں گفتگو کریں تو بستی اس نفسیاتی ضرورت سے لکھی گئی ہے جسے بالغ شخصیت میں حتمی اکائی کی تلاش کا نام دیا جاتا ہے حتمی اکائی کی یہ تلاش ایک سطح پر حتمی معنویت کی تلاش بھی بن جاتی ہے اور ذرا اب اس مواد پر غور کریں جس سے شخصیت کا تانا بانا بنا گیا ہے تو کھلے گا تو اس میں روزانہ کے تجربوں سے لے کر پوری انسانی تاریخ کی زندہ واردات، اور خصوصاً برصغیر میں مسلم کلچر کے تار و پود بھی شامل ہیں تو شخصیت میں حتمی اکائی یا معنویت کی تلاش دراصل اس اجتماعی ورثے اور انفرادی حافظے کے عناصر کی اکائی کی تلاش کا بھی نام ہے جس سے شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ اب ہم سادہ لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ انتظار حسین کے ہاں بستی، ایک درجے میں اپنی شخصیت کی کلیت کو گرفت میں لینے کی کوشش ہے اور لارنس نے فلسفہ، سائنس، مذہب سب چیزوں کو ثانوی قرار دے کر ناول کی اصل اہمیت یہی قرار دی ہے کہ وہ زندگی کو اس کی کلیت میں پیش کرتا ہے اور اسی لیے لارنس نے ناول کو کتاب زندگی قرار دیا ہے۔

یہ طے کر لینے کے بعد کہ بستی کسی ادبی ٹوٹکہ بازی کے نہج پر لکھی گئی کوئی تحریر نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک گہری نفسیاتی ضرورت اور اس کے مقابل اتنا ہی ہمہ گیر تجربہ بھی موجود ہے، ہم یہ سمجھنے

کی کوشش کرتے ہیں کہ انتظار حسین کے ہاں تجربے اور نفسیاتی واردات کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے اور انتظار حسین کے پورے کیریئر میں اس کا منظر نامہ کس طرح مرتب ہوتا ہے۔

اگر مجھے فلسفہ بگھارنے کا شوق ہوتا تو بات یوں شروع ہوتی کہ انتظار حسین کا بنیادی مسئلہ زمین اور زمان کے تعلق کی بدلتی ہوئی کیفیتیں اور ان کی تفتیش ہے پھر اس کے بعد میں دوسرے درجے کی شرحوں سے فلسفیوں کے تصور زمان کے بارے میں کچھ بے ربط فقرے نقل کر دیتا۔ لیکن چونکہ میرا مسئلہ ایک ناول کے حوالے سے انتظار حسین کے تجربے کی نوعیت کو سمجھنا ہے اور اس میں خود ناول اور انتظار حسین کی کہانیاں ہی ہماری مدد کر سکتی ہیں اس لیے یہاں ہائیڈیگر اور وٹ گن سٹین کو زحمت دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

انتظار حسین کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا بنیادی مسئلہ ہجرت ہے ہم اسی مقبول عام تصور کو لے کر آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس مرکزیت کے گرد انتظار کی ایک دبیز ہوتی ہوئی کائنات کا تانا بانا کس طرح بنا جاتا ہے اور کتنی شاخیں اس مرکزی تجربے سے پھوٹتی ہیں ہجرت کے اس ہمہ گیر تجربے کی روح انتظار حسین کے ہاں بستی سے وابستگی کے منظر میں ہے بستی کی یاد ایک کرسٹل کی طرح ہے سرد اور روشن اور قائم جو ایک صورتحال سے دوسری کی طرف سفر کو ہجرت کی معنویت دے کر اسے ایک مدھم اور پر ملال روشنی سے منور کرتا ہے۔ سہیل احمد خاں سے اپنے مکالمے میں انتظار حسین نے اپنی بستی کو اس طرح یاد کیا ہے۔

> "جہاں تک میرا خیال ہے میں دس گیارہ سال کی عمر تک اس بستی میں رہا ہوں۔ وہ تو دس سال تھے یا دس گیارہ سال تھے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ ایک پوری صدی تھی۔ وہ علاقہ، وہ چھوٹی سی زمین وہ بستی اس کے باہر کے چھوٹے چھوٹے دیہات، جہاں میں کبھی کبھی یکے میں بیٹھ کر جایا کرتا تھا اور کبھی بیل گاڑی میں۔ ان سب چیزوں کو دھیان میں لاتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ چھوٹی سی زمین پورا برہماعظم تھی۔"

میں یہاں ایک چھوٹی سی ترمیم کرتا ہوں۔ ایک یاد کی حیثیت سے بستی میں انتظار حسین کے پورے نظام بازیافت میں سب سے روشن چیز ہے اور ایک تجربے کی حیثیت سے اپنی گہرائی کی جہت میں بستی ایک تاریک برِاعظم ہے جسے انتظار حسین بار بار اور مختلف جہتوں سے دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ یاد کی روشنی اور تجربے کی پراسرار گہرائی مل کر ایک ایسا منطقہ تشکیل دیتے ہیں جس میں چیزیں بار بار گرفت میں آتی ہیں اور بار بار پھسل جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بستی کی اس نیو کلیائی

حیثیت میں ابتدائی طور پر کون کون سے امکان پوشیدہ تھے اور انتظار کے ہاں ان امکانات کی دید گی کا طریقہ کیا ہے۔

اپنی بستی کی حیثیت انتظار حسین کے لیے مرکز کائنات کی حیثیت ہے اور اس جگہ انسانی حوالے سے زمین اور زمان کا تعلق واقع ہوتا ہے چنانچہ انتظار حسین کے ہاں اس بستی سے ہجرت کے معنی ہیں اپنے وجود کے مرکز سے ہجرت کرنا اور وقت کے ایک آہنگ کی طرف سے دوسرے آہنگ کی سمت سفر کرنا۔ ان دونوں چیزوں کو آپس میں مربوط کر لیں تو یاد کا استعارہ مکمل ہو جاتا ہے لیکن اصل چیز اس استعارے کی تہہ دار معنویت ہے جو شخصیت میں موجود تہوں کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے اس کی ایک سطح یاد میں واقعاتی ملال کی کیفیت ہے جو انتظار کی ابتدائی کہانیوں میں دکھائی دیتا ہے اس سے آگے بڑھیں تو یہ ہجرت ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کے اجتماعی تجربے میں ایک سطح شعور کی سطح تک آنے کی داستان ہے، اس کے بعد اس کی دو کیفیتیں ہو جاتی ہیں۔ قانون مماثلت کے تحت یہی ہجرت ایک طرف واقعہ کربلا کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری طرف بدھسٹ روایت میں بلکہ تقابل ادیان کی روایت میں جہاں عہد نامہ قدیم و جدید کے منظر آریائی ذہن کے منظروں سے مخلوط ہو جاتے ہیں اسی تجربے کے بالمقابل ایک ہجرت انسانی ذات میں واقع ہوتی ہے مثلاً زرد کتا میں ترک کی طرف سے دنیا کی طرف ہجرت واقع ہوتی ہے اور انتظار کے آدمی کی جون بدلنے کے معنی بھی وجود کی ایک سطح سے دوسری سطح کی طرف ہجرت کرنے کے ہیں اور ایک جنم کے بعد دوسرے جنم کے معنی بھی ایک کائناتی ہجرت کے ہیں۔ استعارے کی تکمیل کا کمال دیکھیے کہ جس جس طرح وجود کی سطحوں سے ہجرت واقع ہوتی ہے اسی طرح زبان کے ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف بھی ہجرت ہوتی ہے۔ زمین و زمان کے بدلتے ہوئے تعلق میں انسانی طرز احساس کی سطحوں کی نمائندگی انتظار کے ہاں زبان کے بدلتے ہوئے اسالیب سے ہوتی ہے۔ ان تمام ہجرتوں میں ایک بات مشترک ہے اور وہ سارے تجربات کے پیچھے ایک طرح کا قانون ثقل کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جو تاریخ میں وقت ہے۔ ذات میں خواہش نفس ہے اور کائنات میں تقدیر ہے۔ انتظار حسین کے نزدیک انسانی صورت حال کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات میں خواہش اور نفس سے، کائنات میں تقدیر سے اور تاریخ میں وقت سے نبرد آزما ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ "والعصر ان الانسان لفی خسر"۔ انتظار حسین کے اہم ترین نقاد سہیل احمد نے "کشتی" کا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انتظار کے ہاں قدیمی علامتیں ظاہر تو ہوتی ہیں لیکن ان کی حیثیت مابعد الطبیعیاتی ہونے کے بجائے عموماً تہذیبی ہے۔ فی الاصل یہ بات اتنی غلط بھی نہیں ہے لیکن میں اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ تہذیبی اور انسانی تجربے کی تفتیش کے ایک مسلسل اور

مستقل عمل نے انتظار حسین کے پورے رویے میں ایک مابعد الطبعیاتی استقلال پیدا کر دیا ہے مابعد الطبعیات کی بنیادی علامتوں میں وجود کی سطحوں کو مرکز اور محیط سے ظاہر کیا جاتا ہے چنانچہ یہ علامت ایک خاص سطح پہ آکر گھومنے والے پہیے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے مرکز میں سکون ہے اور محیط پر حرکت تیز ترین ہے۔ اسی کو بعض جگہوں پر کائناتی پہیہ COSMIC WHEEL بھی کہا گیا ہے جس کا محیط عالم ناسوت ہے۔ انتظار حسین کے ہاں ہجرت کا سارا مظہر اس کائناتی پہیے کے مقابل آتا ہے اور وقت ہو یا نفس وہ سب اسی کے مرکز سے محیط کی طرف ہجرت کرانے والی مرکز گریز قوتیں ہیں اور اسی قانون ثقل کے حیز میں یاد انسان کو مرکز کی طرف کھینچنے والی قوت ہے مابعد الطبعیات کی مختلف تہذیبی روایتوں میں آرٹ کا ایک جواز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ انسانی روح کے مستقل عنصر یعنی لمحۂ اولیں کو یاد دلاتا ہے یا مظہریاتی فنون کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ جنت کی یاد کو تازہ کرتے ہیں انتظار حسین کے ہاں بستی زمین پر جنت یا مرکز کا استعارہ ہے اور کہانی بار بار انسان کی فراموشگار فطرت پر فتح پاتی ہوئی اسے جنت کی طرف لوٹانے والی قوت۔

یہاں تک کہ اس گفتگو سے ہم پر انتظار حسین کی تہہ دار معنویت رکھنے والی کائنات ابھر آتی ہے تین جہتوں میں واضح ہو گئی ہے اور استعارے کی ذاتی، تاریخی اور کائناتی معنویت کا ایک خاکہ سا قائم ہو گیا ہے ابھی اس استعارے کی سرحدوں پر دو بنیادی تجربے باقی ہیں جن کی حیثیت اس پورے نظام میں واضح رہنی چاہیے ان میں سے اہم تر تجربہ بچپن اور جوانی کی سرحد پر محبت کا اولین ناتمام لمس ہے انتظار حسین کے ہاں اجتماعی تجربے اور اس سے منسلک سوالات اتنے قوی ہیں کہ ان میں یہ تجربہ کچھ کھو سا جاتا ہے لیکن اصل میں اس کی اہمیت یہ ہے کہ جیسا کہ لارنس نے گناہ کے تصور پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ عمل گناہ نہیں بلکہ اس کا علم گناہ ہے۔ چنانچہ محبت یا جنس کا یہ تجربہ جو انتظار کے ہاں بار بار ظاہر ہوتا ہے ایک طرف تو اپنے اندر ایک نیا امکان دریافت کرنے کی حیرت سے پُر ہے، دوسری طرف اس کا ناتمام رہ جانا اسے ایک یاد میں ڈھال دینے والی قوت ہے مرکزی نظام میں محبت کا یہ تجربہ نفس پروری کے ان مظاہر کے مقابل آتا ہے جو شعور کی روشنی میں آہستہ آہستہ ناری سواد کی طرف کھنچتے چلے جانے کے تصور سے منسلک ہے۔ اس کے مظاہر ہمیں "زرد کتا"، "کچھوے"، "پتے" وغیرہ میں دکھائی دیتے ہیں اول الذکر کیفیت تعلق کی ایک چوتھی جہت کی دریافت سے مماثلت رکھتی ہے اور اس طرح آدم اولیں کے تجربے کی یاد دلاتی ہے۔ دوسری کیفیت وجود کی برتر کیفیت سے ایک ادنیٰ صورت حال کی طرف ہجرت کے معنی رکھتی ہے۔ انتظار حسین کے مرکزی استعارے کے قریب ہی کہیں ہمیں بہت بڑی تعداد میں وہ کہانیاں دکھائی دیتی ہیں جن کا تعلق

ہجرت کے بعد کے منظر نامے سے ہے اور ان کہانیوں میں زیادہ تر سیاسی تحریکوں، ہنگاموں اور قومی وارداتوں کا تناظر اختیار کیا گیا ہے اس کی معنویت پر گفتگو کرنے سے پہلے وہ واقعے دیکھیئے جو ناول میں اس طرح کے حصوں کے بارے میں اردو فکشن کے ایک غبی نقاد نے دی ہے اور اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف شاید انتظار حسین کا دفاع فرمار ہے ہیں۔ ذرا پہلے اس کے اس ہاتھی کا بیان سنیے۔

> "حقیقت یہ ہے کہ انتظار حسین کا مقصد ناول میں قصہ بیان کرنا تھا ہی نہیں بلکہ آج کے پاکستان کے مسائل اور اس کے قومی وجود کے بارے میں محض سوالات اٹھانا اور تحریک پاکستان کے دوران دی جانے والی قربانیوں، ماضی کی یادوں اور ہجرت کے کرب کو بیان کرنا تھا۔
> علاوہ ازیں اس امر کو بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ ہو سکتا ہے انتظار حسین کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں مصلحتوں سے کام لینا پڑا ہو"

اس سارے بیان سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس ناول میں خوب ڈنڈی ماری گئی ہے انتظار حسین کے ہاں پاکستان کی سیاسی اور قومی واردات کے مواد سے پھوٹے ہوئے افسانے دراصل ایک ہمہ گیر تجربے کی ایک اہم جہت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کہانیوں میں سیاست پر لمبی چوڑی گفتگو نہیں، اس کے مقابل انسانی رشتوں کے سانچے اور مختلف تحریکوں، جنگوں، قومی اور بین الاقوامی وارداتوں کے حوالے میں بنیادی طور پر ایک بات واضح ہے کہ پاکستان بننے کے بعد سیاسی واقعات اور ان سے منسلک انسانی رویوں نے ایک طرح کی تہذیبی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اب آدمی خود کو اسی میں دریافت کرتا ہے یا ظاہر کرتا ہے سیاسی تحریکوں سے وابستہ ہنگاموں کا بنیادی مقصد انتظار حسین کے ہاں بھیڑ کا طرز احساس اور اس سے جنم لینے والی مغائرت ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی پاکستان کی دو جنگیں ہیں۔ یہاں آ کر انتظار حسین نے اس قومی واردات کو دو سطحوں پر دیکھا ہے۔ ایک تو بحیثیت ایک تجربے کے اور دوسرے بحیثیت ایک نتیجے کے۔ تجربے کی حیثیت میں تو انتظار کا موقف یہ ہے کہ جنگ ہماری ذات کے ظہور کا وقت ہے اور دوسرے یہ کہ ادب اس وقت واہگہ کی سرحد پر تخلیق ہو رہا ہے اور نتیجے کی سطح پر آکر لایعنیت کا وہ احساس ابھرتا ہے جو انتظار کے ہاں خندق کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ اس طرح یہ پورا لینڈ سکیپ کسی حقیقی بازیافت کا ایک التباس پیدا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ ہم ہر بار مدینہ جانے کے لیے نکلتے ہیں اور ہر بار کوفہ پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح یہ پورا لینڈ سکیپ ایک گہرے متن کی حیثیت سے ہجرت کے مرکزی تجربے

کو روشن کرتا ہے اور یاد کے عمل میں ایک شدت پیدا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

تو یہ ہے انتظار حسین کا مرکزی استعارہ اور اس کے گرد چلتی ہوتی آواگون کے چکروں جیسی کائنات جسے ایک انسانی زندگی اور تہہ دار یاد کے تناظر میں سمیٹ کر انتظار حسین نے ایک بین التہذیبی معنی دینے کی کوشش کی ہے اور اسکی معرفت اپنی شخصیت کے تانے بانے میں حتمی اکائی کی تلاش کا سفر کیا ہے۔ اتنے بڑے، مرتکز اور تہہ دار استعارے کو ناول کی شکل دینا ایک پرابلم ناول لکھنے کے ہم معنی ہے۔

(۲)

فرینک اوکانر نے ایک جگہ ہارڈی کے بارے میں لکھا ہے۔

"وہ تاریخی انقسام شخصیت کی ایک مسحور کر دینے والی مثال ہے۔ دو تہذیبوں کی سرحد پر کھڑا وہ ایک ایسی تہذیب کو جو سلیٹس سے بھی زیادہ پرانی تھی اور جس کے BARROWS قریبی پہاڑیوں سے بلند تھے۔ ریلوے لائن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جو اپنے ساتھ جدید ترین میوزک ہال کے گانے، میلو ڈرامہ اور جدید ترین سائنسی نظریات لا رہی تھی مٹتے ہوئے دیکھتا ہے۔ جب اس طرح دو تہذیبیں ٹکراتی ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ جو زیادہ بہتر ہو وہ فتح یاب ہو جائے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ کمتر تہذیب دلوں میں پناہ ڈھونڈ لیتی ہے"

اوکانر کا یہ اقتباس میں نے اس لیے دیا ہے کہ تہذیبی پراگندگی کی صورت حال میں تہذیبی فن کار کی کیفیت کے بارے میں ایک نہج سے گفتگو کر سکوں۔ ہارڈی کو تو نصاب میں داخل کر کے مدرسوں نے برباد کر دیا۔ ورنہ برطانیہ کے روایتی معاشرے کے حوالے سے ہارڈی تہذیب کے مسائل پر اور تہذیبی زوال کی صورت حال پر بہت بڑا آدمی ہے۔ مجھے انتظار حسین اور ہارڈی کے ہاں بہت ساری مماثلتیں طرز احساس کی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہارڈی نے اپنے انفرادی مسئلے کو شاعری میں حل کرنے کی کوشش کی ہے اور کائنات اور تقدیر کے جبر کے معاملات ناول میں بیان کیے ہیں ممکن ہے انیسویں صدی کے ایک آؤٹ آف فیشن ناولسٹ کے بارے میں یہ کہنا کہ انتظار حسین کے ہاں طرز احساس کی مماثلتیں دکھائی دیتی ہیں ممکن ہے مضحکہ خیز سمجھا جائے اس لیے کہ آج کل لوگ ایک تو یہ نہیں جانتے کہ طرز احساس کی مماثلت کس چڑیا کا نام ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر چیز کے پیچھے اثر و تاثر کا ایک سلسلہ تلاش کرتے ہیں اور انتظار حسین کے سلسلے میں آئینسکو، کافکا اور لارنس

کا نام ذرا زیادہ چلتا ہے لیکن ہمیں تو ان کے نام نہیں گنانے ہیں بلکہ ایک ناول کو اور اس کے لکھنے والے کے تجربے کو سمجھنا ہے طرز احساس کے ذریعے، اور اس کی مماثلتوں کے ذریعے ہارڈی کے ہاں یاد اور ہجرت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک بامعنی، پر محبت کائنات سے جلاوطنی کا ہے لیکن کائنات اس کے لیے پر اسرار ہے بالکل اسی طرح جیسے انتظار حسین کے لیے ہارڈی کا کہنا ہے۔

" اور آدھے وقت تو میں سایوں پر اسرار آوازوں وجدان، خواب اور آسیبی جگہوں میں یقین رکھتا ہوں" اصل میں انتظار حسین اور ہارڈی ایک ہی مٹی کے لوگ ہیں ان میں سے ایک اپنی پر اسرار کائنات سے جلاوطن کر دیا گیا ہے اور اسے یقین ہے کہ آدمی ہونے کے معنی ہیں المیہ کا کردار ہونا۔ دوسرے نے اپنی زمین اور اپنے بھید بھرے بچپن اور ایک پورے تصور کائنات سے ہجرت کی ہے لیکن یاد اس کے لیے بازیافت کا طریقہ ہے اور کہانی اس کا راستہ ہے اگر انتظار حسین کے پاس کہانی کے ذریعے اپنی کائنات کو دوبارہ تخلیق کرنے کا ہنر نہ موجود ہوتا تو شاید تاریخی اور تہذیبی انفصام شخصیت کی اس سے بڑی مثال ملنی مشکل ہوتی یہاں اگر واقعی یقین ہو جاتا ہے کہ ادب ایک معنی میں علاج الغربا بھی ہے انتظار حسین نے ایک تہذیب سے اپنی ہجرت کو ہر تہذیب سے اپنی ہجرت بنا دیا ہے اور ماضی کو کہانی کے ذریعے حال میں بن دینے کی کوشش کی ہے اور اس کا مطلب ہے اپنے وجود کے وسیع تر متن کی تلاش اور لبستی اسی وسیع تر متن کی تلاش کا نفسیاتی رزمیہ ہے اس نفسیاتی رزمیہ کی تکنیک پر ہمیں پہلے ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

" شہر افسوس کے آخر میں انتظار حسین کا ایک چھوٹا سا مضمونچہ شامل ہے کہانی کی کہانی، جس آدمی نے اسے غور سے نہیں پڑھا، وہ لبستی کی تکنیک اور اس میں وقت کی تین چار جہتوں کی باہم در آویزاں لکیروں کے نظام کو نہیں سمجھ سکتا۔ زمین اور زمانے کے بارے میں انتظار حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر زمین زمانے سے ربط قائم نہیں کرتی تو مٹی کا ایک ڈھیلا ہے۔ لہذا لبستی کی پوری ساخت کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس کے اسلوب وقت کو سمجھنا پڑے گا۔ لبستی میں بنیادی طور پر وقت کی پانچ سطحیں ہیں۔

۱۔ ہبوط آدم کا لمحہ

۲۔ ہند اسلامی تہذیب کا زمانہ۔

۳۔ آریائی وقت۔

۴۔ اسلامی تاریخ میں وقت کی جہت

۵۔ عام زندگی میں وقت کا بہاؤ

وقت کی یہ ساری پرتیں ناول میں ساتھ ساتھ سفر کرتی ہیں اور مختلف کیفیتوں میں ایک دوسرے سے قریب آتی ہیں اور دور ہو جاتی ہیں۔ ان کی پہچان اور نمائندگی تین طریقوں سے ہوتی ہے۔ مماثل واقعات کے ذریعے، انسانی کرداروں کے ذریعے اور موسم کائنات کے ذریعے۔ روپ نگر وہ جگہ ہے جہاں وقت کی پانچوں پرتیں مرتکز ہیں اور یہی اس بستی کی تہہ دار معنویت ہے۔ وقت کی ان پانچوں سطحوں کے مقابل میں اتنے ہی لینڈ سکیپ ہیں۔

۱ :- کائنات
۲ :- روپ نگر
۳ :- مشرقی پاکستان
۴ :- مغربی پاکستان
۵ :- شیراز

ناول کے متنوع اشیاء اور مناظر کسی نہ کسی طور پر ان ہی پانچ منظر ناموں کے اندر یا ان کی سرحد پر واقع ہیں۔ ناول کے پورے بہاؤ میں زمین کی ان پانچ صورتوں کا مختلف سطحوں پر وقت کی پانچ سطحوں سے اتصال ہوتا ہے اور واقعات قانون مماثلت کے تحت ان پانچ سطحوں پر استعاروں کی ایک پوری لڑی بناتے ہیں اس طرح واقعہ در واقعہ اور استعارہ در استعارہ وہ پیچیدہ نظام جنم لیتا ہے جو ناول میں انسانی عمل اور رد عمل کے درمیان کائنات اور انسان کے تعلق سے زندگی کی معنویت کے بارے میں سوال اٹھاتا ہے۔ جہاں تک ناول میں انسانی کرداروں کا تعلق ہے ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جنہیں باقاعدہ ان کے امکان کے حوالے سے DEVELOP کیا گیا ہے۔ بعض جگہ پورے پورے گروہ دراصل ایک ہی کردار بنتے ہیں اور بعض کردار مسلم تاریخ کے کچھ رویوں اور قدروں کی تجسیم ہیں۔ انسانی کرداروں میں سے ناول میں تین کردار اہم ہیں، صابرہ، ابا جان اور افضال۔ صابرہ ناتمام محبت یا ازلی ہجر کی علامت ہے لہٰذا وہ اور روپ نگر ایک جگہ پر آ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ ابا جان، مسلم تاریخ کے پورے سفر کا استعارہ ہیں جو ایک جگہ آ کر گم ہو جاتا ہے اور افضال خواب کی نمائندگی کرتا ہے یا آرٹ کی جو ایک سطح پر گمشدہ منظروں کی بازیافت کرتا ہے اور نئے منظروں کی تخلیق۔ اب ذرا ان تین کرداروں کی معنویت پر ایک اور زاویے سے نظر ڈالیے یہ کردار مماثل اور مقابل قسم کے کرداروں کے جھرمٹ میں واقع ہیں اس طرح ناول میں چھوٹے چھوٹے کرداروں کے استعاراتی گچھے وجود میں آتے ہیں اور کہانی کا پورا سفر انہیں چھوٹے چھوٹے دائروں کی وساطت سے ہوتا ہے اس طرح کہانی کا پورا انسانی ڈھانچہ چھوٹے چھوٹے جزیروں سے ترتیب پاتا ہے جو اپنی معنویت اپنی ناتمام مثالوں کے ساتھ ہونے پر ہی ظاہر کرتے ہیں یا اپنے مقابل سے اور اپنی

ضد سے اُجاگر ہوتے ہیں پھر ان تین کرداروں کی ایک عجیب و غریب موضوعی معنویت بھی ہے جو انتظار حسین کی پوری کائنات کو ایک نئی جہت سے سمیٹتا ہے اور ظاہر کرتا ہے۔ ابا جان کا کردار پوری تاریخ کی وراثت ہے صابرہ ذات کی گہرائی کی جہت میں ایک ناتمام اور پیاسی دریافت ہے اور افضال سرزمین ہجرت میں تاریخ کی قوت، حسن اور مہجور محبت کی بازیافت کا خواب ہے۔ اس طرح یہ کردار انتظار حسین کی داخلی کائنات میں انسانی معنویت کی تین سطحوں کی جہت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ تین کردار روپ نگر وہاں سے ہجرت، جنگ، سیاسی ہنگامہ آرائی، غرض کہ ناول کے پورے لینڈ سکیپ میں جگہ جگہ ظاہر ہوتے ہیں اور ان کے درمیان مختلف سطحوں پر نت نئے منظر وجود میں آتے ہیں اور اس طرح یہ کہانی کے منظر نامے کو وقت، روانی اور واقعات کی مماثلت کے درمیان انسانی حوالوں سے روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔

معاشرے اور فرد کے بارے میں انسانی تعلقات کی معنویت کے نقطہ نظر سے انتظار حسین نے وہ نقطہ نظر اختیار کیا ہے جو اصل میں حقیقت نگاری کا بہت گہرا اور داخلی رویہ ہے یہاں میں آئن واٹ کی ایک بات نقل کرتا چلوں۔ آئن واٹ کا کہنا ہے کہ اعلیٰ ترین حقیقت نگاری میں معاشرے کو بنیادی طور پر ذاتی اصطلاحوں میں دیکھا جاتا ہے اور اشخاص کو تعلقات کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ اساسی طور پر سماجی اصطلاحوں میں یہی کیفیت انتظار حسین کے ہاں ان کرداروں اور ان کے سماجی متن کے سلسلے میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ان کرداروں کی ایک جہت اور ہے اور تعلق کی اس جہت کو سمجھنے کے لیے پہلے آرٹ کے بارے میں لارنس کی ایک بات سن لیجیے۔ میں لارنس کے ایک ہی مضمون میں سے چند فقرے نقل کرتا ہوں تاکہ انتظار حسین کا اپنے کرداروں سے اور ان سے منسلک کائنات سے تعلق کی ایک جہت واضح ہو سکے۔ لارنس کا کہنا ہے۔

> "فن کا کام یہ ہے کہ وہ انسان اور اس کے گرد کی کائنات کے رشتے کو زندہ لمحے میں ظاہر کرے"

اسی کی توضیح میں لارنس نے کہا ہے۔

> "جب وان گاف سورج مکھی پینٹ کرتا ہے تو اس وقت وہ ظاہر کرتا ہے یا حاصل کر لیتا ہے ایک لمحہ بر میں وہ واضح رشتہ جو اس کے اور سورج مکھی کے درمیان ہے"

تو اب ہم کرداروں کے اس بنیادی ڈھانچے پر نظر ڈالنے کے بعد یہ دیکھ سکتے ہیں کہ انتظار حسین کے ہاں اپنی کائنات سے رشتہ کس زندہ لمحے میں واقع ہوتا ہے اور اس میں گہرائی کی کون کون سی جہتیں پائی جاتی ہیں۔ اس مسئلے پر ایک جگہ انتظار حسین نے خود بھی کلام کیا ہے "کہانی کی کہانی" میں انتظار حسین

نے اسے وقت کا روشن نقطہ کہا ہے۔ وقت کا یہ روشن نقطہ دراصل انسانی تعلق کا کرسٹل ہے جو مردہ زمینوں اور بیتے زمانوں کو روشن کر کے لمحۂ موجود بنا دیتا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ انتظار حسین کے ہاں وقت کی کم از کم پانچ سطحیں ہیں جو اپنے متقابل پانچ منظر ناموں میں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرتی ہیں اس طرح انتظار حسین کی کائنات ایک ایسا لینڈ سکیپ پیدا کرتی ہے جس میں ایک روشن نیوکلیائی لمحہ بہت تیزی سے حرکت کرتا ہے اور وقت نئے پیٹرن بناتا چلا جاتا ہے۔ اس پیٹرن کو سمجھے بغیر ہم انتظار حسین کے اہم ترین پہلو یعنی وقت کے عمل کو اور اس کے پورے نظام کو جیسا کہ وہ اس ناول میں ظاہر ہوا ہے نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے فہرستیں اور جدولیں تیار کرنے سے بڑی وحشت ہوتی ہے لیکن یہاں اس طرح تھوڑا بہت ہوم ورک تو کرنا ہی ہوگا۔ انتظار حسین کے ہاں وقت کا طرزِ عمل ان تناظرات میں ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ ہبوطِ آدم کا لمحہ اس کا تناتی یا ارضی وقت کا سرا ہے جو فطرت میں بنیادی تبدیلیاں لاتا ہے۔

۲۔ ہند اسلامی تہذیب میں وقت کا طرزِ عمل بنیادی طور پر تہذیبی ہے جو رویوں میں اور اشیاء اور معاشروں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ اسلامی تاریخ میں وقت کا سرا انتظار حسین کے ہاں واقعہ کربلا ہے جو اپنے مماثل واقعات کے ذریعے پھیلتا ہوا پاکستان کی جنگ تک آجاتا ہے اور بنیادی طور پر تاریخی جبر میں انسانی جوہر کو ظاہر کرتا ہے یہ وقت کی وہ جہت ہے جو تہذیبی وقت کو متاثر کرتی ہے اور انسانی معنویت کے زوال سے منسلک ہے۔ اسی کی ایک توسیع عہدناموں کی جہت بھی ہوتی ہے

۴۔ آریائی وقت بنیادی طور پر دو جہتوں میں سفر کرتا ہے۔ بدھسٹ تناظر میں یہ انسان کی بنیادی سچویشن کو ایک ازلی تکرار کی کیفیت میں ظاہر کرتا ہے اور ہندو تناظر میں یہ لازمان کی جہت سے منسلک ہو جاتا ہے۔

پھر اصل پیچیدگی تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وقت کی یہ ساری جہتیں باہم مخلوط ہونے لگتی ہیں۔ بہرکیف تو وقت کی ان ساری سطحوں کا ارتکاز لمحۂ ہجرت میں ہوتا ہے جو انتظار حسین کے ہاں بنیادی اور مرکزی استعارہ ہے۔ یہیں سے اس کی ایک جہت وقت کے عام تجربے کی ہو جاتی ہے جس میں انتظار حسین کے ناتمام کرداروں کی شخصیت کے تضادات روزمرہ کے سیاسی واقعات میں پژمردگی پاتے ہیں اور اس سطح سے اوپر نہیں اٹھ پاتے۔ بہر تاؤ کے اوضاع کے حوالے سے ناول تہذیبی وقت میں داخل ہو جاتا ہے اور یہاں ایک سطح پر تو ہند اسلامی تہذیب اپنے تمام تخلیقی ورثے

کے ساتھ اماں جیسے کرداروں میں ظاہر ہوتی ہے اور اسی سے ایک جہت وہ پھوٹتی ہے جہاں اس تہذیبی منطقے میں اسلامی تاریخ کا پورا عمل ہوتا ہے اور اباجان اس کے لیے جزوی طور پر میڈیم ہیں۔ اباجان کے کردار میں تاریخی اور تہذیبی وقت یکجان ہو گئے ہیں۔ اسی تناظر میں ظلم کی کیفیات کو کربلا کے ساتھ رکھ کر دیکھا گیا ہے اور یہ اس تاریخ کی تکراری پہلو ہے۔ تاریخ کے اسی جبر اور تکرار سے انسانی برتاؤ کے اوضاع کے بارے میں بنیادی سوالات پیدا ہوتے ہیں اور یہاں ناول ایک بین التہذیبی ڈھانچے میں داخل ہو جاتا ہے اور بدھسٹ تناظر یہاں سے سر ابھوز ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس تناظر میں بنیادی طور پر سوالات کا تعلق انسانی عمل کی نوعیت اور معنویت سے ہے اگر ہندو اصطلاح میں کہیں تو اس سطح پر انتظار حسین کا مسئلہ سنسار ہے یعنی وہ منظر جس میں آدمی اعمال کے ذریعے خود کو ظاہر کرتا ہے اعمال کی اس معنویت کے فوراً بعد ناول لازمان کی سطح کو ایک ہندو تناظر میں چھوتا ہے اور لمحہ زمان میں واقع ایک تجربے کے ڈانڈے ایک ازلی تجربے سے ملا دیتا ہے۔ وہ ازلی تجربہ اور کرب جو انسانی سچویشن کی بنیاد میں واقع ہے۔

"وہ نگری کہ اس بھوساگر میں شانتی کا دیپ تھی، اب ساگر کی امنڈ گھمنڈ لہروں میں بلبلے سمان دکھائی پڑتی تھی۔ سو بھیشم نے کوروکشیتر کے بیچ پران چھوڑتے سمے یدھشٹر سے کہا کہ ہے یدھشٹر پہلے پانی تھا کہ پانی ہی سے سب کچھ بنا ہے اور جانا میں نے کہ انت میں بھی پانی ہی ہے اوم پانی۔ انت پانی۔ اوم شانتی، شانتی، شانتی۔"

تو اس طرح یہاں آ کر وقت کا سانپ اپنی دم اپنے منہ میں دبا کر وقت کا دائرہ مکمل کرتا ہے اور ایک زمانی تجربے کی حد ماورائے زمان کی کیفیت سے مل جاتی ہے اور ہجرت کا ملال بنیادی انسانی کرب میں مخلوط ہو جاتا ہے۔

وقت کے اس سارے نظام نے واقعات اور ان کے درمیان مماثلتوں کے ذریعے اپنا ظہور کیا ہے۔ مثلاً مشرقی پاکستان کا زوال ایک استعارہ بن کر اپنی ساری خوش فہمیوں اور طفل تسلیوں کے ساتھ، سن ستاون کے ساتھ اور اس سے بھی آگے تک چھوٹی چھوٹی علامتوں کی ایک پوری لڑی پروتا جاتا ہے۔ یہی کیفیت جگہوں کی ہے۔ شیراز، امپیریل سے لے کر بھگت کی دکان تک جگہیں ایک استعاراتی جھرمٹ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ سیاسی ہنگامہ آرائی شہر کے کرفیو سے لے کر کوفہ کی دہشت تک مماثلتوں کا ایک پورا نظام رکھتی ہے اور پھر روپ نگر کی حویلی کی فراموش شدہ کوٹھڑی سے لے کر قبرستان میں اباجان کی قبر تک ایک پورا سلسلہ ہے جو وراثت کی کیفیت اور انسان کی بنیادی

معنویت کو اجاگر کر کے انسان کو خاک کا اسیر کر لیتی ہے

چار دیواری عناصر میں

خوب جگہ ہے پر ہے بے بنیاد

واقعات کے ان سارے سلسلوں کو اور منظروں کو ایک لڑی میں پرونے کے اس عمل کو انتظار حسین نے ایک جگہ اپنی مٹی کے ذریعے جنھیں اپنے اپنی جڑوں کے گرد جمع کرنے کا عمل قرار دیا ہے اور بستی کی بنیادی معنویت یہی ہے کہ انتظار حسین نے اس ناول کے ذریعے اپنی پوری تصویر کائنات کے ٹکڑے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور داخلی جہت سے اس کے معنی ہیں۔ اپنی شخصیت کے ادنیٰ ترین تجربوں سے لے کر اعلیٰ ترین سطحوں تک کی بنیادی وحدت کو تلاش کرنا۔ ان معنوں میں بستی ایک بہت بڑے اجتماعی تجربے کو اس کی تمام ممکن جہتوں میں گرفت میں لے لینے کی کوشش ہے۔ اس اجتماعی تجربے کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ انتظار حسین نے اسے آہنگِ زمان کے تناظر میں پوری طرح سمونے کی کوشش کی ہے اور اس میں شیطنیت کا وقت کے مہلک طرزِ عمل کے بارے میں گہرا احساس ہر قدم پر نمایاں ہے۔

یہاں آ کر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انتظار حسین نے اس پورے اجتماعی تجربے کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا ہے؟

اردو فکشن کی تنقید اب ایسی افسوس ناک کیفیت اختیار کر چکی ہے کہ لوگوں نے بستی جیسے ناول کے بارے میں عجیب و غریب بیان داغے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک تو یہ ناول ہی نہیں ہے اس لیے کہ اس میں بعض کرداروں کا ارتقا نہیں ہوا ہے۔ بعضوں کے نزدیک روپ نگر والا حصہ تو بہت اچھا لکھا گیا ہے لیکن جو حصہ پاکستان کے بارے میں ہے اس میں زیادہ تر شیراز میں لمبی لمبی بحثوں پر مشتمل ہے۔ اصل میں ان میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جو بیچارے تکنیک کے معاملے میں ذہنی طور پر فردوس بریں سے اور سید وقار عظیم مرحوم کے مضمون سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ لہٰذا بستی انھیں ناول کے بجائے ایک عجیب و غریب گورکھ دھندا سا دکھائی دیتا ہے اور اتنی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کرداروں کی کوئی اجتماعی نشوونما بھی ہو سکتی ہے اور ان کا ارتقا مختلف چھوٹے چھوٹے ایک دوسرے سے الگ الگ ٹکڑوں میں بھی ہو سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کردار انسانوں کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ انتظار حسین کے ہاں اہم ترین کردار تو اصل میں جگہیں ہیں جن کی کیفیت اور جن کے طرزِ عمل سے انسانی کرداروں کی معنویت اور ان کا نامیاتی وجود متعین ہوتا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ مجھے اس قبیل سے معلوم ہوتے ہیں جو کسی تجربے کی معنویت کو سمجھنے اور اس کی جہتوں میں

سفر کرنے کی مشقت سے گھبراتے ہیں اور ناول کا تصور ان کے پاس ایک جھنجھلاہٹ دار کہانی سے زیادہ نہیں ہے بستی جیسے ناول میں تجربہ چونکہ مختلف سطحوں پر واقع ہوتا ہے اس لیے بے چاروں کی سانس بار بار اکھڑ جاتی ہے۔ بستی کے بارے میں اس طرح کی گفتگوؤں سے مجھے جوائس کے ناولوں پر ہونے والی گفتگو یاد آتی ہے کہ تقریباً اسی طرح کے اعتراضات جوائس کی تحریروں پر بھی ہوئے تھے اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ انتظار حسین نے ایک نفسیاتی رزمیہ لکھا ہے اور ایک بہت بڑے اور تہہ دار تجربے سے نبرد آزما ہونے کی کیفیت ناول میں شروع سے لے کر آخر تک پائی جاتی ہے وہ تجربہ اپنی ساری جہتوں میں پھیلا ضرور گیا ہے لیکن مکمل طور پر اس کا بیان ہونا ممکن نہیں ہے پھر انتظار حسین کے ان تجربوں کے نامکمل رہ جانے کی اپنی ایک الگ تخلیقی معنویت ہے اس طرح بستی میں اہم تر چیز تجربے کا مکمل بیان نہیں بلکہ تجربے کے ساتھ بیان کی ایک مسلسل کش مکش ہے، دائم اور پر ملال۔ اور یہ کیفیت بستی کی ایک ایک سطر میں پائی جاتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بستی کی کہانی اس ناول میں ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک نئی کہانی کے آغاز کے لمحے تک آتی ہے ایک نئی کائنات کے خواب پر جس کا مواد ایک گزرنے والی کائنات سے مستعار لیا گیا ہے۔

"خاموش" افضال حسین نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر عرفان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "مجھے لگتا ہے کہ بشارت ہوگی۔"

"بشارت؟ اب کیا بشارت ہوگی؟" عرفان نے تلخ مایوس لہجے میں کہا

"کا ہے، بشارت ایسے ہی وقت میں ہوا کرتی ہے جب چاروں طرف۔"

کہتے کہتے رکا۔ پھر سرگوشی میں بولا۔ "یہ بشارت کا وقت ہے۔"

اس لمحے پر آ کے ایک پراسرار ہاتھ ناول کی فضا میں ظہور کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کہانی ختم ہو جاتی ہے افضال پر وارد ہونے والا لمحہ بشارت، آرٹ کے ذریعے ایک نئی کائنات کی تشکیل کا وقت ہے اور یہ اصل میں توسیع ہے اس منظر کی۔

"بیٹے، امام کی سواری آتی تھی۔" رکیں پھر بولیں۔ "ایسی روشنی جیسے گیس کا ہنڈا جل گیا ہو، جیسے کوئی کہہ رہا ہے مجلس کرو۔"

ابا جان نے تامل کیا پھر کہا۔

"بی اماں آپ کو بشارت ہوتی ہے۔"

ان میں سے ایک بشارت وہ ہے جو دینی اور تاریخی سرچشموں سے اپنا ظہور کرتی ہے اور دوسری بشارت وہ ہے جو انسان میں موجود کہانی کہنے کی قوت اور خواب دیکھنے کی صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے اور یہ وہ

سطح ہے جب انفرادی وجود انسان کے اجتماعی لاشعور اور حافظے میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ JUNG کا کہنا ہے۔

"فنی تخلیق کا راز اور فن کا تاثر پراسرار اشتراک کی کیفیت میں لوٹنے کے عمل میں ہے یعنی تجربے کی اس سطح تک جہاں انسان جیتا ہے فرد نہیں اور جہاں ایک آدمی کی مسرت ملال کا معاملہ نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف انسانی وجود کا مسئلہ ہوتا ہے۔"

بستی میں انسانی وجود کا یہ مسئلہ ایک ایسی کیفیت میں ظہور کرتا ہے جب داؤد کی آواز ایک زوال پاتی ہوئی کائنات میں گونجتی ہے۔

"اس سے پہلے کہ اس کی مانگ میں چاندی سی بھر جائے اور چڑیاں چپ ہو جائیں۔ اور اس سے پہلے کہ چابیوں کو زنگ لگ جائے اور گلی کے کواڑ بند ہو جائیں اور اس سے پہلے کہ چاندی کی ڈوری کھولی جائے اور سونے کی کٹوری توڑی جائے اور گھڑا چشمے پر پھوڑا جائے اور چندن کا پیڑ اور ساگر میں سانپ اور ....."

اس کیفیت میں دو بشارتوں کے درمیان ایک نئی کائنات کا سایہ جھلک اٹھتا ہے جس میں کہیں کہیں بستی کے خد و خال جھلملا رہے ہیں اور ایک گہری یاد دور تک آسمان پر چھائی چلی جاتی ہے جس میں کبھی کبھی صابرہ کا چہرہ دمک اٹھتا ہے اور قبرستان میں قبروں کے درمیان ایک طویل شام ٹہلتی جاتی ہے۔

OO

انتظار حسین اور اُن کی بستی

عطاء الحق قاسمی

سینئر ادیبوں کے بارے میں لکھتے ہوئے خاصا محتاط ہونا پڑتا ہے۔ انتظار حسین بھی میرے سینئر ہیں۔ چنانچہ میں خاصا محتاط ہوتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ انتظار حسین سے میری بیشتر ملاقاتیں ٹی ہاؤس کے باتھ روم میں ہوتی ہیں۔ یعنی اکثر

؎ کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

والی صورت حال سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ یا پھر یہ کہ ٹی ہاؤس کے باہر ریلنگ سے ٹیک لگا کر ہم کچھ دیر کے لیے گپ شپ لگا لیتے ہیں۔ اسی طرح کتابوں کی تقریبات رونمائی میں جب ہمارا "آئٹم" آتا ہے۔ یعنی چائے کے لیے پکارا جاتا ہے تو کچھ دیر کے لیے یہاں تبادلۂ خیال کا موقع مل جاتا ہے البتہ انتظار صاحب سے تفصیلی ملاقاتیں ان کے دفتر یا گھر پہ ہی ہوتی ہیں۔ یہ ملاقاتیں ٹی ہاؤس کے اندر اس لیے نہیں ہو پاتیں کہ ٹی ہاؤس کی فضا گذشتہ کچھ عرصہ سے بہت زہریلی ہو گئی ہے۔ یہاں لوگ ٹکڑیوں میں بیٹھتے ہیں اور ایک میز سے دوسری میز تک جانے کے لیے اب باقاعدہ ویزا لینا پڑتا ہے۔ امن و آشتی کا یہ علاقہ اب "کومٹ منٹ" کے زیر اثر ہے۔ البتہ اتنا ہے کہ یہ متحارب گروہ جب علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو پھر کسی قسم کی بیگانگی کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ

؎ فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

لیکن اپنے اپنے مورچوں میں پوزیشنیں سنبھالنے کے بعد ان میں سے ہر ایک پھر سے سوا لاکھ کا ہو جاتا ہے صورت حال کو اس نہج تک پہنچانے میں کسی ایک فرد یا کسی ایک گروہ کا ہاتھ نہیں بحمداللہ ہم سب نے مل جل کر ٹی ہاؤس میں یہ فضا پیدا کی ہے۔ ایک ماسٹر صاحب نے اقبالؒ کے شعروں کی تشریح کرتے ہوئے عزیز طلبہ کو بتایا کہ

"آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز" کا مطلب یہ ہے کہ اگر عین لڑائی کے دوران بھی نماز کا وقت آ گیا۔

"قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز" تو عرب قوم قبلے کی طرف منہ کر کے ان کے حضور میں سجدہ ریز ہو گئی۔

"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ آقا اور غلام ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے اتنی دیر میں دشمن نے حملہ کر دیا اور پھر بچوں "نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز"۔ بس اس شعر کی قدر سے مختلف قسم

کی عملی تشریح ان دنوں ٹی ہاؤس میں بھی نظر آتی ہے۔ یعنی یار لوگ ان دونوں صفیں درست کرنے کی بجائے صف آرا ہیں اور نہیں جانتے کہ اگر تیسرے دشمن نے حملہ کر دیا تو نہ کوئی بندہ اور نہ کوئی بندہ نواز رہے گا کیونکہ اس کی سرکار میں پہنچ کر سبھی ایک ہو جاتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ انتظار صاحب کا ذکر کرتے کرتے میں یہ کن چکروں میں پڑ گیا ہوں تو خواتین و حضرات معاملہ دراصل یہ ہے کہ اس ساری گفتگو کا محور ابھی تک انتظار صاحب ہی ہیں کیونکہ اس تمام صورتِ حال میں انتظار حسین گنتی کے ان ادیبوں میں سے ہیں جو اپنی وابستگیوں کے باوجود انسانی رشتوں سے خود کو منقطع نہیں ہونے دیتے۔ ہمارے ہاں کے ایک معروف دانشور گذشتہ دنوں ایک سیاسی پارٹی سے وابستہ دانشوروں کی شدید نفرت کا نشانہ بنے۔ ان کے بعض قریبی دوستوں نے ان سے بات چیت ترک کر دی، کسی محفل میں ملاقات ہوتی تو وہ انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیتے۔ انتظار حسین بھی اپنے اس دوست سے اختلاف رکھتے تھے لیکن انہوں نے عین کشیدگی کے دنوں میں اپنے کالموں میں بڑی محبت سے ان کا ذکر کیا۔ اور خدا جانے اس ایک دوست کے لیے وہ اپنے کتنے دوستوں کو خفا کر بیٹھے۔ اب رہی بات انتظار حسین کے ناول بستی کی تو یہ ناول بھی ویسا ہی ہے جیسا میں نے ابھی انتظار حسین کو بیان کیا ہے یعنی انتظار حسین کی تمام وابستگیاں اس ناول میں پوری طرح نظر آتی ہیں لیکن اس کے لیے انہوں نے انسانوں کو مسترد نہیں کیا۔ انتظار حسین نے نوائے وقت کے ادبی ایڈیشن کے لیے آٹوگراف دیتے ہوئے لکھا تھا "کومٹ منٹ ؟ وہ تو میرا ایم کے پیزڈ کے ساتھ ہے!" اس طرف تو میں بعد میں آؤں گا۔ پہلے یہ عرض کر لوں کہ اردو میں لکھے گئے بیشتر قابلِ ذکر ناول کسی نہ کسی طور پاکستان کے حوالے سے ہی لکھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں آگ کا دریا، اداس نسلیں، اداس آنگن وغیرہ کا نام بطور مثال لیا جا سکتا ہے۔ میں اگر اس رجحان کی وجوہ دریافت کرنے میں مشغول ہو جاؤں تو خدشہ ہے کہ میں "تحریک" سے اتر جاؤں گا۔ چنانچہ فی الحال یہ ذکر بھی چھوڑیں کیونکہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس سلسلے کی ایک اور مثال انتظار حسین کے ناول "بستی" کی صورت میں بھی سامنے آئی ہے کہ یہ ناول بھی ۱۹۴۷ء سے قبل اور ۱۹۴۷ء کے بعد کی صورتِ حال پر مشتمل ہے۔ انتظار کے ہاں ہجرت کا تجربہ یوں تو پوری مستقل مزاجی کے ساتھ سامنے آیا ہے اور بیشتر بدل بدل کر آیا ہے مگر جو بات وہ اپنے افسانوں میں زیرِ لب کرتے تھے، قدرے وہی بات اور قدرے اس سے مختلف بات انہوں نے اس ناول کی صورت میں ذرا بلند آواز میں کہی ہے چنانچہ یہ ناول اس لحاظ سے بھی قابلِ ذکر ہے کہ انتظار کا نقطۂ نظر ایک نادیدہ امانت کی طرح قاری کی طرف منتقل ہونے کے ساتھ کھلے منظروں کی طرح بھی سامنے آیا ہے۔ انتظار حسین اس ناول میں "نہ نہ" کرتے ہوئے بھی "کومٹ منٹ" کر گئے ہیں اور یہ کومٹ منٹ الگزیم کے پیزڈ کے ساتھ ہے بھی تو ناول میں یہ نیم کا پیڑ انڈیا میں رہ جانے والے روپ نگر کے علاوہ لاہور کے آنگنوں اور لاہور کے آنگنوں کے علاوہ مسلمانوں کی تاریخ کے نشیب و فراز میں بھی اگا نظر آتا ہے۔

نیم کا پیڑ — ماں نیم کا پیڑ، ہجرت اور اس کے بعد کے کڑوے کسیلے سیاسی تجربوں، دونوں صورتوں میں بستی میں نظر آتا ہے اور بظاہر کومٹ منٹ سے انکار کرنے والے انتظار کی وہ مخصوص کومٹ منٹ بھی یہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔ جس کا ذکر میں نے اوپر کی سطور میں ان کی شخصیت کے حوالے سے کیا ہے۔ گذشتہ تین دہائیوں میں مسلسل بے چینی، اضطراب، بے ہنگم آوازیں، روپ نگر کی حویلی کی چابیاں، روپ نگر ہی میں رہ جانے والی صابرہ، سقوطِ مشرقی پاکستان، دفن شدہ لاشیں، غیر دفن شدہ لاشیں، کرفیو، بلیک آؤٹ — نگران کے بیچوں بیچ خواجہ صاحب، افضال اور سقوطِ مشرقی پاکستان پر پھوٹ پھوٹ کر رونے والا سفید بالوں والا ایک شخص، پرانے شہروں کو یاد کرنے والے اور نئی بستی سے محبت کرنے والے، اس کے سر سے بلائیں ٹلنے کی دعائیں کرنے والے اور اس کے لیے بشارتیں سنانے والے کردار، پاکستان کی شکست پر قہقہے لگانے والے انقلابی، عوامی۔ امریکہ کو گالیاں دے کہ امریکہ یاترا کرنے والے انقلابی، عوامی، انقلاب کی باتیں کرتے کرتے سی۔ ایس۔ پی بننے والے انقلابی ہر ایک کو غدار کہنے والے غداروں کی صف میں شامل ہونے والے پاکستان کے ماحول، ہندوستان سے ایک محبت بھرا خط اور پاکستان کی فضاؤں پر بمباری کرنے والے ہندوستانی طیارے، یہ سب "بستی" میں موجود ہے اور انتظار حسین کی شخصیت کی طرح دھیمے لہجے اور کہیں کہیں کھلے لہجے کے ساتھ اس ناول کے اوراق میں سامنے آیا ہے۔

مگر اس ناول میں ہیرو کے طور پر جو کردار ابھرتا ہے وہ بہرحال افضال کا ہے۔ افضال، پرانے شہروں کو یاد کرنے والا، نئی بستی سے محبت کرنے والا، اس کے سر سے بلائیں ٹلنے کی دعائیں کرنے والا اور اس کے لیے بشارتیں سنانے والا کردار ہے۔ انتہائی کرب کے ماحول میں ناول کے اختتام پر جو ڈائیلاگ قاری کے کانوں میں اترتے ہیں وہ اسی افضال کے ہیں جو نوید سناتا ہے کہ آسمانوں سے بشارتیں اترنے والی ہیں۔ اس ناول کا ہیرو بظاہر ذاکر ہے جو پرانی حویلی کی چابیاں سنبھال کر رکھتا ہے۔ مگر واقعات کے خلا میں وہ رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ انتظار حسین کے ناول میں یہ سب لوگ کھلے منظروں کی طرح آئے ہیں۔ تاہم اس میں ایک نادیدہ امانت سپرد کرنے کا انداز بھی اسلامی تاریخ کے حوالوں، حکایتوں، دیو مالائی قصوں، دھندلکوں نئے تکنیکی تجربوں اور انتظار کے بے پناہ اسلوب کے ذریعے کچھ خوبصورتی سے در آیا ہے کہ یہ ناول ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد پڑھتے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ختم نہ ہو جائے۔ البتہ جہاں تک اس ناول کے نسوانی کرداروں کا تعلق ہے وہ یاد رہنے والے تو ہیں۔ مگر انتظار نے اپنے ہیرو کی وساطت سے ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ ان سے زیادہ یاد رہنے والا ہے۔ مثلاً ایک دوشیزہ ناول کے ہیرو ذاکر کو رات کے بارہ بجے اپنے کمرے میں چل کر کافی پینے کی دعوت دیتی ہے اور ساتھ یہ بھی کہتی ہے کہ اس کے گھر والے اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے قائل نہیں ہیں۔ مگر یہ ہیرو گریجویٹ ہوتے ہوئے

بھی اس گھر یعنی اس دوشیزہ کے ساتھ علمی مباحثوں کا موقع ہاتھ سے گنوا دیتا ہے۔ بے شک یہ ہیرو ہے جو خسارے میں ہے ۔

اور خواتین و حضرات! میں نے اپنی گفتگو کا آغاز ٹی ہاؤس کے تذکرے سے کیا تھا، سو کوئی حرج نہیں اگر بتا چلوں کہ "بستی" کے بیشتر کردار ٹی ہاؤس ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ناول پڑھتے ہوئے جب ایک کردار کے سامنے یہ جملہ ابھرتا ہے کہ "لاہور شہر خبیث لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ بس تم اور میں طیب ہیں۔ آؤ ہم مل کر پاکستان کو خوبصورت بنائیں" [illegible] چہرہ ہماری نظروں کے سامنے گھومتا ہے وہ ہم سب کا جانا پہچانا ہے۔ پوری اسلامی تاریخ کے پس منظر میں جنت گم شدہ کو تلاش کرنے والا ایک چپ چاپ شخص بھی ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ ہر شخص کو شک کی نظروں سے دیکھنے والا کردار بھی ٹی ہاؤس ہی کا ایک کردار ہے۔ ٹی ہاؤس کی میز پر مکے مار مار کر اور منہ میں جھاگ بھر کر انقلابی گفتگو کرنے والا کردار بھی ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ ہم لوگوں نے ان کی باہر کی جھلک دیکھی ہے۔ انتظار حسین نے انہیں اندر سے جھانکا ہے اور تاریخ کی کڑیوں سے ملا دیا ہے۔ یوں "بستی" ہمارے ظاہر اور باطن کی کہانی ہے۔ اس میں کتنے ہی کردار ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو ایک ہی کردار ہے جو ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر حال کی دہلیز تک آیا ہے ۔

خواتین و حضرات! میں اپنا مضمون یہیں ختم کرنے لگا تھا، مگر مجھے اچانک یاد آیا کہ ہمارے ہاں جو تنقیدی مضامین پڑھے جاتے ہیں یا شائع ہوتے ہیں ان میں اپنے ممدوح کے نظریۂ فن پر بھی بحث کی جاتی ہے۔ سو عرض کیا ہے کہ انتظار حسین کے نظریۂ فن کو سمجھنا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے اس بات کی وضاحت بعد میں ہوگی۔ پہلے ان کے نظریۂ فن کو سمجھنے کے لیے یہ لطیفہ سن لیں۔ لطیفہ کچھ یوں ہے کہ ایک صاحب گائے خریدنے کے لیے مارکیٹ میں گئے۔ آڑھتی نے انہیں دو بھینسیں دکھائیں۔ ایک کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ روزانہ بیس سیر دودھ دیتی ہے اور اس کے علاوہ سال میں دو کٹے بھی دیتی ہے۔ اس کی قیمت پانچ ہزار ہے۔ دوسری بھینس کے بارے میں بتایا کہ یہ نہ دودھ دیتی ہے، نہ کٹا دیتی ہے۔ مگر اس کی قیمت دس ہزار روپے ہے۔ یہ سن کر گاہک نے پریشان ہو کر پوچھا "یہ کیا بات ہوئی؟ جو نہ دودھ دیتی ہے نہ کٹا دیتی ہے اس کی قیمت کیونکر زیادہ ہے؟" آڑھتی نے یہ سن کر تاسف کا اظہار کیا اور کہا "صاحب بہت افسوس کی بات ہے۔ آپ کی نظروں میں کریکٹر کی کوئی قیمت ہی نہیں؟" انتظار حسین بھی فن کے بارے میں جو نظریہ پیش کرتے ہیں، وہ کچھ اسی قسم کا ہے۔ یعنی اس کی افادیت کی بجائے اس کے کریکٹر پر زور دیتے ہیں لیکن "بستی" کی صورت میں انہوں نے ہمیں جو کچھ دیا ہے، اس کا کریکٹر ہی نہیں۔ اس کی افادیت بھی مسلم ہے۔ "قول و فعل" کا تضاد [illegible] کہتے ہیں

○○